

# تفسیر قرطبی

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمہ اللہ

ترجمہ قرآن

ضیاء الامت علیہ السلام شہداء الازہر علیہ السلام

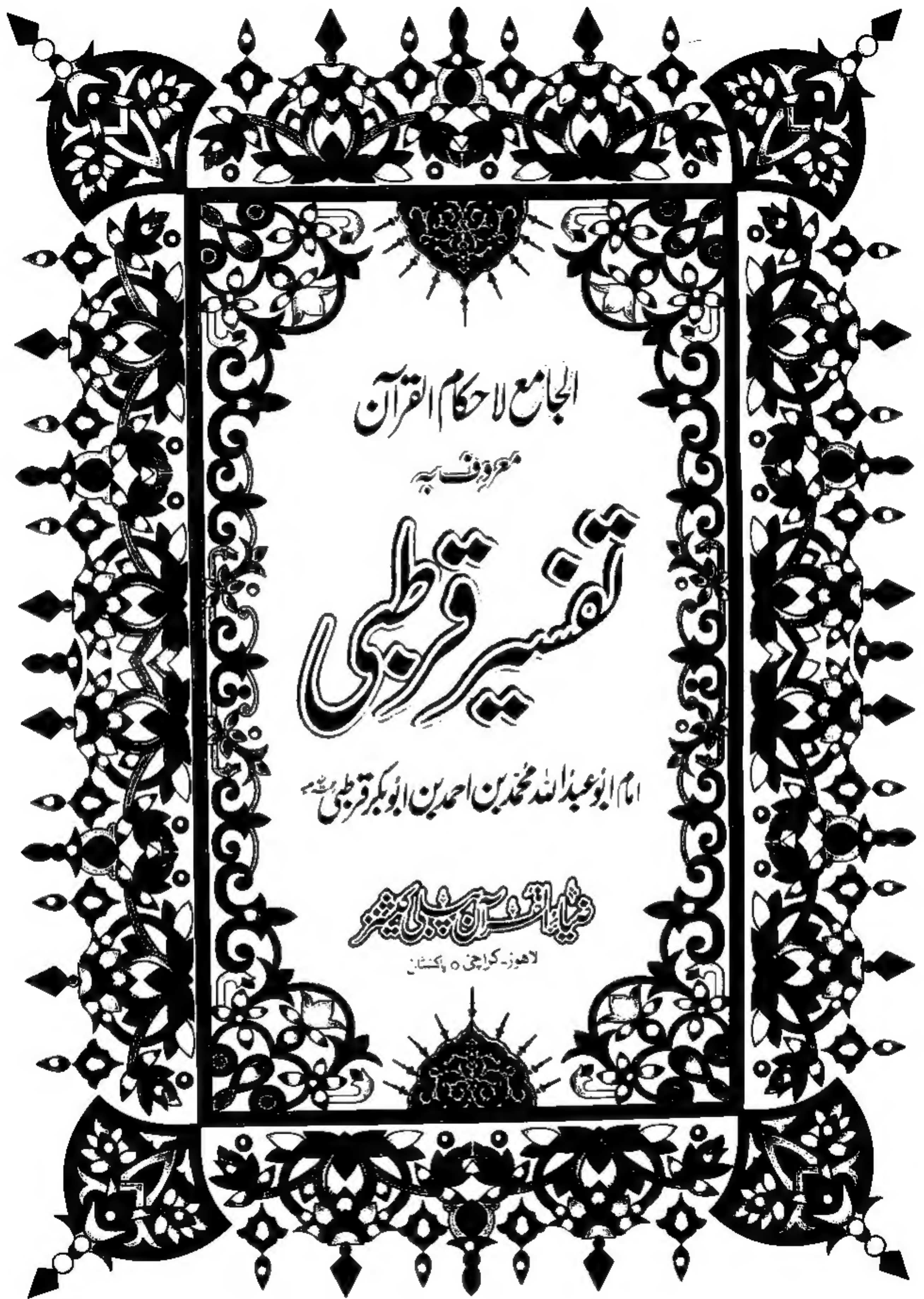
نور اہتمام

ادارہ ضیاء المصطفین بصرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی۔ پاکستان





الجامع لاحکام القرآن  
معروف بہ

# تفسیر قرطبی جلد اول

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمہ اللہ

متن قرآن کا ترجمہ: جنس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری  
مُترجمین

مولانا ملک محمد بوستان مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی  
مولانا محمد انور مگھالوی مولانا شوکت علی چشتی

نویسندگان:

ادارہ ضیاء المصطفین بمبیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ۰ پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد اول)
مفسر	امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمہ اللہ
متن قرآن کا ترجمہ	حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ
مترجمین	مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا شوکت علی چشتی من علماء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف محمد حفیظ البرکات شاہ
زیر اہتمام	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
ناشر	اکتوبر 2012ء، بار اول
سال اشاعت	QT54
کمپیوٹر کوڈ	

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس: 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350 فیکس: 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-32630411-32212011-021 فیکس: 021-32210212

e-mail:- info@ia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com



## فہرست مضامین

15	عرض ناشر
16	حسن انتخاب کا سبب
17	امام قرطبی رحمہ اللہ
18	الجامع لاحکام القرآن
19	اس تفسیر کے اہم مصادر
20	تفسیر قرطبی کے مصادر کی تخریج
21	کچھ فاضل مترجمین کے بارے میں
29	امام ابو عبد اللہ القرطبی کا مختصر تعارف
29	خطبہ الکتاب: جس میں مفسرین کی بلند و بالا شان کا ذکر ہے
30	تفسیر میں علامہ قرطبی کا اسلوب بیان
32	قرآن کے فضائل
38	کتاب اللہ کی تلاوت کی کیفیت
45	اہل علم اور اہل قرآن کو ریاضت سے ڈرانا
48	صاحب قرآن کو خود قرآن پر عمل کرنا چاہیے
50	اعراب قرآن، تعلیم قرآن
53	قرآن کی تفسیر اور مفسرین کی فضیلت
54	حامل قرآن اور حامل قرآن کون ہے
54	قرآن کے قاری پر قرآن کی تعظیم اور حرمت لازم ہے
59	قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرنے پر وعید
63	قرآن کی وضاحت سنت سے کرنا
66	کتاب اللہ اور نبی کریم ﷺ کی سنت سیکھنے کی کیفیت
67	نبی کریم ﷺ کے ارشاد ”ان هذا القرآن انزل علی سبعة احرف“ کا معنی
68	اکثر علماء کا قول ہے کہ سات قراءتیں سات احرف نہیں ہیں
72	حضرت عمر اور حضرت ہشام بن حکیم کی حدیث کا معنی کہ قرآن سات احرف پر نازل کیا گیا ہے



74	قرآن کو جمع کرنے کا ذکر
79	حلولیہ اور حشویہ فرقہ کا رد جو حروف اور آوازوں کے قدیم ہونے کے قائل ہیں
80	قرآن میں بعض رافضیوں کا طعن اور ان کا رد
82	قرآن کی سورتوں، آیات کی ترتیب وغیرہ
87	سورہ، آیت اور حرف کا معنی
90	کیا قرآن میں لغت عرب کے علاوہ لغات کے کلمات وارد ہیں
91	اعجاز قرآن، معجزہ کی شرائط اور معجزہ کی حقیقت میں نکات
93	معجزات کی دو اقسام
98	ان احادیث پر تنبیہ جو سورتوں کی فضیلت میں وضع کی گئی ہیں
101	قرآن میں طعن کرنے والے پر رد
105	استعاذہ کے بارے اور اس میں بارہ مسائل ہیں
110	بسم اللہ پر کلام۔ اس میں اٹھائیس مسائل ہیں
124	سورۃ الفاتحہ
124	اس میں چار ابواب ہیں
124	باب اول: سورۃ فاتحہ کے فضائل اس کے اسماء وغیرہ، اس میں سات مسائل ہیں
131	دوسرا باب: سورۃ فاتحہ کے نزول اور احکام کے بارے میں، اس میں بیس مسائل ہیں
143	تیسرا باب: آمین کہنے کے بارے میں، اس میں آٹھ مسائل ہیں
147	چوتھا باب: سورۃ فاتحہ کے معانی، قرات اس کا اعراب وغیرہ، اس میں چھتیس مسائل ہیں
169	سورۃ البقرہ
169	کلام کے نزول اور فضیلت کے بارے میں
171	الْمَ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۚ فِيْهِ ۙ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۱ آیت 1-2
176	قرآن کی ہدایت پر کلام اس میں چھ مسائل ہیں
180	الَّذِيْنَ يُؤْمِنُ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ..... آیت 3-5
180	اس میں چھبیس مسائل ہیں
199	اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۶..... آیت 6
202	حَتَّمَاللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَاَعْلٰ سَمْعِهِمْ ۚ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ عِشَاقٌ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷..... آیت 7-10



202	اس میں دس مسائل ہیں
215	علماء کے اقوال، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منافقین کو قتل کرنے سے روکنا حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے نفاق کا علم تھا
273	آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے بارے میں جو کہا گیا
277	خلیفہ متعین کرنے کے بارے میں بحث
290	ملائکہ کی تسبیح کے بارے میں بحث
292	حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی کیفیت اور ان کے نام کے اشتقاق کے بارے میں
295	علماء کا اختلاف، ان اسماء کے بارے میں جن کو حضرت آدم علیہ السلام نے جانا
302	کون افضل ہے فرشتے یا بنو آدم
307	سجدہ اور فرشتوں کے سجدہ کے بارے میں بحث
308	ابلیس لعنت اللہ کے بارے میں
313	جنت اور حضرت آدم اور حضرت حوا کے جنت میں رہائش پر کلام، اس میں تیرہ مسائل ہیں
319	درخت میں اختلاف کا ذکر اور اس درخت سے انہوں نے کیسے کھایا
322	کیا انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم سے صبر گناہ ہو سکتا ہے؟
327	سانپوں کو قتل کرنے کے بارے میں بحث اور جنوں کا سانپوں کی شکل اختیار کرنے میں کلام
337	ان کلمات کے بارے میں جو آدم علیہ السلام نے حاصل کیے
347	تعلیم قرآن، علم پڑھانے اور نماز پر اجرت لینے کے بارے میں علماء کا اختلاف
355	الزکاة کے بارے میں بحث
357	وَإِذَا كُنْتُمْ لِلزَّكَاةِ كَاعِبِينَ کے معنی میں بحث، نماز کے جملہ احکام
400	علماء کا بنی اسرائیل کی نجات کی کیفیت میں اختلاف
402	یوم عاشورہ میں اختلاف، کیا یہ نویں محرم کا دن ہے یا دسویں کا؟
405	چالیس دن پر بحث اور جو کچھ ان بنی اسرائیل سے واقع ہو
409	شکر کے معنی کے بارے میں
417	من و سلویٰ پر بحث
428	الاستقاء کے بارے میں
435	تھوم و پیاز کھانے پر بحث اور علماء کا اختلاف
437	یہودیوں کا من و سلویٰ کے بدل کا مطالبہ



- 441 ملتوں پر کلام اور اس میں آٹھ مسائل ہیں
- 447 یہودیوں کا بپتے کے روز میں حد سے تجاوز کرنا
- 449 کیا مسخ شدہ قوموں کی نسل آگے چلتی ہے یا نہیں
- 452 یہودیوں کا گائے ذبح کرنے پر اللہ تعالیٰ کا حکم
- 463 اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا كَـمَعْنٰی پر بحث
- 465 قسامت اور اس کے احکام میں
- 467 قسامت کے موجب کے بارے میں
- 469 ہم سے پہلے شریعت پر بحث۔ کیا وہ ہمارے لیے بھی شریعت ہے یا نہیں
- 473 أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا بِالْكِتَابِ وَقَدْ كَانُوا مِنْ أَفْوَاجٍ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللّٰهِ ثُمَّ يَحَرِّفُونَهُ... آیت 75
- 473 اس میں چار مسائل ہیں
- 475 وَإِذْ يَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَتَأْتُوا بَعْضَهُمْ إِلَى بَعْضٍ فَتَقُولُ أَمْ لَكُم مَّا بَيْنَ يَدَيْهِمْ مِنْ كِتَابٍ مِّنْ دُونِ الْكِتَابِ... آیت 76-77
- 477 وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانٍ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝ آیت 78
- 477 اس میں چار مسائل ہیں
- 480 فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا... آیت 79
- 480 اس میں پانچ مسائل
- 481 الویل کا معنی، اس میں علماء کا اختلاف، جس نے سب سے پہلے قلم سے لکھا، شرع میں تبدیلی اور زیادتی سے ڈرانا
- 482 وَقَالُوا لَنْ تَسْمَعَ النَّاسُ إِلَّا أَيْامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ... آیت 80
- 483 اس میں تین مسائل ہیں
- 483 اس کے سبب نزول میں علماء کا اختلاف
- 484 بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَاطِبَةُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا... آیت 81-82
- 484 اس میں تین مسائل ہیں (بلی اور نعم) پر کلام، السیئة کا معنی، اس کا بیان کہ دو شرطوں پر معلق دو سے کم شرطوں کے ساتھ مکمل نہیں ہوتا۔
- 485 وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآءَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللّٰهَ ۚ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا... آیت 83-84
- 485 اس میں دس مسائل ہیں، الميثاق میں اختلاف، والدین، یتامی، قریبی رشتہ دار اور مساکین سے حسن سلوک کرنا،
- 485 تمام لوگوں سے حسن سلوک کرنا
- 492 ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ... آیت 85-86



اس کا شان نزول، قیدیوں اور قیدیوں کو چھڑانے پر کلام

493

495

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَتَقَيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَأَتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ..... آیت 87-89

496

التقنیہ کا معنی، عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی مینات، روح القدس کا معنی

499

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَنْ يَنْزِلَ اللَّهُ مِنْ ..... آیت 90-91

499

(بِئْسَمَا) میں کلام

502

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَى بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ..... آیت 92-95

502

البینات پر کلام

506

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاتِهِمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا يَوْمَئِذٍ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ ..... آیت 96

506

زندگی پر یہود کے حرص پر کلام

508

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجِبْرِيلِ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ..... آیت 97-101

508

اس کے سبب نزول پر کلام۔ جبریل اور میکائیل کی لغات

513

وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَى مُلْكٍ سُلَيْمٍ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ ..... آیت 102-103

اس میں چوبیس مسائل ہیں، جادو پر کلام، جادو کی اصل، اس میں اختلاف کہ اس کی حقیقت ہے یا نہیں، وہ جادو جو جادو کرنے والے کی طرف سے کفر ہوتا ہے، السحر اور معجزہ میں فرق، مسلمان اور ذمی جادوگر کے حکم میں فقہاء کا اختلاف، ہاروت اور ماروت پر کلام

514

528

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعُوا قَوْلُوا أَنْظِرْنَا وَإِسْعُوا وَلِلْكَافِرِينَ ..... آیت 104-105

529

اس میں پانچ مسائل ہیں، اس کا بیان کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو حکم دیا کہ وہ خوبصورت الفاظ کا انتخاب کریں

533

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى ..... آیت 106-108

اس میں پندرہ مسائل ہیں۔ اس آیت کے نزول کے سبب پر کلام، کلام عرب میں نسخ کا بیان اور اس کا حکم۔ الاخبار میں علماء کا اختلاف، کیا ان میں نسخ داخل ہوتا ہے، نسخ کی معرفت کے طرق کا بیان

533

542

وَذَكِّرْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُغْفِرَ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَفَّارًا ..... آیت 109-110

542

اس میں دو مسئلے ہیں حسد پر کلام، جو اس میں محمود ہے اور جو مذموم ہے

548

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَى فِي خَرَابِهَا أُولَئِكَ ..... آیت 114

اس میں سات مسائل ہیں، اس آیت کے مراد میں اختلاف ہے اور جن کے متعلق نازل ہوئی ان میں اختلاف ہے، مسجد کا خراب کرنا کبھی حقیقی ہوتا ہے اور کبھی مجازی، مسجد کا توڑنا اور اسے فروخت کرنا جائز نہیں، آیت میں دلیل ہے کہ کافر کے لیے کسی حال میں مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں

548



- 550 وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُولُوْا فَاُفْتَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَّاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۱۵ آیت 115  
اس میں پانچ مسائل ہیں۔ فاینما تُولُوْا کے معنی میں علماء کا اختلاف، نماز میں استقبال قبلہ پر کلام، سواری پر نفل
- 551 پڑھنا، غائب پر نماز جنازہ پڑھنا، الوجہ کی طرف قرآن و سنت سے نسبت کی تاویل
- 557 بِيَدِ الْعِلْمِ وَالْاَرْضِ ۝۱۱۷ اِذَا قُضِيَ اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۱۱۷ آیت 117  
اس آیت میں چھ مسائل ہیں بدعت پر کلام۔ اس کے معانی کا بیان، اِذَا قُضِيَ امْرَاچودہ معانی کی طرف پھرتا ہے
- 564 وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصْرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۚ قُلْ اِنْ هٰدٰی اللّٰهُ..... آیت 120  
اس میں دو مسئلے ہیں۔ دین، ملت اور شریعت پر کلام، الکفر ملة واحداۃ
- 566 الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهُ حَقّٖ تِلَاوَتِهِ ۚ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ..... آیت 121 تا 123  
اس آیت پر کلام اور جن کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی
- 566  
567 وَاِذَا بَلَغَ اِبْرٰهِيْمُ رَبُّهٖ بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّتْ مِنْ قَوْلٍ ۚ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۚ قَالَ وَمِنْ..... آیت 124  
اس میں بیس مسائل ہیں، ابراہیم علیہ السلام کے نسب پر کلام، الکلمات کی مراد میں علماء کا اختلاف، الاختان پر کلام  
اور اس میں علماء کا اختلاف، زیر ناف بال صاف کرنے پر کلام، ناخن کاٹنے پر کلام، مسوڑھوں اور انگلیوں کے  
جوڑوں کی صفائی۔ مونچھیں کاٹنے پر کلام، بڑھاپے پر کلام، الذریۃ کا معنی اور اس میں لغات، لاینال عہدی  
الظالمین میں عہد سے مراد، امامت پر کلام اور امام کون ہوگا۔ ظالم امام کی اطاعت پر صبر کرنا اس پر بغاوت کرنے  
سے اولیٰ ہے۔
- 567  
580 وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۚ وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّی ۚ وَعَهْدًا ۚ..... آیت 125  
حرم میں حد قائم کرنے پر کلام، حضرت عمر کا قول کے تین امور میں میں نے اپنے رب کی موافقت کی۔ مقام ابراہیم  
پر کلام، کعبہ کے اندر نماز پڑھنا اور اس کی چھت پر نماز پڑھنا، علماء کا اختلاف کہ کعبہ کے پاس نماز پڑھنا افضل ہے  
یا کعبہ کا طواف افضل ہے
- 580  
586 وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّاٰمُرًا ذٰی اٰهْلَةٍ مِنَ الشَّرٰٓئِیِّ ۚ..... آیت 126  
اس میں تین مسائل ہیں مکہ پر کلام، کیا ابراہیم علیہ السلام کے سوال پر حرم بنایا پہلے سے ہی حرم تھا
- 587  
589 وَاِذْ یُرَفُّ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ۚ رَہْبٰنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ..... آیت 127  
علماء کا اختلاف کہ سب سے پہلے بیت اللہ کس نے بنایا اور کس نے اس کی بنیاد رکھی
- 590  
595 رَہْبٰنَا وَاَجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۚ وَاٰمِنًا سَکَنًا..... آیت 128  
امت کا معنی، مناسک کے مراد کا بیان، لغت میں نسک کی اصل
- 596  
600 رَہْبٰنَا وَاَبْعَثْ فِیْہُمْ رَسُوْلًا مِّنْہُمْ یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالحِکْمَةَ..... آیت 129



- 600 الحکمۃ سے مراد
- 603 اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِربِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۱﴾ آیت 131
- 603 کلام عرب میں اسلام کا معنی
- 603 وَوَضَعِي بِهَا اِبْرَاهِمَ بَنِيهِ وَيَعْقُوبَ يَبْنِي اِنَّ اللَّهَ اصْطَفٰى لَكُمْ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ... آیت 132
- 604 ابراہیم علیہ السلام کی اولاد پر کلام
- 607 تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۴﴾ آیت 134
- 608 اہل السنۃ اور الجبریہ اور المعتزلہ کا بندوں کے افعال میں مذہب
- 612 صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عٰبِدُونَ ﴿۱۳۸﴾ آیت 138
- 612 الصبغة سے مراد، اخلاص پر کلام
- 616 سَيَقُولُ السُّفَهَاۗءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلّٰهِ الشَّرْقُ... آیت 142
- اس میں گیارہ مسائل ہیں۔ اس آیت کے نزول کے سبب پر کلام، تحویل قبلہ کے وقت میں اختلاف، بیت المقدس کی طرف نبی کریم ﷺ کے استقبال کی کیفیت، قرآن کے ساتھ سنت کے نسخ کے جواز پر دلیل۔ خبر واحد کی قطعیت کے جواز پر دلیل اور اس پر دلیل کہ نسخ جس کو نہیں پہنچا وہ پہلے حکم کا مؤلف ہے۔
- 621 وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شٰهَدَآءَ عَلٰى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُوْلُ... آیت 143
- 621 اس میں چار مسائل ہیں الوسط کا معنی، ماکان اللہ لیضیع ایسا نکم پر کلام
- 626 قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ فَكَتٰوْلِيْنٰكَ قَبْلَةً تَرْضٰهَا قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ... آیت 144
- 626 الشطر پر کلام، کعبہ پر افاق میں قبلہ ہے، اس میں اختلاف کہ غائب پر فرض عین استقبال قبلہ ہے یا اس کی جہت سے
- 631 وَلِكُلٍّ وَّجْهَةٌ هٰۤیْ مَوْلٰیہَا فَاَسْتَبِقُوا الْخَبِيْرَ اِنَّ مَاتَكُمْ نُوَاۤیَاتِ بِكُمْ اللّٰهُ جَمِیْعًا... آیت 148
- 631 اس میں چار مسائل ہیں وَجْهَةٌ کا معنی، اول وقت میں نماز جلدی پڑھنے کا بیان
- 638 فَاذْكُرُوْنِیْ اَ اُذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْۤنَ ﴿۱۵۲﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا... آیت 152-153
- 638 تفسیر کی اصل اور اس کا معنی الشکر پر کلام
- 640 وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشِیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالشَّرَّاتِ... آیت 155
- 640 البلاء کا معنی، صبر پر کلام
- 641 الَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُصِیْبَةٌ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ... آیت 156-157
- 641 اس میں چھ مسائل ہیں۔ مصیبت کا معنی اور اس کا اشتقاق، بڑی مصیبت، دین میں مصیبت ہے
- 644 اِنَّ الصَّفَا وَالنُّزُوۡةَ مِنْ شَعَاۤیْرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَبَمَ الْبَیْتِ اَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ... آیت 158



اس میں نو مسائل ہیں۔ صفا و مروہ پر کلام اور ان سے کیا مراد ہے، لغت میں الصفا کی اصل، الشعائر کا معنی، جب نبی کریم ﷺ مکہ میں آئے تو آپ ﷺ نے صفا و مروہ کا طواف کیا۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی کے وجوب میں علماء کا اختلاف، کوئی شخص سوار ہو کر طواف نہ کرے مگر عذر کی وجہ سے

644

650

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي..... آیت 159

اس میں سات مسائل ہیں۔ اس آیت میں اختلاف، کیا یہ ہر اس شخص کے لیے ہے جس نے حق کو چھپایا یا یہود کے ساتھ خاص ہے۔ مبتدع جھگڑالو کو تعلیم دینا جائز نہیں۔ سفہاء میں رخصت کو پھیلانا جائز نہیں۔ آیت میں ایک آدمی کے قول پر عمل کے وجوب پر دلیل ہے

650

654

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَآمَنُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ..... آیت 161-162

654

اس پر کلام کہ معین کافر پر لعنت جائز نہیں۔ معین گنہگار پر لعنت کرنے میں اختلاف

656

وَاللَّهُمَّ إِلَهًا وَاحِدًا لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۖ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ..... آیت 163

656

اس میں دو مسئلے ہیں اس آیت کا شان نزول

657

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي..... آیت 164

اس میں چودہ مسائل ہیں۔ اس کا بیان کہ آسمان اور زمین آیات سے ہیں رات اور دن کا اختلاف اور ان کا اشتقاق، فلک (کشتی) اور سمندری سفر پر کلام، ہواؤں اور ان کے چلنے اور ان کے اسماء پر کلام، بادل پر کلام، وحدانیت کی دلیل

672

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ..... آیت 168

اس میں چار مسائل ہیں۔ اس آیت کا شان نزول، الطیب اور الحلال کا معنی، خطوات الشیطان کی اتباع سے نفی اور شیطان کے خطوات سے کیا مراد ہے

672

675

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَنبَغُ مَا أَفْقَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءُنَا أَوْ لَوْ كَانَ..... آیت 170

676

اس میں سات مسائل ہیں، تقلید میں علماء کے مختلف اقوال

681

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخُزْزِيرِ وَمَا أُهْلَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۚ فَمَنِ..... آیت 173

اس میں چونتیس مسائل ہیں۔ مردار کی حرمت اور ان میں سے مچھلی کے استثناء پر کلام، مردار سے نفع اٹھانے کے جواز میں علماء کا اختلاف اور نجاسات سے نفع اٹھانے پر کلام۔ مردار کی کھال، اس کے بال، اس کا معدہ اور اس کا دودھ، جب ہانڈی میں کوئی حیوان مر جائے، علماء کا اتفاق ہے کہ خون حرام ہے، خنزیر کا گوشت، چربی اور اس کے بال حرام ہیں، لفظ خنزیر کا اشتقاق، مَا أُهْلَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ میں کلام، مجبور شخص کے لیے بقدر بقاء زندگی مردار سے کھانا جائز ہے۔ اضطرار کا بیان، مضطر کا شراب پینا اور اس سے علاج کرنا

681

700

لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تُولُوا ذُؤَاقِطَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ..... آیت 177





نے رمضان کے روزہ کی قضا میں اقطاع کیا یا جماع کیا اس پر کیا واجب ہے، اس میں کلام جو فوت ہوا اور اس پر رمضان کے روزے تھے جو اس نے قضا نہیں کیے تھے۔

736

475

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ.....

745

اس میں پانچ مسائل ہیں۔ کیا آیت منسوخ ہے یا محکم ہے، فدیہ کی مقدار میں اختلاف

749

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى..... آیت 185

اس میں اکیس مسائل ہیں۔ رمضان پر کلام اور اس کے اشتقاق پر کلام، کیا صرف رمضان کہنا جائز ہے اضافت کے بغیر۔ رمضان کے چاند کے ثبوت میں اختلاف، جس نے اکیلے رمضان کا چاند دیکھا یا شوال کا چاند دیکھا، مطالع کے اختلاف میں کلام، اس میں کلام کہ مختلف اوقات میں قرآن نازل ہوا، کافر جب مسلمان ہو تو اس پر کیا واجب ہے، بچہ جب بالغ ہو تو اس پر کیا واجب ہے، تیس رمضان کے دن کو شوال کا چاند نظر آجائے۔ رمضان کے آخری دن میں لوگوں کا اختلاف، رمضان کے آخر میں تکبیر اور اس کے لفظ کا بیان

749

764

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۚ فَلْيَسْتَجِيبُوا..... آیت 186

764

اس میں چار مسائل ہیں۔ اس آیت کے نزول کے سبب میں اختلاف، دعا پر کلام، دعا کی قبولیت سے جو مانع ہے

770

أَجَلٌ لَّكُمْ لَيْلَةُ الصِّيَامِ وَالزَّوْفُ إِلَى نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ ۖ أَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ..... آیت 187

اس میں چھتیس مسائل ہیں۔ اس آیت کے نزول کے سبب پر کلام، عرب کلام میں الرفت کا معنی، اس حد میں اختلاف جس کے ساتھ رکنا واجب ہے، روزے میں نیت پر کلام، الخیض الابيض پر کلام۔ جس نے جان بوجھ کر روزہ توڑ دیا، عورت پر کیا واجب ہے، جب خاوند اس سے رمضان میں وطی کرے، جس نے بھول کر روزے میں جماع کیا یا کھانا کھایا، جس نے روزہ کی حالت میں بوسہ لیا یا مباشرت کی۔ جنبی حالت میں فجر طلوع ہو گئی تو اس کا روزہ صحیح ہے حائض، پاک ہوئی رمضان میں فجر طلوع ہونے سے پہلے، اعتکاف کا لغوی اور شرعی معنی، اعتکاف صرف مسجد میں ہوگا، معتکف پر جو واجب ہے

771

792

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِمَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ..... آیت 188

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔ اس آیت کا شان نزول، جس پر باطل کا اسم واقع ہوگا، اس میں اقوال کہ حاکم کا حکم ظاہر پر ہوگا، وہ باطن کے حکم کو تبدیل نہیں کرے گا، باطل دلائل کے ذریعے حکام کی طرف پہنچنا منع ہے، جس نے کوئی ایسی چیز لی جس پر مال کا اسم واقع ہوتا ہے خواہ وہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ ہو اس کی وجہ سے اسے فاسق کہا جائے گا۔

792

795

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْإِهْلَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَاجَّةِ ۚ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ..... آیت 189

اس میں بارہ مسائل ہیں اس آیت کا شان نزول، الہلال کا معنی، چاند کے معاملات، مدتوں میں اشکال کے زوال کے لیے وقت بنائے گئے ہیں، انصار جب حج کرتے اور واپس لوٹتے تو اپنے گھروں کے دروازوں سے داخل نہ

- 796 ہوتے نہیں اس سے منع کیا گیا۔ اٹھس پر کلام
- 801 وَ قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ① آیت 190
- اس میں تین مسائل ہیں۔ یہ پہلی آیت ہے جو قتال کے امر میں نازل ہوئی، صلح حدیبیہ پر کلام، بچوں اور اس جیسے افراد کو قتل کرنا منع ہے۔ جو بے ضرر ہوں مگر یہ کہ مسلمانوں کو ان سے اذیت پہنچے۔
- 801 وَ اقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ ۚ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ ۚ آیت 191-192
- 804 اس میں پانچ مسائل ہیں۔ مسجد حرام کے پاس قتال پر کلام
- 804 وَ قَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۚ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى ۚ آیت 193
- 807 اس میں دو مسئلے ہیں۔
- 807 الشُّهُرُ الْحَرَامُ بِالشُّهُرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَتُ قِصَاصٌ ۚ آیت 194
- 808 اس میں دس مسائل ہیں۔ آیت کا شان نزول، جس کے مال پر تعدی کی گئی ہو یا زخمی کیا گیا ہو تو وہ اس کی مثل تعدی کر سکتا ہے یا قصاص کے امور حکام پر موقوف ہیں، حقوق کے لینے میں بدلہ میں علماء کا اختلاف، کیا اس کو عدوان کہا جائے گا۔ اس میں علماء کا اختلاف جو کسی حیوان یا سامان کو ہلاک کرتا ہے یا خراب کرتا ہے، جس کا نہ کیل کیا جاتا ہے اور نہ وزن یہ آیت قصاص میں مماثلت میں اصل ہے۔
- 808 وَ اتَّقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تَتْلُوا بآيَاتِهِ الْكُفْرَ ۚ وَ أَحْسِنُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ② آیت 195
- 814 اس میں تین مسائل ہیں۔ علماء کے اقوال اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے بارے میں، جنگ میں آدمی کے گھنے کے بارے میں اور اکیلے دشمن پر حملہ کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف
- 815 وَ اتَّبِعُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُخْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوا ۚ آیت 196
- 819 اس میں سات مسائل ہیں۔ حج اور عمرہ اللہ کے لیے مکمل کرنے سے مراد میں علماء کا اختلاف، مواقیت حج پر کلام، عمرہ کے وجوب پر دلیل جو مناسک حج پر کرتا ہے جبکہ اس نے نہ حج کی نیت کی ہے اور نہ عمرہ کی مراہق (قریب البلوغ) اور غلام حج کا احرام باندھیں پھر مراہق بالغ ہو جائے اور غلام آزاد ہو جائے وقوف عرفہ سے پہلے
- 819 فَإِنْ أُخْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ آیت 197
- 824 اس میں بارہ مسائل ہیں۔ حج میں الاحصار میں علماء کے اقوال، محصر پر کیا واجب ہے حاصر (روکنے والا) کے بارے میں قول، حلق اور ہدی میں کلام۔ اذیت کے فدیہ میں کھانا کھلانے میں اختلاف، اور فدیہ کے مکان کا بیان، حج تمتع، قرآن اور افراد پر کلام، جو ہدی نہ پائے اسے روزہ رکھنے کی رخصت
- 824 الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَةٌ ۚ فَمَنْ قَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ ۚ وَلَا جِدَالَ فِي ۚ آیت 197
- 854 اس میں چودہ مسائل ہیں۔ اشہر معلومات میں اختلاف، اشہر حج کے علاوہ میں حج کے چاند میں اختلاف، رفث، فسوق



- 855 اور حج میں جھگڑے کا بیان
- 862 لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَتٍ ..... آیت 198
- 862 اس میں دو مسئلے ہیں۔ حاجی کے لیے حج میں تجارت کرنے کا جواز
- 863 فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَتٍ فَإِذَا كُرُوا .....  
اس میں سولہ مسائل ہیں۔ عرفات اور وقوف عرفات پر کلام، مزدلفہ میں رات گزارنے پر کلام
- 863 ثُمَّ أَفِيضُوا مِّنْ حَيْثُ أَقَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا لِلَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ آیت 199
- 874 اس میں چار مسائل ہیں۔ اس آیت کے نزول کے سبب پر کلام
- 874 فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِّنْ نَّاسِكِكُمْ فَإِذَا كُرُوا لِلَّهِ كُنِيَ كَرِيكُمْ أَبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ كَرًا ۖ فَمِنَ النَّاسِ ..... آیت 200
- 877 اس میں دو مسئلے ہیں۔ المناسک کا معنی
- 878 وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ آیت 201
- 878 اس میں تین مسائل ہیں الحسنة کی تاویل میں اختلاف، یہ آیت جوامع الدعاء ہے، دنیا اور آخرت کو شامل ہے۔
- 880 أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ آیت 202
- اس میں تین مسائل ہیں۔ اس کا بیان کہ آدمی مال لیتا ہے جس کے ساتھ وہ کسی دوسرے کی طرف سے حج کرتا ہے تو اسے بھی ثواب ہوتا ہے۔

## عرض ناشر

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے حبیب لبیب اور ہمارے آقا حضور پر نور حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے طفیل اس کی توفیق ارزانی فرمائی ہے کہ ادارہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز آپ کی خدمت میں ”الجامع لا ۛکام القرآن“ جو تفسیر قرطبی کے نام سے معروف ہے پیش کر رہا ہے۔ یہ تفسیر امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر قرطبی رحمہ اللہ متوفی 671ھ کی تالیف ہے۔ حضور ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری قدس سرہ العزیز نے تفسیر ضیاء القرآن کی تالیف کے دوران اس تفسیر سے بہت زیادہ استفادہ کیا۔ الفاظ قرآن کی لغوی اور بلاغی تعبیر ہو یا آیات کی ترکیبی توضیح، حکمت دین کا معاملہ ہو یا فلسفہ اسلام جا بجا اس کی تفسیر کی طرف رجوع ملتا ہے یہ امر تفسیر قرطبی کی عظمت شان کا پتہ دیتا ہے۔

دلی آرزو تھی کہ اس تفسیری کام کو اردو زبان میں اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے اس مشکل امر کو ادارہ ضیاء المصنفین کے علماء نے اپنے ذمہ لیا تقریباً ساڑھے چھ سال کی محنت شاقہ کے بعد ہم اس قابل ہوئے کہ یہ ارمغان محبت آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

اپنی بساط کے مطابق ہم نے اس کے ظاہری اور باطنی محاسن کو ملحوظ رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہم امید واثق رکھتے ہیں کہ ہماری یہ کاوش بھی آپ کی نظر التفات کی مستحق بنے گی اور آپ میرے، ادارہ کے جملہ اراکین اور ادارہ کے حق میں دعا کریں گے کہ خدمت دین کا یہ سلسلہ جاری رہے اور ہمارے لیے خصوصاً یہ بھی دعا فرمائیں گے کہ ہماری اس خدمت کو اللہ تعالیٰ توشہ آخرت بنا دے۔

آپ کا خادم  
محمد حفیظ البرکات شاہ غفی عنہ



## حسن انتخاب کا سبب

تفسیر ضیاء القرآن کے مصادر کی تخریج کے مرحلہ سے جب ہم گزر رہے تھے تو یہ امر آشکارا ہوا کہ حضور ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیری ادب میں سے تقریباً چوبیس تفاسیر سے نکات اخذ کئے ہیں اور سب سے زیادہ تفسیر قرطبی اور تفسیر مظہری کی طرف رجوع کیا ہے۔

ادارہ ضیاء المصنفین کے قیام کے ساتھ ہی حاجی حفیظ البرکات شاہ صاحب اور میجر محمد ابراہیم شاہ کے توجہ دلانے سے تفسیر مظہری کا ترجمہ ہوا۔ درمیان میں دوسرے کام ہوتے رہے۔ آج جون 2012ء سے ساڑھے چھ سال پہلے ادارہ ضیاء المصنفین کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ کا اجلاس حضرت پیر محمد امین الحسنات شاہ مدظلہ العالی صدر ادارہ ضیاء المصنفین کی سربراہی میں ہوا اس میں یہ فیصلہ ہوا کہ الجامع لاحکام القرآن جو تفسیر قرطبی کے نام سے معروف ہے کا اردو ترجمہ کروایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کا سلسلہ شروع ہوا اس کام میں چار احباب نے حصہ لیا۔

1۔ جناب سید محمد اقبال شاہ صاحب، شیخ الحدیث دارالعلوم محمدیہ غوثیہ

2۔ جناب محمد انور مگھالوی

3۔ جناب شوکت علی چشتی

4۔ راقم الحروف محمد بوستان

تفسیر قرطبی علوم کا سمندر ہے۔ عربی ادب پر کامل گرفت، حکمت دین پر نگہری نظر اور مسائل شرعیہ پر عبور، یہ حضرت مفسر کا خاصہ ہے اس کو اردو کے قالب میں ڈھالتے وقت یہ کوشش کی گئی ہے کہ قاری آسانی کے ساتھ مفہیم تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس کے مصادر کی تخریج کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

اس کے مصادر کو صفحہ قرطاس کی زینت بنانے اور پروف ریڈنگ کے مختلف مراحل میں علامہ شوکت علی چشتی صاحب نے بھرپور تعاون کیا۔ ان کی عملی مدد حاصل نہ ہوتی تو اس کام کی تکمیل میں مزید کئی سال صرف ہو سکتے تھے۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس فاضل نوجوان کے حق میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ ان کی ذات کو ملت اسلامیہ کے لیے نافع بنائے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ہے کہ وہ ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے اور اسے قبول عام نصیب فرمائے اور ہمارے لیے توشہ آخرت بنائے۔

محمد بوستان غفی عنہ

مدرس دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف

## امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

امام محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح ابو عبد اللہ انصاری، خزر جی، قرطبی، اندلسی مالکی۔  
آپ نے ابن رواج، ابن جمیزی، شیخ ابو العباس احمد بن عمر قرطبی صاحب المفہم، ابو علی حسن بن محمد بن محمد بکری حافظ اور ابو الحسن علی بن محمد بن علی بن حفص محضی وغیرہ سے اکتساب فیض کیا۔  
آپ سے ان کے بیٹے شہاب الدین احمد وغیرہ نے اکتساب فیض کیا۔

امام ذہبی آپ کے بارے میں ذکر کرتے: آپ مختلف فنون میں نہایت نامہ رکھنے والے اور علم میں تبحر امام ہیں۔ آپ کی بڑی مفید تصانیف ہیں جو آپ کے کثرت علم اور زیادتی فضل پر دال ہیں۔ آپ کی تفسیر کو شہرت نصیب ہوئی یہ تفسیر اپنے معنی میں کامل ہے۔ اس میں ایسی چیزیں ہیں جو آپ کی امامت، ذکاوت اور کثرت علم پر دال ہیں۔

ابن فرحون نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں، متقی عارف علماء، دنیا میں زہد اختیار کرنے والے اور ان افراد میں سے تھے جو امور آخرت میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کے اوقات عبادت و تصنیف میں صرف ہوتے آپ نے تکلف کو دور پھینک رکھا تھا۔

ابن عماد نے شذرات الذہب میں کہا: آپ حدیث کے معانی میں غواصی کرنے والے اور عمدہ تصنیف کے حامل تھے۔  
آپ کی مطبوعہ کتب یہ ہیں۔

1۔ الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی وصفاته

2۔ الاعلام بمافی دین انصاری من الاوامر

3۔ التذکار فی افضل الاذکار

4۔ التذکرہ فی احوال الموتی وامور الآخرة

5۔ فتح المحرص بالزہد والقناعة ورد ذل السؤال بالکتب والشفاعة

6۔ الجامع لاحکام القرآن یہی تفسیر ہے۔

آپ کا وصال مصر میں منیۃ بنی خصب میں پیر کی رات نوشوال کو 671ھ میں ہوا اور وہیں آپ کو دفن کیا گیا۔



## الجامع لاحکام القرآن

الجامع لاحکام القرآن جو تفسیر قرطبی کے نام سے معروف ہے یہ تفاسیر میں سے جلیل الشان تفسیر ہے کیونکہ یہ معانی القرآن کی وضاحت اور احکام کی تفصیل پر مشتمل ہے پھر اس پر مستزاد یہ کہ اس میں قراءات، اعراب، شعری شواہد، لغوی مباحث، نحوی اور صرفی نکات کا ذکر کیا گیا ہے۔

آپ کا اسلوب یہ ہے۔

- ☆ سورت کی فضیلت اور اس کے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں۔
- ☆ نزول کا سبب بیان کرتے ہیں۔ آیت کی تفسیر میں ایسی احادیث کا ذکر کرتے ہیں جو اس سے متعلق ہوں اور جو الفاظ جن لغوی معانی کا احتمال رکھتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ اس بارے میں اشعار عرب سے تائید لاتے ہیں۔
- ☆ آیت کے متعلق احکام فقیہ کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان میں ائمہ کا اختلاف ذکر کرتے ہیں اور ہر ایک کے دلائل لاتے ہیں۔

☆ لفظ کے اشتقاق، باب اور اعراب کا ذکر کرتے ہیں ساتھ ہی بعض اوقات ائمہ لغت کے اقوال کو بیان کرتے ہیں۔

☆ قراءات متواترہ اور غیر متواترہ کا ذکر کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب علمی موسوعہ ہے۔ جس میں امام قرطبی رحمہ اللہ نے مختلف علوم کو جمع کر دیا ہے احکام القرآن کی تفصیل کی طرف خصوصی توجہ دی ہے، اسی پر کتاب کی بنیاد رکھی ہے اور اسے اسم بالمسمیٰ بنا دیا ہے۔

## اس تفسیر کے اہم مصادر

- 1- المحرر الوجیز۔ یہ ابن عطیہ کی تفسیر ہے متوفی 546ھ
- 2- النکت والعیون۔ یہ ماوردی کی تفسیر ہے۔ متوفی 450ھ
- 3- تفسیر ابی الیث۔ یہ ابولیت سمرقندی کی تفسیر ہے۔ متوفی 375ھ
- 4- تفسیر بغوی یہی معالم التنزیل ہے۔ متوفی 516ھ
- 5- الوسیط۔ یہ الواحدی کی تفسیر ہے اسباب النزول بھی انہی کی علمی کاوش ہے۔ متوفی 468ھ
- 6- معانی القرآن۔ اعراب بالقرآن اور النسخ والمسنوخ یہ ابوجعفر نحاس کی کتب ہیں۔ متوفی 338ھ
- 7- التمهید، الاستذکار، الکافی اور الدرر وغیرہا یہ ابو عمر بن ابن عبد اللہ کی کتب ہیں۔ متوفی 463ھ
- 8- احکام القرآن۔ یہ ابو بکر بن العربی کی تفسیر ہے متوفی 543ھ
- 9- معانی القرآن اس نام کی کتب یہ انفش سعید متوفی 211ھ، یحییٰ بن زیاد الفراء 207ھ اور ابی اسحاق زجاج متوفی 311ھ تالیفات ہیں۔
- 10- مجاز القرآن یہ ابو عبیدہ متوفی 210ھ کی تالیف ہے۔
- 11- احکام القرآن للکلباء اسی متوفی 504ھ کی تالیف ہے۔
- 12- المہم یہ ابو العباس قرطبی متوفی 656ھ کی تالیف ہے۔
- 13- کتب احادیث جو مشہور و معروف ہیں۔



## تفسیر قرطبی کے مصادر کی تخریج

- ☆ بنیادی طور پر یہ فریضہ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کے دورہ حدیث کے طلباء نے اساتذہ کی نگرانی میں انجام دیا۔
- ☆ صحاح ستہ کے بارے میں ابتداءً یہ ہدایت دی گئی تھی کہ حکومت پاکستان کی وفاقی وزارت تعلیم نے جو کتب شائع کی ہیں ان کو ہی بنیاد بنایا جائے اور کتاب، باب اور صفحہ کو درج کیا جائے۔ عموماً صحاح ستہ کی کتب کی تخریج اسی طرح موجود ہے۔
- ☆ قریب ہی عرصہ میں ضیاء القرآن پبلی کیشنز نے صحاح ستہ (مترجم) کو شائع کیا تو تھوڑے وقت میں یہ کوشش کی گئی کہ ان سے استفادہ کیا جائے۔ صحاح ستہ کی یہ احادیث جن کے نمبر درج ہیں وہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز کی شائع کردہ کتب کے نمبرز ہیں۔
- ☆ تفسیری اقوال کے حوالے سے یہ گزارش ہے کہ جس تفسیر کا ذکر ہے اس کی اسی آیت کے ضمن میں وہ قول دیکھا جاسکتا ہے کیونکہ یہ کتب مختلف مکتبوں نے شائع کی ہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ صفحہ میں کچھ فرق ہو۔
- ☆ مسند امام احمد بن حنبل کے دو مطبوعوں کے حوالہ جات ہیں۔
- 1۔ مسند کی وہ حدیث جس کا نمبر درج ہے وہ مکتبہ دارالحدیث قاہرہ کی شائع شدہ ہیں۔
- 2۔ جلد اور صفحہ والی حدیث یہ دارصادر المکتب الاسلامی بیروت کے مطبوعہ کی ہے۔

## کچھ فاضل مترجمین کے بارے میں

علامہ ملک محمد بوستان صاحب

زمانے کی بساط پر کوئی تحریک اسی وقت ابھرتی ہے جب اسے قائد کے بعد مدبر اور صاحب بصیرت کارکن میسر آجائیں۔ کوئی ادارہ اسی وقت اوج کمال کو چھوتا ہے جب اسے سربراہ کے بعد پر عزم اور وفا شعار رفیق نصیب ہو جائیں۔ بلاشبہ ایسے کارکن اور رفیق قائد کا مان اور تحریک کی جان اور ادارے کی شان ہوتے ہیں۔ ان کی افغان اور رفتار انہی کے کردار سے ہوتی ہے ایسے بلند ہمت نفوس قیمتی سرمایہ اور اثاثہ ہوتے ہیں۔ چمن کا کاروبار انہی کے دم سے چلتا ہے۔

حضرت مولانا ملک محمد بوستان مدظلہ مفکر اسلام، مفسر قرآن حضرت ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کی علمی تحریک دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے ایک ایسے ہی کارکن اور رفیق ہیں جن پر ادارے کو بجا طور پر ناز اور فخر ہے بلاشبہ آپ تحریک سے فکری اور علمی ناٹے بھی رکھتے ہیں اور جی اور قلبی رشتہ بھی۔

حضرت قبلہ ملک صاحب چکوال کے قریب ایک گاؤں کھوکھر زیر میں جناب محترم عبدالرحمن صاحب کے گھر میں پیدا ہوئے سن شعور کو پہنچنے کے بعد ابتدائی دینی و عصری تعلیم اپنے گاؤں میں ہی حاصل کی۔

پھر قسمت مہربان ہوئی، رب رحمن کے دست کرم نے تھاما اور دبستان کرم میں لا بٹھایا۔ جہاں آپ نے حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ظاہری و باطنی، علمی و روحانی فیوضات و برکات کی خوب خوشہ بینی کی، اپنی شخصیت کو نکھارا اسے پروان چڑھایا اور مطلع حیات پر علم و عمل کا پیکر بن کر ظاہر ہوئے۔

مڈل پاس کرنے کے بعد 21 مئی 1971ء کو آپ نے دارالعلوم محمدیہ غوثیہ میں داخلہ لیا اور 21 مئی 1981ء کو مجوزہ نصاب کی تکمیل کر کے فراغت حاصل کی۔ حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ فاضل اور اجل اساتذہ سے استفادہ کیا اور مہارت اور کمال حاصل کیا۔ زمانہ طالب علمی کچھ اس دسوزی جاں سپاری اور سرشاری سے گزارا کہ خود کو حضرت ضیاء الامت اور اپنے اساتذہ کی نگاہ میں اپنی مادر علمی کی ہر طرح کی خدمت کے لیے اہل ثابت کر دیا۔ چنانچہ فراغت کے بعد حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر دارالعلوم میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی اور اس کا حق ادا کیا یوں آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ فن تدریس میں اپنی منفرد شان رکھتے ہیں۔ سبق کی پہلے زبانی جامع تقریر فرماتے ہیں پھر ترجمہ کرتے ہیں جس سے سبق اور کتاب دونوں سے ربط قائم ہو جاتا ہے۔ سبق بھی سمجھ آ جاتا ہے اور عبارت بھی سلجھ جاتی ہے۔ مطالعہ آپ کی عادت ہے۔ بغیر مطالعہ کوئی سبق نہیں پڑھاتے۔ تقریر خوش بیانی اور نکتہ آفرینی کے زیور سے آراستہ ہوتی ہے۔

مرکزی دارالعلوم میں مدرس مقرر ہونا اعزاز بھی تھا اور امتحان بھی۔ آپ نے اپنی لگن، محنت، ذوق اور اخلاص سے نہ صرف اس میدان میں اپنی جگہ بنائی بلکہ خود کو اس منصب کا اہل باور کرایا اور اپنے شیخ کے انتخاب کو بچ کر دکھایا۔ بلاشبہ قدرت



نے آپ کے وجود میں بہت جوہر رکھے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ خوب کھلے۔ اپنے خداداد تدبیر فہم اور بصیرت کی بدولت جلد ہی آپ نے حضرت ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ اور اساتذہ کا اعتماد حاصل کر لیا۔ ادارے کے معتمد کارکن اور فنی شمار ہونے لگے۔ کسی کی نگاہ میں اپنا مقام بنانا آسان کام نہیں لیکن آپ نے اپنے جذبہ اخلاص اور سرفروشی سے اوائل سفر میں یہ کمال حاصل کر لیا۔ تعلیمی مسائل ہوں یا انتظامی، تنظیمی معاملات ہوں یا تحریری، نصابی سرگرمیاں ہوں یا غیر نصابی، تعلیم کا سلسلہ ہو یا تربیت کا، قبلہ ملک صاحب کی ذات ہمیں ہر میدان میں متحرک اور سرگرم نظر آتی ہے۔

دماغ تو ہر کوئی رکھتا ہے لیکن اسے بر محل اور بروقت برتنے کی خوبی کوئی کوئی رکھتا ہے۔ دماغ سے سوچنا، سمجھنا اور مسئلے کا حل نکالنا ہر کسی کا کام نہیں۔ قبلہ ملک صاحب میں یہ خوبی بھی ہے کہ آپ اپنے دماغ سے کام لینا خوب جانتے بھی ہیں اور لیتے بھی ہیں۔ درپیش مسئلے کے ہر پہلو کو سوچنا، پوری گہرائی سے اسے سمجھنا اور پھر حل نکالنا آپ کا نمایاں اور امتیازی وصف ہے۔ آپ اجتہادی فکر اور تجدیدی سوچ کے مالک ہیں۔ تعلیم و تدریس اور انتظام و انصرام میں آپ نے کئی نئی جہات متعارف کرائیں۔

کئی اضافی فرائض نبھاتے ہیں۔ قبلہ عالم حضرت جانشین ضیاء الامت کے معتمد اور مشیر خاص ہیں۔ تدریسی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ہاسٹل وارڈن بھی ہیں۔ مرحلہ دار لجنہ الامتحانات کے سیکریٹری بھی رہے ہیں۔ ادارہ ضیاء المصنفین اور الکرم ویلفیئر فنڈ کی نگرانی بھی فرماتے ہیں۔ نصابی کمیٹی کے بھی رکن ہیں۔

جامع مسجد بازار والی میں عرصہ سے خطبہ بھی ارشاد فرما رہے ہیں۔ آواز گودھیمی ہوتی ہے مگر گفتگو علم و حکمت سے بھری ہوتی ہے۔ فکر و نظر کے نئے نئے زاویوں اور پہلوؤں سے آشنا کرتی ہے۔ سامع محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ وجیہ اور حسین قد و قامت کے مالک ہیں۔ بدن نحیف اور حس لطیف رکھتے ہیں۔ نازک طبع اور منتظم مزاج ہیں نکتہ سنج اور معاملہ فہم ہیں۔ نظم و ضبط کے پابند اور قواعد و ضوابط پر کار بند۔ ذوق نفیس رکھتے ہیں اس لیے خوش خوراکی اور خوش لباسی کے عادی اور بروقت اور متناسب کام کرنے کے خوگر ہیں۔ گہری سوچ، عمیق نظر اور دقیق فکر آپ کی پہچان ہے۔ بر ملا رائے کا اظہار کرنا، اسے صائب سمجھتے ہوئے اس پر قائم رہنا جو کام پسند آجائے اس پر خوش ہونا اور حوصلہ افزائی کرنا اور جو معیار پر نہ ہو اترے اس کی اصلاح کرنا آپ کا وتیرہ ہے۔ اور جسم کے نزاری اور صحت کی کمزوری کے باوجود اپنی جملہ ذمہ داریوں سے مستقل مزاجی سے عہدہ برا ہونا آپ کا وظیفہ ہے۔

قلم کے برتنے کے جوہر سے بھی مالا مال ہیں۔ جہاں آپ نے علم کی دنیا کے دوسرے کئی میدانوں میں اپنی لیاقت کا سکھ جمایا ہے وہاں تحریر کے میدان میں بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے۔ تفسیر بیضاوی (پارہ ۲۹-۳۰)، قصیدہ بردہ (بوصیری) اور قیدہ اطیب النغم (شاہ ولی اللہ) کا عربی میں جامع حاشیہ تحریر فرمایا۔ نیز تفسیر مظہری (جلد 4) تفسیر درمنثور (جلد 2)، النبی محمد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کا ترجمہ بھی فرمایا جو زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ تفسیر قرطبی (جلد 4) جو ابھی زیر طبع ہے۔ فتاویٰ شامی کے ترجمہ پر بھی کام جاری ہے یہ سب آپ کے میدان تحریر میں بھی لیاقت و قابلیت کا ثبوت ہیں۔

## شیخ الحدیث پیر سید محمد اقبال شاہ گیلانی

اگر حضور رحمت عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے سلسلۃ الذہب کو دیکھا جائے تو اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے حسین اور زیبا تر ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان جو آپ نے حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو عطا فرمایا تھا وہ اس نسب پاک کے ہر فرد میں پورے جو بن پر نظر آتا ہے۔ اگر ہم دنیا کے دیگر انساب کو دیکھتے ہیں تو بمشکل ایک یا دو فرد ہی علم و عرفان کے امین نظر آتے ہیں۔ لیکن نثار جائے اس عظیم سلسلہ پر جہاں ہر آفتاب دوسرے سے درخشندہ تر اور ہر ماہتاب دوسرے سے تابندہ تر نظر آتا ہے کہیں امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ لب پہ تبسم سجائے جام شہادت نوش کرتے نظر آتے ہیں اور کہیں رضائے الہی کے حصول کے لیے امام حسین رضی اللہ عنہ بہتر تن واردیتے ہیں کہیں امام زین العابدین اہل عبادت و ریاضت کے لیے مینارہ نور نظر آتے ہیں۔ کہیں امام باقر علم و عرفان کا نیر تاباں دکھائی دیتے ہیں کہیں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ بحر معرفت کے شاور دکھائی دیے ہیں۔ کہیں امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ جیسے نابغہ روزگار شخصیت دکھائی دیتی ہے۔ ہر فرد آسمان علم و حکمت کا مہر منیر نظر آتا ہے حتیٰ کہ مرج البحران یلحقیان کی طرح یہ سارے اوصاف حمیدہ اور شمائل سنیہ حضور غوث الثقلین سیدنا عبدالقادر جیلانی الحسنی والحسنی رضی اللہ عنہ کی ذات ستودہ صفات میں جمع ہو جاتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث پیر سید محمد اقبال شاہ گیلانی صاحب بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک حسین کڑی ہیں آپ اپنے اسلاف عظام کی طرح نہ صرف جدید اور قدیم علوم سے مزین ہیں بلکہ خدائے تعالیٰ نے عرفان و معرفت کی دولت سے بھی سرفراز فرمایا ہے حتیٰ کہ مجھے ایک بزرگ نے فرمایا قبلہ شاہ صاحب کی نہ صرف من موہنی صورت اپنے اسلاف سے ملتی ہے بلکہ چال ڈھال میں بھی کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ علم کی بے کرانی کا عالم یہ ہے کہ قبلہ شاہ صاحب دورہ حدیث شریف کو بخاری شریف جیسی اہم کتاب پڑھا رہے ہیں اور عرفان و معرفت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کبھی سرسجدہ میں رکھ کر اپنے رب تعالیٰ کو راضی کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی درود پاک کو اپنی زبان کی زینت بنا کر بارگاہ رسالت مآب میں ہدیہ عقیدت پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ انتہائی ظریف ہونے کے باوجود نہ کبھی تدریس میں بددیانتی کی ہے اور نہ ہی عبادت میں کمی۔

آپ کا اسم گرامی ”سید محمد اقبال شاہ گیلانی“ ہے۔ والد گرامی کا نام نامی سید محمد حسین شاہ گیلانی ہے آپ حضور غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کی اولاد پاک سے ہیں۔ میانوالی کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ آپ کی پیدائش کا ضلع بنا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم، بعد ازاں میٹرک تک تعلیم ضلع میانوالی میں ہی حاصل کی۔ ہر امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ میٹرک کے بعد 1979ء کو دارالعلوم محمدیہ غوثیہ میں داخلہ لیا دوران تعلیم ایک ذہین اور ہونہار طالب علم کی حیثیت سے بلند مقام حاصل کیا۔ محنت شاقہ سے علم کے زینے طے کئے۔ 1988ء میں دارالعلوم محمدیہ غوثیہ سے تعلیم کی تکمیل کی اور شہادت عالمیہ اور سند حدیث حاصل کی۔ پھر اپنے مرشد کریم، مفسر قرآن، عظیم سیرت نگار، حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے دارالعلوم ضیاء



القرآن فاضل ضلع بھکر میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ بلند پایہ مدرس ثابت ہوئے طلباء کے دلوں میں محبت الہیہ اور عشق مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی جوت جگائی۔ اس کے بعد 1993ء سے تاحال مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ میں مسند تدریس پر فائز ہیں۔ آپ کو یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ آپ 2000ء سے بخاری شریف پڑھا رہے ہیں۔ یہ امر کتنا پر لطف اور دلکش ہے کہ گلشن رسالت کے گلہائے زیبا اہل بیت کا ایک شہزادہ ہی امت مرحومہ میں تقسیم کر رہا ہو۔

2001ء میں حرمین شریفین کی زیارت سے بہرہ مند ہوئے اور عمرہ کی سعادت حاصل کی جبکہ 2006ء میں مجاہد ختم نبوت، پیر طریقت محمد امین الحسنات شاہ صاحب مدظلہ العالی نے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی خلافت سے نوازا۔ 2011ء کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔

آپ کا کمال یہ ہے کہ بخاری اور بیضاوی شریف جیسے اہم مضامین پڑھانے کے باوجود تصنیف و تالیف کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ آپ نے تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ضیائے حرم میں مختلف عنوانات پر مضامین حوالہ قرطاس کئے اور کچھ عرصہ تک ضیائے حرم کا فقہی کالم بھی لکھا، اس کے علاوہ علوم نبوت، حقیقت استمداد، بیعت کی شرعی حیثیت کے نام سے کتب تالیف کیں۔ درود پاک کی فضیلت پر منفرد کتاب ”القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع“ کا ترجمہ کرنے کی سعادت بھی آپ کے حصہ میں آئی۔ دیگر شاہکار کتب درج ذیل ہیں جنہیں آپ نے اردو قالب میں ڈھالا۔

1- تفسیر مظہری، تین جلدیں۔ 2- تفسیر درمنثور، دو جلدیں۔ 3- تفسیر قرطبی تین جلدیں، 4- زجاجة المصابیح۔ 5- بخاری شریف۔ 6- فضائل مدینہ۔

آپ اٹھارہ سال سے ضلع خوشاب میں ایک قبضہ روڈہ میں خطابت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ نے خلوص اور محنت و لگن سے وہاں کی عوام میں بلند مقام حاصل کیا ہے۔ آپ کے دلپذیر خطبات کی وجہ سے کئی بے ریش افراد کے چہروں پر سنت رسول ﷺ کی اور عوام نہ صرف مجموعی سے عبادات کے خوگر بنے بلکہ وہ اپنے معاملات بھی احسن انداز سے دین اسلام کے سنہری اصول پر چلانے لگے ہیں۔ آپ نے وہاں طلباء کے لیے دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کے نام سے اور طالبات کے لیے غوثیہ گرلز کالج کے نام سے دو ادارے قائم کیے ہیں۔ وہاں کے کثیر لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہیں۔ ان چند سطور میں آپ کے علمی کمالات اور روحانی فیضان کو قلمبند نہیں کیا جاسکتا۔ اپنی سعادت کے لیے چند پھول آپ کی

خدمت میں پیش کئے ہیں اس نیت سے کہ

”شاہاں چہ عجب اگر بنوازند گدارا“

## علامہ محمد انور مگھالوی

ادیان عالم میں اللہ تعالیٰ نے جس دین کو اپنا دین قرار دیا جسے سند قبولیت سے نوازا اور جسے تمام ادیان پر غالب کیا وہ دین اسلام ہے۔ چنانچہ اس کی حفاظت بھی اپنے ذمہ کرم پر لی۔ اس کی سنت جاریہ ہے کہ وہ اپنے دین کی حفاظت کا یہ کام اپنے منتخب بندوں سے لیتا ہے۔ اس نے اپنے کسی بندے کو خدمت دین کی سعادت ارزانی فرمانا ہوتی ہے اور اس کی ذات کو دوسروں کے لیے نفع بخش اور فیض رسا بنانا ہوتا ہے تو وہ اپنی خاص رحمت فرماتے ہوئے اسے دین کی راہ پر لگا دیتا ہے جو پھر قرآن مجید کے حکم ”ولتکن منکم امة“ کی تعمیل کرتے ہوئے حفاظت دین کی عملی تفسیر پیش کرتا ہے۔

ہمارے ممدوح حضرت مولانا ابوالعرفان محمد انور مگھالوی مدظلہ بھی انہی پاک نہاد اور بخت رسا نفوس میں سے ایک ہیں جنہیں دین کا فہم اور بصیرت عطا کر کے اس کی خدمت کی سعادت سے نوازا جاتا ہے۔

حضرت مولانا قبلہ 6 اپریل 1959ء کو ضلع چکوال کی تحصیل چو اسیدن شاہ کے ایک معروف گاؤں وعولہ میں حضرت الحاج حافظ نور محمد صاحب کے علمی و روحانی گھر میں پیدا ہوئے۔

حضرت قبلہ حافظ صاحب علاقے کی مشہور دیندار، بارسوخ اور علم و فضل کی مالک شخصیت ہیں۔ آستانہ عالیہ امیر السالکین بھیرہ شریف کے دیرینہ اور مخلص متوسلین میں سے ہیں۔ قرآن مجید سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ چالیس سال قریبی گاؤں مگھال میں پوری تندہی سے امامت و خطابت کے فرائض سرانجام دیئے۔ ہزاروں کو قرآن مجید کی تعلیم سے بہرہ ور کیا اور قرآن کے نور سے ان کے قلوب و اذان کو جلا بخشی۔ یہ قرآن سے الفت، دین سے محبت اور آستانہ عالیہ سے عقیدت ہی ہے کہ اپنی تمام اولاد کو بھی حافظ قرآن اور عالم دین بنایا اور اپنے پوتوں اور نواسوں کو بھی خدمت دین پر مامور کیا۔

حضرت مولانا قبلہ نے جب شعور کی دہلیز پر قدم رکھا تو تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ قرآن مجید ناظرہ اپنے پدر بزرگوار سے پڑھا۔ پرائمری اور مڈل کی تعلیم مقامی سکول سے حاصل کی۔ قسمت نے یاوری کی قدرت نے مہربانی کی گورنمنٹ مڈل سکول ڈلوال میں ابھی ساتویں جماعت میں تھے کہ مفکر اسلام مفسر قرآن حضرت ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری مگھال شریف لائے اور انہیں حافظ صاحب سے اپنے لیے مانگ لیا۔ پھر کیا تھا مراد بن کردستان کرم بھیرہ شریف میں آگئے اور یہیں ہمیشہ کے لیے ڈیرے ڈال دیئے۔

یکم مئی 1977ء کو مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ میں داخلہ لیا اور اپریل 1983ء مجوزہ نصاب کی تکمیل کر کے فراغت حاصل کی۔ چنانچہ حضرت ضیاء الامت رحمہ اللہ کی علمی برکات سے بھی مستفید ہوئے اور روحانی فیوضات سے بھی مستفیض ہوئے۔ علاوہ ازیں شیخ الحدیث مولانا قاضی محمد ایوب رحمہ اللہ، شیخ الفقہ مولانا محمد فاضل، شیخ التفسیر مولانا حافظ محمد خان نوری، شیخ الادب مولانا الحاج ملک عطا محمد، مولانا محمد سعید اسعد، مولانا عبدالرزاق صدیقی، مولانا رب نواز اجیری، مولانا محمد رفیق چشتی، پروفیسر حافظ احمد بخش اور پروفیسر محمد اسلم چوہدری جیسے فاضل اور اہل اساتذہ سے صرف، نحو، لغت، بلاغت ادب، انشا، تاریخ،



منطق، فلسفہ، فقہ و اصول فقہ، حدیث و اصول حدیث، تفسیر و اصول تفسیر وغیرہ جیسے قدیم فنون اور انگریزی، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ جیسے جدید علوم میں درک حاصل کر کے ان میں کمال پیدا کیا۔

مقصد عظیم اور منزل ارفع ہو۔ ذہن میں کچھ کرنے کا سودا سمایا اور دل میں کچھ پانے کی لگن لگی ہو تو زندگی کا رنگ خود بدل جاتا ہے۔ حضرت مولانا اپنے مرشد کے حکم سے دین کی راہ پر نکلے تھے اس لیے اس راہ کی نزاکتوں اور تقاضوں کا ادراک کیا۔ حد درجہ محنت، فرض شناس اور ذمہ دار طالب علم واقع ہوئے۔ زمانہ طالب علمی بڑی جاں سوزی، جگر کاوی اور عرق ریزی سے گزارا۔ نیز تحصیل علم کے ساتھ ساتھ اپنے شیخ اور اساتذہ کی خدمت کو بھی اپنی تعلیم و تربیت کا جزو بنایا جس کا آپ کی شخصیت پر گہرا اثر اور عکس نظر آتا ہے۔ طبیعت میں سادگی، علم میں پختگی اور عمل میں پاکیزگی اسی خدمت کی برکت ہے۔

ستمبر 1983ء کو عملی زندگی کا آغاز کیا۔ فراغت کے بعد حضرت ضیاء الامت کے حکم پر مرکزی دارالعلوم میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی۔ یہ آپ کے لیے اعزاز بھی تھا اور امتحان بھی۔ تاہم آپ نے پورے تدبر اور بصیرت سے اس کا پاس کیا۔ انتھک محنت اور اخلاص سے اپنے فرائض اس خوش اسلوبی سے ادا کئے کہ خود کو بہت تھوڑی سی مدت میں کامیاب مدرسین کی صف میں لاکھڑا کیا بلکہ فن تدریس کو ایک نئی جہت دی صرف و نحو آپ کے خاص مضمون ٹھہرے۔ سبق کی جب تقریر فرماتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے لفظوں کی آبشار رواں ہو گئی ہو۔ کمزور ترین ذہن بھی خالی دامن نہیں اٹھتا۔ سبق کے جملہ پہلوؤں پر کامل دستگاہ، مطالعہ کی وسعت، لفظوں کے معانی کو ذہنوں میں اتار کر انہیں نقش کرنے پر قدرت آپ کی خاص پہچان ہے۔

تدریسی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ہاسٹل وارڈن اور مرحلہ وار شعبہ امتحانات کے سکریٹری کے اضافی فرائض بھی سرانجام دیتے ہیں۔ فن تدریس کے ساتھ فن خطابت کا ملکہ بھی رکھتے ہیں۔ خطاب میں زور بیان بھی ہوتا ہے اور معانی کا سیل رواں بھی۔ جامع ڈلوال میں 1979ء سے خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے ہیں جو اس فن میں آپ کی لیاقت اور قابلیت پر شاہد ہے۔

آپ نے ظاہری علوم کے ساتھ حضرت ضیاء الامت کے روحانی فیوضات سے بھی حظ وافر پایا ہے اس لیے عامل بھی ہیں اور روحانی بیماریوں کا مداوا اور علاج بھی کرتے ہیں۔ دبستان کرم کے پروردہ ہیں اس لیے قلم کے ساتھ بھی اپنا رشتہ قائم کیا اور اسے اپنے ذوق سے پروان چڑھایا اور جلد ہی اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوالیا۔ علمی و تحقیقی کام کر چکے ہیں جو اس فن میں آپ کی مہارت اور دسترس کا ثبوت ہے۔ ”فقہ حنفی کے اساسی قواعد، الوصول الی الاصول فی اصول الفقہ، ضیاء علم الحدیث اور ایام قربانی اور اس کے مسائل“ تالیف فرمائیں۔ زبدۃ الاتقان، تفسیر مظہری، تفسیر درمنثور، تفسیر قرطبی، سنن ابی داؤد اور فضائل مدینہ کا ترجمہ بھی فرمایا۔ فتاویٰ شامی (ج 4) کے ترجمہ پر کام جاری ہے اس کے علاوہ ماہنامہ ضیاء حرم اور مجلہ جمال کرم کے لیے متعدد متوع موضوعات پر مضامین تحریر فرمائے ہیں۔

عالم اور فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ آپ بلاشبہ ان تمام اوصاف اور خواص کے بھی حامل ہیں جو ایک عالم دین کے ماتھے کا جھومر اور شان ہوتے ہیں۔ نہایت متواضع اور منکسر المزاج ہیں۔ سنجیدہ، مہمان نواز اور ملسار ہیں۔ سب سے محبت اور اپنائیت سے ملتے ہیں۔ کشادہ ذہن، فراخ دل مہربان اور مشفق ہیں۔ گفتگو خوب فرماتے ہیں جو خوش مزاجی اور لطافت سے لبریز ہوتی ہے۔

## علامہ شوکت علی چشتی

دین کی نعمت، خدمت اور اس کی تبلیغ کی سعادت سے بڑھ کر ایک مسلمان کے لیے اور بڑا خوش بختی کا کام نہیں۔ یہ خوش بختی صرف اسے نصیب ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ اس کے لیے پسند کر لیتا ہے۔ جس پر ذات باری خیر کے دروازے کھولنے کا ارادہ کرتی ہے۔ جسے دوسروں کے لیے نفع رساں بنانا مقصود ہو اسے وہ اپنے دین کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

من یرد اللہ بہ خیرا یفقهہ فی الدین

برادر م مولانا شوکت علی چشتی صاحب بھی ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی نعمت، اس کی خدمت اور تبلیغ کی توفیق اور سعادت ارزانی فرمائی۔

مولانا موصوف 22 جون 1976ء کو ضلع چکوال کی تحصیل تلہ کنگ کے ایک گاؤں سکھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم روایت کے مطابق قرآن مجید سے شروع ہوئی۔ گورنمنٹ ہائی سکول سکھر سے پرائمری اور مڈل کا امتحان پاس کیا۔ گھرانہ علم دوست اور روحانیت پسند تھا۔ چنانچہ علم کا شوق اور دین کا ذوق کشاں کشاں بھیرہ شریف لے آیا جہاں 1990ء میں عالم اسلام کی عظیم مثالی درس گاہ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ میں داخلہ لیا۔ مفکر اسلام، مفسر قرآن، نابض عصر حضرت ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری قدس سرہ العزیز اور مجاہد ملت امین حسن کرم قبلہ عالم، حضرت پیر محمد امین الحسنات شاہ مدظلہ کے زیر سایہ علوم اسلامیہ و عربیہ کی تکمیل کی اور جید اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کئے۔

شیخ التفسیر مولانا حافظ محمد خان نوری مدظلہ، شیخ الحدیث مولانا مفتی قاضی محمد ایوب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الادب الحاج ملک عطا محمد مدظلہ، شیخ الحدیث مولانا ملک عبدالرزاق صدیقی مدظلہ، علامہ ملک محمد بوستان مدظلہ، علامہ محمد انور مگھالوی مدظلہ نمایاں اساتذہ میں سے ہیں۔

طلب دین کا جذبہ وافر پایا تھا اس لیے اکتساب اور تحصیل کا کوئی موقع ضائع نہ کرتے۔ دیگر علماء سے بھی استفادہ کیا جامعہ نظامیہ لاہور کے شیخ الحدیث مولانا علی احمد سندیلوی سے حدیث مسلسلات کی روایت کی اجازت حاصل کی۔ حضرت ضیاء الامت سے کلام اقبال پڑھنے کی سعادت بھی حصے میں آئی۔

دارالعلوم محمدیہ غوثیہ سے میٹرک، ایف اے، بی اے کے ساتھ ادیب عربی، عالم عربی، فاضل عربی اور الشہادۃ العالمیہ کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کئے۔ 2000ء میں فراغت کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں ماسٹر کیا۔ اس کے بعد انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی۔ جو بڑے اعزاز کی بات ہے۔ جلد ہی اپنی لگن اور محنت سے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دکھایا۔ قابل اور لائق جو نیر ستاف میں شمار ہوتے ہیں۔

تدریسی قابلیت کے ساتھ ساتھ قلمی صلاحیت بھی پائی ہے۔ قلم و قسطاس سے بھی گہرا والہانہ رشتہ رکھتے ہیں۔ ماہنامہ

ضیائے حرم، طلبہ کے ترجمان سیریل شاہین اور دیگر کئی رسائل میں مختلف علمی و فکری عنوانات پر لکھتے رہتے ہیں۔ 2000ء میں حضرت ضیاء الامت کے شہزہ آفاق ترجمہ ”جمال القرآن“ کے مفردات پر کام کیا جسے بیحد پذیرائی ملی۔ جمال القرآن کے ترجمہ کی ریکارڈنگ کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔ مشہور قاری بزرگ شاہ الازہری کی تلاوت کے ساتھ اردو ترجمہ کی ڈنگ کے لیے آپ ہی کی آواز کا انتخاب ہوا۔

بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں ”اسلام میں خواتین کے حقوق“ کے عنوان سے ورکشاپ منعقد ہوئی۔ دارالعلوم کی طرف سے نمائندگی کا اعزاز آپ کے حصے میں آیا۔ ایسے سلسلوں میں آپ یہ اعزاز حاصل کرتے رہتے ہیں خطابت اور نقابت کے جوہر سے بھی مالا مال ہیں۔ سرگودھا شہر کی ایک مرکزی مسجد میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں۔ جہاں ہزاروں اہل اسلام آپ کے مواعظ حسنہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ ادارہ کی تقریبات کی نقابت بڑی خوبی سے سرانجام دیتے ہیں جسے سامعین بڑا سراہتے ہیں۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ سلسلہ ارادت بھی آستانہ عالیہ امیر السالکین بھیرہ شریف سے رکھتے ہیں۔ 1993ء میں حضرت ضیاء الامت کے دست حق پرست پر بیعت کی اور آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ یہ دوسرا اعزاز ہے جو نصیب ہوا۔ متحرک، سرگرم اور باہمت ہیں راہ وفا پہ گامزن ہیں، پر عزم ہیں۔ اس لیے مشن کے فروغ کے لیے اپنے من تن دھن سے کوشاں رہتے ہیں اور سوئے منزل محو سفر رہتے ہیں۔

علامہ ابو عبد اللہ قرطبی رحمہ اللہ کی مشہور تفسیر الجامع لاحکام القرآن کے ترجمہ کی بھی سعادت ارزانی ہوئی، یہ ادارہ ضیاء المصنفین کی آپ پر اعتماد کی دلیل اور ثبوت ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے زور قلم کو اور بہتر کرے اور علمی، فکری ترقی عطا فرمائے۔ آمین



## بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## مقدمہ

وَبِهِ نَسْتَعِينُ وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا

شیخ فقیہ امام عالم عامل، علامہ محدث ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح انصاری خزرجی اندلسی ثم قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہر حمد کرنے والے سے پہلے خود اپنی تعریف کی اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ وحدہ لا شریک کے علاوہ کوئی معبود نہیں، جو سب کو پالنے والا ہے، بے نیاز ہے، یکتا ہے، حیی و قیوم ہے، جسے کبھی موت نہیں آئے گی، صاحب عزت و اکرام ہے، بڑے بڑے عطیات کا مالک ہے، قرآن کے ساتھ کلام کرنے والا ہے، انسان کا خالق ہے، انسان پر ایمان کا انعام فرمانے والا ہے، بیان کے ساتھ اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں، حضرت محمد ﷺ پر جب تک رات اور دن کی گردش رہے اور جب صبح و شام کا تبادلہ ہوتا رہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ایسی واضح کتاب کے ساتھ بھیجا جو شک اور یقین میں فرق کرنے والی ہے، جس کے چیلنج نے بڑے بڑے فصحاء، کو عاجز کر دیا، جس کے مقابلہ نے بڑے زیرک لوگوں کو بے بس کر دیا، جس کی معارضت و مشاکلت نے بلغائے عرب کو گنگ کر دیا، وہ اس کی مثل نہ لاسکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار بھی بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال کو غور و فکر کرنے والے کے لئے عبرت بنایا، اس کے ادا کر کو اس کے لیے ہدایت بنایا جس نے ان میں بصیرت سے دیکھا اور اس کتاب مبین میں احکام کے واجبات کو واضح فرمایا، اس میں حلال و حرام کو واضح کیا، اس میں سمجھنے کے لئے مواعظ اور قصص کا تکرار فرمایا، اس میں مثالیں بیان فرمائیں، غیب کی خبریں بیان کیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا فَرَّ ظَنًّا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام: 38) (نہیں نظر انداز کیا ہم نے کتاب میں کسی چیز کو) اس کے ساتھ اپنے اولیاء (دوستوں) کو خطاب فرمایا، پس انہوں نے اس کو سمجھا اور ان کے لئے اس کی مراد کو بیان فرمایا۔ پس وہ جان گئے، پس قرآن کو پڑھنے والے اللہ تعالیٰ کے خلفاء اور اس کے امین ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے قریبی، خاص، چیدہ اور منتخب لوگ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک ہم میں سے کچھ اللہ کے اہل ہیں۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: قرآن کے اہل، اللہ کے اہل اور اس کے خاص بندے ہیں (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے، ابو بکر البزار نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ پس جس نے اللہ کی کتاب کا علم حاصل کیا وہ اللہ تعالیٰ کے نواہی سے رکے، جو اس میں وضاحت کی گئی ہے اس میں غور و فکر کرنے، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کا خوف کرنے، اس کے احکامات کا خیال کرنے اور اس سے حیا کرنے کا کتنا مستحق ہے، کیونکہ اس پر رسل کا بوجھ ڈالا گیا ہے، وہ قیامت کے روز دوسری ملتوں کے مخالفین پر گواہ ہوگا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ: 143) (اور اسی طرح ہم نے بنا دیا تمہیں) (اے

1۔ ابن ماجہ، باب فضل من تعلم القرآن وعلمہ، حدیث نمبر 210، (مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز)

مسلمانو!) بہترین امت تاکہ تم گواہ بنو لوگوں پر۔

خبردار! جس نے اس کا علم حاصل کیا پھر اس سے غافل ہوا اس پر یہ حجت ہے، اور جو اس سے کوتاہ ہوا اور جاہل ہوا اس پر اس حجت کو مؤکد کیا۔ جس کو علم قرآن عطا کیا گیا اور پھر اس نے نفع نہ اٹھایا، اس کے نواہی نے اسے جھڑکا اور وہ باز نہ آیا اور اس نے نتیجہ گناہوں کا ارتکاب کیا اور رسوا کن جرائم کا مرتکب ہوا، قرآن اس پر حجت ہوگا اور اس کا مد مقابل ہوگا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قرآن تیرے حق میں حجت ہے یا تیرے خلاف حجت ہے“ (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے، پس جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کے لئے خاص فرمایا اسے قرآن کی تلاوت کرنی چاہئے جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے، اور اس کی عبارت کے حقائق میں غور و فکر کرے اور اس کے عجائب کو سمجھے اور اس کے غرائب کو بیان کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کُتِبَ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبْرَكًا لِّمَنْ بَرَّ وَآلِیْمٌ (ص: 29) (یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے آپ کی طرف بڑی بابرکت تاکہ وہ تدبر کریں اس کی آیتوں میں) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَفَلَا یَتَذَكَّرُونَ الْفُتُوٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَغْفَالُهَا ﴿۱۰﴾ (محمد) (کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے قرآن میں یا (ان کے) دلوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں سے بنائے جو اس کی پوری پوری رعایت کریں اور اس میں اچھی طرح غور و فکر کریں، اس کے حق کو ادا کریں اور اس کی شرائط کو پورا کریں اور اس کے علاوہ کسی سے ہدایت تلاش نہ کریں اور اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے ظاہری اعلام اور قطعی احکام سے ہدایت دے اور ہمارے لئے دنیا و آخرت کی بھلائی کو اس کے ذریعے جمع فرمائے۔ وہ اہل التقویٰ اور اہل المغفرۃ ہے۔ پھر اس نے اس قرآن میں جو مجمل تھا اس کا بیان اور اس کے مشکل کی تفسیر، اس کے محتمل کی تحقیق اپنے رسول ﷺ کو سونپی تاکہ رسالت کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اس کے لئے اس اختصاص کا ظہور اور تفویض کا مرتبہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الَّذِیْ کَرِّهُتُبَّیْنَ لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ اِلَیْهِمْ (النحل: 44) (اور ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف) پھر رسول اللہ ﷺ کے بعد اس کے معانی پر جو تنبیہ فرمائی اور اس کے اصول کی طرف اشارہ فرمایا اس کے استنباط کا فریضہ علماء کو بخشا تاکہ اس میں کوشش و محنت کے ذریعے علم المراد تک پہنچیں اور وہ دوسروں سے ممتاز ہو جائیں اور اپنی کوشش کے ثواب سے محض ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یَرْفَعُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (المجادلہ: 11) (اللہ تعالیٰ ان کے، جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا، درجات بلند فرمائے گا۔) پس کتاب اصل ہے اور سنت اس کا بیان ہے اور علماء کا استنباط اس کی وضاحت ہے۔ سب تعریفیں اللہ کے لئے جس نے ہمارے سینوں کو اپنی کتاب کے لئے ظرف بنایا، ہمارے کانوں کو اپنے نبی ﷺ کی حدیثوں کا مورد بنایا اور ہماری ہمتوں کو ان کی تعلیم، ان کے معانی اور غرائب کے متعلق بحث کے لئے پھیر دیا۔ ہم اس کے ساتھ رب العالمین کی رضا کے طالب ہیں اور ملت اور دین کے علم تک اس کے ذریعے داخل ہونے والے ہیں۔

حمد و تعریف کے بعد! جب اللہ تعالیٰ کی کتاب جو تمام علوم شرعیہ کی کفیل ہے، جس نے سنت اور فرض کو قائم فرمایا، اس

کے ساتھ آسمان کا امین (جبریل امین) زمین کے امین (حضرت محمد ﷺ) کی طرف اتر تو میرا ارادہ ہوا کہ میں اپنی عمر اس میں مشغولیت کے ساتھ گزاروں اور اس میں اپنی ساری قوت و صلاحیت صرف کروں، اس طرح کہ میں اس کے متعلق مختصر سی تعلیق لکھوں، جو تفسیری، لغوی، ترکیبی اور قراءت کے نکات اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہو، اس میں گمراہ اور کج رولوگوں کا رد ہو اور ایسی احادیث کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہو جو ان احکام اور نزول آیات کی دلیل ہوں جن کو ہم ذکر کریں اور قرآن و سنت کے معانی کی وہ تعلیق جامع ہو اور سلف و خلف کے اقوال کے ساتھ مشکل الفاظ کو بیان کرنے والی ہو۔ میں نے اپنے نفس کی نصیحت کے لئے یہ عمل کیا اور قبر کے دن کے لئے ذخیرہ اور اپنی موت کے بعد باقی رہنے والے علم صالح کے طور پر یہ عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يُنَبِّئُ الْإِنْسَانَ يَوْمَ مَوْتِهِ بِمَا قَدَّمَ وَ آخَرَ ۝ (القيامة) (آگاہ کر دیا جائے گا انسان کو اس روز جو عمل اس نے پہلے بھیجے اور جو (اثرات) پیچھے چھوڑے)** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **عَلِمْتُ نَفْسٌ مَّا قَدَّمْتُ وَ آخَرْتُ ۝ (الانفطار) (اس وقت) جان لے گا ہر شخص جو (اعمال) اس نے آگے بھیجے تھے اور جو اثرات وہ پیچھے چھوڑ آیا)**۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے مگر تین اعمال سے اس کا ثواب منقطع نہیں ہوتا: صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے نفع اٹھایا جائے اور نیک بیٹا جو اس کے لئے دعا کرتا ہے“۔ (1)

اس کتاب میں میری شرط یہ ہے کہ اقوال کو ان کے قائلین کی طرف منسوب کروں گا اور احادیث کی ان کے مصنفین کی طرف نسبت کروں گا۔ کہا جاتا ہے کہ علم کی برکت میں سے یہ ہے کہ قول کو اس کے قائل کی طرف مضاف کیا جائے۔ اکثر احادیث کتب فقہ اور تفسیر میں مبہم ہوتی ہیں اور جس نے اس کو نقل کیا ہوتا ہے اسے نہیں پہچانتا مگر جو کتب حدیث پر مطلع ہوتا ہے، پس پڑھنے والا حیران و پریشان رہتا ہے۔ نہ وہ صحیح و سقیم کو جانتا ہے حالانکہ اس کی معرفت ایک بہت بڑا علم ہے۔ اس کی طرف سے اس کے ساتھ احتجاج کو اور استدلال کو قبول نہیں کیا جاتا حتیٰ کہ وہ اس کی طرف حدیث کو منسوب کرے جو ائمہ اعلام اور مشاہیر ثقہ لوگوں میں سے ہے جس نے اس کو نقل کیا ہے اور ہم اس کتاب میں ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ صحیح بات کی توفیق دینے والا ہے۔ اور میں مفسرین کے بہت سے قصص اور مؤرخین کی اخبار سے اجتناب کروں گا مگر جن کا ذکر ضروری ہو گا اور وضاحت کی خاطر ان کا چھوڑنا ممکن نہ ہو گا اور احکام کی آیات کو بیان کرنے کے لئے میں ایسے مسائل سے تائید دوں گا جن سے ان کا معنی واضح ہو جائے گا اور جو طالب کی ان احکام کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ ہر آیت کے ضمن میں ایک، دو یا زیادہ احکام ہوتے ہیں، اس میں ہم ہر آیت کے تحت اسباب نزول، تفسیر غریب اور حکم میں سے جو اس کے متعلق احکام و مسائل ہوں گے انہیں بیان کریں گے اور اگر کوئی حکم اپنے ضمن میں نہ رکھتی ہوگی تو میں اس میں تفسیر و تاویل ذکر کروں گا۔ اسی طرح آخر کتاب تک ہوگا۔

میں نے اس کتاب کا نام ”الجامع لأحكام القرآن والنبیین لِمَا تَضَمَّنَتْهُ مِنَ السُّنَّةِ وَ آيِ الْفُرْقَانِ“ رکھا۔ اللہ تعالیٰ اسے خاص اپنی رضا کے لئے کرے اور اس کے ذریعے مجھے اور میرے والدین کو نفع پہنچائے اور اللہ تعالیٰ دعا کو سننے والا ہے، قریب ہے، قبول فرمانے والا ہے۔ آمین



## فضائل قرآن

قرآن میں رغبت دلانا، اس کے طالب، قاری، سننے والے اور اس کے عامل کی فضیلت

جان لو کہ یہ باب بہت بڑا وسیع ہے۔ اس میں علماء نے کثرت سے کتابیں تالیف کی ہیں۔ ہم ان میں سے چند نکات ذکر کریں گے جو اس کی فضیلت پر دلیل ہوں گے اور حاملین قرآن کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو ثواب اور جزا تیار کر رکھی ہے اس پر دلالت کریں گے جب کہ ان کی طلب خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو اور وہ اس پر عمل پیرا ہوں۔ سب سے پہلے تو مومن اس کی فضیلت میں سے یہ سمجھے کہ یہ رب العالمین کا کلام ہے، کلام غیر مخلوق ہے، اس ذات کا کلام ہے جس کی مثل کوئی شے نہیں ہے۔ یہ اس کی صفت ہے جس کی نہ شبیہ ہے، نہ اس کا مد مقابل ہے، وہ اس کی ذات کا نور ہے، اور قراءت، قراء کی آوازیں اور ان کے نعمات یہ ان کے کسب ہیں جن کا بعض عبادات میں ایجابی حالت میں ان کو حکم دیا جاتا ہے اور اکثر اوقات میں استجابی طور پر حکم دیا جاتا ہے اور ان کو اس سے جھڑکا جاتا ہے جب وہ اجتناب کرتے ہیں اور ان کے کرنے پر انہیں ثواب دیا جاتا ہے اور ان کے ترک پر انہیں سزا دی جاتی ہے۔ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے اور آثار اس کے مطابق گواہ ہیں۔ اس پر مشہور اخبار دلیل ہیں اور ثواب و عقاب کا تعلق بندوں کے کسب کے ساتھ ہے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں اس کو اٹھانے کی وہ قوت نہ رکھتا جو اس نے ان میں رکھی تاکہ وہ اس میں غور و فکر کریں، عبرت حاصل کریں اور اس میں جو طاعت و عبادت، حقوق و فرائض کی ادائیگی ہے اس میں تذکیر کریں، تو اس کے بوجھ سے انسانوں کے دل کمزور پڑ جاتے اور لرز جاتے، انہیں اس کے اٹھانے کی کیسے طاقت ہوتی، خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور اس کا قول حق ہے: **لَوْ أَنزَلْنَاهُذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَّرَأَيْنَاهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ** (الحشر: 21) (اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپ اس کو دیکھتے کہ وہ جھک جاتا اور پاش پاش ہو جاتا اللہ کے خوف سے) دلوں کی قوت کا پہاڑوں کی قوت سے کہاں مقابلہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے بندوں کو خود اس کے اٹھانے کی قوت بخشی۔ یہ اس کا فضل اور رحمت ہے۔

وہ آثار جو اس باب کے متعلق آئے ہیں

سب سے پہلا وہ جو امام ترمذی نے حضرت ابو سعید بنی سعد سے نقل کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”جس کو قرآن اور میرا ذکر مجھ سے سوال کرنے سے مشغول رکھتا ہے میں اسے اس سے افضل دیتا ہوں جو میں مانگنے والوں کو دیتا ہوں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے کلام کی فضیلت تمام کلاموں پر اس طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی فضیلت اس کی مخلوق پر ہے۔“ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے (1)۔ ابو محمد الداری السمرقندی نے اپنی مسند میں حضرت

1۔ جامع ترمذی، کتاب الفضائل، باب فضل کلام اللہ علی سائر الکلام، حدیث نمبر 2850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبداللہ سے روایت کیا ہے فرمایا: (اس کی سورتوں میں سے) سبع طویل تورات کی مثل ہیں، المثنون (سو آیات والی سورتیں) انجیل کی مثل ہیں اور مثانی سورتیں زبور کی مثل ہیں۔ اس کے بعد تمام قرآن زیادہ ہے۔ حارث نے حضرت علی سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: ”تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح فتنے ہوں گے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ ان سے نکلنے کا کیا راستہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ کی کتاب جس میں پہلے لوگوں کے واقعات بھی ہیں اور تمہارے بعد کی خبریں بھی ہیں اور جو کچھ تمہارے درمیان ہے اس کا حکم بھی ہے۔ یہ فصل (واضح حکم) ہے، مزاح نہیں ہے۔ جو جابر اسے چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اسے توڑ دے گا اور جو اس کے علاوہ کسی کتاب سے ہدایت کی تلاش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دے گا۔ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے اور واضح نور ہے۔ ذکر حکیم ہے، یہ صراط مستقیم ہے، یہ وہ کتاب ہے جس کے ساتھ خواہشات ٹیڑھی نہیں ہوتیں، زبانیں اس کے ساتھ ملتہس نہیں ہوتی، اس کے ساتھ آراء بکھرتی نہیں ہیں اور اس سے علماء سیر نہیں ہوتے ہیں۔ متقی لوگ اس سے اکتاتے نہیں ہیں، بار بار دہرانے کے باوجود یہ بوسیدہ نہیں ہوتا اور اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے۔ یہ وہ کلام ہے کہ جنوں نے جب اس کو سنا تو انہوں نے اس کا انکار نہ کیا۔ انہوں نے کہا: ہم نے جب قرآن سنا ہے۔ جس نے اس کا علم حاصل کیا وہ سبقت لے گیا، جس نے اس کے ساتھ بات کی اس نے سچ کہا، جس نے اس کے ساتھ فیصلہ کیا اس نے عدل کیا اور جس نے اس کے مطابق عمل کیا اسے اجر ملا۔ جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کی۔ اے عورت! اس کو مضبوطی سے پکڑ لے“ (1)۔ شعبی نے حارث کو جھوٹا کہا ہے اور یہ کچھ نہیں ہے اور حارث سے جھوٹ ظاہر نہیں ہوا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت میں افراط کی وجہ سے اور دوسرے صحابہ پر حضرت علی کو فضیلت دینے کی وجہ سے ان کے بارے میں یہ ناراضگی کی بات کی گئی۔ اسی بناء پر۔ واللہ اعلم۔ شعبی نے اسے جھوٹا کہا ہے کیونکہ شعبی کا نظریہ یہ تھا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ افضل ہیں اور وہ سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔ حضرت ابو عمر بن عبدالبر نے کہا: میرا گمان ہے، شعبی کو اپنے اس قول کی وجہ سے سزا دی گئی، جو انہوں نے حارث ہمدانی کے بارے میں کہا (نہ کہ حارث عور کے بارے میں) کہ مجھے حارث نے بیان کیا اور وہ جھوٹوں میں سے ایک تھا۔

ابو بکر محمد بن قاسم بن بشار بن محمد انباری نحوی لغوی نے اپنی کتاب ”الردۃ علی من خالف مصحف عثمان“ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی دسترخوان ہے، پس تم اس سے اپنی طاقت کے مطابق سیکھو، یہ قرآن اللہ کی رسی ہے، یہ نور بین اور شفا نافع ہے، جس نے اس کو مضبوطی سے پکڑا اس کے لئے حفاظت ہے اور جو اس کی پیروی کرے گا اس کے لئے نجات ہے، ٹیڑھے کو سیدھا کرتا ہے اور کج رو کو درست کرتا ہے، اس کے عجائب ختم نہ ہوں گے اور بار بار پڑھے جانے کی وجہ سے بوسیدہ نہیں ہوتا، پس تم اس کی تلاوت کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی تلاوت پر ہر حرف کے بدلے دس نیکیوں کا اجر دے گا، میں یہ نہیں کہتا کہ التّم ایک حرف ہے۔ میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ما جاء فی فضل القرآن، حدیث 2831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہ وہ ایک پاؤں رکھے ہوئے سورۃ بقرہ کو پڑھنا چھوڑ دے کیونکہ شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۃ بقرہ پڑھی جاتی ہے اور خیر سے خالی گھروں میں سے وہ گھر ہے جو کتاب اللہ سے خالی ہے (1)۔ ابو عبید نے اپنی غریب میں حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی دسترخوان ہے، جو اس میں داخل ہوگا وہ امن میں ہوگا۔ فرمایا: حدیث کی تاویل یہ ہے کہ قرآن کو ایسے کام سے تشبیہ دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے کرتا ہے۔ اس میں ان کے لئے خیر اور منافع ہیں۔ پھر اس نے انہیں اس کی طرف بلایا۔ کہا جاتا ہے: مادۃ، ومادۃ۔ جس نے مادۃ کہا اس نے اس کام کا ارادہ کیا جو انسان کرتا ہے پھر اس کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے اور جس نے مَادۃ کہا وہ اس سے ادب کا مفہوم لیتا ہے اور الادب سے مَفْعَلۃ بنتا ہے، ایک اور حدیث سے وہ حجت لیتا ہے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی ادب گاہ ہے اس کے اخلاق سے سکھو۔ احمر، ان دونوں لغتوں کو ہم معنی بناتا تھا میں نے اس کے علاوہ کسی کو یہ کہتے نہیں سنا۔ فرمایا: پہلی تفسیر میرے نزدیک پسندیدہ ہے۔

بخاری نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ”تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور قرآن سکھائے“ (2)۔ مسلم نے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے لیموں جیسے پھل (سگترہ) کی ہے، جس کی خوشبو بھی اچھی ہوتی ہے اور ذائقہ بھی میٹھا ہوتا ہے اور اس مومن کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال نیازبوی کی ہے جس کی خوشبو اچھی ہوتی ہے اور ذائقہ کڑوا ہوتا ہے۔ منافق کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا اندرائن کی سی ہے جس کی خوشبو بھی نہیں ہوتی اور ذائقہ بھی کڑوا ہوتا ہے“۔ ایک روایت میں منافق کی مثال کی جگہ فاجر کی مثال کے الفاظ ہیں (3)۔ بخاری نے کہا: اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال لیموں جیسے پھل کی سی ہے جس کا ذائقہ اچھا ہوتا ہے اور خوشبو بھی اچھی ہوتی ہے اور مومن کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا وہ کھجور کی مثل ہے (4)۔ آگے پوری حدیث ذکر کی۔

ابو بکر الانباری نے ذکر کیا ہے: ہمیں احمد بن یحییٰ الحلوانی نے خبر دی، انہوں نے کہا: ہمیں یحییٰ بن عبد الحمید نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ہشیم نے بتایا۔ دوسری سند میں ہے: ہمیں ادریس نے خبر دی۔ انہوں نے کہا: ہمیں خلف نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ہشیم نے بتایا، انہوں نے العوام بن حوشب سے روایت کیا کہ ابو عبد الرحمن السلمیٰ پر جب قرآن ختم کرنے والا قرآن ختم کرتا تو وہ اسے اپنے سامنے بٹھاتے اور اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھتے اور اسے کہتے: اے فلاں! اللہ سے ڈر، میں تجھ سے بہتر کوئی شخص نہیں جانتا اگر تو اس کے مطابق عمل کرے جو تو نے جان لیا ہے۔ داری نے وہب الذماری سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ قرآن دیتا ہے اور وہ رات کے اوقات اور دن کے اوقات میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے اور اس

1۔ مستدرک حاکم، کتاب فضائل القرآن، باب اخبار فی فضائل القرآن

2۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب خیر کم من تعلم القرآن وعلمہ، حدیث نمبر 4639، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن وقصرہا، باب فضیلة حافظ القرآن

4۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل القرآن علی سائر الکلام، حدیث نمبر 4671، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز



کے احکام کے مطابق عمل کرتا ہے اور اطاعت پر مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن سفرہ اور احکام کے ساتھ اٹھائے گا۔ سعید نے کہا سفرہ سے مراد ملائکہ ہیں اور احکام سے مراد انبیاء ہیں۔

مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ بنتی نبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن کا ماہر معزز فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو قرآن پڑھتا ہے اور اس کو پڑھتے ہوئے اس کی زبان سے تع تع نکلتا ہے اور اس پر اس کا پڑھنا مشکل ہوتا ہے تو اسے دو اجر ملیں گے (1)۔ ایک اجر تلاوت کا ملے گا اور ایک اجر مشقت کا ملے گا اور ماہر کے درجات اس سے بلند ہیں، کیونکہ اس پر پہلے قرآن کا پڑھنا مشکل تھا پھر وہ اس سے ترقی کر گیا اور فرشتوں کے مشابہ ہو گیا۔ واللہ اعلم۔ ترمذی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کتاب اللہ سے ایک حرف پڑھا اس کے لئے اس کے بدلے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا بدلہ دس نیکیاں ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ الٹ ایک حرف ہے، لیکن الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے، میم ایک حرف ہے (2)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ ایک طریق سے یہ موقوف بھی روایت کی گئی۔ مسلم نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے جبکہ ہم صفہ میں تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کون پسند کرتا ہے کہ وہ روزانہ بطحان یا عقیق کی طرف جائے اور وہاں سے دو بلند کوہانوں والی اونٹنیاں لے آئے جبکہ نہ اس میں گناہ ہو، نہ قطع رحمی۔ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم سب یہ پسند کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو ایسا کیوں نہیں کرتے کہ تم میں سے کوئی صبح کے وقت مسجد کی طرف جائے پھر علم حاصل کرے یا کتاب اللہ میں سے دو آیتیں پڑھے جو اس کے لئے دو اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور تین آیتیں، تین اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور چار آیتیں، چار اونٹنیوں سے بہتر ہیں اور انہی کی تعداد میں اونٹوں سے بہتر ہیں۔ (3)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو کسی مسلمان کی دنیا کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی تکلیفوں میں سے ایک تکلیف دور کرے گا۔ جو کسی تنگ دست پر آسانی کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس پر آسانی کرے گا، اور جو مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں ہوتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں ہوتا ہے اور جو ایسے راستہ پر چلتا ہے جس میں وہ علم کا متلاشی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرمادیتا ہے۔ کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہیں ہوئی (جس میں) وہ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور آپس میں اس کا تکرار کرتے ہیں مگر ان پر سکنت نازل ہوتی ہے اور ان پر رحمت چھا جاتی ہے اور فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان کے اندر کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں اور جو قرآن پر عمل میں سستی کرے گا اس کا نسب اسے جلدی (جنت میں)

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل الماہر بالقرآن

2۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ما جاء من قرأ حرفاً من القرآن الخ، حدیث نمبر 2835، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل قراءة القرآن في الصلاة

نہیں لے جائے گا۔“ (1)

ابوداؤد، نسائی، دارمی اور ترمذی نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: ”قرآن کو بلند آواز سے پڑھنے والا، علانیہ صدقہ کرنے والے کی طرح ہے اور آہستہ قرآن پڑھنے والا، خفیہ صدقہ کرنے والے کی طرح ہے۔“ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے (2)۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ”قیامت کے روز صاحب قرآن آئے گا اور کہے گا: یارب! کپڑوں کا جوڑا۔ تو صاحب قرآن کو کرامت کا تاج پہنایا جائے گا۔ پھر وہ عرض کرے گا: یارب! اس میں اضافہ فرما۔ پھر صاحب قرآن کو کرامت کا جوڑا پہنایا جائے گا۔ پھر وہ عرض کرے گا: یارب! تو اس بندے سے راضی ہو جا۔ تو اللہ تعالیٰ اس حامل قرآن سے راضی ہو جائے گا۔ اسے کہا جائے گا: تو پڑھ اور اوپر چڑھ، ہر آیت کے بدلے ایک نیکی کا اضافہ کیا جائے گا۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے (3)۔ ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صاحب قرآن کو کہا جائے گا: پڑھ اور اوپر چڑھ اور قرآن اس طرح ترتیل سے پڑھ جس طرح دنیا میں ترتیل سے پڑھتا تھا۔ بے شک تیری منزل اس آخری آیت کے پاس ہوگی جو تو تلاوت کرے گا (4)۔ ابن ماجہ نے اس حدیث کو اپنی سنن میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صاحب قرآن کو کہا جائے گا جب وہ جنت میں داخل ہوگا: پڑھ اور اوپر چڑھ۔ وہ پڑھتا جائے گا اور ہر آیت کے ساتھ ایک درجہ اوپر چڑھتا جائے گا حتیٰ کہ وہ آخری آیت پڑھے گا جو اس کے پاس ہوگی۔

ابوبکر الانباری نے ابو امامہ انصاری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو قرآن کا تہائی دیا گیا اسے نبوت کا تہائی دیا گیا اور جسے قرآن کے دو ٹکٹ دیے گئے اسے نبوت کے دو ٹکٹ دیے گئے اور جس نے پورا قرآن پڑھا اسے پوری نبوت (کافیضان) ملا مگر اس کی طرف وحی نہیں کی جاتی، اسے قیامت کے دن کہا جائے گا: قرآن پڑھ اور ترقی کر، وہ ایک آیت پڑھے گا اور ایک درجہ بلند ہوگا حتیٰ کہ وہ پورا قرآن پڑھ لے گا۔ پھر اسے کہا جائے گا: مٹھی بند کر۔ وہ مٹھی بند کرے گا۔ پھر اسے کہا جائے گا: کیا تو جانتا ہے تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تو اس کے دائیں ہاتھ میں خلد ہوگا اور بائیں ہاتھ میں نعمتیں ہوں گی۔

ادریس بن خلف نے ہمیں بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں اسماعیل بن عیاش نے بتایا انہوں نے تمام سے اور انہوں نے حسن سے روایت کیا۔ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے قرآن کا ٹکٹ (۱/۳) حاصل کیا اور اس پر عمل کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن

2۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن

3۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، حدیث 2839، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، باب استحب الترتیل فی القراءة، حدیث 1252، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو اس نے نبوت کا تہائی حاصل کیا اور جس نے نصف قرآن حاصل کیا اور اس پر عمل کیا تو اس نے نبوت کے نصف امر سے حاصل کیا اور جس نے پورا قرآن حاصل کیا اس نے پوری نبوت حاصل کی۔“ فرمایا: محمد بن یحییٰ نے ہمیں بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں محمد نے خبر دی۔ یہ محمد بن سعد ان ہیں۔ انہوں نے کہا: ہمیں حسین بن محمد نے بتایا، انہوں نے حفص سے انہوں نے کثیر بن زاذان سے انہوں نے عاصم بن ضمرہ سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرآن پڑھا اور اس کی تلاوت کی اور اسے یاد کیا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا اور اس کی سفارش اس کے گھر والوں میں سے ایسے دس افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا جن پر دوزخ واجب ہو چکی ہوگی۔ حضرت ام الدرداء نے کہا: میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئی۔ میں نے انہیں کہا: قرآن پڑھنے والے کو، قرآن نہ پڑھنے والے پر کیا فضیلت ہوگی ان میں سے جو جنت میں داخل ہوں گے؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: قرآن کی آیات کی تعداد، جنت کے درجوں کی تعداد کے برابر ہے، کوئی شخص جو جنت میں داخل ہوگا وہ قرآن پڑھنے والے سے افضل نہ ہوگا۔ یہ حدیث ابو محمد کی نے ذکر کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس نے قرآن پڑھا اور اس کے احکامات کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ اسے گمراہی سے ہدایت دے گا اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے برے حساب سے بچائے گا۔ یہ اس لئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْغَىٰ** (طہ) (تو جس نے میری ہدایت کی تو نہ وہ بھٹکے گا اور نہ بد نصیب ہوگا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اسے ضمانت دے گا جو قرآن کی پیروی کرے گا، دنیا میں گمراہ نہیں ہوگا اور آخرت میں بد بخت نہیں ہوگا۔ یہ بھی مکی نے ذکر کیا ہے۔ الیث نے کہا: کہا جاتا ہے کہ کسی کی طرف جو رحمت آتی ہے وہ قرآن سننے والے کی طرف آنے والی رحمت سے تیز نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ** (الاعراف) اور لعل اللہ کی طرف سے وجوب کے مفہوم میں ہوتا ہے۔

ابوداؤد الطیالسی کی مسند میں ہے، یہ پہلی مسند ہے جو اسلام میں تالیف کی گئی ہے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جو دس آیات کے ساتھ قیام کرے گا وہ غافلین سے نہیں لکھا جائے گا اور جو سو آیات کے ساتھ قیام کرے گا وہ عبادت گزاروں سے لکھا جائے گا اور جو ہزار آیات سے قیام کرے گا تو وہ مقنطریں میں سے لکھا جائے گا۔

اس باب میں بہت سے آثار ہیں۔ جو ہم نے ذکر کر دیے ہیں کافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت کی توفیق دینے والا ہے۔



## کتاب اللہ کی تلاوت کی کیفیت اور اس میں سے جو مکروہ ہے اور جو حرام ہے اور اس کے متعلق لوگوں کا اختلاف

امام بخاری نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کی قرأت کے بارے میں پوچھا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”آپ مد کے ساتھ پڑھتے تھے جب بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھتے تھے۔ بِسْمِ اللّٰهِ پر مد کرتے تھے، الرَّحْمٰن پر مد کرتے تھے اور الرَّحِیْمِ پر مد کرتے تھے۔“ (1)

ترمذی نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: ”رسول اللہ ﷺ علیحدہ علیحدہ کر کے قرأت کرتے تھے۔ آپ پڑھتے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ پھر ٹھہر جاتے، پھر الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھتے، پھر وقفہ کرتے، پھر مُلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ پڑھتے۔“ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے (2)۔ ابو داؤد نے اسی طرح روایت کی ہے۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”لوگوں میں اچھی آواز والا وہ ہے جو قرآن پڑھے تو اس پر اللہ کی خشیت دیکھے۔“ زیاد النمیری سے مروی ہے، وہ قراء کے ساتھ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ انہیں کہا گیا تو پڑھ۔ انہوں نے بلند آواز سے قرآن پڑھا اور غنا کے ساتھ پڑھا۔ وہ بڑے بلند آواز تھے۔ حضرت انس نے اپنے چہرے سے پردہ ہٹایا حضرت انس کے چہرے پر کالا کپڑا تھا۔ حضرت انس نے کہا: اے فلاں وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ جب حضرت انس کوئی ایسی چیز دیکھتے جو ناپسند کرتے تو اپنے چہرے سے پردہ اٹھا دیتے تھے۔ قیس بن عباد سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ذکر کے وقت بلند آواز کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور قرآن کی قراءت کے وقت بلند آواز کرنے کی کراہت جن علماء سے مروی ہے ان میں سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، قاسم بن محمد، حسن، ابن سیرین اور نخعی وغیرہ ہیں۔ مالک بن انس اور احمد بن حنبل نے بھی اس کو مکروہ کہا ہے۔ ان تمام نے قرآن کے ساتھ آواز کو بلند کرنے اور اس میں غنا کی صورت پیدا کرنے کو مکروہ قرار دیا۔ سعید بن مسیب سے مروی ہے کہ انہوں نے عمر بن عبدالعزیز کو لوگوں کی امامت کراتے ہوئے سنا، وہ قراءت میں غنا پیدا کر رہے تھے۔ سعید نے انہیں پیغام بھیجا: اللہ تیری اصلاح کرے، ائمہ اس طرح نہیں پڑھتے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کے بعد غنا کو ترک کر دیا۔ قاسم بن محمد سے مروی ہے کہ ایک شخص نے مسجد نبوی ﷺ میں تلاوت کی اور اس نے گانے کی صورت میں پڑھا، تو قاسم نے اس پر انکار کیا ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اِنَّهٗ لَکِتٰبٌ عَزِیْزٌۙ لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْۢ خَلْفِهٖ (حم السجدہ) (بے شک یہ بڑی عزت و حرمت) والی کتاب ہے، اس کے نزدیک نہیں آسکتا باطل، نہ اس کے سامنے سے نہ پیچھے سے (

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب مد القراءۃ، حدیث نمبر 4658، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب القراءات، باب فاتحة الكتاب، حدیث 2877، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مالک سے مروی ہے، ان سے نماز میں قرآن کی قراءت گوئے کی طرز پر پڑھنے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے اس کا انکار کیا اور سخت کراہت کا اظہار فرمایا۔ ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ نماز میں ان سے الحان سے متعلق پوچھا گیا تو امام مالک نے فرمایا: مجھے یہ اچھا نہیں لگتا اور فرمایا: یہ غنا ہے جس کے ساتھ وہ گاتے ہیں تاکہ اس پر دراہم حاصل کریں۔ اور ایک طائفہ نے قرآن کے ساتھ آواز کو بلند کرنے اور اس میں غنا پیدا کرنے کی اجازت دی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ خوبصورت آواز میں قرآن پڑھے گا تو نفوس میں اس کا زیادہ اثر ہوگا اور دل زیادہ متوجہ ہوں گے۔ اور انہوں نے اس ارشاد نبوی سے حجت پکڑی ہے: ”قرآن کو اپنی آوازوں کے ساتھ مزین کرو“، اس حدیث کو حضرت براء بن مازب سے روایت کیا گیا ہے (1)۔ ابو داؤد اور نسائی نے اس کو نقل کیا ہے اور اس ارشاد نبوی سے حجت پکڑی ہے: وہ ہم میں سے نہیں جس نے قرآن کے ساتھ غنا نہ کیا اور حضرت ابو موسیٰ بنی نضر کے قول سے حجت پکڑی ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا تھا: اگر میں جانتا کہ آپ میری قراءت سن رہے ہیں تو میں قرآن کو انتہائی خوبصورت آواز میں پڑھتا اور حضرت عبداللہ بن منفل بن بکر کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے سال اپنے سفر میں سواری پر سورۃ فتح تلاوت کی اور قراءت میں ترجیع کی یعنی آواز کو اوپر نیچے کیا۔ اس نظریہ کے حامل امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب ہیں اور امام شافعی، ابن مبارک، نصر بن حُمیل ہیں اور یہی ابو جعفر الطبری، ابوالحسن بن بطلال اور قاضی ابوبکر بن عربی وغیرہم کا مختار ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول اصح ہے۔ اس دلیل کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ مزید اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور دوسرے قول والوں نے پہلی حدیث جس سے انہوں نے حجت پکڑی ہے وہ اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہے۔ یہ مقلوب کے باب میں سے ہے یعنی قرآن کے ساتھ اپنی آوازوں کو مزین کرو۔ خطاب نے کہا: اور بہت سے محدثین نے اس کی یہ تفسیر بیان کی ہے۔ یعنی اپنی آوازوں کو قرآن سے مزین کرو۔ اور انہوں نے فرمایا: یہ قلب کے باب سے ہے جیسا کہ عرب کہتے ہیں: میں نے حوض اونٹنی پر پیش کیا حالانکہ اس کا مطلب ہے: میں نے اونٹنی کو حوض پر پیش کیا۔ فرمایا: معمر نے منصور سے انہوں نے طلحہ سے یہ حدیث روایت کی ہے اور اصوات کو قرآن پر مقدم کیا ہے اور یہ صحیح ہے۔

خطابی نے کہا: یہ حدیث طلحہ نے عبدالرحمن بن عوجہ سے انہوں نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: زینوا القرآن باصواتکم یعنی قرآن کی قراءت کرو اور اپنی آوازوں کو اس کے ساتھ مشغول کرو اور اس کو شعار اور زینت بناؤ، بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی قرآن کے پڑھنے پر براہیختہ کرنا ہے اور اس پر کوشش اور مشقت کرنا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: زینوا اصواتکم بالقرآن، اپنی آوازوں کو قرآن کے ساتھ مزین کرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: اپنی آوازوں کو قرآن کے ساتھ حسین کرو۔

میں کہتا ہوں: اس معنی کی طرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول راجع ہے۔ ہم میں سے وہ نہیں جو قرآن کے ساتھ غنا نہیں کرتا۔ یعنی ہم میں سے نہیں جو قرآن کے ساتھ اپنی آواز کو خوبصورت نہیں کرتا، اسی طرح عبداللہ بن ابی ملیکہ نے اس کی

1۔ سنن ابی داؤد، باب استحباب الترتیل فی القرآن، حدیث 1256، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تاویل کی ہے۔ عبد الجبار بن الورد نے کہا: میں نے ابن ابی ملیکہ کو یہ فرماتے سنا کہ عبد اللہ بن ابی یزید نے کہا: ہمارے پاس سے ابولبابہ گزرے، ہم ان کے پیچھے چلے حتیٰ کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔ وہ بوسیدہ ہیئت شخص تھے۔ میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: لیس منا من لم يتغن بالقرآن (1) ”وہ ہم میں سے نہیں جس نے قرآن کے ساتھ غنا نہیں کیا“۔ فرمایا: میں نے ابن ابی ملیکہ سے کہا: اے ابو محمد! بتائیے جب کوئی شخص خوبصورت آواز والا نہ ہو تو؟ انہوں نے فرمایا: اپنی استطاعت کے مطابق خوبصورت بنائے۔ یہ ابو داؤد نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابو موسیٰ بنی نضہ کا نبی کریم ﷺ سے یہ کہنا کہ مجھے اگر علم ہوتا کہ آپ میری قراءت سن رہے ہیں تو میں قرآن کے ساتھ اپنی آواز کو خوبصورت کرتا اور اسے مزین کرتا اور ترتیل سے پڑھتا۔

یہ دلیل ہے کہ وہ فطری خوش الحان ہونے کے باوجود قراءت جلدی کرتے تھے، اگر انہیں علم ہوتا کہ نبی کریم ﷺ تلاوت سن رہے ہیں تو وہ اپنی قراءت میں مد کرتے اور ترتیل سے پڑھتے جیسا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر پڑھتے تھے۔ پس یہ قراءت کے ساتھ حسن صوت میں زیادتی تھی۔ معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ پر یہ کہنے کی تاویل کی جائے کہ قرآن کو اصوات کے ساتھ یا کسی اور چیز کے ساتھ مزین کیا جائے گا۔ جس نے یہ تاویل کی وہ ایک عظیم امر میں واقع ہوا کہ قرآن مزین کرنے والے کا محتاج ہے حالانکہ قرآن نور ہے، ضیاء اور زین ہے اس کے لئے جسے اس کی بہجت دی گئی اور وہ اس کی ضیاء سے روشن ہوا۔ بعض علماء نے فرمایا: تزکین کا حکم قراءت کا اکتساب ہے اور اسے آوازوں کے ساتھ مزین کرنا ہے۔ تقدیر یوں ہوگی قراءت کو اپنی آوازوں کے ساتھ مزین کرو، اس صورت میں قرآن بمعنی قراءت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُرْآنَ الْفَجْرِ (الاسراء: 78) یعنی فجر کی قراءت۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعْ لَهُ ۖ إِنَّهُ كَلِمْ ءَاتٍ ۖ يَنْقُلُ بِهِ الْقُلُوبَ مِمَّا تَشَاءُ (الاسراء: 78) یعنی اس کی قراءت کی اتباع کرو۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا: سمندر میں شیاطین میں سے جو قید کیے گئے ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام نے انہیں باندھا ہے۔ قریب ہے کہ وہ نکلیں اور لوگوں پر قرآن پڑھیں یعنی قراءت کریں۔

شاعر نے حضرت عثمان کے بارے میں کہا:

صَحَّوْا بِأَشْمَطِ عُثْمَانَ السُّجُودِ بِهِ يَقْطَعُ اللَّيْلَ تَسْبِيحًا ۖ قُرْآنًا

اس شعر میں قرآن بمعنی قراءت ہے۔

پس اس تاویل پر یہ معنی صحیح ہوگا: مگر یہ کہ وہ قراءت اپنی حد سے نکل جائے تو پھر ممتنع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: حدیث میں جو یتغنی بہ استعمال ہوا ہے اس کا معنی استغناء ہے جو فقر کی ضد ہے نہ کہ غنا مراد ہے۔ کہا جاتا ہے: تغنیت و تغانیت بمعنی استغنیہ صحاح میں ہے: تغنی الرجل، بمعنی استغنی الرجل، یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے غنی کیا۔ و تغانوا یعنی بعض، بعض سے مستغنی ہوئے۔ مغیرہ بن حبنا، انہی نے کہا:

كَلَانَا غِنًى عَنْ أَخِيهِ حَيَاتِهِ وَ نَحْنُ إِذَا مِتْنَا أَشَدُّ تَغَانِيًا

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید باب قولہ تعالیٰ: و اسرءالقولکم و اجمعوا، حدیث نمبر 6973، ضیاء القرآن پبلیکیشنز



ہم دونوں اپنے بھائی کی زندگی سے غنی ہیں اور ہم جب مریں گے تو زیادہ مستغنی ہو جائیں گے۔

اس تاویل کی طرف سفیان بن عیینہ اور وکیع بن جراح گئے ہیں۔ سفیان نے سعد بن ابی وقاص سے یہ روایت کیا ہے۔ سفیان سے دوسری وجہ بھی مروی ہے۔ یہ اسحاق بن راہویہ نے ذکر کی ہے۔ یعنی وہ اس کی وجہ سے دوسری احادیث سے مستغنی ہوتا ہے۔ اس تاویل کی طرف محمد بن اسماعیل بخاری گئے ہیں کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ساتھ عنوان باندھا ہے **أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ** (العنکبوت: 51) مراد یہ ہے کہ قرآن کی وجہ سے دوسری امتوں کی اخبار سے مستغنی ہوتا ہے۔ یہ اہل تاویل کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے قرآن کی وجہ سے وہ غمگین ہوتا ہے یعنی قاری پر وہ غم ظاہر ہوتا ہے جب وہ قرأت اور تلاوت کرتا ہے۔ غم، خوشی کی ضد ہے۔ یہ الغنیۃ سے مشتق نہیں ہے کیونکہ اگر یہ غنیۃ سے ہوتا تو یتغنی بہ ہوتا، یتغنی بہ نہ ہوتا۔ ایک جماعت کا نظریہ یہ بھی ہے، ان میں امام ابو محمد بن حبان البستی ہیں اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو مطرف بن عبد اللہ بن الشخیر عن ابیہ کے سلسلہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور آپ کے سینہ میں رونے کی وجہ سے ہانڈی کے ابلنے جیسی آواز نکل رہی تھی۔ حدیث میں ابلنے کے لئے الاذیر کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے کڑک کی آواز اور ہانڈی کے ابلنے کی آواز۔ علماء نے فرمایا: حدیث میں واضح بیان ہے کہ حدیث سے مراد غمگین ہونا ہے اور انہوں نے اپنی تائید اس حدیث سے لی ہے جس کو ائمہ حدیث نے حضرت عبد اللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر پڑھو، میں نے آپ پر سورہ نساء پڑھی۔ جب میں فکینف إذا جئنا من کل أمة بشہید وجئناک علی ہؤلآء شہیداً (النساء) پر پہنچا تو میں نے دیکھا آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ چار تاویلات ہیں، ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو الحان کے ساتھ قراءت اور قراءت میں ترجیع پر دلالت کرتی ہو۔ ابوسعید بن الاعرابی نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد لیس منا من لم یتغن بالقراءان کی شرح میں فرمایا: عرب غنا اور گانے کے زیادہ حریص تھے۔ جب قرآن نازل ہوا تو انہوں نے پسند کیا کہ قرآن بھی ان کی عادت پر غنا کے ساتھ ہو تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ ہم میں سے نہیں جو قرآن کے ساتھ غنا نہیں کرتا۔ پانچویں تاویل: ترجیع (☆) اور تطریب پر استدلال اس کے ساتھ کیا گیا ہے۔ عمر بن شبہ نے ذکر کیا ہے، فرمایا: میں نے ابو عاصم النبیل سے ابن عیینہ کی یتغن کے قول میں یستغنی کی تاویل ذکر کی تو انہوں نے فرمایا: ابن عیینہ نے کچھ نہیں کیا۔ امام شافعی سے ابن عیینہ کی تاویل کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ہم اس کو زیادہ جانتے ہیں۔ اگر نبی کریم ﷺ نے استغنا مراد لیا ہوتا تو آپ من لم یستغن فرماتے۔ جب آپ نے یتغن فرمایا تو ہم جان گئے کہ آپ نے التغنی مراد لی۔ طبری نے کہا: ہمارے نزدیک کلام عرب میں معروف یہ ہے کہ التغنی سے مراد وہ غنا ہے جو ترجیع کے ساتھ آواز کا خوبصورت ہونا ہے۔ شاعر نے کہا:

تَغْنٍ بِالشَّعْرِ مَهْمَا كُنْتَ قَائِلَهُ      إِنَّ الْغِنَاءَ بِهَذَا الشَّعْرِ مِضْمَارٌ

☆ ترجیع، گانے کی صورت میں آواز کو اونچے نیچے کر کے پڑھنا۔

شعر کو خوش الحانی سے گا جب تو اس کو کہنے والا ہے اس شعر کے ساتھ غنا پوشیدہ ہے۔ فرمایا: جنہوں نے تغنیت بمعنی استغنیٰ کا دعویٰ کیا ہے وہ عرب کلام میں اشعار میں استعمال نہیں ہوا ہے اور ہم کسی عالم کو نہیں جانتے جس نے یہ کہا ہو۔ اور رہا عشی کے اس قول سے احتجاج

وَ كُنْتُ امْرَأًا زَمَنًا بِالْعِرَاقِ عَفِيفًا الْمُنَاحِ طَوِيلَ الشَّغْنِ

انہوں نے کہا: عشی نے تغن سے مراد استغناء لیا ہے۔ تو یہ غلط ہے۔ عشی نے یہاں الشغْن سے مراد ٹھہرنا لیا ہے۔ عرب کہتے ہیں: غَنِيَ فُلَانٌ بِمَكَانٍ كَذَا۔ یعنی فلاں اس جگہ ٹھہرا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَأَنَّ لَمْ يَغْنُوا فِيهَا (الاعراف: 92) رہا ونحن اذا متنا اشد تغنيا۔ اس سے استشہاد بھی غفلت ہے کیونکہ التغانی دونفسوں سے ہوتا ہے جب ہر ایک دوسرے سے مستغنی ہو جائے، جیسے کہا جاتا ہے تضارب الرجلان، جب ہر ایک دوسرے کو مارے اور جس نے یہ دو شخصوں کے فعل میں کہا اس نے اس کی مثل ایک میں کہنا جائز قرار نہیں دیا پس تغانی زید، تضارب عمرو کہنا جائز نہیں ہے اسی طرح تغنی بمعنی استغنی کہنا بھی جائز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: طبری کا یہ دعویٰ کہ کلام عرب میں تغنی بمعنی استغنی وارد نہیں ہوا۔ حالانکہ جوہری نے یہ ذکر کیا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور بروی نے بھی یہ ذکر کیا ہے اور رہا اس کا قول کہ تفاعل کا صیغہ صرف دو شخصوں کے لئے آتا ہے۔ حالانکہ بہت سے مقام پر ایک شخص کے لئے بھی یہ صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اسی سے حضرت ابن عمر کا قول ہے وانا يومئذ قد ناهوت الاحتلام (میں اس وقت قریب البلوغ تھا) عرب کہتے ہیں: طارقت النعل، عاقبت اللص، داویت العلیل۔ ان مثالوں میں تفاعل ایک شخص کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ پس تغانی بھی ان مثالوں میں سے ہے۔

جب نبی کریم ﷺ کا ارشاد یتغن، الغناء اور الاستغناء دونوں معانی کا احتمال رکھتا ہے تو ایک معنی پر محمول کرنا دوسرے سے اولیٰ نہیں ہے بلکہ الاستغناء پر اس کو محمول کرنا اولیٰ ہے اگرچہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی تاویل نہ ہو کیونکہ صحابی کبیر سے مروی ہے جیسا کہ سفیان نے ذکر کیا ہے۔ ابن وہب نے سفیان کے حق میں کہا: میں نے سفیان بن عیینہ سے زیادہ احادیث کی تاویل کو جاننے والا نہیں دیکھا اور یہ مسلم بات ہے کہ اس نے امام شافعی کو دیکھا اور وہ ان کا ہم عصر تھا۔ چھٹی تاویل: وہ ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا: ما اذن الله لشيء ما اذن لنبی حسن الصوت یتغن بالقرآن یجہر بہ (1)۔ یعنی اللہ تعالیٰ اتنا کسی چیز سے راضی نہیں ہوتا جتنا کہ نبی کے خوبصورت آواز میں قرآن پڑھنے سے راضی ہوتا ہے۔ طبری نے کہا اگر بات اس طرح ہوتی جس طرح ابن عیینہ نے کہا ہے تو حسن الصوت اور الجہر بہ کے ذکر کا کوئی معنی نہ ہوتا۔ ہم کہتے ہیں: یجہر بہ کے الفاظ یا تو نبی کریم ﷺ کے ہیں یا حضرت ابو ہریرہ کے ہیں یا کسی اور کے ہیں۔ اگر پہلی صورت ہو تو اس میں بعد ہے اور وہ تطریب و ترجیع کے نہ ہونے پر دلیل ہے کیونکہ بطرب بہ نہیں فرمایا بلکہ یجہر بہ فرمایا ہے، یعنی وہ خود نے اور اس کے قریب والے سنیں۔ اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن وما يتعلق به، باب استعجاب تحسين الصوت بالقرآن، جلد 1، صفحہ 268

کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے بلند آواز سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہنے والوں کو کہا: اے لوگو! اپنے اوپر نرمی کرو، تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے (1) (الحديث) اسی طرح اگر کسی صحابی سے ہو یا کسی اور سے ہو تو اس میں جو انہوں نے کہا ہے اس پر حجت نہیں ہے۔ اس تاویل کو بعض علماء نے اختیار فرمایا اور کہا: یہ شبہ ہے کیونکہ عرب ہر بلند آواز کرنے والے کو غانی کہتے ہیں اور اس کا فعل غنا ہوتا ہے، اگرچہ وہ نغمہ کی طرز پر نہ گارہا ہو اور کہا: یہ تفسیر صحابی نے کی ہے اور وہ کلام اور حال سے زیادہ آگاہ ہے۔

ابو الحسن بن بطلال نے امام شافعی کے مذہب کے لئے حجت قائم کرتے ہوئے کہا: اس مسئلہ میں اشکال کو وہ حدیث دور کرتی ہے جو ابن ابی شیبہ نے روایت کی ہے۔ فرمایا: ہمیں زید بن الحباب نے بتایا، فرمایا: ہمیں موسیٰ بن علی بن رباح نے بتایا انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا اور انہوں نے حضرت عقبہ بن عامر سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن سیکھو اور اس کو خوش الحانی سے پڑھو اور اس کو لکھو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! یہ مخاض (اونٹنی) سے بھی زیادہ رسی سے نکل جانے والا ہے (2)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ حدیث اگرچہ اس کی سند صحیح ہے، پس اس کو رد کرتی ہے یہ بات جو قطعیت سے معلوم ہے کہ قرآن کی قراءت ہماری لغت کے ساتھ متواتر طور پر نسل در نسل نبی کریم ﷺ تک پہنچتی ہے اور اس میں تلخسین (۳۶) و تطریب نہیں ہے حالانکہ کثرت سے حروف کے مخارج، مد، ادغام، اظہار اور اس کے علاوہ قراءت کی کیفیت میں گہرائی سے غور کرنے والے موجود تھے پھر ترجیع اور تطریب میں وہ لفظ مہموز ہو جاتا ہے جو مہموز نہیں ہوتا، اس میں مد ہو جاتی ہے جو مدود نہیں ہوتا، ایک الف کئی الف کی مقدار بن جاتا ہے، ایک واو کئی واو کی مقدار ہو جاتی ہے، ایک حرف کئی حروف کی مقدار بن جاتا ہے اور یہ چیز قرآن میں زیادتی تک پہنچا دیتی ہے اور یہ ممنوع ہے۔ اگر وہ ہمزہ کی جگہ کو اس طرح پڑھے گا تو بہت سے ہمزے بنادے گا، حروف میں سے جہاں ہمزہ واقع ہوتا ہے وہ صرف ایک ہمزہ ہوتا ہے اور پھر وہ مدودہ ہوگا یا مقصورہ ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے سفر میں سواری پر سورۃ فتح پڑھی تو قراءت کو اوپر نیچے کیا۔ یہ حدیث بخاری نے ذکر کی ہے اور اوپر نیچے کی صفت میں آ، آ، آ، فرمایا۔

ہم کہتے ہیں یہ مد کے اشباع پر محمول ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ سواری کی حرکت کے وقت کی آواز کی حکایت ہو، جیسا کہ بلند آواز کرنے والے کو یہ کیفیت لاحق ہوتی ہے۔ جب وہ سوار ہو اس کی آواز سواری کی حرکت سے کٹ جاتی ہے اور رک جاتی ہے۔ جب اس میں یہ احتمال ہے تو اس میں کوئی حجت نہیں ہے۔ ابو محمد عبدالغنی بن سعید الحافظ نے حضرت قتادہ کی حدیث عبدالرحمن بن ابی بکر عن ابیہ کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ کی قراءت مد بھی اس میں ترجیع نہیں تھی۔ ابن جریج نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ کا مؤذن آواز کو

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء اذا علا عقبہ، حدیث نمبر 5905، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ آیت کو گانے کی صورت میں پڑھنا

2۔ مسند امام احمد، حدیث عقبہ بن عامر



اوپر نیچے (غنا کی صورت میں) کرتا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اذان سہل اور بغیر غنا کے ہے۔ جب تیری اذان سہل اور بغیر غنا کے ہو تو قبہا ورنہ تو اذان نہ دے۔ یہ حدیث دارقطنی نے اپنی سنن میں نقل کی ہے۔ جب نبی کریم ﷺ نے تطریب (غنا کی صورت) اذان میں منع فرمائی تو قرآن میں اس کا ناجائز ہونا بدرجہ اولیٰ ہے جس کی حفاظت کا ذمہ الرحمن ذات نے اٹھایا ہے۔ اس نے فرمایا اور اس کا قول حق ہے: **إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ** ① (الحجر) (بے شک ہم نے اتارا ہے اس ذکر (قرآن مجید) کو اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَنِيدٍ** ② (حم السجدة) (اس کے نزدیک نہیں آسکتا باطل نہ اس کے سامنے سے نہ پیچھے سے۔ یہ اتری ہوئی ہے بڑے حکمت والے سب خوبیاں سراسر اے کی طرف سے)

میں کہتا ہوں: یہ اختلاف اس وقت ہے جب قرآن کا معنی اصوات کے لوٹانے اور ترجیعات کی کثرت کی وجہ سے نہ سمجھا جائے اور اگر یہ امر مزید بڑھ جائے حتیٰ کہ اس کا معنی بھی نہ سمجھا جائے تو یہ حرام ہے جیسا کہ مصر کے شہروں میں قراء کرتے ہیں جو بادشاہوں اور جنازوں کے سامنے قرآن پڑھتے ہیں اور اس پر اجرت اور تحائف لیتے ہیں۔ ان کی سعی گم ہوئی اور ان کا عمل ضائع ہوا۔ پس وہ اس کے ساتھ کتاب اللہ کی تبدیلی حلال سمجھتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ پر جرأت کرنا اپنے نفسوں پر آسان سمجھتے ہیں کہ وہ قرآن میں اضافہ کر دیں جو اس میں نہیں ہے۔ یہ ان کی دین سے جہالت، اپنے نبی کی سنت سے خروج اور سلف صالحین کی سیرت کو چھوڑنے اور شیطان کے مزین کردہ اعمال کی طرف رجحان کی وجہ سے ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اچھا عمل کر رہے ہیں۔ پس وہ گمراہی میں گردش کر رہے ہیں اور اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل رہے ہیں **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ لَارْجِعُونَ**! لیکن مخبر صادق نے خبر دی تھی کہ ایسا ہوگا، پس ایسا ہوا جیسا کہ آپ ﷺ نے خبر دی تھی۔

امام الحافظ ابو الحسن رزین اور ابو عبد اللہ الترمذی الحکیم نے نو اور الاصول میں حضرت حذیفہ کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن کو پڑھو عربوں کی لحن اور ان کی آوازوں میں۔ اہل عشق کی آوازوں میں اور اہل کتاب کی آوازوں میں پڑھنے سے پچو میرے بعد ایک قوم آئے گی جو قرآن کے ساتھ غنا اور نوحہ جیسی ترجیع (آواز کو اوپر نیچے کر کے گانے کی صورت میں پڑھنا) کریں گے۔ قرآن ان کے گلوں سے تجاوز نہیں کرے گا، ان کے دل اور ان لوگوں کے دل جو ان کو اچھا سمجھتے ہیں، فتنہ میں مبتلا کئے گئے ہیں (1)۔ اللحن جمع ہے لحن کی اس کا مطلب آواز کو اوپر نیچے کرنا اور قراءت، شعر اور گانے کے ساتھ آواز کو خوبصورت کرنا ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا، ہمارے زمانہ کے قراء جو واعظین کے سامنے اور مجالس میں عجمی لہجوں میں قرآن پڑھتے ہیں یہ اس کے مشابہ ہے جس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ قراءت میں ترجیع کا مطلب ہے حروف کو گھمانا جس طرح نصاریٰ کی قراءت ہے اور قراءت میں ترتیل کا مطلب ہے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا اور حروف و حرکات کو ظاہر کرنا۔ برابر دانتوں کے ساتھ اس کو تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کو گل بابونہ کی کلی سے تشبیہ دی ہے اور قراءت میں یہی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ**

رَأَى الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا ۝ (المزمل) (قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو)۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی قراءت کے بارے اور آپ کی نماز کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: تمہیں ان کی نماز سے کیا مناسبت، آپ نماز پڑھتے تھے اتنی مقدار سو جاتے تھے جتنی دیر نماز پڑھی ہوتی تھی پھر سونے کی مقدار نماز پڑھتے تھے پھر نماز کی مقدار سوتے تھے حتیٰ کہ صبح ہو جاتی۔ پھر حضرت ام سلمہ نے رسول اللہ ﷺ کی قراءت کو بیان کیا۔ آپ قراءت کو حرف حرف بیان کرتی تھیں۔ اس حدیث کو نسائی، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے (1)۔

## اہل قرآن اور اہل علم کو یو یا کاری وغیرہ سے ڈرانا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَأَعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا (النساء: 36)** (اور عبادت کرو اللہ کی اور نہ شریک ٹھہراؤ اس کا کسی چیز کو)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ۝ (الكهف)** (پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی تو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو)۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے دن جس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ شخص شہید ہوگا، اسے لایا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا، وہ سب نعمتیں پہچان لے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے ان نعمتوں کو کیسے استعمال کیا؟ وہ کہے گا: میں نے تیری رضا کی خاطر جہاد کیا حتیٰ کہ میں شہید ہو گیا۔ اللہ فرمائے گا: تو نے جھوٹ بولا۔ تو تو اس لئے لڑا تھا تا کہ جری کہا جائے، وہ تجھے کہا گیا پھر حکم ہوگا کہ اسے منہ کے بل اوندھا گھسیٹ کر لے جاؤ حتیٰ کہ وہ آگ میں ڈالا جائے گا اور وہ شخص جس نے علم سیکھا اور سکھایا اور قرآن پڑھا اسے لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس پر کی گئی نعمتوں کی پہچان کرائے گا، وہ انہیں پہچان لے گا۔ اللہ فرمائے گا: تو نے ان کے بدلے میں کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں نے علم حاصل کیا اور علم سکھایا اور میں نے تیری رضا کے لئے قرآن پڑھا۔ اللہ فرمائے گا: تو نے جھوٹ بولا۔ تو نے علم سیکھا تا کہ عالم کہا جائے تو نے قرآن پڑھا تا کہ قاری کہا جائے وہ تجھے کہا گیا۔ پھر اس کے بارے حکم ہوگا کہ اسے اوندھا گھسیٹ کر لے جاؤ اور آگ میں ڈال دو۔ وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مالی اعتبار سے وسعت دی اور اسے ہر قسم کا مال دیا پھر اسے لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتوں کی پہچان کرائے گا، وہ نعمتیں پہچان لے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے ان نعمتوں کے بدلے کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں نے کوئی ایسا راستہ نہیں چھوڑا جس میں میں نے خرچ کرنے کو پسند کیا مگر میں نے اس میں تیرے لئے خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ بولا۔ تو

1۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، باب کیف کان قراءة النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سنن ابی داؤد، باب استحباب الترتیل فی القراءة، حدیث نمبر 1254، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے یہ عمل کیا تا کہ جو اد کہا جائے وہ تجھے کہا گیا۔ پھر اس کے بارے حکم ہوگا کہ اسے اوندھا گھیٹ کر لے جایا جائے پھر آگ میں ڈالا جائے گا (1)۔ (امام ترمذی نے اس حدیث میں کہا) پھر رسول اللہ ﷺ نے میرے گھٹنے پر مارا اور فرمایا: اے ابو ہریرہ! یہ تین پہلی اللہ کی مخلوق ہوگی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز آگ کو بھڑکائے گا۔ ابو ہریرہ کا نام عبد اللہ ہے بعض نے فرمایا: عبد الرحمن ہے۔ فرمایا: مجھے ابو ہریرہ کی کنیت دی گئی کیونکہ میں اپنی آستین میں بلی اٹھائے ہوئے تھا۔ مجھے رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو پوچھا: یہ کیا ہے؟ میں نے کہا: بلی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابو ہریرہ! ابن عبد البر نے کہا: یہ حدیث اس شخص کے بارے میں ہے جو عمل اور علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں رکھتا۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: جس نے اللہ کے علاوہ کیلئے علم حاصل کیا یا اللہ کی رضا کے علاوہ اس سے کوئی ارادہ کیا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرے (2)۔

ابن مبارک نے "رقائق" میں حضرت عباس بن عبد المطلب سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ دین غالب آئے گا حتیٰ کہ سمندر سے گزر جائے گا حتیٰ کہ گھوڑوں کو اللہ کے راستہ میں دریاؤں میں داخل کیا جائے گا۔ پھر ایک قوم آئے گی جو قرآن پڑھیں گے۔ جب قرآن پڑھیں گے تو کہیں گے ہم سے زیادہ قاری کون ہے ہم سے زیادہ علم والا کون ہے۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم ان میں خیر دیکھتے ہو؟ صحابہ نے کہا: نہیں۔ فرمایا: یہ تم میں سے ہیں اور یہ اس امت سے ہیں اور یہ آگ کا ایندھن ہیں۔ ابو داؤد اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ایسا علم سیکھا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کی جاتی ہے وہ اسے نہیں سیکھتا مگر اس لئے تا کہ دنیا کا کوئی سامان حاصل کرے تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو محسوس نہیں کرے گا (3)۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب الحزن سے اللہ کی پناہ مانگو۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب الحزن کیا ہے؟ فرمایا: جہنم میں ایک وادی ہے جس سے جہنم ہر روز سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! اس میں کون داخل ہوگا؟ فرمایا: قراء جو اعمال کیساتھ دکھاوا کرتے ہیں۔ (4)

امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ اسد بن موسیٰ کی کتاب میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جہنم میں ایک وادی ہے، اس وادی کے شر سے جہنم ہر روز سات مرتبہ پناہ مانگتی ہے، اس وادی میں ایک کنواں ہے، جہنم اور وہ وادی اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل للربیاء والسبعة استحق النار

2۔ جامع ترمذی، باب جاء فین یطلب بعلمہ الدنیا

ایضاً ابن ماجہ، باب الانتفاع بالعلم والعمل بہ، حدیث 253، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب فی طلب العلم لغير الله، حدیث 3179، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، باب ما جاء فی الربیاء والسبعة، حدیث 2305، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



کنویں کے شر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، اس کنویں میں ایک سانپ ہے۔ جہنم، وادی اور کنواں اس سانپ سے سات مرتبہ اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ان اشیاء (بد بخت) کے لئے تیار کر رکھا ہے جو حاملین قرآن اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں۔ پس حامل قرآن اور طالب علم کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہئے اور اللہ کے لئے خاص عمل کرنا چاہئے۔ اگر پہلے کوئی ناپسندیدہ کام ہو چکا ہو تو اسے جلدی تو بہ واستغفار کرنا چاہئے۔ طلب اور عمل میں اخلاص سے آغاز کرے۔ حافظ قرآن کو دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ تحفظ لازم ہے جیسا کہ اس کے لئے جواجر ہے وہ دوسروں کے لئے نہیں۔ ترمذی نے حضرت ابوالدرداء سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بعض کتب میں اللہ نے نازل کیا یا بعض انبیاء کی طرف وحی کی گئی کہ تم ان لوگوں سے کہو جو غیر دین کے لئے فقہ حاصل کرتے ہیں اور غیر عمل کے لئے علم حاصل کرتے ہیں اور آخرت کے عمل کے ساتھ دنیا طلب کرتے ہیں انہیں مینڈھوں کی جلدیں پہنائی جائیں گی اور ان کے دل بھیڑیوں کے دلوں جیسے ہوں گے، ان کی زبانیں شہد سے زیادہ میٹھی ہوں گی اور دل مصر سے زیادہ کڑوے ہوں گے مجھے وہ دھوکا دیتے ہیں اور میرے ساتھ ستہزاء کرتے ہیں میں ان کے لئے ایسی آزمائش تیار کروں گا جو ان میں حلیم کو حیران کر دے گی۔ (1)

طبری نے کتاب ”آداب النفوس“ (۲) میں نقل کیا ہے ہمیں ابو کریب محمد بن علاء نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں محارب بنی نے بتایا انہوں نے عمرو بن عامر بنجلی سے انہوں نے ابن صدقہ سے انہوں نے ایک صحابی سے روایت کیا یا جس نے انہیں بتایا۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو دھوکا نہ دو کیونکہ جو اللہ کو دھوکا دیتا ہے اللہ اسے دھوکے کی سزا دیتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اگر وہ سمجھے۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! اللہ کو کیسے دھوکا دیتا ہے؟ فرمایا: تو اس کے مطابق عمل کرتا ہے جس کا اس نے تجھے حکم دیا اور اس کے ذریعے کسی غیر کو طلب کرتا ہے، ریا سے بچو کیونکہ یہ شرک ہے اور ریا کار قیامت کے روز ان چار اسماء کے ساتھ اشہاد کے سردوں پر بلایا جائے گا جو اس کی طرف منسوب کئے جائیں گے یا کافر، یا خاسر، یا غادر، یا فاجر۔ تیرا عمل گم ہوا اور تیرا اجر باطل ہوا آج تیرے لئے کوئی حصہ نہیں ہے تو اپنا اجر اس سے طلب کر جس کے لئے تو عمل کرتا تھا۔ اے دھوکا باز! علقمہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: تم کیسے ہو گے جب تمہیں ایسا فتنہ لاحق ہوگا جس میں چھوٹا بڑا ہو جائے گا بڑا بوڑھا ہو جائے گا، سنت کو بدعت بنادیا جائے گا لوگ اس بدعت پر چلیں گے جب اس بدعت میں کوئی تبدیلی ہوگی تو کہا جائے گا: سنت بدل دی گئی۔ پوچھا گیا اے ابو عبد الرحمن! یہ کب ہوگا؟ فرمایا: جب تمہارے قراء زیادہ ہوں گے اور فقہاء کم ہوں گے اور امراء زیادہ ہوں گے اور امین کم ہوں گے، دنیا کو آخرت کے عمل کے ذریعے تلاش کیا جائے گا اور دین کے علاوہ کے لئے فقہ حاصل کیا جائے گا (2)۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: ہمیں یہ حضرت ابن عباس سے خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر حاملین قرآن، قرآن کا حق ادا کرتے اور جو مناسب تھا تو اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا لیکن انہوں نے اس کے ساتھ دنیا کو طلب کیا تو اللہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، باب ما جاء في الرياء والسعة، حدیث 2328، فضلاء القرآن، پہلی کیشنر

2۔ سنن دارمی، باب تغیر الزمان وما یحدث فیہ

۳۔ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ذکر کیا طبری کی ایک ترتیب العلماء جس کا یہ آغاز ہے اسے مکمل یہ فرمایا۔

نے ان سے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور وہ لوگوں پر ذلیل ہو گئے۔ ابو جعفر محمد بن علی سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد **فَلْيُكَلِّمُوا فِيهَا هُمٌ وَالْعَاُونَ** (الشعراء) کے تحت مروی ہے، فرمایا: یہ وہ قوم ہے جنہوں نے اپنی زبانوں کے ساتھ حق اور عدل کا وصف بیان کیا اور انہوں نے غیر کی طرف اس کی مخالفت کی۔ اس باب کا مزید بیان کتاب کے دوران ان شاء اللہ آئے گا۔

## صاحب قرآن کو چاہئے کہ وہ اس سے اپنے لئے حصہ بنائے اور غافل نہ ہو

سب سے پہلی بات صاحب قرآن کے لئے یہ ہے کہ وہ قرآن کا علم خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے حاصل کرے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، دوسری یہ کہ وہ رات اور دن میں، نماز میں یا نماز کے علاوہ تلاوت کرے تاکہ اسے قرآن بھول نہ جائے۔ مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صاحب قرآن کی مثال باندھے گئے اونٹوں والے کی ہے کہ وہ ان کی نگرانی کرتا رہتا ہے تو وہ انہیں روکے رکھتا ہے اور اگر وہ انہیں چھوڑ دیتا ہے تو وہ چلے جاتے ہیں۔ جب صاحب قرآن، قرآن کے ساتھ قیام کرتا ہے اور دن اور رات میں اس کی تلاوت کرتا ہے تو وہ اسے یاد رہتا ہے جب وہ قرآن کے ساتھ قیام حفاظت کا اہتمام نہیں کرتا ہے تو وہ اسے بھول جاتا ہے (1)۔ پس صاحب قرآن کے لئے مناسب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرے، اس کی نعمت کا شکر ادا کرے، اس کا ذکر ہو اور اس پر توکل کرنے والا ہو اور اسی سے مدد طلب کرنے والا ہو، اسی کی طرف رغبت کرنے والا ہو، اس کو مضبوطی سے پکڑنے والا ہو، اپنی موت کو یاد کرنے والا ہو، اللہ کی بارگاہ میں حاضری کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے والا ہو، اسے چاہئے کہ وہ اپنے گناہوں سے خوف کرنے والا ہو، اپنے رب کے عفو کا امیدوار ہو، صحت میں خوف اس پر غالب ہو کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کی زندگی کب ختم ہونے والی ہے اور اس کی بارگاہ میں حاضری کے وقت اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے قوی امید رکھنے والا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی نہ مرے مگر وہ اللہ تعالیٰ سے اچھا گمان رکھنے والا ہو یعنی یہ گمان رکھے کہ وہ اس پر رحم فرمائے گا اور اسے بخش دے گا اور اسے چاہئے کہ وہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو جاننے والا ہو، اس کے تسلط سے اپنی حفاظت کرنے والا ہو، اپنے نفس کی خلاصی اور اپنی روح کی نجات کے لئے کوشش کرنے والا ہو اور دنیا کا سامان جتنی قدرت رکھتا ہے آگے بھیجنے والا ہو اور حتی المقدور اپنے نفس سے جہاد کرنے والا ہو اور اس کو چاہئے کہ اس کے نزدیک اہم امر دین میں تقویٰ ہو اور جو اللہ نے حکم دیا اور جس سے اللہ نے منع فرمایا اس کا خیال کرنے والا ہو اور اس میں تقویٰ پر عمل کرنے والا ہو۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قاری قرآن کو چاہئے کہ وہ رات کو جاگنے والا معروف ہو جب لوگ سوئے ہوئے ہوں اور دن کو بھی بیدار معروف ہو جب لوگ بیدار ہوں اور وہ رونے میں مصروف ہو جب لوگ ہنس رہے ہوں اور وہ خاموشی سے معروف ہو جب لوگ بری باتوں میں مشغول ہوں اور وہ خضوع و عجز کے ساتھ معروف ہو جب لوگ ایک دوسرے کو فریب دینے میں مصروف ہوں اور وہ حزن کے ساتھ معروف ہو جب لوگ خوش ہوں۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن وما يتعلق بہ، باب الامر بتعهد القرآن

حضرت عبداللہ بن عمرو نے کہا: حامل قرآن بری باتوں میں مشغول لوگوں کے ساتھ مشغول نہ ہو اور جاہلوں کے ساتھ جاہل نہ بنے، بلکہ قرآن کے حق کی وجہ سے معاف کر دے کیونکہ اس کے جوف میں اللہ کا کلام ہے۔ اس کے لئے مناسب ہے کہ شبہات کے راستوں سے اپنے آپ کو بچائے، غیر مفید باتوں کے ساتھ مجالس قرآن میں کلام نہ کرے اور کم ہنسے، اپنے اوپر حلم اور وقار قائم رکھے اور اسے چاہئے کہ فقراء کے لئے تواضع اختیار کرے، تکبر اور اعجاب سے اجتناب کرے۔ اگر اپنے نفس پر فتنہ کا اندیشہ ہو تو دنیا اور دنیا والوں سے جدا رہے، جنگ و جدل کو ترک کرے اور نرمی اور ادب کا مظاہرہ کرے اور اسے چاہئے کہ وہ ان افراد سے ہو جن کے شر سے امن ہوتا ہے، جن سے خیر کی امید کی جاتی ہے اور جن کے نقصان سے حفاظت سمجھتی جاتی ہے اور اس کی بات نہ سنے جو اس کے پاس چغلی کھائے اور اس کے ساتھ سنگت اختیار کرے جو خیر پر معاون ہو اور صدق اور مکارم اخلاق پر رہنمائی کرنے والا ہو اور اسے زینت بخشنے والا ہو نہ کہ عیب دار کرنے والا ہو۔ اس کے لئے مناسب ہے کہ وہ قرآن کے احکام کو سیکھے اور اللہ تعالیٰ کی جو مراد ہے اسے سمجھے اور جو اللہ نے فرض کیا اسے سیکھے، جو پڑھے اس سے نفع حاصل کرے اور جو تلاوت کرے اس پر عمل کرے۔ پس جو معنی نہیں سمجھے گا وہ عمل کیسے کرے گا اور کتنا برا ہے وہ جو تلاوت کرتا ہے اس کے مفہوم کے متعلق پوچھا جائے اور وہ نہ جانتا ہو۔ اس کی مثال گدھے کی مثل ہے جو کتابیں اٹھائے ہوئے ہوتا ہے، اور اس کے مناسب ہے کہ وہ مکی، مدنی صورتوں کی پہچان کرے تاکہ وہ تفریق کر سکے جب اللہ تعالیٰ نے ابتداء اسلام میں لوگوں سے خطاب فرمایا اور جو آخر میں خطاب فرمایا اور جو اللہ تعالیٰ نے پہلے فرض کیا تھا اور اس کے آخر میں زائد فرض کیا۔ اکثر قرآن میں مکی کے لئے مدنی ناخ ہے اور مکی حکم سے مدنی حکم کو منسوخ کرنا ممکن نہیں کیونکہ منسوخ نزول میں ناخ سے قدم ہوتا ہے اور اس کے کمال میں سے یہ ہے کہ وہ اعراب اور غریب کو جانتا ہو۔ یہ ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے پڑھے جانے والے کے حصہ کی معرفت آسان ہوگی اور جو وہ تلاوت کرے گا اس سے شک دور ہوگا۔ ابو جعفر طبری نے کہا: میں نے جرمی کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں تیس سال سے فقہ میں سیبویہ کی کتاب سے فتویٰ دیتا رہا ہوں۔ محمد بن یزید نے کہا: ابو عمر جرمی صاحب حدیث تھے۔ جب انہوں نے سیبویہ کی کتاب کا علم حاصل کر لیا تو حدیث کا علم سیکھا کیونکہ سیبویہ کی کتاب سے نظر اور تفسیر سیکھتے تھے۔ پھر سنن ماثور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھیں ان میں غور و فکر کرتے تھے۔ طالب، اللہ کی کتاب کے مراد تک پہنچنے کے لئے سنت کا وسیلہ پکڑے یہ اس کے لئے احکام قرآن کے مضمحل راہ کھولے گی۔ ضحاک نے وَلَٰكِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الْكِتَابَ (آل عمران: 79) کے تحت فرمایا: ہر قرآن پڑھنے والے پر حق ہے کہ وہ فقیہ بھی ہو۔

ابن ابی حواری نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہم فضیل بن عیاض کے پاس سنہ ۱۸۵ ہجری میں آئے۔ ہم ایک پوری جماعت تھے۔ ہم دروازے پر کھڑے رہے۔ انہوں نے ہمیں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ کسی نے بتایا کہ اگر وہ نکلیں گے تو تلاوت قرآن کے لئے نکلیں گے۔ ہم نے ایک قاری کو تلاوت کرنے کو کہا۔ اس نے تلاوت کی تو فضیل نے ہماری طرف ایک کھڑکی سے جھانکا۔ ہم نے کہا: السلام علیک ورحمۃ اللہ۔ انہوں نے کہا: وعلیکم السلام۔ ہم نے پوچھا: اے ابو علی! آپ کیسے ہیں آپ کا کیا حال ہے؟ فضیل نے کہا: میں اللہ کی طرف سے عافیت میں ہوں اور تمہاری وجہ سے اذیت میں ہوں اور تم نے



اسلام میں بدعتیں نکالی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ ہم اس لئے علم حاصل نہیں کرتے تھے لیکن ہم مشائخ کے پاس آتے تھے تو ہم ان کے پاس بیٹھنے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتے تھے۔ پس ہم ان سے دور بیٹھتے تھے جو چوری چھپے سنتے تھے جب وہ حدیث گزرتی تو ہم اس کو اعادہ کے لئے تلاش کرتے اور اسے ہم لکھ لیتے اور تم جہالت کے ساتھ علم حاصل کرتے ہو اور تم نے کتاب اللہ کو ضائع کر دیا ہے، اگر تم کتاب اللہ کو طلب کرتے تو تم اس میں اپنی بیماری کی شفاء پاتے۔ ہم نے کہا: ہم نے قرآن سیکھا۔ فضیل نے کہا: تمہارے قرآن سیکھنے میں تمہاری عمروں اور تمہاری اولاد کی عمروں کی مشغولیت ہے۔ ہم نے کہا: اے ابوعلی! وہ کیسے؟ فضیل نے کہا: تم قرآن کو نہیں پہچانو گے حتیٰ کہ تم اس کا اعراب پہچان لو۔

متشابہ سے محکم اور منسوخ سے ناسخ کی پہچان کر لو۔ جب تم اس کی پہچان کر لو گے تو فضیل اور ابن عیینہ کے کلام سے مستغنی ہو جاؤ گے۔ پھر فرمایا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّيِّعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَ هُدًى وَ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٠﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهِ قَدْ اَنْزَلْتُ لَكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿٥١﴾ (یونس) (اے لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے اور (آگئی ہے) شفاء ان بیماریوں کے لئے جو سینوں میں ہیں اور (آگئی ہے) ہدایت اور رحمت مومنین کے لئے (اے حبیب!) آپ فرمائیے یہ کتاب محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے نازل ہوئی ہے۔ پس چاہئے کہ اس پر خوشی منائیں یہ بہتر ہے ان تمام چیزوں سے جن کو وہ جمع کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ مراتب قاری قرآن کو حاصل ہوتے ہیں جب وہ قرآن کا ماہر ہو، فرقان کا عالم ہو اور وہ اس کے قریب ہوتا ہے جو اسے اپنا قرب بخشا ہے اور وہ مذکورہ چیزوں سے نفع حاصل نہیں کرتا حتیٰ کہ اس کو طلب کرے اور طلب کے بعد اس کی نیت میں خلوص ہو اور طالب علم کبھی اس سے ابتدا میں مباحثات اور دنیا میں شرف حاصل کرنے کی نیت کرتا ہے، وہ علم کا حصول اسی خاطر کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نظریہ میں خطا ہے اور اس سے توبہ کرتا ہے اور نیت کو اللہ کے لئے خالص کرتا ہے اور پھر اس سے نفع حاصل کرتا ہے اور اپنا حال درست کرتا ہے۔ حسن نے کہا: ہم دنیا کے لئے علم حاصل کرتے تھے پھر وہ ہمیں آخرت کی طرف لے گیا۔ یہ سفیان ثوری نے بھی کہا ہے۔ حبیب بن ابی ثابت نے کہا: ہم نے علم حاصل کیا اور اس میں ہماری نیت خالص نہ تھی پھر بعد میں ہماری نیت خالص ہوئی۔

## قرآن کے اعراب، قرآن کی تعلیم، قرآن پر ابھارنا اور

### اعراب کے ساتھ قرآن پڑھنے والے کا ثواب

ابوبکر بن انباری نے کہا: نبی کریم ﷺ، صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم سے قرآن کے اعراب کی فضیلت، اس کی تعلیم پر ترغیب مروی ہے اور گانے کی طرز پر پڑھنے کی مذمت اور کراہیت مروی ہے اور قرآن کے قاریوں پر جو کوشش سے اس کی تعلیم حاصل کرنا واجب ہے وہ بھی مروی ہے۔

اس میں سے وہ روایت ہے جو ہمیں یحییٰ بن سلیمان ضحیٰ نے بتائی۔ فرمایا: ہمیں محمد بن ابوسعید نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابو معاویہ نے عبد اللہ بن سعید مقبری سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے اپنے دادا سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کر کے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قرآن کو فصیح انداز میں پڑھو اور اس کے غرائب تلاش کرو۔ مجھے میرے باپ نے بتایا فرمایا: ہمیں ابراہیم بن ہشیم نے بتایا۔ انہوں نے فرمایا: ہمیں آدم یعنی ابن ابی ایاس نے بتایا۔ فرمایا: ہمیں ابو طیب مروزی نے بتایا فرمایا: ہمیں عبدالعزیز بن ابی رواد نے بتایا انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے قرآن پڑھا اور اس میں غلطی نہ کی تو اس پر ایک فرشتہ متعین کیا جاتا ہے جو اس کے لئے لکھتا ہے، جیسا کہ اتارا گیا ہے، ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں لکھتا ہے اور جو اس کے بعض کو فصیح عربی میں پڑھتا ہے اس پر دو فرشتے متعین کئے جاتے ہیں جو اس کے لئے ہر حرف کے بدلے بیس نیکیاں لکھتے ہیں پھر اگر وہ اسے فصیح عربی میں پڑھتا ہے تو اس پر چار فرشتے متعین کئے جاتے ہیں جو اس کے لئے ہر حرف کے بدلے ستر نیکیاں لکھتے ہیں۔ جو ہر نے ضحاک سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا قرآن کو تجوید کے ساتھ پڑھو اور خوبصورت آوازوں کے ساتھ اس کو مزین کرو اور اس کو فصیح عربی میں پڑھو کیونکہ یہ عربی ہے اور اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اسے فصیح عربی میں پڑھا جائے۔ مجاہد سے مروی ہے انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: قرآن کو فصیح عربی میں پڑھو۔ محمد بن عبد الرحمن بن زید سے مروی ہے، فرمایا: حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قرآن کے بعض کو فصیح عربی میں پڑھنا ہمارے نزدیک اس کے حروف یاد کرنے سے افضل ہے اور شعبی سے مروی ہے، فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے قرآن کو فصیح عربی میں پڑھا اس کے لئے دو اجر ہیں نسبت اس کے جس نے فصیح عربی میں نہیں پڑھا۔ ابن جریج نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں عربوں کو تین وجوہ سے پسند کرتا ہوں کیونکہ میں عربی ہوں، قرآن عربی ہے اور اہل جنت کا کلام عربی ہے۔ سفیان نے ابو حمزہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حسن کو اس قوم کے متعلق بتایا گیا جو عربی سمجھتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: وہ اچھا کرتے ہیں وہ اپنے نبی کی لغت سمجھتے ہیں اور حسن سے کہا گیا ہمارا ایک امام ہے جو گانے کی طرز پر قرآن پڑھتا ہے۔ حضرت حسن نے فرمایا: اسے پیچھے ہٹادو۔

ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے، فرمایا: ایک اعرابی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں آیا اور کہا: مجھے وہ کون پڑھائے گا جو محمد ﷺ پر نازل ہوا؟ فرمایا: ایک شخص نے اسے سورہ برأت پڑھائی۔ اس نے جب پڑھا: اِنَّ اللّٰهَ بَرٌّ مِّنْ النَّاسِ كَثِيْرٌ وَّمَا سُوْلَةُ (التوبہ: 3) اس پڑھانے والے نے رسولہ کو زیر کے ساتھ پڑھا تو اعرابی نے کہا: کیا اللہ اپنے رسول سے بری ہے، اگر اللہ اپنے رسول سے بری ہے تو میں اس سے بری ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اعرابی کی بات پہنچی تو اسے بلایا اور کہا: اے اعرابی! کیا تو رسول اللہ ﷺ سے بری ہے۔ اعرابی نے کہا: اے امیر المومنین! میں مدینہ آیا اور مجھے قرآن کے بارے کوئی علم نہ تھا۔ میں نے پوچھا: کون مجھے قرآن پڑھائے گا؟ پس اس نے مجھے سورہ برأت پڑھائی اور کہا: اِنَّ اللّٰهَ بَرٌّ مِّنْ النَّاسِ كَثِيْرٌ وَّمَا سُوْلَةُ (التوبہ: 3) میں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے بری ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے بری

ہے تو میں بھی اس سے بری ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا: اے اعرابی! بات اس طرح نہیں ہے۔ اس نے کہا: اے امیر المؤمنین! یہ کیسے ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا: اِنَّ اللّٰهَ بَرِّىْ عَزَّوَجَلَّ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهُ (التوبہ: 3) اعرابی نے کہا: میں اللہ کی قسم اس سے بری ہوں جس سے اللہ اور اس کا رسول بری ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ لغت کا جاننے والا لوگوں کو قرآن پڑھائے۔ پھر آپ نے ابواسود کو حکم دیا اور اس نے نحو کا علم وضع کیا۔

علی بن جعد سے مروی ہے، فرمایا: میں نے شعبہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ صاحب حدیث جو عربی نہیں جانتا اس گدھے کی مثل ہے جس پر خورجی ہو جس میں چارہ نہ ہو۔ حماد بن سلمہ نے کہا: جس نے حدیث کو طلب کیا اور نحو کو نہیں سیکھا یا فرمایا عربی کو نہیں سیکھا وہ اس گدھے کی مانند ہے جس پر خورجی لٹکائی گئی ہے جس میں جو نہیں ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: قرآن کا اعراب شریعت میں سے ہے کیونکہ اس کے ساتھ وہ معانی قائم ہوئے ہیں جو شرع ہے۔

ابن انباری نے کہا (1): صحابہ کرام اور تابعین سے منقول ہے کہ وہ قرآن کے غریب الفاظ اور مشکل الفاظ پر لغت اور شعر سے حجت پکڑتے تھے جو نحو یوں کے مذہب کی صحت کو بیان کرتا اور اس کے مذہب کے فساد کو واضح کرتا جو ان پر انکار کرتا۔ اس سے یہ ہے جو ہمیں عبید بن عبدالواحد بن شریک البرزازی نے بتایا۔ ہمیں ابن ابی مریم نے بتایا، فرمایا: ہمیں ابن فروخ نے بتایا۔ فرمایا: مجھے اسامہ نے خبر دی۔ انہوں نے کہا: مجھے عکرمہ نے خبر دی کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: تم مجھ سے غریب القرآن کے متعلق پوچھو تو اسے شعر میں تلاش کرو کیونکہ شعر عربوں کا دیوان ہے۔ ہمیں ادريس بن عبدالکریم نے بتایا، فرمایا: ہمیں خلف نے بتایا فرمایا: ہمیں حماد بن زید نے بتایا انہوں نے علی بن زید بن جدعان سے روایت کیا، فرمایا: میں نے حضرات سعید بن جبیر اور یوسف بن مہران کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو سنا، ان سے قرآن کی کسی آیت کے بارے پوچھا جا رہا تھا۔ انہوں نے فرمایا: اس میں ایسا ایسا ہے۔ کیا تم نے شاعر کو ایسا ایسا کہتے ہوئے نہیں سنا۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، حضرت ابن عباس سے کسی شخص نے وَثِيَاكَ فَكَيْفَ؟ (المدثر) کے بارے پوچھا تو آپ نے فرمایا: تو اپنے میلے کپڑے نہ پہن اور غیلان ثقفی کے قول سے مثال دی۔

فَإِنِّي بِحَمْدِ اللَّهِ لَا ثَوْبَ غَادِرٍ لِّبَسْتُ وَلَا مِنْ سِوَاكَ اتَّقِنَعُ  
ایک شخص نے عکرمہ سے الزنیم کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا: وہ ولد الزنا ہے اور شعر کے اس بیت سے مثال بیان کی۔

الزَّنِيْمُ يَسِّرُ يَعْرِفُ مَنْ أَبَوُهُ بَنِيْنَ الْأُمِّ ذُوْ حَسْبٍ لِّثِيْمٍ  
عکرمہ سے یہ بھی مروی ہے کہ الزنیم کا مطلب فاحش کمینہ شخص بھی ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا۔

الزَّنِيْمُ تَدَاعَاهُ الرِّجَالُ زِيَادَةً كَمَا زِيدَ فِي عَرْضِ الْأَدِيْمِ الْكَارِعِ  
عکرمہ سے ذَوَاتَا أَفْئَانٍ (الرحمن) کے ارشاد کے تحت مروی ہے، فرمایا: دونوں سائے اور ٹہنیوں والے اور فرمایا: کیا تم نے شاعر کا قول نہیں سنا۔



ماہاج شوقك من هديل حمامة تدعو عن فتن انغصون حماما

تدعو ابا فرخين صادف طائراً ذاً مغلبين من اصقور قطاما

حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے قَاذَاهُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝ (النازحات) کے تحت فرمایا ہے: اس سے مراد زمین ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے امیہ بن ابی الصلت نے کہا: عندهم لحم بحر ولحم ساهرة۔ ابن ابی ہریرہ نے کہا: راوی اس بیت کو اس طرح روایت کرتے ہیں۔

فيها لحم ساهرة و بحر و ما فاهوا به نهه مقب

نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباس سے کہا لَا تَأْخُذْ سِنَةً وَلَا نَوْمًا (البقرہ: 255) کے بارے مجھے بتائیے۔ یہ السنۃ کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اونگھ ہے۔ زبیر بن ابی سلمیٰ نے کہا:

لا سنة في طول الليل تاخذ ولا ينام ولا في امره فند

رات کی طوالت میں نہ اسے نیند آتی ہے اور نہ وہ سوتا ہے اور نہ اس کے امر میں رائے کی کمزوری ہوتی ہے۔

## قرآن کی تفسیر اور مفسرین کی فضیلت

ہمارے علماء نے فرمایا: صحاح اور تابعین سے تفسیر کی فضیلت میں جو منقول ہے اس میں سے یہ ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ کا ذکر کیا اور ان کا علم کے ساتھ وصف بیان کیا۔ ایک شخص نے کہا: میں جناب پر قربان ہو جاؤں آپ جابر کا علم کے ساتھ وصف بیان کر رہے ہیں جبکہ آپ تو (علم میں) آپ ہی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَاٰكَ اِلٰى مَعَادٍ (القصص: 85) کی تفسیر جانتے تھے۔ مجاہد نے کہا: اللہ کے نزدیک محبوب ترین شخص نازل شدہ کتاب کا عالم ہے۔ حسن نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے کوئی آیت نازل نہیں فرمائی مگر اس نے پسند کیا کہ جس کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور جو اس سے مراد ہے وہ معلوم ہو۔ شعبی نے کہا: مسروق رضی اللہ عنہ نے ایک آیت کی تفسیر کے لئے بصرہ کا سفر کیا۔ انہیں بتایا گیا جو اس آیت کی تفسیر بیان کرتا تھا وہ شام چلا آیا ہے۔ پس مسروق نے تیاری کی اور شام تک سفر کیا حتیٰ کہ اس آیت کی تفسیر جان لی۔ عکرمہ (۱۰۰) نے وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ (النساء: 100) کی تفسیر میں فرمایا: میں چودہ سال اس شخص کا نام تلاش کرتا رہا جو گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلا تھا حتیٰ کہ میں نے اس کا نام پالیا۔ ابن عبدالبر نے کہا وہ ضمرہ بن حبیب ہے۔ مزید بیان آگے آئے گا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: میں دو سال ٹھہرا ہوا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان دو عورتوں کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بات کہنے کا ارادہ کیا تھا۔ مجھے ان کی ہیبت مانع تھی میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: وہ حفصہ اور

مسروق بن اجدع یہ ابوعائشہ وادی ہے ہمدانی، کوئی

ابو عبداللہ قرطبی یہ ان کے مولیٰ تھے مدنی، بربری، حافظ، مفسر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔

عائشہ تھیں۔ ایسا بن معاویہ نے کہا: ان لوگوں کی مثال جو قرآن پڑھتے ہیں اور اس کی تفسیر نہیں جانتے، اس قوم کی طرح ہے جن کے پاس ان کے بادشاہ کی کتاب رات کو آئی ہو اور ان کے پاس چراغ نہ ہو، انہیں خوف لاحق ہو اور وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ کتاب میں کیا ہے اور اس شخص کی مثال جو تفسیر جانتا ہے اس شخص کی طرح ہے جو ان کے پاس چراغ لایا ہو پھر انہوں نے نہ پڑھا ہو جو کچھ کتاب میں تھا۔

## قرآن کا حامل، اور وہ کون ہے اور جس نے حامل قرآن سے دشمنی کی وہ کون ہے

ابو عمر نے کہا (☆): ایک ضعیف و کمزور حدیث نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ تین اشخاص کی عزت اللہ تعالیٰ کے جلال کی تعظیم میں سے ہے: عدل کرنے والا امام، بوڑھا مسلمان اور قرآن کا حامل جو نہ تو غلو کرنے والا ہو اور نہ ہی قرآن سے انحراف کرنے والا ہو (1)۔ ابو عمر نے کہا: حمله القرآن سے مراد اس کے احکام اور اس کے حلال اور حرام کو جاننے والے ہیں اور جو کچھ اس میں ہے اس کو جاننے والے ہیں۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قرآن ہر چیز سے افضل ہے جس نے قرآن کی عزت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی توقیر و عزت کی اور جس نے قرآن کو خفیف سمجھا، اس نے اللہ کے حق کو خفیف سمجھا قرآن کے حاملین اللہ کی رحمت سے گھرے ہوئے ہوتے ہیں، اللہ کے کلام کی تعظیم کرنے والے ہوتے ہیں، اللہ کا نور پہننے والے ہوتے ہیں۔ جس نے ان سے دوستی کی اس نے اللہ تعالیٰ سے محبت کی اور جس نے ان سے دشمنی کی اس نے اللہ کے حق کو خفیف سمجھا۔

## حامل قرآن اور قاری قرآن کو قرآن کی تعظیم اور حرمت لازم ہے

ترمذی حکیم ابو عبد اللہ نے نوادر الاصول میں فرمایا: قرآن کی حرمت میں سے یہ ہے کہ اسے بے وضو نہ چھوئے نیز اسے با وضو پڑھے۔ اس کی حرمت سے ہے کہ تلاوت سے پہلے اپنے منہ کو پاک کرے اور مسواک اور خلل کرے کیونکہ یہ اس کا راستہ ہے۔ یزید بن ابی مالک نے کہا: تمہارے منہ قرآن کے راستوں میں سے ہیں پس تم انہیں پاک اور صاف کرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ اس کی تلاوت کے لئے ایسا لباس پہنے جیسے کسی امیر کے پاس جانے کے لئے پہنتا ہے کیونکہ وہ مناجات کرنے والا ہے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قراءت کے وقت قبلہ رخ ہو۔ ابو العالیہ نے کہا: جب قرآن پڑھے تو عمامہ باندھے، لباس پہنے، چادر اوڑھے اور قبلہ کی طرف رخ کرے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب بھی اسے بلغم آئے کلی کرے۔ شعبہ نے ابو حمزہ (☆ ☆) سے روایت کیا ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، اس کے سامنے ایک برتن ہو جب بھی بلغم کرے تو کلی کرے پھر تلاوت میں شروع ہو، جب بھی بلغم آئے تو کلی کرے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب اسے جمائی آئے تو قراءت سے رک جائے کیونکہ جب وہ تلاوت کر رہا ہوتا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی تنزیل الناس منازلہم، حدیث نمبر 4203، تقدیم و تاخیر کے ساتھ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ ابو حمزہ سے مراد عمر ان بن عطاء الاسدی ہے۔

☆ ابو عمر سے مراد ابن عبد البر ہے

ہے تو اپنے رب سے مخاطب ہوتا ہے اور باتیں کر رہا ہوتا ہے اور جمائی شیطان کی طرف سے ہے۔ مجاہد نے کہا: جب تجھے جمائی آئے جبکہ تو قرآن پڑھ رہا ہو تو قرآن کی تعظیم کی خاطر قرآن کی تلاوت سے رک جاتے کہ جمائی ختم ہو جائے۔ یہ عکرمہ نے کہا ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ وہ اس فعل میں قرآن کی عزت کر رہا ہے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ وہ تلاوت کی ابتدا میں **اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ** اور **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ** پڑھے اگر اس کی قراءت سورت کے آغاز سے ہو یا جس جگہ پہنچا ہو۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب قراءت شروع کرے تو بغیر ضرورت آدمیوں سے کلام کرتے ہوئے اسے لمحہ بہ لمحہ قطع نہ کرے اس کی حرمت سے یہ ہے کہ قراءت کے لئے تنہا بیٹھے تاکہ اس پر کلام کے ذریعے کوئی تلاوت کو قطع نہ کرے اور اس کے جواب کے ساتھ تلاوت کو ملانہ دے کیونکہ جب وہ ایسا کرے گا تو اس سے استعاذہ کی سلطانی زائل ہو جائے گی جو اس نے ابتدا میں کہا تھا۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ وہ آہستہ آہستہ تلاوت کرے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے قرآن میں اپنے ذہن اور فہم کو استعمال کرے تاکہ مفہوم کو سمجھے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ آیت وعدہ پر ٹھہرے اور اللہ تعالیٰ سے رغبت کرے اور اس کے فضل کا سوال کرے اور آیت وعید پر ٹھہرے اور اللہ تعالیٰ سے اس سے پناہ مانگے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ وہ قرآن کی امثال پر ٹھہرے اور ان کی پیروی کرے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ اس کے غرائب کو تلاش کرے۔ اس کی حرمت میں سے ہے کہ ہر حرف کو اس کی ادائیگی کا حق دے تاکہ کلام لفظ کے ساتھ مکمل ظاہر ہو کیونکہ ہر حرف کے بدلے اس کے لئے دس نیکیاں ہیں اور اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب قراءت کو ختم کرے تو اپنے رب کی تصدیق کرے یعنی صدق اللہ العظیم کہے اور رسول کریم کے پہنچانے کی شہادت دے اور یہ گواہی دے کہ یہ حق ہے۔ پس کہے صدقت ربنا، وبلغت رسلك و نحن على ذلك من الشاهدين - اللهم اجعلنا من شهداء الحق، القائمين بالقسط۔ پھر دعائیں مانگے اور اس کی حرمت سے ہے کہ جب تلاوت کرے تو ہر سورت سے کچھ آیات چن کر نہ پڑھے کیونکہ ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے حضرت بلال کو حکم دیا جبکہ وہ ہر سورت سے کچھ تلاوت کر رہے تھے آپ ﷺ نے اسے پوری سورت تلاوت کرنے کا حکم فرمایا اور کہا قال علیہ السلام۔

اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب قرآن کو رکھے تو کھلا ہو نہ چھوڑے اور کوئی کتاب قرآن کے اوپر نہ رکھے حتیٰ کہ ہمیشہ تمام کتب سے بلند ہو، وہ کتب علمی ہوں یا کوئی اور۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب تلاوت کرے تو قرآن کو اپنی گود میں رکھے یا سامنے کسی چیز پر رکھے، زمین پر نہ رکھے۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ تختی سے قرآن کو تھوک کے ساتھ صاف نہ کرے بلکہ پانی کے ساتھ دھوئے۔ اس کی حرمت سے ہے کہ جب پانی کے ساتھ دھوئے اور پانی کو نجاست والی جگہ سے اور ایسی جگہوں سے بچائے جو روندی جاتی ہیں کیونکہ اس غسالہ کی بھی حرمت ہے۔ سلف صالحین قرآن کے دھوون سے شفاء طلب کرتے تھے۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ قرآن کے اوراق بوسیدہ ہو جائیں تو انہیں دوسری کتب کی حفاظت کے لئے استعمال نہ کرے کیونکہ یہ عظیم جفا ہے بلکہ پانی کے ساتھ اسے منادے۔

اس کی حرمت سے یہ ہے کہ کوئی دن بھی قرآن کی زیارت سے خالی نہ ہو اور حضرت ابو موسیٰ فرماتے تھے: میں حیا کرتا



ہوں کہ میں کسی دن ایک مرتبہ اپنے رب کے عہد کو نہ دیکھوں۔ اس کی حرمت سے ہے کہ اپنی آنکھوں کو قرآن سے حصہ دے کیونکہ آنکھ نفس تک پہنچاتی ہے، نفس اور سینہ کے درمیان حجاب ہے اور قرآن سینہ میں ہوتا ہے جو زبانی تلاوت کرے گا تو اس کے کان سنیں گے پھر وہ نفس تک پہنچائیں گے اور جب وہ خط کو دیکھے گا تو آنکھ اور کان دونوں ادائیگی میں شریک ہوں گے اور یہ ادائیگی کے لئے زیادہ مناسب ہے کیونکہ آنکھ نے بھی کان کی طرح اپنا حصہ لیا۔ زید بن اسلم نے عطاء بن یسار سے انہوں نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنی آنکھوں کو عبادت سے حصہ دو۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! آنکھوں کا عبادت سے کیا حصہ ہے؟ فرمایا: قرآن کی طرف دیکھنا، اس میں غور و فکر کرنا اور اس کے عجائب کے وقت غیبت حاصل کرنا۔ مکحول نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری امت کی افضل عبادت دیکھ کر قرآن پڑھنا ہے اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے دنیا کی کسی چیز کے سامنے آنے کے وقت قرآن کی تاویل نہ کرے۔ ہمیں عمرو بن زیاد حنظلی نے بتایا، فرمایا: ہمیں ہشیم بن بشیر نے بتایا انہوں نے حضرت مغیرہ سے انہوں نے ابراہیم سے روایت کیا فرمایا: وہ دنیا کی کسی چیز کے سامنے آنے پر قرآن کی بطور حوالہ آیت پڑھنا مکروہ سمجھتے تھے۔ مثلاً جب کوئی شخص تیرے پاس آئے تو تو کہے: چُتْ عَلٰی قَدْرَ مَا تُؤْمِلُ (ط) کھانا سامنے آئے تو کہے: کُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ (الحاقہ) اس طرح کی اور مثالیں ہیں۔ اس کی حرمت سے ہے کہ یہ نہ کہے کہ فلاں سورت جیسے تو کہتا ہے سورۃ النحل، سورۃ البقرہ، سورۃ النساء، بلکہ کہے: وہ سورت جس میں نخل کا ذکر ہے وغیرہ۔ میں کہتا ہوں: یہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد الایقان من آخر سورۃ البقرۃ من قرء بھما فی لیلة کفتاہ (سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتیں جو انہیں رات کو پڑھے گا یہ اس کی کفایت کریں گی۔) کے مخالف ہے (۱)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قرآن کو الٹا تلاوت نہ کرے جیسے بچوں کے معلم کرتے ہیں وہ اپنے طور پر اس میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ اس میں مخالفت ہے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ اس کی قراءت گلے میں زور دے کر نہ نکالے جس طرح یہ ہمزین مبتدعین تکلفاً اپنے بدبودار مونہوں سے کلام کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بدعت ہے شیطان نے ان کی طرف اس کو ڈالا اور انہوں نے اس کو قبول کر لیا۔ اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ گانے کی طرز پر قرآن نہ پڑھے جس طرح اہل فسق پڑھتے ہیں۔ نہ تو نصاریٰ کی ترجیع میں پڑھے اور نہ رہبانوں کے نوحہ میں پڑھے۔ یہ سب راہ حق سے ہٹا ہے، یہ پہلے نذر چکا ہے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب قرآن لکھے تو عظیم الفاظ میں لکھے۔ ابو حکیمہ سے مروی ہے کہ وہ کوفہ میں قرآن لکھتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ گزرے تو آپ نے اس کی کتاب کی طرف دیکھا اور فرمایا: اپنی قلم کو موٹا کرو۔ میں نے قلم کو قوط دیا ایک طرف سے پھر میں نے لکھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے میری کتاب کو دیکھ رہے تھے۔ فرمایا: اس طرح اس کو روشن کر جس طرح اللہ نے اسے روشن کیا۔ اس کی حرمت سے ہے کہ پڑھتے ہوئے ایک دوسرے سے بلند نہ پڑھیں تاکہ دوسرے پر فساد پیدا کر دے حتیٰ کہ سننے والا اس پر ناراض ہو اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کیفیت طاری ہو

۱۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب من شہود المدینۃ بدار، حدیث نمبر 3707، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قرائتوں میں جھگڑا نہ کرے اور اپنے ساتھی کو یہ نہ کہے کہ یہ اس طرح نہیں ہے، ہو سکتا ہے وہ صحیح ہو اور قرآن میں جائز ہو تو یہ کتاب کا انکار کرنا ہوگا۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ بازاروں میں شور و غل اور لغوجگہ میں اور بیوقوفوں کے مجمع میں نہ پڑھے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کا ذکر کیا اور ان کی تعریف فرمائی کہ اذامزوا باللغو مزوا کراماً۔ یہ تو خود گزرنے پر ہے پھر تلاوت قرآن کرنے والے کا اہل لغو کے درمیان اور سبھا کے مجمع سے گزرنا کتنا منع ہوگا۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قرآن کو تکیہ نہ بنائے اور اس پر ٹیک نہ لگائے اور قرآن کسی کو دینے لگے تو قرآن کو پھینکے نہیں اور اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قرآن کو بالکل چھوٹا نہ کرے۔ اعمش نے ابراہیم سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ مصحف کو چھوٹا نہ بنایا جائے۔

میں کہتا ہوں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے ایک شخص کے ہاتھ میں چھوٹا سا قرآن دیکھا تو پوچھا: یہ کس نے لکھا ہے؟ اس نے کہا: میں نے۔ حضرت عمر نے اسے درے سے مارا اور فرمایا: قرآن کی تعظیم کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے مسیجد یا مصیحف کہنے سے منع فرمایا۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہ ملائے جو اس میں سے نہ ہو۔ اس کی حرمت میں سے ہے کہ وہ اسے نہ تو سونے سے مزین کرے اور نہ سونے سے لکھے تاکہ دنیا کی زینت ان کے ساتھ نہ ملے۔ مغیرہ نے ابراہیم سے روایت کیا ہے وہ مصحف کو سونے سے مزین کرنا اور لکھنا ناپسند سمجھتے تھے یا اس کی آیتوں کے سروں پر نشان لگانے اور قرآن کو چھوٹا بنانے کو ناپسند کرتے تھے۔ حضرت ابو درداء سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اپنی مساجد کو مزین کرو گے اور اپنے مصاحف کو زیور پہناؤ گے تو تم پر ہلاکت ہوگی (۱)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب انہوں نے قرآن کو چاندی سے مزین دیکھا، تم اس پر چوروں کو ابھارتے ہو حالانکہ زینت اس کے جوف میں ہے۔ اس کی حرمت میں سے ہے کہ زمین پر اور دیوار پر نہ لکھے جیسا کہ جدید مساجد میں ہوتا ہے۔ ہمیں محمد بن علی شقی نے اپنے باپ سے انہوں نے عبد اللہ بن مبارک سے انہوں نے سفیان سے انہوں نے محمد بن زبیر سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: میں نے حضرت عمر بن عبد العزیز کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر لکھی ہوئی ایک تحریر کے پاس سے گزرے، آپ نے ہذیل کے ایک نوجوان سے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ اللہ کی کتاب کے الفاظ ہیں جو یہودی نے لکھے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس پر لعنت کرے جس نے ایسا کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اپنے مقام پر رکھو۔ محمد بن زبیر نے کہا: حضرت عمر بن عبد العزیز نے ایک لڑکے کو دیوار پر قرآن لکھتے ہوئے دیکھا تو اسے مارا۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب کسی مریض کی شفا کے لئے قرآن کی تحریر کو دھوئے تو اسے کوڑے پر اور نجاست کی جگہ پر اور روندی جانے والی جگہ پر نہ ڈالے، بلکہ زمین کے کسی ایسے کونے میں ڈالے جہاں لوگوں کے پاؤں نہ پہنچیں۔ یا کسی پاک جگہ پر گڑھا کھودے تاکہ پانی اس گڑھے میں گرے یا کسی بڑی نہر میں اسے بہائے تاکہ اس کے پانی کے ساتھ بہہ جائے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ جب قرآن کو ختم کرے تو پھر سے شروع کرے تاکہ اسے چھوڑنے والے کی ہینٹ پر نہ ہو اسی وجہ

سے رسول اللہ ﷺ جب ختم فرماتے تو ابتدا سے پانچ آیات کی مقدار پڑھتے تاکہ مجبور کی ہیئت پر نہ ہوں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: ایک شخص آیا اور کہا: یا رسول اللہ! ﷺ کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: علیک بالاحوال المرتحل۔ (1) اس نے عرض کی: حضور! اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: صاحب قرآن اول سے آخر تک پڑھے پھر ابتداء سے شروع کرے جب بھی ختم کرے تو نئے سرے سے شروع کر دے۔

میں کہتا ہوں: مستحب ہے کہ جب قرآن ختم کرے تو اپنے گھر والوں کو جمع کرے۔ ابو بکر انباری نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں ادریس نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں خلف نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں وکیع نے بتایا انہوں نے مسعر سے انہوں نے حضرت قتادہ سے روایت کیا کہ حضرت انس بن مالک جب قرآن ختم کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کرتے اور دعا کرتے۔ ہمیں ادریس نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں خلف نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں جریر نے بتایا انہوں نے منصور سے انہوں نے حکم سے روایت کیا فرمایا: مجاہد اور عبدہ بن ابی لبابہ اور لوگ قرآن حکیم کا دور کرتے۔ جب ختم کرنے کا ارادہ کرتے تو ہماری طرف متوجہ ہوتے اور ہمیں بلاتے کیونکہ قرآن کریم کے ختم کے وقت رحمت نازل ہوتی ہے۔

ہمیں ادریس نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں خلف نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ہشیم نے بتایا انہوں نے عوام سے اور انہوں نے ابراہیم تیمی سے روایت کیا، فرمایا: جس نے دن کی ابتدا میں قرآن ختم کیا اس کے لئے شام تک فرشتے دعا کرتے رہتے ہیں اور جس نے رات کے آغاز میں قرآن ختم کیا اس پر صبح تک فرشتے درود بھیجتے رہتے ہیں۔ فرمایا: لوگ دن کے اور رات کے آغاز میں قرآن ختم کرنا مستحب سمجھتے تھے۔ اس کی حرمت میں سے یہ ہے کہ قرآن سے تعویذ نہ بنایا جائے اور پھر اس کے ساتھ بیت الخلا میں داخل ہو مگر یہ کہ وہ چمڑے یا چاندی وغیرہ کے غلاف میں ہو۔ پھر وہ اس طرح ہو جائے گا جیسے تیرے سینہ میں ہے۔ اس کی حرمت سے یہ ہے کہ جب وہ قرآن لکھے اور اس کو پیئے تو ہر سانس پر اللہ کا نام لے اور اس میں بڑی نیت کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نیت کی مقدار ہی اسے عطا فرمائے گا۔ لیث نے مجاہد سے روایت کیا، فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں کہ تو قرآن لکھے اور پھر مریض کو پلائے۔ ابو جعفر سے مروی ہے، فرمایا: جو اپنے دل میں سختی پائے تو وہ زعفران کے ساتھ پیالے میں سورہ یس لکھے پھر اسے پیئے۔

میں کہتا ہوں: اس کی حرمت سے ہے کہ چھوٹی سورت نہ کہا جائے۔ ابو العالیہ نے چھوٹی یا بڑی سورت کہنا ناپسند کیا اور جس کو یہ کہتے ہوئے انہوں نے سنا اسے فرمایا: تو اس سے چھوٹا ہے قرآن سارا عظیم ہے۔ مکی نے یہ قول ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابو داؤد نے حور روایت کیا ہے وہ اس کے معارض ہے۔ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے نقل کیا ہے۔ فرمایا: مفصل میں سے کوئی چھوٹی اور بڑی سورت نہیں ہے مگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس کے ساتھ لوگوں کو امامت کراتے سنا ہے۔ (2)

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء ان القرآن انزل علی سبعة احراف، حدیث نمبر 2872، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب من رأى التحفیف فیہا، حدیث 691، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز



## قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرنے اور اس پر جرأت کرنے پر

### وعید اور مفسرین کے مراتب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ کتاب اللہ کی تفسیر فرماتے تھے مگر چند آیات کی جو جبریل آپ کو سکھاتے تھے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس حدیث کا مطلب ہے قرآن کے مغیبات کے بارے میں، مجمل کی تفسیر وغیرہ کے بارے میں حضور تفسیر فرماتے تھے جن تک اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر رسائی ممکن نہ تھی۔ جملہ مغیبات میں سے وہ ہے اللہ تعالیٰ نے جن کا علم نہیں دیا ہے جیسے قیامت کے قیام کا وقت وغیرہ، جو الفاظ سے تلاوت کی جاتی ہیں، صور میں نوحات کی تعداد، آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی ترتیب۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میری طرف سے حدیث بیان کرنے سے بچو مگر جو تم جانتے ہو (وہ بیان کرو) جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا تو وہ آگ کے ٹھکانا میں اترے اور فرمایا: جو قرآن میں اپنی رائے کو دخل دے وہ آگ کے ٹھکانا میں اترے (1)۔ حضرت جندب سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے دی اور صحیح بھی بیان کیا تو اس نے خطا کی (2)۔ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے اور اس کے ایک راوی پر کلام کی گئی ہے۔ رزین نے یہ زائد بیان کیا ہے جس نے اپنی رائے دی اور غلطی کی تو اس نے کفر کیا۔ ابو بکر محمد بن قاسم بن بشار بن محمد انباری نحوی، لغوی نے اپنی کتاب الرد میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس کی حدیث کی دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں (1) جس نے قرآن کے مشکل الفاظ کی ایسی تفسیر بیان کی جو صحابہ، تابعین اور پہلے لوگوں کے مذہب سے معروف نہیں ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے اور قول اثبت ہے اور معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ جس نے قرآن کے بارے میں کوئی قول کیا جبکہ وہ جانتا ہے کہ حق اس کے علاوہ ہے تو وہ دوزخ کے ٹھکانا میں اترے، یتبوا کا معنی یبزل و یحل (اترنا) ہے۔ شاعر نے کہا۔

و ہوت فی صمیم معشرها فتم فی قومها مبدؤھا

اور حضرت جندب کی حدیث میں فرمایا: بعض اہل علم نے اس حدیث کو اس پر محمول کیا ہے کہ رائے سے مراد خواہش ہے یعنی جس نے قرآن کے بارے میں ایسا قول کیا جو اس کی خواہش کے موافق ہے اس نے ائمہ سلف سے نہیں لیا ہے پھر وہ ٹھیک بھی کہے گا تو خطا کرنے والا ہوگا کیونکہ اس نے قرآن پر ایسا حکم لگایا جس کی اصل معروف نہیں ہے اور وہ اہل اثر اور نقل کے مذاہب پر موقوف نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص سے کتاب اللہ کا کوئی معنی پوچھا گیا تو اس

1۔ مسند امام احمد، مسند عبد اللہ بن عباس، جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ما جاء فی الذی تفسیر القرآن برأیہ، حدیث نمبر 2875، مطبوعہ نیاہ القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب الکلام فی کتاب اللہ بغير علم، حدیث نمبر 3167، مطبوعہ نیاہ القرآن پبلی کیشنز

نے علماء کے قول میں غور و فکر کئے بغیر فوراً کوئی معنی بتا دیا جس کا تقاضا علم کے قوانین نحو اور اصول کرتے ہیں تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے کیونکہ لغوی علماء لغت کی وضاحت کرتے ہیں، نحوی علماء نحو کی وضاحت کرتے ہیں فقہاء اس کے معانی بیان کرتے ہیں اور ہر ایک علم و نظر کے قوانین پر مبنی اجتہاد سے کہتا ہے۔ اس صفت پر کہنے والا وہ اپنی رائے سے کہنے والا نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے اس قول کو بہت سے علماء نے اختیار کیا ہے۔ جس نے اپنے گمان اور دل کے خیال سے بات کی جبکہ اس نے اصول سے استدلال نہیں کیا تو وہ خطا کرنے والا ہے اور جس نے اس کا معنی مستنبط کیا محکم اور متفق اصول پر محمول کرتے ہوئے تو وہ ممدوح ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: تفسیر سماع پر موقوف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (النساء: 59)** علماء کا یہ قول فاسد ہے کیونکہ قرآن کی تفسیر کے متعلق نبی ان باتوں سے خالی نہ ہوگی یا تو اس سے نقل، مسموع اور استنباط کے ترک پر اکتفا کرنا مراد ہے یا کوئی دوسرا مفہوم مراد ہے اور یہ تو باطل ہے کہ اس سے یہ مراد ہو کہ کوئی شخص قرآن کے متعلق کلام نہ کرے مگر جو اس نے سنا ہے کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قرآن پڑھا اور اس کی تفسیر نئی وجوہ سے کی۔ جو انہوں نے کہا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر نہیں کہا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس کو بلایا اور دعا دی: **اللهم فقهه في الدين وعلمه التأويل**۔ اے اللہ! دین میں اسے سمجھ عطا فرما اور اسے تاویل سکھا۔ اگر تاویل پھر قرآن کی طرح مسموع ہوتی تو اس تخصیص کا کیا فائدہ تھا۔ یہ واضح ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے مزید بیان سورہ النساء میں ان شاء اللہ آئے گا۔ نبی کو دو وجہوں میں سے ایک پر محمول کیا جائے گا۔

### تفسیر بالرائی کی صورت

ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے کسی چیز میں رائے ہو اور اس کی طرف اس کا طبعی میلان اور خواہش ہو پھر وہ اپنی رائے اور خواہش کے مطابق قرآن کی تاویل کرے تاکہ وہ اپنی غرض کی صحت پر حجت پکڑے۔ اور اگر اس کی یہ رائے اور خواہش نہ ہوتی تو قرآن سے اس کے لئے یہ معنی ظاہر نہ ہوتا۔ یہ صورت کبھی تو علم کے ساتھ ہوتی ہے جیسے وہ شخص جو بعض آیات سے اپنی بدعت کی صحت پر حجت پکڑتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ آیت سے مراد یہ نہیں ہے لیکن اس کا مقصود اپنے خصم (مقابل) پر مسئلہ کو ملتبس کرنا ہوتا ہے۔ اور کبھی یہ جہالت کی بنا پر ہوتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ آیت احتمال رکھتی ہے اس کا فہم اس وجہ کی طرف مائل ہوتا ہے جو اس کی غرض کے موافق ہے۔ وہ اپنی رائے اور خواہش سے اس جانب کو رائج کرتا ہے۔ پس وہ اپنی رائے سے تفسیر کرتا ہے یعنی اس کی رائے اسے اس تفسیر پر ابھارتی ہے اگر اس کی یہ رائے نہ ہوتی تو یہ وجہ اس کے نزدیک رائج نہ ہوتی۔ کبھی اس کے لئے صحیح غرض ہوتی ہے اس کے لئے وہ قرآن سے دلیل طلب کرتا ہے اور وہ اس پر ایسی بات سے استدلال کرتا ہے جو معلوم ہے کہ اس سے یہ ارادہ کیا گیا ہے جیسے سخت دل کو مجاہدہ کی طرف کوئی بلاتا ہے اور کہتا ہے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ (طہ)** اور اس کے دل کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ فرعون سے یہی مراد ہے۔ یہ جنس بعض واعظین مقاصد صحیحہ میں کلام کی تحسین اور سامعین کی رغبت کے لئے استعمال کرتے ہیں اور یہ ممنوع ہے

کیونکہ یہ فہم میں قیاس ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ اور بھی باطنیہ، لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے اور اپنے باطل مذاہب کی طرف دعوت دینے کے لئے مقاصد فاسدہ میں استعمال کرتے ہیں اور قرآن کو اپنی رائے کے مطابق اتارتے ہیں اور اپنے مذہب کے مطابق کرتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ قرآن سے یہ مراد نہیں۔ یہ فنون تفسیر بالرائے سے منع کی ایک وجہ ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ غرائب قرآن کے متعلق نقل اور سماع کے بغیر ظاہر عربی کے ساتھ جلدی سے قرآن کی تفسیر بیان کرنا اور قرآن میں جو مبہم اور مبدل الفاظ ہیں اور جو قرآن میں اختصار، حذف، انضمام اور تقدیم و تاخیر ہے اس کے اظہار میں نقل و سماع کا اظہار نہ کر کے قرآن کی تفسیر کرنا۔ جو تفسیر کے ظاہر کو محکم نہیں کرتا اور صرف حربی جاننے پر حسانی کے استنباط کی طرف جلدی کرتا ہے وہ اکثر غلطی کرتا ہے اور تفسیر القرآن بالرائے کرنے والوں کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ابتدا ظاہر تفسیر میں نقل اور سماع کا اعتبار ضروری ہے تاکہ اس میں غلطیوں سے محفوظ رہے اس کے بعد فہم اور استنباط کو وسعت دے۔ غرائب وہ ہوتے ہیں جو صرف سماع سے سمجھے جاسکتے ہیں ظاہر احکام سے پہلے باطن تدبیر کی کوئی امید نہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ اتَيْنَا شُورَا النَّاقَةِ مُبْصِرًا فَظَلَمُوا بِهَا** (الاسراء: 59) اس کا معنی ہے: آیت مبصرۃ فظلموا انفسهم بقتلہا۔ پس ظاہر عربی کی طرف دیکھنے والا گمان کرے گا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اونٹنی روشن تھی اور اسے معدوم نہیں ہوگا کہ کس کے ساتھ انہوں نے ظلم کیا حالانکہ انہوں نے دوسروں سے اور اپنے آپ نے ظلم کیا۔ یہ حذف اور انضمام سے ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں کثیر ہیں۔ ان دو وجہوں کے علاوہ نو مبیحہ لاحق نہیں ہے۔ واللہ اعلم

ابن عطیہ نے کہا: بڑے سلف صالحین جیسے حضرات سعید بن مسیب، عامر شعبی وغیرہما تفسیر قرآن کو بڑا سمجھتے تھے اور ادراک اور تقدم کے باوجود احتیاط اور تقویٰ کی بنا پر تفسیر قرآن سے توقف کرتے تھے۔ ابو بکر انباری نے کہا: گزشتہ ائمہ کرام قرآن کے مشکل کی تفسیر سے بچتے تھے۔ بعض تو کہتے تھے کہ ہو سکتا ہے وہ قرآن کی ایسی تفسیر کرے جو اللہ تعالیٰ کی مراد کے موافق نہ ہو پھر وہ اس قول سے پیچھے ہٹ جاتا تھا اور بعض اس سے ڈرتے تھے کہ وہ تفسیر میں امام بنا دیا جائے اور اس کے مذہب پر بنیاد رکھی جائے اور اس کے طریقہ پر اکتفا کیا جائے۔ شاید بعد میں آنے والا اسی حرف کی اپنی رائے سے تفسیر بیان کرے اور اس میں خطا کرے اور ہے سلف میں سے ذہاں امام تفسیر قرآن بالرائے میں میرا امام ہے۔ حضرت ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے، فرمایا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے قرآن کے ایک حرف کی تفسیر کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اور میں کہاں جاؤں گا اور میں کیسے کروں گا جب میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ایک حرف کے بارے میں ایسی بات کہہ دوں گا جو اللہ تعالیٰ کی مراد نہ ہوگی۔ ابن عطیہ نے کہا: سلف صالحین میں بہت سی تعداد ہے جنہوں نے قرآن کی تفسیر کی وہ اس سلسلہ میں مسلمانوں پر رحمت و مہربانی کرنے والے تھے۔ صدر المفسرین اور مفسرین کے مؤید حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ تھے، ان کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس تھے، انہوں نے اس کام کے لیے تجدد اختیار کیا اور اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ علماء نے ان کی پیروی کی جیسے حضرات مجاہد، سعید بن مسیب وغیرہما، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تفسیری نکات جو محفوظ ہیں ان کی نسبت حضرت عبداللہ بن عباس سے زیادہ محفوظ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:



میں نے قرآن کی تفسیر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لی ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کی تعریف کرتے تھے اور ان سے تفسیر لینے پر برا بیگنہ کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے: عبد اللہ بن عباس کتنا بہترین ترجمان قرآن ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے متعلق فرمایا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما گویا باریک پردے سے غیب کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر ان کے بعد حضرات عبد اللہ بن مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت، عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم ہیں جو صحابہ سے لیا گیا وہ عمدہ ہے کیونکہ وہ نزول قرآن کے وقت موجود تھے اور قرآن ان کی لغت میں نازل ہوا۔ حضرت عامر بن واثلہ سے مروی ہے: میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا وہ خطبہ دے رہے تھے میں نے ان کو خطبہ کے دوران یہ کہتے ہوئے سنا: تم مجھ سے پوچھو اللہ کی قسم! تم مجھ سے کسی چیز کے بارے میں نہیں پوچھو گے جو قیامت تک ہونی ہے مگر میں تمہیں اس کے متعلق بیان کروں گا۔ تم مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھو اللہ کی قسم! کوئی آیت ایسی نہیں مگر میں جانتا ہوں کہ یہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو، ہموار زمین پر نازل ہوئی یا پہاڑ پر، ابن الکواء کھڑا ہوا اور کہا: اے امیر المؤمنین! الذاریات ذروا کیا ہے اور حدیث ذکر کی (1)۔ منہال بن عمرو سے مروی ہے، فرمایا: حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: اگر مجھے کسی کے بارے میں علم ہو کہ وہ مجھ سے کتاب اللہ زیادہ جانتا ہے مجھے اس تک سواریاں پہنچائیں گی تو میں اس کے پاس جاؤں گا۔ کسی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے کہا: کیا تم حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نہیں ملے ہو؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں میں ان سے ملا ہوں (2)۔ مسروق سے مروی ہے، فرمایا: میں نے حضرت محمد بن حنفیہؓ کے صحابہ کو علم میں بڑا چھوٹا پایا، ایک عالم اپنے سے بڑے عالم سے روایت کرتا ہے ایک عالم، دو عالموں سے روایت کرتا ہے۔ ان میں سے ایک عالم اگر لوگوں پر وارد ہو تو ان سب کو کھینچ لائے اور حضرت عبد اللہ بن مسعود ان علماء میں سے تھے۔ یہ مناقب ابوبکر انباری نے کتاب الرد میں ذکر کیے ہیں اور فرمایا: اخاذ عربوں کے نزدیک وہ جگہ ہوتی ہے جہاں پانی روکا جاتا ہے جیسے تالاب۔ ابوبکر نے کہا: ہمیں احمد بن یثیم بن خالد نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں احمد بن عبد اللہ بن یونس نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں سلام نے بتایا انہوں نے زید العجمی سے روایت کیا، انہوں نے ابی الصدیق الناجی سے انہوں نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت پر زیادہ رحم کرنے والا ابوبکر ہے، اللہ کے دین میں سب سے مضبوط عمر ہے، حیا کے اعتبار سے سچا عثمان ہے اور سب سے بڑا قاضی علی ہے اور زید سب سے زیادہ علم وراثت کو جاننے والا ہے اور کتاب اللہ کا زیادہ قاری ابی بن کعب ہے، حال و حرام کو زیادہ جاننے والا معاذ بن جبل ہے، اس امت کا امین ابوعبیدہ بن جراح ہے اور ابو ہریرہ علم کا برتن ہے، سلمان ایک علم کا سمندر ہے جس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا اور زمین و آسمان میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے زیادہ سچا کوئی نہیں۔ (3)

ابن عطیہ نے کہا: تابعین میں سے مفسرین حضرات حسن بصری، مجاہد، سعید بن جبیر، علقمہ ہیں۔ مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پر قراءت کی ہر آیت پر وقوف کیا اور ہر آیت کو سمجھ کر پڑھا، ان کے بعد عکرمہ اور ضحاک ہیں۔ اگرچہ ضحاک

1۔ البحر والتحدیل، تعارف علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، 2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل اصحاب، باب من فضائل عبد اللہ بن مسعود و امہ

3۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل۔ ایضاً، 1، 2، 3، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 150-151، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نہیں ملا تھا انہوں نے ابن جبیر سے علم حاصل کیا ہے اور عامر شعبی سدی اس پر اور ابو صالح پر طعن کرتے تھے کیونکہ وہ انہیں کوتاہ نظر سمجھتے تھے۔

میں کہتا ہوں: یحییٰ بن معین نے کہا: کلبی کوئی شے نہیں ہے۔ یحییٰ بن سعید قطان نے سفیان سے روایت کیا ہے، فرمایا: کلبی نے کہا ابو صالح نے مجھے ایک مرتبہ کہا جو میں تجھے بتاؤں تو وہ جھوٹ ہے۔ حبیب بن ابی ثابت نے کہا: ہم اسے جھوٹا کہتے تھے یعنی ابو صالح مولیٰ ام ہانی اور فارسی لغت میں زیادہ جھوٹ بولنے والے کو دروغ زن کہا جاتا ہے۔

پھر کتاب اللہ کی تفسیر کو ہر خلف سے عادل لوگوں نے حاصل کیا جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اس علم کو ہر خلف سے ان کے عادل لوگ حاصل کریں گے اور اس سے غالی لوگوں کی تحریف، مبطلین کے مذہب اختیار کرنے اور جاہلوں کی تاویلوں کو دور کریں گے۔ اس حدیث کو ابو عمرو وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ خطیب ابو بکر احمد بن علی بغدادی نے کہا: یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے شہادت ہے کہ وہ دین کی پہچان، مسلمانوں کے ائمہ، تحریف سے شریعت کی حفاظت کریں گے، باطل سے بچائیں گے اور بیوقوفوں کی تاویل کا رد کریں گے، ان کی طرف رجوع واجب ہے اور دین کے معاملہ میں اعتماد ان پر ہوگا۔ ﷺ

ابن عطیہ نے کہا: تفسیر کے بارے میں علماء نے تالیفیں کیں جیسے عبدالرزاق، مفضل، علی بن ابی طلحہ بخاری وغیرہم۔ پھر محمد بن جریر نے لوگوں پر مختلف تفاسیر کو جمع کیا، ان سے بعید کو قریب کیا اور اسناد کے ذریعے شفا دی۔ متاخرین مفسرین میں ابو اسحاق الزجاج ابو علی فارسی ہیں۔ رہے ابو بکر نکاش، ابو جعفر نحاس، اکثر لوگوں نے ان کی غلطیاں نکالیں اور ان کے طریقے پر کئی بن ابی طالب تھے۔ ابو العباس المہدوی تالیف کو پختہ کرنے والے تھے۔ یہ سب مجتہد تھے اور ماجور تھے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے اور ان کے چہروں کو شاداب رکھے۔

## کتاب کی وضاحت سنت سے کرنا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ** (النحل: 44) (اور اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر، آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ** (النور) (پس ڈرنا چاہئے انہیں جو خلاف ورزی کرتے ہیں رسول ﷺ کے فرمان کی کہ انہیں کوئی مصیبت نہ پہنچے یا انہیں دردناک عذاب نہ آئے)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ** (الشوری: 52) (بلاشبہ آپ رہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف) اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں حضور علیہ السلام کی اطاعت کو فرض قرار دیا اور ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ ملایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَمَا أَسْأَلُكُمْ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا** (الحشر: 7) (اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرمادیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ)۔

ابن عبدالبر نے کتاب العلم میں عبدالرحمن بن یزید سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک محرم (احرام باندھنے والا) کو

دیکھا جس نے کپڑے پہنے ہوئے تھے تو آپ نے محرم کو منع کیا۔ اس محرم نے کہا: اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کوئی آیت بطور دلیل پیش کرو تو میں اپنے کپڑے اتار دوں گا تو عبدالرحمن نے یہ آیت پڑھی: وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر: 7) اور رسول کریم جو تمہیں عطا فرمادیں وہ لے لو اور جن سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ۔

ہشام بن حجیر سے مروی ہے، فرمایا: طاؤس عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ چھوڑ دو۔ طاؤس نے کہا: حضور نے انہیں سنت بنانے سے منع فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد نماز سے منع فرمایا ہے۔ میں نہیں جانتا ان دو رکعتوں پر تجھے عذاب دیا جائے گا یا اجردیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا كَانَ لِلْمُؤْمِنِ وَلَا الْمُؤْمِنَةِ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (الاحزاب: 36) (نہ کسی مومن مرد کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ کسی مومن عورت کو کہ جب فیصلہ فرمادے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا، تو پھر انہیں کوئی اختیار ہوا اپنے اس معاملہ میں۔

ابوداؤد نے مقداد بن معدیکرب سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، آپ نے فرمایا: خبردار! مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل دی گئی ہے۔ خبردار! قریب ہے کوئی شخص تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے تمہیں اس قرآن کے بارے میں کہے جو تم اس میں حلال پاؤ اسے حلال کرو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے حرام کرو۔ خبردار! تمہارے لئے گھروں کے رہنے والے گدھے اور ذی ناب درندے اور معاہد کی گری پڑی چیز حلال نہیں ہے مگر یہ کہ اس چیز کا مالک اس چیز سے مستغنی ہو جائے۔ جو کسی قوم کے پاس آئے، اس قوم پر اس کی مہمان نوازی کرنا ہے اگر وہ مہمان نوازی نہ کرے تو اس کے لئے جائز ہے وہ اپنی مہمان نوازی کی مثل ان سے لے لے۔ (1)

خطابی نے کہا اذیت الکتاب و مشلہ معہ (2) کا ارشاد کئی احتمال رکھتا ہے: ایک یہ کہ اس کا معنی ہے مجھے وحی باطن عطا کی گئی ہے جو غیر متلو ہے جیسا کہ مجھے وحی ظاہر متلو عطا کی گئی ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ مجھے کتاب بطور وحی عطا کی گئی ہے جو تلاوت کی جاتی ہے اور اس کی مثل بیان بھی عطا کیا گیا ہے یعنی آپ کو اجازت دی گئی ہے کہ آپ اسے بیان فرمائیں جو کتاب میں ہے۔ پس عام کریں، خاص کریں، اس میں زیادتی کریں اور کتاب میں جو کچھ ہے اسے شریعت بنائیں۔ پس اس پر عمل واجب ہوگا اور اس کا قبول کرنا لازم ہوگا جیسا کہ ظاہر جو قرآن سے تلاوت کیا جاتا ہے (اس کا قبول کرنا لازم ہے) اور یوشک رجاء شعبان اس ارشاد سے آپ ان سنن کی مخالفت سے ڈر رہے ہیں جن کو آپ نے مقرر فرمایا جن کا قرآن میں ذکر نہیں ہے جیسا کہ خوارج اور روافض کا نظریہ ہے کہ وہ ظاہر قرآن کو پکڑتے ہیں اور ان سنن کو ترک کرتے ہیں جو کتاب کے بیان کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہیں۔ فرمایا: وہ لوگ حیران ہوئے اور گمراہ ہوئے۔ فرمایا: الاریکہ پلنگ کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: اریکہ نہیں بولا جاتا مگر جب وہ پاکی میں ہو۔ فرمایا: اریکہ سے مراد مال و دولت والے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گھروں کو لازم پکڑا اور علم حاصل نہ کیا۔ الا ان یستغنی عنها صاحبها کا مطلب یہ ہے کہ جس کی چیز گم ہوئی ہے وہ اس سے نہ لے جس



نے وہ چیز اٹھائی ہے، اس سے عدم دلچسپی کی بنا پر۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **فَكَفَرُوا وَتَوَلَّوْا وَاسْتَغْنَوْا** (التغابن: 6) اس کا معنی ہے ان سے استغنا کی بناء پر اللہ نے انہیں فراموش کر دیا۔

اور **فلله ان يعقبهم** مثل قراہ یہ اس کے لئے حکم ہے جو مضطر اور مجبور ہو اور کھانا نہ پائے اور اسے جان تلف ہونے کا اندیشہ ہو۔ پس اس کے لئے جائز ہے کہ جس مہمان نوازی سے انہوں نے اسے محروم کیا اس کی مقدار ان کے مال سے لے لے۔ **يعقبهم** مشدود اور معاقبہ سے مخفف دونوں طرح مروی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ** (النحل: 126) یعنی غلبہ تمہارے لئے ہو پھر تم ان سے مال غنیمت کو اسی طرح مہمان نوازی کی مقدار سے ان کے مال سے لے لو۔ فرمایا: حدیث کے اندر یہ دلیل ہے کہ حدیث کو قرآن پر پیش کرنے کی ضرورت نہیں جب وہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو تو وہ خود حجت ہے۔ فرمایا: جو بعض علماء نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب تمہارے پاس کوئی حدیث آئے تو اسے کتاب اللہ پر پیش کرو اگر وہ اس کے موافق ہے تو اسے قبول کر لو اور اگر موافق نہیں ہے تو اسے رد کر دو۔ یہ حدیث باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

پھر آپ ﷺ کے بیان کی دو قسمیں ہیں۔ کتاب میں جو مجمل ہے اس کا بیان جیسے پانچ نمازوں کے لئے ان کے اوقات، سجود، رکوع اور سارے احکام کا بیان اور زکوٰۃ کی مقدار، اس کا وقت، کس مال سے زکوٰۃ لی جائے گی ان سب چیزوں کا بیان، اسی طرح مناسک حج کا بیان۔ آپ ﷺ نے جب حج فرمایا تو فرمایا: مجھ سے مناسک حج سیکھ لو (1) اور فرمایا: تم نماز پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا (2)۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ ابن مبارک نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک شخص سے کہا: تو ایک احمق آدمی ہے کیا تو اللہ کی کتاب میں ظہر کی چار رکعتیں پاتا ہے جن میں جہری قراءت نہیں ہے۔ پھر اس پر نماز، زکوٰۃ وغیرہ کو شمار کیا پھر فرمایا: کیا تو یہ چیزیں کتاب اللہ میں تفسیر سے پاتا ہے۔ کتاب اللہ میں یہ چیزیں مبہم ہیں اور سنت اس کی مفسر ہے۔ امام اوزاعی نے حسان بن عطیہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: وحی رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتی تھی اور جبریل سنت کے ساتھ آتے تھے جو اس کی تفسیر کرتی تھی۔ سعید بن منصور نے روایت کیا ہے، ہمیں عیسیٰ بن یونس نے اوزاعی سے روایت کر کے بتایا انہوں نے مکحول سے روایت کیا، فرمایا: قرآن کو سنت کی زیادہ ضرورت ہے نسبت سنت کو قرآن کی ضرورت کے۔ اوزاعی سے یہی مروی ہے۔ فرمایا: یحییٰ بن ابی کثیر نے کہا: سنت کتاب پر فیصلہ کرنے والی ہے جب کہ کتاب سنت پر فیصلہ کرنے والی نہیں۔ فضل بن زیاد نے کہا: میں نے احمد بن حنبل کو سنا جبکہ اس حدیث کے بارے میں ان سے پوچھا گیا جس میں ہے کہ سنت کتاب اللہ پر فیصلہ کرتی ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا۔ میں تو کہتا ہوں: سنت کتاب کی تفسیر کرتی ہے اور اسے بیان کرتی ہے۔

دوسرا بیان: وہ کتاب کے حکم پر زیادتی کرنا ہے جیسے پھوپھی اور خالہ کے عقد میں ہوتے ہوئے ان کی بھتیجی اور بھانجی سے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب رمی جمرۃ العقبة الخ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمساقرین، حدیث نمبر 595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نکاح کرنا حرام ہے، پالتو گدھوں کا اور ذی ناب درندوں کا حرام کرنا اور ایک گواہ کے ساتھ قسم سے فیصلہ کرنا، اس کا بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

کتاب اللہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو سمجھنے اور سیکھنے کی کیفیت اور جو وارد ہے کہ

اس پر آسانی کی گئی جس نے اس پر عمل پر پیش قدمی کی اور حفظ نہ کیا

ابو عمرو الدانی نے کتاب ”البيان“ میں اپنی سند سے حضرات عثمان، ابن مسعود اور ابی بنیہیم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دس آیات پڑھاتے تھے اور دوسری دس آیات کی طرف تجاوز نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ وہ جان لیتے تھے جو ان میں عمل ہوتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں قرآن اور عمل اکٹھا سکھاتے تھے۔ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے عطاء بن سائب سے انہوں نے ابو عبد الرحمن سلمیٰ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم جب قرآن کی دس آیات سیکھتے تھے تو بعد والی دس آیات نہ سیکھتے تھے حتیٰ کہ ہم ان آیات کا حلال، حرام، امر اور نہی پہچان لیتے تھے۔ مؤطا امام مالک میں ہے، فرمایا: انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر آٹھ سال تک سورہ بقرہ کو سیکھتے رہے۔ ابو بکر احمد بن علی بن ثابت الحافظ نے اپنی کتاب المسمیٰ میں مرداس بن محمد ابو بلال اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں مالک نے بتایا انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا، فرمایا: حضرت عمر نے بارہ سال میں سورہ بقرہ سیکھی جب اسے ختم کیا تو ایک اونٹ ذبح کیا (1)۔ ابو بکر انباری نے ذکر کیا ہے، فرمایا: مجھے محمد بن شہریار نے بتایا ہمیں حسین بن اسود نے بتایا ہمیں عبید اللہ بن موسیٰ نے بتایا انہوں نے زیاد بن ابی مسلم ابو عمرو سے روایت کیا انہوں نے زیاد بن مخراق سے روایت کیا، فرمایا: حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: ہم پر قرآن کے الفاظ حفظ کرنا مشکل تھا اور ہم پر اس پر عمل کرنا آسان تھا اور ہمارے بعد والوں پر قرآن کا حفظ کرنا آسان ہے اور اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔

ابراہیم بن موسیٰ نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا: ہمیں یوسف بن موسیٰ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں فضل بن دکین نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں اسماعیل بن ابراہیم بن مہاجر نے بتایا انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے مجاہد سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا، فرمایا: اس امت کی ابتدا میں اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کوئی فاضل قرآن سے ایک سورت وغیرہ یاد کرتا تھا اور انہیں قرآن پر عمل بخشا گیا تھا اور اس امت کا آخر ان میں بچے، بوڑھے اور اندھے قرآن پڑھیں گے اور انہیں عمل کی توفیق نہ ہوگی۔ مجھے حسن بن وہاب، ابو محمد بن ابی عنبر نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں ابو بکر بن حماد مقری نے بتایا فرمایا: میں نے خلف بن ہشام البزار سے سنا وہ فرما رہے تھے: میں گمان کرتا ہوں ہمارے ہاتھوں میں قرآن خالی ہے۔ اس طرح کہ ہم روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے سورہ بقرہ دس سے زائد سالوں میں یاد کی پھر جب حفظ کر لی تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک اونٹ ذبح کیا اور ہمارے زمانہ میں ایک بچہ میرے سامنے بیٹھتا ہے اور تہائی قرآن تلاوت کر لیتا

ہے اس سے ایک حرف بھی نہیں چھوڑتا میرا خیال ہے ہمارے سامنے قرآن خالی ہے۔ محدثین نے کہا: طالب علم کے لئے مناسب نہیں کہ حدیث کو سمجھے بغیر صرف یاد کرے اور لکھے۔ ورنہ وہ لا حاصل کام میں اپنے نفس کو تھکانے والا ہوگا، اس کا حدیث کی حفاظت کرنا بتدریج تھوڑا تھوڑا اور دن اور رات میں ہو۔ یہ شعبہ، ابن علیہ اور معمر جیسے محدثین سے مروی ہے۔ معمر نے کہا: میں نے زہری کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو اکٹھا علم حاصل کرے گا اکٹھا ہی ضائع کرے گا۔ علم کو ایک ایک دو دو حدیث یاد کر کے حاصل کیا جائے۔ واللہ اعلم۔ حضرت معاذ بن جبل نے کہا: تم جو چاہو علم حاصل کرو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے علم پر ہرگز اجر نہ دے گا حتیٰ کہ تم عمل کرو۔ ابن عبدالبر نے کہا: نبی کریم ﷺ سے معاذ کے قول کی مثل عباد بن عبدالصمد کی روایت سے مروی ہے اس میں یہ زیادتی ہے کہ علماء کی بہت (ارادہ) درایت ہے اور سفہاء (بیوقوفوں) کا ارادہ روایت ہے۔ انہوں نے موقوف روایت کی ہے اور موقوف اس کی روایت سے اولیٰ ہے جنہوں نے مرفوع روایت کی ہے۔ عباد بن عبدالصمد ان لوگوں میں سے نہیں جن سے حجت پکڑی جائے۔ کتنا اچھا کہا ہے جس نے علم کی فضیلت، کتاب عزیز و روشن سنت کے شرف کے بارے میں کہا ہے۔ عربی اشعار۔

ترجمہ: علوم اگرچہ ان کے محاسن عظیم ہیں ان سب کا تاج وہ ہے جس پر ایمان لانا واجب ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جس کی حفاظت وہ خود کرتا ہے، اس کے بعد وہ علم ہے جس نے تکالیف کو دور کیا۔ وہ مصطفیٰ کریم ﷺ کی حدیث ہے اس میں نبوت کا نور ہے، شریعت اور ادب ہے۔ اس کے بعد علوم کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ تو اسے علم کو ترجیح دینے والے! تو اپنے لئے اختیار کر اور علم خزانہ ہے تو اس کو معادن میں پائے گا اے طالب! تلاش کر اور کتب کا مطالعہ کر اور کتاب اللہ کو سمجھ کر پڑھ اس میں تمام علوم ہیں اس میں غور و فکر کرنے سے عجب چیزیں دیکھے گا۔ اور پڑھ، حدیث مصطفیٰ سے تجھے ہدایت کی گئی ہے اور اپنے مولا سے سوال کر جو تیری خواہش ہو وہ تیری ہر خواہش پوری کرے گا۔ جس نے دین کے علم کا ذائقہ چکھا وہ خوش ہوا، اس نے بیان کیا تو علم میں اضافہ ہوا اور خوش ہوا۔

**نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا جو آسان ہو وہ پڑھو**

مسلم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ بنی غفار کے غدیر کے پاس تھے۔ جبریل امین آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا: اللہ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ اپنی امت پر ایک حرف پڑھیں۔ آپ ﷺ نے کہا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر دوبارہ جبریل امین آئے اور کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ دو حرفوں پر تلاوت کریں، آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر جبریل امین تیسری مرتبہ آئے اور کہا: اللہ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ اپنی امت پر تین حروف پڑھیں۔ آپ ﷺ نے کہا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر جبریل امین چوتھی مرتبہ آئے اور کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ اپنی امت پر قرآن سات



حروف پر پڑھیں۔ جس حرف پر پڑھیں گے، درست ہوگا (1)۔ ترمذی نے ان سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ جبریل امین سے ملے اور کہا: اے جبریل! مجھے ایک امی امت کی طرف بھیجا گیا ہے، اس میں بوڑھے، شیخ کبیر، غلام، لونڈی اور وہ افراد ہیں جنہوں نے کبھی کتاب نہیں پڑھی۔ جبریل نے کہا: اے محمد! قرآن سات حروف پر اتارا گیا ہے (2)۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث صحیح ہے اور بخاری، مسلم، مؤطا، ابوداؤد، نسائی وغیرہ اہمات الکتب جو مصنفات اور مسندات میں سے لکھی گئی ہیں ان میں حضرت ہشام بن حکیم کا واقعہ مذکور ہے (☆)، باب کے آخر میں مکمل طور پر آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

”سات حروف پر نازل ہونے“ کے متعلق علماء کے پینتیس اقوال ہیں، ان کو ابو حاتم محمد بن حبان بستی نے ذکر کیا ہے۔ ہم ان میں سے اس کتاب میں صرف پانچ اقوال ذکر کریں گے۔

پہلا قول: یہ وہ قول ہے جس پر اکثر اہل علم ہیں مثلاً حضرات سفیان بن عیینہ، عبد اللہ بن وہب، طبری، طحاوی وغیرہم۔ اس سے مراد مختلف الفاظ کے ساتھ متقارب معانی کی سات وجوہ مراد ہیں مثلاً اقبل، تعال اور ہلم (ان سب کا معنی ہے آؤ)۔ طحاوی نے کہا: ابوبکرہ کی حدیث میں جو ہے وہ اس کی وضاحت کرتا ہے۔ فرمایا: جبریل امین نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: ایک حرف پر پڑھو اور میکائیل نے کہا: حضور ﷺ کو مزید دو تو جبریل نے کہا: دو حروف پر پڑھو۔ میکائیل نے کہا: مزید دو حتیٰ کہ سات حروف تک پہنچے اور کہا: پڑھو، ہر ایک شافی اور کافی ہے مگر آیت رحمت، آیت عذاب سے یا آیت عذاب، آیت رحمت سے خلط ملط نہ ہو، جیسے ہلم، تعال، اقبل، اذهب، اسرع، عجل۔

ورقاء نے ابن ابی نجیح سے انہوں نے مجاہد سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے انہوں نے حضرت ابی بن کعب سے روایت کیا ہے وہ لِّلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُوا (الحج: 13) کو للذین آمنوا امهلونا، للذین آمنوا اخرونا، للذین آمنوا ارقبونا پڑھتے تھے۔ اسی سند کے ساتھ ابی سے مروی ہے کہ وہ کُلَّمَا أَصْلَأَ لَهُمْ مَشُوا فِيهِ (البقرہ: 20) مردافیہ، سعوافیہ پڑھتے تھے۔ بخاری اور مسلم میں ہے زہری نے کہا: یہ حروف ایک امر میں حرام، حلال میں مختلف نہیں ہوتے۔ طحاوی نے کہا: حروف میں لوگوں کے لئے وسعت رکھی گئی کیونکہ وہ دوسروں کی لغت پر قرآن حاصل کرنے پر عاجز تھے کیونکہ وہ امی تھے لکھنا نہیں جانتے تھے مگر تھوڑے جب کسی ایک لغت والے پر گراں ہوتا کہ وہ دوسری لغت کی طرف پھرے، اگر وہ اس کا قصد کرتا تو اس کے لئے بہت عظیم مشقت ہوتی۔ پس ان کے لئے الفاظ کے اختلاف میں وسعت پیدا کی گئی جبکہ معنی ایک ہو۔ وہ اسی نہج پر تھے حتیٰ کہ ان میں سے لکھنے والے زیادہ ہو گئے اور ان کی لغات رسول اللہ ﷺ کی لغت کی طرف پھر گئیں۔ پس وہ آپ کے الفاظ کی حفاظت پر قادر ہو گئے۔ پس اس وقت انہیں اس کے خلاف پڑھنے کی گنجائش نہ تھی۔ ابن عبد البر نے کہا: اس سے ظاہر ہوا کہ یہ سات حروف ایک خاص وقت میں ضرورت کے لئے تھے جن کا تقاضا موجود تھا۔ پھر یہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن وما يتعلق به، باب بیان القرآن علی سبعة احرف

2۔ جامع ترمذی، کتاب القراءۃ، حدیث 2868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

۱۲۔ صحابی بن صحابی یعنی حکیم بن حزام نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی سالوں میں وصال فرمایا، السیر، جلد 3، صفحہ 51

ضرورت ختم ہوگئی اور سات حروف والا حکم بھی اٹھ گیا اور ایک حرف پر پڑھنا واپس آ گیا۔

ابوداؤد نے حضرت ابی سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا: اے ابی! مجھے قرآن پڑھایا گیا، مجھے کہا گیا ایک یا دو حروف پر؟ فرشتہ جو میرے ساتھ تھا اس نے کہا: تم کہو دو حرفوں پر۔ پھر مجھے کہا گیا: دو حرفوں پر یا تین حروف پر؟ میرے ساتھی فرشتے نے کہا: تم کہو تین حروف پر حتیٰ کہ سات حروف پر معاملہ پہنچا۔ پھر کہا: اس میں سے کوئی حرف نہیں ہے مگر شافی و کافی ہے۔ اگر تو کہے: سبیعا، علیما، عزیزا، حکیمان جب تک کہ آیت عذاب آیت رحمت سے یا آیت رحمت آیت عذاب سے خلط ملط نہ ہو (1)۔ ثابت بن قاسم نے اس حدیث کی مثل حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے اور انہوں نے حضرت ابن مسعود کے کلام سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ قاضی بن طیب نے کہا: جب یہ روایت (یعنی حدیث ابی) ثابت ہے تو یہ اس پر محمول ہوگا کہ پہلے حکم مطلق تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ پس لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے اسماء کو ان کی جگہ سے بدلنا جائز نہیں خواہ ان کا معنی موافق ہو یا مخالف ہو۔

دوسرا قول: بعض علماء نے کہا: یہ سات لغات قرآن میں ہیں تمام عربوں کی لغات پر یعنی ان کے یمنی و نزار قبائل کی لغات۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ ان لغات میں سے ہر ایک لغت جانتے تھے آپ کو جوامع الکلم کی شان دی گئی تھی۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ ایک حرف میں سات وجوہ ہیں لیکن یہ سات لغات قرآن میں متفرق ہیں۔ اس کا بعض لغت قریش پر ہے بعض لغت ہذیل پر ہے بعض لغت ہوازن پر ہے بعض لغت یمن پر ہے۔ خطابی نے کہا: قرآن میں جو الفاظ سات وجوہ پر پڑھے گئے وہ یہ ہیں وَ عَبْدَ الطَّاغُوتِ (المائدہ: 60) اور مَعْنَا عَدَايَ تَتَمَّ وَيَلْعَبُ (یوسف: 12) پھر خطابی نے ان وجوہ کا ذکر کیا ہے۔ گویا خطابی کا نظریہ ہے کہ بعض الفاظ سات حروف پر نازل کئے گئے ہیں نہ کہ تمام۔ اس قول کے مطابق قرآن سات حروف پر آیا ہے یعنی سات لغات پر اتر ہے۔ ابو عبیدہ قاسم بن سلام اور ابن عطیہ کا یہی نظریہ ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: بعض قبائل نے بعض سے زیادہ حصہ پایا۔ ابن شہاب کی حدیث حضرت انس سے روایت کی گئی کہ حضرت عثمان نے جب انہیں قرآن کے نسخے لکھنے کا حکم دیا تو فرمایا: جب تم اور زیادہ اختلاف کرو تو لغت قریش میں لکھو، کیونکہ قرآن ان کی لغت میں نازل ہوا ہے (2)۔ یہ بخاری نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ذکر کی ہے۔ فرمایا: قرآن کعبین کی لغت میں نازل ہوا۔ کعب قریش اور کعب خزاعہ۔ بعض علماء نے کہا: یہ کیسے ہے؟ فرمایا: کیونکہ گھرا ایک ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: یعنی خزاعہ قریش کے پڑوسی ہیں انہوں نے ان کی لغت سے لیا۔

قاضی ابن طیب نے کہا: حضرت عثمان کے قول ”قرآن قریش کی زبان پر نازل ہوا“ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا اکثر حصہ اور زیادہ حصہ ان کی زبان پر نازل ہوا اور کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ سارا قرآن صرف قریش کی لغت پر نازل ہوا کیونکہ اس میں ایسے کلمات اور حروف ہیں جو قریش کی لغت کے خلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، باب انزل القرآن علی سبعة احرف، حدیث نمبر 1262، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب نزل القرآن بلسان قریش، حدیث نمبر 3244، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(الزخرف: 3) یہ نہیں فرمایا کہ قرآن قریشیہ۔ یہ دلیل ہے کہ قرآن عربوں کی تمام زبانوں پر نازل ہوا۔ کسی کے لئے یہ کہنا جائز نہیں کہ وہ عربوں میں سے دوسروں کو چھوڑ کر قریش کا ارادہ کرے جیسا کہ کسی کے لئے یہ کہنا جائز نہیں کہ عدنان کی لغت کا ارادہ فرمایا نہ کہ قحطان کا، یا ربیعہ کا ارادہ فرمایا نہ کہ مضر کا، کیونکہ عرب کا اسم تمام قبائل کو مکمل شامل ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: جس نے کہا قرآن لغت قریش کے مطابق نازل ہوا میرے نزدیک اس کا معنی ہے کہ زیادہ لغت قریش پر نازل ہوا کیونکہ لغت قریش کے علاوہ بھی صحیح قراءت میں موجود ہیں مثلاً ہمزات وغیرہ کا موجود ہونا اور قریش ہمزہ نہیں پڑھتے۔ ابن عطیہ نے کہا: نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ (قرآن سات حروف پر نازل ہوا) اس کا مطلب ہے سات قبائل، تمام کی لغت کے مطابق قرآن نازل ہوا، اس کے معنی کو کبھی قریش کی عبارت سے کبھی ہذیل کی عبارت سے کبھی دوسرے قبائل کی عبارت سے تعبیر فرمایا، لفظ میں جو فصیح اور ایجاز کے مطابق تھا۔ آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ فطر کا معنی قریش کے علاوہ کے نزدیک ابتدا ہے اس نے چیز کو پیدا کیا اور کام پر لگایا پھر قرآن میں آیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو سمجھ نہ آیا حتیٰ کہ دو اعرابی ان کے پاس ایک کنویں کے بارے میں جھگڑا لے آئے تو ایک نے کہا: انا فطر تھا (میں نے اسے کھودا تھا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس وقت مجھے فاطر السموات والارض کا معنی سمجھ آیا۔ اسی طرح فرمایا میں رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ (اعراف: 89) کا معنی نہیں جانتا تھا حتیٰ کہ میں نے ذی یزن کی ایک عورت کو اپنے خاوند کو یہ کہتے ہوئے سنا تعالٰی افاتحک یعنی میں تیرا فیصلہ کروں، اسی طرح حضرت عمر بن خطاب نے کہا وہ اَوْيَاْخُذْهُمْ عَلَى تَخَوُّفٍ (النحل: 47) کا معنی نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح قطبہ بن مالک کے لئے اتفاق ہوا جب اس نے نبی کریم ﷺ کو وَالنَّحْلُ بِسُتٍ (ق: 10) پڑھتے ہوئے سنا۔ یہ مسلم نے باب القراءۃ فی صلاۃ الفجر میں ذکر فرمایا۔ اس کے علاوہ بہت سی مثالیں ہیں۔

تیسرا قول: یہ سات لغات مضر قبیلہ میں تھیں۔ یہ ایک قوم کا خیال ہے اور انہوں نے حضرت عثمان کے اس قول سے حجت پکڑی ہے قرآن مضر کی لغت میں نازل ہوا اور انہوں نے کہا: یہ بھی جائز ہے اس میں سے قریش، کنانہ، اسد، ہذیل، تیم، ضہ اور قیس کی لغات ہوں۔ وہ کہتے ہیں: یہ مضر کے قبائل ہیں وہ سات لغات کو ان مراتب پر گھیرے ہوئے ہیں۔ حضرت ابن مسعود پسند کرتے تھے کہ مصاحف لکھنے والے مضر قبیلہ سے ہوں، دوسروں نے انکار کیا کہ تمام مضر قبیلہ سے ہوں اور انہوں نے کہا مضر قبیلہ میں شواذ ہیں ان کے ساتھ قرآن کو پڑھنا جائز نہیں مثلاً کَشْكُشَہ، قِیس، حَمْتَمَہ، تَمِیم، رہا کَشْكُشَہ قِیس تو وہ مؤنث کی کاف کو شین بنادیتے ہیں اور وہ جَعَلَ رَبُّكَ تَخْلُكُ سَرِيًّا (مریم: 24) کو جعل ربك تخشش سربیا پڑھتے ہیں اور رہا تَمْتَمَہ تَمِیم تو وہ الناس کو الناس اور اکیاس کو اکیاس پڑھتے ہیں۔ یہ لغات ہیں، ان کے ساتھ قرآن کا پڑھا جانا درست نہیں اور نہ سلف سے اس کے متعلق کوئی چیز محفوظ ہے۔

دوسرے کہتے ہیں: رہا ہمزہ کو عین سے بدلنا اور حروف حلقیہ کو ایک دوسرے سے بدلنا تو فصحاء سے مشہور ہے اور اس کے ساتھ بڑے بڑے قراء نے پڑھا ہے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت سے حجت پکڑی ہے۔ لیسجنہ عتی حین انہوں نے پڑھا ہے اور یہ ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اور ان علماء نے ذی الرمہ کے قول سے حجت پکڑی ہے۔



فعیناک عیناہا و جیدک جیدہا ولونک الا عنہا غیر طائل  
عنہا سے مراد انہا ہے۔

چوتھا قول: یہ صاحب الدلائل نے بعض علماء سے حکایت کیا ہے۔ قاضی بن طیب نے اسی طرح حکایت کیا ہے۔ فرمایا: تو قرأت میں اختلاف کی وجہ میں غور کرے گا تو انہیں سات ہی پائے گا۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس میں حرکت تبدیل ہوتی ہے اور معنی زائل نہیں ہوتا اور صورت بھی نہیں بدلتی۔ مثلاً ہن اظہر لکم، واطہر، ویضیق صدری، ویضیق، بعض میں صورت نہیں بدلتی، اعراب کے ساتھ معنی بدل جاتا ہے مثلاً ربنا باعد بین اسفارنا، وبعاد بعض میں صورت باقی رہتی ہے حروف کے اختلاف کے ساتھ معنی تبدیل ہو جاتا ہے مثلاً تنشزھا وتنشزھا، بعض میں صورت بدلتی ہے اور معنی باقی رہتا ہے جیسے کالعین النفوش و کالصوف النفوش، بعض میں صورت اور معنی دونوں بدل جاتے ہیں مثلاً و طلع منضود و طلع منضود اس میں تقدیم و تاخیر ہے جیسے و جاءت سکرة الموت بالحق اور جاءت سکرة الحق بالموت۔ زیادہ اور کمی کے ساتھ جیسے تسع و تسعون نعمة انی اور یہ قول اما الغلام فکان کافراً و کان ابواہ مومنین۔ اور یہ قول فان الله من بعد اکراھن لهن غفور، رحیم۔

پانچواں قول: سات حروف سے مراد کتاب اللہ کے معانی ہیں۔ یہ امر، نبی، وعدہ، وعید، قصص مجادلہ اور امثال ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف ہے کیونکہ اس کو احرف سے تعبیر نہیں کیا جاتا اور اس پر اجماع ہے کہ حلال کی حلت میں اور معانی میں سے کسی معنی کو تبدیل کرنے کی گنجائش نہیں۔ قاضی ابن طیب نے اس معنی میں ایک حدیث نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ پھر فرمایا لیکن یہ ایسی صورت نہیں جس کے ساتھ قراءت کی اجازت دی ہو۔ اس صورت میں حرف بمعنی جہت اور طریقہ ہوگا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنَ الثَّانِيں مَنْ يَعْْبُدُ اللّٰهَ عَلَىٰ حَرْفٍ (الحج: 11) پس اسی طرح اس حدیث کا معنی ہو سات طریقے جیسے تحلیل، تحریم وغیرہ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس ارشاد (سات حروف پر قرآن نازل ہوا) کا مطلب وہ سات قراءتیں ہیں جو سات قراء نے پڑھی ہیں کیونکہ وہ تمام رسول اللہ ﷺ سے صحت سے مروی ہیں اور یہ قول بھی کچھ نہیں ہے کیونکہ اس کا بطلان ظاہر ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

**فصل:** بہت سے علماء مثلاً داؤدی، ابن ابی صفرہ وغیرہا نے فرمایا: یہ سات قراءتیں جو ان سات قراء کی طرف منسوب ہیں۔ یہ وہ سات حروف ہیں جن کے ساتھ قرأت میں صحابہ کو رعایت دی گئی۔ یہ سات میں سے ایک حرف کی طرف راجع ہیں۔ یہ وہ ہے جس پر حضرت عثمان نے مصحف کو جمع فرمایا۔ یہ ابن نحاس وغیرہ نے ذکر فرمایا۔ یہ مشہور قراءتیں ان ائمہ قراء کے اختیارات ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے اس کو اختیار فرمایا جو مروی تھا اور اس کی وجہ معلوم تھی اور اس کے نزدیک وہ احسن اور اولیٰ تھی۔ پس اس نے اس کا التزام کیا۔ پس اس نے اس کو روایت کیا اور اس کے ساتھ پڑھا اور اس سے وہ قرأت مشہور ہوئی، اس سے معروف ہوئی اور اس کی طرف منسوب ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: حرف نافع، حرف ابن کثیر۔ ان میں سے کسی نے دوسرے کے اختیار کو منع نہیں فرمایا اور نہ اس کا انکار کیا بلکہ اس کو جائز قرار دیا۔ ان ساتوں میں ہر ایک سے دو یا دو سے زیادہ اختیار بھی

مروی ہیں اور سب صحیح ہیں۔

مسلمانوں کا اس زمانہ میں ان ائمہ سے جو صحیح مروی ہے اس پر اعتماد کرنے میں اجماع ہے۔ جو کچھ انہوں نے روایت کیا اور جو انہوں نے قراءت میں سے جو رائے قائم کی اور انہوں نے اس کے متعلق تصانیف لکھیں اور درست بات پر اجماع قائم ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے جو حفظ کتاب کا وعدہ فرمایا وہ پورا ہوا۔ یہی نظریہ متقدمین فضلاء محققین کا ہے جیسے قاضی ابوبکر بن طیب اور طبری وغیرہما۔ ابن عطیہ نے کہا سات قراءتوں پر زمانہ گزر چکا ہے اور ان کے ساتھ نماز پڑھی جاتی ہے، کیونکہ یہ اجماع سے ثابت ہیں اور رہی شاذ قراءتیں تو ان کے ساتھ نماز نہیں پڑھی جاتی، کیونکہ لوگوں کا اس پر اجماع ہے اور ان شاذ قراءتوں میں سے جو صحابہ سے اور علماء تابعین سے مروی ہیں، ان میں اعتقاد نہیں کیا جاتا مگر انہوں نے اس کو روایت کیا ہے اور جو ابو السمال اور ان کے ہم عصر علماء سے مروی ہے اس پر بھی اعتقاد نہیں کیا جاتا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: مصاحف متواترہ سے شاذ قراءتیں قرآن میں ہیں ان کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا کہ یہ اس میں سے ہیں۔ اور اس کا بہترین محمل یہ ہے کہ وہ اس شخص کے مذہب کی تاویل کا بیان ہیں جن کی طرف وہ قراءت منسوب کی گئی ہے مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت فصیام ثلاثۃ ایام متابعات اگر راوی رسول اللہ ﷺ سے سماع کی صراحت کرے تو پھر بھی دو اقوال کے مطابق اس پر عمل میں اختلاف ہے یعنی ایک قول نفی میں ہے اور ایک قول اثبات میں ہے۔ نفی کی وجہ یہ ہے کہ راوی نے خبر کے مطابق روایت نہیں کیا بلکہ قرآن کے مطابق روایت کیا۔ وہ ثابت نہیں ہے تو قرآن ہونا ثابت نہ ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن ہونا ثابت نہیں ہے تو سنت ہونا ثابت ہوا۔ اس پر عمل کرنا، دوسری اخبار احاد کی طرح ہوگا۔

### فصل: حضرت عمر اور ہشام کی حدیث کے معنی کا ذکر

ابن عطیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لئے ان سات حروف پر پڑھنا مباح فرمایا ہے۔ جبریل امین نے یہ سات حروف پیش کئے اور اس طریقہ پر پیش کئے جس میں اعجاز اور عمدگی تھی اور فَاَقْرَأْ مَا تَشَاءُ مِنْهُ (الزلزلہ: 20) کے ارشاد سے یہ اباحت ثابت نہیں کہ ہر صحابی جب چاہے بعض الفاظ کو بعض سے بدلنا چاہے تو اپنی طرف سے بدل دے۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کا اعجاز ختم ہو جاتا اور ہر ایک حرف دوسرے سے بدل دیا جاتا اور قرآن وہ نہ رہتا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ نبی کریم ﷺ کے لئے ان سات حروف میں اباحت واقع ہوتی تھی تاکہ اس کے ساتھ اپنی امت پر وسعت پیدا کریں۔ کبھی تو آپ نے حضرت ابی کے لئے پڑھا جو جبریل امین لائے تھے، کبھی حضرت ابن مسعود کے لئے پڑھا جو جبریل امین لائے تھے۔ اس بنا پر حضرت عمر کی سورۃ فرقان کی قراءت اور ہشام بن حکیم کی قراءت واقع ہوئی ورنہ یہ کیسے ہوتا کہ نبی کریم ﷺ ہر قراءت کے بارے فرماتے جو مختلف تھیں مجھے جبریل نے اسی طرح پڑھائی ہے، یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ نے کبھی اس طرح پڑھی ہو اور کبھی اس طرح پڑھی ہو۔ اس پر حضرت انس کا قول محمول ہوگا جب انہوں نے پڑھا اِنْ نَّاشِئَةُ اللَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَاَصَوْبُ قَيْلًا وَاَهْيَا۔ ان سے کہا گیا: ہم تو اقوام قیلًا پڑھتے ہیں۔ حضرت انس نے کہا: اصوب قیلًا اور اقوام قیلًا واهیا ایک ہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے یہ تمام نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں۔ ورنہ اگر لوگوں میں

سے کسی کے لئے ایسا کرنا درست ہوتا تو اِنَّ اَنْحُنْ نَزَّلْنَا الَّذِي كَرُوْا اِنَّ اِلٰهَهُ لَخَفِيْظُوْنَ ﴿١﴾ (الحجر) کا معنی باطل ہو جاتا۔ بخاری اور مسلم وغیرہا نے حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے ہشام بن حکیم کو سورہ فرقان اس انداز میں پڑھتے سنا جو میرے پڑھنے کے انداز سے مختلف تھا اور مجھے یہ سورت خود رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی تھی۔ قریب تھا کہ میں ہشام پر جھپٹ پڑتا پھر میں نے اے بہت دی حتیٰ کہ اس نے سلام پھیرا تو میں نے اس کو چادر سے پکڑ لیا اور اسے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آیا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں نے اس کو سورہ فرقان اپنے سے مختلف انداز میں پڑھتے ہوئے سنا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا: پڑھو، اس نے اس طریقہ پر پڑھی جس پر پڑھتے ہوئے میں نے اسے سنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر مجھے فرمایا: تم پڑھو۔ میں نے پڑھی تو فرمایا: اسی طرح نازل ہوئی ہے، یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے جو ان میں سے آسان ہو اس پر پڑھو (۱)۔ میں کہتا ہوں: حضرت عمر کی اس حدیث کے معنی میں مسلم کی روایت ہے جو حضرت ابی بن کعب سے روایت ہے، فرمایا: میں مسجد میں تھا۔ ایک شخص داخل ہوا اور نماز پڑھنا شروع کی۔ اس نے ایسی قراءت کی جس کو میں نہیں جانتا تھا۔ پھر دوسرا شخص آیا اس نے پہلے ساتھی کے علاوہ طریقہ پر قراءت کی۔ جب ہم نے نماز مکمل کر لی تو ہم سب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کی: اس نے ایسی قراءت کی ہے جس کا میں نے انکار کیا ہے۔ دوسرا داخل ہوا اس نے اس قراءت سے مختلف قراءت کی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کو فرمایا: پڑھو۔ ان دونوں نے پڑھا تو نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کی تحسین فرمائی۔ میرے دل میں ہیبت وحیرت واقع ہوئی۔ تکذیب کی وجہ سے میں چونکہ زمانہ جاہلیت میں ایسا نہ تھا۔ نبی کریم ﷺ میری کیفیت دیکھ کر پہچان گئے۔ انہوں نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا، تو میرا پسینہ نکل آیا گویا میں اللہ تعالیٰ کی طرف خوف سے دیکھ رہا ہوں۔ آپ ﷺ نے مجھے فرمایا: اے ابی! مجھے یہ پیغام بھیجا گیا ہے کہ میں ایک حرف پر قرآن پڑھوں۔ میں نے بات لوائی کہ میری امت پر آسانی کرو۔ پھر دوبارہ پیغام آیا کہ دو حروف پر قراءت کرو۔ میں نے عرض کی کہ میری امت پر آسانی کرو۔ تیسری دفعہ پیغام آیا کہ سات حروف پر قراءت کرو۔ پس تیرے لیے ہر بار لوانے کے بدلے میں ایک دعا کا موقع ہے جو آپ کر سکتے ہیں۔ میں نے عرض کی: اے اللہ! میری امت کی مغفرت فرما، اے اللہ! میری امت کی مغفرت فرما اور تیسری مرتبہ کو میں نے اس دن کے لئے مؤخر کر دیا جس دن ساری مخلوق میری طرف رغبت کرے گی حتیٰ کہ ابراہیم علیہ السلام بھی (2)۔

حضرت ابی کا قول: فسقطني نفسی کا معنی ہے مجھے حیرت اور دہشت لاحق ہوئی یعنی شیطان کا حملہ ہوا کہ اس پر ان کا حال مشوش کرے اور اس پر اس کا وقت مکر کر دے کیونکہ شیطان نے قرآن کے اختلاف کو ان پر عظیم بنا دیا جو حقیقت میں ایک عظیم مسئلہ نہ تھا اور نہ اختلاف قراءت سے کون سا حال اور تکذیب لازم آتی ہے اور یہ چیز الحمد للہ نسخ میں بھی لازم نہ آتی جو اس

1۔ صحیح بخاری، باب انزل القرآن علی سبعة احرف، حدیث نمبر 4608، نیل، القرآن، ج ۱، کتب

2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب بیان ان القرآن علی سبعة احرف



سے عظیم تھا تو قراءت میں یہ کیسے آسکتی تھی۔

جب نبی کریم ﷺ نے اس کی کیفیت بدلتی ہوئی دیکھی تو اس کے سینہ پر ہاتھ مار کر اسے تنبیہ فرمائی تو اس کے بعد حضرت ابی کا سینہ کھل گیا اور باطن روشن ہو گیا حتیٰ کہ کشف اور شرح معاینہ کی حالت کی طرف لوٹ گیا۔ جب دل کی فتح ان پر ظاہر ہوئی تو اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہوا اور اللہ تعالیٰ سے حیا کی وجہ سے پسینہ میں ڈوب گئے۔ اس شخص کا دل بھی اسی قبیل سے تھا جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا۔ انہوں نے کہا ہم اپنے نفسوں میں ایسی کیفیت پاتے ہیں ہم میں سے کوئی اس کو بیان کرنا بھی برا سمجھتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم ایسی کیفیت پاتے ہو؟ صحابہ نے کہا: ہاں، فرمایا: یہ صریح ایمان ہے (1)۔ یہ حدیث مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ مزید کلام سورۃ اعراف میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**قرآن جمع کرنے کا ذکر، حضرت عثمان کا قرآن کے نسخے لکھوانے کا سبب اور باقی نسخے**

**جلانے کا ذکر، صحابہ میں سے حفاظ قرآن کا ذکر جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھے**

نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں قرآن مردوں کے سینوں میں متفرق تھا اور کچھ صحیفوں میں تھا۔ کچھ کھجور کے پتوں پر تھا، کچھ لحاف اور ظرر پر اور کچھ ٹھیکریوں وغیرہ پر تھا۔ اصمعی نے کہا: لحاف سفید باریک پتھر کو کہتے ہیں اور اس کا واحد لخفة ہے اور الظور اس پتھر کو کہتے ہیں جس کی چھری کی طرح دھار ہوتی ہے اس کی جمع ظراد ہے جیسے رطب کی جمع رطاب ہے، رباع کی جمع رباع ہے اور اس کی جمع ظران بھی ہے جیسے صرد کی جمع صردان ہے۔ جب حضرت ابوبکر کے زمانہ میں جنگ یمامہ میں قراء کی شہادت زیادہ ہوئی اس جنگ میں سات سو قراء شہید ہوئے۔ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قرآن جمع کرنے کا مشورہ دیا کہ بوڑھے قراء فوت نہ ہو جائیں جیسے حضرات ابی، ابن مسعود اور زید بن ثابتؓ تو ان دونوں حضرات نے حضرت زید بن ثابت کو اس کام کے لئے بلایا۔ انہوں نے بڑی مشقت کے بعد سورتوں کی ترتیب کے بغیر قرآن کو جمع کیا۔ بخاری نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے، فرمایا: جنگ یمامہ کے موقع پر مجھے حضرت ابوبکر نے بلایا (میں پہنچا) تو حضرت عمر بھی ان کے پاس موجود تھے۔ حضرت ابوبکر نے کہا: حضرت عمر میرے پاس آئے اور کہا: جنگ یمامہ میں بہت سے لوگ شہید ہو گئے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ قراء بہت سے مواقع پر شہید ہو گئے تو قرآن کا بہت سا حصہ ضائع ہو جائے گا مگر یہ کہ تم قرآن کو جمع کر لو۔ میرا خیال ہے کہ تم قرآن کو جمع کرو۔ حضرت ابوبکر نے کہا: میں نے حضرت عمر کو کہا: میں وہ کام کیسے کروں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا تھا۔ حضرت عمر نے کہا: اللہ کی قسم! یہ عمل خیر ہے۔ حضرت عمر مجھ پر یہ بات بار بار لوٹاتے رہے حتیٰ کہ اس کے لئے اللہ نے میرا سینہ کھول دیا۔ میں نے بھی وہ رائے قائم کر لی جو حضرت عمر کی تھی۔ حضرت زید نے کہا جبکہ حضرت عمران کے پاس خاموش بیٹھے تھے حضرت ابوبکر نے مجھے کہا: تو ایک نوجوان، عظمند شخص ہے اور تجھ پر کوئی تہمت نہیں ہے تو رسول اللہ ﷺ کے لئے وحی لکھتا رہا ہے تم قرآن کو تلاش کرو اور جمع کرو۔ اللہ کی قسم! اگر حضرت ابوبکر مجھے پہاڑوں میں سے کوئی پہاڑ نقل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسة فی الایمان

کرنے کا حکم دیتے تو مجھ پر وہ اتنا بھاری نہ ہوتا جتنا کہ مجھے حضرت ابوبکر نے قرآن جمع کرنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے کہا: تم دونوں وہ کام کیسے کرتے ہو جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا تھا؟ حضرت ابوبکر نے کہا: اللہ کی قسم! یہ عمل خیر ہے میں بار بار یہ بات لوٹا تا رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ کھول دیا اس کام کے لئے جس کے لیے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا سینہ کھول دیا تھا، میں نے قرآن کو تلاش کیا اور میں کپڑوں سے، کندھوں کی ہڈیوں سے، کھجور کے پتوں سے اور مردوں کے سینوں سے قرآن کو جمع کرنے لگا حتیٰ کہ میں نے سورہ توبہ کی دو آیتیں صرف خزیمہ انصاری کے پاس پائیں جو میں نے کسی اور کے پاس نہ پائیں۔ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ (التوبہ)

وہ صحیفے جن میں قرآن جمع کیا گیا تھا وہ پہلے حضرت ابوبکر کے پاس رہے حتیٰ کہ ان کا وصال ہو گیا پھر حضرت عمر کے پاس رہے حتیٰ کہ ان کا وصال ہو گیا پھر حضرت حفصہ بنت عمر کے پاس رہے۔ لیث نے کہا: مجھے عبدالرحمن بن غالب نے ابن شہاب سے روایت کر کے بتایا کہ ابو خزیمہ انصاری کے پاس وہ آیات تھیں، ابو ثابت نے کہا: ہمیں ابراہیم نے بتایا وہ خزیمہ کے پاس یا ابو خزیمہ کے پاس تھیں: فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ (توبہ) امام ترمذی نے اپنی حدیث میں، حضرت زید سے روایت کیا کہ میں نے سورہ برأت کی آخری آیات خزیمہ بن ثابت کے پاس پائیں لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ (التوبہ) امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔

بخاری میں حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے، فرمایا: جب ہم نے مصاحف میں صحیفوں کو نقل کیا تو میں نے سورہ احزاب کی وہ آیت نہ پائی جو میں رسول اللہ ﷺ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا۔ میں نے کسی کے پاس وہ آیت نہ پائی مگر خزیمہ انصاری کے پاس، جن کی شہادت کو رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کی شہادت کے قائم مقام بنایا تھا۔ رَجُلًا صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ (الاحزاب: 23) (2) امام ترمذی نے ان سے روایت کیا ہے کہ میں نے سورہ احزاب کی وہ آیت نہ پائی جو میں رسول اللہ ﷺ کو پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رَجُلًا صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْتَظِرُ (الاحزاب: 23) میں نے اس کو تلاش کیا تو میں نے اسے خزیمہ انصاری یا ابو خزیمہ کے پاس پایا پھر میں نے اسے اس سورت سے لاحق کر دیا (3)۔ میں کہتا ہوں: پہلی آیت سورہ برأت کے آخر سے پہلی مرتبہ جمع کرنے کے وقت ساقط تھی جیسا کہ بخاری اور ترمذی نے کہا اور دوسری مرتبہ جمع کرنے کے وقت سورہ احزاب کی آیت

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب لقد جاءكم رسول من انفسكم، حدیث نمبر 4311، جامع ترمذی، حدیث 3028، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، حدیث نمبر 4411، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، باب من سورة الاعراف، حدیث نمبر 3029، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

موجود نہ تھی۔ طبری نے حکایت کیا ہے کہ آیت برأت آخری جمع کے وقت ساقط تھی۔ پہلا قول اصح ہے۔ واللہ اعلم، اگر یہ کہا جائے کہ کیا وجہ تھی کہ حضرت عثمان نے اپنے مصحف پر لوگوں کو جمع کیا حالانکہ حضرت ابوبکر اس کام کو پہلے سرانجام دے چکے تھے اور وہ اس کام سے فارغ ہو چکے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عثمان نے جو کیا ان سے ان کا مقصد مصحف کی تالیف پر لوگوں کو جمع کرنا نہ تھا۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ انہوں نے کس طرح حضرت حفصہ کی طرف پیغام بھیجا کہ ہماری طرف صحیفہ بھیجو ہم اس کو دوسرے مصاحف میں نقل کریں گے پھر تمہیں اپنا صحیفہ واپس کر دیں گے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ حضرت عثمان نے یہ اس لئے کیا تھا کہ لوگ قراءتوں میں اختلاف کرنے لگ گئے تھے کیونکہ صحابہ کرام مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے اس میں صورت حال گھمبیر ہو گئی تھی اور اختلاف و انتشار بڑھ گیا تھا اور اہل شام اور عراق کے درمیان وہ واقع ہوا جو حضرت حذیفہ نے ذکر فرمایا۔ یہ اس طرح ہوا کہ وہ غزوہ ارمینہ میں جمع ہوئے تو ہر طائفہ نے اس کے مطابق قراءت کی جو اسے روایت کیا گیا تھا۔ آپس میں اختلاف کرنے لگے اور جھگڑنے لگے اور ایک دوسرے پر کفر کے فتوے اور ایک دوسرے سے برأت اور ایک دوسرے پر لعنت کرنے لگے۔ حضرت حذیفہ نے یہ منظر دیکھا تو بہت پریشان ہوئے۔ جب مدینہ طیبہ آئے تو اپنے گھر جانے سے پہلے حضرت عثمان کے پاس آئے۔ عرض کی: اس امت کی چارہ سازی کیجئے اس سے پہلے کہ یہ ہلاک ہو جائے۔ حضرت عثمان نے پوچھا: کیا ہوا؟ حضرت حذیفہ نے کہا: اللہ کی کتاب کے بارے جھگڑا ہوا۔ میں اس غزوہ میں موجود تھا۔ لوگ اس غزوہ میں عراق، شام اور حجاز سے جمع ہوئے تھے پھر سارا واقعہ بیان کیا، اور فرمایا: مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ اپنی کتاب کے بارے میں اس طرح اختلاف کریں گے جس طرح یہود و نصاریٰ نے اختلاف کیا تھا (۱)۔

میں کہتا ہوں: یہ ان علماء کے قول کے بطلان پر بڑی واضح دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ سات حروف سے مراد سات قراء کی قراءتیں ہیں کیونکہ حق میں اختلاف نہیں ہوتا۔ حضرت سید بن غفلہ نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے، حضرت عثمان نے کہا: تم مصاحف کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو کیونکہ لوگ قراءت میں اختلاف کر چکے ہیں حتیٰ کہ کوئی کہتا ہے میری قراءت تیری قراءت سے بہتر ہے اور یہ کفر کے مشابہ ہے۔ ہم نے کہا: اے امیر المومنین! آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرت عثمان نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ لوگ ایک قراءت پر جمع ہو جائیں، کیونکہ آج اگر تم اختلاف کرو گے تو تمہارے بعد آنے والے مزید اختلاف کریں گے۔ ہم نے کہا: اے امیر المومنین! آپ کی رائے درست ہے۔ حضرت عثمان نے حضرت حفصہ کی طرف پیغام بھیجا کہ تم ہماری طرف قرآن کا نسخہ بھیجو ہم اس سے مزید نسخے تیار کرائیں گے پھر تمہیں اپنا مصحف واپس کر دیں گے۔ حضرت حفصہ نے وہ حضرت عثمان کی طرف بھیج دیا۔ حضرت عثمان نے حضرات زید بن ثابت، عبد اللہ بن زبیر، سعید بن العاص، عبدالرحمن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ قرآنی نسخے نقل کریں۔ حضرت عثمان نے قریش کے گردہ کو کہا: جب تم اور زید بن ثابت قرآن کے متعلق کسی چیز کے بارے میں اختلاف کرو تو اسے قریش کی زبان میں لکھو کیونکہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پس انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب انہوں نے اس صحیفہ سے مزید مصاحف

۱۔ جامع ترمذی، دمن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3029، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



نقل کر لئے تو حضرت عثمان نے وہ صحیفہ حضرت حفصہ کو واپس کر دیا۔ حضرت عثمان نے ہر علاقہ کی طرف ایک نسخہ بھیجا اور قرآن کے باقی جتنے صحیفے یا مصاحف موجود تھے انہیں جلانے کا حکم دیا۔ یہ حضرت عثمان نے کام کیا جبکہ مہاجرین، انصار اور اجل اہل اسلام اس بات پر متفق ہو گئے ہیں اور حضرت عثمان نے ان سے مشورہ کر لیا تھا۔ پس وہ اس بات پر متفق ہو گئے کہ جو قرآن کی قراءت مشہورہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے اس کو جمع کیا جائے اس کے علاوہ کو ترک کر دیا جائے۔ سب نے حضرت عثمان کی رائے کو درست کہا اور ان کی رائے پختہ اور صائب تھی۔ رحمۃ اللہ علیہ طبری نے اپنی روایت میں کہا: حضرت عثمان نے حضرت زید کے ساتھ ابان بن سعید بن العاص کو ملایا تھا یہ ضعیف ہے۔ بخاری، ترمذی وغیرہا نے جو کہا ہے وہی اصح ہے۔ طبری نے کہا: وہ صحیفہ جو حضرت حفصہ کے پاس تھا اسے اس آخری جمع میں امام و مقتداء بنایا گیا اور یہ صحیح ہے۔

ابن شہاب نے کہا: مجھے عبید اللہ بن عبد اللہ نے کہا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے حضرت زید بن ثابت کے مصاحف نقل کرنے کو ناپسند کیا۔ انہوں نے کہا: اے مسلمانوں کے گروہ! میں مصاحف کی نقل سے جدا ہوتا ہوں اس کام کا ایسا والی بنا ہے اللہ کی قسم! میں اسلام لا چکا تھا اور یہ ایک کافر شخص کی پیٹھ میں تھا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی مراد زید بن ثابت تھے۔ اسی وجہ سے حضرت عبد اللہ بن مسعود نے کہا تھا: اے اہل عراق! وہ مصاحف جو تمہارے پاس ہیں ان کو چھپا دو اور انہیں بند کر لو، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ** (آل عمران: 161) پس تم اللہ سے مصاحف کے ساتھ ملو۔ اس حدیث کو ترمذی نے نقل کیا ہے اس پر مزید کلام سورہ آل عمران میں ان شاء اللہ آئے گی (1)۔

ابو بکر انباری نے کہا: حضرت زید کو حضرات ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی طرف سے حضرت عبد اللہ بن مسعود پر جمع قرآن میں ترجیح نہ تھی۔ حضرت عبد اللہ، حضرت زید سے افضل تھے اور ان سے اسلام قبول کرنے میں مقدم تھے اور زیادہ سبقت لے جانے والے تھے اور عظیم فضائل کے مالک تھے مگر حضرت زید حضرت عبد اللہ سے قرآن کو زیادہ یاد کرنے والے تھے کیونکہ انہوں نے سارا قرآن یاد کر لیا تھا جبکہ رسول اللہ ﷺ ظاہر حیات میں تھے اور حضرت عبد اللہ نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ستر سے زائد سورتیں آپ سے سیکھی تھیں پھر باقی سورتیں رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد سیکھی تھیں۔ پس جو رسول اللہ ﷺ کی ظاہری حیات میں قرآن ختم کر چکا تھا اور یاد کر چکا تھا وہ مصحف کو جمع کرنے میں اولیٰ تھا اور ایثار و اختیار کے لئے زیادہ حقدار تھا، کسی جاہل کو یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ اس میں حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ پر طعن ہے کیونکہ حضرت زید ان سے قرآن کو زیادہ یاد کرنے والے تھے۔ پس یہ ان کے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے تقدم کا موجب ہے کیونکہ حضرات ابو بکر و عمر سے بھی حضرت زید قرآن کو زیادہ یاد کرنے والے تھے حالانکہ حضرت زید ان دونوں حضرات سے بہتر نہیں بلکہ فضائل و مناقب میں ان کے مساوی بھی نہیں۔ حضرت ابو بکر نے کہا: حضرت عبد اللہ کی طرف سے جو انکار وارد ہوا ہے یہ ایک ایسی چیز ہے جو غصہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس پر نہ عمل ہو گا نہ اس کو قبول کیا جائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد حضرت عثمان اور دوسرے اصحاب رسول ﷺ کے حسن اختیار کو پہچان لیا اور پھر ان کی موافقت پر باقی رہے اور اختلاف

1۔ جامع ترمذی، ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3028، حضرت عبد اللہ بن مسعود کے ان الفاظ کو طویل القدر صحابہ نے سخت ناپسند کیا تھا۔

ترک کر دیا۔ اور یہ اہل نقل و روایت کے نزدیک مشہور و معروف اور جانا پہچانا مسئلہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے بقیہ قرآن رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد حاصل کیا۔ بعض ائمہ نے فرمایا: حضرت عبداللہ قرآن ختم کرنے سے پہلے وصال فرما گئے۔ یزید بن ہارون نے کہا۔ المعودتان (سورہ قل أعوذ برب الفلق اور قل أعوذ برب الناس) سورہ بقرہ اور آل عمران کے متعلق جو کہتا ہے کہ یہ قرآن سے نہیں ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے والا ہے۔ حضرت زید سے کہا گیا حضرت عبداللہ کا ان سورتوں کے متعلق قول کا کیا ہوگا؟ حضرت زید نے فرمایا: مسلمانوں کے درمیان اختلاف نہیں کہ حضرت عبداللہ کا وصال ہو گیا تھا جبکہ انہوں نے ابھی سارا قرآن یاد نہیں کیا تھا۔

میں کہتا ہوں: اس میں نظر ہے، اس کی وضاحت آگے آئے گی، اسماعیل بن اسحاق وغیرہ نے کہا حضرت حماد نے کہا: میرا خیال ہے حضرت مالک بن انس سے انہوں نے روایت کیا ہے؟ فرمایا: لوگ ایک آیت کے بارے میں اختلاف رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے: فلاں بن فلاں کو یہ رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی تھی۔ پھر مدینہ طیبہ سے وہ تین راتوں کی مسافت پر ہوتا تو اسے لایا جاتا اور اسے کہا جاتا: تجھے فلاں فلاں آیت رسول اللہ ﷺ نے کیسے کیسے پڑھائی تھی۔ پس وہ جس طرح کہتا لوگ لکھ لیتے تھے۔ ابن شہاب نے کہا: اس دن تابوت میں اختلاف ہوا۔ حضرت زید نے کہا: یہ التابوہ ہے۔ حضرات ابن زبیر، سعید بن العاص نے کہا: التابوت ہے۔ یہ اختلاف حضرت عثمان کے پاس لایا گیا تو انہوں نے فرمایا: اسے تاء کے ساتھ لکھو کیونکہ قرآن قریش کی لغت میں نازل ہوا۔ اس روایت کو بخاری اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: حضرت زید نے ہاء کے ساتھ پڑھا اور قریشیوں نے تاء کے ساتھ پڑھا تو انہوں نے تاء کے ساتھ لکھا۔ مصاحف اسی طریقہ پر لکھے گئے تھے جس طرح پہلے تھے حضرت عثمان نے ان سے نقل کروائی۔ دوسرے علماء نے کہا: وہ نئے نسخے جو تیار کئے گئے تھے وہ سات تھے۔ بعض نے کہا: چار تھے۔ یہ اکثر کا قول ہے اور یہ نسخے مختلف علاقوں میں بھیجے گئے۔ عراق، شام اور مصر اصل نسخے بھیجے گئے۔ پس ان شہروں کو قراء نے اپنے اختیارات کا معتمد بنایا اور ان میں سے کسی نے مصحف کی مخالفت نہ کی جس طرح کہ انہیں وہ پہنچا۔ اور جو سات قراء میں حروف میں اختلاف پایا جاتا ہے، بعض زیادہ کرتے ہیں بعض کم کر دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس پر اعتماد کرتا تھا جو اسے پہنچا تھا اور انہوں نے جو روایت کیا تھا کیونکہ حضرت عثمان نے بعض نسخوں میں ان جگہوں کو لکھوایا اور بعض میں نہ لکھوایا یہ شعور دلاتے ہوئے کہ یہ سب صحیح ہیں اور ان میں سے ہر ایک سے قراءت جائز ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: پھر حضرت عثمان نے باقی مصاحف جلا دینے کا حکم دیا۔ ان تحرق اور ان تحرق دونوں طرح یہ لفظ مروی ہے خاء نقطہ کے ساتھ ہو تو معنی ہوگا دفن کرنے کا حکم دیا اور بغیر نقطہ والی خاء کی روایت احسن ہے۔

ابو بکر انباری نے کتاب الرد میں حضرت سوید بن غفلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو یہ فرماتے سنا، اے لوگوں کے گروہ! اللہ سے ڈرو اور حضرت عثمان کے بارے میں غلو سے بچو۔ تم کہتے ہو حضرت عثمان قرآن کو جلانے والے تھے۔ اللہ کی قسم! انہوں نے ان نسخوں کو نہیں جلایا مگر ہم میں سے اصحاب محمد کے گروہ سے مشورہ کر کے ایسا کیا۔ عمیر بن سعید سے مروی ہے، فرمایا: حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا: اگر حضرت عثمان کے وقت میں میں والی ہوتا تو میں

بھی مصاحف کے بارے میں وہی کرتا جو حضرت عثمان نے کیا تھا۔

ابو الحسن بن بطلال نے کہا: حضرت عثمان کے مصاحف کو جمع قرآن کے وقت جلانے کے حکم سے، ان کتب کے جلانے کا جواز ثابت ہوتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کے اسماء ہوتے ہیں اور یہ ان نسخوں کا اکرام تھا اور انہیں قدموں کے نیچے روندے جانے سے اور زمین میں ضائع ہونے سے بچانے کے لئے تھا۔ معمر نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ وہ ان صحف کو جلا دیتے تھے جب ان کے پاس رسائل جمع ہو جاتے تھے جن میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھا ہوا ہوتا تھا۔ حضرت عروہ بن زبیر نے فقہ کی کتب جلائیں جو جنگ کے دن ان کے پاس تھیں۔ ابراہیم نے ان صحیفوں کو جلانے کو ناپسند کیا جن میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو اور جلانے والے کا قول اولیٰ بالصواب ہے۔ حضرت عثمان نے ایسا کیا تھا۔ قاضی ابوبکر نے لسان الامہ میں کہا: امام کے لئے ان صحیفوں کو جلانا جائز ہے جن میں قرآن ہو جب اس کا اجتہاد ان کو جلانے تک پہنچے۔

**فصل:** ہمارے علماء نے فرمایا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فعل میں حلوٰیہ اور حشوٰیہ فرقوں کا رد ہے جو حروف اور اصوات قدیم کہتے ہیں، اور کہتے ہیں قراءت اور تلاوت قدیم ہیں ایمان قدیم ہے اور روح قدیم ہے حالانکہ امت محمدیہ اور امت نصاریٰ، یہود اور براہمہ بلکہ ہر مذهب و موجد کا اجماع ہے کہ قدیم وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ قادر کی قدرت کسی وجہ اور سبب سے متعلق نہیں ہوتی اور قدیم پر عدم جائز نہیں ہوتا اور قدیم محدث نہیں ہوتا اور محدث قدیم نہیں ہوتا اور قدیم وہ ہوتا ہے جس کے وجود کے لئے آغاز نہیں اور محدث (حادث) وہ ہوتا ہے جو نہ ہونے کے بعد ہوتا ہے یہ طائفہ ملتوں کے عقائد کے اجماع کے خلاف کہنے والا ہے۔ وہ کہتے ہیں: محدث کے لئے قدیم ہونا جائز ہے اور بندہ جب اللہ کا کلام پڑھتا ہے تو وہ اللہ کے کلام کو قدیم بنا دیتا ہے، اسی طرح جب وہ کسی اینٹ اور لکڑی سے حروف تراشتا ہے یا سونے اور چاندی سے حروف بناتا ہے یا کوئی کپڑا بناتا ہے اور اس پر کتاب اللہ کی کوئی آیت منقش کرتا ہے تو انہوں نے کلام اللہ کو قدیم بنا دیا اس کا کلام منسوخ قدیم، منخوت قدیم، مصنوع قدیم ہو گیا۔ انہیں کہا جائے گا تم اللہ تعالیٰ کے کلام کے متعلق کیا کہتے ہو، کیا اس کا پگھلانا، مٹانا اور جلانا جائز ہے؟ اگر وہ کہیں ہاں تو وہ دین سے نکل گئے اگر وہ کہیں نہیں تو انہیں کہا جائے گا تمہارا ان حروف کے بارے میں کیا قول ہوگا۔ شمع یا سونا یا چاندی یا لکڑی یا کاغذ سے کتاب سے کسی آیت کی جن سے تصویر بنائی گئی ہے پھر وہ آگ میں گری اور جل گئی اور پگھل گئی، کیا تم کہتے ہو کہ اللہ کا کلام جل گیا؟ اگر وہ کہیں ہاں تو انہوں نے اپنا قول چھوڑ دیا اگر وہ کہیں نہیں تو انہیں کہا جائے گا کیا تم نے نہیں کہا کہ یہ کتاب کلام اللہ ہے حالانکہ وہ جل گیا ہے، اور تم نے کہا یہ حروف اللہ کا کلام ہیں حالانکہ وہ پگھل گئے ہیں، اگر وہ کہیں حروف جل گئے ہیں اور کلام اللہ باقی ہے تو وہ حق اور صواب کی طرف لوٹ آئے اور وہ جواب کے قریب ہو گئے یہ وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس پر تنبیہ کرتے ہوئے جو اہل حق کہتے ہیں۔ اگر قرآن کھال میں ہو پھر آگ میں واقع ہو تو وہ نہیں جلے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ پر کتاب نازل کی گئی ہے جس کو پانی نہیں دھوتا تم اسے سوتے ہوئے اور بیدار ہوتے ہوئے پڑھتے ہو (1)۔ مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اللہ کا کلام نہ حروف ہے اور نہ حروف کے مشابہ ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیبہا، باب الصفات التي يعرف بها أهل الدنيا أهل الجنة



اس مسئلہ میں کلام طویل ہے۔ اس کی مکمل بحث کتب اصول میں ہے۔ ہم نے اس مسئلہ کو الکتاب الاسنی، فی شرح اسماء اللہ الحسنی میں بیان کر دیا ہے۔

**فصل:** روافض، اللہ ان کو تباہ و ناکام کرے، قرآن میں طعن کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ایک شخص آیت اور حرف کی نقل میں کافی ہے جیسا کہ تم نے کیا، تم نے ایک شخص کے قول سے سورہ برأت کا آخر ثابت کیا وہ خزیمہ بن ثابت تھا ہے اور وہن المؤمنین برجال (الاحزاب: 23) بھی اسی ایک شخص سے ثابت کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خزیمہ رضی اللہ عنہ نے جب ان آیات کو بیان کیا تو بہت سے صحابہ کو یاد آ گئیں۔ حضرت زید ان دو آیات کو پہچانتے تھے۔ اسی وجہ سے فرمایا: میں نے سورہ توبہ کے آخر سے دو آیتیں مفقود پائیں اگر وہ ان آیتوں کو نہ جانتے ہوتے تو وہ نہ جانتے کہ کیا کوئی آیت مفقود ہے یا نہیں۔ آیت اجماع سے ثابت ہوئی نہ کہ تنہا حضرت خزیمہ سے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک حضرت خزیمہ کی گواہی سے ثابت ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں اس کی صحت پر دلیل قائم ہے۔ یہ قرینہ ہے جو دوسرے گواہ کے طلب سے مستغنی کر دیتا ہے بخلاف آیت احزاب کے۔ وہ حضرت زید اور حضرت ابو خزیمہ کی شہادت سے ثابت ہوئی کیونکہ ان دونوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ آیت سنی تھی۔ مہلب نے یہ مفہوم بیان کیا اور ذکر کیا کہ حضرت خزیمہ، حضرت ابو خزیمہ کے علاوہ ہے اور حضرت ابو خزیمہ وہ ہے جن کے پاس آیت توبہ پائی گئی، یہ انصار میں سے معروف صحابی ہیں۔ حضرت انس نے اس کو پہچانا اور کہا: ہم اس کے وارث ہیں اور سورہ احزاب کی آیت حضرت خزیمہ بن ثابت کے پاس پائی گئی، پس کوئی تعارض نہیں۔ یہ واقعہ اس واقعہ سے مختلف ہے اس میں کوئی اشکال اور التباس نہیں ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: حضرت ابو خزیمہ کے نام کی صحت پر آگاہی نہیں ہے وہ اپنی کنیت کے ساتھ مشہور ہے اور وہ حضرت ابو خزیمہ بن اوس بن زید بن اصرم بن ثعلبہ بن غنم بن مالک بن نجار ہے یہ جنگ بدر اور اس کے بعد کی جنگوں میں شریک ہوئے تھے اور حضرت عثمان کے دور خلافت میں فوت ہوئے تھے، یہ مسعود بن اوس کے بھائی تھے۔ ابن شہاب نے عبید بن سابق سے انہوں نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ میں نے سورہ توبہ کی آخری آیات حضرت ابو خزیمہ انصاری کے پاس پائیں، یہ وہ ہے جس کا حارث بن خزیمہ ابو خزیمہ سے نسبی رشتہ نہیں ہے مگر انصار میں دونوں جمع ہوتے ہیں۔ ایک اوسی ہے اور دوسرا خزرجی ہے۔ مسلم اور بخاری نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انصار میں سے چار شخصوں نے جمع کیا تھا۔ حضرات ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید۔ میں نے حضرت انس سے کہا: ابو زید کون ہے؟ انہوں نے کہا: میرے چچوں میں سے ایک ہے (1)۔ بخاری میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور قرآن چار آدمیوں کے علاوہ کسی نے جمع نہیں کیا تھا: حضرات ابو دردائی، معاذ بن جبل، زید اور ابو زید۔ حضرت انس نے کہا: ہم ابو زید کے وارث بنے (2)۔ دوسری روایت میں ہے، فرمایا: ابو زید فوت ہوئے اور کوئی اولاد نہ چھوڑی وہ بدری صحابی تھے ابو زید کا نام سعد بن

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 4619، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بن کعب الخ

2۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 4620، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبدتھا۔ ابن طیب نے فرمایا: یہ آثار دلالت نہیں کرتے کہ نبی کریم ﷺ کی حیات ظاہرہ میں قرآن محفوظ نہیں تھا اور ان چار کے علاوہ کسی نے جمع نہیں کیا تھا جیسا کہ حضرت انس بن مالک نے کہا ہے۔ طرق متواترہ سے ثابت ہے کہ قرآن حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت تمیم داری، حضرت عبادہ بن صامت اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم نے جمع کیا۔ حضرت انس کا قول کہ قرآن ان چار افراد کے علاوہ کسی نے جمع نہیں کیا تھا یہ احتمال رکھتا ہے کہ ان چار کے علاوہ کسی نے رسول اللہ ﷺ کے منہ مبارک سے حاصل نہیں کیا تھا اور جمع نہیں کیا تھا کیونکہ اکثر صحابہ نے ایک دوسرے سے حاصل کیا تھا۔ روایات ایک دوسرے کی معاون ہیں کہ خلفاء اربعہ نے نبی کریم ﷺ کے عہد میں قرآن جمع کیا تھا کیونکہ وہ اسلام میں سبقت لے گئے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں عظمت دی تھی۔

میں کہتا ہوں: قاضی نے، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سالم مولیٰ ابو حذیفہ کا ذکر نہیں کیا، میرے خیال میں ان دونوں نے قرآن جمع کیا ہوا تھا۔ جریر نے عبداللہ بن یزید صہبانی سے انہوں نے کمال سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا اور آپ کے ساتھ ابو بکر بھی تھے اور وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے چاہا تھا۔ ہم حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس سے گزرے وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ کون ہے جو قرآن پڑھ رہا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ عبداللہ بن ام عبد ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عبداللہ اسی طرح قرآن پڑھ رہا ہے جس طرح پہلی قراءت پر نازل ہوا ہے۔ بعض علماء نے غضا کما انزل کا معنی یہ بیان فرمایا کہ وہ پہلے حرف پر پڑھ رہا ہے جس پر قرآن نازل ہوا تھا نہ کہ ان سات حروف پر جن کی قراءت پر رسول اللہ ﷺ کو رخصت دی گئی تھی۔ اس کے بعد ہر رمضان میں جبریل آپ سے قرآن کے دور فرماتے تھے۔ وکیع اور ایک جماعت نے اعمش سے انہوں نے ابو ظبیان سے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا: تم کون سی قراءت پر پڑھتے ہو؟ میں نے کہا: پہلی قراءت جو ابن ام عبد کی قراءت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے مجھے فرمایا بلکہ یہ دوسری قراءت ہے۔ رسول اللہ ﷺ ہر سال جبریل کو قرآن سناتے تھے جب آپ کے وصال کا سال تھا آپ نے دو مرتبہ قرآن سنایا۔ اس وقت حضرت عبداللہ بھی موجود تھے۔ پس حضرت عبداللہ نے جان لیا جو اس میں سے منسوخ ہوا تھا اور جو تبدل ہوا تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: قرآن چار شخصوں سے حاصل کرو: ابن ام عبد سے، پہلے ان کا نام ذکر فرمایا، معاذ بن جبل سے، ابی بن کعب سے سالم مولیٰ ابی حذیفہ سے۔

میں کہتا ہوں: یہ اخبار دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عبداللہ نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں قرآن جمع کر لیا تھا بخلاف پہلی روایات کے۔ واللہ اعلم۔ ابو بکر انباری نے کتاب الرد میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں محمد بن شہریار نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں حسین بن اسود نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں یحییٰ بن آدم نے بتایا انہوں نے ابو بکر سے انہوں نے ابو اسحاق سے روایت کیا ہے فرمایا: حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کے منہ مبارک سے بہتر اور بہتر سورتیں پڑھیں۔ میں نے آپ پر سورہ بقرہ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٠٠﴾ (البقرہ) تک پڑھی۔ ابو اسحاق نے کہا: حضرت

عبداللہ نے باقی قرآن مجید بن جاریہ انصاری سے سیکھا تھا۔

میں کہتا ہوں: اگر یہ صحیح ہیں تو وہ اجماع صحیح ہے جس کا ذکر یزید بن ہارون نے کیا ہے۔ اسی وجہ سے قاضی ابوبکر بن طیب نے نبی کریم ﷺ کی زندگی میں قرآن جمع کرنے والوں کے ساتھ ان کا ذکر نہیں کیا۔

ابوبکر انباری نے کہا: مجھے ابراہیم بن موسیٰ الخوزی نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں یوسف بن موسیٰ نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں مالک بن اسماعیل نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں زہیر نے بتایا انہوں نے ابواسحاق سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے اسود سے پوچھا کہ حضرت عبداللہ سورہ اعراف کے ساتھ کیا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا: وہ اسے سیکھتے تھے حتیٰ کہ کوفہ میں آگئے بعض اہل علم نے کہا: حضرت عبداللہ بن مسعود کا وصال ہو گیا تھا معوذتین سیکھنے سے پہلے۔ اسی وجہ سے ان کے مصحف میں دو سورتیں نہ تھیں۔ اس کے علاوہ بھی علماء کے قول میں مزید بیان معوذتین کے ذکر کے وقت ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابوبکر نے کہا: وہ حدیث جو ہمیں ابراہیم بن موسیٰ نے بیان کی انہوں نے کہا ہمیں یوسف بن موسیٰ نے بیان کی، انہوں نے کہا: ہمیں عمر بن ہارون خراسانی نے بیان کیا انہوں نے ربیعہ بن عثمان سے انہوں نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا، فرمایا: جنہوں نے قرآن ختم کر لیا تھا اور رسول اللہ ﷺ ظاہری حیات میں تھے۔ وہ حضرات عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم تھے۔ اہل علم کے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ یہ محمد بن کعب پر مقصور ہے وہ مقطوع ہے اس کو نہ لیا جائے گا نہ اس پر اعتماد ہوگا۔ میں کہتا ہوں: نبی کریم ﷺ کا ارشاد (قرآن چار شخصوں سے حاصل کرو، ابن ام عبد) یہ اس کی صحت پر دلیل ہے اور ان چیزوں میں سے جو تیرے لئے بیان کرتی ہیں کہ اصحاب قراءات اہل حجاز، شام اور عراق میں سے تھے ان میں سے ہر ایک نے ایسی قراءت حضرت کو اس کی طرف منسوب کیا ہے جس کو صحابہ میں سے کسی ایک نے اختیار کیا تھا اس نے رسول اللہ ﷺ پر اس کو پڑھا تھا اور جملہ قرآن سے کسی چیز کی استثنیٰ نہیں کی۔ عاصم نے اپنی قراءت حضرت علی اور حضرت ابن مسعود کی طرف منسوب کی اور ابن کثیر نے اپنی قراءت ابی کی طرف منسوب کی۔ اسی طرح ابوعمر و بن علاء نے اپنی قراءت ابی کی طرف منسوب کی اور عبداللہ بن عامر نے اپنی قراءت حضرت عثمان کی طرف منسوب کی۔ یہ تمام کہتے ہیں: ہم نے رسول اللہ ﷺ پر قرآن پڑھا۔ ان قراءتوں کی اسانید متصل ہیں اور ان کے رجال ثقہ ہیں یہ خطابی کا قول ہے۔

قرآن کی سورتوں، آیات، شکل، نقطوں، منازل، تعشیر، حروف کی تعداد، اجزاء

کلمات اور آیت کی ترتیب کے بارے میں جو وارد ہے

ابن طیب نے کہا: اگر کوئی کہنے والا کہے کہ سلف کا قرآن کی سورتوں کی ترتیب میں اختلاف ہے، بعض نے اپنے مصحف میں سورتوں کو ان کے نزول کی ترتیب کے اعتبار سے لکھا مگر کوئی پر مقدم کیا۔ بعض نے اپنے مصحف میں پہلے سورہ الحمد لکھی، بعض نے پہلے اِقْدَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ (علق: 1) لکھی۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مصحف کے آغاز میں تھی اور مصحف ابن مسعود کے آغاز میں مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ (فاتحہ: 3) پھر سورہ بقرہ پھر النساء تھی یعنی مختلف ترتیب پر تھے۔ مصحف ابی کی ابتدا میں الحمد، پھر سورہ



نساء پھر آل عمران پھر انعام پھر اعراف پھر مائدہ تھی پھر اسی طرح شدید اختلاف تھا۔ قاضی ابوبکر بن طیب نے کہا: اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ ترتیب پر قرآن صحابہ کے اجتہاد کی بنا پر تھا۔ یہ مکی بن ابی ربیع نے سورہ برأت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور انہوں نے ذکر کیا ہے کہ سورتوں میں آیات کی ترتیب اور سورتوں کی ابتدا میں بسم اللہ لکھنا نبی کریم ﷺ کی طرف سے تھا۔ جب آپ نے سورہ برأت کے آغاز میں بسم اللہ لکھنے کا حکم نہ دیا تو بسم اللہ نہ لکھی گئی۔ یہ اصح ہے جو کچھ اس کے متعلق کہا گیا ہے۔

ابن وہب نے اپنی جامع میں ذکر کیا ہے، فرمایا: میں نے سلیمان بن بلال کو یہ کہتے سنا کہ میں نے ربیعہ کو یہ کہتے سنا، ان سے پوچھا گیا سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کیوں مقدم کی گئی ہے حالانکہ ان سے پہلے اسی (80) سے زائد سورتیں نازل ہوئی تھیں یہ سورتیں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی تھیں تو ربیعہ نے کہا: یہ دو سورتیں مقدم کی گئیں اور قرآن اس کے علم پر مرکب کیا گیا جس نے اس کو مرکب کیا تھا اور اس علم پر اجتماع ہوا۔ پس اس تک ہماری انتہا ہے اور ہم سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ سنید نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں معتمر نے بتایا انہوں نے سلام بن مسکین سے انہوں نے قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت ابن مسعود نے فرمایا: جو تم میں سے پیروی کرنا چاہے وہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کی پیروی کرے کیونکہ وہ دلوں کے اعتبار سے اس امت میں نیکو کار تھے، علم کے اعتبار سے گہرے تھے، تکلف کے اعتبار سے کم تھے، ہدایت کے اعتبار سے درست تھے، حالات کے اعتبار سے خوبصورت تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت کے لئے اختیار فرمایا تھا اور اپنے دین کے قیام کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ پس تم ان کی فضیلت کو پیچانو اور ان کے آثار کی اتباع کرو کیونکہ وہ سیدھی راہ پر تھے۔ اہل علم کی ایک قوم نے کہا: سورتوں کی تالیف جو ہمارے مصحف میں ہے نبی کریم ﷺ کی طرف سے توقیفی ہے اور جو حضرات ابی، علی اور عبد اللہ کے مصحف میں اختلاف مروی ہے وہ آخری مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے جبریل پر پڑھنے سے پہلے کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے سورتوں کی تالیف کو مرتب فرمایا اس کے بعد کہ پہلے ایسا نہیں کیا تھا۔ یونس نے ابن وہب سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ قرآن اسی طرح پر تالیف ہے جس طرح صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا۔ ابوبکر انباری نے کتاب الرد میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اکٹھا آسمان دنیا پر اتارا پھر بیس سال میں نبی کریم ﷺ پر متفرق طور پر نازل ہوتا رہا (1)۔ کوئی سورت کسی واقعہ کے بارے میں نازل ہوتی جو روپذیر ہوتا۔ کوئی آیت کسی سوال کرنے والے کا جواب ہوتی۔ جبریل امین، رسول اللہ ﷺ کو سورہ اور آیت کی جگہ پر آگاہ کرتے۔ پس سورتوں کا سیاق بھی آیات اور حروف کے سیاق کی طرح ہے یہ سب محمد خاتم النبیین ﷺ سے مروی ہیں اور انہوں نے رب العالمین سے روایت کیا ہے جس نے مقدم سورت کو مؤخر کیا، یا مؤخر کو مقدم کیا تو وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے آیات کے نظم کو خراب کیا، حروف اور کلمات کو بدلا اور اہل حق پر سورہ بقرہ کے انعام پر مقدم ہونے پر کوئی حجت نہیں ہے، سورہ انعام، بقرہ سے پہلے نازل ہوئی تھی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسی ترتیب سے لی تھی۔ آپ خود فرماتے تھے: اس سورت کو قرآن کی فلاں جگہ پر رکھو۔ جبریل آیات کی جگہ پر آگاہ کرتے تھے۔

1- صحیح قول یہ ہے کہ تقریباً تیس 23 سالوں میں اس کا نزول ہوا۔

حسن بن حباب نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ابوہشام نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ابو بکر بن عیاش نے بتایا انہوں نے ابو اسحاق سے انہوں نے براء سے روایت کیا، فرمایا: قرآن میں سے جو آخر میں نازل ہوا یہ آیت تھی: **يَسْتَفْتُونَكَ قُلُوبُهُمْ يُفْتِيكَمُ فِي الْكَلَلَةِ (النساء: 176)**

ابو بکر بن عیاش نے کہا: ابو اسحاق نے غلطی کی کیونکہ محمد بن سائب نے ہمیں ابو سائب سے روایت کر کے بتایا اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا، فرمایا: قرآن میں سے جو آخر میں نازل ہوا وہ یہ آیت تھی: **وَالْتَقُوا يَوْمَ تَرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ (البقرہ)**

جبریل نے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کو سورۃ بقرہ کی دوسواں آیت کے آغاز میں رکھو۔

ابو الحسن بن بطلال نے کہا: جو علماء یہ کہتے ہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ قرآن کی تلاوت نماز میں اور درس میں مصحف کی ترتیب پر واجب ہے بلکہ رسم اور خط میں سورہ کی تالیف واجب ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کسی نے یہ کہا ہو کہ یہ ترتیب نماز میں اور قرآن کی تلاوت میں اور درس میں واجب ہے، اور کسی کے لئے سورۃ بقرہ سے پہلے سورۃ کہف کا سیکھنا حلال نہیں اور کہف سے پہلے حج کا سیکھنا حلال نہیں..... کیا آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ملاحظہ نہیں فرمایا جس نے آپ سے پوچھا تھا تجھے کوئی نقصان نہ دے گی تو پہلے جو آیت بھی تلاوت کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ایک رکعت میں ایک سورت تلاوت کرتے تھے پھر دوسری رکعت میں اس سورت کے علاوہ پڑھتے تھے جو پہلی رکعت کی سورت کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی تھی اور حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر سے جو مروی ہے کہ وہ قرآن کو الٹا پڑھنے کو ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: یہ دل کے لئے کرنے کا باعث ہے۔ انہوں نے اس سے مراد سورت کو الٹا پڑھنا لیا ہے مثلاً آخر سے شروع کرے اور ابتداء تک لے آئے، یہ ممنوع اور حرام ہے۔ لوگوں میں سے کچھ لوگ قرآن اور اشعار میں ایسا کرتے ہیں تاکہ ان کی زبان اس کے ساتھ چلے اور حفظ پر قادر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت کو ممنوع قرار دیا ہے اور قرآن میں اس سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ سورت کا خراب کرنا ہے اور سورت سے جو مقصود ہے اس کی مخالفت ہے۔

مصاحف میں قرآن کا اثبات، تاریخ نزول کے اعتبار سے واجب نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ صحیح اور ثابت شدہ بات ہے کہ آیات مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں وہ کی سورتوں میں رکھی گئیں۔ کیا آپ نے حضرت عائشہ کا قول ملاحظہ نہیں فرمایا۔ سورۃ بقرہ اور النساء نازل ہوئیں تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی (1) یعنی مدینہ طیبہ میں اور یہ دونوں سورتیں مصحف میں مقدم کی گئیں ان سورتوں پر جو مکہ میں نازل ہوئی تھیں۔ اگر وہ تاریخ نزول پر مرتب کرتے تو سورتوں کی آیات کی ترتیب کا ٹوٹنا واجب ہوتا۔

ابو بکر انباری نے کہا: ہمیں اسماعیل بن اسحاق قاضی نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں حجاج بن منہال نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ہمام نے بتایا، انہوں نے قتادہ سے روایت کیا، فرمایا: قرآن میں سورۃ بقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانفال، برأت، الرعد، النحل، الحج، النور، الاحزاب، محمد، الفتح، الحجرات، الرحمن، الحديد، المجادلہ، الحشر، الممتحنہ، القف، الجمعۃ،

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، حدیث نمبر 4609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

المناقون، التغابن، الطلاق اور یا ایہا النبی لم تحرم دس آیات، اذا زلزلت، اذا جاء نصر اللہ یہ تمام سورتیں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں اور باقی قرآن مکہ میں نازل ہوا۔

ابوبکر نے کہا: جس نے اثر کے ترک اور اجماع سے اعراض پر عمل کیا اور سورتوں کو مکہ مدینہ کے منازل کے اعتبار سے منظم کیا اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ سورہ فاتحہ کو کہاں رکھے کیونکہ اس کے نزول کی جگہ کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے اور جو شخص اس آیت کو مؤخر کرنے کی طرف مجبور ہوا وہ سورہ بقرہ کی دو سو پینتیس سے چالیس تک ہیں اور جس نے نظم قرآن کو خراب کیا اس نے کفر کیا اور حضرت محمد ﷺ نے جو رب تعالیٰ سے حکایت کیا اس کا رد کیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ مدنی سورتوں کی مکی سورتوں پر تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو ان کی لغت کے ساتھ خطاب فرمایا اور خطاب کے فنون اور محاورات میں خطاب فرمایا جن کو عرب جانتے تھے۔ جب ان کی کلام کا فن مؤخر کو مقدم کرنے اور مقدم کو مؤخر کرنے پر مبنی تھا تو اس معنی کے ساتھ کتاب اللہ میں ان کو خطاب کیا گیا۔ اگر وہ قرآن میں یہ فن نہ پاتے تو کہہ سکتے تھے کہ یہ کیسا کلام ہے جو ہمارے پسندیدہ کلام میں جو نظم تھا اس سے یہ خالی ہے۔ عبید بن ابرص نے کہا:

ان بُذلت منہم وحوشاً و غیرت حالہا الخطوب  
عیناک دمعہا سروب کان شأنیہما شعیب

اصل کلام اس طرح ہے: عیناک دمعہا سروب لان تبدلت من اہلہا وحوشاً۔ مؤخر کو مقدم کیا اور مقدم کو مؤخر کیا اور سروب کا معنی ہے زمین کی سطح پر انڈیلا گیا، اسی سے سارب ہے زمین میں سیدھا چلنے والا۔ شاعر نے کہا: ان سرابت و کنت غیر سروب۔ میں چلا اور تو نہیں چلی۔

اور شأنیہما، شان واحد ہے اس کی جمع شون ہے۔ سر کے حصوں کو ملانے والی جگہ اس سے آنسو آتے ہیں۔ شعیب سے مراد متفرق ہے۔

### فصل: مصحف کے اعراب اور اس کے نقطے

روایت ہے کہ عبد اللہ بن مروان نے ان کا حکم دیا تھا، واسط میں حجاج نے یہ کام کیا اور اس میں بڑی کوشش کی اور اس کی تحزیب کا اضافہ کیا۔ اس نے حسن بصری اور یحییٰ بن یعمر کو یہ کام کرنے کا حکم دیا جب وہ عراق کا والی تھا۔ اس کے بعد واسط میں اس کی قراءتوں کے بارے میں کتاب تالیف کی اس میں ان تمام روایتوں کو جمع کیا جن میں لوگوں کا اختلاف تھا اور جن میں خط کی موافقت تھی، لوگ اس پر ایک زمانہ تک چلتے رہے یہاں تک کہ ابن مجاہد نے اپنی کتاب قراءات کے بارے میں ترتیب دی۔ زبیدی نے کتاب الطبقات میں مبرد تک سند بیان کر کے کہا کہ سب سے پہلے مصحف کے نقطے ابو اسود دؤلی نے لگائے تھے۔ اور اس طرح اس نے یہ ذکر کیا ہے کہ ابن سیرین کا مصحف تھا اس پر یحییٰ بن یعمر نے نقطے لگائے تھے۔

### فصل: دس دس آیات کے بعد نشان لگانا

ابن عطیہ نے کہا: بعض تاریخ کی کتب میں گزرا کہ مامون عباسی نے اس کا حکم دیا تھا، بعض نے کہا: حجاج نے یہ کام کیا



تھا ابو عمرو الدانی نے کتاب البیان میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ مصحف میں دس آیتوں کے بعد نشانات لگانا مکروہ ہے وہ اس کو مٹا دیتے تھے۔ مجاہد سے مروی ہے کہ وہ مصحف میں خوشبو اور تحشیر کو ناپسند کرتے تھے۔ اشہب نے کہا: میں نے امام مالک سے سنا ان سے ان نشانات کے بارے میں پوچھا گیا جو سرخ سیاہی کے ساتھ یا دوسرے رنگوں کے ساتھ لگائے جاتے ہیں تو امام مالک نے اس کو ناپسند فرمایا اور فرمایا: سیاہی کے ساتھ مصحف کے دس دس آیتوں کے بعد نشان لگانے میں کوئی حرج نہیں ان مصاحف کے بارے میں پوچھا گیا جن میں سورتوں کے خواتم لکھے جاتے ہیں ہر سورت میں جتنی اس کی آیات ہوتیں۔ امام مالک نے فرمایا میں مصاحف کے اصل نسخوں میں سے کسی بھی چیز کو لکھنا یا کوئی شکل بنانا ناپسند کرتا ہوں۔ رہے وہ نشانات جو بچوں کو سکھانے کے لئے ہوتے ہیں ان میں کوئی حرج نہیں دیکھتا۔ اشہب نے کہا: پھر ہمارے لئے انہوں نے اپنے دادا کا مصحف نکالا جو انہوں نے اس وقت لکھا تھا جب حضرت عثمان نے مصاحف لکھوائے تھے ہم نے اس کا خواتم دیکھا وہ سیاہی سے لمبی سطر میں تھا اور میں نے دیکھا کہ اس کی سیاہی کے ساتھ آیتوں کو نشان لگایا گیا تھا۔ قتادہ نے فرمایا: پہلے انہوں نے نقطے لگائے پھر پانچ آیتوں پر نشان لگائے پھر دس دس آیتوں پر نشان لگائے۔ یحییٰ بن ابی کثیر نے کہا: قرآن، مصاحف میں مجرد تھا سب سے پہلے باء، تاء اور ثاء پر نقطے لگائے گئے تھے اور علماء نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں یہ اس کے لئے نور ہے پھر آیات کے اختتام پر نقطے ایجاد کئے پھر فواتح اور خواتیم ایجاد ہوئے۔ ابو حمزہ سے مروی ہے، فرمایا: ابراہیم نخعی نے میرے مصحف میں سورت کے آغاز میں اس طرح دیکھا تو فرمایا: اس کو مٹا دو کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: کتاب اللہ میں کوئی ایسی چیز داخل نہ کرو جو اس میں سے نہیں ہے۔ ابو بکر سراج سے مروی ہے، فرمایا: میں نے ابو رزین کو کہا: کیا میں اپنے مصحف میں سورت اس اس طرح لکھوں؟ انہوں نے فرمایا: مجھے اندیشہ ہے کوئی اس کی حقیقت کونہ جانتے ہوئے اسے قرآن نہ گمان کرنے لگے۔

الدانی نے کہا: یہ تمام اخبار اس بات پر آگاہی دیتی ہیں کہ تحشیر، تخمیس، فواتح السور، ردوؤس الآیات صحابہ کے عمل سے تھے، اس عمل کی طرف ان کی اجتہاد نے رہنمائی کی اور میرا خیال ہے جنہوں نے اس کو مکروہ کہا انہوں نے مختلف رنگوں مثلاً سرخ، زرد رنگ کے استعمال کی وجہ سے مکروہ کہا کیونکہ تمام آفاق میں مسلمانوں کا اس کے جواز اور اصل نسخوں میں اس کے استعمال پر اتفاق ہے اور حرج اور خطا دونوں ان سے اٹھ جاتے ہیں جس میں مسلمانوں کا اتفاق ہو جائے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

### فصل: حروف کی تعداد اور اس کے اجزاء کے بارے میں

سلام ابو محمد حماتی نے روایت کیا ہے کہ حجاج بن یوسف نے قراء، حفاظ اور کاتبوں کو جمع کیا اور کہا: مجھے بتاؤ سارے قرآن کے کتنے حروف ہیں؟ سلام نے کہا: میں بھی ان میں تھا ہم نے حساب لگایا تو ہم نے اس بات پر اجماع کیا کہ قرآن کے تین لاکھ چالیس ہزار سات سو چالیس حروف ہیں۔ پھر حجاج نے کہا: مجھے بتاؤ۔ کس حرف پر نصف قرآن ختم ہوتا ہے؟ تو وہ سورہ کہف میں ولیتلطف کی فاء پر ہوتا تھا۔ پھر اس نے کہا: اس کے تین حصے کہاں تک بنتے ہیں؟ تو پہلا تہائی سورہ برأت کی سویں آیت پر، دوسری تہائی سورہ الشعراء کی سویں یا ایک سو ایک آیت پر بنتا ہے اور تیسری تہائی باقی قرآن ہے۔ پھر اس نے کہا: حروف کے

اعتبار سے سات حصے کہاں کہاں تک بنتے ہیں؟ تو پہلا ساتواں سورہ نساء میں منہم من صد کی دال میں، دوسرا ساتواں حصہ اعراف میں حبیط کی تاء میں، تیسرا ساتواں حصہ سورہ الرعد (اکلھا دائم) میں اکلھا کے آخری الف میں، چوتھا ساتواں حصہ سورہ الحج میں ولکل امة جعلنا منسكاً کے الف میں، پانچواں ساتواں حصہ سورہ احزاب میں وماکان لمومن ولا مومنة کی ہاء میں چھٹا ساتواں حصہ سورہ الفتح میں الظانین باللہ ظن السوء کی واو میں اور باقی سارا قرآن ساتواں حصہ ہے۔

سلام ابو محمد نے کہا: ہم نے چار مہینے یہ عمل کیا۔ حجاج پر رات کو چوتھائی قرآن پڑھتا تھا۔ پہلا چوتھائی سورہ انعام کا خاتمہ ہے، دوسرا چوتھائی سورہ کہف میں ولیتلطف پر ہے اور تیسرا چوتھائی سورہ الزمر کا خاتمہ ہے اور چوتھا چوتھائی باقی قرآن ہے۔ اس جملہ میں ابو عمرو الدانی کی کتاب البیان میں اختلاف مذکور ہے جو اس سے آگاہی چاہے وہ وہاں مطالعہ کرے۔

### فصل: المدنی الاول میں قرآن کی آیات کی تعداد

محمد بن عیسیٰ نے کہا: مدنی اول میں قرآن کی آیات کی تعداد چھ ہزار ہے۔ ابو عمرو نے کہا: یہ وہ تعداد ہے جو اہل کوفہ نے اہل مدینہ سے روایت کی ہے اور کسی معین شخص کا نام نہیں لیا جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہوں۔ اور رہا المدنی الاخر تو وہ اسماعیل بن جعفر کے قول کے مطابق چھ ہزار دو سو چودہ آیات ہیں۔ فضل نے کہا: مکیوں کے قول کے مطابق قرآن کی آیات کی تعداد چھ ہزار دو سو انیس ہے۔ محمد بن عیسیٰ نے کہا: کوفیوں کے قول کے مطابق قرآن کی آیات کی تعداد چھ ہزار دو سو چھتیس ہے۔ یہ وہ عدد ہے جو سلیم اور کسائی نے حمزہ سے روایت کیا ہے، کسائی نے اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ محمد نے کہا: بصریوں کے قول کے مطابق قرآن کی آیات کی تعداد چھ ہزار دو سو چار ہے یہ وہ عدد ہے جس پر سلف اعتماد کرتے آئے ہیں اور یحییٰ بن حارث دماری نے کہا: اہل شام کے نزدیک تعداد چھ ہزار دو سو چھتیس ہے ایک روایت میں چھ ہزار دو سو پچیس ہے ایک آیت کم ہے۔ ابن ذکوان نے کہا: میرا گمان ہے یحییٰ نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کو شمار نہیں کیا۔ ابو عمرو نے کہا: یہ وہ تعداد ہے جس کو لوگ تالیف میں استعمال کرتے ہیں اور قدیم وجدید تمام آفاق میں اس کو شمار کرتے ہیں۔

رہے قرآن کے کلمات تو فضل بن شاذان نے کہا: قرآن کے تمام کلمات، عطا بن یسار کے قول کے مطابق ستتر ہزار چار سو انتالیس ہیں اور اس کے حروف تین لاکھ تیس ہزار پندرہ ہیں۔

میں کہتا ہوں: حمانی سے جو قول پہلے گزرا ہے یہ اس کے مخالف ہے۔ عبد اللہ بن کثیر نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: وہ تعداد جو ہم نے قرآن سے شمار کی ہے وہ تین لاکھ گیارہ ہزار ایک سو تیس ہے یہ بھی حمانی سے منقول قول کے مخالف ہے۔

### سورت، آیت، کلمہ اور حرف کا معنی

کلام عرب میں سورت کا معنی ایک سورت کو دوسری سورت سے جدا کرنا اور علیحدہ کرنا ہے۔ اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس میں انسان ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بلند ہوتا ہے۔ نابغہ نے کہا:

الم تر ان الله اعطاك سورة تری کل ملک دونها یتذبذب

یعنی کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے شرف والی منزل عطا کی ہے تو ہر بادشاہ کو اس کے بارے میں متذبذب دیکھتا ہے۔

بعض نے فرمایا: اس کو یہ نام اس کے شرف اور بلند ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے جیسا کہ زمین کے بلند ٹکڑے کو سورا کہا جاتا ہے، بعض نے فرمایا: اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کا پڑھنے والا اس مرتبہ پر بلند ہوتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتا جیسے عمارت کی چار دیواری یہ تمام بغیر ہمزہ کے ہے، بعض نے فرمایا: یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ قرآن میں سے علیحدہ ہوتی ہے عرب بقیہ کو سُور کہتے ہیں جاء فی آسار الناس یعنی بقایا ہم۔ اس مفہوم پر سورۃ کی اصل ہمزہ کے ساتھ ہوگی پھر اس میں تخفیف کی گئی اور ماقبل مضموم کی وجہ سے اسے واؤ سے بدلا گیا۔ بعض نے فرمایا: اس کو یہ نام اس کے تمام اور کمال کی وجہ سے دیا گیا ہے عرب مکمل اوٹنی کو سورۃ کہتے ہیں اس کی جمع سُور واو کے فتح کے ساتھ آتی ہے۔ شاعر نے کہا:

سود البحر لا یقرآن بالسور۔

یہ بھی جائز ہے کہ اس کی جمع سُورات اور سُورات ہو۔

الآیۃ اس کا معنی علامت ہے یعنی یہ اس کلام کے انقطاع کی علامت ہوتی ہے جو پہلی ہوتی ہے یعنی اس کا بعد والے کلام سے کوئی تعلق نہیں یعنی یہ اپنے قریب والی سے جدا اور منفرد ہے۔ عرب کہتے ہیں: میرے اور فلاں کے درمیان (آیۃ) علامت ہے۔ اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ (البقرہ: 248) نابغہ نے کہا۔

توهت آیات لها فعرقتها لسته اعوام و ذا العام سابغ

میں نے اس کی آیات کا وہم کیا تو میں نے اسے چھ سال سے پہچان لیا اور یہ ساتواں سال ہے۔

نابغہ نے اس شعر میں آیات کو علامات کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ قرآن کے حروف کی جماعت ہوتی ہے جیسے کہا جاتا ہے: خراج القوم بآیاتہم یعنی لوگ جماعت کے ساتھ نکلے۔ برج بن مسہر الطائی نے کہا:

خرجنا من النقبین لا حی مثلنا بآیاتنا نرجی اللقاء المطافلا

اس شعر میں آیات جماعت کے معنی میں ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ یہ عجیب ہے۔ انسان اس کی مثل کے ساتھ کلام کرنے سے عاجز ہے۔ نحو یوں کا آیۃ کی اصل میں اختلاف ہے۔ سیبویہ نے کہا: یہ فَعْلَۃ کے وزن پر آیۃ تھا جیسے اَکْمَۃ و شَجَرۃ۔ جب یاء متحرک ماقبل مفتوح ہو تو یاء الف سے بدل گئی۔ پس آیۃ ہمزہ کے ساتھ ہے اس کے بعد مدہ ہے۔ کسائی نے کہا: اس کی اصل آیۃ ہے بروزن فاعلۃ جیسے آمنۃ یاء الف سے بدل گئی کیونکہ وہ مفتوح تھی اور اس کا ماقبل متحرک تھا پھر جمع کے ساتھ التباس کی وجہ سے حذف ہو گئی۔ فراء نے کہا: اس کی اصل آیۃ ہے یعنی پہلی یاء مشددہ ہے پھر تشدید کی کراہت کی وجہ سے الف سے بدل گئی اور آیۃ ہو گئی اس کی جمع آی، آیات، آیاء آتی ہے۔



ابوزید نے کہا:

لَمْ يَبْقَ هَذَا الدَّهْرُ مِنْ آيَاتِهِ غَيْرَ اثْنَيْ عَشَرَ وَارْمَدَانِهِ

اس زمانہ میں اپنی آیات میں سے سوائے اپنے پتھروں اور راکھ کے کوئی شی باقی نہیں چھوڑی۔

الحکمة، وہ صورت جو حروف کے ساتھ قائم ہوتی ہے اور قرآن میں لمباترین کلمہ وہ ہے جس کے حروف دس تک پہنچتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَيْسْتَ خَلْفَتَهُمْ اور اَنْتَ مُكْمُوها اور ان کے مشابہ کلمات ہیں، اور فَاَسَقَيْنَكَوُ اس کے لکھنے میں دس حروف ہیں اور بولنے میں گیارہ حروف ہیں اور چھوٹا کلمہ وہ ہے جو دو حروف پر مشتمل ہے جیسے لا، ما، لك، له اور ان کے مشابہ حروف۔ اور معانی کے حروف میں سے وہ جو ایک کلمہ پر مشتمل ہوتے ہیں مثلاً ہمزہ استفہام، واو عاطفہ، مگر اس کو مفرد نہیں بولا جاتا۔ کبھی ایک کلمہ پوری آیت ہوتا ہے مثلاً والفجر، والضحی، والعصر اسی طرح الم، المص، طه، یس، حم یہ کوفیوں کے قول کے مطابق ہے اور یہ سورتوں کے آغاز میں ہیں اور سورتوں کے درمیان میں نہیں ہیں۔

ابو عمرو والدانی نے کہا میں کوئی ایسا کلمہ نہیں دیکھتا جو آیت ہو مگر سورة الرحمن میں مُدَّهَا مَثْنٍ ۝ کا کلمہ، اس کے علاوہ کوئی نہیں، البتہ دو کلمے متصل آتے ہیں اور وہ دو آیتیں ہیں۔

اور یہ اس ارشاد میں ہیں حَمَّ ۝ عَسَقَ ۝ (شوری) کوفیوں کے قول کے مطابق کبھی کلمہ کا لفظ اور معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مکمل آیت اور وہ کلام جو قائم بنفسہ ہے اگرچہ وہ زیادہ ہو یا تھوڑی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْخُسْفٰی كُلِّ بَنِي اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا (الاعراف: 137) بعض علماء نے فرمایا: یہاں کلمہ سے مراد یہ ارشاد ہے: وَنُرِيْدُ اَنْ نُّمِثَّ عَلٰی الَّذِیْنَ اسْتَضَعُّوْا فِی الْاَرْضِ اٰخِرَ الْاٰیَتِیْنَ (القصص: 5) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّذِیْنَ اٰتٰهُمْ كَلِمَةً التَّقْوٰی (الفتح: 26) مجاہد نے کہا اس سے مراد لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: دو کلمے زبان پر خفیف ہیں، میزان پر بھاری ہیں، رحمٰن کو محبوب ہیں سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم (1)۔ عرب پورے قصیدہ اور قصہ کو بھی کلمہ کہتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں: قال قس فی کلمتہ کذا، یعنی قس نے اپنے خطبہ میں کہا: وقال زهیر بنی کلمتہ کذا۔ یعنی اپنے قصیدہ میں یہ کہا قال فلان فی کلمتہ، یعنی فی رسالتہ۔ کلام کے جملہ کو بھی کلمہ کہا جاتا ہے کیونکہ کلمہ اس سے ہوتا ہے۔ عربوں کی عادت ہے کہ کسی شے کا نام اس چیز سے رکھ دیتے ہیں جس سے وہ چیز بنتی ہے یا جو اس کے قریب ہوتی ہے اور اس کا سبب ہوتی ہے۔ یہ مجاز اور اتساعاً ہوتا ہے۔

الحرف: وہ ہوتا ہے جو تنہا قائم ہوتا ہے، حرف کو کلمہ کہا جاتا ہے اور کلمہ کو حرف کہا جاتا ہے اس میں وسعت و مجاز ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ ابو عمرو والدانی نے کہا: اگر کہا جائے کہ ان حروف کو کیسے یہ کہا جائے گا جو سورتوں کے آغاز میں ایک ایک حرف آیا ہوا ہے جیسے (ص، ق اور ن) انہیں حرف یا کلمہ کیسے کہا جائے گا۔

میں کہتا ہوں: کلمہ ہیں حرف نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرف پر سکوت نہیں کیا جاتا اور صورت میں تنہا نہیں ہوتا اور جس سے

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ ونضع المواضع القسط الخ، آخری حدیث، حدیث نمبر 7008، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ملا ہوا ہوتا ہے اس سے جدا نہیں ہوتا اور ان حروف پر سکوت کیا جاتا ہے یہ علیحدہ اور جدا ہوتے ہیں جس طرح کلمہ جدا اور علیحدہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کو کلمات کہا جاتا ہے حروف نہیں کہا جاتا۔ ابو عمرو نے کہا: حرف کبھی اور معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً مذہب اور وجہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمِنَ الثَّانِيں مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلَىٰ حَرْفٍ (الحج: 11) یعنی علی وجہ و مذہب۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے یعنی لغات کی سات وجہ پر نازل کیا گیا ہے (1)۔ واللہ اعلم

## کیا قرآن میں عربوں کی لغت کے علاوہ کسی لغت کے کلمات وارد ہیں یا نہیں

اس میں ائمہ کا اختلاف نہیں کہ قرآن میں غیر عربی اسلوب پر کلام مرکب نہیں اس میں اسماء اعلام ہیں جو عربی زبان میں سے نہیں ہیں جیسے اسرائیل، جبریل، عمران، نوح، لوط۔ اس میں اختلاف ہے کہ کیا اعلام مفردہ کے علاوہ غیر عربی الفاظ ہیں یا نہیں۔ قاضی ابوبکر بن طیب اور طبری وغیرہما کا خیال ہے کہ قرآن میں ایسے الفاظ نہیں ہیں، قرآن صریح عربی ہے اور وہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں اور جن کی نسبت تمام لغات کی طرف ہے ان میں اتفاق ہے کہ لغات ان پر وارد ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ عربوں، فارسیوں اور حبشیوں وغیرہ نے کلام کی ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ قرآن میں ان کا وجود ہے اور یہ الفاظ بہت کم ہیں اس لئے یہ قرآن کو عربی ہونے سے نہیں نکالتے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زبان کے ساتھ کلام کرنے والا ہونے سے نکالتے ہیں۔ المشکاۃ کا معنی طاقت ہے۔ نشا کا معنی رات کو اٹھنا ہے۔ اسی سے ہے إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ (المزل: 6) يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ (الحمدید: 28) یعنی دو ہراجر۔ قُرْآنٌ مِّنْ قَسْوَرَةٍ (المدرثر: 51) قسورہ سے مراد شیر ہیں۔ یہ تمام الفاظ حبشی زبان کے ہیں۔ الغساق ترکی زبان میں بدبودار پانی کو کہتے ہیں القسطاس رومیوں کی لغت میں میزان کو کہتے ہیں، السجیل فارسی زبان میں پتھر اور مٹی کو کہتے ہیں، الطور، سے مراد پہاڑ ہے، الیم سریانی زبان میں دریا کو کہتے ہیں، التنور زمین کی سطح، عجمی زبان کا لفظ ہے۔

ابن عطیہ نے کہا: ان الفاظ کی حقیقت یہ ہے کہ اصل میں یہ عجمی ہیں لیکن عربوں نے ان کو استعمال کیا ہے اور عربی بنایا ہے۔ پس اس وجہ سے یہ عربی ہیں۔ عرب عار بہ جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا وہ تجارت کی وجہ سے اور قریش کے سفروں کی وجہ سے دوسری زبانوں سے بعض الفاظ خلط ملط ہوتے جیسا کہ مسافر بن ابی عمرو نے شام کی طرف سفر کیا۔ اسی طرح حضرت عمر بن خطاب کا سفر، حضرت عمرو بن العاص کا سفر اور عمارہ بن ولید کا حبشہ کی زمین کی طرف سفر، ایشی کا حیرہ کی طرف سفر، اور اس کا نصاریٰ سے ملنا حالانکہ وہ لغت میں حجت تھا۔ ان اسفار کی وجہ سے عربوں نے عجمی الفاظ استعمال کئے، بعض حروف میں کمی کی اور عجمہ کے ثقل کو تخفیف سے بدلا اور ان الفاظ کو اپنے اشعار اور محاورات میں استعمال کیا حتیٰ کہ یہ الفاظ عربی صحیح کے قائم مقام ہو گئے اور ان کا بیان واقع ہوا۔ اس حد پر قرآن ان سات قراءت پر نازل ہوا۔ اگر کوئی عربی ان الفاظ سے جاہل ہو تو وہ صریح عربی کا دوسروں کی لغت کو نہ جاننے کے مترادف ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فاطمہ کا معنی نہ جانا۔ ابن عطیہ نے کہا: طبری کا نظریہ یہ کہ دو لغتیں ایک لفظ میں متفق ہو گئیں یہ بعید ہے بلکہ اکثر میں ایک اصل ہے اور دوسری

۱۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، حدیث 2868، تفصیل اس کے متعلقہ بحث میں ملاحظہ کیجئے۔

فرع ہے کیونکہ ہم قلیل اتفاق کے جواز کا انکار نہیں کرتے۔

دوسرے علماء نے کہا: پہلا قول اصح ہے اور یہ دوسروں کے کلام میں اصل ہے اور عربوں کے کلام میں دخیل ہے۔ یہ قول اپنے برعکس قول سے اولیٰ نہیں کیونکہ عربوں نے اس کے ساتھ خطاب کیا ہوگا یا نہیں۔ اگر پہلی صورت ہو تو یہ ان کے کلام سے ہوگا کیونکہ ان کی لغت اور کلام کا اور کوئی معنی نہیں مگر جو ان کے نزدیک اسی طرح ہو۔ اور یہ بھی بعید نہیں کہ دوسروں نے بعض کلمات پر ان کی موافقت کی ہو۔ یہ امام کبیر ابو عبیدہ نے کہا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ کلمات عرب کلام کے اوزان پر نہیں ہیں۔ پس یہ عرب کلام سے نہیں ہیں ہم کہیں گے کسی نے تمہارے لئے یہ تسلیم کیا ہے کہ تم نے عربوں کے اوزان کو شمار کر لیا ہے تاکہ تم ان الفاظ کو ان اوزان سے خارج کر دو۔ قاضی نے کلام عرب کے اوزان اصول سے بحث کی ہے اور ان اسماء کو نحوی طریقہ پر ان اصولوں کی طرف لوٹایا ہے۔ اگر عربوں نے ان کے ساتھ کلام نہیں کیا ہے اور نہ عربوں نے پہچانا ہے تو اللہ تعالیٰ کا ان سے ایسی کلام سے کلام کرنا محال ہے جس کو وہ نہ جانتے ہوں۔ اس صورت میں تو قرآن عربی مبین نہیں رہے گا اور نہ رسول اللہ ﷺ اپنی قوم کو ان کی زبان میں خطاب کرنے والے ہوں گے۔

## اعجاز قرآن میں نکات کا ذکر، معجزہ کی شرائط اور اس کی حقیقت

معجزہ اس کی جمع معجزات ہے۔ انبیاء کے معجزات ان کی صداقت پر دلیل ہوتے ہیں۔ معجزہ کو معجزہ اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ دوسرے انسان اس کے لانے سے عاجز ہوتے ہیں۔ اس کی پانچ شرائط ہیں۔ اگر ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو وہ معجزہ نہ ہوگا۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اس پر قادر نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ، اور معجزہ کے لئے اس شرط کا حصول واجب ہے کیونکہ اگر کوئی آنے والا ایسے زمانہ میں آیا جس میں رسل کا آنا صحیح ہو اور اس نے رسالت کا دعویٰ کیا ہو، اور اپنا معجزہ حرکت کرنا، سکون کرنا، کھڑا ہونا یا بیٹھنا بنایا تو یہ اس کا دعویٰ معجزہ نہ ہوگا نہ اس کی سچائی کی دلیل ہوگا کیونکہ مخلوق اس کی مثل پر قادر ہوتی ہے، واجب ہے کہ معجزات ایسے ہوں جیسے دریا کا پھٹنا، چاند کا ٹوٹنا اور ان کے مشابہ چیزیں ہوں جن پر انسان قادر نہیں ہوتا۔

دوسری شرط :- وہ عادت کے خلاف ہو۔ اس شرط کا پایا جانا واجب ہے کیونکہ اگر کوئی مدعی رسالت کہے کہ میری نشانی یہ ہے کہ دن کے بعد رات کا آنا ہے اور مشرق سے سورج کا طلوع ہونا ہے تو اس کا یہ دعویٰ معجزہ نہ ہوگا کیونکہ یہ افعال اگرچہ ایسے ہیں جن پر اللہ کے سوا کوئی قادر نہیں لیکن یہ اس شخص کی وجہ سے نہیں ہیں۔ یہ اس کے دعویٰ سے پہلے بھی اسی طرح تھے جس طرح اس کے دعویٰ کے وقت ہیں اور اپنی نبوت پر ان کی دلالت کا دعویٰ، دوسرے دعویٰ کی طرح ہے۔ پس ظاہر ہوا کہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس کے صدق پر دلیل ہے۔ وہ چیز جس کی گواہی رسول دیتا ہے وہ اس کی سچائی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ وہ کہتا ہے میری سچائی پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے رسالت کے دعویٰ کی وجہ سے عادت کے خلاف کرے گا وہ اس ڈنڈے کو سانپ بنادے گا، پتھر کو پھاڑ دے گا، اس کے درمیان سے اونٹنی نکالے گا یا میری انگلیوں کے درمیان سے پانی نکلے گا جیسے چشمہ سے پانی نکلتا ہے۔ پس اس کے لئے یہ علامات اللہ تعالیٰ کے قول کے قائم مقام ہوں گی اگر ہم اس کا کلام سن سکتے تو وہ فرماتا اس نے سچ کہا میں نے اس کو مبعوث کیا ہے۔ اس مسئلہ کی مثال، اللہ اور اس کے رسول کی اعلیٰ امثال ہیں، اگر زمین کے بادشاہوں میں



سے کسی بادشاہ کے پاس ایک جماعت ہو۔ اس جماعت میں سے ایک شخص کہے جبکہ وہ سامنے ہو اور بادشاہ سن رہا ہو۔ بادشاہ تمہیں حکم دیتا ہے اے جماعت! اس طرح کرو۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بادشاہ اپنے افعال میں سے کسی فعل کے ساتھ میری تصدیق کرے گا اور وہ میری تصدیق کے ارادہ سے اپنے ہاتھ سے اپنی انگلی نکالے گا۔ جب بادشاہ اس کے کلام اور دعویٰ کو ان کے درمیان سے پھر وہ اس کی سچائی پر گواہی پیش کر دے تو یہ اس کے اس قول کے قائم مقام ہوگا کہ اگر وہ کہتا اس نے جو میرے بارے دعویٰ کیا ہے اس میں سچا ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کوئی عمل کر دے جس پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہو اور رسول کے ہاتھ پر عادت کے خلاف کر دے تو یہ فعل اللہ تعالیٰ کے کلام کے قائم مقام ہوگا۔ اگر وہ ہمیں سنائی دیتا اور وہ کہتا میرے بندے نے رسالت کے دعویٰ میں سچ کہا میں نے اسے تمہاری طرف بھیجا ہے تم غور سے سنو اور اطاعت کرو۔

تیسری شرط: یہ ہے کہ وہ مدعی رسالت اس معجزہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر گواہی طلب کرے۔ وہ کہے میری نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پانی کو زیتون کا تیل بنا دے گا اور میرے زمین کو زلزلہ پیدا کرنے کا حکم دینے کے ساتھ اللہ تعالیٰ زمین کو حرکت دے گا۔ جب اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا تو اس کا یہ چیلنج صحیح ہوگا۔

چوتھی شرط: یہ ہے کہ معجزہ اس کے دعویٰ کے مطابق واقع ہو، اس شرط کا پایا جانا ضروری ہے کیونکہ اگر مدعی رسالت کہے کہ میری نبوت کی نشانی اور میری حجت کی دلیل یہ ہے کہ میرا ہاتھ بولے گا یا یہ سواری بولے گی، پھر وہ ہاتھ بولا یا سواری بولی اور اس نے کہا: یہ جھوٹا ہے اور یہ نبی نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ نے کلام پیدا کی ہے جو اس مدعی رسالت کے جھوٹ پر دلیل ہے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ نے کیا وہ اس کے دعویٰ کے مطابق نہ تھا۔ اسی طرح جو روایت ہے کہ مسیلمہ الکذاب لعنہ اللہ۔ نے ایک کنویں میں تھوکا تاکہ اس کا پانی زیادہ ہو جائے تو پانی مزید نیچے چلا گیا، جو پانی موجود تھا وہ بھی چلا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ سے کیا۔ یہ آیات اس کو جھٹلانے والی ہیں جن کے ہاتھ پر یہ ظاہر ہوئیں، کیونکہ یہ بناوٹی جھوٹے نبی کے ارادہ کے خلاف واقع ہوئیں۔

پانچویں شرط: یہ ہے کہ وہ چیز جو چیلنج کے وقت معجزہ ظاہر کرے اور کوئی دوسرا ایسا معجزہ مقابلہ کی بنا پر نہ لاسکے۔ اگر چیلنج شدہ امر جس کے ذریعے نبوت پر شہادت حاصل کی گئی ہے ان شرائط سے مکمل ہو تو وہ اس شخص کی نبوت پر دلالت کرنے والا معجزہ ہو گا جس کے ہاتھ پر یہ ظاہر ہوا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے کے لئے کوئی پیدا کر دیا حتیٰ کہ وہ بھی ایسا لے آیا جو مدعی نبوت لایا تھا اور اس نے بھی اس کے عمل کی طرح عمل کر دکھایا تو اس کا نبی ہونا باطل ہو جائے گا اور اس امر کا معجزہ ہونا خارج ہو جائے گا اور اس کی صداقت پر دلیل نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ** (الطور: 34) (اس کی مثل کلام لے آئیں اگر وہ سچے ہیں) اور فرمایا **أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرِيَاتٍ** (ہود: 13) (یا وہ کہتے ہیں اس نے یہ خود گھڑا ہے فرمائیے تم اس کی مثل دس گھڑی ہوئی سورتیں لے آؤ) گویا فرمایا: اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ یہ قرآن محمد ﷺ کے نظم سے ہے اور ان کے عمل سے ہے تو تم اس نظم کی جنس سے دس سورتیں لے آؤ۔ جب نہ تمام اس سے عاجز ہو تو جان لو کہ یہ ان کے نظم اور عمل سے نہیں ہے۔

بہ نہ کہا جائے گا کہ وہ معجزات جو ان پانچ شرائط کے ساتھ مقید ہیں صرف سچے لوگوں کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ

مسح دجال کے لئے بھی ہوں گے جیسا کہ تم نے اپنے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اس کے ہاتھوں پر بڑی بڑی آیات اور بڑے بڑے امور ظاہر ہوں گے جو معروف و مشہور ہیں۔ ہم کہیں گے وہ نبوت و رسالت کا دعویٰ نہیں کرے گا بلکہ وہ ربوبیت کا دعویٰ کرے گا، ان کے درمیان اتنا فرق ہے جتنا اندھوں اور دیکھنے والوں کے درمیان فرق ہے۔ دلیل عقلی قائم ہو چکی ہے کہ بعض مخلوق کو بعض کی طرف بھیجنا ممنوع اور مستحیل نہیں ہے، اور کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی سچائی پر دلائل قائم کر دے جو شرع اور ملت کو ساتھ لے آئے۔ دلائل عقلیہ دلالت کرتے ہیں کہ مسح دجال اس میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف بدلنا ہے اور یہ ثابت ہے کہ یہ صفات محدثات کے لائق ہیں اور اللہ تعالیٰ تشبیہ سے پاک ہے کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہے وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

**فصل:-** جب یہ ثابت ہے تو جان لو کہ معجزات کی دو قسمیں ہیں: (۱) جن کی نقل مشہور ہے اور نبی کریم ﷺ کے وصال کے ساتھ ان کا زمانہ ختم ہو گیا۔ (۲) جن کی صحت اور حصول کے ساتھ اخبار متواتر ہیں اور اس کے ثبوت اور وجود کے ساتھ اخبار مشہور ہیں، سامع کو ان کا علم ضرورتاً حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی شرط میں سے یہ ہے کہ اس کے نقل کرنے والے کثیر تعداد میں ہوں اور جس کو وہ نقل کر رہے ہوں اس کے متعلق علم ضروری رکھتے ہوں۔ کثرت تعداد میں، ابتدا اور وسط میں اور آخر میں راوی برابر ہوں حتیٰ کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو۔ یہ صفت قرآن اور نبی کریم ﷺ کے وجود کی نقل کی ہے کیونکہ امت قرآن کو ہر دور میں ایک دوسرے سے نقل کرتی آئی ہے حتیٰ کہ یہ سلسلہ نبی کریم ﷺ تک پہنچتا ہے جن کا وجود بالضرورة معلوم ہے اور جن کی صداقت معجزات کے ساتھ ثابت ہے اور رسول کریم ﷺ نے جبریل سے اور انہوں نے رب تعالیٰ سے روایت کیا ہے۔ پس قرآن کو دو معصوم رسولوں نے کی اور زیادتی کے بغیر نقل کیا اور ہماری طرف ان کے بعد اہل تواتر نے نقل کیا جن پر نقل کرنے اور سنانے میں کثرت تعداد کی وجہ سے کذب جائز نہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے لئے انہوں نے جو حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس سے قرآن کے ظہور اور چیلنج میں سے جو نقل کیا اس کے بارے میں ان کی سچائی کی وجہ سے علم ضروری حاصل ہوا۔ اس کی مثال دنیا کا علم ہے انسان اسے جانتا ہے جو شہروں کے وجود کے متعلق اس کی طرف جو نقل کیا گیا جیسے بصرہ، شام، عراق، خراسان، مدینہ، مکہ اور دوسری اس کے مشابہ مثالیں جو اخبار متواترہ سے ثابت ہیں۔ پس قرآن ہمارے نبی کریم ﷺ کا معجزہ آپ ﷺ کے بعد قیامت تک رہنے والا ہے، ہر نبی کا معجزہ اس کے جانے کے بعد ختم ہو گیا یا اس میں تبدیلی اور تغیر پیدا ہو گیا جیسے تورات اور انجیل۔

قرآن کی وجوہ اعجاز دس ہیں

۱۔ یکتا نظم

عربی اور غیر عربی زبان میں جو معبود نظم موجود تھا قرآن کا نظم اس سے مختلف ہے کیونکہ اس کا نظم نہ تو نظم شعری میں سے ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشُّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ (یسین: 69) (اور نہ ہم نے اسے شعر سکھایا اور نہ یہ اس

کے لئے مناسب ہے) اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابوذر کے بھائی انیس نے حضرت ابوذر سے کہا: میں مکہ میں ایک شخص سے ملا ہوں جو تیرے دین پر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مبعوث فرمایا ہے۔ میں نے کہا: لوگ کیا کہتے ہیں؟ اس نے کہا: وہ کہتے ہیں شاعر ہے، کابن ہے، ساحر ہے اور انیس ایک شاعر تھا، انیس نے کہا: میں نے کاهنوں کا کلام سنا ہے وہ ان کے کلام جیسا کلام نہیں کرتا۔ میں نے اس کا قول شعر کی اقسام پر پیش کیا تو میرے بعد کسی کی زبان پر اس کے کلام کو شعر کہنا بھی مناسب نہیں۔ اللہ کی قسم! وہ سچا ہے اور لوگ جھوٹے ہیں (1)۔ اسی طرح عتبہ بن ربیعہ نے اعتراف کیا تھا کہ وہ نہ جادو ہے، نہ شعر ہے جب رسول اللہ ﷺ نے حم فصلت تلاوت کی تھی۔ اس کا بیان وہاں آئے گا جب عتبہ نے زبان کے اعتبار سے اور اس کی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اعتراف کیا کہ اس نے قرآن کی مثل کلام نہیں سنا تو وہ اس قول میں قرآن کے اعجاز کا اقرار کرنے والا تھا حالانکہ اسے اور ان کے ہم مثل متحققین کو فصاحت اور تکلم پر قدرت تھی، وہ کلام کی تمام انواع و اجناس پر کلام کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔

2۔ دوسری وجہ اعجاز یہ ہے کہ اس کا اسلوب تمام اسالیب عرب سے مختلف ہے۔

3۔ تیسری یہ کہ اس میں ایسی بڑائی ہے جو مخلوق کے لئے کسی حال میں صحیح نہیں۔ سورہ قیٰ ش وَالْقُرْآنِ الْمَجِید ۱ (ق: 1) میں آخر تک غور کر اور وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ الْآخِرُ السُّورَةُ (الزمر: 67) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ الْآخِرُهَا۔ (ابراہیم: 42) ابن حصار نے کہا جس نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ حق ہے اس نے جان لیا کہ اس بڑائی کی مثل کسی دوسرے کے خطاب میں صحیح نہیں اور کسی دنیا کے عظیم بادشاہ کی طرف سے یہ کہنا صحیح نہیں لَيْسَ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (غافر: 16) اور نہ یہ کہنا جائز ہے: وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقُ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ (الرعد: 13)

ابن حصار نے کہا: یہ تینوں نظم، اسلوب اور جزالت ہر سورت کو لازم ہے بلکہ ہر ایک آیت کو لازم ہیں۔ ان تینوں صفات کے مجموعہ کی وجہ سے ہر آیت اور ہر سورت مسوع، بشر کے کلام سے ممتاز ہے۔ اس کے ساتھ چیلنج واقع ہوا ہے اور لوگوں کو عاجز کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر سورت ان تینوں صفات کے ساتھ منفرد ہے بغیر اس کے کہ کوئی دوسری دس وجوہ اعجاز میں سے کوئی وجہ اس کی طرف مضاف ہو۔

یہ سورۃ الکوثر چھوٹی تین آیات ہیں۔ یہ قرآن کی چھوٹی سورت ہے حالانکہ یہ دو غیب کی باتیں اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ کوثر (نہر) کے متعلق خبر، اس کی بڑائی، اس کی وسعت اور اس کے برتنوں کی کثرت کے متعلق خبر دے رہی ہے اور یہ دلیل ہے کہ اس کی تصدیق کرنے والے تمام رسولوں کے قبعین سے زیادہ ہوں گے۔ دوسری ولید بن مغیرہ کے متعلق خبر ہے۔ وہ اس آیت کے نزول کے وقت مالدار اور صاحب اولاد تھا جیسا کہ یہ ارشاد تقاضا کرتا ہے: ذُرِّيَّتِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۝ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ۝ وَبَنِينَ شُهُودًا ۝ وَمَهْدَتْ لَهُ تَهْنِيدًا ۝ (المدثر) پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے مال اور اولاد کو ہلاک کر دیا اور اس کی نسل کو ختم کر دیا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحاب، باب فضائل ابوذر، حدیث نمبر 4570، ضیاء القرآن پبلیکیشنز



4۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ عرب زبان میں اس انداز سے تصرف ہے کہ کوئی عربی میں اس طرح نہیں کر سکتا حتیٰ کہ عربوں کی طرف سے اتفاق سے یہ قول آیا ہے کہ اس کا ہر کلمہ اور ہر حرف اپنی جگہ پر بالکل درست آیا ہے۔

5۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ یہ ان امور کی خبر دیتا ہے جو دنیا کے آغاز سے اس کے نزول کے وقت تک گزر چکے ہیں اور یہ ایسے امی کی طرف سے خبریں ہیں جس نے اس سے پہلے نہ کتاب پڑھی ہے نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھا ہے۔ اس نے انبیاء اور ان کی امتوں کے حالات بتائے اور گزشتہ زمانہ کے واقعات و حالات کو بیان کیا اور اہل کتاب نے جو آپ سے سوال کئے ان کا ذکر کیا۔ انہوں نے اہل کہف کے قصہ، موسیٰ و خضر علیہما السلام اور ذوالقرنین کے حالات کے متعلق پوچھا تو آپ نے انہیں جواب دیا حالانکہ آپ امی تھے امی امت سے تھے جس کو ان باتوں کا علم نہ تھا۔ اس کے ذریعے وہ گزشتہ کتب کی صحت کو پہچان گئے اور اس کی سچائی کا یقین کیا۔

قاضی ابن طیب نے کہا: ہم ضرورہ جانتے ہیں کہ یہ ایسی چیز ہے جس تک رسائی ممکن نہیں مگر سیکھنے سے جبکہ یہ معروف تھا کہ آپ اہل آثار سے اور مؤرخین سے نہیں ملے نہ آپ کسی معلم کے پاس گئے ہیں اور نہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو پڑھ سکتے ہیں تاکہ یہ جائز ہو کہ آپ کو کوئی کتاب ملی ہو جس سے یہ ساری چیزیں آپ نے لی ہوں۔ پس معلوم ہوا کہ ان کے علم تک رسائی ممکن نہیں مگر وحی کی تائید سے۔

6۔ اس کی وجہ اعجاز میں سے ایک وعدہ کا وفا ہے اللہ تعالیٰ نے جس کے متعلق جو وعدہ فرمایا وہ وعدہ ظاہر و عیاں پایا گیا ہے یہ اخبار مطلقہ اور شرط کے ساتھ مقید وعدہ کی طرف منقسم ہے، اخبار مطلقہ کی مثال جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور ان لوگوں کو نکالنے کا وعدہ کیا جنہوں نے آپ کو اپنے وطن سے نکالا تھا اور دوسرے مقید شرط کی مثال جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ (الطلاق: 3) وَمَنْ يُؤْمَرْ بِاللَّهِ يَهْدِ اللَّهُ قَلْبَهُ (التغابن: 11) وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا (الطلاق) إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرُونَ صَبْرُونَ يَغْلِبُوا أَمَاطَيْنِ (الانفال: 65)**

7۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ یہ آنے والے حالات غیبیہ کی خبر دیتا ہے جن کی اطلاع صرف وحی کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔ اس میں سے اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وعدہ ہے کہ وہ اس کے دین کو سب ادیان پر غالب کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **هُوَ الَّذِي أَنزَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ (الصف: 9)** تو ایسا ہی ہوا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جب اپنے لشکروں کو کسی مہم پر روانہ کرتے تو انہیں اللہ کی طرف سے اپنے دین کو غالب کرنے کا وعدہ یاد دلاتے تاکہ انہیں نصرت کا وثوق ہو جائے اور کامیابی کا یقین ہو جائے۔ حضرت عمر بھی ایسا کرتے تھے۔ پس شرق و غرب اور بحر و بر میں متواتر فتوحات ہوتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور: 55)**

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّعْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ (فتح: 27)** (یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو سچا خواب دکھایا حق کے ساتھ کہ تم ضرور داخل ہو گے مسجد حرام میں جب اللہ

نے چاہا امن و امان سے۔)

اور فرمایا: **وَإِذْ يَعِدُّكُمْ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ (الانفال: 7)** (اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دو گروہوں میں سے کہ وہ تمہارے لئے ہے۔

فرمایا: **الَّتِي غَلَبَتِ الرُّومَ ۚ فِي أَذَى الْأَرْضِ وَهُمْ قَرِيبٌ عَلَيْهِمْ سَيْغَرُهُمْ ۖ (الروم)** (الف، لام، میم ہرا دیئے گئے رومی پاس کی زمین میں اور وہ ہار جانے کے بعد ضرور غالب آئیں گے)۔

یہ تمام غیوب کی خبریں ہیں جن پر صرف رب العالمین واقف ہے یا وہ جس کو رب العالمین نے ان سے واقف کیا۔ یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان آنے والے واقعات پر آگاہ کیا تاکہ آپ کی سچائی پر دلیل ہو جائیں۔

8۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ قرآن اپنے ضمن میں ایسا علم رکھتا ہے جو پوری انسانیت کے لئے قوام ہے۔ حلال، حرام اور دوسرے تمام احکام اس میں موجود ہیں۔

9۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ اس میں حکم بالغہ ہیں جو ایک آدمی سے عادتاً اپنے شرف اور کثرت کی وجہ سے صادر نہیں ہوتیں۔

10۔ ایک وجہ اعجاز یہ ہے کہ جو علم ظاہر اور باطناً اس میں ہے اس میں تناسب ہے اختلاف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۖ (النساء)**

میں کہتا ہوں: یہ دس وجوہ اعجاز ہیں جو ہمارے علماء نے ذکر کی ہیں اور گیارہویں وجہ اعجاز وہ ہے جو نظام اور بعض قدریوں نے بیان کی۔ وہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ سے روکا گیا ہے اور چیلنج کے وقت اس کی مثل لانے سے پھیرا گیا ہے، یہ منع اور پھیرنا ذات قرآن کے علاوہ ایک معجزہ ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہمتوں کو معارضہ سے پھیر دیا ہے حالانکہ انہیں اس کی مثل ایک سورت لانے کا چیلنج کیا گیا ہے اور یہ فاسد ہے کیونکہ امت کا اجماع ہے مخالف کے حدوث سے پہلے قرآن معجز تھا۔ اگر ہم کہیں کہ منع اور پھیر دینا معجز ہے تو قرآن کا معجزہ ہونا خارج ہو جاتا ہے اور یہ اجماع کے خلاف ہے۔ جب معاملہ اس طرح ہے تو معلوم ہوا کہ نفس قرآن معجز ہے، کیونکہ اس کی فصاحت و بلاغت خارق للعادت ہے کیونکہ کوئی کلام اس انداز میں نہیں کیا گیا۔ جب ان سے ایسا کلام مالوف و معتاد ہی نہیں ہے تو دلیل ہے کہ منع اور صرف معجز نہیں ہے اور جنہوں نے اس کے مقابلہ سے پھیرنے کا قول کیا ہے ان کے دو قول ہیں: (۱) مقابلہ کی قدرت سے انہیں پھیر دیا گیا، اگر وہ اس کا مقابلہ کرتے تو بھی عاجز آتے (۲) وہ مقابلہ کرنے سے پھیرے گئے حالانکہ انہیں اس کی قدرت تھی۔ اگر وہ اس کا مقابلہ کرتے تو اس پر ان کا قادر ہونا ناجائز ہوتا۔

ابن عطیہ نے کہا: قرآن میں چیلنج کی وجہ اس کا نظم اور معانی کی صحت، الفاظ کی فصاحت کا متواتر ہونا ہے اور اس کی وجہ اعجاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس چیز کا اپنے علم سے احاطہ کر رکھا ہے اور از روئے علم کے کلام کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ پس اپنے احاطہ سے اس نے جان لیا کہ کون سا لفظ پہلے لفظ سے ملنے کی صلاحیت رکھتا ہے، ایک معنی کے بعد دوسرے معنی کو بیان کرے گا پھر اسی طرح اول قرآن سے آخر قرآن تک ہے۔ انسانوں کو جہالت، نسیان اور ذہول طاری ہوتا ہے اور ضرورتاً معلوم ہے کہ

انسان کبھی بھی احاطہ کرنے والا نہیں ہوا۔

اسی وجہ سے نظم قرآن انتہائی فصاحت و بلاغت کو چھو رہا ہے۔ اس نظر سے ان کا قول باطل ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ عرب کی قدرت میں تھا کہ وہ قرآن کی مثل انتہائی فصاحت و بلاغت والا کلام لائے۔ جب حضرت محمد ﷺ آئے تو وہ اس سے پھیر دیئے گئے اور وہ اس جیسا کلام لانے سے عاجز ہو گئے۔ صحیح یہ ہے کہ قرآن کی مثل لانے کی کبھی کسی مخلوق میں قدرت ہی نہیں ہے، تیرے لئے انسانی کمزوری اس میں ظاہر ہوگی کہ ان کا فصیح شخص خطبہ دیتا ہے یا قصیدہ پڑھتا ہے، اس میں وہ اپنی پوری کوشش صرف کرتا ہے پھر وہ پورا سال خود اس کی تنقیح کرتا ہے پھر اس کے بعد کسی دوسرے کو وہ قصیدہ دیتا ہے وہ اس میں تبدیلی اور تنقیح کرتا ہے اور اپنی طبیعت کے مطابق کچھ لیتا ہے پھر بھی اس کے بعد اس میں نظر اور تبدیلی کے مقامات موجود ہوتے ہیں اور کتاب اللہ اگر اس سے ایک لفظ بھی نکالا جائے پھر پوری لسان عرب سے اس سے بہتر لفظ ڈھونڈا جائے تو نہیں پایا جائے گا۔

قرآن کی فصاحت سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں دو امروں، دو نہیوں، دو خبروں اور دو بشارتوں کا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اذْ حِينًا اِلٰى اُقْدِ مُوسٰى اَنْ اُنْزِلَ عَلَيْهِ (القصص: 7)** (ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی کی کہ وہ انہیں دودھ پلائے) اسی طرح سورہ مائدہ کا آغاز ہے وفا کا حکم دیا اور عہد توڑنے سے منع فرمایا، ایک چیز کو حلال فرمایا پھر استثنا کے بعد استثنا فرمائی پھر اس کی حکمت و قدرت کے متعلق بتایا۔ یہ ایسی چیز ہے جس پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موت، فوت شدہ کا افسوس، آخرت کا گھر، اس کا ثواب، عقاب، دارین کی فلاح، مجرموں کا ہلاک ہونا، دنیا سے دھوکا کھانے سے ڈرانے کی خبر دی اور دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں قلت سے تعبیر فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **كُلُّ نَفْسٍ ذٰلِقَةٌ الْمَوْتِ ۚ وَاِنَّمَا تُؤْتُونَ اُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ (آل عمران: 185)** ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور تمہیں قیامت کے دن پورے اجر دیئے جائیں گے۔ اسی طرح پہلے، پچھلے اور خوشحال لوگوں کے حالات، ہلاک ہونے والوں کی صفات ایک آیت کے ایک حصہ میں بیان فرمادیئے۔ ارشاد فرمایا: **فِيْنَهُمْ مِّنْ اُنْرَسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۙ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۙ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۙ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا (العنكبوت: 40)** (پس ان میں سے بعض پر ہم نے برسائے پتھر اور ان میں سے بعض کو آلیا شدید کڑک نے اور بعض کو ہم نے (دریا میں) ڈبو دیا۔) اللہ تعالیٰ نے کشتی کے امر، اس کے چلانے، کفار کو ہلاک کرنے اور کشتی کے ٹھہرنے اور اس کے استواء اور آسمان اور زمین کی طرف تسخیر کے اوامر کی توجیہ کے بارے میں بتایا۔ ارشاد فرمایا: **وَقَالَ اِنْرِكُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرَہَا وَ مَرْسَہَا ۚ اِنَّ رَّابِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۰ وَ هِیْ تَجْرِیْ بِہُمْ فِیْ مَوْجٍ کَالْجِبَالِ ۚ وَ نَادٰی نُوْحٌ اِبْنَهٗ وَ کَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یُّبَنِیْ اِنْرِکِبْ مَعَنَا وَ لَا تَکُنْ مَعَ الْکٰفِرِیْنَ ۝۱۱ قَالَ سَآوِیْ اِلٰی جَبَلٍ یَّعِصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ ۚ قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالٌ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَکَانَ مِنَ الْمَغْرَقِیْنَ ۝۱۲ وَ قِیْلَ یٰۤاِنْرَضِ اِبْلِیْعِیْ مَآءٌ لَّنْ وَ لَیْسَ مَآءٌ اَقْلَبٰی وَ غِیْضَ الْمَآءِ وَ قُضِیَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلٰی الْجُوْدِیْ وَ قِیْلَ بَعْدَ الْقَوْمِ الظَّالِمِیْنَ ۝۱۳ (ہود)**

جب قریش قرآن کی مثل لانے سے عاجز آ گئے تو کہانی کریم ﷺ نے یہ خود کہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل



فرمائی: اَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُۥٓ بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦٦﴾ فَلْيَاثُورُوا بِحَدِيثِ قَوْلِهِ اِنْ كَانُوا صٰدِقِيْنَ ﴿٦٧﴾ (الطور) پھر انہیں مزید عاجز کرنے کے لئے یہ اتارا: اَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۚ قُلْ فَاَتُوبُ اَعَشِرُ سُوْرًا مِّثْلَهُ مُفْتَرِيَةً (ہود: 13) جب وہ عاجز آ گئے تو اس مقدار کو مزید کم کر دیا۔ اس کی سورتوں میں سے چھوٹی سورت کی مثل لے آؤ۔ فرمایا: وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَاٰیِ قِبٰلِنَا لَنٰ اَعْلٰ عٰبِدِنَا فَاَتُوبُ اٰهٰسُوْرًا مِّثْلَهُ (البقرہ: 23) پس جواب سے وہ عاجز آ گئے اور ان کے اسباب کٹ گئے اور وہ جنگ اور عناد کی طرف پلٹے اور انہوں نے بیوں بچوں کے قیدی ہونے کو ترجیح دی۔ اگر وہ معارضہ پر قادر ہوتے تو یہ ان کے لئے بہت آسان تھا اور حجت میں زیادہ بلیغ اور تاثیر میں زیادہ شدید تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ارباب البلاغت اور صاحب زبان تھے۔ ان سے فصاحت و بلاغت سیکھی جاتی تھی۔

قرآن کی بلاغت احسان کے اعلیٰ طبقات میں ہے اور ایجاز و بیان کے بلند درجات میں ہے بلکہ حسن و عمدگی کی حد سے تجاوز کرتے ہوئے زیادتی و بلندی کے مقام تک پہنچ گئی۔ رسول اللہ ﷺ کو جوامع الکلم عطا کئے گئے تھے اور آپ غرائب الکلم کے ساتھ مختص تھے۔ جب تو نبی کریم ﷺ کے قول میں غور کرے گا جو آپ نے جنت کی صفت میں فرمایا اگرچہ وہ احسان کی انتہا میں ہے لیکن تو اسے قرآن کے رتبہ سے کم پائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب کا ارشاد ہے: فِيْهَا مَا لَا عَيْنٌ رَّآتْ، وَلَا اَذْنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ۔ (اس میں ایسی نعمتیں ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہیں نہ کسی کان نے سنی ہیں نہ کسی انسان کے دل میں ان کا تصور آیا ہے۔) (1)

لیکن اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اس کو کیا نسبت وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَكُنُّ اَلَا عَيْنٌ (الزخرف: 71) اور ارشاد فرمایا: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرْوَةٍ اَعْيُنٌ (السجدة: 17) یہ وزن کے اعتبار سے اعدل ہے، ترکیب کے اعتبار سے احسن ہے لفظ کے اعتبار سے زیادہ اعذب (میٹھا) ہے اور حروف کے اعتبار سے کم ہے۔ اس کا اعتبار نہیں ہو سکتا مگر سورت کی مقدار میں یا لمبی آیت کی مقدار میں کیونکہ کلام جب طویل ہو تو اس میں متصرف کی مجال کی وسعت ہوتی ہے اور کوتاہ و متکلف پر مقال تنگ ہو جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ عربوں پر حجت قائم فرمائی کیونکہ وہ ارباب فصاحت تھے اور معارضت کی جگہ تھے جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں اطباء پر حجت قائم ہوئی۔ موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں جادو گروں پر حجت قائم ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے معجزات کو مشہور وجہ کے ساتھ زیادہ عمدہ طریقہ کے ساتھ پیش کیا جو اس نبی کے زمانہ میں جس کے اظہار کا ارادہ فرمایا تھا۔ پس جادو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا (تو موسیٰ علیہ السلام کو اس کے مقابلہ کی طاقت بخشی) طب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں عروج پر تھی، فصاحت حضرت محمد ﷺ کے زمانہ میں کمال بلندی پر تھی۔

ان احادیث پر تنبیہ جو قرآن کی سورتوں کی فضیلت میں وضع کی گئی ہیں

قرآن کی سورتوں اور فضائل اعمال کے بارے میں احادیث کے واضعین اور جھوٹی اور باطل اخبار گھڑنے والوں کی

1۔ صحیح بخاری، باب ما جاء فی صفة الجنة وانها مخلوقة، حدیث نمبر 3005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں ہونی چاہئے۔ ایک پوری جماعت نے ایسی احادیث گھڑنے کا ارتکاب کیا ہے اس ارتکاب میں ان کے اغراض و مقاصد مختلف تھے مثلاً زنادقہ میں سے مغیرہ بن سعید کوئی، محمد بن سعید شامی جس کو زنادقہ کی وجہ سے پھانسی چڑھایا گیا تھا۔ انہوں نے احادیث گھڑیں اور ایسی احادیث بیان کیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں شک ڈالیں۔ ان گھڑی ہوئی روایات میں سے محمد بن سعید نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انا خاتم الانبیاء لا نبی بعدی الا ما شاء اللہ۔ میں انبیاء کا خاتم ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے مگر جو اللہ چاہے۔ وہ الحاد اور زنادقہ کی طرف جو بلاتا تھا اس کی وجہ سے استثنا کا اضافہ کر دیا۔

میں کہتا ہوں: ابن عبد البر نے اس حدیث کو التعمید میں ذکر کیا ہے اور اس پر کوئی کلام نہیں کی ہے بلکہ ردیاء پر استثنا کی تاویل کی ہے۔

بعض لوگوں نے اپنی خواہش کے لئے احادیث گھڑیں جس کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔ خوارج کے شیخ نے توبہ کرنے کے بعد کہا: یہ احادیث دین ہیں (پہلے) دیکھو تم یہ دین کس سے لے رہے ہو۔ ہم جب کسی امر کی خواہش کرتے تھے اسے حدیث بنا دیتے تھے۔ بعض لوگوں نے ثواب کی خاطر احادیث گھڑیں جیسا کہ انہوں نے کہا کہ وہ لوگوں کو فضائل اعمال کی طرف دعوت دیتے ہیں جس طرح ابو عاصمہ بن نوح بن ابی مریم مروزی، محمد بن عکاشہ کرمانی، احمد بن عبد اللہ جو بیاری وغیرہم سے روایت کیا گیا ہے۔ ابو عاصمہ سے کہا گیا تم نے یہ قرآن کی ہر سورت کی فضیلت میں عن عمرہ عن ابن عباس کا ارتکاب کیوں کیا؟ تو اس نے کہا: میں نے لوگوں کو دیکھا وہ قرآن سے اعراض کر رہے ہیں اور امام ابو حنیفہ کی فقہ، محمد بن اسحاق کے مغازی میں زیادہ مشغول ہو رہے ہیں تو میں نے ثواب کی خاطر یہ حدیث گھڑی۔ ابو عمر و عثمان بن صلاح نے اپنی کتاب علوم حدیث میں فرمایا۔ اسی طرح ایک طویل حدیث ابی بن کعب عن النبی ﷺ کے سلسلہ میں قرآن کی ہر سورت کی فضیلت میں گھڑی گئی ہے۔ متلاشی نے اس کے مخرج سے بات کی تو اس نے اعتراف کر لیا کہ اس نے اور ایک جماعت نے اس حدیث کو وضع کیا ہے اور اس پر وضع کا اثر ظاہر ہے۔ الواحدی مفسر اور دوسرے مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اس روایت کو نقل کرنے میں غلطی کی ہے۔

ایک سائلین اور بھکاری لوگوں کی جماعت نے بھی یہ کام کیا۔ وہ بازاروں اور مساجد میں کھڑے ہوتے تھے اور صحیح اسانید کے ساتھ، جو انہوں نے یاد کر رکھی ہوتی تھیں، رسول اللہ ﷺ پر احادیث منسوب کرتے تھے۔ وہ ان اسانید کے ساتھ جھوٹی روایات بیان کرتے تھے۔ جعفر بن محمد طیالسی نے کہا: مسجد الرصافہ میں احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے نماز پڑھی ان کے سامنے ایک قصہ گو کھڑا ہوا اور کہا: حدثنا احمد بن حنبل و یحییٰ بن معین قالوا انبأنا عبد الرزاق قال انبأنا معمر عن قتادة عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ۔ یعنی اس سند کے ساتھ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کے حوالہ سے یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہا اس کے ہر کلمہ سے ایک پرندہ پیدا کیا جاتا ہے جس کی چونچ

سونے کی، پر مرجان کے۔ اس نے بیس ورق کا یہ واقعہ بیان کیا۔ احمد، یحییٰ کی طرف دیکھنے لگے اور یحییٰ، احمد کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: تو نے اسے یہ بیان کی ہے؟ دوسرے نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے تو یہ سنی بھی اسی وقت ہے۔ وہ دونوں خاموش رہے حتیٰ کہ وہ اپنے قصص سے فارغ ہو تو یحییٰ نے پوچھا: تجھے یہ حدیث کس نے بیان کی۔ اس نے کہا: احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے۔ انہوں نے کہا: میں یحییٰ بن معین ہوں اور یہ احمد بن حنبل ہے۔ ہم نے تو یہ کبھی رسول اللہ کی حدیث میں سنی ہی نہیں۔ اگر تجھے ضرور جھوٹ بولنا ہے تو کسی دوسرے کی طرف منسوب کیا کر۔ وہ قصہ گو کہنے لگا: تو یحییٰ بن معین ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: میں سننا رہتا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے۔ اب مجھے اس کا یقین ہوا ہے۔ یحییٰ نے پوچھا: تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں احمق ہوں۔ اس نے کہا: گویا دنیا میں یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل تمہارے علاوہ نہیں ہیں۔ میں نے اس کے علاوہ گیارہ احمد بن حنبل سے احادیث لکھی ہیں۔ احمد نے اپنے منہ پر اپنی آستین رکھی اور کہا: اسے چھوڑو۔ وہ آدمی ان سے مزاح کرنے والے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ ان تمام گروہوں نے رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولے اور دوسرے لوگ جو ان کی طرح تھے انہوں نے بھی جھوٹ بولے۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ رشید کبوتروں کو پسند کرتا تھا اور ان سے کھیلا کرتا تھا۔ اس کو ایک کبوتر ہدیہ دیا گیا اور اس کے پاس ابوالختری القاضی بیٹھا تھا۔ اس نے کہا: حضرت ابو ہریرہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مقابلہ نہیں ہے مگر اونٹ دوڑانے میں یا گھوڑے دوڑانے میں یا پرندے اڑانے میں۔ اس نے پرندے اڑانے کا ذکر اپنی طرف سے زائد کیا۔ یہ لفظ اس نے رشید کی خاطر وضع کیا تھا۔ رشید نے اسے عظیم انعام دیا۔ جب وہ چلا گیا تو رشید نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے جان لیا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔ اس نے تمام کبوتر ذبح کرنے کا حکم دے دیا۔ اس سے کہا گیا: کبوتروں کا کیا گناہ ہے؟ اس نے کہا: ان کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولا گیا ہے۔ پس علماء نے اس کی وجہ سے اور دوسری موضوعات کی وجہ سے بختری کی حدیث کو ترک کر دیا۔ علماء اس کی حدیث کسی حال میں نہیں لکھتے۔

میں کہتا ہوں: اگر لوگ اس پر اکتفا کرتے جو صحاح اور مسانید میں ثابت ہیں جو علماء کے ہاتھوں کتب گردش کرتی ہیں اور جو ائمہ فقہاء نے روایت کی ہیں تو ان کے لئے ان میں کفایت تھی اور وہ نبی کریم ﷺ کے فرمان کی تحدیر سے نکل جاتے۔ میرے بارے میں حدیث بیان کرنے سے بچو مگر جو تم جانتے ہو۔ جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنائے (1)۔ (المحدث) نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو جھوٹ کی بناء پر آگ سے ڈرایا۔ یہ دلیل ہے کہ آپ جانتے تھے کہ آپ پر جھوٹ بولا جائے گا۔ پس دین کے دشمنوں کی من گھڑت باتوں سے بچو جو انہوں نے ترغیب و ترہیب میں وضع کی ہیں۔ سب سے زیادہ نقصان دہ وہ لوگ ہیں جو زہد کی طرف منسوب ہیں اور اپنے گمان میں ثواب کی خاطر حدیثیں گھڑی ہیں۔ لوگوں نے ان کی جھوٹی باتوں کو ان پر اعتماد کی وجہ سے قبول کیا اور ان کی طرف میلان کی وجہ سے ان کی باتوں کو قبول کیا۔ پس وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ما جاء فی الذی یفسد القرآن ہر ابہ، حدیث نمبر 2975، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



## قرآن پر طعن کرنے والے کے خلاف حجت اور مصحف عثمان کی زیادتی اور کمی

### کی بناء پر مخالفت کرنے والے کے خلاف حجت

امت اور ائمہ اہل سنت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کے اس کلام کا نام ہے جو حضرت محمد ﷺ بطور معجزہ لے کر آئے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ وہ سینوں میں محفوظ ہے، زبانوں پر پڑھا گیا ہے، مصاحف میں لکھا گیا ہے، اس کی سورتیں اور آیات علم یقینی کی بنا پر معلوم ہیں اس کے حروف اور کلمات کی اور زیادتی سے مبرا ہیں۔ یہ قرآن اپنی تعریف میں نہ کسی حد کا محتاج ہے اور نہ کسی شمار کا۔ جس نے اس پر زیادتی یا اس میں کمی کا دعویٰ کیا اس نے اجماع کو توڑا اور لوگوں کو مبہوت کیا اور وہ قرآن جو رسول اللہ پر نازل ہوا تھا جس کو رسول اللہ ﷺ لے کر آتے تھے اس نے اس کا رد کیا اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا رد کیا: قُلْ لِّیْنَ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَاَنْتُمْ کَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۝ (الاسراء) (آپ فرمائیے اگر انس و جن اس قرآن کی مثل لانے پر جمع بھی ہو جائیں تو اس کی مثل نہیں لاسکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔)

اور اس نے رسول اللہ ﷺ کے معجزہ کو رد کیا کیونکہ اس طرح تو قرآن ان کی مقدور میں ہوگا۔ جب باطل کی اس میں ملاوٹ کی گئی ہوگی جب وہ اس پر قادر ہوں گے تو نہ حجت رہے گا نہ نشانی، اور معجزہ ہونے سے بھی خارج ہو جائے گا۔ پس جو کہتا ہے قرآن میں کمی اور زیادتی ہے تو وہ کتاب اللہ کو رد کرنے والا ہے اور جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے اس کا انکار کرنے والا ہے جیسے کوئی کہتا ہے فرض نمازیں پچاس ہیں، نو عورتوں سے نکاح کرنا حلال ہے، اللہ نے رمضان کے ساتھ اور کچھ دن کے روزے فرض کئے ہیں اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں کا ذکر کرتا ہے جو دین میں ثابت نہیں ہیں اس نے اجماع کا رد کیا۔ قرآن پر اجماع، زیادہ مؤکد، زیادہ لازم اور زیادہ واجب تھا۔

امام ابو بکر محمد بن قاسم بن بشار محمد انباری نے کہا: اہل فضل و عقل ہمیشہ سے قرآن کے شرف اور اس کے بلند مرتبہ کے معترف رہے ہیں۔ حق، انصاف اور دیانت جس کو ثابت کرتی ہے اور مسطلین کے قول، ملحدین کی طمع سازی اور زانغین کی تحریف کی اس سے نفی کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ ہمارے زمانہ میں یہ ملت اسلامیہ سے دور شخص نکلا اور امت پر حملہ آور ہوا اس حملہ کے ساتھ وہ اس شریعت کو باطل کرنے کا ارادہ کرتا ہے جس کی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے تائید فرماتا رہا ہے اور اس کی بنیاد کو ثابت فرمایا ہے اور اس کی شاخوں کو بڑھایا ہے اور ظالموں کے معایب سے اور اہل عداوت و کفر کی سازشوں سے اس کی حفاظت فرمائی ہے۔

وہ کہتا ہے: یہ مصحف جو حضرت عثمان نے جمع فرمایا تھا جبکہ حضرت عثمان کے فعل کے صائب ہونے پر صحابہ کا اتفاق تھا۔ وہ پورے قرآن پر مشتمل نہیں ہے کیونکہ اس سے پانچ سو حروف ساقط ہو گئے ہیں۔ میں نے بعض کا ذکر کیا ہے اور باقی کا بعد میں ذکر کروں گا ان میں سے بعض یہ ہیں: والعصر و نوائب الدھر۔ وہ کہتا ہے: مسلمانوں سے نوائب الدھر کے الفاظ ساقط ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں حَتّٰی اِذَا اَخَذَتْ الْاِمْرَاضُ زُخْرُفَهَا وَاَثَرَيْتَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَا اَنْتُمْ قَدِمُوْنَ عَلَیْهَا اَلْهٰی

أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَنْ لَّمْ تَعْنِ بِأَلَا مِسْ وَ مَا كَانَ اللَّهُ يَهْلِكهَا إِلَّا بِذُنُوبِ أَهْلِهَا۔ یہ انسان دعویٰ کرتا ہے کہ قرآن سے یہ بھی ساقط ہو گیا ہے (و ما كان الله يهلكها الا بذنوب اهله) اس نے بہت سے حروف کا دعویٰ کیا ہے۔

اور اس نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عثمان اور صحابہ نے قرآن میں ایسی زیادتی کی ہے جو قرآن سے نہیں ہے۔ اس نے فرض نماز میں پڑھا اور لوگ سنتے رہے، اللہ الواحد الصمد۔ اس نے (قل هو) قرآن سے ساقط کر دیا اور (احد) لفظ میں تبدیلی کی اور دعویٰ کیا کہ یہ درست ہے اور جس پر لوگ قائم ہیں وہ باطل اور محال ہے۔ اس نے فرض نماز میں پڑھا: قل للذين كفروا لا اعيد ما تعبدون۔ اور اس نے مسلمانوں کی قراءت پر طعن کیا ہے۔

اس نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ مصحف جو ہمارے ہاتھوں میں ہے حروف کی تصحیف پر مشتمل ہے اس میں فساد اور تغیر ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے: إِنَّ تُعَذِّبُهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرَ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (المائدہ) اس آیت میں حکمت اور

عزت، مغفرت کے مناسب نہیں ہیں۔ صحیح یہ ہے وان تغفر لهم فانك انت الغفور الرحيم اس کے ذریعے گمراہی کو اس میں

ڈالا اور اشکال پیدا کئے حتیٰ کہ اس نے دعویٰ کیا مسلمان اس آیت میں تبدیلی کرتے ہیں۔ وَ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ وَجِهًا ۝

(الاحزاب: 69) جب کہ اس کے نزدیک درست یہ ہے جس میں تبدیلی نہیں کی گئی۔ و كان عبداً لله وجهاً۔ حتیٰ کہ اس نے

فرض نماز میں پڑھا ہمیں اس جماعت نے بتایا جنہوں نے اس سے سنا اور اس کے پاس موجود تھے۔ لا تحرك به لسانك ان

علينا جمعه و قراءته فاذا قرأناه فاتبع قراءته ثم ان علينا نبأ به۔ ہمیں دوسرے لوگوں نے کئی اور لوگوں سے روایت

کر کے بتایا کہ انہوں نے اسے یہ پڑھتے ہوئے سنا: ولقد نصركم الله ببدر بسيف علي و اتم اذلة۔ اور ان لوگوں نے

ہمیں اس سے روایت کیا کہ اس نے کہا: هذا صراط علي مستقيم اور انہوں نے بتایا کہ اس نے قرآن کی آیت میں ایسی چیز

داخل کی جو رسول اللہ ﷺ کی فصاحت کے مناسب نہیں اور یہ اس قوم کی زبان میں داخل ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے

فرمایا: وَمَا أَنَا سَلْمًا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ (ابراہیم: 4) اس نے اأنت قلت للناس کی جگہ اليس قلت للناس

پڑھا ہے۔ یہ اعراب دینے والوں سے معروف نہیں اور نہ نحویوں کے مذاہب پر محمول ہے کیونکہ عرب ليس قبت نہیں کہتے۔

اور رہا لست قبت تاء کے ساتھ تو یہ شاذ، قبیح، خبیث اور ردی لغت ہے کیونکہ ليس فعل ماضی کی نفی نہیں کرتا اور اس کی مثل نہیں

پایا جاتا مگر ان کے قول میں اليس قد خلق الله مثلهم۔ یہ شاذ لغت ہے کتاب اللہ کو اس پر محمول نہیں کیا جائے گا۔ اس شخص

نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب قرآن جمع کرنے کا معاملہ حضرت زید بن ثابت کے سپرد کیا تو صحیح نہیں کیا۔

کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابی بن کعب حضرت زید سے اولیٰ اور بہتر تھے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

میری امت کا بڑا قاری ابی بن کعب ہے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس کو قرآن پہلی قرأت پر پڑھنا خوش کرے جیسا کہ

وہ نازل ہوا تھا تو وہ ابن ام عبد کی قراءت کے ساتھ پڑھے۔ وہ کہتا ہے: میں مصحف عثمان کی مخالفت کرتا ہوں جس طرح ابو عمرو

بن العلاء نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس نے پڑھا: (ان هذين) (فاصدق واکون) (وبشرا عباده الذين) فبا اتاني

الله (ياء کے فتح کے ساتھ) اور مصحف میں ہے ان هذان (الف کے ساتھ ہے) فاصدق واکن (بغير واو کے ہے) فبشرا

عباد۔ مہاتان اللہ (دونوں جگہ یاء کے بغیر ہے) اور جس طرح ابن کثیر، تافع، حمزہ اور کسائی نے عثمان کے مصحف کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے پڑھا: کَذَلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نَبِیُّ الْمُؤْمِنِينَ۔ دونوں دونوں کے اثبات کے ساتھ، بعض نے دوسرے نون کو فتح دیا، بعض نے اسے ساکن کیا اور مصحف میں ایک نون ہے (۱)۔ جیسا کہ حمزہ نے مصحف عثمان کی مخالفت کی۔ اس نے پڑھا: (أَتَمِدُونَ بِمَالٍ) ایک نون کے ساتھ اور یاء پر وقف کیا اور مصحف عثمانی میں دونوں ہیں اور ان کے بعد یاء نہیں ہے۔ جس طرح حمزہ نے مصحف عثمانی کی مخالفت کی اور پڑھا: اَلَا اِنَّ شُعُوْدًا كَفَرُوا رَبِّهٖمْ بِغَيْرِ تَوْنٍ کے اور الف کے اثبات کے ساتھ جو تونین کا موجب ہوتا ہے اور ان تمام صورتوں میں قراء پر تنقید کی ہے جن کی وجہ سے مصحف کا خلاف لازم آتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ہم نے پہلے اس تعداد کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس میں مصاحف کا اختلاف ہے۔ مزید بیان ان شاء اللہ اپنے اپنے مواقع پر آئے گا۔

ابوبکر نے کہا: اس شخص نے ذکر کیا کہ ابی بن کعب وہ ہے جس نے پڑھا: (كَانَ لَمْ تَغْنِ بِالْمَسِّ وَمَا كَانَ اللَّهُ يَهْلِكُهَا) (الْبِذْنُوبِ أَهْلُهَا) اور یہ باطل ہے کیونکہ عبد اللہ بن کثیر نے مجاہد پر پڑھا اور مجاہد نے حضرت ابن عباس پر پڑھا اور حضرت ابن عباس نے حضرت ابی بن کعب پر پڑھا: (حَصِيدًا كَانَ لَمْ تَغْنِ بِالْمَسِّ كَذَلِكَ نَفْصَلُ الْآيَاتِ) ایک روایت میں ہے حضرت ابی بن کعب نے رسول اللہ ﷺ پر پڑھا۔ یہ سند رسول اللہ ﷺ تک متصل ہے۔ اہل عدالت و صیانت نے اس کو نقل کیا ہے جب ایک امر رسو' اللہ ﷺ سے صحیح مروی ہو تو اسے اس حدیث کی وجہ سے نہیں لیا جائے گا جو اس کی مخالف ہو۔ یحییٰ بن مبارک یزیدی نے کہا: میں نے قرآن ابی عمرو بن العلاء پر پڑھا، ابو عمرو نے مجاہد پر پڑھا اور مجاہد نے حضرت ابن عباس پر پڑھا، حضرت ابن عباس نے حضرت ابی بن کعب پر پڑھا اور حضرت ابی نے نبی کریم ﷺ پر پڑھا اور اس میں یہ نہیں ہے: وَمَا كَانَ اللَّهُ يَهْلِكُهَا (الْبِذْنُوبِ أَهْلُهَا) جس نے انکار کیا کہ یہ زیادتی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر نازل کی ہے تو وہ کافر اور گناہگار نہیں۔

مجھے ابی نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں نصر بن داؤد صاغانی نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ابو عبید نے بتایا فرمایا: جو حروف مروی ہیں اور وہ اس مصحف کے مخالف ہیں جس پر اجماع ہے ان حروف میں سے جن کی اسانید کو خاص لوگ جانتے ہیں عام نہیں جیسا انہوں نے حضرت ابی سے نقل کئے ہیں: وَمَا كَانَ اللَّهُ يَهْلِكُهَا (الْبِذْنُوبِ أَهْلُهَا) کے حروف بھی ان میں سے ہیں اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے، لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم فی مواسم الحج اور اس میں سے جو حضرت عمر سے روایت کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ غیْرُ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَغِیْرُ الضَّالِّیْنَ پڑھتے تھے۔ اس قسم کی مثالیں بہت ہیں اہل علم نے یہ نقل نہیں کیا کہ ان کے ساتھ نماز جائز ہے اور نہ یہ نقل کیا ہے کہ یہ مصحف عثمان کے معارض ہیں کیونکہ یہ اگر کوئی اس کا انکار کرے کہ یہ قرآن سے ہیں تو کافر نہیں ہوگا۔ اور قرآن وہ ہے جس کو حضرت عثمان نے جمع کیا انہیں صحابہ کی موافقت بھی حاصل تھی۔ اگر اس کے کسی حصہ کا انکار کیا تو وہ کافر ہوگا اس کا حکم مرتد کا حکم ہوگا اس سے توبہ طلب کی جائے گی۔ اگر وہ توبہ



کرے تو فبھا ورنہ اس کی گردن اڑادی جائے گی۔ ابو عبید نے کہا: حضرت عثمان کا قرآن جمع کرنے کا کام ہمیشہ سے آپ کے بڑے مناقب میں شمار ہوتا رہا بعض کج فہموں نے آپ کے اس کام پر طعن کیا۔ پس اس کا پردہ چاک ہوا اور شرمندہ ہوا۔ ابو عبید نے کہا: مجھے یزید بن زریع عن عمران بن جریر عن ابی مجلز کے سلسلہ سے بتایا گیا ہے، فرمایا: ایک قوم نے اپنی حماقت کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن جمع کرنے پر طعن کیا پھر انہوں نے نسخ شدہ قرآن پڑھا۔ ابو عبید نے کہا: ابو مجلز اس طرف گئے ہیں کہ حضرت عثمان نے جو ساقط کیا تو علم کے ساتھ ساقط کیا جس طرح جو ثابت کیا تو علم کے ساتھ ثابت کیا۔ ابو بکر نے کہا: اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِنَّ اَنْحٰنُ نَزَّلْنَا الَّذِیْ کُوِّرَ اِنَّ اِلٰهَ لَخَفِظُوْنَ ① (الحجر) میں ایسے شخص کے کفر پر دلالت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تغیر و تبدل سے حفاظت فرمائی ہے اور زیادتی اور کمی سے حفاظت فرمائی ہے، جب کوئی قاری تبت یدا ابی لہب و قد تب ما اغنی عنہ مالہ و ما کسب سیصلی ناراً ذات لہب و مریتہ حبالہ الحطب فی جیدہا حبل من لیف پڑھے تو اس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولا اور ایسی بات کہی جو اس نے نہیں کی اور اس نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو بدلا اور اس میں تحریف کی اور اس نے اس کا ارادہ کیا جس سے اس نے قرآن کی حفاظت فرمائی اور اختلاط سے منع فرمایا۔ اس عمل میں جو اس نے کیا ملحد لوگوں کے لئے راستہ ہموار کیا تا کہ وہ قرآن میں ایسی چیز کو داخل کریں جس کے ساتھ وہ اسلام کے امر کو گدلا کریں اور وہ اس قوم کی طرف منسوب کرتے ہیں جیسے وہ قوم جنہوں نے اس کو باطل کے ساتھ ان پر پھیرا۔ اس میں اس اجماع کا ابطال ہے جس کے ساتھ اسلام کی حفاظت ہوتی ہے اور اس کے ثبات کے ساتھ نمازوں کا قیام ہوتا ہے، زکوٰۃ کی ادائیگی ہوتی ہے اور عبادات کا قصد کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِنَّ اِلٰهَ لَخَفِظُوْنَ ① (ہود: 1) میں ایسے انسان کی بدعت پر اور کفر کی طرف خروج پر دلالت ہے۔ کیونکہ اُحْکِمْتَ اِیْمَہُ کا معنی مخلوق کو اس قدرت سے روکنا ہے کہ وہ ان پر اضافہ کر سکیں یا اس سے کمی کر سکیں یا اس کا معارضہ پیش کر سکیں، ہم نے اس انسان کو پایا کہ اس نے اس میں یہ زیادتی کی ہے و کفی اللہ المومنین القتال بعلی و کان اللہ قویا عزیزا۔ اور قرآن میں اس نے جھوٹ بولا۔ اور اس نے حضرت علی کا ایسی جگہ ذکر کیا اگر آپ اس کو یہ ذکر کرتے ہوئے سن لیتے تو آپ اس پر حد جاری فرماتے اور اس کے قتل کا حکم دیتے۔ اس نے اللہ کے کلام سے (قل ہو) کو ساقط کر دیا اور (احد) کو تبدیل کیا اور اللہ الواحد الصمد پڑھا جو اس نے ساقط کیا اس کا اسقاط اس کی نفی ہے اور کفر ہے اور جس نے قرآن کے ایک حرف کا کفر کیا تو اس نے سارے قرآن کا کفر کیا اور آیت کا معنی باطل کر دیا کیونکہ اہل تفسیر نے کہا: یہ آیت اہل شرک کے رد میں نازل ہوئی جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو کہا ہمارے لئے اپنے رب کی صفت بیان کیجئے کیا وہ سونے کا ہے یا تانبے کا ہے یا کسی اور دھات کا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ② اور ہو میں رد اور جواب پر دلالت ہے۔ جب وہ ساقط ہوا تو آیت کا معنی ہی باطل ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ پر افترا اور رسول اللہ ﷺ کی تکذیب واقع ہوئی۔ اس انسان کو اور اس کے مددگاروں کو کہا جائے گا، ہمیں اس قرآن کے متعلق بتاؤ جو ہم پڑھتے ہیں اور ہم اور ہم سے پہلے اسلاف اس کے علاوہ کو نہیں جانتے۔ کیا وہ اول سے آخر تک پورے قرآن پر مشتمل ہے الفاظ صحیح اور معانی فساد اور خلل سے خالی ہیں؟ یا وہ بعض قرآن پر واقع ہے اور بعض ہم سے غائب

ہے جیسا کہ ہمارے اسلاف سے غائب تھا اور ہماری ملت کے پہلے لوگوں سے غائب تھا؟ اگر وہ جواب دیں کہ قرآن جو ہمارے پاس ہے وہ تمام قرآن پر مشتمل ہے اس سے کوئی چیز ساقط نہیں ہے لفظ صحیح ہیں اور معانی بھی صحیح ہیں اور ہر زلل خلل سے سلامت ہیں تو انہوں نے خود ہی اپنے اوپر کفر کا فیصلہ کر لیا۔ جب انہوں نے اس میں زیادتی کی فلیس لہ الیوم ہاھنا حمیم و لیس لہ شراب الا من غسلین من عین تجری من تحت الجحیم اس سے زیادہ واضح قرآن میں زیادتی کون سی ہوگی اور قرآن میں اور ملاوٹ کیسی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے اسے محفوظ فرمایا ہے اور ہر مفتری اور مبطل کو اس کے ساتھ ایسے الحاق سے منع فرمایا ہے۔ جب اس کے معنی میں غور و فکر کیا گیا تو وہ فاسد اور غیر صحیح نکلا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے مشابہ نہیں ہے اور نہ اس کے ساتھ ملتا ہے اور نہ معنی اس کے موافق ہے کیونکہ اس کے بعد ہے لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ﴿۱۰۶﴾ (الحاقہ) شراب کو کیسے کھایا جاتا ہے اور وہ جو اس نے پہلے کہا: فلیس لہ الیوم ہاھنا حمیم و لیس لہ شراب الا من غسلین من عین تجری من تحت الجحیم لا یاکلہ الا الخاطئون۔ یہ کلام ایک دوسرے کی مناقض ہے کیونکہ شراب کھائی نہیں جاتی۔ عرب یہ نہیں کہتے: اکلت الباء (میں نے پانی کھایا) بلکہ وہ کہتے ہیں شربتہ و ذقتہ و طعنتہ۔ اس کا معنی اللہ تعالیٰ نے صحیح قرآن میں اتارا ہے۔ جس نے ایک حرف کی مخالفت کی اس نے کفر کیا۔ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غَسِلِینَ ﴿۱۰۷﴾ (الحاقہ) غسلین کو نہیں کھائیں گے مگر خطا کار، یا یہ کھانا نہیں کھائیں گے مگر خطا کار۔ غسلین، پیٹ وغیرہ سے جو پیپ نکلتی ہے۔ یہ کھانا بطور سزا کھلایا جائے گا۔ اور پینے والی چیز کا کھانا محال ہوتا ہے اگر یہ انسان دعویٰ کرے کہ یہ باطل جو اس نے اپنے قول سے زائد کیا ہے (من عین تجری من تحت الجحیم) اس کے بعد لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ﴿۱۰۶﴾ (الحاقہ) نہیں ہے۔ اور اس نے اس آیت کی قرآن سے نفی کر دی تاکہ اس کی زیادتی صحیح ہو جائے تو اس نے کفر کیا کیونکہ اس نے قرآن کی ایک آیت کا انکار کیا۔ تیرے لئے یہ سب اس کے قول کو رد کرنے اور اس کے کلام کو رسوا کرنے کے لئے کافی ہے اور صحابہ اور تابعین سے جو مروی ہے کہ انہوں نے ایسا ایسا پڑھا وہ بطور بیان اور تفسیر ہے نہ کہ وہ قرآن ہے جو پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ آیات جن کے الفاظ اور حکم یا لفظ منسوخ ہیں لیکن ان حکم نہیں وہ قرآن نہیں۔ اس کا مزید بیان مَائِنْتُمْ مِنْ آيَةِ (البقرہ: 106) کے تحت آئے گا۔

### أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

اس کے متعلق بارہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** ہر قراءت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے أَعُوذُ بِاللّٰهِ پڑھنے کا حکم دیا فرمایا۔ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿۱﴾ (النحل) یعنی جب تو تلاوت کرنے کا ارادہ کرے۔ مستقبل کے صیغہ کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔ جیسا شاعر نے کہا

من الود و استئناف ما كان في غد

وان لا تیکم لذكری الذی مضی

اس شعر میں مستقبل کے صیغہ کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔ مایکون کی جگہ ماکان استعمال کیا۔ بعض علماء نے فرمایا:

کلام میں تقدیم و تاخیر سے ہر دو فعل معنی میں قریب قریب ہوں تو جائز ہے جس کو چاہیں مقدم کر دیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا شَمَّ

ذَنَّا فَتَمَكَّنَّا ① (النجم) اس کا معنی ہے فتدل ثم دنا۔ اس کی مثل ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ② (القمر) یہ قرآن میں کثیر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اَعُوذُ بِاللّٰهِ پڑھنے کا امر استحبّی ہے۔ جمہور کے قول کے مطابق نماز کے علاوہ ہر قراءت میں اور نماز میں اس کے متعلق اختلاف ہے۔ نقاش نے عطاء سے حکایت کیا ہے استعاذہ واجب ہے۔ ابن سیرین، نخعی اور ایک اور جماعت نماز کی ہر رکعت میں تعوذ پڑھتے تھے اور استعاذہ میں عموم پر اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نماز میں پہلی رکعت میں تعوذ پڑھتے ہیں اور وہ پوری نماز کی قراءت کو ایک قراءت کی طرح سمجھتے ہیں اور امام مالک فرضی نماز میں تعوذ پڑھنے کا نظریہ نہیں رکھتے اور قیام رمضان میں اس کے پڑھنے کا نظریہ رکھتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3:** علماء کا اجماع ہے کہ تعوذ قرآن سے نہیں ہے اور نہ یہ قرآن کی آیت ہے۔ یہ قرآن کے قاری کا قول ہے اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ جمہور کے نزدیک تعوذ کے یہی الفاظ ہیں کیونکہ یہ کتاب اللہ کے الفاظ ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، انہوں نے کہا: میں نے اَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ کہا تو مجھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے ابن ام عبد! اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مجھے جبریل نے لوح محفوظ کے واسطے سے قلم سے اسی طرح پڑھایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** ابو داؤد اور ابن ماجہ نے اپنی اپنی سنن میں حضرت جبیر بن مطعم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا۔ عمرو نے کہا: مجھے معلوم نہیں یہ کون سی نماز تھی۔ آپ نے کہا: اللہ اکبر کبیراً اللہ اکبر (تین مرتبہ) الحمد لله کثیراً الحمد لله کثیراً (تین مرتبہ) سبحان الله بكرة واصيلاً (تین مرتبہ) اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ مِنَ نَفْخِهِ وَنَفْثِهِ وَهَبْزِهِ۔ عمرو نے کہا: هَبْز سے مراد مرگی، نَفْث سے مراد شعر اور نَفْخ سے مراد کبر ہے (1)۔ ابن ماجہ نے کہا: الموتة سے مراد جنون ہے اور النفث سے مراد بغیر تھوک کے پھونک مارنا ہے اور الکبر سے مراد بھٹکانا ہے۔ ابو داؤد نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب رات کو اٹھتے تو اللہ اکبر کہتے پھر تین بار لا اِلهَ اِلَّا اللهُ کہتے اور اللہ اکبر کبیراً بھی تین بار کہتے پھر اَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنَ هَبْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ پھر قراءت کرتے (2)۔

سلیمان بن سالم نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کہ استعاذہ یہ ہے: اَعُوذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ان الله هو السميع العليم بسم الله الرحمن الرحيم۔ ابن عطیہ نے کہا: پڑھنے والوں نے اسم کی صفت میں بہت زیادہ تبدیلی کی ہے جیسے بعض نے کہا: اَعُوذُ بِاللّٰهِ الْحَمِيدِ، من الشيطان السريد۔ اس قسم کو میں نہ تو اچھی بدعت کہتا ہوں اور نہ ہی میں کہتا ہوں کہ یہ جائز نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** مہدوی نے کہا: قراء کا اس بات پر اجماع ہے کہ سورہ الحمد کی قراءت سے پہلے استعاذہ کا اظہار کیا

1۔ سنن ابی داؤد، باب ما یستفتح به الصلاة، حدیث نمبر 651، سنن ابن ماجہ، باب الاستعاذہ فی الصلاة، حدیث نمبر 798، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، ابواب تفریع استفتاح الصلاة، باب ما یستفتح به الصلاة، حدیث نمبر 658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



جائے گا مگر حمزہ نے اس کو مخفی کیا ہے۔ سدی نے اہل مدینہ سے روایت کیا ہے کہ وہ قراءت بسم اللہ سے شروع کرتے تھے۔ ابو لیث سمرقندی نے بعض مفسرین سے روایت کیا ہے کہ تعوذ فرض ہے۔ جب قاری بھول جائے اور بعد میں اسے یاد آئے تو تلاوت چھوڑ کر اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھے پھر ابتدا سے قرأت کرے۔

بعض علماء فرماتے ہیں: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھے پھر اسی جگہ سے شروع کرے جہاں وقف کیا تھا۔ پہلا قول حجاز اور عراق کے علماء کا ہے اور دوسرا قول شام اور مصر کے علماء کا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** زہراوی نے حکایت کیا ہے: یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی، نماز میں ہم استعاذہ کو مستحب سمجھتے ہیں، فرض نہیں ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: نبی کریم ﷺ پر فرض تھا پھر ہم نے آپ کی پیروی کی۔

**مسئلہ نمبر 7:** حضرت ابو ہریرہ سے قراءت کے بعد استعاذہ پڑھنا مروی ہے۔ یہ داؤد کا قول ہے۔ ابو بکر بن عربی نے کہا: قوم کو بے علمی نے یہاں تک پہنچا دیا کہ انہوں نے کہا: جب قاری قرآن کی قراءت سے فارغ ہو جائے تو اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھے۔ حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ قراءت سے پہلے نماز میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھتے تھے۔ یہ نص ہے اگر کہا جائے کہ قراءت کے وقت شیطان سے پناہ مانگنے کا کیا فائدہ ہے؟ تو ہم کہیں گے: ایک فائدہ تو حکم الہی کی پیروی ہے۔ شریعات کا فائدہ امر کی اطاعت کرتے ہوئے وفا کے حق کو قائم کرنا اور نہی کی صورت میں اس سے اجتناب کر کے حق کو پورا کرنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: قراءت کے وقت شیطان کے دوسرے سے پناہ مانگ کر حکم کی پیروی کرنا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا اَنۡرَا سَلٰمًا مِّنۡ قَبۡلِكَ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نُبۡیَ اِلَّا اِذَا تَسَّیَ اَلۡفَی الشَّیْطٰنُ فِیۡ اٰمَنِیَّتِہٖ (الحج: 52) ابن عربی نے کہا: فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیۡمِ (النحل) کی تفسیر میں امام مالک کا قول ہم نے بہت عجیب پایا۔ انہوں نے کہا: جو نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھے اس کے بعد اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھے۔ یہ ایسا قول ہے جس کے بارے میں کوئی اثر نہیں ہے اور نہ اس کی تائید میں کوئی نظر ہے۔ اگر یہ اسی طرح ہے جس طرح لوگوں نے کہا کہ استعاذہ قراءت کے بعد ہے تو اس کی نماز میں سورۃ فاتحہ کی قراءت کے ساتھ تخصیص بے بنیاد دعویٰ ہے۔ مالک کی اصل درست نہیں ہے نہ اس کو فہم تسلیم کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس روایت کے راز کو بہتر جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** تعوذ کی فضیلت: مسلم نے سلیمان بن مرد سے روایت کیا ہے، دو شخصوں نے نبی کریم ﷺ کے قریب آپس میں جھگڑا کیا۔ ایک اتنا غصہ میں تھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور رگیں پھول گئیں۔ نبی کریم ﷺ نے اسے دیکھا تو فرمایا: میں ایک کلمہ جانتا ہوں اگر یہ شخص وہ کلمہ کہے تو اس کا یہ غصہ چلا جائے گا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیۡمِ (1) ایک شخص جس نے نبی کریم ﷺ سے یہ سنا وہ اس کے پاس گیا اور کہا: کیا تو جانتا ہے جو ابھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے؟

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: میں ایک کلمہ جانتا ہوں اگر یہ شخص وہ کلمہ کہے تو اس سے یہ غصہ چلا جائے گا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ

1۔ صحیح بخاری، کتاب ہدای الخلق، باب صفۃ اہلبیس وضوۃ، حدیث نمبر 3040، غیاء القرآن پبلی کیشنز

مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ وہ شخص کہنے لگا: کیا تو مجھے مجنون دیکھتا ہے (کہ میں یہ کلمہ کہوں) اس حدیث کو بخاری نے بھی نقل کیا ہے۔  
 مسلم نے عثمان بن ابی عاص ثقفی سے روایت کیا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! شیطان میرے اور میری نماز اور میری قراءت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور اسے مجھ پر خلط ملط کر دیتا ہے۔  
 رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ شیطان ہے جسے خنزب کہا جاتا ہے۔ جب تو اسے محسوس کرے تو اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ مانگ اور اپنی بائیں طرف تین دفعہ تھوک دے۔ عثمان بن ابی عاص فرماتے ہیں: میں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے دور کر دیا (1)۔ ابو داؤد نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب سفر کرتے اور کسی جگہ رات گزارتے تو یہ پڑھتے۔  
 يَا اَرْضُ رَبِّي وَ رَبُّكَ اللَّهُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّكَ وَمِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ فَبَيْنَكَ وَمِنْ شَرِّ مَا يَدُبُّ عَلَيْكَ وَمِنْ اَسَدٍ وَّ اَسْوَدٍ وَّ مِنَ الْحَيَّةِ وَّ الْعُقْبِ وَّ مِنَ سَاكِنِ الْبَلَدِ وَّ اِلَيْدٍ وَّ مَا وَّلَدَ۔ (2)

ترجمہ:- اے زمین میرا اور تیرا رب اللہ ہے میں تیرے شر اور اللہ تعالیٰ نے جو تجھ میں پیدا کیا اس کے شر سے اور جو تجھ پر ریگستا ہے اس کے شر شیر، ناگ، سانپ، بچھو، بستی والوں اور باپ اور اولاد کے شر سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔  
 حضرت خولہ بنت حکیم نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: جو کسی جگہ اترے پھر یہ کہے: اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ الثَّامَاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ تو اسے کوچ کرنے تک کوئی چیز نقصان نہیں پہنچائے گی (3)۔ اس حدیث کو موطا، مسلم اور ترمذی نے نقل کیا۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔ جن کلمات کے ساتھ پناہ مانگی جاتی ہے وہ احادیث میں کثرت سے ثابت ہیں۔ واللہ المستعان۔

**مسئلہ نمبر 9:** استعاذہ کا معنی عرب کلام میں پناہ لینا ہے کسی کی طرف جگہ لینا ہے یعنی مکروہ چیز سے بچنا ہے۔ کہا جاتا ہے: عُدْتُ بِفُلَانٍ وَّ اسْتَعَذْتُ بِهِ یعنی میں نے اس کی بارگاہ میں پناہ لی وہ میری پناہ گاہ ہے۔ و اعذت غیری بہ و عوذتہ دونوں ہم معنی ہیں کہا جاتا ہے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ۔ اس کا معنی ہے: میں تجھ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ راجز نے کہا:

قالت و فيها حيدة و ذعر عوذ بهي منكم و جحر

عرب ناپسندیدہ امر کے وقت کہتے ہیں: حجراً له یعنی دفعاً له۔ یہ کسی امر سے پناہ مانگنے کے لئے ہوتا ہے۔ العوذۃ و البعاذۃ و التعویذ تمام کا معنی ہے پناہ لینا۔ اعوذ اصل میں اَعُوْذُ تھا۔ ضمہ کو عین کی طرف نقل کیا کیونکہ واؤ پر ثقیل تھا پس واؤ ساکن ہو گئی۔

**مسئلہ نمبر 10:** شیطان کی جمع شیاطین جمع مکسر ہے، اس کا نون اصلی ہے کیونکہ یہ شطن سے مشتق ہے جب کوئی خیر سے دور ہو تو شطن بولتے ہیں و شطنت دارہ اس کا گھر دور ہے۔ شاعر نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب التعوذ من شیطان الوسوسة فی الصلاة

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب ما یقول الرجل اذا نزل المنزل، حدیث نمبر 2236، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ موطا امام مالک، کتاب الاستئذان، باب ما یؤمر به من الکلام فی السفر

نَأْتِ بِسَعَادٍ عَنْكَ نَوَى شَطُونِ قِبَانَتِ وَالْفَوَادِ بِهَا رَهِينِ

بئز شطون ایسا کنواں جو بہت گہرا ہو۔ الشطن رسی کو بھی کہتے ہیں اس لئے کہ اس کی دونوں طرفیں دور ہوتی ہیں۔ ایک اعرابی نے اپنے سرکش گھوڑے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا: کانہ شیطان فی الشطان۔ شیطان کو شیطان اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حق سے دور ہوتا ہے اور سرکش ہوتا ہے۔ جن، انس اور جانوروں میں ہر سرکش کو شیطان کہا جاتا ہے۔ جریر نے کہا:

ایام یدعوننی الشیطان من غزل و هن یھویننی اذ کنت شیطانا

بعض علماء نے فرمایا: شیطان، شاطی شیط سے مشتق ہے جس کا معنی ہے ہلاک ہونا اور نون زائدہ ہے اور شاط کا معنی جلنا بھی ہے شیطت اللحم۔ میں نے گوشت کو پکایا۔ اشتاط الرجل، جب کوئی شخص انتہائی غصہ میں ہو۔ ناقة مشیط جو موٹا پا ہو۔ اشتاط کا معنی ہے ہلاک ہونا، اعش نے کہا:

قد نغضب العیر من مکنون فائلہ و قد یشیط علی ارماحنا البص

اس شعر میں ہلاکت کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

اس قول والے علماء پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ سیبویہ نے حکایت کیا ہے کہ عرب کہتے ہیں تشیطن فلان۔ جب کوئی شیطانوں والے افعال کرے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ یہ شطن سے تفعیل کا وزن بنایا گیا ہے۔ اگر یہ شاط سے ہوتا تو تشیط کہتے۔ اسی طرح امیہ بن ابی صلت کا شعر بھی ان کا رد کرتا ہے۔

ایسا شاطن عصاء عکاء و رماہ فی السجن والاغلل

اس شعر میں شاطن، شطن سے مشتق ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 11:** الرجیم، خیر سے دور، ذلیل۔ الرجم کی اصل پتھر مارنا ہے قد رجمتہ ارجنہ، فہو رجیم و مرجوم کا معنی پتھر مارنا ہے۔

الرجیم کا معنی قتل کرنا، لعنت کرنا، دھتکارنا اور گالی دینا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہ تمام معانی بیان کئے گئے ہیں لَیِّن لَّمْ تَنْتَهِ یُنُوْخْ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ ﴿۵﴾ (الشعراء) اور حضرت ابراہیم کے باپ کا قول ہے: لَیِّن لَّمْ تَنْتَهِ لَا تُرْجُکَ (مریم: 46) اس کا بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 12:** اعش نے ابو دائل سے انہوں نے حضرت عبد اللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت علی نے فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کو صفا کے پاس دیکھا۔ آپ ایک شخص کی طرف متوجہ تھے جو ہاتھی کی صورت میں تھا۔ آپ اسے لعنت کر رہے تھے۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ! مٹی پڑاؤں یہ کون تھا جس کو آپ لعنت کر رہے تھے؟ فرمایا: یہ الشیطان الرجیم ہے۔ میں نے کہا: اے اللہ کے دشمن! اللہ کی قسم! میں تجھے قتل کروں گا اور امت کو تجھ سے راحت دوں گا۔ شیطان نے کہا: یہ میری تمہاری طرف سے کیا جزا ہے؟ میں نے کہا: اے اللہ کے دشمن! میری طرف سے تیری کیا جزا ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی قسم! تجھ سے کوئی دشمنی نہیں کریگا مگر میں اس کے باپ کے ساتھ اس کی ماں کے رحم میں شریک ہوا۔



## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس میں اٹھائیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** علماء نے فرمایا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہمارے رب کی طرف سے قسم ہے۔ اس نے ہر سورت کے آغاز پر اس کو نازل فرمایا اس نے اپنے بندوں کے لئے قسم اٹھائی کہ یہ میں نے تمہارے لئے رکھی ہے۔ اے میرے بندو! اس سورت میں حق ہے اور میں تمہارے لئے وہ تمام وعدے، لطف اور بھلائی پوری کروں گا جو اس سورت میں ہے اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہماری کتاب میں اتارا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد خصوصی طور پر اس امت پر اسکو اتارا۔ بعض علماء نے فرمایا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تمام شرع کو متضمن ہے کیونکہ یہ ذات اور صفات پر دلالت کرتی ہے اور یہ صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** حضرت سعید بن ابی سکینہ نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے اسے فرمایا: اسے عمدہ طریقہ سے لکھو، ایک شخص نے اسے عمدہ طریقہ سے لکھا تو اس کی بخشش کر دی گئی (1)۔ حضرت سعید نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک شخص نے ایک کاغذ میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ دیکھی تو اسے بوسہ دیا اور اپنی آنکھوں پر لگایا تو اس کی بخشش کر دی گئی۔ اسی مفہوم میں بشرحانی کا واقعہ ہے۔ انہوں نے جب وہ کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا جس میں بسم اللہ لکھی ہوئی تھی اسے خوشبو لگائی تو اس کے نام کو خوشبو لگائی گئی۔ یہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔

امام نسائی نے ابویحییٰ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے بیٹھنے والے سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب تیری سواری ٹھوکر کھائے تو تعس الشیطان (شیطان تباہ ہو) نہ کہو وہ بڑا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ کمرے کی مثل ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: میں نے اپنی طاقت سے یہ کیا لیکن تم بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہو کیونکہ اس سے وہ چھوٹا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ مکھی کی مثل ہو جاتا ہے۔ حضرت علی بن حسین نے اپنی تفسیر میں: وَإِذَا ذُكِّرْتُ بِرَبِّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدًا وَلَوْ أَنِّي أَدْبَارُهُمْ لَفُتُوْنَا ۖ (الاسراء) کے تحت فرمایا اس کا مطلب ہے جب تم بِسْمِ اللّٰهِ پڑھتے ہو۔ وکیع نے اعش سے انہوں نے ابوداؤد سے انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: جو ارادہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دوزخ کے انیس فرشتوں سے نجات عطا فرمائے تو وہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر حرف کے بدلہ ہر ایک فرشتے سے ڈھال بنا دے گا۔ بِسْمِ اللّٰهِ کے دوزخ کے فرشتوں کی تعداد کے برابر انیس حروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کے بارے فرمایا: علیہا تسعة عشر۔ وہ اپنے ہر فعل میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہتے ہیں یہی ان کی قوت ہے اور بسم اللہ کے ساتھ وہ قوت حاصل کرتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کی مثال ان کا قول لیلۃ القدر کے بارے میں ہے: ستائیسویں کی رات ہے کیونکہ انا انزلنا سورۃ کے کلمات سے (ہی) کا لفظ ستائیسواں کلمہ ہے۔ اس کی مثال ان فرشتوں کی تعداد میں بھی ہے جنہوں نے رہنا ذلك الحمد حسداً كثيراً طیباً مبارکاً فیہ کہنے والے کے اس قول کو لکھنے میں جلدی کی، اس کلمہ

کے تیس سے زیادہ حروف ہیں۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں نے تیس سے زائد فرشتوں کو جلدی کرتے ہوئے دیکھا کہ پہلے کون لکھتا ہے (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ عمدہ تفسیر ہے لیکن پختہ علم سے نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** شعبی اور اعمش سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ باسْمِ اللہ لکھتے تھے حتیٰ کہ آپ کو بِسْمِ اللہ لکھنے کا حکم دیا گیا۔ پس آپ نے بِسْمِ اللہ لکھا پھر جب قُلْ اَدْعُوا اللہَ اَوْ اَدْعُوا الرَّحْمٰنَ (الاسراء: 110) نازل ہوا تو آپ نے بِسْمِ اللہ الرَّحْمٰنِ لکھا جب اِنَّہٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّہٗ بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (النمل) نازل ہوا تو آپ نے بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھا اور مصنف ابو داؤد میں ہے امام شعبی، ابو مالک، قتادہ، ثابت بن عمارہ نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نہیں لکھا حتیٰ کہ سورہ النمل نازل ہوئی۔

**مسئلہ نمبر 4:** امام جعفر الصادق سے مروی ہے، فرمایا: بِسْمِ اللہ، سورتوں کے تاج ہیں میں کہتا ہوں یہ دلیل ہے کہ یہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی دوسری سورت کی۔ علماء کے اس کے متعلق تین مختلف اقوال ہیں۔

۱- یہ نہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی دوسری سورت کی۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔

۲- یہ ہر سورت کی آیت ہے۔ یہ عبد اللہ بن مبارک کا قول ہے۔

۳- امام شافعی نے فرمایا: یہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے اور باقی سورتوں کے بارے میں انہیں تردد ہے۔ کبھی فرمایا: ہر سورہ کی آیت ہے کبھی فرمایا: یہ صرف سورہ فاتحہ کی آیت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ سورہ النمل کی آیت ہے۔

امام شافعی نے دارقطنی کی اس حدیث سے دلیل پکڑی ہے جو ابو بکر حنفی نے عبد الحمید بن جعفر سے انہوں نے نوح بن ابی بلال سے انہوں نے سعید بن ابی سعید مقبری سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب تم اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی قرأت کرو تو بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھو یہ ام القرآن ہے، ام الكتاب ہے السبع المثانی ہے اور بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اس کی آیت میں سے ایک آیت ہے۔

عبد الحمید بن جعفر نے اس حدیث کو مرفوع بیان کیا ہے اور عبد اللہ کو احمد بن حنبل، یحییٰ بن سعید اور یحییٰ بن معین نے اس کی توثیق کی ہے۔ ابو حاتم نے اس کے بارے فرمایا: اس کا محل صدق ہے۔ سفیان ثوری اس کو ضعیف قرار دیتے تھے اور ان سے روایت بھی کرتے تھے۔ نوح بن ابی بلال ثقہ مشہور ہے۔

ابن مبارک کی حجت اور امام شافعی کے ایک قول کی حجت مسلم کی روایت ہے جو انہوں نے حضرت انس سے روایت کی ہے، فرمایا: ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان تھے آپ کو اونگھ آگئی۔ پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سراٹھایا۔ ہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! ﷺ آپ کو کس نے ہنسا یا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ نے پڑھا: بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِنَّا اَعْطٰیْکَ الْکُوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ ۝ اِنَّ شَانِئْکَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ حدیث ذکر فرمائی۔ مکمل ان شاء اللہ سورہ کوثر میں آئے گی۔

1۔ صحیح بخاری، باب فضل اللہم ابتلائک الحمد، حدیث نمبر 757، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 5:** ان اقوال میں سے صحیح قول امام مالک کا ہے کیونکہ قرآن اخبار احاد سے ثابت نہیں ہوتا، اس کا طریق

تواتر قطعی ہے جس میں اختلاف نہیں ہوتا ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کے قرآن نہ ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ اس میں

لوگوں کا اختلاف ہے اور قرآن میں اختلاف نہیں ہے۔ صحیح اخبار جن میں کوئی طعن نہیں ہے وہ دلالت کرتی ہیں کہ یہ نہ تو سورۃ

فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی اور سورت کی آیت ہے۔ سوائے سورۃ النمل کے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے،

فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے نماز اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو

حصوں میں تقسیم کی ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا۔ جب بندہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی اور جب بندہ کہتا ہے الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے

بندے نے میری ثنا کی اور جب بندہ کہتا ہے هٰذَا يَوْمُ الدِّينِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بڑائی

بیان کی۔ اور کبھی فرمایا میرے بندے نے میری طرف اپنا معاملہ سپرد کیا۔ اور جب بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ

نَسْتَعِيْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے، اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس

نے سوال کیا، جب اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ ۝۔

فرمایا یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا (۱)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ قسمت

الصلوة۔ اس سے مراد سورۃ فاتحہ ہے یعنی سورۃ فاتحہ کو تقسیم کیا۔ سورۃ فاتحہ کو صلاۃ کہا کیونکہ نماز اس کے بغیر صحیح نہیں ہوتی۔ پہلی

تین آیات اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بیان فرمائیں اور انہیں اپنے ساتھ خاص کیا، اس میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف نہیں۔ پھر

چوتھی آیت اپنے اور اپنے بندے کے درمیان فرمائی کیونکہ وہ آیت بندے کے تذلل اور اللہ تعالیٰ سے استعانت طلب کرنے

کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے پھر تین آیات سات آیات کا تہ

ہیں۔ جو چیز ان آیات کے تین ہونے پر دلیل ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰذَا لِعِبَادِيْ (یہ میرے بندے کے لئے ہیں)

یہ حدیث مالک نے نقل کی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ (ہاتان) یہ دلیل ہے کہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ایک آیت ہے۔ ابن بکیر نے کہا:

امام مالک نے فرمایا اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ایک آیت ہے۔ پھر ساتویں آیت آخر تک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم اور نبی کریم

ﷺ کا ارشاد جو آپ نے ابی کو فرمایا تھا کہ تو جب نماز شروع کرتا ہے تو کیسے پڑھتا ہے؟ تو اس نے کہا: میں نے پڑھا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ حتیٰ کہ میں آخر تک پہنچا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کی آیت نہیں ہے اسی طرح

اہل مدینہ، اہل شام، اہل بصرہ اور اکثر قراء نے اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کو آیت شمار کیا۔ اسی طرح قتادہ نے ابونضرہ سے انہوں نے

حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ چھٹی آیت اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ہے اور رہے اہل کوفہ کے قراء اور فقہاء تو وہ بسم اللہ کو آیت

شمار کرتے ہیں اور اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کو علیحدہ آیت شمار نہیں کرتے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ بسم اللہ مصحف میں موجود ہے، لکھی ہوئی ہے اور نقل ہوتی آرہی ہے جس طرح سورۃ النمل میں نقل

1۔ صحیح مسلم کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءة الفاتحة فی کل رکعة، حدیث نمبر 648، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



ہوتی آرہی ہے تو یہ تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے جو تم نے ذکر کیا وہ صحیح ہے لیکن یہ اس کے قرآن ہونے یا سورتوں کے درمیان فاصل ہونے کی وجہ سے ہے جیسا کہ صحابہ سے مروی ہے کہ ہم سورت کا اختتام نہیں جانتے تھے حتیٰ کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نازل ہوئی (1)۔ یہ ابو داؤد نے روایت کیا ہے یا اس سے برکت حاصل کرنے کے لئے ہر سورت کے آغاز میں اسے لکھا جاتا ہے جیسا کہ کتب اور رسائل کی ابتدا میں اسے لکھنے پر امت کا اتفاق ہے۔ یہ سب احتمال ہیں اور حریری نے کہا حضرت حسن سے بسم اللہ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: رسائل کے آغاز میں لکھی جاتی ہے اور حسن نے یہ بھی فرمایا کہ بسم اللہ، قرآن میں سے کسی سورت میں نازل نہیں ہوئی مگر سورۃ طس میں اِنَّهُ مِنْ سُلَيْمٰنٍ وَّ اِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

فیصلہ یہ ہے کہ قرآن نظر اور استدلال سے ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن نقل متواتر، قطعی اضطراری کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔ پھر امام شافعی کا قول ہر سورت کے آغاز میں بسم اللہ کے متعلق مضطرب ہے۔ یہ دلیل ہے کہ یہ نہ کسی سورت کی اور نہ الحمد للہ کی آیت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک جماعت سے اس کا قرآن ہونا مروی ہے۔ دارقطنی نے ایک جز میں اس جماعت کے اقوال کو جمع کیا ہے اور اس کی تصحیح کی ہے؟ ہم اس کے جواب میں کہیں گے ہم اس کے متعلق روایت کا انکار نہیں کرتے اور ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا بھی ہے اور ہماری بھی اس کے مقابلہ میں روایات ہیں جن کو ائمہ ثقات اور فقہاء اثبات نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ سے صحیح مسلم میں مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ تکبیر کے ساتھ نماز کا آغاز فرماتے اور قراءت کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سے فرماتے۔ الحدیث۔ مکمل حدیث آگے آئے گی۔ مسلم نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ، سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر کے پیچھے نماز پڑھی، وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سے آغاز کرتے تھے۔ وہ بسم اللہ کا ذکر نہیں کرتے تھے نہ قراءت کی ابتدا میں اور نہ آخر میں۔ (2)

ہمارا مذہب ایک عظیم وجہ کے ساتھ رائج ہے اور وہی معقول بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی مسجد جو مدینہ طیبہ میں ہے اس پر زمانہ گزر چکا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے لے کر امام مالک کے زمانہ تک طویل عرصہ بیت چکا ہے اور اس مسجد میں کسی نے کبھی سنت کی اتباع کرتے ہوئے بسم اللہ نہیں پڑھی اور یہ تمہاری احادیث کا رد ہے۔

مگر ہمارے اصحاب نے نقل میں اس کی قراءت کو مستحب کہا ہے اور اسی پر اس کی قراءت کے بارے میں وارد آثار محمول ہیں یا اس میں وسعت کی بنا پر ہے۔ امام مالک نے فرمایا: نفلوں میں بسم اللہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور ان کے پڑھنے میں بھی کوئی حرج نہیں جو دور کرتے ہیں۔ امام مالک اور ان کے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ یہ نہ تو سورۃ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ یہ کسی اور سورت سے ہے۔ نمازی فرض نماز میں اور کسی دوسری نماز میں اس کو سزا اور جبراً نہیں پڑھے گا اور نوافل میں اس کا پڑھنا جائز ہے۔ اصحاب مالک کے نزدیک یہی مشہور مذہب ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ نوافل میں سورت کے آغاز میں

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب من جہر بہا، حدیث نمبر 669، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب حجة من قال لا یجہر بالہمسلة، حدیث نمبر 655، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بسم اللہ پڑھی جائے گی اور سورت الحمد سے پہلے نہیں پڑھی جائے گی۔ ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ فرض اور نفل نماز میں اس کے ساتھ قراءت شروع کی جائے گی اور کسی حال میں ترک نہیں کی جائے گی۔ اہل مدینہ میں سے بعض نے کہا: نماز میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ضروری ہے، ان میں سے حضرت ابن عمر اور ابن شہاب ہیں۔ یہی امام شافعی، احمد، اسحاق، ابو ثور اور ابو عبیدہ کا قول ہے۔

یہ دلیل ہے کہ یہ مسئلہ اجتہاد یہ ہے قطعاً نہیں ہے جیسا کہ بعض جہلاء نے کہا ہے جس کے قول پر مسلمانوں کی تکفیر لازم آتی ہے۔ حقیقت اس طرح نہیں ہے جس طرح اس نے گمان کیا ہے کیونکہ اختلاف علماء موجود ہے۔ الحمد للہ۔ علماء کی جماعت کا خیال یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ کو آہستہ پڑھا جائے گا۔ ان میں سے امام ابو حنیفہ اور ثوری ہیں۔ یہی حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت عمار اور حضرت ابن زبیر کا قول ہے یہی حکم اور حماد کا قول ہے۔ امام احمد بن حنبل اور ابو عبیدہ نے بھی یہی کہا ہے۔ اوزاعی نے اس کی مثل روایت کیا ہے۔ ابو عمر نے اسناد کار میں یہی حکایت کیا ہے اور ان علماء نے اس اثر سے حجت پکڑی ہے جو منصور بن زاذان نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی اور ہمیں بسم اللہ کی قراءت نہ سنائی (۱) اور عمار بن رزق نے اعمش سے انہوں نے شعبہ سے انہوں نے ثابت سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے اور حضرات ابو بکر و عمر کے پیچھے نماز پڑھی میں نے ان میں سے کسی سے بسم اللہ جہراً نہیں سنی۔

میں کہتا ہوں: یہ عمدہ قول ہے اس پر حضرت انس سے مروی آثار متفق ہیں اور ان میں تضاد نہیں ہے اور اس طرح بسم اللہ کے متعلق اختلاف سے بھی انسان نکل جاتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرمایا: مشرک مسجد میں آتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ پڑھتے تو وہ کہتے: یہ محمد، یمامہ کے رحمان یعنی مسلمان کا ذکر کرتا ہے۔ تو آپ کو بسم اللہ آہستہ پڑھنے کا حکم دیا گیا اور وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافُتْ بِهَا (الاسراء: 110) کا ارشاد نازل ہوا۔ حکیم ترمذی ابو عبد اللہ نے کہا: آج تک یہ اسی طریقہ پر باقی ہے اگرچہ علت زائل ہو گئی ہے۔ جس طرح طواف میں رمل باقی ہے اگرچہ علت ختم ہو گئی ہے، دن کی نماز میں سری قراءت باقی ہے اگرچہ علت ختم ہو گئی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** امت کا اتفاق ہے کہ رسائل اور علم کی کتابوں میں سے ہر کتاب کے آغاز میں بسم اللہ لکھنے کا جواز ہے۔ اگر کتاب شعری دیوان ہو تو مجاہد نے شجی سے روایت کیا ہے، فرمایا: علماء کا اجماع ہے کہ وہ شعر سے پہلے بسم اللہ نہ لکھیں۔ زہری نے کہا: سنت قائم ہو چکی ہے کہ شعر میں بسم اللہ نہیں لکھی جاتی اور حضرت سعید بن جبیر کا نظریہ یہ ہے کہ شعر کی کتب کے آغاز میں بسم اللہ لکھنا جائز ہے۔ اکثر متأخرین نے ان کی متابعت کی ہے۔ ابو بکر خطیب نے کہا: ہم اس کو پسند کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7:** الماوردی نے کہا: بسم اللہ کہنے والے کو مبہمل کہنا یہ ردی لغت ہے۔ شعر میں آیا ہے، عمر بن ابی ربیعہ نے کہا:

1۔ سنن نسائی، کتاب الافتتاح، باب ترک الجہر بسم اللہ الرحمن الرحیم، حدیث نمبر 896، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لقد بسملت لیلی غداة لقیتها فیا حبذا ذاك الحبيب المبسل  
لیلی نے اس صبح بسم اللہ کہا جس صبح میں ملا، وہ حبیب بسم اللہ کہنے والا کتنا اچھا ہے۔

میں کہتا ہوں: اہل لغت سے مشہور بسل ہے۔ یعقوب بن سکیت، مطرز ثعالبی وغیرہم لغویوں نے کہا: بسم اللہ الرجل جب کوئی بسم اللہ کہے کہا جاتا ہے: اکثر من البسلة یعنی تو نے بسم اللہ کا قول زیادہ کیا۔ اس کی مثل حوقل الرجل ہے اس نے لاحول ولا قوۃ الا بالله کہا۔ ہلل۔ جب کوئی لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہے۔ سبعل جب سبحان اللہ کہے۔ حمدل جب کوئی الحمد لله کہے، حیصل جب حی علی الصلوۃ کہے۔ جعفل جب جعلت فداک کہے، طبقل جب کہے اطلال اللہ بقاءک (اللہ تیری عمر دراز کرے) دمعز جب کہے ادام اللہ عزک۔ حیقل جب کہے حی علی الفلاح۔ مطرز نے الحیصلۃ کا ذکر نہیں کیا جب حی علی الصلوۃ کہے اور جعفل، جب جُعِلْتُ فداک کہے، طبقل، جب اطلال اللہ بقاءک کہے، دمعز جب ادام اللہ عزک کہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** ہر فعل سے پہلے بسم اللہ کا ذکر مستحب ہے جیسے کھانا، پینا، ذبح کرنا، حقوق زوجیت ادا کرنا، سمندر پر سوار ہونا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكُلُوا وَامْشَوْا ذِكْرًا لِّاسْمِ اللَّهِ عَلَيْهِ (الانعام: 118) (اے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو)۔ ارشاد ہے: قَالَ امْرُؤُا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرِبَهَا وَفُوسَهَا (ہود: 41) (نوح نے کہا: سوار ہو جاؤ اس کشتی میں اللہ کے نام کے ساتھ ہی اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دروازہ بند کرو تو اللہ کا نام لو، اپنا چراغ بجھاؤ تو اللہ کا نام ذکر کرو، اپنے برتن کوڑھاؤ تو اللہ کا نام ذکر کرو اور اپنے مشکیزہ کا منہ باندھو تو اللہ کا نام ذکر کرو (1)۔ اور فرمایا: اگر تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کرنے کا ارادہ کرے تو یہ دعا پڑھے: بسم اللہ اللھم جنبنا الشیطان و جنب الشیطان ما رزقنا۔ اگر ان کی تقدیر میں بچہ ہوگا تو شیطان اسے کبھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ عمر بن ابی سلمہ کو فرمایا: اے غلام! بسم اللہ پڑھ اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھا اور اپنے سامنے سے کھا (2)۔ اور فرمایا: شیطان کھانے کو حلال کر لیتا ہے مگر جب اس کھانے پر اللہ کا نام لیا جائے۔ اور فرمایا: جس نے ابھی ذبح نہیں کیا وہ بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرے۔ عثمان بن ابی العاص نے اس تکلیف کی شکایت کی جو انہیں اسلام قبول کرنے کے وقت سے جسم میں تھی۔ اسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے جسم میں تکلیف والی جگہ پر ہاتھ رکھ اور تین مرتبہ بسم اللہ پڑھ اور سات مرتبہ یہ کلمات کہہ اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللَّهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَيْءٍ مَا اَجِدُوْا اَحَاذِرُ (3)۔ یہ تمام احادیث صحیح میں ثابت ہیں۔ ابن ماجہ اور ترمذی نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جنوں اور بنی آدم کی شرمگاہوں کے درمیان پردہ ہے کہ جب لیٹرین میں داخل ہو تو پہلے بسم اللہ پڑھے (4)۔ دارقطنی میں حضرت عائشہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفۃ ابلیس وضوۃ، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاطعمۃ، حدیث نمبر 4957، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب استحباب وضع الید علی موضع الاثم مع الدعاء

4۔ سنن ابن ماجہ، ما یقول الرجل اذا دخل الخلاء، حدیث نمبر 292، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



نبیؐ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب پانی کو چھوتے تو بسم اللہ پڑھتے پھر اپنے ہاتھوں پر پانی بہاتے۔

**مسئلہ نمبر 9:** ہمارے علماء نے فرمایا: اس میں قدر یہ وغیرہ کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ ان کے افعال کی انہیں قدرت دی گئی ہے اور ان کے خلاف حجت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر فعل کو شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

بسم اللہ کا معنی، بسم اللہ ہے اور بسم اللہ کا مفہوم ہے اللہ کی تخلیق اور تقدیر سے مقصود تک پہنچا جاتا ہے۔ اس کا مزید بیان آگے آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: بسم اللہ کا مطلب ہے میں نے اللہ کی مدد، اس کی توفیق اور برکت سے شروع کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو تعلیم ہے تاکہ قراءت اور دوسرے کاموں کا آغاز اللہ تعالیٰ کے نام کے ذکر سے کریں تاکہ اللہ کی برکت سے افتتاح ہو۔

**مسئلہ نمبر 10:** ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ کا نظریہ یہ ہے کہ اسمہ اندہ ہے اور انہوں نے لبید کے اس شعر سے استشہاد کیا ہے۔

الی الحول ثم اسم السلام علیکم و من یبک حولاً کاملاً فقد اعتذر

ایک سال تک تم رو پھر تم سلامتی ہو جو ایک سال تک روئے وہ معزور ہے۔

اس شعر میں اسم کا لفظ زیادہ ہے مراد اسم السلام علیکم ہے۔

ہمارے علماء نے لبید کے اس قول سے استدلال کیا ہے کہ اسم ہی مسمیٰ ہے۔ مزید کلام آگے آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 11:** اسم کے زیادہ ذکر کرنے کی وجہ میں اختلاف ہے۔ قطرب نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے اجلال اور تعظیم کے لئے زیادہ کیا گیا ہے۔ انفش نے کہا: یہ اس لئے زیادہ کیا گیا ہے تاکہ قسم کے حکم سے نکل جائے اور تبرک کا قصد ظاہر ہو کیونکہ اصل کلام بسم اللہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 12:** اس پر با کے دخول کے معنی میں بھی علماء کا اختلاف ہے، کیا یہ امر کے معنی پر داخل ہوا تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: ابدأ بسم اللہ۔ یا خبر کے معنی پر داخل ہوا؟ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: ابتدأت بسم اللہ۔ پہلا قول فراء کا ہے اور دوسرا زجاج کا ہے اور نصب کی حالت میں ہونے کی دو تاویلیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے ابتدائی بسم اللہ۔ بسم اللہ محل رفع میں ہوگا۔ مبتدا کی خبر کی حیثیت سے۔ بعض نے فرمایا: خبر محذوف ہے۔ یعنی ابتدائی مستقر یا ثابت بسم اللہ۔ اور جب تو خبر کو ظاہر کرے گا تو محل نصب میں ثابت اور مستقر کی وجہ سے ہوگا۔ یہ زید فی الدار کے قائم مقام ہوگا۔ قرآن میں ہے: فَلَمَّا رَأَاهُ مُسْتَقَرًّا عِنْدَآ قَالَ هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ (النمل: 40) اور عند محل نصب میں ہے۔ یہ بصرہ کے نحو یوں سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی تقدیر اس طرح ہے: ابتدائی بسم اللہ موجود اور ثابت۔ پس بسم اس مصدر کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا جو ابتدائی ہے۔

**مسئلہ نمبر 13:** بسم اللہ کو بغیر الف کے لکھا جاتا ہے باء، الصاق کی وجہ سے۔ اس کے لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی اور کثرت استعمال کی وجہ سے لفظ اور خطا اس کا اظہار نہیں ہوتا۔ بخلاف اقراہا بسم رہک کے قلت استعمال کی وجہ سے

حذف نہیں کی جاتی۔ الرحمن اور القاهر کے ساتھ اس کو حذف کرنے میں اختلاف ہے۔ کسائی، سعید، انفش نے کہا: الف حذف کی جائے گی۔ یحییٰ بن وثاب نے کہا: الف حذف نہیں کی جاتی مگر صرف بسم اللہ میں کیونکہ اس کا استعمال کثیر ہے۔

**مسئلہ نمبر 14:** با جارہ کو کسرہ دینے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا تاکہ اپنے عمل کے مناسب ہو جائے۔ بعض نے فرمایا: باء چونکہ صرف اسماء پر داخل ہوتی ہے اس لئے زیر کے ساتھ خاص کی جو اسماء کے ساتھ خاص ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کے اور اسم حروف کے درمیان فرق کرنے کے لئے جیسے کاف۔ شاعر کا قول ہے:

و رحنابکا بن الماء یجنب و سطنا۔ اس کا مطلب بيشل ابن الماء یا جو اس کی مثل ہے۔

**مسئلہ نمبر 15:** اسم اس کا وزن افْعَم، اس میں واو حذف ہے کیونکہ یہ سہوت سے ماخوذ ہے اس کی جمع اسماء اور تصغیر سُئ ہے۔ اس کی اصل کی تقدیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: فِعْلٌ، بعض نے فرمایا فَعْل ہے۔ جوہری نے کہا: اسماء جمع اس وزن کی ہوگی اس کی مثال جذع کی جمع اجزاء ہے، قُفْل کی جمع اقفال ہے۔ اس کا صیغہ سماع کے ساتھ ی پایا جاتا ہے، اس میں چار لغات ہیں اسم ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ، اسم ضمہ کے ساتھ۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: جنہوں نے الف کو ضمہ دیا انہوں نے اسے سہوت اور اَسْمُو سے مشتق کیا ہے اور جنہوں نے ہمزہ کو کسرہ دیا انہوں نے سَنِیت اُسُی سے مشتق کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: سِمٌ اور سُمٌ۔ شاعر نے کہا:

والله ا. ماك سنا مباركا آثرک الله به ایشارک

اس شعر میں شاعر نے سنا استعمال کیا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

و عامنا اعجبنا مقدمہ يدعى ابا السمع و قرضات سُبُه

مہتر کا لکل عظم یدلحہ۔

اس میں شاعر نے سُم استعمال کیا ہے۔ ان اشعار میں قرضاب استعمال ہوا ہے۔ جب کوئی شخص خشک چیز کھائے تو وہ کہتے ہیں قرضب الرجل۔ سمہ سین کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔ ایک شاعر نے کہا:

باسم الذی فی کل سورة سُبُه اس کے نام سے شروع کرتا ہے ہر سورت میں جس کا نام ہے۔

باسم سے سین کو غیر قیاسی تعلیل کر کے ساکن کیا گیا ہے اس کا الف وصلی ہے کبھی کبھی ضرورت کے لئے شاعر اس کے الف کو قطعی بنا دیتا ہے۔ جیسے احوص کا قول ہے:

و ما انا بالمخسوس فی جذم مالک ولا من تستی ثم ینتزم الاسما

اس میں شاعر نے ہمزہ کو قطعی بنایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 16:** عرب اسم کی نسبت کے وقت کہتے ہیں سموی۔ اگر تو چاہے تو اسی کہہ دے، اب تو نے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کی جمع اسماء ہے اور اسماء کی جمع اسماء ہے، الفراء نے حکایت کیا ہے: اعیذک باسماءات اللہ۔

**مسئلہ نمبر 17:** اسم کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ بھریوں نے کہا: یہ السمو سے مشتق ہے جس کا معنی بلندی اور رفعت ہے۔ بعض نے فرمایا: اسم اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے انسان بلند ہو جاتا ہے۔ بعض نے کہا: اسم مسمی کو بلند کرتا ہے اور اسے دوسروں سے بلند کر دیتا ہے۔ بعض نے فرمایا: سم کو اسم اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ کلام کی دونوں قسموں حرف اور فعل پر اپنی قوت سے بلند ہوتا ہے۔ اسم، حرف اور فعل سے بالا جماع اقویٰ ہے کیونکہ اسم اصل ہے۔ پس اس کے حرف اور فعل سے بلند ہونے کی وجہ سے اسم کہا جاتا ہے۔ یہ تین اقوال ہیں۔

کوفیوں نے کہا: یہ السمة سے مشتق ہے جس کا معنی علامت ہے کیونکہ اسم علامت ہوتا ہے اس کی جس کے لئے وضع کیا جاتا ہے اس بناء پر اسم کی اصل و سم ہوگی۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ تصغیر میں سسی اور جمع اسماء بولا جاتا ہے۔ جمع اور تصغیر اشیاء کو اپنی اصل کی طرف لوٹا دیتی ہیں۔ دُسم اور اسم نہیں کہا جاتا۔ اس کی صحت پر اختلاف کا فائدہ دلالت کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 18:** جو کہتا ہے السمو سے مشتق ہے جس کا معنی العلو ہے وہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ مخلوق کے وجود سے پہلے اور ان کے وجود کے بعد اور ان کے فنا ہونے کے وقت ہمیشہ ہمیشہ موصوف تھا۔ اس کے اسماء اور صفات میں مخلوق کا کوئی اثر نہیں۔ یہ اہل سنت کا قول ہے اور جنہوں نے کہا: یہ السمة سے مشتق ہے وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ازل میں بغیر اسم اور صفت کے تھا جب اس نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو مخلوق نے اللہ تعالیٰ کے لئے اسماء اور صفات بنائیں۔ جب اللہ انہیں فنا کر دے گا تو پھر بغیر اسم اور صفت کے رہ جائے گا۔ یہ معتزلہ کا قول ہے۔ یہ قول امت کے اجماع کے مخالف ہے۔ یہ ان کی بڑی خطا ہے کیونکہ انہوں نے کہا: اللہ کا کلام مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بلند ہے۔ اس اختلاف کی بنا پر اسم اور مسمی میں اختلاف واقع ہوا ہے۔

**مسئلہ نمبر 19:** اہل حق کا نظریہ یہ ہے جو قاضی ابوبکر بن طیب نے نقل کیا ہے کہ اسم ہی مسمی ہے۔ ابن فورک نے بھی اس کو پسند کیا ہے، یہی قول ابو عبیدہ اور سیبویہ کا ہے۔ جب کوئی کہتا ہے: اللہ عالم، تو اس کا قول اس ذات پر دلالت کرتا ہے جو عالم ہونے کے ساتھ موصوف ہے پس اسم عالم ہوگا اور بعینہ وہی مسمی ہے۔ اسی طرح جب کہتا ہے: اللہ خالق تو خالق اللہ ہے۔ وہی بعینہ اس کا اسم ہے۔ پس اسم ان کے نزدیک بعینہ مسمی ہے بغیر کسی تفصیل کے۔ ابن حصار نے کہا: جو بدعتی لوگوں میں سے صفات کی نفی کرتا ہے وہ کہتا ہے اسماء کے لئے کوئی مدلول نہیں ہے مگر ذات، اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں اسم مسمی کا غیر ہے اور جو صفات کو ثابت کرتا ہے وہ اسماء کے لئے مدلولات کو ثابت کرتا ہے یہ ذات کے اوصاف ہیں اور یہ عبارات کا غیر ہیں اور یہ ان کے نزدیک اسماء ہیں اس کا مزید بیان ان شاء اللہ سورۃ بقرہ اور سورۃ اعراف میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 20:** اللہ، یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں بڑا اور جامع ترین اسم ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا: یہ اسم اعظم ہے اور کسی غیر کا نام اس کے ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ اسی وجہ سے نہ اس کا تشبیہ ہوتا ہے نہ جمع بنائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا (مریم: 65) کی ایک تاویل یہ بھی ہے یعنی کیا اللہ کے اسم کے ساتھ کسی کا نام رکھا جاتا ہے۔ اللہ اس موجود حق، صفات الہیہ کی جامع، ربوبیت کی صفات سے موصوف ذات کا اسم ہے جو وجود حقیقی کے ساتھ منفرد ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ کا معنی ہے وہ ذات جو عبادت کی مستحق ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے واجب



الوجود جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ان سب کا مفہوم ایک ہے۔

**مسئلہ نمبر 21:** اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ مشتق ہے یا یہ ذات کے لئے علم وضع کیا گیا ہے۔ اکثر اہل علم کا پہلا نظریہ ہے اور اس کے اشتقاق میں اور اس کی اصل میں بھی اختلاف ہے۔ سیبویہ نے خلیل سے روایت کیا ہے کہ اس کی اصل الاء ہے جسے فعال۔ پھر ہمزہ بدل الف، لام داخل کیا گیا۔ سیبویہ نے کہا: یہ الناس کی مثل ہے جس کی اصل اناس ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل (لاہ) ہے اور تعظیم کے لئے الف، لام اس پر داخل کیا گیا ہے۔ یہ سیبویہ کا مختار ہے۔ اس نے بطور استشہاد یہ شعر پڑھا ہے۔

لاہ ابن عبك لا افضلک فی حسب عنی ولا انت دیانی فتخزون

اس شعر میں لاہ استعمال ہوا ہے اور اس شعر میں تخزونی جاء مجمع کے ساتھ ہے اور اس کا معنی تسوسنی (دیکھ بال کرنا) ہے۔ کسائی اور فراء نے کہا: بسم اللہ کا معنی بسم اللہ ہے۔ ہمزہ حذف کیا اور پہلے لام کو دوسرے لام میں ادغام کیا گیا تو لام مشدد ہو گیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَکِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّیْ (الکہف: 38) اس کا معنی لکن انا ہے۔ اسی طرح حسن نے بھی پڑھا ہے پھر کہا ہے کہ یہ ذلّة سے مشتق ہے جس کا معنی حیران ہونا ہے۔ الوالہ کا مطلب عقل کا چلا جانا ہے کہا جاتا ہے: رجل والة وامرة والهة والہ۔ وماء مولہ۔ صحراء میں بھیجا گیا پانی، اللہ تعالیٰ کے بارے عقل حیران ہیں اور اس کی صفات کی حقائق میں وہ گم ہیں اور فکر اس کی معرفت میں ششدر ہے۔ اس بنا پر الاء کی اصل ولاہ ہوگی۔ ہمزہ، واو کا بدل ہے جس طرح اشاح میں ہمزہ واو کا بدل ہے اسی طرح اسادۃ اصل میں وسادۃ تھا۔ خلیل سے مروی ہے اور ضحاک سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ کا نام الہ ہے کیونکہ مخلوق اپنی حاجات میں اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتی ہے اور تکالیف کے وقت اس کی بارگاہ میں عجز و انکساری اور تضرع و زاری کرتے ہیں۔ خلیل بن احمد سے ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مخلوق اس کی بارگاہ میں رجوع کرتی ہے۔ یا لہون لام کے فتح کے ساتھ اور کسرہ کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الار تفاع کے معنی میں ہے۔ عرب ہر بلند چیز کو لاہا کہتے ہیں۔ وہ کہتے تھے جب سورج طلوع ہوتا تھا لاہت۔ بعض نے فرمایا: یہ آلہ الرجل سے مشتق ہے جب وہ عبادت کرے۔ تآلہ، جب کوئی عبادت کرے۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: وَیَذَرُکَ وَ الْیَھتَکَ (الاعراف: 127)۔ اس قراءت پر حضرت ابن عباس وغیرہ نے دعادت تک پڑھا ہے۔

علماء نے فرمایا: اللہ کا اسم اس سے مشتق ہے۔ پس اللہ کا معنی ہوگا: المقصود بالعبادۃ اسی سے موحدین کا قول ہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اس کا معنی ہے لا معبود غیر اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور الا کا کلمہ غیر کے معنی میں ہے استثناء کے معنی میں نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس میں اصل الہاء ہے جو غائب سے کنایہ ہے۔ انہوں نے اس کو لوگوں کی عقل میں موجود ثابت کیا ہے۔ پس انہوں نے اس کی طرف حرف کنایہ کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ پھر اس میں لام الملک زیادہ کیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے جان لیا کہ وہ تمام اشیاء کا خالق ہے ان کا مالک ہے پس (لہ) ہو گیا پھر اس میں تعظیم و تفعیم کے لئے الف، لام زیادہ کیا گیا۔

دوسرا قول: یہ قول بہت سے علماء کا ہے ان میں امام شافعی، ابوالمعالی، خطابی، غزالی، مفضل وغیرہم ہیں، خلیل اور سیبویہ سے

مروی ہے کہ الف، لام اس کا لازمہ ہے، اس کو اس سے حذف کرنا جائز نہیں۔ خطابی نے کہا اور اس پر دلیل کہ الف، لام اس اسم کی اصل سے ہے اور الف، لام تعریف کیلئے داخل نہیں ہوا، اس پر حرف ندا کے حرف کا داخل ہونا ہے جیسے تیرا قول ہے یا اللہ۔ اور حروف نداء، الف لام تعریف کے ساتھ جمع نہیں ہوتے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ تو یا الرحمن اور یا الرحیم نہیں کہتا جیسا کہ تو کہتا ہے یا اللہ۔ پس یہ دلیل ہے کہ الف لام اس اسم کی اصل سے ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 22:** الرحمن کے اسم کے اشتقاق میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا کوئی اشتقاق نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء مختصہ میں سے ہے۔ اگر یہ الرحمة سے مشتق ہوتا تو مرحومہ کے ذکر کے ساتھ متصل ہوتا۔ پس یہ کہنا جائز ہوتا اللہ رحمٰن بعبادہ جس طرح رحیم بعبادہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ رحمة سے مشتق ہوتا، عرب اس کا انکار نہ کرتے جب انہوں نے اس کو سنا تھا کیونکہ وہ اپنے رب کی رحمت کا انکار نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَنُ الْآيَةُ (الفرقان: 60) (جب انہیں کہا جاتا ہے۔ رحمٰن کے لئے سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمٰن کون ہے؟) جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھا تو سہیل بن عمرو نے کہا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، ہم اس کو نہیں جانتے، بلکہ تم وہ لکھو جو ہم جانتے ہیں بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ (1)۔ ابن عربی نے کہا: وہ صفت سے جا مل تھے موصوف سے نہیں۔ اس نے اس پر عربوں کے قول ما الرحمن سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے ومن الرحمن نہیں کہا۔ ابن حصار نے کہا: گویا ابن عربی رحمہ اللہ نے دوسری آیت وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَنِ (الرعد: 30) نہیں پڑھی تھی۔ جمہور لوگوں کا خیال یہ ہے کہ الرحمن، الرحمة سے مشتق ہے، مبالغہ کے لئے بنایا گیا ہے اس کا معنی ہے ایسا رحمت والا جس کی رحمت میں مثال نہیں۔ اسی وجہ سے اس کا تشبیہ اور جمع نہیں بنائی جاتی جس طرح الرحیم کا تشبیہ اور جمع بنائی جاتی ہے۔

ابن حصار نے کہا: اس کے اشتقاق پر جو روایت دلالت کرتی ہے وہ ہے جسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔ انہوں نے حضرت عبدالرحمن بن عوف سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں رحمٰن ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا اور اس کے لئے اسم اپنے اسم سے مشتق کیا۔ پس جو رشتہ داری کو ملائے گا میں اسے ملاؤں گا اور جو اس کو کانے گا میں اسے کانوں گا (2)۔ یہ حدیث اشتقاق میں نص ہے مخالفت و شقاق کا کوئی مطلب نہیں اور عربوں کا اس کا انکار ان کی اللہ تعالیٰ اور اس کی شان سے جہالت کی بنا پر ہے۔

**مسئلہ نمبر 23:** مبرد نے لکھا ہے جو ابن انباری نے اپنی کتاب ”الزاهر“ میں بیان کیا ہے کہ الرحمن عبرانی اسم ہے اور اس کے ساتھ الرحیم لایا جاتا ہے۔ انہوں نے بطور استشہاد یہ اشعار پڑھے ہیں۔

لن تدركوا المجد او تشهدوا عباء كم  
بالغز او تجعلوا اليمنوت ضمرا نا

1۔ مجمع بخاری، باب الشروط والجهاد الخ، حدیث نمبر 2529، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب البدو والصلة، باب ما جاء من قطع الرحمة، حدیث نمبر 1830، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

او تتركون الی القسین هجرتكم و مسحكم صلبهم رحمان قربانا  
ابو اسحاق زجاج نے ”معانی القرآن“ میں کہا ہے: احمد بن یحییٰ نے کہا: الرحیم عربی ہے اور الرحمن عبرانی ہے۔ اسی وجہ سے دونوں کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ وہ قول ہے جو مرغوب نہیں ہے۔

ابو العباس نے کہا: نعت کبھی مدح کے لئے واقع ہوتی ہے جس طرح تو کہتا ہے۔ جریر شاعر نے کہا: مطرف نے قتادہ سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے قول کے تحت روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی مدح فرمائی۔ ابو اسحاق نے کہا: یہ قول اچھا ہے۔ قطرب نے کہا: تاکید کے لئے ان دونوں کو جمع کرنا جائز ہے۔ ابو اسحاق نے کہا: یہ قول اچھا ہے اور تاکید میں عظیم فائدہ ہے۔ یہ کلام عرب میں کثیر ہے استشہاد کی ضرورت نہیں اس میں فائدہ وہ ہے جو محمد بن یزید نے کہا ہے کہ یہ تفضل کے بعد تفضل ہے۔ انعام کے بعد انعام ہے، یہ رغبت کرنے والوں کی امیدوں کو قوت دینا ہے اور وعدہ ہے کہ اس کی امید خائب و خاسر نہ ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 24:** اس میں اختلاف ہے کہ یہ دونوں ہم معنی ہیں یا مختلف معانی رکھتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ہم معنی ہیں جیسے ندمان، ندیم۔ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فعلان کی بنا پر فعل کی طرح نہیں ہے کیونکہ فعلان واقع نہیں ہوگا مگر فعل کے مبالغہ پر، جیسے تیرا قول ہے رجل غضبان۔ جو غصہ سے بھرا ہوا ہو اور فعل کبھی بمعنی فاعل اور مفعول کے معنی میں ہوتا ہے۔ عملس نے کہا

فاما اذا عفت بك الحرب عفة فانك معطوف عليك رحيم

الرحمن خاص الاسم عام الفعل ہے اور الرحیم عام الاسم خاص الفعل ہے یہ جمہور کا قول ہے۔ ابو علی فارسی نے کہا: الرحمن، رحمت کی تمام اقسام میں عام ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ خاص ہے اور الرحیم، وہ مومنین کی جہت میں ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ۝ (الاحزاب) عزیزی نے کہا: الرحمن وہ اپنی تمام مخلوق کو بارشیں عطا فرماتا ہے جو اس کی نعمتیں عطا فرماتا ہے اور عام نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ الرحیم مومنین پر رحیم ہے کہ انہیں ہدایت دیتا ہے اور ان پر لطف فرماتا ہے۔ ابن مبارک نے کہا: الرحمن۔ جب اس سے مانگا جاتا ہے تو عطا فرماتا ہے۔ الرحیم جب اس سے نہ مانگا جائے تو ناراض ہوتا ہے۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں، امام ترمذی نے اپنی جامع میں ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے (1)۔ فرمایا: میں نے ابو زرہ سے ابوصالح کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: ابوصالح وہ ہے جسے الفارسی کہا جاتا ہے۔ یہ خوزستان کا رہنے والا تھا میں اس کا نام نہیں جانتا۔ بعض شعراء نے یہ معنی لیا اور کہا:

الله يغضب ان تركت سؤاله و بني آدم يسال يغضب

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب ما جاء في فضل الدعاء، حدیث نمبر 3295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، باب فضل الدعاء، حدیث نمبر 3816، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



اگر اللہ تعالیٰ سے سوال نہ کیا جائے تو اللہ ناراض ہوتا ہے اور انسان سے سوال کیا جاتا ہے تو ناراض ہوتا ہے۔  
حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ دونوں اسم رقت پر دلالت کرتے ہیں ایک دوسرے سے زیادہ رفیق ہے یعنی رحمت میں زیادہ ہے۔

خطابی نے کہا: یہ مشکل ہے کیونکہ رقت کا اللہ کی صفات میں سے کسی شے میں دخل نہیں۔ حسین بن فضل بجلی نے کہا: یہ راوی سے وہم ہے کیونکہ رقت اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے نہیں ہے۔ یہ دونوں اسم رقت پر دلالت کرتے ہیں ایک دوسرے سے زیادہ رفیق پر دلالت کرتا ہے اور رقت اللہ تعالیٰ کی صفات سے ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ رفیق (مہربان) ہے رقت کو پسند کرتا ہے۔ رقت پر جو وہ عطا کرتا ہے وہ سختی پر عطا نہیں کرتا۔

**مسئلہ نمبر 25:** اکثر علماء کا قول ہے کہ الرحمن اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے کسی دوسرے کا اس کے ساتھ نام رکھنا جائز نہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ اِذْ عُوَا اللّٰهُ اَوْ اِذْ عُوَا الرَّحْمٰنُ (الاسراء: 110) اس اسم کو ذکر فرمایا جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں فرمایا۔ وَ سَأَلْنَا مَنْ اَمْرًا سَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ ثَمَلْنَا اَجْعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمٰنِ الْهٰٓءُ يُعْبَدُوْنَ (الزخرف: 45) پس اس نے خبر دی کہ رحمن ہی عبادت کا مستحق ہے مسئلہ کذاب لعنۃ اللہ علیہ نے افسوسناک کام کیا اور اپنا نام رحمن الیمامہ رکھا اور یہ نام نہ رکھا حتیٰ کہ کذاب کی صفت اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کذاب کی صفت کو لازم کر دیا اگرچہ ہر کافر جھوٹا ہوتا ہے۔ پس یہ وصف (کذاب) مسئلہ کے لئے علم بن گیا جس کے ساتھ وہ پہچانا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر کذاب کا اسم لازم کر دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: الرحمن اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ یہ ابن عربی نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 26:** الرحیم، مخلوق کے لئے صفت مطلقہ ہے۔ چونکہ الرحمن میں عموم پایا جاتا ہے ہمارے کلام میں قرآن کی موافقت میں الرحیم پر اس کو مقدم کیا گیا ہے۔ یہ مہدوی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: رحیم کا معنی ہے کہ تم رحیم کے ذریعے اللہ اور الرحمن تک پہنچے۔ الرحیم، حضرت محمد ﷺ کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ صفت بیان فرمائی ہے۔ فرمایا: (رؤف رحیم) گویا یہ معنی ہے: بسم اللہ الرحمن الرحیم و بالرحیم۔ یعنی محمد ﷺ کے ذریعے تم مجھ تک پہنچے یعنی اس کی اتباع کر کے اور جو وہ لے کر آئے اس کے ساتھ تم نے میرا ثواب، میری کرامت اور میرے چہرہ کی طرف نظر کرنے کو پایا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 27:** حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: بسم اللہ ہر بیماری کی شفا ہے اور ہر دوا پر مدد ہے اور الرحمن ہر ایمان لانے والے کے لئے مدد ہے۔ یہ ایسا اسم ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کا نام نہیں رکھا جاتا اور رہا رحیم۔ یہ ہر توبہ کرنے، ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والے کے لئے ہے۔ بعض نے حروف پر تفسیر بیان کی ہے۔ حضرت عثمان بن عفان سے مروی ہے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بسم اللہ کی تفسیر کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: الباء سے مراد بلاء اللہ و روحہ و نصرتہ و بہاء ہے یعنی اللہ کا انعام، اس کی روح، اس کی شادابی اور رونق اور سین سے مراد اس کی سناء (روشنی) ہے اور میم سے مراد اللہ کا ملک ہے۔ اور اللہ سے مراد لا الہ غیرہ ہے اور الرحمن اپنی مخلوق میں سے ہر فاسق، فاجر پر مہربانی

فرمانے والا ہے۔ اور الرحیم وہ صرف مومنین پر مہربان ہے۔ حضرت کعب احبار سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: الباء سے مراد اس کی رونق و شادابی ہے۔ سین سے مراد اس کی روشنی ہے، کوئی چیز اس سے اعلیٰ نہیں ہے میم سے مراد اس کا ملک ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کوئی چیز اسے مشکل میں نہیں ڈالتی۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر حرف، اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم کا آغاز ہے۔ باء، اس کے اسم بصیر کی چابی ہے، سین اس کے اسم سبیب کی چابی ہے میم اس کے اسم ملیک کی چابی ہے، الف اس کے اسم اللہ کی چابی ہے لام اس کے اسم لطیف کی چابی ہے، ہاء اس کے اسم ہادی کی چابی ہے، راء اس کے اسم رازق کی چابی ہے، حاء اس کے اسم حلیم کی چابی ہے نون اس کے اسم نور کی چابی ہے۔ اس کا معنی ہر چیز کے آغاز کے وقت اللہ تعالیٰ کو پکارنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 28:** الرحیم کو الْحَمْدُ لِلّٰہ کے ساتھ ملانے میں اختلاف ہے۔ حضرت ام سلمہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے الرحیم الحمد۔ میم کو ساکن کرتے اور اس پر وقف کرتے اور الف کے ساتھ علیحدہ آغاز کرتے۔ کوفیوں کی ایک قوم نے ایسا پڑھا بھی ہے۔ جمہور لوگوں کی قراءت الرحیم الحمد ہے۔ الرحیم کو جر کے ساتھ اعراب دیا جاتا ہے اور الْحَمْدُ کے الف کو وصلی بنایا جاتا ہے۔ کسائی نے بعض عربوں سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے الرحیم الحمد یعنی میم کے فتح اور الف کے وصل کے ساتھ پڑھا ہے گویا میم ساکن کی گئی اور الف کو قطعی بنایا گیا پھر اس کی حرکت میم پر ڈالی گئی اور اسے حذف کیا گیا۔ ابن عطیہ نے کہا: میری معلومات کے مطابق ایسی قراءت کسی سے مروی نہیں ہے۔ یحییٰ بن زیاد کا اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اَللّٰہُمَّ (آل عمران: 1) میں اسی طرح کا نظریہ ہے۔

## سورۃ الفاتحہ

﴿ اَبَاتُهَا ۷ ﴾ ﴿ ۱ سُورَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ ۵ ﴾ ﴿ رُكُوعُهَا ۱ ﴾

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۝ إِيَّاكَ  
نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ  
عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝

”سب تعریفیں اللہ کے لئے جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کا، بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا، مالک ہے روز جزا کا، تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ چلا ہم کو سیدھے راستہ پر راستہ ان کا جن پر تو نے انعام فرمایا نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا۔“

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين والصلاة والسلام على سيد المرسلين

## تفسیر سورۃ فاتحہ

اس کے متعلق چار ابواب ہیں۔

### الباب الاول

یہ باب سورۃ فاتحہ کے فضائل اور اسکے اسماء کے بارے میں ہے اور اس باب میں سات مسائل کا ذکر ہوگا  
**مسئلہ نمبر 1:** ترمذی نے حضرت ابی بن کعب سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تورات اور انجیل میں اللہ تعالیٰ نے ام القرآن (سورۃ فاتحہ) کی مثل کلام نہیں اتارا اور یہ سورہ سبع مثانی (ایسی سات آیات جو بار بار پڑھی جاتی ہیں) ہے۔ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان منقسم ہے اور میرے بندے کے لئے وہی ہے جو اس نے سوال کیا۔ (1)  
مالک نے علاء بن عبد الرحمن بن یعقوب سے روایت کیا ہے کہ ابو سعید مولیٰ عبد اللہ بن عامر بن کریم نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابی بن کعب کو بلایا جبکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ پھر مذکورہ بالا حدیث ذکر کی۔ ابن عبد البر نے فرمایا: ابو سعید کے نام پر آگاہی نہیں ہوئی وہ اہل مدینہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے اور ان

1۔ جامع الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب من سورۃ الحجر، صفحہ 140، جلد 2، (وزارت تعلیم) ایضاً، حدیث نمبر 3050، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



کی یہ حدیث مرسل ہے اور یہی حدیث ابوسعید بن معلیٰ سے بھی مروی ہے، یہ صحابہ میں سے ایک شخص ہے اس کے نام پر بھی آگاہی نہیں ہوئی۔ اس حدیث کو ابوسعید نے حفص بن عاصم اور عبید بن حسنین سے روایت کیا ہے۔

میں (قرطبی) کہتا ہوں: ”التمہید“ میں اسی طرح ہے کہ اس کے نام پر آگاہی نہیں ہوئی اور ”کتاب الصحابہ“ میں اس کے نام میں اختلاف ذکر کیا گیا ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے ابوسعید بن معلیٰ سے روایت کیا ہے۔ ابوسعید نے فرمایا: میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے آواز دی۔ میں نے آپ کو جواب نہ دیا (میں دیر سے حاضر خدمت ہوا) تو عرض کی: یا رسول اللہ! میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: **اَسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَالْمُرْسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ** (الانفال: 24) لبیک کہو اللہ اور (اس کے) رسول کی پکار پر جب وہ رسول بلائے تمہیں) پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تجھے مسجد سے نکلنے سے پہلے ایک سورت سکھاؤں گا جو قرآن میں سب سورتوں سے عظیم ہے۔ پھر آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا، جب آپ ﷺ نے مسجد سے نکلنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کی: حضور! آپ نے فرمایا نہیں تھا کہ میں تجھے ایک سورت سکھاؤں گا جو قرآن میں سب سورتوں سے عظیم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ سورت یہ ہے **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** ○ یہ سبج مثانی ہے اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے (1)۔ ابن عبد البر وغیرہ نے فرمایا: ابوسعید بن معلیٰ جلیل القدر انصار میں سے ہے اور انصار کے سرداروں میں سے ہے۔ امام بخاری نے تنہا ان سے روایت کیا ہے۔ اس کا نام رافع ہے۔ اسے حارث بن نفیع بن معلیٰ کہا جاتا ہے اور اوس بن معلیٰ بھی کہا جاتا ہے اور ابوسعید بن اوس بن معلیٰ بھی کہا جاتا ہے ان کا وصال ۷۴ ہجری میں ہوا جبکہ ان کی عمر ۶۴ سال تھی۔ قبلہ کی تبدیلی ہوئی تو یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ مزید ذکر آگے آئے گا۔ حضرت ابی بن کعب کی حدیث کو یزید بن زریع نے مسند (متصل) ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں: ہمیں روح بن قاسم نے علاء بن عبد الرحمن سے روایت کر کے بتایا، علاء نے اپنے باپ سے، ان کے باپ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا، حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ ابی کے پاس تشریف لے گئے جبکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ پھر مکمل حدیث کا مفہوم ذکر کیا۔

ابن انباری نے اپنی کتاب ”الرد“ میں ذکر کیا ہے کہ مجھے میرے باپ نے بتایا، انہوں نے فرمایا: مجھے ابوسعید اللہ وراق نے بتایا۔ انہوں نے کہا: ہمیں ابوداؤد نے بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں شیبان نے بتایا انہوں نے منصور سے اور انہوں نے مجاہد سے روایت کیا، فرمایا: ابلیس۔ اللہ اس پر لعنت کرے۔ چار مرتبہ (افسوس کا اظہار کرتے ہوئے) رویا: (۱) جب اس پر لعنت کی گئی (۲) جب اسے جنت سے نکالا گیا (۳) جب حضرت محمد ﷺ کو مبعوث کیا گیا (۴) جب سورہ فاتحہ نازل ہوئی اور یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی (2)۔

**مسئلہ نمبر 2:** علماء کا بعض سورتوں اور بعض آیتوں کا دوسری بعض سورتوں اور آیتوں پر فضیلت رکھنے کے متعلق اختلاف

1۔ صحیح بخاری، تفسیر القرآن، صفحہ 642، جلد 2، (وزارت تعلیم)

ایضاً، صحیح بخاری، تفسیر القرآن، باب ما جاء فی فاتحة الكتاب، حدیث 4114، فیاء القرآن، پہلی کیشنز 2۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 5، زیر آیت

ہے، (اسی طرح) بعض اسماء حسنیٰ کا دوسرے بعض اسماء حسنیٰ پر فضیلت رکھنے کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: کسی سورت، آیت اور اسم کو دوسری سورت، آیت اور اسم پر فضیلت نہیں ہے کیونکہ قرآن سارا اللہ کا کلام ہے، اسی طرح اس کے اسماء حسنیٰ کے درمیان بھی کوئی تفاضل نہیں ہے یہ قول شیخ ابوالحسن اشعری، قاضی ابوبکر بن طیب، ابو حاتم محمد بن حبان بستی اور فقہاء کی ایک جماعت کا ہے۔ امام مالک سے بھی اس کا مفہوم مروی ہے۔ یحییٰ بن یحییٰ نے کہا: بعض قرآن کو بعض قرآن پر فضیلت دینا غلطی ہے۔ اسی طرح امام مالک نے ایک سورت کو بار بار پڑھنا یا اسے ہی دہراتے رہنا مکروہ قرار دیا ہے۔ امام مالک سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلَهَا (البقرہ: 106) کے تحت یہ مروی ہے کہ ہم منسوخ آیت کی جگہ محکم آیت لے آتے ہیں۔ ابن کنانہ نے امام مالک سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ ان علماء نے اس طرح حجت پکڑی ہے کہ افضل، مفضول کے نقص کا شعور دیتا ہے، جبکہ تمام قرآن میں ذاتیت ایک ہے اور وہ کلام اللہ ہونا ہے اور اللہ کے کلام میں کوئی نقص نہیں ہے۔

سبقتی نے کہا: حدیث کے الفاظ ”تورات و انجیل میں سورہ فاتحہ کی مثل نہیں اتارا گیا“ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تورات اور انجیل کو پڑھنے والے کو اتنا ثواب عطا نہیں فرماتا جو ام القرآن (سورہ فاتحہ) پڑھنے والے کو عطا فرماتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت (محمدیہ) کو دوسری امتوں پر اپنے فضل خاص سے فضیلت بخشی ہے اور اپنے کلام قرآن کی قراءت پر دوسرے اپنے کلام کی قراءت کی نسبت زیادہ فضیلت دی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے اس امت کے لئے خاص فضل ہے اور فرمایا: اعظم سورت کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت قرآن کی سورتوں میں سے اجر کے اعتبار سے عظیم ہے، نہ کہ بعض قرآن بعض سے افضل ہے۔

بعض علماء بعض قرآن کی بعض پر فضیلت کے قائل ہیں، وہ فرماتے ہیں: قرآن کی آیت وَاللَّهُمَّ إِلَهٌ وَاحِدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ (البقرہ) آیۃ الکرسی، سورہ حشر کی آخری آیات، سورہ اخلاص اور وہ سورتیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات پر دلالت کرتی ہیں ان میں جو فضیلت ہے وہ ثَبَّتْ يَدَآءِ لَهَا (لہب: 1) اور اس جیسی دوسری سورتوں میں موجود نہیں ہے۔

اور تفضیل معانی عجیبہ اور کثرت معانی کے اعتبار سے ہے نہ کہ صفت کے اعتبار سے ہے اور یہی حق ہے اور جو علماء تفضیل کے قائل ہیں ان میں سے اسحاق بن راہویہ وغیرہ متکلمین علماء میں سے ہیں اور یہ قول قاضی ابوبکر بن عربی، ابن حصار کا مختار ہے۔ ان علماء کے قول کی وجہ ابوسعید بن معلی اور حضرت ابی بن کعب کی حدیث ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ابی! تیرے نزدیک کتاب اللہ میں کون سی آیت عظیم تر ہے، میں نے عرض کی اَللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ (البقرہ: 255) حضرت ابی نے فرمایا: آپ ﷺ نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اے ابا منذر! تجھے یہ علم مبارک ہو۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ (1)

ابن حصار نے کہا: مجھے ان علماء پر تعجب ہے جو ان نصوص کے ہوتے ہوئے بھی اختلاف ذکر کرتے ہیں۔

ابن عربی نے کہا: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد کہ اللہ تعالیٰ نے تورات، انجیل اور قرآن میں اس (سورہ فاتحہ) کی مثل نازل نہیں کیا (1)۔ اس حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باقی کتب کا ذکر نہیں کیا جیسے منزل صحیفے اور زبور وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مذکور دوسری کتب سے افضل ہیں اور جب کوئی چیز کسی افضل سے افضل ہو تو وہ تمام چیزوں سے افضل ہوتی ہے جیسے تیرا قول زید، علماء سے افضل ہے۔ پس وہ تمام لوگوں سے افضل ہے۔ سورہ فاتحہ میں ایسی صفات ہیں جو کسی دوسری سورت میں نہیں حتیٰ کہ بعض علماء نے کہا: پورا قرآن اس سورت میں ہے اس کے پچیس کلمات ہیں جو تمام علوم قرآن کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہیں۔ اس سورت کے شرف میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور بندے کے درمیان تقسیم فرمایا ہے اور قربت صرف اسی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اور کوئی عمل اس کے ثواب کو لاحق نہیں ہوتا۔ اسی مفہوم کی وجہ سے یہ قرآن عظیم کی اصل بن گئی۔ جیسا کہ سورہ قل ھو اللہ اَحَدٌ قرآن کا ثلث (۱/۳) ہے (2) کیونکہ قرآن، توحید، احکام اور مواظب کا نام ہے اور سورہ قل ھو اللہ اَحَدٌ میں ساری توحید ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسرت ابی بن کعب سے پوچھا: قرآن میں کون سی آیت عظیم ہے؟ تو حضرت ابی نے کہا: اللہ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ (البقرہ: 255) (3) یہ آیت عظیم ہے کیونکہ یہ تمام توحید ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد افضل ما قلتہ انا والنبیون من قبل لا اله الا الله وحده لا شریک له (4) افضل ذکر بن گیا کیونکہ یہ ایسے کلمات ہیں جو توحید میں تمام علوم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ سورہ فاتحہ توحید، عبادت، وعظا اور نصیحت کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں۔

**مسئلہ نمبر 3:** حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے روایت فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی، شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ (آل عمران: 18) قُلِ اللّٰهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ (آل عمران: 26) یہ آیات عرش سے معلق ہیں ان کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے، ابو عمرو دانی نے اپنی کتاب البیان میں اس روایت کو متصل نقل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** سورہ فاتحہ کے اسماء

اس کے بارہ اسماء ہیں۔

۱۔ الصلاۃ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف، نصف تقسیم کیا (5) یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 7، جلد 1 (دار الفکر)

2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل القراءة قل هو الله احد، صفحہ 271، جلد 1، (قدیمی کتب خانہ) صحیح بخاری، حدیث نمبر 4627، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

4۔ مؤطا امام مالک، کتاب القرآن، باب ما جاء فی الدعاء، صفحہ 198، جلد 1 (وزارت تعلیم) جامع ترمذی، حدیث نمبر 3305، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب وجوب قراءة الفاتحة، صفحہ 170، جلد 1، (قدیمی کتب خانہ)



## ۲- سورۃ الحمد

چونکہ اس میں حمد کا ذکر ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ سورۃ اعراف، سورۃ انفال اور سورۃ توبہ وغیرہ۔

## ۳- فاتحہ الكتاب

اس نام میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ لفظ اس کے ساتھ قرآن کی قراءت کا آغاز کیا جاتا ہے اور خطاً مصحف میں اس کے ساتھ کتابت کا آغاز کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ نمازوں کو شروع کیا جاتا ہے۔

## ۴- ام الكتاب

اس نام میں اختلاف ہے۔ جمہور نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ حضرات انس، حسن بصری اور ابن سیرین نے مکروہ قرار دیا ہے۔ حسن نے کہا: ام الكتاب حلال اور حرام احکام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اَلَيْتُمْ مُخَلِّمَتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَاٰخَرُ مُتَشَابِهَتٌ (آل عمران: 7) حضرت انس اور ابن سیرین نے کہا: ام الكتاب لوح محفوظ کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّهٗ فِىْ اُمِّ الْكِتٰبِ (الزخرف: 4)

## ۵: ام القرآن

اس نام میں بھی اختلاف ہے۔ جمہور نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ حضرت انس اور ابن سیرین نے اس کو ناپسند کیا ہے۔ احادیث ثابتہ ان دونوں اقوال کی تردید کرتی ہیں۔ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الحمد لله ام القرآن، ام الكتاب اور السبع المثانی ہے (1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے اور بخاری میں ہے فرمایا: ام الكتاب نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ مصحف میں اس کے لکھنے کے ساتھ آغاز کیا جاتا ہے اور نماز میں اس کی قراءت کے ساتھ آغاز کیا جاتا ہے (2)۔ یحییٰ بن یحمر نے کہا: ام القرئی مکہ ہے، ام خراسان مروہ ہے اور ام القرآن سورۃ الحمد ہے (3)۔ بعض علماء نے فرمایا: سورۃ فاتحہ کو ام القرآن اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ قرآن کے آغاز میں ہے اور قرآن کے تمام علوم کو متضمن ہے۔ اسی وجہ سے مکہ کو ام القرئی کہا جاتا ہے کیونکہ مکہ، زمین کا پہلا ٹکڑا ہے پھر اس سے زمین پھیلائی گئی۔ اسی وجہ سے ماں کو ام کہا جاتا ہے کیونکہ وہ نسل کی اصل ہوتی ہے اور امیہ بن ابی الصلت کے قول میں زمین کو ام کہا گیا ہے۔

فلا ارض معقلنا و کانت امنا فیہا مقابرنا و فیہا نولد

زمین ہماری پناہ گاہ ہے اور زمین ہماری اصل ہے اس میں ہماری مقابر ہیں اور اس میں ہماری پیدائش ہے۔

1- سنن ابی داؤد، صفحہ 205، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ایضاً، سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، باب فاتحۃ الكتاب، حدیث 1245، جامع ترمذی، حدیث نمبر 3049، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3- ایضاً

2- المحرر الوجیز، صفحہ 65، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جنگ کے جھنڈے کو بھی ام کہا جاتا ہے کیونکہ وہ آگے ہوتا ہے اور لشکر اس کی پیروی کرتا ہے اور ام کی اصل امۃ ہے۔ اسی وجہ سے اس کی جمع امہات آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَأُمَّهَاتُكُمُ (النساء: 23)**۔ بغیر ہاء کے امات بھی کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا: **فَرَجَتْ الظَّلَامَ بِأَمَاتِکَا**۔ تو نے اپنی نسی شرافت سے تاریکیوں کو ختم کر دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: انسانوں میں امہات اور چوپاؤں میں امات بولا جاتا ہے ابن فارس نے ”المجمل“ میں یہی بیان کیا ہے۔

## ۶۔ المثنائی

یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ یہ ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس امت کے لئے خاص کی گئی ہے پہلی امتوں میں سے کسی پر یہ نازل نہیں ہوئی، اسی امت کے لئے محفوظ کی گئی تھی۔

## ۷۔ القرآن العظیم

یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس کے ضمن میں قرآن کے تمام علوم ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف کمال و جلاں کے ساتھ اس کی ثنا پر مشتمل ہے اور عبادت کے امر اور اخلاص، بغیر اعانت الہیہ کے کسی کام کرنے سے عجز کے اعتراف پر مشتمل ہے نیز صراط مستقیم کی طرف ہدایت کے لئے اسی کی بارگاہ میں تضرع و زاری پر مشتمل ہے۔ نیز اس میں عہد توڑنے والوں کے احوال کی کفایت بھی ہے اور محنت کرنے والوں کے انجام کے بیان پر مشتمل ہے۔

## ۸۔ الشفاء

دارمی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فاتحہ الكتاب ہر زہر سے شفاء ہے (1)۔

## ۹۔ الرقیۃ (دم کرنا)

حضرت ابوسعید خدری کی حدیث سے یہ نام ثابت ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے فرمایا، جس نے قبیلہ کے سردار کو دم کیا تھا: تجھے کیا معلوم کہ یہ دم ہے۔ حضرت ابوسعید نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ یہ ایک چیز تھی جو میرے دل میں ڈالی گئی تھی (2)۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث مکمل آگے آئے گی۔

## ۱۰۔ اساس

ایک شخص نے امام شعبی سے اپنے پہلو میں درد کی شکایت کی تو امام شعبی نے کہا: تو اساس القرآن، فاتحہ الكتاب پڑھ۔ میں نے حضرت ابن عباس کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہر چیز کے لئے ایک اساس (بنیاد) ہوتی ہے، دنیا کی اساس مکہ ہے، کیونکہ اس سے زمین پھیلائی گئی اور آسمانوں کی اساس عریب ہے یہ ساتواں آسمان ہے، زمین کی اساس عجیب ہے، یہ نخلی ساتویں

1۔ سنن دارمی، صفحہ 320، جلد 1 (مدینۃ النورہ الحجاز)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 854، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاجارۃ باب ما یعطی فی الرقیۃ، حدیث نمبر 2115، فیہ القرآن پہلی کیشنز

زمین ہے، جنتوں کی اساس جنت عدن ہے، یہ جنتوں کی ناف ہے اس پر جنت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ آگ کی اساس جہنم ہے اور نیچے والا ساتواں طبقہ ہے اس پر درکات کی بنیاد رکھی گئی ہے، خلق کی اساس آدم ہیں اور انبیاء کی اساس نوح ہیں، بنی اسرائیل کی اساس یعقوب ہیں، کتب کی اساس قرآن ہے، قرآن کی اساس سورہ فاتحہ ہے، سورہ فاتحہ کی اساس بسملہ ہے جب تو بیمار ہو یا تجھے تکلیف ہو تو تجھے سورہ فاتحہ پڑھنی چاہئے، تجھے شفا ہوگی۔

۱۱- وافیہ

سفیان بن عیینہ نے یہ نام بیان کیا ہے۔ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ نصف نصف نہیں ہوتی اور جدائی کو برداشت نہیں کرتی۔ اگر کوئی باقی سورتوں میں سے کسی سورت کا نصف ایک رکعت میں پڑھے اور نصف دوسری رکعت میں پڑھے تو یہ جائز ہوگا۔ اگر سورہ فاتحہ کو آدھا آدھا کر کے دو رکعتوں میں پڑھے تو جائز نہ ہوگا۔

۱۲- کافیہ

یحییٰ بن ابی کثیر نے فرمایا: اس نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ باقی تمام سورتوں سے کفایت کرتی ہے جبکہ باقی تمام سورتیں اس سے کفایت نہیں کرتیں۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو محمد بن خلاد اسکندرانی نے روایت کی، فرمایا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ام القرآن دوسری تمام سورتوں کا بدل ہے جبکہ دوسری سورتیں اس کا بدل نہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر 5:** مہلب نے کہا: دم کا مقام یہ ہے **إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ** ○ بعض علماء نے فرمایا: پوری سورت دم ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو ارشاد فرمایا: جس نے سورہ فاتحہ سے دم کرنے کی خبر دی تھی: تجھے کیسے معلوم تھا کہ یہ سورت دم ہے (2)۔ آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس میں دم ہے۔ پس یہ دلیل ہے کہ پوری سورت دم ہے کیونکہ یہ کتاب کا آغاز ہے اور تمام علوم کو متضمن ہے جیسے ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** دوسری چیزوں کا نام المثنیٰ اور ام الکتاب رکھنے کی وجہ سے اس کا نام المثنیٰ اور ام الکتاب رکھنے سے کوئی چیز مانع نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كِتَابًا مَّثْنً شَاهِدًا مَّثَانِي** (الزمر: 23) اس آیت میں کتاب پر مثنیٰ کا اطلاق فرمایا ہے کیونکہ اس میں اخبار بار بار بیان کی جاتی ہیں۔ سبع طوال سورتوں کو بھی مثنیٰ کہا جاتا ہے کیونکہ ان میں فرائض اور قصص دہرائے جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کو سبعا من المثنیٰ دی گئیں۔ فرمایا: اس سے مراد السبع الطوال سورتیں ہیں (3) یہ قول نسائی نے ذکر کیا ہے اور السبع الطوال سورتیں سورہ بقرہ سے اعراف تک چھ سورتیں ہیں اور ساتویں میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: سورہ یونس ساتویں ہے، بعض نے فرمایا: سورہ انفال اور توبہ ہے۔ یہ حضرات مجاہد، سعید بن جبیر کا قول ہے۔ اعشیٰ ہمدان نے کہا تھا:

1۔ سنن دارقطنی، صفحہ 322، جلد 1 (دارالحسن للطباعة قاہرہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 854، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاجارہ باب ما يعطى في الرقية، حدیث 2115، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، صفحہ 146، جلد 1 (د۔ت)۔ کتاب افتتاح الصلاة، باب تاویل قول الله لقد آتيناك سبعا من المثنیٰ، حدیث 905، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



فلجوا المسجد و ادعوا ربکم وادرسوا هذی المثنی الطول

یعنی مساجد میں داخل ہو جاؤ اور اپنے رب کو پکارو اور یہ مثنیٰ اور طوال سورتیں پڑھو۔

مزید بیان ان شاء اللہ سورۃ الحج میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 7:** المثنیٰ، مثنیٰ کی جمع ہے اس سے مراد دوسری ہے، طُول جمع ہے اطول کی، الانفال کو مثنیٰ کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ مقدار میں طویل سورتوں کے بعد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ سورت ہے جس کی آیات مفصل سورتوں سے زائد ہیں اور مثنیٰ سورتوں سے کم ہیں۔ مَن ان سورتوں کو کہا جاتا ہے جن میں سے ہر سورت کی سو سے زائد آیات ہوتی ہیں۔

دوسرا باب

یہ باب سورہ فاتحہ کے نزول اور اس کے احکام کے بارے میں ہے۔ اس میں بیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ سورہ فاتحہ کی سات آیات ہیں، مگر صرف حسین الجعفی سے روایت کیا گیا ہے کہ اس کی چھ آیات ہیں (1)۔ اور یہ قول شاذ ہے۔ (اسی طرح) عمرو بن عبید سے مروی ہے کہ اس نے إِيَّاكَ تَعْبُدُ کو علیحدہ آیت شمار کیا ہے (2) اور آٹھ آیات بنائی ہیں۔ یہ قول بھی شاذ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَقَدْ آتَيْنَكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي (الحجر: 87) اور فرمایا: میں نے نماز کو تقسیم کیا (3)۔ (الحديث) یہ آیت اور حدیث ان دونوں اقوال کا رد کرتی ہیں۔

اس بات پر بھی امت کا اجماع ہے کہ یہ سورہ قرآن سے ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر یہ قرآن میں سے ہوتی تو حضرت عبد اللہ بن مسعود اپنے مصحف میں اسے لکھتے، جب انہوں نے اسے اپنے مصحف میں نہیں لکھا تو یہ دلیل ہے کہ یہ قرآن میں سے نہیں ہے، جیسا کہ معوذتین (قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ) کا حکم ان کے ہاں تھا۔

اس کا جواب ابو بکر انباری نے یہ دیا ہے۔ فرمایا: ہمیں حسن بن حباب نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں سلیمان بن اشعث نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں ابن ابی قدامہ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں جریر نے اعش سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: میرا خیال ہے انہوں نے ابراہیم سے روایت کیا، ابراہیم نے فرمایا: حضرت عبد اللہ بن مسعود سے کہا گیا تم اپنے مصحف میں سورہ فاتحہ کیوں نہیں لکھتے؟ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: اگر میں اسے لکھتا تو میں اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا۔ ابو بکر نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ ہر رکعت میں تلاوت کی گئی سورت سے پہلے ام القرآن سے آغاز کیا جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: میں نے اس کو چھوڑ کر اختصار کیا ہے اور میں نے اس بات پر اعتماد کیا ہے کہ مسلمان اس کو محفوظ کئے ہوئے ہیں میں نے اسے کسی ایک جگہ پر نہیں لکھا۔ مجھ پر لازم تھا کہ میں اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا کیونکہ نماز میں یہ ہر سورت سے مقدم ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ کیا یہ نکی سورت ہے یا مدنی سورت ہے۔ حضرات ابن عباس، قتادہ اور ابو العالیہ الریاحی اس کا نام رفع ہے وغیرہم نے فرمایا: یہ سورت نکی ہے۔ حضرات ابو ہریرہ، مجاہد، عطاء بن یسار، زہری وغیرہم نے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 69، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ ایضاً

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ وجوب قراءۃ الفاتحہ، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

فرمایا: یہ مدنی سورت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا نصف مکہ میں نازل ہوا اور نصف مدینہ میں نازل ہوا۔ یہ قول ابوليث نصر بن محمد بن ابراہیم سمرقندی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ** ① یہ آیت سورۃ الحجر کی ہے اور سورۃ الحجر بالاجماع مکی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ نماز مکہ میں فرض تھی اور اسلام میں کبھی بغیر الحمد کے نماز نہیں تھی۔ اس پر نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: ”لا صلاة الا بفاتحة الكتاب“ (1) (سورۃ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں)۔ یہ حکم کے متعلق خبر ہے نہ کہ ابتدا کے متعلق خبر ہے۔ واللہ اعلم

قاضی ابن طیب نے اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ذکر کیا ہے کہ قرآن کا کون سا حصہ سب سے پہلے نازل ہوا۔ بعض علماء نے فرمایا: سورۃ مدثر، بعض نے فرمایا: اقرا بعض نے فرمایا: سورۃ فاتحہ۔ بیہقی نے دلائل النبوة میں ابو میسرہ عمرو بن شریل سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہ کو فرمایا: جب میں تنہا خلوت میں ہوتا ہوں تو میں ایک آواز سنتا ہوں، اللہ کی قسم! مجھے کچھ ہونے کا اندیشہ ہے۔ حضرت خدیجہ نے کہا: معاذ اللہ! اللہ کی یہ شان نہیں کہ آپ کے ساتھ ایسا کرے، اللہ کی قسم! تم امانت کو ادا کرتے ہو، صلہ رحمی کرتے ہو، بات سچی کرتے ہو۔ جب حضرت ابو بکر داخل ہوئے رسول اللہ ﷺ وہاں موجود نہیں تھے۔ حضرت خدیجہ نے حضرت ابو بکر کو رسول اللہ ﷺ کی بات بتائی اور کہا: اے عتیق! تم حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس جاؤ۔ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو حضرت ابو بکر نے آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑا اور کہا: ہمارے ساتھ ورقہ کی طرف چلو۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے۔ ابو بکر نے کہا: خدیجہ نے۔ پس دونوں ورقہ کی طرف چلے اور اسے صورت حال بتائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب میں تنہا ہوتا ہوں تو پیچھے سے یا محمد، یا محمد کی آواز سنتا ہوں، پھر میں زمین میں بھاگ پڑتا ہوں۔ ورقہ نے کہا: ایسا نہ کیا کر۔ جب تیرے پاس آواز آئے تو ٹھہر جاؤ حتیٰ کہ وہ جو کہے سن لو، پھر میرے پاس آؤ اور مجھے بتاؤ۔ جب آپ تنہائی میں تھے تو آواز آئی۔ یا محمد! کہو: **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ ۝** کہو: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ پھر آپ ﷺ ورقہ کے پاس آئے اور یہ سب کچھ ذکر کیا۔ ورقہ نے آپ سے کہا: بشارت ہو، بشارت ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو وہ ہے جس کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی اور تو موسیٰ علیہ السلام کے ناموس کی مثل پر ہے، تو نبی مرسل ہے، تو ایک وقت جہاد کا حکم دے گا۔ اگر مجھے وہ وقت میسر آیا تو میں آپ کے ساتھ مل کر ضرور جہاد کروں گا۔ جب ورقہ فوت ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے ورقہ کو جنت میں دیکھا اس پر ریشمی کپڑے تھے، کیونکہ وہ مجھ پر ایمان لایا تھا اور میری تصدیق کی تھی (2)۔ بیہقی نے فرمایا: یہ حدیث منقطع ہے اگر یہ محفوظ ہو تو پر یہ احتمال ہوگا کہ یہ **اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ هَا الْمُنَاقِرُ** کے نزول کے بعد الحمد کے نزول کی خبر ہو۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 104، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفة الصلاة، باب وجوب القراءة للامام والمأموم، حدیث 714، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ دلائل النبوة، جہاد ابواب المبعدة، باب مبتدأ المبعدة والتبویل

**مسئلہ نمبر 3:** امین عطیہ نے کہا: بعض علماء نے گمان کیا کہ جبریل سورۃ الحمد کے ساتھ نازل نہیں ہوئے کیونکہ مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: جبریل نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے اوپر سے ایک آواز سنی، آپ ﷺ نے سر اٹھایا اور کہا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں کھلا، اس دروازے سے ایک فرشتہ اتر رہا ہے۔ جبریل نے کہا: یہ فرشتہ زمین پر اتر رہا ہے آج سے پہلے کبھی نہیں اتر رہا، اس نے سلام کیا اور کہا: تمہیں دونوروں کی بشارت ہو جو آپ کو عطا کئے گئے ہیں آپ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کئے گئے۔ (وہ نور یہ ہیں) فاتحہ الکتاب اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات۔ آپ ان میں سے کوئی حرف نہیں پڑھیں گے مگر تمہیں وہ عطا کیا جائے گا (1)۔ امین عطیہ نے کہا: حقیقت اس طرح نہیں ہے جس طرح بعض علماء نے گمان کیا ہے کیونکہ یہ حدیث تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جبریل نبی کریم ﷺ کے پاس اس فرشتے سے پہلے آئے۔ اس کی آمد اور جو کچھ وہ لے کر آ رہا تھا اس کے متعلق آگاہ کیا۔ اس بنا پر جبریل اس کے نزول میں شریک ہو گیا۔ واللہ اعلم

میں (علامہ قرطبی) کہتا ہوں: حدیث کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جبریل امین نے نبی کریم ﷺ کو اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ اس کا نزول مکہ میں ہوا تھا اور جبریل اس سورت کو لے کر آئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَزَّلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (الشعراء) یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ سارا قرآن جبریل امین لے کر آئے۔ پس جبریل اس کی تلاوت مکہ لے کر آئے ہوں گے اور یہ فرشتہ مدینہ طیبہ میں اس کا ثواب لے کر آیا ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ سورت مکی، مدنی ہے جبریل امین اس کو دو مرتبہ لے کر آئے تھے۔ یہ قول ثعلبی نے حکایت کیا ہے اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ اولیٰ ہے کیونکہ ہمارا قول قرآن و سنت کو جمع کرنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** یہ پہلے گزر چکا ہے کہ بسم اللہ صحیح قول کے مطابق اس سورت کا جز نہیں ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو نماز کا حکم یہ ہے کہ جب وہ تکبیر تحریر کرے کہ سورۃ فاتحہ پڑھے اور خاموش نہ رہے، نہ توجیہ ذکر کرے اور نہ تسبیح کیونکہ حضرت عائشہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی احادیث اسی پر دلالت کرتی ہیں جو پیچھے گزر چکی ہیں۔ جبکہ توجیہ، تسبیح اور سکوت کی احادیث بھی موجود ہیں۔ علماء کی ایک جماعت نے یہ فرمایا ہے: حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ یہ دونوں حضرات جب نماز شروع کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے: سبحانک اللہم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالیٰ جَدُّک ولا الہ غیرک (2) حضرات سفیان، احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے کا یہی قول ہے۔ امام شافعی کا قول وہ ہے جو حضرت علی سے مروی ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ جب آپ نماز شروع کرتے تو تکبیر کہتے پھر کہتے: وجہت وجہی (3) اس کو مسلم نے ذکر کیا ہے۔ پوری حدیث سورۃ انعام کے آخر میں آئے گی۔ اس مسئلہ میں مکمل گفتگو وہاں آئے گی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل الفاتحة وخواتیم سورۃ البقرہ، صفحہ 271، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب حجة من قال لا یجہر بالبسملة، صفحہ 172، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ ایضاً، کتاب الصلاة، باب الدعاء فی صلاۃ و قیامہ، صفحہ 263، جلد 1



ابن منذر نے کہا: یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز میں تکبیر (تحریمہ) کہتے تو قراءت سے پہلے تھوڑی دیر خاموش رہتے اور یہ دعا پڑھتے: اللھم باعد بینی و بین خطایای کما باعدت بین المشرق و المغرب اللھم نقنی من خطایای کما ینقئ الثوب الابيض من الدنس اللھم اغسلنی بالماء والثلج والبرد۔ حضرت ابو ہریرہ نے اس پر عمل کیا۔ ابوسلمہ بن عبد الرحمن نے کہا: امام کے لئے دو سکتے ہیں۔ ان سکتوں میں قراءت کو غنیمت جانو (1)۔ حضرات اوزاعی، سعید بن عبد العزیز، امام احمد بن حنبل کا میلان بھی اس مسئلہ میں نبی کریم ﷺ کی حدیث کی طرف ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** نماز میں سورہ فاتحہ کی قراءت کے وجوب میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے متبعین علماء نے فرمایا: یہ امام اور منفرد کے لئے ہر رکعت میں متعین ہے۔ ابن خویز مند اد بصری مالکی نے کہا: امام مالک کا قول مختلف نہیں ہے کہ جو دو رکعت والی نماز میں ایک رکعت میں الحمد شریف پڑھنا بھول جائے تو اس کی نماز باطل ہے اور جائز نہیں ہے اور اس شخص کے متعلق امام مالک کا قول مختلف ہے جو چار یا تین رکعت والی نماز میں کسی ایک رکعت میں الحمد بھول جائے، کبھی تو فرمایا: وہ نماز کا اعادہ کرے اور کبھی فرمایا: سجدہ سہو کرے۔ ابن عبد حکیم وغیرہ نے امام مالک سے یہ روایت کیا ہے۔ ابن خویز مند اد نے فرمایا: یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اس رکعت کا اعادہ کرے اور سلام کے بعد نمازی دوسری رکعت پڑھے گا جیسا کہ وہ شخص جس نے بھول کر سجدہ ساقط کر دیا۔ یہ ابن قاسم کا مختار مذہب ہے۔ حضرت حسن بصری، اکثر اہل بصرہ اور مغیرہ بن عبد الرحمن مخزومی مدنی نے کہا: جب کوئی شخص نماز میں ایک مرتبہ ام القرآن پڑھ لے تو وہ کافی ہو جائے گی، اس پر اعادہ نہ ہوگا کیونکہ نماز میں اس نے ام القرآن پڑھ لی ہے۔ پس اس کی نماز مکمل ہوگی کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کی نماز مکمل نہیں جس نے ام القرآن (الحمد) نہیں پڑھی (2)۔ اور اس شخص نے الحمد ایک مرتبہ پڑھ لی ہے (پس اس کی نماز مکمل ہوگی)۔ میں کہتا ہوں: اس حدیث میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ اس کی نماز نہیں جس نے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔ یہی قول صحیح ہے جیسا کہ آگے وضاحت آئے گی اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مطلب ہو کہ اس کی نماز نہیں جس نے نماز کی اکثر رکعات میں الحمد شریف نہیں پڑھی۔ یہی اختلاف کا سبب ہے۔ واللہ اعلم

حضرات امام ابو حنیفہ، ثوری، اوزاعی نے فرمایا: اگر جان بوجھ کر پوری نماز میں الحمد شریف چھوڑ دی اور کوئی دوسری سورت پڑھ دی تو اس کی نماز جائز ہو جائے گی۔ امام اوزاعی سے اس کے متعلق اختلاف مروی ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن نے کہا: قراءت کی کم از کم مقدار تین آیات ہیں یا ایک بڑی آیت ہے جیسے قرضہ والی آیت۔ اور امام محمد سے یہ بھی مروی ہے۔ فرمایا: میں آیت کی مقدار اور کلمہ مفہومہ کی مقدار میں اجتہاد کو جائز قرار دیتا ہوں جیسے الحمد للہ، اور میں ایسے حرف کو جائز قرار نہیں دیتا جو کلام نہ ہو۔

علامہ طبری نے فرمایا: نمازی ہر رکعت میں الحمد کی تلاوت کرے گا، اگر الحمد نہیں پڑھے گا تو نماز جائز نہ ہوگی مگر یہ کہ الحمد کی

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 103، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفة الصلاة، باب ما یقول بعد التکبیر، حدیث 702، نیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة فی کل رکعة، صفحہ 169، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

مثل قرآن سے الحمد کی آیات کی تعداد اور اس کے حروف کی تعداد کے مطابق تلاوت کرے۔

ابن عبدالبر نے کہا: اس کا کوئی مطلب نہیں کیونکہ الحمد کی تعیین اور تخصیص نے اس حکم کے ساتھ اس کو خاص کر دیا ہے اور یہ محال ہے کہ جس پر الحمد کا پڑھنا واجب ہے وہ اس کا بدل پڑھ لے اور الحمد چھوڑ دے جبکہ وہ الحمد پڑھنے پر قادر بھی ہو بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ الحمد ہی پڑھے اور اسی کی طرف لوٹے جیسا کہ دوسری عبادات میں متعین فرائض ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** مقتدی اگر امام کو رکوع میں پالے تو امام مقتدی کی طرف سے قراءت کرنے والا ہوگا کیونکہ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ مقتدی امام کو رکوع کی حالت میں پالے تو مقتدی تکبیر کہے اور رکوع میں چلا جائے، قراءت نہ کرے اور اگر امام کو قیام میں پالے تو قراءت کرے۔

**مسئلہ نمبر 7:** اور کسی کے لئے مناسب نہیں کہ وہ امام کے پیچھے سری نماز میں قراءت چھوڑ دے۔ اگر وہ قراءت چھوڑ دے گا تو اچھا نہیں کرے گا، لیکن امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک اس پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ اور جب امام، بری قراءت کر رہا ہو تو پھر یہ مسئلہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** امام کے پیچھے جہری نماز میں نہ سورۃ فاتحہ پڑھے اور نہ کوئی دوسری سورت پڑھے۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا (الاعراف: 204)** (جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”کیا بات ہے مجھ سے قرآن میں جھگڑا کیا جا رہا ہے“ (1)۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امام کے بارے ارشاد ہے: ”جب وہ قراءت کرے تو تم خاموش رہو“ (صحیح مسلم۔ کتاب الصلاة)۔ اور ارشاد فرمایا: ”جس کا امام ہو، امام کی قراءت اس کی قراءت ہے“ (2)۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اور امام شافعی سے یہ قول بویطی اور امام احمد بن حنبل نے حکایت فرمایا کہ کسی کی نماز نہ ہوگی حتیٰ کہ وہ ہر رکعت میں الحمد پڑھے خواہ وہ امام ہو یا مقتدی ہو۔ امام جہری قراءت کر رہا ہو یا سری۔ امام شافعی عراق میں مقتدی کے بارے میں کہتے تھے جب امام سری قراءت کرے تو مقتدی قراءت کرے اور جب جہری قراءت کرے تو مقتدی قراءت نہ کرے جیسا کہ امام مالک کا مشہور مذہب ہے۔ اور امام شافعی کے مصر میں امام کے جہری قراءت کرنے کی صورت میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ مقتدی قراءت کرے دوسرا یہ کہ امام کی قراءت کافی ہے مقتدی خود قراءت نہ کرے۔ یہ ابن منذر نے حکایت کیا ہے۔ ابن وہب، اشہب، ابن عبدالحکم، ابن حبیب اور کوفہ کے علماء نے کہا: مقتدی بالکل قراءت نہ کرے۔ خواہ امام جہری قراءت کر رہا ہو یا سری قراءت کر رہا ہو۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: امام کی قراءت، مقتدی کی قراءت ہے (3) یہ حکم عام ہے اور جابر کا قول ہے: جس نے نماز پڑھی اور اس میں الحمد نہیں پڑھی تو اس نے نماز نہیں پڑھی مگر یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو (4)۔

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلاة، باب ترک القراءۃ خلف الامام، صفحہ 59، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 61، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب اقامۃ الصلاة، اذا قرأ الامام الخ، حدیث 839، ضیاء القرآن پبلیکیشنز

3۔ ایضاً

4۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ الاضافۃ للکتاب، صفحہ 42، جلد 1 (وزارت تعلیم)

**مسئلہ نمبر 9:** ان اقوال میں سے صحیح قول امام شافعی، امام احمد کا ہے اور امام مالک کا دوسرا قول ہے کیونکہ ہر شخص کے لئے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا بالعموم متعین ہے (☆)۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اس کی نماز نہیں جس نے نماز میں الحمد نہیں پڑھی (1)۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جس نے نماز پڑھی اور اس میں الحمد نہیں پڑھی اس کی نماز ناقص ہے (2)۔ یہ تین مرتبہ فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں اعلان کروں کہ سورہ الحمد اور اس سے زائد کی قراءت کے بغیر نماز نہیں (3)۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے، جس طرح کہ کسی رکعت کا سجدہ اور رکوع دوسری رکعت کے قائم مقام نہیں ہوتا اسی طرح ایک رکعت کی قراءت دوسری رکعت کے قائم مقام نہیں ہوتی۔

عبداللہ بن عون، ایوب سختیانی اور ابو ثور وغیرہ اصحاب شوافع، داؤد بن علی نے بھی یہی کہا ہے۔ اس کی مثل اوزاعی سے بھی مروی ہے اور یہی قول مکحول کا بھی ہے۔ حضرات عمر بن خطاب، عبداللہ بن عباس، ابو ہریرہ، ابی بن کعب، ابو ایوب انصاری، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبادہ بن صامت، ابوسعید خدری، عثمان بن ابی عاص اور خوات بن جیسر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، فرماتے ہیں: سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں۔ یہی قول حضرت ابن عمر کا ہے اور اوزاعی کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔ یہ صحابہ مقتداء ہیں اور ان ذوات میں اسوہ ہے یہ تمام حضرات ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے وجوب کے قائل ہیں۔

امام ابو عبداللہ بن محمد یزید بن ماجہ القزوی نے اپنی سنن میں ایسی روایت نقل کی ہے جو اختلاف کو ختم کر دیتی ہے اور ہر احتمال کو زائل کر دیتی ہے۔ فرمایا: ہمیں ابو کریب نے بتایا، انہوں نے فرمایا: ہمیں محمد بن فضیل نے بتایا۔ دوسری سند اس طرح ہے ہمیں سوید بن سعید نے بتایا، ہمیں علی بن مسہر نے بتایا تمام نے ابوسفیان سعدی سے روایت کیا، انہوں نے ابونضرہ سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابوسعید سے روایت کیا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کی نماز نہیں جس نے ہر رکعت میں الحمد اور کوئی دوسری سورت نہیں پڑھی (4)۔ خواہ فرضی نماز ہو یا نقلی نماز ہو۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص سے فرمایا جس کو آپ نماز سکھا رہے تھے: ”تو اس طرح اپنی تمام نماز میں کر (5)“۔ آگے یہ حدیث تفصیل سے آئے گی۔ دوسری دلیل اس کے متعلق وہ روایت ہے جو ابو داؤد نے نافع بن محمود الریج سے روایت کی ہے، فرمایا: حضرت عبادہ بن صامت صبح کی نماز میں لیٹ ہو گئے تو ابونعیم مؤذن نے تکبیر کہی اور خود ہی لوگوں کو نماز پڑھا دی۔ حضرت عبادہ بن صامت آئے تو میں بھی ان کے ساتھ تھا حتیٰ کہ ہم نے ابونعیم کے پیچھے صف بنائی، ابونعیم جہری قراءت کر رہے تھے عبادہ نے الحمد پڑھنی شروع کر دی جب سلام پھیرا تو میں نے عبادہ سے کہا: میں تجھے الحمد پڑھتے ہوئے سن رہا تھا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحہ، صفحہ 169، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ باب لا صلوة الا بفاتحۃ الکتاب، صفحہ 42، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 118، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب من ترک القراءۃ فی صلاۃ، حدیث نمبر 697، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 61، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب القرائۃ خلف الامام، حدیث نمبر 829، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 119، جلد 1 (د۔ ت)۔ کتاب الصلوٰۃ، باب من ترک القراءۃ فی صلاۃ بفاتحۃ الکتاب، حدیث 701، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

۱۱۔ جب امام کی قراءت مقتدی کی کفالت کر جاتی ہے تو پھر احناف کا قول رائج ہوگا کیونکہ مقتدی جب امام کو رکوع میں پائے تو اس کی رکعت مکمل ہو جاتی ہے۔ مترجم



جبکہ ابو نعیم جہری قراءت کر رہے تھے؟ عبادہ نے کہا: ہاں۔ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایک نماز پڑھائی جس میں آپ جہری قراءت کر رہے تھے، آپ پر قراءت غلط ملط ہو گئی جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو ہماری طرف رخ انور پھیر لیا اور فرمایا: کیا تم قراءت کرتے ہو جب میں جہری قراءت کرتا ہوں؟ ہم میں سے بعض نے کہا: ہم واقعی ایسا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا نہ کیا کرو، میں کہہ رہا تھا مجھے کیا ہے کہ مجھ سے قرآن چھینا جا رہا ہے، تم قرآن میں سے کچھ نہ پڑھا کرو جب میں جہری قراءت کر رہا ہوں، مگر صرف سورہ الحمد (پڑھا کرو) (1)۔ یہ مقتدی کے بارے میں نص صریح ہے کہ وہ بھی سورہ الحمد پڑھے۔ اس حدیث کا معنی ابو یسٰی ترمذی نے محمد بن اسحاق کی حدیث سے نقل کیا ہے اور امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے۔ اور امام کے پیچھے قراءت کرنے کے بارے میں اس حدیث پر اکثر اہل علم صحابہ اور تابعین کا عمل ہے۔ حضرات مالک بن انس، ابن مبارک، شافعی، احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔ یہ حضرات امام کے پیچھے قراءت کا نظریہ رکھتے تھے۔

اس حدیث کو دارقطنی نے بھی نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ اسناد حسن ہے۔ اس کے راوی تمام ثقہ ہیں اور انہوں نے ذکر کیا کہ محمود بن ربیع ایلیم میں رہتے تھے اور ابو نعیم پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے بیت المقدس میں اذان دی۔ ابو محمد عبد الحق نے کہا: نافع بن محمود کو بخاری نے اپنی تاریخ میں ذکر نہیں کیا اور نہ ابن ابی حاتم نے اسے ذکر کیا اور نہ بخاری اور مسلم نے اس سے کوئی چیز نقل کی۔ اس کے متعلق ابو عمر نے فرمایا: یہ مجہول ہے۔ دارقطنی نے یزید بن شریک سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے عمر سے قراءت خلف الامام کے بارے پوچھا تو انہوں نے مجھے قراءت خلف الامام کا حکم دیا۔ میں نے کہا: اگر آپ بھی امام ہوں؟ انہوں نے کہا: اگرچہ میں بھی ہوں۔ میں نے کہا: اگرچہ آپ جہری قراءت کر رہے ہوں؟ انہوں نے کہا: اگرچہ میں جہری قراءت کر رہا ہوں (2)۔ دارقطنی نے کہا: یہ سند صحیح ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام ضامن ہے (3) جو کچھ وہ کرے تم بھی وہ کرو۔ ابو حاتم نے کہا: یہ اس کے لئے (دلیل) صحیح ہے جو امام کے پیچھے قراءت کا قائل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ نے الفاریسیٰ کو یہی فتویٰ دیا تھا کہ وہ دل میں قراءت کیا کرے جب اس نے حضرت ابو ہریرہ سے کہا تھا کہ میں کبھی امام کے پیچھے ہوتا ہوں پھر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا گیا ہے میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، اس کا نصف میرے لئے ہے اور اس کا نصف میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے سوال کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پڑھو۔ بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (4) (الحدیث)

**مسئلہ نمبر 10:** پہلے علماء نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد واذا قرأ فانصتوا (5) (جب امام قراءت کرے تو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحہ فی کل رکعۃ، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن دارقطنی، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ ام الكتاب، صفحہ 317، جلد 1 (دارالحسن للطباعة القاہرہ)

3۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 77، جلد 1 (د۔ ت)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یجب علی المؤذن من تعاهد الوقت، حدیث 434، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن نسائی، کتاب الافتتاح، باب ترک قراءۃ بسم اللہ فی الفاتحہ، صفحہ 144، جلد 1 (وزارت تعلیم)

5۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد فی الصلوٰۃ، صفحہ 174، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

خاموش رہو) سے استدلال کیا ہے۔ اسے مسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کی حدیث سے نقل کیا ہے اور فرمایا: جریر عن سلیمان عن قتادہ کی سند سے جو حدیث مروی ہے اس میں زیادتی ہے: وَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعْ لَهُ۔ دارقطنی نے کہا: قتادہ سے اس زیادتی کو ذکر کرنے میں سلیمان تیمی کی متابعت نہیں کی گئی بلکہ قتادہ کے شاگردوں میں سے حفاظ نے اس کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے ان الفاظ کو ذکر نہیں کیا۔ حفاظ حدیث میں یہ افراد شامل ہیں: شعبہ، ہشام، سعید بن ابی عروبہ، ہمام، ابو عوانہ، معمر، عدی بن ابی عمارہ۔ دارقطنی نے کہا: ان حفاظ کا اجماع دلیل ہے کہ سلیمان تیمی کو ان الفاظ میں وہم ہوا ہے۔ عبد اللہ بن عامر عن قتادہ کی سند سے تیمی کی متابعت مروی ہے لیکن وہ قوی نہیں ہے۔ قطان نے اس کو ترک کیا ہے۔ ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث سے یہ زیادہ نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ زیادتی اذقراء فانصتوا محفوظ نہیں ہے (1)۔ ابو محمد عبد الحق نے ذکر کیا ہے کہ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو صحیح کہا ہے اور فرمایا: یہ میرے نزدیک بھی صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: امام مسلم کا حضرت ابو موسیٰ کی حدیث سے ان الفاظ کو اپنی کتاب میں داخل کرنا ان کے نزدیک اس کی صحت کی دلیل ہے اگرچہ اس کی صحت کا تمام علماء کا اجماع نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام احمد بن حنبل اور ابن منذر نے صحیح کہا ہے۔ رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَاَنْصِتُوا (الاعراف: 204) تو یہ مکہ میں نازل ہوا اور نماز میں کلام کرنے کی حرمت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی جیسا کہ حضرت زید بن ارقم نے فرمایا: پس اس میں حجت نہ رہی کیونکہ مقصود مشرکین تھے جیسا کہ حضرت سعید بن مسیب نے کہا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نماز میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے آواز بلند کرنے کے بارے نازل ہوئی۔ اور دارقطنی نے فرمایا: عبد اللہ بن عامر ضعیف ہے۔ رہا حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد کیا بات ہے کہ قرآن مجھ سے چھینا جا رہا ہے (2)۔ اسے امام مالک نے ابن شہاب سے انہوں نے ابن اکیمہ لیشی سے روایت کیا ہے۔ امام مالک نے اس کے نام کے بارے فرمایا: عمرو۔ جبکہ دوسرے محدثین نے کہا: عامر، بعض نے کہا: یزید، بعض نے کہا: عمارہ، بعض نے کہا: عباد، اس کی کنیت ابو الولید تھی، ایک سوا یک ہجری میں اس کا وصال ہوا جبکہ اس کی عمر ۹۹ سال تھی۔ ان سے زہری نے صرف یہی حدیث روایت کی ہے اور یہ ثقہ ہے۔ محمد بن عمرو وغیرہ نے اس سے روایت کیا ہے۔ اس کی حدیث میں یہ معنی موجود ہے جب میں بلند آواز سے قراءت کروں تو تم بلند آواز سے قراءت نہ کرو کیونکہ یہ تنازع، چھیننا اور تنہا ہے (بلکہ) دل میں پڑھو۔ حضرت عبادہ کی حدیث اور حضرت عمر فاروق اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کے فتاویٰ بھی اس حدیث کے مفہوم کو بیان کرتے ہیں۔ اگر مالی انازع القرآن (کیا بات ہے کہ مجھ سے قرآن چھینا جا رہا ہے) (3) سے وہ یہ منع کا مفہوم سمجھتے تو اس کے خلاف فتویٰ نہ دیتے۔ حضرت ابن اکیمہ کی حدیث میں زہری کا قول ہے کہ پھر لوگ اس نماز میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قراءت کرنے سے رک گئے جن میں رسول اللہ ﷺ بلند آواز سے قراءت کرتے تھے جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات سنی۔ یہاں قراءت سے مراد الحمد ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 69، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ کتاب الصلوٰۃ، باب الامام یصلی من تَعُوذ، حدیث 511، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، باب ترک القراءۃ باب خلف الامام فیما جہر فیہ، صفحہ 69، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ ایضاً

ہے۔ وبالله توفیقنا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں توفیق ملتی ہے۔

رہا رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد: ”جس کا امام ہو، تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے“ (1)۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ حسن بن غمارہ نے اسے متصل ذکر کیا ہے اور وہ متروک ہے۔ ابو حنیفہ (امام اعظم) وہ بھی ضعیف ہے (یہ تبصرہ تعجب کی بات ہے خصوصاً جب حضرت عبداللہ بن مبارک جیسے محدث آپ کی شاگردی پر فخر کریں۔ مترجم)۔ ان دونوں حضرات نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے انہوں نے عبداللہ بن شداد سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: اس حدیث کو حضرات سفیان ثوری، شعبہ، اسرائیل، ابن یونس، شریک، ابو خالد الدالانی، ابو الاحوص، سفیان بن عیینہ، جریر بن عبد الحمید وغیرہم نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے انہوں نے عبداللہ بن شداد سے انہوں نے مرسلان نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے اور مرسل ہی درست ہے۔ رہا حضرت جابر کا قول کہ ”جس نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں الحمد نہ پڑھی تو اس نے نماز نہیں پڑھی، مگر جب امام کے پیچھے ہو“ (2)۔ اس قول کو مالک نے وہب بن کیسان سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: اس قول کو یحییٰ بن سلام صاحب تفسیر نے مالک سے انہوں نے ابو نعیم وہب بن کیسان سے انہوں نے حضرت جابر سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ صواب حضرت جابر پر موقوف ہے جیسا کہ مؤطا میں ہے۔ اس حدیث میں فقہی مسئلہ یہی مستنبط ہوتا ہے کہ وہ رکعت باطل ہے جس میں الحمد نہ پڑھی گئی۔ یہ دلیل ہے اس مذہب کی جس کی طرف ابن قاسم گئے ہیں اور انہوں نے مالک سے اس رکعت کے لغو ہونے اور دوسری رکعت پر بنا کرنے کو روایت کیا ہے۔ نمازی اس رکعت کو شمار نہیں کرے گا جس میں اس نے الحمد نہ پڑھی ہوگی۔ اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ امام کی قراءت اس کے مقتدیوں کی قراءت ہے (1)۔ یہ حضرت جابر کا مذہب تھا اور دوسرے لوگوں نے ان کی اس مسئلہ میں مخالفت کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 11:** ابن عربی نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کے ارشاد: لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب (3) (اس کی نماز نہیں جس نے الحمد نہیں پڑھی) اس کی اصل کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ کیا یہ کمال اور تمام کی نفی پر محمول ہے یا جواز کی نفی پر محمول ہے۔ ناظر کے حال کے اختلاف کی وجہ سے فتویٰ بھی مختلف ہے۔ اس اصل میں مشہور اور اقویٰ یہ ہے کہ نفی عموم پر ہے اور مالک کی روایت سے اقویٰ یہ ہے کہ جس نے اپنی نماز میں الحمد نہیں پڑھی اس کی نماز باطل ہے پھر ہم نے ہر رکعت میں الحمد کے تکرار میں غور کیا۔ پس جس نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد: افعل ذالک فی صلاتک کلھا (4) (اپنی نماز میں ایسا کر) کی یہی تادیل کی اسے ہر رکعت میں الحمد کا لوٹنا لازم ہے جیسا کہ رکوع و سجود کو لوٹنا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 12:** اس باب میں سورۃ فاتحہ کی تعین میں جو معانی اور احادیث ذکر کی ہیں یہ سب کوفہ کے علماء کے اس

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 61، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب اذا قرأ الامام فاتحتہ، حدیث 839، ضیاء القرآن پبلی کیشنز،

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاتی امر القرآن، صفحہ 66، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحہ، صفحہ 169، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ ایضاً، صفحہ 170، جلد 1

(1) قراءت خلف الامام کے حوالے سے شرح معانی الآثار کتاب الصلوٰۃ باب قراءۃ خلف الامام میں اور علامہ مینی کی عمدۃ القاری شرح بخاری میں تفصیلی بحث موجود ہے۔



قول کا رد کرتی ہیں جو کہتے ہیں کہ سورہ فاتحہ متعین نہیں ہے اور سورہ فاتحہ اور قرآن کی دوسری آیات برابر نہیں، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشاد سے اسے متعین فرمایا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور نبی کریم ﷺ واقیموا الصلوٰۃ کی مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کرنے والے ہیں۔ ابو داؤد نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سورہ فاتحہ اور جو مزید قراءت میسر ہو وہ پڑھیں (1)۔ پس یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اعرابی کو جو فرمایا تھا کہ جو تیرے پاس قرآن ہے وہ پڑھ اور جو سورہ فاتحہ سے زائد ہے وہ پڑھ (2)۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَاقْرَءْ ذٰلَکَ تَیْسَرَ مِنْہُ (المزل: 20) کی تفسیر ہے تو پڑھ لیا کر قرآن سے جتنا آسان ہو۔

مسلم نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کی نماز نہیں جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی (3) ایک روایت میں ”اور کچھ زائد“ اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز ناقص ہے مکمل نہیں ہے (4) یعنی اولہ مذکورہ کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔ الخداہ کا لفظ حدیث میں استعمال ہوا ہے اس کا معنی نقص اور فساد ہے۔ انفس نے کہا: خدجت الناقة اس وقت بولا جاتا ہے جب اونٹنی ناقص بچہ جنم دے اور اخدجت اس وقت کہا جاتا ہے جب وقت سے پہلے بچہ پھینک دے اگرچہ اس کی تخلیق مکمل ہو۔

نظر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کمی کے ہوتے ہوئے نماز جائز نہ ہو کیونکہ یہ ایک ایسی نماز ہے جو مکمل نہیں ہوئی اور جو اپنی نماز سے خارج ہو جبکہ اس کی نماز مکمل نہ ہوئی ہو تو اس پر اعادہ واجب ہے جیسا کہ حکم دیا گیا ہے اور جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کمی کے باوجود نماز جائز ہے حالانکہ وہ کمی کا اقرار بھی کرتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ دلیل پیش کرے اور اس کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو لازم ہو۔

**مسئلہ نمبر 13:** امام مالک سے مروی ہے کہ کسی نماز میں قراءت واجب نہیں ہے اور اسی طرح امام شافعی عراق میں اس شخص کے بارے فرماتے تھے جو قراءت بھول جائے پھر مصر میں اس قول سے رجوع کر لیا اور کہا: اس شخص کی نماز جائز نہیں، جو سورہ فاتحہ اچھی طرح پڑھ سکتا ہے مگر سورہ فاتحہ کے ساتھ۔ اور سورہ فاتحہ میں سے ایک حرف بھی کم ہو تو نماز جائز نہ ہو گی۔ پس اگر سورہ فاتحہ کو نہ پڑھا یا اس سے کوئی حرف کم کر دیا تو وہ نماز کا اعادہ کرے اگرچہ دوسری کوئی سورت تلاوت بھی کی ہو۔ اس مسئلہ میں یہی قول صحیح ہے۔ اور رہا وہ مسئلہ جو حضرت عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی۔ ان کے سامنے قراءت نہ کرنے کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے پوچھا رکوع و سجود کیسا تھا؟ لوگوں نے کہا: وہ تو بہت اچھا تھا۔ حضرت عمر نے کہا: پھر کوئی حرج نہیں۔ یہ حدیث منکر اللفظ ہے اور منقطع الاسناد ہے کیونکہ اسے ابراہیم بن حارث تیمی نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے اور کبھی ابراہیم اسے ابو سلمہ بن عبد الرحمن بن عمر کے سلسلہ سے روایت کرتے تھے اور دونوں سندیں منقطع ہیں اس میں حجت نہیں ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں اسے ذکر کیا ہے اور یہ بعض رواۃ نے بیان

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 118، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب من ترک القرائۃ فی صلاۃ بغفائہ الکتاب، حدیث 695، فیاء القرآن جلی کیشنز

2۔ سنن مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراۃ الفاتحہ، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)۔ 3۔ ایضاً، صفحہ 189، جلد 1۔ 4۔ ایضاً

کی ہے جبکہ یحییٰ اور ان کے ساتھ والے طاغفہ نے اسے بیان نہیں کیا کیونکہ امام مالک نے اپنی کتاب میں اسے آخر میں ذکر کیا ہے اور فرمایا: اس حدیث پر عمل نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر وہ نماز جس میں الحمد نہ پڑھی گئی ہو وہ ناقص ہے (1) حضرت عمر سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے اس نماز کا اعادہ کیا تھا اور یہ ان سے صحیح ثابت ہے۔

یحییٰ بن یحییٰ نیساپوری نے فرمایا: ابو معاویہ نے ہمیں بتایا انہوں نے اعمش سے انہوں نے ابراہیم نخعی سے انہوں نے ہمام بن حارث سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر مغرب کی نماز میں قراءت بھول گئے تو آپ نے لوگوں کو دوبارہ نماز پڑھائی۔ ابن عبد البر نے کہا: یہ حدیث متصل ہے۔ ہمام نے حضرت عمر سے اس کو بیان کیا اور اس کو انہوں نے کئی طرق سے روایت کیا۔ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: امام مالک سے اس شخص کے بارے پوچھا گیا جو قراءت بھول گیا تھا۔ کیا تجھے تعجب میں ڈالتا ہے جو حضرت عمر نے کہا تھا؟ انہوں نے فرمایا: میں انکار کرتا ہوں کہ حضرت عمر نے ایسا کیا تھا اور میں اس روایت کا انکار کرتا ہوں۔ امام مالک نے فرمایا: لوگ حضرت عمر کو مغرب کی نماز میں ایسا کرتے دیکھتے تھے اور وہ سبحان اللہ نہیں کہتے تھے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جو ایسا کرے (یعنی قراءت نہ کرے) تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔

**مسئلہ نمبر 14:** علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ قراءت کے بغیر نماز نہیں ہوتی جیسا کہ علماء کے اصول سے گزر چکا ہے اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ سورۃ فاتحہ کے بعد کوئی قرأت متعین نہیں ہے مگر وہ مستحب قرار دیتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کے ساتھ ایک سورت پڑھے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے یہ عمل اکثر ثابت ہے۔ امام مالک نے فرمایا: قراءت میں سنت یہ ہے کہ پہلی دو رکعتوں میں الحمد اور کوئی سورت پڑھے اور آخری دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ پڑھے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: ام القرآن (الحمد) پڑھے اگر الحمد نہ پڑھی اور کوئی دوسری سورت پڑھ دی تو بھی اس کی نماز جائز ہو جائے گی اور فرمایا: اگر تین رکعتوں میں قراءت بھول جائے تو نماز کو دوبارہ پڑھے۔ ثوری نے فرمایا: پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور کوئی دوسری سورت پڑھے اور آخری دو رکعتوں میں چاہے تو تسبیح کرے اور اگر چاہے تو قراءت کرے، اور اگر قراءت نہ کرے اور تسبیح بھی نہ کرے تب بھی نماز جائز ہو گی۔ یہ قول امام ابو حنیفہ اور دوسرے تمام کوفیوں کا ہے۔ ابن منذر نے فرمایا: ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: پہلی دو رکعتوں میں قراءت کر اور دوسری دو رکعتوں میں تسبیح پڑھ۔ امام نخعی کا بھی یہی قول ہے۔

سفیان نے کہا: اگر تین رکعتوں میں قراءت نہ کی تو نماز کا اعادہ کرے کیونکہ ایک رکعت کی قراءت جائز نہیں۔ فرمایا: اسی طرح اگر فجر کی نماز میں ایک رکعت میں قراءت بھول جائے (تو بھی نماز کا اعادہ کرے)۔ ابو ثور نے کہا: نماز جائز نہیں مگر ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے ساتھ جیسا کہ امام شافعی کا مصری قول ہے اسی پر شوافع کا اجماع ہے۔ اسی طرح ابن خويز منداد مالکی کا قول ہے۔ فرمایا: ہمارے نزدیک ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے اور یہی اس مسئلہ میں صحیح ہے۔

مسلم نے حضرت ابو قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھاتے تھے اور ظہر اور عصر کی نمازوں

1۔ صحیح مسلم، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة وانه اذا لم يحسن الفاتحة ولا مكنه تعلمها قرا ما تيسر له غيرها، صفحہ 170، جلد 1 (تدريسي كتب خانہ)

کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور دو سورتیں تلاوت کرتے تھے۔ کبھی ہمیں کوئی آیت کریمہ سناتے تھے، ظہر کی پہلی رکعت کو طویل کرتے تھے اور دوسری کو چھوٹا کرتے تھے اور اسی طرح صبح کی نماز میں کرتے تھے (1)۔ ایک روایت میں ہے کہ دوسری دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھتے تھے (2) یہ صریح نص ہے اور حدیث صحیح ہے۔ یہی امام مالک کا مسلک ہے۔ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے تعین میں یہ نص ہے بخلاف ان علماء کے جنہوں نے اس کا انکار کیا۔ حجت، سنت میں ہوتی ہے نہ کہ اس قول میں جو سنت کے خلاف ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 15:** جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ سورہ فاتحہ سے زائد قراءت واجب نہیں ہے کیونکہ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہر نماز میں قراءت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جو ہم سے جہری قراءت کی ہم نے تم سے جہری قراءت کی، جو آپ ﷺ ہم سے مخفی (قراءت) کی ہم نے بھی تم سے مخفی کی۔ پس جس نے سورہ فاتحہ پڑھ لی اس کی طرف سے قرأت جائز ہو گئی اور جس نے سورہ فاتحہ سے زائد پڑھا وہ افضل ہے (3)۔ بخاری میں ہے: اگر تم اس سے زائد پڑھو تو بہتر ہے (4)۔ اکثر اہل علم نے ضرورت یا غیر ضرورت کے لئے سورت کو ترک کرنے سے انکار کیا ہے۔ ان میں سے حضرات عمران بن حصین، ابوسعید خدری، خوات بن جبر، مجاہد، ابو وائل، ابن عمر، ابن عباس وغیرہم ہیں۔ یہ علماء فرماتے ہیں: اس کی نماز نہیں ہوتی جو سورہ فاتحہ اور قرآن میں سے مزید کچھ نہ پڑھے۔ پھر ان علماء میں سے بعض نے دو آیات کی حد متعین کی، بعض نے ایک آیت کی حد متعین کی، بعض نے کوئی حد متعین نہیں کی اور فرمایا: قرآن میں سے کچھ پڑھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکم ہے: فَأَقْرَأُوا مَا تَشَاءُ مِنْهُ (مزل: 20) پس سورہ فاتحہ کے ساتھ ہر حال میں جو اسے میسر ہو وہ پڑھے کیونکہ حضرات عبادہ، ابوسعید خدری وغیرہما کی حدیث میں یہی حکم ہے۔ مدونہ میں ہے: وکیع نے اعمش سے انہوں نے خیمہ سے روایت کیا، فرمایا: مجھے اس نے بتایا جس نے حضرت عمر بن خطاب کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا۔ اس شخص کی نماز نہیں جو سورہ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور نہ پڑھے۔ سورت کی قراءت کے بارے میں تین اقوال ہیں: سنت ہے، فضیلت ہے، واجب ہے۔

**مسئلہ نمبر 16:** جو شخص بسیار کوشش کے باوجود سورہ فاتحہ یا قرآن میں سے اور کچھ نہ سیکھ سکے تو اسے لازم ہے کہ وہ قراءت کی جگہ ممکن حد تک تکبیر یا تہلیل یا تحمید یا تسبیح یا تمجید یا لا حول ولا قوۃ الا باللہ کہے۔ جب وہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو یا امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو جبکہ سری قراءت والی نماز ہو۔

ابوداؤد وغیرہ نے عبد اللہ بن ابی اوفی سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: میں قرآن یاد نہیں کر سکتا مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیں جو قراءت کی کفایت کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو کہہ: سبحان اللہ، الحمد للہ، ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ اس شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ تو اللہ کے لئے ہے، میرے لئے کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب القراءۃ فی الظهر والعصر، صفحہ 185، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ ایضاً

3۔ ایضاً، کتاب الصلوۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحہ، صفحہ 170، جلد 1

4۔ صحیح بخاری، صفحہ 106، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفة الصلوۃ، باب القراءۃ فی الفجر، حدیث 730، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



ہے؟ فرمایا: تو اس طرح کہہ: اے اللہ! تو مجھ پر رحم کر، مجھے عافیت دے، مجھے ہدایت دے اور مجھے رزق عطا فرما (1)۔

**مسئلہ نمبر 17:** اگر کوئی شخص ان الفاظ کے یاد کرنے سے بھی عاجز ہو تو وہ امام کے ساتھ نماز کو نہ چھوڑے۔ امام اس کی طرف سے ان شاء اللہ یہ ادا کرنے والا ہوگا۔ اس شخص پر لازم ہے کہ وہ سورہ فاتحہ اور کچھ مزید قرآن سیکھنے کی کوشش ہمیشہ کرتا رہے حتیٰ کہ اس پر موت آجائے، تو بھی وہ کوشش میں لگا ہوا ہو۔ پس اللہ تعالیٰ اس کا عذر قبول فرمائے گا۔

**مسئلہ نمبر 18:** جو غمی لوگوں میں سے عربی نہ بول سکتا ہو اور اس کے لئے عربی دعا کا اس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہو جس کو وہ سمجھتا ہو تا کہ وہ اپنی نماز قائم کرے تو ان شاء اللہ یہ بھی اس کے لئے جائز ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 19:** جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ جو عربی اچھی طرح جانتا ہو وہ اگر فارسی میں قراءت کرے گا تو اس کی نماز جائز نہ ہوگی۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: فارسی میں قراءت جائز ہے اگرچہ عربی اچھی طرح جانتا بھی ہو کیونکہ مقصود معنی کو پانا ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ جائز نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے اور اس کے بھی خلاف ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا اور مسلمانوں کی جماعت کے عمل کے بھی خلاف ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ امام ابوحنیفہ کے قول کی کسی عالم نے موافقت کی ہے۔ (۱)

**مسئلہ نمبر 20:** جس نے نماز کو شروع کیا جس طرح کہ حکم دیا گیا تھا جبکہ وہ قراءت نہ جانتا تھا پھر نماز کے دوران ہی اسے قرأت کا علم حاصل ہو۔ اور یہ متصور ہے اس طرح کہ کوئی شخص تلاوت سنے اور سننے کے ساتھ ہی وہ اس کے حافظہ میں معلق ہو جائے تو ایسا شخص نماز کو نئے سرے سے شروع نہ کرے کیونکہ اس نے جو پیچھے ادا کیا وہ حکم الہی کے مطابق تھا۔ پس اس کے سابقہ عمل کو باطل کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ ابن حنون نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

تیسرا باب

## آمین کہنے کے متعلق ہے

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** قرآن پڑھنے والے کے لئے سنت ہے کہ سورہ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد وَلَا الضَّالِّينَ کے نون پر سکتے کے بعد آمین کہے تاکہ قرآن، غیر قرآن سے ممتاز ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 2:** حضرت ابو ہریرہ کی حدیث سے کتب حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو کیونکہ جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے سے موافقت کر جائے گا اس کے سابقہ تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے“ (2)۔

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 121، جلد 1 (و۔ت)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یجوز فی الامی والاعجب من القراۃ، حدیث 708، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 108، جلد 1 (دزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب جہر الامام بالتأمین، حدیث نمبر 738، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(۱) احناف کی کتب میں موجود ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ نے اس قول سے رجوع کر لیا تھا ”ہدایہ“ ان کا پہلا عذر حکمی کی وجہ سے تھا۔

ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا: گناہ کی مغفرت کی ترتیب چار مقدمات پر ہے جن کو یہ حدیث متضمن ہے: (۱) امام کا آمین کہنا۔ (۲) مقتدیوں کا آمین کہنا۔ (۳) فرشتوں کا آمین کہنا۔ (۴) آمین کہنے میں موافقت۔ بعض علماء نے فرمایا: اجابت میں موافقت، بعض نے فرمایا: زمانہ میں موافقت، بعض نے فرمایا: دعا کے اخلاص کی صفت میں موافقت مراد ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو در اس حالیکہ تمہیں اس کی قبولیت کا یقین ہو۔ اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ غافل اور اخلاص سے خالی دل کی دعا قبول نہیں فرماتا“ (۱)۔

**مسئلہ نمبر 3:** ابوداؤد نے ابو مصحیح مقرائی سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم ابوزہیر منیری کے پاس بیٹھتے تھے اور وہ صحابہ میں سے تھے، وہ بڑے اچھے انداز میں حدیث بیان کرتے تھے۔ جب ہم میں سے کوئی دعا مانگتا تو کہتے: اس پر آمین سے مہر لگاؤ کیونکہ آمین صحیفہ پر مہر کی طرح ہے۔ ابوزہیر نے کہا: میں تمہیں اس کے متعلق نہ بتاؤں۔ ہم ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے۔ ہم ایک شخص کے پاس آئے جو دعا کرنے میں اصرار کر رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ اسے سنتے ہوئے ٹھہر گئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر اس نے مہر لگا دی تو یہ واجب کر دے گا۔ ایک شخص نے کہا: کس چیز کے ساتھ مہر لگائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: آمین کے ساتھ کیونکہ اگر آمین کے ساتھ مہر لگا دے گا تو واجب کر دے گا۔ وہ شخص جس نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تھا وہ واپس آیا اور اس شخص کے پاس پہنچا اور اسے کہا: اے فلاں! مہر لگا اور خوش ہو (۲)۔

ابن عبد البر نے کہا: ابوزہیر منیری کا نام یحییٰ بن نفیر تھا۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، مٹزی کو قتل نہ کرو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا شکر ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا: آمین کے چار حرف ہیں اللہ تعالیٰ ہر حرف سے ایک فرشتہ پیدا فرماتا ہے جو دعا کرتا رہتا ہے۔ اے اللہ! ہر اس شخص کو بخش دے جس نے آمین کہا اور خبر میں ہے سورہ فاتحہ سے میرے فارغ ہونے کے بعد مجھے جبریل نے آمین کی تلقین کی اور کہا: یہ خط پر مہر کی طرح ہے ایک اور حدیث میں ہے آمین رب العالمین کی مہر ہے۔ ہروی نے کہا: ابوبکر نے کہا: اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر مہر لگائی کیونکہ وہ آمین کے ساتھ بندوں سے آفات و بلیات دور فرماتا ہے۔ پس گویا یہ خط کی مہر کی مانند ہے جو خط کو محفوظ رکھتی ہے اور اس میں خرابی کرنے اور اس کے اندر جو کچھ ہے اسے ظاہر کرنے سے مانع ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے آمین جنت میں ایک درجہ ہے۔ ابوبکر نے کہا: اس کا معنی یہ ہے یہ ایک ایسا کلمہ ہے جس کا کہنے والا اس کے ذریعے جنت میں ایک درجہ حاصل کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اکثر اہل علم کے نزدیک آمین کا معنی ہے: اللہم استجب لنا (اے اللہ ہماری دعا قبول فرما) یہ دعا کی جگہ رکھا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ یہ جعفر بن محمد، مجاہد، ہلال بن یساف سے مروی ہے اور یہ بات حضرت ابن عباس نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے جبکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: آمین کا معنی ہے اسی طرح ہونا چاہئے۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ کلبی نے ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابن

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی جامع الدعوات، صفحہ 186، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 135، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ کتاب الصلوٰۃ، باب التامیض و راد الامام، حدیث نمبر 803، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا آمین کا معنی کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: (اس کا معنی ہے) اے میرے رب! تو (ایسا) کر۔ مقاتل نے کہا: یہ کلمہ دعا کے لئے قوت ہے اور برکت طلب کرنے کے لئے ہے۔ ترمذی نے کہا: اس کا معنی ہے ہماری امیدوں کو نامراد نہ کر۔

**مسئلہ نمبر 5:** آمین میں دو لغتیں ہیں: (۱) مد، بروزن فاعیل جیسے یاسین (۲) بغیر مد کے یمین کے وزن پر۔ شاعر نے مد میں کہا ہے۔

یا رب لا تسلبنی حبھا ابداً و یرحم اللہ عبداً قال آمینا

اے رب! مجھ سے اس کی محبت کبھی نہ نکال اور اللہ اس بندے پر رحم فرمائے جو آمین کہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

آمین آمین لا ارضی بواحدۃ حتی ابلغھا الفین آمینا

آمین آمین، میں ایک مرتبہ کہنے پر راضی نہ ہوں گا حتیٰ کہ میں اسے دو ہزار آمین تک پہنچاؤں گا۔

ایک اور شاعر نے بغیر مد کے کہا ہے:

تباعد منی فطخل اذا سالتہ امین فزاد اللہ ما بیننا بعداً

اس شعر میں امین بغیر مد کے استعمال ہوا ہے۔

آمین کو میم کی شد کے ساتھ پڑھنا غلطی ہے یہ جوہری کا قول ہے۔ حسن اور حضرت امام جعفر صادق سے شد کے ساتھ مروی ہے حسین بن فضل کا بھی یہی قول ہے اور یہ ام سے مشتق ہے جس کا معنی ہے قصد کرنا یعنی ہم تیری طرف قصد کرنے والے ہیں۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا آتَمِنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ (المائدہ: 2) یہ قول ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الکریم قشیری نے حکایت کیا ہے۔ جوہری نے کہا: یہ امین اور کیف کی مثل بنی برفتح ہے کیونکہ اجتماع ساکنین ہے۔ اسی سے تو کہتا ہے: آمَنَ فلان تامینا۔

**مسئلہ نمبر 6:** علماء کا اختلاف ہے کیا امام آمین کہے اور کیا وہ اسے بلند آواز سے کہے۔ امام شافعی اور مالک اور ایک روایت میں مدنی علماء اسی مسلک کی طرف گئے ہیں۔ کوفہ کے علماء اور بعض مدنی علماء نے کہا: وہ بلند آواز سے آمین نہ کہے۔ یہی طبری کا قول ہے۔ ہمارے مالکی علماء میں سے ابن حبیب نے یہی کہا ہے۔ ابن بکیر نے کہا: اسے اختیار ہے (۱)۔ ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ امام آمین نہ کہے بلکہ مقتدی آمین کہیں۔ یہ ابن قاسم اور اصحاب مالک میں سے مصری علماء کا قول ہے اور ان کی حجت حضرت ابو موسیٰ اشعری کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور ہمارے لئے ہمارا طریقہ بیان فرمایا اور ہمیں اپنی نماز سکھائی اور فرمایا: جب تم نماز پڑھو تو اپنی صفوں کو سیدھا کرو پھر تم میں سے جو بڑا ہو وہ امامت کرائے۔ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو جب وہ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ کہے تو تم آمین کہو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول فرمائے گا (2) حدیث ذکر فرمائی۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے اسی کی مثل سی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد، صفحہ 174، جلد 1 (تذیبی کتب خانہ)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 79، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)



اسے مالک نے نقل فرمایا۔ پہلا قول صحیح ہے اس کی دلیل حضرت وائل بن حجر کی حدیث ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب وَاَلَا الضَّالِّیْنَ پڑھتے تو آمین کہتے اور اس کے ساتھ آواز کو بلند کرتے (1)۔ ابو داؤد اور دارقطنی نے یہ حدیث روایت کی ہے اور یہ زائد ذکر کیا ہے۔ ابو بکر نے کہا: یہ سنت ہے جس کے ساتھ اہل کوفہ منفرد ہیں یہ صحیح ہے اور جو اس کے بعد ہے۔

امام بخاری نے ایک عنوان باندھا ہے: جہر الامام بالتامین۔ (2)

عطاء نے کہا: آمین دعا ہے۔ ابن زبیر اور ان کے مقتدیوں نے آمین کہا حتیٰ کہ مسجد میں گونج پیدا ہوئی۔ امام ترمذی نے کہا: نبی کریم ﷺ کے صحابہ اور تابعین علماء میں سے اکثر علماء فرماتے ہیں کہ نمازی اپنی آواز آمین کے ساتھ بلند کرے اور آہستہ نہ کہے (3)۔ یہی قول امام شافعی، احمد اور اسحاق کا ہے۔ مؤطا اور بخاری و مسلم میں ہے، ابن شہاب نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: آمین (4)۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: لوگوں نے آمین کو چھوڑ دیا ہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ جب غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ کہتے تو آمین کہتے تھے حتیٰ کہ پہلی صف والے سن لیتے تھے اور مسجد اس کے ساتھ گونج جاتی تھی (5)۔ رہی ابو موسیٰ اور سکی کی حدیث تو ان دونوں کا معنی اس مقام کی وضاحت ہے جہاں آمین کہا جاتا ہے اور وہ وہ مقام ہے جب امام وَاَلَا الضَّالِّیْنَ کہتا ہے تاکہ ان دونوں کا قول اکٹھا ہو جائے اور مقتدی آمین کے قول کے ساتھ امام سے آگے نہ بڑھ جائیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو (6)۔ ابن نافع نے اپنی کتاب ”ابن الحارث“ میں فرمایا: مقتدی آمین نہ کہے حتیٰ کہ امام کو وَاَلَا الضَّالِّیْنَ کہتے ہوئے سن لے اور جب امام سے اتنا دور ہو کہ اس کی آواز نہ سن سکے تو آمین نہ کہے۔ ابن عبدوس نے کہا: وہ قراءت کا اندازہ کر کے آمین کہے (7)۔

**مسئلہ نمبر 7:** امام ابو حنیفہ کے ساتھیوں نے کہا: آہستہ آمین کہنا، بلند آواز سے آمین کہنے کی نسبت زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً (اعراف: 55) (دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ)۔ مزید کہتے ہیں: آہستہ آمین کہنے پر دلیل وہ تاویل ہے جو اس آیت قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوُكُمَا (یونس: 89) کے بارے میں مروی ہے۔ فرمایا: موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے۔ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے آمین کہنے والا فرمایا۔

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 134-135، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب التامین وراء الامام، حدیث 797، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 107، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔

3۔ سنن ترمذی، صفحہ 34، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی التامین

4۔ مؤطا امام مالک، صفحہ 69، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی التامین خلف الامام

5۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 62، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب الجہر بالتامین، حدیث نمبر 842، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

6۔ صحیح بخاری، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب جہر الامام بالتامین، حدیث نمبر 738، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

7۔ المحرر الوجیز، صفحہ 80، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اس کا جواب یہ ہے کہ دعا کا اخفاء افضل ہے کیونکہ اس میں ریاد داخل ہو جاتا ہے لیکن وہ امر جو جماعت کی نماز کے ساتھ متعلق ہے، اس میں حاضری، ایک شعار کا اظہار ہے اور حق کا اظہار بندوں کو اس کے اظہار کی دعوت دیتا ہے۔ امام سورہ فاتحہ کی قراءت بلند آواز سے کرتا ہے جو دعا اور آمین کہنے پر مشتمل ہے۔ جب دعا ایسی چیز ہے جس میں جبر سنت ہے تو آمین کہنا تو دعا کے لئے مہر ہے اور اس کے قائم مقام ہے اور یہ واضح امر ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** آمین کا کلمہ ہم سے پہلے صرف موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے لئے تھا۔ حکیم ترمذی نے ”نوادرا الاصول“ میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں عبدالوارث بن عبدالصمد نے بتایا انہوں نے کہا: مجھے میرے باپ نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں رزین نے بتایا جو ہشام بن حسان کی مسجد کے مؤذن تھے۔ انہوں نے کہا: ہمیں حضرت انس بن مالک نے بتایا، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت کو تین ایسی چیزیں عطا فرمائی ہیں جو ان سے پہلے کسی کو عطا نہیں فرمائیں۔ وہ یہ ہیں: اہل جنت کا سلام، فرشتوں کی صفیں اور آمین مگر موسیٰ اور ہارون کو آمین کا کلمہ دیا گیا تھا۔ ابو عبد اللہ نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے خلاف دعا کی اور ہارون علیہ السلام نے آمین کہی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا قرآن میں اس طرح ذکر کیا قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَاهُ تِلْكَ (یونس: 89) ہارون علیہ السلام کے کلام کو ذکر نہیں فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ربنا (اے ہمارے رب!) اور ہارون علیہ السلام نے کہا: آمین۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان دونوں کو دعا کرنے والا کہا کیونکہ ان کی طرف سے یہ دعا ہو گئی تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: آمین اس امت کے ساتھ خاص ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: یہود تم پر اتنا حسد کسی چیز پر نہیں کرتے جتنا کہ وہ سلام اور آمین کہنے پر حسد کرتے ہیں (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے حصاد بن سلمہ عن سہیل بن ابی صالح عن ابیہ عن عائشہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مکمل حدیث ذکر کی۔ حضرت ابن عباس کی حدیث سے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرمایا، فرمایا: یہود تم پر کسی چیز میں اتنا حسد نہیں کرتے جتنا کہ آمین پر تم سے حسد کرتے ہیں، پس آمین کا قول زیادہ کہا کرو (2)۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں: اہل کتاب نے ہم سے حسد کیا کیونکہ اس کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے پھر اس کی بارگاہ میں عجز و نیاز ہے پھر ہمارے لئے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی دعا ہے پھر ہمارے قول آمین کے ساتھ ان کے لئے بد دعا ہے۔

چوتھا باب

اس میں سورہ فاتحہ کے معانی، قراءت، اعراب اور حمد کرنیوالوں کی فضیلت ہے

اس باب میں چھتیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں)۔ ابو محمد عبد الغنی بن سعید الحافظ نے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری کی حدیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب

بندہ الْحَمْدُ لِلّٰہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے سچ کہا، بے شک حمد میرے لئے ہے (1)۔ مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے خوش ہوتا ہے جو لقمہ کھائے تو اس پر اللہ کی حمد کرے، کوئی مشروب پیے تو اس پر اس کی حمد کرے (2)۔ حضرت حسن نے فرمایا: کوئی نعمت نہیں ہے مگر اس پر اللہ کی حمد ہو تو وہ اس نعمت سے افضل ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر کوئی نعمت فرمائی پھر اس نے الْحَمْدُ لِلّٰہ کہا تو اللہ تعالیٰ نے اس موجود نعمت سے افضل نعمت اسے عطا فرمائی (3)۔ ”نوادیر الاصول“ میں حضرت انس بن مالک سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر یہ دنیا تمام کی تمام میرے امتی کے ایک ہاتھ میں ہو پھر وہ الْحَمْدُ لِلّٰہ کہے تو الْحَمْدُ لِلّٰہ ان تمام نعمتوں سے افضل ہوگی۔ ابو عبد اللہ نے فرمایا: ہمارے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اسے دعا عطا فرمائی پھر اس کے بعد یہ حمد کا کلمہ عطا فرمایا حتیٰ کہ اس نے یہ کلمہ بولا تو یہ کلمہ ساری دنیا سے افضل تھا کیونکہ دنیا فانی ہے اور یہ کلمہ باقی ہے، یہ باقیات صالحات سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْبَقِيَّةُ الصَّالِحَةُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا ﴿١٠﴾ (الکہف) بعض روایات میں ہے جو اس نے دیا وہ اس سے زیادہ ہے جو اس نے لیا۔ پس یہ کلمہ بندے کی طرف سے ہے اور دنیا وہ اللہ تعالیٰ سے لینے والا ہے، پس یہ تدبیر میں ہے۔ اسی طرح کلام میں جاری ہوگا کہ یہ کلمہ بندے کی طرف سے ہے اور دنیا اللہ کی طرف سے ہے اور اصل میں دونوں اللہ کی طرف سے ہیں، دنیا بھی اس کی طرف سے ہے اور الْحَمْدُ کا کلمہ بھی اللہ کی طرف سے ہے، دنیا اس نے بندے کو عطا فرمائی اور اسے غنی کر دیا پھر اسے کلمہ (الْحَمْدُ لِلّٰہ) عطا فرمایا اور آخرت میں اس کے ساتھ اسے شرف عطا فرمائے گا۔

ابن ماجہ نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بیان کیا کہ ایک بندے نے کہا: یا رب لك الحمد كما ينبغي لجلال وجهك وعظيم سلطانك۔ فرشتوں کے لئے اس کا لکھنا مشکل ہو گیا وہ نہیں جانتے تھے کہ اسے کیسے لکھیں۔ پس وہ دونوں آسمان کی طرف بلند ہوئے اور عرض کی: یا رب! تیرے بندے نے ایسی کلام کی ہے ہم نہیں جانتے کہ اسے کیسے لکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا، حالانکہ وہ زیادہ جانتا ہے جو اس کے بندے نے کہا تھا۔ میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتوں نے کہا: یا رب! اس نے کہا: یا رب لك الحمد كما ينبغي لجلال وجهك وعظيم سلطانك۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اسی طرح لکھ دو جس طرح میرے بندے نے کہا حتیٰ کہ وہ مجھ سے آکر ملے گا تو میں خود اسے اس کی جزا دوں گا (4)۔

اہل لغت نے کہا: اعضل الامر، جب معاملہ سخت ہو جائے اور بند ہو جائے۔ العضلات سختیوں کو کہتے ہیں۔ عضلت المرأة والشاة کہا جاتا ہے جب بچہ جنم دے اور اس کا مخرج تنگ ہو یہ ضاد کی شد کے ساتھ ہے۔ اسی بنا پر فرمایا: اعضلت الملكين يا عضلت الملكين، یعنی اس امر نے فرشتوں کو مشکل میں ڈال دیا۔ واللہ اعلم

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، باب فضل لا الہ الا اللہ، صفحہ 277، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب استحباب حمد اللہ تعالیٰ بعد الاکل والشرب، صفحہ 352، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ ایضاً

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، باب فضل العامدین، صفحہ 278، جلد 1 (وزارت تعلیم)



مسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: طہارت ایمان کا نصف ہے۔  
الْحَمْدُ لِلّٰہِ میزان کو بھر دیتا ہے، سبحان اللہ اور الْحَمْدُ لِلّٰہِ آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے اسے بھر دیتے ہیں (1)۔ آگے حدیث ذکر کی۔

**مسئلہ نمبر 2:** علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ بندے کا قول الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِينَ افضل ہے یا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ افضل ہے۔ علماء کے ایک گروہ نے کہا: الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِينَ افضل ہے کیونکہ اس کے ضمن میں توحید لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ بھی موجود ہے اور بندے کے اس قول میں توحید اور حمد ہے اور لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ میں صرف توحید ہے۔ اس کی بنیاد پر مخلوق سے جنگ کی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال (جنگ) کروں حتیٰ کہ وہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہہ دیں (2)۔ اس قول کو ابن عطیہ نے اختیار کیا ہے۔ فرمایا: اس پر قول فیصل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: افضل ذکر وہ ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے نبیوں نے کہا: لا اله الا الله وحده لا شریک له۔ (3)

**مسئلہ نمبر 3:** مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ساری نعمتوں پر محمود ہے اور اس کے انعاموں میں سے ایک ایمان بھی ہے میں یہ دلیل ہے کہ ایمان اس کا فعل اور اس کی تخلیق ہے اس پر دلیل رَبِّ الْعَالَمِينَ اس کا ارشاد ہے۔ العالمون تمام مخلوق کو کہتے ہیں اور اس مخلوق میں سے ایمان بھی ہے۔ اس طرح نہیں ہے جس طرح قدر یہ کہتے ہیں کہ ایمان ان کی تخلیق ہے جیسا کہ تفصیل آگے آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 4:** عرب کلام میں الْحَمْدُ کا معنی ثنا کامل ہے۔ الف اور لام محامد کی جنس کے استغراق کے لئے ہے۔ پس اللہ تعالیٰ ہی ہر حمد کا مستحق ہے کیونکہ اس کے اسماء خوبصورت ہیں اور صفات بلند ہیں۔ شاعر کے قول میں الْحَمْدُ کے لفظ کی جمع، جمع قلت کے وزن پر بنائی گئی ہے۔

و ابدج محمود الشناء خصته بأفضل اقوال و أفضل احدى

اس کی محمود تعریف روشن ہے۔ میں نے اسے اپنے افضل اقوال اور افضل حمد کے ساتھ خاص کیا ہے۔

حمد، مذمت کی نقیض ہے۔ تو کہتا ہے: حمدت الرجل احداً فهو حميدٌ و محمود۔ التحيد، حمد سے زیادہ بلیغ ہے اور حمد، شکر سے اعم ہے۔ الحمد اس ذات کو کہتے ہیں جس کے خصائل حمیدہ کثیر ہوں۔  
شاعر نے کہا:

الى الساجد القرم الجواد الحمد

اس مصرعہ میں شاعر نے الحمد اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء، صفحہ 118، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب فان تابوا واقاموا الصلاۃ والزکوۃ، صفحہ 8، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب القرآن باب ما جاء فی الدعاء، صفحہ 198، جلد 1 (وزارت تعلیم)

اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ نام رکھا گیا ہے۔  
شاعر نے کہا:

فشق له من اسمه ليجله فذو العرش محمود و هذا محمد

اس نے اپنے نام سے اس کا نام مشتق کیا تاکہ اسے عظمت دے، وہ صاحب عرش محمود ہے یہ محمد ہے۔

المحمدة، یہ المذمة کے خلاف ہے۔ احمد الرجل، اس کا مطلب ہے اس کا امر حمد کا باعث ہوا۔ احمدتہ کا مطلب ہے: میں نے اسے محمود پایا۔ تو کہتا ہے: میں فلاں جگہ آیا اور میں نے اسے محمود اور موافق پایا۔ یہ اس وقت کہے گا جب تو اس میں رہائش یا اس کی چراگاہ پر راضی ہو۔ رجل جمدۃ، ہمزہ کی مثل اس شخص کو کہتے ہیں جو اشیاء کی حمد زیادہ کرتا ہو اور ان چیزوں کی صفات بیان کرنے میں مبالغہ کرتا ہو۔ حمدة النار۔ آگ کے بھڑکنے کی آواز کو کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5:** ابو جعفر طبری اور ابو العباس مبرد کا خیال ہے کہ حمد اور شکر ایک معنی میں ہے اور یہ پسندیدہ نہیں

ہے (1)۔ ابو عبد الرحمن سلمی نے اپنی کتاب ”الحقائق“ میں امام جعفر صادق اور ابن عطا سے یہی روایت کیا ہے۔ ابن عطائے

کہا: اس کا معنی اللہ کا شکر ہے کیونکہ اس کی ہمیں تعلیم بھی اس کا احسان ہے حتیٰ کہ ہم نے اس کی تعریف کی۔ طبری نے ان کے

ہم معنی ہونے پر تیرے اس قول کی صحت سے استدلال کیا ہے الحمد للہ شکر (2) ابن عطیہ نے کہا کہ یہ حقیقت میں دلیل

ہے ان کے مسلک کے خلاف پر کیونکہ تیرے قول شکر، تو اس کو حمد کے ساتھ خاص کیا کیونکہ یہ بھی نعمتوں میں سے ایک نعمت

ہے (3)۔ بعض علماء نے فرمایا: شکر، حمد سے زیادہ عام ہے کیونکہ شکر، زبان، جوارح اور دل سے ہوتا ہے اور حمد صرف زبان

سے ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: حمد اعم ہے کیونکہ اس میں شکر اور مدح کا معنی ہے اور یہ شکر سے اعم ہے کیونکہ حمد شکر کی جگہ رکھی

جاتی ہے اور شکر کو حمد کی جگہ نہیں رکھا جاتا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ہر شکر گزار کا کلمہ ہے۔ آدم علیہ السلام کو جب چھینک آئی تو کہا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ اور اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو فرمایا: فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ نَجَّسْنَا مِنْ الْقَوْرِ الظَّالِمِیْنَ (المومنون)

(تو کہنا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے ہمیں نجات دی ظالم قوم (کے جو رستم) سے) اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلٰی الْکِبَرِ اِسْمٰیئِلَ وَ اِسْحٰقَ (ابراہیم: 39)

داؤد اور سلیمان علیہما السلام نے کہا: وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِہِ الْمُؤْمِنِیْنَ (النمل) اور

انہوں نے کہا: سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے برگزیدہ کیا ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر) اور نبی کریم ﷺ

کو فرمایا: وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا (الاسراء: 111) (اور آپ فرمائیے سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں

جس نے نہیں بنایا) (کسی کو اپنا) بیٹا)۔

اہل جنت نے کہا: الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ (فاطر: 34) (کہیں گے سب ستائشیں اللہ کے لئے ہیں جس نے دور کر دیا ہم سے غم) (واندودہ) (وَ اِخْرَجُوْهُمْ اَنْ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (یونس: 10) (اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں) میں کہتا ہوں: حمد، ممدوح کی اس کی صفات کی وجہ سے کسی سابقہ احسان کے بغیر تعریف کرنا ہے اور شکر، مشکور کی احسان کی وجہ سے تعریف کرنا ہے۔ اس تعریف کی بنا پر ہمارے علماء نے فرمایا: الْحَمْدُ شکر ہے اعم ہے کیونکہ حمد ثنا، تحمید اور شکر پر واقع ہوتی ہے اور جزا مخصوص ہے کہ یہ اس کا بدل ہوتی ہے جو تیرے ساتھ نیکی کرتا ہے۔ پس الْحَمْدُ اس آیت میں اعم ہے کیونکہ یہ شکر پر زائد ہے اور یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ حمد بمعنی رضا بھی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: بلوتہ فحصدتہ یعنی میں خوش ہوا۔ اس سے یہ ارشاد بھی ہے: مَقَامًا مَّخْصُودًا ⑤ (الاسراء)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: احد الیکم غسل الاحلیل میں تمہارے لئے شرمگاہ کا دھونا پسند کرتا ہوں۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے الْحَمْدُ لِلّٰهِ کی تفسیر میں مروی ہے۔ جس نے اس کی صفات کی وجہ سے اس کی حمد کی جس طرح اس نے خود اپنی توصیف کی ہے اس نے حمد کی، کیونکہ حمد حا، میم اور دال سے مرکب ہے، حا، وحدانیت سے ہے، میم، الملک سے ہے اور دال دیومیت (ہیشگی) سے ہے جس نے وحدانیت، دیومیت اور الملک کو پہچان لیا اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد کو پہچان لیا۔ یہی الْحَمْدُ لِلّٰهِ کی حقیقت ہے۔ شقیق بن ابراہیم نے الْحَمْدُ کی تفسیر میں فرمایا: یہ تین وجوہ پر منحصر ہے: (۱) جب اللہ تعالیٰ تجھے کوئی چیز عطا فرمائے تو تو جان لے جس نے تجھے یہ چیز عطا کی۔ (۲) جو اس نے تجھے عطا فرمایا تو اس پر خوش ہو، (۳) جب تک تیرے جسم میں قوت ہے تو اس کی نافرمانی نہ کر۔ یہ حمد کی شرائط ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ سبحانہ نے اپنی حمد خود فرمائی اور اپنی کتاب کا آغاز اپنی حمد سے کیا اور دوسروں کو اپنی حمد تعریف کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ اپنی تعریف کرنے سے اپنی کتاب اور اپنے نبی کی زبان کے ذریعے منع فرمایا۔ فرمایا: فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ ⑥ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ اَتَى ⑦ (النجم) (پس اپنی خود ستائی نہ کیا کرو وہ خوب جانتا ہے کہ کون پرہیزگار ہے) اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مدح کرنے والوں کے مونہوں میں مٹی ڈالو (۱)۔ اس حدیث کو حضرت مقداد نے روایت کیا اس کے متعلق سورہ النساء میں ان شاء اللہ وضاحت آئے گی۔

پس الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ⑧ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے خود اپنی حمد کی ہے اس سے پہلے کہ عالمین میں سے کوئی میری حمد کرتا اور میں نے اپنی حمد ازل میں بغیر کسی علت کے کی تھی اور مخلوق جو میری حمد کرتی ہے وہ علل کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: مخلوق جس کو کمال کلی عطا نہیں کیا گیا اس کا اپنی تعریف کرنا اچھا نہیں تاکہ وہ اپنے لئے منافع حاصل کرے اور اپنے آپ سے نقصان دور کرے۔

بعض علماء نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اس کے بندے اس کی حمد سے عاجز ہیں تو اس نے اپنی حمد ازل میں خود ہی کی۔ پس اس کے بندوں نے انتہائی کوشش کی اس کی حمد سے عاجزی کا اظہار ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ سید

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد والرقائق، باب من المدح اذا کان فیہ افراط، صفحہ 414، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)



المسلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے عجز کا اظہار فرمایا۔ ارشاد فرمایا: لَا أُحْصِي ثَنَاءَ عَلَيْكَ۔ (1) (میں تیری ثناء نہیں کر سکتا)۔  
اور یہ شعر پڑھو:

اذا نحن اثینا عليك بصلح فانك كما تشفى وفوق الذی تشفى  
اور جب ہم کسی کرم کی وجہ سے تیری ثنا کرتے ہیں تو تو واقعی اسی طرح ہے جس طرح ہم تیری تعریف کرتے ہیں اور تو اس سے بلند مرتبہ ہے جو ہم تیری تعریف کرتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: اس نے ازل میں اپنی حمد خود فرمائی جب اس نے اپنے بندوں پر نعمتوں کی کثرت کو دیکھا اور ان کے شکر کے قیام کے عجز کو دیکھا تو اس نے اپنی تعریف کی اور ان کی طرف سے اپنی تعریف خود کی تاکہ ان کے سامنے نعمت مزید خوشگوار ہو جائے اس حیثیت سے کہ اس نے لوگوں سے احسان کا بوجھ بھی ساقط کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 7:** ساتوں قراء اور جمہور لوگوں کا الحمد کی دال پر رفع پڑھنے میں اجماع ہے۔ سفیان بن عیینہ، رؤبہ بن عجاج سے الحمد میں دال کا نصب مروی ہے اور یہ فعل کے اظہار کی تقدیر پر ہے (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَفْعُ کے ساتھ مبتدا اور خبر میں اور خبر کی سبیل فائدہ دینا ہوتا ہے۔ اس میں کیا فائدہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ سیبویہ نے کہا: جب کوئی شخص الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَفْعُ کے ساتھ پڑھتا ہے تو اس میں اسی قسم کا معنی ہوتا ہے جو تیرے اس قول میں ہے: حمدت اللہ حمداً مگر وہ جو الْحَمْدُ کو رفع دے رہا ہے وہ یہ خبر دے رہا ہے کہ اس کی طرف سے حمد اور تمام مخلوق کی طرف سے حمد اللہ کے لئے ہے اور وہ جو الْحَمْدُ کو نصب دیتا ہے وہ خبر دیتا ہے کہ تنہا اس کی طرف سے حمد اللہ کے لئے ہے۔ سیبویہ کے علاوہ علماء نے فرمایا: وہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کے عفو، مغفرت، اس کی تعظیم اور اس کی بزرگی بیان کرنے کے لئے کرتا ہے اور خبر کے معنی کے خلاف ہے، اس میں سوال کا معنی ہے۔ حدیث میں ہے: "جس کو میرے ذکر کرنے مجھ سے سوال کرنے سے مشغول رکھا میں اس سے افضل دوں گا جو میں سوال کرنے والوں کو دوں گا" (3)۔

بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا اپنی حمد و ثناء کرنا بندوں کو یہ سکھانے کے لئے ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ تم الْحَمْدُ لِلّٰهِ کہو۔ طبری نے کہا: الْحَمْدُ لِلّٰهِ تعریف ہے اس کے ساتھ اس نے اپنی ہی تعریف کی اور اس کے ضمن میں اپنے بندوں کو حکم فرمایا کہ تم بھی اس کی تعریف کرو۔ گویا یوں فرمایا: الْحَمْدُ لِلّٰهِ کہو۔ اسی طرح ہوگا کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہو۔ عرب اس طرح حذف کرتے ہیں کہ ظاہر کلام اس حذف پر دلالت کرتا ہے۔ جس طرح شاعر نے کہا:

و اعلم انني ساكون رمسا اذا سار النواجم لايسير  
فقال السائلون لمن حفرتم فقال القائلون لهم وزير

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب ما يقال في الركوع والسجود، صفحہ 192، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ المحرر الوجيز، صفحہ 66، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

3۔ سنن ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ما جاء كيف كانت قراءة النبي ﷺ، صفحہ 116، جلد 2 (وزارت تعلیم)

میں جانتا ہوں کہ ہوجاؤں گا جب تیز رفتار اونٹنیاں نہیں چلیں گی۔ سوال کرنے والوں نے کہا کس کے لئے قبر کھود رہے ہو جواب دینے والوں نے کہا ان کا وزیر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس کے لئے قبر کھودی جا رہی ہے وہ وزیر ہے۔ پس اس کو حذف کر دیا گیا کیونکہ ظاہر کلام اس پر دلالت کر رہا تھا اور یہ عرب کلام میں کثیر ہے (1) ابن ابی عبیدہ سے الحدیث اللہ دال اور لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھنا مروی ہے اس بنا پر کہ دوسرا حرف اعراب میں پہلے حرف کے تابع کر دیا گیا ہو۔ بنا کا لفظ متجانس ہو جائے اور لفظوں میں تجانس کا طلب کرنا عربوں کے کلام میں بہت زیادہ ہے۔ مثلاً أَجْوَنُ، وَهُوَ مِنْهُدٌ مِنَ الْجَبَلِ (☆)۔ اس میں دال اور جیم کو ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ شاعر کا قول ہے: اضرب السَّامِينَ امْكْ هَابِلْ۔ اس مصرعہ میں ہمزہ کے ضمہ کی وجہ سے نون ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اہل مکہ کی قراءت میں مُرْدَفِينَ رَاءِ پر ضمہ پڑھا گیا ہے میم کی اتباع کرتے ہوئے۔ اسی طرح مُقْتَدِينَ میں میم کی اتباع میں قاف پر ضمہ پڑھا گیا ہے۔ اس طرح عرب کہتے ہیں: لَا مَكَ لِعَنَى لَامِ کی اتباع میں ہمزہ کو کسرہ دیتے ہیں۔ نعمان بن بشیر کے لئے یہ کہا:

وَيْلَ امْهَا فِي هَوَاءِ الْجَوِ طَالِبَةِ      وَلَا كَهَذَا الَّذِي فِي الْأَرْضِ مَطْلُوبِ

اس شعر میں ہمزہ کو کسرہ دیا ہے۔

اصل میں دیل، لامھا تھا پہلے لام کو حذف کیا گیا اب کسرہ کے بعد ہمزہ پر ضمہ بھاری تھا پھر اس ہمزہ کو لام کی طرف منتقل کر دیا پھر لام کو میم کی طرح حرکت دی گئی۔ حسن بن ابی الحسن اور زید بن علی سے مروی ہے، اَلْحَنْدِ يَثُو۔ یعنی دال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے پہلے حرف کو حرکت میں دوسرے حرف کی اتباع کرائی گئی (2)۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا مالک ہے، ہر چیز جس کا وہ مالک ہے وہ اس کا رب ہے۔ پس الرب کا مطلب المالك ہے اور ”الصَّحاح“ میں الرب، اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ اس لئے بغیر نسبت و اضافت کے کسی دوسرے کے لئے نہیں بولا جائے گا، لوگ زمانہ جاہلیت میں مالک کے لئے رب کا لفظ بولتے تھے۔ حارث بن حلزہ نے کہا:

وَهُوَ الرَّبُّ وَالشَّهِيدُ عَلَى يَوْمِ      الْحَيَارِينَ      وَالْبَلَاءِ      بَلَاءِ

اس میں رب، مالک کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

رب کا معنی سردار بھی ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں استعمال ہوا ہے: اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ (یوسف: 42) (یعنی اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا) اور حدیث میں ہے ان تلد الامۃ ربّتها۔ (3) یعنی لونڈی اپنے سردار کو جنم دے گی۔ اور ہم نے اپنی کتاب ”الہدٰی“ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور الرب سے مراد مصلح، مدبر، جابر اور قائم

2۔ ایضاً صفحہ 133، جلد 1

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 66-67، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

3۔ صحیح بخاری، کتاب العتق، باب المدلولہ، صفحہ 344، جلد 1 (وزارت تعلیم)

(نگران) بھی ہوتا ہے۔ الہروی وغیرہ نے کہا: جو شخص کسی شے کی اصلاح کرتا ہے اور اسے مکمل کرتا ہے اس کے لئے بولا جاتا ہے: رَبِّهِ يَرْبِيهِ فَهُوَ رَبُّ لَهْ وَرَابُّ۔ اسی وجہ سے علماء کو ربانیون کہا جاتا ہے جو کتب کے مطالعہ میں رہتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے هَلْ لَكَ مِنْ نِعْمَةٍ تَرْبِيهَا عَلَيْه (1) یعنی کیا تیرے پاس کوئی نعمت ہے جس کی تو دیکھ بھال کرتا ہے اور اس کی اصلاح کرتا ہے اور الرب بمعنی معبود بھی استعمال ہوتا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

اَرْبُّ يَبُولُ الشَّعْبَانَ بِرَاسِهِ      لَقَدْ ذَلَّ مِنَ بَالَتِ عَلَيْهِ الشَّعَالِبُ (2)

اور یہ لفظ زیادتی اور کثرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ رباہ و ربیہ و ربثہ (یعنی اس سے اسے زیادہ کر دیا) یہ معنی نحاس نے بیان کیا ہے۔ ”الصحاح“ میں ہے: رَبُّ فُلَانٍ وَلَدُهُ يَرْبِيهِ رَبًّا، وَرَبِيَّةٌ وَتَرْبِيَةٌ كَمَا مَعْنَى هُوَ رَبَّاهُ أَوْ السَّرِيوبُ كَمَا مَطْلَبُ هُوَ السَّرِيْبُ۔ جس میں کثرت کی گئی ہو۔

**مسئلہ نمبر 9:** بعض علماء نے فرمایا: یہ اسم (رب) اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے کیونکہ اسے پکارنے والے کثرت سے پکارتے ہیں اور قرآن حکیم میں غور کرنے سے بھی یہی پتہ چلتا ہے جیسا کہ سورہ آل عمران، سورہ ابراہیم وغیرہ میں ہے۔ یہ وصف رب اور مربوب کے درمیان تعلق کا شعور دیتا ہے ساتھ ساتھ اپنے ضمن میں ہر حال میں مہربانی، رحمت اور مخلوق کے اس کی طرف محتاج ہونے کا تصور بھی رکھتا ہے۔

اس کے اشتقاق کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: یہ التریبۃ سے مشتق ہے۔ اللہ تعالیٰ مخلوق کا مدبر اور مربی ہے۔ اسی مفہوم میں ہے: رَبَّآ يَرْبِيْكُمْ اَلَّتِيْ فِيْ حُجُوْبٍ كُمْ (النساء: 23) (تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں پرورش پا رہی ہیں) بیوی کی بیٹی کو ربیہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا خاوند اس کی تربیت کرتا ہے۔ پس اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا مدبر اور مربی ہے تو یہ فعل کی صفت ہوگی اور اس بنا پر کہ الرب بمعنی مالک اور سردار ہے تو یہ ذات کی صفت ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 10:** جب رب پر الف لام داخل ہو تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ خاص ہوتا ہے کیونکہ الف لام عہد کے لئے ہو گا۔ اور اگر ہم الف لام حذف کر دیں تو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان مشترک ہوگا۔ کہا جاتا ہے: اللہ رب العباد، (اللہ بندوں کا رب ہے) زید رب الدار (زید گھر کا مالک ہے) اللہ تعالیٰ رب الارباب ہے، وہ مالک و مملوک کا مالک ہے وہ ہر ایک کا خالق و رازق ہے۔ اس کے علاوہ ہر رب، غیر خالق اور غیر رازق ہے ہر مملوک، مالک بنایا گیا ہے اس کے بعد کہ وہ مالک نہ تھا اور اس سے ملکیت چھینی بھی جائے گی، مخلوق میں سے مالک کسی چیز کا مالک ہوتا ہے اور کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ان معانی کے مخالف ہے اور خالق و مخلوق کی صفت کے درمیان یہی فرق ہے۔

**مسئلہ نمبر 11:** الْعَلَمِيْنَ، اِلٰ تَاوِيْلٍ كَالْعَلَمِيْنَ کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ قتادہ نے کہا: العالمون، جمع ہے عالم کی اور عالم سے مراد اللہ کے سوا ہر موجود ہے اور لفظاً اس کا واحد نہیں ہے جیسے رھط اور قوم کا لفظاً واحد نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر زمانہ کے لوگ عالم ہیں۔ یہ حسین بن فضل کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَتَاَتُوْنَ الدُّكْرَانَ مِنْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البدو الصلۃ باب فی العبدی اللہ، صفحہ 317، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ البحر الوجیز، صفحہ 67، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)



الْعَلَمِينَ ﴿٥﴾ (الشعراء) اس آیت میں الْعَلَمِينَ سے مراد لوگ ہیں۔ حجاج نے کہا:

فخندف هامة هذا العالم

جریر بن خطمی نے کہا:

تنصف البیة و هو سام و یضحی العالمون له عیالا

اس شعر میں العالمون لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: عالمون سے مراد جن وانس ہیں اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لِيَكُونَ لِلْعَلَمِينَ نَذِيرًا ○ (الفرقان) (اور آپ ﷺ جن وانس کو ڈرانے والے تھے نہ کہ چوپاؤں کو)۔ فرما: اور ابو عبیدہ نے کہا: العالم سے مراد ہر ذی عقل ہے اور یہ چار امم ہیں: انسان، جن، ملائکہ اور شیاطین۔ بہائم، چوپاؤں کو عالم میں نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ جمع ذی عقل کی جمع ہوتی ہے۔

اعشی نے کہا:

ما ان سعت بشلہم فی العالمینا میں نے ذی عقل لوگوں میں ان کی مثل نہیں سنا۔

زید بن اسلم نے کہا: اس سے مراد وہ ہیں جن کو رزق دیا جاتا ہے۔ اسی قسم کا قول ابو عمرو بن علاء کا ہے کہ وہ روحانیون ہیں۔ حضرت ابن عباس کے قول کا معنی بھی یہی ہے، ہر ذی روح جو زمین کی سطح پر چلا۔ وہب بن منبہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں دنیا ان عالموں میں سے ایک عالم ہے۔ حضرت ابوسعید خدری نے کہا: اللہ تعالیٰ کے چالیس ہزار عالم ہیں۔ دنیا، مشرق سے مغرب تک ایک عالم ہے۔ مقاتل نے کہا: عالمون، اسی ہزار عالم ہے، چالیس ہزار عالم خشکی میں ہیں اور چالیس ہزار عالم سمندر میں ہیں۔ ربیع بن انس نے ابو العالیہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جن ایک عالم ہے، انسان ایک عالم ہے، اس کے علاوہ زمین کے چار کونے ہیں، ہر کونے میں پندرہ ہزار عالم ہیں اللہ تعالیٰ نے سب کو اپنی عبادت کے لئے تخلیق فرمایا ہے۔ میں کہتا ہوں: ان اقوال میں سے صحیح ترین قول یہ ہے کہ عالم ہر مخلوق و موجود کو شامل ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَلَمِينَ ﴿٥٠﴾ قَالَ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (الشعراء)

اور یہ علم اور علامۃ سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ اپنے موجب پر دلالت کرتا ہے اسی طرح حجاج نے کہا: عالم سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں پیدا فرمایا۔ خلیل نے کہا: العلم، العلمۃ اور المعلم ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز پر دلالت کرے۔ عالم چونکہ دال ہے اپنے خالق و مدبر پر اور یہ واضح ہے۔

ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت جنید کے سامنے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تو حضرت جنید نے اسے کہا: اسے مکمل کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تم کہو: رَبُّ الْعَلَمِينَ اس شخص نے پوچھا: العالمین کون ہیں حتیٰ کہ تم اللہ کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہو؟ حضرت جنید نے فرمایا: ابے بھائی! تم کہو کیونکہ حادث کا جب قدیم کے ساتھ ملا کر ذکر کیا جاتا ہے تو حادث کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔

**مسئلہ نمبر 12:** رب میں رفع اور نصب جائز ہے۔ نصب، مدح کی بنا پر اور رفع قطع (1) کی بنا پر۔ یعنی عبارت یوں ہوگی: ہو رب العالمین۔

**مسئلہ نمبر 13:** الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ○ - رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے اپنی صفت بیان کرنے کے بعد اپنی تعریف ان کلمات سے فرمائی کہ وہ بہت مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے، چونکہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی صفت سے متصف ہونے میں ترہیب تھی اس لئے ساتھ ہی الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ذکر فرمادیا کیوں کہ اس میں ترغیب تھی تاکہ اس کا خوف اور اس کی طرف رغبت دونوں کو اپنی صفات میں جمع کر لے، پس یہ اس کی طاعت اور نافرمانی سے اجتناب میں مددگار ثابت ہوں گی جیسا کہ ارشاد فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الْعٰبِدُوْنِ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنْ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۝ (الحجر) (بتا دوسرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا از حد رحم کرنے والا ہوں) (اور یہ بھی بتا دو کہ) میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے)۔

اور فرمایا: غَافِرُ الدُّثُوْبِ وَقَابِلُ التَّوْبِ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذِي الْكُوْلِ (غافر: 3) (گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول فرمانے والا، سخت سزا دینے والا، فضل و کرم فرمانے والا ہے)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر مومن وہ سزا جان لے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو کوئی جنت کا طمع بھی نہ کرے اور اگر کافر اللہ کی رحمت جان لے تو کوئی جنت سے مایوس نہ ہو“ (2)۔

الرَّحْمٰنُ اور الرَّحِيْمُ دونوں اسموں کے معانی گزر چکے ہیں پس دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 14:** مَلِكٌ يُّوْمَ الدِّيْنِ ○ - محمد بن اسمعیل نے مالک کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں چار لغات ہیں: 1۔ مالک، 2۔ ملک، 3۔ مَلِكٌ... مَلِكٌ سے مخففہ..... 4۔ ملیک۔

شاعر نے کہا:

و ايام لنا غي طوال عصينا الملك فيها ان ندينا

ہمارے لئے روشن لمبے دن تھے۔ ان میں ہم نے بادشاہ کی اطاعت کرنے میں نافرمانی کی۔

اور ایک شاعر نے کہا:

فاقنح بها قسم المليك فاننا قسم الخلاق بيننا علامها

میں اس پر قناعت کرتا ہوں جو مالک نے تقسیم فرمایا اور طباع کو ان کے جاننے والے نے ہمارے درمیان تقسیم فرمایا۔

اس شعر میں الخلاق سے مراد وہ فطرت ہے جس پر انسان پیدا کیا جاتا ہے، نافع سے ملک میں کسرہ کا اشباع مروی ہے۔ اس شخص کی لغت پر جو حرکات میں اشباع کرتا ہے مَلِكٌ پڑھا گیا ہے۔ یہ بھی عربوں کی ایک لغت ہے، جس کو مہدوی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

1۔ صفت کو موصوف سے جدا کر دیا جائے تو پھر اس سے پہلے مبتدا محذوف ہوتا ہے۔

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب سعة رحمة الله تعالى، صفحہ 356، جلد 2 (تدوینی کتب خانہ)

**مسئلہ نمبر 15:** علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ مِلک زیادہ بلیغ ہے یا مالک۔ دونوں قراءتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ امام ترمذی نے ان کو ذکر فرمایا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مِلک، یہ مالک سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ ہر ملک مالک ہوتا ہے اور ہر مالک، ملک نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مِلک کا امر، ہر مالک میں اس کی مِلک میں نافذ ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ مالک، ملک کی تدبیر سے ہی تصرف کرتا ہے۔ ابوعبیدہ اور میرد نے یہ کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مالک زیادہ بلیغ ہے کیونکہ وہ انسانوں اور دوسری چیزوں کا مالک ہوتا ہے۔ پس مالک از روئے تصرف کے زیادہ بلیغ اور عظیم ہے کیونکہ شرع کے قوانین کا اجراء اس کی طرف سے ہوتا ہے پھر مالک کے پاس تملک میں زیادتی ہوتی ہے۔

ابوعلی نے کہا: ابوبکر بن سراج نے ان لوگوں سے حکایت کیا ہے جنہوں نے ملک کی قراءت کو پسند کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رَبِّ الْعَالَمِينَ کے ساتھ اپنی توصیف فرمائی کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ اس لئے مالک کی قراءت کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ اس طرح تو تکرار ہو جائے گا۔

ابوعلی نے کہا: اس میں کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ قرآن حکیم میں اس انداز میں بہت سی اشیاء آئی ہیں عام مقدم ہوتا ہے پھر خاص کا ذکر ہوتا ہے جیسے هو الله الخالق البارئ المصور۔ خالق عام ہے۔ پھر المصور کا ذکر فرمایا کیونکہ اس میں صنعت اور حکمت کے وجود پر تنبیہ ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْآخِرَةُ هُمْ يُوْقِنُونَ ① (البقرہ) یہ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (البقرہ: 3) کے بعد ذکر فرمایا، جبکہ غیب کا کلمہ آخرت اور دوسری غائب چیزوں کو شامل تھا لیکن آخرت کی عظمت اور اس کے اعتقاد کے وجوب پر تنبیہ اور منکرین کفار کا رد کرنے کے لئے پھر ذکر فرمایا۔ اسی طرح فرمایا: الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ہے۔ پہلے الرَّحْمٰن ذکر فرمایا جو عام ہے اس کے بعد الرَّحِيْمُ ذکر فرمایا کیونکہ وہ کان بالمومنين رحيم کے ارشاد میں مومنین کے ساتھ اس کی رحمت تخصیص ہے (1)۔

ابو حاتم نے کہا: مالک۔ خالق کی مدح میں ملک سے زیادہ بلیغ ہے اور ملک مخلوق کی مدح میں مالک سے زیادہ بلیغ ہے۔ ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ مخلوق میں سے مالک کبھی مِلک نہیں ہوتا جبکہ اللہ تعالیٰ مالک ہوگا تو ملک بھی ہوگا۔ یہ قول قاضی ابوبکر بن عربی نے پسند کیا ہے اور انہوں نے اس کی تین وجوہ ذکر فرمائی ہیں:

۱- تو مالک کو خاص اور عام کی طرف مضاف کرتا ہے اور تو کہتا ہے: مالک الدار والارض والشوب (گھر کا مالک، زمین کا مالک، کپڑے کا مالک) جس طرح تو کہتا ہے: مالک الملوك (بادشاہوں کا مالک)۔

۲- مالک کا اطلاق زیادہ اور تھوڑی ملکیت والے پر ہوتا ہے۔ جب تو ان دونوں قولوں میں غور و فکر کرے گا تو دونوں کو ایک پائے گا۔

۳- تو کہتا ہے: مالک الملک، جبکہ تو مِلک الملک نہیں کہتا۔

ابن حصار نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ مالک سے مراد ملک پر دلالت ہے اور یہ مُلک کو مستفہم نہیں ہے اور مِلک دونوں



امروں کو شامل ہے پس مبالغہ کی وجہ سے اولیٰ ہے۔ اور یہ کمال کو بھی متضمن ہے اسی وجہ سے وہ دوسرے تمام بادشاہوں پر ملک کا مستحق ہے۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملاحظہ نہیں فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ** (البقرہ: 247) (بے شک اللہ تعالیٰ نے جن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے اسے کشادگی علم میں اور جسم میں) اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: الامامة في قریش (1)۔ اور قریش، عرب قبائل میں سے افضل ہیں اور عرب، عجم سے افضل و اشرف ہیں۔ اقتدار اور اختیار کو متضمن ہیں۔ یہ الملک میں ضروری امر ہے اگر وہ قادر، مختار نہ ہو اور اس کا حکم اور امر نافذ نہ ہو تو دشمن اس پر جبر کرے گا اور غیر اس پر غالب آجائے گا اور اس کی رعیت ذلیل و رسوا ہو جائے گی اور یہ سخت پکڑ، امر، نبی، وعدہ، وعید کو بھی متضمن ہے۔

آپ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول ملاحظہ نہیں فرمایا: **مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدُودَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ** لَأَعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا (النمل) اس کے علاوہ بھی امور عجیبہ عمدہ معانی ملک میں پائے جاتے ہیں جو مالک میں نہیں پائے جاتے۔ میں کہتا ہوں: بعض علماء نے حجت پکڑی ہے کہ ملک زیادہ بلوغ ہے کیونکہ مالک میں ایک حرف زائد ہے اور اس کے قاری (پڑھنے والے) کے لئے دس نیکیاں زیادہ ہوں، جبکہ ملک کے پڑھنے والے کے لئے دس نیکیاں کم ہوں گی۔ میں کہتا ہوں: یہ صیغہ کے اعتبار سے ہے نہ کہ معنی کے اعتبار سے ہے۔ ملک کے ساتھ قرأت ثابت ہے، اور ملک میں جو معنی پایا جاتا ہے وہ مالک میں نہیں ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

**مسئلہ نمبر 16:** کسی کا یہ نام نہیں رکھا جائے گا اور اس کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے گا۔ بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ زمین کو اپنے قبضہ میں لے گا اور آسمان کو اپنے دائیں ہاتھ میں لپیٹ لے گا۔ پھر فرمائے گا: میں الملک ہوں، زمین کے بادشاہ کہاں گئے؟ (2) اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ترین نام اس شخص کا ہے جسے مالک الاملاک کہا جائے (3)۔ مسلم میں یہ زائد ہے۔ ”اللہ کے سوا کوئی مالک نہ ہوگا“ (4)۔ سفیان نے کہا: ملک الاملاک شاہان شاہ کی مثل ہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: میں نے ابو عمرو شیبانی سے انصع کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اس کا معنی اوضاع (گھٹیا) ہے۔ ان سے ہی مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ کی بارگاہ میں باعث ناراضگی اور برا ترین شخص وہ ہوگا جسے ملک الاملاک کہا جاتا ہوگا، اللہ کے سوا کوئی ملک نہیں ہے (5)۔ ابن حصار نے کہا اسی طرح **مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ** اور **مَالِكِ الْمَلِكِ** ہے اس میں تو اختلاف نہیں ہونا چاہئے کہ تمام مخلوق پر یہ نام

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 497، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب قریش، حدیث نمبر 3239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوب، باب صفۃ القيامة والجنة والنار، صفحہ 370، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 916، جلد 2 (د۔ ت)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب ابغض الاسماء الى الله تبارک و تعالیٰ، حدیث 5737، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح مسلم، کتاب الاداب، باب استحباب تغيير الاسم القبيح، صفحہ 208، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

5۔ ایضاً

رکھنا حرام کیا گیا ہے جس طرح ملک الاملاک حرام کیا گیا ہے، اور رہا مالک اور ملک بطور وصف ذکر کرنا۔

**مسئلہ نمبر 17:** ان کے ساتھ اس کو موصوف کرنا جائز ہوگا جو ان دونوں مفہوموں کے ساتھ متصف ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ان الله قد بعث لكم طالوت ملكا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمادیا ہے تمہارے لئے طالوت کو اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ناس من امتی عرض علی غزاة فی سبیل اللہ یرکبون ثبج هذا البحر ملوکاً علی الأسرة او مثل الملوک علی الأسرة (1)۔ یعنی میری امت کے کچھ لوگ مجھ پر پیش کئے گئے جو اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے تھے وہ اس سمندر کے وسط پر سوار تھے (جیسے) تختوں پر بادشاہ ہوتے ہیں یا فرمایا بادشاہوں کی مثل تختوں پر سوار تھے۔

**مسئلہ نمبر 18:** اگر کوئی یہ کہے کہ مَلِکَ یَوْمَ الدِّینِ ○ کیسے فرمایا جبکہ یَوْمَ الدِّینِ ابھی آیا ہی نہیں اور اپنی ایسی چیز کی ملکیت سے صفت بیان کرنا کیسے صحیح ہے جس کو اس نے ابھی پایا ہی نہیں؟ اسے کہا جائے گا کہ مالک اسم فاعل کا صیغہ ہے ملک یملک سے۔ اور اسم فاعل عرب کلام میں اپنے مابعد کی طرف مضاف کیا جاتا ہے اور وہ فعل مستقبل کے معنی میں ہوتا ہے اور عربوں کے نزدیک یہ کلام معقول، پختہ اور صحیح ہوتی ہے۔ جیسے تو کہتا ہے: هذا ضارب زید غدا یعنی وہ کل زید کو مارے گا اور اسی طرح هذا حاجب بیت اللہ فی العامل المقبل، اس کا مطلب ہے آئندہ سال وہ حج کرے گا۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ فعل اس کی طرح منسوب کیا گیا ہے حالانکہ اس نے ابھی وہ فعل کیا نہیں اور اس سے مراد استقبال لیا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَلِکَ یَوْمَ الدِّینِ ○ استقبال کی تاویل پر ہے یعنی وہ مالک ہوگا روز جزا کا یا وہ روز جزا کا مالک ہوگا جب وہ دن آئے گا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مالک کی تاویل قدرت کی طرف لوٹنے والی ہوگی یعنی وہ روز جزا میں قادر ہوگا، یا یہ معنی کہ وہ روز جزا پر قادر ہوگا اور اسے پیدا کرنے پر قادر ہے کیونکہ کسی شے کا مالک اسی شے میں تصرف کرنے والا اور اس پر قادر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا مالک ہے اور اپنے ارادہ کے مطابق انہیں پھیرنے والا ہے اس پر اسے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ پہلی وجہ عربی زبان کے اصول سے زیادہ مس کرنے والی ہے اور اس کے ضابطہ کے مطابق زیادہ جاری ہونے والی ہے۔ یہ ابو القاسم الزجاجی کا قول ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر کہا جائے کہ یہاں یَوْمَ الدِّینِ کی ملکیت کی تخصیص کیوں کی گئی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اور دوسری چیزوں کا بھی مالک ہوگا۔ جواباً کہا جائے گا کہ لوگ دنیا میں ملک میں جھگڑا کرنے والے تھے جیسے فرعون، نمرود وغیرہما، لیکن اس دن اس کی ملک میں کوئی اس سے جھگڑا کرنے والا نہ ہوگا تمام لوگ سر جھکائے ہوئے ہوں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ (غافر: 16) آج بادشاہی کس کے لئے ہے، ساری مخلوق جواب دے گی: لله الواحد القہار اللہ واحد قہار کی ہے۔ اسی لئے فرمایا: مَلِکَ یَوْمَ الدِّینِ یعنی اس دن میں نہ کوئی مالک ہوگا، نہ قاضی ہوگا، نہ کوئی جزا دینے والا ہوگا سوائے اللہ تعالیٰ کے، پاک ہے وہ ذات کوئی معبود برحق نہیں سوائے اس کے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 391، جلد 1 (و۔ت)۔ ایضاً، کتاب الجہاد، باب الدعاء بالجہاد والشہادة للرجال والنساء، حدیث 2580، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 19:** اگر اللہ تعالیٰ کی صفت بیان کی جائے کہ وہ ملک ہے تو یہ اس کی ذات کی صفات سے ہوگی۔ اگر مالک کے ساتھ صفت بیان کی جائے تو یہ اس کے فعل کی صفات سے ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 20:** الیوم سے مراد طلوع فجر سے لے کر غروب شمس تک وقت ہے پھر یہ عاریۃ یا مجازاً قیامت کے آغاز سے لے کر جنتوں کے جنت میں داخل ہونے تک اور دوزخیوں کے دوزخ میں داخل ہونے تک کے لئے بولا جاتا ہے کبھی الیوم پورے دن کی ایک گھڑی کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** (المائدہ: 3) یوم کی جمع ایام ہے۔ اصل میں ایام تھا پھر ادغام کیا گیا بعض اوقات شدت کو الیوم سے تعبیر کرنے میں کہا جاتا ہے۔ یوم ایوم، جس طرح کہا جاتا ہے: **لَيْلَةُ لَيْلَاءٍ**۔ راجز نے کہا:

نعم اخوالہیجاء فی الیوم الیسی۔

ہیجا کا بھائی شدت میں کتنا اچھا تھا۔

اس مصرعہ میں الیسی میں قلب کیا گیا ہے۔ واؤ کو مؤخر کیا گیا ہے اور میم کو مقدم کیا گیا ہے۔ پھر واؤ کو یاء سے قلب کیا گیا ہے کیونکہ وہ طرف کلمہ میں ہے جیسا کہ عرب دلو کی جمع میں ادل کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 21:** الدین۔ اس کا مطلب اعمال پر جزا اور اعمال کا حساب ہے۔ حضرات ابن مسعود، ابن عباس، ابن جریج اور قتادہ وغیرہم نے اسی طرح فرمایا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے بھی یہ مروی ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: **يَوْمَ مَوْذِيٰ يُؤْتِيهِمُ اللّٰهُ وَيُنْفِخُ النَّفْسِ** (النور: 25) اس آیت میں دین سے مراد حساب ہے۔ فرمایا: **الْيَوْمَ تُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ** (غافر: 17) اور فرمایا **الْيَوْمَ تُجْزٰی مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (الجماعہ: 28) اور فرمایا **إِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ** (صافات) یعنی ہم جزا دیے جائیں گے اور ہمارا محاسبہ کیا جائے گا۔ لبید نے کہا:

حصادک یوماً ما زہمت و انما یدان الفقی یوماً کما ہودائن

تو اس دن وہی کاٹے گا جو تو نے بویا، نوجوان کو جزا دی جائے گی جو وہ کرنے والا ہوگا۔

ایک اور نے کہا:

اذا ما رمونا رمینا ہم و دنا ہم مثل ما یقرضونا

جب انہوں نے ہم پر تیر پھینکے تو ہم نے ان پر تیر پھینکے اور ہم نے انہیں جزا دی جیسا انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔

ایک اور نے کہا:

واعلم یقیناً ان ملکک زائل و اعلم بان کما تدین تدان

جان لو کہ تمہاری حکومت ختم ہونے والی ہے اور جان لو جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

اہل لغت نے بیان کیا ہے: **وَتَتَّ بِفَعْلِهِ دِيْنًا** (مصدر) دال کے فتح اور کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے: میں نے

اسے جزا دی، اسی سے ہے: الدیان۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے یعنی جزا دینے والا ہے۔ حدیث شریف میں ہے: **الکیس من**



دان نفسہ (1) (عقلندہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے) بعض نے فرمایا: الدین سے مراد فیصلہ ہے۔ یہ بھی حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ اسی معنی میں طرفہ کا قول ہے۔

لعبرك ما كانت حولة معبد  
عنى جدھا حرباً لدينك من مضر  
تیری عمر کی قسم معبد کے اونٹ کنویں پر تیرے فیصلہ کی وجہ سے مضر قبیلہ سے جنگ کرنے کے لئے نہیں تھے۔  
دین کے یہ تینوں معانی قریب قریب ہیں۔ الدین کا معنی طاعت بھی ہے۔ اس معنی میں عمرو بن کلثوم کا شعر ہے۔  
و ایام لنا غر طوال  
عصینا الملك فیھا ان ندینا  
ہمارے لئے روشن لمبے دن تھے۔ ہم نے ان میں بادشاہ کی اطاعت کرنے میں نافرمانی کی۔  
پس یہ دین کا لفظ مشترک ہے۔

**مسئلہ نمبر 22:** ثعلب نے کہا: دان الرجل کا مطلب ہے اس نے اطاعت کی اور دان کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس نے نافرمانی کی۔ دان اس وقت بھی بولا جاتا ہے جب کوئی عزت پائے اور اس وقت بھی بولا جاتا ہے جب کوئی ذلیل ہو اور اس وقت بھی بولا جاتا ہے جب کوئی غالب آئے۔ پس یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ الدین کا اطلاق عادت اور شان پر بھی ہوتا ہے جیسا ہے کہ ایک شاعر نے کہا:

كدینك من ام الحویث قبلھا  
جیسا کہ تیری شان ام الحویث کی طرف سے ہے۔  
مقرب نے اپنی اونٹنی کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

تقول اذا درأت لها وفینی  
اهذا دینہ ابدأ و دینی  
وہ اونٹنی کہتی ہے جب میں اس کا تنگ زمین پر بچھا دیتا ہوں یہ اس کی اور میری ہمیشہ کی عادت ہے۔  
الدین بادشاہ کی عملداری کو بھی کہتے ہیں۔ زہیر نے کہا:

لئن حللت بجو فی بنی اسد  
فی دین عمرو وحالت بیننا فذاك  
اگر تو بنی اسد میں تجو کے مقام پر عمرو کی عملداری میں اترے گا تو ہمارے درمیان فداک کا مقام حائل ہوگا۔  
شاعر نے عمرو کی طاعت کی جگہ مراد لی ہے۔

الدین سے مراد بیماری بھی ہے۔ لہجانی سے مروی ہے، اس نے کہا:

یا دین قلبك من سلسی وقد دینا  
اس میں دین بمعنی مرض استعمال کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 23:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِيَّاكَ نَعْبُدُ۔ اللہ تعالیٰ نے غائب کے صیغوں سے خطاب کے صیغہ کی طرف رجوع فرمایا کلام میں رنگینی پیدا کرنے کے لئے کیونکہ سورت کے آغاز سے لے کر یہاں تک اللہ تعالیٰ کے متعلق خبر تھی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الذہد، باب ذکر الموت والاستعداد له، حدیث نمبر 4249، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس کی شائقی۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَسَقُومُهُمْ شَرَابًا طَهُورًا** (الدھر: 22) (اور پلائے گا انہیں ان کا پروردگار نہایت پاکیزہ شراب)۔ پھر آگے مخاطب کی ضمیر ذکر فرمائی۔ فرمایا: **إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً** (الدھر: 22) (انہیں کہا جائے گا) یہ تمہارا صلہ ہے۔ اسی طرح اس کا الٹ بھی قرآن میں ہے یعنی پہلے مخاطب کے صیغے اور پھر غائب کے صیغے ذکر فرمائے۔  
**حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَجَرَّتْ بِوَهُمْ (یونس: 22)** (یہاں تک کہ جب تم سوار ہوتے ہو کشتیوں میں اور وہ چلنے لگتی ہیں مسافروں کو لے کر) اس کا ذکر آگے آئے گا۔

نعبد کا معنی ہے نطیع (ہم عبادت کرتے ہیں) عبادت کا مطلب طاعت اور عجز و انکساری کا اظہار کرنا ہے۔ طریق معبد اس راستہ کو کہتے ہیں جو چلنے والوں کے لئے آسان بنایا گیا ہو۔ یہ ہر وی کا قول ہے۔ بندہ جب یہ کہتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے عبادت کو ثابت کرتا ہے، کیونکہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں وغیرہ کو بھی پوجتے ہیں۔ **وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ** ○۔ یعنی ہم تجھ سے ہی مدد، تائید اور توفیق طلب کرتے ہیں۔ سلمیٰ نے ”حقائق“ میں کہا: میں نے محمد بن عبد اللہ بن شاذان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ابو حفص فرغانی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس نے **إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ** کا اقرار کیا وہ جبر و قدر سے بری ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 24:** اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہاں مفعول کو فعل پر مقدم کیوں کیا گیا ہے تو جواباً کہا جائے گا اہتمام کی خاطر مقدم کیا گیا ہے۔ عربوں کی یہ عادت ہے کہ اہم کو مقدم کر دیتے ہیں۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک بدو نے دوسرے بدو کو گالی دی تو جس کو گالی دی گئی اس نے گالی دینے والے سے اعراض کیا۔ گالی دینے والے نے اس سے کہا: **إِيَّاكَ اعْنِي** (میری مراد تو ہی ہے)۔ اسے دوسرے نے کہا: **وَعَنْكَ اعْزُضْ** میں تجھ ہی سے اعراض کرتا ہوں۔ دونوں نے اہم کو مقدم کیا۔ اسی طرح بندے اور عبادت کو معبود پر مقدم نہیں کیا گیا۔ پس **نَعْبُدُكَ** اور **نَسْتَعِينُكَ**، **وَلَا نَعْبُدُ إِلَّاكَ** و **نَسْتَعِينُ إِلَّاكَ** جائز نہیں کہ فعل کو مفعول کی ضمیر پر مقدم کیا جائے، لفظ قرآن کی اتباع کی جائے گی۔ عجاج نے کہا:

إِيَّاكَ اَدْعُو فَتَقْبَلْ مَلَقِي وَ اَغْفِرْ خَطَايَايَ وَ كَثْرَ دَرَقِي

میں تجھ سے ہی التجا کرتا ہوں، میری عاجزی کو قبول فرما، میرے گناہ معاف فرما اور میرے مال سے زیادہ فرما۔ اور شمر بھی مروی ہے۔ رہا شاعر کا قول:

إِيَّاكَ حَتَّىٰ بَلَغْتَ إِيَّاكَ اَوْثَنِي تِيرِي طَرَفَ حَلِي حَتَّىٰ كَتَمْتِ تِيرِي بِسَاسٍ خَفِيٍّ

یہ شاذ ہے اس پر قیاس نہیں کیا جائے گا۔ ورف راء کے کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد دراء، اَلْمُ اور واء کے فتح کے ساتھ ہو تو مراد مال ہوگا۔ آیت میں ضمیر کو مکرر فرمایا تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور غیر سے مدد چاہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 25:** جمہور قراء اور علماء ایان کو یاء کی شد کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ عمرو بن قاعد نے ایان کو ہمزہ کے کسرہ اور یاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے یاء کی تضعیف کو ناپسند کیا ہے کیونکہ یاء کی تشدید اور اس کے ماقبل کسرہ ہونے کی وجہ سے ثقل لازم آتا ہے یہ قرأت مرغوب نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں معنی ہوگا ہم تیرے سورج یا تیری روشنی کی عبادت

کرتے ہیں ایات الشمس کا مطلب ہے سورج کی روشنی اور کبھی ہمزہ کو فتح بھی دیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

سَقَتْهُ اَيَاةُ الشَّمْسِ اِلَّا لثَاتِهِ اُسِفْتُ فَلَمْ تَكْدُمْ عَلَيْهِ بَاشِدُ

اس میں شاعر نے ایات کو ہمزہ کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔

اگر تو ہا کو گرا دے تو مد کے ساتھ پڑھے گا۔ کہا جاتا ہے: الایات للشمس کالہالۃ للقمیر یعنی چاند کے ارد گرد کے دائرہ کو ہالہ کہتے ہیں اور سورج کے دائرہ کو ایات کہتے ہیں۔ فضل رقاشی نے ایان ہمزہ کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مشہور لغت ہے (1)۔ ابوسوار غنوی نے دونوں جگہ پر ہیٹاک پڑھا ہے۔ یہ بھی ایک لغت ہے۔ شاعر نے کہا:

فَهِيَ اَكْ وَالْاَمْرَ الَّذِي اِنْ تَوَسَّعَتْ مَوَارِدُهُ ضَاقَتْ عَلَيْكَ مَصَادِرُهُ

یہاں ہیٹاک، ایان کے لئے استعمال ہوا ہے۔

**مسئلہ نمبر 26: وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ○**

جملہ کا جملہ پر عطف ہے۔ یحییٰ بن وثاب اور اعمش نے نستعین کو نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ تمیم، اسد، قیس اور ربیعہ قبائل کی لغت ہے تاکہ مد و طلب کرنے والے پر دلالت کرے، نون کو کسرہ دیا جاتا ہے جس طرح الف وصل کو کسرہ دیا جاتا ہے۔ نستعین اصل میں نَسْتَعِينُ تھا واو کی حرکت عین کو دی تو واو یاء بن گئی۔ اس کا مصدر استعانۃ ہے اصل میں استعوان تھا۔ واو کی حرکت عین کو دی گئی تو واو الف سے بدل گئی، دوسا کن جمع نہیں ہوتے، تو دوسرے الف کو حذف کیا گیا کیونکہ یہ زائدہ تھا۔ بعض نے فرمایا: پہلے الف کو حذف کیا گیا کیونکہ دوسرا معنی کے لئے ہے اور ہاء عوضاً لازم ہے (یعنی واو کو حذف کیا تو اس کے عوض آخر میں ہاء لازم ہے۔)

**مسئلہ نمبر 27: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ○**

اهدنا، مربوب کی، رب کی بارگاہ میں دعا اور رغبت ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہماری سیدھے راستہ پر رہنمائی فرما اور سیدھے راستہ کی طرف ہمیں ہدایت عطا فرما اور ہمیں اپنی ہدایت کا وہ راستہ دکھا جو تیری عبادت اور تیرے قرب تک پہنچنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے دعا اور تمام چیزوں کو اس سورت میں رکھ دیا۔ اس کے نصف میں ثنا ہے اور نصف میں حاجات کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ اس سورت میں جو دعا ہے وہ اس دعا سے افضل ہے جو دعا کرنے والا خود مانگتا ہے کیونکہ یہ وہ کلام ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔ اور حدیث میں ہے: ”اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا سے زیادہ معزز کوئی چیز نہیں“ (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہمیں اپنے فرائض کی ادائیگی میں سنن کے استعمال کی رہنمائی فرما۔ بعض نے فرمایا: اس میں اصل امالہ (مائل کرنا) ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّا هَدَيْنَاكَ اِلَيْكَ (اعراف: 156) یعنی ہدنا کا معنی ہم مائل ہوئے ہے۔ نبی کریم ﷺ مرض کی حالت میں مسجد میں تشریف لائے۔ اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 72، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب ما جاء فی فضل الدعاء، صفحہ 173، جلد 2 (وزارت تعلیم)



راوی نے کہا: یتھاذی بین اثنین یعنی دو آدمیوں کے درمیان جھک کر چل رہے تھے۔ یہاں یتھاذی بمعنی یتھایل ہے۔ اس سے الھدیۃ ہے جو ایک شخص کی ملکیت سے دوسرے کی ملکیت کی طرف جاتا ہے۔ اسی سے الھدی اس حیوان کو کہا جاتا ہے جو حرم کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہمارے دلوں کو حق کی طرف مائل کر دے۔ فضیل بن عیاض نے کہا: الصراط المستقیم سے مراد دلائل کا راستہ ہے، یہ خاص ہے، جبکہ عمومی معنی بہتر ہے۔

محمد بن حنفیہ نے اٰھدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کے بارے میں فرمایا: یہ اللہ کا دین ہے، اللہ تعالیٰ اس کے علاوہ بندوں سے کوئی دین قبول نہیں کرتا۔

عاصم احوال نے ابوالعالیہ سے روایت کیا ہے، الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سے مراد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد کے دو خلفاء ہیں۔ عاصم نے کہا: میں نے حسن سے کہا: ابوالعالیہ کہتے ہیں: الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دونوں ساتھی (ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما) ہیں۔ حسن نے کہا: انہوں نے سچ کہا اور ٹھیک کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 28:** الصِّرَاطَ کا اصل معنی عرب کلام میں الطریق ہے۔ عامر بن طفیل نے کہا:

شحنًا ارضهم بالخیل حتی ترکنا ہم اذل من الصراط  
شاعر نے الصِّرَاطَ کو راستہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔  
جریر نے کہا:

امیر المومنین علی صراط اذا اعوج الموارد مستقیم  
اس شعر میں صراط بمعنی راستہ استعمال کیا ہے یعنی امیر المومنین سیدھے راستہ پر ہے۔

ایک اور نے کہا:

فصد عن نهج الصراط الواضح اس نے واضح راستہ سے روکا۔

نقاش نے بیان کیا کہ رومی لغت میں الصِّرَاطَ کا مطلب الطریق (راستہ) ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف قول ہے (1)۔ السراط (سین کے ساتھ) بھی پڑھا گیا اور اس صورت میں یہ الاستراط سے مشتق ہوگا جس کا معنی الابتلا (نکلتا) ہے۔ گویا راستہ چلنے والوں کو نگل لیتا ہے۔ راء اور صاد کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور سین اصل ہے۔ سلمہ نے فراء سے روایت کیا ہے، فراء نے کہا: الزراط۔ خالص زاء کے ساتھ عذرہ، کلب اور بنی القین کی لغت ہے۔ فرمایا: لوگ کہتے ہیں: اصدق جب انہوں نے اصدق کہنا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں: الازد اور الاسد ولسق بہ اور لصق بہ۔ الصراط، دوسرے مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے، کیونکہ ہدایت کا فعل حرف جر کے واسطے سے دوسرے مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاهْدُوهُمْ إِلَى صِرَاطِ الْجَحِيمِ ① (الصافات) اور ہدایت کا فعل بغیر حرف جر کے بھی دوسرے مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ الْمُسْتَقِیْمَ، الصِّرَاطَ کی صفت ہے۔ مستقیم اسے کہتے ہیں جس میں کوئی ٹیڑھا پن

اور انحراف (موڑ) نہ ہو۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اَنْ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ** (انعام: 153) مستقیم اصل میں مستقیم تھا۔ واو کی حرکت نقل کر کے ماقبل قاف کو دی گئی پھر واو ماقبل کسرہ کی وجہ سے یاء سے بدل گئی۔

### مسئلہ نمبر 29: صِرَاطُ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

صِرَاطُ، الصِّرَاطُ سے بدل کل ہے جیسے تو کہتا ہے: جاء بی زید ابوک۔ اس آیت کا مطلب ہے ہمیں ہمیشہ اپنی ہدایت عطا فرما کیونکہ انسان راستہ کی طرف رہنمائی کیا جاتا ہے پھر وہ اس سے بھٹک بھی جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس صراط سے مراد اور صراط ہے۔ اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کا فہم۔ یہ جعفر بن محمد کا قول ہے اور قرآن کی لغت الذین ہی ہے حالت رفعی، نصبی اور جری میں اور ہذیل حالت رفعی میں الذنون کہتے ہیں۔ عربوں میں کچھ کہتے ہیں الذنوا اور بعض الذی کہتے ہیں (خواہ حالت رفعی ہو نصبی ہو یا جری ہو) جیسا کہ آگے آئے گا۔

عَلَيْهِمْ میں دس لغات ہیں: عَلَيْهِمْ ہاء کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ ہا کے کسرہ اور میم کے سکون کے ساتھ۔۔۔ علیہمی ہا اور میم کے کسرہ اور کسرہ کے بعد یاء کے الحاق کے ساتھ۔ علیہم۔ ہا کے کسرہ، میم کے ضمہ اور ضمہ کے بعد واو کی زیادتی کے ساتھ۔ علیہم ہاء اور میم کے ضمہ اور میم کے بعد واو کے ادخال کے ساتھ علیہم ہا اور میم کے ضمہ کے ساتھ واو کی زیادتی کے بغیر۔ یہ چھ وجوہ قراءۃ سے منقول اور چار وجوہ عربوں سے منقول ہیں قراء کی طرف سے بیان نہیں کی گئیں۔ علیہہ ہا کے ضمہ، میم کے کسرہ اور میم کے بعد یاء کے ادخال کے ساتھ یہ حضرت حسن بصری نے عربوں سے حکایت کیا ہے۔ علیہم ہا کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ یاء کی زیادتی کے بغیر۔ علیہم ہا کے کسرہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ واو کے الحاق کے بغیر۔ علیہم ہاء اور میم کے کسرہ کے ساتھ میم کے بعد یاء کے بغیر۔ یہ تمام صورتیں درست ہیں۔ یہ ابن انباری کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 30: حضرت عمر بن خطاب بن زبیر رضی اللہ عنہما نے صراط من انعمت علیہم پڑھا ہے۔ علماء مفسرین کا اختلاف ہے کہ کون لوگ مراد ہیں جن پر انعام کیا گیا ہے۔ جمہور مفسرین نے فرمایا: اس سے مراد انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ **وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ اَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ اُولَٰئِكَ رَفِيقًا** (النساء) (اور جو اطاعت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اور (اس کے) رسول کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی)۔

ہدایت تقاضا کرتی ہے کہ یہ لوگ صراط مستقیم پر ہیں اور آیت الحمد میں ہی مطلوب ہے اور تمام اقوال کا مرجع یہی ہے۔ اس لئے متعدد اقوال ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ فاللہ المستعان

مسئلہ نمبر 31: اس آیت میں قدر یہ اور معتزلہ، امامیہ کا رد ہے کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ انسان سے فعل کے صدور میں انسان کا ارادہ ہی کافی ہے خواہ وہ فعل طاعت ہو یا معصیت ہو کیونکہ ان کے نزدیک انسان اپنے افعال کا خالق ہے وہ اپنے افعال کے صدور میں اپنے رب کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی تکذیب فرمائی کیونکہ انہوں نے

صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا اس کی بارگاہ سے سوال کیا۔ اگر معاملہ ان کے سپرد ہوتا اور ان کے اختیار میں ہوتا ان کے رب کے پاس یہ معاملہ نہ ہوتا تو وہ ہدایت کا اس سے سوال نہ کرتے اور ہر نماز میں بار بار سوال نہ کرتے۔ اسی طرح مصیبت کے دور کرنے میں اس کی طرف ان کا تضرع و زاری کرنا بھی ہے۔

اور مکروہ سے مراد ہدایت کے مخالف چیز ہے۔ جب انہوں نے کہا: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ لَعَنَّاكَ الْكَاذِبُ ۝ جس طرح انہوں نے اس سے اپنی ہدایت کا سوال کیا اس طرح انہوں نے سوال کیا کہ انہیں گمراہ نہ کر۔ اسی طرح وہ دعائیں لگتے ہیں اور کہتے ہیں: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا (آل عمران: 8)

### مسئلہ نمبر 32: غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝

علماء کا اختلاف ہے کہ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ اور الضَّالِّينَ سے کون مراد ہیں۔ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہود ہیں اور الضَّالِّينَ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ عدی بن حاتم کی حدیث میں اور ان کے اسلام کے قصہ میں نبی کریم ﷺ سے یہ بات تفسیر سے ذکر کی گئی ہے (1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں اور ترمذی نے اپنی جامع میں نقل کیا ہے۔ اس تفسیر کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے جو یہود کے بارے میں وارد ہے وَبَاغُوتٍ غَضَبٍ مِنَ اللَّهِ (البقرہ: 61) (وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے۔) اور فرمایا غَضَبَ اللَّهِ عَلَيْهِمْ (الفتح: 6) (ان پر اللہ کا غضب ہوا) اور نصاریٰ کے بارے فرمایا: قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ ۝ (المائدہ: 77) (جو گمراہ ہو چکی ہے پہلے سے) (قوم) اور گمراہ کر چکے ہیں بہت سے لوگوں کو اور بھٹک چکے ہیں راہ راست سے) بعض علماء فرماتے ہیں: الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ سے مراد مشرکین ہیں اور الضَّالِّينَ سے مراد منافقین ہیں۔ اور بعض نے فرمایا: الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے نماز میں اس سورت کی فرضیت کو ساقط کیا۔ الضَّالِّينَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس کی قراءت کی برکت سے گمراہ ہوئے۔ یہ قول سلمیٰ نے اپنی ”حقائق“ میں اور ماوردی نے اپنی تفسیر میں حکایت کیا ہے لیکن اس قول کی کوئی حقیقت نہیں۔ ماوردی نے کہا: یہ قول مردود ہے کیونکہ جب اس کے مفہوم میں اخبار آپس میں معارض ہیں اور آثار مقابل ہیں اور اختلاف پھیلا ہوا ہے تو اس پر اس حکم کا اطلاق جائز نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے بدعتوں کی اتباع کی اور اس وجہ سے ان پر غضب ہوا۔ الضَّالِّينَ سے سنن ہدیٰ سے گمراہ لوگ مراد ہیں۔

میں کہتا ہوں: یہ قول حسن ہے اور نبی کریم ﷺ کی تفسیر اولیٰ، اعلیٰ اور احسن ہے۔ عَلَيْهِمْ حالت رفیعی میں ہے کیونکہ اس کا معنی ان پر غضب کیا گیا۔ لغت میں غضب کا معنی شدت ہے۔ رَجُلٌ غَضُوبٌ، یعنی سخت خلق والا شخص۔ الغضوب برے سانپ کو کہتے ہیں اس کی شدت کی وجہ سے۔ الغضبۃ اس ڈھال کو کہتے ہیں جو اونٹ کی جلد سے بنائی جاتی ہے اور تہہ در تہہ ہوتی ہے۔ اس کی شدت کی وجہ سے اسے الغضبۃ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت میں غضب کا معنی سزا کا ارادہ کرنا ہے۔ یہ ذات کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کی ذات کی صفات سے ہے۔ یا اس کا معنی نفس عقوبت (سزا) ہے۔ اسی مفہوم میں حدیث



استعمال ہوئی ہے: ان الصدقة لتطفئ غضب الرب۔ (1) (صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو بجھا دیتا ہے یہ فعل کی صفت ہے)۔

**مسئلہ نمبر 33: وَلَا الضَّالِّينَ** ○ عرب کلام میں الضلال کا مطلب حق کے راستہ اور قصد کے طریقوں سے دور چلا جانا ہے۔ اس معنی میں یہ مثال ہے: ضل اللبن في الماء، یعنی دودھ پانی میں غائب ہو گیا۔ عَرَاذًا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ (السجدة: 10)۔ یعنی ہم موت کے ساتھ غائب ہو جائیں گے اور مٹی بن جائیں گے۔ شاعر نے کہا:

ألم تسأل فتخبرك الديار عن الحى المضلل اين ساروا

کیا تو نے نہیں پوچھا کہ تجھے گھر خبر دیتے غائب قبیلہ کے متعلق کہ وہ کہاں چلے گئے۔

الضلالة اس ملائم پتھر کو کہتے ہیں پانی جسے وادی میں گھماتا رہتا ہے۔ اسی طرح الغضبہ پہاڑ میں اس چٹان کو کہتے ہیں جس کا رنگ پہاڑ سے مختلف ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

او غضبة في غضبة ما امنعا

**مسئلہ نمبر 34:** حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابی بن کعب نے غیر المغضوب علیہم وغیر الضالین پڑھا ہے (2) اور ان دونوں حضرات سے راء پر نصب اور جر کا پڑھنا مروی ہے اور جر یہ الذین سے علیہم میں ہا اور میم سے بدل ہونے کی وجہ سے ہوگا یا الذین کی صفت کی حیثیت سے ہوگا۔ الذین معرفہ ہے اور اصول یہ ہے کہ معرفہ کی صفت نکرہ سے اور نکرہ کی صفت معرفہ سے نہیں لگائی جاتی۔ لیکن یہاں الذین سے متعین افراد نہیں ہیں بلکہ یہ عام ہے۔ پس یہ تیرے اس قول کے قائم مقام ہوگا: ان لا مربشك فاکرمہ۔ یا غیث کا لفظ معرفہ بن گیا ہے کیونکہ یہ دو چیزوں کے درمیان ہے جن کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ (یعنی دو ضدوں کے درمیان ہے اور دو ضدوں کے درمیان غیث آئے تو معرفہ بن جاتا ہے) جیسے الحی غیر البیت، الساکن غیر المتحرک، القائم غیر القاعد۔

یہ ترکیب کے دو قول ہیں: پہلا فارسی کا ہے اور دوسرا زمخشری کا ہے اور غیث پر نصب کی دو وجہیں ہیں: یا تو الذین سے حال ہے یا علیہم میں ہا اور میم سے حال ہے۔ گویا تو نے کہا: انعت علیہم لا مغضوباً علیہم یا استثناء کی بنا پر نصب ہے۔ گویا تو کہتا ہے: الا المغضوب علیہم۔ اور اعنی فعل کے ساتھ نصب جائز ہے۔ خلیل سے یہ حکایت کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 35: وَلَا الضَّالِّينَ** میں جو لا ہے اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ زائدہ ہے۔ یہ طبری کا قول ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: صَامِعَكَ إِلَّا تَسْجُدَ (اعراف: 12) (اس میں لازائدہ ہے)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ تاکید کے لئے داخل کیا گیا ہے تاکہ وہم نہ ہو کہ الضالین، الذین پر معطوف ہے۔ یہ قول مکی اور مہدوی نے حکایت کیا ہے۔ کوفیوں نے کہا لا بمعنی غیث ہے۔ یہ عمر اور ابی کی قراءت ہے جیسا کہ نیچے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 36: الضَّالِّينَ** اصل میں الضالین تھا۔ پہلے لام کی حرکت حذف کی گئی پھر لام کو لام میں ادغام کیا گیا۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الزکوٰۃ، باب ما جاء فضل الصدقة، صفحہ 184، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ البحر الوجیز، صفحہ 78، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

پس دوساکن جمع ہوئے۔ مدۃ الالف اور لام مدغمہ۔ ایوب سختیانی نے ولا الضالین غیر ممدودہ ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا اس نے التقاء ساکنین سے دوری اختیار کی۔ یہ بھی ایک لغت ہے۔ ابوزید نے حکایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عمرو بن عبید کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے: فیومئذ لا یسأل عن ذنبہ انش ولا جان۔ میں نے گمان کیا انہوں نے غلطی کی ہے حتیٰ کہ میں نے عربوں سے سنا: دابة و شابة۔ ابوالفتح نے کہا: اس لغت پر بہت سے اقوال ہیں۔

اذا ما العوالی بالعبیط احمارت۔ (1)

جب تازہ خون کی وجہ سے نیزوں کی انیاں سرخ ہو گئیں۔

سورہ الحمد کی تفسیر ہم مکمل کرتے ہیں۔ سب تعریفیں اور احسان اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔

## سورۃ البقرہ

﴿ابانتھا ۲۸۶﴾ ﴿۲ سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَكِّيَّةٌ ۸۷﴾ ﴿مَرَكُوعَاتُهَا ۴۰﴾

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے کرم سے شروع کرتا ہوں جس کے سوا کوئی پالنے والا نہیں۔

اس سورت کے آغاز میں اس سورت کا نزول، اس کی فضیلت اور جو کچھ اس کے متعلق مروی ہے اسے ذکر کیا جائے گا۔ ہم ہر سورت کے آغاز میں اسی طرح عمل کریں گے اگر ہمیں اس کے نزول اور فضیلت کے متعلق کچھ میسر آیا۔

سورۃ بقرہ مدنی سورت ہے۔ یہ مختلف اوقات میں نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ پہلی سورت ہے جو مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ سوائے اس ایک ارشاد کے: **وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ** کیونکہ یہ آخری آیت ہے جو آسمان سے نازل ہوئی اور یہ دسویں ذی الحجہ کے دن حجۃ الوداع میں منیٰ میں نازل ہوئی اور سود والی آیات بھی قرآن حکیم میں سے آخر میں نازل ہونے والی ہیں۔ اس سورت کی فضیلت عظیم ہے اور اس کا ثواب جسیم ہے، اسے فسطاط القرآن کہا جاتا ہے۔ یہ خالد بن معدان کا قول ہے۔ اس نام کی وجہ اس کی عظمت، بہا، کثرت احکام اور مواعظ کی وجہ سے ہے۔ حضرت عمر نے اس سورت کو اس کی فقاہت اور معانی کے ساتھ بارہ سال میں پڑھا اور ان کے بیٹے حضرت عبداللہ نے اس سورت کو آٹھ سال میں پڑھا جیسا کہ گزر چکا ہے۔ ابن عربی نے کہا: میں نے اپنے بعض شیوخ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس سورت میں ہزار امر، ہزار نہی، ہزار حکم اور ہزار خبر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا، وہ کثیر تعداد میں تھا اور ایک نوجوان کو ان کا امیر بنایا گیا تھا کیونکہ اس کو سورۃ بقرہ یاد تھی۔ اسے فرمایا: ”تو جاتو ان کا امیر ہے“ (۱)۔ اس حدیث کو ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے، مسلم نے حضرت ابو امامہ بابلی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ سورۃ بقرہ پڑھو کیونکہ اس کا حاصل کرنا برکت ہے اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے اور بطلہ اس کے (پڑھنے کی) طاقت نہیں رکھتے (۲)۔ اس حدیث کے ایک راوی معاویہ نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ البطلہ سے مراد جادوگر ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے گھروں کو مقابر نہ بناؤ۔ شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۃ بقرہ پڑھی جاتی ہے (۳)۔

دارمی نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، کوئی گھر ایسا نہیں جس میں سورۃ بقرہ پڑھی جائے مگر اس سے شیطان نکل جاتا ہے جبکہ اس کی ہوا آواز بلند خارج ہو رہی ہوتی ہے (۴)۔ اور فرمایا: ہر چیز کی کوہان ہوتی ہے اور قرآن کی کوہان سورۃ بقرہ ہے۔ ہر چیز کا لباب ہوتا ہے اور قرآن کا لباب مفصل ہے۔ ابو محمد دارمی نے کہا: اللباب سے مراد خالص ہے۔ صحیح البیہقی میں ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ما جاء فی فضل سورۃ البقرہ، آیتہ الکرمی، صفحہ 111، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل قرأت القرآن وسورۃ البقرہ، صفحہ 270، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ ایضاً، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استجاب صلاۃ النافلۃ فی بیتہ وجوازہا فی المسجد، صفحہ 265، جلد 1

4۔ سنن دارمی، صفحہ 365، جلد 2 (المدینۃ المنورہ الحجاز)



حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر چیز کی کوہان ہوتی ہے اور قرآن کی کوہان سورہ بقرہ ہے جس نے اسے رات کے وقت اپنے گھر میں پڑھا اس کے گھر میں تین راتیں شیطان داخل نہ ہوگا اور جس نے اسے دن کے وقت پڑھا وہ شیطان اس کے گھر میں تین دن داخل نہ ہوگا (1)، اس سے مراد سرکش شیطان ہیں۔

دارمی نے اپنی مسند میں شعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عبد اللہ نے فرمایا: جس نے رات کے وقت سورہ بقرہ کی دس آیات تلاوت کیں اس گھر میں اس رات شیطان داخل نہ ہوگا حتیٰ کہ صبح ہو جائے (وہ دس آیات یہ ہیں) ابتدائی چار آیات، آیہ الکرسی اور آیہ الکرسی کے بعد والی دو آیات اور تین آخری آیات۔ جن کا آغاز **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** سے ہے (2)۔ شعبی سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کے اور اس کے گھر والوں کے قریب اس دن نہ شیطان آئے گا اور نہ کوئی ایسی چیز جو اسے ناپسند ہو۔ یہ کسی مجنون پر نہیں پڑھی جائے گی مگر اسے ہوش آجائے گا۔ مغیرہ بن سبیع نے کہا: یہ عبد اللہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ وہ قرآن نہیں بھولے گا۔ اسحاق بن عیسیٰ نے کہا: جو اس نے یاد کیا ہو گا وہ نہیں بھولے گا۔ ابو محمد دارمی نے کہا: جو یہ کہتے تھے ان میں مغیرہ بن سبیع بھی تھے۔ ابن عبد البر کی کتاب ”الاستیعاب“ میں ہے لبید بن ربیعہ (بن عامر) بن مالک بن جعفر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ جاہلیت کے شعراء میں سے تھا اس نے اسلام کا زمانہ پایا اور اسلام قبول کر کے اسے خوب نبھایا اور اسلام کے زمانہ میں اس نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔ حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں اس سے اس کے اشعار کے متعلق پوچھا اور اس سے شعر سننا چاہا تو لبید نے سورہ بقرہ پڑھ دی۔ حضرت عمر نے کہا: میں نے تجھ سے تیرے اشعار کے متعلق سوال کیا ہے۔ لبید نے کہا: مجھے جب سے اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کا علم بخشا ہے اس کے بعد میں نے کبھی شعر کا ایک مصرعہ بھی نہیں کہا۔ حضرت عمر کو اس کے اس قول پر تعجب ہوا، اس کا وظیفہ دو ہزار تھا تو حضرت عمر نے مزید پانچ سو کا اضافہ کر دیا۔ بہت سے مؤرخین نے لکھا ہے کہ لبید نے جب سے اسلام قبول کیا کبھی شعر نہیں کہا۔ بعض نے فرمایا: اس نے اپنے زمانہ اسلام میں اس شعر کے علاوہ کوئی شعر نہیں کہا۔

الحمد لله اذ لم ياتني اجل حتى اکتسبت من الاسلام سربالاً

سب تعریفیں اللہ کے لئے کہ میری موت نہیں آئی حتیٰ کہ میں نے اسلام کا لباس زیب تن کر لیا۔

ابن عبد البر نے کہا: بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ شعر قردہ بن نفاث السلولی کا ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے۔ بعض علماء نے کہا: وہ شعر یہ ہے جو اس نے اسلام کے زمانہ میں کہا تھا۔

ما عاتب البرء الكريم كنفسه والبرء يصلحه القرين الصالح

اس نے کریم شخص کو اپنے نفس کی طرح عتاب نہیں کیا اور انسان کی اصلاح اس کا نیک دوست کرتا ہے۔

مزید فضیلت کا ذکر، آیہ الکرسی اور سورہ بقرہ کی آخری آیات کی تفسیر کے ضمن میں آئے گا اور سورہ آل عمران کی ابتدا میں اس سورت کی فضیلت کا مزید بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اے میرے رب آسان فرما اور مدد فرما۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلَمْ يَكُنْ لَكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هٰذِیْ لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝

”الف لام میم۔ یہ ذی شان کتاب اور ذرا شک نہیں اس میں، یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے۔“

علماء تاویل کا ان حروف کا مفہوم متعین کرنے میں اختلاف ہے جو سورتوں کی ابتدا میں ہیں۔ عامر شعبی، سفیان ثوری اور محدثین کی ایک جماعت نے کہا: یہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے راز ہیں (1) اور اللہ کی کتب میں سے ہر کتاب میں اس کے راز ہیں یہ ان مشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور ان کے متعلق گفتگو کرنا واجب نہیں لیکن ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح آئے ہیں۔ یہ قول حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ابولیث سمرقندی نے حضرت عمر، حضرت عثمان اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حروف مقطعه پوشیدہ حقیقت سے ہیں جن کی تفسیر نہیں کی جاسکتی۔ ابو حاتم نے کہا: ہم حروف مقطعه صرف سورتوں کے آغاز میں پاتے ہیں اور ہم نہیں جانتے جو اللہ تعالیٰ نے ان سے مراد لیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی مفہوم کو ابو بکر انباری نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اپنی سند سے ربیع بن خثیم سے روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن نازل کیا اور اس میں جتنا علم چاہا اپنے ساتھ خاص فرمایا اور جتنا چاہا اس پر تمہیں مطلع فرمایا اور جو اس نے اپنے ساتھ خاص فرمایا تم اس کو حاصل نہیں کر سکتے۔ پس تم اس کے متعلق مت پوچھو اور وہ علم جس پر اس نے تمہیں مطلع فرمایا وہ علم ہے جس کے متعلق تم پوچھتے ہو اور تجھے اس کے متعلق بتایا جاتا ہے۔ پورا قرآن تم نہیں جانتے اور وہ جو تم جانتے ہو اس پر عمل کرتے ہو۔ حضرت ابو بکر نے کہا: یہ بات وضاحت کرتی ہے کہ قرآن کے کچھ حروف کے معانی عام عالم سے چھپائے گئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے بطور آزمائش و امتحان کیا ہے۔ پس جو ان پر ایمان لایا اس نے اجر پایا اور سعادت مند ہوا اور جس نے انکار اور شک کیا وہ گنہگار ہوا اور حق سے دور ہو گیا۔ ہمیں ابو یوسف بن یعقوب القاضی نے بتایا۔ انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن ابی بکر نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں عبدالرحمن بن مہدی نے بتایا۔ انہوں نے سفیان سے انہوں نے اعمش سے انہوں نے عمارہ سے انہوں نے حریش بن ظہیر سے انہوں نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا، فرمایا: کوئی مومن ایمان بالغیب سے افضل ایمان نہیں لایا پھر یہ آیت پڑھی: الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ۔

میں کہتا ہوں: یہ قول مشابہ اور اس کے حکم کے متعلق ہے اور یہ صحیح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورہ آل عمران میں آئے گا۔ بہت سے علماء کبار نے فرمایا بلکہ ان کے متعلق ہم پر گفتگو کرنا واجب ہے تاکہ ہم وہ فوائد نکالیں جو ان کے ضمن میں ہیں اور وہ معانی نکالیں جو ان سے نکل سکتے ہیں، اس کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں: حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور حضرت

علی بن ابی طالب سے مروی ہے کہ قرآن میں حروف مقطعه اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے مگر ہم نہیں جانتے کہ اس کی ان حروف سے تالیف کیسی ہے (1)، قطرب اور فراء وغیرہا نے کہا: یہ حروف ہجاء کی طرف اشارہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب عربوں کو چیلنج فرمایا تو انہیں ان کے ساتھ بتایا کہ یہ قرآن ان حروف سے مرکب ہے جن پر ان کے کلام کی بنیاد ہے تاکہ ان کا اس سے عجز زیادہ ظاہر ہو جائے کیونکہ اس نے ان کے کلام سے خروج نہیں کیا۔ قطرب نے کہا: وہ لوگ قرآن کو سننے سے بھاگتے تھے جب وہ سننے لگتے تھے، البص، انہوں نے اس لفظ کو عجیب سمجھا۔ جب وہ نبی کریم ﷺ کی بات سننے کے لئے خاموش ہوئے تو آپ ﷺ نے مرکب قرآن ان پر پڑھا تا کہ قرآن کو ان کے کانوں میں ثابت کر دیں اور ان پر حجت قائم کر دیں۔ ایک قوم نے کہا: روایت ہے کہ مشرکین نے جب مکہ میں قرآن سننے سے یہ اعراض کیا تو انہوں نے کہا: لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوَا فِيهِ (فصلت: 26)۔ مت سنا کرو اس قرآن کو اور شور و غل مچا دیا کرو اس کی تلاوت کے درمیان تو یہ حروف مقطعات نازل ہوئے تاکہ وہ اس پر تعجب کریں پھر اپنے کانوں کو اس کی طرف متوجہ کریں اور اس کے قرآن کو سنیں تاکہ ان پر حجت لازم ہو جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: یہ حروف اسماء پر دلالت کرتے ہیں، اسماء سے یہ حروف اخذ کئے گئے ہیں اور ان کے بقیہ حروف کو حذف کیا گیا ہے جیسے حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے، الف، اللہ سے ہے، لام، جبریل سے ہے، میم، محمد سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الف، اسم اللہ کی چابی ہے، لام، لطیف کی چابی ہے، میم، اسم مجید کی چابی ہے۔ ابوالضحیٰ نے حضرت ابن عباس سے الہم کے قول میں روایت کیا ہے، فرمایا: انا اللہ اعلم۔ الت۔ انا اللہ ادری۔ البص۔ انا اللہ افصل۔ (2) الف انا کے معنی کو ادا کرتا ہے، لام اللہ کے اسم کا معنی ادا کرتا ہے اور میم اعلم کا معنی ادا کرتا ہے۔ اس قول کو زجاج نے پسند کیا ہے۔ زجاج نے کہا: میرا خیال یہ ہے کہ ان حروف میں سے ہر حرف ایک معنی ادا کرتا ہے۔ عرب بھی نظماً اور فصلاً حروف مقطعات کو ان کلمات کے بدل بولتے ہیں جن سے یہ حروف مشتق ہیں۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

فقلت لها قفي فقلت قاف

میں نے اسے کہا ٹھہر جا تو اس نے کہا: میں ٹھہر گئی۔

شاعر نے یہ ارادہ کیا ہے کہ قالت وقف۔ زہیر نے کہا:

بالخير خيرات وان شراً فـ لا أريد الشـ إلا ان تا

اس سے شاعر نے یہ ارادہ کیا ہے وان شراً فـ اور إلا أن تشاء۔ ایک اور شاعر نے کہا:

نادوهم ألا الجبو ألكنا قالوا جميعاً كلهم ألاف

اس میں شاعر نے الاترکبون مراد لیا ہے اور انہوں نے کہا: الافار کبوا اور حدیث پاک میں ہے: من اعان علی قتل

مسلم بشطر کلمۃ۔ (3) شقیق نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اقتل میں سے اقی کہتا ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:



کفی بالسيف شا۔ اس کا مطلب ہے: شافیتا۔

حضرت زید بن اسلم نے کہا: یہ حروف مقطعات سورتوں کے اسماء ہیں۔ کلبی نے کہا: یہ قسمیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے شرف اور فضل کی وجہ سے ان کے ساتھ قسمیں اٹھائی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے۔ بعض علماء نے اس قول کو رد کیا ہے۔ فرمایا: ان کا قسم ہونا صحیح نہیں کیونکہ قسم کے لئے مخصوص حروف ہیں مثلاً ان۔ قد، لقد اور ما اور ان حروف میں سے کوئی حرف یہاں نہیں پایا جاتا۔ پس قسم ہونا جائز نہیں۔ اس کا جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ قسم کی جگہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا مَرِيْبٌ فِيْهِ اِذَا كُنِيَ اِنْسَانٌ قَسَمَ اُتْھَاے تو کہے گا: وَاِنَّهٗ هٰذَا الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ تو یہ کلام درست ہوگا اور لا جواب قسم ہوگا۔ پس کلبی کا قول اور جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے صحیح اور درست ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قسم اٹھانے میں کیا حکمت ہے۔ اس وقت میں لوگ دو قسم کے تھے: ایک تصدیق کرنے والے اور دوسرے تکذیب کرنے والے۔ تصدیق کرنے والے تو بغیر قسم کے ہی تصدیق کر دیتے ہیں اور مکتذب قسم کے ساتھ بھی تصدیق نہیں کرتے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ قرآن لغت عرب میں نازل ہوا ہے۔ عربوں میں سے جب کوئی اپنے کلام کو مؤکد کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے کلام پر قسم اٹھاتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی حجت کو مؤکد کرنے کا ارادہ فرمایا تو قسم اٹھائی کہ قرآن اس کی طرف سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اَلَمْ کا مطلب ہے میں نے تجھ پر یہ کتاب لوح محفوظ سے نازل کی۔ قتادہ نے اَلَمْ کی تفہیم میں فرمایا: یہ قرآن کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ محمد بن علی ترمذی سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں میں جو احکام اور قصص و دیعت فرمائے ہیں وہ ان حروف میں ودیعت فرمادیے جو ان سورتوں کی ابتدا میں ذکر کئے ہیں۔ ان حقیقتوں کو سوائے نبی یا ولی کے کوئی نہیں جانتا پھر ان حقائق کو سورت میں بیان فرمایا تاکہ لوگ سمجھ سکیں (1)۔ ان اقوال کے علاوہ بھی حروف مقطعات کے بارے میں اقوال موجود ہیں۔ حقیقت حال اللہ بہتر جانتا ہے۔

ان حروف پر وقف ان کے نقصان کی وجہ سے ہے مگر جب ان کو تو مبتدا بنائے گا یا انہیں معطوف کرے گا تو ان کو اعراب دے گا۔ علماء کا اختلاف ہے کہ ان کا اعراب میں کوئی محل ہے یا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا کوئی اعراب نہیں کیونکہ یہ اسماء مستکنہ نہیں ہیں نہ یہ افعال مضارع ہیں۔ یہ حروف تہجی کے قائم مقام ہیں۔ پس یہ محکیہ ہیں یہ خلیل اور سیمویہ کا مذہب ہے اور جن علماء نے فرمایا کہ یہ سورتوں کے اسماء ہیں ان کے نزدیک ان کا اعراب مرفوع ہے اس بنا پر کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہیں یعنی ہذا الم۔ جیسا کہ تو کہتا ہے: ہذا سورۃ البقرۃ یا یہ مبتدا ہیں اور ان کی خبر ذالک ہے جیسا کہ تو کہتا ہے زید ذالک الرجل۔ ابن کیسان نحوی نے کہا اَلَمْ نصب کی جگہ میں ہے جیسا کہ تو کہتا ہے: اقرأ الم یا علیک الم۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قسم کی بنا پر جر کی جگہ میں ہیں کیونکہ حضرت ابن عباس کا قول ہے: یہ قسمیں ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قسمیں اٹھائی ہیں (2)۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہذا الكتاب۔ اور ذٰلِكَ حاضر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اگرچہ یہ وضع غائب کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق خبر دیتے

ہوئے فرمایا: ذٰلِكَ عَلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ① (السجدہ) اسی طرح خفاف بن عبدہ کا قول ہے

اقول له و الرمح ياطر متنه تامل خفافاً اننى انا ذلکا

یعنی انا ہذا۔ پس ذٰلِكَ کا اشارہ قرآن کی طرف ہے۔ یہ ہذا کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ اس کی تخصیص یہ ہے: الم ہذا الكتاب لا ريب۔ یہ ابو عبیدہ، عکرمہ وغیرہما کا قول ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا اِبْرَاهِيمَ (انعام: 83) (اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے دی ابراہیم کو)۔ تِلْكَ اَيْتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (بقرہ: 252) (یہ سب نشانیاں ہیں اللہ کی (قدرت کی) ہم بیان کرتے ہیں انہیں آپ پر حق کے ساتھ)۔ ان آیات میں تِلْكَ بمعنی ہذا استعمال ہوتا ہے لیکن جب یہ توڑیں گئیں تو گویا وہ دور ہو گئیں۔ بخاری میں ہے، معمر نے ذٰلِكَ الْكِتَابُ کی تفسیر میں فرمایا: کتاب سے مراد یہ قرآن ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ② یہ بیان اور دلالت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَخُكِّمُ بَيْنَكُمْ (الممتحنہ: 10) یعنی ہذا حکم اللہ۔

میں کہتا ہوں: ہذا بمعنی ذٰلِكَ استعمال ہوتا ہے، مثلاً ام حرام کی حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: یو کہون شبح هذا البحر (1)۔ یعنی ذٰلِكَ البحر، (واللہ اعلم)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ غائب کی طرف اشارہ کے باب پر ہے۔ اس غائب میں علماء کے مختلف دس اقوال ہیں: بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتَابُ سے مراد وہ کتاب ہے جو میں نے مخلوق کی سعادت، شقاوت، عمر اور رزق کے بارے میں لکھی۔ لَا تَأْتِيْكَ فِيْهِ یعنی اس میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتَابُ سے مراد وہ تحریر ہے جو ازل میں میں نے اپنے بارے میں لکھی کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے (2)۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو اپنی کتاب میں اپنے بارے میں لکھا اور وہ کتاب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ (ایک روایت میں تغلب کی جگہ سبقت کے الفاظ ہیں) (3)۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اس پر ایسی کتاب نازل کرے گا جس کو پانی نہیں مٹا سکے گا۔ پس اسی وعدہ کی طرف اشارہ فرمایا، جیسا کہ صحیح مسلم میں عیاض بن حمار مجاشعی کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف دیکھا اور اس کے عرب و عجم پر ناراضگی کا اظہار کیا سوائے اہل کتاب کے بقیہ لوگوں کے۔ اور فرمایا: میں نے تجھے مبعوث فرمایا تاکہ تجھے آزمائش میں ڈالوں اور تیرے ذریعے آزماؤں، میں تجھ پر ایک کتاب نازل کروں گا جس کو

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 391، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ایضاً، کتاب الجہاد، باب الدعاء بالجہاد والشہادۃ للہ، جلد 1، حدیث 2580، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب سبحة رحمة اللہ تعالیٰ وانہا سبقت غضبہ، صفحہ 356، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

پانی صاف نہیں کر دے گا، تو اسے نیند اور بیداری کی حالت میں پڑھے گا (1)۔ (الحمدیث)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قرآن کے اس حصہ کی طرف اشارہ ہے جو مکہ میں نازل ہوا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم ﷺ پر مکہ میں یہ ارشاد نازل فرمایا تھا: **إِنَّا سَنُلْقِيْكَ عَلَيْنَا ثِقِيلًا** (المزل) (بیشک ہم جلدی ہی القا کریں گے آپ پر ایک بھاری کلام)۔ رسول اللہ ﷺ اپنے رب کی طرف سے اس وعدہ کے پورا ہونے کے منتظر رہتے تھے۔ پھر جب مدینہ طیبہ میں **الْمَٓذِكُ الْكِتٰبُ لَا مَرِيْبَ فِيْهِ** نازل ہوا۔ اس میں اس قرآن کا معنی ہے جو میں نے تم پر مدینہ طیبہ میں اتارا۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا میں نے تجھ سے مکہ میں وعدہ کیا تھا کہ میں تیری طرف وحی کروں گا۔ بعض علماء نے فرمایا: **ذٰلِكَ** سے اس کلام کی طرف اشارہ ہے جو تورات اور انجیل میں ہے اور **الْمَٓذِكُ** قرآن کا اسم ہے نقد یہ کلام یہ ہوگا: یہ قرآن وہ کتاب ہے جس کی تفسیر تورات اور انجیل میں کی گئی ہے یعنی تورات اور انجیل اس کی صحت کے گواہ ہیں اور جو معانی تورات اور انجیل میں ہیں ان کا یہ جامع ہے اور جو کچھ ان میں نہیں وہ بھی اس میں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: **ذٰلِكَ الْكِتٰبُ** تورات اور انجیل دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ **الْمَٓذِكُ** دو کتابیں ہیں یا ان دو کتابوں کی مثل ہے یعنی یہ قرآن ان دونوں کتابوں کے معانی و حقائق کا جامع ہے، پس تثنیہ کو **ذٰلِكَ** سے تعبیر فرمایا اس کی مثال قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّمَا يَبْقَرُ وَلَا فَاْرِضُ وَلَا يَكْثُرُ عَوَانُ بَشَرٍ** (البقرہ: 68) (کہ وہ گائے ہے جو نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی) (بلکہ) (درمیانی عمر ہو)۔ یہاں **بَشَرٍ** **ذٰلِكَ** بمعنی بین تینوں ہے یعنی بوڑھی اور جوان کے درمیان ہو۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ بعض علماء نے فرمایا: **ذٰلِكَ** لوح محفوظ کی طرف اشارہ ہے۔ کسائی نے کہا **ذٰلِكَ** اس قرآن کی طرف اشارہ ہے جو آسمان میں تھا اور ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ محمد ﷺ پر ایک کتاب نازل کرے گا۔ پس یہ اشارہ اس وعدہ کی طرف ہے (2)۔ المبرد نے کہا: معنی یہ ہے کہ یہ قرآن وہ کتاب ہے جس کے وسیلہ سے تم کفار پر فتح طلب کیا کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اشارہ ہے حروف مجمر کی طرف، اس کے قول پر جو کہتا ہے: **الْمَٓذِكُ** سے مراد وہ حروف ہیں جن پر قرآن نظم کر کے میں نے تمہیں چیلنج کیا ہے (3)۔

کتاب: کتب یکتب سے مصدر ہے۔ اس کا معنی ہے: جمع کرنا۔ اسی وجہ سے لشکر کو کتیبہ کہا جاتا ہے اس کے اجتماع کی وجہ سے۔ عرب کہتے ہیں: **تکتبت الخیل** جو گھوڑے چھوٹے چھوٹے لشکر ہو جائیں۔ **کتبت البغلة** کہا جاتا ہے۔ جب بغلہ کے رحم کو حلقہ یادھاگہ کے ساتھ جمع کر دیا جائے۔ شاعر نے کہا:

لا تامنن فزاريا حلت به على قلوصلك واكتبها باسيار

الکتبہ (کاف کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی الخرزہ۔ سینے کا تسمہ ہے اور اس کی جمع **کُتُبٌ** ہے اور **الکتب الخرز** یعنی تسمہ۔ ذوالرمہ کا شعر ہے:

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنة وصفة نعيمها واهلها، باب الصفات التي يعرف بها أهل الدنيا أهل الجنة وأهل النار، صفحہ 385، جلد 2

2۔ المحرر الوجيز، صفحہ 83، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

3۔ ایضاً



مششئل ضیعتہ بینہا الکتب

وفراء غرفیۃ اثنای خوارنہا

اس شعر میں یہ لفظ اسی مفہوم میں شاعر نے استعمال کیا ہے۔

کتاب کاتب کے حروف معجزہ لکھنے کو کہتے ہیں خواہ وہ حروف جمع ہوں یا جدا جدا ہوں اس کتاب کہا جاتا ہے اگرچہ مکتوب ہو، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

کتاب مثل ما لصق الغراء

تومل رجعة منی و فیہا

اس میں مذکورہ مفہوم میں کتاب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

کتاب کا معنی فرض، حکم اور القدر بھی ہے۔ جعدی کا قول ہے:

عنکم وهل امنعن الله ما فعلا

یابنة عی کتاب الله اخراجنی

اس میں شاعر نے کتاب سے مراد فرض، حکم لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تَرٰیْبٌ فِیْہِ۔ یہ نفی عام ہے، اسی وجہ سے تَرٰیْب کو اس کے ساتھ نصب دی گئی ہے، تَرٰیْب کے تین معانی ہیں۔

۱۔ شک: عبد اللہ بن الزبیری نے کہا:

انما الريب ما يقول الجھول

لیس فی الحق یا امیۃ ریب

اے امیر! حق میں کوئی شک نہیں، شک تو اس میں ہوتا ہے جو جاہل کہتا ہے۔

۲۔ تہمت: جمیل نے کہا:

فقلت کلانا یابشین مربب

بشینۃ قالت یا جمیل اربتنی

بشینہ نے کہا: اے جمیل! تو نے مجھ پر تہمت لگائی۔ میں نے کہا: ہم میں سے ہر ایک اے بشین تہمت لگانے والا ہے۔

۳۔ حاجت: شاعر (کعب بن مالک) نے کہا:

د خیبر ثم اجبنا السیوفا

قضینا من تھامة کل ریب

ہم نے تہامہ اور خیبر سے ہر حاجت کو پورا کر لیا پھر ہم نے تلواروں کو جمع کیا۔

پس اللہ کی کتاب میں کوئی شک وارتیاب نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات میں حق ہے وہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور اس کی صفات میں سے ایک صفت غیر مخلوق اور غیر حادث ہے اگرچہ کفار کے لئے شک واقع ہوا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ خبر ہے اور اس کا معنی یہی ہے یعنی تم اس میں شک نہ کرو۔ کلام مکمل ہے۔ گویا فرمایا: یہ کتاب حق ہے، تو کہتا ہے: رابنی هذا الامر۔ جب وہ امر شک اور خوف کو داخل کر دے۔ اراب، شک والا ہو گیا۔ فہو مربب، رابنی امرہ، ریب الدھر۔ زمانہ کی گردشیں۔

اس کے متعلق چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فِيهِ اس** میں ہدائی کی وجہ سے حالت جری میں ہے، اس میں پانچ وجوہ ہیں عمدہ ترین وجہ **فِيهِ** ہدی اور اس کے قریب پھر **فِيهِ** ہدی (بغیر واؤ کے ہاء کے ضمہ کے ساتھ) یہ زہری، سلام اور ابوالمنذر کی قراءت ہے۔ پھر اس کے قریب **فِيهِ** ہدی ہے یعنی (یاء کے اثبات کے ساتھ) یہ ابن کثیر کی قراءت ہے۔ اس میں **فِيهِ** ہدی (واؤ کے ساتھ) بھی جائز ہے، اس میں **فِيهِ** ہدی مدغم کر کے پڑھنا جائز ہے، ہدی کا رفع مبتدا ہونے کی بنا پر ہے اور **فِيهِ** خبر ہے، الہدی عرب کلام میں الرشد اور بیان کے معنی میں ہوتا ہے یعنی اس میں اہل معرفت کے لئے کشف، رشد، بیان کی زیادتی اور رہنمائی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** الہدی، ہدیان، ہدی کا معنی دلالت ہے۔ یہ وہ ہے جس پر رسول اور ان کے قابعین قادر ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ** (الرعد) (اور ہر قوم کے لئے آپ ہادی ہیں)۔ اور ارشاد ہے: **وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** (الشوریٰ) (اور بلاشبہ آپ رہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف)۔ اللہ تعالیٰ نے رسل کے لئے ہدایت کو ثابت فرمایا جس کا معنی ہے دلالت، دعوت اور تنبیہ۔ اور وہ ہدایت جس کا معنی تائید اور توفیق ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ سے فرمایا: **اِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** (الشوریٰ: 52)۔ (بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں)۔

پس اس اعتبار سے **هُدًى** کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو دل میں پیدا فرمایا۔ اس مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَبِّهِمْ** (البقرہ: 5) (وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب (کی توفیق) سے) اور ارشاد ہے **يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ** (البقرہ: 142) ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ الہدی اور الہتداء اس کا معنی ارشاد کے معنی کی طرف راجع ہے، جیسے بھی تو اس کا صیغہ بنائے۔ ابوالعالی نے کہا: کبھی ہدایۃ کا لفظ وارد ہوتا ہے اور اس سے مراد مومنین کی جنت کے راستوں اور جنت تک پہنچانے والے طرق کی طرف رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں مجاہدین کی صفت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **فَلَنْ يُفْلِحَ اَعْمَالُهُمْ** (محمد: 4) اسی مفہوم میں یہ ارشاد ہے: **فَاَهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ** (صافات) اس کا معنی ہے انہیں جحیم کے راستہ کی طرف چلاؤ۔

**مسئلہ نمبر 3:** الہدی لفظ مونث ہے۔ فراء نے کہا: بعض بنی اسد الہدی کو مونث استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: **هَذِهِ هُدًى حَسَنَةٌ**۔ اور لسانی نے کہا: یہ مذکر ہے، اس پر اعراب نہیں آتا، یہ اسم مقصور ہے اور الف پر حرکت نہیں آتی۔ یہ حرف جر کے ساتھ اور بغیر حرف جر کے متعدی ہوتا ہے۔ سورہ فاتحہ میں یہ گزر چکا ہے، تو کہتا ہے: **هَدِيْتَهُ الطَّرِيْقَ** والی الطریق، والدار والی الدار (یعنی میں نے اسے راستہ کی پہچان کرائی اور گھر کی پہچان کرائی) حرف جر کے متعدی ہونا اہل حجاز کی لغت ہے اور دوسری صورت یعنی بغیر حرف جر کے متعدی ہونا، انخفش نے حکایت کیا ہے اور قرآن حکیم میں ہے **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** (فاتحہ) (چلا ہم کو سیدھے راستے پر)۔

**الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدٰنَا لِهٰذَا** (الاعراف: 43)۔ ساری تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جس نے راہ دکھائی ہمیں اس بہشت کی۔

بعض علماء نے فرمایا: الہدی دن کے اسماء میں سے ایک اسم ہے کیونکہ لوگ دن میں اپنی معیشت اور نام کے لئے راستوں پر نکلتے ہیں۔ اسی سے ابن مقبل کا قول ہے:

حق استبنت الہدی والبیذ حاجۃ  
اس شعر میں الہدی، دن کے لئے استعمال ہوا ہے۔  
یخشعن فی الال غلغا او یصلینا

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لِّلْمُتَّقِیْنَ**۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے ساتھ المتقین کو خاص فرمایا ہے اگرچہ قرآن ساری مخلوق کے لئے ہے یہ متقین کو شرف بخشنے کے لئے فرمایا ہے کیونکہ وہ ایمان لائے اور جو کچھ اس قرآن میں ہے اس کی تصدیق کی۔ ابوروق سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: **هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ** یعنی متقین کی عزت و شرف کے لئے ہدایت کو متقین کے لئے ذکر فرمایا اور ان کی فضیلت و عظمت کے لئے یہ فرمایا۔

متقین اصل میں الموقنین تھا یعنی دو یا دوں کے ساتھ تھا، پہلی یاء کے کسرہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کر دیا گیا پھر التقاء ساکنین کی وجہ سے یاء کو حذف کر دیا گیا اور واو اور تاء کے اجتماع کی صورت میں واو کو تاء سے بدل دیا گیا پھر تاء کو تاء میں ادغام کیا گیا، پس یہ متقین بن گیا۔

**مسئلہ نمبر 5:** التقویٰ اس کا اصل میں لغوی معنی قلت کلام ہے۔ ابن فارس نے یہ معنی حکایت کیا ہے۔ اسی مفہوم میں حدیث شریف ہے التقی مدجم، کم کلام کرنے والا لگام دیا گیا ہے۔ متقی، مومن اور اطاعت کرنے والے سے بلند درجہ ہے، یہ وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے نیک عمل اور خالص دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچتا ہے۔ یہ اتقاء البکر وہ بہا ت جعلہ حاجزاً بینک و بینہ سے مشتق ہے یعنی جس کو تو اپنے اور مکروہ چیز کے درمیان آڑ بناتا ہے جیسا کہ نابغہ نے کہا تھا:

سقط النصف و لم ترد اسقاطہ فتناولتہ و اتقتنا بالید

اس کی اوڑھنی گر گئی اور اس نے اس کو گرانے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ پس اس نے اس کو پکڑ لیا اور ہاتھ سے ہمیں بچا لیا۔ ایک اور شاعر نے کہا:

فالقت قناعاً دونہ الشمس واتقت باحسن موصولین کف و معصم

اس نے دھوپ سے بچاؤ کیلئے پردہ ڈالا اور ہاتھ اور کلائی دونوں خوبصورت ملی ہوئی چیزوں کے ساتھ بچاؤ کیا۔ ابو محمد عبد الغنی الحافظ نے سعید بن زہبی ابو عبیدہ بن عامر بن بہدلہ عن زہاب بن جیش عن ابن مسعود کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ابن مسعود نے ایک اپنے بھتیجے سے کہا: اے میرے بھتیجے! تو کتنے زیادہ لوگ دیکھتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: ان میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے تابع توبہ کرنے والے اور گناہوں سے بچنے والے کے۔ پھر فرمایا: اے میرے بھائی کے بیٹے! تو لوگوں کو دیکھتا ہے کتنے زیادہ ہیں؟ میں نے کہا: کیوں نہیں۔ فرمایا: ان میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے عالم یا معلم کے۔

ابو یزید بسطامی نے کہا: متقی وہ ہے جب بات کرے تو اللہ کے لئے بات کرے اور جب عمل کرے تو اللہ کے لئے عمل



کرے، ابوسلیمان دارانی نے کہا: المتقین وہ ہیں جن کے دلوں سے اللہ تعالیٰ نے خواہشات کی محبت ختم کر دی۔ بعض علماء نے فرمایا: متقی وہ ہے جو شرک سے بچتا ہے اور نفاق سے بری ہوتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول فاسد ہے کیونکہ کبھی ایک شخص شرک و نفاق سے پاک ہوتا ہے لیکن وہ فاسق ہوتا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے حضرت ابی سے تقویٰ کے متعلق پوچھا، تو حضرت ابی نے کہا: کیا تم نے کانٹوں والا راستہ پایا ہے؟ حضرت عمر نے کہا: ہاں۔ حضرت ابی نے کہا: پھر تم نے اس سے گزرتے ہوئے کیا کیا تھا۔ حضرت عمر نے کہا: میں نے کپڑے اوپر کر لئے اور بچ کے احتیاط سے گزرا۔ حضرت ابی نے کہا: یہ تقویٰ ہے ابن المعمر نے یہی معنی لیا ہے اور اسے نظم کیا ہے:

خل الذنوب صغیرھا      و کبیرھا ذاک التقی  
واصنع کماشی فوق ار      ض الشون یحذر ما یری  
لا تحقن صغیرة      ان الجبال من الحصى

ترجمہ: تو گناہ صغیرہ اور کبیرہ کو چھوڑ دے۔ یہی تقویٰ ہے اور تو کانٹوں والی زمین کے اوپر چلنے والے کی طرح کر کہ وہ کانٹوں کو دیکھ کر احتیاط کرتا ہے۔ صغیرہ گناہ کو بھی حقیر نہ سمجھ کیونکہ پہاڑ، کنکریوں سے بنتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** تقویٰ میں تمام خیر کے اعمال جمع ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اولین و آخرین میں وصیت ہے۔ یہ وہ خیر ہے جو انسان حاصل کرتا ہے جیسا کہ حضرت ابوالدرداء نے کہا، ان سے پوچھا گیا: تمہارے ساتھی شعر کہتے ہیں اور تجھ سے کوئی چیز محفوظ نہیں کی گئی۔ فرمایا:

یرید السوء ان یوق مناه      و یابی اللہ الا ما ارادا  
یقول السوء فائدتی و مالی      و تقوی اللہ افضل ما استفادا

انسان ارادہ کرتا ہے کہ اس کی خواہش پوری کی جائے اور اللہ تعالیٰ عطا نہیں فرماتا مگر جس کا اللہ ارادہ فرماتا ہے۔ انسان کہتا ہے میرا فائدہ اور میرا مال حالانکہ جو اس نے فائدہ اٹھایا اس میں سے افضل اللہ تعالیٰ کا تقویٰ ہے۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت ابوامامہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: مومن تقویٰ کے بعد نیک بیوی سے بہتر کوئی خیر حاصل نہیں کرتا اگر وہ اسے حکم دے، تو اس کی اطاعت کرے اگر وہ اس کی طرف دیکھے تو اسے خوش کرے اور اس پر کوئی قسم اٹھائے تو اسے سچا کرے، اگر وہ اس سے غائب ہو تو اپنے نفس اور اس کے مال میں اس سے اخلاص کا مظاہرہ کرے (1)۔

تقویٰ اصل میں وقوی تھا بروزن فعلی، پھر واد کو تاء سے بدلا گیا یہ وقیتہ، اقیہ سے مشتق ہے یعنی میں نے اسے بچایا رجل تنی، یعنی ڈرنے والا شخص۔ اصل میں وقی تھا اسی طرح تقاة اصل میں وقاة تھا جیسا کہ عرب کہتے ہیں تجاہ، و تراث اصل میں دُجاہ اور وارث تھا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 135، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب النکاح، باب افضل النساء، حدیث نمبر 1846، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿٢﴾

”وہ جو ایمان لائے غیب پر اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز اور اس سے جو ہم نے انہیں روزی دی خرچ کرتے ہیں۔“

اس میں چھبیس مسائل ہیں ☆۔

**مسئلہ نمبر 1:** الَّذِينَ یہ متقین کی صفت ہونے کے اعتبار سے حالت جری میں ہے اور قطع کے اعتبار سے رفع بھی جائز ہے۔ یعنی اس سے پہلے ہم ضمیر مبتدا محذوف ہوگی اور مدح کے اعتبار سے نصب بھی جائز ہے۔ يُؤْمِنُونَ کا معنی یصدقون ہے یعنی وہ تصدیق کرتے ہیں۔ الايمان کا لغوی معنی تصدیق کرنا ہے قرآن حکیم میں ہے: وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا (یوسف: 17) (تو ہماری تصدیق کرنے والا نہیں) ایمان کا لفظ باء اور لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا بِمَا نُنَیِّمُ (آل عمران: 73) (ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہیں کہ مت مانو کسی کی بات، سوائے ان لوگوں کے جو پیروی کرتے ہیں تمہارے دین کی) اور فرمایا: فَمَا آمَنَ لِمُؤَلَّى (یونس: 83) (پس نہ ایمان لائے موسیٰ پر) حجاج بن حجاج احوال سے مروی ہے (یہ زق العسل سے ملقب ہوتا تھا) فرمایا: میں نے حضرت قتادہ کو یہ فرماتے سنا، اے ابن آدم! اگر تو چستی کے ساتھ نیکی کرنا چاہتا ہے تو تیرا نفس اکٹھا ہٹ، کوتاہی اور بے زاری کی طرف مائل ہوگا، لیکن مومن وہ ہوتا ہے جو تکلیف اٹھانے والا ہوتا ہے، مومن وہ ہوتا ہے جو قوت کا اظہار کرنے والا ہوتا ہے اور مومن اپنے نفس پر سختی کرنے والا ہوتا ہے، مومنین رات دن اللہ کی بارگاہ میں آواز بلند کرنے والے ہوتے ہیں۔ اللہ کی قسم! بندہ مومن سر اور علانیہ رہنا، رہنا کہتا رہتا ہے حتیٰ کہ سر اور علانیہ اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْغَيْبِ عرب کلام میں الغیب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تجھ سے غائب ہے۔ یہ لفظ اجوف یائی ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: غابت الشمس تغیب۔ الغیبة معروف ہے وَاغَابَتِ الْمَرْأَةُ یعنی وہ عورت جس کا خاوند غائب ہوتا ہے۔ وودعنا فی غیبة و غیابة یعنی ہم زمین کی گہرائی میں واقع ہوئے۔ الغیابة کا معنی ہے: الاجتة، یعنی گھنے درخت جن میں چھپا جاتا ہے، ہموار زمین کو بھی الغیب کہتے ہیں کیونکہ وہ آنکھ سے غائب ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** مفسرین نے الغیب کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت میں الغیب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ابن عربی نے اس قول کو ضعیف کہا ہے۔ بعض دوسرے علماء نے کہا: الغیب سے مراد قضاء و قدر ہے۔ بعض علماء نے کہا: الغیب سے مراد قرآن اور اس میں موجود غیوب ہیں۔ بعض علماء نے کہا: اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے متعلق رسول کریم ﷺ نے خبر دی جس تک عقل انسانی نہیں پہنچ سکتی مثلاً قیامت کی علامات، عذاب قبر، حشر، نشر، صراط، میزان، جنت، دوزخ۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ اقوال متعارض نہیں ہیں بلکہ ان تمام پر غیب کا اطلاق ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ ایمان شرعی ہے جس کی طرف حدیث جبریل میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جب جبریل نے نبی کریم ﷺ سے کہا: مجھے ایمان کے متعلق بتائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو اللہ تعالیٰ، ملائکہ، کتب، رسل، آخرت کے دن پر ایمان لائے اور

1۔ متن میں اسی طرح ہے مگر تفصیل میں پچیس مسائل ہیں۔

خبر و شر کی تقدیر پر ایمان لائے۔ جبریل امین نے کہا: آپ نے سچ فرمایا۔ (آگے مکمل حدیث ذکر کی) (1)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: کوئی مومن ایمان بالغیب سے افضل ایمان نہیں لایا۔ پھر یہ آیت پڑھی: **الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ**۔ (2) میں کہتا ہوں۔ قرآن حکیم میں ہے **وَمَا كُنَّا بِمُؤْمِنِينَ** (اعراف) (اور نہ تھے ہم ان سے غائب)۔ اور فرمایا: **الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ** (انبیاء: 49) (جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں)۔ اللہ تعالیٰ کی ذات آنکھوں سے غائب ہے، اس دنیا میں وہ دیکھی نہیں جاتی لیکن نظر و استدلال کے اعتبار سے غائب نہیں۔ یعنی وہ ایمان لاتے ہیں کہ ان کا رب قادر ہے وہ اعمال پر جزا دے گا، وہ اپنی خلوتوں میں بھی اس سے ڈرتے ہیں جہاں وہ لوگوں سے غائب ہوتے ہیں کیونکہ انہیں علم ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر آگاہ ہے۔ اس اعتبار سے آیات متفق ہو جاتی ہیں اور ان میں تعارض نہیں رہتا۔ **الْحَمْدُ لِلَّهِ**

بعض علماء نے فرمایا: الغیب سے مراد لوگوں کے ضمائر اور قلوب ہیں بخلاف منافقین کے۔ یہ عمدہ قول ہے۔ شاعر نے کہا:

و بالغیب آمنا وقد كان قوماً يصلون للادشان قبل محمد

ہم دل سے ایمان لائے جبکہ ہماری قوم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بہشت سے پہلے۔ دن کی عبادت کرتی تھی۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ** یہ جملہ کا جملہ پر عطف ہے۔ اقامۃ الصلوٰۃ کا مطلب ہے نماز کو اس کے ارکان، سنن اور اس کی ہیئت کے ساتھ اس کے اوقات میں ادا کرنا، اس کی وضاحت آگے آئے گی۔ کہا جاتا ہے: قام الشيء یعنی اس چیز کو دوام اور ثبوت ہو گیا۔ یہ القیام علی الرجل سے مشتق نہیں ہے۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: قام الحق یعنی حق ظاہر ہو گیا اور ثابت ہو گیا۔ شاعر نے کہا:

وقامت الحرب بنا على ساق

یعنی ہم پر جنگ قائم اور ثابت ہو گئی۔

ایک اور شاعر نے کہا:

واذا يقال أتیتم لم یبرحوا حتی تقیم الخیل سوق طعان

اور جب کہا جاتا ہے تم آگئے وہ اپنی جگہ سے نہیں ملتے حتیٰ کہ گھوڑے نیزوں کے چلنے کو ظاہر کر دیتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: **يُقِيمُونَ** کا معنی یدبیون ہے۔ و اقامہ یعنی اس نے اسے ہمیشہ قائم کیا۔ اسی معنی کی طرف حضرت عمر نے اشارہ فرمایا: **من حفظها وحافظ عليها حفظ دينه ومن ضيعها فهو لما سواها اضيع**۔ (جس نے نماز کی حفاظت کی اور اس پر دوام اختیار کیا تو اس نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا اور جس نے نماز کو ضائع کیا وہ نماز کے علاوہ احکام کو زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا)۔

1۔ صحیح بخاری، باب سوال جبریل النبی عن الایمان والاسلام والاحسان، حدیث نمبر 48، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث جبریل، صفحہ 27، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)



**مسئلہ نمبر 5:** اقامۃ الصلاۃ معروف ہے اور جمہور کے نزدیک یہ سنت ہے کیونکہ جو اس کے سنن وغیرہ کو ترک کر دیتا ہے اس پر اعادہ نہیں ہے اور اوزاعی، عطاء، مجاہد، ابن ابی لیلیٰ کے نزدیک اقامۃ الصلوٰۃ واجب ہے اور جو اقامت کو ترک کرے گا اس پر اعادہ واجب ہوگا، اہل ظواہر کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک سے مروی ہے اور ابن عربی نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ فرمایا: اعرابی والی حدیث میں ہے ”اقم“ (یعنی نماز قائم کرو) یہاں اقامت کا حکم دیا ہے جس طرح تکبیر، استقبال قبلہ اور وضو کا حکم دیا ہے۔

فرمایا: اب تم حدیث پر آگاہ ہو چکے ہو تو امام مالک کی اس روایت کے مطابق قول کرنا واجب ہے وہ یہ کہ اقامت فرض ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کی تحریم تکبیر ہے (1)“ دلیل ہے کہ جس نے تکبیر تحریم نہیں کی وہ نماز میں داخل نہیں ہوا۔ پس جو کچھ احرام سے پہلے تھا اس کا حکم یہ ہے کہ اس کی وجہ سے نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ جس چیز پر علماء کا اجماع ہو تو اسے اجماع کی وجہ سے تسلیم کیا جائے گا جیسے طہارت، قبلہ، وقت اور دوسری اس قسم کی چیزیں۔ بعض علماء نے فرمایا: جس نے جان بوجھ کر اقامت کو ترک کیا وہ نماز کا اعادہ کرے اور یہ اقامت کے وجوب کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ اگر یہ واجب ہوتا تو اس کا سہوا اور عمدت ترک کرنے کا حکم برابر ہوتا۔ یہ اعادہ کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس نے سنن کو ہلکا سمجھا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 6:** علماء نے اس شخص کے بارے اختلاف کیا ہے جو نماز کی اقامت سے تو کیا وہ جلدی چلے یا نہیں۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ جلدی نہ چلے اگرچہ اسے رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ بھی ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم دوڑتے ہوئے نہ آؤ بلکہ تم اس حال میں چلتے ہوئے آؤ کہ تم پر وقار ہو پھر جو نماز جماعت کے ساتھ پالو وہ پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے وہ مکمل کر لو (2)“۔ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے اور امام مسلم نے نقل کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب نماز کے لئے تکبیر کہی جائے تو تم میں سے کوئی نماز کی طرف دوڑ کر نہ آئے بلکہ چل کر آئے جبکہ اس پر سکینت اور وقار ہو، جو تو پائے وہ امام کے ساتھ پڑھ لے اور جو وہ تجھ سے پہلے پڑھ چکا ہے اس کو بعد میں پڑھ لے (3)“ یہ (مراحتہ) نص ہے معنی کے اعتبار سے کہ جب وہ تیز چلے گا تو اس کا سانس اکھڑا ہوا ہوگا اور اس پر نماز میں داخل ہونا اس کی قراءت اور خشوع سب میں تشویش ہوگی۔ سابقین علماء کی ایک جماعت جن میں حضرات ابن عمر اور ابن مسعود بھی ہیں، مذکور نظریہ سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: جب رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ تیز چلے۔ اسحاق نے کہا: جب رکعت کے فوت ہونے کا خوف ہو تو تیز چلے۔ امام مالک سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ فرمایا: اس شخص کے لئے کوئی حرج نہیں جو گھوڑے پر سوار ہو تو اسے نماز کے لئے تیز چلائے۔ بعض نے پیدل چلنے والے اور سوار کے درمیان فرق کیا ہے کیونکہ سوار کا سانس اس طرح اکھڑا ہوا نہیں ہوگا جس طرح پیدل چلنے والے کا ہوگا۔

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 9، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الطہارۃ، باب فرض الوضوء، حدیث نمبر 56، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 124، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب الشیء الی الجمعة، حدیث نمبر 857، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی النداء للصلوٰۃ، صفحہ 53، جلد 1 (وزارت تعلیم)

میں کہتا ہوں: رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرنا ہر حال میں اولیٰ ہے۔ پس وہ وقار اور سکون کے ساتھ چلے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کیونکہ وہ نماز میں ہے اور یہ محال ہے کہ آپ ﷺ کی خبر اس کے خلاف ہو جو آپ ﷺ نے خبر دی ہو۔ پس جس طرح نماز میں داخل ہونے والے پر سکینت اور وقار لازم ہے اسی طرح نماز کے لئے جانے والے پر ہے تاکہ اسے اس کے ساتھ مشابہت حاصل ہو اور اس کی صحت پر دلیل وہ حدیث ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اور وہ حدیث ہے جو دارمی نے اپنی مسند میں روایت کی ہے۔ حضرت کعب بن عجرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب تو وضو کرے اور مسجد کی طرف جانے کا ارادہ کرے تو اپنی انگلیوں کو انگلیوں میں مت ڈال کیونکہ تو نماز میں ہے (1)۔“ اس حدیث میں آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ صحیح ہے کہ یہ عمل جلدی چلنے سے کم ہے نماز کی طرف جانے والے کو نماز پڑھنے والے کی طرح بنایا ہے۔ یہ تمام سنن اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَاَسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ (الجمعة: 9) کا معنی واضح کرتی ہیں۔ اس سے مراد تیز چلنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد جمعہ کی تیاری کرنا ہے۔ امام مالک نے اسی طرح کی تفسیر فرمائی ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** نبی کریم ﷺ کے ارشاد وما فاتکم فاتموا (2) (جو نماز امام کے پیچھے رہ جائے اسے مکمل کرلو) اور واقض ما سبقک (3) (جو امام تجھ سے پہلے پڑھ چکا ہے اسے ادا کرلو) کی تعبیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ کیا یہ دونوں ہم معنی ہیں یا نہیں؟ بعض علماء نے فرمایا: یہ دونوں ہم معنی ہیں، کبھی قضاء کا لفظ بولا جاتا ہے اور مراد تمام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ (البقرہ: 200) (جب تم اپنے مناسک حج مکمل کرلو) اور علماء نے فرمایا: ان دونوں جملوں کا معنی مختلف ہے اور یہی قول صحیح ہے۔ اس اختلاف کی بنا پر یہ اختلاف مرتب ہوتا ہے کہ جو شخص نماز میں شریک ہوتا ہے یہ اس کی نماز کا اول ہے یا اس کی نماز کا آخر ہے، پہلے قول کی طرف مالکیوں کی رائے گئی ہے ان میں ابن قاسم بھی ہے لیکن فوت شدہ نماز کو الحمد اور سورت کے ساتھ قضا کرے۔ پس وہ افعال میں بنا کرنے والا ہوگا اور اقوال میں قضا کرنے والا ہوگا۔

ابن عبدالبر نے کہا: یہ مشہور مذہب ہے۔ ابن خویز مند اد نے کہا: وہ قول جس پر ہمارے اصحاب کا نظریہ قائم ہے وہ یہی ہے اور یہی قول اوزاعی، شافعی، محمد بن حسن، احمد بن حنبل، طبری اور داؤد بن علی کا ہے۔ اشہب نے روایت کیا ہے، یہ وہی قول ہے جو ابن عبدالحکم نے مالک سے روایت کیا ہے۔ عیسیٰ نے ابن قاسم عن مالک کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ جو اس نے امام کے ساتھ نماز پائی وہ اس کی آخری نماز ہے اور وہ افعال و اقوال میں قضا کرنے والا ہے۔ یہی کوفہ کے علماء کا قول ہے۔

قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے کہا: یہی امام مالک کا مشہور مذہب ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: جن علماء نے امام کے ساتھ پائی جانے والی نماز کو پہلی نماز قرار دیا میرا خیال ہے انہوں نے احرام (تکبیر تحریمہ) کی رعایت کی کیونکہ احرام (تکبیر تحریمہ) نماز کے آغاز میں ہوتی ہے اور تشہد اور سلام نماز کے آخر میں ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے فرمایا: جو اس نے امام کے ساتھ

1۔ جامع ترمذی، صفحہ 51، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ابواب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی کراهیۃ التشبیک بین الاصابۃ فی الصلوٰۃ

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار و سکینۃ والنہی عن اتیانہا سعیاً، صفحہ 220، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 3۔ ایضاً

نماز پائی وہ اس کی پہلی نماز ہے، اس کے ساتھ ساتھ سنت میں فاتموا کا ارشاد وارد ہے اور تمام آخر ہوتا ہے۔

دوسرے علماء نے فاتموا کے ارشاد سے حجت پکڑی ہے، وہ جو قضا کرتا ہے وہ پہلی نماز کو فوت کرنے والا ہے، مگر فاتموا کی روایت زیادہ راویوں سے مروی ہے اور اس شخص کے قول پر یہ درست نہیں جس نے کہا: جو امام کے ساتھ نماز پائی وہ پہلی نماز ہے اور یہ عام ہے مگر عبدالعزیز بن ابی سلمہ، الماجشون، المیزنی، اسحاق اور داؤد نے کہا: اگر امام کے ساتھ نماز پائے تو الحمد اور سورت پڑھے اور جب بقیہ نماز کو قضا کرنے کے لئے کھڑا ہو تو صرف الحمد پڑھے۔ یہ ان کی اصل قول اور فعل پر عام ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** اقامت نقلی نماز کے شروع کرنے سے مانع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب نماز کھڑی ہو جائے تو فرضی نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں (1)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے مگر جب کوئی پہلے نوافل شروع کر چکا ہو تو وہ انہیں نہ توڑے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَبْطُلُوا أَعْمَالَكُمْ (محمد) (اپنے اعمال کو باطل نہ کرو) خصوصاً جبکہ ایک رکعت پڑھ چکا ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: نوافل کو توڑ دے کیونکہ حدیث کا حکم عام ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** علماء کا اس شخص کے بارے اختلاف ہے جو مسجد میں داخل ہو اور اس نے فجر کی دو سنتیں نہ پڑھی ہوں۔ پھر نماز کھڑی ہو جائے۔

امام مالک نے فرمایا: امام کے ساتھ نماز میں شامل ہو جائے اور سنتیں ادا نہ کرے اور اگر مسجد میں داخل نہ ہوا ہو اور اسے ایک رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو وہ مسجد کے باہر سنتیں ادا کرے مسجد کے احاطہ میں سنتیں ادا نہ کرے۔ جہاں نماز جمعہ پڑھی جاتی ہے۔ جو مسجد سے متصل ہے۔ اگر اسے پہلی رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے۔ اور پھر یہ سنتیں اگر پڑھنا پسند کرے تو سورج طلوع ہونے کے بعد ادا کرے۔ میرے نزدیک سورج طلوع ہونے کے بعد ان کا ادا کرنا ان کے ترک سے افضل ہے۔

امام ابو حنیفہ اور ان کے مقلدین کہتے ہیں: اگر نمازی کو فرضوں کی دونوں رکعتوں کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو اور دوسری رکعت کے رکوع سے سر اٹھانے سے پہلے امام کو نہ پاسکے تو امام کے ساتھ جماعت میں شامل ہو جائے۔ اگر اسے ایک رکعت فرض پانے کی امید ہو تو فجر کی سنتیں مسجد سے باہر ادا کرے پھر امام کے ساتھ شریک ہو۔ یہی قول امام اوزاعی کا بھی ہے مگر وہ کہتے ہیں: جب تک دوسری رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو مسجد میں سنتیں ادا کرنا جائز ہے۔ ثوری نے کہا: اگر ایک رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو جماعت کے ساتھ شامل ہو جائے اور سنتیں ادا نہ کرے اور اگر رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو سنتیں پڑھ لے اگرچہ مسجد میں داخل بھی ہے۔ حسن بن حی نے کہا: جنہیں ابن حیان کہا جاتا ہے جب مقیم اقامت سن لے تو پھر فجر کی سنتوں کے علاوہ کوئی نفل نہ پڑھے۔ امام شافعی نے فرمایا: جو مسجد میں داخل ہو اور جماعت کھڑی ہو جائے تو وہ امام کے ساتھ شریک ہو جائے اور سنتیں ادا نہ کرے، نہ مسجد سے باہر اور نہ مسجد کے اندر۔ اسی طرح طبری نے کہا ہے اور امام احمد بن حنبل نے بھی یہی کہا ہے۔ امام مالک سے بھی یہی حکایت ہے اور یہ قول صحیح ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: ”جب نماز

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرين و قصر ما بہا بکراہیۃ الشراعی نافلۃ بعد شراعی المؤذن فی اقامۃ الخ، ص 247، جلد 1



کھڑی ہو جائے تو فرضی نماز کے علاوہ کوئی نماز جائز نہیں (1) اور فجر کی دو رکعتیں سنت ہیں یا فضیلت ہیں یا رغبت ہیں اور جھگڑے کے وقت حجت، سنت ہوتی ہے۔ امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے قول کی حجت وہ روایت ہے جو حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر آئے جبکہ امام صبح کی نماز پڑھا رہا تھا۔ پس حضرت ابن عمر نے حضرت حفصہ کے حجرہ میں دو سنتیں ادا فرمائیں پھر امام کے ساتھ فرض نماز پڑھی اور ثوری اور اوزاعی کی حجت میں سے وہ روایت ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے جبکہ نماز کھڑی ہو چکی تھی۔ آپ نے مسجد کے اندر ایک ستون کے پاس فجر کی دو رکعتیں ادا فرمائیں پھر نماز میں شریک ہوئے جبکہ حضرات حذیفہ اور ابو موسیٰ بھی وہاں موجود تھے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: جب فرضی نماز کو چھوڑ کر مسجد سے باہر نوافل میں مشغول ہونا جائز ہے تو مسجد کے اندر بھی مشغول ہونا جائز ہے۔ امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن ملک بن سینیہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: صبح کی نماز کھڑی ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھا جبکہ مؤذن تکبیر کہہ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو صبح کی چار رکعتیں پڑھتا ہے (2) اور یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے اس شخص پر انکار تھا جو فجر کی سنتیں مسجد میں پڑھ رہا تھا جبکہ امام فرض پڑھا رہا تھا۔ اس سے یہ استدلال کرنا بھی ممکن ہے کہ فجر کی دو سنتیں اس حال میں ادا کی جائیں تو صحیح ہیں کیونکہ آپ ﷺ نے اس کی نماز ختم نہیں کرائی جبکہ آپ ﷺ اس پر قادر تھے۔

**مسئلہ نمبر 10:** صلاۃ کا لغوی معنی دعا ہے اور صَلَّی یُصَلِّی سے مشتق ہے جس کا معنی ہے دعا کرنا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اِذَا دَعَى أَحَدُكُمْ إِلَى طَعَامٍ فَلْيَجِبْ فَإِنْ كَانَ مَضْطَرًا فَلْيَطْعَمْ وَأِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيَصِلْ (3) (جب تم میں سے کسی کو کھانے کی طرف بلایا جائے تو اس کی دعوت قبول کرے اور اگر روزے سے نہ ہو تو کھانا کھائے اور اگر روزے سے ہو تو دعا کرے)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس حدیث میں فلیصل سے مراد بھی معروف نماز ہے۔ پس وہ دعوت دینے والے کے گھر دو رکعتیں پڑھے اور واپس آجائے لیکن پہلا معنی (دعا کرنا) مشہور ہے اور اکثر علماء کا یہی نظریہ ہے۔ جب حضرت اسماء نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو جنم دیا تو حضرت اسماء نے اسے نبی کریم ﷺ کی طرف بھیجا۔ حضرت اسماء نے فرمایا: ثم مسحہ و صلّی علیہ (نبی کریم ﷺ نے اس پر ہاتھ پھیرا اور اس کے لئے دعا کی) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (توبہ: 103) یعنی ان کیلئے دعا کیجئے۔ ایشی نے کہا:

يا رب جنب ابی الاوصاب والوجعا  
نوماً فان لجنب البرء مضطجعا

تقول بنتی و قد قربت مرتحلاً  
علیک مثل الذی صلیت فاغتبطی

ان اشعار میں صلاۃ کا لفظ دعا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔  
اور ایشی نے کہا:

وقابلها الريح فی دنھا و صلی علی دنھا و ارتسم

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین و قصرہا باب کراهیۃ الشروع فی نافلۃ بعد شروع المؤمن فی اقامۃ الخ، صفحہ 247، جلد 1

ایضاً، بخاری، ابواب صلاۃ الجماعة والامامة، باب اذا اقيمت الصلوة فلا صلوة الا المكتوبة، حدیث نمبر 623، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الامر باجابة الداعی الی دعوة، صفحہ 462، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اس میں بھی صلاۃ دعا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ارتسم الوجہ کا معنی ہے، اس نے تکبیر کہی اور دعا کی۔ صحاح میں اس کا یہی معنی درج ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الصلا سے مشتق ہے اس سے مراد وہ رگ ہے جو پیٹھ کے وسط میں ہوتی ہے اور اس کے آخری حصہ میں جدا ہو جاتی ہے اور اسے گھیر لیتی ہے۔ اسی سے ہے: اخذ المصلی فی سبق الخیل، مصلی گھوڑ دوڑ میں شروع ہوا کیونکہ وہ دوڑ میں شریک ہوتا ہے اور اس کا سر سبقت لے جانے والے کے پچھلے حصہ کے قریب ہوتا ہے۔ پس الصلاۃ اس سے مشتق ہے یا اس لئے کہ نماز کا ایمان کے بعد دوسرا نمبر ہے۔ پس نماز کو گھوڑے سے تشبیہ دی گئی یا اس لئے کہ رکوع کرنے والا اپنے پچھلے حصہ کو دھرا کرتا ہے۔ الصلا، گھوڑے کی دم کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس کا تثنیہ صلوان ہے۔ المصلی، دوسرے نمبر پر آنے والے کو کہتے ہیں کیونکہ اس کا سراگلے گھوڑے کے پچھلے حصہ کے قریب ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے نمبر پر تھے دوسرے نمبر پر حضرت ابوبکر تھے اور تیسرے نمبر پر حضرت عمر تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ لزوم سے ماخوذ ہے۔ اسی سے ہے: صلی بالنار جب وہ آگ کو لازم ہو جائے۔ تَصْلٰی نَارًا حَامِيَةً ① (غاشیہ)

حارث بن عباد نے کہا:

لَمْ اَكُنْ مِنْ جَنَاتِهَا عِلْمَ اللَّهِ لَهُ دَانِيٌ بِحَرِّهَا الْيَوْمَ صَالٌ

اس شعر میں صال، کا مطلب ہے کہ اس کی گرمی کو لازم پکڑنے والا ہے۔

گویا اس صورت میں معنی یہ ہے کہ اس حد پر عبارت کو لازم پکڑنا جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ صلیت العود بالنار سے ماخوذ ہے جب تو لکڑی کو سیدھا کرے اور آگ پر گرم کر کے اسے نرم کرے۔ الصلاء، صلاء النار صاد کے کسرہ کے ساتھ ممدود ہے اگر تو صاد کو فتح دے گا تو مقصور ہوگا گویا نمازی اپنے نفس کو عبادت میں لگا کر اسے سیدھا کرتا ہے اور نرم کرتا ہے۔ الحارز نجی نے کہا:

فَلَا تَعْجَلْ بِامْرُكٍ وَاسْتَدِمَّهُ فَمَا صَلَّيْ عَصَاكَ كَسْتَدِيمُ

اس میں صلی سیدھا کرنے کے معنی میں ہے۔

الصَّلَاةُ کا معنی دعا ہے اور الصَّلَاةُ کا معنی رحمت بھی ہے۔ اسی سے ہے: اللہم صلی علی محمد (1) (اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت بھیج) اور الصَّلَاةُ کا معنی عبادت بھی ہے۔ اسی سے ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ (الانفال: 35) (یعنی ان کی عبادت بیت اللہ کے پاس نہ تھی) الصَّلَاةُ کا معنی نقل نماز بھی ہے۔ اسی معنی میں ہے: وَأَمْرًا هَلَكًا بِالصَّلَاةِ (طہ: 132) (اپنے گھر والوں کو نقلی نماز کا حکم دو)۔ صلاۃ کا معنی تسبیح بھی ہے، اسی سے ہے: فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ ② (صافات) اگر وہ نمازیوں میں سے نہ ہوتا، اسی سے سبحة الضحیٰ ہے، چاشت کی نماز۔ بعض علماء نے نُسَبُّهُمْ بِحَمْدِ (بقرہ: 30) کی تاویل میں فرمایا: ہم نماز پڑھتے ہیں۔ الصَّلَاةُ کا معنی قراءت بھی ہے۔ اس معنی میں ہے: وَلَا تُجْهَرُ

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 940، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الدعوات، باب الصلوة علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث 5880، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بِصَلَاتِكَ (الاسراء: 110) (اپنی قراءت کو بلند نہ کرو)۔

الصَّلَاةُ کا لفظ مشترک ہے۔ الصَّلَاةُ اس مکان کو بھی کہتے ہیں جس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ ابن فارس نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: علم ہے جو عبادت کے لئے وضع کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی زمانہ کو بھی شریعت سے خالی نہیں چھوڑا اور کوئی شرع نماز سے خالی نہیں تھی۔ یہ مفہوم ابو نصر القشیری نے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس قول پر اس کا کوئی اشتقاق نہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 11:** علماء اصول کا اختلاف ہے کہ کیا یہ اپنے اصلی وضعی ابتدائی لغوی معنی پر باقی ہے۔ اسی طرح ایمان، زکوٰۃ، صیام اور حج (اپنی اصلی معنی پر باقی ہیں) شرع نے مشروط و احکام کے ساتھ اس میں تصرف فرمایا۔ یا شرع کی طرف سے یہ زیادتی اسے شرع سے پہلے کی وضع ابتدائی کی طرح موضوعہ کر دیتی ہے یہاں بھی اختلاف ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ شریعت، عربی زبان میں ثابت ہے اور قرآن عربی زبان میں نازل ہوا لیکن عربوں کے لئے اسماء میں فیصلہ کا اختیار ہے جیسے دابة پر ہر اس چیز کے لئے وضع کیا گیا ہے جو زمین پر رینگ کر چلے پھر عرف نے اسے چوپایوں کے لئے خاص کر دیا اسی طرح شرع کے عرف کے لئے اسماء میں انہیں اختیار ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 12:** اس آیت میں الصَّلَاةُ کی مراد میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فرائض مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا: فرائض و نوافل سب مراد ہیں، یہی صحیح ہے کیونکہ لفظ عام ہے اور متقی فرائض و نوافل دونوں ادا کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13:** نماز رزق کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأُمُرُ أَهْلِكَ بِالصَّلَاةِ (طہ: 132) (اپنے اہل کو نماز کا حکم دو) جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورہ طہ میں آئے گا اور نماز پیٹ وغیرہ کی تکلیف کے لئے شفا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ نے ”ظہر کی نماز جلدی پڑھی میں نے بھی جلدی کی، نماز پڑھی اور میں بیٹھ گیا۔ نبی کریم ﷺ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اشکت دردہ (کیا تیرے پیٹ میں درد ہے؟) میں نے کہا: ہاں یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: اٹھو اور نماز پڑھو کیونکہ نماز میں شفا ہے (1)۔“ ایک روایت میں ہے، اشکت دردہ (یعنی تیرے پیٹ میں درد ہے) نبی کریم ﷺ کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو نماز کی طرف پناہ لیتے (2)۔

**مسئلہ نمبر 14:** نماز صحیح نہیں ہوتی مگر چند شرط اور فرائض کے ساتھ۔ نماز کی شرط میں ایک شرط، طہارت ہے جس کے احکام کا بیان سورہ نساء اور مائدہ میں آئے گا، دوسری شرط شرمگاہ کا ڈھانپنا ہے، اس کا بیان ان شاء اللہ سورہ اعراف میں آئے گا اور نماز کے فرائض یہ ہیں۔ قبلہ کی طرف منہ کرنا، نیت کرنا، تکبیر تحریمہ، اس کے لئے قیام کرنا، الحمد کی قراءت کرنا، قراءت کے لئے قیام کرنا، رکوع کرنا اس میں طہانیت کا ہونا، رکوع سے سر اٹھانا اور اس میں اعتدال کرنا، سجدہ کرنا اس میں طہانیت کا ہونا، سجدہ سے سر اٹھانا، دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا اور اس جلوس (بیٹھنے) میں طہانیت کا ہونا، دوسرا سجدہ کرنا اس میں

1۔ ابن ماجہ، کتاب الطب، باب الصلوة شفاء، حدیث نمبر 3448، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، ابواب قیام الدلیل، باب وقت قیام النبی من الدلیل، حدیث نمبر 1124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



طمہانیت کا ہونا۔ ان تمام فرائض کی اصل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو اس شخص کے بارے میں ہے جسے نبی کریم ﷺ نے نماز سکھائی تھی جب اس نے نماز صحیح ادا نہیں فرمائی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب نماز کا تو ارادہ کرے تو مکمل وضو کر، پھر قبلہ کی طرف منہ کر پھر تکبیر کہہ پھر قرآن پڑھ جو تجھے میسر ہو، پھر رکوع کرتی کہ رکوع کرتے ہوئے مطمئن ہو جائے پھر رکوع سے سر اٹھا حتیٰ کہ سیدھا کھڑا ہو جائے پھر سجدہ کرتی کہ سجدہ کرتے ہوئے مطمئن ہو جائے پھر سجدہ سے سر اٹھا حتیٰ کہ مطمئن ہو کر بیٹھ جا، پھر پوری نماز اسی اطمینان کے ساتھ ادا کر (1)۔“ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس کی مثل حضرت رفاعہ بن رافع کی حدیث ہے جسے دارقطنی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ ہمارے علماء (مالکی علماء) نے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے نماز کے ارکان کو بیان فرمایا اور اقامت اور رفع یدین سے، قراءت کی حد سے انتقالات کی تکبیر سے، رکوع و سجود کی تسبیح سے، درمیانی جلسہ سے، تشهد سے، جلسہ اخیرہ سے اور سلام سے سکوت فرمایا۔ اقامت اور سورہ فاتحہ کی تعیین پر کلام پہلے گزر چکی ہے۔ رفع یدین ہمارے علماء اور عام فقہاء کے نزدیک واجب نہیں ہے، اس کی وجہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت رفاعہ بن رافع کی حدیث ہے۔ داؤد اور بعض ان کے ساتھیوں نے کہا: رفع یدین تکبیر تحریمہ کے وقت واجب ہے۔ داؤد کے بعض ساتھیوں نے کہا: تکبیر تحریمہ، رکوع اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین واجب ہے اور جس نے ہاتھ نہ اٹھائے اس کی نماز باطل ہے۔ یہ حمیدی کا قول ہے اور اوزاعی سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ ان علماء نے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: صلوا کما رانیتمولی اصل (2) (تم نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا)۔

اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: ہم پر واجب ہے کہ ہم اس طرح کریں جس طرح ہم نے آپ ﷺ کو کرتے دیکھا کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مراد کو پہچاننے والے ہیں اور حدیث مذکور کی وجہ سے جمہور علماء کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی تکبیریں مسنون ہیں۔ ابن قاسم جو امام مالک کے شاگرد ہیں، فرماتے ہیں: جس نے نماز میں تین یا اس سے زائد تکبیریں چھوڑ دیں تو وہ سلام سے پہلے سجدہ سہو کرے۔ اگر اس نے سجدہ سہو نہ کیا تو اس کی نماز باطل ہے۔ اگر ایک تکبیر بھول گیا یا دو تکبیریں بھول گیا تو بھی سجدہ سہو کرے لیکن اگر اس صورت میں سجدہ نہ کیا تو اس پر کوئی چیز واجب نہ ہو گی۔ ابن قاسم سے مروی ہے کہ ایک تکبیر بھول جائے تو بھولنے والے پر کچھ واجب نہیں۔ یہ دلیل ہے کہ زیادہ تکبیریں اور کل تکبیریں ان کے نزدیک فرض ہیں، لیکن تھوڑی تکبیریں اگر رہ جائیں تو معاف ہیں۔ اصبح بن فرج اور عبد اللہ بن عبد الحکم نے کہا: اگر کوئی شخص ابتدا سے لے کر انتہا تک تکبیریں نہ کہے جبکہ اس نے تکبیر تحریمہ کہی ہو تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے اور اگر تکبیر تحریمہ بھول جائے تو سجدہ سہو کرے۔ اگر سجدہ نہ کرے گا تو بھی کچھ واجب نہ ہوگا۔ پس کسی کے لئے جان بوجھ کر تکبیر کو ترک کرنا مناسب نہیں کیونکہ یہ نماز کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ اگر اس کو کوئی چھوڑ دے گا تو وہ برا کرے گا اور اس پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی اور اس کی نماز ہو جائے گی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ من کل رکعۃ وانہ اذا لم یحسن الفاتحۃ الخ، صفحہ 170، جلد 1 (تدوینی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 88، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب الاذان للمساقر اذا کانوا جماعة، حدیث 595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کہتا ہوں: صحیح قول شافعی علماء، کوئی فقہاء اور اہل حدیث کی جماعت اور مالکیوں کا ہے نہ کہ ان علماء کا جو ابن قاسم کے قول کے پیروکار ہیں۔ امام بخاری نے ایک عنوان باندھا ہے باب اتمام التکبیر فی الركوع والسجود اور اس میں حضرت مطرف بن عبد اللہ کی حدیث ذکر کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: میں نے اور حضرت عمران بن حصین نے حضرت علی بن ابی طالب کے پیچھے نماز پڑھی۔ حضرت علی جب سجدہ کرتے تو تکبیر کہتے، جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو تکبیر کہتے، جب دو رکعتوں سے اٹھتے تو تکبیر کہتے، جب نماز کو حضرت علی نے مکمل فرمایا تو حضرت عمران بن حصین نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: اس شخص نے مجھے رسول اللہ ﷺ کی نماز یاد دلادی ہے یا فرمایا: اس نے ہمیں حضرت محمد ﷺ کی نماز پڑھائی۔ حضرت عمرؓ کی حدیث ہے، فرمایا: میں نے ایک شخص کو مقام ابراہیم کے پاس دیکھا جو نیچے جاتے ہوئے اور اوپر اٹھتے ہوئے تکبیر کہتا تھا اور جب کھڑا ہوتا تو تکبیر کہتا۔ میں نے حضرت ابن عباس کو یہ بتایا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: کیا یہی نبی کریم ﷺ کی نماز نہیں ہے (1) (تیری ماں نہ ہو)۔ امام بخاری نے تیری رہنمائی فرمائی کہ تکبیر ان کے نزدیک معمول ہے نہیں تھی۔

ابو اسحاق السبئی نے یزید بن ابی مریم سے انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت علی نے جنگ جمل کے دن نماز پڑھائی جس کے ساتھ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی نماز یاد دلادی۔ آپ ﷺ نیچے جاتے ہوئے، اوپر اٹھتے ہوئے، قیام کرتے ہوئے، بیٹھتے ہوئے تکبیر کہتے تھے (2)۔ حضرت ابو موسیٰ نے کہا: ہم نے یا تو ان تکبیروں کو بھول کر ترک کر دیا یا جان بوجھ کر ترک کر دیا۔ میں کہتا ہوں: کیا تو انہیں دیکھتا ہے کہ انہوں نے نماز کا اعادہ کیا۔ پس کسے کہا جاسکتا ہے کہ جس نے تکبیر کو ترک کیا اس کی نماز باطل ہے اگر یہ ایسا ہوتا تو سنت اور فرض کے درمیان فرق نہ ہوتا۔ جب کوئی چیز انفراداً واجب نہ ہو تو وہ جماعاً بھی واجب نہیں ہوتی۔ وبالله التوفیق

**مسئلہ نمبر 15:** رکوع و سجود میں تسبیح جمہور علماء کے نزدیک مذکور حدیث کی وجہ سے واجب نہیں۔ اسحاق بن راہویہ نے تسبیحات کو واجب قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک جس نے تسبیحات کو ترک کیا وہ نماز کا اعادہ کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”رکوع میں رب کی تعظیم بیان کرو اور سجدہ میں دعا میں اجتہاد کرو، یہ اس لائق ہے کہ تمہاری دعا قبول کی جائے“ (3)۔

**مسئلہ نمبر 16:** جلوس اور تشہد، اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے قبعین نے فرمایا: پہلا جلوس (قعدہ) اور اس میں تشہد سنت ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے پہلے قعدہ کو واجب کہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: یہ تمام فرائض سے مخصوص ہے کہ سجدہ کے قائم مقام ہو جاتا ہے جیسے بیچ مزانہ (☆) میں سے عرایا (☆☆) کی بیچ جائز ہے اور اجارات میں سے قراض جائز ہے، اسی طرح تکبیر تحریر کے بعد اس شخص کا وقوف جائز ہے جو امام کو رکوع کی حالت میں پائے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: اگر یہ سنت ہوتا تو جان بوجھ کر اسے ترک کرنے والے کی نماز باطل نہ ہوتی جس طرح نماز کی

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب اتمام التکبیر فی السجود، حدیث 745، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح ابن ماجہ، صفحہ 66، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ وسنت، باب التسلیم، حدیث 906، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یقال فی الركوع والسجود، صفحہ 191، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

☆ اندازہ سے بیچ کر ناجیسے درخت پر موجود پھل کی اتارے ہوئے پھل سے بیچ کرنا۔ ☆ ہبہ کے طور پر کھجور کا پھل درخت پر ہی دے دینا۔

دوسری سنن ترک کرنے کی وجہ سے نماز باطل نہیں ہوتی اور جو علماء اسے واجب نہیں کہتے انہوں نے اس طرح حجت پکڑی ہے کہ اگر یہ نماز کے فرائض میں سے ہوتا تو بھولنے والا اس کی طرف واپس آ جاتا حتیٰ کہ اسے ادا کرتا جیسا کہ اگر کوئی سجدہ ترک کر دے یا رکوع ترک کر دے تو وہ واپس آ جاتا ہے۔ اس میں وہ اسی طرح تواتر اور رتبہ کی رعایت کرتا جس طرح رکوع و سجود میں کرتا ہے پھر وہ سجدہ سہو کرتا جس طرح رکوع یا سجدہ ترک کرنے والا کرتا ہے اور پھر انہیں ادا کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن حبشیہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو رکعتوں کے بعد کھڑے ہو گئے اور تشہد پڑھنا بھول گئے۔ لوگوں نے تسبیح کہی تا کہ آپ بیٹھ جائیں، آپ سیدھے کھڑے ہو گئے اور پیچھے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو سلام سے پہلے دو سجدے سہو کے لئے کیے (1)۔ اگر بیٹھنا فرض ہوتا تو نسیان اور سہو سے ساقط نہ کرتے کیونکہ نماز میں فرائض کا حکم یہ ہوتا ہے۔ سہو اور عمدان کا ترک برابر ہوتا ہے سوائے مقتدی کے۔ نماز کے آخری جلوس کے حکم میں بھی اختلاف ہے اور اس سے جو غرض ہے اس میں اختلاف ہے۔

### مسئلہ نمبر 17: اس کے بارے علماء کے پانچ اقوال ہیں:

پہلا قول: بیٹھنا فرض ہے اور اس میں تشہد پڑھنا بھی فرض ہے اور سلام بھی فرض ہے۔ جن علماء نے یہ کہا ان میں امام شافعی، احمد بن حنبل (ایک روایت میں) ابو مصنف نے اپنی مختصر میں امام مالک اور اہل مدینہ سے یہی حکایت کیا ہے اور داؤد نے بھی یہی کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جس نے پہلا تشہد ترک کیا اور نبی کریم ﷺ پر درود ترک کیا اس پر نماز کا اعادہ نہیں ہے اور ان کے ترک کی وجہ سے اس پر سجدہ سہو ہے۔ جب کوئی بھول کر یا جان بوجھ کر تشہد ترک کر دے تو نماز کا اعادہ کرے اور ان علماء نے اس سے دلیل پکڑی ہے کہ نبی کریم ﷺ کا بیان نماز میں فرض ہے کیونکہ اس کے فرض کی اصل مجمل ہے جو بیان کا محتاج ہے مگر یہ کہ جو دلیل سے خارج ہو۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا“ (2)۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ آخری قعدہ، تشہد اور سلام واجب نہیں ہیں۔ یہ تمام سنت ہیں یہ بعض بصریوں کا قول ہے اور ابراہیم بن علیہ کا بھی یہی نظریہ ہے۔ انہوں نے آخری قعدہ کو پہلے قعدہ پر قیاس کرنے کی تصریح کی ہے۔ جمہور علماء کی اس نے مخالفت کی ہے اور ان سے جدا نظریہ قائم کیا ہے مگر وہ اس شخص پر نماز کا اعادہ لازم سمجھتے ہیں جو ان چیزوں میں سے کسی چیز کو ترک کر دے۔ ان کی حجت میں سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب امام اپنی نماز کے آخری سجدہ سے سر اٹھائے پھر اسے حدیث لاحق ہو جائے تو اس کی نماز مکمل ہو گئی۔ یہ حدیث ابو عمرو کے قول پر صحیح نہیں ہے ہم نے اسے ”کتاب المستنبس“ میں بیان کیا ہے اور یہ لفظ سلام کو ساقط کرتے ہیں جلوس (بیٹھنے) کو ساقط نہیں کرتے۔

تیسرا قول: تشہد کی مقدار بیٹھنا فرض ہے اور تشہد اور سلام بطور فرض واجب نہیں۔ یہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 85، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً کتاب القامۃ الصلوٰۃ والسنة فیہا، باب ما جاء فی الخ، حدیث 1195، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 88، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة، حدیث 595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



اور کوفیوں کی جماعت کا قول ہے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مبارک کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جو انہوں نے افریقی عبدالرحمن بن زیاد سے روایت کی ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنی نماز کے آخر میں بیٹھے پھر سلام سے پہلے اسے حدیث لاحق ہو جائے تو اس کی نماز مکمل ہوگئی (☆)۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے شیخ فخر الاسلام درس میں یہ شعر پڑھتے تھے۔

ویری الخروج من الصلوة بضربة این الضراط من السلام علیکم

وہ گوز کے ساتھ نماز سے نکلنا صحیح خیال کرتے ہیں، گوز، السلام علیکم کی جگہ کیسے ہو سکتا ہے۔

ابن عربی نے کہا: ہمارے بعض علماء نے اس مسئلہ کی وجہ سے دو ضعیف فرعی مسئلے نکالے ہیں۔ ایک وہ جو عبدالملک نے عبدالملک سے روایت کیا ہے کہ جس نے دل لگی کرتے ہوئے دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا اس نے اگر چار رکعتوں کی نیت کی تھی تو یہ اس کی دو رکعتیں جائز ہو جائیں گی یہ اہل عراق کا مذہب ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ غیر مقبول کتب میں ہے کہ امام تشہد کے بعد سلام سے پہلے جب جان بوجھ کر حدیث لاحق کرے تو اس کے مقتدیوں کی نماز جائز ہو جائے گی۔ یہ ایسی بات ہے جس کی طرف فتویٰ میں توجہ نہیں دی جاتی اگرچہ اس کے ساتھ یاد کے لئے مجالس آباد ہوں۔

چوتھا قول: جلوس اور سلام فرض ہے اور تشہد واجب نہیں، یہ حضرت مالک بن انس، آپ کے اصحاب اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے: اور انہوں نے یہ کہہ کر استدلال کیا ہے کہ تکبیر تحریمہ اور أم القرآن (سورہ فاتحہ) کے علاوہ ذکر میں سے کوئی چیز واجب نہیں۔

پانچواں قول: یہ ہے کہ تشہد اور جلوس دونوں واجب ہیں اور سلام واجب نہیں ہے۔ یہ ایک جماعت کا قول ہے جس میں اسحاق بن راہویہ بھی ہے۔ اسحاق نے حضرت ابن مسعود کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جب رسول اللہ ﷺ نے اسے تشہد کی تعلیم دی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ”جب تو اس سے فارغ ہو جائے گا تو تیری نماز مکمل ہو جائے گی اور جو تجھ پر لازم تھا وہ تو نے ادا کر دیا“ (1)۔

دارقطنی نے کہا: ”آپ ﷺ کا یہ ارشاد جب تو اس سے فارغ ہو جائے گا تو تیری نماز مکمل ہو جائے گی“ (2)۔ بعض روایوں نے اس جملہ کو زہیر کی طرف سے حدیث میں داخل کیا ہے اور اس نے نبی کے کلام کے ساتھ اس کو ملا دیا ہے اور شبابہ نے زہیر سے روایت کر کے علیحدہ ذکر کیا ہے اور اس جملہ کو حضرت ابن مسعود کے کلام سے شمار کیا ہے یہ قول زیادہ درست ہے بنسبت اس کے قول کے جس نے اس کو حدیث میں داخل کر دیا ہے۔ شبابہ ثقہ شخص ہے۔ غسان بن ربیع نے اس پر ان کی

1۔ سنن ابی داؤد، ابواب الصلوة، باب ما جاء فی وصف الصلوة، حدیث 825، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، ابواب الصلوة، باب ما جاء فی وصف الصلوة، حدیث 825، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ اختلاف کے نزدیک صورتحال یہ نہیں۔ اگر اسے اس حالت میں حدیث لاحق ہو جائے تو وہ وضو کرے گا اور بنا کرتے ہوئے سلام پھیرے گا تب نماز مکمل ہوگی جس طرح ہدایہ شریف میں اس کی تصریح ہے اور اگر وہ اس حالت میں جان بوجھ کر حدیث لاحق کرے گا تو صورتحال مختلف ہوگی۔ مترجم

متابعت کی ہے حدیث کے آخر کو اس نے بھی حضرت ابن مسعود کا کلام بتایا ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے مرفوع روایت نہیں کی۔

**مسئلہ نمبر 18:** سلام کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ واجب ہے، بعض نے فرمایا: واجب نہیں ہے لیکن حضرت عائشہ اور حضرت علی کی صحیح حدیث کی وجہ سے اس کے وجوب کا قول صحیح ہے۔ حضرت علی کی حدیث ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے اور اسے سفیان ثوری نے حضرت عبداللہ بن محمد بن عقیل سے انہوں نے حضرت محمد بن حنفیہ سے انہوں نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”نماز کی چابی طہارت ہے، اس کی تحریم تکبیر ہے اور اس کی تحلیل سلام ہے“ (1)۔ یہ حدیث تکبیر اور سلام کے وجوب میں اصل ہے کوئی دوسری چیز ان کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ عبدالرحمن بن مہدی نے کہا: اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ستر اسماء کے ساتھ نماز کو شروع کرے اور تکبیر تحریمہ نہ کہے تو یہ جائز نہ ہوگا اور اگر سلام سے پہلے حدیث لاحق ہو گیا تو بھی جائز نہ ہوگا۔ یہ عبدالرحمن بن مہدی کی طرف سے حضرت علی کی حدیث کی تصحیح ہے اور عبدالرحمن بن مہدی علم حدیث میں اور صحیح و سقیم کی پہچان میں امام ہیں۔ تیرے لئے یہی کافی ہے۔ علماء نے آغاز کے وقت تکبیر کے وجوب میں اختلاف کیا ہے:

**مسئلہ نمبر 19:** ابن شہاب زہری، سعید بن مسیب، اوزاعی، عبدالرحمن اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ تکبیر تحریمہ واجب نہیں ہے۔ امام مالک سے مقتدی کے بارے میں ایک روایت ہے جو اس قول پر دلیل ہے لیکن امام مالک کا مذہب صحیح یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ واجب ہے۔ یہ فرض ہے اور نماز کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور یہی صواب ہے اور یہی جمہور کا نظریہ ہے کہ ہر وہ شخص جس نے اس قول کی مخالفت کی اس کا مقابلہ سنت سے کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 20:** علماء کا اختلاف ہے اس لفظ کے بارے میں جس کے ساتھ نمازی نماز میں داخل ہو۔ امام مالک ان کے قبیحین اور جمہور علماء نے کہا: تکبیر کے بغیر نماز میں داخل ہونا جائز نہیں۔ تکبیر کی جگہ تحلیل، تسبیح، تعظیم اور تحمید جائز نہیں۔ یہ حجازیوں اور اکثر عراقیوں کا قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک اللہ اکبر کے علاوہ کوئی کلمہ جائز نہیں۔ امام شافعی نے بھی اسی طرح کہا ہے اور انہوں نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ اللہ الاکبر اور اللہ الکبیر بھی جائز ہے۔

امام مالک کی حجت حضرت عائشہ کی حدیث ہے، فرمایا: ”رسول اللہ ﷺ نماز کو تکبیر اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کی قرأت کے ساتھ شروع فرماتے تھے“ (2)۔ حدیث علی میں ہے نماز کی تحریم تکبیر ہے۔ اعرابی کی حدیث میں ہے: فکبر (3) (تکبیر کہہ)۔ سنن ابن ماجہ میں ہے: ہمیں ابوبکر بن ابی شیبہ اور علی بن محمد طنافسی نے بتایا۔ انہوں نے فرمایا: ہمیں ابو اسامہ نے بتایا انہوں نے کہا: مجھے عبدالحمید بن جعفر نے بتایا فرمایا: ہمیں محمد بن عمرو بن عطاء نے بتایا فرمایا: میں نے حضرت ابو حمید ساعدی کو یہ فرماتے ہوئے سنا، رسول اللہ ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو قبلہ کی طرف رخ کرتے اور اپنے ہاتھوں

1۔ جامع ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب ما جاء مفتاح الصلوۃ الطہور، صفحہ 40، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب ما یجوز من صفة الصلوۃ وما یفتاح بہ ویختم بہ وصفۃ الركوع والاعتدال الخ، صفحہ 194، جلد 1 (تذیبی کتب خانہ)

3۔ جامع ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب ما جاء مفتاح الصلوۃ الطہور، صفحہ 3، جلد 1 (وزارت تعلیم)

کو بلند کرتے اور اللہ اکبر کہتے (1)۔ یہ صریح نص ہے صحیح حدیث ہے جو لفظ تکبیر کی تعیین کر رہی ہے۔ شاعر نے کہا:

رأيت الله اكبر كل شيء محاولة و اعظمه جنوداً

میں نے دیکھا اللہ تعالیٰ از روئے تدبیر ہر چیز سے بڑا ہے اور از روئے لشکر عظیم ہے۔

پھر یہ قدم کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے جبکہ کبیر اور عظیم اس کو اپنے ضمن میں نہیں لیتے۔ پس یہ معنی میں زیادہ بلیغ ہو

گا۔ واللہ اعلم

امام ابو حنیفہ نے کہا: اگر لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ سے نماز کو شروع کرے تب بھی جائز ہے اور اگر اللھم اغفر لی کہا تو جائز نہ ہوگا محمد بن حسن کا بھی یہی قول ہے۔ ابو یوسف نے فرمایا: جب تکبیر اچھی طرح کہہ سکتا ہو تو اور کلمات جائز نہیں۔ حکم بن عتیبة نے فرمایا: جب تکبیر کی جگہ اللہ کا ذکر کر دے تو جائز ہوگا۔ ابن منذر نے کہا: میں اس بات میں علماء کا اختلاف نہیں جانتا کہ جو قرأت اچھی طرح کر سکتا ہو وہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ اور تکبیر کہہ دے اور قراءت نہ کرے تو اس کی نماز فاسد ہے۔ پس جس کا یہ مذہب ہے اس کو یہ کہنا لازم ہے کہ تکبیر کی جگہ کوئی دوسرا کلمہ جائز نہ ہو جیسا کہ قراءت کی جگہ کوئی دوسرا کلمہ جائز نہیں۔

امام ابو حنیفہ نے فرمایا: فارسی میں تکبیر جائز ہے اگرچہ عربی اچھی طرح جانتا بھی ہو۔ ابن المنذر نے کہا: یہ جائز نہیں کیونکہ اس میں مسلمانوں کی جماعات سے اختلاف ہے اور اس کا خلاف ہے جو نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو سکھایا۔ ہم کوئی ایسا شخص نہیں جانتے جس نے امام ابو حنیفہ کی اس قول میں موافقت کی ہو۔

**مسئلہ نمبر 21:** امت کا تکبیر تحریرہ کے وقت نیت کے وجوب پر اتفاق ہے۔ جو ہمارے اصحاب نے روایت کیا ہے اس پر مزید کلام آیت طہارت میں آئے گا۔ اس کی حقیقت آمر کے تقرب کا قصد کرنا ہے ایسے فعل کے ساتھ جس کا اس نے حکم دیا ہے جیسا کہ اس نے وہ فعل طلب کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: نیت میں اصل یہ ہے کہ اس کا عقد، اس فعل کے کرنے کے ساتھ ہو جس کی نیت کی گئی ہے یا استصحاب کی شرط کے ساتھ اس فعل سے قبل نیت ہو۔ اگر پہلے نیت کی ہو پھر غفلت طاری ہو جائے حتیٰ کہ اس حالت میں عبادت میں تلبس واقع ہو تو اس نیت کا اعتبار نہ ہوگا جس طرح اس نیت کا اعتبار نہیں ہوتا جب فعل میں تلبس کے بعد واقع ہو۔ روزے میں نیت کے مقدم کرنے کی رخصت دی گئی ہے کیونکہ اس کے آغاز میں نیت متصل کرنے میں حرج واقع ہوتی ہے۔

ابن عربی نے کہا ابو الحسن قرونی نے ہمیں عسقلان کی سرحد پر کہا کہ میں نے امام الحرمین کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ انسان نماز پڑھتے وقت نیت کرے اور وہ صانع میں نظر کرے، عالم کے حدوث کو دیکھے نبوت کو دیکھے، حتیٰ کہ اس کی نظر نماز کی نیت تک پہنچ جائے۔ فرمایا: اس کے لئے اسے طویل زمانہ کی ضرورت نہیں بلکہ یہ ایک لمحہ میں ہو سکتی ہے کیونکہ جملوں کی تعلیم تو طویل زمانہ کی محتاج ہے اور ان چیزوں کو ذہن میں یاد کرنا ایک لمحہ میں ہوتا ہے۔ نیت کی تکمیل میں سے یہ ہے کہ نیت پوری نماز میں متصل ہو مگر جب یہ امر مشکل ہو تو شریعت نے نماز کے درمیان میں نیت کے جدا ہونے کو معاف فرما دیا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 58، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، ابواب اقامة الصلوة وانسنة فیہا باب افتتاح الصلوة، حدیث 794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



میں نے اپنے شیخ ابوبکر الفہری (☆) کو مسجد اقصیٰ میں یہ فرماتے سنا کہ محمد بن سحنون (☆☆) نے فرمایا: میں نے اپنے باپ سحنون کو دیکھا بعض دفعہ جب وہ نماز مکمل کر لیتے تو دوبارہ پڑھتے۔ میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا: نماز کے دوران میری نیت جدا ہو گئی تھی اسی وجہ سے میں نے نماز کا اعادہ کیا۔

میں کہتا ہوں: یہ نماز کے اجمالی احکام تھے اور تفصیلی احکام اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اپنے اپنے مقام پر آئیں گے۔ رکوع، جماعت کے ساتھ نماز، قبلہ، اوقات کی طرف جلدی کرنا اور نماز خوف کا ذکر تو اسی سورت میں آجائے گا۔ قصر نماز اور خوف کی نماز سورہ نساء اور اوقات کا ذکر سورہ ہود، سبحان اور سورہ روم میں آئے گا اور رات کی نماز (تہجد) کا ذکر سورہ المزمل میں آئے گا اور سجدہ تلاوت کا ذکر سورہ اعراف میں آئے گا اور سجدہ شکر کا ذکر سورہ ص میں آئے گا۔ ان شاء اللہ ہر ایک کا ذکر اپنی جگہ آئے گا۔

### مسئلہ نمبر 22: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ①

رَزَقْنَاهُمْ کا معنی ہے، ہم نے انہیں عطا کیا۔ اہل سنت کے نزدیک رزق سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے نفع حاصل کرنا صحیح ہو خواہ وہ حلال ہو یا حرام ہو۔ معتزلہ کا مسلک اس کے مخالف ہے۔ ان کے نزدیک حرام رزق نہیں ہے کیونکہ اس کا تملک صحیح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ حرام عطا نہیں فرماتا بلکہ حلال عطا فرماتا ہے اور رزق ملک کے معنی میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر ایک بچہ چوروں کے ساتھ پرورش پائے اور اس نے کچھ نہ کھایا مگر وہ جو چوروں نے اسے کھلایا حتیٰ کہ وہ بالغ ہوا، طاقتور ہوا اور چور بن گیا پھر وہ ہمیشہ چوری کرتا رہا اور مرتے دم تک چوری کا مال کھاتا رہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے کوئی چیز عطا نہ فرمائی کیونکہ اس کا اسے مالک نہیں بنایا تھا اور وہ مر گیا اور اس نے اللہ کے رزق سے کچھ نہ کھایا۔

یہ قول اور نظریہ فاسد ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رزق بمعنی تملیک ہوتا تو واجب تھا کہ بچے کو رزق نہیں دیا گیا اور ان جانوروں کے بچوں کو بھی رزق نہیں ملا کیونکہ ان کی ماؤں کے دودھ کا مالک تو ان کا مالک تھا نہ کہ جانوروں کے بچے۔

جب امت کا اس پر اجماع ہے کہ بچہ اور جانوروں کے بچے اور دوسرے جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں رزق دیتا ہے حالانکہ وہ مالک نہیں ہوتے۔ پس معلوم ہوا کہ رزق صرف غذا ہے کیونکہ امت کا اجماع ہے کہ غلاموں اور جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں رزق دیتا ہے جبکہ وہ مالک نہیں ہوتے۔ پس معلوم ہوا رزق ۱۱ ہے جو ہم نے بیان کیا نہ کہ وہ جو معتزلہ نے بیان کیا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرِ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (فاطر: 3)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ② (الذاریات) (بلاشبہ اللہ ہی (سب کو) روزی دینے والا قوت والا (اور) زور والا ہے) اور فرمایا: وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ يَرْزُقُهَا (ہود: 6) (اور نہیں کوئی جاندار زمین میں مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق)۔ یہ آیات قطعی ہیں، اللہ تعالیٰ حقیقہ رازق ہے اور بندہ مجاز رازق ہے کیونکہ اس کا مالک ہونا عارضی ہے جیسا کہ ہم نے سورہ فاتحہ میں بیان کیا ہے۔ بندے کو بھی حقیقہ ان جانوروں کی طرح رزق

دیا گیا ہے جن کو کوئی ملکیت حاصل نہیں ہوتی مگر جب اسے کسی چیز کے حاصل کرنے کا اذن دے دیا گیا تو وہ حکماً اس کے لئے حلال ہوگی اور جس کے استعمال کی اجازت نہیں دی گئی تو اس کا لینا حکماً حرام ہے اور یہ تمام رزق ہے۔

بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استنباط کیا ہے: **كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلَدًا طَيِّبَةً وَرَبُّ غَفُورٌ** (سبا) (کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور اس کا شکر ادا کرو اتنا پاکیزہ شہر اور ایسا رب غفور)۔  
فرمایا: مغفرت کا ذکر یہ اشارہ کرتا ہے کہ رزق کبھی حرام بھی ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 23:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ رِزْقًا مِّنْ دُونِهَا** اور الرزق کا اور الرزق راء کے فتح کے ساتھ مصدر ہے اور الراء کے کسرہ کے ساتھ اسم ہے اس کی جمع الرزاق ہے اور الرزاق کا مطلب ہے الرزاقیہ اولی سفید کپڑوں کو کہتے ہیں۔ الرزق الجند کا مطلب ہے دس بکریوں نے اپنا اپنا رزق حاصل کیا۔ الرزقۃ ایک مرتبہ لینا، اہل لغت نے اسی طرح کہا ہے۔ ابن سکیت نے کہا: الرزق کا معنی از دشنہ لغت میں شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں رزق کا معنی شکر ہے: **وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنْتُمْ تُكَلِّبُونَ** (واقعہ) یعنی تمہارا شکر جھٹلانا ہے۔ رزقنی کا معنی ہے: شکریں اس نے میرا شکر ادا کیا۔

**مسئلہ نمبر 24:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يُفْقُونَ** اس کا معنی ہے: وہ نکالتے ہیں۔ انفاق کا معنی ہاتھ سے مال نکالنا ہے اسی سے ہے نفق البیع یعنی بیع بائع کے ہاتھ سے نکل کر خریدنے والے کے ہاتھ میں چلی گئی۔ نفقت الدابة یعنی جانوروں کی روح نکل گئی۔ اسی سے ہے: النفاق اس چوہے کی بل کو کہتے ہیں جب وہ اپنی بل سے نکل جاتا ہے، جب بل کی دوسری طرف کو اختیار کرتا ہے اسی سے المنافق ہے کیونکہ وہ ایمان سے نکل جاتا ہے یا ایمان اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ نيفق السراويل معروف ہے۔ شلوار کا وہ حصہ جہاں سے پاؤں نکالا جاتا ہے۔ نفق الزاد کا معنی ہے زاد راہ ختم ہو گیا، مالک نے اسے خرچ کر دیا۔ انفق القوم قوم کا زاد راہ ختم ہو گیا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِذَا لَأَمَسْتُمْ خَشْيَةَ الْإِنْفَاقِ** (الاسراء: 100) (سو اس وقت تم ضرور ہاتھ روک لیتے اس خوف سے کہ کہیں) (سارے خزانے) ختم ہی نہ ہو جائیں)۔

**مسئلہ نمبر 25:** اس آیت میں نفقہ کی مراد کو متعین کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد فرضی زکوٰۃ ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ فرضیہ ہے کیونکہ اس کے ساتھ نماز کا ذکر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد انسان کا اپنے اہل پر خرچ کرنا ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ اپنے گھر والوں پر خرچ کرنا افضل صدقہ ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ایک دینار وہ ہے جو تو نے اللہ کے راستہ میں خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے غلام آزاد کرنے میں خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے مسکین پر خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے اپنے اہل پر خرچ کیا، ان سب سے از روئے اجر کے عظیم وہ دینار ہے جو تو نے اپنے اہل پر خرچ کیا (1)“۔ حضرت ثوبان سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”افضل دینار وہ ہے جو آدمی اپنے عیال پر خرچ کرتا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقة على العیال والعلوک واثم من ضیعهم او حبس الخ، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ہے اور وہ دینار جو اللہ کے راستہ میں (جہاد کے لئے) اپنی سواری پر خرچ کرتا ہے اور وہ دینار ہے جو اللہ کے راستہ میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرتا ہے۔ ابو قلابہ نے کہا: عیال سے آغاز فرمایا پھر ابو قلابہ نے کہا: کون سا شخص اس شخص سے زیادہ اجر والا ہے جو اپنے چھوٹے بچوں پر خرچ کرتا ہے وہ انہیں بچاتا ہے یا اللہ تعالیٰ انہیں اس کے ساتھ نفع دیتا ہے اور انہیں غنی کرتا ہے“ (1)۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد نفلی صدقہ ہے۔ ضحاک سے مروی ہے کہ زکوٰۃ کا ذکر لفظ مخصوص زکوٰۃ کے ساتھ آتا ہے جب زکوٰۃ کے علاوہ خرچ کرنے کا ذکر آئے تو فرضی اور نفلی دونوں کا احتمال ہوتا ہے اور جب انفاق کے لفظ کے ساتھ آئے تو نفلی خرچ ہی مراد ہوتا ہے۔ ضحاک نے کہا: نفقہ ایک قرب تھا لوگ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب اپنے اخلاص کے مطابق حاصل کرتے تھے حتیٰ کہ فرضی صدقات اور ناسخات کا حکم سورہ برأت میں نازل ہوا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ وہ واجبی حقوق ہیں جو مال کو لاحق ہوتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب اسے نماز کے ساتھ ملایا تو یہ فرض تھا جب لفظ زکوٰۃ سے عدول فرمایا تو زکوٰۃ کے علاوہ فرض مراد ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ عام ہے اور یہی صحیح قول ہے کیونکہ یہاں جو انہیں دیا گیا ہے اس سے خرچ کرنا مدح کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور یہ صرف حلال مال میں ہوتا ہے یعنی وہ عطا کرتے ہیں جو شرع نے اس پر لازم کیا زکوٰۃ اور دوسرے مالی حقوق جو بعض احوال میں لاحق ہوتے ہیں جبکہ اس خرچ کی طرف انہیں رغبت بھی دی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: ایمان بالغیب، دل کا نصیبہ ہے اور نماز قائم کرنا بدن کا حصہ ہے اور مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ مال کا حصہ ہے اور یہ ظاہر ہے۔ بعض متقدمین مفسرین نے مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ کی تاویل میں فرمایا: جو ہم نے انہیں سکھایا وہ سکھاتے ہیں۔ یہ ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الکریم القشیری نے حکایت کیا ہے۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۖ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿١٠﴾

”اور وہ جو ایمان لائے اس پر (اے حبیب! سنیٰ علیہ السلام) جو اتارا گیا ہے آپ پر اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں“۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد اہل کتاب کے مؤمن ہیں جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام۔ ان کے بارے یہ آیت نازل ہوئی اور پہلی آیت عرب کے مؤمنین کے بارے نازل ہوئی۔ بعض نے فرمایا: دونوں آیتیں مؤمنین کے بارے نازل ہوئیں۔ اسی بنا پر الَّذِينَ کا اعراب عطف کی وجہ سے مجرور ہے اور استیناف کی بنا پر رفع ہونا بھی صحیح ہے یعنی اس سے پہلے ہم ضمیر مبتدا مخدوف ہوگی اور جنہوں نے دونوں آیتوں سے دونوں علیحدہ علیحدہ قسمیں مراد لی ہیں ان کے نزدیک الَّذِينَ کا اعراب مبتدا ہونے کی وجہ سے رفع ہے اور اس کی خبر اُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى ہے اور عطف کے احتمال کی وجہ سے جر کا احتمال بھی رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد بِمَا أُنْزِلَ اس سے مراد قرآن ہے وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ سے مراد سابقہ کتب ہیں بخلاف اس کے جو یہود و نصاریٰ نے کہا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کے متعلق بتایا وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْكُتُوا بِمَا أُنْزِلَ اللَّهُ قَالُوا تَوَاضَعُوا لِمَا يُرْسَلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِمْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقة على العيال والملك واثم من ضيعهم او حبس الخ، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)



عَلَيْنَا (البقرہ: 91) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر)۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ تو یہود و نصاریٰ نے کہا ہم غیب پر ایمان لائے جب یہ آیت نازل ہوئی وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ تو انہوں نے کہا: ہم نماز پڑھتے ہیں۔ جب وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ کا حکم نازل ہوا تو کہنے لگے: ہم خرچ کرتے ہیں اور صدقہ کرتے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی: وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ تو بدک پڑے۔ حضرت ابوذر کی حدیث میں ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! مَنَّا نَزَّلَ كَتَبَ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک سو چار کتب نازل فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے شیث علیہ السلام پر پچاس صحیفے نازل فرمائے اور اخنوخ (حضرت ادریس علیہ السلام) پر تیس صحیفے نازل فرمائے۔ حضرت ابراہیم پر دس صحائف نازل فرمائے، تورات سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دس صحیفے نازل فرمائے۔ تورات، انجیل۔ زبور اور فرقان نازل فرمائیں۔ اس حدیث کو حسین آجری اور ابو حاتم البستی نے نقل کیا ہے۔

ایک مسئلہ: اگر کہنے والا کہے سابقہ تمام کتب پر ایمان لانا کیسے ممکن ہے جبکہ ان کے احکام منافی ہیں؟ اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں: (۱) یہ ایمان لانا ضروری ہے کہ تمام کتب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ یہ اس شخص کا قول ہے جس نے پہلی شریعتوں کی پابندی کرنے کو ساقط کر دیا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ان سے ایمان لانا منسوخ نہیں ہوا۔ یہ اس شخص کا قول ہے جس نے متقدمہ شرائع کے التزام کو واجب قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالْآخِرَةُ هُمْ يُوَفَّقُونَ (یعنی وہ قیامت کے دن دوبارہ اٹھنے کے متعلق جانتے ہیں)۔ الیقین اس علم کو کہتے ہیں جس میں شک نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: یقنت الامر یقناً وایقنت واستیقنت وتیقنت ان تمام کا معنی ایک ہے میں یقین پر ہوں۔ موقن میں یا ماقبل ضمہ کی وجہ سے واو سے بدل گئی ہے جب تو اس کی تصغیر بنائے گا تو اصل کی طرف لوٹا دے گا۔ تو کہے گا: مُيَيَّنٌ تصغیر اشیاء کو اپنے اصل کی طرف لوٹا دیتی ہے اسی طرح جمع بھی اشیاء کو اپنے اصل کی طرف لوٹا دیتی ہے۔ بعض اوقات ظن کو یقین کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اس سے لغو قسم میں ہمارے علماء کا قول ہے کہ وہ اللہ کی قسم اٹھائے ایک ایسے امر پر جس کا اسے گمان ہو پھر اس کے لئے ظاہر ہو کہ معاملہ تو اس کے خلاف تھا تو اس پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی۔

شاعر نے کہا:

تَحَسَّبْ هَوَا سَ دَايِقِنَ اِنِ      بَهَا مَفْتَدٍ مِّنْ وَّاحِدٍ لَا اَغَامِرُهُ

آخرت، تاخر سے مشتق ہے ہم سے اس کے تاخر کی وجہ سے اور ہمارے اس سے تاخر کی وجہ سے اسے آخرت کہا جاتا ہے جیسا کہ دنیا، دنو سے مشتق ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

أُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ⑤

”وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب (کی توفیق) سے اور وہی دونوں جہان میں کامیاب ہیں۔“

نحاس نے کہا: اہل مجد کہتے ہیں: اَلَاكَ، بعض کہتے ہیں: اَلَا لَكَ، ک خطاب کے لئے ہے۔ کسائی نے کہا: جس نے اُولَئِكَ

کہا اس کا واحد ذالک ہے اور جس نے الاک کہا اس کا واحد ذاک ہے اور اُولَک، اولئک کی مثل ہے۔ ابن سکیت نے شعر کہا ہے:

الاک قومى لم یکنوا اشابة و هل یعظ الضلیل الا الاکا

اس شعر میں الاک کا معنی اولئک ہے۔

بعض کہتے ہیں: اولئک غیر عقلاء کے لئے ہے۔ شاعر نے کہا:

ذم المنازل بعد منزلة اللوی والعیش بعد اولئک الايام

اس میں اولئک غیر عقلاء کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴿١٠﴾ (الاسراء)

ہمارے علماء نے فرمایا: قَمِنْ تَرَبُّهُمْ کے کلمات میں قدر یہ وارد ہے جو کہتے ہیں کہ وہ ایمان اور ہدایت خود گھڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول سے پاک ہے۔ اگر بات اس طرح ہوتی جس طرح قدر یہ نے کہا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا: من انفسهم اس پر اور ہدئی پر کلام گزر چکی ہے اس کے اعادہ کا کوئی فائدہ نہیں۔

وَ اُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ، هُمْ میں یہ بھی جائز ہے کہ یہ دوسرا مبتدا ہو اور اس کی خبر الْمُفْلِحُونَ ہو۔ پھر یہ مبتدا خبر اُولَئِكَ مبتدا کی خبر ہوں، اور یہ بھی جائز ہے کہ هُمْ زائدہ ہو۔ بھری علماء اسے فاصلہ کہتے ہیں اور کوئی علماء اسے عماد کہتے ہیں اور الْمُفْلِحُونَ، اُولَئِكَ کی خبر ہو۔

الفلح کا لغوی معنی الشق اور القطع (پھٹنا اور کاٹنا) ہے۔ شاعر نے کہا

ان الحديد بالحديد يفلح

لوہے کے ساتھ لوہا کاٹا جاتا ہے۔

اسی سے فلاح الارضین ہے جو زمین کو کھیتی کے لئے پھاڑتا ہے۔ یہ مفہوم ابو عبید نے بیان کیا ہے اسی وجہ سے کسان کو فلاح کہا جاتا ہے، جس کا نچلا ہونٹ کاٹا گیا ہو اسے افلاح کہا جاتا ہے۔ جس کا شق ظاہر ہو۔ گویا مفلح مصائب و مشکلات کو کاٹتا جاتا ہے حتیٰ کہ اپنا مطلوب حاصل کر لیتا ہے، کبھی یہ غور و بقا میں استعمال ہوتا ہے، یہ لغت میں اس کی اصل ہے۔ اس سے مرد کو اپنی بیوی کو یہ کہنا ہے۔

استفدحی بامرک اس کا معنی ہے: اپنے امر میں کامیاب ہو جا۔ شاعر نے کہا:

لو کان من مدرك الفلاح ادرکه ملاعب الرماح

اس میں فلاح کامیابی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اضبط بن قریع سعدی نے زمانہ جاہلیت میں کہا تھا:

لکل هم من الهموم سعه والسق والصبح لا فلاح معه

شاعر نے یہاں بھی فلاح کو کامیابی و کامرانی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

کسی نے کہا:

ليس مع كثرة الليل والنهار بقاء  
رات اور دن کی گردش کے ساتھ بقاء نہیں۔

ایک اور نے کہا:

﴿

نَجَلْ بِلَاداً كُلَّهَا حُلْ قَبْلُنَا  
ہم ان تمام شہروں میں اترے جس طرح ہمارے بزرگ اترے اور ہم عاد اور حمیر کے بعد فلاح کی امید کرتے ہیں۔  
عبید نے کہا:

افلح بما شئت فقد يدرك بالضر  
عف و قد يخدم الاريب

جس کے ساتھ چاہے کامیاب ہو جا، ضعف و کمزوری ضرور آئے گی، کبھی ذہین و فطین بھی دھوکا کھا جاتا ہے۔  
أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥﴾ کا معنی ہے جنت کی کامیابی حاصل کرنے والے اور اس میں باقی رہنے والے۔ ابن ابی اسحاق نے کہا: الْمُفْلِحُونَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے وہ سب کچھ پالیا جو انہوں نے طلب کیا اور اس شر سے بچ گئے جس سے وہ بھاگے تھے، یہ ایک معنی ہے۔ کبھی الفلاح، السحور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں یہ حدیث ہے ”حقى كاد يفوتنا الفلاح مع رسول الله ﷺ قلت و ما الفلاح قال السحور“ (1) حتیٰ کہ قریب تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارا فلاح فوت ہو جاتا۔ میں نے پوچھا: الفلاح کیا ہے؟ فرمایا: سحری کا کھانا۔ تو حدیث کا معنی یہ ہے کہ سحری کھانے کے ساتھ روزے کی بقا ہے، اسی وجہ سے سحری کے کھانے کو فلاح کہا جاتا ہے الفلاح، کراہیہ پر جانور دینے والے کو کہتے ہیں۔

لها رطل تكيل الزيت فيه وفلاح يسوق لها جبارا

پھر الفلاح عرف میں، مطلوب کی کامیابی اور خوفناک چیز سے نجات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی کہنے والا کہے کہ حمزہ نے یہ کیسے پڑھا۔ علیہم والیہم ولدیہم جبکہ، من ربہم اور فیہم اور جنتیہم نہیں پڑھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ علیہم الیہم ولدیہم میں یا الف سے بدلی ہوئی ہے۔ اصل میں علاہم، لداہم اور الاہم تھے۔ پس ہا اپنے ضمہ پر قائم ہے اور فیہم، من ربہم اور جنتیہم میں ایسا نہیں ہے۔ کسائی نے علیہم الذلہ اور الیہم اثنین میں حمزہ کی موافقت کی ہے۔ ان کے متعلق قراء سے یہی معروف ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠﴾

”بے شک جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ہے یکساں ہے ان کے لئے چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔“

جب پہلے مومنین اور ان کے احوال کا ذکر فرمایا تو کافروں اور ان کے انجام کا اب ذکر ہو رہا ہے۔ کفر، ایمان کی ضد ہے،

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فقہا، باب ما جاء فی قیام شہر رمضان، حدیث نمبر 1316، خیار القرآن پبلی کیشنز



آیت میں یہی مراد ہے کبھی کفر کا لفظ نعمت اور احسان کی ناشکری کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، حدیث کسوف میں عورتوں کے متعلق نبی کریم ﷺ کا ارشاد اسی معنی میں ہے۔ فرمایا: و رایت النار قدام منظرأ کالیوم قط افظعم و رایت اکثر اهلها النساء قیل بیا رسول اللہ ﷺ قال بکفر من قیل ایکفرن بالله قال یکفرن العشیرو یکفرن الاحسان لو احسنت الی احداهن الدهر کلہ ثم رات منك شیئاً قالت ما رایت منك خیراً قط (1) (بخاری) میں نے جہنم دیکھی اور میں نے آج کی طرح کبھی خوفناک منظر نہیں دیکھا۔ میں نے دوزخ میں اکثر عورتوں کو دیکھا۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! ﷺ ایسا کیوں؟ فرمایا: ان کے کفر کی وجہ سے۔ عرض کی گئی: کیا یہ اللہ سے کفر کرتی ہیں؟ فرمایا: یہ خاوند کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان کی ناشکری کرتی ہیں۔ اگر تو ان میں سے کسی سے پورا زمانہ احسان بھی کرے کبھی تجھ سے کوئی تھوڑی سی کمی دیکھے گی تو کہے گی: میں نے تجھ سے کبھی خیر نہیں دیکھی۔

عرب کلام میں کفر کی اصل ڈھانپنا اور پردہ ڈالنا ہے۔ شاعر کا قول ہے: فی لیلة کفر النجوم غمامها۔ (رات کے بادلوں نے ستاروں کو چھپا دیا)۔ اسی وجہ سے رات کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی تاریکی کے ساتھ ہر چیز کو چھپا لیتی ہے۔ شاعر نے کہا:

فتذکرا ثقلاً رشیداً بعدما اقلت ذکاء یسینها فی کافر

یہاں کافر ڈھانپنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ذکاء، (ذال کے ضمہ اور مد کے ساتھ) یہ سورج کا اسم ہے۔

اسی سے شاعر کا قول ہے:

فوردت قبل انبلاج الفجر و ابن ذکاء کامن فی کفر

وہ فجر پھوٹنے سے پہلے آئی جبکہ سورج رات میں چھپا ہوا تھا۔

کافر دریا، اور بڑی نہر کو کہتے ہیں، کافر، کسان کو بھی کہتے ہیں اس کی جمع کفار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کَسَّابٌ خَیْثُ أَغْجَبَ الْكُفَّاءَ نَبَاتُهُ (الحجید: 20) یعنی کسان، کیوں کہ وہ دانے کو (زمین میں) چھپاتے ہیں۔ رماد مکفور چھپائی گئی را کہ۔ سفت الريح عليه التراب ہوانے اس پر مٹی اڑائی۔ الکافر من الارض اس جگہ کو کہا جاتا ہے جو لوگوں سے دور ہو اور کوئی وہاں اترتا نہ ہو اور کوئی وہاں سے گزرتا نہ ہو۔ پس جو ایسی جگہوں پر اتریں انہیں اهل الکفور کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: الکفور یعنی دیہات۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَوَّآءٌ عَلَيْهِمْ یَعْنٰی اَنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِمْ اَوْ لَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِمْ اِنَّهُمْ کَانُوا عَمٰیً (الشعراء: 136) کی وجہ سے استفہام کو لایا گیا۔ اس کی مثل ہے: سَوَّآءٌ عَلَیْنَا اَوْ عَطَتْ اَمْرٌ لَمْ تَكُنْ فِی الْوَعْدِ (الشعراء: 136) شاعر نے کہا: اسی مفہوم کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، 144، (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، ابواب الکسوف، باب صلوة الکسوف جماعة، حدیث نمبر 993، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

و لیل یقول الناس من ظلماتہ  
سواء صحیحات العیون و عورها  
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اَنْذَرْتَهُمْ** الانذار کا معنی ابلاغ اور اعلام (آگاہ کرنا) ہے اور یہ معنی صرف تخویف (ڈرانے) کی صورت میں ہوتا ہے جس سے بچنے کا زمانہ وسیع ہو۔ اگر بچنے کے لئے اس کا زمانہ وسیع نہ ہو تو اشعار ہوگا، انداز نہ ہوگا۔ شاعر نے کہا:

انذرت عمراً و هو فی مہل قبل الصباح فقد عصى عمرو

تناذرینو فلان هذا الامر، بولا جاتا ہے جب بعض، بعض کو اس امر سے ڈرائیں۔

علماء نے اس آیت کی تاویل میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ لفظ کے اعتبار سے عام ہے اور اس کا معنی اس شخص کے حق میں خاص ہے جس پر عذاب کا کلمہ ثابت ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ کفر پر مرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ آگاہ کر دے اس بات پر کہ لوگوں میں اس حال والے بھی کچھ لوگ ہوں گے، کسی کو متعین نہیں فرمایا۔ حضرت ابن عباس اور بکلی نے فرمایا: یہ آیت یہود کے رؤساء کے بارے نازل ہوئی جس میں حی بن اخطب، کعب بن اشرف اور ان جیسے دوسرے یہودی تھے۔ حضرت ربیع بن انس نے کہا: یہ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو کفار کے سرداروں میں بدر کے دن قتل ہوئے تھے (1)۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ پس جنہوں نے کسی کو متعین کیا اس کی مثال اس شخص کی ہے جس پر غیب کھل گیا کہ اس کی موت کفر پر ہوگی۔ یہ اس آیت کے ضمن میں داخل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لَا يُؤْمِنُونَ** یہ ترکیبی اعتبار سے مرفوع ہے اور ان کی خبر ہے، یعنی جنہوں نے کفر کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ بعض نے فرمایا: یہ ان کی خبر ہے سو آئے اور اس کے بعد والا کلام صلہ کے قائم مقام ہے۔ یہ ابن کیسان کا قول ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: سو آئے مبتدا کے اعتبار سے مرفوع ہے **وَ اَنْذَرْتَهُمْ** امر لَمْ تُنْذِرْتَهُمْ خبر ہے، اور پورا جملہ ان کی خبر ہے۔ نحاس نے کہا: یعنی وہ بیوقوف ہیں انہیں ڈرانا کچھ مفید نہیں۔

**وَ اَنْذَرْتَهُمْ** کی قراءت میں قراء کا اختلاف ہے۔ اہل مدینہ، ابو عمرو، اعمش اور عبد اللہ بن ابی اسحاق نے پہلے ہمزہ کی تحقیق اور دوسرے ہمزہ کی تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے، خلیل اور سیبویہ نے اسی کو پسند کیا ہے۔ یہ قریش اور سعد بن بکر کی لغت ہے، اسی کے مطابق شاعر کا قول ہے۔

ایا ظبیہ الوعاء بین جلاجل و بین النقا آنت ام ام سالم

اس میں آنت پہلے ہمزہ کی تحقیق اور دوسرے ہمزہ کی تسہیل کے ساتھ ہے۔

اس شعر میں آنت ایک الف کے ساتھ آیا ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

تطاللت فا ستشرفتہ فعرفتہ ققلت له آنت زید الارانب

میں نے اسے جھانک کر دیکھا اور اسے پہچان لیا میں نے اسے کہا: کیا تو خرگوشوں والا زید ہے۔

ابن محیسن سے مروی ہے کہ انہوں نے انذرتہم امر لم تنذرہم پڑھا ہے یعنی صرف ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اس کے بعد الف نہیں پڑھا، دو ہمزوں کے جمع ہونے کی وجہ سے ایک کو حذف کیا گیا ہے یا اس لئے کہ امر مستفہام پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا:

تروح من الحی ام تبتکی و ماذا یضیک ولو تنتظر  
اس میں شاعر نے ہمزہ کو حذف کیا ہے۔

تروح سے مراد اُتروح لیا ہے اور امر پر اکتفا کیا ہے۔ ابن ابی اسحاق سے مروی ہے کہ انہوں نے (اُانذرتہم) پڑھا ہے۔ پس انہوں نے دو ہمزوں کو قائم رکھا ہے اور ان کے درمیان الف داخل کیا ہے تاکہ دو ہمزے جمع نہ ہوں۔ ابو حاتم نے کہا: ان دو ہمزوں کے درمیان الف داخل کرنا اور دوسرے ہمزہ کو تخفیف کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ ابو عمرو، اور نافع اکثر ایسا کرتے تھے۔ حمزہ، عاصم اور کسائی نے دو ہمزوں کے ثبوت کے ساتھ پڑھا ہے (1) یہ ابو عبیدہ کا پسندیدہ قول ہے اور خلیل کے نزدیک یہ بعید ہے۔ سیبویہ نے کہا: یہ ثقل میں صَنِئُوا کے مشابہ ہے۔ اخفش نے کہا: پہلے ہمزہ کی تخفیف اولیٰ ہے۔ یہ قول ردیٰ ہے کیونکہ عرب استثقال کے بعد اور ایک حرف کی ادائیگی کے بعد تخفیف کرتے ہیں۔ ابو حاتم نے کہا: دو ہمزوں کی تخفیف جائز ہے۔ یہ جمہور کے قول کے مخالف ہے۔ اخفش نے کہا: سعید نے ہمزہ کو ہاء سے بدلا ہے اور هانذرتہم پڑھا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: هياك و اياك۔ اخفش نے کہا: هانتہم اصل میں اُاعتہم تھا۔

خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

”مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔“

اس آیت میں دس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** خَتَمَ اللَّهُ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان نہ لانے کو خَتَمَ اللَّهُ کے ارشاد سے بیان فرمایا ہے۔ الختم ختمت الشیء ختلاً فهو مختوم و مختم (مبالغہ کے لئے شد پڑھی گئی ہے) کا مصدر ہے۔ اس کا معنی کسی شے کو ڈھانپ دینا اور اسے باندھ دینا ہے حتیٰ کہ اس میں کوئی چیز داخل نہ ہو۔ اس سے ختم الکتاب والباب اور اس کے مشابہ چیزیں ہیں حتیٰ کہ اس کے اندر کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی اور جو کچھ اس میں ہے اس کے علاوہ کچھ رکھا نہیں جاسکتا۔

اہل معانی نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں کو دس اوصاف کے ساتھ موصوف فرمایا ہے۔ الختم، الطبع، الضیق، المرض، الرین، الموت، القساوة، الانصراف، الحبیۃ، الانکار۔ انکار کا ذکر اس آیت میں فرمایا: قُلُوبُهُمْ مُّكْرَرَةٌ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُونَ ۝ (النحل) الحبیۃ کے ذکر میں فرمایا: اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی قُلُوبِهِمُ الْحَبِیْۃَ (الفح: 26) قساوت کے



ذکر میں فرمایا: قَوْلٌ لِلنَّفْسِ قُلُوبُهُمْ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ (الزمر: 22) الانصراف کے ذکر میں فرمایا: ثُمَّ انْصَرَفُوا صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ (توبہ) موت کے بارے میں فرمایا: وَمَنْ كَانَ مَيِّتًا فَاحْيِيْنُهُ (الانعام: 122) اور فرمایا: إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ وَالْمَوْتَى يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ (الانعام: 36) رین کے بارے میں فرمایا: كَلَّا بَلْ عَصَاكَ حَدِيدٌ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (المطففين) اور مرض کے بارے میں فرمایا: فَيَقُولُ لَهُمْ مَرَضٌ (البقرہ: 10) الضيق کے بارے میں فرمایا: وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا (الانعام: 125) الطبع کے بارے میں فرمایا: وَطَبَعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ (توبہ) اور فرمایا: بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (النساء: 155) اور الختم کے بارے میں فرمایا: خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ (البقرہ: 7) ان تمام کا بیان ان شاء اللہ اپنی اپنی جگہ پر آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 2:** کبھی ختم (مہر لگا دینا) حسی ہوتا ہے اور کبھی معنوی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں معنوی ختم مراد ہے۔ دلوں پر مہر لگانے سے مراد اللہ تعالیٰ کے پیغام کو یاد نہ کرنا، اس کے مخاطبات کا مفہوم محفوظ نہ کرنا اور اس کی آیات میں غور و فکر نہ کرنا ہے اور کانوں پر مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو نہ سمجھنا جب ان پر تلاوت کیا جاتا ہے یا انہیں اللہ کی وحدانیت کی طرف بلایا جاتا ہے اور آنکھوں پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی مخلوقات اور اس کی مصنوعات کے عجائب میں غور و فکر کے لئے ہدایت حاصل نہ کرنا۔ یہ مفہوم حضرات ابن عباس، ابن مسعود، قتادہ وغیرہم نے بیان کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اس آیت میں بڑی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت و ضلال، کفر و ایمان کا خالق ہے۔ اے سننے والو! عبرت حاصل کرو، اے مفکرین! قدر یہ فرقہ کی عقول پر تعجب کرو جو کہتے ہیں کہ ایمان و ہدایت کا وہ خود خالق ہے، ختم کا معنی مہر لگانا ہے تو پھر ان کے لئے ایمان کہاں ہوگا اگرچہ وہ (ہزار) کوشش بھی کریں ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے تو پھر وہ کب ہدایت پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد انہیں کون ہدایت دے گا جب کہ اللہ نے انہیں گمراہ کر دیا اور انہیں بہرہ کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا: وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ (غافر: 33)۔ (اور جسے گمراہ کر دے اللہ اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں) اللہ کا فعل ان لوگوں کے بارے میں عدل ہے جن کو اس نے گمراہ کیا اور رسوا کیا کیونکہ اس نے انہیں حق سے نہیں روکا جو اس کے لئے واجب تھا ورنہ اس سے صفت عدل زائل ہو جائے گی انہیں اس چیز نے روکا کہ جو اس نے ان پر فضل فرمایا تھا نہ کہ اس چیز نے جو ان کے لئے ثابت تھی۔

اگر وہ کہیں کہ ختم، طبع، غشاوت سے مراد نام رکھنا، حکم لگانا اور خبر دینا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، نہ کہ یہ فعل کی خبر دی گئی ہے ہم کہیں گے: یہ قول فاسد ہے کیونکہ ختم اور طبع کی حقیقت وہ فعل ہے جس کی وجہ سے دل مطبوع و مختوم ہو جاتا ہے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی حقیقت نام رکھنا اور حکم لگانا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا جب کہا جاتا ہے: فلاں طبع الکتاب و ختمہ۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایسا فعل کیا جس کی وجہ سے کتاب مطبوع اور مختوم ہو گئی ہے نہ کہ نام رکھنا اور حکم لگانا۔ یہ ایسا مفہوم ہے جس میں اہل لغت کا کوئی اختلاف نہیں ہے نیز امت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں پر مہر لگانے کی نسبت اپنی طرف مجازاً کی ہے، یہ ان کے کفر کی وجہ سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا

يَكْفُرْهُمْ (النساء: 155) (اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگا دی) اور امت کا اس پر بھی اجماع ہے کہ طبع اور ختم ان کے دلوں پر نبی کریم ﷺ، ملائکہ اور مومنین کی طرف بھی ممتنع ہے اگر ختم اور طبع نام رکھنا اور حکم لگانا ہوتا تو انبیاء اور مومنین کی طرف ممنوع نہ ہوتا کیونکہ وہ تمام کفار کا نام رکھ سکتے تھے کہ ان پر مہر لگائی گئی ہے ان کے دلوں پر ختم لگائی گئی ہے وہ گمراہی میں ہیں ایمان نہیں لائیں گے وہ تمام ان کفار پر حکم لگا سکتے تھے۔

پس ثابت ہوا کہ ختم اور طبع معنوی ہے نام رکھنا اور حکم لگانا نہیں ہے بلکہ یہ معنی ہے جو اللہ تعالیٰ دل میں پیدا فرماتا ہے جو اسے ایمان سے روکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد بھی ہے: كَذَلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ (الحجر) (اسی طرح ہم داخل کرتے ہیں گمراہی کو مجرموں کے دلوں میں وہ نہیں ایمان لائیں گے) اور فرمایا: وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوْا (الانعام: 25) (اور ہم نے ڈال دیئے ہیں ان کے دلوں پر پردے تاکہ نہ سمجھیں وہ اسے)۔

**مسئلہ نمبر 4:** عَلٰی قُلُوبِهِمْ اس میں دلیل ہے کہ دل کو تمام اعضاء پر فضیلت حاصل ہے۔ دل انسان اور دوسری تمام چیزوں کا ہوتا ہے، ہر چیز میں سے جو خالص ہو اور جو چیز معزز ہو وہ اس کا دل ہے۔ دل، فکر کا مقام ہے اصل میں یہ مصدر ہے قلبت الشيء اقلبه قلباً۔ جب کوئی کسی چیز کو اس کے آغاز پر لوٹا دے، تو اس وقت یہ فعل استعمال کیا جاتا ہے قلبت الاناء۔ میں نے برتن کو الٹا کر دیا پھر یہ لفظ نقل کیا گیا اور اس کے ساتھ اس عضو کا نام رکھا گیا جو معزز ترین عضو ہے کیونکہ خیالات جلدی سے اس کی طرف جاتے ہیں اور اس کی طرف لوٹتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

ما سى القلب الا من تقلبه فاحذر على القلب من قلب و تحويل

قلب کو قلب اس کے پھرنے کی وجہ سے کہا جاتا ہے پس تو دل کی تبدیلی اور تحويل سے بچ۔

پھر جب عربوں نے اس مصدر کو اس شریف عضو کے لئے نقل کیا تو عظمت اس میں لازم ہو گئی۔ اس کے اور اس کی اصل کے درمیان فرق کرنے کے لئے یہ ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابو موسیٰ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”دل کی مثال اس تنکا کی ہے ہوا میں جسے صحراء میں گھماتی رہتی ہیں“ (1)۔ اسی معنی کے لئے آپ ﷺ دعا کرتے تھے: اللھم یا مشیت القلوب ثبت قلوبنا علی طاعتک (اے اللہ اے دلوں کو ثابت رکھنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی طاعت پر ثابت رکھ (2)۔) جب نبی کریم ﷺ اتنے عظیم منصب اور جلالت شان کے باوجود یہ دعا کرتے تھے تو ہمیں آپ ﷺ کی اقتدا میں یہ دعا بدرجہ اولیٰ کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ (الانفال: 24) (اور خوب جان لو کہ اللہ (کا حکم) حائل ہو جاتا ہے انسان اور اس کے دل (کے ارادوں) کے درمیان)۔

**مسئلہ نمبر 5:** جوارح اگر چہ دل کے تابع ہیں لیکن کبھی دل، جوارح کے اعمال سے متاثر ہوتا ہے اس تعلق کی وجہ سے

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 10، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، مقدمہ، باب فی القدر، حدیث نمبر 84، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 18، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب فضائل صحابہ، باب فیہا انکرت الجہیمۃ، حدیث 194، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو ظاہر اور باطن کے درمیان ہے، اگرچہ دل ان اعضاء کا رئیس اور مالک ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ایک شخص سچ بولتا ہے تو اس کے دل میں ایک سفید نکتہ پیدا ہو جاتا ہے اور کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے“ (1)۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے (اور اس کی سند صحیح ہے)۔ ”ایک شخص گناہ کرتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے پھر اگر وہ توبہ کرتا ہے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے“ (2)۔ فرمایا: یہی وہ البرین ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس آیت کے اندر کیا ہے: **كَلَّا بَلْ عَصَيْنَا عَنْ أَمْرِ رَبِّنَا ۚ وَمَا كُنَّا لِنَكْسِبُوهٖٓ** (المطففين)

مجاہد نے کہا: دل ہتھیلی کی مانند ہے ہر گناہ کی وجہ سے ایک انگلی بند ہو جاتی ہے۔ پھر مکمل بند کر دیا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں: مجاہد کے اس قول میں اور نبی کریم ﷺ کے اس قول میں ”جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ صحیح ہو تو پورا جسم صحیح ہوتا ہے اور جب وہ فاسد ہو تو پورا جسم فاسد ہوتا ہے۔ خبردار وہ ٹکڑا دل ہے“ (3)۔ دلیل ہے کہ ختم حقیقی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض علماء نے فرمایا: دل صنوبر کے مشابہ ہوتا ہے مجاہد کا قول اس کی تائید کرتا ہے۔ واللہ اعلم

مسلم نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں رسول اللہ ﷺ نے دو احادیث بیان فرمائیں۔ ایک تو میں دیکھ چکا ہوں جبکہ دوسری کا منتظر ہوں۔ آپ ﷺ نے ہمیں بیان فرمایا کہ امانت لوگوں کے دلوں کی جڑوں میں نازل ہوئی پھر قرآن نازل ہوا، لوگوں نے قرآن سے اس کو جانا اور حدیث سے اس کو پہچانا۔ پھر ہمیں امانت کے اٹھ جانے کے متعلق بتایا۔ فرمایا: ایک شخص سوئے گا تو اس کے دل سے امانت اٹھالی جائے گی اس کا اثر ایک جلن کی مثل باقی ہوگا پھر وہ سوئے گا تو اس دل سے امانت اٹھالی جائے گی۔ پس اس کا اثر ایک چھالے کی مثل ہوگا جیسے تیرے پاؤں پر انگارہ گر جائے تو وہ جگہ پھول جاتی ہے تو اسے پھولا ہوا دیکھتا ہے حالانکہ اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا، پھر آپ نے کنکری اٹھائی اور اسے اپنے پاؤں پر لڑھکایا۔ لوگ بیع و شراء کرتے رہیں گے کوئی ایک بھی امانت ادا کرنے والا نہ ہوگا حتیٰ کہ کہا جائے گا: فلاں قبیلہ میں ایک امین شخص ہے حتیٰ کہ اس شخص کے متعلق کہا جائے گا وہ کتنا پختہ آدمی ہے، کتنا ہوشیار اور کتنا عقلمند آدمی ہے حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہ ہوگا، مجھ پر ایک ایسا زمانہ بھی گزرا کہ میں پرواہ نہیں کرتا تھا کہ میں کس سے بیع کر رہا ہوں، اگر وہ مسلمان ہو تو اس کا دین مجھ پر میری امانت لوٹا دے گا اور اگر وہ نصرانی ہوگا تو اس کا سردار مجھ پر لوٹا دے گا لیکن آج میں تم سے صرف فلاں فلاں سے بیع کرتا ہوں (4)۔ حدیث میں الوکت کا لفظ ہے اس کا مطلب ہے تھوڑا سا اثر، کچی کھجور میں جب پکنے کا تھوڑا سا نشان لگتا ہے تو عرب کہتے ہیں قد وکت فہو موکت۔ اور النجل۔ اس سے مراد چھالہ ہے یعنی وہ پانی جو جلد اور گوشت کے درمیان ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی تفسیر اپنے اس قول (کجبر دحرجتہ) سے فرمائی یعنی تو نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والادب باب قہم الکذب وحسن صدق وفضله، صفحہ 325، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر عن رسول اللہ ﷺ باب من سورۃ ویل للمطففین، صفحہ 168-169، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 13، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدينه، حدیث 50، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب رقم الامانة والایمان من بعض القلوب وعرض الفتن علی القلوب، صفحہ 82، جلد 1 (قدیمی)



انکارے کو اپنے پاؤں پر گھمایا تو وہ پھول گیا، تو نے اسے ابھرا ہوا دیکھا۔ .... یہ احادیث دلالت کرتی ہیں کہ یہ سب کچھ دل میں محسوس ہوتا ہے اس میں یہ سب کچھ کہا جاتا ہے اسی طرح الختم اور الطبع ہے۔

حضرت حذیفہ کی حدیث میں ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: دلوں کو نئے نئے فتنے لاحق ہوتے ہیں جیسے چٹائی ہوتی ہے، جس دل میں یہ فتنے راسخ ہو گئے اس میں سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے اور جو دل ان فتنوں کا انکار کرتا ہے اس میں سفید نکتہ پیدا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ دو دل ہو جاتے ہیں۔ ایک سفید جو صفا کی طرح ہوتا ہے اس کو کوئی فتنہ نقصان نہیں دے گا جب تک آسمان اور زمین قائم ہوں گی اور دوسرا دل سیاہ جس میں سیاہی ملی ہوتی ہے جیسے کوزہ ہوتا ہے جو ٹیڑھا ہوتا ہے وہ نیکی کو جانتا بھی نہیں وہ کسی برائی کا انکار نہیں کرتا، لیکن جو اس کے دل میں برائی راسخ ہو چکی ہوتی ہے (1) (وہ وہی کرتا ہے)۔

**مسئلہ نمبر 6:** دل کو فواد اور صدر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ** (فرقان: 32) اور فرمایا: **أَلَمْ نُشْرِكْ لَكَ صَدْرًا** (الم نشرح) یعنی دونوں جگہ قلب مراد ہے کبھی قلب سے مراد عقل لیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لِّمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ** (ق: 37) یہاں قلب سے مراد عقل ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک دل، عقل کا محل ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ** اس آیت سے کانوں کو آنکھوں پر فضیلت دینے والے نے استدلال کیا ہے، کیونکہ کانوں کو آنکھوں پر مقدم کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قُلْ أَسْمَعُ يَتُومَ إِن أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ** (الانعام: 46) اور فرمایا: **وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ** (النحل: 78)

فرمایا: کان چھ جہات، نور اور اندھیرے میں ادراک کرتے ہیں جبکہ آنکھ صرف سامنے کی جہت کا ادراک کرتی ہے اور روشنی کے ذریعہ سے ادراک کرتی ہے۔ اکثر متکلمین نے کانوں پر آنکھوں کو فضیلت دینے کا قول کیا ہے کیونکہ کان صرف آوازوں اور کلام کا ادراک کرتے ہیں جبکہ آنکھ جسموں، رنگوں اور تمام مہیخوں کا ادراک کرتی ہے۔ جب اس کے تعلقات زیادہ ہیں تو یہ افضل ہوئی اور انہوں نے آنکھ کے ساتھ چھ جہتوں سے ادراک کو جائز قرار دیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** اگر کوئی کہنے والا کہے کہ ابصار تو جمع اور سماع کو مفرد کیوں ذکر فرمایا؟ اسے کہا جائے گا: سماع کو مفرد ذکر کیا کیونکہ یہ مصدر ہے قلت وکثرت کے لئے واقع ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: **سَمِعْتُ الشَّيْءَ سَمْعَهُ سَمْعًا وَسَمَاعًا**۔ پس السمع، سمعت کا مصدر ہے اور السمع اس عضو کا اسم بھی ہے جس کے ساتھ سنا جاتا ہے اس کو مصدر کا نام دیا گیا ہے۔ بعض علماء نے کہا: جب سماع کی اضافت جماعت کی طرف کی جائے تو یہ اس پر دلیل ہوتی ہے اس سے مراد جماعت کے کان ہوتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

بها جيف الحصرى فاما عظامها فبيض واما جلدھا فصليب

یہاں جلد سے مراد جلود ہے۔ مفرد ذکر کیا کیونکہ یہ معلوم ہے کہ جماعت کے لئے ایک جلد نہیں ہوتی۔

1۔ تہج مسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانة والایمان من بعض القلوب وعرض الفتن علی القلوب، صفحہ 82، جلد 1 (تدیی)

اس کی مثل ایک اور شاعر نے کہا:

لا تنكر القتل و قد سبينا      في حلقكم عظم و قد شجينا  
اس شعر میں حلق سے مراد حلق ہیں۔  
اس کی مثل دوسرے شاعر کا قول ہے:

كانه وجه تركيين قد غضبا      مستهدف لطعان غير تذييب  
اس شعر میں وجہ سے مراد وجہین ہے۔ شاعر نے کہا: وجہ ترکیب کیونکہ معلوم تھا کہ دو شخصوں کے لئے ایک وجہ (چہرہ) نہیں ہوتا۔ اس کی مثالیں بہت سی ہیں اور وعدی اسماعہم بھی پڑھا گیا ہے، اور وعدی مواضع سماعہم کے معنی کا بھی احتمال ہے کیونکہ سماع پر مہر نہیں لگائی جاتی بلکہ سماع کی جگہ مہر لگائی جاتی ہے۔ پس مضاف کو حذف کیا گیا ہے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے کبھی سماع بمعنی استماع بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سمعت حدیثی... ای استبعت الی حدیثی یعجبنی۔ مجھے تیرا میری بات کو غور سے سننا اچھا لگتا ہے۔۔۔۔۔ اسی مفہوم میں ذی الرمد کا قول ہے جو ایک نیل کی تعریف کرتا ہے جو شکاریوں اور کتوں کی آواز غور سے سنتا ہے۔

وقد تو جس رکنما مقفر ندس      بنبأ الصوت ما في سماعه كذب  
یعنی اس کے استماع میں کذب نہیں یعنی وہ سچا غور سے سننے والا ہے، الندس کا معنی ہے حاذق، النبأ خفی آواز کو کہتے ہیں۔ اسی معنی میں الرکنہ ہے، السماع (سین کے کسرہ اور میم کے سکون کے ساتھ) سے مراد انسان کا اچھائی کے ساتھ ذکر ہے۔ کہا جاتا ہے: ذهب سماعہ فی الناس یعنی لوگوں میں اس کا ذکر پھیل گیا۔ السماع بجو سے بھیڑیے کے بچے کو بھی کہتے ہیں..... وَقَلَّ سَمْعُهُمْ پر وقف ہے۔

غشاوة مبتدا ہے اور اس کا ماقبل خبر ہے۔ فی قلوبہم اور جو اس پر معطوف ہیں ان سب کی ضمیریں اس کے لئے ہیں جو اللہ کے علم میں ہیں کہ کفار قریش میں سے ایمان نہیں لائیں گے۔ بعض نے فرمایا: منافقین کے لئے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہود کے لئے ہے۔ بعض نے فرمایا: تمام کفار کے لئے ہے۔ یہ قول زیادہ عام ہے۔ ختم (مہر) دلوں اور کانوں پر ہے اور غشاوة آنکھوں پر ہے۔ الغشاء کا معنی ڈھانپنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** اسی سے غاشیۃ السرج ہے۔ غشیت الشیء و اغشیتہ۔ تابغہ نے کہا:

هلا سالت بنی ذبیحاً ما حسبی      اذا الدخان تغشى الاشیط البرما  
تو نے بنی ذبیحان سے کیوں نہیں پوچھا جو میرے لئے کافی ہے۔ دھواں ادھیز عمر والی قوم کے ساتھ شراب نہ پینے والے پر چھا جاتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

صحبتك اذ عینی علیها غشاوة      فلما انجلت قطعت نفی الومها

میں نے تیری سنگت اختیار کی جبکہ میری آنکھوں پر پردہ تھا جب پردہ کھلا میں نے اپنے نفس کو ملامت کیا۔  
ابن کیسان نے کہا: اگر اس کی جمع بنائی جائے تو یہ غشاوۃ کے حذف کے ساتھ ہوگا۔ فراء نے اس کی جمع غشاوی ذکر کی  
ہے جیسے ادوی جمع ہے۔ غشاوۃ نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور اس سے پہلے جعل محذوف ہوگا اور یہ اس بات سے ہوگا  
علفتھا تبناً و ماءً بارداً (میں نے اسے چارہ کھلایا اور ٹھنڈا پانی پلایا)۔  
ایک اور شاعر کا قول ہے:

یا لیت زوجک قد غدا متقلدا سیفا و رمحا

کاش! تیرا خاوند تلواریں لٹکائے ہوئے اور نیزہ اٹھائے ہوئے جاتا۔

معنی ہے: اسقیتھا ماء میں نے اسے پانی پلایا، و حاملاً رمحاً۔ کیونکہ نیزہ گلے میں لٹکایا نہیں جاتا۔ فارسی نے کہا: تو یہ  
استعمال وسعت و اختیار کی حالت میں نہیں پائے گا۔ غشاوۃ پر رفع پڑھنا احسن ہے، وادو عاطفہ ہوگی جملہ کا جملہ پر عطف ہوگا اور  
فرمایا: میں نے غشاوۃ سے وادو کے ساتھ تصرف کرنے والا فعل نہیں سنا۔ بعض مفسرین نے کہا: کانوں اور آنکھوں پر غشاوۃ  
ہے، وقف قُلُوہُم پر ہے۔ دوسرے مفسرین نے کہا: مہر تمام پر ہے اور غشاوۃ کا مطلب بھی ختم (مہر) ہے۔ اس صورت  
میں وقف غشاوۃ پر ہوگا۔ حسن نے غشاوۃ غین کے ضمہ کے ساتھ، ابو حیوہ نے اسے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، ابو عمرو نے غشوۃ  
پڑھا ہے اس نے اسے مصدر کی اصل کی طرف لوٹا یا ابن کیسان نے فرمایا: غشوۃ اور غشوۃ پڑھنا جائز ہے اور بہتر غشاوۃ ہے  
اسی طرح ہر لفظ کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں جو کسی چیز پر مشتمل ہونے پر دلالت کرے جیسے عمامہ، کنانۃ، قلادہ، عصا بہ وغیرہ۔  
**مسئلہ نمبر 10:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَهُمْ** یعنی جھٹلانے والے کفار کے لئے **عَذَابٌ عَظِيمٌ** عذاب عظیم ہے۔

**عَذَابٌ عَظِيمٌ** کی صفت ہے۔ عذاب کی کئی صورتیں ہیں: مثلاً کوڑے مارنا، آگ کے ساتھ جلانا، لوہے سے کاٹنا وغیرہ جو بھی  
انسان کو تکلیف پہنچائے وہ عذاب ہے۔ قرآن میں ہے: **وَلَيَشْهَدَنَّ عَذَابُهَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ** (النور) اس کا معنی  
الحبس اور المنع (روکنا) ہے۔ لغت میں کہا جاتا ہے: اعذبہ عن کذا یعنی میں نے اسے روک دیا۔ اسی سے عذوبۃ الماء  
ہے پانی کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ برتن میں پانی کو روکا جاتا ہے تاکہ صاف ہو جائے اور جو دوسرا مواد اس میں ملا ہوا ہے وہ  
جدا ہو جائے۔ اسی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: اعذبوا نساءکم عن الخروج، یعنی عورتوں کو باہر نکلنے سے روکو۔ حضرت علی  
رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر تیار کیا تو آپ نے فرمایا: اعذبوا عن ذکر النساء (انفسکم) اپنے نفسوں کو  
عورتوں کے ذکر سے روکو کیونکہ ان کا ذکر تمہیں جہاد سے محروم کرے گا۔ ہر وہ جسے تو کسی چیز سے روکے تو اس کے لئے اعتدال  
استعمال کر سکتا ہے۔ ضرب المثل میں ہے: لالجنک لجاماً معذباً۔ (میں تمہیں ایسی لگام چڑھاؤں گا جو تجھے لوگوں پر  
چڑھنے سے روک لے گی)۔ کہا جاتا ہے: اعذب یعنی میں رک جاتا ہوں۔ اعذب غیدہ، غیر کو روکتا ہوں۔ یہ لازم اور متعدی  
دونوں طرح استعمال ہوتا ہے عذاب کو عذاب اسی لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی عذاب دیئے جانے والے کو روک دیتا ہے اور جسم  
کے مناسب سب خیر والی چیزوں کو اس سے روک لیتا ہے۔ اس کے مخالف چیزیں اس پر ڈالتا ہے۔



وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ﴿١﴾  
 ”اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر حالانکہ وہ مؤمن نہیں۔“  
 اس آیت میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** ابن جریج نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: سورہ بقرہ میں مومنین کے بارے چار آیات نازل ہوئیں، دو آیات کافروں کے بارے نازل ہوئیں اور تیرہ آیات منافقین کے بارے نازل ہوئیں۔ اسباط نے سدی سے وَمِنَ النَّاسِ کے تحت روایت کیا ہے، فرمایا: اس سے مراد منافقین ہیں۔ علماء صوفیاء نے فرمایا: النَّاسِ اسم جنس ہے اور اسم جنس کے ساتھ اولیاء کو مخاطب نہیں کیا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** لفظ النَّاسِ کے بارے میں نحو یوں کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اسماء جموع میں سے ایک اسم ہے یہ بغیر لفظ کے انسان اور انسانۃ کی جمع ہے اس کی تصغیر نوس ہے۔ الناس، النوس سے مشتق ہے جس کا معنی حرکت ہے۔ کہا جاتا ہے: ناس ینوس یعنی حرکت کرنا۔ اسی سے ام زرع کی حدیث ہے اُناس من حل اذن (1)۔ (زیورات سے میرے کانوں کو حرکت دی) بعض نے فرمایا: اس کی اصل نسی سے ہے۔ ناس کا اصل نسی ہے قلب ہوا ہے۔ پس نیس بن گیا یا مفتوح ماقبل فتح کی وجہ سے الف سے بدل گئی ہے پھر الف، لام داخل ہوا ہے، بعض نے فرمایا: اس کی اصل النَّاسِ ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نسی آدم عہد اللہ فستی انساناً۔ (آدم علیہ السلام اللہ کا عہد بھول گئے تو انہیں انسان کیا گیا)۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: آدم علیہ السلام بھول گئے تو ان کی اولاد بھی بھولی (2)۔ قرآن میں ہے: وَلَقَدْ عٰهَدْنَا اِلٰى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ (طہ: 115) اس صورت میں ہمزہ زائدہ ہوگا۔ شاعر نے کہا

لاتنسین تلك العهود فانما سمیت انسانا لانك ناسی  
 ان عہود کو مت بھول، تیرے بھولنے کی وجہ سے تجھے انسان کہا گیا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

فان نسیت عہوداً منك سالفة فاغف، فاذل ناس اول الناس  
 اگر تو سابقہ عہود بھول گیا ہے تو توبہ کر۔ پہلا بھولنے والا پہلا انسان تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: حضرت آدم کو انسان کہا گیا کیونکہ وہ حضرت حوا سے انس رکھتے تھے۔ بعض نے فرمایا: اپنے رب سے انس رکھتے تھے، اس صورت میں ہمزہ اصلی ہوگا شاعر نے کہا:

دما سی الانسان الا لانسہ ولا القلب الا انه یتقلب  
 انسان کو انسان اس کے انس کی وجہ سے کہا جاتا ہے اور قلب کو قلب اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ پھرتا رہتا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب حسن العاشرة مع الاصل، حدیث نمبر 4790، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر عن رسول اللہ ﷺ، باب من سورة الموعودتین، صفحہ 173، جلد 2 (وزارت تعلیم)

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ نے مومنین کا پہلے ذکر فرمایا۔ ان کے شرف اور ان کی فضیلت کی وجہ سے ان سے آغاز فرمایا۔ ان کے مقابلہ میں پھر کافرین کا ذکر کیا کیونکہ کفر اور ایمان دو طرفیں ہیں۔ پھر ان کے بعد منافقین کا ذکر فرمایا اور انہیں کافروں کے ساتھ ملایا کیوں کہ ان میں بھی ایمان نہیں پایا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ۔

اس آیت میں کرامیہ فرقہ کا رد ہے جنہوں نے کہا کہ ایمان زبان کے اقرار کا نام ہے اگرچہ دل میں اعتقاد نہ بھی ہو اور اس قول سے حجت پکڑی ہے: فَأَشَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا (مائدہ: 85) (تو عطا فرمائے اللہ نے بعض اس قول کے جو وہ کہتے ہیں) اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا جو انہوں نے کہا اور دل میں تصدیق رکھی اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ ”مجھے لوگوں سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ وہ کہیں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ جب وہ یہ کہہ دیں گے تو انہوں نے مجھ سے اپنے خون اور اپنے مال محفوظ کر لئے“ (1)۔ یہ کرامیہ کی عقل کا قصور اور فکر کا جمود ہے۔ قرآن و حدیث میں قول اور اعتقاد کے ساتھ عمل کا جو بیان ہے اس میں غور و فکر کے ترک کی وجہ سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ایمان دل کی معرفت، زبان کے قول اور ارکان کے عمل کا نام ہے“ (2)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔ محمد بن کرام بھستانی اور اس کے ساتھیوں کا جو نظریہ ہے وہ نفاق ہے اور عین شقاق ہے۔ ہم خدا لان اور برے اعتقاد سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 4:** ہمارے علماء نے فرمایا: مومن کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ مومن جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اور اس سے پیار کرتا ہے اور ایک وہ مومن جس سے اللہ تعالیٰ نہ محبت کرتا ہے نہ اس سے پیار کرتا ہے بلکہ اس سے بغض رکھتا ہے اور اس سے دشمنی کرتا ہے، پس ہر وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ ایمان قبول کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے محبت و پیار کرتا ہے اور اس سے راضی ہوتا ہے اور ہر وہ شخص جس کے بارے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ کفر اختیار کرے گا تو اللہ اس سے بغض رکھتا ہے، اس سے ناراض ہوتا ہے اور اس سے دشمنی رکھتا ہے اس کے موجودہ ایمان کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے اس کفر اور گمراہی کی وجہ سے جس کے ساتھ وہ موافقت کرے گا۔ اسی طرح کافر کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک کافر وہ جس کو اللہ تعالیٰ یقیناً عذاب دے گا اور ایک کافر وہ جس کو عذاب نہیں دے گا۔ وہ کافر جسے عذاب دیا جائے گا وہ ایسا کافر ہے جو کفر سے آخر تک موافقت کرے گا۔ پس اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اس سے دشمنی کرتا ہے اور وہ کافر جس کو عذاب نہیں دیا جائے گا وہ ایسا کافر ہے جو بالآخر ایمان سے موافقت کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض نہیں ہوتا اور اس سے بغض نہیں رکھتا، بلکہ اس سے محبت و پیار کرتا ہے، اس کے موجودہ کفر کی وجہ سے نہیں بلکہ اس ایمان کی وجہ سے جس سے بالآخر وہ موافقت کرے گا۔ پس مطلق قول کرنا جائز نہیں۔

**مسئلہ نمبر 5:** مومن ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور کافر عذاب کا مستحق ہوتا ہے بلکہ اس کی موافقات (ایمان پر خاتمہ، کفر پر خاتمہ) سے پیدا نا واجب ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: اللہ تعالیٰ حضرت عمر سے اس وقت بھی راضی تھا جب بتوں کی عبادت کرتے تھے اور اسے ثواب دینے اور اس کے جہنم میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ بتوں کی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول اللہ عزوجل وامرهم شورى بهذا، حدیث 935، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 8، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً کتاب المقدمہ، باب فی الایمان، حدیث نمبر 63، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبادت کرتے تھے بلکہ اس ایمان کی وجہ سے بالآخر جس سے انہوں نے موافقت کر لی تھی اور اللہ تعالیٰ ابلیس پر ناراض تھا اس کی عبادت کی حالت میں بھی اس کے اس کفر کی وجہ سے بالآخر جس کے ساتھ اس نے موافقت کرنی تھی۔

قدر یہ فرقہ والے اس مسئلہ میں مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ ابلیس پر اس کی عبادت کے وقت ناراض نہیں تھا اور عمر کی بتوں کی عبادت کے وقت عمر سے راضی نہیں تھا۔ یہ قول فاسد ہے۔ جب ثابت ہے کہ ابلیس اس کفر سے موافقت کرنی تھی اللہ اسے جاننے والا ہے اور عمر نے جس ایمان کی موافقت کرنی تھی اسے بھی جاننے والا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ابلیس پر اللہ تعالیٰ ناراض تھا اور عمر پر راضی تھا اس پر امت کا اجماع دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے والا نہیں جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ وہ دوزخی ہے بلکہ اس سے ناراض ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے والا ہوتا ہے جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ وہ جنتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ایمان (کا ثواب و کمال) خاتمہ پر ہے“ (1)۔ اسی لئے صوفیاء و علماء کہتے ہیں: ایمان وہ نہیں جس کے ساتھ بندہ قولاً اور فعلاً مزین ہے بلکہ ایمان ازل کے سواہن میں سعادت کا جاری ہوتا ہے۔ رہا اس کا ہیاکل میں ظہور تو وہ کبھی عارضی ہوتا ہے اور کبھی حقیقتہً ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ ثابت ہے جس طرح کہ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بتایا جو سچے ہیں (اور) آپ سے سچ کہا گیا ہے، کہ تم میں کسی ایک کی تخلیق کو اس کی ماں کے بطن میں چالیس دن میں جمع کیا جاتا ہے پھر وہ اتنی مدت میں جما ہوا خون رہتا ہے پھر اتنی مدت میں گوشت کا ٹکڑا رہتا ہے پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے وہ اس میں روح پھونکتا ہے اور اس فرشتے کو چار کلمات کا حکم دیا جاتا ہے (یعنی) اس کا رزق، اس کی عمر، اس کا عمل اور اس کا بد بخت یا سعید ہونا لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں کہ تم میں سے کوئی جنتیوں والے عالم، کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ جنت اور اس کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ پس اس پر نوشتہ تقدیر غالب آ جاتا ہے۔ وہ دوزخیوں والا عمل کرتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے تم میں سے کوئی دوزخیوں والے اعمال کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے اس پر نوشتہ تقدیر غالب آتا ہے وہ دوزخیوں والا عمل کرتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ (2)۔

**مسئلہ نمبر 6:** امام حافظ ابو محمد عبد الغنی بن سعید مصری نے محمد بن عید شامی کی حدیث الزندقہ کے بارے میں نقل کی ہے۔ محمد بن سعید سے مراد محمد بن ابی قیس ہے، انہوں نے سلیمان بن موسیٰ سے روایت کی ہے یہ سلیمان اشدق ہے، سلیمان نے حضرت مجاہد بن جبر سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، فرمایا: ہمیں ابو رزین عقیلی نے بتایا، فرمایا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اور تو اے ابارزین! ایسے دودھ سے ہیں جس کا ذائقہ نہیں بدلا۔ ابو رزین نے کہا: میں نے عرض کی: اللہ تعالیٰ مردے کیسے زندہ کرے گا؟ فرمایا: کیا تو بھی بنجر زمین سے نہیں گزرا پھر تو سرسبز زمین سے نہیں گزرا پھر تو بنجر زمین سے نہیں گزرا پھر تو سرسبز زمین سے نہیں گزرا پھر تو بنجر زمین سے نہیں گزرا۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 961، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً کتاب الرقاق، باب الاعمال بالنحو اتیم وما یخاف، حدیث 6012، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب اذا اثنی علی الصالح فہی بشری، صفحہ 332، جلد 2 (تدبیری کتب خانہ)



میں سے نہیں گزرا پھر تو سرسبز سے نہیں گزرا؟ میں نے عرض کی: کیوں نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل اسی طرح نشور ہوگا۔ ابو رزین نے کہا: میں نے عرض کی: میں کیسے جان لوں کہ مومن ہوں؟ فرمایا: کوئی اس امت کا فرد نہیں ہے جس نے کوئی نیک عمل کیا پھر اس نے جان لیا کہ یہ نیک عمل ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی بہتر جزا عطا کرنے والا ہے یا اس نے برا عمل کیا پھر اس نے جانا کہ یہ برا عمل ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی سزا دینے والا ہے یا اسے معاف کرنے والا ہے، مگر بندہ مومن کی یہ شان ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ حدیث اگرچہ ایسی ہے کہ اس کی سند قوی نہیں ہے۔ اگر اس کا معنی صحیح بھی ہو تو پھر بھی حضرت ابن مسعود کی حدیث کے مخالف نہیں ہے کیونکہ وہ خاتمہ پر موقوف ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اعمال کا دار و مدار خاتمہ پر ہے (1)۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ فی الحال مومن ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 7:** علماء لغت نے فرمایا: منافق کو منافق اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ایسی بات کا اظہار کرتا ہے جس کے مخالف وہ دل میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے، اس کی تشبیہ جنگلی چوہا ہے اس کی ایک بل ہوتی ہے اسے نافقہ کہا جاتا ہے اور ایک اور اس کی بل ہوتی ہے جسے القاصعہ کہا جاتا ہے وہ زمین کو کریدتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ زمین کے ظاہر تک یعنی معمولی سی مٹی تک پہنچ جاتا ہے۔ جب اسے کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے تو وہ اس مٹی کو دور کرتا ہے اور اپنی بل سے نکل جاتا ہے، اس کی بل کے ظاہر پر مٹی ہوتی ہے اور اس کے اندر سوراخ ہوتا ہے۔ اسی طرح منافق اس کا ظاہر ایمان ہوتا ہے اور باطن کوئی اور۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

يُخِذُ عُونََ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ①

”فریب دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو اور (حقیقت میں) نہیں فریب دے رہے مگر اپنے آپ کو اور اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔“

ہمارے علماء نے فرمایا: يُخِذُ عُونََ اللَّهِ کا معنی ہے: وہ اپنے گمان اور خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اس لئے فرمایا کیونکہ ان کا عمل، ایک دھوکا دینے والے کے عمل جیسا ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کلام میں حذف ہے۔ اصل میں ہے: يَخْدَعُونَ رسول اللہ ﷺ۔ وہ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔ حسن وغیرہ سے مروی ہے، ان کے رسول اللہ کو دھوکا دینے کو اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کے مترادف فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ ﷺ کی رسالت کے ساتھ بلایا۔ اسی طرح جب انہوں نے مومنین کو دھوکا دیا تو یقیناً انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیا۔ ان کا دھوکا یہ تھا کہ ایمان ظاہر کرتے تھے جبکہ ان کے دلوں میں کفر تھا۔ یہ وہ اس لئے کرتے تھے تاکہ اپنے خون اور اپنے اموال بچالیں اور وہ گمان کرتے تھے کہ وہ نجات پا گئے اور انہوں نے دھوکا دے دیا۔ یہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اہل لغت نے فرمایا: کلام عرب میں الخدع کا معنی ہے: فساد۔ ثعلب نے یہ ابن ابراہی سے روایت کیا ہے۔ اس نے شعر کہا ہے:

ابيض اللون لذیذ طعمه طيب الريق اذ الريق خدع

رنگ سفید ہے ذائقہ لذیذ ہے، اس کا لعاب پاک ہے جب کہ اس کا لعاب فاسد ہو جائے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 961، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب الاعمال بالغواتیم، حدیث 6012، ضیاء القرآن پبلیکیشنز

میں کہتا ہوں: اس اعتبار سے يُخْدَعُونَ اللہ کا معنی ہوگا: وہ اپنے ایمان اور اعمال کو ریاکاری کی وجہ سے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان خراب کر دیتے ہیں۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ سے تفسیر کے ساتھ آیا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور قرآن حکیم میں ہے: يُؤْخَذُ النَّاسُ (النساء: 142) (وہ لوگوں کے لئے دکھاوا کرتے ہیں)۔ بعض علماء نے فرمایا: خدع کا اصل معنی الاخفاء (چھپانا ہے) ہے۔ اسی سے مخدع البیت ہے جس میں کوئی چیز چھپائی جاتی ہے۔ یہ ابن فارسی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ عرب کہتے ہیں: انخدع الضب فی جحرہ۔ یعنی گود اپنے بل میں چھپ گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا يُخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ۔ اس میں نفی اور ایجاب ہے یعنی دھوکے کا انجام اپنے اوپر ہی نازل ہوگا۔ یہ عربوں کے کلام سے ہے: من خدع من لا یخدع فانما یخدع نفسه، جو ایسی ذات کو دھوکا دیتا ہے جس کو دھوکا نہیں دیا جاسکتا تو وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ دھوکا تو اسے دیا جاسکتا ہے جو بواطن کو نہ جانتا ہو، اور جو بواطن کو جانتا ہو جو اس کے ساتھ دھوکا کرتا ہے تو وہ اپنے آپ سے دھوکا کرتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ منافقین نے اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں پہچانا کیونکہ اگر وہ اسے پہچانتے ہوتے تو وہ جان لیتے کہ اسے دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔ پہلے نبی کریم ﷺ کا ارشاد گزر چکا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کو دھوکا نہ دو کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس دھوکے کی سزا دیتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اگر وہ سمجھے۔ تو صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ کو کیسے دھوکا دیا جاسکتا ہے؟ فرمایا: تو وہ عمل کرتا ہے جس کا اللہ نے تجھے حکم دیا اور اس کے ساتھ تو غیر کی رضا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دھوکا کی حقیقت کا بیان آگے اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کے تحت آئے گا۔ نافع، ابن کثیر، ابو عمرہ نے دونوں جگہ یخدعون پڑھا ہے تاکہ دونوں لفظ متجانس ہو جائیں۔ عاصم، حمزہ، کسائی اور ابن عامر نے دوسری جگہ یخدعون پڑھا ہے اس کا مصدر خدع و خدیعة ہے۔ یہ ابو زید نے حکایت کیا ہے مورق العلی یخدعون اللہ یعنی یا کے ضمہ، حا کے فتح اور دال کی تشدید کے ساتھ پڑھتے کثرت کا معنی لینے کے لئے۔ ابوطالوت عبدالسلام بن شداد اور جارود نے یا کے ضمہ، خا کے سکون اور دال کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے (1) اس معنی پر ما یخدعون الاعن انفسهم، حرف جر کو حذف کیا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اخْتَارَ مُوسٰی قَوْمَهُ (الاعراف: 155) اصل میں من قومہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا يَشْعُرُونَ یعنی وہ نہیں جانتے کہ ان کے دھوکے کا وبال ان کی طرف ہی لوٹنے والا ہے وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنے دھوکے کی وجہ سے نجات پاگئے اور کامیاب ہو گئے۔ یہ دنیا میں ہے اور آخرت میں انہیں کہا جائے گا: ارجعوا وراءکم فالتبسوا نوراً۔ واپس پلٹ جاؤ اور نور تلاش کرو، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اہل لغت نے کہا: شعرت بالشئ یعنی میں نے اس کو جان لیا۔ اسی سے شاعر کی فطانت کی وجہ سے اسے شاعر کہا جاتا ہے کیونکہ شاعر جو معانی پہچانتا ہے وہ دوسرے نہیں پہچانتے۔ اسی سے عربوں کا قول ہے: لبیت شعری۔ یعنی کاش میں جان لیتا۔

فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٢٥﴾

”ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھادی اللہ نے ان کی بیماری اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ المرض سے مراد وہ فساد ہے جو ان کے عقائد میں تھا یا تو یہ شک اور نفاق تھا یا انکار اور تکذیب تھی۔ معنی یہ ہے ان کے دل مریض ہیں کیونکہ وہ عصمت، توفیق، رعایت اور تائید سے خالی ہیں۔ ابن فارس لغوی نے کہا: مَرَضٌ سے مراد ہر وہ چیز ہوتی ہے جو انسان کو صحت کی حد سے خارج کر دے خواہ وہ بیماری ہو یا نفاق ہو یا کسی امر میں کوتاہی ہو۔ قراء کا مرض کے راء کے فتح پر اجماع ہے مگر اصمعی نے ابو عمرو سے روایت کیا ہے کہ اس نے راء کو ساکن کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا بعض علماء نے فرمایا: یہ منافقین کے خلاف بددعا ہے۔ اس کلام کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے شک اور نفاق میں اضافہ فرمائے ان کے کفر پر جزا دیتے ہوئے، اور ان کی مدد کی جگہ ضعف اور قدرت کی جگہ عجز میں اضافہ فرمائے۔ جیسے شاعر نے کہا:

يا مرسل الريح جنوباً وصبا اذ غضبت زید فزدها غضباً

اے جنوب کی ہوا اور باد صبا کو چلانے والے! جب بنو زید غضبناک ہوں تو ان کے غضب میں اضافہ کر۔

اس صورت میں آیت کے اندر دلیل ہے منافقین کے خلاف دعا کرنے اور انہیں دھتکارنے کی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بری ترین مخلوق ہیں۔ بعض علماء نے کہا: یہ ان کی مرض کی زیادتی کی اللہ تعالیٰ خبر دے رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی مرض میں اضافہ کر دیا۔ جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ (توبہ: 125)

اہل معانی نے کہا: فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ ان کے دلوں میں مرض کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا کی لذتوں سے پرسکون ہیں اور دنیا کی محبت ان کے دلوں میں ہے اور آخرت سے غافل ہیں اور آخرت سے اعراض کئے ہوئے ہیں اور فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے نفسوں کے سپرد کر دیا ہے۔ ان پر دنیا کے غموں کو جمع کر دیا ہے اس لئے وہ دین کے اہتمام کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ یعنی دنیا فانی کے بدلے انہیں ایسا عذاب دیا جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔ جنید نے کہا: دلوں کی بیماریاں خواہش نفس کی پیروی کی وجہ سے ہیں جیسا کہ اعضاء کی بیماریاں بدن کے مرض سے ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ، أَلِيمٌ کا معنی عرب کلام میں مؤلم ہے یعنی درد پہنچانے والا جیسے سبب معنی مسبب ہوتا ہے۔ ذوالرمد اونٹوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

ونرفع من صدور شردلات يصك و جوهها وهج اليم

ہم لمبے اونٹوں کے سینوں کو بلند کرتے ہیں جبکہ ان کے چہروں کو تکلیف دہ گرمی لگ رہی ہوتی ہے۔

الم کا معنی ہے تکلیف دینا، الايلام کا معنی ہے تکلیف دینا۔ الم، تکلیف کو کہتے ہیں اَلِمَ يَأْلَمُ الْمَاءُ التالم کا معنی تکلیف



محسوس کرنا۔ اَلَيْسَ کی جمع اَلِیَّاء ہے جیسے کریم کی جمع کرماء ہے آلام اس کی جمع اشراف کی طرح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَكْذِبُوْنَ**، مامصدر یہ ہے یعنی رسل کی تکذیب کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ کا انکار اور اس کی آیات کی تکذیب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں دردناک عذاب دیا۔ یہ ابو حاتم نے کہا ہے۔ عاصم، حمزہ اور کسائی نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے ان کے جھوٹ کی وجہ سے اور ان کے اس قول کی وجہ سے کہ ہم ایمان لائے حالانکہ وہ مومن نہ تھے۔

**مسئلہ:** نبی کریم ﷺ کو منافقین کے نفاق کا علم تھا تو ان کے قتل سے کیوں رکے رہے، اس کے متعلق علماء کے مختلف چار اقوال ہیں۔

۱۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ ﷺ نے انہیں قتل نہ فرمایا کیونکہ آپ ﷺ کے علاوہ کسی کو ان کی حالت کا علم نہ تھا اور اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ قاضی اپنے علم کی بنا پر قتل نہیں کر سکتا۔ باقی تمام احکام میں علماء کا اختلاف ہے، ابن عربی نے کہ: یہ قول درست نہیں کیونکہ مجذربن زیاد کو حارث بن سوید بن الصامت نے قتل کیا تھا کیونکہ مجذربن حارث کے باپ سوید کو جنگ بعاث میں قتل کیا تھا۔ حارث اسلام لے آیا، جنگ احد میں مجذربن کو غفلت میں پایا تو اسے قتل کر دیا۔ جبریل امین نے اس کی خبر نبی کریم ﷺ کو دی اور اسے اس کے بدلے میں قتل کر دیا، کیونکہ اس کا قتل دھوکے سے تھا اور دھوکے سے قتل کرنا اللہ کی حدود میں سے ایک حد ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ ابن عربی کی غفلت ہے کیونکہ اگر اجماع مذکور ثابت ہے تو پھر اس واقعہ سے اجماع نہیں ٹوٹا کیونکہ اجماع منعقد نہیں ہوتا اور ثابت نہیں ہوتا مگر نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد اور وحی کے انقطاع کے بعد۔ یہ واقعہ تو عین وحی کے ساتھ تھا، پس اس سے حجت نہیں پکڑی جاسکتی ہے یا یہ بالا اجماع منسوخ ہے۔ واللہ اعلم

۲۔ امام شافعی کے پیروکار علماء فرماتے ہیں: آپ ﷺ نے انہیں قتل نہیں فرمایا کیونکہ زندیق وہ ہوتا ہے جو کفر کو چھپاتا ہے اور ایمان ظاہر کرتا ہے۔ اس سے توبہ طلب کی جاتی ہے اور اسے قتل نہیں کیا جاتا۔ ابن عربی نے کہا: یہ وہم ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان سے توبہ طلب نہیں کی تھی اور نہ یہ کسی اور نے کیا تھا، کسی نے یہ نہیں کہا کہ زندیق سے توبہ طلب کرنا واجب ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے متعلق علم ہونے کے باوجود اعراض فرمایا۔ اصحاب شافعی میں سے یہ متاخر ہے۔ جس نے کہا زندیق سے توبہ طلب کرنا جائز ہے اس نے ایسی بات کہی ہے جو کسی کے لئے صحیح نہیں ہے۔

۳۔ آپ ﷺ نے تالیف قلوب کی مصلحت کی خاطر انہیں قتل نہیں کیا تا کہ وہ آپ سے متنفر نہ ہو جائیں۔ آپ ﷺ نے اس معنی کی طرف اشارہ فرمایا جبکہ آپ ﷺ نے حضرت عمر سے فرمایا: **مَعَاذَ اللّٰهِ اِنْ يَتَّحِدُ النَّاسُ اِنِ اِقْتُلَ اَصْحَابُ**۔ (۱) اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ لوگ کہیں کہ میں اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہوں۔ اس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ مؤلف قلوب کو نبی کریم ﷺ عطا فرماتے تھے حالانکہ آپ ﷺ کو ان کی بد اعتقادی کا علم تھا یہ ہمارے اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ابن عطیہ کا قول ہے: نبی کریم ﷺ کے منافقین کو قتل نہ کرنے کے بارے میں یہ اصحاب مالک کی دلیل

۱۔ صحیح بخاری، صفحہ 499، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً: کتاب المناقب، باب ما ینھو عنہ من دعوة النجاة، حدیث 3257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے: اس پر محمد بن الجہم، قاضی اسماعیل، الابہری، ابن الماجشون نے نص قائم کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے حجت پکڑی ہے لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۖ مَلْعُونِينَ أَيْسَرَ تُحْضَوْنَ ۖ وَاقْتُلُوا الْمُتَقَاتِلَ ۖ (الاحزاب)

قنادہ نے کہا: اس کا معنی ہے جب انہوں نے نفاق کا اعلان کیا۔ امام مالک نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کے عہد میں جو نفاق تھا وہ آج زندہ ہے۔ پس زندیق کو قتل کیا جائے گا جب اس پر گواہی قائم ہو جائے گی اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی۔ یہ امام شافعی کا ایک قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: نبی کریم ﷺ منافقین کے قتل سے رک گئے تاکہ امت کو بیان کریں کہ حاکم اپنے علم کے مطابق فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ منافقین کے خلاف گواہی نہیں تھی۔ قاضی اسماعیل نے کہا: عبد اللہ بن ابی پر گواہی نہ دی مگر صرف زید بن ارقم نے۔ اور جلاس بن سوید پر گواہی نہ دی مگر عمیر بن سعد نے جو اس کی پرورش میں تھا۔ اگر اس میں سے کسی ایک پر دو آدمی اس کے کفر اور نفاق کی گواہی دیتے تو اسے قتل کیا جاتا۔ امام شافعی نے دوسرے قول کے لئے حجت پکڑتے ہوئے کہا کہ اس شخص کے بارے سنت یہ ہے جس پر زندیق ہونے کی گواہی دی گئی ہو پھر وہ انکار کرے اور ایمان کا اعلان کرے اور دین اسلام کا اعلان کرے اور دین اسلام کے علاوہ ہر دین سے براءت کرے تو اس کا خون بہانا ممنوع ہے۔ اصحاب الرائے، احمد، طبری وغیرہم کا یہی نظریہ ہے۔ امام شافعی اور ان کے قبعین نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے منافقین کو قتل نہیں کیا کیونکہ وہ اسلام کو ظاہر کرتے تھے حالانکہ آپ ﷺ کو ان کے نفاق کا علم تھا، وہ جس کو ظاہر کرتے تھے وہ ماقبل گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔

طبری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بندوں پر احکام ظاہر پر رکھے ہیں، ان کے بواطن کا معاملہ اس کے اپنے سپرد ہے۔ مخلوق میں سے کسی کو یہ اختیار نہیں کسی کے لئے اس کے ظاہر کے خلاف فیصلہ کرے کیونکہ یہ ظنون کے مطابق حکم ہوگا۔ اگر کسی فرد کے لئے یہ جائز ہوتا تو نبی کریم ﷺ اس کے زیادہ لائق ہوتے۔ نبی کریم ﷺ نے منافقین کے ظاہر کی وجہ سے ان پر مسلمانوں والا حکم لگایا اور ان کے بواطن کو اللہ کے سپرد کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں وَاللَّهُ يَشْهَدُ أَنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاِبُونَ ۖ (المنافقون) میں ان کے ظاہر کی تکذیب کی ہے۔ ابن عطیہ مالکی اس الزام سے اس آیت کی وجہ سے بری ہیں جو ان پر لازم آتا تھا کیونکہ آیت میں اشخاص کو متعین نہیں کیا گیا۔ اس میں ہر اس شخص کے لئے زجر و توبیخ ہے جو بھی نفاق میں گھر ہوا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے لئے یہ کہنا باقی رہ گیا ہے اس میں سے میں مراد نہیں ہوں۔ میں مومن ہی ہوں، اگر کسی کو متعین کر دیا جاتا تو اس کا جھوٹ کسی چیز کو ختم نہ کرتا۔

میں کہتا ہوں: اس انفصال میں نظر ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ انہیں جانتے تھے یا اللہ تعالیٰ کی عطا سے ان کی شخصیات اور ان کے اسماء کو جانتے تھے۔ حضرت حذیفہ نبی کریم ﷺ کے بتانے کی وجہ سے منافقین کو جانتے تھے حتیٰ کہ حضرت عمر، حضرت حذیفہ کو کہتے تھے: اے حذیفہ! کیا میں ان میں سے ہوں، حذیفہ کہتے: نہیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحاب کی حفاظت فرمائی تھی کہ منافقین انہیں خراب کر سکیں کیونکہ اللہ تعالیٰ

نے مومنین کو ثبات عطا فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اصحاب کی حفاظت فرمائی تھی کہ منافقین ان کے دین میں بگاڑ پیدا کر سکیں۔ پس ان کے باقی رکھنے میں کوئی ضرر نہ تھا، لیکن آج اس طرح نہیں ہے، ہم زنا دقہ سے امن میں نہیں ہیں کہ وہ ہمارے عام اور جاہل لوگوں کے نظریات خراب نہیں کریں گے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ⑤

”اور جب کہا جائے انہیں کہ مت فساد پھیلاؤ زمین میں تو کہتے ہیں ہم ہی تو سنوارنے والے ہیں۔“

اِذَا ظَرْف کی بنا پر حالت نصبی میں ہے اور اس میں عامل قَالُوا ہے، اِذَا یہ فعل منتظر کے وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ جوہری نے کہا اِذَا اسم ہے جو زمانہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے اور یہ جملہ کی طرف مضاف ہو کر استعمال ہوتا ہے مثلاً اَجِيْتُكَ اِذَا احمر البسر، وَاِذَا قَدِمَ فُلَانٌ، یعنی میں تیرے پاس آؤں گا جب کھجوریں سرخ ہو جائیں گی اور جب فِلاں آجائے گا اور جو چیز اس کے اسم ہونے پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ یوم کی جگہ واقع ہوتا ہے مثلاً آتِيكَ يَوْمَ يَقْدُمُ فُلَانٌ يَهْ ظَرْف ہے اور اس میں مجازۃ کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ شرط کی جزائیں چیزیں ہوتی ہیں: الفعل، الفاء اور اِذَا۔ فعل کی مثال ان تَاتَنِي اَتَكَ۔ فاء کی مثال ان تَاتَنِي فَا نَا احسن اليك، اِذَا کی مثال، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَبَاقِدْ مَتَّ اَيُّهُمْ اِذَا هُمْ يَفْقَطُونَ ⑥ (الروم) اور اگر پہنچتی ہے انہیں کوئی تکلیف بوجہ ان کو تو توں کے جو آگے بھیجے ہیں ان کے ہاتھوں نے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ مجازۃ کے معنی میں اِذَا اس شعر میں استعمال ہوا ہے:

اِذَا قَصَرَتْ اَسْيَافُنَا كَانَتْ وَصْلُهَا عَطَانَا اِلَى اَعْدَائِنَا فَنَضَارِبُ

جب ہماری تلواریں قاصر آجائیں گی تو ہمارے قدم انہیں ہمارے دشمنوں تک پہنچائیں گے اور ہم انہیں ماریں گے۔  
نضارب کا عطف کان پر ہے، اس لئے یہ مجزوم ہے۔ اگر نضارب مجزوم نہ ہوتا تو فنضارب نصب کے ساتھ ہوتا کبھی اِذَا پر مائید اِذَا ذکر کیا جاتا ہے پھر اس کے ساتھ جزم دی جاتی ہے۔ فرزدق کا قول ہے:

نَقَامَ اَبُو لَيْثٍ اِلَيْهِ اِبْنُ ظَالِمٍ وَكَانَ اِذَا مَا يَسْلُلُ السِّيفُ يَضْرِبُ

ابو لیلیٰ ابن ظالم اس کی طرف اٹھا اور وہ جب تلوار سونت لیتا ہے تو مار دیتا ہے۔

سیبویہ نے کہا: کعب بن زہیر نے جو کہا وہ عمدہ ہے:

وَإِذَا مَا تَشَاءُ تَبْعُثُ مِنْهَا مَغْرِبُ الشَّمْسِ نَاشِطًا مَذْعُورًا

اور جب تو اس سے سورج کے غروب ہونے کے وقت چلنا طلب کرے گا تو وہ اس وقت بھی ایسی تیزی سے اٹھے گی جیسے کوئی جانور شکاری سے ڈرا ہوا ہوتا ہے۔

یعنی عمدہ یہ کہ اِذَا کے ساتھ جزم نہ دی جائے جیسے اس بیت میں جزم نہیں دی گئی۔ مبرد سے حکایت کیا گیا ہے کہ خراجت فاذا زید میں اِذَا ظَرْف مکان ہے کیونکہ اپنے ضمن میں جثہ کو لئے ہوئے ہے اور یہ مردود ہے کیونکہ اس کا معنی ہے خراجت فاذا حضور زید۔ یہ مصدر کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہوتا ہے جیسے دوسرے ظَرْف زمان تقاضا کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے



اليوم خمرو غداً امرو۔ اس کا معنی ہے آج خمر کا وجود ہے اور کل امر کا وقوع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَتِيلٌ يَهْلِكُ يَوْمَئِذٍ السَّامِیَہُ۔ اصل میں قَتُولٌ تھا۔ واؤ کے کسرہ کو قاف کی طرف نقل کیا گیا پھر واؤ یاء سے بدل گئی۔ اور قَتِيلٌ لَہُمْ میں لام کو لام میں ادغام کرنا بھی جائز ہے اور دو ساکنوں کو جمع کرنا بھی جائز ہے کیونکہ یاء حرف مدولین ہے۔ انخس نے کہا: قیل قاف اور یاء کے ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ کسائی نے کہا: قاف کو ضمہ کی بودے کر پڑھنا بھی جائز ہے تاکہ دلالت کرے کہ یہ مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ قیس قبیلہ کی لغت ہے، اسی طرح جی، غیض، حیل، سیق، سیی، اور سیئت (1) میں ہے۔ ہشام نے حضرت ابن عباس، رویش نے یعقوب سے اسی طرح روایت کیا ہے اور ان الفاظ میں سیی اور سیئت کو نافع نے خاص طور پر اشام سے پڑھا ہے۔ ابن ذکوان نے حیل اور سیق میں بھی اشام کیا ہے اور باقی قراء نے تمام میں کسرہ دیا ہے۔ ہذیل، بنو بکر جو اسد اور بنی فقعس سے تھے وہ اسے قَوْلٌ واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَا تُفْسِدُوا مَا فِي الْأَرْضِ۔ فساد، صلاح کی ضد ہے، اور فساد کی حقیقت، سیدھے راستہ سے عدل کر کے اس کی ضد کی طرف جانا ہے فساد الشيء یفسد فساداً وفسوداً وفساداً وفسیداً آیت میں اس کا معنی ہے زمین میں کفر کر کے اور اہل کفر سے محبت کر کے لوگوں کو محمد ﷺ پر ایمان لانے اور قرآن پر ایمان لانے میں جدائی کر کے فساد نہ کرو۔ بعض علماء نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے زمین میں فساد تھا، زمین پر ہر قسم کے گناہ کیے جاتے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تو فساد اٹھ گیا اور زمین کا اصلاح ہو گئی۔ جب منافقین نے پھر گناہ شروع کیے تو اس کی اصلاح کے بعد فساد کیا جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا (الاعراف: 56) (تم زمین میں فساد برپا نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِي الْأَرْضِ مَوْنٌ اسم جنس ہے، اس کے واحد کا حق تھا کہ ارضۃ کہا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا۔ اس کی جمع ارضات آتی ہے کیونکہ عرب ایسی مؤنث کی جمع تاء کے ساتھ بناتے ہیں جس کے آخر میں تاء تانیث نہیں ہوتی مثلاً عرسات۔ پھر علماء کہتے ہیں ارضون۔ انہوں نے اس کی جمع واؤ، نون کے ساتھ بنائی ہے اور مؤنث کی جمع واؤ اور نون کے ساتھ نہیں آتی مگر یہ کہ وہ منقوص ہو جسے ثبۃ اور ظبۃ، لیکن انہوں نے واؤ اور نون کو الف اور تاء جو حذف ہیں ان کے عوض کو ذکر کیا ہے اور را کے فتح کو اپنی حالت پر رکھا ہے۔ اور کبھی ساکن کر کے پڑھا ہے۔ اس کی جمع اروض بھی بنائی جاتی ہے۔ ابو الخطاب نے کہا ہے کہ وہ کہتے ہیں ارض، اراض جیسا کہ اہل کے بارے میں کہا ہے: اہل، اہال، اور الاراضی بھی بغیر قیاس کے جمع آتی ہے۔ گویا انہوں نے ارض کی جمع بنائی۔ ہر وہ چیز جو نیچے ہو وہ ارض ہے ارض اریضۃ یعنی پاکیزہ زمین جس کی اراضت ظاہر ہے۔ قد ارضت کا معنی ہے، پاکیزہ، عمدہ ہے۔ ابو عمرو نے کہا: نزلنا ارضاً اریضۃ یعنی ہم ایسی زمین میں اترے جو آنکھوں کو اچھی لگنے والی تھی۔ کہا جاتا ہے: لا ارض لك۔ جیسے کہا جاتا ہے: لا امر لك۔

الارض جانور کے نیچے والے پاؤں کو کہتے ہیں۔ حمید اپنے گھوڑے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَلَمْ يَقْلِبْ اَرْضَهَا الْبَيْطَارُ      وَ لَا لَحْبِلِيْهِ بِهَا حَبَارُ

الارض سے مراد نفصۃ (جھاڑتا ہے) اور الوعدۃ (کچکی) کو بھی کہتے ہیں۔ حماد بن سلمہ نے قتادہ سے انہوں نے عبد اللہ بن حارث سے روایت کیا ہے فرمایا: بصرہ میں زمین پر زلزلہ آیا تو حضرت ابن عباس نے کہا: ازلزلت الارض امری ارض۔ کیا زمین لرز رہی ہے یا مجھ پر کچکی طاری ہے۔ ذوالرمہ نے شکاری کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا:

اِذَا تَوَجَّسَ رَكْنًا مِنْ سَنَابِكِهَا      اَوْ كَانَ صَاحِبَ اَرْضٍ اَوْ بِهِ السُّومُ

جب اس کے پاؤں کی مدہم سے آواز سنتا ہے یا اسے لرزہ ہے یا اسے برسام کی بیماری ہے۔ الارض کا معنی الرکام بھی ہے قد آرضہ اللہ ایراضاً یعنی اسے زکام لگا دیا۔ فسیلٌ مستأرضٌ وودیۃٌ مستأرضۃ (راء کے کسرہ کے ساتھ) جس کی زمین میں جڑ ہو۔ اور جب کھجور تنے پر اُگ آئے تو اسے راکب کہتے ہیں۔ الاراض اوان اور بالوں کی بنی ہوئی بڑی قالین۔ رجل اریض، متواضع اور نیکی کرنے والا شخص۔ اصمعی نے کہا: کہا جاتا ہے: هُوَ اَرْضُهُمْ اَنْ یَفْعَلَ ذٰلِكَ۔ یعنی اس نے انہیں پیدا کیا۔ شئ عریض۔ اریض اس کی پیروی کرنے والا۔ بعض نے اس کو علیحدہ ذکر کیا کہ جَدَّی اریض یعنی موٹا ونبہ یا موٹا تحفہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَحْنُ اس کی اصل نحن ہے۔ ہاء کی پیش نون کو دی گئی اور ہاء کو ساکن کر دیا۔ یہ ہشام بن معاویہ نحوی کا قول ہے، الزجاج نے کہا: نحن جمع کے لئے ہے اور جمع کی علامت میں سے واؤ ہے اور ضمہ واو کی جنس سے ہے، جب نَحْنُ کو حرکت دینے کی طرف مجبور ہوئے تو انہوں نے ایسی حرکت دی جو جماعت کے لئے تھی۔ زجاج نے کہا: اسی وجہ سے واؤ جمع کو اس ارشاد میں ضمہ دیا ہے: اُولَئِكَ الَّذِیْنَ اسْتَرَوْا الضَّلٰلَةَ (البقرہ: 16) (یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو خریدا) محمد بن یزید نے کہا: نحن، قبل اور بعد کی مثل ہے کیونکہ یہ دو یا زائد کی خبر دینے کے لئے ہے۔ انا، واحد کے لئے ہے نحن تثنیہ اور جمع کے لئے ہے۔ کبھی متکلم اس کے ساتھ اپنے متعلق خبر دیتا ہے جیسے نحن قمنا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّوٰثِقَهُمْ (الزخرف: 32) ہم نے خود تقسیم کیا ہے ان کے درمیان سامان زیست کو۔ اور مؤنث اس صورت میں مذکر کے قائم مقام ہوتی ہے جبکہ وہ کلام کرنے والی ہو۔ عورت کہتی ہے: قَسَمْتُ وَ ذَهَبْتُ، قَسَمْنَا وَ ذَهَبْنَا۔ وَاَنَا فَعَلْتُ ذٰلِكَ۔ و نحن فعلنا یہ عربوں کا کلام ہے۔ خوب جان لو!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُضِلُّوْهُنَّ یہ اِصْدَح سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ الصلاح فساد کی ضد ہے، صِدَح لام کے ضمہ اور فتح کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں۔ یہ ابن سکیت نے کہا ہے۔ صِدَح، صَاد کے ضمہ کے ساتھ صِدَح (بضم اللام) کا مصدر ہے۔ شاعر نے کہا:

فَكَيْفَ بِاطْرَاقِ اِذَا مَا شَتَمْتَنِي      وَ مَا بَعْدَ شَتَمِ الْوَالِدِیْنِ صِلُوْهُ

جب تم مجھے گالی دو گے تو میں کیسے سر جھکاؤں گا، والدین کو گالی دینے کے بعد صلح نہیں ہوتی۔

اور صلاح مکہ کے اسماء میں سے ہے، الصلاح صاۃ کے کسرہ کے ساتھ نہر کو کہتے ہیں۔ یہ انہوں نے اپنے گمان کے مطابق کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ان کا فساد کرنا، اصلاح تھا۔ یعنی ہمارا کفار کی مدد کرنا اس لئے تھا کہ ہم ان کے اور مومنین کے درمیان اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ یہ ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔

اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلٰكِنْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٥٠﴾

”ہوشیارو ہی فسادی ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ یہ منافقین کے قول کا رد ہے اور ان کو جھٹلاتا ہے، ارباب المعانی نے کہا: جس نے دعویٰ ظاہر کیا اس نے جھوٹ بولا، کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ یہ صحیح ہے ان کو کسرہ دیا گیا ہے، کیونکہ یہ ابتداء کلام میں ہے۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ علی بن سلیمان نے کہا: اُن یرفتحہ بھی جائز ہے جیسا کہ سیبویہ نے جائز قرار دیا ہے۔ حَقَّ اَنْتَ مَنْطِقٌ حَقًّا بمعنی الا ہے، اور ”ہم“ اس کا مبتدا ہونا جائز ہے۔ اور المفسدون خبر ہے پھر مبتدا اور خبر، ان کی خبریں اور یہ بھی جائز ہے کہ ”ہم“ انہم میں جو باء اور میم ہے اس کی تاکید کے لئے ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ ہم فاصلہ ہو کوئی اس کو عماد کہتے ہیں اور المفسدون ان کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے الا انہم المفسدون جیسا کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥١﴾ کے قول میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلٰكِنْ لَا يَشْعُرُونَ ابن کیسان نے کہا: کہا جاتا ہے جو جانتا نہ ہو کہ وہ مفسد ہے تو اس کی مذمت نہیں ہوتی۔ مذمت تو اس کی ہوتی ہے جو جانتا ہو کہ وہ مفسد ہے پھر علم کے باوجود فساد برپا کرے۔ ابن کیسان نے کہا: اس کے دو جواب ہیں یہ خفیۃً فساد کرتے تھے اور ظاہر صلاح کرتے تھے اور وہ یہ نہ جانتے تھے کہ ان کا یہ معاملہ نبی کریم ﷺ کے پاس ظاہر ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا فساد ان کے نزدیک صلاح تھا اور وہ نہ جانتے تھے کہ یہ فساد ہے۔ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، حق کو ظاہر کرنے اور اس کی اتباع کو ترک کر کے۔ وَلٰكِنْ یہ حرف تاکید اور استدراک ہے اس میں نفی اور اثبات ضروری ہے۔ اگر اس سے پہلے نفی ہو تو اس کے بعد ایجاب ہوگا۔ اگر اس سے پہلے ایجاب ہو تو اس کے بعد نفی ہوگی۔ اس کے بعد ایک اسم پر اکتفا بھی جائز ہے جب پہلے ایجاب ہو۔ لیکن تو اس کے بعد ماقبل کا مخالف جملہ ذکر کرے گا جیسا کہ اس آیت میں ہے اور تیسرا قول ہے جاءنی زید و لکن عمرو لم یجئنی۔ اور یہ جائز نہیں جاءنی زید لکن عمرو پھر تو خاموش ہو جائے کیونکہ لکن کی جگہ بل کی وجہ سے اس جیسی مثال میں مستغنی ہو جاتے ہیں۔ یہ اسی صورت میں جائز ہے جب پہلے نفی ہو جیسے تیسرا قول ہے ما جاءنی زید لکن عمرو۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَا اٰمَنَ السُّفَهَاءُ ؕ اَلَا اِنَّهُمْ

هُمُ السُّفَهَاءُ وَلٰكِنْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٢﴾

”اور جب کہا جائے انہیں: ایمان لاؤ جیسے ایمان لائے (اور) لوگ تو کہتے ہیں: کیا ہم ایمان لائیں جس طرح

ایمان لائے یہ قوف؟ خبردار! بے شک وہی احمق ہیں مگر وہ جانتے نہیں۔“



اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ هُمْ ضَمِيرٌ** سے مراد منافقین ہیں۔ یہ مقاتل وغیرہ کا قول ہے **أَمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ** یعنی تم بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کی تصدیق کرو جیسا کہ مہاجرین نے تصدیق کی اور اہل یثرب میں سے مختلف لوگوں نے تصدیق کی۔ **أَمِنُوا** میں الف قطعی ہے۔ تو کہتا ہے یومن، کاف نصب کے مقام پر ہے کیونکہ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی ایسا نا کا بیان الناس۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قَالُوا أَتُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ** یعنی اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ منافقین نے **السُّفَهَاءُ** سے اہل کتاب کے مؤمنین مراد لئے۔ یہ منافقین کا قول ہے۔ وہ پوشیدہ اور استہزاء کے طور پر یہ کہتے تھے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کو اس پر آگاہ فرما دیا۔ اور ثابت فرمایا کہ بیوقوفی، عقلوں کا نرم ہونا، بصیرت کا فاسد ہونا، ان کی اپنی ذوات میں ہے اور ان کی صفت ہے بتایا کہ یہی بیوقوف ہیں دلوں پر چڑھی ہوئی میل کی وجہ سے جانتے نہیں ہیں، بکلی نے ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ یعنی جب یہود کو کہا گیا کہ ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے یعنی عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھی تو انہوں نے کہا: کیا ہم ایمان لائیں جیسے **السُّفَهَاءُ** ایمان لائے یعنی جہال اور نا سمجھ۔ کلام عرب میں السفہ کا معنی ہے خفت اور رقت، کہا جاتا ہے۔ ثوب سفیہ جب کپڑے کی بنائی اچھی نہ ہو یا پرانا اور بار یک ہو۔ تسفہت الريح الشجر ہوانے درخت کو جھکا دیا۔ ذوالرمہ نے کہا:

مشین کما احتوت رماح تسفہت اعالیہا مز الرياح النواسم

وہ عورتیں چلیں جیسے نیزے حرکت کر رہے ہوں ہلکی پھلکی ہوا کے چلنے نے ان کے اوپر والے حصوں کو جھکا دیا۔

تسفہت الشئ کسی چیز کو حقیر سمجھنا۔ السفہ، حلم (دانشمندی) کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے: ان السفہ ان یکثر الرجل شرب الماء فلا یروی۔ سفاہیت ہے کہ آدمی زیادہ پانی پیے اور سیر نہ ہو۔ السفہاء کے دونوں ہمزوں میں چار وجوہ جائز ہیں۔ عمدہ وجہ یہ ہے کہ پہلے ہمزہ کو ثابت کرے اور دوسرے کو واؤ سے بدل دے۔ یہ اہل مدینہ کی قرأت ہے اور ابو عمرو کی قرأت سے معروف ہے اور اگر تو چاہے تو دونوں میں تخفیف کرے۔ پہلے تو ہمزہ اور واؤ کے درمیان پڑھے اور دوسرے کو خالص واؤ کے ساتھ پڑھے۔ اگر تو چاہے تو پہلے میں تخفیف کرے اور دوسرے کو ثابت رکھے۔ اگر تو چاہے تو دونوں کو ثابت رکھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ** یہ **وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ** کی مثل ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ علم، معلوم کی معرفت کو کہتے ہیں جیسا کہ وہ معلوم ہے تو کہتا ہے: علمت الشئ اعلمہ علماً عرفته۔ علمت الرجل فعلمته اعلمہ (لام کے ضمہ کے ساتھ) یعنی میں علم کے ساتھ اس پر غالب آیا۔

**وَإِذَا قَالُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شُيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا**

**نَحْنُ مُسْتَهْزَؤُونَ** ⑤

”اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں اپنے

شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں: ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف (ان کا) مذاق اڑا رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا بِآيَاتِ الْمُنَافِقِينَ كَذِبٌ بَيْنَ يَدَيْهِمْ لَئِنْ لَمْ يَرْجِعْ بَيْنَهُمُ الْمُنَافِقُونَ لَبُغَا لَنَا بِمَا كَانُوا يَكُونُونَ ﴿١٠٧﴾ وَلَقَدْ نَزَّلْنَاهُ بِذِكْرِ الْوَيْدِ وَأَنزَلْنَاهُ فِي الْقُدْحِ وَإِنَّا لَنَاقِلُوهَا فِي الْبُرْجِ ﴿١٠٨﴾ وَلَقَدْ نَزَّلْنَاهُ بِالْأَمْرِ وَإِنَّا لَنَاقِلُوهَا فِي الْبُرْجِ ﴿١٠٩﴾ وَلَقَدْ نَزَّلْنَاهُ بِالْأَمْرِ وَإِنَّا لَنَاقِلُوهَا فِي الْبُرْجِ ﴿١١٠﴾

اگر یہ کہا جائے کہ لا قوا میں واؤ کو کیوں ضمہ دیا گیا اور لَقُوا میں حذف کیوں کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لَقُوا میں جو واؤ ہے اس سے پہلے ضمہ تھا۔ اگر واؤ کو ضمہ کی حرکت دی جاتی تو زبان پر اس کا تلفظ ثقیل ہوتا پس اس کے نقل کی وجہ سے اسے حذف کیا گیا اور لا قوا میں حرکت دی گئی کیونکہ اس سے پہلے فتح تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذَا خَلَاوُا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ

اگر کہا جائے کہ خَلَاوُا کا صلہ الی کیوں ذکر ہوا جبکہ معروف یہ ہے کہ اس کا صلہ باء ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہاں خَلَاوُا بمعنی ذہبوا اور انصرفوا ہے۔ فرزدق کا قول ہے:

كيف تراني قالبا مجتئ اضرب امرى ظهرة لبطن

قد قتل الله زياداً عنى (1)

تو مجھے اپنی ڈھال پھیرنے والا کیسے دیکھتا ہے، میں اس کی پیٹھ پر اس کے بطن کے لئے مارتا ہوں

اللہ تعالیٰ نے زیاد کو میری طرف سے قتل کر دیا ہو

جب صرف کے قائم مقام رکھا تو اس کا صلہ ذکر کیا۔

بعض علماء نے کہا: الی بمعنی مع ہے۔ اس قول میں ضعف ہے۔ بعض علماء نے کہا: الی بمعنی باء ہے (2)۔ اس کا خلیل اور سیبویہ نے انکار کیا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے واذا خلوا من المؤمنين الی شیاطینہم۔ اس صورت میں الی اپنے اصلی معنی میں ہوگا۔ الشیاطین، شیطان کی جمع مکسر ہے۔ اس کے اشتقاق اور اس کے معنی کے متعلق قول اَعُوذُ بِاللّٰهِ کے تحت گزر چکا ہے۔

یہاں شیطان سے کون مراد ہیں؟ اس کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: یہ کفر کے سردار ہیں (3)۔ کلبی نے کہا: یہ جنوں کے شیاطین ہیں۔ اکثر مفسرین نے کہا: یہ کابن لوگ ہیں۔ الشیطانة کا لفظ وہ ہے جس کا معنی ہے ایمان اور خیر سے دور ہونا۔ جو کچھ ذکر کیا گیا ہے یہ سب کو شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّمَا هُمْ فَسَقَةٌ يَخُوتَ وَيَخْلَفُونَ ﴿١١١﴾ یعنی ہمیں جس کی طرف بلایا جاتا ہے ہم اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ بعض علماء نے اس کا معنی کیا ہے: ہم تمسخر کرتے ہیں۔ الہود کا معنی ہے تمسخر کرنا اور دل بہلانا۔ کہا جاتا ہے: هُوَّاهُ وَاسْتَهْزَأَ۔

راجز نے کہا:

قد هزئت مني امر طيسله  
 قالت اراه معدما لا مال له  
 امر طيسله نے مجھ سے تمسخر کیا۔ اس نے کہا: میں اسے مفلس دیکھتی ہوں، اس کے پاس کوئی مال نہیں۔  
 بعض علماء نے فرمایا: استہزاء کا معنی انتقام لینا ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا:

قد استهزءوا منهم بالغي مدجج  
 سرائهم وسط الصحاح جشم  
 انہوں نے ان سے دو ہزار ہتھیار بندوں کے ساتھ انتقام لیا۔ ان کے سردار چٹیل زمین کے دریاں اپنے ہاتھ کو لازم پکڑے ہوئے تھے۔

اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمْدُحُ فِي طُغْيَانِهِم يَعْمَهُونَ ⑤

”اللہ سزا دے رہا ہے انہیں اس مذاق کی اور ڈھیل دیتا ہے انہیں تاکہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ ان سے انتقام لے گا اور انہیں سزا دے گا اور ان سے تمسخر کرے گا اور انہیں ان کے تمسخر کی سزا دے گا۔ سزا کو گناہ کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے۔ اور عرب اپنے کلام میں اس قسم کی ترکیب کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ عمرو بن کلثوم کا قول ہے:

الا لا يجهلن احدٌ علينا  
 فنجهل فوق جهل الجاهلينا (1)

خبردار! کوئی ہم پر (حملہ کر کے) جہالت کا مظاہرہ نہ کرے ورنہ ہم زمانہ جاہلیت کی جہالت سے زیادہ جہالت کا مظاہرہ کریں گے۔

اس نے اپنے غلبہ کو جہل سے تعبیر کیا۔ حالانکہ کوئی صاحب عقل جہالت پر فخر نہیں کرتا۔ یہ اس نے کلام کو ملانے کے لئے جہل کا لفظ استعمال کیا ہے پس یہ زبان پر خفیف ہو جائے گا حالانکہ اس کے لفظ اور اس کے اس مفہوم کے درمیان مخالفت ہے۔ عرب جب ایک لفظ کو کسی لفظ کے مقابلہ میں بطور جواب اور جزا ذکر کرتے ہیں تو اس لفظ کی مثل ذکر کرتے ہیں، اگرچہ وہ لفظ اس کے معنی کے مخالف ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں قرآن و سنت میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجَزَّوُا سَيِّئًا سَيِّئًا مِّثْلُهَا (الشوری: 40) اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ اور فرمایا فَمَنْ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ (البقرہ: 194) تو جو تم پر زیادتی کرے تو تم اس پر زیادتی کرو لیکن اسی قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو۔ جزاء، سینۃ (برائی) نہیں ہوتی اور قصاص (بدلہ) اعتد نہیں ہوتا ہے کیونکہ قصاص تو ثابت حق ہوتا ہے۔ اسی طرح فرمایا وَمَكْرُؤًا فَاَعْتَدُوا لِلَّهِ (آل عمران: 54) اور یہودیوں نے (مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کی) خفیہ تدبیر کی اور (مسیح کو بچانے کے لئے) اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی۔ اِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ⑥ وَ اَكِيدُ كَيْدًا ⑦ (الطارق) یہ لوگ طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں اور میں بھی تدبیر فرما رہا ہوں۔



اسی طرح فرمایا: اِنَّكَ اَنْتَ اَنْتَ مُسْتَهْزِئٌ ۝۱۴۱ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهٖمُ (البقرہ)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ مکر ہے نہ استہزاء ہے اور نہ کید ہے بلکہ یہ ان کے مکر اور استہزاء کی جزا ہے اور ان کے کید کی جزا ہے۔ اسی طرح فرمایا: يُخَذِّعُ غَوْنُ اللّٰهِ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (النساء: 142) وہ دھوکا دے رہے ہیں اللہ کو اور اللہ تعالیٰ سزا دینے والا ہے انہیں (اس دھوکہ بازی کی) فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ (التوبہ: 79) تو یہ ان کا بھی مذاق اڑاتے ہیں اللہ تعالیٰ سزا دے گا انہیں اس مذاق کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان اللہ لایسل حق تلبو (1) ولا یسأمر حتی تساموا (2) یعنی اللہ تعالیٰ نہیں اکتا تا حتیٰ کہ تم اکتا جاؤ گے اور وہ ملول نہیں ہوتا حتیٰ کہ تم ملول ہو جاؤ گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس حدیث میں حتیٰ بمعنی واؤ ہے یعنی اور تم اکتا جاؤ گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اور تم اکتا جاؤ گے۔ بعض نے فرمایا: وہ تم سے تمہارے اعمال کا ثواب ختم نہیں کرے گا حتیٰ کہ تم عمل چھوڑ دو گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ایسے افعال کرے گا جو انسان کے خیال میں استہزاء، دھوکہ اور مکر ہوں گے۔ جیسا کہ روایت ہے کہ آگ جم جائے گی جس طرح گھی کا تلچھٹ جم جاتا ہے۔ وہ اس آگ پر چلیں گے اور وہ انہیں نجات گمان کریں گے۔ پھر وہ انہیں دھنسا دے گی (3)۔ کلبی نے ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا (البقرہ: 14) سے مراد اہل کتاب ہیں، منافق لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا اور ان کے استہزاء کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ جب اپنے شیطانوں کے پاس جاتے ہیں یعنی کفر کے رؤساء کے پاس جاتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ تو کہتے ہیں: ہم تمہارے ساتھ تمہارے دین پر ہیں۔ ہم تو محمد ﷺ کے اصحاب سے تمسخر کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں انہیں اس تمسخر کی سزا دے گا ان کے لئے، جنت سے جہنم کا دروازہ کھولا جائے گا پھر انہیں کہا جائے گا: ادھر آؤ پس وہ آئیں گے تو وہ جہنم میں چلے جائیں گے اور مومنین اپنے پلنگوں پر بیٹھے انہیں دیکھ رہے ہوں گے۔ جب وہ دروازے پر پہنچیں گے تو اسے بند کر دیا جائے گا پھر مومنین انہیں دیکھ کر ہنسیں گے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے، اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهٖمُ۔ یعنی آخرت میں اللہ انہیں اس استہزاء کی سزا دے گا جب ان پر دروازے بند ہوں گے تو مومنین ان پر ہنسیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہی مراد ہے: قَالِیَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَصْحَكُونَ ۝۱۴۲ عَلَى الْآثَرِ اُولٰٓئِكَ يَنْظُرُونَ ۝۱۴۳ (المطففين) یعنی مومنین دوزخیوں کو دیکھ رہے ہوں گے: هَلْ ثُبُوبَ الْكُفَّارِ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝۱۴۴ (المطففين) کیوں کچھ بدلہ ملا کفار کو (اپنے کرتوتوں کا) جو وہ کیا کرتے تھے۔

ایک قوم نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور استہزاء سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان دنیوی نعمتوں کے ذریعے آہستہ آہستہ دوزخ کی طرف لے جا رہا ہے اللہ تعالیٰ ان کے لئے دنیا میں احسان ظاہر کرتا ہے جبکہ عذاب آخرت ان سے چھپائے ہوئے ہے۔ پس وہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ان پر حتمی عذاب کا فیصلہ کر چکا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً کتاب الایمان، باب احب الدین الی اللہ عزوجل اذ وہ، حدیث 41، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافر وقصرها، باب امر من نعس فی الصلوٰۃ، صفحہ 267، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ البحر الروضی، صفحہ 97، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)



أَنَّا رَبُّكُمْ أَلاَ غُلٰی ۝ (النازعات) (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں)۔

آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لمبی عمر کے ساتھ ڈھیل دی حتیٰ کہ ان کی سرکشی میں اضافہ ہو گیا۔ پس وہ ان کے عذاب میں اضافہ کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَعْهَوْنَ مجاہد نے فرمایا: یعنی وہ کفر میں متحیر ہیں اور بھٹک رہے ہیں۔ اہل لغت نے بیان کیا کہ عہ الرجل یعہ عہا و عہا فہو عہ و عامہ کا معنی ہے آدمی حیران ہو گیا۔ کہا جاتا ہے: رجل عامہ و عہ متردد اور حیران شخص۔ اس کی جمع عمہ ہے۔ عرب کہتے ہیں: ذہبت ابلہ العہی۔ جب معلوم نہ ہو کہ اونٹ کہا چلا گیا۔ لعمی آنکھ کے (اندھے پن) کے لئے استعمال ہوتا ہے اور العہ دل کے اندھے پن کے لئے استعمال ہوتا ہے اور قرآن حکیم میں ہے: فَإِنَّهَا لَا تَعْنٰی اِلَّا بَصَارًا وَلٰكِنْ تَعْنٰی الْقُلُوبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُورِ ۝ (الحج) (حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتی بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں)۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی ۖ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوا مُهْتَدِیْنَ ۝

”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے بدلے مگر نفع بخش نہ ہوئی ان کی (یہ) تجارت اور وہ صحیح راہ نہ جانتے تھے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی سیبویہ نے کہا: اشْتَرُوا میں واؤ کو ضمہ دیا گیا ہے تاکہ واؤ جمع اور واو اصلہ میں فرق ہو جائے جیسے وَأَنْ لِّوِاسْتِقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ (الحج: 16)۔ (اور اگر وہ ثابت قدم رہیں راہ حق پر)۔

ابن کیسان نے کہا: واؤ میں ضمہ دوسری حرکات کی نسبت خفیف ہے کیونکہ ضمہ واؤ کی جنس سے ہے۔ الزجاج نے کہا: ضمہ کی حرکت دی گئی ہے جیسے نحن میں کہا گیا ہے۔ ابن ابی اسحاق، یحییٰ بن یعمر نے اتقاء ساکنین کی اصل پر واؤ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ ابوزید انصاری نے قنبل ابی سالم عدوی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے واؤ کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فتح خفیف ہے اگرچہ اس کا ما قبل مفتوح ہے۔ کسائی نے واؤ کے ہمزہ اور اس کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسے ادور، اشتوا، ثراء سے مشتق ہے اور الشراء یہاں مستعار ہے۔ معنی یہ ہے کہ انہوں نے ایمان پر کفر کو پسند کیا جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَاسْتَحَبُّوا النِّعٰی عَلَى الْهُدٰی (فصلت: 17)۔ یہاں ثراء سے تعبیر فرمایا کیونکہ ثراء اس چیز میں ہوتا ہے جس کو مشتری پسند کرتا ہے لیکن اگر ثراء کا معنی معاوضہ ہو تو پھر یہ معنی نہیں ہوگا کیونکہ منافقین مومن تھے ہی نہیں کہ وہ ایمان بیچتے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: انہوں نے گمراہی کو لیا اور ہدایت کو چھوڑ دیا۔ اس کا معنی ہے: انہوں نے ایمان کو بدلا اور کفر کو ایمان پر پسند کیا۔ وسعت



کی بنا پر لفظ شراء کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ شرا اور تجارت، تبدیلی چاہنے کی طرف لوٹتے ہیں۔ عرب اس شخص کے لئے شرا کو استعمال کرتے ہیں جو کسی چیز کو دوسری چیز سے بدلے۔ ابو ذؤیب نے کہا:

ان تزعمینی كنت اجهل فیکم فانی شريت الحلم بعدك بالجهل

(اگر تو مجھے گمان کرتی ہے کہ میں تم سے ناواقف ہوں تو میں نے تیرے بعد جہالت کے بدلے حلم کو اختیار کیا۔)

الضلالہ کا اصل معنی حیرت ہے، نسیان کو بھی ضلالت کہتے ہیں کیونکہ اس میں بھی کچھ حیرت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَعَلَّهَا إِذَا وَاَنَّا مِنَ الضَّالِّينَ** (الشراء)

اس آیت میں ضالین بمعنی ناسین (بھولنے والے) ہے۔ بلاکت کو بھی ضلالت کہتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَقَالُوا إِذَا وَاَصَلْنَا فِي الْأَرْضِ ضَالٌّ** (السجدہ: 10) (اور کہنے لگے کیا جب (مرنے کے بعد) ہم گم ہو جائیں گے زمین میں)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَا رَبَّحَتْ تِجَارَتُهُمْ** اللہ تعالیٰ نے عربوں کی عادت کے مطابق ربح کی نسبت تجارت کی طرف کی۔ (مثلاً) عرب کہتے ہیں: ربح بیعت و خسرت صفقتک لیل و نہار صائم۔ (1) معنی یہ ہے کہ تو نے اپنی بیع میں نفع اٹھایا اور تو نے اپنی بیع میں خسارہ اٹھایا، تو نے رات کو قیام کیا اور دن کو روزہ رکھا یعنی انہوں نے تجارت میں نفع نہ اٹھایا۔ شاعر نے کہا:

نهارك هائم و ليلك نائم كذلك في الدنيا تعيش البهائم

تو دن بھر گھومتا رہتا ہے اور رات بھر سویا رہتا ہے، دنیا میں حیوان اسی طرح زندگی گزارتے ہیں۔

ابن کیسان نے کہا: تجارة و تجائر، ضلالہ و ضلائل جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ** (وہ گمراہی کو خریدنے میں ہدایت پانے والے نہ تھے)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کی بات ہے (2)۔  
الاعتداء، گمراہی کی ضد ہے۔

**مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَلَّتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ**

**وَوَرَّاهُمْ فِي ظُلُمٍ لَا يَبْصُرُونَ** (3)

”ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی پھر جب جگمگا اٹھا اس کا آس پاس تو لے گیا اللہ ان کا نور اور چھوڑ دیا انہیں گھپ اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا** مثلہم مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے خبر کاف میں ہے یہ اسم ہے جیسا کہ اعشی کے قول میں ہے:

انتتهون و لن ينهي ذوى شطط كالطعن يذهب فيه الزيت والفتل (3)

کیا تم روکتے ہو جبکہ ظالم لوگ پیٹ تک پہنچنے والے تیر کی طرح نہ رکیں گے جس میں تیل اور ڈیوٹ چلی جاتی ہے۔  
امرء القیس کا شعر ہے:

ورحنا بکابن الماء یجنب وسطنا      تصوب فیہ العین طوراً و ترتقی

ان اشعار میں ک بمعنی مثل ہے یعنی مثل الطعن اور بمثل ابن الماء مراد لیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ خبر محذوف ہو۔ تقدیر  
کلام یوں ہو: مثلہم مستقر کمثل۔ اس صورت میں کاف حرف ہوگا، المثل، المثل والمثل تمام کا معنی ایک ہے اور  
اس کا معنی شبیہ ہے۔ متماثلان کا معنی متشابہان ہے۔ اہل لغت نے اسی طرح کہا ہے (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد الذی یہ اسم موصول واحد اور جمع کے لئے واقع ہوتا ہے۔ ابن الشجر ی بہتہ اللہ بن علی نے کہا: کچھ عرب  
جمع کو واحد کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے شاعر نے کہا:

وان الذی حانت بفدج دمائہم      ہم القوم کل القوم یا ام خالد

وہ لوگ جن کے خون بنے کا وقت فلج کے مقام پر قریب آیا تو اے ام خالد! وہ قوم ہی کامل قوم تھی۔

(اس شعر میں الذی کو جمع کے لئے استعمال کیا گیا ہے)۔ بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس قول وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَ  
صَدَّقَ بِهِ أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ① (الزمر) میں بھی یہی کہا ہے (یعنی الذی بمعنی الذین ہے) یہ اس لغت کے اعتبار سے  
ہوگا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: كَمَثَلِ الَّذِي  
اسْتَوْقَدَ۔ اسی لئے آگے فرمایا ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ (یعنی جمع کی ضمیر ذکر فرمائی) کلام کے آغاز کو واحد پر اور آخر کو جمع پر محمول  
کیا، رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا (توبہ: 69) اس میں الذی مصدر محذوف کی صفت ہے تقدیر کلام اس  
طرح ہوگی: خضتم كالخوض الذی خاضوا۔

بعض علماء نے فرمایا: الذی اور اسْتَوْقَدَ واحد ذکر فرمایا کیونکہ آگ جلانے والا ایک تھا اگر آگ جلانا اس کے سپرد تھا۔  
جب روشنی ختم ہو گئی تو ان تمام کی طرف رجوع فرمایا..... فرمایا: بِنُورِهِمْ۔ اسْتَوْقَدَ بمعنی اوقد ہے جیسے استعجاب بمعنی  
اجاب ہے سین اور تاء زائدہ ہیں۔ یہ انخس کا قول ہے۔ شاعر کا قول ہے:

و دابع دعا یا من یجیب الی الندی      فلم یستجبه عند ذاک مجیب

پکارنے والے نے پکارا: اے آواز کا جواب دینے والے! اس وقت کسی جواب دینے والے نے جواب نہ دیا۔

نحو یوں کا "لما" کے جواب میں اختلاف ہے اور نورہم کی ضمیر کے مرجع میں بھی اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لما  
کا جواب محذوف ہے اور وہ طفت ہے اور نورہم میں ضمیر کا مرجع منافقین ہیں۔ یہ ان کی آخرت کی حالت کی خبر دی جا رہی  
ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَصُوبَ بَيْنَهُمْ نُورًا لَهُ بَابٌ (الحمدید: 13) (پس کھڑی کر دی جائے گی ان کے اور اہل  
ایمان کے درمیان ایک دیوار جس کا ایک دروازہ ہوگا)۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا جواب ”ذهب“ ہے اور نورہم میں ضمیر کا مرجع الذیٰ ہے، اس قول کے مطابق منافق کی تمثیل آگ جلانے کے ساتھ مکمل ہوگی کیونکہ آگ جلانے والے کی بقا، تاریکیوں میں جو نہیں دیکھتا، اس منافق کی بقا کی طرح ہے جو حیرت و تردید میں ہوتا ہے۔ آیت کی مراد یہ ہے کہ یہ منافقین کے لئے مثال دی گئی ہے یہ اس طرح ہے کہ جو وہ ایمان ظاہر کرتے ہیں اس ایمان کی وجہ سے ان کے لئے مسلمانوں کے احکام ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً نکاح، توارث، غنیمت، نفوس، اولاد اور اموال پر امن وغیرہ یہ مشابہ ہے اس شخص کے جو تاریک رات میں آگ جلاتا ہے اس وجہ سے روشنی ہو جاتی ہے وہ دیکھتا ہے جس سے بچنا اور امن مناسب ہوتا ہے۔ پھر جب وہ آگ بجھ جاتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے تو اسے اذیت پہنچتی ہے اور وہ متحیر باقی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح منافقین جب ایمان لائے تو انہوں نے اسلام کے کلمہ کے ساتھ دھوکا کیا پھر وہ مرنے کے بعد عذاب الیم کی طرف جائیں گے جیسا کہ قرآن حکیم نے بتایا: **إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَجَةِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: 145)** (بے شک منافق سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے دوزخ (کے طبقوں) سے) اور ان کا نور چلا جائے گا، اس لئے وہ کہیں گے **انظُرُونَا نَقْتُسِسْ مِنْ نُّورٍ كُمْ (الحديد: 13)**۔ ذرا ہمارا بھی انتظار کرو ہم بھی روشنی حاصل کریں تمہارے نور سے۔ بعض علماء نے کہا: منافقین کا مسلمانوں کی طرف متوجہ ہونا اور ان کے ساتھ ان کا کلام کرنا آگ کی طرح ہے اور ان کا ان کی مودت سے پھرنا اور ان کا ان سے منہ پھیر لینا اس آگ کے جانے کی طرح ہے (1)، اس کے علاوہ بھی علماء کے اقوال ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **النَّارُ مَوْثِقَةٌ** ہے یہ نور سے مشتق ہے اس کا معنی بھی روشن کرنا ہے اور اس کا الف اصل میں وا کو یا سے بدلا گیا کیونکہ ما قبل کسرہ ہے۔ ضاءت اور اضاعت دونوں لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: **ضاء القمر يضاء ضوء** و **اضاء يضيئ**۔ یہ لازم اور متعدی ہوتا ہے۔ محمد بن سميع نے ضاءت بغیر الف کے پڑھا ہے۔ عام لوگ الف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

اضاعت لهم احسابهم و وجوهم      دُجى الليل حتى نظم الجزم ثاقبه

**مَاحَوْلُهُ**۔ مازائدہ مؤکدہ ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اضاعت کا مفعول ہے اور حولہ ظرف مکان ہے اور حالت جری میں ہے کیونکہ حول اس کی طرف مضاف ہے، ذهب اور اذهب دونوں لغتیں ہیں اور یہ ذهاب سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے کسی شے کا زوال..... **وَتَرَكَهُمْ** یعنی انہیں باقی رکھا۔ **فِي ظُلُمَاتٍ** یہ ظلمۃ کی جمع ہے۔ اعمش نے لام کے سکون کے ساتھ ظلمات پڑھا ہے اور جنہوں نے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسم اور لغت میں فرق کرنے کے لئے ایسا پڑھا ہے۔ اشہب عقیلی نے لام کے فتح کے ساتھ ظلمات پڑھا ہے۔ بصریوں نے کہا: ضمہ کو فتح سے بدلا گیا کیونکہ وہ خفیف ہے کسائی نے کہا: ظلمات، جمع الجمع ہے یہ ظلم کی جمع ہے۔ **لَا يَبْصُرُونَ** فعل مضارع حال واقع ہو رہا ہے گویا یوں فرمایا: غیر مبصرین..... اس معنی کے اعتبار سے ظلمات پر وقف جائز نہ ہوگا۔

**صُمُّ بَكْمٌ عَنْهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ①**



”یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ نہیں پھریں گے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے صُمُّ بَكْمٌ عُمٌّ۔ صُمٌّ یعنی ہم صم یعنی یہ مبتدا محذوف کی خبریں ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت حفصہ کی قراءت میں صم بکما عیاً میں بطور ذم نصب (1) بھی جائز ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَلْعُونَيْنِ ۖ اٰیْنِمَا شَقِیْقُوْا (الاحزاب: 61) (ان پر لعنت برس رہی ہوگی جہاں وہ پائے جائیں گے)۔ اسی طرح فرمایا: وَاصْرَاۡتُہٗ حَمَآلَۃٌۭ لَّحْطٰی (الہب) (اور اس کی جو رو بھی بد بخت ایندھن اٹھانے والی ہے)۔ شاعر نے کہا:

سَقَوْنِ اتَخَمَرْتُ تَكْنَفُوْنَ عَدَاۃَ اللّٰہِ مِنْ کَذِبٍ وَ زُورٍ

انہوں نے مجھے شراب پلائی پھر مجھے گھیر لیا۔ اللہ! دشمنوں کی جھوٹ اور غلط بیانی پر میں مذمت کرتا ہوں۔

اس شعر میں عداۃ اللہ بطور ذم منصوب ہے۔ اس مذہب کے مطابق مبصر دن پر وقف صحیح ہے اور صم کو ترکہم کی وجہ سے نصب بھی جائز ہے۔ گویا فرمایا: ترکہم صم بکنا عیاً۔ انہیں بہرہ، گونگا، اندھا چھوڑ دیا۔ اس مذہب کے مطابق مبصر دن پر وقف بہتر نہ ہوگا۔ الصم کا معنی عرب کلام میں بند ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے؟ قنات صماء ایسا نیزہ جو اندر سے کھوکھلا نہ ہو صبت القارورۃ میں نے بوتل کو بند کر دیا۔ فالاصم جس کے کان کے سوراخ بند ہوں۔ الاہکم جونہ بولتا ہے نہ سمجھتا ہے اور جو سمجھتا ہو بولتا نہ ہو اسے اخرس کہتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا: اخرس اور ابکم ایک ہی ہیں۔ کہا جاتا ہے: رجل ابکم و بکیم یعنی جو پوری طرح گونگا ہو، گونگا پن بالکل ظاہر ہو۔ شاعر نے کہا:

فلیت لسان کان نصفین منها بکیم و نصف عندی مجری الکواکب

العی، کا معنی بینائی کا چلا جانا، عی فہو عی، قوم عی، اعیاء اللہ، تعامی الرجل جو آدمی اپنے آپ کو اندھا ظاہر کرے۔ عی علیہ الامر، جب معاملہ ملتبس ہو جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَوِّیْتُ عَلَیْہُمْ اِلَّا نُبَّآءُ یَوْمَیْہِ (القصص: 66) (اندھی ہو جائیں گی ان پر خبریں اس دن) جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس سے مقصود ان کے حواس سے جملہ ادراکات کی نفی نہیں بلکہ ایک مخصوص جہت سے ان کی نفی مقصود ہے۔ تو کہتا ہے: فلان اصم عن الخنا۔ شاعر نے کتنا خوب کہا ہے:

اصم عیاء سیع۔ یعنی بری بات سننے سے بہرہ اس کے علاوہ کو خوب سننے والا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

وعوداء الکلام صبت عنہا دلو انی اشاء بها سیع

نیزھی کلام والی، اس سے میں بہرہ ہوں اگر میں چاہوں تو اسے خوب سننے والا ہوں۔

داری نے کہا:

اعی اذا ما جارق خراج حقی یواری جارق الجدر

میں اندھا ہوتا ہوں جب میری پڑوسن نکلتی ہے حتیٰ کہ میری پڑوسن کو دیواریں چھپا لیتی ہیں۔  
کسی نے ایک شخص کو وصیت کی جو اکثر بادشاہوں کے پاس جاتا تھا:

أَدْخُلْ إِذَا مَا دَخَلْتَ أَعْمَى وَأَخْرُجْ إِذَا مَا خَرَجْتَ آخِرَسَ

جب تو بادشاہ کے پاس جائے تو اندھا ہو کر داخل ہو اور جب تو نکلے تو گونگا ہو کر نکل۔

قنادہ نے کہا: وہ حق سننے سے بہرے ہیں، حق کہنے سے گونگے ہیں، حق دیکھنے سے اندھے ہیں۔ میں کہتا ہوں: یہی معنی مراد ہے نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا جو آپ نے آخر زمانہ کے والیوں کے متعلق حدیث جبریل میں فرمایا۔ واذا ارابت الحفاة العراة الصم البکم ملوک الارض فذاک من اشراطها۔ (جب تو دیکھے کہ ننگے پاؤں، برہنہ بدن، (حق سننے سے) بہرے، (حق کہنے سے) گونگے زمین کے بادشاہ بن گئے ہیں تو یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے (1))۔ واللہ اعلم  
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ وہ حق کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ یہ اس لئے فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم ازل میں تھا کہ وہ حق کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ رجع بنفسه رجوعاً رجعه غيرة کہا جاتا ہے یعنی یہ لازم اور متعدی استعمال ہوتا ہے۔  
ہذیل کہتے ہیں: ارجعه غيرة۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلَى بَعْضِ الْقَوْلِ (سبا: 31) یعنی آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کریں گے۔ جیسا کہ قرآن نے سورہ سبأ میں بیان فرمایا ہے۔

أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَّجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ  
مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۗ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝

”یا پھر جیسے زور کا مینہ برس رہا ہو بادل سے جس میں اندھیرے ہوں اور گرج اور چمک ہو۔ ٹھونکتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے باعث موت کے ڈر سے اور اللہ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو۔“  
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ طبری نے کہا: أَوْ بمعنی واؤ ہے (2)۔ فراء نے یہی کہا ہے۔  
وقد زعت ليلی بانی فاجر  
لنفسی تقاها او علیها فجورها  
لیل نے کہا کہ میں گنہگار ہوں میرے نفس کے لئے تقویٰ ہے اور اس کے خلاف اس کا فجور ہے۔  
ایک اور شاعر نے کہا:

نال الخلافة اوکانت له قدراً کما اتى ربه موسى على قدر

اس نے خلافت کو پایا اور خلافت اس کا مقدر تھی جس طرح موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی بارگاہ میں آئے جو ان کے حق میں مقدر تھا۔

ان اشعار میں اذ بمعنی واؤ ہے۔ بعض نے فرمایا: اذ تخییر کے لئے ہے۔

یعنی تم ان منافقوں کو اس سے تشبیہ دو یا اس سے، کسی ایک امر پر اکتفا نہیں۔ معنی ہے: او کا صاحب صیب۔ یا وہ بارش

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث جبریل، صفحہ 29، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ البحر الزوین، صفحہ 101، جلد 1 (دار کتب العلمیہ)

والوں کی طرح ہیں۔ الصیب سے مراد بارش ہے۔ یہ صاب یصوب سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: نازل ہونا۔ علقمہ نے کہا:

فلا تعدلی بینی و بین مغیر سقتک روایا المذن حیث تصوب

میرے اور جاہل کے درمیان برابری نہ کر بادل تجھے میرا ب کرے جہاں برے۔

صیب اصل میں صیوب تھا۔ واد اور یا جمع ہوئے پہلا ان میں سے ساکن ہے اس لئے وادیا سے بدلی اور پھر مدغم ہو گئی جیسا کہ میت، ہینا اور لین میں کہا گیا ہے۔ بعض کوفیوں نے کہا: اس کی اصل صوبت ہے فعیل کے وزن پر۔ نحاس نے کہا: اگر اس طرح اس کی اصل ہوتی تو اس کا ادغام جائز نہ ہوتا جیسا کہ طویل میں ادغام جائز نہیں ہے۔ صیب کی جمع صیایب ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: مثلهم کمثل الذی استوقد ناراً او کمثل صیب۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَوْنِ السَّمَاءِ، السَّمَاءِ، مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اس کی جمع اسمیۃ، سموات اور سسی (بروزن فعول) بنائی جاتی ہے۔ عجاج نے کہا:

تلفہ الرياح والسُسی

ہواؤں اور بارشوں نے اسے گھیر رکھا ہے۔

السَّمَاءِ ہر وہ چیز جو تیرے اوپر ہو اور تجھ پر سایہ کرے وہ سماء ہے۔ اسی وجہ سے گھر کی چھت کو سماء کہا جاتا ہے۔ بارش کو سماء کہا جاتا ہے۔ بارش کو سماء کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آسمان سے اترتی ہے۔ حضرت حسان بن ثابت نے کہا:

دیار من بنی الحساس قفر تعفیها الروامس والسما

بنی حساس کے گھر چٹیل میدان ہیں۔ ہواؤں اور بارش نے ان کے نشانات مٹا دیئے ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

اذا سقط السماء بارض قوم رعیناہ دان کانوا غضابا

جب کسی قوم کی زمین پر بارش برسی ہے تو ہم اس زمین پر چراتے ہیں اگرچہ اس کے مالک ناراض بھی ہوں۔

مٹی اور گھاس کو بھی سماء کہا جاتا ہے۔ مازلنا نطأ السماء حتی اتیناکم۔

ہم گھاس اور مٹی کو روندتے رہے حتیٰ کہ ہم تمہارے پاس پہنچے۔

گھوڑے کی پیٹھ کو بھی اس کے بلند ہونے کی وجہ سے سماء کہا جاتا ہے۔

د احمر کالدیباہ اما سیاۃ فریا و اما ارضہ فمحول

ریشم کی طرح سرخ ہے، رہی اس کی پیٹھ تو وہ بہت عمدہ ہے اور اس کے پاؤں بڑے سخت ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِیْہِ ظُلُمٰتٌ یَّہْتَدِیْہِا بَرْقٌ (درعد و برق) معطوف علیہ ہے۔ ظلمات جمع ذکر فرمایا یہ اشارہ ہے

رات کی تاریکی اور بادل کی تاریکی کی طرف، تہہ در تہہ تاریکی ہے اس لئے جمع ذکر فرمایا، اس کی وضاحت پہلے ذکر ہو چکی ہے

اعادہ کی ضرورت نہیں۔



علماء کا رَعْد کے متعلق اختلاف ہے۔ ترمذی میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: یہود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رَعْد کے متعلق پوچھا کہ یہ (کڑک) کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے (جو بادل پر مقرر ہے) اس کے پاس آگ کے کوڑے ہیں جن کے ساتھ وہ بادل کو ہانک کر لے جاتا ہے جہاں اللہ چاہتا ہے۔ یہود نے کہا: یہ آواز کیا ہے جو ہم سنتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ فرشتہ بادل کو جھڑکتا ہے جب وہ اسے جھڑکتا ہے حتیٰ کہ وہ وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ یہود نے کہا: آپ نے سچ کہا (1)۔ الخ

اس تفسیر پر اکثر علماء کا اتفاق ہے۔ پس الرعد (کڑک) سنی جانے والی آواز کا اسم ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا۔ یہ لغت عرب میں معلوم ہے۔

لبید نے زمانہ جاہلیت میں کہا تھا:

فجعني الرعد و الصواعق

مجھے کڑک اور بجلیوں نے ڈرایا.....

حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: الرعد ایک ہوا ہے۔ بادل کے درمیان چھا جاتی ہے تو آواز پیدا کرتی ہے (2)۔ البرق کے بارے میں اختلاف ہے، حضرات علی، ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ البرق لوہے کا کوڑا ہے جو فرشتے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس کے ساتھ وہ بادل کو چلاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ترمذی کی حدیث سے یہی ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ یہ نور کا کوڑا ہے جو فرشتے کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ بادل کو جھڑکتا ہے (3)۔ حضرت ابن عباس سے ہی مروی ہے کہ البرق فرشتہ ہے جو نظر آتا ہے۔

فلاسفہ کہتے ہیں: الرعد بادل کے اجرام کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی آواز ہے اور اجرام کے ٹکراؤ سے جو آگ چمکتی ہے وہ البرق ہے۔ یہ قول مردود ہے اس کی نقل صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ کہا جاتا ہے: رَعْد کی اصل حرکت سے ہے۔ اسی سے الرعدید، (بزدل کی کپکپی) ہے، ارتعد کا معنی ہے: حرکت کرنا، اسی معنی میں حدیث ہے: فجی بہما ترعد فرائصہما (4) (ان دونوں کو لایا گیا تو ان کے کندھوں کا گوشت حرکت کر رہا تھا)۔ یہ حدیث ابوداؤد نے روایت کی ہے۔

البرق کا اصل معنی چمک اور روشنی ہے۔ اسی سے البراق ہے وہ سواری جس پر معراج کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے اور دوسرے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سوار ہوئے۔ رعدت السماء، یہ الرعد سے ہے جس کا معنی ہے: گرج، اور برقت، البرق سے ہے اور رعدت المرأة وبرقت، عورت جب بناؤ سنگھار کر کے سامنے آئے، رعد الرجل وبرق، جب

1۔ جامع ترمذی، صفحہ 140، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ایضاً، کتاب التفسیر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب من سورۃ الرعد، حدیث 3042، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً

3۔ ایضاً

2۔ البحر الرائق، صفحہ 102، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

آدمی دھمکی دے اور ڈرائے۔

ابن احمر نے کہا:

يا جُل ما بعدت عليك بلادنا و طلابنا فابرق بارضك وارعد

اے جل! تجھ پر ہمارے شہر اور ہمارے مطلوب تجھ سے کتنے ہی دور ہو گئے ہیں اب تو اپنی زمین کو ڈرا دھمکا دے۔

ارعد القوم و ابرقوا یعنی قوم کو کڑک اور بجلی نے آیا۔ ابو عبیدہ اور ابو عمرو نے بیان کیا ہے: ارعدت السماء و ابرقت۔ آسمان گرجا اور بجلی چمکی۔ ارعد الرجل و ابرق فلاں نے دھمکی دی اور ڈرایا۔ اصمعی نے اس کا انکار کیا ہے اور اس پر اس کے خلاف کیت کے قول سے حجت پکڑی گئی ہے۔

ابرق و ارعد یا یزید فما وعيدك لي بضائر

اے یزید! تو دھمکی دے تیری دھمکی مجھے کچھ مضرت نہیں۔

اصمعی نے کہا کیت حجت نہیں ہے۔

**فائدہ:** حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: ہم حضرت عمر کے ساتھ مدینہ اور شام کے درمیان ایک سفر میں تھے اور ہمارے ساتھ حضرت کعب الاحبار بھی تھے۔ فرمایا: تیز ہوا چلنے لگی، بادل گر بنے لگا اور شدید بارش اور ٹھنڈک ہو گئی۔ لوگ گھبرا گئے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: مجھے کعب الاحبار نے کہا جس نے کڑک کی آواز سن کر کہا سبحان من یسبح الرعد بحمده و الملائکة من خیفته تو اس بادل، ٹھنڈک اور بجلی میں جو مصیبت ہوگی اس سے وہ بچا لیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں نے اور کعب نے یہ کلمات پڑھے جب صبح ہوئی تو لوگ جمع ہوئے تو میں نے حضرت عمر سے کہا: اے امیر المومنین! لوگوں میں جو گھبراہٹ تھی وہ ہم میں نہ تھی۔ حضرت عمر نے پوچھا: وہ کیسے؟ حضرت ابن عباس نے کہا: میں نے حضرت عمر سے حضرت کعب کی بات کہی تو حضرت عمر نے کہا: سبحان الله! کیوں تم نے ہمیں نہیں بتایا کہ ہم بھی وہ کہتے جیسا تم نے کہا۔ ایک روایت میں ہے، ٹھنڈک حضرت عمر کے ناک کو لگی اور اس نے حضرت عمر پر اثر کیا۔ یہ روایت ان شاء الله سورہ رعد میں آئے گی۔ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے تابعین سے صحابہ کی روایات میں دو روایتیں ذکر کی ہیں۔

حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کڑک اور بجلیوں کو سنتے تو یہ دعا کرتے: اللهم لا تقتلنا بغضبك ولا تهلكنا بعذابك و عافنا قبل ذالك۔ (1) اے اللہ! تو ہمیں اپنے غضب کے ساتھ ہلاک نہ کر اور تو ہمیں اپنے عذاب سے ہلاک نہ کر اور ہمیں اس سے پہلے عافیت دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ انْكَيُوتُ كَوَانِهِمْ ذَالِئِذٍ اسْمِعُ الْغَافِقِينَ ذَالِئِذٍ يَخْلَعُ الْغَافِقِينَ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں یہ ان کے نزدیک کفر ہے اور کفر موت ہے۔ الاصابع کے واحد

1۔ جامع ترمذی، صفحہ 183، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ایضاً ابواب الدعوات عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما یقول اذا سمع الرعد، حدیث نمبر 3372، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں پانچ لغتیں ہیں: اصبع ہمزہ کے کسرہ اور با کے فتح کے ساتھ۔ اصبع ہمزہ کے فتح اور باء کے کسرہ کے ساتھ۔ ہمزہ اور با کے فتح کے ساتھ، دونوں کے ضمہ کے ساتھ، دونوں کے کسرہ کے ساتھ بھی بولا جاتا ہے۔ یہ مؤنث استعمال ہوتا ہے اسی طرح اذن (کان) مؤنث استعمال ہوتا ہے، اس میں تخفیف، تشقیل اور تصغیر بنائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: اذینۃ۔ اگر تو اذن کے ساتھ کسی کا نام رکھے تو اس کی تصغیر بنائے گا تو کہے گا: اذین، پھر یہ مؤنث استعمال نہ ہوگا کیونکہ مذکر کی طرف منتقل ہونے کی وجہ سے اس سے تانیث زائل ہوگئی۔ رہا عربوں کا قول: اذینۃ اسم علم تو اس کے ساتھ مصغر نام رکھا گیا ہے، اذن کی جمع آذان آتی ہے۔ تو کہتا ہے: اذنتہ جب تو اسے کان پر مارے، رجل اذن اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ہر ایک کا کلام سنے اس میں واحد اور جمع برابر ہے۔ اذانی بڑے کانوں والا۔ نعمة اذناء، کبش اذن (کانوں والی بھیڑ اور دنبہ) و اذنت النعل وغیرہا تا اذینا جب تو جوتے وغیرہ کے کان بنائے، و اذنت الصبی جب تو بچے کا کان ملے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنَ الصَّوَاعِقِ یعنی بجلیوں کی وجہ سے۔

الصواعق، جمع ہے صاعقة کی۔ حضرات ابن عباس اور مجاہد وغیرہا نے کہا: جب الرعد فرشتہ زیادہ غضبناک ہوتا ہے تو اس کے منہ سے آگ نکلتی ہے یہی صواعق ہے۔ اسی طرح خلیل نے کہا۔ فرمایا: یہ رعد کی آواز سے شدید ہوتی ہے، اس کے ساتھ کبھی آگ کا ٹکڑا ہوتا ہے جس پر وہ گرتا ہے اسے جلادیتا ہے۔ ابو یزید نے کہا: الصاعقه آگ ہے جو سخت کڑک میں آسمان سے گرتی ہے، خلیل نے ایک قوم سے الصاعقه (سین کے ساتھ) حکایت کیا ہے۔ ابو بکر نقاش نے کہا، کہا جاتا ہے: صاعقه، صاعقه و صاعقة تمام کا معنی ایک ہے۔ حسن نے من الصواعق (قاف کی تقدیم کے ساتھ) پڑھا ہے۔ اسی سے ابوالنجم کا شعر ہے:

يحكون بالمسقولہ القواطع تشقق البرق عن الصواعق

نحاس نے کہا: یہ بنی تمیم اور بعض بنی ربیعہ کی لغت ہے۔ کہا جاتا ہے: صعقتهم السماء، جب آسمان لوگوں پر بجلی گرا دے۔ الصاعقه، عذاب کی ایک چیخ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَأَخَذَتْهُمْ صَعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ (فصلت: 17) (تو پکڑ لیا انہیں اس عذاب کی کڑک نے جو رسوا کن ہے)۔ کہا جاتا ہے: صعق الرجل صعقة و تصعاقا یعنی اس پر چھا گئی، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا (اعراف: 143)

اصعقه غيرة بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس نے اسے ہلاک کر دیا۔

ابن مقبل نے کہا:

ترى النعرات الزرق تحت لبانه أحاد و مشنى اصعقتها صواهلہ

اس کے سینے کے نیچے نیلی آنکھوں والی کھیاں ایک ایک، دودو دیکھتا ہے اس کے ہنہانے نے ان کو قتل کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَصَعِقَ مَن فِي السَّمَوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ (الزمر: 68) (یعنی فوت ہو گیا جو آسمانوں میں تھا اور

جوزمین میں تھا)۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں منافقین کے احوال کو تشبیہ دی ہے ان چیزوں کے ساتھ جو بارش میں تاریکیاں، کڑک، چمک اور بجلیوں میں سے ہوتی ہیں۔



ظَلُمْتُ ان کے کفر یہ اعتقادات کی مثال ہے۔ کڑک اور چمک اس کی مثال ہے جس کے ساتھ انہیں ڈرایا جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بارش سے مثال دی کیوں کہ اس میں ان پر بہت سی مشکلات تھیں۔ العی سے مراد تاریکیاں ہیں اور جو اس میں وعید اور زجر ہے وہ کڑک ہے اور اس میں جو نور اور دلائل باہرہ ہیں جو کبھی ان پر ظاہر ہوتے ہیں وہ بجلی ہے۔ الصَّوَاعِقُ یہ مثال ہے جو قرآن میں جلدی میں جنگ کی طرف نکلنے کی دعوت دی ہے اور تاخیر میں وعید دی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الصَّوَاعِقُ شرع کی تکالیف ہیں جن کو وہ ناپسند کرتے تھے مثلاً جہاد، زکوٰۃ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَذَرَ الْمَوْتِ، حذر اور حذار دونوں کا ایک معنی ہے اور دونوں طرح پڑھا بھی گیا ہے۔ یہ سیبویہ نے کہا: یہ منصوب ہے کیونکہ یہ مفعول لہ ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ مصدر ہے۔ سیبویہ نے ایک شعر کہا ہے:

وَاعْفُ عَوْرَاءَ الْكَرِيمِ اَذْخَارَهُ  
وَاعْرِضْ عَنِ شَتَمِ اللَّئِيمِ تَكْرُمًا

میں کریم شخص کی جہالت کو اس کے تعلق کو ذخیرہ کے لئے معاف کر دیتا ہوں اور لئیم آدمی کی گالی سے تکرماً اعراض کرتا ہوں۔

فراء نے کہا: یہ تمیز کی وجہ سے منصوب ہے۔ الموت، حیات کی ضد ہے، مات بیوت و بیات استعمال ہوتا ہے۔ راجز نے کہا:

بَنِيَّتِي سَيِّدَةُ الْبَنَاتِ  
عَيْشِي وَلَا يَوْمُنِ ان تَسَاقِ

اے میری بیٹی! بیٹیوں کی سردار تھی تو زندہ رہے تیری موت سے امن نہیں۔

فہومیت و میت، قوم موق و اموات و میتون و میتون والموات۔ الموت اور الموات ایسی چیز کو کہتے ہیں جس میں روح نہ ہو۔ الموات اس زمین کو کہتے ہیں جس کا کوئی انسان، مک نہ ہو اور نہ اس سے کوئی نفع اٹھاتا ہو۔ المواتان، یہ حیوان کا مخالف ہے۔ کہا جاتا ہے: اشتر المواتان ولا تشتتر الحيوان یعنی زمینیں اور گھر خرید، غلام اور جانور مست خرید مواتان اس موت کو کہتے ہیں جو جانوروں میں ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: وقع في المال مواتان، اماتہ اللہ و موثہ۔ مبالغہ کے لئے تشدید ذکر کی گئی۔ شاعر نے کہا

فَعَرُوةٌ مَاتَ مَوْتًا مُسْتَرِيحًا  
فَهَا نَذَا اموت كل يوم

عروہ تو آرام کی موت مر گیا میں ہوں کہ ہر روز مرتا ہوں

امات الناقة، جب اونٹنی کا بچہ مر جائے، فہی میت ومیة۔

ابو عبیدہ نے کہا: اسی طرح امات امراة ہے جس عورت کا بچہ مر جائے۔ اس کی جمع مساویت ہے۔ ابن سکیت نے کہا: امات فلان جب کسی کا ایک یا بہت سے بیٹے فوت ہو جائیں۔ المتوات، ریاکار عبادت کرنے والے کی صفت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ موت مائت، جیسے تیرا قول ہے لیل لائل۔ اس لفظ سے صفت کا صیغہ بنایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ تاکید لگائی جاتی ہے المستمیت للأمر۔ ڈھیلا کام کرنے والا۔ رویہ نے کہا:

و زبد البحر له كتيت  
والليل فوق الماء مستميت

اور سمندر کی جھاگ اس کے لئے آواز ہے اور رات پانی کے اوپرستی سے گزرنے والی ہے۔

المستیت، اس شخص کو کہا جاتا ہے جو جنگ میں موت کی پروا نہیں کرتا۔

حدیث پاک میں ہے: اری القوم مستیتین (1) وہ لوگ جو موت پر جنگ کرتے ہیں۔ الموتة، جنون اور مرگی کی ایک جنس ہے جو انسان کو لاحق ہوتی ہے جب اسے افاقہ ہوتا ہے تو پوری عقل اس کی طرف لوٹ آتی ہے جیسے سونے والے اور نشہ والے کے ساتھ ہوتا ہے۔ موتہ (میم کے ضمہ اور واو کے ہمزہ کے ساتھ) اس زمین کو بھی کہتے ہیں جہاں حضرت جعفر بن ابی طالب شہید ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ یہ مبتدا خبر ہیں یعنی وہ اس سے فوت نہیں ہوں گے۔ کہا جاتا ہے: احاط السلطان بغداد جب بادشاہ کسی کو سختی سے پکڑ لے اور ہر جہت سے اس کا محاصرہ کر لے۔ شاعر نے کہا:

احطنا بهم حتى اذا ما تيقنوا بما قد راوا مالوا جميعا الى السلم

ہم نے ان کا گھیراؤ کیا حتیٰ کہ جب انہوں نے اس کا یقین کر لیا جو انہوں نے دیکھا تو وہ تمام صلح کی طرف مائل ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ (الکہف: 42) (اور اس کا) (باغ) برباد ہو گیا۔

اصل میں مُحِيط تھا یا کی حرکت حا کی طرف نقل کی گئی اور یا کو ساکن کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا احاطہ کرنے والا ہے یعنی وہ اس کے قبضہ اور اس کے غلبہ کے تحت ہے جیسا کہ فرمایا: وَالْاَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ (الزمر: 67) (ماری زمین اس کی منہی میں ہوگی قیامت کے دن)۔ بعض علماء نے فرمایا: مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ کا معنی ہے انہیں جانے والا ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ احَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (الطلاق) (اور بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا اپنے علم سے احاطہ کر رکھا ہے)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ انہیں ہلاک کرنے والا اور انہیں جمع کرنے والا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِلَّا اَنْ يُحَاطَ بِكُم (یوسف: 66) (مگر یہ کہ تمہیں بے بس کر دیا جائے)۔ یعنی تم تمام ہلاک کئے جاؤ۔ کافروں کا خصوصی ذکر فرمایا کیونکہ آیت میں پہلے ان کا ذکر ہے۔

يَكَاذِبُ يَخْطَفُ ابْصَارَهُمْ كُلْبًا اَضَاءَ لَهُمْ مَّشْوَافِيهِؕ وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُواؕ

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌؕ

”قریب ہے کہ بجلی اچک لے جائے ان کی بینائی جب چمکتی ہے ان کے لئے تو چلنے لگتے ہیں اس (کی روشنی)

میں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے ان پر تو کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر چاہے اللہ تو لے جائے ان کے سننے کی

قوت اور ان کی بینائی۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَكَاذِبُ يَخْطَفُ ابْصَارَهُمْ، یکاذ بمعنی یقارب ہے۔ کہا جاتا ہے: کاذ یفعل کذا جب کوئی شخص کام کرنے کے قریب ہو اور کرے نہیں۔ غیر قرآن میں جائز ہے یکاذ ان یفعل، جیسا کہ روایت نے کہا:

قد کاد من طول البلی ان یصحا

قریب ہے کہ لمبی آزمائش ختم ہو جائے۔

یہ المصح سے مشتق ہے جس کا معنی ہے ختم ہو جانا، مٹ جانا۔ بہتر یہ ہے کہ اس کی خبر بغیر ان کے ہو کیونکہ یہ حال کی مقاربت کے لئے آتا ہے اور ان کلام کو زمانہ مستقبل کی طرف پھیر دیتا ہے اور یہ منافات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَکَادُ سَنَابِرُقُہُ یَذْہَبُ بِالْأَبْصَارِ ۝ (النور)

عرب کلام میں ہے: کاد النعام یطیر، شتر مرغ اڑنے کے قریب ہے۔ کاد العروس ان یکون امیرا، دولہا امیر ہونے کے قریب ہے ان کے اس حالت کے قریب ہونے کی وجہ سے۔ کاد فعل متصرف ہے فَعَلَ یَفْعَلُ کے وزن پر۔ اس کی خبر کبھی اسم ہوتی ہے لیکن یہ بہت قلیل ہے۔ تابط شرانے کہا: وما کدت آتیا میں لوٹنے کے قریب نہ ہوا۔ کرب، جعل، قارب اور طفق بغیر ان کے خبر استعمال ہونے میں کاد کی طرح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ طَفَقَا یُخْصِفْنَ عَلَیْہِمَا مِنْ وَرَاقِ الْجَنَّةِ (الاعراف: 22) (اور وہ دونوں چپانے لگ گئے اپنے (بدن) پر جنت کے پتے)۔

یہ تمام الفاظ حال اور مقاربت کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ حال کے ساتھ ان نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَخْطِفُ أَبْصَارَهُمْ، الخطف کا معنی ہے تیزی سے اچک لینا۔ ایک پرندے کو اس کی تیزی کی وجہ سے خطاف کہا جاتا ہے۔ پس جس نے قرآن کو تخویف (ڈرانے) کے لئے بنایا ہے معنی یہ ہے کہ جو ان پر نازل ہوتا اس کی وجہ سے ڈرتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اچک نہ لے اور جس نے قرآن کو بیان کے لئے مثال بنایا جو قرآن میں ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ان کے پاس بیان آیا جو ان پر غالب آ گیا یخطف اور یخطف دونوں لغتیں ہیں دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ خطفہ یخطفہ خطفاً یہ عمدہ لغت ہے اور دوسری لغت کو انخفش نے بیان کیا ہے خطف یخطف۔

جوہری نے کہا: یہ قلیل اور ردی لغت ہے معروف نہیں۔ یونس نے اس لغت کے ساتھ اس آیت کو پڑھا ہے: یَکَادُ الْبَرُّ یَخْطِفُ أَبْصَارَهُمْ۔ نحاس نے کہا: یَخْطِفُ میں سات وجوہ ہیں: قراءت فصیحہ یخطف ہے۔ علی بن الحسین اور یحییٰ بن وثاب نے یخطف طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ سعید انخفش نے کہا: یہ بھی ایک لغت ہے۔ حضرات حسن، قتادہ، عاصم، محمد بن ابی رجا، العطار دی نے یا کے فتح خا اور طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے خا کے فتح خا اور طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے خا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا: بعض اہل مدینہ نے خا کے سکون اور طا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی، انخفش اور فراء نے کہا: یخطف یا، خا، طا کے کسرہ کے ساتھ جائز ہے۔ یہ چھ وجوہ ہیں جو لکھنے میں موافق ہیں۔ ساتویں صورت جسے عبدالوارث نے بیان فرمایا ہے، فرمایا: مصحف ابی بن کعب میں میں نے دیکھا یخطف لکھا ہوا تھا۔ سیبویہ اور کسائی نے کہا کہ جس نے یخطف خا اور طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس کے نزدیک اس کی اصل یخطف ہے پھر تا کو طا میں ادغام کیا گیا۔ دوسرا کن جمع ہوئے تو خا کو اتقائے ساکنین کی وجہ سے کسرہ دیا گیا۔ سیبویہ نے کہا: جس نے خا کو فتح دیا اس نے تا کی حرکت اسے دی۔ کسائی نے کہا: جس نے یا کو کسرہ دیا اس کی وجہ یہ ہے



کہ اختطف میں الف مکسورہ ہے اور فراء نے اہل مدینہ سے جو خاء کا سکون اور ادغام حکایت کیا ہے وہ معروف نہیں اور جائز نہیں کیونکہ اس میں دوساکنوں کو جمع کرنا ہے یہ نحاس وغیرہ نے کہا ہے۔

میں کہتا ہوں: حسن اور ابور جاء سے یخطف مروی ہے۔ حضرت ابن مجاہد نے کہا: میں اسے غلط گمان کرتا ہوں، انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے خطف الخطفۃ۔ کسی نے بھی اسے فتح کے ساتھ نہیں پڑھا۔

أَبْصَارُهُمْ یہ بصر کی جمع ہے یہ دیکھنے کا حاسہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ قریب تھا کہ حج قرآنیہ اور براہین ساطعہ ان پر روشن ہونے کے قریب تھے اور جنہوں نے النبوٰی کو ڈرنے کے لئے مثال بنایا ہے ان کے نزدیک معنی یہ ہوگا کہ جو ان پر مصیبت اتری ہے قریب ہے ان کی آنکھیں اچک لے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَلِمًا أَضَلَّ لَهُمْ مَقْشُوفِيهِ، كَلِمًا مَنْصُوبٌ ہے کیونکہ یہ ظرف ہے اور جب کلمہ بمعنی اذا ہو تو یہ موصولہ ہوتا ہے۔ اس میں عامل مشوا ہے اور مشوا ہی اس کا جواب ہے، اس میں اضاء عامل نہیں ہے کیونکہ وہ ما کے نہ میں ہے اور مبرد کے قول کے مطابق مفعول محذوف ہے۔ اس کے نزدیک تقدیر عبارت اس طرح ہے: كَلِمًا اضاء لَهُم الْبَرْقُ الطَّرِيقَ۔ (یعنی جب بجلی نے ان کے لئے راستہ روشن کر دیا۔)

بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ فعل اور افعِل ہم معنی ہوں، جیسے سکت اور اسکت ہم معنی ہیں۔ پس اضاء اور ضاء برابر ہوں گے۔ مفعول کے حذف کی تقدیر کی ضرورت نہ رہے گی۔ فراء نے کہا: ضاء، اضاء پہلے گزر چکا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جب وہ قرآن سنتے ہیں اور ان کے لئے حج (دلائل) ظاہر ہوتے ہیں تو وہ مانوس ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ چلتے ہیں اور جب قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا ہے جس میں وہ اندھے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ گمراہ ہوتے ہیں یا انہیں اس کا مکلف بنایا جاتا ہے تو قائلوا وہ اپنے نفاق پر ٹھہر جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: معنی یہ ہے کہ جب کھیتوں اور مویشی میں ان کے حالات درست ہوتے ہیں، نعمتیں متواتر ملتی ہیں تو کہتے ہیں: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین مبارک ہے اور جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے اور کسی سختی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ناراض ہوتے ہیں اور اپنے نفاق پر ٹھہر جاتے ہیں۔ یہ حضرت ابن مسعود اور قتادہ سے مروی ہے۔ نحاس نے کہا یہ قول عمدہ ہے اور اس کی صحت پر دلیل یہ ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْْبُدُ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ ۚ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ ۖ طَغَىٰ ۚ وَإِنْ أَصَابَهُ فِتْنَةٌ ۖ أُنْقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ ۚ (الحج: 11) اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی کنارہ پر (کھڑے کھڑے) پھر اگر پہنچے اسے بھلائی (اس عبادت سے) تو مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر پہنچے اسے کوئی آزمائش تو فوراً (دین سے) منہ موڑ لیتا ہے۔

علماء صوفیہ نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی مثال بیان فرمائی ہے جس کے ابتداء احوال ارادت درست نہیں ہوتے، پس اپنے دعاوی کے ساتھ ان احوال سے اکابر کے احوال تک بلند ہوتا ہے، گویا اس پر ارادت کے احوال روشن ہوتے اگر وہ ارادت کے اداب کی ملازمت کے ساتھ ارادت کو صحیح کرتا۔ جب اس نے ارادت میں دعاوی کی ملاوٹ کر دی تو اللہ تعالیٰ اس سے وہ انوار لے گیا اور اسے اپنے دعوؤں کی تاریکیوں میں چھوڑ دیا۔ اب وہ ان تاریکیوں سے خروج کا راستہ نہیں دیکھتا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں، جب نبی کریم ﷺ کی جنگ بدر میں مدد کی گئی تو انہوں نے طمع کیا اور کہا: اللہ کی قسم! یہی وہ نبی ہے جس کی ہمیں موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی کہ اس کا جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ جب احد میں شکست کا سامنا ہوا تو یہ لوگ مرتد ہو گئے اور شک کرنے لگے۔ یہ قول ضعیف ہے۔ یہ آیت منافقین کے متعلق ہے۔ یہ حضرت ابن عباس سے اصح قول ہے اور معنی تمام اقوال کو شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ”لو“ یہ حرف تمنا ہے۔ اس میں جزا کا معنی ہے۔ اس کا جواب لام یعنی جس جملہ پر لام ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو مومنین کو ان پر مطلع کر دیتا پھر ان سے اسلام کی عزت چھین لیتا، مومنین کو ان پر غلبہ عطا فرما کر اور انہیں قتل کر کے اور انہیں مسلمانوں سے باہر نکال کر۔

یہاں سب اور بصر کو خصوصاً ذکر فرمایا کیونکہ پہلی آیت میں ان کا ذکر ہو چکا ہے یا اس لئے کہ یہ انسان میں معزز چیزیں ہیں۔ باسماعہم بھی پڑھا گیا ہے۔ اس پر کلام پہلے اسی جز میں گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ اس میں عموم ہے متکلمین کے نزدیک جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو موصوف کرنا جائز ہے، اس پر اس کی قدرت مراد ہے۔ امت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قدیر کہا جائے۔ اللہ تعالیٰ قدیر، قادر اور مقتدر ہے۔ قدیر میں قادر کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے۔ زجاجی نے کہا ہے: ہر وہی نے کہا: قدیر، قادر دونوں کا ایک معنی ہے۔ کہا جاتا ہے: قَدَرْتُ عَلَى الشَّيْءِ أَقْدَرُ قَدْرًا وَقَدَرْتُ وَقَدَرَانًا (یعنی قدرۃ) الاقتدار علی الشیء کا مطلب اس پر قدرت ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ قادر، مقتدر اور قدیر ہے۔ ہر ممکن چیز پر جو وجود اور عدم کو قبول کرتی ہے۔ ہر مکلف پر واجب ہے کہ وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے، اسے قدرت ہے، اپنے علم اور اختیار سے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور انسان پر یہ جاننا بھی واجب ہے کہ بندہ کی وہ قدرت جس کے ساتھ وہ کوئی کام کرتا ہے وہ قدرت ہے جو اللہ تعالیٰ نے عادۃً پیدا فرمائی، بندہ اس قدرت کا مختار نہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت قدرت خاص طور پر ذکر فرمائی، کیونکہ پہلے ایک ایسے فعل کا ذکر گزرا ہے جو وعید اور خوف دلانے کو متضمن ہے، پس یہاں قدرت کا ذکر ہی مناسب تھا۔

یہ بیس آیات ہیں، کوفیوں کی تعداد کے مطابق چار آیات مومنین کی شان میں پھر دو آیات کافروں کے ذکر میں ہیں اور بقیہ تمام منافقین کے بارے میں ہیں۔ اس کے متعلق روایت ابن جریج سے گزر چکی ہے۔ یہ مجاہد کا بھی قول ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٧١﴾

”اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پر ہیزگار بن جاؤ۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ علقمہ اور مجاہد نے کہا: ہر وہ آیت جس کی ابتدا میں يَا أَيُّهَا النَّاسُ ہے وہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اور ہر آیت جس کی ابتدا میں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ہے وہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں: اس قول کا رد اس سے ہو جاتا ہے کہ یہ سورۃ اور سورۃ نساء مدنی ہیں۔ ان میں يَا أَيُّهَا النَّاسُ آیا ہے۔ رہا یہ کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

اَمْثُوْا جس سورت میں ہے وہ مدنی ہے۔ یہ قول صحیح ہے۔ عروہ بن زبیر نے کہا: ہر حد اور ہر فرض مدینہ طیبہ میں نازل ہوا اور جہاں امم اور عذاب کا ذکر ہے وہ مکہ میں نازل ہوا۔ یہ واضح ہے۔

”یا“، ”یَاٰیُّهَا“ میں حرف ندا ہے۔ ائی منادی مفرد مبنی بر ضمہ ہے۔ کیونکہ لفظ میں وہ منادی ہے اور ہائنبیہ کے لئے ہے۔ النَّاسُ مرفوع ہے کیونکہ ائی کی صفت ہے۔ یہ جمہور نحو یوں کے نزدیک ہے، سوائے مازنی کے۔ انہوں نے یا ہذا الرجل میں نصب کے جواز پر قیاس کرتے ہوئے اس میں نصب کو جائز قرار دیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: ائی کو ضمہ دیا گیا ہے جس طرح مقصود مفرد کو ضمہ دیا جاتا ہے اور ہا کو دوسری یا کے عوض ذکر کیا یا کو ذکر نہیں کیا تا کہ کلام منقطع نہ ہو جائے۔ ہا کو ذکر کیا تا کہ کلام متصل رہے۔ سیبویہ نے کہا: گویا تو نے یا کو دوبارہ ذکر کیا۔ اور اسم ان دونوں کے درمیان ہو گیا جس طرح وہ کہتے ہیں: ہا ہو ذا۔ بعض علماء نے فرمایا: جب دو حرف تعریف سے خالی منادی کی صورت میں ذکر کیے اور اس پر معرف باللام المقصود بالنداء کے احکام پر جاری کیے اور اس کے رفع کا التزام کیا۔ وکنہ وہ مقصود بالنداء ہے، پس انہوں نے ایسی حرکت کے ساتھ اس کو اعراب دیا جس کا وہ مستحق تھا اگر اس کے ساتھ حرف ندا ملا ہوا ہوتا اس بات پر تشبیہ کرتے ہوئے کہ یہ منادی ہے۔

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ النَّاسُ سے کون مراد ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ کفار مراد ہیں جنہوں نے عبادت نہ کی۔ اس پر یہ قول دلالت کرتا ہے: وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ سَیِّئٍ (البقرہ: 23) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ تمام لوگوں کو شامل ہے۔ پس مومنین کے لئے خطاب ہمیشہ عبادت کرتے رہنے کے لئے ہے اور کفار کے لئے عبادت شروع کرنے کے لئے ہے۔ یہ قول عمدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَعْبُدُوْا یہ عبادت کا حکم ہے۔ یہاں عبادت سے مراد اس کی توحید کا اقرار اور اس کے دین کی شرائع کا التزام ہے۔ عبادت کی اصل خضوع اور تذلیل ہے، کہا جاتا ہے: طریق معبد ڈا، جب راستہ قدموں سے روند ا گیا ہو طرفہ نے کہا: وظیفاء وظیفاء فوق مور معبد۔ میں موٹی پنڈلیوں والی اونٹنی کے پیچھے روندے ہوئے راستہ کے اوپر چلا۔

عبادت کا معنی طاعت ہے۔ التعبد کا معنی التنسک (احکام بجالانا) عبادت فلانا میں نے اسے غلام بنایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِیْ مَنِیْ خَلَقَکُمْ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق کو خاص طور پر ذکر کیا ہے کیونکہ عرب اس بات کے مقرر تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر بطور حجت اس کو ذکر کیا اور انہیں متنبہ کرنے کے لئے اس صفت کو ذکر کیا۔ بعض علماء نے فرمایا تا کہ انہیں اپنی نعمت یاد دلانے کے لئے اس پر کی ہوئی ہے۔ الخلق کی اصل میں دو وجہیں ہیں:

۱۔ تقدیر۔ کہا جاتا ہے خلقت الادیم للسقاء جب تو چمڑے کو مشکیزے کے لئے کاٹنے سے پہلے اندازہ کرے تو یہ جملہ بولے۔ شاعر نے کہا:

ولانت تغری ما خلقت و بعد ض القوم یخلق ثم لا یغری

تو وہ ہے کہ جس کا تو اندازہ کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے اور بعض لوگ اندازہ کرتے ہیں پھر اس کام کو کر نہیں سکتے۔

حجاج نے کہا: ما خلقت الا فریت ولا وعدت الا فریت یعنی میں نے کبھی اندازہ نہیں کیا مگر اسے کر گزرا۔ اور میں نے کبھی



وعدہ نہیں کیا مگر میں نے اسے پورا کیا۔

۲۔ خلق کا دوسرا معنی انشاء، اختراع اور ابداع ہے (یعنی پیدا کرنا)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَخْلُقُونَ اِفْكَارًا (عنکبوت: 17) اور تم گھڑا کرتے ہو نرا جھوٹ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ کہا جاتا ہے کہ جب ان کے نزدیک ان کی تخلیق ثابت تھی تو دوسروں کی تخلیق بھی ان کے نزدیک ثابت تھی (تو پھر پہلے لوگوں کی تخلیق کا ذکر کیوں کیا)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کلام کو تنبیہ اور تذکیر کے لئے جاری فرمایا تا کہ نصیحت میں بلیغ ہو جائے۔ انہیں پہلے لوگ یاد دلانے تاکہ وہ جان لیں کہ جس ذات نے ان سے پہلے لوگوں کو موت دی اور وہ ان کا بھی خالق ہے، انہیں بھی مارے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے لوگوں میں غور و فکر کریں کہ وہ کیسے تھے اور کن امور کی بناء پر ہلاک ہوئے، تاکہ وہ جان لیں کہ انہیں بھی مبتلا کیا جائے گا جیسے وہ لوگ مبتلا کیے گئے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، لعل اعبدا کے متعلق ہے، خَلَقَكُمْ کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے جہنم کے لئے پیدا فرمایا ہے اس نے انہیں تقویٰ کے لئے پیدا نہیں فرمایا۔ اس قسم کا کلام جو کلام الہی میں وارد ہے مثلاً لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ، لَعَلَّكُمْ تَذْكُرُونَ، لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ، تو اس میں تین تاویلات ہیں:

۱۔ لعل ترجی اور توقع کے معنی میں ہے اور ترجی اور توقع یہ بشر کی چیز میں ہے۔ گویا انہیں کہا گیا یہ کرو اس امید پر کہ تم سمجھ جاؤ، تم نصیحت حاصل کر لو اور متقی بن جاؤ۔ یہ سیبویہ اور زبان عرب کے رؤساء کا قول ہے۔ سیبویہ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے متعلق کہا: اِذْهَبَا اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰ ۝ فَقَوْلَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰی ۝ (طہ) اس کا معنی ہے تم اپنی اس طمع اور رجا پر جاؤ کہ وہ نصیحت حاصل کرے گا یا ڈرے گا۔ اس قول کو ابوالمعالی نے پسند کیا ہے۔

۲۔ عرب لعل کو شک سے پاک لام کی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا تاکہ تم سمجھ جاؤ، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ اس پر شاعر کا قول دلالت کرتا ہے:

وَقُلْتُمْ لَنَا كَفُوا الْحُرُوبَ لَعَلَّنَا

نَكْفُ دَوْلَتَكُمْ لَنَا كُلَّ مَوْثِقٍ

فَلَمَّا كَفَفْنَا الْحَرْبَ كَانَتْ عَهْدُكُمْ

كَلِمَ سَرَابٍ فِي الْمَلَأِ مَتَالِقِ

تم نے ہمیں کہا: جنگ روک لو تاکہ ہم رک جائیں اور تم نے ہمیں ہر پختہ عہد دیا۔ جب ہم نے جنگ کو روک لیا تو تمہارے عہد صحرا میں سراب کی چمک کی طرح تھے۔

مطلب یہ ہے کہ کفوا الحروب لنکف۔ جنگ کو روکو تاکہ ہم روک لیں۔ اگر لعل یہاں شک کے لئے ہوتا تو وہ ان کے لئے ہر پختہ عہد نہ کرتے۔ یہ قول قطرب اور طبری سے منقول ہے۔

۳۔ لعل اس معنی میں ہے کہ کسی شے سے تعرض کرنا۔ گویا کہ کہا گیا: یہ کرو تعرض کرتے ہوئے تاکہ سمجھ جاؤ یا نصیحت حاصل کر لو، یا متقی بن جاؤ۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ کا معنی ہے تاکہ تم امر الہی کی قبولیت کو اپنے اور آگ کے درمیان بچاؤ کا ذریعہ بنا لو۔ یہ عربوں کے اس قول سے ہے اتقواہ بحقہ۔ جب تو اس کے حق کو قبول کرے گویا اس نے اسے اپنا حق دے کر اس کے مطالبہ

سے بچاؤ حاصل کر لیا، اسی سے حضرت علی کا قول ہے: کنا اذا احمر البأس اتقینا بالنبی ﷺ (1)۔ جب جنگ شدید ہو جاتی تو ہم نبی کریم ﷺ کی ذات کو دشمن سے بچاؤ کا ذریعہ بناتے، عثرہ نے کہا۔

ولقد کدرت المهر یدمی نحرہ حتی اتقتنی الخیل یا بنی حذیم  
میں نے گھوڑے کو پلٹایا حالانکہ اس کا سینہ زخمی تھا، حتیٰ کہ گھوڑوں نے مجھے میرے بیٹے حذیم کے ساتھ بچایا۔

الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناءً وانزل من السماء ماءً فاخرج به  
مِن الثمرات رزقا لکم فلا تجعلوا لله اندادا وانتم تعلمون ﴿۳۱﴾

”وہ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے کچھ پھل تمہارے کھانے کے لئے پس نہ ٹھہراؤ اللہ کے لئے مد مقابل حالانکہ تم جانتے ہو۔“

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: الذی جعل لکم الارض فراشا میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** الذی جعل۔ یہاں جعل بمعنی صیر ہے۔ کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے، جعل، خلق کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ (المائدہ: 103) نہیں مقرر کیا اللہ تعالیٰ نے بحیرہ اور سائبہ۔ اور ارشاد ہے جَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ (الانعام: 1) اور بنایا اندھیروں کو اور نور کو یہ سنی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس معنی میں یہ ارشاد ہے حَمْدٌ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ ﴿۱﴾ اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا یعنی ہم نے اس کا نام قرآن عربی رکھا، اور ارشاد ہے وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادٍ جُزْءًا (الزخرف: 15) اور بنادی ہے (مشرکوں نے) اس کے لئے اس کے بندوں سے جز اور وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبْدُ الرَّحْمَنِ اِنَّا كُنَّا (الزخرف: 19) اور انہوں نے ٹھہرا لیا ہے فرشتوں کو جو خداوند رحمن کے بندے ہیں عورتیں۔ ان تمام ارشادات میں جعل بمعنی سنی ہے یعنی نام رکھنا۔ اور خلق اخذ کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسے شاعر نے کہا:

لضغيبها ما يقرع العظم نابها

وقد جعلت نفس تطيب لضغبة

اس میں جعل، خلق اور اخذ کے معنی میں ہے۔

کبھی جعل زائدہ ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

والواحد اثنين لما هدى الكبير

وقد جعلت اري الاثنين اربعة

میں نے دو کو چار دیکھا اور ایک کو دو دیکھا جب مجھے بڑھاپے نے آیا۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: جَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ (الانعام: 1) میں بھی کہا گیا ہے کہ یہاں جعل زائدہ ہے۔ جعل اور

اجتعل ایک معنی میں ہیں۔ شاعر نے کہا:

ل كحيل العادية الممدود

ناط امر الضعاف واجتعل اليه

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسير، باب فی غزوة حنین، صفحہ 101-100، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اس میں اجتمع بھی جعل ہے۔

فِرَاشًا وہ بچھونا جو لوگ بچھاتے ہیں اور اس پر قرار پکڑتے ہیں اور وہ جگہیں جو بچھونا نہیں ہیں جیسے پہاڑ، نشیبی علاقے، سمندر یہ بچھونے کے مصالح میں سے ہیں کیونکہ پہاڑ کیلوں کی طرح ہیں جیسے فرمایا اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مَهْدًا لِّوَالِجِبَالِ اَوْ تَاْدًا (النبا) کیا ہم نے نہیں بنادیا زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں۔ اور سمندر، منافع کے حصول کے لئے ان پر سواری کی جاتی ہے جیسے فرمایا: وَالْفُلُكَ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ (البقرہ: 164) اور جانوروں میں سے جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں اٹھائیں جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو۔

**مسئلہ نمبر 2:** شوافع نے کہا: اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ وہ بستر پر رات نہیں گزارے گا یا چراغ کی روشنی میں نہیں بیٹھے گا پھر اس نے زمین پر رات گزاری اور سورج کی دھوپ میں بیٹھا تو وہ حائث نہ ہوگا کیونکہ لفظ عرفان کی طرف راجع نہیں ہوتا۔ مالکی علماء فرماتے ہیں: ایمان کی قسمیں نیت یا سبب یا بساط پر محمول ہوں گی جس پر قسم جاری ہوئی۔ اگر یہ نہ ہو تو عرف کا اعتبار ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالسَّمَاءَ بَنَاءً آسَانَ زَمِينَ کے لئے ایسے ہے جیسے گھر کے لئے چھت۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا (الانبیاء: 32) (ہم نے بنایا آسمان کو ایک چھت جو) شکست و ریخت سے محفوظ ہے ہر وہ چیز جو بلند ہو اور سایہ کرے اسے سماء کہا جاتا ہے، اس کے متعلق پہلے کلام گزر چکی ہے۔ تتقون پر وقف کی نسبت بناء پر وقف زیادہ بہتر ہے کیونکہ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْاَرْضَ فِرَاشًا۔ رب کی صفت ہے۔ کہا جاتا ہے: بنی فلان بیٹا د بنی علی اہلہ۔ فلاں نے گھر بنایا، اپنی بیوی سے شب زفاف گزاری۔ عام لوگ کہتے ہیں: بنی باہلہ۔ یہ غلطی ہے۔ گویا اس میں اصل یہ ہے کہ جو اپنے گھر والوں کے پاس آتا ہے تو وہ اپنی اہلیہ پر دخول کی رات قبہ بناتا ہے پس اپنے اہل کے پاس جانے والے کو بان کہتے ہیں۔ بنی کثرت کے لئے تشدید ذکر کرتے ہیں۔ ابتنی دار اود بنی دونوں کا ایک معنی ہے۔ اس نے گھر بنایا۔ اسی سے بنیان الحائط ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھنا حتیٰ کہ دیوار قائم ہو جائے۔

الماء کی اصل مواء ہے۔ ما قبل فتح کی وجہ سے واؤ متحرک کو الف سے بدلا گیا تو تو نے کہا ماء۔ پھر دو حرف خفی ملے تو ہاء کو ہمزہ سے بدل دیا گیا۔ کیونکہ وہ زیادہ پختہ ہے اور یہ الف کے زیادہ مشابہ ہے۔ تو تو نے کہا: ماء۔ پہلا الف فعل کا عین کلمہ ہے اور اس کے بعد وہ ہمزہ ہے جو ہاء کا بدل ہے اور ہمزہ کے بعد الف ہے جو ثوین کا بدل ہے۔ ابوالحسن نے کہا: بصریوں کے نزدیک صرف دو الف کے ساتھ لکھنا جائز ہے۔ اگر تو چاہے تو تین الف کے ساتھ لکھے۔ جب عرب اس کی جمع بناتے ہیں یا تصغیر بناتے ہیں تو اصل کی طرف لوٹتے ہیں۔ کہتے ہیں: مَوْنَةٌ، وَاَمَوَاتٌ مِیَاةٌ جیسے جمال و اجمال۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاحْزَبْہِ مِنَ الْغَمْرِۤ اِذَا قَالْتُمْ، الْغَمْرُ شُرۃ کی جمع ہے کہا جاتا ہے شہر جیسے شجر۔ کہا جاتا ہے شہر جیسے خشب، کہا جاتا ہے شہر مثل بُذُنْ۔ شمار جیسے اکام یہ شہر کی جمع ہے اس کا مزید بیان ان شاء اللہ سورۃ الانعام میں آئے گا۔ شمار السیاط کوڑے کے اطراف کی گرہیں۔ آیت کا معنی ہے ہم نے تمہارے لئے مختلف





نحمد الله ولا ندله عندہ الخیر و ما شاء فعل

ہم اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں، اس کا کوئی مد مقابل نہیں، اسی کے پاس ساری خیر ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔  
حضرت حسان نے کہا:

أتہجوہ ولست له بند فشرکما لخيرکما الفداء

کیا تو محمد ﷺ کی شان میں بکو اس کرتا ہے، تو تو اس کا ہم مثل ہی نہیں۔ پس تم میں سے برا تم میں سے بہتر کے لئے  
قربان ہو جائے۔

کہا جاتا ہے: نَدُّ و نَدِيدٌ و نَدِيدَةٌ سب کا معنی مد مقابل ہے۔ لبید نے کہا:

لکیلا یکون السندری نَدِيدِی واجعل اقواما عموما عابعا

تا کہ سندری میرا مقابل نہ ہو اور میں جمع شدہ قوم کو جدا جدا نہ کر دوں

ابو عبیدہ نے کہا: اَنْدَادًا کا معنی ہے: اضداداً (مد مقابل)۔ نحاس نے کہا: اَنْدَادًا پہلا مفعول ہے اور لَيْلَہ دوسرے مفعول کی جگہ ہے۔ جوہری نے کہا: الند (بفتح نون) آسمان کی طرف بلند نیلے کو کہتے ہیں اور خوشبو میں سے النَدَّ عربی میں نہیں ہے۔ نَدَّ البعید یندأ و ندادا و ندودا، جدھر منہ آئے بھاگ جانا۔ اسی سے بعض نے یوم التناد پڑھا ہے نَدَّ بہ یعنی اس نے اسے شہرت دی۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ** یہ مبتدا خبر ہیں اور جملہ حال واقع ہو رہا ہے، خطاب کافروں

اور منافقین کو ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا وصف علم کے ساتھ کیسے بیان فرمایا اس کے برعکس ختم طبع، الصمم اور العمی کے ساتھ پہلے ان کا وصف بیان کیا۔ اس کا جواب دو طرح سے ہے:

۱۔ **وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ** سے مراد علم خاص ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا، پانی کو نازل کیا، رزق کو اگایا۔ پس وہ جانتے ہیں کہ وہی انعام فرمانے والا ہے، نہ کہ اس کے مقابل (جو انہوں نے خود بنا رکھے ہیں)۔

۲۔ معنی یہ ہے کہ تم بالقوۃ اور بالامکان اس کی وحدانیت کو جان لیتے ہو اگر تم غور و فکر کرتے۔ واللہ اعلم۔ اس میں دلیل ہے عقلی دلائل کے استعمال کے امر پر اور تقلید کو باطل کرنے پر۔

ابن فورک نے کہا: یہ بھی احتمال ہے کہ آیت مومنین کو بھی شامل ہو۔ معنی یہ ہوگا: اے مومنو! مرتد نہ ہو جانا اور اللہ تعالیٰ کے مد مقابل نہ بنانا اس علم کے بعد کہ اللہ ایک ہے (۱)۔

وَ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ ۚ وَادْعُوا

شُهَدَاءَ كُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

”اور اگر تمہیں شک ہو اس میں جو ہم نے نازل کیا اپنے (برگزیدہ) بندے پر تو لے آؤ ایک سورت اس جیسی اور

بلاوا اپنے حمایتیوں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْهُ لِنَزْلِ الْأَنْزِلِ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَىٰ يَشَاقِقُ الْكَاذِبِينَ۔ اس آیت کا مخاطب مشرک ہیں جن کو چیلنج کیا گیا کیونکہ انہوں نے جب قرآن سنا تو کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے مشابہ نہیں ہے۔ ہم اس میں شک کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس آیت کا ماقبل سے اتصال اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب پہلی آیت میں اپنی وحدانیت و قدرت پر دلالت کو ذکر کیا تو اس کے بعد اپنے نبی کی نبوت پر دلالت کو ذکر کیا کہ وہ جو کچھ لے کر آیا ہے وہ اس کا اپنا گھڑا ہوا نہیں ہے۔

عَبْدِنَا: یعنی محمد ﷺ۔ عبد، تعبد سے ماخوذ ہے جس کا معنی عجز و انکساری کرنا، غلام کو عبد اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے آقا کے سامنے عجز اور خضوع کا اظہار کرتا ہے۔ طرفہ نے کہا:

إِنْ أَنْ تَحَامَتَنِ الْعَشِيرَةُ كُلُّهَا وَافْرَدَتْ أَفْرَادَ الْبَعِيرِ الْمَعْبُدِ

یہاں تک کہ پورے خاندان نے مجھے روکا اور نڈل اونٹ جدا ہونے کی طرح میں جدا ہو گیا۔

بعض علماء نے کہا: جب عبادت معزز ترین خصلت ہے اس کے ساتھ نام رکھنا معزز ترین درجہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عبد کہہ کر ذکر فرمایا۔

يَا قَوْمِ قَلْبِي عِنْدَ ذَهْرَاءَ يَعْرِفُهُ السَّامِعُ وَالرَّائِي

لَا تَدْعُ الْإِثْمَ عَبْدَهَا فَانْهَ اشْرَفَ أَسْمَاءَ

اے میری قوم! میرا دل زہراء کے پاس ہے جس کو ہر سامع اور دیکھنے والا جانتا ہے۔ وہ مجھے نہیں پکارتی مگر یا عبد کہہ کر، کیونکہ یہ میرے معزز ناموں میں سے ہے۔

فَاتُوا بِسُورَةٍ جَاءَ جَوَابَ شَرْطِهَا۔ تو لے آؤ ایک سورت کیونکہ یہ مجھ کے باب سے ہے۔ یہ ابن کیسان نے کہا ہے، یہ امر کا صیغہ ہے اور یہاں اس کا معنی عاجز کرنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سورت لانے سے ان کا عجز معلوم تھا۔ السورة، السور کا واحد ہے اس کے متعلق کلام اس سورت میں اور اعجاز قرآن کی بحث میں گزر چکا ہے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ من مشہد میں ”من“ زائد ہے جیسا کہ فاتوا بسورة مشہد کہا ہے اور مشہد کی ضمیر کا مرجع جمہور مفسرین کے نزدیک قرآن ہے جیسے حضرات قتادہ، مجاہد وغیرہما۔

بعض مفسرین نے فرمایا: اس کا مرجع تورات اور انجیل ہیں معنی یہ ہوگا کہ تم اس کی مثل کتاب سے سورت لے آؤ، کیونکہ تورات و انجیل اس کی تصدیق کرتی ہیں جو اس میں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع نبی کریم ﷺ کی ذات ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ کوئی سورت لاؤ کسی ایسے بشر سے جو آپ کی مثل ہو جو نہ لکھتا ہو نہ پڑھتا ہو۔ ان دونوں تاویلوں پر من تبعیضیہ ہوگا اور مشہد پر وقف نام نہ ہوگا کیونکہ وادعوا کا تعلق اس کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ، شَهِدَاءُ سے مراد مددگار اور حمایتی ہیں۔ فراء نے کہا: اس سے مراد ان کے



معبود (بت) ہیں۔ ابن کیسان نے کہا: اگر کہا جائے کہ یہاں شہداء کا ذکر کیسے کیا۔ شہداء تو اس لئے ہوتے ہیں تاکہ وہ کسی امر کی گواہی دیں یا کسی امر کی خبر دیں جو انہوں نے دیکھا ہو۔ انہیں تو کہا گیا ہے: **فَاتَّبِعُوا سُبُوتًا مِّمَّنْ مِّثْلِهِ**؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: اپنے علماء میں سے جو پاؤں سے مدد طلب کرو اور انہیں لے آؤ تاکہ وہ دیکھیں جو تم لے کر آتے ہو۔ تو یہ تمام لوگوں پر رد، حجت قائم کرنے کے اعتبار سے زیادہ مؤکد ہے۔ میں کہتا ہوں: مجاہد کے قول کا یہی معنی ہے۔ مجاہد نے کہا: **ادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ** کا معنی ہے: لوگوں کو بلاؤ جو تمہارے لئے گواہی دیں کہ تم نے قرآن کا مقابلہ پیش کر دیا ہے۔ نحاس نے کہا: **شُهَدَاءَكُمْ** فعل کے ساتھ اس کو نصب دی گئی ہے اور یہ شہید کی جمع ہے۔ کہا جاتا ہے: شاہد، وشہید، جیسے قادر وقدید۔ **مِّنْ دُونِ اللَّهِ** یعنی اللہ کے سوا دوسروں سے، **دُونِ** کا لفظ فوق کی نفیض (متضاد) ہے اور یہ غایت سے کمی کرنا ہے۔ یہ ظرف ہوتا ہے۔ **الدون**، حقیر اور خسیس کو کہتے ہیں

اذا ما علا المرء رام العلاء ويقنع بالدون من كان دوناً

جب کوئی انسان بلند ہوتا ہے تو بلندی کا قصد کرتا ہے اور خسیس آدمی، پستی پر قناعت کرتا ہے۔

**دُونِ** کے لفظ سے فعل مشتق نہیں ہوتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں: **دان** **يدون** **دوناً** اور کہا جاتا ہے: **هذا دون ذالك** یعنی یہ اس کے زیادہ قریب ہے۔ کسی چیز پر برا بیچتے کرنے کے لئے کہا جاتا ہے: **دُونَكِ** (تم اسے پکڑو)۔ تمیم نے حجاج کو کہا: **اقبونا صالحاً** ہمیں اجازت دے کہ ہم صالح کی قبر کھودیں۔ حجاج نے صالح کو سولی پر لٹکایا تھا تو حجاج نے کہا: **دونكوه** تم اسے لے لو اور دفن کر دو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ** ”اگر تم سچے ہو“ اس میں جو تم نے کہا ہے کہ تم قرآن کے مقابلہ پر قادر ہو، مشرکوں نے کہا تھا: **لو نشاء لقلنا مثل هذا** (اگر ہم چاہیں تو ہم اس کی مثل کہہ سکتے ہیں)۔ صدق (سچائی) یہ کذب (جھوٹ) کا متضاد ہے۔ کہا جاتا ہے: **وقد صدق فی الحديث**، اس نے بات سچی کی، الصدق، نیزوں میں سخت۔ کہا جاتا ہے: **صدقوهم القتال**۔ انہوں نے ان کو جنگ کے بارے سچی بات بتائی۔ الصديق جو ہمیشہ سچ بولتا ہو۔ کہا جاتا ہے **رجل صدق** (سچا آدمی)۔ جیسے کہا جاتا ہے: **نعم الرجل** (اچھا آدمی) **الصداقة**، یہ الصدق سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اخلاص اور محبت میں سچا ہونا۔

**فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ**

**لِلْكَافِرِينَ ۚ**

”پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا** یعنی اگر تم یہ چیلنج پورا نہ کر سکو۔ **وَلَنْ تَفْعَلُوا** یعنی تم اس کی ہرگز طاقت نہیں رکھو گے۔

اس صورت میں ضِدِّ قَيْنٍ پر وقف، وقف تام ہوگا۔ اکثر مفسرین نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے تم اپنے حمایتیوں کو بلاؤ اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو اور تم ایسا ہرگز نہیں کر سکو گے۔ اگر تم ایسا نہ کر سکو تو آگ سے ڈرو۔ اس تفسیر پر ضِدِّ قَيْنٍ پر وقف مکمل نہ ہوگا۔

اگر کہا جائے کہ لم پر ان کیسے داخل ہوا حالانکہ ایک عامل، دوسرے عامل پر داخل نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اِنْ لفظ میں عاملہ نہیں ہے۔ پس یہ لم پر داخل ہو گیا جیسے کہ یہ ماضی پر داخل ہو جاتا ہے، لم میں یہ عمل نہیں کر رہا جس طرح یہ ماضی میں عمل نہیں کرتا۔ پس اِنْ لم تفعلوا کا معنی ہے: اِنْ ترکتم الفعل اگر تم یہ فعل چھوڑ دو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ تَفْعَلُوا۔ لَنْ کے ساتھ فعل منصوب ہے عربوں میں سے کچھ لوگ اسے جزم دیتے ہیں۔ ابو عبیدہ نے جزم والا قول ذکر کیا ہے۔ اسی سے نابغہ کا شعر ہے

فلن اعرض ابیت اللعن بالصنف (1)

میں جناب کے فضائل عطا کی خاطر بیان نہیں کر رہا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے، جب انہیں خواب میں آگ کی طرف لے جایا گیا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: مجھے کہا گیا: لَنْ تُرْمَ (تم نہ ڈرو) یہ اسی لغت کے مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَنْ تَفْعَلُوا میں اِنْ کے ارادوں کو ابھارنا اور اِنْ کے نفوس کو حرکت دینا ہے تاکہ اس کے بعد اِنْ کا عجز پھر سے ظاہر ہو جائے، یہ اِنْ غیوب سے ہے جن کی خبر قرآن نے اِنْ کے وقوع سے پہلے دی (2)۔ ابن کیسان نے کہا: وَلَنْ تَفْعَلُوا اِنْ کو اس بات سے روکنا ہے کہ یہ قرآن حق ہے اور وہ اپنے اس گمان میں سچے نہیں ہیں کہ یہ قرآن جھوٹ ہے اور یہ گھڑا گیا ہے اور یہ جادو ہے اور یہ شعر ہے اور یہ پہلے لوگوں کے قصے، کہانیاں ہیں وہ علم کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن وہ اس کی مثل ایک سورت بھی پیش نہیں کر سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاتَّقُوا النَّارَ يَوْمَ تَفْعَلُوا کا جواب ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر کے آگ سے بچو۔ اتقویٰ کا معنی پہلے گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تمیم اور اسد قبائل کی لغت فتقوا النار ہے۔ سیبویہ نے بیان کیا ہے: تتقی يتقى جیسے قضي يقضی۔

النار مفعول ہے اتقی اس کی صفت ہے۔ اتقی میں تین لغات ہیں اتقی، اللت (تاء کے کسرہ کے ساتھ) اللت (تاء کے سکون کے ساتھ) یہ مؤنث کے لئے اسم مبہم ہے اور یہ معرفہ ہے اس کو نکرہ بنانے کے لئے اس سے الف لام بنانا جائز نہیں ہے اور اس کا مفہوم مکمل نہیں ہوتا مگر صلہ کے ساتھ۔ اس کے تشبیہ میں بھی تین لغات ہیں: اللتان، اللتا (نون کے حذف کے ساتھ) اللتان (نون کی تشدید کے ساتھ) اس کی جمع میں پانچ لغات ہیں: اللاتی، یہ قرآن کی لغت ہے، اللات (تاء کے کسرہ کے ساتھ بغیر یاء کے) اللواتی، واللوات (بغیر یاء کے)

ابو عبیدہ نے کہا:

من اللواق واللتی واللاقی ذعن ان قد کبرث لداق

ان سب کا گمان ہے کہ وہ سب عمر رسیدہ ہو چکی ہیں۔

اللواء (تاء کے سقوط کے ساتھ) یہ جوہری نے حکایت کیا ہے۔ ابن شجری نے یہ زیادہ کیا ہے اللائی (ہمزہ اور یاء کے اثبات کے ساتھ) اور اللاء (ہمزہ کے کسرہ اور یاء کے حذف کے ساتھ) واللا (ہمزہ کے حذف کے ساتھ) اگر تو اس کی جمع الجمع بنائے تو تو اللاتی میں کہے گا: اللواق۔ اور اللائی میں کہے گا: اللوائی۔ اور جوہری نے کہا: الی کی تصغیر اللتیا (فتح اور تشدید کے ساتھ)۔ الراجز نے کہا:

بعد اللتیا واللتیا والتی اذا علتها نفس تردت

ان کے بعد جب وہ بلندی پر پہنچیں تو تھک ہار کر ہلاک ہو گئیں۔

بعض شعراء نے اللتی پر حرف نداد اخل کیا اور حرف نداد ایسے اسم پر داخل نہیں ہوتا جس پر الف لام ہوتا ہے مگر صرف یا اللہ میں۔ گویا اس نے اسے اسم جلالت سے تشبیہ دی ہے اس حیثیت سے الف لام اس سے بھی جدا نہیں ہوتا۔ شاعر نے کہا:

من اجلک یا الی تیت قلبی وانت بخيلة بالود عنی

تیری وجہ سے اے وہ محبوبہ! تو نے میرے دل کو غلام بنا لیا ہے جبکہ مجھ سے محبت کرنے میں بخل کرتی ہے۔

کہا جاتا ہے: وقع فلان واللتیا والتی۔ یہ دونوں مصیبت کے اسماء میں سے ہیں یعنی فلاں مصیبت میں واقع ہوا۔

الوقود، اس کا معنی لکڑی، ایندھن ہے، جبکہ واو کے فتح کے ساتھ ہو اور واو کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی روشن ہوتا ہے۔ الناس اس میں عموم ہے لیکن مراد خاص لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ وہ آگ کا ایندھن ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس آگ سے بچائے۔

الْحَجَّارَةُ یہ سیاہ گندھک کا پتھر ہے۔ حضرت ابن مسعود اور فراء سے یہ مروی ہے، اس پتھر کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ یہ عذاب دینے میں پانچ اعتبار سے دوسرے تمام پتھروں سے زیادہ ہے، جلدی جلتا ہے، بدبودار ہے، دھواں زیادہ ہوتا ہے، بدن کے ساتھ سختی سے چمٹ جاتا ہے، جب گرم ہوتا ہے تو باقی تمام پتھروں سے زیادہ گرم ہوتا ہے (1)۔ وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحَجَّارَةُ میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے انسان اور پتھر کے علاوہ اس آگ میں کچھ نہ ہوگا۔ کیونکہ دوسری آیات میں جنوں اور شیاطین کے آگ میں ہونے کا ذکر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الْحَجَّارَةُ سے مراد بت ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَأَيْتُمْ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (الانبیاء: 98) (تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر جہنم کا ایندھن ہیں)۔ اس اعتبار سے پتھر اور لوگ آگ کا ایندھن ہوں گے یہ آگ کی بڑائی کے لئے ذکر فرمایا ہے کہ وہ آگ اتنی سخت ہے کہ لوگوں کو جلانے کے ساتھ ساتھ پتھروں کو بھی جلا دیتی ہے۔ پہلی تاویل پر انہیں آگ اور پتھروں کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔





سے دوزخ کی آگ میں پھینکا گیا ہے وہ اب تک آگ میں گرتا ہے حتیٰ کہ اس کی گہرائی تک پہنچ گیا ہے (1)۔

بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آگ اور جنت کا مناظرہ ہوا۔ آگ نے کہا: میرے اندر جابر اور متکبر لوگ داخل ہوں گے اور جنت نے کہا: میرے اندر ضعیف اور مسکین لوگ داخل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آگ کو فرمایا: تو میرا عذاب ہے تیرے ساتھ جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا اور جنت سے فرمایا: تو میری رحمت ہے جس کو چاہوں گا تیرے ساتھ اس پر رحمت کروں گا۔ تم میں سے ہر ایک نے بھرنے (2)۔ مسلم نے اس کا مفہوم نقل کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: احتجت بمعنی تحتج ہے۔ اس کی وجہ حضرت ابن مسعود کی حدیث کا مفہوم ہے۔ نیز نبی کریم ﷺ کو جنت اور دوزخ نماز کسوف میں دکھائی گئیں۔ اسی طرح شب معراج میں جنت اور دوزخ کو دیکھا اور آپ ﷺ جنت میں داخل بھی ہوئے (3)۔ پس جو اس کا مخالف قول کرے اس کا کوئی اعتبار نہیں سب توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔ اُعدَّت یہ ہو سکتا ہے کہ یہ الثَّامَر سے معدۃ کے معنی میں حال ہو اور قد مضمر ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ جَاءُوكُمْ حَصَٰثُ صُدُوْرُهُمْ (النساء: 90) اس کا معنی ہے: قد حیرت صدورہم۔ حالانکہ قد مضمر ہے قد کے اضمار کا قول اس لئے کیا ہے کیونکہ ماضی قد کے ساتھ حال ہوتا ہے۔ اس صورت میں الْحِجَابُ ثَابِتٌ پر وقف تام نہ ہوگا اور یہ بھی جائز ہے کہ اُعدَّت کا ماقبل کلام سے کوئی تعلق نہ ہو، جیسے فرمایا وَ ذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَنْزَلَكُمْ (فصلت: 23) (اور تمہارے اس گمان نے جو تم اپنے رب کے بارے میں کیا کرتے تھے انہیں ہلاک کر دیا)۔

جستانی نے کہا: اُعدَّت لِلْكَافِرِيْنَ، التی کے صلہ سے ہے جیسا کہ سورہ آل عمران میں فرمایا وَ اتَّقُوا الثَّامَرَ الَّذِي اُعدَّت لِلْكَافِرِيْنَ ۝ (آل عمران) (اور ڈرو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے) ابن ابی ہریرہ نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ سورہ بقرہ میں التی کا صلہ وَ قُوْدُهَا النَّاسُ موجود ہے۔ پس اسے دوسرے صلہ کے ساتھ ملانا جائز نہیں اور سورہ آل عمران میں اُعدَّت کے علاوہ کوئی صلہ ہے ہی نہیں۔

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنَّتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ  
كُلَّمَا رَزَّقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِي رَزَقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاَتُوْا بِهٖ  
مُتَشٰبِهًا ۚ وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۚ وَهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

”اور خوشخبری دیجئے انہیں جو ایمان لائے اور کیے نیک عمل (کہ) یقیناً ان کے لئے باغات ہیں۔ بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں، جب کھلایا جائے گا انہیں ان باغوں سے کوئی پھل، (تو صورت دیکھ کر) کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے کھلایا گیا تھا اور دیا گیا انہیں پھل (صورت میں) ملتا جلتا اور ان کے لئے جنت میں پاکیزہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعيمها واهلها، باب جهنم اعدنا الله منها، صفحہ 381، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 144، جلد 1 (د۔ ت)۔ ایضاً، ابواب الكسوف، باب صلوٰۃ النساء مع الرجال فی الكسوف، حدیث 994، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا** اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** جب اللہ تعالیٰ نے کفار کی جزا کا ذکر فرمایا تو مومنین کی جزا کا بھی ذکر فرمایا: تبشیر کا مطلب ہے: ایسی چیز کی خبر دینا جس کا اثر جلد پر ظاہر ہو۔ پہلی خبر جو تجھ پر وارد ہوتی ہے اس کے ساتھ جلد میں تبدیلی ظاہر ہوتی ہے پھر یہ عام طور پر خوشی کے لئے استعمال ہونے لگا ایسی خبر کی قید کے ساتھ جس کی بشارت دی گئی ہو اور کبھی غیر مقید بھی استعمال ہوتا ہے اور غم اور شر کے لئے تبشیر استعمال نہیں ہوتا مگر اس شر پر قید کے ساتھ جس کی بشارت دی گئی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ** (الانشقاق) (تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی)۔ کہا جاتا ہے: فابشیر، واستبشیر وبشیر بیشر جب کوئی خوشی ہو تو اس وقت بولا جاتا ہے۔ وجہ بشیر اس کو کہا جاتا ہے جو خوبصورت ہو اور جس کی خوبصورتی بالکل واضح ہو۔ البشیر جو کچھ خوشخبری والے کو دیا جاتا ہے۔ تبشیر الشیء چیز کا ابتدائی حصہ۔

**مسئلہ نمبر 2:** علماء کا اس پر اجماع ہے کہ مکلف (عقل بالغ) جب یہ کہے کہ جو میرے غلاموں میں سے اس بات کی بشارت دے گا وہ آزاد ہے۔ ایک غلام نے پہلے اسے بشارت دی پھر دوسرے غلاموں نے بشارت دی تو ان میں سے پہلا آزاد ہو گا دوسرا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ جب کوئی کہے میرے غلاموں میں سے جس نے مجھے فلاں بات کی خبر دی تو وہ آزاد ہے، تو کیا اس میں دوسرا پہلے کی مانند ہے؟ شوافع نے کہا: ہاں کیونکہ ان میں سے ہر ایک مخبر ہے۔ ہمارے علماء (ہاشمی) نے کہا: نہیں کیونکہ مکلف اس خبر کا قصد کرتا ہے جو بشارت ہوتی ہے اور یہ پہلے غلام کے ساتھ خاص ہے اور یہ عرفاً معلوم ہے۔ پس قول کو عرف کی طرف پھیرنا واجب ہے۔ محمد بن الحسن نے اخبین اور حدثنی کے قول میں فرق کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب کوئی شخص کہے: جس غلام نے مجھے فلاں خبر دی یا مجھے ایسا ایسا بتایا تو وہ آزاد ہے اور اس کی کوئی نیت نہیں ہے، پس اس کے غلام نے اسے کتاب، یا کلام یا پیغام رسانی کے ذریعے وہ خبر دی تو وہ غلام آزاد ہو جائے گا کیونکہ یہ خبر ہے اس کے بعد اس کے کسی غلام نے بھی خبر دی تو وہ بھی آزاد ہو جائے گا کیونکہ اس نے کہا تھا جو غلام مجھے خبر دے گا وہ آزاد ہے، اگر نب غلام یہ خبر دیں گے تو سب آزاد ہو جائیں گے۔ اگر اس نے قسم اٹھاتے وقت بالمشافہ کلام کے ذریعے خبر دینے کا ارادہ کیا تھا تو ان میں سے صرف وہی آزاد ہو گا جو بالمشافہ کلام کے ساتھ وہ خبر دے گا اور جب کہے: ائی غلامی حدثنی۔ تو یہ بالمشافہ گفتگو کرنے پر محمول ہو گا ان میں سے کوئی آزاد نہیں ہو گا۔

**مسئلہ نمبر 3:** **وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ** اس ارشاد میں اس شخص کا رد ہے جو کہتا ہے کہ ایمان صرف طاعات کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ اگر ایمان صرف اعمال ہوتے تو دوبارہ **وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ** ذکر نہ کیا جاتا (1)۔ پس جنت ایمان اور عمل صالح کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: جنت ایمان کے ساتھ حاصل ہوگی اور درجات کا استحقاق اعمال صالحہ کے ساتھ ہوگا۔ واللہ اعلم



Marfat.com

جنت چاہیں گے وہ چلتی رہیں گی۔ اِلَّا تُنْهَضُ پر وقف حسن ہے لیکن تام نہیں کیونکہ کُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ جَنَّتِ کے وصف سے ہے (دنہقا) مصدر ہے۔ الرزاق کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ مِنْ قَبْلُ سے مراد ہے دنیا میں۔ اس میں دو وجوہ ہیں: (۱) وہ کہیں گے یہ وہی ہے جس کا دنیا میں ہم سے وعدہ کیا گیا ہے (۲) یہ وہ رزق ہے جو دنیا میں ہمیں دیا گیا ہے۔ یہ وہ اس لئے کہیں گے کیونکہ جنت کے پھلوں کا رنگ دنیا کے پھلوں جیسا ہوگا۔ جب وہ انہیں کھائیں گے تو اس کا ذائقہ مختلف پائیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: مِنْ قَبْلُ یعنی جنت میں جو پہلے دیا گیا، کیونکہ انہیں رزق دیا جائے گا پھر دوبارہ رزق دیا جائے گا جب انہیں دن کے آغاز میں کھانے اور پھلوں کے ساتھ رزق دیئے جائیں گے تو وہ اس سے کھائیں گے پھر دن کے آخر میں اس رزق سے دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ تو ہمیں پہلے دیا گیا تھا یعنی ہم دن کے آغاز میں کھا چکے ہیں کیونکہ اس کا رنگ اس کھانے کے مشابہ ہوگا لیکن جب اسے کھائیں گے تو صبح والے کھانے سے اس کا ذائقہ مختلف پائیں گے۔ وَأُتُوا یہ اتبت سے مجہول کا صیغہ ہے۔ ایک جماعت نے اسے ہمزہ کے ضمہ اور تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہارون الاغور نے اُتوا یعنی: زہ اور تاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلی قراءت میں ضمیر اہل جنت کے لئے ہے اور دوسری میں خدام کے لئے ہے۔

یہ مُتَشَابِهًا یہ ہم کی ضمیر سے حال ہے یعنی دیکھنے میں بعض بعض کے مشابہ ہوں گے اور ذائقہ میں مختلف ہوں گے (۱)۔ یہ حضرات ابن عباس، مجاہد اور حسن وغیرہم کا قول ہے۔

حضرت عکرمہ نے کہا: وہ پھل دنیا کے پھلوں کے مشابہ ہوں گے لیکن صفات میں ان سے مختلف ہوں گے (۲)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ وہ تعجب کی بنا پر کہیں گے دنیا میں کوئی جنت کی چیزوں کے مشابہ نہیں سوائے اسماء کے۔ گویا وہ تعجب کریں گے جب وہ پھلوں کی خوبصورتی اور ان کی عظیم تخلیق کو دیکھیں گے۔ قتادہ نے کہا: مُتَشَابِهًا کا مطلب ہے: وہ سارے عمدہ ہیں ان میں کوئی گھٹیا نہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَكْتُمُ الْمُتَشَابِهًا (الزمر: ۲۳) اور دنیا کے پھلوں کی طرح نہیں ہیں جو مشابہ نہیں کیونکہ دنیا میں کچھ بہتر ہوتے ہیں اور کچھ بہتر نہیں ہوتے۔

وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ یہ مبتدا خبر ہے، أَزْوَاجٌ جمع ہے زوجہ کی۔ مرد کا زوج عورت ہے اور عورت کا زوج مرد ہے (۳)۔ اصمعی نے کہا: عرب زوجہ نہیں کہتے۔ الفراء نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: زوجۃ۔ فرزدق نے کہا:

وَالَّذِي يَسْعَى لِيَفْسِدَ زَوْجَتِي  
كَمَا يَسْعَى إِلَى أَسَدٍ الشَّامِي يَسْتَبِيلُهَا  
وہ شخص جو کوشش کرتا ہے تاکہ میری بیوی کو خراب کرے وہ اس شخص کی طرح ہے جو شیروں کی کچھار کی طرف کوشش کرتا ہے تاکہ ان کا پیشاب ہاتھ میں لے۔

حضرت عمار بن یاسر نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں کہا تھا: اللہ کی قسم! میں جانتا ہوں وہ دنیا و آخرت میں نبی کریم ﷺ کی زوجہ (محترمہ) ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں آزمائش میں ڈالا ہے (۴)۔ یہ حدیث بخاری نے ذکر کی ہے۔ کسائی

نے اس کو پسند کیا ہے۔

مُطَهَّرَةٌ - یہ اَزْوَاج کی صفت ہے۔ مُطَهَّرَةٌ طہارت سے زیادہ جامع اور بلیغ ہے۔ اس طہارت سے مراد حیض، تھوک اور دوسری عورتوں کی ناپسندیدہ چیزوں سے پاک ہونا ہے۔ عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے، فرمایا: مجھے ثوری نے ابن ابی نجیح سے روایت کر کے بتایا اور ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ مُطَهَّرَةٌ یعنی وہ نہ پیشاب کریں گی نہ پاخانہ، نہ بچے جنم دیں گی نہ انہیں حیض آئے گا نہ ان کو مٹی آئے گی نہ وہ تھوکیں گے۔ ہم نے اپنی کتاب ”الحد کرہ“ میں اہل جنت کی صفات اور جنت کی صفات اور اس کی نعمتوں کے وصف کے عنوان کے تحت ان سب چیزوں کو ذکر کر دیا ہے۔ الحمد للہ

وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ ہُمْ مبتدا ہے خَالِدُونَ اس کی خبر ہے۔ ظرف لغو ہے۔ غیر قرآن میں خالدین کو نصب حال کی حیثیت سے بھی جائز ہے۔ الخلود سے مراد بقاء ہے، اسی سے حبة الخلد ہے یعنی ہمیشہ رہنے والی جنت کبھی یہ زیادہ مدت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اسی سے عربوں کا قول دعا کے بارے میں ہے: خلد الله ملكه اس کی بادشاہی کو طوالت عطا فرمائی۔ زہیر نے کہا:

الا لا اری علی الحوادث باقیا ولا خالداً الا الجبال الرواسیا

خبردار! میں حوادث کو باقی رہنے والا اور لمبی مدت رہنے والا نہیں دیکھتا سوائے ان پہاڑوں کے جو زمین میں گڑھے ہوئے ہیں۔

آیت میں جو خلود کا لفظ استعمال ہوا ہے ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے معنی میں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَعِجِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةٌ فَمَّا فَوْقَهَا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا

فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا

مَثَلًا يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿١٧﴾

”بے شک اللہ حیا نہیں فرماتا اس سے کہ ذکر کرے کوئی مثال مچھر کی ہو یا اس سے بھی حقیر چیز کی۔ تو جو ایمان

لائے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے (اتری ہے) اور جنہوں نے کفر کیا سو وہ

کہتے ہیں کیا قصد کیا اللہ نے اس مثال کے ذکر سے۔ گمراہ کرتا ہے اللہ اس سے بہتیروں کو اور ہدایت دیتا ہے اس

سے بہتیروں کو اور نہیں گمراہ کرتا ہے اس سے مگر نافرمانوں کو۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَعِجِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا حضرت ابن عباس نے حضرت ابوصالح کی روایت میں فرمایا:

جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کے لئے یہ دو مثالیں دیں (یعنی مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا (البقرہ: 17) اور أَوْ

كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ (البقرہ: 19) تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی ذات مثالیں بیان کرنے میں بلند اور اعلیٰ ہے، اللہ تعالیٰ نے

اس پر یہ آیت نازل فرمائی۔



عطا کی روایت میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے خداؤں کا ذکر کیا اور فرمایا: **يَسْلُبُهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُ وَكَامِنَةٌ** (الحج: 73) (اور اگر چھین لے ان سے مکھی بھی کوئی چیز تو وہ نہیں چھڑا سکتے اسے اس مکھی سے) اور ان کے خداؤں کے حیلہ کو ذکر کیا تو اسے مکڑی کا جال بیان فرمایا۔ وہ کہنے لگے: کیا تو نے دیکھا اللہ تعالیٰ نے مکھی اور مکڑی کا ذکر کیا ہے اس قرآن میں جو محمد ﷺ پر نازل فرمایا ہے، وہ اس سے کیا چاہتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرات حسن اور قادہ نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مکھی اور مکڑی کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ مشرکین کے لئے مثال دی تو یہودی ہنسے اور کہا: کیا یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے مشابہ ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

**يَسْتَحْيِي** اصل میں **يَسْتَحْيِي** تھا عین اور لام کلمہ حرف علت تھے تو لام کلمہ میں تعلیل کی گئی۔ ضمہ یا پر ثقیل تھا تو اسے ساکن کر دیا۔ اسم فاعل بھی اسی طرح ہے **مُسْتَحْيُونَ مُسْتَحْيِينَ**۔ ابن محسن نے **يَسْتَحْيِي** حاء کے کسرہ اور ایک یا ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر سے مروی ہے (یہ تمیم اور بکر بن وائل کی لغت ہے) اس میں پہلی یا کی حرکت حاء کی طرف نقل کی گئی اور اسے ساکن کر دیا پھر ضمہ دوسری یا پر ثقیل تھا تو اسے بھی ساکن کر دیا پھر التقاء ساکنین کی وجہ سے ایک یا کو حذف کر دیا گیا۔ اسم فاعل **مُسْتَحْي** ہے جمع **مُسْتَحْيُونَ** اور **مُسْتَحْيِينَ** ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے: اس آیت میں **يَسْتَحْيِي** کے معنی کرنے میں متاویلین کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ **لَا يَخْشَى** کے معنی میں ہے (یعنی اللہ نہیں ڈرتا)۔ طبری نے اس معنی کو ترجیح دی ہے، قرآن میں ہے: **تَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ** (احزاب: 37) یہاں **تَخْشَى** بمعنی **تَسْتَحْيِي** ہے۔ دوسرے علماء نے فرمایا: یہ **لَا يَتَوَكَّلُ** کے معنی میں ہے (یعنی اللہ نہیں چھوڑتا)۔ بعض نے فرمایا **لَا يَسْتَدْعِي** کے معنی میں ہے یعنی اللہ نہیں رکتا۔ استحياء کا اصل معنی کسی شے سے رکنا ہے فتح کے مواقع کے خوف سے اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کے لئے بیان کرنا محال ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ام سلمہ سے مروی ہے، فرمایا: حضرت ام سلیم نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! ان اللہ **لَا يَسْتَحْيِي** من الحق۔ (1) اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس میں حیا کا حکم نہیں دیتا اور اس کے ذکر سے نہیں رکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا، يَضْرِبُ** کا معنی **يَبِينُ** (بیان کرنا) ہے، ان اپنے فعل کے ساتھ من کے حذف کی تقدیر کے ساتھ محل نصب میں ہے (مثلاً) **يَضْرِبُ** کی وجہ سے منصوب ہے (بعوضۃ) کے نصب کی چار وجوہ ہیں:

- ۱- (ما) زائدہ ہے اور **بعوضۃ**، مثلاً سے بدل ہے۔
- ۲- (ما) نکرہ ہے مثلاً سے بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور **بعوضۃ** (ما) کی صفت ہے اور ما کی صفت ہے اور جنس نکرہ کے ساتھ لگائی جاتی ہے اس کے ابہام کی وجہ سے کیونکہ وہ بمعنی **قلیل** ہوتا ہے یہ فراء، زجاج اور ثعلب کا قول ہے (2)۔
- ۳- حرف جار کے استقاط کی تقدیر پر اسے نصب دی گئی ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا: ان **يَضْرِبُ** مثلاً ما بین **بعوضۃ**۔ بین کو حذف کیا گیا اور اس کا اغراب **بعوضۃ** کو دیا گیا۔ فابمعنی الی ہے یعنی جو اس سے بڑی چیز ہے یہ کسائی اور فراء کا قول ہے۔ ابو

1- صحیح مسلم، کتاب النہض، باب وجوب الغسل علی المرأة بغضوبہ المني منها، صفحہ 146، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2- المحرر الوجيز، صفحہ 110-111، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

العباس نے کہا:

یا احسن الناس ما قرنا الی قدم  
اے وہ ذات جو سر سے قدم تک تمام لوگوں سے زیادہ حسین ہے! محب واصل کا کوئی رشتہ پہنچنے والا نہیں۔  
اس شعر میں ماقرناً سے مراد ما بین قرین ہے، جب بین کو ساقط کر دیا تو اس کو منصوب کر دیا۔

۴- یضرب بمعنی یجعل ہو۔ اس صورت میں بعوضۃ متفعول ثانی ہوگا۔ ضحاک، ابراہیم بن ابی عبیدہ، رؤبہ بن حجاج نے بعوضہ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ تمیم کی لغت ہے۔ ابوالفتح نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ ما اسم ہے جو الذی کے قائم مقام ہے اور بعوضۃ کو مبتدا کے اضمار پر رفع دیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: لا یستحی ان یضرب الذی ہو بعوضۃ مثلاً۔ پس موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر کو حذف کر دیا اور وہ ہو مبتدا ہے، اس کی مثل بعض قراء کی قراءت ہے: تسامع علی الذی احسن یعنی علی الذی هو احسن۔ ہو مبتدا محذوف ہے۔ سیبویہ نے بیان کیا ہے: ما انا بالذی قائل لك شیئاً یعنی ہو قائل۔ (1) نحاس نے کہا: قائل میں حذف زیادہ قبیح ہے الذی میں حذف کی نسبت کیونکہ الذی کے لئے تو ایک ہی وجہ ہے، اس کے ساتھ زیادہ طویل ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ضربت له مثلاً کا معنی ہے: مثلت له مثلاً میں نے اس کے لئے مثال دی ہذا الابنیۃ علی ضرب واحد (تمام عمارتیں ایک جیسی ہیں) علی مثال واحد ونوع واحد۔ الضرب کا معنی نوع (قسم) ہے۔ البعوضۃ یہ بَعْض سے فعولہ کے وزن پر ہے۔ بَعْض کا معنی ہے اس نے گوشت کاٹ لیا۔ کہا جاتا ہے: بضع اور بعض ہم معنی ہیں۔ قد بعضته تبعیضاً، میں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کیا تو وہ ٹکڑے ہو گیا۔ البعوض سے مراد چھوٹا ہے۔ اس کا واحد بعوضۃ اس کو بعوضہ اس کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ یہ جوہری وغیرہ کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا فَوْقَهَا پہلے گزر چکا ہے کہ فَا بمعنی الی ہے اور جنہوں نے پہلے مَا کو صلہ زائدہ بنایا ہے اس نے دوسرے مَا کو اس پر معطوف کیا ہے۔ کسائی اور ابو عبیدہ وغیرہا نے کہا: فَمَا فَوْقَهَا کا معنی اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ ما دونہا ہے (2)، یعنی جو چیز چھوٹے ہونے میں اس سے زیادہ ہو۔ کسائی نے کہا: یہ کلام میں تیرے اس قول کی مانند ہے اُتِراہ قصیراً؟ (کیا تو اسے چھوٹا دیکھتا ہے)۔ کہنے والا کہتا ہے: اذ فوق ذالک یعنی جتنا تو اسے دیکھ رہا ہے وہ اس سے بھی چھوٹا ہے۔ قتادہ اور ابن جریج نے کہا: فَمَا فَوْقَهَا کا مطلب ہے اس سے بڑی چیز (3)، اور (انہ) کی ضمیر کا مرجع البطل ہے یعنی مثل حق ہے۔ حق، باطل کے خلاف ہوتا ہے حق کی جمع حقوق ہے۔ الحقۃ، حا کے فتح کے ساتھ اس سے زیادہ خاص ہے۔ کہا جاتا ہے: ہذہ حقتی یعنی یہ میرا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاقْصَا الَّذِیْنَ کَفَرُوا بنی تمیم اور بنی عامر کی لغت اُما میں آیا ہے۔ وہ تضعیف کی کراہت کی وجہ سے ایک میم کو یا سے بدل دیتے ہیں۔ اس بنا پر عمر بن ابی ربیعہ کا شعر پڑھا جاتا ہے:

رأت رجلاً ایما اذ الشمس عارضت فیضی و ایما بالعشی فیخصر

اس نے ایک شخص دیکھا جب سورج چڑھتا تو وہ گرم ہوتا جب شام ہوتی تو وہ ٹھنڈا ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا** نحو یوں کا **مَاذَا** کے متعلق اختلاف ہے۔ یہ ایک اسم کے قائم مقام ہے۔ معنی یہ ہوگا: ای شیء اراد اللہ۔ (1) (اللہ تعالیٰ کس چیز کا ارادہ فرماتا ہے)۔ اس صورت میں **أَرَادَ** کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا۔ ابن کیسان نے کہا: یہ عمدہ قول ہے۔ بعض نے فرمایا: **مَا** اسم تام ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور **ذَآ** بمعنی الذی ہے اور یہ مبتدا کی خبر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی **مَا** الذی اراد اللہ بهذا مثلاً۔ ان کے اس کلام کا مطلب استفہام کے لفظ کے ساتھ انکار ہے اور **مَثَلًا** قطع کی بنا پر منصوب ہے۔ تقدیر عبارت ہے: اراد مثلاً یہ ثعلب کا قول ہے۔ ابن کیسان نے کہا: یہ اس تمیز کی بنا پر منصوب ہے جو حال کی جگہ واقع ہوتی ہے (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يُضِلُّ بِهٖ كَثِيرًا مِّنْهُمْ وَيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا** بعض علماء نے فرمایا کہ کفار کے قول کا معنی یہ ہے کہ اس مثال سے اللہ کی مراد کیا ہے جس کے ساتھ وہ لوگوں کو گمراہی کی طرف اور ہدایت کی طرف تفریق کرتا ہے (3)۔

بعض نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے۔ یہ زیادہ بہتر قول ہے کیونکہ وہ اقرار کرتے تھے کہ ہدایت اس کی طرف سے ہے۔ معنی یہ ہوگا آپ فرمائیے اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بہتروں کو گمراہ کرتا ہے بہتروں کو ہدایت دیتا ہے یعنی توفیق دیتا ہے اور محروم کرتا ہے۔ اس میں معتزلہ کے قول کا رد ہے جو پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ گمراہی پیدا کرتا ہے نہ ہدایت۔ وہ کہتے ہیں: اس آیت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کا نام گمراہ رکھتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: فسقت فلان یعنی میں نے اس کا نام فاسق رکھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہ نہیں کرتا، یہ ان کا اضلال میں طریقہ ہے۔ یہ مفسرین کے اقوال کے خلاف ہے اور لغت میں بھی اس کا احتمال نہیں کیونکہ کہا جاتا ہے: جب کوئی کسی کا نام ضال رکھے تو کہتے ہیں ضلہ، اور جب کسی کا نام رکھے تو **أَضَلَّه** نہیں کہا جاتا لیکن اس آیت کا معنی وہی ہے جو مفسرین نے بیان فرمایا کہ بہت سے لوگوں کو اس کے ذریعے محروم فرماتا ہے ان کے کفر کی جزا دیتے ہوئے۔ **وَمَا يُضِلُّ بِهٖ إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ** کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، **الْفٰسِقِيْنَ** کو نصب فعل کی وجہ سے دی گئی ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: **وَمَا يُضِلُّ احْدًا اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ** الذین سبق فی علمہ انہ لا یہدیہم۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ گمراہ نہیں کرتا مگر فاسقین کو جن کے متعلق پہلے ہی اس کے علم میں ہے کہ اس نے انہیں ہدایت کی توفیق نہیں دینی ہے۔ اور استثنا کی بنا پر **الْفٰسِقِيْنَ** کو نصب جائز نہیں کیونکہ استثنا ہمیشہ کلام کے مکمل ہونے کے بعد ہوتا ہے۔

نوف بکالی نے کہا: حضرت عزیر علیہ السلام نے اپنے رب سے عرض کیا: الہی! تو نے مخلوق پیدا کی ہے تو جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے تو حضرت عزیر علیہ السلام سے کہا گیا: اس سوال سے اعراض کرو تم اس سوال کو چھوڑ دو ورنہ میں تمہارا مرتبہ نبوت ختم کر دوں گا، جو میں کرتا ہوں اس کے متعلق مجھ سے سوال نہیں کیا جاتا لوگوں سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔



الضلال، اس کا اصل معنی ہلاک ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے: ضل الماء فی الدین جب پانی دودھ میں مل کر ختم ہو جائے، اسی سے یہ ارشاد ہے: **وَإِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ** (السجدہ: 10) سورہ فاتحہ میں بحث گزر چکی ہے۔ فسق کی اصل، کلام عرب میں کسی چیز سے خروج ہے۔ کہا جاتا ہے: فسقت الرطبة جب پھل اپنے پردے سے باہر آ جائے اور چوبہا اپنی بل سے باہر آ جائے۔ الفویسقة چوبہا کو کہتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے: خمس فواسق يقتلن فی الحل والحرم الحیة والغراب الأبقع والفارعة والکلب العقور والحذیا (1)۔

پانچ چیزیں فواسق ہیں انہیں حل و حرم میں قتل کیا جائے گا: سانپ، کالا کوا، چوہا، کانٹے والا کتا اور چیل۔ یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں سانپ کی جگہ بچھو کا ذکر ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اذیت کی وجہ سے ان کا نام فواسق رکھا ہے جیسا کہ آئندہ ان شاء اللہ ذکر آئے گا۔ فسق الرجل یفسق ویفسق... عن الاخفش... فسقا وفسوقاً یعنی نکلا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ** (الکہف: 50) (یعنی اپنے رب کے حکم سے نکل گیا)۔ ابن اعرابی نے کہا ہے کہ اس نے جاہلیت کے کلام اور اشعار میں کبھی فاسق کا لفظ نہیں سنا۔ فرمایا: یہ عجیب ہے۔ یہ عربی کلام ہے اس کو ابن الفارس اور جوہری نے بیان کیا ہے۔ میں کہتا ہوں: ابوبکر انباری نے اپنی کتاب ”الزاهر“ میں ذکر کیا ہے جب وہ فسق کے معنی پر گفتگو کر رہے تھے۔ شاعر کا قول ہے:

یذهب فی نجد و غورا غائراً فواسقاً عن قصدھا جوائراً  
وہ نجد میں گئیں اور نشیبی علاقہ میں چلی گئیں اپنے مقصود سے نکل کر ٹیڑھے راستہ پر نکل گئیں۔

الفسیق ہمیشہ فسق کا ارتکاب کرنے والا، خدا کرنے والا وقت۔ کہا جاتا ہے: یا فسق و یا خبیث۔ مراد ہوتا ہے: یا ایہا الفاسق و یا ایہا الخبیث۔ عرف شرعی میں فسق کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی طاعت سے نکلنا۔ کبھی اس شخص پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کفر کے ساتھ نکلتا ہے اور اس پر بھی جو نافرمانی کیساتھ نکلتا ہے۔

الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوَصَّلَ  
وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿٥١﴾

”وہ جو توڑتے رہتے ہیں عہد خداوندی کو اسے پختہ باندھنے کے بعد اور کاٹتے رہتے ہیں اسے حکم فرمایا اللہ نے جس کے جوڑنے کا اور فساد مچاتے رہتے ہیں زمین میں۔ وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔“

اس آیت میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الَّذِينَ** یہ فاسقین کی نعت ہونے کی بنا پر منصوب ہے اگر تو چاہے تو مبتدا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ما یندب للمحرم وغیرہ قتله من الدواب فی الحل والحرم، صفحہ 381، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

صحیح بخاری، کتاب ہدای الخلق، باب خمس من الدواب فواسق یقتلن فی الحل والحرم، حدیث نمبر 3067، صیاء القرآن پبلی کیشنز

مخدوف کی خبر بنا کر حالت رفع میں کر دے یعنی ہم الذین۔ اس کی مزید بحث پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يَنْقُضُونَ النِّقْضَ** کسی دیوار، یا رسی یا عہد کو توڑ دینا۔ **النَّقَاضَةُ** بالوں کی رسی کو توڑ دینا۔ **المناقضة**، ایسا کلام جس کے معنی میں تناقض ہو۔ **النقيضة في الشعر** ایسا شعر جو کسی کے جواب میں کہا جائے۔ **النقض**۔ توڑی ہوئی چیز۔

علماء کا اس عہد کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے لیا تھا جب انہیں آدم کی پیٹھ سے نکالا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ کی اپنی مخلوق کو وصیت اور اس کا امر ہے جو اس نے انہیں اپنی اطاعت کا حکم دیا ہے اور نبی ہے جو اس نے اپنے رسل کی زبان کے ذریعے اپنی کتب میں اپنی معصیت سے روکا ہے اور اس کا نقض اس کے احکام پر عمل کا ترک ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ دلائل ہیں جو اس نے آسمانوں، زمین اور دوسری اپنی کرشمہ سازیوں کے ذریعے اپنی وحدانیت پر دیئے ہیں یہ عہد کے قائم مقام ہیں اور ان کا توڑنا ان میں غور و فکر کو ترک کرنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ عہد ہے جو ان لوگوں سے کیا گیا جنہیں کتاب دی گئی تھی کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بیان کریں اور ان کے امر کو نہ چھپائیں۔ اس صورت میں یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہوگی۔ ابو اسحاق الزجاج نے کہا: اس عہد سے مراد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء اور ان کے تبعین سے لیا کہ وہ نبی مکرّم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہ کریں۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: **وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي** (آل عمران: 81) میں کہتا ہوں: اس آیت کے ماقبل اور مابعد کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ یہ آیت کفار کے بارے میں ہے۔ یہ پانچ اقوال ہیں اور دوسرا قول سب کو جامع ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ**، ميثاق اس عہد کو کہا جاتا ہے جس کو قسم کے ساتھ منو کہ کیا گیا ہو۔ **الميثاقه والمعاهده** (۳۶) سے مفعول کا وزن ہے۔ اس کا معنی عقد اور باندھنے میں شدت کرنا۔ اصل پر اس کی جمع **المواثيق** ہے کیونکہ ميثاق کی اصل موثاق ہے۔ ماقبل کسرہ کی وجہ سے واو یاء سے بدل گئی، اس کی جمع ميثاق اور مواثیق بھی آتی ہے۔ ابن عربی نے کہا:

حتى لا يحل الدهر الا باذنتنا ولا نسال الاقوام عهد الميثاق

چرا گاہ ہمارے اذن کے بغیر زمانہ اسے حلال نہیں کرتا اور قوموں سے عہد و پیمان کا مطالبہ نہیں کرتے۔

**الموثق، الميثاق، المواثقة** سب کا معنی معاہدہ ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ** (المانہ: 7) (اور اس کے وعدہ کو جو اس نے پختہ کیا تھا تم سے)۔

**مسئلہ نمبر 4:** **وَيَقْطَعُونَ**، القطع یہ معروف ہے۔ قطع تعلقی میں مصدر القطيعة استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: **قطيعة فهو رجل قَطَعَ دَقِطَةً** جیسے **هُمَزَةٌ**۔ **قطعت الحبل قطعاً** میں نے رسی کو توڑ دیا۔ **قطعت النهر قطعاً**... **قطعت**

☆ یہ غلطی اعتبار سے محل نظر ہے۔

الضیر قِصُوعاً وَ قِطَاعاً وَ قِطَاعاً جب کوئی پرندہ ایک شہر سے نکل کر دوسرے شہر میں چلا جائے۔ اصاب الناس قطعۃ جب لوگوں کے پانی کم ہو جائیں۔ ورجل به قطع جب آدمی کا سانس تھکاوٹ کی وجہ سے متواتر پے در پے آنے لگے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُؤْصَلَ اس میں (مَا) يَقْطَعُونَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اگر تو چاہے تو اُن کو مَا سے بدل بنا دے اور اگر چاہے تو پہ میں جو ضمیر ہے اس سے (ان) کو بدل بنا دے۔ یہ ترکیب بہتر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ننلا یوصل ہو یعنی کراہۃ ان یوصل۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس چیز کو ملانے کا حکم دیا؟ بعض نے فرمایا: صلہ رحمی۔ بعض نے فرمایا: قول کو عمل کے ساتھ ملانے کا حکم ہے۔ پس انہوں نے قول و عمل کو جدا جدا کر دیا۔ اس طرح کہ جو انہوں نے کہا اس پر عمل نہیں کیا۔ بعض نے فرمایا: تمام انبیاء کی تصدیق کو ملانے کا حکم دیا۔ پس انہوں نے بعض انبیاء کی تصدیق اور بعض کی تکذیب کر کے اس کو توڑا۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ کے دین اور زمین میں اس کی عبادت، شریعت کا قائم کرنا اور شرعی حدود کی حفاظت کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ ہر اس صورت کو شامل ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم دیا۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے اور الرحم اس کا ایک جز ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ یعنی وہ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور افعال میں ظلم کرتے ہیں کیونکہ ان کے افعال ان کی شہوات کے مطابق ہوتے ہیں (1)۔ یہ فساد کی حد ہے۔

أُولَئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ۔ یہ مبتدا خبر ہیں۔ اور هُمْ زائدہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ هُمْ دوسرا مبتدا ہو اور الْخٰسِرُونَ اس کی خبر ہو اور پھر مبتدا خبر دونوں پہلے مبتدا کی خبر ہوں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ الْخٰسِرُونَ شخص ہے جو فلاح و فوز میں سے اپنا حصہ ہی کم کر دے۔ الْخِسْرَانِ کا مطلب نقصان ہے خواہ وہ میزان میں ہو یا کسی اور چیز میں۔ جریر نے کہا:

ان سلیطاً فی الخسار انہ اولاد قوم خلقوا اقنہ

بے شک سلیط خسارے میں ہے وہ ایک قوم کی اولاد ہے جو غلام پیدا کئے گئے ہیں۔

یعنی اپنے حظوظ اور شرف میں کمی کرنے کی وجہ سے خسارہ میں ہیں۔

جوہری نے کہا: خَسِرَتِ الشَّيْءُ وَ اخْسَرْتَهُ کا معنی ہے: کمی کرنا۔ الْخِسَارُ وَ الْخِسَارَةُ وَ الْخِيسِرُ۔ کا معنی گمراہ ہونا اور ہلاک ہونا ہے۔ ہلاک ہونے والے کو خاسر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو خسارہ دینے والا ہے اور وہ جنت میں اپنی منزل سے روکے گئے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7:** اس آیت میں دلیل ہے کہ عہد پورا کرنا، اس کا التزام کرنا ہے اور ہر عہد جس کو انسان نے اپنے اوپر لازم کیا ہو اسے اس کے لئے توڑنا حلال نہیں ہے، خواہ وہ مسلمان کے ساتھ ہو یا کسی غیر مسلم کے ساتھ ہو اللہ تعالیٰ نے عہد توڑنے والے کی مذمت کی ہے۔ فرمایا: أَوْفُوا بِالْعُقُودِ (المائدہ: 1) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے کہا: وَأَمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَأَنْهِيهِمْ (انفال: 58) پس اللہ تعالیٰ نے عذر (عہد شکنی) سے منع فرمایا ہے اور یہ نہیں ہوتا مگر عہد توڑنے کی وجہ



سے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَئًا فَاحْيَاكُمْ ثُمَّ يُبَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ  
تَرْجَعُونَ ۝

”کیونکر تم انکار کرتے ہو اللہ کا حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے۔“

کَيْفَ حالت کے متعلق سوال ہے۔ یہ اسم ہے اور تَكْفُرُونَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے یہ مبنی برفتح ہے اس کو ساکن ہونا تھا کیونکہ اس میں اس استفہام کا معنی ہے جس کا معنی تعجب ہے۔ پس اس کو حروف سے مشابہت دی گئی اور فتح کی خفت کی وجہ سے اس کے لئے فتح اختیار کیا گیا یعنی یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن پر تعجب کرنا واجب ہے جب انہوں نے کفر کیا حالانکہ ان پر حجت ثابت ہو چکی ہے۔

اگر کہا جائے کہ یہ خطاب اہل کتاب کو ہونا کیسے جائز ہے کیونکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کا انکار نہیں کرتے تھے۔ اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے کہ جب انہوں نے محمد ﷺ کی نبوت کو تسلیم نہ کیا اور جو کچھ آپ احکام لے کر آئے اس کی تصدیق نہ کی تو انہوں نے شرک کیا کیونکہ انہوں نے یہ اقرار نہ کیا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو یہ گمان کرے کہ قرآن انسان کا کلام ہے اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا اور وہ عہد کو توڑنے والا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: کَيْفَ کا لفظ تو لفظ استفہام ہے لیکن معنی استفہام نہیں بلکہ یہ تقریر اور توہین کے لئے ہے یعنی تم کیسے اس کی نعمت کا انکار کرتے ہو جبکہ اس کی قدرت یہ ہے (1)۔ الواسطی نے کہا: اس کلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انہیں حد درجہ کی توہین فرمائی کیونکہ مردوں اور جمادات سے اس کا صانع کسی چیز میں جھڑا نہیں کرتا۔ منازعت (جھڑا) بیا کل روحانیہ سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُنْتُمْ اَمْوَئًا یہ واقعہ ہے اور قد مضمر ہے۔ زجاج نے کہا: تقدیر عبارت قد كنتم ہے۔ پھر قد حذف ہو گیا۔ فراء نے کہا اَمْوَئًا، كُنْتُمْ کی خبر ہے۔

فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُبَيِّتُكُمْ یہاں وقف تام ہے۔ ابو حاتم نے اسی طرح کہا پھر فرمایا: ثُمَّ يُحْيِيكُمْ اہل تاویل نے ان دو موتوں اور دو زندگیوں کی ترتیب میں اختلاف کیا ہے اور انسان کے لئے کتنی موتیں اور کتنی زندگیاں ہیں اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ حضرات ابن عباس اور ابن مسعود نے فرمایا: یعنی تم تخلیق سے پہلے معدوم تھے۔

فَاَحْيَاكُمْ اس نے تمہیں پیدا کیا۔ ثُمَّ يُبَيِّتُكُمْ پھر تمہاری عمروں کے مکمل ہونے کے وقت تمہیں موت دے گا ثُمَّ يُحْيِيكُمْ پھر تمہیں قیامت کے روز زندہ کرے گا۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول اس آیت سے مراد ہے۔ کفار کو اس قول سے انکار نہیں تھا کیونکہ وہ ان دونوں چیزوں کا اقرار کرتے تھے (2)، جب کفار کے نفوس کو یقین تھا کہ وہ معدوم تھے اور پھر دنیا میں انہیں پیدا کیا پھر اس دنیا میں انہیں مارنے کا بھی یقین تھا تو ان پر دوبارہ زندہ کرنے کا لزوم قوی ہو گیا۔ اب ان کا آخرت میں اٹھنے کا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 113، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

2۔ ایضاً، صفحہ 114، جلد 1

انکار ایسا دعویٰ تھا جس پر کوئی دلیل نہ تھی۔ دوسرے علماء نے کہا: اس تاویل پر قبر کی زندگی دنیا کی زندگی کے حکم میں ہوگی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس زندگی کا کوئی اعتبار نہیں جس میں اس کی موت کا اعتبار نہیں کیا گیا جسے دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مارا پھر دنیا میں ہی اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کیا۔

بعض علماء نے فرمایا: کُنْتُمْ اَمْوَآتًا یعنی آدم کی پیٹھ میں تم مردہ تھے پھر اس نے تمہیں اس کی پیٹھ سے چیونٹیوں کی صورت میں نکالا کُنْتُمْ یُیْبِیْتُکُمْ پھر تمہیں دنیا کی موت دے گا پھر تمہیں اٹھائے گا۔ بعض نے فرمایا کُنْتُمْ اَمْوَآتًا یعنی تم مردوں کی صلیبوں اور عورتوں کے رحموں میں نطفہ کی صورت میں تھے پھر اس نے تمہیں رحموں سے نقل کیا فَاَحْیَاکُمْ اور تمہیں زندگی بخشی کُنْتُمْ یُیْبِیْتُکُمْ پھر تمہیں اس زندگی کے بعد موت دے گا پھر سوال کے لئے تمہیں زندہ کرے گا پھر تمہیں قبر میں موت دے گا پھر حشر کی طرف لے جانے کے لئے نثر کی زندگی دے گا۔ یہ ایسی زندگی ہے جس کے بعد موت نہیں۔

میں کہتا ہوں: اس تاویل پر تین موتیں اور تین زندگیاں ہوں گی اور ان کا آدم کی پیٹھ میں مردہ ہونا اور ان کا آدم کی پیٹھ سے نکلنا اور ان پر گواہی دینا مگر ان کے باپوں کی صلیبوں اور ماؤں کی رحموں میں ان کا نطفہ نہ ہونا اس صورت میں چار موتیں اور چار زندگیاں ہو جائیں گی۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے لوگوں کو ذروں کی صورت میں پیدا کیا پھر انہیں موت دی۔ اس صورت میں پانچ موتیں اور پانچ زندگیاں ہو جائیں گی چھٹی موت امت محمدیہؐ کے مجرموں کے لئے جب وہ آگ میں داخل ہوں گے کیونکہ حضرت ابوسعید خدری کی حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رہے دوزخی جو دوزخ والے ہیں وہ اس میں نہ مریں گے نہ زندہ ہوں گے لیکن کچھ لوگ جنہیں آگ لگے گی ان کے گناہوں کے سبب پھر اللہ انہیں موت دے گا حتیٰ کہ جب وہ کوئلہ بن جائیں تو اذن شفاعت ہوگا انہیں گروہوں کی صورت میں لایا جائے گا پھر جنت کی نہروں پر انہیں بکھیر دیا جائے گا۔ پھر کہا جائے گا: اے اہل جنت! ان پر پانی بہاؤ۔ پس اس طرح ان پر گوشت پیدا ہو جائے گا جیسے سیلاب کی مٹی پر بوٹی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص نے کہا: گویا کہ رسول اللہ ﷺ جنگل میں بکریاں چراتے تھے (1)۔ (مسلم)

میں کہتا ہوں: آپ ﷺ کے ارشاد اماتہ اللہ اماتہ (اللہ پھر انہیں موت دے گا) اس سے حقیقت موت مراد ہے کیونکہ مصدر کے ساتھ تاکید لگائی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نیند طاری کر کے انہیں عذاب سے غائب کر دیا ہو اور یہاں حقیقی موت مراد نہ ہو لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ نحو یوں کا اجماع ہے کہ جب فعل کی مصدر کے ساتھ تاکید لگائی گئی ہو تو وہاں مجاز مراد نہیں ہوتا بلکہ حقیقت مراد ہوتی ہے جیسے کَلَّمَ اللہُ مُوسٰی تَکَلِّمُنَا (النساء) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ کُنْتُمْ اَمْوَآتًا یعنی تم گناہ تھے فَاَحْیَاکُمْ اس نے زندگی بخشی کہ تمہارا ذکر کیا گیا اور تم اس دین اور اس نبی کریم ﷺ سے شرف ہوئے جو تمہارے پاس آیا۔ پھر وہ تمہیں موت دے گا۔ پس تمہارا ذکر ختم ہو جائے گا پھر تمہیں بعث کے لئے زندہ کرے گا۔

1۔ تصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب اثبات الشفاعۃ و اخراج الموحدين من النار، صفحہ 104، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ پھر اس کے عذاب کی طرف، اپنے کفر کی وجہ سے لوٹنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ معنی ہے کہ زندگی کی طرف اور سوال کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ (الانبیاء: 104) پس ان کا دوبارہ زندہ کرنا ان کے ابتدا میں زندہ کرنے کی طرح ہے اور یہی رجوع ہے اور ترجعون اکثر قراء کی قراءت ہے۔ یحییٰ بن یحمر، ابن ابی اسحق، مجاہد، ابن محیسن، سلام بن یعقوب نے حرف مضارع کو فتح اور جیم کے سرور کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ

سَمَوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٠﴾

”وہی تو ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب پھر توجہ فرمائی اوپر کی طرف تو

ٹھیک ٹھیک بنا دیا انہیں سات آسمان اور وہ سب کچھ خوب جانتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (وہی تو ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین

میں ہے سب کا سب۔)

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** خَلَقَ اس کا معنی عدم سے وجود میں لانا ہے۔ کبھی انسان کے لئے خلق بولا جاتا ہے جب وہ کسی چیز کو ایجاد کرے۔ شاعر کا قول ہے:

مَنْ كَانَ يَخْلُقُ مَا يَقُولُ فَحِيلَتِي فِيهِ قَدِيلَةٌ (1)

جو وہ کر گزرتا ہے جو وہ کہتا ہے تو میرا حیلہ اس کے بارے میں کم ہے۔

یہ معنی گزر چکا ہے۔ ابن کیسان نے کہا: خَلَقَ لَكُمْ کا معنی ہے مَنْ اَجْلَكُمْ تمہارے لئے پیدا کیا۔ بعض نے فرمایا: معنی یہ

ہے کہ جو کچھ زمین میں ہے تم پر وہ انعام کیا گیا ہے وہ تمہارے لئے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ توحید اور اعتبار کی دلیل ہے۔ میں

کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے جیسا کہ ہم بیان کریں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہوں جن کے وہ محتاج ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2:** جن علماء کا یہ اصول ہے کہ وہ اشیاء جن سے نفع حاصل کیا جاتا ہے وہ مباح ہیں انہوں نے اسی آیت

سے یہ اصول مستنبط کیا ہے اور اسی طرح کی دوسری آیات سے استدلال کیا ہے مثلاً: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي

الْأَرْضِ جَمِيعًا قَبْلَ هَذِهِ (الجماعہ: 13) (یعنی نفع بخش چیزیں حلال ہیں) حتیٰ کہ منع پر دلیل آجائے۔

انہوں نے اپنے اس اصول کی تائید میں یہ کہا ہے کہ لذیذ کھانے پیدا کئے گئے ہیں ان کے پیدا کرنے کا امکان بھی موجود تھا،

یہ عبث تو پیدا نہیں کئے گئے، ان کی کوئی منفعت ہوگی اور اس کی منفعت کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹانا تو صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی ذات

ان چیزوں سے مستغنی ہے۔ پس یہ منفعت ہماری طرف ہی لوٹے گی اور ہماری منفعت یا تولدت کے حاصل کرنے میں ہے یا



ان چیزوں سے اجتناب میں ہے تاکہ ہماری اس طرح آزمائش کی جائے یا ہم ان سے عبرت حاصل کریں ان امور سے کوئی بھی حاصل نہیں ہو سکتا مگر چکھنے کے ساتھ۔ پس یہ لازم ہوا کہ یہ مباح ہیں، یہ قول فاسد ہے کیونکہ منفعت کے بغیر تخلیق سے عبث لازم نہیں آتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے منفعت کے لئے پیدا کیا ہے کیونکہ اس پر منفعت اصل واجب نہیں ہے بلکہ یہ منفعت اس کو پیدا کرنے کا موجب ہے۔ ہم منفعت کا حصر ان صورتوں میں تسلیم نہیں کرتے جو انہوں نے بیان کی ہیں اور ان منافع میں سے بعض کا حصول چکھنے پر موقوف نہیں ہے بلکہ ذائقہ دوسرے ذرائع سے بھی حاصل کیا جاتا ہے جیسے کہ طبائعیین کے نزدیک معروف ہے۔ پھر ان کا اصول معارض ہے ہر اس چیز سے جس کے چکھنے سے اس کے ہلاک کرنے والی زہر ہونے کا خوف ہو۔ اصحابِ حظ نے شبہات سے معارض ہیں۔ بعض نے توقف فرمایا اور کہا: ہر فعل جس کا حسن اور قبح معلوم نہ ہو مگر یہ کہ وہ فی نفسہ حسن ہو، شرع کے درود سے پہلے کوئی معین کرنے والا نہیں۔ وقف تو شریعت کے درود تک موقوف ہوگا۔ یہ تینوں معتزلہ کے اقوال ہیں۔ شیخ ابوالحسن اور اس کے ساتھی اکثر مالکی اور صیرفی نے اس مسئلہ میں مطلق وقف کا قول کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ اس حالت میں ان اشیاء کا کوئی حکم نہیں ہوگا شرع کے لئے ہے جب وہ آئے تو جو چاہے حکم دے۔

عقل وجوب اور غیر وجوب کے ساتھ حکم نہیں لگاتی۔ اس کا حصہ ہے امور اس کے مطابق پہنچائے جائیں گے جیسے وہ ہیں۔ ابنِ عطیہ نے کہا: ابنِ فورک نے ابنِ الصانع سے روایت کر کے بیان کیا ہے، فرمایا: عقل کبھی سمع سے خالی نہیں ہوتی کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اس میں سمع (سننا) ہوتا ہے، یا اس کے ساتھ اس کا تعلق ہوگا یا اس کے لئے ایسی حالت ہوگی جس کی وجہ سے اسے کہا جائے گا۔ فرمایا: مناسب ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ یہ حظ، اباحت اور توقف میں غور و فکر سے مستغنی کر دیتا ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 3:** خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ کے معنی میں صحیح اعتبار ہے۔ اس سے ماقبل اور مابعد عبرتوں کے دلائل اس پر دلالت کرتے ہیں (مثلاً) زندہ کرنا، مارنا، تخلیق کرنا، آسمانوں کی طرف استویٰ اور آسمانوں کا تسویہ یعنی جو ذات تمہارے زندہ کرنے پر اور تمہاری تخلیق پر، آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر قادر ہے اس کی قدرت سے دوبارہ زندہ کرنا بعید نہیں۔

اگر کہا جائے کہ لَكُمْ کا معنی انتفاع ہے یعنی تاکہ تم ان تمام چیزوں سے نفع اٹھاؤ ہم کہیں گے انتفاع سے مراد اعتبار (عبرت حاصل کرنا) ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ بچھوؤں اور سانپوں میں کیا عبرت ہے؟ ہم کہیں گے انسان موذی چیزوں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے لئے آگ میں سزائیں تیار کر رکھی ہیں۔ پس یہ چیزیں ایمان کا سبب اور گناہوں کے ترک کا سبب بنتی ہیں یہ بہت بڑی عبرت ہے۔ ابنِ عربی نے کہا: ان تمام چیزوں سے اس قدرت کے متعلق جو خبر دی گئی اس میں منع، اباحت اور توقف کا کوئی تقاضا نہیں۔ یہ آیت دلالت اور تنبیہ کے لئے ہے تاکہ اس کے ذریعے اس کی وحدانیت پر استدلال کیا جائے۔ اربابِ معانی نے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَبِیْعًا کے متعلق فرمایا: یہ سب تمہارے لئے پیدا فرمایا ہے تاکہ تم اس کی اطاعت پر قوت حاصل کرو نہ کہ تم اس کی معصیت کی وجہ میں تصرف کرو۔ ابو عثمان نے کہا: تجھے یہ سب کچھ عطا فرمایا اور تیرے لئے مسخر کر دیا تاکہ تم اس کے وجود کی وسعت پر استدلال کرو اور تو سکون

حاصل کر اس سے جو آخرت میں تیرے لئے بڑی بڑی نعمتیں محفوظ کر رکھی ہیں تو اپنے قلیل عمل پر کثیر نیک کامطالبہ نہ کر اس نے تجھے عمل سے پہلے ہی عظیم نعمت دی ہے اور وہ توحید ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** حضرت زید بن اسلم نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کچھ عطا کرنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس کچھ نہیں ہے لیکن تم میرے نام پر مال خرید لو جب مال آئے گا تو ہم ادا کر دیں گے۔ حضرت عمر نے عرض کی: حضور! جو آپ کے پاس ہو وہ دے دیا کریں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا مکلف نہیں بنایا جس پر آپ قادر نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے قول کو ناپسند فرمایا۔ ایک انصاری نے کہا: یا رسول اللہ! انفق ولا تخش من ذی العرش اقلالا (آپ خرچ کریں اور آپ صاحب عرش کی طرف سے کمی کا اندیشہ نہ کریں)۔ انصاری کا یہ جملہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور آپ کے چہرے سے خوشی پہچانی گئی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اسی چیز کا حکم دیا گیا ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: اقلال کا خوف اللہ تعالیٰ کے متعلق سوئے ظن سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور جو کچھ اس میں ہے انسان کے لئے پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا: خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا (جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے) اور فرمایا: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا لِّنُبَيِّنَ الْاٰيٰتِ (اور میں نے مسخر کر دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے)۔ یہ تمام چیزیں انسان کے لئے مسخر کر دیں تاکہ اس کا عذر ختم ہو جائے اور اس پر حجت قائم ہو جائے تاکہ وہ اللہ کا بندہ بن جائے جس طرح اس نے اسے بندہ پیدا کیا ہے جب بندہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھتا ہے تو اسے کمی کا اندیشہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس پر مزید مہربانی فرماتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: وَمَا اَنفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُۥٓ وَهُوَ خَيْرُ الرَّٰزِقِيْنَ ۝ (سبا) (اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو تو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے)۔

اور فرمایا: فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝ (النمل) (بلاشبہ میرا رب غنی بھی ہے) (اور) کریم بھی)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری رحمت میرے غضب سے سہقت لے گئی۔ اے ابن آدم! تو خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا اللہ کا دایاں ہاتھ بھرا ہوا ہے ہمیشہ عطا فرما رہا ہے دن رات کے خرچ نے اس میں کچھ کمی نہیں کی ہے (1) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ایک کہتا ہے: ”اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بہتر بدل عطا فرما اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے: اے اللہ! کنجوس کا مال تلف فرما (2)۔“ اسی طرح سورج کے غروب ہونے کے وقت وہ فرشتے ندا دیتے ہیں۔ یہ صحیح روایت ہے ائمہ حدیث نے روایت کی ہے۔ والحمد لله

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی النفقة وتبشیر المنفق بالخلف، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ بقرہ، باب قوله وكان عرشه على الماء، حدیث نمبر 4316، 6872، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی النفقة وتبشیر المنفق بالخلف، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب قول الله تعالى فاما من اعطى وانفق۔ الخ، حدیث نمبر 1351، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جس شخص کا سینہ روشن ہوا اور اس نے اپنے رب کی غنا، اس کے کم کو جان لیا اس نے خرچ کیا اور کمی کا خوف نہ کیا، اسی طرح جس کی دنیوی خواہشات ختم ہو گئیں اور قوت لایموت سے اپنی روح کے لئے طاقت حاصل کی اور اپنے نفس کی خواہش کو فنا کر دیا تو ایسا شخص خوشحالی اور تنگی میں عطا کرتا ہے اور کمی کا اندیشہ نہیں کرتا، کمی کا خوف تو وہ کرتا ہے جسے اشیاء دنیا میں خواہش ہو جب وہ آج دے گا تو کل اسے ضرورت ہوگی وہ خوف کرتا ہے کہ کل شاید اسے یہ نہ ملے تو اس پر کمی کے خوف کی وجہ سے آج خرچ کرنے میں تنگی محسوس کرتا ہے۔ مسلم نے حضرت اسماء بنت ابی بکر سے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عطا کرو اور انڈیل دو اور خرچ کرو اور شمار نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر شمار کرے گا اور خرچ کرنے میں بغل سے کام نہ لو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی اپنی عطا روک لے گا (1)۔ نسائی نے حضرت عائشہ بنتی نبیہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک دفعہ ایک سائل میرے پاس آیا اور میرے پاس رسول اللہ ﷺ موجود تھے۔ میں نے سائل کے لئے کسی چیز کے دینے کا حکم کیا پھر میں نے اسے بلایا اور اس مال کو دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تو نہیں چاہتی کہ تیرے گھر میں کوئی چیز داخل نہ ہو اور نہ کوئی چیز خارج ہو مگر تجھے اس کا علم ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں میں یہی چاہتی ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! ٹھہرو، شمار نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تجھ پر شمار کرے گا (2)۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اسْتَوَىٰ، ثُمَّ اخْبَارَ کی ترتیب کے لئے ہے نہ کہ فی نفسہ امر کی ترتیب کے لئے ہوتا ہے۔ الاستویٰ کا لغوی معنی، کسی شے پر بلند ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَعَكَ عَلَى الْفُلْكِ (المومنون: 28) (اور پھر جب اچھی طرح بیٹھ جائیں آپ اور آپ کے ساتھی کشتی کے عرشہ پر) اور فرمایا: لِتَسْتَوُوا عَلَى ظُهُورِهِمْ (زخرف: 13) (تاکہ تم جم کر بیٹھو ان کی پیٹھوں پر)۔ شاعر نے کہا:

فادردتهم ماء بقیفاء قفرة و قد حلق النجم الیمانی فاستوی

اس شعر میں استویٰ بھی ارتفع و علا ہے یعنی بلند ہوا۔ استوت الشمس علی راسی، یعنی سورج میرے سر پر چڑھا، داستوت الطیر علی قمة راسی یعنی پرندے میرے سر پر بلند ہوئے۔ یہ آیت مشکلات میں سے ہے یہ آیت اور اس کے مشابہ دوسری آیات کے بارے علماء کے تین نظریات ہیں: بعض علماء نے فرمایا: ہم اس آیت کو پڑھتے ہیں اور ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہم اس کی تفسیر بیان نہیں کرتے اکثر ائمہ کا یہی نظریہ ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسا کہ امام مالک سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے أَلَرَّحْلُنْ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ (ط) کے متعلق سوال کیا تو امام مالک نے فرمایا: الاستویٰ مجہول نہیں ہے اور کیفیت سمجھنے کے قابل نہیں ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے، میں تجھے برا آدمی دیکھتا ہوں، اس کو باہر نکال دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم اس آیت کو پڑھتے ہیں اور اس طرح اس کی تفسیر کرتے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی الانفاق و کراهۃ الاحصاء، صفحہ 331، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب حبة المرأة بغير زوجها و عتقها... الخ، حدیث نمبر 2402، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، صفحہ 254-255، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً کتاب الزکوٰۃ، باب الاحصاء فی الصدقة، حدیث 2501، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



ہیں جس طرح ظاہر لغت احتمال رکھتی ہے یہ مشبہ فرقہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم اس کی تلاوت کرتے ہیں ہم اس کی تاویل کرتے ہیں اور اس کے ظاہر معنی پر اس کے محمل کو پھیرتے ہیں۔ فراء نے **ثُمَّ اسْتَوٰی اِلٰی السَّمَاءِ فَسَوَّيْنٰ** کے متعلق کہا **الاستواء** کلام عرب میں دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ ان یستوی الرجل وینتھی شبابہ وقوتہ۔ او یستوی عن اعوجاج یعنی آدمی بڑا ہوا اور اس کی جوانی اور قوت انتہا کو پہنچی یا نیزگی روش کو چھوڑ کر سیدھا ہو گیا (راہ راست پر آ گیا)۔ یہ دو وجہیں ہیں اور تیسری وجہ یہ ہے کہ تو کہے: کان فلان مقبلاً علی فلان ثم استوی عن والی یشاتسبی۔ (فلاں شمس فلاں کی طرف متوجہ تھا پھر میری طرف متوجہ ہوا اور مجھے گالی دینے لگا)۔ یعنی اس کا معنی ہو گا میری طرف متوجہ ہوا۔ اس آیت **ثُمَّ اسْتَوٰی اِلٰی السَّمَاءِ** میں یہی معنی ہے۔ واللہ اعلم۔ اور فرمایا: حضرت ابن عباس نے فرمایا: **ثُمَّ اسْتَوٰی اِلٰی السَّمَاءِ** کا مطلب ہے: بلند ہوا۔ یہ تیرے اس قول کی مانند ہے: کان قاعداً فاستوی وہ بیٹھا تھا پھر کھڑا ہو گیا۔ کان قائماً فاستوی قاعداً پہلے کھڑا تھا پھر بیٹھ گیا۔ یہ تمام معانی عرب کلام میں جائز ہیں۔

امام بیہقی ابو بکر احمد بن علی بن الحسن نے کہا: **اسْتَوٰی** کا معنی اقبل (متوجہ ہونا) صحیح ہے کیونکہ اقبال کا معنی آسمان کی تخلیق کی طرف قصد کرنا ہے اور قصد سے مراد ارادہ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں جائز ہے اور **ثُمَّ** کا لفظ خلق سے تعلق کے لئے ہے نہ کہ ارادہ کے لئے۔ اور ربی وہ بات جو اس نے حضرت ابن عباس سے حکایت کی ہے وہ انہوں نے کبھی کی تفسیر سے لی ہے اور کبھی ضعیف ہے۔ سفیان بن عیینہ اور ابن کیسان نے **ثُمَّ اسْتَوٰی اِلٰی السَّمَاءِ** کے متعلق فرمایا: قصد الیہا یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان کی تخلیق کا ارادہ فرمایا۔ یہ ایک قول ہے، بعض علماء نے فرمایا: یہ بغیر تکلیف اور تحدید کے ہے۔ طبری نے اس قول کو اختیار کیا۔ ابو العالیہ الریاحی سے اس آیت کے متعلق روایت کیا جاتا ہے کہ کہا جاتا ہے: **اسْتَوٰی** بمعنی ارتفع ہے (بلند ہوا)۔ بیہقی نے کہا: اس سے مراد اس کے امر کا بلند ہونا ہے وہ پانی کے بخارات ہیں جن سے آسمان کی تخلیق واقع ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: **المستوی** چڑھنے والا دھواں تھا۔

ابن عطیہ نے کہا: کلام کا وصف اس قول کا انکار کرتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: **اسْتَوٰی** کا معنی استوی (غالب آنا) ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

قد استوی بشرٌ علی العراق من غیر سیف ودم مہراق (1)

بشر عراق پر غالب آیا بغیر تلوار کے اور بغیر خون بہائے۔

ابن عطیہ نے کہا: **الزَّحْنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی** (ط) میں یہ معنی مراد ہے (2)، میں کہتا ہوں: فراء کے قول میں پہلے گزر چکا ہے کہ علی اور ان ایک معنی میں ہیں۔ اس کے متعلق مزید معلومات سورۃ اعراف میں آئیں گی ان شاء اللہ۔ اور اس آیت اور اس جیسی دوسری آیات میں قاعدہ نقل و حرکت نہ کرنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پہلے زمین کی تخلیق فرمائی۔ اسی طرح حم السجدہ

سورت میں ہے اور سورہ النازعات میں فرمایا: **ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمَ السَّمَاءُ - بَنَاهَا** (کیا تمہیں پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان کا اس نے اسے بنایا)۔ اس میں آسمان کی تخلیق کا وصف بیان فرمایا اور اس کے بعد فرمایا: **وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا** (النازعات) (اور زمین کو بعد ازاں بچھا دیا)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے گویا آسمان کو زمین سے پہلے تخلیق فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (انعام: 1)** (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمینوں کو)۔ یہ قنادہ کا قول ہے کہ آسمان پہلے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کو طبری نے قنادہ سے روایت کیا ہے مجاہد وغیرہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس پانی کو خشک کیا جس پر اس کا عرش تھا اور اسے زمین بنا دیا اس میں دھواں اٹھا اور بلند ہوا تو اس سے آسمان بنا دیا۔ پس زمین کی تخلیق آسمان کی تخلیق سے پہلے ہوئی پھر اس کے امر نے آسمانوں کا قصد کیا اور انہیں سات آسمان بنایا پھر اس کے بعد زمین کو پھیلا یا۔ جب پہلے پیدا فرمایا تھا تو یہ پھیلی ہوئی نہ تھی۔

میں کہتا ہوں: قنادہ کا قول صحیح وجہ پر نکلے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمان کا دھواں پیدا فرمایا پھر زمین کو پیدا فرمایا پھر آسمان کی طرف قصد کیا وہ دھواں تھا اسے سات آسمان بنایا، پھر اس کے بعد زمین کو پھیلا یا، جو چیز دلیل ہے کہ دھویں کو زمین سے پہلے تخلیق کیا گیا وہ وہ روایت ہے جو سدی نے ابی مالک سے اور ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے مرہ البہدانی سے انہوں نے حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے اور بہت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے اس ارشاد کے بارے روایت کی ہے: **هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ**۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور پانی سے پہلے اس نے کوئی چیز پیدا نہ کی۔ جب اس نے مخلوق کو پیدا کرنے کا قصد کیا تو پانی سے دھواں نکالا۔ پس وہ دھواں پانی پر بلند ہوا اور اوپر ہو گیا، اس کا نام سماء رکھا پھر پانی کو خشک کیا اور اس سے ایک زمین بنا دی پھر اسے پہاڑ اور دو دنوں میں (یعنی) اتوار اور سوموار میں انہیں سات زمینیں بنایا، پھر زمین کو مچھلی پر رکھا۔ الحوت سے مراد النون (مچھلی) ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں کیا: **ن وَالْقَلَمِ (ن: 1)** مچھلی پانی میں ایک چٹان پر تھی اور وہ چٹان ایک فرشتے کی پیٹھ پر تھی اور وہ فرشتہ ایک چٹان پر تھا اور وہ چٹان ہوا میں تھی، یہ وہ (چٹان) ہے جس کا ذکر حضرت لقمان نے کیا لیست فی السماء ولا فی الارض ..... پھر مچھلی نے حرکت کی تو زمین لرزنے لگی پھر اس پر پہاڑوں کو رکھا تو وہ قرار پائی، پہاڑ زمین پر فخر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَالَّذِي فِي الْاَرْضِ رَءٰى اَنْ تُبَدِّلَہُمْ (لقمان: 10)** (اور اللہ تعالیٰ نے گاڑ دیئے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تاکہ زمین لرزتی نہ رہے تمہارے ساتھ)۔ یعنی زمین میں پہاڑ پیدا کئے اور زمین والوں کی خوراک اور درخت اور جو کچھ زمین کے لئے مناسب تھا دو دنوں میں یعنی منگل اور بدھ کو پیدا فرمایا۔ یہ جب فرمایا: **قُلْ اٰیٰتُکُمْ** **لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِي خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنٍ وَتَجْعَلُوْنَ لَہٗ اٰنْدَادًا - ذٰلِکَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ** (فصلت) آپ (ان سے) پوچھے کیا تم فوقہا و برون فیہا و قد رافیہا اقواتہا فی اربعۃ ایاام - سو آء للسا یلمن (فصلت) آپ (ان سے) پوچھے کیا تم

لوگ انکار کرتے ہو اس ذات کا جس نے پیدا فرمایا زمین کو دو دن میں اور ٹھہراتے ہو اس کے لئے مد مقابل وہ تورب الہامین ہے (اس کا مد مقابل کون ہو سکتا ہے) اور اس نے (ہی) بنائے ہیں زمین میں کھڑے ہوئے پہاڑ اور جو اس کے اوپر (اٹھے ہوئے) ہیں اور اس نے بڑی برکتیں رکھی ہیں اس میں اور اندازے سے مقرر کردی ہیں اس میں غذائیں (ہر نوع کے لئے) چار دنوں میں (ان کا حصول) یکساں ہے طلبگاروں کے لئے۔

جو یہ پوچھے تو معاملہ اسی طرح ہے ثُمَّ اسْتَوٰی اِلٰی السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ (فصلت: 11) پھر اس نے توجہ فرمائی آسمان کی طرف وہ اس وقت محض دھواں تھا یہ دھواں پانی کے بخارات سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک آسمان بنایا پھر اسے پہاڑ اور دو دنوں میں یعنی تیس اور جمعہ کے روز سات آسمان بنائے۔ جمعہ کو جمعہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق جمع ہوئی۔ اَوْ لٰمِیْ فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرًا (فصلت: 12) فرمایا: ہر آسمان میں اس کی مخلوق پیدا فرمائی یعنی فرشتے اور سمندر اولوں کے پہاڑ اور دوسری چیزیں جن کا علم نہیں وہ پیدا فرمایا۔ پھر آسمان دنیا کو ستاروں سے مزین فرمایا اور ان ستاروں کو زینت بنایا اور شیطانوں سے حفاظت کا باعث بنایا جب اس تخلیق کو مکمل فرمایا جو پسند تھی تو عرش پر استواء فرمایا۔ یہ مراد ہے جب فرمایا: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (حدید: 4) (پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں)۔

فرمایا کَاٰتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء: 30) (آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے الگ الگ کر دیا انہیں) حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق میں یہ سارا واقعہ ذکر فرمایا جیسا کہ ان شاء اللہ اسی سورت میں اس کا بیان آئے گا۔ وکیع نے اعمش سے انہوں نے ابو ظبیان سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا پھر اسے فرمایا: تو لکھ۔ قلم نے پوچھا: یا رب! کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تقدیر لکھ۔ پس وہ سب کچھ جاری ہو گیا جو اس دن سے قیامت تک ہوتا تھا۔ فرمایا: پھر مچھلی کو پیدا فرمایا اس پر زمین کو پھیلایا، پانی کے بخارات اٹھے، اس سے آسمان بنے مچھلی نے حرکت کی تو زمین پھیل گئی۔ اس پر پہاڑ پیدا کئے گئے، پہاڑ قیامت تک زمین پر فخر کرتے رہیں گے (1) اس روایت میں زمین کی تخلیق پانی کے بخار کے بلند ہونے سے پہلے ہے جو بخار دھواں تھا، یہ پہلی روایت کے خلاف ہے اور پہلی روایت اس روایت سے اور دوسری روایات سے اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰیہَا (النارعات) (اور زمین کو بعد ازاں بچھا دیا)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو اس نے کیا۔ اس کے متعلق اقوال مختلف ہیں اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔

ابونعیم نے حضرت کعب الاحبار سے ذکر کیا ہے کہ ابلیس اس مچھلی کے اندر داخل ہو جس کی پیٹھ پر ساری زمین تھی۔ اس نے اس کے دل میں دوسو سو ڈالا۔ اس نے کہا: اے لوشیا! کیا تو جانتی ہے جو تیری پیٹھ پر تو میں، درخت، جانور، لوگ اور پہاڑ ہیں اگر تو ان کو جھاڑ دے تو تو انہیں اپنی پیٹھ سے نیچے پھینک دے گی۔ حضرت کعب نے کہا: لوشیا (مچھلی) نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک جانور بھیجا جو اس مچھلی کے نتھنے میں داخل ہو گیا، مچھلی نے اس سے نجات کے لئے اللہ کی بارگاہ میں التجا



کی تو وہ جانور نکل گیا، حضرت کعب نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! وہ پھلی سامنے اس کو دیکھ رہی تھی اور وہ اسے دیکھ رہا تھا اگر وہ کوئی ارادہ کرتی تو وہ جانور پھر اس کے ناک میں داخل ہو جاتا۔

**مسئلہ نمبر 7:** تمام اشیاء کی تخلیق کی اصل پانی سے ہے کیونکہ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور ابو حاتم البستی نے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب میں آپ کو دیکھتا ہوں تو میرا نفس خوش ہوتا ہے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں مجھے ہر چیز کے متعلق بتائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر چیز پانی سے تخلیق کی گئی ہے۔ میں نے کہا: حضور ﷺ! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جب میں اسے کروں تو جنت میں داخل ہو جاؤں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کھانا کھلاؤ، سلام کو پھیلاؤ، صلہ رحمی کرو، رات کو قیام کرو جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے (1)۔ ابو حاتم نے کہا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول مجھے ہر چیز کے بارے میں خبر دیتے ہیں۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو پانی سے پیدا کی گئی تھی، اس کی صحت پر دلیل مصطفیٰ علیہ السلام کا جواب ہے۔ آپ نے فرمایا: کل شیء خلق من الماء۔ (ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے اگرچہ وہ ابھی مخلوق نہ تھی)۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، وہ بیان فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے پہلے جس چیز کو اللہ نے پیدا فرمایا وہ قلم تھا پھر اسے حکم دیا تو اس نے وہ سب کچھ لکھا جو ہونا تھا (2)۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے بھی یہ حدیث مرفوع مروی ہے۔

امام بیہقی نے کہا: یہاں پہلی چیز جو اس نے پیدا کی، سے مراد پانی اور ہوا ہے اور عرش کے بعد پہلی چیز جو پیدا کی وہ قلم تھا۔ یہ مفہوم حضرت عمران بن حصین کی حدیث میں واضح ہے۔ پھر آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا (3)۔ عبدالرزاق بن عمر بن حبیب البکلی نے حمید بن قیس الاعرج سے انہوں نے طاؤس سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے پاس آیا اور پوچھا: یہ مخلوق کس سے پیدا کی گئی؟ حضرت عبداللہ نے کہا: پانی، نور، ظلمت، ہوا اور مٹی سے۔ اس شخص نے کہا: یہ چیزیں کس سے پیدا کی گئیں۔ حضرت عبداللہ نے کہا: میں نہیں جانتا۔ پھر وہ شخص حضرت عبداللہ بن زبیر کے پاس آیا۔ ان سے یہی سوال کیا انہوں نے بھی حضرت عبداللہ بن عمرو کے قول کی مثل جواب دیا۔ پھر وہ شخص حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس آیا ان سے یہی سوال کیا۔ کہا: یہ مخلوق کس چیز سے پیدا ہوئی ہے؟ حضرت ابن عباس نے کہا: پانی، نور، ظلمت، ہوا اور تاریکی سے۔ اس شخص نے پوچھا: یہ چیزیں کس سے پیدا ہوئی ہیں، تو حضرت عبداللہ بن عباس نے یہ آیت تلاوت کی: وَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا قَوْلَهُ (الجماعہ: 13) (اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے اس نے سخر کر دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے)۔ اس شخص نے کہا یہ جواب تو صرف نبی کریم ﷺ

1۔ سنن ابن ماجہ، ج 1، صفحہ 95، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔

ایضاً، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیہا، باب ماجاء فی قیام الدلیل، حدیث 1323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن الکبریٰ للبیہقی، ج 3، جلد 9 (دار الفکر)۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 3241، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب دکان عرشہ علی الماء، حدیث نمبر 6868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے گھرانے کا فرد ہی دے سکتا ہے۔ امام بیہقی نے فرمایا تمام چیزوں کا مصدر اس سے ہے یعنی اس کی تخلیق، ایجاد اور اختراع سے ہے، اس نے پہلے پانی کو پیدا فرمایا یا پانی اور اس سے اس چیز کو پیدا کیا جس کو اس نے پیدا کرنا چاہا، نہ تو یہ کسی اصل سے ہیں نہ کسی سابق مثال سے ہیں پھر بعد میں جو اس نے پیدا کیا اس کی اصل بنائی، حقیقی پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں جس کے علاوہ کوئی خالق نہیں اس کی ذات ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسَوَّيْنَاهُمْ سَبْعَ سَوَاتٍ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا کہ آسمان سات ہیں اور زمین کے لئے کوئی صریح عدد قرآن میں ایسا نہیں آیا جو تاویل کا احتمال نہ رکھتا ہو سوائے اس ارشاد کے وَ مِنْ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ (الطلاق: 12) (اور زمین کو بھی انہی کی مانند) اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَ مِنْ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ یعنی زمین میں سے تعداد میں اس کی مثل ہیں کیونکہ کیفیت اور صفت میں تو مشاہدہ اور اخبار سے معلوم ہے کہ یہ مختلف ہیں۔ پس تعداد کے اعتبار سے ہم مثل ہونا متعین ہو گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: مِثْلَهُنَّ میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس میں ہم مثل ہونا مراد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: زمینیں بھی سات ہیں لیکن یہ ایک دوسرے سے بنائی گئی ہیں، یہ داؤدی کا قول ہے: پہلا قول ہی صحیح ہے زمینیں، آسمانوں کی طرح سات ہیں۔ مسلم نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے جس نے ایک بالشت کسی کی زمین ظلماً لے لی اسے سات زمینوں تک اس کا طوق پہنایا جائے گا (2)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح مروی ہے لیکن اس میں الی کی جگہ من ہے یعنی سات زمینوں سے اس کو طوق پہنایا جائے گا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کوئی شخص ناحق کسی کی ایک بالشت زمین نہیں لے گا مگر اللہ تعالیٰ اسے (قیامت کے روز) سات زمینوں تک طوق پہنائے گا (3)۔

نسائی نے حضرت ابو سعید خدری سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یا رب! مجھے کوئی ایسی چیز سکھا جس کے ساتھ میں تجھے یاد کروں اور تجھ سے اس کے ذریعے دعا مانگوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! تو کہہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یا رب! یہ تو تیرا ہر بندہ کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو کہہ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ موسیٰ علیہ السلام نے کہا لا الہ الا انت، میں ایسی چیز چاہتا ہوں جس کے ساتھ تو مجھے خاص کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور ان کو آباد کرنے والے میرے سوا اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں ہوں اور لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دوسرے پلڑے میں ہو، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ والا پلڑا دوسرے پلڑے سے بھاری ہو جائے گا۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام بیٹھے تھے کہ ان پر ایک بادل

1۔ مستدرک حاکم، کتاب التفسیر، باب سورۃ حم الجاثیہ

2۔ صحیح مسلم، کتاب المسافاة والمزارعة، باب تحریم الظلم وغصب الارض وغیرہا، صفحہ 33، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً، صحیح بخاری، کتاب ہدء الخلق، باب ما جاء فی سبع ارضین، حدیث نمبر 2959، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب المسافاة والمزارعة، باب تحریم الظلم وغصب الارض وغیرہا، صفحہ 33، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً، صحیح بخاری، کتاب المظالم والغصب، باب ثم من ظلم شیء من الارض، حدیث نمبر 2273، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بادل ہے یہ زمین سیراب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ایسی قوم کی طرف بھیجتا ہے جو شکر نہیں کرتی اور دعا نہیں مانگتی۔ فرمایا: کیا تم جانتے ہو تمہارے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: رفع آسمان ہے (یہ) محفوظ چھت ہے اور روکی گئی موج ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو تمہارے اور اس آسمان کے درمیان کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: تمہارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ پھر فرمایا: اسی طرح (کی مسافت ہے) حتیٰ کہ سات آسمانوں کو شمار کیا ہر دو آسمانوں کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی آسمان اور زمین کے درمیان مسافت ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو آسمانوں کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: اس کے اوپر عرش ہے آسمانوں اور عرش کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی کہ دو آسمانوں کے درمیان ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ زمین ہے پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو اس کے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: اس زمین کے نیچے دوسری زمین ہے۔ ان دونوں زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے حتیٰ کہ آپ نے سات زمینیں شمار کیں ہر دو زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ پھر فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! اگر تم نخلی زمین کی طرف رسی لٹکاؤ تو وہ اللہ (کے علم) پر گرے گی۔ پھر یہ آیت پڑھی: **هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ** (المحید) (وہی اول، وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے) (1)۔

ابو عیسیٰ نے کہا: رسول اللہ ﷺ کا اس آیت کو تلاوت کرنا اس بات پر دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے یہ مراد لیا کہ وہ رسی اللہ تعالیٰ کے علم، اس کی قدرت اور سلطنت پر گرے گی۔ اللہ تعالیٰ کا علم، اس کی قدرت اور اس کی سلطنت ہر جگہ ہے جبکہ وہ عرش پر ہے جیسا کہ اس نے خود اپنی کتاب میں اپنا وصف بیان کیا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت حسن (بصری) نے حضرت ابو ہریرہ سے (حدیث) نہیں سنی اور ان آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ زمینیں سات ہیں اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ کافی ہے۔ ابوالضحیٰ..... اس کا نام مسلم ہے..... نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: **اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ (الطلاق: 12)** سات زمینیں ہیں ہر زمین میں ایک نبی ہے جیسے تمہارے نبی ہیں آدم کی طرح، نوح کی طرح، ابراہیم کی طرح، عیسیٰ کی طرح، عیسیٰ نے یہ بتائی کہ اس کی سند حضرت ابن عباس سے صحیح ہے یہ مرہ کی وجہ سے شاذ ہے۔ میں ابوالضحیٰ کے لئے اس پر کوئی متابع نہیں جانتا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ** یہ مبتدا خبر ہیں۔ مآ محل نصب میں ہے

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر عن رسول اللہ ﷺ، باب سورۃ المحید، صفحہ 162، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ایضاً، کتاب فضائل القرآن، باب من سورۃ المحید، حدیث نمبر 3220، غیاء القرآن پبلی کیشنز



جَمِيعًا سَبَوِيَّہ کے نزدیک یہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰی اہل نجد اس میں امالہ کرتے ہیں تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ یاء والے الفاظ میں سے ہے اور اہل حجاز تفخیم کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ سَبَوٰیہ ہن ضمیر سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی فسوی سبع سموت۔ اور مفعول بھی ہو سکتا ہے اس تقدیر پر یسوی بینہن سبع سموات، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اخْتَارَ مُوسٰی قَوْمَهُ سَبْعَیْنَ رَجُلًا (الاعراف: 155) اصل میں مِنْ قَوْمِهِ تھا۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ اخفش نے کہا: حال کی بنا پر (سبع) منصوب ہے۔ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ یہ مبتدا خبر ہیں (ہو) میں اصل ہا کی حرکت ہے اور اسکان تخفیف کی بنا پر ہے۔

السَّمَاء۔ واحد مونث استعمال ہوتا ہے جیسے عنان ہے اس کا مذکر ہونا شاذ ہے اور کبھی السماء، سماء کی جمع ہوتا ہے یہ اخفش کے قول کے مطابق ہے اور زجاج کے قول میں یہ سماء لگی جمع ہے اور جمع الجمع سموات، سماءات ہے۔ سواہن بھی آیا یا تو اس لئے کہ السماء جمع ہے یا اس لئے کہ مفرد اسم جنس ہے سواہن کا معنی ہوگا: ان کی سطحوں کو ہموار کرنے کے ساتھ برابر کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: انہیں برابر کیا۔

**مسئلہ نمبر 10:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ جو اس نے پیدا کیا اسے جاننے والا ہے، وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ پس ثابت ہوا کہ وہ ہر چیز کا عالم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (الملک: 14) ((نادانو)) کیا وہ نہیں جانتا (بندوں کے احوال کو) جس نے (انہیں) پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ عالم ہے اور اپنے قدیم ازلی علم کے ساتھ تمام معلومات کو جاننے والا ہے وہ یکتا ہے قائم بذاتہ ہے۔ معتزلہ عالمیت میں ہمارے ساتھ موافقت کرتے ہیں علمیت میں موافقت نہیں کرتے۔ جہم فریقہ کا نظریہ ہے کہ وہ جاننے والا ہے علم سے قائم ہے مگر کسی محل میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ گمراہوں کے قول سے بلند و بالا ہے۔ ان لوگوں کا رد دیانات کی کتب میں ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف علم کے ساتھ بیان فرمایا: اَنْزَلْنٰهُ بِعِلْمِهِۦ وَالْمَلٰٓئِکَةُ یُشْہَدُوْنَ (النساء: 166) (اس نے اسے اتارا ہے اپنے علم سے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں)۔ اور فرمایا: فَاَعْلَمُوْۤا اَنَّہٗ اَنْزَلَ بِعِلْمِ اللّٰہِ (ہود: 14) (پھر جان لو کہ یہ قرآن محض علم الہی سے اتارا گیا ہے) اور فرمایا: فَلْتَقْصِّنَّ عَلَیْہِمْ بِعِلْمِ (اعراف: 7) (پھر ہم ضرور بیان کریں گے (ان کے حالات) ان پر اپنے علم سے) اور فرمایا: وَمَا تَحِیْلُ مِنْ اَنْفِیْ وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہِ (فاطر: 11) (اور نہ ہی حاملہ ہوتی کوئی عورت اور نہ بچہ جنمتی ہے) اور فرمایا: وَ عِنْدَکَ مَفَاتِیْحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُہَا اِلَّا هُوَ (الانعام: 59) (اور اسی کے پاس ہیں کنجیاں غیب کی مگر اس کو اس کا علم ہوتا ہے نہیں جانتا سوائے اس کے)۔ ہم اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی تمام صفات کے ثبوت پر اسی سورت میں یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمْ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (البقرہ: 185) کے تحت استدلال کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کسائی اور قالون نے نافع سے (ہو اور ہی) کو ہا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے جب ان سے پہلے فاء، واو، لام یا ثم ہو۔ اسی طرح ابو عمرو نے کہا ہے مگر ثم کے ساتھ اس طرح نہیں پڑھا۔ ابو عون نے حلوانی سے انہوں نے قالون سے یہ زائد نقل کیا ہے انہوں نے ان یصل ہو میں ہا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے حرکت کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنۢ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۗ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾

”اور یاد کرو جب فرمایا تمہارے رب نے فرشتوں سے میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب۔ کہنے لگے: کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں اور خونریزیاں کرے گا حالانکہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ اور پاکی بیان کرتے ہیں تیرے لئے۔ فرمایا: بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً اس میں سترہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ، إِذْ اور اذ دونوں حرف توقیت ہیں إِذْ ماضی کے لئے ہے اور اذ مستقبل کے لئے ہے کبھی یہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ البرد نے کہا: إِذْ جب مضارع کے ساتھ آئے تو اس کا معنی ماضی ہوتا ہے جیسے: وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ (الانفال: 30) (واذ تقول للذي انعم الله عليه) اس کا معنی اذ مکروا ہے اور واذ قلت ہے یعنی مضارع کو ماضی کے معنی میں کر دیتا ہے اور جب اذ ماضی پر داخل ہو تو اسے مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ (النازعات: 34) فَإِذَا جَاءَتِ الصَّآخَةُ ﴿٣٥﴾ (عبس) إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ (نصر: 1) ان سب میں جَاءَ بمعنی بجایی ہو جائے گا۔ معمر بن المثنیٰ ابو عبیدہ نے کہا: إِذْ زائدہ ہے تقدیر یہ ہے وقال ربك۔ اور اس نے اسود بن یعفر کے قول سے استشہاد کیا ہے۔

فَإِذَا وَ ذَالِكَ لَا مَهَاءَ لَذِكْرِهِ وَالْدَّهْرُ يَعْقِبُ صَالِحًا بَفْسَادِهِ

اس قول کا زجاج، نحاس اور تمام مفسرین نے انکار کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ غلطی ہے کیونکہ (إِذْ) اسم ہے اور یہ ظرف زمان ہے یہ ایسے حروف میں سے نہیں ہے جو زائد کئے جاتے ہیں۔ الزجاج نے کہا: یہ ابو عبیدہ کی طرف سے ایک جرم ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں اور دوسری چیز کی تخلیق کا ذکر فرمایا ہے۔ تقدیریوں نے: وَأَبْتَدَأَ خَلْقَكُم اذ قال۔ تمہاری تخلیق کا آغاز کیا جب اس نے کہا۔ پس یہ اس محذوف سے ہے جس پر کلام دلالت کرتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

فَانِ الْمَنِيَّةَ مِنْ يَخْشَاهَا فَسُوفَ تَصَادِفُهُ اَيْنَمَا

موت اس کے لئے بھی ہے جو موت سے ڈرتا ہے موت اسے ملے گی جہاں بھی چلا جائے گا۔

اس شعر میں اینما کے بعد ذہب محذوف ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ (اذ) فعل مقدر کے متعلق ہو۔ تقدیر اس طرح ہو: اذ کہ اذ قال۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ (البقرہ: 21) کی طرف لوٹایا گیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ جس نے تمہیں پیدا کیا جب

تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اور خطاب فرشتوں کے لئے ثابت ہے اور ازل سے ہے اس شرط کے ساتھ کہ ان کا وجود بھی ہو اور ان کی سمجھ بھی ہو، یہ مسئلہ تمام اللہ کے اوامر، نواہی اور مخاطبات میں ہے۔ یہ شیخ ابوالحسن اشعری کا قول ہے۔ اس کو ابوالمعالی نے پسند کیا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی و صفات اللہ العلی میں اس کا ذکر کیا ہے۔

رب مالک، سردار، مصلح اور جابر کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کا بیان گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد لِلْمَلٰٓئِكَةِ اس کا واحد ملک ہے۔ ابن کیسان وغیرہ نے کہا: مَلٰٓئِكٌ بروزن فَعَلَ یہ الملک سے مشتق ہے۔ ابو عبید نے کہا: یہ مفعول کے وزن پر لَآئِکٌ سے مشتق ہے جس کا معنی بھیجنا ہے۔ اللوکیۃ، المالکۃ، المائلۃ ان کا معنی پیغام رسانی ہے۔ لبید نے کہا:

و غلام ارسلته أمه  
بالون فبذلنا ما سأل  
ابدغ النعمان عني مألکاً  
انني قد طال حبسني و انتظاری

لڑکے کو اس کی ماں نے پیغام دے کر بھیجا تو ہم نے وہ سب خرچ کیا جو اس نے مانگا۔ کہا جاتا ہے: یہ کہا جاتا ہے: اَلِکُنِ یعنی مجھے بھیج۔ اس بنا پر اس کی اصل مَالِکٌ ہوگی ہمزہ فعل کا فاعل ہے پھر لوگوں نے اسے عین کلمہ سے قلب کر دیا اور مَلٰٓئِکٌ پھر تسہیل کی اور کہا: مَلٰٓئِکٌ۔ بعض علماء نے کہا: اس کی اصل مَلٰٓئِکٌ ہے اور یہ ملک یملک سے مشتق ہے جسے شِئَال، شِئَل سے مشتق ہے ہمزہ زائدہ ہے۔ یہ ابن کیسان سے بھی مروی ہے شعر میں اصل پر آیا ہے۔ شاعر نے کہا:

فلست لإنس ولكن لملائک  
تنزل من جو السماء یصوب  
توانسان نہیں بلکہ فرشتہ ہے جو آسمان کی فضا سے اترتا ہے جو بارش برساتا ہے۔

نضر بن شمیل نے کہا: عربوں کے ہاں الملک کا اشتقاق نہیں ہے۔ الملائکۃ میں ہا جمع کی تانیث کی تاکید ہے، اس کی مثل صلا دمہ ہے اور الصلا دمہ ہے (سخت گھوڑے) اس کا واحد صلد مہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مبالغہ کے لئے ہے جیسے علامہ اور نسابہ کے آخر میں مبالغہ کے لئے ہے۔ ارباب معانی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو خطاب فرمایا یہ مشورہ کے لئے نہیں تھا بلکہ ان میں جو حرکات، عبادت، تسبیح اور تقدیس کی رویت موجود تھی اس کا ظاہر کرنا تھا۔ پھر فرشتوں کو انسانوں کا جو قیم (باپ) تھا اس کی طرف لوٹایا اور فرمایا: اسْجُدُوا لِآدَمَ (اعراف: 11) (آدم کے لئے سجدہ کرو)

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً یہاں جَاعِلٌ بمعنی خالق ہے یعنی میں پیدا کرنے والا ہوں۔ طبری نے یہ ابوروق سے بیان کیا ہے اسی وجہ سے یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ الاَرْضُ سے مراد بعض علماء نے فرمایا: مکہ ہے۔ ابن سابط نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: زمین مکہ سے پھیلائی گئی اسی وجہ سے مکہ کو ام القریٰ کہا جاتا ہے۔ فرمایا: حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہم السلام کی قبور زمزم، رکن اور مقام کے درمیان ہیں اور خَلِیْفَۃً کبھی فاعل کے معنی میں ہوتا ہے یعنی جو



زمین میں ان سے پہلے فرشتوں میں تھے ان کے پیچھے آنے والا ہے، جیسا کہ مروی ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خلیفہ مفعول کے معنی میں ہو یعنی پیچھے لایا گیا، جیسے ذبیحہ بمعنی مفعولہ (مذبحہ) استعمال ہوتا ہے۔ الخلف لام کے فتح کے ساتھ ہو تو نیکو کاروں میں سے جو پیچھے آئے اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو بروں میں سے جو پیچھے آئے، یہ معروف ہے۔ مزید بیان ان شاء اللہ سورہ اعراف میں آئے گا۔

خَلِيفَةُ قَاء کے ساتھ اکثر قراء کی قراءت ہے مگر حضرت زید بن علی سے مروی ہے کہ اس نے خلیفہ قاف کے ساتھ پڑھا ہے، یہاں خلیفہ سے مراد حضرات ابن مسعود، ابن عباس اور تمام اہل تاویل کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام ہیں وہی اللہ تعالیٰ کے احکام اور اوامر نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں کیونکہ وہی زمین کی طرف پہلے رسول ہیں جیسا کہ حضرت ابوذر کی حدیث میں ہے، انہوں نے کہا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! سَلِّمْ عَلَیْہِمْ کیا آدم علیہ السلام نبی مرسل تھے؟ آپ سَلِّمْ عَلَیْہِمْ نے فرمایا: ہاں۔ اور کہا جاتا ہے وہ کس کے لئے رسول تھے جبکہ زمین میں کوئی شخص تھا ہی نہیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی طرف رسول تھے، آپ کی اولاد چالیس تھے جو بیس بطنوں میں پیدا ہوئے تھے، ہر بطن میں جوڑا جوڑا پیدا ہوا، پھر ان کے بچے پیدا ہوئے حتیٰ کہ بہت سے لوگ ہو گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **خَلَقْنَا مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ خَلْقًا وَجْهًا وَ بَنَتْ مِنْهُمْ سَبْعًا لَاحِظًا وَنِسَاءً (النساء: 1)** (پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا اور ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں (کثیر تعداد میں))

ان پر اللہ تعالیٰ نے مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کی تحریم نازل کی تھی اور آدم علیہ السلام نو سو تیس سال زندہ رہے تھے۔ اہل تورات نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ حضرت وہب بن منبہ سے مروی ہے کہ وہ ہزار سال زندہ رہے تھے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4:** یہ آیت امام اور خلیفہ قائم کرنے میں اصل ہے ایسا خلیفہ اور امام جس کی بات سنی جائے اور اس کی اطاعت کی جائے تاکہ اس کے ساتھ کلمہ مجتمع رہے اور اس کے ساتھ خلیفہ کے احکام نافذ ہوں۔ امام اور خلیفہ کے وجوب کے متعلق امت کے ائمہ کا کوئی اختلاف نہیں مگر وہ قول جو اہم (بہرہ) سے مروی ہے یہ شریعت سے بھی اہم (بہرہ) تھا۔ اسی طرح ہر وہ شخص جس نے اہم جیسا قول کیا اور اس کی رائے اور اس کے مذہب کی پیروی کی وہ شریعت میں (بہرہ) ہے۔ اہم کا قول ہے کہ دین میں خلیفہ واجب نہیں ہے بلکہ جائز ہے، جبکہ لوگ اپنا حج اور جہاد قائم کرتے ہوں، اپنے آپ میں انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوں اور حق کو اپنی طرف سے ادا کرتے ہوں، مال غنیمت، مال فے اور صدقات وغیرہ ان کے اہل اور مستحق لوگوں میں تقسیم کرتے ہوں اور جن لوگوں پر حدود واجب ہوں ان پر حدود جاری کرتے ہوں تو یہ ان کے لئے کافی ہے ان پر امام متعین کرنا واجب نہیں ہے جو ان تمام امور کا والی ہو۔ ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب)۔** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ (ص: 26)** (اے داؤد ہم نے مقرر کیا ہے آپ کو نائب زمین میں) اور فرمایا: **وَعَدَا اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (النور: 55)** (وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں

سے اور نیک عمل کئے کہ وہ ضرور خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں)۔ یہ تمام آیات اور ان کے علاوہ آیات ہمارے دلائل ہیں۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں مہاجرین و انصار کے درمیان خلیفہ کے تعیین میں اختلاف واقع ہونے کے بعد سیدنا صدیق اکبر کی تقدیم پر صحابہ کا اجماع ہوا حتیٰ کہ انصار نے کہا: ایک امیر ہمارا ہوگا ایک امیر تمہارا ہوگا، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر اور مہاجرین نے ان کی طرف سے یہ قول قبول نہ کیا۔ مہاجرین نے انہیں کہا: عرب صرف قریش میں سے صرف اس قبیلہ کی پیروی و اطاعت کریں گے اور مہاجرین نے انصار کے لئے حدیث بھی روایت کی، تو انصار نے اپنے قول سے رجوع کر لیا اور قریش کی اطاعت کی۔ اگر امامت کا فریضہ واجب نہ ہوتا نہ قریش میں نہ کسی دوسرے قبیلہ میں تو یہ مناسرہ اور تلخ گفتگو جائز نہ ہوتی، اور کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ خلافت کا امر واجب نہیں ہے نہ قریش میں اور نہ کسی دوسرے قبیلہ میں، تمہارے جھگڑنے کی کیا وجہ ہے؟ اس امر میں لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں جو واجب نہیں ہے، پھر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے وصال کا وقت قریب ہوا تو انہوں نے حضرت عمر کو امامت کا عہدہ دیا۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ امر ہم پر اور تم پر واجب نہیں ہے۔ پس یہ خلافت کے وجوب کا دلیل ہے اور یہ دین کے ارکان میں سے ایک رکن ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کا قوام اور اجتماع ہے۔

رافضیوں نے کہا: خلیفہ کا قائم کرنا عقلاً واجب ہے اور نقلی دلائل، عقلی تقاضا کی تاکید کی بنا پر وارد ہیں اور رہی امام کی معرفت یہ نقل کی جہت سے پائی گئی ہے نہ کہ عقل کے تقاضا سے۔ یہ قول فاسد ہے کیونکہ عقل نہ کسی چیز کو ثابت کر سکتی ہے نہ منع کر سکتی ہے نہ اسے برا کہہ سکتی ہے۔ اس کی تحسین کر سکتی ہے، جب معاملہ اس طرح ہے تو ثابت ہوا کہ یہ شرع کی طرف سے واجب ہے نہ کہ عقل کی جہت سے۔ یہ واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** جب یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ امامت کے وجوب کا طریق نقلی دلائل ہیں تو ہمیں بتاؤ کہ امام کی معرفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جہت سے نصوص کے ذریعے واجب ہے یا اہل حل و عقد کے اختیار کی طرف سے ہے یا اس شخص میں ائمہ کے خصال کے کمال کی وجہ سے ہے اور اس کا اپنی طرف سے دعویٰ کرنا کافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ امامیہ وغیرہ کا نظریہ یہ ہے کہ امام کی معرفت کا راستہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نص ہے، اس میں اختیار کا کوئی دخل نہیں، اور ہمارے نزدیک امام کی معرفت کا طریق غور و فکر اور اہل اجتہاد کا اجماع بھی اس کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ امام کی معرفت کا ذریعہ صرف نص ہے انہوں نے اپنے اس نظریہ کی بنیاد اپنے اصول پر رکھی ہے کہ قیاس، رائے اور اجتہاد باطل ہے اس کے ذریعے کسی چیز کی پہچان نہیں ہوتی۔ انہوں نے قیاس کو اصلاً اور فرعاً باطل قرار دیا ہے۔ پھر تین فرقوں کا اختلاف ہوا۔ ایک فرقہ دعویٰ کرتا ہے کہ نص حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ہے، دوسرا گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ نص حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ہے اور تیسرا گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ نص حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ہے۔ کسی معین امام پر نص کے مفقود ہونے پر دلیل یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر امت پر کسی معین امام کی طاعت کو اس طرح فرض کر دیتے کہ اس سے عدول جائز نہ ہوتا تو آپ بتا دیتے کیونکہ غیر معین امام میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی پوری امت کو تکلیف دینا محال ہے اور ان کے لئے اس تکلیف کے علم کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ جب علم واجب ہو تو پھر اس علم کی یہ صورتیں ہیں یا تو عقلی

دلائل سے ہوگا یا خبر سے ہوگا۔ عقلی دلائل ایسے نہیں جو کسی شخص معین کی امامت کے ثبوت پر دلالت کریں اور خبر میں بھی کوئی ایسی خبر نہیں جو کسی معین امام کے ثبوت کے علم کو ثابت کرے کیونکہ وہ یا تو متواتر ہوگی جو علم ضروری یا استدلالی کو ثابت کرے گی یا خبر اخبار احاد میں سے ہوگی۔ اس کا طریق تواتر ہونا جائز نہیں جو علم ضروری یا علم استدلالی کا موجب ہوتا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ہر مکلف اس معین کی اطاعت کے وجوب کا علم رکھتا اور اس کے دین سے ہوتا جیسا کہ ہر مکلف کو علم ہے کہ اللہ کے دین سے اس پر پانچ نمازیں، رمضان کے روزے اور بیت اللہ کا حج واجب ہے لیکن معین خلیفہ کی طاعت کو ضرورہ کوئی بھی نہیں جانتا تو یہ دعویٰ باطل ہوا اور اخبار احاد کے ساتھ معلوم ہونا بھی باطل ہے کیونکہ اس کے ساتھ علم کا وقوع محال ہے۔ اگر امام پر نص کی نقل کا رجوع واجب ہو کہ خواہ نص کیسی بھی ہو تو حضرت ابوبکر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی امامت کا اثبات واجب ہوتا کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک کے لئے ایک قوم اس کی امامت پر صریح نص نقل کرتی ہے، جب نص کے ذریعے ایک وقت میں تینوں کا اثبات باطل ہے..... جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا..... اسی طرح ایک کا اثبات بھی باطل ہے، کیونکہ کوئی گروہ نص کی وجہ سے دوسرے سے اولیٰ نہیں ہے، جب نص کا ثبوت عدم طریق کی وجہ سے باطل ہو گیا تو اختیار اور اجتہاد ثابت ہو گیا۔ اگر کوئی ہٹ دھرم ہٹ دھرمی کرے اور نص کے ساتھ علم ضروری اور تواتر کا دعویٰ کرے تو اسے فوراً ان لوگوں کے دعویٰ کی نفی پیش کرنی چاہئے جو حضرت ابوبکر کے بارے نص کے دعویٰ دار ہیں انہیں ان اخبار کا مقابلہ پیش کرنا چاہئے جو اس سے زیادہ ہیں کہ وہ نص کے قائم مقام ہو جاتی ہیں۔ پھر امامیہ فرقہ کے علاوہ نص کی نفی میں لوگوں کی پختہ رائے میں شک نہیں، اور یہ نظریہ خلق کثیر کا اور جم غفیر کا ہے اور علم ضروری ایسا علم ہوتا ہے جس کی نفی پر وہ افراد اجتماع نہیں کر سکتے جن کی تعداد امام کے مخالفین کی تعداد کے دسویں حصہ سے کم ہوں۔ اگر علم ضروری کا اس طرح ناجائز ہوتا تو ایک گروہ کا بغداد اور چین کا انکار کرنا جائز ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 6:** یہ ان احادیث کے رد میں ہے جن سے امامیہ فرقہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں نص ہونے پر حجت پکڑی ہے۔

۱۔ وہ کہتے ہیں: امت اس نص کے انکار کی وجہ سے کافر ہو گئی اور مرتد ہو گئی اس نے عناد کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے امر کی مخالفت کی ہے۔

ان نصوص میں سے ایک یہ ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مَنْ كُنْتَ مَوْلَا فَعَلَى مَوْلَاكَ اللَّهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاكَ وَعَادَ مِنْ عَادَاكَ (۱)۔ وہ کہتے ہیں: اس حدیث میں مولیٰ کا لفظ آیا ہے۔ لغت میں مولیٰ بمعنی اولیٰ ہے۔ جب آپ ﷺ نے فرمایا: فَعَلَى مَوْلَاكَ فَاتَّبِعْ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ مولیٰ سے مراد یہ ہے کہ وہ زیادہ حقدار اور زیادہ مستحق ہیں۔ پس اس سے آپ کی امامت مراد ہونا ثابت ہوا۔ اور حضرت علی کی طاعت فرض ہے۔

دوسرا ارشاد نبی کریم ﷺ نے حضرت علی کو فرمایا: انت مني بمنزلة هارون من موسى الا انه لا نبي بعدي (۲)۔ تو

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 12، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب مقدمہ، باب فضل علی بن ابی طالب، حدیث 112، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 526، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب علی بن ابی طالب، حدیث 3430، 4064، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



میرے نزدیک اس طرح ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک ہارون تھے لیکن میرے بعد نبی نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ کہتے ہیں: حضرت ہارون علیہ السلام کا مقام و مرتبہ معروف ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نبوت میں شریک تھے جبکہ حضرت علی کے لئے نبوت تو نہیں ہے۔ حضرت ہارون، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے حضرت علی، حضور علیہ السلام کے بھائی بھی نہیں تھے۔ حضرت ہارون، موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے تو معلوم ہوا کہ اس سے مراد خلافت ہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اہل تشیع کے دلائل ہیں جن سے انہوں نے حجت پکڑی ہے، ان دلائل کا ذکر ان شاء اللہ اس کتاب میں آئندہ آئے گا۔

پہلی حدیث کا جواب یہ ہے کہ وہ حدیث متواتر نہیں ہے، اس کی صحت میں اختلاف ہے۔ ابو داؤد سجستانی اور ابو حاتم رازی نے اس کی سند پر جرح کی ہے۔ ان دونوں حضرات نے اس کے بطلان پر نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے استدلال کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مزیٰنہ و جہینہ و غفار و مسلم موالی دون الناس کلہم لیس لہم مولیٰ دون اللہ و رسولہ (1) مزیٰنہ، جہینہ، غفار اور مسلم قبائل میرے موالی ہیں دوسرے تمام لوگوں کو چھوڑ کر، ان کا اللہ اور اس کے رسول کے سوا کوئی مولیٰ نہیں ہے۔

ہمارے یہ علماء کہتے ہیں: اگر من کنت مولاہ فعلی مولا کا بھی فرمایا ہے تو ان دونوں خبروں میں سے ایک خبر جھوٹی ہوگی۔ دوسرا جواب: یہ ہے کہ خبر اگر صحیح ہو، ثقہ راوی نے ثقہ سے روایت کیا ہو تو پھر بھی اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلیل نہیں۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے وہ اس طرح کہ المولیٰ بمعنی الولیٰ ہو، خبر کا معنی یہ ہوگا: من کنت ولیہ فعلی ولیہ۔ (میں جس کا ولی ہوں، علی اس کا ولی ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ إِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاہُ (التحریم: 4) یعنی اللہ تعالیٰ اس کا ولی ہے، اس حدیث سے مقصود لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ظاہر، ان کے باطن کی طرح ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظیم فضیلت ہے۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ یہ خبر ایک خاص سبب پر وارد ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت اسامہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا جھگڑا ہوا۔ حضرت علی نے حضرت اسامہ سے کہا: انت مولائی (تو میرا غلام ہے) حضرت اسامہ نے کہا: لست مولک بل انا مولیٰ رسول اللہ ﷺ میں تمہارا غلام نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا غلام ہوں۔ پس یہ نبی کریم ﷺ کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ (2) جس کا میں مولیٰ ہوں، علی اس کا مولیٰ ہے۔

چوتھا جواب: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہمت کے واقعہ میں نبی کریم ﷺ سے کہا تھا حضور! اس کے علاوہ عورتیں بہت ہیں (3)۔ یہ بات حضرت عائشہ پر شاق گزری، منافقین کو موقع مل گیا، انہوں نے حضرت علی پر طعن کیا اور ان سے برأت کا اظہار کیا۔ نبی کریم ﷺ نے ایسے لوگوں کی بات کا رد کر کے اور انہوں نے حضرت علی سے برأت اور ان پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب ذکر اسلام و غفار و مزیٰنہ و جہینہ و اشجع، حدیث نمبر 3250، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب علی ابن ابی طالب، صفحہ 213، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 595، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ کتاب المغازی، باب حدیث الافک، حدیث نمبر 3826، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طعن کیا تھا اس کو جھٹلاتے ہوئے یہ فرمایا۔ اسی وجہ سے صحابہ کی جماعت سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد میں منافقین کو حضرت علی کے بغض کی وجہ سے پہچانتے تھے (1)۔

دوسری حدیث تو نبی کریم ﷺ نے بمنزلہ ہارون من موسیٰ سے خلافت مراد نہیں لی کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام کا وصال حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہوا تھا جیسا کہ سورہ مائدہ میں ان کی وفات کا بیان آئے گا۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد خلیفہ نہ تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ حضرت یوشع بن نون تھے، اگر انت منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ سے مراد خلافت ہوتی تو آپ فرماتے: انت منی بمنزلہ یوشع من موسیٰ۔ جب آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تو یہ دلیل ہے کہ خلافت مراد نہیں۔ آپ ﷺ نے یہ مراد لیا کہ میں اپنی زندگی اور عدم موجودگی میں اپنے اہل پر خلیفہ بناؤں گا جیسا کہ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان کی قوم پر خلیفہ تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے مناجات کے لئے نکلے تھے۔

یہ کہا گیا ہے کہ یہ حدیث ایک سبب خاص پر ارشاد فرمائی۔ وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ جب غزوہ تبوک کی طرف تشریف لے گئے تو مدینہ طیبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا۔ منافقین نے یہ افواہ پھیلانی کہ آپ ﷺ نے اسے بغض اور ناراضگی کی بنا پر خلیفہ بنایا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، نبی کریم ﷺ سے ملے اور عرض کی کہ منافقین ایسا ایسا کہہ رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: انہوں نے جھوٹ بولا ہے بلکہ میں نے تجھے اسی طرح اپنا خلیفہ بنایا ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنایا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اما ترضی ان تكون منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ۔ (2) (کیا تجھے پسند نہیں کہ تو میری طرف سے ایسا ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہارون علیہ السلام تھے)۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ آپ نے خلیفہ بنانے کا ارادہ کیا تھا تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوسرے کئی صحابہ بھی اس فضیلت میں شریک ہو جائیں گے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ہر غزوہ میں جاتے وقت کسی نہ کسی صحابی کو اپنا خلیفہ بنایا۔ ان میں سے ابن ام مکتوم اور محمد بن سلمہ وغیرہما صحابہ ہیں۔ اس خبر کا مدار حضرت سعد بن ابی وقاص پر ہے اور یہ خبر واحد ہے، اس کے مقابلہ میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے لئے روایات مروی ہیں جو اس سے اولیٰ ہیں۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا تو آپ ﷺ سے عرض کی گئی: حضور! ابو بکر اور عمر کو کیوں نہیں بھیجا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے ان دونوں سے استغناء نہیں کیونکہ ان کا میرے نزدیک اسی طرح مقام ہے جس طرح سر کے لئے کانوں اور آنکھوں کا ہے۔ فرمایا: وہ اہل زمین میں میرے وزیر ہیں۔ یہ بھی مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ابو بکر اور عمر اسی طرح ہیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قریب حضرت ہارون کا مرتبہ تھا (3)۔ یہ خبر ابتداء وارد ہوئی ہے اور حضرت علی کی خبر ایک سبب پر وارد ہوئی۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت ابو بکر حضرت علی رضی اللہ عنہما کی نسبت امامت کے زیادہ حق دار ہیں۔ واللہ اعلم

1۔ جامع ترمذی، کتاب نبی پاک کے فضائل، باب مناقب علی بن ابی طالب، حدیث نمبر 3650، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 633، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب علی بن ابی طالب، حدیث 3430، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب علی بن ابی طالب، صفحہ 208، جلد 2 (وزارت تعلیم)

**مسئلہ نمبر 7:** اس میں اختلاف ہے کہ امام، امام کیسے ہوگا۔ اس کے تین طرق ہیں:

۱۔ نص: اس کے متعلق اختلاف گزر چکا ہے۔ حنابلہ، اہل حدیث کی ایک جماعت حضرت حسن بصری، بکر بن اخت عبد الواحد، اس کے ساتھی اور خوارج کی ایک جماعت کا یہی نظریہ ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر کی خلافت پر اشارہ کے ساتھ نص فرمائی اور حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کی خلافت پر نص فرمائی۔ جب خلیفہ بنانے والا کسی ایک شخص کی خلافت پر نص قائم کر دے جیسا کہ حضرت صدیق اکبر نے حضرت عمر کی خلافت پر نص قائم کی تھی یا کسی جماعت کے سپرد یہ کام کر دے جس طرح حضرت عمر نے کیا تھا تو یہ امام ہونے کا دوسرا طریقہ ہے، اور اس جماعت میں سے ایک کے چننے کا اختیار اس جماعت کے سپرد ہوگا جیسا کہ صحابہ کرام نے حضرت عثمان کی تعیین میں کیا تھا۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے متعلق اہل حل و عقد کا اجماع ہو جائے۔ وہ اس طرح ہے مسلمانوں کے کسی شہر میں ایک جماعت ہو جب ان کا امام فوت ہو جائے اور ان کا امام نہ ہو اور نہ مرنے والے نے کسی کو خلیفہ بنایا، پھر جس شہر میں وہ امام موجود تھا اس شہر والے اپنے لئے کسی کو امام بنادیں اس پر اجماع ہو جائے اور وہ لوگ اس سے خوش ہوں تو آفاق میں آگے پیچھے جہاں بھی مسلمان موجود ہیں ان کو اس امام کی طاعت میں داخل ہونا واجب ہے جبکہ وہ امام اعلانیہ فسق و فساد کرنے والا نہ ہو کیونکہ یہ دعوت ان کو محیط ہے اس کا قبول کرنا واجب ہے کسی کو اس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ دو اماموں کے قائم کرنے میں کلمہ کا اختلاف ہے اور واضح فساد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین چیزوں کی وجہ سے مومن کے دل میں کھوٹ اور نفاق نہیں ہوتا: (۱) اللہ تعالیٰ کے لئے عمل میں اخلاص۔ ۲۔ جماعت کا لزوم۔ ۳۔ اپنے حکمرانوں سے خلوص کا اظہار کیونکہ مسلمانوں کی دعوت ان کے ذریعے محفوظ ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** اگر ایک شخص اہل حل و عقد میں سے کسی کو خلیفہ نامزد کر دے تو وہ ثابت ہو جائے گا اور دوسروں پر اس کو تسلیم کرنا لازم ہو جائے گا لیکن بعض لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ خلیفہ نامزد اہل حل و عقد میں سے ایک جماعت کرے گی۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر کی بیعت کی تو کسی صحابی نے اس کا انکار نہ کیا، چونکہ یہ بھی ایک عقد ہے اس لئے کسی تعداد کی ضرورت نہیں جو اس کو منعقد کریں جس طرح کہ دوسری عقود ہیں۔ امام ابوالمعالی نے کہا: جس کے لئے ایک شخص کے عقد کے ساتھ امامت منعقد ہو جائے تو امامت لازم ہو جائے گی، بغیر حدث اور تغیر امر کے اس کو معزول کرنا جائز نہیں۔ انہوں نے فرمایا: اس پر اجماع ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** اگر کوئی ایسا شخص عہدہ امامت پر غلبہ کر لے جس کو امامت کی اہلیت ہو اور وہ امامت قہر اور غلبہ سے حاصل کر لے تو کہا گیا ہے کہ یہ امامت کا چوتھا طریقہ ہے۔ حضرت سہل بن عبد اللہ تستری سے پوچھا گیا: ہم پر اس شخص کے لئے کیا واجب ہے جو ہمارے شہروں پر غلبہ حاصل کر لے جبکہ وہ امام ہو؟ حضرت عبد اللہ نے فرمایا: تم اس کو تسلیم کرو اور اپنے حق میں سے جو وہ مطالبہ کرے اسے ادا کرو اور اس کے افعال کا انکار کرو اور اس سے مت بھاگو۔ جب اس نے تجھے امر دین میں سے کسی راز کا امین بنایا ہے تو تم اسے افشانہ کرو۔



ابن خويز منداد نے کہا: جو شخص خود بخود تخت خلافت پر کود پڑے جبکہ وہ خلافت کی صلاحیت رکھتا ہو جبکہ اس نے نہ کسی سے مشورہ کیا ہو، نہ اسے اختیار کیا گیا ہو اور لوگوں نے اس کی بیعت کر لی ہو تو اس کے لئے بیعت مکمل ہوگئی۔

**مسئلہ نمبر 10:** امامت کی عقد پر شہادت میں اختلاف ہے۔ ہمارے بعض علماء نے کہا: گواہوں کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ شہادت تو قطعی نقلی دلیل کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ یہاں کوئی قطعی نقلی دلیل نہیں ہے جو شہادت کے اثبات پر دلالت کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: گواہوں کی ضرورت ہے۔ جس نے یہ کہا ہے انہوں نے اس طرح حجت پکڑی ہے کہ اگر امر امامت پر شہادت منعقد نہ ہوگی تو ہر شخص یہ دعویٰ کر دے گا کہ سر اس کی امامت قائم ہوئی ہے اور یہ چیز فتنہ اور جنگ تک پہنچا دے گی۔ پس ثابت ہوا کہ شہادت معتبر ہے اس میں دو گواہ کافی ہیں، جبکہ جبائی کا قول اس کے مخالف ہے۔ اس نے کہا: چار گواہ، ایک امام بنانے والا اور ایک امام بننے والا ہو کیونکہ حضرت عمر نے چھ آدمیوں کو مشورہ سونپا تھا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ ہمارے درمیان اور اس کے درمیان اختلاف نہیں ہے کہ دو آدمیوں کی گواہی معتبر ہے اور جو زائد ہیں ان میں اختلاف ہے اور زیادتی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے۔ پس زیادتی کا اعتبار نہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 11:** امام کی شرائط۔ یہ گیارہ ہیں:

۱۔ امام کا تعلق قریش کے خاندان سے ہو کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: **الائمة من قریش (1)** (قریش میں سے ائمہ ہوں گے) اس میں اختلاف ہے۔

۲۔ وہ مسلمانوں کا قاضی بننے کی صلاحیت رکھتا ہو، اجتہاد کرنے والا ہو اور اسے حوادث میں دوسروں سے استفتاء کی ضرورت نہ ہو۔ یہ متفق علیہ ہے۔

۳۔ وہ دانشمند اور صاحب رائے ہو، جنگی امور، لشکروں کی تدبیر، سرحدوں کی حفاظت، ملت اسلامیہ کی حمایت، امت کو انتشار سے روکنے، ظالم سے انتقام لینے اور مظلوم کو اپنا حق دلانے کی قدرت رکھتا ہو۔

۴۔ وہ ایسا شخص ہو کہ حدود قائم کرنے میں اسے رقت لاحق نہ ہو اور گردنوں کو اڑانے اور جسم کو کاٹنے سے مت گھبرائے۔ ان سب پر دلیل صحابہ کرام کا اجماع ہے کیونکہ ان کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ یہ صفات اس شخص میں جمع ہوں کیونکہ یہ شخص قاضیوں اور دوسرے حکمرانوں کا والی ہوتا ہے اور اس کے خود فیصلہ کرنے اور حکم کرنے کی صلاحیت بھی ہو، خلفاء کے امور اور قاضیوں کے فیصلوں کی چھان بین کر سکتا ہو اور یہ امور صرف وہی بجالا سکتا ہے جو عالم ہو اور علم میں پختہ ہو۔

۵۔ ۶۔ وہ آزاد ہو۔ امام کے آزاد ہونے اور اس کے مسلمان ہونے کی شرط میں کوئی خفا نہیں، اس کا مسلمان ہونا یہ چھٹی شرط ہے۔

۷۔ ۸۔ وہ مذکر ہو۔ اس کے اعضاء سلامت ہوں۔ اس پر اجماع ہے کہ عورت کا امام ہونا جائز نہیں اگرچہ اس کے قاضی ہونے کے جواز میں اختلاف ہے ان امور میں جس میں عورت کی شہادت جائز ہے۔

۹۔ ۱۰۔ وہ عاقل، بالغ ہو۔ اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔

۱۔ صحیح بخاری، جلد 497، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب قریش، حدیث 3239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

۱۱: وہ عادل ہو کیونکہ امت میں کوئی اختلاف نہیں کہ فاسق کے لئے امامت کی ذمہ داری جائز نہیں۔ ضروری ہے کہ وہ علم میں لوگوں سے افضل ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: تمہارے ائمہ تمہارے سفارشی ہیں۔ غور کرو کس سے سفارش طلب کر رہے ہو (1)۔ قرآن حکیم میں حضرت طالوت علیہ السلام کے وصف میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَتْ بَصَاطَةً فِيْ الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرہ: 247) (بے شک اللہ تعالیٰ نے جن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے کشادگی علم میں اور جسم میں)۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے علم کا ذکر کیا ہے پھر اس چیز کا ذکر فرمایا جو قوت اور اعضاء کی سلامتی پر دلالت کرتی ہے۔ اصطفیٰ کا معنی ہے: اس نے اسے چن لیا۔ یہ نسب کی شرط پر دلیل ہے، اس کی شرائط میں گناہوں اور خطا سے معصوم ہونا نہیں ہے نہ اس کا عالم بالغیب ہونا ضروری ہے نہ اس کا افراد امت میں سب سے زیادہ بہادر اور گھوڑ سواری میں ماہر ہونا شرائط میں سے ہے اس کا صرف بنی ہاشم سے ہونا بھی شرط نہیں ہے کیونکہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کی امامت پر اجماع ہے حالانکہ وہ بنی ہاشم میں سے نہ تھے۔

**مسئلہ نمبر 12:** فاضل کے ہوتے ہوئے فتنہ کے خوف سے مفضول کو امام بنانا جائز ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ امت کا امر درست نہ ہو۔ یہ اس لئے ہے کہ امام اسی لئے بنایا جاتا ہے تاکہ دشمن سے دفاع کرے، ملت بیضاء کی حمایت کرے، خلل کو روکے اور حقوق ادا کرے، حدود کو قائم کرے، بیت المال کے لئے مال جمع کرے اور اسے مستحق لوگوں پر تقسیم کرے۔ جب افضل شخص کو مقرر کرنے پر جنگ، فساد اور ان امور کے ضیاع کا خوف ہو جن کے لئے امام مقرر کیا جاتا ہے تو یہ فاضل سے مفضول کی طرف عدول کرنے کا ظاہر عذر ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر اور ساری امت کو مشورہ کے وقت معلوم تھا کہ ان چھ افراد میں فاضل اور مفضول موجود تھے۔

حضرت عمر نے ان میں سے ہر ایک کے لئے اس ذمہ داری کی اجازت دی تھی جب مصلحت اس کا تقاضا کرتی تھی اس پر امت کا اجماع ہوا تھا کسی نے انکار نہیں کیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 13:** جب امام مقرر کیا جائے پھر تقرر کے بعد فاسق ہو جائے تو جمہور علماء کا قول ہے کہ اس کی امامت ختم ہو جائے گی اور ظاہر معلوم فسق کی وجہ سے وہ معزول کر دیا جائے گا کیونکہ یہ ثابت ہے کہ امام حدود کو قائم کرنے، حقوق ادا کرنے، یتیموں اور مجنوں کے مال کی حفاظت کرنے اور ان دوسرے امور کی نگرانی کے لئے مقرر کیا جاتا ہے جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور جس شخص میں فسق ہو گا وہ ان امور کو قائم نہیں کر سکے گا، ان کے قیام سے عاجز ہوگا۔ اگر ہم فاسق کی امامت جائز قرار دیں تو ان امور کا ابطال لازم آئے گا جن کے لئے اسے مقرر کیا جاتا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ ابتداء میں بھی فاسق کو امام بنانا جائز نہیں ہوتا کیونکہ ان امور کا ابطال لازم آتا ہے جن کے لئے وہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہوگا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: امام معزول نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہ کفر کرے یا نماز کا پڑھنا ترک کر دے یا نماز کی طرف بلانا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الاستقاء، صفحہ 139، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ترک کر دے یا شریعت کا کوئی امر ترک کر دے کیونکہ حدیث عبادہ میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”ہم امامت میں اس کے اہل لوگوں سے نہیں جھگڑیں گے۔ فرمایا: مگر یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا ظاہر کفر دیکھو جس میں دلیل ہو“ (1)۔ اور حضرت عوف بن مالک کی حدیث میں ہے اس وقت تک نہیں جب تک وہ تم میں نماز کو قائم کریں (2)۔ ان دونوں حدیثوں کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم پر امراء بنائے جائیں گے۔ جس نے ناپسند کیا وہ بری ہو گیا جس نے انکار کیا وہ سلامت ہو گیا لیکن جو ان سے راضی ہوا اور ان کی پیروی کی..... صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ فرمایا: نہیں جب تک وہ نماز پڑھیں۔ یعنی جس نے دل سے ناپسند کیا اور دل سے انکار کیا (3)، اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 14:** جب امام اپنے آپ میں ایسا نقص پائے جو اس کی امامت میں موثر ہوتا ہو تو اسے معزول ہو جانا واجب ہے، اور جب ایسا نقص نہ پائے تو کیا اس کو معزول ہونا چاہئے اور کسی غیر کی بیعت کر لینی چاہئے اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کی امامت ختم نہ ہوگی۔ بعض نے فرمایا: اسے معزول ہو جانا چاہئے۔ اس پر دلیل کہ امام جب اپنے آپ کو معزول کرے گا تو معزول ہو جائے گا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے اقبلونی اقبلونی، ”مجھ سے بیعت واپس لے لو..... مجھ سے بیعت واپس لے لو“۔ اور صحابہ نے کہا: ہم نہ تجھ سے بیعت واپس لیتے ہیں نہ ہم اس کا مطالبہ کرتے ہیں تجھے رسول اللہ ﷺ نے ہمارے دین کے لئے مقدم کیا تھا۔ پس کس کی مجال کہ تجھے ہٹائے۔ تجھ سے رسول اللہ ﷺ ہمارے دین کے لئے راضی ہوئے تو ہم آپ سے راضی نہ ہوں گے۔ اگر حضرت ابو بکر کے لئے ایسا کرنا جائز نہ ہوتا تو صحابہ کرام اس کا انکار کرتے اور حضرت ابو بکر سے کہتے تجھے یہ کہنا درست نہیں اور آپ کے لئے ایسا کرنا صحیح نہیں۔ جب صحابہ کرام اس پر قائم رہے تو معلوم ہوا کہ امام کے لئے ایسا کرنا جائز ہے چونکہ امام دوسروں کی نگرانی کرنے والا ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس کا حکم حاکم کا حکم ہو، اور وکیل جب اپنے آپ کو معزول کر سکتا ہے امام بھی امت کا وکیل اور اس کا نائب ہوتا ہے۔ جب وکیل، حاکم اور ہر نائب کے بارے میں اتفاق ہے کہ وہ اپنے آپ کو معزول کر سکتا ہے تو امام بھی اسی طرح ہوتا ہے اس کا بھی اس کی مثل ہونا واجب ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 15:** جب ارباب حل و عقد کے اتفاق سے یا ایک آدمی کے ذریعے کسی امام کی امامت منعقد ہو جائے تو تمام لوگوں پر واجب ہے کہ وہ حکم سننے اور اطاعت کرنے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی اقامت پر بیعت کریں اور جو کسی عذر کی بناء پر بیعت سے انکار کرے تو اس کا عذر قبول کیا جائے گا اور جو بغیر عذر کے انکار کرے تو اس پر جبر کیا جائے گا، تاکہ مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ بکھر نہ جائے۔ جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو پہلا خلیفہ ہوگا اور دوسرا قتل کیا جائے گا۔ اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعة الامراء علی غیر معصیۃ، صفحہ 125، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الامارۃ، باب بغیار الامۃ وشرارہم، صفحہ 129، جلد 2

3۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب الانکار علی الامراء، صفحہ 128، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)



کے قتل میں اختلاف ہے کیا یہ قتل حسا ہے یا معنی ہے۔ پس اس کا معزول کرنا اس کا قتل اور اس کی موت ہے۔ پہلا معنی ظاہر ہے (یعنی اسے قتل کیا جائے گا)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو ان میں سے دوسرے کو قتل کر دو (1)۔ اس حدیث کو حضرت ابوسعید خدری نے روایت کیا ہے اور مسلم نے نقل کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جو ایک امام کی بیعت کر لے، اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دے اور دل کا خلوص پیش کر دے تو اسے اس کی اطاعت کرنی چاہئے اگر اسے استطاعت ہے۔ اگر کوئی دوسرا امام آجائے تو وہ اس سے لڑے اور دوسرے امام کی رائے میں اتار دے (2) اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عرفجہ کی حدیث میں ہے، اس کو تلوار سے مارو خواہ کوئی بھی ہو (3)۔ یہ دو امام مقرر نہ ہونے پر بڑی واضح دلیل ہے کیونکہ یہ چیز نفاق، مخالفت، انتشار، فتنوں کے ظہور اور نعمتوں کے زوال کا باعث بنتی ہے لیکن اگر قطر بہت دور ہوں اور علاقے جدا جدا ہوں جیسے اندلس اور خراسان تو پھر ہر علاقہ کے لئے علیحدہ امام جائز ہے جیسا کہ مزید بیان آئندہ آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 16:** اگر کوئی شخص عادل امام کے خلاف خروج کرے تو لوگوں پر اس سے جنگ کرنا واجب ہے۔ اگر امام فاسق ہو اور خروج کرنے والا عدل کو ظاہر کرنے والا ہو پھر بھی لوگوں کو مناسب نہیں کہ وہ اس خروج کرنے والے کی نصرت میں جلدی کریں حتیٰ کہ جو وہ عدل ظاہر کرتا ہے وہ واضح ہو جائے یا پہلے امام کے معزول کرنے پر سارے لوگ متفق ہو جائیں۔ یہ اس لئے کہ ہر شخص جو اس قسم کا معاملہ طلب کرتا ہے وہ اپنی طرف سے صلاح کا نعرہ لگاتا ہے حتیٰ کہ جب غالب آجاتا ہے تو پھر اپنی اصل حالت کی طرف لوٹ آتا ہے جو اس کے ظاہری صلاح کے خلاف ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 17:** ایک زمانہ میں اور ایک شہر (ملک) میں دو یا تین اماموں کا قیام بالکل جائز نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ امام ابوالمعالی نے کہا: ہمارے اصحاب عالم کی دونوں طرفوں میں دو شخصوں کی امامت کی ذمہ داری کے عدم جواز کا نظریہ رکھتے ہیں۔ پھر انہوں نے فرمایا: اگر دو شخصوں کے لئے امامت کی عقد پر اتفاق ہو جائے تو یہ اس کے قائم مقام ہوگا کہ ایک عورت کے دو ولیوں نے دو خاوندوں سے نکاح کر دیا جبکہ ہر ایک کو دوسرے عقد کا شعور نہ تھا۔ فرمایا: میرے نزدیک اس میں یہ ہے کہ دو شخصوں کے لئے امامت کی عقد قریبی علاقوں میں تو جائز نہیں اس پر اجماع ہے ہاں جب دونوں اماموں کے درمیان بہت زیادہ دوری ہو تو پھر اس میں احتمال کی گنجائش ہے۔ استاذ ابواسحاق نے ان دو سلطنتوں میں دو اماموں کا تقرر جائز قرار دیا جو ایک دوسرے سے بہت دور ہوں تاکہ لوگوں کے حقوق اور احکام معطل نہ ہوں۔ کرامیہ فرقہ بغیر تفصیل کے دو امام مقرر کرنے کا نظریہ رکھتے ہیں۔ انہیں پھر ایک شہر میں بھی اس کی اجازت دینا لازم آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب اذا بریعت الخلیفتین، صفحہ 128، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب الوفاء ببيعة الخلفاء الاول، صفحہ 126، جلد 2

3۔ ایضاً، کتاب الامارۃ، باب حکم من فرق امر المسلمین، صفحہ 128، جلد 2

حضرت امیر معاویہ دونوں امام تھے۔ انہوں نے کہا: جب دو شہروں یا دو طرفوں میں دو امام ہوں گے تو ہر ایک اپنے علاقہ کے معاملات پر زیادہ کنٹرول کرے گا اور اس کے معاملات زیادہ نگرانی سے چلائے گا۔ دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب ایک زمانہ میں دونوں کی بعثت جائز ہے اور یہ چیز نبوت کے ابطال تک نہیں پہنچاتی تو امامت بدرجہ اولیٰ جائز ہوگی اور یہ چیز امامت کے ابطال تک نہیں پہنچائے گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جائز ہوتا اگر اس سے شرع نے منع نہ کیا ہوتا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **فَاَقْتُلُوا الْاِخْوَةَ مِنْهُمْ**۔ (1) ”دونوں اماموں میں سے جو دوسرا ہے اسے قتل کر دو“۔ امت کا اتفاق اسی پر رہا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مسئلہ انہوں نے اپنے لئے امامت کا دعویٰ نہیں کیا تھا وہ شام کی ولایت کے مدعی تھے کہ پہلے ائمہ نے انہیں شام کی حکمرانی دی تھی۔ اس پر دلیل ان کے دور میں ائمہ کا اجماع ہے کہ امام ایک ہے، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں امام ہوں اور میرا مخالف بھی امام ہے۔ اگر وہ کہیں عقل اسے محال قرار نہیں دیتی اور نقل میں کوئی چیز اس سے مانع نہیں تو ہم کہیں گے: نقلی دلائل میں سے قوی ترین دلیل اجماع ہے اور وہ اس کے منع کا حکم دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قَالُوا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيْهَا وَمَنْ يُقْسِدُ فِيْهَا سَائِرُ النَّاسِ كَالَّذِيْ هُوَ يُفْسِدُ فِيْهَا وَمَنْ يُقْسِدُ فِيْهَا سَائِرُ النَّاسِ كَالَّذِيْ هُوَ يُفْسِدُ فِيْهَا وَمَنْ يُقْسِدُ فِيْهَا سَائِرُ النَّاسِ** (الانبیاء: 27) کا ارشاد ان کی مدح کے لئے ذکر کیا گیا ہے، پھر انہوں نے کیسے کہا **اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيْهَا** اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے جب انہوں نے خلیفہ کا لفظ سنا تو وہ سمجھے کہ بنی آدم میں کچھ لوگ فساد کریں گے کیونکہ خلیفہ کا مقصود اصلاح اور ترک الفساد ہوتا ہے لیکن انہوں نے تمام لوگوں پر معصیت کا حکم لگا دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ان میں سے بعض فساد کریں گے اور بعض فساد نہیں کریں گے۔ پس ان کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے فرمایا: **اِنِّيْٓ اَعْلَمُ** اور اس چیز کو ثابت فرمایا کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسما کا علم سکھایا اور ان کے لئے اپنے پوشیدہ علم سے پردہ اٹھایا۔ بعض علماء نے فرمایا: ملائکہ نے دیکھا اور جان لیا تھا جو کچھ جنوں نے فساد برپا کیا تھا اور خوریزی کی تھی۔ یہ اس طرح ہے کہ زمین میں آدم کی تخلیق سے پہلے جن رہتے تھے، انہوں نے فساد کیا اور خوریزی کی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ابلیس کو ملائکہ کے لشکر میں بھیجا۔ پس اس نے انہیں قتل کیا اور بعض کو سمندروں اور پہاڑوں پر بھگا دیا۔ پس اس وقت شیطان کو عزت ملی تو فرشتوں نے محض استفہام کی جہت سے **اَتَجْعَلُ فِيْهَا** کہا۔ کیا یہ خلیفہ پہلے جنوں کے طریقہ پر ہوگا یا نہیں؟ یہ احمد بن یحییٰ ثعلب کا قول ہے۔

ابن زید وغیرہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ خلیفہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے کچھ لوگ زمین میں فساد کریں گے اور خون ریزی کریں گے تو انہوں نے یہ قول کیا (2)۔ انہوں نے یا تو گنہگار کو خلیفہ بنانے پر تعجب کرتے ہوئے یہ سوال کیا یا اس اعتبار سے کہ جس کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں خلیفہ بنا رہا ہے اور جس پر یہ انعام کیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا۔ بڑی تعجب کی بات ہے یا اس کام کو بہت بڑا سمجھتے ہوئے یہ سوال کیا کہ اسے خلافت بھی ملے گی اور وہ نافرمان بھی ہوگا۔ حضرت قتادہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب اذا ہونع لخلیفۃین، صفحہ 128، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 117، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ جب وہ زمین میں مخلوق پیدا کرے گا تو وہ فساد برپا کریں گے اور خونریزی کریں گے۔ انہوں نے یہ سوال کیا جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً، کیا یہ وہی ہے جس کے متعلق انہیں بتایا یا کوئی اور ہے۔ یہ قول بہتر ہے یہ عبدالرزاق نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں معمر نے قتادہ سے روایت کر کے اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا کی تفسیر میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ زمین میں جب مخلوق ہوگی تو وہ اس میں فساد برپا کرے گی اور خونریزی کرے گی۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا کلام میں ان کے مذہب پر حذف ہے معنی یہ ہے کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں جو ایسا ایسا کرے گا تو فرشتوں نے کہا: کیا زمین میں تو اسے خلیفہ بنانے والا ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا تھا یا کوئی اور ہے۔ پہلا قول بہت بہتر ہے کیونکہ اس میں علم کا استخراج اور استنباط الفاظ کے مقتضی سے ہے اور یہ نہیں ہو سکتا مگر علماء سے جو ان دونوں اقوال کے درمیان حسن ہے۔ اس میں غور و فکر کر۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے سوال کرنا کہ تم نے میرے بندوں کو کیسے چھوڑا (1)..... جیسا کہ مسلم وغیرہ میں ثابت ہے..... تو یہ ان کو توبخ کرنے کے لئے ہے جنہوں نے کہا تھا: اَتَجْعَلُ فِیْهَا، اور اپنی ازلی معلومات کا اظہار ہے کیونکہ انہیں فرمایا اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا، مَنْ تَجْعَلُ کا مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور فیہا دوسرے مفعول کے قائم مقام ہے۔ یفسد لفظ کے اعتبار سے ہے غیر قرآن میں معنی کے اعتبار سے یفسد و ن بھی جائز ہے۔ قرآن حکیم میں ہے: وَمِنْهُمْ مَّنْ یُّسْتَوِیْ اِلَیْكَ (الانعام: 25) یہ لفظ کے اعتبار سے ہے معنی کے اعتبار سے یستمعون ہے۔ (ویسفک) یہ معطوف ہے اس میں دو ذہبیں جائز ہیں۔ اسید نے اعرج سے روایت کیا کہ انہوں نے ویسفک الدماء، پڑھا ہے یعنی مضارع کو منصوب پڑھا ہے اور واو کے ساتھ اسے استفہام کا جواب بنایا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا

الم ان جارکم و تکون بینی و بینکم البودة والاخاء

کیا میں تمہارا پڑوسی نہ تھا اور میرے اور تمہارے درمیان محبت و بھائی چارہ نہ تھا۔

السفک کا معنی انڈیلنا (بھانا) ہے سفکت الدم اسفکھ سفکا۔ میں نے خون کو بھایا اسی طرح آنسو بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ ابن الفارس اور جوہری کا قول ہے۔

السفک، کا معنی السفاح ہے جو کلام پر قادر ہو۔ مہدوی نے کہا: السفک صرف خون بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے کبھی کلام کی نثر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سفک الکلام جب وہ کلام کرے۔ الدماء کا مفرد دم ہے، لام کلمہ مخدوف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل دَمَع ہے۔ بعض نے فرمایا: دَمَع ہے اور کوئی اسم دو حرفوں پر نہیں آتا مگر اس سے حرف حذف کیا گیا ہوتا ہے۔ دم سے مخدوف یا ہے اور کبھی اصل پر بھی بولا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

فلو انا علی حجر ذبحنا جری الدمیان بالخبر الیقین

اگر ہم اس پتھر پر ہوتے تو ہم ذبح کئے جاتے، یقیناً دونوں طرف سے خون جاری ہوتے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 457، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب ہدایہ الخلق، باب ذکر السلاک، حدیث 2984، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (یعنی ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں)۔ ان صفات سے جو تیری شان کے لائق نہیں، التسبیح کا معنی تعظیم کے طور پر ہر نقص سے پاکیزگی بیان کرنا ہے۔ اسی سے اُٹھی کا قول ہے:

اقول لما جاءني فخره سبحان من علقه الفاخر  
میں کہتا ہوں: جب میرے پاس اس کا فخر آیا، میں علقہ فخر کرنے والے سے برأت کرتا ہوں۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سبحان اللہ کی تفسیر پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ہر نقص اور عیب سے پاکیزگی بیان کرنا، یہ السبح سے مشتق ہے جس کا معنی چلنا اور جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ① (المزل) (بے شک دن میں مصروفیت ہے) پس سبحان اللہ کہنے والا اللہ کی ہر نقص اور عیب سے پاکیزگی بیان کرنے میں چلنے والا ہے نحن میں کلام گزر چکی ہے نون کونون میں ادغام کرنا جائز نہیں تاکہ دو ساکن جمع نہ ہوں۔

**مسئلہ:** اہل تاویل کافرشتوں کی تسبیح میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس نے فرمایا: فرشتوں کی تسبیح ان کی نماز ہے (1)، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ ② (الصافات) یعنی اگر وہ نمازیوں میں سے نہ ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کی تسبیح، ذکر کے ساتھ آواز کو بلند کرنا ہے۔ مفصل نے یہی کہا ہے اور جریر کے قول سے استشہاد کیا ہے

تسبح الاله وجوه تغلب كلما سبح الحبيب و كتبوا اهلا

تغلب کے چہروں کو اللہ تعالیٰ نے فتح کیا جب حاجیوں نے بلند آواز سے ذکر کیا اور تلبیہ کہا۔

حضرت قتادہ نے کہا: ان کی تسبیح سبحان اللہ ہے (2) عرف کے مطابق لغت میں یہ صحیح ہے کیونکہ حضرت ابو ذر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا کلام افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو ملائکہ کے لئے چنا ہے (یا اپنے بندوں کے لئے چنا ہے) سبحان اللہ و بحمدہ، اس کو مسلم نے نقل کیا ہے (3)۔ حضرت عبدالرحمن بن قرط سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جس رات سیر کرائی گئی آپ نے اوپر والے آسمانوں میں یہ تسبیح سنی: سبحان العلیٰ الیٰ علی سبحانہ و تعالیٰ۔ اس کو بیہقی نے ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِحَمْدِكَ یعنی ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کو ملاتے ہیں۔ الحمد کا معنی ثنا (تعریف) ہے پہلے گزر چکا ہے، یہ بھی احتمال ہے کہ بِحَمْدِكَ دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ ہو۔ گویا انہوں نے کہا: ہم تیری تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں پھر تسلیم کی جہت پر معترض کلام ذکر کی یعنی تو اس کی طرف ہدایت میں محمود ہے (4)۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَتَقْدِسُ لَكَ** یعنی ہم تیری تعظیم کرتے ہیں اور ہم تیری بزرگی بیان کرتے ہیں اور ہم تیرے ذکر کو ان خرافات سے پاک کرتے ہیں جو ملحد لوگ تیرے بارے میں کہتے ہیں۔ یہ مجاہد اور ابو صالح وغیرہما کا قول ہے۔ ضحاک وغیرہ نے کہا: ہم تیری رضا چاہتے ہوئے اپنے نفسوں کو تیرے لئے پاک کرتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا جن میں قتادہ بھی ہیں: تقدس لك اس کا معنی ہے ہم نماز پڑھتے ہیں اور التقدیس کا معنی نماز ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف ہے (1)۔

میں کہتا ہوں بلکہ اس کا معنی صحیح ہے کیونکہ نماز تعظیم، تقدیس اور تسبیح پر مشتمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ رکوع اور سجود میں کہتے تھے: **سبح قدوس رب الملائکہ والروح**۔ (2) یہ حضرت عائشہ نے روایت کی ہے اور مسلم نے نقل کی ہے۔ قدس کی بنا پر جیسے بھی بنائی جائے اس کا معنی پاک کرنا ہی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ (المائدہ: 21)** یعنی پاک زمین میں داخل ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الْمَلِکُ الْقُدُّوسُ (الحشر: 23)** یعنی طاہر۔ اس کی مثل ہے **پَالَوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی** (النازعات) بیت المقدس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ یہ وہ مکان ہے جس میں انسان گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے لوئے کو قدس کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے وضو کیا جاتا ہے اور طہارت حاصل کی جاتی ہے۔ اسی سے القادوس ہے۔ حدیث پاک میں ہے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو پاک نہیں فرمایا جو ضعیف کے لئے قوی سے مواخذہ نہیں کرتی (3)۔ ابن ماجہ نے اسے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔ القدس پاکیزگی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ شاعر کا قول ہے:

فادرکنہ یاخذن بالساق والنسا      کما شبرق الولدان ثوب المقدس

کتوں نے بیل کو پنڈلیوں اور رانوں سے اس طرح پکڑ لیا ہے جیسے نصاریٰ کے بچے اپنے راہب کے کپڑوں کو تبرک کے لئے کاٹ لیتے ہیں۔

نماز بندے کو گناہوں سے پاک کرنے والی ہے، نمازی نماز میں اکمل حالات میں داخل ہوتا ہے کیونکہ نماز افضل عمل ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ**، **أَعْلَمُ** میں دو تا ویلیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ فعل مضارع ہے۔ بعض نے فرمایا: اسم بمعنی فاعل ہے جیسے کہا جاتا ہے: اللہ اکبر بمعنی کبیر جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

لعرک ما ادری و انی لاوجل      علی اینا تعدو النیة اول

تیری عمر کی قسم! میں نہیں جانتا اور مجھے خوف ہے موت ہم میں سے کس پر پہلے آتی ہے۔

اگر اعلیٰ فعل ہو تو ما اعلیٰ کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا اور میم کا میم میں ادغام بھی جائز ہے، اگر تو اسے عالم کے معنی میں اسم بنائے تو (ما) اضافت کی وجہ سے محل جر میں ہوگا۔

ابن عطیہ نے کہا: نحو یوں کے اجماع کی وجہ سے اس کو منصرف بنانا صحیح نہیں۔ اختلاف افعال میں ہے جب اس کے ساتھ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یقول فی الركوع والسجود، صفحہ 292، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 177، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 118، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

نام رکھا جائے اور یہ نکرہ ہو۔ سیبویہ اور خلیل اس کو غیر منصرف بناتے ہیں انفس اسے منصرف بناتا ہے (1)۔ مہدوی نے کہا: اَعْلَمُ میں تنوین مقدر کرنا جائز ہے جب تو اسے عالم کے معنی میں مقدر کرے، اور ما کو اس کی وجہ سے نصب ہوگی۔ یہ حواج بیت اللہ کی مثل ہوگا۔ جوہری نے کہا: نسوة حواج بیت اللہ اضافت کے ساتھ جب وہ حج کریں اور اگر وہ حج نہ کریں تو تو کہے گا حواج بیت اللہ۔ بیت کو تو نصب دے گا کیونکہ حواج میں تنوین کا ارادہ کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَا تَعْلَمُونَ اس ارشاد کی تاویل میں علماء تاویل کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ابلیس (لعنة الله عليه) نے غرور کیا اور اس میں تکبر داخل ہوا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسے آسمان کا خازن بنایا اور اسے عزت بخشی تو وہ دل میں اعتقاد رکھنے لگا کہ اسے فضیلت حاصل ہے (2)۔ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سے معصیت اور کفر کو حقیر جانا۔ فرشتوں نے کہا: وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَلَقَدْ سَلِّكُوكَ فرشتے نہیں جانتے تھے کہ ابلیس کے نفس میں اس کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ قتادہ نے کہا: جب فرشتوں نے کہا: اَتَجْعَلُ فِيْهَا اللّٰهَ تَعَالٰی کو علم تھا کہ جن کو وہ خلیفہ بنا رہا ہے ان میں انبیاء، فضلاء اور طاعت شعار بھی ہیں تو فرمایا: اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ (3) میں کہتا ہوں: اس معنی کا بھی احتمال ہے میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اس میں سے جو پہلے ہو چکا ہے اور جو ہو رہا ہے اور جو ہوگا۔ یہ عام ہے۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ

إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ③

”اور اللہ تعالیٰ نے سکھا دیئے آدم کو تمام اشیاء کے نام پھر پیش کیا انہیں فرشتوں کے سامنے اور فرمایا: بتاؤ تم تو مجھے نام ان چیزوں کے اگر تم (اپنے خیال میں) سچے ہو۔“

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا، عَلَّمَ بمعنی عرف (پہچان کرانا) ہے اور یہاں تعلیم سے مراد اپنا علم ضروری الہام کرنا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ علم فرشتے جبریل کے واسطے سے ہو جیسا کہ آگے آئے گا۔ اس کو علم مجہول کا صیغہ بھی پڑھا گیا ہے۔ پہلا لفظ زیادہ ظاہر ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ علماء صوفیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے تعلیم حق دینے کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام نے ان اسماء کو جانا اور اللہ تعالیٰ کے یاد کرانے کے ساتھ انہوں نے یاد کیا اور جو اللہ تعالیٰ نے آدم سے عہد کیا تھا وہ بھول گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس میں ان کے نفس کے سپرد کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ قَنُوقٍ وَلَمْ يَجِدْ لَهُ عَزْمًا ④ (طہ)

اور ہم نے حکم دیا تھا آدم کو اس سے پہلے (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اس کا کوئی قصد۔



ابن عطاء نے کہا: اگر حضرت آدم علیہ السلام کے لئے ان اسماء کا علم منکشف نہ کیا جاتا تو ملائکہ کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام خبر دینے سے زیادہ عاجز ہوتے۔ یہ واضح ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی کنیت ابوالبشر ہے۔ بعض نے فرمایا: ابو محمد ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت خاتم الانبیاء بیان کی جاتی ہے یہ پہلی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کی کنیت ابو محمد تھی، زمین میں ابوالبشر تھی، اس کی اصل دو ہمزوں کے ساتھ ہے (آدم) کیونکہ یہ افعول کے وزن پر ہے مگر دوسرے ہمزہ کو لین کر دیا، جب اس کو حرکت دینے کی طرف توجہ پڑے گا تو تو اسے واؤ بنادے گا تو جمع میں اودام کہے گا کیونکہ یاء میں اس کی اصل معروف نہیں ہے عام طور پر اس میں واؤ رکھی جاتی ہے یہ خفش سے مروی ہے۔

اس کے مادہ اشتقاق میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ ادمۃ الارض وادیہا سے مشتق ہے جس کا معنی زمین کی سطح ہے، انسان اس سے پیدا ہوا اسی وجہ سے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ادمۃ سے مشتق ہے، جس کا معنی گندمی رنگ ہے۔ ادمۃ میں اختلاف ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد گندمی رنگ ہے۔ نظر نے کہا: یہ سفید رنگ ہے آدم علیہ السلام سفید تھے اور یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے ناقۃ ادماء، جب اونٹنی سفید ہو۔ اس اشتقاق پر اس کی جمع اذہم اور اودام ہوگی جیسے حمرا و احامر ہے، کسی بھی طرح منصرف نہیں اور ادمۃ سے مشتق ہو تو اس کی جمع آدمون ہوگی۔ اس کے والوں پر اس کو منصرف بنانا لازم ہوگا۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ یہ ادمۃ الارض سے مشتق ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: آدم کو آدم اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ زمین کی سطح سے پیدا کیا گیا ہے انسان کو انسان اس لئے کہا جاتا ہے کہ کیونکہ یہ بھولا تھا۔ ابن سعد نے اسے طبقات میں ذکر کیا ہے۔ سدی نے ابومالک سے اور ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، مرہ الہمدانی نے حضرت ابن مسعود سے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے قصہ میں روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو زمین کی طرف بھیجا تا کہ اس کی مٹی لے آئے۔ زمین نے کہا: میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں کہ تو مجھ سے کچھ کمی کرے یا مجھے عیب لگائے۔ جبریل واپس آگئے اور مٹی نہ لے آئے۔ جبریل نے عرض کی: یا اللہ! اس نے تیری پناہ مانگی تو میں نے اسے پناہ دے دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے میکائیل کو بھیجا۔ زمین نے اس سے بھی پناہ چاہی تو انہوں نے پناہ دے دی۔ وہ بھی واپس آگئے اور اسی طرح کہا جس طرح جبریل نے کہا۔ پھر ملک الموت کو بھیجا۔ زمین نے اس سے پناہ مانگی تو ملک الموت نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں واپس جاؤں اور اس کا امر نافذ نہ کروں پس ملک الموت نے زمین کی سطح سے مٹی لی اور اسے مختلف جگہوں سے لیا کسی ایک جگہ سے نہ لیا، سرخ، سفید اور سیاہ مٹی سے لیا، اسی وجہ سے آدم علیہ السلام کی اولاد کے رنگ مختلف ہیں۔ اسی وجہ سے آدم کو آدم کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمین کی سطح سے لئے گئے تھے (1)۔ ملک الموت مٹی لے کر اوپر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا: تجھے رحم نہ آیا جب زمین نے تیری بارگاہ میں تضرع و زاری کی۔ فرمایا: میں نے تیرا معاملہ اس کے قول سے زیادہ سخت

دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو آدم کی اولاد کی ارواح قبض کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، پھر مٹی کو ترک کیا حتیٰ کہ وہ لیس دار مٹی بن گئی، اللہ تعالیٰ اس مٹی کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے، پھر اس مٹی کو چھوڑ دیا گیا حتیٰ کہ اس میں بدبو پیدا ہو گئی اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قِنْ حَمًا مَّسْتُونٌ ⑤ (الحجر) یعنی بدبودار سیاہ مٹی سے۔ پھر ملائکہ سے فرمایا: اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ⑥ (ص) (فَاِذَا سَوَّیْتُهُ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا اِلَیْہِ سَجْدًا ⑦) (الحجر) (میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کچھڑ سے پس جب میں اس کو سنوار دوں اور پھونک ماروں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا تا کہ ابلیس ان پر بڑائی نہ جتلائے۔ فرمایا: کیا تو اس پر بڑائی جتلاتا ہے جسے میں نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا ہے اور میں اس کی وجہ سے فخر نہیں کرتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے بشر بنایا، وہ جمعہ کے دن کی مقدار سے چالیس سال تک مٹی کا جسم رہا۔ پھر ملائکہ اس کے پاس سے گزرے تو وہ اس سے ڈر گئے، جب انہوں نے اسے دیکھا سب سے زیادہ ڈرنے والا ابلیس تھا وہ اس کے پاس سے گزرتا تھا تو اسے مارتا تھا، جسم سے آواز پیدا ہوتی تھی جس طرح ٹھیکری سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا: مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ ⑧ (الرحمن)

شیطان کہتا: اللہ تعالیٰ نے اسے کس امر کے لئے پیدا کیا ہے ابلیس اس آدم کے ڈھانچے کے منہ سے داخل ہوتا اور اس کی دبر سے نکل جاتا۔ ابلیس نے ملائکہ سے کہا: اس سے مت ڈرو یہ کھوکھلا ہے۔ اگر مجھے اس پر مسلط کیا گیا تو میں اسے ہلاک کر دوں گا۔ کہا جاتا ہے: ابلیس جب فرشتوں کے ساتھ آدم کے ڈھانچے کے پاس سے گزرتا تو کہتا: کیا تم نے ملاحظہ کیا اسے جس کے مشابہہ تم نے کوئی مخلوق نہیں دیکھی۔ اگر اسے تم پر فضیلت دی جائے اور تمہیں اس کی اطاعت کا حکم دیا جائے تو تم ایسا کرو گے؟ فرشتوں نے کہا: ہم اپنے رب کے حکم کی اطاعت کریں گے۔ ابلیس نے اپنے دل میں سوچا اگر اسے مجھ پر فضیلت دی گئی تو میں اس کی اطاعت نہیں کروں گا۔ اگر مجھے اس پر فضیلت دی گئی تو میں اسے ہلاک کر دوں گا۔ جب وہ وقت آیا جب اللہ تعالیٰ نے آدم میں روح پھونکنے کا ارادہ کیا تو فرشتوں سے کہا: جب میں اس میں اپنی روح پھونکوں تو تم اس کے لئے سجدہ کرنا۔ جب اس میں روح پھونکی گئی اور روح آدم کے سر میں داخل ہوئی تو آدم نے چھینک ماری۔ فرشتوں نے اسے کہا: تم کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، آدم نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رَحِمَ رَبِّکَ (تیرا رب تجھ پر رحم فرمائے) جب روح آدم علیہ السلام کی آنکھوں میں پہنچی تو آدم علیہ السلام نے جنت کے پھلوں کو دیکھا۔ جب روح آدم کے پیٹ میں داخل ہوئی تو آدم کو کھانے کا شوق ہوا۔ پس وہ روح کے قدموں تک پہنچنے سے پہلے جلدی کرتے ہوئے جنت کے پھلوں کی طرف لپکے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیاء: 37) فَسَجَدَ الْمَلَائِکَةُ كُلُّهُمْ اٰجَعُوْنَ ⑨ اِلَّا ابْلِیْسَ ⑩ اَلِیْ اَنْ یَّکُوْنَ مَعَ السَّٰجِدِیْنَ ⑪ (الحجر) (پس سر بسجود ہو گئے فرشتے سارے کے سارے سوائے ابلیس کے اس نے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو)۔

ترمذی نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے آدم علیہ السلام کو اسی (مٹی کی) مٹی سے پیدا فرمایا جو اس نے تمام زمین سے بھری تھی، پس بنو آدم زمین کی قدر پر پیدا ہوئے، بعض سرخ، بعض سفید اور بعض سیاہ پیدا ہوئے اور بعض گندمی رنگ پیدا ہوئے، کچھ نرم مزاج، کچھ سخت مزاج، کچھ خبیث اور کچھ نیک۔ ابو یسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ ادیم جمع ہے آدم کی۔ شاعر نے کہا:

الناس اخیاف و شتی فی الشیم و کلہم یجمعہم وجہ الادم

لوگ مختلف رنگوں میں ہیں اور خصائل میں بھی مختلف ہیں، سب کو زمین کی سطح جمع کرتی ہے۔

پس آدم، ادیم اور الادم سے مشتق ہے نہ کہ الادمۃ سے مشتق ہے اللہ بہتر جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے دونوں سے مشتق ہو، اس مسئلہ کی مزید وضاحت تخلیق آدم کے قصہ میں سورۃ انعام میں آئے گی۔

آدم، یہ غیر منصرف ہے، ابو جعفر نحاس نے کہا: آدم معرفہ ہونے کی صورت میں غیر منصرف ہے اس پر نحو یوں کا اجماع ہے کیونکہ افعل کے وزن پر یہ معرفہ ہے اور بھریوں کے نزدیک اس کو منصرف ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں مگر دو علتیں، اگر تو اسے نکرہ بنادے اور یہ نعت نہ ہو۔ خلیل اور سیبویہ اسے غیر منصرف بناتے ہیں۔ انھیں سعید اسے منصرف بناتا ہے کہ یہ نعت ہے اور یہ فعل کے وزن پر ہے اگر نعت نہ ہو تو منصرف ہوگا۔ ابواسحاق زجاج نے کہا: قول تو سیبویہ کا ہے۔ وہ نعت اور غیر میں فرق نہیں کرتے، کیونکہ یہ بعینہ وہی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ نے فرمایا **الْأَسْمَاءُ كُلُّهَا**، **الْأَسْمَاءُ** سے یہاں مراد عبارات ہیں۔ کبھی اسم بولا جاتا ہے اور مراد مسمیٰ ہوتا ہے جیسے تیرا قول **يَذْقَانِ**۔ الاسد شجاع۔ کبھی نام سے مراد ذات ہوتی ہے جیسے تیرا قول اسد کے تین حرف میں پہلی صورت میں اسم بولا گیا ہے مراد مسمیٰ ہے، دوسری صورت میں مسمیٰ مراد نہیں ہوتا کبھی لغت میں ذات کے قائم مقام عبارت ہوتی ہے اس طرح استعمال اکثر ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا** یہ مشہور تاویلات پر ہے۔ اسی سے نبی کریم ﷺ کا قول **إِنَّ اللَّهَ تِسْعَةٌ وَتِسْعِينَ اسْمًا**۔ (2) کبھی یہ ذات کے قائم مقام ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ذات، نفس، عین اسم یہ سب ہم معنی ہیں۔ اکثر اہل علم نے **سَبَّحَ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى** (الاعلیٰ) اور **تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ** (الرحمن: 78) اور **إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءُ سَمِيَّتُوهَا** (النجم: 23) میں اسم کو ذات پر محمول کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** وہ اسماء جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائے ان کے معنی میں اہل تاویل نے اختلاف کیا ہے۔ حضرات ابن عباس، عکرمہ، قتادہ، مجاہد، ابن جبیر نے کہا: علیہ اسماء جمیع الاشیاء کلھا جلیلھا وحقیرھا۔ (3) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام بڑی چھوٹی اشیاء کے اسماء سکھا دیئے۔

عاصم بن کلیب نے سعد مولیٰ حسن بن علی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں حضرت ابن عباس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پس

1۔ جامع ترمذی، کتاب ابواب التفسیر، باب من سورۃ البقرہ، صفحہ 120، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فی اسماء اللہ تعالیٰ وفضل من احصاها، صفحہ 342، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 2531، خیار القرآن، پہلی کیشز

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 119، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)



لوگوں نے برتنوں کے نام اور کوڑے کے نام کا ذکر کیا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے تمام چیزوں کے اسماء سکھائے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی مرفوع حدیث میں بھی مروی ہے اور لفظ کلمہ بھی اسی بات کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ کلمہ یا احاطہ اور عموم کے لئے وضع کیا گیا ہے، بخاری میں حضرت انس کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مومنین قیامت کے روز جمع ہوں گے اور کہیں گے: اگر ہم اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سفارش طلب کریں۔ پس لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور انہیں کہیں گے: انت ابو الناس خلقتک اللہ بیدہ و اسجد لک ملائکتہ و علمت اسماء کل شیء، آپ لوگوں کے باپ ہیں اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا، تیرے سامنے ملائکہ کو سجدہ کرایا، تجھے ہر چیز کا نام سکھایا (1)۔ الحدیث۔

ابن خویز منداد نے کہا: اس آیت میں دلیل ہے کہ لغت توقیفی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اور تفصیلی اسماء سکھائے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر چیز کا نام بتایا حتیٰ کہ پیالے اور دودھ دوہنے کے برتن کا نام بھی بتایا۔

شیبان نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی مخلوق کے اسماء بتائے جبکہ ملائکہ کو نہ بتائے۔ چیز کا نام بتایا اور ہر چیز کی منفعت اس کی جنس کی طرف پھیری۔ نحاس نے کہا: یہ کچھ اس باب کے متعلق مروی ہے اس میں سے بہتر یہی قول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اجناس کے اسماء بھی سکھائے اور ان کے منافع بھی بتائے۔ یہ چیز اس طرح اور یہ اس کام کے لئے ہے۔ طبری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو فرشتوں کے اسماء اور ان کو اپنی اولاد کے اسماء سکھائے۔ طبری نے اس قول کو پسند کیا ہے اور اس قول کی وجہ سے اسے ترجیح دی ہے: ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ۔

ابن زید نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کے اسماء سکھائے۔ ربیع بن خثیم نے کہا: خاص فرشتوں کے اسماء سکھائے۔ قتبی نے کہا: جو کچھ زمین میں پیدا فرمایا ان کے اسماء سکھائے۔ بعض علماء نے فرمایا: اجناس اور انواع کے اسماء سکھائے (2) میں کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ ذکر کریں گے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اہل تاویل کا اختلاف ہے کہ کیا ملائکہ پر اشخاص کے نام پیش کئے تھے یا صرف اسماء پیش کئے تھے بغیر اشخاص کے۔ حضرت ابن مسعود وغیرہ نے فرمایا: اشخاص کو پیش کیا گیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عَرَضَهُمْ (انہیں پیش کیا)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَتُؤْتُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ (ان کے اسماء بتاؤ) عرب کہتے ہیں: عرضت الشئ فاعرض میں نے چیز کو ظاہر کیا تو وہ ظاہر ہو گئی۔ اسی سے ہے عرضت الشئ للبیع میں نے چیز کو بیع کے لئے پیش کیا۔ حدیث پاک میں ہے: انہ عرضہم امثال الذر انہوں نے چیونٹیوں کی مثال میں پیش کیا (3)۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قوله وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَخْفِئًا، حدیث نمبر 6962، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 120-119، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 120، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

حضرت ابن عباس وغیرہ نے فرمایا: اسماء کو پیش کیا۔ حضرت ابن مسعود کے حرف میں ہے: عرضہن۔ انہوں نے ضمیر اسماء کی طرف لوٹائی اشخاص کی طرف نہیں، ہن ضمیر مؤنث کے ساتھ خاص ہے، اور حضرت ابی کے حرف میں ہے: عرضہا۔ مجاہد نے کہا: اصحاب الاسماء کو پیش کیا جنہوں نے کہا: اسماء سے مراد المسمیات ہے تو انہوں نے ابی کی قرأت عرضہا کو بنیاد بنایا۔ اور جنہوں نے عرضہم پڑھا انہوں نے کہا: لفظ اسماء اشخاص پر دلالت کرتا ہے اس لئے اسماء کے لئے عرضہم کہنا جائز ہے اور هؤلاء میں اسماء کے اشخاص کی طرف اشارہ مراد ہے لیکن اگرچہ وہ غائب تھے پس وہ حاضر تھا جو ان میں سے تھا ایک سبب کی وجہ سے اور وہ ان کے اسماء تھے۔ ابن عطیہ نے کہا: وہ بات جو ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء سکھائے اور ان اجناس کے ساتھ ان پر اسماء پیش کئے پھر ان چیزوں کو لانا کہہ کر پیش کیا اور ان سے ان چیزوں کے اسماء پوچھے، جو حضرت آدم علیہ السلام نے سیکھ لئے تھے۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں بتایا اس چیز کا یہ اسم ہے اس چیز کا یہ اسم ہے۔

الماوردی نے کہا: اصح یہ ہے کہ ذوات کو پیش کیا گیا تھا پھر ان چیزوں کے پیش کرنے کے زمانہ میں دو قول ہیں۔ (۱) ان چیزوں کو تخلیق کرنے کے بعد انہیں پیش کیا۔ (۲) اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے دلوں میں ان کی تصویریں ڈال دیں پھر انہیں پیش کیا۔

**مسئلہ نمبر 5:** اس میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلے عربی زبان کس نے بولی۔ حضرت کعب الاحبار سے مروی ہے کہ سب سے پہلے جس نے عربی اور سریانی کتاب اور باقی کتب جس نے وضع کیں اور تمام زبانوں کے ساتھ کلام کی وہ حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ یہ حضرت کعب الاحبار کے علاوہ علماء کا بھی قول ہے۔

اگر کہا جائے کہ حضرت کعب احبار سے بہتر وجہ مروی ہے، فرمایا: جس نے سب سے پہلے عربی بولی وہ حضرت جبریل علیہ السلام تھے انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی زبان پر عربی ڈالی تھی اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے سام کی زبان پر ڈالی تھی اسے ثور بن زید نے خالد بن معدان سے انہوں نے حضرت کعب سے روایت کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: جس نے واضح عربی زبان سب سے پہلے بولی وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے وہ اس وقت دس سال کے تھے۔ یہ بھی مروی ہے کہ سب سے پہلے عربی یعر ب بن قحطان نے بولی۔ اس کے علاوہ بھی روایات ہیں۔ ہم کہیں گے: صحیح یہ ہے کہ سب سے پہلے انسانوں میں سے عربی بولنے والے حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا**۔ اور لغات ساری اسماء ہیں۔ پس یہ اس کے تحت داخل ہیں، سنت میں بھی اس طرح آیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء سکھائے حتیٰ کہ پلیٹ اور پیالہ کا نام بھی سکھایا اور پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے سب سے پہلے عربی بولی تو اس میں احتمال ہے کہ یہ مراد ہو کہ حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے سب سے پہلے حضرت اسماعیل نے عربی بولی۔ اسی طرح اس قول کے علاوہ جو اقوال ہیں وہ بھی اس پر محمول ہوں گے کہ مذکور شخص نے اپنے قبیلہ سے پہلے عربی بولی۔ اس کی دلیل وہی ہے جو میں نے ذکر کر دی ہے۔ اسی طرح جبریل





حکمت والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّ تِمْثَالَ ذُرِّيَّةٍ فِىْ سِتْرِكَ لَافِيْهِ خُبْرٌ

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سُبْحٰنَكَ تو اس سے پاک ہے کہ تیرے سوا کوئی غیب جانے۔ یہ اُنْمُوْنِ کے ارشاد کا جواب ہے۔ فرشتوں نے جواب دیا کہ وہ تو صرف وہی جانتے ہیں جو وہ انہیں سکھاتا ہے اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس کا انہیں علم نہیں جیسا کہ ہم میں سے جہال کہا کرتے ہیں۔ مَا عَلَّمْتَنَا میں معنی الذی ہے یعنی وہ جو تو نے ہمیں سکھایا اور یہ بھی جائز ہے کہ مَا مَصْدَرِیْہ ہو بمعنی الا تعلیمک ایانا یعنی مگر تیرے سکھانے کے ساتھ۔

**مسئلہ نمبر 2:** جس شخص سے کوئی علمی بات پوچھی جائے اور وہ نہ جانتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ فرشتوں، انبیاء، فضلاء علماء کی اقتداء کرتے ہوئے یہ کہے کہ اللہ جانتا ہے میں نہیں جانتا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے بتایا کہ علماء کی موت کے ساتھ علم اٹھالیا جائے گا، پھر جہال لوگ باقی رہ جائیں گے جن سے فتوے طلب کئے جائیں گے وہ اپنی رائے سے فتوے دیں گے، وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے (1)۔ نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام اور تابعین سے اس آیت کے معنی میں جو مروی ہے وہ البستی نے ”المسند الصحیح“ میں حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: بری جگہیں کون سی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نہیں جانتا حتیٰ کہ میں جبریل امین علیہ السلام سے پوچھ لوں۔ جبریل امین علیہ السلام سے آپ ﷺ نے پوچھا تو اس نے کہا: میں نہیں جانتا حتیٰ کہ میں میکائیل علیہ السلام سے پوچھ لوں، میکائیل علیہ السلام آئے اور کہا: اچھی جگہیں مساجد ہیں اور بری جگہیں بازار ہیں۔ حضرت عذیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دادی کو ایک مسئلہ میں کہا تھا تو لوٹ جاتی کہ میں لوگوں سے پوچھ لوں (2)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ذَابَتْ دَعَا عَلِی الْکِبَد۔ یہ تین مرتبہ فرمایا۔ لوگوں نے کہا: اے امیر المومنین! یہ کیا ہے؟ فرمایا: آدمی سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے جو وہ نہ جانتا ہو تو وہ کہے: اللہ اعلم

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا: مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ جب وہ شخص واپس چلا گیا تو حضرت ابن عمر نے فرمایا: ابن عمر نے ٹھیک کہا ہے ایسی بات پوچھی گئی جس کا اسے علم نہیں تھا تو کہا: مجھے اس کا علم نہیں۔ یہ داری نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔ صحیح مسلم میں ابی عقیل یحییٰ بن متوکل صاحب ”بہیۃ“ نے کہا: میں قاسم بن عبید اللہ اور یحییٰ بن سعید کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یحییٰ نے قاسم سے کہا: اے ابامحمد! تیرے جیسے شخص پر بہت بری بات ہے کہ اس دین کا کوئی مسئلہ تجھ سے پوچھا جائے پھر تیرے پاس اس کا علم نہ ہو اور نہ کوئی کشادگی کا راستہ ہو، یا کہا: نہ علم اور نہ نکلنے کا راستہ ہو۔ قاسم نے اسے کہا: یہ کس کے لئے؟ یحییٰ نے کہا کیونکہ تو ہدایت یافتہ اماموں ابو بکر اور عمر کا بیٹا ہے۔ قاسم نے اسے کہا: جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل بخشی ہے اس کے نزدیک اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ انسان بغیر علم کے کوئی بات کرے یا کسی غیر ثقہ سے مسئلہ

1۔ صحیح بخاری کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم، حدیث نمبر 98، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 6511

2۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2507۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 2027، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پوچھے۔ بیٹی خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت مالک بن انس نے فرمایا: میں نے ابن ہریرہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ عالم کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو لادری (میں نہیں جانتا) کی میراث دے تاکہ ان کے ہاتھوں میں اصل ہو۔ جب ان میں سے کسی سے وہ مسئلہ پوچھا جائے گا جو وہ نہیں جانتا ہوگا تو کہے گا: میں نہیں جانتا۔ یثیم بن جمیل نے ذکر کیا ہے کہ میں امام مالک سے اڑتالیس مسائل پوچھنے کے لئے حاضر ہوا تو امام مالک نے بتیس مسائل میں فرمایا: میں نہیں جانتا۔

میں کہتا ہوں: صحابہ کرام، تابعین اور فقہاء مسلمین سے بہت سی ایسی مثالیں مروی ہیں۔ اس کو اس ریاست کے ترک اور علم میں انصاف نہ کرنے پر محمول کیا جائے گا۔ ابن عبدالبر نے کہا: علم کی برکت اور اس کے آداب سے اس میں انصاف کرنا ہے جس نے انصاف نہیں کیا اس نے نہ سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی۔ یونس بن عبدالاعلیٰ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے ابن وہب کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ہمارے زمانہ میں انصاف سے کم کوئی چیز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صورت امام مالک کے زمانہ میں تھی تو پھر آج ہمارے زمانہ میں کیا حالت ہوگی جبکہ ہمارے اندر فساد پھیل چکا ہے اور کینے لوگوں کی کثرت ہے اور ریاست کے لئے علم طلب کیا جاتا ہے نہ کہ شعور و آگاہی کے لئے بلکہ دنیا میں ظاہر ہونے اور اس جنگ و جدل کے ذریعے اپنے ہم عصروں پر غلبہ پانے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے جو جنگ و جدل دل میں قساوت پیدا کرتا ہے اور کینہ چھوڑتا ہے۔ اس کو عدم تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہونے پر محمول کیا جائے گا۔

کہاں گئی وہ روایت جو حضرت عمر سے مروی ہے۔ انہوں نے کہا: اپنی عورتوں کے مہر چالیس اوقیہ سے زائد نہ رکھو اگرچہ عورت ذی العصبہ کی بیٹی ہو یعنی یزید بن حصین حارثی کی بیٹی ہو جو زیادہ رکھے گا زیادتی بیت المال میں رکھی جائے گی۔ ایک عورت انھی جو صائب الرائے عورتوں میں سے تھی۔ اس کا منہ لبا تھا اور ناک چھٹی تھی۔ اس عورت نے کہا: تجھے اس مہر کے تعین کا حق نہیں۔ حضرت عمر نے کہا: کیوں؟ اس عورت نے کہا: اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَتَيْتُكُمْ اِخْلَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا (النساء: 20) دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز۔

حضرت عمر نے کہا: عورت صحیح ہے اور مرد نے غلطی کی (1)۔

وکیع نے ابو محشر سے انہوں نے حضرت محمد بن کعب القرظی سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک شخص نے حضرت علی سے ایک مسئلہ پوچھا۔ حضرت علی نے جواب دیا تو اس شخص نے کہا: اے امیر المومنین! مسئلہ اس طرح نہیں ہے بلکہ اس طرح ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو نے صحیح کہا اور میں نے غلطی کی ہر علم والے کے اوپر علم والا ہوتا ہے۔

ابو محمد قاسم بن اصبح نے ذکر کیا ہے کہ جب میں مشرق کی طرف چلا تو میں قیروان میں اتر اور میں نے بکر بن حماد سے مسدد کی حدیث حاصل کی۔ پھر میں بغداد چلا گیا۔ میں لوگوں سے ملا۔ جب میں واپس آیا تو میں مسدد کی حدیث کی تکمیل کے لئے ان کی طرف لوٹا۔ ایک میں نے ان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پڑھی ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قوم آئی جس کا تعلق مضر قبیلہ سے تھا انہوں نے دھاری دار قمیصیں پہنی ہوئی تھیں بکر بن حماد نے کہا: حدیث میں لفظ مجتباں النمار نہیں مجتباں

الشار ہے۔ میں نے کہا: مجتہب النمار ہے۔ میں نے اندلس اور عراق میں جس شخص پر بھی یہ حدیث پڑھی میں نے اسی طرح پڑھی ہے۔

بکر بن حماد نے کہا: تو عراق میں جانے کی وجہ سے ہمارا مقابلہ کرتا ہے اور ہم پر فخر کرتا ہے۔ پھر مجھے فرمایا: ہمارے ساتھ اس شیخ کی طرف چلو..... جو مسجد میں موجود تھے..... اس کے پاس اس کا علم ہے۔ ہم ان کی طرف چلے۔ ہم نے ان سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: ہو مجتہب النمار جیسا کہ میں نے کہا تھا۔ یہ لوگ دھاری دار کپڑے پہنتے تھے اور ان کے گریبان سامنے ہوتے تھے۔ النمار جمع ہے تہوۃ کی۔ بکر بن حماد نے اپنا ناک پکڑ لیا اور کہا: حق کے لئے میری ناک خاک آلود ہو، حق کے لئے میری ناک خاک آلود ہو پھر وہ واپس چلے گئے۔ یزید بن ولید بن عبد الملک نے کتنا اچھا کہا ہے:

اذا ما تحدثت فی مجلس تناهی حدیثی الی ما علمت

ولم اعد علی الی غیرہ و کان اذا ما تناهی سکت

جب میں کسی مجلس میں بات کرتا ہوں تو میری بات کی انتہا میرے علم تک ہوتی ہے۔ میں اپنے علم کو کسی غیر تک نہیں لے جاتا۔ جب میرے علم کی انتہا ہوتی ہے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **سُبْحٰنَكَ**۔ خلیل اور سیبویہ کے نزدیک سبحان مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یہ اس معنی کو ادا کرتا ہے: **نَسْبُكَ** تسبیحاً ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں۔ کسائی نے کہا: یہ نداء کی وجہ سے منصوب ہے (1)۔

**الْعَلِیْمُ** مبالغہ کے لئے اور اللہ کی مخلوق میں معلومات میں کثرت کا معنی دینے کے لئے فاعل کے وزن پر ہے۔ **الْحَكِیْمُ** اس کا معنی حاکم ہے، ان دونوں اسموں کے درمیان مزید مبالغہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی محکم ہے اس صورت میں حکیم فعل کی صفات سے ہوگا، پھر یہ مفعول سے فاعل کے وزن پر پھیرا گیا ہے جیسا کہ **مُسَبِّحٌ** کو **سَبِّحٌ** کی طرف اور **مُؤَلِّمٌ** کو **الِیْمٌ** کی طرف پھیرا گیا ہے یہ ابن انباری نے کہا ہے۔ ایک قوم نے کہا: **الْحَكِیْمُ** کا معنی ہے فساد سے روکنے والا۔ اسی سے **حکمة الدجاء** کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی گھوڑے کو مقصد کے بغیر بھاگنے اور چلنے سے روکتی ہے۔ جریر نے کہا:

أبْنِی حَنِیْفَہُ احْكُمَا سَفْهَاءَکُم اِنِ اخَافَ عَلَیْکُم اِنْ اغْضَبَا (2)

کیا بنی حنیفہ نے اپنے نادان لوگوں کو روکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں تم پر غصہ کروں گا یعنی کیا بنی حنیفہ نے اپنے بیوقوف لوگوں کو فساد سے روکا ہے۔

زہیر نے کہا:

القائد الخیل منکوباً دواہراً قد أحکمت حکمات القذِّ والابتنّا

وہ گھوڑوں کو چلاتا ہے حتیٰ کہ ان کے پاؤں گھس جاتے ہیں وہ روئی اور چمڑے کی لگاموں کے ساتھ روکے گئے ہیں۔



عرب کہتے ہیں: احکم الیتیم عن کذا و کذا۔ یتیم کو اس اس کام سے روکا گیا ہے۔ السورۃ المحکمۃ ایسی سورت جس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہو اور اس کے ساتھ اس کو ملایا جائے جو اس سے خارج ہو اور اس پر زائد کیا جائے جو اس سے نہ ہو ایسی حکمت ہے، وہ بھی حکمت والے کو جہالت سے روکتی ہے۔ کہا جاتا ہے: احکم الشیء جب کوئی کسی کام کو پختہ کرے اور مقصود سے خارج ہونے والی چیز کو روکے۔ فہو محکم و حکیم کثرت اور زیادتی حکمت کا معنی ہے۔

قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاسْمَآئِهِمْ ۖ فَلَمَّا اَنْۢبَاَهُمْ بِاسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ

اِلٰی ۙ اَعْلَمُ غَيْۢبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوۡنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوۡنَ ﴿۳۱﴾

”فرمایا: اے آدم! بتا دو انہیں ان چیزوں کے نام پھر جب آدم نے بتادیے فرشتوں کو ان کے نام تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نہیں کہا تھا میں نے تم سے کہ میں خوب جانتا ہوں سب چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں اور زمین کی اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاسْمَآئِهِمْ اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اَنْۢبِئْهُمْ بِاسْمَآئِهِمْ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت اور بلند مرتبہ پر آگاہ کرنے کے لئے انہیں حکم دیا کہ فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتاؤ، اس کے بعد کہ پہلے ان پر ان چیزوں کو پیش کیا گیا تھا تا کہ فرشتے جان لیں کہ وہ زیادہ جاننے والا ہے اس کے متعلق جو ان سے پوچھی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل تھے کہ اسے ان پر مقدم کیا اس کے لئے انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا اور انہیں آدم کا شاگرد بنایا اور انہیں حکم دیا کہ ان سے علم حاصل کرو۔ پس حضرت آدم علیہ السلام کو عظمت و جلال کا رتبہ حاصل ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے مسجودہ بنایا اور علم کے ساتھ خاص فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 2:** اس آیت میں علم اور صاحب علم کی فضیلت کی دلیل ہے۔ حدیث پاک میں ہے فرشتے طالب علم کی رضا کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں (1) یعنی اس کے لئے تواضع و انکساری کرتے ہیں۔ فرشتے تمام لوگوں میں صرف اہل علم کے لئے ایسا کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ادب و احترام ان پر حضرت آدم علیہ السلام کے لئے لازم کیا تھا۔ پس یہ ادب ان فرشتوں نے سیکھا جب بھی کسی بشر میں علم ان کے سامنے ظاہر ہوا فرشتے اس کے لئے جھک گئے اور علم کی اور صاحب علم کی تعظیم کے لئے عاجزی کرنے لگے اور علم طلب کرنے اور علم سے مشغول ہونے کی وجہ سے یہ سب تعظیم و مرتبہ انہیں ملا۔ یہ مرتبہ تو طلباء کا ہے، علماء اور جو رہبانہیں ہیں ان کا مقام کتنا بلند ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان لوگوں میں سے کرے بے شک وہ عظیم فضل والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اس باب میں علماء نے اختلاف کیا ہے کہ فرشتے افضل ہیں یا انسان افضل ہے علماء کے دو قول ہیں: ایک قوم کا خیال ہے کہ انسانوں میں سے رسل، فرشتوں میں رسل پر افضل ہیں، انسانوں میں سے اولیاء فرشتوں میں سے

1۔ جامع ترمذی، ابواب العلم عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ، صفحہ 93، جلد 2 (وزارت تعلیم)

سنن ابی داؤد، کتاب العلم، حدیث نمبر 3157، خیاء القرآن پبلی کیشنز

اولیاء پر افضل ہیں۔ دوسرے علماء کا خیال ہے: ملاء اعلیٰ افضل ہے جنہوں نے فرشتوں کو فضیلت دی ہے۔ انہوں نے ان آیات اور احادیث سے حجت پکڑی ہے: عِبَادُ فَكِّرُوا ۝ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِ رَبِّهِمْ يَعْمَلُونَ ۝ (الانبیاء) (وہ معزز بندے ہیں نہیں سبقت کرتے بات کرنے میں اور وہ اسی کے حکم پر کار بند ہیں)۔

لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ (التحریم) لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ (النساء: 172) ہرگز عار نہ سمجھے گا مسیح (علیہ السلام) کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے)

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ (الانعام: 50) (آپ فرمائیے کہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہوں گا کہ خود جان لیتا ہوں غیب اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں)۔

اور بخاری میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَاءِ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَاءِ خَيْرٍ مِنْهُمْ (1) (جس نے مجھے مجمع میں یاد کیا میں نے اسے ان سے بہتر مجمع میں یاد کیا)۔ یہ نص ہے۔

اور جن علماء نے بنی آدم کو ترجیح دی انہوں نے ان آیات اور احادیث سے استدلال کیا ہے: إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ (البینہ) (یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہی ساری مخلوق سے بہتر ہیں)۔

اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: ان الملائكة لتضع اجنحتها رضى لطالب العلم (2) (بے شک فرشتے طالب علم کی رضا کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں)۔

یہ حدیث ابو داؤد نے ذکر کی ہے، ایسی بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل عرفات کی وجہ سے فرشتوں پر مباہات فرماتا ہے اور مباہات ہمیشہ افضل کی وجہ سے کیا جاتا ہے (3)۔ واللہ اعلم بالصواب

بعض علماء نے فرمایا: کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ انبیاء فرشتوں سے افضل ہیں اور نہ اس پر کوئی قطعی دلیل ہے کہ فرشتے انبیاء سے افضل ہیں کیونکہ اس کا طریق اللہ تعالیٰ کا کوئی ارشاد ہے یا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے یا اجماع امت ہے اور اس بارے میں کوئی چیز بھی موجود نہیں ہے۔ قدر یہ فرقہ اور قاضی ابوبکر کا نظریہ اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: فرشتے افضل ہیں۔ قاضی نے کہا: ہمارے اصحاب نے اور شیعہ حضرات نے جو کہا ہے کہ انبیاء افضل ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ تو ان کو یہ کہا جائے گا کہ مسجود، سجدہ کرنے والے سے افضل نہیں ہوتا، کیا

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ عز وجل ويحذركم الله نفسه، حدیث نمبر 6856، خیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة، صفحہ 93، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل يوم عرفه، صفحہ 436، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کعبہ مسجود لہا ہے انبیاء اور ساری مخلوق اسے سجدہ کرتی ہے، پھر انبیاء بالاتفاق کعبہ سے بہتر و افضل ہیں، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے کیونکہ سجدہ عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ جب معاملہ اس طرح ہے تو سجدہ ایک چھت کی طرف ہونا اس کی دلیل نہیں ہے کہ وہ چھت سجدہ کرنے والے اور عابد سے افضل ہے اور یہ بات واضح ہے۔ مزید بیان اس کے بعد آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** اس آیت میں دلیل ہے کہ کوئی شخص غیب نہیں جانتا مگر جن کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے جیسے انبیاء کرام یا جن کے لئے اللہ نے علم غیب عطا فرمایا وہ کسی کو کچھ غیب کا علم عطا فرمادیں۔ پس یہ نجومی اور کاہن لوگ جھوٹے ہیں۔ مزید بیان ان شاء اللہ سورہ انعام میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ**۔ یعنی ان کے قول کو میں جانتا ہوں جو انہوں نے کہا **أَنْتَ جَعَلْ فِيهَا مَنْ يَفْسِدُ فِيهَا** (البقرہ: 30) یہ مکی اور ماوردی نے کہا ہے زہراوی نے کہا اور جو انہوں نے ظاہر کیا وہ ان کا حضرت آدم علیہ السلام کو جلدی سے سجدہ کرنا ہے **وَمَا لَكُمْ تَكْتُمُونَ**۔

حضرات ابن عباس، ابن مسعود اور سعید بن جبیر نے فرمایا: اس سے مراد وہ ہے جو ابلیس نے کبر اور معصیت اپنے نفس میں چھپائی ہوئی تھی۔ ابن عطیہ نے کہا: تکتُمون جمع کا صیغہ ہے جبکہ وہ چھپانے والا اس قول کے مطابق ایک تھا تو یہ مجازاً اور وسعت کی بنا پر ہے۔ کسی قوم کو کہا جاتا ہے جبکہ ان کے ایک بیوقوف نے جنایت کی ہوتی ہے: **انتم فعلتم کذا** تم نے یہ کیا ہے، یعنی تم میں سے ایک ایسا کرنے والا ہے۔ یہ سختی کرنے کے ارادہ سے ہوتا ہے (1)۔

اسی سے یہ ارشاد ہے: **إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ** (الحجرات) حالانکہ ایک شخص عینہ نے پکارا تھا یا بعض نے کہا: اقرع نے پکارا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: ظاہر کرنا اور چھپانا یہ تمام فرشتوں کے ظواہر اور اسرار کی معرفت کے عمومی معنی پر ہے۔ مہدی بن میمون نے کہا: ہم حضرت حسن کے پاس موجود تھے۔ ان سے حسن بن دینار نے پوچھا: فرشتوں نے کیا چھپایا تھا؟ حسن نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو فرشتوں نے ایک عجیب مخلوق دیکھی گویا ان کے دلوں میں کچھ خیال پیدا ہوا۔ فرمایا: پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے اور آپس میں سرگوشی کرنے لگے اور کہا: تمہیں اس مخلوق سے کوئی پریشانی نہیں اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق پیدا ہی نہیں فرمائی مگر ہم اس سے اس کے نزدیک افضل ہیں۔

**مَا تُبْدُونَ** سے **مَا** اس کو **أَعْلَمُ** کی وجہ سے نصب جائز ہے اس بنا پر کہ **أَعْلَمُ** فعل ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ **أَعْلَمُ** بمعنی عالم ہو اور اس کی وجہ سے **مَا** منصوب ہو پس یہ حواجر بیت اللہ کی مثل ہوگا۔ پہلے اس کی بحث گزر چکی ہے۔

**وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ**

**مِنَ الْكَافِرِينَ** ﴿۳۷﴾



”جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور (داخل) ہو گیا وہ کفار (کے ٹولہ) میں۔“

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَإِذْ قُلْنَا اس** سے پہلے اذ کر محذوف ہے اور رہا ابو عبیدہ کا قول کہ (اذ) زائد ہے یہ جائز نہیں ہے کیونکہ (اذ) ظرف ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے، اور فرمایا: قلنا، قلت نہیں فرمایا، چونکہ جبار عظیم ذات اپنے بارے جماعت کے فعل کے ساتھ خبر دیتی ہے، عظمت اور ذکر کی بلندی کے اظہار کے اعتبار سے۔

ملائکہ یہ جمع ہے ملک کی۔ اس سے پہلے اس کا ذکر گزر چکا ہے، آدم کے متعلق اور اس کے اشتقاق کے متعلق بھی بحث گزر چکی ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ابو جعفر بن قعقاع سے مروی ہے کہ انہوں نے ملائکہ کی تاء کو اسجد وا کے جیم کے ضمہ کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔ اس کی مثال الحمد للہ

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اسْجُدُوا**۔ سجود کا معنی عرب کلام میں تذلل اور خضوع (عجز و انکساری) ہے۔ شاعر نے کہا:

بجمع تفضل البلق فی حجراتہ      تروی الا کم فیہا سجداً للحواف

اس شعر میں سجداً خضوع و خشوع اور جھکنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

عین ساجدة، ایسی آنکھ جو دیکھنے سے تھکی ہوتی ہو۔ سجدہ کی غایت زمین پر چہرے کو رکھنا ہے۔ ابن فارس نے کہا: **سَجَدَ** اس وقت بولتے ہیں جب کوئی سر جھکا دے۔ جس نے سجدہ کیا اس نے عجز کا اظہار کیا۔ الاسجد، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا۔ ابو عمرو نے کہا: اسجد کا معنی ہے: اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ شاعر نے کہا:

فضول ازمتہا اسجدت      سجود النصاری لاحبارہا

ان عورتوں نے اپنے جمال کے اضافی کپڑے اپنی کلائیوں پر اس طرح جھکا دیئے جیسے نصاریٰ اپنے راہبوں کے لئے جھکتے ہیں۔

ابو عبیدہ نے کہا: ایک بنی اسد کے اعرابی نے یہ کہا:

وقلن لہ اسجد للیل فاسجد

انہوں نے اسے کہا لیلیٰ کے لئے سر جھکا دے تو اس نے سر جھکا دیا۔

یعنی جب اونٹ نے سر جھکا دیا۔ دراهم الاسجد ان سکوں کو کہتے ہیں جن کے اوپر تصویریں بنی ہوئی تھیں اور لوگ انہیں سجدہ کرتے تھے۔ شاعر کا قول ہے:

دانی بہا کدراہم الاسجد      اس نے اسے پایا دراهم الاسجد کی طرح۔

**مسئلہ نمبر 3:** وہ علماء جنہوں نے حضرت آدم اور ان کی اولاد کی فضیلت پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے استدلال کیا، جس

میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا اسْجُدُوا لِآدَمَ۔ فرمایا: یہ ارشاد دلیل ہے کہ انسان فرشتوں سے افضل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسْجُدُوا لِآدَمَ کا معنی ہے: آدم کے چہرے کی طرف منہ کرتے ہوئے سجدہ کرو۔ یہ اس طرح ہے جیسے ارشاد فرمایا: اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِكَ الشَّيْءِ (الاسراء: 78) یعنی سورج کے ڈھلنے کے وقت نماز قائم کرو اور اس طرح ارشاد ہے: نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سُجُوْدًا ۝ (ص) یعنی جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔

یعنی اس کی تخلیق مکمل ہونے کے وقت تم اس کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا۔ پہلے ہم نے بیان کیا ہے کہ مسجودہ، سجدہ کرنے والے سے افضل نہیں ہوتا جیسا کہ قبلہ سجدہ کرنے والوں سے افضل نہیں۔

اگر کہا جائے کہ اگر حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل نہ تھے تو پھر اس کے ان کے سجدہ کرنے کے حکم میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ملائکہ نے جب اپنی تسبیح اور تقدیس کی وجہ سے کچھ بڑائی محسوس کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تاکہ انہیں دکھائے کہ وہ ان کی تسبیح و تقدیس اور ان کی عبادت سے مستغنی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام پر عیب لگایا اور انہیں حقیر سمجھا اور ان کی صنعت کے خصائص کو نہ جان سکے تو انہیں بطور تکریم حضرت آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قول اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيْهَا (البقرہ: 30) پر سزا دینے کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیا جب فرشتوں کو فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ان سے خطاب فرمائے گا تو وہ یہی کہیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا اِنِّیْ خَالِیْقُ بَشَرًا قِنْ طٰیْنٍ ۝ (ص) (بے شک میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کیچڑ سے اور اسے خلیفہ بنانے والا ہوں) وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سُجُوْدًا ۝ (ص) اور جب میں پھونک دوں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ تاکہ یہ تمہارے لئے اس وقت سزا ہوگی اس قول کی جو تم نے اب کہا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابن عباس نے انسان کی فضیلت پر اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی قسم اٹھائی ہے۔ فرمایا: لَعَنَّاكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ (الحجر) (اے محبوب! آپ کی زندگی کی قسم! یہ (اپنی طاقت کے نشہ میں) مست ہیں اور بہکے بہکے پھر رہے ہیں) اور اپنے اس قول سے عذاب سے امن کی نوید سنائی: لَيَغْفِرَنَّ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (الفتح: 2) (تاکہ دور فرمادے آپ کے لئے اللہ تعالیٰ جو الزام آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے اور جو ہجرت کے بعد لگائے گئے)۔

اور فرشتوں کو فرمایا: وَ مَنْ یَقُلْ مِنْهُمْ اِنِّیْ اِلٰهٌ مِنْ دُوْنِهِ فَاُولٰٓئِكَ نَجْزِیْهِمْ جَهَنَّمَ (الانبياء: 29) (اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو ہم اسے سزا دیں گے جہنم کی)۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی ذات کی قسم نہیں اٹھائی اسی طرح فرشتوں کی حیات کی قسم نہیں اٹھائی۔ لعنہ نہیں فرمایا، اور آسمان اور زمین کی قسم اٹھائی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین اور آسمان، عرش اور ساتوں جنتوں

سے افضل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے التین اور زیتون کی قسم اٹھائی ہے۔ اور رہا یہ ارشاد: مَنْ يَتَّقِلْ مِنْهُمْ النَّحْلُ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی مکرم ﷺ سے یہ فرمانا ہے: لَئِنْ أَشْرَكَ كُنْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (الزمر: 65)۔ (اور اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو ضائع ہو جائیں گے آپ کے اعمال اور آپ بھی خاسرین میں سے ہو جائیں گے)۔ پس اس میں کوئی فضیلت کی دلیل نہیں ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4:** ملائکہ کے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کی کیفیت میں اختلاف ہے جبکہ اس پر اتفاق ہے کہ یہ سجدہ عبادت نہ تھا۔ جمہور علماء نے فرمایا: فرشتوں کو اپنی پیشانیاں زمین پر رکھنے کا حکم تھا جیسا کہ نماز میں سجدہ ہوتا ہے، کیونکہ عرف و شرع میں سجدہ سے یہی ظاہر ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے یہ سجدہ آدم علیہ السلام کی تکریم اور ان کی فضیلت کے اظہار کے لئے تھا اور اللہ تعالیٰ کی طاعت کے لئے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام ان کے لئے ایسے تھے جیسے ہمارے لئے قبلہ ہے۔ لہذا دم کا مطلب ہے الی آدم جیسے کہا جاتا ہے: صِلْ لِلْقِبْلَةِ یعنی قبلہ کی طرف نماز پڑھی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ سجدہ وہ نہیں تھا جو آج معروف ہے یعنی زمین پر پیشانی رکھنا بلکہ لغت کی اصل کے اعتبار سے تھا یعنی تذلل و انقیاد یعنی حضرت آدم کے لئے انہوں نے عجز کا اظہار کیا اور اس کی فضیلت کا اقرار کیا۔ فَسَجَدُوا یعنی جو انہیں حکم دیا گیا تھا اس کی انہوں نے پیروی کی۔ اس میں بھی اختلاف ہے کیا وہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے خاص تھا۔ پس اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے سجدہ کرنا جائز نہیں یا حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانہ تک جائز تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا (یوسف: 100) (آپ نے اوپر اٹھایا اپنے والدین کو تخت پر اور وہ گر پڑے آپ کے لئے سجدہ کرتے ہوئے)۔

یہ آخری وقت تھا جب مخلوق کے لئے سجدہ مباح کیا گیا تھا اور اکثر کا قول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو درخت اور اونٹ نے سجدہ کیا، تو صحابہ کرام نے عرض کیا: حضور! ہم درخت اور بد کے ہوئے اونٹ کی نسبت آپ کو سجدہ کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ رب العالمین کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ کرنا روا نہیں۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور البہقی نے اپنی صحیح میں ابوداؤد سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب حضرت معاذ بن جبل شام سے آئے تو رسول اللہ ﷺ کو سجدہ کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ حضرت معاذ نے کہا: یا رسول اللہ! میں شام سے آیا ہوں میں نے لوگوں کو دیکھا وہ اپنے بزرگوں اور راہبوں کو سجدہ کرتے ہیں، میں نے آپ کے ساتھ ایسا کرنا چاہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کر۔ اگر میں کسی کو کسی کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ عورت اپنے رب کا حق ادا نہیں کر سکتی حتیٰ کہ اپنے خاوند کا حق ادا کرے حتیٰ کہ اگر عورت کا خاوند اس سے خواہش پوری کرنے کا سوال کرے اور وہ کجاوے پر ہو تو اسے منع نہ کرے (1)۔ حدیث میں القتب کا لفظ آیا ہے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا: عربوں کے نزدیک ولادت کے لئے کرسی کا وجود باعث عزت تھا۔ وہ اپنی عورتوں کو ولادت کے وقت کجاوے پر سوار کرتے تھے۔ بعض طرق میں ہے انسان کو سجدہ سے منع فرمایا اور مصافحہ کا حکم دیا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة، حدیث نمبر 1842، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



میں کہتا ہوں: یہ سجدہ جس سے منع کیا گیا ہے جاہل صوفیوں نے سماع اور مشائخ کے پاس جانے کے وقت اور ان سے دعا طلب کرنے کے وقت وہ سجدہ کرتے ہیں، ان میں سے کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ جب اس کے گمان کے مطابق اسے حال آجاتا ہے تو وہ سجدہ کرتا ہے۔ یہ اس کی جہالت ہے خواہ وہ قبلہ کی طرف ہو یا غیر قبلہ کی طرف ہو یہ ان کی جہالت ہے ان کی یہ ساری سعی و کوشش ضائع ہے اور ان کا عمل نامراد ہے۔

**مسئلہ نمبر 5: إِلَّا ابْلِيَسْ**۔ مستثنیٰ متصل کی بنا پر اسے نصب دی گئی ہے کیونکہ جمہور کے قول کے مطابق یہ فرشتوں میں سے تھا۔ یہ حضرات ابن عباس، ابن مسعود، ابن جریج، ابن مسیب اور قتادہ وغیرہم کا قول ہے۔ شیخ ابوالحسن کا اختیار بھی یہی ہے۔ طبری نے اس کو ترجیح دی ہے۔ یہی آیت کا ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ابلیس کا نام عزازیل تھا یہ معزز فرشتوں میں سے تھا اس کے چار پر تھے پھر بعد میں یہ مایوس کر دیا گیا۔ سماک بن حرب نے حضرت عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: ابلیس، ملائکہ میں سے تھا جب اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر غضب فرمایا اور اس پر لعنت کی تو وہ شیطان بن گیا۔ الماوردی نے حکایت کیا ہے کہ حضرت قتادہ سے مروی ہے، ملائکہ میں سے افضل صنف سے ابلیس تھا جن کو الجنة کہا جاتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: جن ملائکہ میں سے ایک قبیلہ ہے جو آگ سے پیدا کئے گئے ہیں، ابلیس ان میں سے تھا اور باقی تمام ملائکہ نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ ابن زید، حسن اور قتادہ نے بھی یہ کہا ہے کہ ابلیس ابوالجن ہے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر ہیں وہ فرشتہ نہیں تھا۔ حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح مروی ہے، فرمایا: اس کا نام الحارث تھا۔ شہر بن حوشب اور بعض اصولیوں نے کہا: ابلیس ان جنوں میں سے تھا جو زمین میں رہتے تھے ملائکہ نے ان کو قتل کیا تھا، ابلیس چھوٹا تھا تو اسے فرشتوں نے قید کر لیا تھا۔ پھر یہ ملائکہ کے ساتھ عبادت کرتا رہا اور اسے خطاب کیا گیا (1)۔ طبری نے یہ حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے، اس مفہوم پر یہ مستثنیٰ منقطع ہو گا۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (النساء: 157) (نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی) اور ارشاد ہے: إِلَّا مَا ذُكِّرْتُمْ (المائدہ: 3) سوائے اس کے جسے تم ذبح کرلو۔ شاعر نے کہا:

ليس عليك عطش ولا جوع  
الا الرقاد والرقاد ممنوع

تم پر نہ پیاس ہے نہ بھوک مگر نیند اور نیند بھی ممنوع ہے۔

بعض یہ قول کرنے والے اس سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کا وصف بیان فرمایا: لَا يَخْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ① (التحریم)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِلَّا ابْلِيَسْ ② كَانَ مِنَ الْجِنِّ (الکہف: 50)

اور جن ملائکہ کا غیر ہیں تو پہلے مقالہ والوں نے یہ جواب دیا کہ ملائکہ سے ابلیس کو خارج کرنا ممتنع نہیں ہے جبکہ پہلے ہی اس

کی شکاوت اللہ کے علم میں تھی۔ یہ اس کی طرف سے عدل ہے، جو اللہ تعالیٰ کرتا ہے اس سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جاتا۔ اس کی تخلیق میں نہ آگ شامل تھی اور نہ وہ شہوت سے مرکب تھا جب اس پر غضب ہوا۔ یہ بعید نہیں کہ وہ ملائکہ سے ہو اور جن علماء نے کہا وہ زمین کے جنوں میں سے تھاپس وہ قیدی بنایا گیا اس کے مقابلہ میں روایت کیا گیا ہے کہ ابلیس وہ ہے جس نے زمین میں ملائکہ کے لشکر کے ساتھ جنوں سے جنگ کی۔ یہ مہدی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ ثعلبی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ابلیس ملائکہ کے قبائل میں سے ایک قبیلہ سے تھا جنہیں جن کہا جاتا تھا ان کو نار السموم سے پیدا کیا گیا تھا اور ملائکہ نور سے پیدا کئے گئے ہیں۔ سریانی زبان میں اس کا نام عزازیل ہے۔ عربی میں حارث ہے یہ جنت کے دربانوں میں سے تھا اور آسمان دنیا کے ملائکہ کا رئیس تھا۔ اسے آسمان دنیا اور زمین کی سلطانی بخشی گئی تھی۔ یہ ملائکہ میں سے انتہائی محنت کرنے والا اور زیادہ علم والا تھا۔ آسمان اور زمین جو کچھ ہے سب کا انتظام چلاتا تھا، اس نے اپنا شرف اور عظمت دیکھی تو یہی چیز اس کے کفر کا باعث بنی۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے دھتکارا ہوا شیطان بنا دیا۔ جب انسان کی خطا کبر کی وجہ سے ہو تو اس کی امید نہ رکھو اور جب خطا معصیت کی وجہ سے ہو تو پھر اس کی امید رکھو۔

آدم علیہ السلام کی خطا معصیت تھی اور ابلیس کی خطا تکبر تھی۔ ملائکہ کو ان کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے جن کہا جاتا ہے قرآن حکیم میں ہے: **وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ نَسَبًا** (الصافات: 158) شاعر نے کہا:

سخر من جن الملائك تسعة قياما لديه يعملون بلا اجر (1)

اس نے ملائکہ کے جنوں میں نو مسخر کر لیے۔ وہ اس کے سامنے بلا اجر کام کرتے رہتے ہیں۔

جب وہ جنت کے خزان (دربانوں) میں سے تھا تو اس کی طرف نسبت کی گئی، اس کا اسم جنت سے مشتق کیا گیا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ ابلیس کا وزن افعیل ہے، اور یہ ابلاس سے مشتق ہے۔ اس کا معنی اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا ہے اور یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ معرفہ ہے۔ اسماء میں اس کی مثال نہیں ہے اسے عجمیت کے ساتھ مشابہ کیا گیا ہے۔ یہ ابو عبیدہ وغیرہ نے کہا ہے، بعض علماء نے فرمایا: یہ عجمی ہے اس کا اشتقاق نہیں ہے عجمہ اور تعریف کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ یہ زجاج وغیرہ نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد آبی اس کا معنی ہے جس کا اسے حکم دیا گیا تھا اس سے وہ رک گیا۔ اسی مفہوم میں صحیح حدیث حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے جو نبی کریم ﷺ سے انہوں نے روایت فرمائی ہے: **اذا قرأ ابن آدم السجدة (فسجد) اعتزل الشيطان يبكي يقول يا ذيلة... في رواية... يا ذیلی امر ابن آدم بالسجود فسجد فله الجنة و امرت بالسجود فابیت فلی النار (2)** (مسلم) جب انسان آیت سجدہ پڑھتا ہے پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان جدا ہو کر رونے لگتا ہے اور کہتا ہے: ہاے افسوس! انسان کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کیا۔ پس اس کے لئے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے سجدہ نہ کیا تو میرے لئے دوزخ ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 125، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلوۃ، صفحہ 61، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کہا جاتا ہے: اَبَیْ یٰأَبَیْ اَبَیْ قَیْ نَادِر حَرْفٌ هُوَ جَوْفَعْلٌ یَفْعَلُ کے وزن پر آیا ہے حالانکہ اس میں حروف حلقی میں سے کوئی حرف نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الف مضارع حروف حلقیہ کے لئے ہے۔ زجاج نے کہا: میں نے اسماعیل بن اسحاق القاضی کو یہ کہتے سنا کہ میرے نزدیک الف مضارع حروف حلقیہ کے لئے ہے۔ نحاس نے کہا: میں نہیں جانتا کہ ابواحق نے اسماعیل سے اس حرف کے علاوہ کوئی اس طرح روایت کیا ہو۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اُسْتُکْبِرَ، استکبار کا معنی استعظام (اپنے آپ کو بڑا سمجھنا) ہے۔ گویا اس نے سجدہ کو اپنے حق میں ناپسند کیا اور آدم کے حق میں بڑا سمجھا۔ اس نے حضرت آدم کے سامنے سجدہ کرنے کو ترک کیا اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کی حکمت کو نہ سمجھتے ہوئے۔

نبی کریم ﷺ نے اس حالت کو کبر سے تعبیر فرمایا۔ ارشاد فرمایا: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِی قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ کِبَرٍ۔ (1) جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر تکبر ہوگا۔ ایک روایت میں ہے ایک شخص نے عرض کی: ایک آدمی اچھا لباس اور اچھا جوتا پسند کرتا ہے (کیا یہ کبر ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ جَمِیْلٌ یُّحِبُّ الْجَمَالَ۔ الْکِبْرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَغِیْطُ النَّاسِ۔ (2) اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے تکبر یہ ہے کہ حق کو باطل قرار دے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔ (مسلم) غِیْطُ النَّاسِ کے الفاظ بھی مروی ہیں۔ اس کا معنی بھی حقیر سمجھنا ہے۔ جب آدمی نعمت کا شکر ادا نہ کرے تو کہتے ہیں: غِیْطُ فُلَانٍ النِّعْمَةُ... غِیْطُ عَلَیْهِ قَوْلًا قَالَهُ یَعْنِیْ فِیْهِ نَیْیَ اَسَیْبٌ لِّگَیَا۔ اس معنی کی شیطان لعین نے وضاحت کی تھی۔ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِیْنٍ ۝ (اعراف) (میں بہتر ہوں اس سے تو نے پیدا کیا ہے مجھے آگ سے اور پیدا کیا ہے اسے کیچڑ سے)۔ عَاَسَجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا ۝ (الاسراء) (کیا میں سجدہ کروں اس (آدم) کو جس کو تو نے کیچڑ سے پیدا کیا)۔ لَمْ اَكُنْ لَّا سَجْدًا لِیَبْشَرَ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَّسْتُوْنٍ ۝ (الحجر) (میں گوارا نہیں کرتا کہ سجدہ کروں اس بشر کو جسے تو نے پیدا کیا ہے بجنے والی مٹی سے جو پہلے سیاہ بدبودار تھی)۔

اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے کافر قرار دیا جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی امر یا رسول اللہ ﷺ کے کسی امر کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کا حکم بھی یہی ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ابن القاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ سب سے پہلا گناہ حسد اور کبر تھا، ابلیس نے حضرت آدم سے حسد کیا، درخت کھلانے میں حضرت آدم کو برا بیخوش کیا (3)۔ قتادہ نے کہا: ابلیس نے حضرت آدم سے حسد کیا اس نعمت و کرامت کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ شیطان نے کہا: میں ناری ہوں اور تو طینی (مٹی سے بنا ہوا) ہے۔ گناہوں کا آغاز کبر سے ہوا پھر حرص

1۔ جامع ترمذی، ابواب البعد والصلۃ، صفحہ 21، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر و بیانہ، صفحہ 65، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 125، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)



سے ہوا حتیٰ کہ آدم علیہ السلام نے درخت سے کھالیا پھر آدم کے بیٹے نے اپنے بھائی سے حسد کیا۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ** بعض علماء نے فرمایا: یہاں **كَانَ** بمعنی صادر ہے۔ جس طرح

کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: **فَكَانَ مِنَ الْمُعْرِقِينَ** (ہود) یعنی وہ غرق ہونے والوں میں سے ہو گیا۔ شاعر نے کہا:

بِتِيْهَاءٍ قَفِيٍّ وَالْمَطِيٍّ كَانَهَا قَطَا انْحَزَنَ قَدْ كَانَتْ فِرَاحًا بِيَوْضِهَا

تہیاء کا میدان اور سواریاں غمگین کوچ کی طرح ہیں جن کے انڈے بچے بن گئے ہیں۔

ابن فورک نے کہا: یہاں **كَانَ** کو بمعنی صادر کرنا خطا ہے، اصول اس قول کا رد کرتے ہیں۔ جمہور متاویلین نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ کفر کرے گا، کیونکہ حقیقۃً کافر اور حقیقۃً مومن وہی ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ یہ آخر میں کفر اختیار کرے گا یا ایمان اختیار کرے گا (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے کیونکہ صحیح بخاری میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اعمال کا دار و مدار خاتمہ پر ہے (2)، بعض علماء نے فرمایا: ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی اسی ہزار سال عبادت کی اور جنت میں علی الاستدراج، ریاست اور خزانہ دی گئی جس طرح کہ منافقین نے اپنی زبانوں کی اطراف پر **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کی شہادت دی، اور اسی طرح بلعام نے اپنی زبان کی طرف سے اسم اعظم کی گواہی دی۔ پس یہ چیز اس کی ریاست میں تھی جبکہ کبر اس کے نفس میں متمکن تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: شیطان سوچتا تھا کہ اس کو جو اللہ نے نعمتیں دی ہیں ان کی وجہ سے اسے فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے، اسی وجہ سے اس نے کہا **تَهَآ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ** (اعراف: 12)

اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتَ بِيدَيَّ** <sup>1</sup> **أَسْتَكْبِرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ** (ص) (کس چیز نے باز رکھا تمہیں اس کو سجدہ کرنے سے جسے میں نے پیدا کیا اپنے دونوں ہاتھوں سے کیا تم نے تکبر کیا یا تو اپنے آپ کو اس سے عالی مرتبہ خیال کرتا ہے)۔

یعنی تو نے تکبر کیا حالانکہ تجھے کبر نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے تکبر نہیں کیا جب میں نے اسے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور کبر تو میرے لئے مناسب ہے۔ اسی لئے فرمایا: **وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ** شیطان کی خلقت کی اصل عزت کی آگ سے تھی اسی وجہ سے اس نے اللہ تعالیٰ کی عزت کی قسم اٹھائی اس نے کہا **فِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ** (ص) عزت نے اسے کبر دیا حتیٰ کہ اس نے آدم علیہ السلام پر اپنی فضیلت دیکھی۔

ابو صالح سے مروی ہے، فرمایا: ملائکہ عزت کے نور سے پیدا کئے گئے ہیں اور ابلیس عزت کی آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** ہمارے علماء نے فرمایا: جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کرامات اور خوارق للعادات امور ظاہر کرے جبکہ وہ نبی نہ ہو تو یہ چیز اس کی ولایت کی دلیل نہیں ہے، لیکن بعض صوفیاء اور رافضیوں کا نظریہ اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 125، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 961، جلد 2 (د۔ ت۔)۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب الاعمال بالخواتیم وما یخاف منها، حدیث 6012، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرامات دلیل ہیں کہ وہ ولی ہے اگر یہ ولی نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر کرامات ظاہر نہ فرماتا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کے ولی ہونے کا علم صحیح نہیں ہوتا مگر اس کے بعد کہ یہ معلوم ہو کہ وہ مومن ہو کفوت نہوا ہے۔ جب یہ معلوم نہ ہو کہ وہ مومن ہو کر مرا ہے تو ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ ہم قطعی طور پر کہیں کہ وہ اللہ کا ولی ہے کیونکہ اللہ کا ولی وہ ہوتا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ وہ ایمان سے ہی موافقت کرے گا۔ جب ہمارا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہمارے لئے کسی پر قطعی طور پر یہ حکم لگانا ممکن نہیں کہ وہ ایمان سے موافقت کرے گا نہ خود اپنے بارے کوئی قطعی طور پر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ بالآخر ایمان سے موافقت کرے گا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ چیز اللہ کے ولی ہونے پر دلیل نہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ ممنوع نہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اولیاء کو اپنے حسن انجام اور حسن عمل کے خاتمہ کی خبر دے دے اور اس کے ساتھ دوسروں کے حسن خاتمہ کی خبر دے دے (☆)۔

یہ شیخ ابوالحسن اشعری وغیرہ کا قول ہے۔ طبری کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ابلیس کے واقعہ سے انسان میں سے جو ابلیس کے مشابہ ہیں انہیں تنبیہ کرنا مقصود ہے اور وہ یہودی ہیں جنہوں نے حضرت محمد ﷺ کا انکار کیا حالانکہ وہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت کو جانتے تھے اور ان نعمتوں کو جانتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر اور ان کے اسلاف (1) پر کی تھیں۔

**مسئلہ نمبر 10:** علماء کا اختلاف ہے کہ ابلیس کافر تھا یا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: کافر نہیں تھا اور ابلیس نے سب سے پہلے کفر کیا اور بعض علماء نے فرمایا: اس سے پہلے کفار تھے اور وہ جن تھے جو زمین میں آباد تھے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ ابلیس نے جہالت یا عناد کی بنا پر کفر کیا تھا۔ اس میں اہل سنت و جماعت کے دو قول ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ اپنے کفر سے پہلے اللہ تعالیٰ کو جاننے والا تھا اور جس نے کہا اس نے جہالت کی وجہ سے کفر کیا تھا اس نے کہا اس کے کفر کے وقت اس سے علم چھین لیا گیا تھا اور جنہوں نے کہا عناد کی وجہ سے اس نے کفر کیا تھا اس نے کہا شیطان نے کفر کیا حالانکہ اس کے پاس علم تھا۔ ابن عطیہ نے کہا: علم کے باقی ہوتے ہوئے عناد کفر کرنا بعید ہے مگر یہ میرے نزدیک جائز ہے اللہ تعالیٰ جس کو رسوا کرنا چاہے اس کے لئے محال نہیں ہے۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا

تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ⑤

”اور ہم نے فرمایا: اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی اس جنت میں اور دونوں کھاؤ اس جنت سے جتنا چاہو جہاں

سے چاہو اور مت نزدیک جانا اس درخت کے ورنہ ہو جاؤ گے اپنا حق تلف کرنے والوں سے۔“

اس میں تیرہ مسائل ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 126، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

☆ اس قول میں اولیاء اللہ کے بارے حضرت مفسر نے زیادہ ہی شدت کا اظہار کیا ہے حالانکہ شرح عقائد مغنیہ میں اس پر جامع ترین گفتگو کی گئی ہے۔

ولایت کے ایمان، طاعات پر مواعبت اور معاصی سے اجتناب لازم ہے اور اولیاء اللہ سے کرامات کا وقوع حق ہے۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ** اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اس کے کفر کرنے کے وقت اپنی بارگاہ سے نکال دیا اور اسے جنت سے دور کر دیا اور اس کو نکالنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا (اسکن) یعنی ٹھہرو اور جنت کو مسکن بناؤ۔ **سكن اليه يسكن** سکونا (کسی کے پاس ٹھہرنا) **السكرن** آگ کو بھی کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

قد قُومْتُ بسكن وادهان  
آگ اور تیل لگانے کے ساتھ سیدھے کیے گئے۔

اور **السكرن** ہر وہ چیز جس کی طرف سکون حاصل کیا جائے، **السكرين** چھری کو کہتے ہیں اور چھری کو **سكرين** کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر مذبوح کی حرکت کو ساکن کر دیتی ہے، اسی سے **سكرين** ہے جس کا تصرف کم اور حرکت قلیل ہوتی ہے، **سكان السفينه** کشتی کا پچھلا حصہ وہ کشتی کو اضطراب سے سکون دیتا ہے اس لئے اسے **سكان السفينه** کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **السكرن** یہ نکلنے پر تنبیہ ہے کیونکہ سکنی ملکیت نہیں ہوتا اس لئے بعض عارفین نے کہا: سکنی ایک خاص مدت تک ہوتا ہے پھر وہ ختم ہو جاتا ہے پس جنت میں آدم و حواء کا دخول، بطور سکنی تھا نہ کہ بطور اقامت تھا۔ میں کہتا ہوں: جب یہ معنی ہو تو پھر جمہور کے قول کی اس میں دلیل ہے کہ جو کسی شخص کو اپنی کسی جگہ ٹھہرائے تو وہ ٹھہرنے کی وجہ سے مالک نہیں ہوگا۔ جب ٹھہرانے کی مدت ختم ہو جائے تو اس کے لئے اسے نکالنا جائز ہے۔ امام شعبی فرماتے تھے: جب کوئی شخص یہ کہے: **داري لك سكني** حق تموت میرا گھر تیرے لئے سکنی ہے یہاں تک کہ تو فوت ہو جائے تو وہ زندگی اور موت میں موہوب لہ (جس کو دیا گیا) کے لئے ہوگا۔ جب یہ کہا: **داري هذه اسكنها** حق تموت یہ میرا گھر ہے تو اس میں رہائش رکھ یہاں تک کہ تو فوت ہو جائے۔ تو مالک کی طرف لوٹے گا جب ٹھہرنے والا مر جائے گا۔ سکنی کی طرح عمری ہے مگر عمری میں سکنی کی نسبت اختلاف زیادہ قوی ہے۔ عمری پر کلام ان شاء اللہ سورہ ہود میں آئے گی۔ حربی نے کہا: میں نے ابن اعرابی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ عربوں کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ اشیاء مالک کی ملک میں ہوتی ہیں اور ان کے منافع اس کے لئے ہوتے ہیں جس کو عمری، رقبی، افتار، اخیال، منح، عریہ، سکنی، اطراق کے الفاظ بول کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ امام مالک اور ان کے قبیعین کی حجت ہے کہ ان چیزوں کا موہوب لہ مالک نہ ہوگا مگر منافع کا مالک ہوگا سوائے غلاموں کے۔ یہ لیث بن سعد، قاسم بن محمد اور یزید بن قسیط کا قول ہے۔

عمری یہ ہے کہ تو کسی شخص کو اپنے گھر میں اپنی عمر کی مدت یا اس کی عمر کی مدت ٹھہرائے، اسی طرح رقبی ہے۔ تو یہ کہے کہ اگر تو مجھ سے پہلے مر گیا تو میں تیری طرف لوٹ آؤں گا اور اگر میں تجھ سے پہلے مر گیا تو یہ تیرے لئے ہوگا۔ یہ المراقبہ سے ہے اور مراقبہ یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کی موت کو تار تار ہے۔ اسی وجہ سے اس کی اجازت اور عدم اجازت میں اختلاف ہے۔ ابو یوسف اور امام شافعی نے اس کی اجازت دی ہے گویا ان کے نزدیک یہ وصیت ہے اور امام مالک اور کوفیوں نے اس سے منع کیا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک عوغل کا قصد کرتا ہے۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ کیا اسے ملے گا؟ اور ہر ایک دوسرے کی موت



کی تمنا کرتا ہے، اس کے متعلق دو احادیث ہیں جن میں اجازت اور عدم اجازت کا ذکر ہے وہ دونوں احادیث ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کی ہیں۔ پہلی وہ ہے جسے حضرت جابر بن عبد اللہ نے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: العمری جائزۃ لمن اعمرھا والرقبی جائزۃ لمن ارقبھا۔ (1) یعنی عمری جائز ہے جس کے لئے اسے عمر بھر دیا گیا اور رقبی جائز ہے اس کے لئے جس کے لئے رقبی کیا گیا۔ اس حدیث میں عمری اور رقبی حکم میں برابر ہیں۔ دوسری وہ حدیث ہے جو حضرت ابن عمر نے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا رقبی ممن ارقب شیئاً فہو لہ حیاتہ و مباتہ۔ (2) ”فرمایا: رقبی نہیں ہے، پس جس کے لئے رقبی کیا گیا وہ حیات و موت میں اس کے لئے ہے۔“ فرمایا: رقبی یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو کہے: منی و منك موتاً میری اور تیری موت تک ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ”لا رقبی“ یہ نہیں ہے جو منع پر دلیل ہے اور من ارقب شیئاً فہو لہ۔ یہ جواز پر دلالت کرتا ہے۔ یہ دونوں احادیث نسائی نے بھی نقل کی ہیں۔ حضرت ابن عباس سے ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: عمری اور رقبی برابر ہیں۔ ابن منذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: العمری جائزۃ لمن اعمرھا والرقبی جائزۃ لمن ارقبھا۔ ابن منذر نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ یہ اس شخص کے لئے حجت ہے جس نے کہا: عمری اور رقبی برابر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور ثوری اور احمد نے بھی یہی کہا ہے کہ وہ پہلے کی طرف کبھی نہیں لوٹے گا۔ اسحاق کا بھی یہی قول ہے۔ طاؤس نے کہا: من ارقب شیئاً فہو سبیل المیراث جس کو کوئی چیز رقبی کے طور پر دی گئی تو وہ میراث ہے۔

الانقار، یہ فقار الظہر (پیٹھ کے مہرے) سے ماخوذ ہے۔ افقر تک نافقی یعنی میں نے تجھے عاریہ اس کی پیٹھ سوار ہونے کے لئے دی، افقرک الصید جب وہ تجھے اس کی پیٹھ پر قدرت دے حتیٰ کہ تو اس پر تیر پھینکے۔ اس کی مثل الاخیال ہے۔ کہا جاتا ہے: اخبلت فلاناً اذا امرتۃ ناقة یرکبھا او فرساً یغزو علیہ۔ جب کوئی اپنی اونٹنی سوار ہونے کے لئے یا گھوڑا جہاد کے لئے پیش کرے تو کہتے ہیں: اخبلت فلاناً۔ زہیر نے کہا:

هنا لك ان يستحبوا المال یخبلوا وان یسئلوا یعطوا وان ییسروا یغلوا

وہاں ان سے مال عاریہ لیا جائے تو وہ مال دیتے ہیں، اگر ان سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ مال دیتے ہیں اور وہ جب سے کہتے جاتے ہیں تو وہ مہنگے ہوتے ہیں۔

المنحة سے مراد عطیہ ہے۔ المنحة، دودھ کا عطیہ، النبیحة وہ اونٹنی یا بکری جو کوئی شخص دوسرے کو دودھ پینے کے لئے دیتا ہے پھر وہ اسے واپس کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: العاریۃ مؤداة والمنحة مردودة والدين مقضی والزعیم غارم (3) عاریہ دی گئی چیز واپس پہنچائی جائے گی دودھ والا جانور واپس کیا جائے گا اور قرض ادا کیا جائے گا اور زعیم غارم ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 173، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاحکام، باب الرقبی، حدیث نمبر 2373، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 173، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاحکام، باب الرقبی، حدیث نمبر 2372، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیع، باب تضمین العاریۃ، حدیث نمبر 3094، ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2046، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس حدیث کو ابوامامہ نے روایت کیا ہے۔ اسے ترمذی، دارقطنی وغیرہا نے ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

الاطراق، نر جانور عاریۃ دینا۔ استطرق فلان فلاناً فحله فلاں نے فلاں سے نر جانور طلب کیا تاکہ وہ اپنی اونٹنی پر بٹھائے فاطرقہ ایسا، اسے نر جانور دیا۔ کہا جاتا ہے: اطرقنی فحلت یعنی مجھے اپنا نر جانور دو تاکہ میں اپنی اونٹنی پر بٹھاؤں۔ طرق الفحل الناقة، اونٹ اونٹنی پر بیٹھا۔ طروقة الفحل، مادہ اونٹنی۔ کہا جاتا ہے: ناقة طروقة الفحل یہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو جفتی کے قابل ہو۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةُ، اَنْتَ فعل میں مضمر ضمیر کی تاکید کے لیے ہے، اس کی مثال یہ ہے فاذهبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ (مائدہ: 24) صرف اسکن و زوجن جائز نہیں ہے اور اذهب و ربك جائز نہیں ہے مگر ضرورت کے لیے جائز ہے۔ شاعر نے کہا:

قلت اذ اقبلت و زهر تهادی کنعاج الملا تعسفن رملا

میں نے کہا: جب وہ اور سفید چمکنے والیاں سوار ہو کر آہستہ آہستہ چل کر آئیں جیسے جنگلی گاہوں کا گروہ ہو۔

اس شعر میں زهر کا عطف ضمیر مضمر پر ہے جو اقبلت میں ہے۔ اس ضمیر کی تاکید نہیں لگائی گئی اور غیر قرآن میں بعیدی طور پر تاکید نہ لگانا جائز ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَزَوْجُكَ یہ قرآن کی لغت ہے۔ زوج ہاء کے بغیر۔ اس پر کلام پہلے گزر چکی ہے۔ صحیح مسلم میں آتا ہے (زوجۃ) حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی ایک زوجہ محترمہ کے ساتھ تھے۔ ایک شخص آپ کے پاس سے گزرا تو آپ ﷺ نے اسے بلایا۔ وہ آیا تو فرمایا: یا فلاں ہذا زوجتی فلائہ۔ یہ میری فلاں بیوی ہے۔ اس شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں کون ہوں جو یہ گمان کروں میں نے آپ کے متعلق کوئی ایسا گمان نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شیطان انسان میں خون کے چلنے کی طرف چلتا ہے (1)۔ حضرت آدم کی بیوی حضرت حوا تھی سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام ہی تھے جنہوں نے ان کا یہ نام رکھا جب وہ ان کی پسلی سے پیدا ہوئی تھیں مگر حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی تخلیق محسوس نہ ہوئی تھی۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو تکلیف محسوس ہوتی تو کوئی شخص اپنی بیوی پر مہربان نہ ہوتا۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ سے کہا گیا: یہ کون ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: عورت ہے۔ پوچھا گیا: اس کا نام کیا ہے؟ فرمایا: حوا۔ پوچھا گیا: اس کا امراۃ نام کیوں رکھا گیا؟ فرمایا: کیوں کہ یہ البراء (مرد) سے ہے۔ پوچھا گیا: اس کا نام حوا کیوں رکھا گیا؟ فرمایا: کیونکہ یہ حی (زندہ) سے پیدا کی گئی ہے۔ روایت ہے کہ ملائکہ نے یہ سب سوال کئے تاکہ حضرت آدم علیہ السلام کے علم کا تجربہ کر لیں، فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے پوچھا: اے آدم! کیا تو اس سے محبت کرتا ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ پھر فرشتوں نے حضرت حوا سے پوچھا: اے حوا! کیا تو حضرت آدم سے محبت کرتی ہے؟ حضرت حوا نے کہا: نہیں حالانکہ حضرت حوا کے دل میں، حضرت آدم علیہ السلام کی محبت سے کئی گنا زیادہ محبت تھی۔ فرشتوں نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب بیان انہ يستحب لمن رای خالیا بامراۃ الخ، صفحہ 216، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے محبت میں سچ بولتی ہوتی تو حضرت حوا بھی سچ کہتی۔ حضرات ابن مسعود اور ابن عباس نے فرمایا: جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں ٹھہرایا گیا تو وہ اس میں وحشت سے چلے جب سو گئے تو ان کی بائیں جانب سے چھوٹی پسلی سے حضرت حوا پیدا کی گئی تاکہ آپ اس سے سکون حاصل کریں اور مانوس ہوں، جب آپ جاگے تو آپ نے اسے دیکھا۔ پوچھا: تو کون ہے؟ حضرت حواء نے کہا: ایک عورت ہوں جو تیری پسلی سے پیدا کی گئی ہوں تاکہ تو سکون پائے (1)۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی معنی ہے **هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا ذُرُوجًا لِيُتَسَكَّنَ إِلَيْهَا** (اعراف: 189) (وہ (خدا ہے) جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک نفس سے اور بنایا اس سے اس کا جوڑا تاکہ اطمینان حاصل کرے اس (جوڑے) سے)۔

علماء نے فرمایا: اسی وجہ سے عورت کا مزاج ٹیڑھا ہوتا ہے کیونکہ وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے (2)۔ ایک روایت میں ہے: پسلی میں سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا حصہ ہے یہ تیرے لئے ایک طریقہ پر سیدھی نہیں ہوگی اگر تو اس سے فائدہ اٹھائے تو فائدہ اٹھالے جبکہ اس میں ٹیڑھا پن ہوگا۔ اگر تو اسے سیدھا کرنا چاہے گا تو تو اسے توڑ دے گا اور اس کا توڑنا اس کو طلاق دینا ہے (3)۔ شاعر نے کہا:

ہی الضلع العوجاء لست تقيها  
الا ان تقويم الضلوع انكسارها  
اتجمع ضعفا و اقتداراً على الفقى  
ليس عجيباً ضعفا و اقتدارها

یہ ٹیڑھی پسلی ہے تو اس کو سیدھا نہیں کر سکے گا۔ خبردار! اس کا سیدھا کرنا اس کو توڑنا ہے۔ کیا تو ایک نوجوان پر ضعف اور اقتدار کو جمع کرے گا کیا اس (عورت) کا ضعف اور اس کا اقتدار عجیب نہیں ہے۔

اس سے علماء نے خنثی مشکل کی میراث پر استدلال کیا ہے۔ جب اس میں عورتوں اور مردوں والی تمام صفات و علامات برابر ہوں مثلاً داڑھی بھی ہو، پستان بھی ہوں اور پیشاب کی جگہ میں بھی برابر ہو تو اعضاء کی کمی کا اعتبار ہوگا۔ اگر اس کی پسلیاں عورت کی پسلیوں سے کم ہیں تو اسے مرد والا حصہ دیا جائے گا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے..... کیونکہ حضرت حوا آدم علیہ السلام کی ایک پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ ان شاء اللہ مزید تفصیل آگے میراث کی بحث میں آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الْجَنَّةُ أَسْ كَامْنٍ** کا معنی باغ ہے۔ اس پر تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ معتزلہ اور قدریہ کے قول کی طرف توجہ نہیں دی جائے گی جو وہ کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت الخلد میں نہیں تھے بلکہ وہ عدن کی زمین میں ایک باغ میں تھے اور انہوں نے اپنی بدعت پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ اگر یہاں جنت سے جنت الخلد مراد ہوتی تو ابلیس جنت میں نہ پہنچتا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **لَا تَغْوِيَهَا وَلَا تَأْتِيَهَا** (الطور) اور فرمایا: **لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِلْهَا** (النبا) اور فرمایا: **لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْتِيَهَا** (الواقعة: 25)

1۔ المحرر الوجيز، صفحہ 126، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیۃ بالنساء، صفحہ 475، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیۃ بالنساء، صفحہ 475، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)



نیز وہ کہتے ہیں: اہل جنت تو جنت سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿٥﴾ (الحجر) نیز جنت دارالقدس ہے گناہوں اور خطاؤں سے پاک رکھی گئی ہے۔ جبکہ ابلیس نے تو لغویات کی اور جھوٹ بولا نیز حضرت آدم و حضرت حوا اپنی معصیت کی وجہ سے جنت سے باہر نکالے گئے۔

وہ کہتے ہیں: حضرت آدم علیہ السلام کے لئے یہ کیسے جائز تھا کہ وہ شجرۃ الخلد طلب کریں جبکہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کی بارگاہ میں بڑے مقرب تھے اور آپ عقل میں کمال رکھتے تھے حالانکہ وہ دارالخلد میں تھے اور ایسے ملک میں تھے جو کبھی پرانا ہونے والا نہیں تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو معرف باللام ذکر کیا ہے اور جو کہتا ہے: اسأل الله الجنة (میں اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرتا ہوں) مخلوق کے عرف میں جنت سے مراد جنت الخلد ہی ہوتی ہے اور عقلاً کوئی محال نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا دینے کے لئے ابلیس جنت میں داخل ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: تو نے اپنی اولاد کو محروم کیا اور انہیں جنت سے نکالا (1)۔ الف، لام جنت پر داخل کیا گیا ہے تاکہ یہ دلالت کرے کہ اس سے مراد جنت معروفہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کوئی انکار نہیں کیا اگر اس سے کوئی اور جنت مراد ہوتی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رد کر دیتے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام اس پر خاموش رہے جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ثابت کیا تو صحیح ہوا کہ جس گھر سے اللہ تعالیٰ نے انہیں نکالا وہ جنت تھی اور وہ اس گھر کے مخالف تھی جس کی طرف وہ نکالے گئے تھے۔

اور جن آیات سے معتزلہ اور قدریہ نے حجت پکڑی ہے یہ حکم اس کے بعد ہوگا جب جنتی قیامت کے دن جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ بھی ممتنع نہیں ہے کہ جنت دارالخلد اس شخص کے لئے ہو جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسے ہمیشہ اس میں رکھنے کا ارادہ کیا ہو اور وہ جنت سے نکل جائے گا جس کے متعلق فنا کا ارادہ کیا گیا ہوگا۔

اہل تاویل کا اس بات پر اجماع ہے کہ ملائکہ جنت میں اہل جنت پر داخل ہوتے ہیں اور پھر جنت سے نکل آتے ہیں۔ جنت کی چابیاں ابلیس کے ہاتھ میں تھیں پھر معصیت کے بعد اس سے واپس لے لیں گئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں معراج کی رات داخل ہوئے پھر اس سے باہر تشریف لے آئے اور جو کچھ اس کے اندر تھا اس کے متعلق بتایا اور یہ یقیناً جنت الخلد تھی۔ رہا معتزلہ کا یہ قول کہ جنت دارالقدس ہے اللہ تعالیٰ نے اسے گناہوں سے پاک رکھا ہے یہ ان کی جہالت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ ارض مقدسہ (شام) میں داخل ہوں۔ اہل شریعت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مقدس فرمایا حالانکہ ان میں گناہ، کفر، جھوٹ سب پائے گئے ہیں اس کی تقدیس، گناہوں سے مانع نہیں۔ اسی طرح دارالقدس بھی ہے۔ ابوالحسن بن بطلال نے کہا: بعض مشائخ نے بیان کیا ہے کہ اہل سنت کا اجماع ہے کہ جنت الخلد وہی ہے جس سے حضرت آدم علیہ السلام اترے، جو اس کا مخالف ہے اس کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ان کا یہ قول کہ حضرت آدم علیہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قولہ کلم اللہ موسیٰ تکلیماً، حدیث نمبر 6961، فیما القرآن، پہلی کیشنز



**مسئلہ نمبر 8:** هَذِهِ الشَّجَرَةُ، هَذِهِ اسم مبہم ہے اس کے ساتھ ایسے اسم کو بطور صفت ذکر کیا جاتا ہے جس پر الف، لام ہو اس کے علاوہ نہیں۔ جیسے تیرا قول مردت بهذا الرجل، بهذه المرأة و هذه الشجرة۔ ابن محیسن نے اسے ہذی الشجرة یعنی یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہی اصل ہے۔ کیونکہ اس میں ہا، یا کا بدل ہے اسی وجہ سے اس کا ما قبل مکسور ہے۔ کلام میں اس لفظ کے علاوہ کوئی ایسی ہا ثانیث نہیں ہے جس کا ما قبل کسرہ ہو اور اس میں ہا کا اصل آیا ہے۔

والشجرة والشجرة والشجرة۔ یہ تین لغات ہیں الشجرة، شین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے الشجرة والشجرة اس درخت کو کہتے ہیں جس کا زمین میں تنہا ہو، ارض شجيرة و شجرا ایسی زمین جس میں درخت زیادہ ہوں۔ واد شجیر اور واد اشجر نہیں کہا جاتا شجرا کا واحد شجرة ہے اس جمع کے وزن پر بہت کم حروف کی جمع آتی ہے شجرة شجرا۔ قصبة قصباء۔ طرفۃ طرفاء، حلفۃ حلفاء۔ اصمعی نے کہا: الحلفاء مفرد حلفۃ ہے معنی دوسرے الفاظ سے مختلف ہے۔ سیبویہ نے کہا: الشجرا واحد اور جمع ہے۔ اسی طرح القصباء والطرفاء اور الحلفاء ہے۔ المشجرة درختوں والی جگہ۔ ارض مشجرة۔ کہا جاتا ہے: هذه الارض اشجر من هذه۔ یعنی یہ زمین اس زمین سے زیادہ درختوں والی ہے۔ یہ جوہری کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** اہل تاویل کا اس درخت کی تعیین میں اختلاف ہے جس کے کھانے سے منع کیا گیا تھا۔ حضرات ابن مسعود، ابن عباس، شعبہ بن جبیر، جعدہ بن بصرہ نے کہا: یہ انگور کی بیل تھی، اسی وجہ سے شراب ہم پر حرام کی گئی ہے۔

حضرت ابن عباس، ابو مالک اور قتادہ نے فرمایا: یہ سنبل کا درخت تھا اور اس کا دانہ گائے کے گردے کی طرح ہوتا ہے اور شہد سے زیادہ میٹھا اور مکھن سے زیادہ سفید ہوتا ہے۔ وہب بن منبہ کا یہی قول ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی تو اسے حضرت آدم کی اولاد کے لئے غذا بنا دیا۔ ابن جریج نے کہا: بعض صحابہ سے مروی ہے کہ یہ انجیر کا درخت تھا (1)۔ سعید نے حضرت قتادہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اسی وجہ سے خواب میں اس کی تعبیر ندامت کی جاتی ہے کیونکہ اس کے کھانے کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام نادم ہوئے تھے۔ یہ پہلی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس میں کوئی چیز متعین نہیں جس کی تائید خبر کرے۔ درست بات یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو درخت سے منع فرمایا اور انہوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کے کھانے میں ان سے لغزش ہوئی۔ ابو نصر قشیری نے کہا: میرے والد صاحب فرماتے تھے معلوم ہوتا ہے بہر حال یہ محضہ کا درخت تھا۔

**مسئلہ نمبر 10:** علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت آدم نے یہ کیسے کھالیا تھا جب کہ اس کے قریب جانے پر بھی وعید سنائی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَتَكُونُوا مِنَ الظَّالِمِينَ۔

بعض علماء نے فرمایا: جس درخت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اس کے علاوہ کوئی درخت کھالیا تھا اور انہوں نے نبی کی تاویل یہ نہ کی کہ یہ نبی پوری جنس پر واقع ہے، گویا ابلیس نے انہیں ظاہر کو لینے کا دھوکا دیا۔ ابن عربی نے کہا: یہ پہلی معصیت تھی جو اللہ تعالیٰ کی آدم نے کی (2)۔ اس قول کی بنا پر فرمایا: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جو قسم اٹھائے کہ وہ اس روئی سے نہیں کھائے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 127، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 18، جلد 1 (دار الفکر)



گا پھر وہ اس جنس سے کھالے گا تو حانث ہو جائے گا اس میں تحقیق المذاہب یہ ہے کہ اکثر علماء فرماتے ہیں: اس میں وہ حانث نہیں ہوگا۔

امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: اگر قسم کی بساط مشارالیه کی تعیین کا تقاضا کرتی ہے تو اس کی جنس سے کھانے سے حانث نہ ہوگا اور اگر قسم کی بساط یا اس کا سبب یا اس کی نیت جنس کا تقاضا کرتی ہے تو پھر اس پر اسے محمول کیا جائے گا اس جنس سے کسی دوسری چیز کو کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا، اس پر حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ کو محمول کیا گیا ہے، ان کو متعین درخت سے نبی کی گئی تھی اور اس کی جنس مراد لی گئی تھی۔ پس انہوں نے قول کو لفظ پر محمول کیا معنی پر محمول نہ کیا۔

ہمارے علماء کا اس وجہ سے فرع میں اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں یہ گندم نہیں کھاؤں گا پھر اس نے اس کی روٹی کھالی تو اس میں علماء کے دو قول ہیں: الکتاب میں فرمایا: وہ حانث ہو جائے گا، کیونکہ گندم اسی طرح روٹی بنا کر کھائی جاتی ہے۔ ابن المواز نے کہا: اس پر کوئی کفارہ نہیں کیونکہ اس نے گندم نہیں کھائی اس نے روٹی کھائی ہے۔ اس نے اسم اور صفت کا اعتبار کیا۔ اور اگر اس نے اپنی قسم میں کہا میں اس گندم سے نہیں کھاؤں گا تو اس گندم سے بنائی گئی روٹی کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا اور جب اس گندم کی قیمت سے کوئی اور کھانا خریدے یا اسے اگلے تو اس میں اختلاف ہے۔ دوسرے علماء فرماتے ہیں: نہیں ندب پر محمول تھی۔ ابن عربی نے کہا: یہ مسئلہ اصول فقہ سے تھا یہاں ساقط ہو گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَكُونُوا مِنَ الظَّالِمِينَ (1)

نبی کو وعید کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا يُغْنِي عَنْكُمْ كُفْرًا مِنْ الْجَنَّةِ فَكُفُّوا (طہ) سو (ایسا نہ ہو) کہ وہ نکال دے تمہیں جنت سے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔

ابن مسیب نے فرمایا: حضرت آدم نے اس وقت کھایا جب حضرت حوا نے انہیں شراب پلا دی تھی اور آپ نشہ میں ہو گئے تھے اور آپ کو سمجھ نہ تھی۔ یزید بن قسیط نے بھی اسی طرح کہا: وہ دونوں قسم اٹھاتے تھے کہ حضرت آدم نے عقل میں ہوتے ہوئے اس درخت سے نہیں کھایا تھا۔ ابن عربی نے کہا: یہ نقل اور عقلاً فاسد ہے۔ نقل کسی حال میں بھی صحیح نہیں ہے (2) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنتی شراب کا یہ وصف بیان کیا ہے: لَا فِيهَا عُثُورٌ (الصافات: 47) اور رہی عقل، تو انبیاء کرام نبوت کے بعد معصوم ہوتے ہیں ہر اس چیز سے جو فرائض میں خلل اور جرائم کے ارتکاب کا باعث بنے۔

میں کہتا ہوں: بعض علماء نے حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کو جنت میں ٹھہرائے جانے سے پہلے سے ثابت کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا أَتَيْنَاهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ (البقرہ: 33) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرشتوں کو وہ علم بتاؤ جو ان کے پاس نہیں ہے۔

بعض علماء نے کہا: حضرت آدم نے وہ درخت بھول کر کھایا تھا اور یہ ممکن ہے کہ وہ دونوں وعید کو بھول گئے ہوں۔ میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حتمی اور قطعی طور پر بتایا: وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلُ

فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ۝ (ط)

لیکن جب انبیاء کرام کو کثرت معارف اور علومنازل کی وجہ سے ایسا تحفظ و تیقظ ضروری ہوتا ہے جو دوسروں کو لازم نہیں ہوتا تو حضرت آدم علیہ السلام کا نبی کو یاد نہ رکھنا اسے ضائع کرنے کے مترادف تھا تو اس وجہ سے وہ مخالفت کرنے والے ہو گئے۔ حضرت ابو امامہ نے کہا: اگر حضرت آدم کی اولاد جو اللہ تعالیٰ نے ابتدا سے لے کر قیامت تک پیدا کرنی ہے ان سب کی عقلیں ایک پلڑے میں اور حضرت آدم کی عقل دوسرے پلڑے میں رکھی جائے تو حضرت آدم علیہ السلام کی عقل ان پر غالب آجائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ۝ (ط)

میں کہتا ہوں: حضرت ابو امامہ کا یہ قول تمام بنی آدم کو شامل ہے اور احتمال ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خاص ہوں، کیونکہ آپ عقل و دانش کے اعتبار سے سب لوگوں سے زیادہ تھے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت ابو امامہ کے قول کا مطلب یہ ہو کہ اگر بنی آدم کی عقل جو انبیاء نہیں ہیں وہ مراد ہیں۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں: پہلا قول حسن ہے۔ پس آدم و حوا نے معین درخت مراد لیا اور حقیقت میں مراد جنس تھی جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب آپ نے سونے اور ریشم کو پکڑا۔ فرمایا: ہذان حرامان علی ذکور امتی (1) یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔ اور ایک اور جگہ فرمایا: ہذان مہلکان امتی۔ یہ دونوں میری امت کو ہلاک کرنے والی چیزیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے اور ریشم کی جنس مراد لی ہے نہ کہ وہ معین سونا اور ریشم۔

**مسئلہ نمبر 11:** کہا جاتا ہے: درخت سے پہلے حضرت حوا نے کھایا تھا اس کا سبب ابلیس کا انہیں اغوا (بھٹکانا) تھا جیسا کہ آگے آئے گا۔ شیطان نے پہلے حضرت حوا سے کلام کی کیونکہ عورت محبت کا دوسوہ ہے۔ یہ پہلا فتنہ تھا جو مردوں پر عورتوں کی طرف سے داخل ہوا۔ شیطان نے کہا: تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا گیا مگر اس لئے کہ یہ شجرۃ الخلد ہے کیونکہ شیطان کو معلوم تھا کہ یہ دونوں ہمیشہ رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ پس وہ دونوں کے پاس ایسی جہت سے آیا جو انہیں پسند تھی..... حبك الشی یعنی و یصم..... کسی چیز کی محبت اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔ جب حضرت حوا نے حضرت آدم سے کہا تو حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کیا اور عہد الہی کو یاد کیا۔ حضرت حوا پر حضرت آدم اصرار کرتے رہے (کہ نہ کھاؤ) اور حضرت حوا حضرت آدم پر کھانے کے لئے اصرار کرتی رہی حتیٰ کہ حضرت حوا نے کہا: میں تجھ سے پہلے کھاتی ہوں یہاں تک کہ اگر مجھے کوئی تکلیف پہنچے تو تم سلامت رہو گے۔ پس حضرت حوا نے وہ کھالیا اور انہیں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ حضرت حوا حضرت آدم کے پاس آئی اور کہا: تم بھی کھا لو، میں نے کھایا ہے تو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے۔ پس حضرت آدم نے وہ کھایا تو ان کا لباس اتر گیا اور گناہ کے حکم میں ہو گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ۔ وہ دونوں نبی میں جمع فرمائے تھے اس لئے سزا نہ اتری حتیٰ کہ دونوں کی طرف سے منیٰ عنہ کا ارتکاب پایا گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام پر یہ مسئلہ مخفی تھا۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے فرمایا: اگر کسی نے اپنی دو بیویوں یا دو لونڈیوں کو کہا: اگر تم دونوں گھر میں داخل ہوئیں تو تم دونوں کو طلاق یا تم دونوں

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 205، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً کتاب اللباس، باب فی الحریر للنساء، حدیث نمبر 3535، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آزاد تو طلاق اور آزادی ایک کے داخل ہونے سے واقع نہ ہوگی۔ اس میں علماء کے تین اقوال ہیں۔ ابن قاسم نے کہا: دونوں کو نہ طلاق ہوگی نہ دونوں آزاد ہوں گی حتیٰ کہ اکٹھی گھر میں داخل ہوں، انہوں نے اس اصل پر محمول کیا ہے۔

مطلق لفظ کے مقتضیٰ کو لیا ہے۔ سخون نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن قاسم نے دوسری مرتبہ کہا: کسی ایک کے داخل ہونے سے دونوں مطلق ہو جائیں گی اور آزاد ہو جائیں گی کیونکہ بعض قسم کا ٹوٹنا پوری قسم کا ٹوٹنا ہے۔ جیسے اگر کوئی قسم اٹھائے کہ یہ دو روٹیاں نہیں کھاؤں گا تو وہ ایک روٹی کھانے سے بھی حانت ہو جائے گا بلکہ ان میں سے ایک لقمہ کھانے سے بھی حانت ہو جائے گا (1)۔ اشہب نے کہا: جو داخل ہوگی وہ آزاد ہو جائے اور اسے طلاق ہو جائے گی کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنی طلاق یا آزادی میں شرط تھی۔ ابن عربی نے کہا: یہ بعید ہے کیونکہ بعض شرط، شرط نہیں ہوتی اس پر اجماع ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول صحیح ہے۔ نہی جب دو فعلوں پر معلق ہو تو مخالفت متحقق نہ ہوگی جب تک کہ دونوں فعل نہ پائے جائیں کیونکہ جب تو کہتا ہے تم دونوں گھر میں داخل نہ ہو۔ پھر ایک داخل ہوتی ہے تو دونوں کی طرف سے مخالفت نہ پائی گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ۔ یہ دونوں کے لئے نہی ہے: فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ۔ اس کا جواب ہے۔ پس دونوں ظالم نہ ہوں گے حتیٰ کہ دونوں اس کام کو کریں جب حضرت حوٰنہ نے کھایا تو اسے کوئی تکلیف نہ پہنچی کیونکہ منہی عنہ وہ تھا جو کامل پایا گیا۔ یہ معنی حضرت آدم علیہ السلام پر مخفی ہو گیا آپ نے طمع کیا اور یہ حکم بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی معنی ہے: وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ قَنُوسٍ (ط: 115) بعض علماء نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام یہ ارشاد بھول گئے: إِنَّ هَذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجُكَمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْلُ (ط) بے شک یہ تیرا بھی دشمن ہے اور تیری زوجہ کا بھی سو (ایسا نہ ہو) کہ وہ نکال دے تمہیں جنت سے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔

**مسئلہ نمبر 12:** علماء کا اختلاف ہے کہ کیا انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین سے صغیرہ گناہ سرزد ہوتا ہے اس کی وجہ سے ان سے مواخذہ ہوتا ہے اور ان پر انہیں عتاب کیا جاتا ہے یا نہیں۔ اس اتفاق کے بعد کہ انبیاء کرام کبیرہ گناہوں اور ہر رذیل بات سے معصوم ہوتے ہیں جس میں نقص اور عیب ہوتا ہے۔ یہ قاضی ابوبکر کے نزدیک مسئلہ اجماعاً ثابت ہے اور استاذ ابواسحاق کے نزدیک یہ معجزہ کی دلیل کا مقتضا ہے اور معتزلہ کے نزدیک یہ عقلی دلیل کا مقتضی ہے ان کے اصول پر۔ طبری وغیرہ فقہاء، متکلمین اور محدثین نے کہا: انبیاء کرام سے صغائر واقع ہوتے ہیں جبکہ رافضیوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: انبیاء کرام کبار و صغائر سے معصوم ہیں اور انہوں نے ان آیات سے حجت پکڑی ہے جو قرآن کریم میں واقع ہوئی ہیں اور جو ان کے گناہوں سے نکلنے کے متعلق احادیث میں ثابت ہے یہ بات ظاہر ہے اس میں کوئی خفا نہیں۔ جمہور فقہاء، مالکی، ابو حنیفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں: وہ تمام صغائر سے اسی طرح معصوم ہیں؟ اس طرح کبار سے معصوم ہیں کیونکہ ہمیں ان کے افعال، آثار اور سیرت میں ان کی اتباع کا بغیر کسی قرینہ کے التزام کے حکم دیا گیا ہے۔ اگر ان پر ہم صغائر کو جائز قرار دیں تو پھر ان کی اقتدا ممکن نہیں کیونکہ ان کے افعال میں ہر فعل کا مقصد، قربت، اباحت یا ممانعت یا معصیت کے اعتبار سے ممتاز نہیں



ہوتا اور کسی کو کسی ایسے امر کی پیروی کا حکم دینا صحیح نہیں ہے شاید کہ وہ معصیت ہو، خصوصاً ان اصولیوں کے نزدیک جو فعل کو قول پر مقدم جانتے ہیں جب ان میں تعارض آجائے۔

استاذ ابواسحاق اسفراکینی نے کہا: علماء کا صفار کے متعلق اختلاف ہے اور وہ بات جس پر اکثر علماء کا نظریہ قائم ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کرام پر صفار جائز نہیں۔ پس بعض علماء نے صفار کو جائز قرار دیا ہے اور اس مقال کی کوئی اصل نہیں ہے۔

بعض متأخرین نے کہا: جو پہلے نظریہ کے حامل ہیں: یہ کہنا مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء سے گناہ کے وقوع کی خبر دی ہے اور گناہ کی نسبت ان کی طرف کی ہے اور اس پر انہیں عتاب بھی فرمایا ہے اور خود انبیاء کرام کے اپنے نفوس سے گناہوں کے متعلق بتایا ہے اور ان سے وہ نکلے اور ان گناہوں کی وجہ سے ڈرے اور توبہ کی۔ یہ چیزیں بہت سی جگہوں پر وارد ہیں تاویل تمام کو قبول نہیں کرتی اگرچہ اخبار احاد اس کو قبول کرتی ہیں اور یہ تمام کام ایسے ہیں جو انبیاء کے منصب کے لئے معیوب ہیں۔ یہ تمام امور ان سے نادر طور پر اور خطا و نسیان کے طور پر یا ایسی تاویل کے طور پر واقع ہوئے ہیں جو تاویل اس کام کی طرف داعی تھی۔ یہ امور دوسرے لوگوں کے اعتبار سے نیکیاں ہیں اور ان کے حق میں سیئات ہیں ان کے مناصب اور بلند اقدار کی نسبت سے کیونکہ وزیر سے ایک بات پر مواخذہ ہوتا ہے جبکہ سپاہی کو اسی کام پر بدلہ دیا جاتا ہے۔ پس وہ قیامت کے موقف سے ڈرے باوجود اس کے کہ ان کو امن و امان اور سلامتی کا علم تھا۔ فرمایا: یہی حق اور ثواب ہے۔ حضرت جنید نے کتنا عمدہ کہا ہے: حسنات الابرار سیئات المقربین وہ کام جو ابرار کی نیکیاں ہوتے ہیں مقربین کے حق میں گناہ ہوتے ہیں۔ پس انبیاء کرام اگرچہ نصوص ان سے گناہ کے وقوع کی شہادت دیتی ہیں پھر بھی یہ ان کے مناصب میں خلل ثابت نہیں اور نہ ان کے رتبہ میں جرح کا موجب ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایسے امور کی تلافی فرمادی انہیں چن لیا، انہیں ہدایت سے نوازا ان کی مدح فرمائی ان کا تذکرہ فرمایا، انہیں منتخب کیا اور انہیں چن لیا۔ صلوات اللہ علیہم

**مسئلہ نمبر 13:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **فَتَكُونُوا مِنَ الظَّالِمِينَ** ظلم کا اصل معنی کسی شے کو مناسب جگہ پر نہ رکھنا۔ الارض المظلومہ اس زمین کو کہتے ہیں جو کبھی کھودی نہ گئی ہو پھر کھودی گئی۔ نابغہ نے کہا:

وقفت فيها اصيلاً اسألها عيت جواباً وما بالربع من احد

إلا الادارى لأيا ما ابينها والنوى كالحوض بالظلومة الجلد

میں عصر کے وقت ان کھنڈرات میں کھڑا ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا تو وہ جواب دینے سے عاجز تھے اور وہاں پر کوئی شخص نہ تھا سوائے رسیوں کے اور مشقت کے میں اس کو بیان نہیں کرتا اور حوض کی طرح گڑھے کے جو اس سخت زمین میں کھودا گیا تھا۔ اس کو التراب الظلم بھی کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

فاصبح في غبراء بعد اشاحۃ علی العیش مردود علیہا ظلمہا

صبح کے وقت قبر کے گڑھے میں تھا جس کی مٹی اس پر لوٹائی گئی تھی۔

جب اونٹ کو بغیر بیماری کے ذبح کیا جائے تو اس پر ظلم کیا گیا..... اونٹوں کو بغیر بیماریوں کے ذبح کرنے والوں کو ظلامون

للجذر کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے: سَقَانَا ظَلِيمَةً طَيِّبَةً جب اس نے دودھ پکنے سے پہلے انہیں پلا دیا۔ وقد ظلم و طبع، مکھن نکالنے سے پہلے دودھ پلا یا گیا ہو تو یہ جملہ بولتے ہیں: الدین مظلوم و ظلم، دودھ تیار نہ ہو۔ شاعر نے کہا:

و قائلۃ ظلمت لكم سقائي وهل يخفى على العبد الظلم

اور وہ کہہ رہی تھی میں نے تمہیں دودھ جننے سے پہلے پلا یا کیا زبان کی جڑ پر وہ دودھ مخفی تھا۔

رجل ظلم، سخت ظلم کرنے والا شخص۔ الظلم سے مراد شرک بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴿۱۶﴾ (لقمان)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَلَّا مِنْهَا رَعْدًا، کلا سے نون حذف کیا گیا ہے کیونکہ یہ امر کا صیغہ ہے اور ہمزہ کثرت استعمال کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے، اس کا حذف شاذ ہے۔ سیبویہ نے کہا: عربوں میں کچھ لوگ کہتے ہیں أَعْ كُلُّ فَيْتَمٍ۔ کہا جاتا ہے: اَکَلْتُ الطَّعَامَ أَكْلًا وَمَا كَلَّا۔ الْاَکْلَةُ (بالفتح) سیر ہو کر کھانا۔ الْاَکْلَةُ (بالضم) لقمہ میں کہتے ہیں۔ تو کہتا ہے: اَکَلْتُ اَکْلَةً وَاحِدَةً یعنی میں نے ایک لقمہ کھایا، روٹی کو بھی کہتے ہیں هَذَا الشَّيْءُ اَکْلَةٌ لَكَ یعنی طعمہ لک (تمہاری خوراک سے) الْاَکْلُ جو چیز کھائی جائے۔ کہا جاتا ہے: فُلَانٌ ذُو اَکْلٍ یعنی وہ شخص جس کو دنیا کا بہت حصہ ملا ہو اور وسیع رزق والا ہو۔ (رعداً) یہ مصدر مخذوف کی صفت ہے یعنی اَکَلًا رَعْدًا۔ ابن کيسان نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال کی حیثیت سے مصدر ہو۔ مجاہد نے کہا: رَعْدًا کا مطلب ہے ان پر حساب نہ ہوگا۔ الرعد لغت میں اس کثیر کو کہتے ہیں جو تجھے مشقت میں نہ ڈالے۔ کہا جاتا ہے: ارعد القوم، جب لوگ خوشحالی میں ہوں۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

حَيْثُ یہ مبنی بر ضمہ ہے یہ دوسرے ظروف سے مختلف ہے کہ یہ مضاف نہیں ہوتا بہ، قبل اور بعد سے مشابہ ہے جب وہ مضاف الیہ سے جدا کئے گئے ہوں۔ پس اس لئے اسے ضمہ دیا گیا۔ کسائی نے کہا: قیس اور کنانہ کی لغت ضمہ ہے اور تمیم کی لغت فتح ہے۔ کسائی نے کہا: بنو اسد جر کی جگہ اس کو جر دیتے ہیں اور نصب کی جگہ نصب دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۷﴾ (القلم) حیث پر ضمہ اور فتح پڑھا جاتا ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوا هَذِهِ الشَّجَرَةَ، هَذِهِ میں ہا، یا کا بدل ہے کیونکہ اصل میں ہندی تھا۔ نحاس نے کہا: میں عربی زبان میں ہا تانیث نہیں جانتا جب کہ ما قبل کسور ہو سوائے هَذِهِ کے ہا کے۔ عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: ہا تہا ہند بعض کہتے ہیں: ہا ق ہند۔

سیبویہ نے حکایت کیا ہے: ہذا ہند۔ (ہا کے سکون کے ساتھ) کسائی نے عربوں سے حکایت کیا ہے: وَلَا تَقْرَبُوا هَذِهِ الشَّجَرَةَ۔ شبل بن عباد سے مروی ہے، فرمایا: ابن کثیر اور ابن محیسن قرآن میں هَذِهِ میں ہا کو کسی جگہ ثابت نہیں رکھتے۔ جماعت کی قراءت رعداً نہیں کے فتح کے ساتھ ہے۔ ابن وثاب اور نخعی سے مروی ہے کہ وہ غین کے سکون کے ساتھ پڑھتے تھے۔ سلمہ نے فراء سے حکایت کیا ہے، فرمایا: کہا جاتا ہے: هَذَا فَعَلْتُ وَهَذِي فَعَلْتُ۔ ذال کے بعد یا کے اثبات کے ساتھ، هَذَا فَعَلْتُ (ذال کے کسرہ کے ساتھ یا اور ہا کے الحاق کے بغیر)

ہاتا فعلت۔ ہشام نے کہا: کہا جاتا ہے تافعلت۔ شعر کہا ہے:

خلیل لو لا ساکن الدار لم أقم      بتا الدار الا عابر ابن سبیل  
میرے دو دوست اگر اس گھر میں رہنے والے نہ ہوتے تو میں بھی اس گھر میں نہ ٹھہرتا مگر مسافر کی طرح گزر جاتا۔

ابن انباری نے کہا: ہا کے اسقاط کے ساتھ تا اس طرح ہے جس طرح ذی، ہذا سے ہا کے اسقاط کے ساتھ ہے، اور ہذا سے ہا کے اسقاط کے ساتھ ذہ ہے۔ فراء نے کہا: جس نے کہا: ہذا قامت وہ ہا کو ساقط نہیں کرتا کیونکہ صرف ذال پر اسم مشتمل نہیں ہوتا۔

فَتَكُونُ، تقریباً پر اس کا عطف ہے اس وجہ سے نون کو حذف کیا گیا ہے۔ جرمی نے کہا: فانا صہ ہے اور دونوں جائز ہیں۔

فَازَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ

عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝

”پھر پھسلا دیا انہیں شیطان نے اس درخت کے باعث اور نکلوا دیا ان دونوں کو وہاں سے جہاں وہ تھے اور ہم نے فرمایا اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اور (اب) تمہارا زمین میں ٹھکانا ہے اور فائدہ اٹھانا وقت مقررہ تک۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَازَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** فَازَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا جماعت نے فاز لہا بغیر الف کے الزکة سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ الذلۃ کا معنی خطا ہے یعنی ان سے خطا کروائی اور انہیں خطا میں واقع کیا۔ حمزہ نے فاز لہما یعنی الف کے ساتھ پڑھا ہے، اس کا معنی ہے: اس نے انہیں دور کر دیا۔ کہا جاتا ہے: ازلتہ فزال، میں نے اسے دور کیا تو وہ دور ہو گیا۔ ابن کیسان نے کہا: فاز لہما، زوال سے مشتق ہے یعنی آدم و حوا طاعت پر تھے اس سے اس (شیطان) نے معصیت کی طرف پھیر دیا۔

میں کہتا ہوں: اس مفہوم پر دونوں قراءتوں کا معنی ایک ہوگا مگر جماعت کی قراءت معنی کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہے۔ کہا جاتا ہے: ازلتہ فزل۔ میں نے اسے پھسلا دیا تو وہ پھسل گیا۔ اس معنی پر یہ قول بھی دلیل ہے: إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا (آل عمران: 155) ان کے بعض کرتوتوں کے سبب شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قَوَسُوا لَهُمَا الشَّيْطَانُ (اعراف: 20) (شیطان نے ان دونوں کے لئے دوسرے ڈالا) الوسوسہ کا مطلب ہے معصیت کے ساتھ اس نے انہیں خطا میں داخل کیا۔ شیطان کو یہ قدرت نہیں ہے کہ کسی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹا دے اسے ذل میں داخل کرنے کی قدرت ہے۔ پس یہ گناہ کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف زوال کا سبب ہوگا۔ بعض نے فرمایا: ازلہما یہ زل عن المكان سے مشتق ہے جب کوئی اپنی جگہ سے ہٹ جائے پھر معنی حمزہ کی قراءت کے مطابق ہوگا یعنی یہ زوال سے مشتق ہوگا۔ امرء القیس نے کہا:

يزل الغلام الخف عن صهواته      و يلوى باثواب العنيف المثقل



ہلکا پھلکا غلام گھوڑے سے گر جاتا ہے اور سخت اور بھاری آدمی اسے کپڑوں کے ساتھ لے جاتا ہے۔  
ایک اور شاعر کہتا ہے:

کمیت یزل اللبد عن حال متنه کہا زلت الصفواء بالمتنزل

کمیت گھوڑے سے اس کا کپڑا اس طرح اس کی پیٹھ سے گر جاتا ہے جیسے صاف چٹان اپنے اوپر چڑھنے والے کو گرا دیتی ہے۔  
**مسئلہ نمبر 2:** فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ جب ازال کو زال عن المكان سے مشتق مانا جائے تو فَأَخْرَجَهُمَا زوال کا بیان اور تاکید ہوگا، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ وہ جنت میں ہی ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف منتقل ہو گئے ہوں، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ جنت سے زمین کی طرف انہیں نکالنا تھا، کیونکہ وہ زمین سے پیدا کئے گئے تھے، تاکہ حضرت آدم علیہ السلام زمین میں خلیفہ بنیں۔ ابلیس نے حضرت آدم کو جنت سے نکالنے کا یہ قصد تو نہیں کیا تھا۔ اس نے تو حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے مرتبہ سے گرانے کا قصد کیا تھا اور انہیں رحمت الہی سے دور کرنے کا قصد کیا تھا جیسا کہ وہ خود دور کیا گیا تھا، اس کا مقصد پورا نہ ہوا اور اس کو اپنی مراد نہ ملی بلکہ اس کی آنکھ کی گرمی، نفس کے غصہ اور گمان کے نقصان میں اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَى ۝ (طہ)

پس حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے گھر میں اس کے پڑوسی ہونے کے بعد اس کی زمین میں اس کا خلیفہ بن گئے خلیفہ اور پڑوسی میں بڑا فرق ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس کام کو ابلیس کی طرف منسوب کیا گیا کیونکہ وہ اس کا سبب تھا اس میں مفسرین کا کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کا اغواء ابلیس کے ہاتھوں ہوا لیکن کیفیت میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس اور جمہور علماء نے فرمایا: اس کا اغواء بالمشافہ تھا (1)۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَقَاسَاهُمَا إِلَىٰ نَكَمٍ مِّنَ النَّوَصِیِّنَ ۝ (اعراف)

مقاسمہ کا ظاہر مشافہ ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قول عبدالرزاق نے حضرت وہب بن منہ سے روایت کیا ہے۔ شیطان سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہوا تھا۔ یہ سانپ چار ٹانگوں والا تھا جیسے بختی اونٹ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن جانوروں کو پیدا کیا تھا ان میں سانپ خوبصورت ترین جانور تھا، شیطان نے پہلے اپنے آپ کو تمام حیوانوں پر پیش کیا تھا کہ وہ اسے منہ میں لے کر جنت میں داخل ہو جائیں۔ سوائے سانپ کے کسی نے اسے داخل نہ کیا جب سانپ اسے جنت میں لے گیا تو ابلیس اس کے پیٹ سے نکلا اس نے اس درخت کو لیا جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کی زوجہ کو منع کیا تھا۔ ابلیس وہ لے کر حضرت حواء کے پاس آیا اور کہا: اس درخت کو دیکھو اس کی خوشبو کتنی عمدہ ہے، اس کا ذائقہ کتنا عمدہ ہے، اس کا رنگ کتنا پیارا ہے، وہ انہیں اغوا کرتا رہا حتیٰ کہ حضرت حواء نے وہ درخت لے لیا اور کھالیا۔ پھر ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو اغوا کیا۔ حضرت حواء نے حضرت آدم سے کہا: کھا لو، میں نے کھایا ہے تو مجھے اس نے کوئی تکلیف نہیں دی۔ پس حضرت آدم علیہ السلام نے بھی اسے کھالیا۔ ان دونوں کے لباس اتر گئے، اور گناہ کے حکم میں ہو گئے۔ حضرت آدم اس درخت کے پیٹ

میں داخل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آواز دی: تو کہاں ہے؟ حضرت آدم نے عرض کی: میں یہاں ہوں اے رب! اللہ تعالیٰ نے پوچھا: کیا تو باہر نہیں نکلے گا؟ حضرت آدم نے کہا: یا رب! مجھے تجھ سے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس زمین کی طرف اتر جا جس سے تیری تخلیق کی گئی ہے۔ سانپ پر لعنت کی گئی اور اس کی ٹانگیں اس کے پیٹ میں لوٹا دی گئیں اور اس کے اور اولاد آدم کے درمیان عداوت و دشمنی بن گئی۔ اسی وجہ سے ہمیں ان کے قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے (جیسا کہ وضاحت آگے آئے گی)۔ حضرت حوا سے کہا گیا جس طرح تو نے اس درخت کا خون بہایا اسی طرح تجھے بھی ہر مہینے خون کی تکلیف لاحق ہوگی تو حمل اٹھائے گی اور بچہ جنم دے گی تکلیف کے ساتھ تو اس کی وجہ سے کئی مرتبہ موت کے قریب ہو جائے گی۔ طبری اور نقاش نے یہ زائد لکھا ہے کہ توسفیہ ہوگی حالانکہ توسیانی تھی، ایک جماعت نے کہا: ابلیس جنت میں نکالے جانے کے بعد حضرت آدم کے پاس نہیں پہنچا تھا اس نے اپنی شیطانیت، سلطنت اور اپنے وسوسہ کے ذریعے حضرت آدم کو اغوا کیا تھا، جس کی اللہ تعالیٰ نے اسے قدرت بخشی تھی جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم۔ (1) شیطان ابن آدم میں خون کے چلنے کی طرح چلتا ہے۔ واللہ اعلم

سورہ اعراف میں آئے گا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے وہ درخت کھایا تو آپ برہنہ ہو گئے اور انہوں نے لباس تلاش کرنے کی کوشش کی تو درخت ان سے دور ہو گئے اور معصیت کی وجہ سے انہیں رلایا اور انجیر کے درخت نے حضرت آدم پر رحم کھایا۔ پس آپ نے اس۔ پتے لیے اور اپنے آپ کو ڈھانپا۔ پس آپ برہنہ ہونے کے ساتھ آزمائے گئے نہ کہ درخت سے۔ واللہ اعلم

بعض علماء نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنے میں حکمت دنیا کو آباد کرنا تھا۔

**مسئلہ نمبر 3:** ذکر کیا جاتا ہے کہ سانپ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کا خادم تھا۔ اس نے خیانت کی اس طرح کہ اس نے اللہ کے دشمن کو اپنے نفس پر قدرت دی اس وجہ سے اس کے لئے عداوت ظاہر ہو گئی۔ جب وہ نیچے اترے تو عداوت مؤکد ہو گئی اور اس کا رزق مٹی بنائی گئی۔ اسے کہا گیا: تو بنی آدم کا دشمن ہے اور وہ تیرے دشمن ہیں جہاں بھی ان میں کوئی تجھے پائے گا تیرا سر پھل دے گا۔

حضرت ابن عمر نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: پانچ چیزوں کو محرم قتل کر سکتا ہے (2)۔ ان پانچ چیزوں میں سانپ بھی ہے۔ روایت ہے کہ ابلیس نے سانپ سے کہا: مجھے تو جنت میں لے جا تو میرے ذمہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس فرمایا کرتے تھے: ابلیس کے ذمہ کو توڑو۔ ساکنہ بنت جعد نے سراء بنت مبہان غنویہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: چھوٹے، بڑے، کالے اور سفید سانپوں کو قتل کرو۔ جو ان کو قتل کرے گا اس کے

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 1063، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔

ایضاً، کتاب الاحکام، باب الشہادۃ تکون عند الحاکم فی ولائتہ القضاء، حدیث 6636، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، صفحہ 467، جلد 1۔ ایضاً، کتاب برأ الخلق، باب خمس من الدواب یقتلن فی الحرام، حدیث 3068، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لئے یہ آگ سے فدیہ ہوں گے اور جس کو سانپ قتل کر دے گا وہ شہید ہوگا (1)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: آگ سے فدیہ اس لئے ہوگا کیونکہ یہ ابلیس کے ساتھ شریک تھا اور حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو تکلیف پہنچانے میں اس کا معاون تھا۔ اسی وجہ سے جس کسی نے سانپ کو قتل کیا گویا اس نے کافر کو قتل کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کافر اور اس کا قاتل کبھی دوزخ میں جمع نہ ہوں گے (2)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** ابن حزم نے حضرت عمرو بن دینار سے انہوں نے حضرت ابو عبیدہ بن عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ منیٰ میں تھے، ایک سانپ گزرا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسے قتل کرو۔ وہ ہم سے بھاگ کر غار میں چلا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کھجور کی شاخیں اور آگ لے آؤ اور اس پر آگ جلا دو (3)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ حدیث اسی نبی کو خاص کرتی ہے جس میں آپ ﷺ نے مثلہ سے منع فرمایا اور اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے عذاب کے ساتھ عذاب نہ دے۔ علماء نے فرمایا: اس حدیث نے اس دشمن کے لئے کوئی حرمت نہیں چھوڑی، جہاں بھی یہ چلا جائے حتیٰ کہ جہاں بھی قدرت ہو اس تک ہلاکت کو پہنچائے، اگر کہا جائے کہ ابراہیم نخعی سے مروی ہے کہ انہوں نے بچھو کو آگ کے ساتھ جلانے کو ناپسند کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ مثلہ ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: ہو سکتا ہے ان کو یہ حدیث نبی کریم ﷺ کی طرف سے نہ پہنچی ہو اور انہوں نے اس حدیث پر عمل کیا ہو جس میں ہے اللہ کے عذاب کے ساتھ عذاب نہ دو۔ ان کے نزدیک اس پر عمل اس بنا پر ہوگا۔

اگر کہا جائے کہ مسلم نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک غار میں تھے جبکہ وَالْمُزْسَلَتْ عُزْفًا (المرسلات) سورت نازل ہوئی۔ ہم نے اسی وقت آپ ﷺ کے منہ مبارک سے سنی تھی اچانک ہم پر ایک سانپ نکلا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو قتل کرو۔ ہم اسے قتل کرنے کے لئے دوڑے تو وہ ہم سے بھاگ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے شر سے بچالیا اور تمہیں اس کے شر سے بچالیا (4)، اس میں تو نہ اس پر آگ جلائی گئی اور نہ اس کے قتل کا کوئی اور حیلہ کیا گیا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے وہاں آگ نہ پائی ہو اس لئے اسے ترک کر دیا ہو۔ یا اس کی بل ایسی نہ ہو جہاں آگ فائدہ دیتی ہو دھواں بھی نقصان نہ دیتا ہو اور حیوان تک وہ نہ پہنچتا ہو۔ واللہ اعلم حضور علیہ السلام کا ارشاد اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے شر سے بچالیا یعنی تم اسے قتل کر دیتے اور تمہیں اس کے شر سے بچالیا یعنی اس کے ڈنکے سے تمہیں بچالیا۔

**مسئلہ نمبر 5:** سانپوں کو قتل کرنے کا حکم تکلیف کو دور کرنے کے ارشاد سے ہے جس نقصان کا سانپوں سے خوف ہوتا ہے۔ جس سانپ کا ضرر یقینی ہو اس کا قتل کرنے کی طرف جلدی کرنا واجب ہے، کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: اقتلوا

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 49، جلد 1 (دارالمصادر بیروت)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قتل کافر اثم سدود، صفحہ 137، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ نوادر الاصول، صفحہ 50، جلد 1 (دارالمصادر بیروت)

4۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وعلوہا، باب قتل الحیان، صفحہ 235، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)



الحيات واقتلوا ذا الطفيتين والابتد فانهما يخطفان البصر ويستقطان الحبل (1) (یعنی سانپوں کو قتل کرو اور دو دھاریوں والے اور دم کٹے سانپ کو قتل کرو کیونکہ یہ دونوں آنکھوں کو ضائع کر دیتے ہیں اور حمل گرا دیتے ہیں) ان دو سانپوں کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا حالانکہ یہ پہلے عموم میں داخل تھے اور ان کے ضرر کے بڑے سبب کی وجہ سے ان پر متنبہ فرمایا اور جس سانپ کا ضرر متحقق نہ ہو پس ان میں سے جو گھروں کے علاوہ کسی جگہ پر ہوں تو ظاہری عمومی حکم کی وجہ سے انہیں قتل کر دو کیونکہ سانپوں کی ہر نوع میں ضرر غالب ہے۔ پس اس پر عمل کیا جائے گا، کیونکہ سانپ اپنی صورت کی وجہ سے خوف ناک ہے اور نفوس میں نفرت ہے (اس لئے اسے قتل کرنا چاہئے۔) اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ شجاعت کو پسند فرماتا ہے اگرچہ سانپ کے قتل پر ہی ہو۔ آپ ﷺ نے سانپ کے قتل پر تشبیح فرمائی۔ ابو داؤد کی حدیث جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے مرفوعاً مروی ہے، اس میں فرمایا: تمام سانپوں کو قتل کرو جو ان کے بدلہ لینے سے ڈرا وہ مجھ سے نہیں (یعنی میرے طریقہ پر نہیں) (2)

**مسئلہ نمبر 6:** وہ سانپ جو گھروں میں رہتے ہیں ان کو قتل نہ کیا جائے حتیٰ کہ تین دن انہیں تنبیہ کی جائے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: مدینہ طیبہ میں جن ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے جب تم ان میں سے کسی کو دیکھو تو تین دن اسے آگاہ کرو (3)۔ بعض علماء نے اس حدیث کو صرف مدینہ کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ مدینہ طیبہ کے جنوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، ہم نہیں جانتے کہ مدینہ طیبہ کے علاوہ جو جن ہیں وہ اسلام لائے ہیں یا نہیں، یہ ابن نافع کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: تمام شہروں میں گھروں کے سانپوں کو قتل کرنے سے منع ہے، یہی قول صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِنَ الْجِنِّ يَسْمِعُونَ الْقُرْآنَ (احقاف: 29)

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس جنوں کا داعی آیا میں ان کے ساتھ گیا۔ میں نے ان پر قرآن پڑھا۔ اس حدیث میں ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ سے خوراک کا سوال کیا وہ جزیرہ کے جن تھے (4)۔ اس کی تفصیل سورہ جن میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جب یہ ثابت ہے تو کسی سانپ کو قتل نہیں کیا جائے گا حتیٰ کہ پہلے اس پر تنگی کی جائے گی اور اسے ڈرایا جائے گا۔ مزید بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 7:** ائمہ نے ابوالسائب مولیٰ ہشام بن زہرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ حضرت ابوسعید خدری کے پاس ان کے گھر میں گئے۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ابوسعید خدری کو میں نے نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ میں انتظار میں بیٹھ گیا تا کہ وہ نماز کو مکمل کر لیں۔ میں نے گھر کی ایک طرف کھجور کی چھڑیوں میں کچھ حرکت سنی۔ میں متوجہ ہوا تو وہ سانپ تھا۔ میں اسے قتل

1۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرہا، باب قتل الحیان، صفحہ 234، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 356، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب قتل الحیات، حدیث 4569، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، قتل الحیات وغیرہا، قتل الحیات، صفحہ 235، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب الجہر بالقراۃ فی الصبح والقراۃ علی الجن، صفحہ 184، جلد 1

کرنے کے لئے دوڑا تو حضرت ابوسعید نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ میں بیٹھ گیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو گھر کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: کیا تم یہ کمرہ دیکھ رہے ہو؟ میں نے کہا: ہاں۔ انہوں نے کہا: اس میں ہمارا ایک نوجوان رہتا تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ فرمایا: ہم خندق کی طرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے وہ نوجوان نصف النہار کے وقت رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کرتا تھا اور گھر واپس آ جاتا تھا۔ ایک دن اس نے اجازت طلب کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنا ہتھیار لے لو مجھے تجھ پر قرینہ (کے حملہ) کا اندیشہ ہے۔ اس شخص نے اپنا ہتھیار لے لیا پھر لوٹ آیا وہ گھر کے قریب پہنچا تو اس کی بیوی دروازے کے درمیان کھڑی تھی۔ اس نے اسے نیزہ مارنے کے لئے نیزہ اس کی طرف جھکایا، کیونکہ اسے غیرت آگئی تھی۔ بیوی نے کہا: اپنا نیزہ دور کر لے اور گھر کے اندر داخل ہوتا کہ تو وہ دیکھ لے جس نے مجھے گھر سے باہر نکالا۔ پس وہ اندر گیا تو زمین پر ایک بہت بڑا سانپ لیٹا پڑا تھا۔ نوجوان نے اس کی طرف نیزہ جھکایا اس میں سانپ کو پروردیا، پھر وہ باہر نکلا اور نیزہ کو گھر کے صحن میں گاڑ دیا۔ پس اس سانپ نے اس نیزے کے اوپر حرکت کی پھر معلوم نہ ہوا۔ کا کہ کون پہلے مرا سانپ یا وہ نوجوان۔ حضرت ابوسعید نے فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور یہ واقعہ ذکر کیا۔ ہم نے کہا: حضور! دعا فرمائیں اسے اللہ تعالیٰ ہمارے لئے زندہ کر دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو۔ پھر فرمایا: مدینہ طیبہ کے جن مسلمان ہو گئے ہیں جب تم ان میں سے کسی کو دیکھو تو تین دن اس کو تنبیہ کرو اگر پھر تمہارے لئے یہ ظاہر ہو تو اسے قتل کر دو وہ شیطان ہے۔ دوسری سند سے اس طرح مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان گھروں میں رہنے والے سانپ ہیں جب ان میں سے کسی کو دیکھو تو تین دن اس پر تنگی کرو اگر وہ چلا جائے تو فہماور نہ اسے قتل کر دو وہ کافر ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: جاؤ اور اپنے ساتھی کو دفن کر دو۔

ہمارے علماء نے فرمایا: اس حدیث سے یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ وہ سانپ جس کو نوجوان نے قتل کیا تھا وہ مسلمان تھا اور جنوں نے اسے قصاصاً قتل کیا تھا کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قصاص ہمارے اور جنوں کے درمیان مشروع ہے تو وہ پھر قتل عمد میں ہو گا اور اس نوجوان نے قتل عمد نہیں کیا تھا کیونکہ اسے تو اس کے مسلمان ہونے کا علم نہ تھا، انہوں نے تو اس نوع کے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کا قتل کرنا شرعاً مشروع تھا۔ یہ قتل خطا ہے اور اس میں قصاص نہیں ہے۔ پس یہ کہنا بہتر ہے کہ کافر اور فاسق جنوں نے اس نوجوان کو اپنے ساتھی کا انتقام لینے کے لئے قتل کیا تھا۔ جنوں نے حضرت سعد بن عبادہ کو قتل کیا تھا وہ اپنے غسل خانہ میں مردہ پائے گئے تھے اور ان کا جسم سبز ہو چکا تھا اور لوگوں کو ان کی موت کا سبب معلوم نہیں ہو رہا تھا حتیٰ کہ انہوں نے کسی کہنے والے کو یہ کہتے ہوئے سنا جبکہ انہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

قد قتلنا سید الخزرج سعد بن عبادہ  
د رمیناہ بسہیہ ن فلم نخط فوادہ

ترجمہ: ہم نے خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو قتل کیا۔ اور ہم نے انہیں دو تیر مارے اور ہم نے اس کے دل سے خطا نہیں کی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (مدینہ طیبہ کے جنوں نے اسلام قبول کر لیا ہے) تاکہ وہ راستہ بیان فرمادیں جس کے ذریعے ان

میں سے کسی مسلمان کو قتل کرنے سے بچایا جائے اور ان میں سے کسی کافر کے قتل پر غلبہ پایا جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کئی سندوں سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک سانپ مار ڈالا، پھر انہیں خواب میں دکھایا گیا کہ کوئی انہیں کہہ رہا ہے تو نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اگر وہ مسلمان ہوتا تو نبی کریم ﷺ کی ازواج کے پاس داخل نہ ہوتا۔ اس کہنے والے نے کہا: وہ آپ کے پاس کبھی داخل نہیں ہوا مگر جب آپ باپردہ ہوتی تھیں۔ صبح ہوئی تو حضرت عائشہ نے بارہ ہزار درہم اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا۔ ایک روایت میں ہے: وہ آپ پر داخل نہیں ہوا مگر جب آپ باپردہ ہوتی تھیں۔ حضرت عائشہ نے صدقہ کیا اور کئی غلام آزاد کیے۔ ربیع بن بدر نے کہا: الجان ان سانپوں میں سے ہے جن کے قتل سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ یہ وہ سانپ ہیں جو چلتے ہیں اور دو ہرے نہیں ہوتے۔ علقمہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** انذار (ڈرانے) کا طریقہ: امام مالک نے فرمایا: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تین دن انہیں ڈرایا جائے۔ عیسیٰ بن دینار کا بھی یہی قول ہے اگرچہ ایک دن میں کئی مرتبہ ظاہر ہو۔ ایک دن میں تین مرتبہ ڈرانے کا اکتفا نہیں کیا جائے گا حتیٰ کہ تین دن میں یہ ڈرانا پایا جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: تین مرتبہ ڈرانا کافی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فلیؤذنه ثلاثاً اس کو تین مرتبہ آگاہ کرو۔ اور فرمایا: حرجوا علیہ ثلاثاً اور اس پر تین مرتبہ تنگی کرو۔ ثلاثاً (تین) کا عدد مؤنث کے لئے ہے پس ظاہر ہوا کہ مراد تین مرتبہ ہے۔ امام مالک کا قول اولیٰ ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ثلاثۃ ایام یہ صحیح نص ہے ان مطلقات کے لئے مقید ہے اور ثلاثاً کو تین ایام کی راتوں کے ارادہ پر محمول کیا جائے گا۔ عربوں کی عادت پر تاریخ کے باب میں رات غالب ہے کیونکہ ان میں تانیث غالب ہوتی ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ڈرانے میں یہ کہنا کافی ہے: أخرج عليك بالله واليوم الآخر الاتبد والنا ولا تؤذونا یعنی میں تجھ پر اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن کے واسطے سے تنگی کرتا ہوں کہ تم ہمارے لئے ظاہر نہ ہو اور نہ ہمیں تکلیف دو۔ ثابت بنانی نے عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ سے روایت کیا ہے کہ ان کے سامنے گھروں میں پائے جانے والے سانپوں کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: جب تم ان میں سے کوئی سانپ اپنے گھروں میں دیکھو تو کہو: انشدکم بالعهد الذی اخذ علیکم نوح علیہ السلام وانشدکم بالعهد الذی اخذ علیکم سلیمان علیہ السلام۔ میں تمہیں اس عہد کا واسطہ دیتا ہوں جو تم سے نوح علیہ السلام نے لیا تھا اور میں تمہیں اس عہد کا واسطہ دیتا ہوں جو تم سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے لیا تھا۔ پھر جب ان میں سے کسی کو دیکھو تو اسے قتل کر دو۔

میں کہتا ہوں: یہ بظاہر ایک دفعہ اذن کی کفایت پر دلیل ہے لیکن حدیث اس کا رد کرتی ہے۔ واللہ اعلم

ابن حبیب نے نبی کریم ﷺ سے روایت فرمایا ہے آپ فرماتے ہیں: انشدکن بالعهد الذی اخذ علیکن سلیمان... علیہ السلام... الاتوذیننا و آلتظہرن علینا۔ (1)

**مسئلہ نمبر 9:** جبیر نے نفیر سے انہوں نے حضرت ابو ثعلبہ النخشی سے روایت کیا ہے۔ ابو ثعلبہ کا نام جرثوم ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنوں کی تین قسمیں ہیں اور سب ایک تہائی ہیں: ایک قسم وہ ہے جن کے پر ہیں وہ ہوا میں

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 357، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب فی قتل العیات، حدیث 4576، ضیاء القرآن پبلیکیشنز



اڑتے ہیں اور ایک قسم سانپ اور کتے ہیں اور ایک قسم وہ ہے جو کی جگہ پڑاؤ ڈالتے ہیں اور سفر کرتے ہیں (1)۔

حضرت ابو درداء نے روایت کیا ہے..... ان کا نام عویر ہے..... فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جن تین حصوں میں پیدا کیے گئے ہیں: ایک تہائی کتے، سانپ اور زمین کے کیڑوں کی صورت میں ہوتے ہیں اور ایک تہائی تیز چلنے والی ہوا کی طرح ہوتے ہیں اور ایک تہائی انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے لئے ثواب اور عقاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کو تین تہائیوں میں پیدا کیا۔ ایک تہائی کے دل ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہوتی ہیں جن کے ساتھ دیکھتے نہیں اور کان ہوتے ہیں جن کے ساتھ سنتے نہیں وہ نہیں ہیں مگر ڈنگروں کی مانند بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہیں اور ایک تہائی جن کے جسم انسانوں کے جسم جیسے ہوتے ہیں، ان کے دل شیطانوں کے دلوں جیسے ہوتے ہیں اور ایک تہائی اللہ کے (عرش کے) سایہ میں ہوں گے جس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا (2)۔

**مسئلہ نمبر 10:** ہر وہ جانور جس کی اصل تکلیف پہنچانا ہو تو اسے ابتداء قتل کیا جائے گا اس کی اذیت پہنچانے کی وجہ سے، اس میں کوئی اختلاف نہیں جیسے سانپ، بچھو، چوہا، چھکلی اور اس کے مشابہ جانور..... رسول اللہ نے فرمایا: پانچ فواسق ہیں: انہیں، حل اور حرم میں قتل کیا جائے گا (3)..... سانپ نے اپنا جو ہر خبیث ظاہر کیا جب اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے خیانت کی اس طرح کہ وہ اپنے جبرڑوں کے درمیان ابلیس کو جنت میں لے گیا۔ اگر سانپ اسے ظاہر کرتا تو جنت کا دربان اسے داخل نہ ہونے دیتا۔ ابلیس نے سانپ سے کہا: تو میرے ذمہ میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سانپوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا: سانپ کو قتل کرو اگرچہ تم نماز میں ہو (4) (یعنی سانپ اور بچھو کو قتل کرو)۔

الوزغة (چھکلی) اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو پھونکنے دیئے تھے جبکہ دوسرے حیوانوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ پس اس پر لعنت کی گئی۔ یہ اس نوع سے ہے جو آپ سے روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: جس نے چھکلی کو قتل کیا گویا اس نے ایک کافر کو قتل کیا اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، جس نے چھکلی کو پہلی ضرب سے مارا اس کے لئے سونکیاں لکھی جائیں گی اور جس نے دوسری ضرب سے مارا اس کے لئے اس سے کم نیکیاں ہوں گی اور جس نے تیسری ضرب سے مارا اس کے لئے اس سے کم نیکیاں ہوں گی۔ ایک روایت میں ہے، فرمایا: پہلی ضرب پر ستر نیکیاں ہیں (5)۔

چوہیا، اس نے اپنا جو ہر خبیث ظاہر کیا کہ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی رسیاں کاٹنے کا قصد کیا اور انہیں کاٹ دیا۔ عبد الرحمن بن ابی نعیم نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: محرم سانپ، بچھو، چیل

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 51، جلد 1 (دارالمصادر)

2۔ نوادر الاصول، صفحہ 51، جلد 1 (دارالمصادر)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ما یندب للمحرم وغیرہ قتله من الدواب فی الحل والحرم، صفحہ 381، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ نوادر الاصول، صفحہ 50، جلد 1 (دارالمصادر)

5۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیان وغیرہا، باب استحباب قتل الوزغ، صفحہ 236، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایسا درندہ جو حملہ کرے، کاٹنے والا کتا اور فویسقہ (چوہیا) کو قتل کرے (1)۔ رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے تو چوہیا نے چراغ کی وٹ پکڑی ہوئی تھی تاکہ گھر کو آگ لگا دے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔

کوا، اس نے اپنا جوہر اس وقت ظاہر کیا جب حضرت نوح علیہ السلام نے اسے کشتی سے بھیجا کہ زمین کی خبر لے آئے تو اس نے نوح علیہ السلام کے حکم کو ترک کر دیا اور مردار پر جا بیٹھا۔ یہ سب سانپ کے حکم میں ہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے ذکر کر دیا۔ مزید وضاحت ان شاء اللہ سورہ مائدہ میں آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ** اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَقُلْنَا اهْبِطُوا، اهْبِطُوا** سے لفظ الف حذف کیا گیا ہے کیونکہ یہ الف وصلی ہے، اور قلنا سے لفظ الف حذف کیا گیا ہے اس کے اور اس کے بعد ہا کے سکون کی وجہ سے۔

محمد بن مصطفیٰ نے ابو حیوہ سے روایت کیا ہے کہ اہبطوا میں با پر ضمہ ہے یہ ایک لغت ہے۔ اس قول کو یہ بات تقویت دیتی ہے کہ یہ غیر متعدی ہے، اور اکثر غیر متعدی فعل **يَفْعُلُ** کے وزن پر آتا ہے۔ یہ خطاب حضرت آدم، حوا، سانپ اور شیطان کو ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ حسن نے کہا: حضرت آدم، حوا اور وسوسہ کو (2)، مجاہد اور حسن نے کہا: بنو آدم اور بنو ابلیس کو ہے۔ الہبوط کا معنی اوپر سے نیچے کی طرف اترنا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں سرندیپ میں ایک پہاڑ پر اترے جسے بوذ کہا جاتا ہے۔ آپ کے ساتھ جنت کی خوشبو تھی۔ پس اس علاقہ کے درختوں اور وادیوں سے لگی ہر چیز خوشبو سے بھر گئی، اسی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی خوشبو سے وہاں سے خوشبو لائی جاتی ہے۔ بادل آپ کے سر کو چھوتا تھا تو آپ گنبے ہو گئے تھے۔ پس گنجاپن آپ کی اولاد کو میراث میں ملا۔

بخاری میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا تو ان کا طول ساٹھ ہاتھ تھا (3)۔ (الحديث) مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے، آئندہ ذکر ہوگی۔ حضرت حوا جدہ میں اتریں اور ابلیس اہلبہ میں اور سانپ بیسان میں اترے۔ بعض نے فرمایا: بستان میں، بستان میں تمام شہروں سے زیادہ سانپ ہیں۔ اگر عرب سانپ نہ ہوتا جو سانپوں کو کھا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے اکثر مر جاتے ہیں بستان سانپوں کے لئے خالی کر دیا جاتا۔ یہ ابو الحسن مسعودی نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ**، **بَعْضُكُمْ** مبتدا ہے، **عَدُوٌّ** خبر ہے اور یہ جملہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: **وَهَذِهِ حَالُكُمْ**۔ واد کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ کلام میں ضمیر عائد موجود ہے جیسے کہا جاتا ہے: **رَأَيْتَكَ السَّمَاءَ تَمُطِرُ عَلَيْكَ**۔ میں نے تجھے دیکھا دریاں حالیکہ آسمان تم پر بارش برسا رہا تھا۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الحج، باب ما جاء ما يقتل المحرم من الدواب، صفحہ 103، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر قطبی، صفحہ 221، جلد 1 (دارالاحیاء التراث)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 468، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الانبیاء، باب خلق آدم وذریئہ، حدیث 3079، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

العدو۔ دشمن، یہ صدیق (دوست) کا متضاد ہے یہ عدا سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: ظلم کرنا۔ ذنب عدوان (دشمن بھڑیا) یعدو عنی الناس جو لوگوں پر تجاوز کرتا ہے، العدو ان صریح ظلم۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تجاوز کرنا۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: لا یعدون هذا الامر یعنی یہ امر تجھ سے تجاوز نہیں کرے گا۔ عدا، اس نے اس سے تجاوز کیا، اس کو عداؤ اس لئے کہتے ہیں اپنے ساتھی کی ناپسند میں حد سے تجاوز کرتا ہے۔ اسی سے ہے: العدو بالقدم۔ چلنے میں تجاوز کرنا۔ دونوں معانی قریب قریب ہیں کیونکہ جو ظلم کرتا ہے وہ تجاوز کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: بعض علماء نے بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کو انسان پر محمول کیا ہے اگرچہ یہ معنی صحیح ہے لیکن یہ بعید ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد اس کی دلیل ہے جب بندہ صبح کرتا ہے تو تمام اعضاء زبان سے کہتے ہیں ہمارے لئے اللہ سے ڈر۔ تو جب سیدھی ہوگی تو ہم سیدھے ہوں گے تو ٹیڑھی ہوگی تو ہم ٹیڑھے ہوں گے (1)۔

اگر یہ کہا جائے کہ عَدُوٌّ کیسے فرمایا اعداء نہیں فرمایا؟ اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ بعض اور کل کے لفظ کی خبر لفظ کے اعتبار سے واحد لگائی جاتی ہے اور معنی کے اعتبار سے اس کے مطابق لگائی جاتی ہے اور قرآن میں یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کُلُّهُمْ اِتِّیَهِ یَوْمَ الْقِیَمَةِ فَرْدًا ⑤ (مریم) یہاں لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد خبر لگائی۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ کُلُّ اَتَوْکَا ذَخِرَیْنِ ⑥ (النمل) یہاں معنی کے اعتبار سے خبر جمع لگادی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ عدو جمع کی جگہ مفرد ذکر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ هُمْ لَکُمْ عَدُوٌّ یُّبْسِلُ لِلظَّالِمِیْنَ بَدَلًا ⑦ (الکہف) (اور وہ سب تمہارے دشمن ہیں ظالموں کے لئے بہت برا بدلہ ہے)

اسی طرح فرمایا: یَحْسَبُوْنَ کُلَّ صِیْحَةٍ عَلَیْهِمْ ⑧ هُمُ الْعَدُوُّ (النافقون: 4) (گمان کرتے ہیں کہ ہر گرج ان کے خلاف ہی ہے۔ یہی حقیقی دشمن ہیں) ابن فارس نے کہا: الْعَدُوُّ، اسم ہے جو واحد، تشبیہ، جمع اور تانیث کو جامع ہے، کبھی اس کی جمع بھی بنائی جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنا اور جنت سے اتارنا بطور سزا نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے کے بعد انہیں زمین پر اتارا، یا تو تادیب کی خاطر یا محنت میں سختی کی خاطر اتارا۔ اور صحیح یہ ہے کہ ان کو اتارنا اور زمین میں ٹھہرانا حکمت ازلیہ کے سبب تھا اور وہ حکمت یہ تھی کہ زمین میں ان کی نسل پھیلانی جائے تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنا مکلف بنائے اور انہیں آزمائے۔ پھر اس پر ان کے ثواب اور اخروی عقاب کو مرتب فرمائے، کیونکہ جنت اور دوزخ ایسی جگہ نہیں ہیں جہاں احکام کا مکلف بنایا گیا ہو۔ پس وہ کھانا جنت سے اتارنے کا سبب بنا اور اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے جو چاہے کرے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا تھا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ: 30) یہ منقبت عظیمہ اور فضیلت کریمہ شریفہ ہے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ ہم نے کہا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کرنے کے بعد زمین پر اتارا کیونکہ دوسری مرتبہ فرمایا: قُلْنَا اهْبِطُوا۔



**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ یہ مبتدا خبر ہیں اور مُسْتَقَرٌّ اسم ظرف ہے۔ یہ ابو العالیہ اور ابن زید کا قول ہے۔ سدی نے کہا: مُسْتَقَرٌّ سے مراد قبور ہیں۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد جَعَلَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ قَرَارًا (غافر: 64) یہ دونوں معانی کا احتمال رکھتا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَتَاعٌ، المتاع ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے لطف اٹھایا جائے خواہ کھانا ہو، لباس ہو، زندگی (کی کوئی اور ضرورت ہو) بات ہو، محبت وغیرہ ہو۔ اس سے منفعة النکاح کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے لطف اٹھایا جاتا ہے۔ سلیمان بن عبد الملک جب اپنے بیٹے کو دفن کے بعد اس کی قبر پر کھڑا ہوا تو کہا:

وقفت على قبر غريب بفقرة متاع قليل من حبيب مفارق (1)

میں ایک میدان میں مسافر کی قبر پر کھڑا ہوں۔ یہ جدا ہونے والے دوست سے تھوڑا سا سامان ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِيَّايَ حِجِينِ، الحین کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں ایک جماعت کا کہنا ہے: اس سے مراد موت ہے (یعنی مرنے تک) یہ ان کا قول ہے جو کہتے ہیں: المستقر دنیا میں ٹھہرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: اس سے مراد ہے قیامت کے قیام تک۔ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں: المستقر سے مراد قبور ہیں۔ ربیع نے کہا: إِيَّايَ حِجِينِ سے مراد الی اجل یعنی موت تک۔

الحین سے مراد وقت بعید ہے اس وقت تیرے قول الآن اب سے دور کرنا سے ہے۔ خویلد نے کہا:

كأن الرمد عظيم القدر جفنته حين الشتاء كحوض المنهل اللقف

بہت زیادہ سختی ہے، اس کا پیالہ بہت بڑا ہے، سردیوں کے وقت کھلے گھاٹ والے حوض کی طرح ہے۔

کبھی حین پر تا داخل کرتے ہیں۔ ابو جزمہ نے کہا:

العاطفون تحین ما من عاطف والبطعون زمان أين المطعم

وہ مہربانی کرنے والے ہوتے ہیں جبکہ کوئی مہربان نہیں ہوتا اور وہ کھلانے والے ہوتے ہیں جس وقت کہا جاتا ہے کھلانے والا کہاں ہے۔

الحین کا معنی مدت بھی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ (الدھر: 1) الحین کا معنی ساعت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَوْ تَقُولُ حِينٌ تَرَى الْعَذَابَ (زمر: 58)، ابن عرفہ نے کہا: الحین زمانہ کے ایک ٹکڑے کو کہتے ہیں جیسے ساعت، گھڑی اور اس سے اوپر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ نَرَاهُمْ فِي عَمَتِهِمْ حَتَّى حِينٍ (المومنون) اسے محبوب رہنے دو انہیں اپنی مدہوشی میں کچھ وقت۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تُؤْتِي أُمَّهَاتُ كُلِّ حِينٍ (ابراہیم: 25) وہ سارا سال پھل لاتا ہے، بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہر چھ ماہ بعد پھل لاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: صبح و شام پھل دیتا ہے۔ الا زہری نے کہا: الحین اسم ہے جیسے الوقت یہ تمام زمانوں کو شامل ہے خواہ وہ لمبا زمانہ ہو یا مختصر۔

مطلب یہ ہے کہ اس سے ہر وقت نفع اٹھایا جاتا ہے اور اس کا نفع کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ فرمایا: الحین سے مراد قیامت کا دن ہے۔ الحین سے مراد صبح و شام بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ ﴿۲۵﴾ (الروم) (سو پا کی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو) کہا جاتا ہے: عاملتہ محابنۃ کچھ میں نے اس کے ساتھ معاملہ کیا۔ احینت بالیہکان میں وقت وہاں ٹھہرا حان حین کذا۔ یعنی قریب ہوا۔ ثینۃ نے کہا:

وان سلوی عن جیل لساعة من الدهر ما حانت ولا حان حیثھا

**مسئلہ نمبر 7:** جہاں الحین کے متعلق اہل زبان کا اختلاف ہے وہاں ہمارے علماء اور دوسرے علماء کے درمیان بھی اس میں اختلاف ہے۔ فراء نے کہا: الحین کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس کی حد پر واقفیت نہیں ہوتی۔ دوسرا حین وہ جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا: تُوْتِیْ اَکْثَہَا کُلَّ حَیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّہَا (ابراہیم: 25) یہاں حین سے مراد چھ مہینے ہیں۔ ابن عربی نے کہا: الحین السجھول وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ کوئی حکم متعلق نہیں ہوتا اور الحین المعلوم وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ احکام متعلق ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ تکلیف کا تعلق ہوتا ہے۔ معلوم کی زیادہ سے زیادہ مدت ایک سال ہے۔ امام مالک احکام اور ایمان (قسموں) میں اس کو اسماء اور زمانوں میں اعم خیال کرتے ہیں۔ امام شافعی اقل خیال کرتے ہیں، ابو حنیفہ درمیانی مدت مراد لیتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: چھ ماہ۔ ان کے قول کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ان کے نزدیک مقدرات قیاساً ثابت نہیں ہوتی ہیں اور اس میں صاحب شریعت کی طرف سے کوئی نص نہیں ہے، معنی پر اعتبار کے لفظ کے مقتضی پر لغوی طور پر آگاہی کے بعد ہوتا ہے۔ پس جس نے نذر مانی کہ وہ ایک صین نماز پڑھے گا تو اسے امام شافعی کے نزدیک ایک رکعت پر محمول کیا جائے گا کیونکہ ایک رکعت نفل میں سے کم از کم ہے۔ انہوں نے وتر کی ایک رکعت پر قیاس کیا ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: نوافل کم از کم دو ہیں۔ پس زمانہ نفل کی مقدار کے ساتھ مقدر ہوگا۔ ابن خویر منداد نے ذکر کیا ہے کہ جو قسم اٹھائے الایکم فلانا حینا اولایفعل کذا حیناً۔ تو حین سے مراد ایک سال ہوگا اور فرمایا: احکام میں علماء کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی قسم اٹھائے کہ وہ ایک حین ایسا نہیں کرے گا یا فلاں سے ایک حین بات نہیں کرے گا۔ سال پر زیادتی اس کی قسم میں داخل نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ اتفاق ان کے مذہب میں ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جس نے قسم اٹھائی کہ وہ ایک صین یا زمانہ، یا دھر ایسا نہیں کرے گا تو سب سے مراد ایک سال ہوگا۔ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے، دھر میں ایک سال ہونے میں انہیں شک ہوا۔ ابن منذر نے یعقوب اور ابن الحسن سے حکایت کیا ہے کہ دھر سے مراد چھ ماہ ہے۔ حضرت ابن عباس، اصحاب الرائے، عکرمہ، سعید بن جبیر، عامر الشعمی اور عبیدہ نے تُوْتِیْ اَکْثَہَا کُلَّ حَیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّہَا (ابراہیم: 25) کے تحت فرمایا کہ کل حین سے مراد چھ ماہ ہیں۔ اوزاعی اور ابو عبیدہ نے کہا: الحین سے مراد چھ ماہ ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک الحین میں کوئی معلوم وقت نہیں ہے اور نہ صین کے لئے کوئی حد ہے کبھی ان کے نزدیک الحین سے مراد دنیا کی مدت ہوتی ہے ہم کبھی بھی اسے حانث نہیں بنائیں گے اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ دن کے ختم ہونے سے پہلے ادا کر دے۔ ابو ثور وغیرہ نے کہا: الحین اور الزمان اس پر محمول ہوگا جو لغت کہتی ہے۔ کہا جاتا ہے: قد جئت من حین شاید وہ نصف دن سے نہ آیا ہو، الکیا طبری شافعی

نے کہا: وبالجملة، الحین کے کئی مصارف ہیں۔ امام شافعی کسی محل کی تعیین نہیں کرتے کیونکہ یہ محل ہے لغت میں کسی معین معنی کے لئے وضع نہیں کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اِنِّیْ حَیْنٌ یہ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے بشارت ہے تاکہ وہ جان لیں کہ انہوں نے ہمیشہ اس دنیا میں باقی نہیں رہنا ہے انہوں نے جنت کی طرف منتقل ہونا ہے جس کی طرف لوٹنے کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور یہ حضرت آدم کے علاوہ لوگوں کے لئے قیامت کے قائم ہونے پر دلیل ہے۔ یہی کافی ہے۔ واللہ اعلم

فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۰﴾

”پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے چند کلمے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم کرنے والا۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ بعض علماء نے فرمایا: تَلَقَّى کا معنی سمجھنا ہے۔ بعض نے فرمایا: قبول کرنا اور لینا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام یتلقى الوحی یعنی وحی حاصل کرتے تھے اسے لیتے تھے۔ تو کہتا ہے: خراجنا تتلقى الحجاج ہم نکلے تاکہ حاجیوں کا استقبال کریں۔ بعض نے فرمایا: تَلَقَّى کا معنی تلقین کرنا ہے، یہ معنی صحیح ہے لیکن اصل میں تَلَقَّى کا تلقن سے ہونا جائز نہیں کیونکہ جب دو حرف ہم جنس ہوں تو ایک کو یا، سے قلب کیا جاتا ہے مثلاً تظنی، یہ تظنن سے ہے تفضی یہ تفضص اس کی مثل ہے تسریت یہ تسارت سے ہے املیت یہ امللت سے ہے اس کی قسم کی دوسری مثالیں بھی ہیں اسی وجہ سے یہ نہیں کہا جاتا تَقْبَلُ، تَقْبَلُ سے ہے اور نہ یہ کہا جاتا ہے کہ تَلَقَّى، تَلَقِّن سے ہے، مکی نے حکایت کیا حضرت آدم علیہ السلام کو کلمات الہام کئے گئے۔ پس حضرت آدم علیہ السلام نے ان سے نفع اٹھایا۔ حسن نے کہا: وہ کلمات سیکھے اور ان پر عمل کیا۔

**مسئلہ نمبر 2:** کَلِمَاتٍ میں مفسرین کا اختلاف ہے، حضرات ابن عباس، حسن، سعید بن جبیر، ضحاک اور مجاہد نے کہا: وہ کلمات یہ تھے: رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۱۰﴾ (اعراف) مجاہد سے یہ الفاظ بھی مروی ہیں: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ رَبِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (1)۔ ایک جماعت نے کہا: انہوں نے عرش کے پائے پر یہ لکھا ہوا دیکھا: مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ تو انہوں نے ان کلمات سے سفارش طلب کی تو ان کی سفارش قبول کی گئی۔ کلمات سے مراد یہ کلمات ہیں۔ ایک گروہ نے کہا: کَلِمَاتٍ سے مراد رونا، حیا، کرنا اور دعا کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: ندامت، استغفار اور پریشان ہونا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول تقاضا کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے معبود استغفار کے علاوہ کچھ نہ کہا (2)۔ بعض نیک لوگوں سے پوچھا گیا کہ گناہگار کو کیا کہنا چاہئے تو اس نے کہا: جو اس کے والدین نے کہا تھا: رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا (اعراف: 23) مویٰ علیہ السلام نے کہا تھا: رَبِّیْ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي (القصص: 16) یونس علیہ السلام نے کہا تھا: لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۰﴾ (الانبياء) حضرت ابن عباس اور وہب



بن منہ سے مروی ہے کہ یہ کلمات تھے: سبحان اللہ وبحمدک لا الہ الا انت عملت سوءاً و ظلمت نفسی فقتب علی انک انت التواب الرحیم۔ محمد بن کعب نے کہا: یہ کلمات تھے: لا الہ الا انت سبحانک وبحمدک عملت سوءاً و ظلمت نفسی فقتب علی انک انت التواب الرحیم لا الہ الا انت سبحانک وبحمدک عملت سوءاً و ظلمت نفسی فارحمتنی انک انت الغفور الرحیم لا الہ الا انت سبحانک وبحمدک عملت سوءاً و ظلمت نفسی فارحمتنی انک ارحم الراحمین۔ بعض نے فرمایا: کلمات سے مراد چھینک کے بعد الحمد للہ کہنا ہے۔

الکلمات، کلمۃ کی جمع ہے۔ الکلمہ کا لفظ قلیل و کثیر پر بولا جاتا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فتابَ عَلَیْہِ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی یا توبہ کی توفیق بخشی۔ جمعہ کے دن دس محرم الحرام کو توبہ قبول فرمائی جیسا کہ آگے اس کا بیان آئے گا۔ تاب العبد کا مطلب بندہ اپنے رب کی طاعت کی طرف لوٹ آیا۔

عبد تواب، طاعت کی طرف کثرت سے رجوع کرنے والا۔ توبہ کا اصل معنی لوٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے تاب و تاب و آب و اناب ان سب کا معنی لوٹنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اگر کہا جائے کہ عَلَیْہِ کیوں فرمایا علیہما کیوں نہیں فرمایا، حضرت حوا بھی تو بالا جماع اس کام میں شریک تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو فرمایا تھا: وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ (البقرہ: 35) اس درخت کے قریب نہ جانا، اور قَالَ لَا تَبْتَاطِلُنَا أَنْفُسًا (اعراف: 23) دونوں نے کہا ہمارے رب ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قصہ کے آغاز میں جب حضرت آدم علیہ السلام کو اُسکن کے ارشاد سے خطاب کیا گیا تو تلقی میں بھی خاص ان کا ذکر فرمایا۔ اسی وجہ سے واقعہ کی تکمیل بھی صرف ان کے ذکر سے کی۔ نیز عورت حرمت اور مستورہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر نہ فرما کر اس کے لئے پردہ کا ارادہ فرمایا۔ اسی وجہ سے معصیت میں بھی ان کا ذکر نہیں فرمایا وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ (طہ)

نیز عمومی احکام میں عورت مرد کے تابع ہوتی ہے اس کا ذکر نہیں کیا جاتا، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو نو جوان تھا اس کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نہیں فرمایا: أَلَمْ أَقُلْ لَّكَ (الکہف: 75) (کیا میں نے تجھے کہا نہیں تھا) بعض علماء نے فرمایا: چونکہ دونوں کا امر برابر تھا حضرت آدم کی توبہ کی قبولیت کا ذکر حضرت حوا کی توبہ کی قبولیت کی دلیل ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا (الجمعة: 11) چونکہ قوم کی مقصود تجارت تھی اس لئے ضمیر کی طرف لوٹادی اور تثنیہ کی ضمیر ذکر نہیں فرمائی، معنی قریب قریب ہے۔ شاعر نے کہا:

رمانی ہامو کنت منه و والدی برینا و من فوق الطوی رمانی

اس نے مجھ پر ایک امر کی تہمت لگائی میں اور میرا والد اس سے بری تھے اور اس نے ایک کنویں کی وجہ سے مجھ پر تہمت لگائی۔ قرآن حکیم میں ہے اللہ وَمَسْئُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُزْصَوَّكَ (توبہ: 62) (اللہ اور اس کا رسول زیادہ مستحق ہے کہ اسے راضی

کریں) یہاں بھی ایجاز و اختصار کی خاطر حذف کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ** اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت التَّوَّابُ بیان فرمائی اور قرآن حکیم میں یہ صفت معرفہ، تکررہ، اسم اور فعل کی صورت میں بار بار ذکر فرمائی، کبھی ثواب کا اطلاق بندے پر بھی کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ** (البقرہ) (بے شک اللہ دوست رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے صاف ستھرا رہنے والوں کو)

ابن عربی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا وصف ہونے میں ہمارے علماء کے تین اقوال ہیں:

۱- رب تعالیٰ کے حق میں یہ جائز ہے اس نام کے ساتھ اسے پکارا جائے گا جیسا کہ کتاب و سنت میں وارد ہوا ہے اور کوئی تاویل نہیں کی جائے گی۔ دوسرے علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا وصف حقیقی ہے۔ توبۃ اللہ علی العبد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو معصیت کی حالت سے طاعت کی حالت کی طرف لوٹا دیا۔ بعض دوسرے علماء نے فرمایا: توبۃ اللہ علی العبد کا مطلب اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کی توبہ قبول کرنا یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد قبلت توبتک (میں نے تیری توبہ قبول کی) کی طرف لوٹے اور اس طرف لوٹنے کا احتمال رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مجرم بندے کے دل میں توبہ کرنے اور ظاہری اعضاء پر طاعات کو جاری کرنے کی توفیق بخش دے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کے حق میں تائب کہنا جائز نہیں۔ تائب، اسم فاعل ہے تاب یتوب سے، کیونکہ ہمارے لئے جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی اسم یا صفت استعمال کریں مگر صرف وہی جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے استعمال فرمایا یا نبی کریم ﷺ نے اس کے لئے استعمال فرمایا یا مسلمانوں کی جماعت نے استعمال فرمایا۔ اگرچہ لغت میں وہ جائز بھی ہو۔ اس باب میں بھی صحیح ہے جیسا کہ ہم نے ”الکتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی“ میں بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **لَقَدْ ثَابَّ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ** (توبہ: 117) (یقیناً رحمت سے توجہ فرمائی اللہ تعالیٰ نے (اپنے) نبی پر نیز مہاجرین اور انصار پر) اور فرمایا **هُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ** (الشوری: 25) (اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی) اللہ تعالیٰ کو ثواب کہا گیا ہے فعل کے مبالغہ کے لئے اور جو کثرت سے اس کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے کثرت سے اس کی توبہ قبول کرنے کی وجہ سے۔

**مسئلہ نمبر 7:** کسی کو توبہ تخلیق کرنے کی قدرت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اعمال کی تخلیق میں منفرد ہے جب کہ معتزلہ اور ان کے ہم نواؤں کا مسلک اس سے مختلف ہے۔ اسی طرح کسی کے لئے مجرم کی توبہ قبول کرنا اور اسے معاف کرنا جائز نہیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہود و نصاریٰ نے دین میں اس اصل کا انکار کیا۔ **إِثَّخَذُوا أَحْبَابَهُمْ وَرُءُفَاءَهُمْ أَرْبَابًا مِمَّنْ دُونِ اللَّهِ** (توبہ: 31) (انہوں نے بنالیا اپنے پادریوں اور اپنے راہبوں کو) (اپنے) پروردگار اللہ کو چھوڑ کر) انہوں نے مجرم، گنہگار کے لئے یہ اصول بنایا کہ وہ کسی عالم یا راہب کے پاس جائے اور اسے کوئی چیز (نذرانہ) دے دے تو اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ **أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّ اللَّهَ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ** (انعام) (بہتان باندھ کر اللہ پر بے شک وہ گمراہ ہو

گئے اور نہ تھے وہ ہدایت پانے والے۔

**مسئلہ نمبر 8:** ابن کثیر نے فتلقی آدم من ربہ کلمات پڑھا ہے باقی قراء نے آدم کے رفع اور کلمات کی نصب کے ساتھ پڑھا ہے (1) دونوں قراءتیں ایک ہی معنی کی طرف لوٹی ہیں کیونکہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے کلمات کو پایا تو کلمات انہیں مل گئے۔ بعض علماء نے فرمایا: کلمات ہی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرت آدم علیہ السلام کو ملنے والے تھے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرت آدم نے وہ کلمات قبول کئے اور ان کے ساتھ دعا کی تو یہ کلمات ہی فاعل ہیں۔ گویا اصل اس قراءت پر ہے فتلق آدم من ربہ کلمات۔ لیکن جب مؤنث اور اس کے فعل کے درمیان بعد اور دوری پائی گئی تو علامت تانیث کو حذف کرنا اچھا ہوا۔ یہ اصل ہے جو قرآن اور کلام میں جاری ہوتی ہے جب مؤنث کا فعل بغیر علامت تانیث کے ہو۔ اسی سے عربوں کا قول ہے۔ حضر القاضی الیوم امراؤ۔ عورت آج قاضی کے پاس حاضر ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا کلمات کی تانیث جب حقیقی نہ تھی تو اسے الکلم کے معنی پر محمول کیا گیا۔ پس صیغہ مذکر ذکر کیا گیا۔ اعمش نے آدم من ربہ کو مدغم کر کے پڑھا ہے۔ ابونوفل بن ابی عقرب نے (أنه) ہمزہ کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے لانہ کے معنی کی بنا پر۔ باقی قراء نے نئی کلام کی بنا پر کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو، عیسیٰ اور طلحہ نے ہا کو ہا میں ادغام کیا ہے۔ یہ ابو حاتم نے ابو عمرو وغیرہ سے حکایت کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ جائز نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان لفظا واو ہے خطا نہیں۔ نحاس نے کہا: سیبویہ نے اس واو کو حذف کرنا جائز قرار دیا ہے اور اس نے یہ شعر پڑھا ہے:

لہ زجل كأنہ صوت حاد اذا طلب الوسیقة او زمیر

اس کیلئے مترنم آواز تھی گویا وہ کسی حدی خوان کی آواز ہے۔ جب اس نے اپنی مادہ کو طلب کیا یا اس کی آواز میں مزار ہے۔ پس اس صورت میں ادغام جائز ہے۔ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور ثواب خبر ہے پھر پورا جملہ ان کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ہوا کی تاکید ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ ہوا صمد ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر نے کہا: جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین کی طرف اتارا گیا تو زمین میں خشکی پر گدھ کے علاوہ کچھ نہ تھا اور دریا میں مچھلی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ گدھ مچھلی کے پاس پناہ لیتی اور رات گزارتی۔ جب گدھ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھا تو کہا: اے مچھلی آج زمین کی طرف ایک چیز اتاری گئی ہے جو ٹانگوں پر چلتی ہے اور ہاتھوں سے پکڑتی ہے۔ مچھلی نے کہا: اگر تو سچی ہے تو پھر میرے لئے دریا میں نجات کی جگہ نہیں اور تیرے لئے خشکی میں اس سے خلاصی کی جگہ نہیں۔

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَاَمَّا يٰٓاٰدَمُ فَسَلِّمْ هٰذَا فَاٰمُرُكَ بِاَنْ تَخْرُجَ مِنْ هٰذَا فَاَمُرُكَ بِاَنْ تَخْرُجَ مِنْ هٰذَا فَاَمُرُكَ بِاَنْ تَخْرُجَ مِنْ هٰذَا

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَخْزَنُونَ ﴿٣٠﴾

”ہم نے حکم دیا اتر جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے (پیغام)

ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“





کتاب اللہ ہے۔ یہ سدی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ہدایت کی توفیق ہے۔ ایک جماعت نے کہا: الہدیٰ سے مراد رسل ہیں جو فرشتوں میں سے حضرت آدم کی طرف آئے اور بشروں میں سے حضرت آدم کی اولاد کی طرف آئے (1)۔ جیسا کہ حضرت ابو ذر کی حدیث میں آیا ہے۔ آجری نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

قبتی کے قول میں اشارہ ہے کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں، جبکہ قدر یہ وغیرہ کا قول اس سے مختلف ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔

جمہوری نے ہدیٰ پڑھا ہے یہ ہذیل کی لغت ہے۔ وہ کہتے ہیں: ہدیٰ، عصی، محییٰ۔ نحو یوں نے ابو ذرؓ کا شعر نقل کیا ہے جو وہ اپنے بیٹے کے مرثیہ میں کہتا ہے:

سبقوا ہوتی واعنقوا لہواہم فتخبروا ولکل جنب مصرع (2)

وہ میری خواہش سے سبقت لے گئے گویا انہوں نے موت کی خواہش کی۔ پس وہ ایک ایک کر کے پکڑے گئے، ہر پہلو کے لئے گرنا ہے۔

نحاس نے کہا: خلیل اور سیبویہ کے نزدیک اس لغت کی علت یہ ہے کہ اضافت کی یا کا ماقبل کسرہ ہونا چاہئے تھا جب وہ نہ تھی کیونکہ الف کو حرکت نہیں دی جاتی تو الف کو یا سے بدل دیا گیا پھر یا کو یا میں ادغام کر دیا گیا۔

(اما) اس میں مازائدہ ہے، ان شرط کے لئے ہے، اور جواب شرط فاشرط ثانی کے ساتھ ہے۔ جو ”فَمَنْ تَبِعَ“ میں ہے۔ من مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور تَبِعَ شرط کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔ فَلَاحَوْفٌ، اس دوسری شرط کا جواب ہے، سیبویہ نے کہا دوسری شرط اور اس کا جواب دونوں پہلی شرط کا جواب ہیں، کسائی نے کہا: فَلَاحَوْفٌ عَلَيْهِمْ۔ دونوں شرطوں کا اکٹھا جواب ہے (3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَاحَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٥٠﴾، حَوْفٌ سے مراد پریشانی، گھبراہٹ ہے اور یہ مستقبل کے امر پر ہوتی ہے۔ حاد فنی فلائ فحفتہ۔ فلاں نے مجھے ڈرایا تو میں اس سے انتہائی خوف زدہ ہو گیا۔ التخوف کا معنی کمی ہونا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَوْ يَأْخُذْهُمْ عَلَى تَخَوُّفٍ (النحل: 47) حضرات زہری، حسن، عیسیٰ بن عمر، ابن ابی اسحاق اور یعقوب نے (فلا حوف) فاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور نحو یوں کے نزدیک پسندیدہ رفع اور تنوین ہے۔ مبتدا ہونے کے اعتبار سے۔ کیونکہ دوسرا اسم معرفہ ہے اور اس میں صرف رفع ہی ہوتا ہے کیونکہ لا معرفہ میں عمل نہیں کرتا۔ پس انہوں نے پہلے اسم میں ہی رفع کو اختیار کیا ہے تاکہ کلام ایک جیسی ہو جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ لا حوف میں لا بمعنی لیس ہو۔

الحزن اور الحزن۔ یہ مس و رکی ضد ہیں۔ یہ ماضی کے کسی امر پر ہوتا ہے۔ حزن الرجل فهو حزن و حزين، احزنہ غیرہ و حزنہ۔ جیسے اسلک و سلک۔ (یعنی حزن لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے) اس کا مجہول محزون آتا ہے۔ یزیدی نے کہا: حزنہ یہ قریش کی لغت ہے۔ احزنہ یہ تمیم کی لغت ہے۔ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے احزن اور تحزن کا ایک

معنی ہے: غمگین ہونا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ ان پر آخرت کا کوئی خوف نہیں ہے اور دنیا میں جو فوت ہوا اس پر وہ غمگین نہیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس میں قیامت کے دن کی ہولناکیوں اور اطاعت شعاروں پر قیامت کے خوف کی نفی کی دلیل نہیں ہے کیونکہ قیامت کی تکلیفوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے بیان فرمایا ہے لیکن اطاعت شعاروں سے وہ تکلیفیں اللہ تعالیٰ کم کر دے گا جب وہ اللہ کی رحمت کی طرف چلے گئے تو گویا انہیں خوف ہے ہی نہیں۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٣٠﴾

”اور جنہوں نے کفر کیا اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو وہ دوزخی ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِينَ كَفَرُوا یعنی جنہوں نے شرک کیا، کیونکہ آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ صحبت کا مطلب ہوتا ہے ہر حالت میں اور ہر زمانہ میں کسی چیز سے ملا ہوا ہونا، اگر ملازمت اور اختلاط ہو تو یہ کمال صحبت ہے۔ اسی طرح یہ دوزخیوں کی دوزخ سے صحبت ہے، اس قول کی وجہ سے صحابہ کا نام رکھنے میں اختلاف ختم ہو جاتا ہے کیونکہ مراتب مختلف ہیں (1)۔ مزید تفصیل ہم ان شاء اللہ سورہ برأت میں بیان کریں گے۔ اس آیت کے باقی الفاظ کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

يَبْنِي إِسْرَءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أَوْفِ

بِعَهْدِكُمْ وَآيَايَ، فَاتَّهَبُونَ ﴿٣١﴾

”اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو کیا میں نے تم پر اور پورا کرو تم میرے (ساتھ کئے ہوئے) وعدہ کو میں پورا کروں گا تمہارے (ساتھ کئے ہوئے) وعدہ کو اور صرف مجھ ہی سے ڈرا کرو۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَبْنِي إِسْرَءِيلَ یہ ندا مضاف ہے اس میں نصب کی علامت یاء ہے۔ اضافت کی وجہ سے اس سے نون حذف کیا گیا ہے۔ بنین کا واحد ابن ہے اس میں اصل بنی ہے بعض نے فرمایا: بَنُو ہے۔ جنہوں نے فرمایا: اس میں واو حذف کی گئی ہے انہوں نے بنوۃ سے حجت پکڑی ہے، اس میں کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: الفتوة میں اصل یاء ہے۔ زجاج نے کہا: میرے نزدیک یاء حذف ہے گویا یہ بنیت سے مشتق ہے۔ اخفش نے اس سے واو کے حذف کو پسند کیا ہے کیونکہ واو کے ثقل کی وجہ سے واو کا حذف اکثر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ابن بیت، البنوۃ۔ اور تصغیر بنی فراء نے کہا: یا بنی یا بنی دونوں لغتیں ہیں جیسے یا ابت و یا ابت دونوں طرح پڑھا گیا ہے یہ البناء سے مشتق ہے۔ یہ کسی شے کو دوسری شے پر رکھنا ہے۔ الابن یہ باپ کی فرع ہے اس پر اس کو رکھا گیا ہے۔

إِسْرَءِيلَ سے مراد یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام ہے۔ ابو الفرج جوزی نے کہا: حضرت یعقوب کے علاوہ انبیائے کرام میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کے دو نام ہوں مگر ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے نام ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ”فہوم الآثار“ میں اس کا ذکر کیا ہے۔



میں کہتا ہوں: کہا گیا ہے کہ المسیح عیسیٰ علیہ السلام کا علم ہے غیر مشتق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام روح اور کلمہ رکھا ہے لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابیل الابیہین کہتے تھے۔ یہ جوہری نے ”الصحاب“ میں ذکر کیا ہے۔ یہی نے ”دلائل النبوة“ میں خلیل بن احمد سے روایت کیا ہے کہ پانچ انبیائے کرام دو دو ناموں والے تھے۔ محمد اور احمد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، عیسیٰ اور مسیح، اسرائیل اور یعقوب، یونس اور ذوالنون، الیاس اور ذوالکفل صلی اللہ علیہ وسلم۔ میں کہتا ہوں: ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار نام تھے لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اسماء تھے۔ ان کا بیان اپنی جگہ پر ہوگا۔ اسْرَآءِیْلَ عجمی اسم ہے اسی وجہ سے غیر منصرف ہے یہ اضافت کی وجہ سے محل جر میں ہے، اس میں سات لغات ہیں۔ اسرائیل یہ قرآن کی لغت ہے اور اسرائیل مدہ مہوزہ مختلسہ کے ساتھ، یہ شنو ذ نے ورش سے حکایت کیا ہے۔ اسرائیل بغیر ہمزہ کے یاء کے مد کے ساتھ، یہ اعمش اور عیسیٰ بن عمر کی قراءت ہے۔ حسن اور زہری نے بغیر ہمزہ اور مد کے پڑھا ہے۔ اسرائیل بغیر یاء کے اور ہمزہ مکسورہ کے ساتھ، اسرائیل ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ..... تمیم کہتے ہیں: اسرائیل یعنی نون کے ساتھ۔ اسرائیل کا معنی ہے: عبد اللہ۔ حضرت ابن عباس نے کہا: عبرانی زبان میں اسرا سے مراد بندہ ہے اور ایل سے مراد اللہ ہے۔ بعض نے فرمایا: اسرا سے مراد اللہ کا چنا ہوا ہے اور ایل سے مراد اللہ ہے۔ بعض نے فرمایا: اسرا کا معنی سخت ہونا ہے گویا اسرائیل وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سخت بنایا اور اس کی تخلیق کو پختہ کیا۔ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ سہیلی نے کہا: اسرائیل اس لئے کہا گیا کہ انہیں ایک رات میں سیر کرائی گئی جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ پس ان کا نام اسرائیل رکھا گیا یعنی اس نے اللہ کی طرف سیر کی۔ پس اسم کا بعض عبرانی ہے اور بعض عرب کے موافق ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ، ذکر اسم مشترک ہے ذکر بالقلب (دل کا ذکر) یہ بھولنے کی ضد ہے۔ الذکر باللسان یہ خاموش رہنے کی ضد ہے۔ ذکر الشئ بلسان و قلبی ذکر ہے۔ میں نے زبان اور دل سے اس کا ذکر کیا۔ واجعله منك على ذکر (بضم ذال) یعنی اس کو مت بھول۔ کسائی نے کہا: جو ذکر دل سے ہو وہ ذال کے ضمہ کے ساتھ ہوتا ہے اور جو زبان کے ساتھ ہو وہ ذال مکسور کے ساتھ ہوتا ہے۔ بعض دوسرے علماء نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: ذکر اور ذکر ہم معنی ہیں اور الذکر (بفتح ذال) مؤنث کا متضاد..... الذکر کا معنی شرف بھی ہے۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: وَ اِنَّهُ لَذِيْ كُوْلُكَ وَلِقَوْمِكَ (زخرف: 44)

ابن انباری نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے کہ میری نعمت کے شکر کو یاد کرو۔ نعمت کے ذکر پر اکتفا کرتے ہوئے شکر کو حذف کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں ذکر بالقلب مراد ہے اور وہی مطلوب ہے، یعنی میری اس نعمت سے غافل نہ ہو جاؤ جو میں نے تم پر کی اور اسے بھول نہ جاؤ، یہ عمدہ قول ہے۔ النعمة یہاں اسم جنس ہے یہ مفرد ہے اور جمع کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تَعَدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصَوْهَا (ابراہیم: 34) یہاں بھی نعمة سے مراد نعمتیں ہیں۔ اللہ کی نعمتوں میں سے جو اس نے بنی اسرائیل پر فرمائیں یہ ہیں: فرعونوں سے نجات بخشی، ان سے انبیاء بنائے، ان پر کتب اور من و سلویٰ نازل فرمایا، پتھر سے پانی نکالا، انہیں تورات عطا فرمائی جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت، نعمت اور رسالت کا ذکر تھا، والدین

پر جو نعمتیں ہوں وہ اولاد پر بھی ہوتی ہے کیونکہ اولاد والدین کے شرف سے شرف ہوتی ہے۔

نوٹ: ارباب معافی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا نعمت کے ذکر کے ساتھ تعلق قائم فرمایا ہے، جبکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے نعمت کے ذکر کو ساقط کر دیا اور اپنے ذکر کی طرف انہیں بلایا ہے۔ فرمایا: **فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ** (البقرہ: 152) تاکہ دوسری امتوں کی نظر نعمت سے منعم کی طرف جائے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی نظر منعم سے نعمت کی طرف جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اَوْفُوا بعهْدِيْ اَوْفِ بعهْدِكُمْ** یہ امر اور جواب امر ہے۔ زہری نے تفسیر کے لئے اوف واد کے فتنے اور فاء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس عہد سے کون سا عہد مراد ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حسن نے کہا: اس عہد سے مراد یہ ہے: **خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ** (اعراف: 171)

اور ارشاد ہے: **وَلَقَدْ اخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ** **وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا** (المائدہ: 12) اور یقیناً لیا تھا اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے اور ہم نے مقرر کیے ان میں سے بارہ سردار۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ ہے **وَ اِذَا اخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ اُوْتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكُنُّوْهُ** (آل عمران: 187) الزجاج نے کہا: **اَوْفُوا بعهْدِيْ** جو میں نے تم سے تورات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا عہد لیا ہے **اَوْفِ بعهْدِكُمْ** جو میں نے تمہیں اس پر ضمانت دی ہے وہ میں پوری کروں گا۔ اگر تم اس عہد کو پورا کرو گے تو تمہارے لئے جنت ہوگی بعض نے فرمایا: **اَوْفُوا بعهْدِيْ** یعنی سنت اور اخلاص کے ساتھ فرائض کی ادائیگی میں اپنا عہد پورا کرو۔ **اَوْفِ بعهْدِكُمْ** میں تمہیں رعایات کی منازل تک پہنچاؤں گا۔ بعض نے فرمایا: **اَوْفُوا بعهْدِيْ** ظاہری آداب کی حفاظت میں میرا عہد پورا کرو۔ **اَوْفِ بعهْدِكُمْ** میں تمہارے باطن کی تزئین کا عہد پورا کروں گا۔ بعض نے فرمایا: یہ حکم تمام ادوام، نواہی اور وصایا کو شامل ہے اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی داخل ہے جو تورات وغیرہ میں ہے۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے اور یہی صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عہد یہ ہے کہ وہ انہیں جنت میں داخل کرے گا۔

میں کہتا ہوں: جو وفاء عہد ان سے طلب کیا گیا ہے وہ ہم سے بھی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اَوْفُوا بِالْعُقُوْدِ** (المائدہ: 1) **وَ اَوْفُوا بعهْدِ اللّٰهِ** (النحل: 91) کثرت سے اس قسم کے ارشاد ہمارے لئے بھی ذکر ہیں۔ ان کا اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرنا، ان کے لئے اللہ کی طرف سے وفا کی علامت ہے، اس کے لئے علت نہیں بلکہ یہ اس کی طرف سے ان پر فضل اور مہربانی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ**، **الرُّهْب**، **الرَّهْب** اور **الرَّهْبَةُ** ان سب کا معنی خوف ہے۔ یہ امر اپنے ضمن میں تہدید کا معنی رکھتا ہے نون کے بعد یا ساقط ہوگئی ہے کیونکہ یہ آیت کا سر ہے (1)۔ ابن ابی اسحاق نے فارہبون (یاء کے ساتھ) پڑھا ہے اسی طرح فاتقون اصل پر پڑھا ہے۔ ایٹای فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے۔ اسی طرح امر، نہی اور استفہام میں اختیار ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: **وَ اِيَّايَ ارْهَبُوا** فارہبون۔ اور کلام میں **وَ اِنَا فَارْهَبُونَ** بھی مبتدا اور خبر

کے اعتبار سے جائز ہے۔ فَاتَّهَبُونَ حذف کی تقدیر پر خبر ہوگی۔ معنی یہ ہوگا: وانا ربکم فارہبون۔

وَامِنُؤَابِهًا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا اَوَّلَ كَافِرِيْهِمْ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِيْ  
شَيْئًا قَلِيْلًا ۚ وَاِيَّايَ فَاتَّقَوْنَ ﴿٣١﴾

”اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو نازل کی ہے میں نے۔ یہ سچا ثابت کرنے والی ہے اس کو جو تمہارے پاس ہے اور نہ بن جاؤ تم سب سے پہلے انکار کرنے والے اس کے اور نہ خریدو تم میری آیتوں کے عوض تھوڑی سی قیمت اور صرف مجھی سے ڈرا کرو۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰمِنُؤَابِهًا اَنْزَلْتُ یعنی قرآن کی تصدیق کرو۔ مُصَدِّقًا یہ اَنْزَلْتُ کی ضمیر سے حال ہے (1)۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: بسا انزلتہ مصدقا۔ اس میں عامل انزلت ہے یہ بھی جائز ہے کہ ما۔ سے حال ہو اور اس میں عامل اٰمِنُؤَابِهًا ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: آمنا بالقرآن مصدقا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ما مصدر یہ ہو۔ تقدیر عبارت آمنا بانزال۔ لہما معکم، یعنی تورات میں سے جو تمہارے پاس ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكُونُوا اَوَّلَ كَافِرِيْهِمْ۔ یہ میں ضمیر کا مرجع نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت محمد ﷺ ہیں۔ یہ ابو العالیہ نے کہا ہے اور ابن جریج نے کہا: اس کا مرجع قرآن ہے کیونکہ بسا انزلت کا قول اسے اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مرجع تورات ہے کیونکہ لِّمَا مَعَكُمْ کا قول اسے اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے (2)۔

اگر کہا جائے کہ کافر کیسے فرمایا کافرین نہیں فرمایا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی تقدیر یہ ہے: وَلَا تَكُونُوا اَوَّلَ فِرَاقِيْ كَافِرِيْہِمْ (3)۔ انفس اور فراء نے کہا: یہ فعل کے معنی پر محمول ہے کیونکہ اس کا معنی ہے: اَوَّلُ مَنْ كَفَرَ بَّہ۔ سیبویہ نے حکایت کیا ہے: هُوَ اَظَرُّ الْفِتْيَانِ وَاجْمَلُهُ۔ ظاہر کلام هُوَ اَظَرُّ فَتًى وَاجْمَلُهُ تھا۔ فرمایا: اَوَّلُ كَافِرِيْہِمْ حالانکہ ان سے پہلے کفار قریش نے اس کا انکار کیا تھا۔ اس کا معنی ہے: اہل کتاب میں سے پہلے تم کفر کرنے والے نہ ہو جاؤ، کیونکہ ایسی مثال میں ان کی طرف نظر کی جاتی ہے کیونکہ وہ حجت تھے ان کے متعلق علم کا گمان کیا جاتا ہے۔ سیبویہ کے نزدیک اَوَّلُ کو نصب کان کی خبر کے اعتبار سے ہے۔ یہ ان کلمات سے ہے جن کا فعل نہیں بولا جاتا یہ افعل کے وزن پر ہے اس کا عین اور فاء کلمہ واو ہے، اس سے فعل نہیں بولا جاتا تا کہ دونوں جہتوں (عین اور فاء) سے تعلیل نہ ہو۔ یہ بصریوں کا مذہب ہے۔ کوفیوں نے کہا: یہ وال سے مشتق ہے جس کا معنی ہے نجات پانا۔ اصل میں او آل تھا۔ پھر ہمزہ میں تخفیف کی گئی اور واو سے بدل دیا گیا اور پھر ادغام کیا گیا۔ اور اَوَّلُ کہا گیا جس طرح خطیئة کے ہمزہ کی تخفیف کی جاتی ہے۔ جوہری نے کہا: اس کی جمع الاوائی والاوالی قلب کی صورت میں بھی آتی ہے۔ بعض نے کہا: اصل میں یہ دوئل فوعل کے وزن پر تھا پہلی واو ہمزہ سے بدل گئی اور اس کی جمع او اول نہیں بنائی جاتی کیونکہ دو واو کا جمع کرنا جن کے درمیان الف جمع ہو ثقیل ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ آل یذول سے افعل کے وزن پر ہے اس کی اصل اول تھا، اس میں قلب کیا گیا افعل، افعل سے مقلوب ہو کر آیا ہے، پھر تسہیل کی گئی بدل کر ادغام کیا گیا (4)۔



**مسئلہ:** اس آیت میں ان علماء کے لئے کوئی حجت نہیں ہے جو دلیل خطاب کے ساتھ قول کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ کوئی اور ان کے موافقت کرنے والے علماء ہیں کیونکہ کلام سے مقصود اول و آخر کفر سے نہیں ہے۔ اول کو ذکر کے ساتھ خاص کیا کیونکہ اس میں تقدم زیادہ شدید ہے۔ پس مذکور اور مسکوت عنہ کا حکم ایک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا۔ اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَلَا تَكُونُوا مِمَّنْ يَمُوتُونَ مَرْتَدًا وَعَلَىٰ قُلُوبِهِمْ حُمُومٌ۔ یہود کے علماء ایسا کرتے تھے اس لئے انہیں اس سے منع کیا گیا۔ یہ بعض مفسرین کا قول ہے ان میں سے حسن وغیرہ ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہودی علماء اپنے علم پر کھانا لیتے تھے جیسے وظیفہ اور تنخواہ ہوتی ہے۔ پس انہیں اس سے منع کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کے علماء لوگوں کو دین اجرت پر سکھاتے تھے اس سے انہیں منع کیا گیا، ان کی کتابوں میں ہے اے ابن آدم! علم سکھاؤ جس لرح تجھے مفت علم سکھایا گیا۔ یہ ابو العالیہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ تم میرے اوامر و نواہی اور آیات کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت نہ لو یعنی دنیا اور اس کی مدت۔ اور وہ زندگی جو تھوڑی ہو اس کا کوئی مرتبہ نہیں (1)۔ جو وہ عوض لیتے تھے اسے ثمن (قیمت) کیا گیا کیونکہ انہوں نے اس کو عوض بنایا تھا جو چیز عوض ہو اس پر ثمن کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے اگرچہ وہ حقیقت میں ثمن نہ بھی ہو۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ شاعر نے کہا:

ان كنت حاولت ذنبا او ظفرت به فبا اصبت بترك الحج من ثمن

”اگر تو گناہ کا ارادہ کرے یا گناہ کر لے تو حج کے ترک کے عوض تو نے کوئی ثمن نہیں پائی۔“

میں کہتا ہوں یہ آیت اگرچہ بنی اسرائیل کے ساتھ خاص ہے لیکن یہ اس کو بھی شامل ہے جو ان جیسا فعل کرے گا۔ پس جو حق میں تبدیلی یا اس کو باطل کرنے پر رشوت لے گا یا داجی تعلیم کے دینے سے انکار کرے گا یا جو اس نے سیکھا اس کی ادائیگی سے رکے گا حالانکہ اس کا سکھانا اس پر متعین ہے حتیٰ کہ وہ اس پر اجرت لے تو وہ اس آیت کے مقتضی میں داخل ہے۔ واللہ اعلم

ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ایسا علم سیکھا جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کی جاتی ہے وہ اسے نہیں سیکھتا مگر اس لئے کہ اس کے عوض دنیا کا مال حاصل کرے تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا (2)۔

**مسئلہ نمبر 2:** علماء کا اختلاف ہے کہ قرآن اور علم کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں۔ زہری اور اصحاب الرائے (احناف) نے اس سے منع کیا ہے۔ یہ کہتے ہیں: قرآن کی تعلیم پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ تعلیم قرآن ان واجبات میں سے ایک واجب ہے جن میں تقرب کی نیت اور اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس نماز، روزے کی طرح تعلیم قرآن پر بھی

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 135، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 159، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب العلم، باب فی طلب العلم لغير الله تعالیٰ، حدیث 3179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اجرت نہیں لی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَسْتَرْوُا بِأَلَيْتِي ثَمَنًا قَلِيلًا (اور نہ خرید و میری آیتوں کے عوض تھوڑی سی قیمت) حضرت ابن عباس نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: معلّموا صبیانکم شرارکم اقلہم رحمۃً بالیتیم و اغلظہم علی المسکین تمہارے بچوں کے اساتذہ تمہارے برے لوگ ہیں جو یتیم پر رحمت کم کرتے ہیں اور مسکین پر سختی زیادہ کرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ معلمین کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ان کا درہم حرام ہے، ان کا کپڑا سُحت (حرام) ہے اور ان کا کلام ریا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت نے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے اہل ذمہ میں سے بعض لوگوں کو قرآن اور کتابت سکھائی۔ ان میں ایک شخص نے مجھے ایک کمان دی۔ میں نے کہا: یہ مال نہیں ہے میں اس کے ساتھ اللہ کے راستہ میں جہاد کروں گا۔ میں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تجھے پسند ہے کہ تجھے اس کے بدلے آگ کا طوق پہنایا جائے تو پھر یہ قبول کر لے (1)۔ امام مالک، امام شافعی، احمد، ابو ثور اور اکثر علماء نے قرآن کی تعلیم پر اجرت کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ حضرت ابن عباس کی حدیث .... حدیث الرقیہ (دم والی حدیث) میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ان احق ما اخذتم علیہ اجرا کتاب اللہ (2)۔ جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں سے سب سے زیادہ حقدار کتاب اللہ ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے، یہ نص ہے اختلاف کو اٹھا دیتی ہے۔ پس اس پر ہی اکتفا کرنا چاہئے۔ رہا مخالف کا نماز اور روزے پر قیاس تو یہ فاسد ہے کیونکہ یہ قیاس نص کے مقابل ہے۔ پھر ان کے درمیان فرق بھی ہے وہ یہ کہ نماز اور روزہ فاعل کے ساتھ مختص عبادات ہیں اور تعلیم القرآن معلم کے علاوہ کے لئے متعدی عبادت ہے۔ پس اس کو نقل کرنے کے ارادہ پر اجرت جائز ہے جیسے قرآن کی کتابت کی تعلیم پر اجرت جائز ہے۔

ابن منذر نے کہا: امام ابو حنیفہ اجرت کے ساتھ قرآن کی تعلیم کو مکروہ قرار دیتے ہیں اور یہ جائز قرار دیتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کو اجرت پر لے کہ وہ اسے تختی یا شعر یا معلوم گانا معلوم اجرت پر لکھ دے گا۔ جو چیز معصیت ہے اس میں اجارہ کو جائز قرار دیتے ہیں اور جو چیز طاعت ہے اس میں اجارہ کو باطل قرار دیتے ہیں۔ آیت کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد بنو اسرائیل میں اور شرع من قبلنا ہل ہو شرع لنا (جو ہم سے پہلے لوگوں کی شریعت تھی کیا وہ ہمارے لئے شریعت ہے) کے اصول میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ بھی یہ نہیں کہتے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت کریمہ اس شخص کے متعلق ہے جس پر تعلیم دینا متعین ہو پھر وہ انکار کرے حتیٰ کہ اس پر اجرت لے لے۔ مگر جب متعین نہ ہو تو سنت کی دلیل کے ساتھ اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ کبھی اس شخص پر تعلیم دینا متعین ہوتا ہے لیکن اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو وہ اپنے اوپر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے تو اس پر تعلیم دینا واجب نہیں ہوتا

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 157، (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب التجارات، باب الاجر علی تعلیم القرآن، حدیث 2147، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 854، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الطب، باب الشہطی الرقیۃ بقطیہ من الفم، حدیث 5296، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس کے لئے اپنی صنعت اور اپنے ہنر پر مال قبول کرنا جائز ہے۔ امام وقت پر واجب ہے کہ دین کی اقامت کے لئے اس کی مدد کرے ورنہ مسلمانوں پر ضروری ہے کہ اس کی مدد کریں کیونکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلافت کے والی بنے اور خلافت کے لئے آپ کو متعین کیا گیا تو آپ کے پاس اتنا مال نہ تھا جو آپ کے گھر والوں کی کفایت کرتا۔ آپ نے کپڑے اٹھائے اور بازار کی طرف نکلے۔ آپ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: میں اپنے عیال پر کہاں سے خرچ کروں، تو صحابہ کرام نے آپ کو واپس لوٹا دیا اور آپ کے لئے بقدر کفایت وظیفہ مقرر کیا۔

رہیں وہ احادیث جو انہوں نے پیش کی ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو قابل حجت ہو۔ ان میں کوئی حدیث نقل کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس کی حدیث وہ سعید بن طریف نے حضرت عکرمہ سے اور حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے اور سعید موقوف راوی ہے اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث علی بن عاصم نے حماد بن سلمہ سے انہوں نے ابو جریہم سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے، ابو جریہم مجہول غیر معروف راوی ہے۔ حماد بن سلمہ نے کسی ایسے راوی سے روایت نہیں کیا جس کو ابو جریہم کہا جاتا ہو انہوں نے ابو الہزم سے روایت کیا ہے اور وہ بھی موقوف الحدیث ہے اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے۔ رہی حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث جو ابو داؤد نے مغیرہ بن زیاد موصلی سے انہوں نے عبادہ بن نسی سے انہوں نے اسود بن ثعلبہ سے انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے مغیرہ اہل علم کے نزدیک معروف ہے لیکن اس کی بہت سی مناکیر احادیث ہیں یہ ان میں سے ایک منکر حدیث ہے۔ یہ ابو عمر نے کہا ہے، پھر فرمایا: رہی قوس (کمان) والی حدیث یہ اہل علم کے نزدیک معروف ہے کیونکہ یہ حضرت عبادہ سے دوسندوں سے روایت کی گئی ہے اور حضرت ابی بن کعب سے موسیٰ بن علی عن ایبہ عن ابی کے سلسلہ سے مروی ہے لیکن وہ منقطع ہے۔ اس بارے میں کوئی ایسی حدیث نہیں ہے نقل کی جہت سے جس پر عمل واجب ہو اور حضرت عبادہ اور حضرت ابی کی حدیث تاویل کا احتمال رکھتی ہے کیونکہ یہ جائز ہے کہ پہلے انہوں نے رضائے الہی کے لئے تعلیم دی ہو پھر اس پر اجریا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: لوگوں میں سے بہتر اور جوزمین کی سطح پر چل رہے ہیں ان میں سے بہتر اساتذہ ہیں جب بھی دین بوسیدہ ہونے لگا تو انہوں نے اسے جلا بخشی تم انہیں اجرت پر نہ لو کہ تم انہیں تنگ کر دو کیونکہ معلم جب بچے کو کہتا ہے: پڑھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، بچہ کہتا ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تو اللہ تعالیٰ اس سے بچے کی برأت، معلم کی برأت اور اس کے والدین کی برأت لکھ دیتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اجرت پر نماز پڑھانے والے کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کے متعلق پوچھا گیا جسے نماز پڑھانے کے لئے رمضان میں اجرت پر لیا گیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں کہ اس میں کچھ حرج نہ ہوگی۔ فرضوں میں اس کے لئے سخت کراہت ہے۔

امام شافعی اور آپ کے اصحاب، ابو ثور نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں اور اس کے پیچھے نماز میں بھی کوئی حرج نہیں۔ امام اوزاعی نے فرمایا: اس کی نماز ہی نہیں ہے اور امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب نے اس کو ناپسند کیا ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا



ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ مسئلہ سابقہ مسئلہ سے معلق ہے اور ان دونوں کی اصل ایک ہے۔

میں کہتا ہوں: سورہ برأت میں اس کی ایک اور اصل آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ابن قاسم نے شعر اور نحو کی تعلیم پر اجرت لی۔ ابن حبیب نے کہا: شعر، رسائل، تاریخ عرب کی تعلیم پر اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں اور وہ اشعار جن میں شراب، غنا، ہجو کا کا ذکر ہو وہ مکروہ ہیں۔ ابوالحسن نخعی نے کہا: اس قول پر کتب پر اجرت لینا اور کتب کو بیچنے کا جواز لازم آتا ہے، لیکن غنا اور نوحہ ہر حال میں ممنوع ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ ہمیں یعقوب بن ابراہیم نے بتایا، انہوں نے فرمایا: ہمیں محمد بن عمر بن کیت نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں علی بن وہب الہمدانی نے بتایا، انہوں نے فرمایا: ہمیں ضحاک بن موسیٰ نے بتایا، انہوں نے فرمایا: سلیمان بن عبد الملک مدینہ طیبہ سے گزرا وہ مکہ مکرمہ جا رہا تھا۔ وہ مدینہ طیبہ میں کچھ دن ٹھہرا۔ اس سے پوچھا گیا: مدینہ طیبہ میں کوئی ایسا شخص ہے جس نے نبی کریم ﷺ کے کسی صحابی سے ملاقات کی ہو؟ لوگوں نے کہا: ابو حازم ہے۔ سلیمان نے ابو حازم کو بلایا۔ جب وہ اس کے پاس آیا تو اس نے پوچھا: اے ابو حازم! یہ جفا کیا ہے؟ ابو حازم نے کہا: اے امیر المؤمنین! تو نے کون سی جفا مجھ سے دیکھی ہے؟ سلیمان نے کہا: تمام اہل مدینہ میرے پاس آئے اور تو میرے پاس نہ آیا۔ ابو حازم نے کہا: اے امیر المؤمنین! میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تو وہ کہے جو ہوا نہیں ہے، میں نے اس دن سے پہلے نہ تجھے پہچانا ہے اور نہ میں نے تجھے دیکھا ہے۔ سلیمان، محمد بن شہاب زہری کی طرف متوجہ ہوا تو زہری نے کہا: شیخ نے صحیح کہا ہے اور تو نے غلطی کی ہے۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! کیا وجہ ہے کہ ہم موت کو ناپسند کرتے ہیں؟ ابو حازم نے کہا: کیونکہ تم نے اپنی آخرت کو خراب کر دیا ہے اور دنیا کو آباد کیا ہے۔ پس تم آبادی سے خرابی کی طرف منتقل ہونے کو ناپسند کرتے ہو۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! تو نے صحیح کہا، کل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کیسے آئیں گے؟ ابو حازم نے کہا: جو نیکو کار ہے وہ اس غائب شخص کی طرح آئے گا جو اپنے گھر والوں کے پاس آیا ہے اور جو بدکار ہے وہ بھاگے ہوئے غلام کی طرح آئے گا جو اپنے آقا کے پاس آتا ہے۔ سلیمان رونے لگا اور کہا: کاش! میرا شعور کام کرتا۔ ہمارے لئے اللہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے کیا ہے؟ ابو حازم نے کہا: اپنے اعمال کو کتاب اللہ پر پیش کرو۔ سلیمان نے پوچھا: میں کون سا مکان پاؤں گا؟ ابو حازم نے کہا: إِنَّ الْأَهْرَاءَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿١﴾ وَإِنَّ الْفَجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ﴿٢﴾ (انفطار) (بے شک نیک لوگ عیش و آرام میں ہوں گے اور یقیناً بدکار جہنم میں ہوں گے) سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! اللہ تعالیٰ کی رحمت کہاں ہے؟ ابو حازم نے کہا: رَاحَتُ اللَّهِ قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٣﴾ (اعراف) (اللہ کی رحمت قریب ہے محسنین کے)۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! اللہ کے کون سے بندے معزز ہیں؟ ابو حازم نے کہا: صاحب مروت اور صاحب عقل۔ سلیمان نے کہا: کون سے اعمال افضل ہیں؟ ابو حازم نے کہا: محارم سے اجتناب کے ساتھ فرائض کا ادا کرنا۔ سلیمان نے کہا: کون سی دعا زیادہ سنی جاتی ہے؟ ابو حازم نے کہا: جو شخص اپنے محسن کے لئے کرتا ہے۔ سلیمان نے پوچھا: کون سا صدقہ افضل ہے؟ ابو حازم نے کہا: مسکین سائل کے لئے اور کم مال والے محنتی کے لئے جس میں احسان اور اذیت نہ ہو۔ سلیمان نے کہا: کون سا قول زیادہ بہتر ہے؟ ابو حازم نے

کہا: اس کے سامنے حق کا کلمہ کہنا جس سے تو ڈرتا ہے یا جس سے تو امید رکھتا ہے۔ سلیمان نے پوچھا: کون سا مومن عقلمند ہے؟ ابو حازم نے کہا: وہ جو اللہ کی طاعت کا عمل کرے اور طاعت پر لوگوں کی رہنمائی کرے۔ کون سا مومن احمق ہے؟ ابو حازم نے کہا: وہ جو اپنے بھائی کی خواہش میں گر گیا حالانکہ وہ ظالم تھا، اس نے اپنی آخرت کو غیر کی دنیا کے بدلے بیچ ڈالا۔ سلیمان نے اس سے کہا: تو نے صحیح کہا۔ ہم جس حالت میں ہیں اس کے متعلق تو کیا کہتا ہے؟ ابو حازم نے کہا: اے امیر المومنین! کیا تو مجھے معاف کر دے گا؟ سلیمان نے کہا: نہیں لیکن یہ تو نصیحت ہے جو تو مجھے پہنچائے گا۔ ابو حازم نے کہا: اے امیر المومنین! تیرے آباء نے تلوار کے ساتھ لوگوں پر جبر کیا اور مسلمانوں کی رضا اور مشورہ کے بغیر یہ ملک انہوں نے سختی سے حاصل کیا حتیٰ کہ انہوں نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا وہ دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ کاش! تجھے شعور ہوتا جو انہوں نے کہا اور جو ان کے بارے میں کہا گیا۔ بادشاہ سلیمان کے ایک حواری نے کہا: اے ابو حازم! تو نے بہت بری بات کی۔ ابو حازم نے کہا: تو نے جھوٹ بولا اللہ تعالیٰ نے علماء سے عہد لیا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے حقائق بیان کریں گے اور اسے چھپائیں گے نہیں۔ سلیمان نے کہا: ہم کیسے اصلاح کریں؟ ابو حازم نے کہا: ڈینگیں مارنا چھوڑو، مروت کو پکڑو اور برابر تقسیم کرو۔ سلیمان نے پوچھا: ہم نکس کیسے لیں؟ ابو حازم نے کہا: جس سے لینا جائز ہے اس سے وصول کرو اور جو حقدار ہے اسے پہنچاؤ۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! کیا تیرے لئے ممکن ہے کہ تو ہمارے ساتھ رہے تو ہم سے فائدہ اٹھائے، ہم تجھ سے فائدہ اٹھائیں؟ ابو حازم نے کہا: اعوذ باللہ (میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں) سلیمان نے پوچھا: ایسا کیوں؟ ابو حازم نے کہا: مجھے اندیشہ ہے کہ میں تمہاری طرف کسی تھوڑی سی چیز کو جھکا دوں اور اللہ تعالیٰ مجھے دنیا و آخرت کا دو ہر عذاب دے۔ سلیمان نے کہا: اپنی ضروریات ہمیں پیش کرو۔ ابو حازم نے کہا: تو مجھے آگ سے بچالے اور مجھے جنت میں داخل کر دے۔ سلیمان نے کہا: یہ تو میری قدرت میں نہیں۔ ابو حازم نے اسے کہا: مجھے تجھ سے اور تو کوئی حاجت نہیں۔ سلیمان نے کہا: تم میرے لئے دعا کرو۔ ابو حازم نے کہا: اے اللہ! اگر سلیمان تیرا ولی ہے تو اس کے لئے دنیا و آخرت کی خیر آسان فرما دے، اگر تیرا دشمن ہے تو اس کی پیشانی کو پکڑ لے جب تک تو پسند کرے۔ سلیمان نے کہا: یہ کافی ہے۔ ابو حازم نے کہا: میں نے مختصر دعا مانگی ہے اور اگر تو اس دعا کا اہل ہے تو میں نے زیادہ مانگ لیا ہے اور اگر تو اس کا اہل نہیں ہے تو مناسب نہیں کہ میں ایسی کمان سے مارا جاؤں جس کا وتر نہ ہو۔ سلیمان نے کہا: مجھے کوئی وصیت کیجئے۔ میں تجھے مختصری وصیت کروں گا، تو اپنے رب کی عظمت بیان کر اور اسے دور رکھ کہ تجھے ایسی جگہ دیکھے جہاں سے اس نے تجھے منع کیا ہے یا تجھے مفقود پائے جہاں اس نے تجھے حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ جب ابو حازم باہر نکل گیا تو سلیمان نے اس کی طرف سودینار بھیجے اور اسے لکھا کہ تو انہیں خرچ کر اور تیرے لئے میرے پاس اس کی مثل بہت سے دینار ہیں۔ راوی فرماتے ہیں: ابو حازم نے وہ دینار واپس کر دیے اور اسے خط لکھا: اے امیر المومنین! میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا مجھ سے سوال کرنا مذاق ہو یا میں تیری عطا کی امید رکھوں، میں ان رقوم کو تیرے لئے پسند نہیں کرتا تو میں اپنے لئے کیسے پسند کروں گا۔

حضرت موسیٰ بن عمران جب مدین کے پانی پر وارد ہوئے تو اس پانی پر چرواہوں کو اپنے جانوروں کو پانی پلاتے ہوئے پایا

اور ان کے تھوڑا دور دوڑ کیوں کو پایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے وہاں کھڑے ہونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا: ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلاتیں یہاں تک کہ چراہے واپس چلے جائیں۔ ہمارا باپ بوڑھا آدمی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی بکریوں کو پانی پلایا پھر سائے کی طرف لوٹ گئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اے میرے رب! میں محتاج ہوں اس کا جو تو میری طرف خیر میں سے اتارے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ بھوکے بھی تھے اور خوفزدہ بھی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا لوگوں سے سوال نہ کیا اور نہ آپ نے چراہوں کو اپنا مسافر ہونا بتایا۔ وہ بچیاں آپ کی کیفیت پہچان گئی تھیں۔ جب وہ دونوں لڑکیاں اپنے باپ کے پاس آئیں تو سارا واقعہ انہیں عرض کیا اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی تھی وہ بھی بتائی۔ ان بچیوں کے والد، جو حضرت شعیب علیہ السلام تھے انہوں نے کہا: وہ شخص بھوکا تھا۔ حضرت شعیب نے ایک بچی سے کہا: تو جا اور اس شخص کو بلا کر لے آ۔ جب وہ بچی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی تو اس نے ان کی عظمت کو دیکھا اور اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور کہا: میرے والد صاحب تمہیں بلا رہے ہیں تاکہ آپ کو ہمارے لئے پانی پلانے کا اجر عطا فرمائیں۔ جب اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی پلانے کے اجر کا ذکر کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بہت شاق گزرا، آپ نے اس بچی کے ساتھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ پایا کیونکہ آپ پہاڑوں کے درمیان بھوکے اور خوفزدہ تھے۔ جب آپ اس کے پیچھے چلے تو ہوا چل پڑی، اس کے کپڑے اس کی پیٹھ کے ساتھ چپک گئے اور اس کا پچھلا حصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ظاہر ہونے لگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کبھی نظر اوپر اٹھاتے کبھی جھکا دیتے جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو آواز دی: اے اللہ کی بندی! میرے پیچھے ہو جا اور اپنی زبان سے میری رہنمائی کر۔ جب حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچے تو وہ کھانا کھانے کے لئے تیار تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے نوجوان! بیٹھ اور کھانا کھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے پوچھا: کیوں کیا تو بھوکا نہیں ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیوں نہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ میرے پانی پلانے کا عوض نہ ہو جائے۔ میں اہل بیت سے ہوں ہم اپنے دین کو زمین بھر سونے کے عوض نہیں بیچتے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں کہا: اے نوجوان! ایسا نہیں لیکن یہ میری اور میرے آباء کی عادت ہے ہم مہمان نوازی کرتے ہیں اور کھانا کھلاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیٹھ گئے اور کھانا کھایا۔

ابو حازم نے کہا: یہ سودینا میری گفتگو کا عوض ہیں تو مردار، خون اور خنزیر کا گوشت حالت اضطرار میں حلال ہوتا ہے، اور اگر یہ بیت المال میں حق کی وجہ سے ہے تو اس میں میرے جیسے اور لوگ بھی ہیں۔ اگر تو نے ہمارے درمیان برابری کی ہے تو نبھاؤ نہ مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں ہے (۱)۔

میں کہتا ہوں: اس طرح کتاب اور انبیاء کرام کی اقتدا ہوتی ہے۔ اس امام فاضل عالم کو دیکھو کیسے اس نے اپنے عمل پر عوض نہیں لیا اور نہ ہی اپنی وصیت کا بدل لیا اور نہ اپنی نصیحت پر بخشش لی بلکہ انہوں نے حق کو بیان کیا اور ڈنکے کی چوٹ پر



بیان کیا۔ اس بارے میں اسے کوئی گھبراہٹ اور پریشانی لاحق نہ ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہیں کسی کی ہیبت حق کہنے یا حق کو قائم کرنے سے نہ روکے جہاں بھی ہو (1)۔ قرآن حکیم میں ہے: **يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ** (المائدہ: 54) (جہاد کریں گے اللہ کی راہ میں اور نہ ڈریں گے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِيَّايَ فَاتَّقُوا** تقویٰ کا معنی پہلے گزر چکا ہے، فاتقونی یا کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، سہل بن عبد اللہ نے کہا: **وَإِيَّايَ فَاتَّقُوا** تمہارے بارے میں مجھے ازلی علم ہے اس لئے مجھ سے ڈرو۔ **وَإِيَّايَ فَاتَّقُوا** (۱) یہ استدراج اور تدبیر کے مقام پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ** (اعراف) (ہم انہیں بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَلَا يَأْمُرُكُمْ اللَّهُ إِلَّا إِلَىٰ الصَّوَابِ** (الاعراف) (پس نہیں بے خوف ہوتے اللہ کی خفیہ تدبیر سے سوائے اس قوم کے جو نقصان اٹھانے والی ہوتی ہے) کسی نبی اور صدیق کا استثناء نہیں فرمایا۔

**وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ** (۱)

”اور مت ملایا کرو حق کو باطل کے ساتھ اور مت چھپاؤ حق کو حالانکہ تم (اسے) جانتے ہو۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ**، اللبس کا معنی خلط ملط ہونا ہے۔ لبست علیہ الامر والبسہ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو اس کی دلیل کو اس کی مشکل کے ساتھ ملا دے اور اس کے حق کو اس کے باطل کے ساتھ ملا دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَلْبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبِسُونَ** (الانعام)

ولی الامر لبسہ، یعنی امر واضح نہیں ہے۔ اسی مفہوم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا قول ہے جو آپ نے حارث بن حوط کو کہا تھا: یا حارث انہ ملبوس علیک ان الحق لا یعرف بالرجال اعرف الحق تعرف اہلہ۔ اے حارث! معاملہ تجھ پر خلط ملط ہو گیا ہے حق مردوں کے ساتھ نہیں پہچانا جاتا میں حق کو پہچانتا ہوں تو حق والوں کو پہچانتا ہے۔ خساء نے کہا تھا:

تري الجليس يقول الحق تحسبه

صدق مقالته واخذر عداوته

رُشداً و هيئات فانظر ما به التباسا

والبس عليه اموراً مثل مالبسا

تو دوست کو دیکھتا ہے کہ وہ حق کہہ رہا ہے تو اسے ہدایت گمان کرتا ہے دیکھ اس کے ساتھ جو کچھ اس نے ملا دیا۔ اس کی

بات کی تصدیق کر اور اس کی عداوت سے محتاط ہو جا اور تو بھی اس پر امور کو ملتبس کر دے جس طرح اس نے التباس کیا۔

عجاج نے کہا

لما لبس الحق بالتجني

غنين واستبدلن زيدا مني

سعید نے قتادہ سے روایت کیا ہے: **وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ**۔ یعنی یہودیت اور نصرانیت کو اسلام کے ساتھ ملتبس نہ

1۔ کنز العمال، حدیث 5567۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الامر بالمعروف والنهي عن المنكر، حدیث نمبر 3996، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرو تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کا دین وہ ہے جس کے علاوہ اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا اور اس کے بغیر جزا نہیں دیتا وہ دین اسلام ہے، یہودیت و نصرانیت بدعت ہے وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ عثرہ کے قول سے یہ معنی ظاہر ہے:

وکتیبة لبستھا بکتیبة

کتنے لشکر ہیں جن کو میں نے دوسرے لشکروں کے ساتھ ملا دیا۔

یہ اسی مفہوم میں ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ لباس سے ہو۔ آیت کے معنی میں یہ کہا گیا ہے کہ تم نہ ڈھانپو۔ اسی سے لبس الثوب ہے، کپڑے کا پہننا۔ کہا جاتا ہے: لَبِسْتُ الثَّوْبَ الْبُسَّہ۔ لباس الرجل زوجته، مرد کا لباس اس کی بیوی ہے اور زوجہا لباسا۔ اور مرد اپنی بیوی کا لباس ہے۔ جعدی نے کہا:

اذا ما الضجیع ثنی جیدھا تشتت علیہ فکانت لباسا

جب سونے والے نے اپنی بیوی کی گردن کو دوہرا کیا تو وہ اس پر لپٹی اور وہ اس کا لباس تھی۔

اخطل نے کہا:

وقد لسبت لهذا الامر اعصره حق تجلل راسی الشیب فاشتعل

اس امر کی وجہ سے میں نے اس کا زمانہ ڈھانپ لیا حتیٰ کہ میرے سر میں بڑھا پا ظاہر ہو گیا۔

اللبوس، کپڑے اور زرہ میں سے جو پہنا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُؤْسٍ لِّكُمُ (الانبیاء: 80)

ولا لبست فلاناً حتی عرف باطنه۔ میں فلاں سے چمٹا رہا حتیٰ کہ میں نے اس کا باطن پہچان لیا۔

وفی فلان ملبس۔ فلاں لطف اندوز ہونے کی جگہ ہے۔ شاعر نے کہا:

ألا إن بعد العدم للسوء قنوة و بعد المشیب طول عمر و ملبسا

خبردار! آدمی کے لئے فقدان کے بعد لباس ہوتا ہے اور بڑھاپے کے بعد لمبی عمر اور لباس ہوتا ہے۔

لبس الكعبة والهودج۔ کعبہ اور ہودج کا کپڑا۔ لباس

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْبَاطِلِ بَاطِلٌ كَلَامُ عَرَبٍ مِّمَّنْ حَقَّ خِلَافُ كَوَافِرِهِمْ اس کا معنی زائل کرنا ہے۔ لبید نے کہا:

الا کل شیء ما خلا الله باطل خبردار! ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سوا زوال پذیر ہے۔

بطل الشيء یبطل بطلا و بطولا و بطلانا۔ چیز ضائع ہو گئی، خسارے میں چلی گئی۔ ابطلہ غیرہ، دوسری چیز نے اسے

زائل کر دیا۔ کہا جاتا ہے: ذهب دمه بطلا یعنی اس کا خون رائیگاں گیا..... الباطل شیطان کو کہتے ہیں۔ البطل بہادر آدمی۔

اس کو البطل اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دوسرے کی شجاعت کو زائل کر دیتا ہے۔ نابغہ نے کہا:

لهم لواء بایدی ماجد بطل لا یقطع الخرق الا طرفه سامی

ان کا جھنڈا بہادر آدمی کے ہاتھوں میں ہے، وہ پھٹا نہیں ہے مگر اس کی بلند طرف۔

المرأة بطلہ۔ عورت بہادر ہے۔ قد بطل الرجل (طا کے ضمہ کے ساتھ) بطل بطولة و بطالة۔ یعنی وہ شخص بہادر ہو

گیا۔ بَطْل (بفتح طاء) بطلان یعنی معطل ہو گیا فهو بطلان۔

اہل تاویل کا الْحَقُّ بِالْبَاطِلِ کے مراد میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے جو تمہارے پاس کتاب میں حق ہے اسے باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔ یعنی اس سے مراد تغیر و تبدل کرنا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: یہود نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا ہے لیکن ہماری طرف نہیں ان کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اقرار کرنا اور ان کی طرف بعثت کا انکار کرنا باطل ہے۔ ابن زید نے فرمایا: الْحَقُّ سے مراد تورات ہے اور باطل سے مراد وہ ہے جو انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو بدلا۔ مجاہد نے کہا: یہودیت اور نصرانیت کو اسلام کے ساتھ نہ ملاؤ (1)۔ یہ قتادہ نے کہا ہے۔ یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس کا قول زیادہ درست ہے، کیونکہ وہ عام ہے اس میں تمام اقوال جمع ہیں۔ واللہ المستعان اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَكْفُرُوا بِالْحَقِّ یہ جائز ہے کہ یہ تَلْسُوا پر معطوف ہو اور یہ مجزوم ہو، اور اس کا اُن کے اضمار کے ساتھ منصوب ہونا بھی جائز ہے۔ تقدیر یوں ہوگی: لَا يَكُنْ مِنْكُمْ لِنَبِّئِ الْحَقِّ وَكِتْمَانُهُ یعنی اگر تم حق کو چھپاتے ہو تو تمہاری طرف سے حق کا التباس اور چھپانا نہیں ہونا چاہئے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کو چھپانا ہے حالانکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے تھے۔ محمد بن سیرین نے کہا حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے ایک جماعت یثرب میں آکر اتری جب بنی اسرائیل کو دشمن کے غلبہ اور ذلت کا سامنا ہوا تھا۔ یہی گروہ اس وقت تورات کا حامل تھا وہ یثرب میں ٹھہر گئے اور وہ امید رکھتے تھے کہ ان کے درمیان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوں گے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کرنے والے تھے، جب وہ بزرگ چلے گئے جو مومنین میں سے تھے پھر ان کی نسل سے لوگ آئے انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور انہوں نے آپ کا انکار کیا حالانکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ (البقرہ: 89) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ یہ جملہ حال ہے یعنی تم جانتے ہو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حق ہیں اور ان کا کفر عناد کی وجہ سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے علم کی گواہی نہیں دی بلکہ انہیں اس سے منع فرمایا کہ جو وہ جانتے ہیں اسے نہ چھپائیں۔ یہ دلیل ہے کہ اسے سخت گناہ ہوتا ہے جو جانتے ہوئے گناہ کرتا ہے وہ جاہل سے زیادہ نافرمان ہوتا ہے۔ مزید بیان اَتَا مُرُونَ النَّاسَ بِالْبُزْرِ (البقرہ: 44) کے تحت آئے گا۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ③

”اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور رکوع کرو، رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔“

اس میں چوتیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ امر ہے اور وجوب کے لئے ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اقامۃ الصلوٰۃ اور اس کے اشتقاق اور اس کے تفصیلی احکام پہلے گزر چکے ہیں۔ واللہ۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَآتُوا الزَّكَاةَ یہ امر بھی وجوب کے لئے ہے۔ الايتاء کا مطلب عطا کرنا ہے



آتیتہ، کا معنی آعطیتہ میں نے اسے عطا کیا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَیْسَ اِثْنًا مِّنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ (توبہ: 75) (اگر اس نے دیا ہمیں اپنے فضل سے تو ہم دل کھول کر خیرات دیں گے)۔

آتیتہ۔ قصر کے ساتھ بغیر مد کے ہے اس کا معنی ہے میں اس کے پاس آیا۔ جب اتنی استقبال کے معنی میں ہو تو مد کیساتھ ہوتا ہے۔ اسی سے حدیث پاک ہے: لَاتِیَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَلَاحِبْرَةٍ مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا اور آپ کو یہ بتاؤں گا (1)۔ تفصیل سے یہ حدیث آگے آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 3:** زکاۃ یہ زکا الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے چیز میں اضافہ ہوا۔ کہا جاتا ہے۔ زکا الزرع، والبال یزکو جب کھیتی زیادہ ہو اور مال بڑھ جائے۔ رجل زکی زیادہ خیر والے شخص کا مال نکالنے کو زکوۃ کہا جاتا ہے ظاہر مال میں کمی ہوتی ہے لیکن برکت کے ساتھ یا اجر کے ساتھ مال بڑھاتا ہے جس اجر کے ذریعے زکوۃ دینے والے کو ثواب دیا جاتا ہے (2)۔ کہا جاتا ہے: زکاء زکات بین الزکاء۔

زکات الناقة بولدھا تزکابہ۔ جب اونٹنی اپنا بچہ اپنی ٹانگوں کے درمیان پھینک دے۔ زکا الفرد جب طاق، جفت بن جائے۔ شاعر نے کہا:

كانوا حسنا او زكا من دون اربعة لم يخلقوا و جدود الناس تعتدج

وہ طاق تھے یا جفت تھے چار سے کم تھے، انہوں نے پیدا نہیں کیا اور لوگوں کے بخت بلند تھے۔

جدو جمع ہے جد کی اس کا معنی حصہ اور بخت ہے تعتدج کا معنی بلند ہونا ہے۔

اعتدجت الارض جب زمین کی کھیتی بڑی ہو جائے۔ فحسنا سے مراد طاق اور زکا سے مراد جفت ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: زکاۃ کا معنی اچھی تعریف ہے۔ اسی سے ہے: زکی القاضی الشاہد قاضی نے گواہ کی تعریف کی۔ پس جو زکاۃ نکالتا ہے اسے اچھی تعریف حاصل ہوتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: زکاۃ تطہیر کے معنی میں ہے۔ کہا جاتا ہے زکا فلان یعنی فلاں غافل کرنے اور تنقید کی میل سے پاک ہوا۔ پس گویا مال کی زکاۃ نکالنے والا اپنے آپ کو اس حق کے بوجھ سے پاک کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس مال میں مساکین کے لئے رکھا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے زکاۃ کے مال کو لوگوں کا میل کہا ہے (3)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خُلِّ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةٌ تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (توبہ: 103) (اے حبیب وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ تاکہ آپ پاک کریں انہیں اور بابرکت فرمائیں انہیں اس ذریعے سے)۔

**مسئلہ نمبر 4:** یہاں زکاۃ کی مراد میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد فرض زکاۃ ہے کیونکہ یہ نماز سے متصل ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد صدقہ فطر ہے، یہ امام مالک کا قول ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب القراۃ فی العشاء، صفحہ 187، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، باب من شک امامہ، حدیث نمبر 664، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 136، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)



**مسئلہ نمبر 6:** خصوصی طور پر رکوع کے ذکر کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک قوم نے فرمایا: رکوع کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ نماز کے ارکان میں سے ہے، اس سے مراد پوری نماز ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صرف رکوع کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ شرع نے قراءت سے نماز کو تعبیر فرمایا ہے۔ اسی طرح سجدہ سے ایک رکعت مراد لی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: **وَقُرْآنَ الْفَجْرِ** (اسراء: 78) یعنی فجر کی نماز۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **مَنْ أَدْرَكَ سَجْدَةً مِنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ**۔ (1) یعنی جس نے نماز کی ایک رکعت کو پالیا اس نے نماز کو پالیا، اہل حجاز رکعت پر سجدہ کا اطلاق کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: رکوع کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا کیونکہ بنی اسرائیل کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ بعض علماء نے فرمایا کیونکہ لوگوں پر زمانہ جاہلیت میں رکوع زیادہ بھاری تھاتی کہ بعض لوگ جنہوں نے اسلام قبول کیا..... میرا خیال ہے وہ عمران بن حصین تھا..... انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی: میں جھکوں گا نہیں مگر کھڑا ہو کر، یعنی میں رکوع نہیں کروں گا جب اسلام ان کے دل میں راسخ ہو گیا اور ان کا نفس اس سے مطمئن ہو گیا تو انہوں نے رکوع کے حکم کی پیروی کی۔

**مسئلہ نمبر 7:** رکوع شرعی یہ ہے کہ آدمی اپنی پیٹھ کو ٹیڑھا کرے اور اپنی پیٹھ اور گردن کو لمبا کرے اور اپنی ہاتھ کی انگلیوں کو کھولے اور ان سے اپنے گھٹنوں کو پکڑے پھر اطمینان سے رکوع کرے اور سبحان ربی العظیم تین مرتبہ کہے اور یہ کم از کم مقدار ہے۔ امام مسلم نے حضرت عائشہ بنتیہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ تکبیر کے ساتھ نماز شروع فرماتے تھے۔ قراءت **الْحَمْدُ** سے شروع کرتے تھے اور جب رکوع کرتے تھے تو سر کو نہ زیادہ اونچا رکھتے تھے اور نہ زیادہ جھکاتے تھے بلکہ درمیان میں رکھتے تھے (2)۔ بخاری نے حضرت ابو حمید ساعدی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جب آپ تکبیر کہتے تو اپنے ہاتھوں کو کندھوں کے برابر کرتے اور جب رکوع کرتے تو اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھتے اور اپنی پیٹھ کو ٹیڑھا کرتے (3)۔

**مسئلہ نمبر 8:** رکوع فرض ہے۔ یہ قرآن و سنت سے ثابت ہے اسی طرح سجدہ بھی فرض ہے کیونکہ سورۃ حج کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **أَنَّا كَعُودًا وَاسْجُدُوا** (الحج: 77) سنت نے اس میں طمانیت اور ان کے درمیان فاصلہ کا اضافہ کیا اس کے متعلق کلام پہلے گزر چکی ہے اور رکوع کا طریقہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اور رہا سجدہ تو وہ بھی حضرت ابو حمید ساعدی کی حدیث میں وضاحت کے ساتھ آچکا ہے، نبی کریم ﷺ جب سجدہ کرتے تھے تو اپنی پیشانی اور ناک کو زمین پر نکالتے تھے اپنے ہاتھوں کو اپنے پہلوؤں سے جدا رکھتے تھے اور اپنی ہتھیلیوں کو کندھوں کے برابر رکھتے تھے (4)۔ اسی حدیث کو امام ترمذی نے نقل فرمایا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سجدہ میں اعتدال کرو اور تم میں سے کوئی

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب من أدرك ركعة من الصلوٰۃ فقد أدرك تلك الصلوٰۃ، صفحہ 221، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یجب من صفة الصلوٰۃ وما یفتح به الخ، صفحہ 194، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 114، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)۔ ایضاً، کتاب صفة الصلوٰۃ، باب سنة الجلوس فی التشہد، حدیث 785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی السجود علی الجبهة والانف، صفحہ 36، جلد 1 (وزارت تعلیم)



اپنے بازو کتے کی طرح نہ پھیلائے (1)۔ حضرت براء سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تو سجدہ کرے تو اپنی ہتھیلیوں کو رکھ اور اپنی کہنیوں کو بلند کر (2)۔ حضرت میمونہ بنتی جحش سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تھے تو ہاتھوں کو پھیلاتے تھے حتیٰ کہ آپ ﷺ کے پیچھے سے آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی تھی اور جب بیٹھتے تھے تو اپنی بائیں ران پر بیٹھتے تھے (3)۔

**مسئلہ نمبر 9:** اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جس نے سجدہ میں اپنی پیشانی کو رکھا اور ناک کو نہ رکھا یا ناک کو رکھا اور پیشانی کو نہ رکھا، امام مالک نے فرمایا: وہ اپنی پیشانی اور ناک پر سجدہ کرے۔ ثوری اور احمد کا یہی قول ہے۔ نخعی کا بھی یہی قول ہے۔

امام احمد نے فرمایا: صرف پیشانی یا صرف ناک پر سجدہ جائز نہیں۔ یہی قول ابوخیثمہ اور ابن ابی شیبہ کا ہے۔ اسحاق نے کہا: اگر ایک چیز پر سجدہ کیا تو ایسا کرنے والے کی نماز فاسد ہے۔ امام اوزاعی، سعید بن عبد العزیز نے یہی فرمایا۔ حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، عکرمہ، عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ تمام نے ناک پر سجدہ کا حکم دیا ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: پیشانی پر سجدہ کافی ہے جبکہ ناک نہ بھی لگے۔ یہ قول حضرات عطاء، طاؤس، عکرمہ، ابن سیرین اور حسن بصری کا ہے۔ یہی قول شافعی، ابو ثور، یعقوب اور محمد کا ہے۔ ابن منذر نے کہا: ایک کہنے والے نے کہا: اگر پیشانی کو رکھا اور ناک کو نہ رکھا یا ناک کو رکھا اور پیشانی کو نہ رکھا تو اس نے برا کیا۔ اس کی نماز مکمل ہے۔ یہ نعمان کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: میں نہیں جانتا جس نے پہلے اس قسم کا قول کیا اور نہ بعد والے کسی کو جانتا ہوں جس نے ایسا قول کیا ہو۔

میں کہتا ہوں: سجدہ میں صحیح پیشانی اور ناک کا رکھنا ہے۔ اس کی دلیل ابو حمید کی حدیث ہے جو گزر چکی ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سات اعضاء پر سجدہ کروں۔ پیشانی پر... اپنے ہاتھ سے ناک کی طرف اشارہ کیا... دونوں ہاتھوں پر، دونوں گھٹنوں پر اور دونوں پیروں کی اطراف پر۔ ہم کپڑے اور بال جمع نہیں کرتے (4)۔ یہ تمام نماز کے اجمال کی تفصیل ہے۔ پس یہ قول متعین ہو گیا۔ واللہ اعلم امام مالک سے روایت کیا گیا ہے کہ وہ ناک لگائے بغیر صرف پیشانی پر سجدہ کو جائز قرار دیتے تھے جیسا کہ عطاء اور شافعی کا قول ہے۔ ہمارے نزدیک مختار پہلا قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک سجدہ جائز نہ ہوگا جب تک پیشانی پر سجدہ نہیں کرے گا۔

**مسئلہ نمبر 10:** گپڑی کے پلو پر سجدہ کرنا مکروہ ہے۔ اگر وہ ایسا کپڑا ہو جیسے وہ کپڑے ہوتے ہیں جو گھٹنوں اور قدموں کو ڈھانپ دیتے ہیں تو کوئی حرج نہیں افضل یہ ہے کہ زمین پر سجدہ کرے یا ایسی چیز پر سجدہ کرے جس پر سجدہ کیا جاتا ہے اگر وہاں کوئی ایسی چیز ہو جو اذیت دیتی ہو تو نماز میں داخل ہونے سے پہلے اسے زائل کر دے اگر پہلے ایسا نہ کیا ہو تو ایک

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب الاعتدال فی السجود و وضع الکفین علی الارض، صفحہ 193، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یجوز من صفة الصلوٰۃ، صفحہ 194، جلد 1

3۔ ایضاً

4۔ صحیح بخاری، صفحہ 112، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفة الصلوٰۃ، باب السجود علی الارض، حدیث 770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مرتبہ اسے برابر کر دے۔

مسلم نے حضرت معقیب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے بارے فرمایا جو سجدہ کرتے وقت مٹی برابر کرتا ہے۔ فرمایا: اگر تو نے ایسا کرنا ہے تو ایک مرتبہ کر لو (1)۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: ہم سخت گرمی میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ جب ہم سے کوئی زمین پر اپنی پیشانی نہیں رکھ سکتا تھا تو وہ اپنا کپڑا بچھاتا تھا اور اس پر سجدہ کرتا تھا (2)۔

**مسئلہ نمبر 11:** جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّكُمْ لَعَمْرُؤُا فَسَّجِدُوا لِلّٰهِ (الحج: 77) تو ہمارے علماء نے فرمایا: رکوع و سجود میں سے وہ کافی ہے جسے رکوع و سجود کہا جائے۔ اسی طرح قیام کا حکم ہے انہوں نے اس میں طمانیت کو شرط قرار نہیں دیا، اور انہوں نے اس کم از کم کو لیا ہے جس پر رکوع و سجود کا اطلاق ہو سکے۔ گویا انہوں نے نماز کے لغو ہونے کے متعلق ثابت شدہ احادیث سنی ہی نہیں۔ ابن عبد البر نے کہا: رکوع، سجود، رکوع کے بعد وقوف، دو سجدوں کے درمیان جلوس جائز ہی نہیں حتیٰ کہ آرام سے رکوع کرے، آرام سے وقوف کرے، آرام سے سجدہ کرے اور آرام سے بیٹھے۔ حدیث میں یہی صحیح ہے۔ یہ جمہور علماء اور اہل نظر کا نظریہ ہے۔ ابن وہب اور ابو مصعب نے امام مالک سے یہی روایت کیا ہے۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: ابن قاسم سے فصل کے وجوب اور طمانیت کے سقوط کی روایات کثرت سے ہیں اور یہ وہم عظیم ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے طمانیت سے ہر رکن کو ادا کیا اس کا حکم بھی دیا اور اس کی تعلیم بھی دی۔ اگر ابن قاسم کے لئے عذر ہو کہ وہ اس پر مطلع نہیں تھا تو تمہارے لئے کوئی عذر نہیں جبکہ علم تم تک پہنچ چکا ہے اور اس کے ساتھ تم پر حجت قائم ہوئی۔ نسائی، دارقطنی، علی بن عبد العزیز نے حضرت رفاعہ بن رافع سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص آیا۔ مسجد میں داخل ہوا اور نماز پڑھی۔ جب نماز پڑھ لی تو وہ آیا اور رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا اور لوگوں کو سلام کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: واپس جاؤ، نماز پڑھو تم نے (پہلے صحیح) نماز نہیں پڑھی۔ وہ شخص دوبارہ نماز پڑھنے لگا، ہم اس کی نماز کو تاڑتے رہے، ہم نہیں جانتے تھے کہ کس وجہ سے اس کی نماز معیوب ہوئی ہے۔ پھر جب وہ آیا نبی کریم ﷺ اور لوگوں پر سلام کیا تو اسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم واپس جاؤ اور نماز پڑھو تم نے نماز (صحیح) نہیں پڑھی۔ ہمام نے کہا: ہم نہیں جانتے یہ امر اس کے ساتھ دو دفعہ ہوا یا تین دفعہ۔ اس شخص نے عرض کی: میں نے اب تو کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں نہیں جانتا کہ آپ نے مجھ پر میری نماز کی وجہ سے کیوں عیب لگایا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کسی کی نماز مکمل نہیں ہوتی حتیٰ کہ وہ وضو کو مکمل کرے جس طرح اسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اپنے چہرے کو دھوئے اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوئے، اپنے سر کا مسح کرے اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں دھوئے پھر تکبیر کہے۔ اللہ تعالیٰ کی ثنا پڑھے پھر سورہ الحمد پڑھے اور قرآن حکیم میں سے جو میسر ہو وہ پڑھے پھر تکبیر کہے اور رکوع کرے، رکوع میں اپنی ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر رکھے حتیٰ کہ اس کے جوڑ مطمئن ہو جائیں اور وہ ڈھیلا ہو

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب کراۃ مسح الحصى وتسویۃ التراب فی الصلوٰۃ، صفحہ 205، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 56، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب السجود علی الشوب فی شدۃ الحر، حدیث 372، نیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے پھر سمع اللہ لمن حمد کہے اور سیدھا کھڑا ہو جائے حتیٰ کہ اس کی پیٹھ سیدھی ہو جائے اور ہر جوڑ اپنی جگہ پر آ جائے، پھر تکبیر کہے اور سجدہ کرے اور اپنے چہرے کو زمین پر رکھے۔ ہمام نے کہا: کبھی کہتے اپنی پیشانی کو زمین پر رکھے حتیٰ کہ اس کے مفصل مطمئن ہو جائیں اور وہ ڈھیلا ہو جائے، پھر تکبیر کہے اور اپنی مقعد پر بیٹھ جائے اور اس کی پیٹھ سیدھی ہو۔ چاروں رکعتوں کا اس طرح وصف بیان فرمایا یہاں تک کہ فارغ ہو گئے۔ پھر فرمایا: تم میں سے کسی کی نماز مکمل نہیں ہوتی حتیٰ کہ وہ اس طرح نماز پڑھے۔ اس کی مثل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ یہ پہلے گزر چکی ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ کتاب اللہ میں مجمل نماز کا بیان ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دیا ہے اور ساری امت کو پہنچایا ہے۔ پس جو اس بیان سے واقف نہیں اور اس نے کمی کی جو رحمن نے اس پر فرض کیا اور اس نے پیروی نہ کی اس امر کی جو اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پہنچا وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا ذکر اس آیت میں ہے **فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ (مریم: 59)** اس کا بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

بخاری نے حضرت زید بن وہب سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت حذیفہ نے ایک شخص کو دیکھا جو رکوع و سجود مکمل نہیں کر رہا تھا۔ حضرت حذیفہ نے اسے فرمایا: تو نے نماز (صحیح) نہیں پڑھی اگر تو (اسی حالت میں) مرے گا تو اس فطرت پر نہیں مرے گا جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا فرمایا (1)۔

**مسئلہ نمبر 12:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **مَعَ التَّوَكُّعَيْنِ**، مع کالفظ معیت اور جمعیت پر دلالت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کے مفسرین کی ایک جماعت نے کہا: ابتدا میں نماز کا امر جماعت کے ساتھ حاضری کا تقاضا نہیں کرتا تھا تو مع کے قول کے ساتھ جماعت کی حاضری کا حکم دیا۔ جماعت کے ساتھ حاضر ہونے کے متعلق علماء کے دو مختلف اقوال ہیں: جمہور کا نظریہ یہ ہے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا سنن موکدہ سے ہے اور جو بغیر کسی عذر کے جماعت سے پیچھے رہتا ہے اس پر سزا واجب ہے اور بعض اہل علم نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ قول صحیح ہے کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ تمام مساجد کا جماعت سے خالی ہونا جائز نہیں۔ جب مسجد میں جماعت کھڑی ہو جائے تو گھر میں منفرد کی نماز جائز ہو گی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے ستائیس درجے افضل ہے (2)۔ اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے پچیس درجے افضل ہے (3)۔ داؤد نے کہا: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ہر شخص پر فرض ہے جیسے جمعہ فرض ہے اور داؤد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے: لا صلاة لجار المسجد الا في المسجد مسجد کے پڑوسی کی نماز صرف مسجد میں ہی جائز ہے۔ ابو داؤد نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ابو محمد عبدالحق نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرات عطاء بن ابی رباح، احمد بن حنبل، ابو ثور وغیرہم کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا:

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 112، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب اذا لم يتم السجود، حدیث 376، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل صلاة الجماعة، صفحہ 231، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)



میں کسی شخص کو جماعت ترک کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر قادر ہو مگر عذر کی وجہ سے جماعت چھوڑ سکتا ہے یہ ابن منذر نے ان کا قول حکایت کیا ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: نبی کریم ﷺ کے پاس ایک نابینا شخص آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میرا کوئی قاعد نہیں جو مجھے مسجد میں لے آئے، اس نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تا کہ آپ اسے رخصت دے دیں اور وہ اپنے گھر میں نماز پڑھ لیا کرے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے رخصت دے دی۔ جب وہ واپس چلا گیا تو اسے پھر بلایا اور فرمایا: کیا تو نماز کی اذان سنتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر جواب دے (1) کہ (یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کر) ابو داؤد کے الفاظ اس حدیث میں یہ ہیں ”میں تیرے لئے رخصت نہیں پاتا“ اس حدیث کو حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم سے روایت کیا، انہوں نے فرمایا: سائل عبد اللہ بن ام مکتوم تھے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اذان سنی اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے اسے کوئی عذر مانع نہ ہو..... صحابہ نے پوچھا: عذر کیا ہے؟ فرمایا خوف یا مرض..... اس کی نماز قبول نہ ہوئی جو اس نے پڑھی (2)۔ ابو محمد عبد الحق نے کہا: اس حدیث کو مغراء العبدی نے روایت کیا ہے۔ صحیح حضرت ابن عباس پر موقوف ہے جس نے اذان سنی اور (جماعت کے ساتھ) نہ آیا تو اس کی نماز نہیں۔ قاسم بن اصبح نے اپنی کتاب میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے اذان سنی اور جواب نہ دیا (یعنی جماعت کے ساتھ حاضر نہ ہوا) تو اس کی نماز نہیں مگر یہ کہ اسے عذر ہو (3)۔ اس خبر کے ساتھ تیرے لئے اس کی صحت کافی ہے۔ مغراء العبدی سے ابو اسحاق نے روایت کی ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: ہم نے دیکھا کہ جماعت سے پیچھے نہیں رہتا مگر ایسا منافق جس کا اتفاق معلوم ہوتا ہے (4)۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہمارے اور منافقین کے درمیان فرق عشاء اور صبح کی جماعت کی حاضری ہے۔ منافقین ان نمازوں میں حاضر ہونے کی طاقت نہیں رکھتے (5)۔ ابن منذر نے کہا: ہم نے کئی اصحاب نبی ﷺ سے روایت کیا، انہوں نے فرمایا: جس نے اذان سنی اور بغیر عذر کے جواب نہ دیا اس کی نماز نہیں (6)۔ ان صحابہ میں حضرت ابن مسعود، حضرت ابو موسیٰ اشعری ہیں۔

ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے ارادہ کیا کہ میں اپنے دو جوانوں کو حکم دوں کہ وہ لکڑیوں کے گٹھے اکٹھے کریں پھر میں ان لوگوں کے پاس آؤں جنہوں نے اپنے گھروں میں نماز پڑھی ہے۔ انہیں کوئی بیماری بھی نہیں ہے تو میں ان پر ان کے گھر جلا دوں (7)۔ یہ ان کی دلیل ہے جنہوں نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض قرار دیا یہ وجوب میں ظاہر ہے۔ جمہور علماء نے جماعت کے ساتھ نماز کی حاضری کی تاکید پر محمول کیا ہے اور صحابہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد وموضع الصلوٰۃ، باب فضل صلوٰۃ الجماعة وبيان التشديد في التغلف عنه، صفحہ 232، جلد 1

2۔ سنن دارقطنی، صفحہ 421، جلد 1 (دارالحسن قاہرہ)

3۔ ایضاً، صفحہ 420، جلد 1

4۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد وموضع الصلوٰۃ، باب فضل صلوٰۃ الجماعة وبيان التشديد في التغلف عنه، صفحہ 232، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

5۔ سنن ابی امام مالک، صفحہ 114

6۔ سنن دارقطنی، صفحہ 420، جلد 1 (دارالحسن)

7۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب التشديد في ترك الجماعة، حدیث نمبر 462، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے اقوال اور حدیث لا صلوقہ (اس کی نماز نہیں) کو کمال اور فضیلت پر محمول کیا ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ابن ام مکتوم کو فاجب کا امر کرنا استحباب پر محمول کیا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا لقد همت (میں نے ارادہ کیا) یہ حتمی وجوب پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ آپ نے ارادہ فرمایا لیکن ایسا کیا نہیں۔ آپ نے یہ ارشاد غافلوں کو وعید اور تہدید کے طور پر ذکر فرمایا جو جماعت اور جمعہ سے رہ جاتے ہیں۔ اس معنی کو مسلم کی روایت بھی بیان کرتی ہے جو حضرت عبداللہ نے روایت کی ہے، فرمایا: جسے یہ بات خوش کرے کہ وہ کل اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہو کر ملے تو اسے ان نمازوں کی حفاظت کرنی چاہئے جہاں بھی ان کی ندا دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کے لئے سنن ہدیٰ کو مشروع کیا ہے اور یہ نمازیں (جماعت کے ساتھ پڑھنا) سنن ہدیٰ میں سے ہیں۔ اگر تم اپنے گھروں میں نماز پڑھو گے جس طرح یہ شخص اپنے گھر میں نماز پڑھتا ہے تو تم اپنے نبی ﷺ کی سنت کو چھوڑ دو گے اور اگر تم اپنے نبی ﷺ کی سنت کو چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ جو شخص اچھی طرح طہارت کرے پھر کسی مسجد کا ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم کے بدلے ایک نیکی لکھتا ہے اور اس کے بدلے اس کا ایک درجہ بلند فرماتا ہے اور اس کے بدلے ایک گناہ معاف فرماتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ہم میں سے جماعت سے ایسا منافق پیچھے رہتا تھا جس کا نفاق معلوم ہوتا تھا۔ ایک شخص کو لایا جاتا تھا جبکہ وہ دو شخصوں کے سہارے پر ہوتا تھا حتیٰ کہ اسے صف میں کھڑا کیا جاتا تھا (1)۔ حضرت عبداللہ نے اپنی حدیث میں بیان فرمایا کہ جماعت کے ساتھ شریک ہونا سنن ہدیٰ میں سے ایک سنت ہے اور اس کا ترک کرنا گمراہی ہے۔ اسی وجہ سے قاضی ابوالفضل عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: سنن کے ظاہر کے ترک پر ایک دوسرے کی مدد کرنے والوں کے بارے میں اختلاف ہے کیا ان سے جنگ کی جائے گی یا نہیں؟ صحیح یہ ہے کہ ایسے عمل پر ان سے قتال کیا جائے گا کیونکہ سنن ہدیٰ کے ترک پر ایک دوسرے کی مدد کرنا انہیں ختم کرنے کے مترادف ہے۔

میں کہتا ہوں: اس بنا پر حجت قائم اور ظاہر ہو جائے تو منفرد کی نماز جائز اور صحیح ہوگی۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آدمی کی نماز جماعت کے ساتھ گھر میں اور بازار میں اس کی نماز سے بیس سے زائد درجے بلند ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص جب وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر وہ مسجد میں آتا ہے اور اس کا ارادہ فقط جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی ہوتا ہے تو جو وہ قدم اٹھاتا ہے اس کے بدلے اس کے لئے ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے اور اس کے بدلے اس کا ایک گناہ معاف کیا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ مسجد میں داخل ہو جائے۔ جب وہ مسجد میں داخل ہوتا ہے جب تک اسے نماز روکے ہوئے ہوتی ہے وہ نماز میں ہی شمار ہوتا ہے اور فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ اس جگہ میں ہوتا ہے جہاں سے اس نے نماز پڑھی ہوتی ہے۔ فرشتے یہ کہتے رہتے ہیں: اے اللہ! اس پر رحم فرما، اے اللہ! اس کی مغفرت فرما، اے اللہ! اس پر نظر رحمت فرما، یہ دعا کا سلسلہ جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ اس مجلس میں تکلیف نہیں دیتا (یعنی) جب تک اسے حدت لاحق نہیں ہوتا (2)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: حدت سے کیا مراد ہے؟

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب فضل صلوٰۃ الجماعة، صفحہ 232، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل الصلوٰۃ، المكتوبة في جماعة وفضل انتظار الصلوٰۃ و كثرة الخطا الخ، صفحہ 234، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: اس کی ہوا آہستہ خارج ہو یا بلند آواز سے خارج ہو۔

**مسئلہ نمبر 13:** جماعت کی طرف جو فضیلت منسوب کی گئی ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ فقط جماعت کے لئے ہے جہاں بھی ہو یا یہ فضیلت اس جماعت کی ہے جو مسجد میں ہوتی ہے، کیونکہ یہ فضیلت ایسے افعال کے ساتھ لازم ہے جو مساجد کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ حدیث پاک میں بیان ہوا ہے۔ علماء کے اس کے متعلق دو قول ہیں: پہلا زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ جماعت وہ وصف ہے جس پر حکم معلق کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

مسجد کی طرف زیادہ قدم چل کر جانا، مسجد کی طرف آنا، مسجد میں بیٹھنا یہ جماعت کی فضیلت کے علاوہ زیادہ ثواب ہیں۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 14:** علماء کا اختلاف ہے کہ کیا ایک جماعت دوسری جماعت سے کثرت تعداد اور امام کی فضیلت کی وجہ سے فضیلت رکھتی ہے یا نہیں؟ امام مالک نے فرمایا: نہیں۔ ابن حبیب نے فرمایا: فضیلت رکھتی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی کا دوسرے آدمی سے مل کر نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور ایک شخص کا دو آدمیوں کے ساتھ نماز پڑھنا ایک آدمی کے ساتھ نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور جو تعداد زیادہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے (1)۔ اس حدیث کو حضرت ابی بن کعب نے روایت کیا ہے، اور ابو داؤد نے نقل کی ہے، اس کی سند میں کمزوری ہے۔

**مسئلہ نمبر 15:** جس نے ایک جماعت سے نماز پڑھ لی ہو وہ وہی نماز دوسری جماعت سے دوبارہ پڑھ سکتا ہے؟ اس کے متعلق بھی علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور ان کے اصحاب نے فرمایا: وہ شخص جو تنہا اپنے گھر میں یا کسی اور جگہ نماز پڑھ چکا ہو وہ امام کے ساتھ نماز دوبارہ پڑھے اور جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھ چکا ہو اگرچہ وہ جماعت تھوڑی بھی ہو وہ زیادہ تعداد والی جماعت یا کم والی جماعت کے ساتھ نماز دوبارہ نہ پڑھے۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور داؤد بن علی نے فرمایا: جو ایک دفعہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ چکا ہو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ نماز اگر چاہے تو دوسری جماعت کے ساتھ پڑھ لے کیونکہ یہ نفل اور سنت ہو جائے گی۔

یہی بات حضرات حذیفہ بن یمان، ابو موسیٰ اشعری، انس بن مالک، صلہ بن زفر، شعبی اور نخعی سے مروی ہے۔ حضرت حماد بن زید اور حضرت سلیمان بن حرب کا بھی یہی قول ہے۔

امام مالک نے اس قول سے حجت پکڑی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک نماز ایک دن میں دو مرتبہ نہیں پڑھی جائے گی (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: دوبارہ نماز نہ پڑھو۔ یہ قول حضرت سلیمان بن یسار نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ احمد اور اسحاق نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی ایک فرض پڑھے پھر وہ کھڑا ہو اور دوبارہ اسی فرض کی نیت سے دوبارہ پڑھے، لیکن جب وہ امام کے ساتھ سنت یا نفل کی نیت سے پڑھے گا تو وہ نماز کا اعادہ نہیں ہوگا۔

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 82، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً کتاب الصلوٰۃ، باب فی فضل الصلوٰۃ الجماعۃ، حدیث 467، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دارقطنی، صفحہ 416، جلد 1 (دارالحسن)



جن کو رسول اللہ ﷺ نے نماز کے اعادہ کا جماعت کے ساتھ حکم دیا تھا انہیں فرمایا تھا یہ تمہارے لئے نفل ہے (1) جیسا کہ حضرت ابو ذر وغیرہ کی حدیث میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 16:** مسلم نے حضرت ابو مسعود سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: قوم کی امامت وہ کرائے جو کتاب اللہ کا اچھا قاری ہو، اگر قراءت میں برابر ہوں تو جو سنت کو زیادہ جاننے والا ہو، اگر سنت میں برابر ہوں تو جو ہجرت میں مقدم ہو، ہجرت میں بھی برابر ہوں تو جو اسلام لانے میں مقدم ہو۔ کوئی شخص دوسرے کی سلطنت میں امامت نہ کرائے اور اس کے بیٹھنے کی جگہ پر نہ بیٹھے مگر یہ کہ وہ اسے اجازت دے (2)۔ ایک روایت میں اسلام میں مقدم ہونے کی جگہ، عمر میں بڑا ہونے کا ذکر ہے، یہ حدیث ابو داؤد نے روایت کی ہے، فرمایا: شعبہ نے فرمایا: میں نے اسماعیل سے پوچھا: حدیث میں جو تکممتہ کے الفاظ آئے ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے فرمایا: اس کا پچھونا (اس کے بیٹھنے کی جگہ) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا: حضرت ابو مسعود کی حدیث حسن صحیح ہے اس پر اہل علم کا عمل ہے۔

علماء نے فرمایا: امامت کا سب سے زیادہ حقدار وہ ہے جو کتاب اللہ (قرآن) کا زیادہ قاری ہو اور سنت کو زیادہ جاننے والا ہو اور علماء نے فرمایا: گھر کا مالک امامت کا زیادہ حقدار ہے۔ بعض نے فرمایا: جب گھر کا مالک دوسرے کو اجازت دے دے تو دوسرے کے امامت کرانے میں کوئی حرج نہیں، بعض نے اس کو ناپسند کیا ہے، فرمایا: سنت یہ ہے کہ گھر کا مالک امامت کرائے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ ہم نے اشعث بن قیس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک نوجوان کو امامت کے لئے مقدم کیا اور فرمایا: میں قرآن کو مقدم کرتا ہوں۔ جنہوں نے فرمایا کہ قوم کی امامت وہ کرائے جو قرآن کا بڑا قاری ہو، ان میں حضرات ابن سیرین، ثوری، اسحاق اور اصحاب الرائے ہیں۔ ابن منذر نے کہا: ہم بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ یہ قول سنت کے موافق ہے۔ امام مالک نے فرمایا: وہ شخص مقدم ہو جو زیادہ علم والا ہو جبکہ اس کی حالت اچھی ہو اور عمر کا بھی حق ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: وہ امامت کرائے جو زیادہ فقیہ ہو، اسی طرح امام شافعی اور ابو ثور نے فرمایا جبکہ وہ قرآن پڑھ سکتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقیہ نماز میں لاحق ہونے والے حوادث کو زیادہ جانتا ہے اور انہوں نے حدیث کی اس طرح تاویل کی ہے کہ صحابہ میں سے بڑا قاری بڑا فقیہ بھی ہوتا تھا کیونکہ وہ قرآن میں سمجھ حاصل کرتے تھے اور صحابہ کے عرف میں فقہاء کو قراء کہا جاتا تھا اور انہوں نے اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی بیماری کی حالت میں حضرت ابو بکر کو ان کے فضل و علم کی وجہ سے مقدم فرمایا۔

اسحاق نے کہا: نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو بکر کو اس لئے مقدم فرمایا تا کہ یہ دلیل بن جائے کہ آپ ﷺ کے بعد وہ خلیفہ ہوں گے، یہ ابو عمر نے ”التعمید“ میں ذکر کیا ہے۔ ابو البزار نے اپنی حسن سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم سفر کرو تو تم میں سے جو بڑا قاری ہو وہ تمہاری امامت کرائے اگرچہ وہ عمر میں چھوٹا بھی ہو، جب وہ تمہاری امامت کرائے گا تو وہ تمہارا امیر ہوگا (3)؟ فرمایا: ہم نہیں جانتے کہ یہ نبی کریم ﷺ سے

1۔ سنن دارقطنی، صفحہ 413، جلد 1 (دارالحسن) 2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب من احق بالامامة، صفحہ 236، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ کنز العمال، حدیث نمبر 17501

روایت کی گئی ہے مگر حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے اس سند کے ساتھ۔

میں نے کہا: چھوٹے کی امامت جائز ہے جب وہ قاری ہو۔ صحیح بخاری میں عمرو بن سلمہ سے مروی ہے، فرمایا: ہم ایک چشمہ پر رہتے تھے جو لوگوں کی گزرگاہ پر تھا۔ ہمارے پاس سے قافلے گزرتے تھے تو ہم ان سے پوچھتے تھے کہ لوگوں کا کیا بنا، وہ شخص (جس نے نبوت کا اعلان کیا ہے) وہ کون ہے؟ لوگ کہتے ہیں: وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مبعوث فرمایا ہے اور اس کی طرف ایسی ایسی وحی کی ہے ایسی ایسی وحی کی ہے میں وہ کلام یاد کر لیتا تھا گو یا وہ میرے سینے میں کلام جم جاتا تھا۔

عرب لوگوں کے اسلام لانے کے منتظر تھے۔ وہ کہتے تھے: اس کو اور اس کی قوم کو چھوڑ دو اگر وہ اپنی قوم پر غالب آجائے گا تو وہ سچا نبی ہوگا۔ جب مکہ فتح ہوا تو ہر قوم نے اسلام قبول کرنے میں جلدی کی۔ میرے باپ نے اپنی قوم کے اسلام کے لئے جلدی کی، جب وہ آئے تو کہا: یقیناً میں تمہارے پاس اللہ کے نبی کی طرف سے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: تم اس وقت میں اس طرح نماز پڑھو۔ جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک اذان دے اور جو تم میں سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہو وہ امامت کرائے۔ پس لوگوں نے دیکھا کہ مجھ سے زیادہ کوئی بھی قرآن پڑھنے والا نہیں کیونکہ میں قافلوں میں ملتا تھا (اور ان سے قرآن سن کر یاد کر لیتا تھا)۔ پس لوگوں نے مجھے امامت کے لئے آگے کیا۔ جب کہ میری عمر چھ یا سات سال تھی میرے اوپر ایک چادر ہوتی تھی جب میں سجدہ کرتا تھا تو وہ اکٹھی ہو جاتی تھی۔ قبیلہ کی ایک عورت نے آواز دی: کیا تم اپنے قاری کی شرمگاہ نہیں ڈھانپو گے؟ پس لوگوں نے میرے لئے ایک قمیص خرید دی مجھے کبھی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی کہ مجھے اس قمیص کی وجہ سے ہوئی تھی (1)۔ جن علماء نے نابالغ بچے کی امامت جائز قرار دی ہے ان میں حسن بصری اور اسحاق بن راہویہ ہیں۔ ابن منذر نے اس کو پسند کیا ہے جب کہ بچہ نماز کو سمجھتا ہو اور نماز پڑھا سکتا ہو، کیونکہ وہ بچہ بھی اس ارشاد میں داخل ہے ”قوم کی امامت بڑا قاری کرائے (2)۔“

آپ ﷺ نے نابالغ کی استیفاء نہیں فرمائی۔ ان علماء نے حجت عمرو بن سلمہ کی حدیث کو بنایا ہے۔ امام شافعی کا ایک قول ہے: وہ باقی تمام نمازوں کی امامت کرائے لیکن جمعہ کی امامت نہ کرائے، وہ اس سے پہلے فرماتے تھے: جس کی امامت فرض نماز میں جائز ہے اس کی امامت عید میں بھی جائز ہے مگر میں اس میں غیرولی کی امامت کو ناپسند کرتا ہوں۔ امام اوزاعی نے فرمایا: فرضی نماز میں بچہ امامت نہیں کرا سکتا حتیٰ کہ اسے احتلام ہو جائے مگر یہ کہ ایسی قوم ہو جن کے پاس قرآن نہ ہو (یعنی کسی کو قرآن یاد نہ ہو) تو پھر قریب البلوغ بچہ امامت کرا سکتا ہے۔ زہری نے کہا: اگر بچے کی امامت میں اضطراب ہو تو وہ ان کی امامت کرائے۔ مالک، ثوری اور اصحاب رائے نے بچے کی امامت سے ہر صورت میں منع فرمایا ہے۔

**مسئلہ نمبر 17:** ہر بالغ مسلمان آزاد کا مستقل امامت کرانا جائز ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جب وہ امام نماز کی حدود کو جانتا ہو اور الحمد شریف پڑھنے میں کوئی ایسی غلطی نہ کرتا ہو جو معنی میں غلطی کا باعث ہو مثلاً وہ ایان نعبہ میں کاف پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مقام النہی عن الخمر، حدیث 3963، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب من احق بالامامة، حدیث 494، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کسرہ پڑھ دے انعت میں تا پر ضمہ پڑھ دے اور وہ طا اور ضاد میں فرق کر سکتا ہو، جو ان میں تفریق نہ کر سکتا ہو اس کی امامت صحیح نہیں کیونکہ ان دونوں کا معنی مختلف ہے۔ ان میں سے بعض نے ان تمام صورتوں میں رخصت دی ہے جبکہ وہ قراءت سے جاہل ہو اور جاہلوں کی ہی امامت کراتا ہو۔ عورت اور ختنی مشکل، کافر اور مجنون اور ان پڑھ آدمی کی امامت جائز نہیں۔ اکثر علماء کے نزدیک ان لوگوں کا کسی صورت میں امامت کرنا جائز نہیں مگر ان پڑھ اپنے جیسوں کی امامت کر سکتا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس ان پڑھ کی امامت صحیح نہیں جو قراءت اچھی طرح نہ کر سکتا ہو جبکہ کوئی قاری موجود ہو۔ امام شافعی کا یہی قول ہے۔ اگر ان پڑھ نے ان پڑھ کی امامت کرائی تو ہمارے نزدیک اور امام شافعی کے نزدیک صحیح ہے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: جب ان پڑھ شخص کسی ایسی قوم کی امامت کرائے جن میں پڑھے ہوئے بھی ہوں اور ان پڑھ بھی ہوں تو تمام کی نماز فاسد ہے۔ امام ابو یوسف نے اس کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: امام کی نماز اور جو قرآن نہیں پڑھ سکتے ان کی نماز ہو جائے گی۔ ایک لڑوہ نے فرمایا: ان سب کی نماز جائز ہے کیونکہ ہر ایک اپنا فرض ادا کرنے والا ہے اور ذلك مثل المتيم يصل بالستطهرين بالماء، والصلی قاعد ایصل بقوم قیام صلاتهم مجزئة فی قول من خالفنا، لأن کلام مؤد فرض نفسه۔

میں کہتا ہوں: اس قول کی تائید میں نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے بھی حجت پکڑی جاتی ہے ”کیا نمازی نہیں دیکھتا جب وہ نماز پڑھتا ہے، کیسے وہ نماز پڑھتا ہے وہ اپنے لئے نماز پڑھتا ہے (1)“ مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ مقتدی کی نماز امام کی نماز کے ساتھ مربوط نہیں۔ واللہ اعلم..... عطاء بن ابی رباح فرماتے تھے: جب عورت پڑھی ہوئی ہو تو امام تکبیر کہے اور عورت قراءت کرے جب وہ قراءت سے فارغ ہو تو تکبیر کہے اور رکوع اور سجدہ کرے دریاں حالیکہ عورت مرد کے پیچھے ہو اسی قسم کا مفہوم حضرت قتادہ سے بھی مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 18:** اندھے، لنگڑے، اشل، ہاتھ یا پاؤں کٹے ہوئے، خصی اور غلام کی امامت میں کوئی حرج نہیں جبکہ ان میں سے ہر شخص نماز کا عالم ہو۔ ابن وہب نے فرمایا: میں نہیں دیکھتا کہ ہاتھ یا پاؤں کٹا ہوا شخص اور اشل امامت کرائے کیونکہ وہ درجہ کمال سے ناقص ہے۔ میں اس کی امامت اس کی کمی اور نقص کی وجہ سے ناپسند کرتا ہوں۔ جمہور علماء نے ان کی مخالفت کی ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ کسی عضو کا فقدان نماز کے فروض میں سے کسی فرض سے مانع نہیں ہے۔ پس اس عضو کے نہ ہونے ہوئے بھی ہمیشہ کی امامت جائز ہے جیسے آنکھ نہ ہو تو امامت جائز ہوتی ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ابن ام مکتوم کو خلیفہ بنایا جو لوگوں کی امامت کراتے تھے حالانکہ وہ نابینا تھے (2)۔ اسی طرح لنگڑے، ہاتھ کٹے ہوئے، اشل اور خصی کا قیام اور نظر ایسی حکم ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نابینے شخص کے بارے میں فرمایا انہیں اس سے کیا حاجت ہے؟ (یعنی لوگ ان کے بارے میں یہ مسئلہ کیوں پوچھتے ہیں) حضرت ابن عباس اور حضرت عثمان بن مالک دونوں امامت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب امر بتحصین الصلوٰۃ واتمامها والخشوع فیها، صفحہ 180، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ



کراتے تھے اور دونوں نابینے تھے، اسی پر عام علماء کا فتویٰ ہے۔

**مسئلہ نمبر 19:** ولد الزنا (حرامی) کی امامت میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں اس کا ہمیشہ امام ہونا ناپسند کرتا ہوں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی اس کو ناپسند کیا ہے۔ حضرت عطاء بن ابی رباح فرماتے تھے اسے امامت کرانی چاہئے جبکہ وہ پسندیدہ (نیک) شخص ہو۔ یہ حضرات حسن بصری زہری، نخعی، سفیان ثوری، اوزاعی، احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ اصحاب رائے (احناف) کے نزدیک ولد الزنا کے پیچھے نماز جائز ہے لیکن دوسرا شخص ان کے نزدیک بھی بہتر ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: میں ایسے شخص کو مستقل امام بنانا ناپسند کرتا ہوں جس کا باپ معروف نہ ہو لیکن جس نے اس کے پیچھے نماز پڑھ لی جائز ہوگی۔ عیسیٰ بن دینار نے کہا: ولد الزنا کی امامت کے بارے امام مالک کے قول کو نہیں اپناتا اس بچے پر والدین کے گناہ میں سے کچھ نہیں ہے، ابن عبدالحکم نے اسی طرح فرمایا جب کہ اس میں امامت کی اہلیت نہ ہو۔ ابن منذر نے کہا: ولد الزنا بھی رسول اللہ ﷺ کے عام ارشاد میں داخل ہے: یوم القوم اقرءہم، (1) لوگوں میں امامت ان میں سے اچھا قاری کرائے۔ ابو عمر نے کہا: امامت کی شرط میں وارد آثار میں کوئی ایسا اثر نہیں ہے جو نسب کی رعایت پر دلالت کرے، ان سب آثار میں فقہ، قراءت اور دین کی صلاح کا ذکر ہے۔

**مسئلہ نمبر 20:** رہا غلام تو امام بخاری نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: پہلے مہاجرین کا گروہ نبی کریم ﷺ کی آمد سے پہلے قبا کے مقام پر پہنچا تو اس کی امامت سالم کراتے تھے جو ابو حذیفہ کے غلام تھے اور انہیں قرآن زیادہ یاد تھا (2)۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: سالم جو ابو حذیفہ کے غلام تھے مہاجرین اولین اور نبی کریم ﷺ کے اصحاب کی قبا کی مسجد میں امامت کراتے تھے، ان لوگوں میں حضرات ابوبکر، عمر، زید، عامر بن ربیعہ وغیرہ موجود تھے (3)۔ حضرت عائشہ کا غلام ذکوان قرآن سے دیکھ کر آپ کی امامت کراتا تھا (4)۔ ابن منذر نے کہا: ابوسعید جو ابواسید کے غلام تھے وہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کی ایک جماعت کی امامت کراتے تھے ان صحابہ میں حضرات حذیفہ اور ابوسعود بھی تھے۔

غلام کی امامت کی رخصت نخعی، شعبی، حسن بصری، حکم، ثوری، شافعی، احمد، اسحاق اور اصحاب رائے نے دی ہے۔ ابو مجلز نے اس کو ناپسند کیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: غلام امامت نہ کرائے مگر یہ کہ وہ قاری ہو اور اس کے ساتھ جو آزاد لوگ ہوں قراءت نہ کر سکتے ہوں لیکن عید اور جمعہ کی امامت غلام نہ کرائے۔ اوزاعی کے نزدیک جائز ہے اگر وہ اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں۔ ابن منذر نے کہا: غلام بھی آپ ﷺ کے اس ارشاد میں داخل ہے: یوم القوم اقرءہم امامت وہ کرائے جو ان میں سے زیادہ قراءت جانتا ہو۔

**مسئلہ نمبر 21:** رہی عورت تو امام بخاری نے حضرت ابوبکرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب رسول اللہ ﷺ کو خبر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب من احق بالامامة، صفحہ 236، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، باب الامۃ الاعلیٰ، کتاب الاذان ابواب صلوٰۃ الجماعة والامامة باب امامة العبد والمول، حدیث 651، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، کتاب الاحکام، باب استسقاء الموال واستعمالہم، حدیث 6640، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً، کتاب الاذان ابواب صلوٰۃ الجماعة والامامة باب امامة العبد والمول، حدیث 651، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پہنچی کہ اہل فارس نے بنت کسریٰ کو اپنی ملکہ بنایا ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ قوم ہرگز کامیاب نہ ہوگی جنہوں نے اپنا والی عورت کو بنایا (1)..... ابو داؤد نے عبد الرحمن بن خلد سے انہوں نے ام ورقہ بنت عبد اللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ اس کی ملاقات کے لئے ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ فرمایا: آپ ﷺ نے اس کے لئے ایک مؤذن مقرر فرمایا تھا جو اس کے لئے اذان دیتا تھا اور آپ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کرایا کرے۔ عبد الرحمن نے کہا: میں نے اس کا مؤذن ایک بوڑھا شخص دیکھا (2)۔ ابن منذر اور شافعی نے کہا: مردوں میں سے جنہوں نے عورت کے پیچھے نماز پڑھی ان پر نماز کا اعادہ واجب ہے۔ ابو ثور نے کہا: ان پر اعادہ واجب نہیں۔ یہ مرنی کے قول کا قیاس ہے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے فرمایا: عورت کی امامت، مردوں اور عورتوں کے لئے صحیح نہیں ہے۔ ابن ایمن نے عورتوں کے لئے عورت کی امامت کا جواز روایت کیا ہے۔

رہا خنثی مشکل، تو امام شافعی نے فرمایا: وہ مردوں کی امامت نہ کرائے عورتوں کی امامت کرائے۔ امام مالک نے فرمایا: وہ کسی حال میں امام نہیں بن سکتا۔ یہ اکثر فقہاء کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 22:** کافر جو شرع محمدیہ کا مخالف ہے جیسے یہودی اور نصرانی مسلمانوں کی امامت کرادے جبکہ مسلمانوں کو اس کے کفر کا علم نہ ہو تو امام شافعی اور احمد کہتے ہیں ان کی نماز جائز نہ ہوگی اور وہ نماز کا اعادہ کریں۔ یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کا قول ہے کیونکہ وہ قربت کے اہل میں سے نہیں ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: اسے سزا دی جائے گی۔ ابو ثور اور مرنی نے فرمایا: جس نے ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ لی اس پر اعادہ نہیں ہے اور وہ اپنی نماز کی وجہ سے مسلمان نہیں ہوگا۔ یہ امام شافعی اور ابو ثور کے نزدیک ہے۔ امام احمد نے فرمایا: اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 23:** اہل بدعت جو خواہشات نفس کے پرستار ہیں جیسے معتزلہ، جہمیہ وغیرہ۔ تو امام بخاری نے حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے کہ تو نماز پڑھ لے، اس کی بدعت کا وبال اس پر ہے۔ امام احمد نے فرمایا: اہل ہوا میں سے کسی کے پیچھے نماز نہ پڑھے جبکہ وہ اپنی خواہش (بدعت) کی طرف دعوت دینے والا ہو۔ امام مالک نے فرمایا: ظالم ائمہ کے پیچھے نماز پڑھ لے۔ اہل بدعت قدر یہ وغیرہم کے پیچھے نماز نہ پڑھے۔ ابن منذر نے کہا: ہر وہ شخص جس کی بدعت کفر کا موجب ہو اس کے پیچھے نماز جائز نہیں اور جس کی بدعت ایسی نہ ہو اس کے پیچھے نماز جائز ہے اور ایسی صفت والے کو آگے کرنا جائز نہیں۔

**مسئلہ نمبر 24:** اپنے اعضاء کے ساتھ فسق (گناہ) کرنے والا مثلاً زانی، شرابی اور اس جیسے شخص کی امامت میں اختلاف ہے۔ ابن حبیب نے فرمایا: جس نے شرابی کے پیچھے نماز پڑھی وہ نماز کو لوٹائے مگر یہ کہ وہ والی ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے والے پر اعادہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ نشہ کی حالت میں ہو۔ یہ امام مالک کے ساتھیوں کا قول ہے جن سے میں ملا ہوں۔ حضرت جابر بن عبد اللہ کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کوئی عورت

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب الفتنة التي تنجم كمنها البهيم، حدیث 6570، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب المدة النساء، حدیث نمبر 500، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مرد کی امامت نہ کرائے اور کوئی بدو مہاجر کی امامت نہ کرائے کوئی فاجر نیکو کار کی امامت نہ کرائے مگر یہ کہ وہ صاحب سلطنت ہو۔ ابو محمد عبدالحق نے فرمایا: یہ علی بن زید بن جدعان نے حضرت سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے۔ اکثر علماء علی بن زید کو ضعیف کہتے ہیں۔ دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم کو اپنی نمازوں کو اچھا کرنا پسند ہے تو اپنے اچھے لوگوں کو (امامت کے لئے) آگے کرو۔ اس کی سند میں ابوالولید خالد بن اسماعیل مخزومی ہے جو ضعیف ہے۔ یہ دارقطنی کا قول ہے۔ ابواحمد بن عدی نے خالد کے بارے کہا: یہ مسلمانوں میں سے ثقہ لوگوں پر احادیث وضع کرتا تھا۔ اس کی یہ حدیث اس نے یہ ابن جریج سے انہوں نے عطا سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔

دارقطنی نے سلام بن سلیمان عن عمر بن محمد بن واسع عن سعید بن جبیر عن ابن عمر کے سلسلہ سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے امام اپنے عمدہ لوگوں کو بناؤ کیونکہ وہ تمہارے اور اللہ کے درمیان وفد ہیں (1)۔ دارقطنی نے کہا: یہ عمر میرے نزدیک عمر بن یزید مدائن کا قاضی ہے اور سلام بن سلیمان بھی مدائن کا رہنے والا ہے۔ یہ قوی نہیں ہے۔ یہ عبدالحق نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 25:** ائمہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی پیروی کی جائے۔ پس اس سے اختلاف نہ کرو جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب وہ سبَّ اللہ لَمَنْ حَبَدَا کہے تو تم کہو اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔ جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو (2)۔

علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے، جو رکوع کرے یا جھک جائے امام کے رکوع کرنے سے پہلے اور وہ یہ عمل جان بوجھ کر کرے۔ دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ ایسے شخص کی نماز فاسد ہے اگر اس نے یہ تمام نماز میں کیا یا اکثر نماز میں کیا۔ یہ اہل ظاہر کا قول ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، سنید نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں ابن علیہ نے بیان کیا انہوں نے ایوب سے انہوں نے ابوقلابہ سے انہوں نے حضرت ابوالورد انصاری سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر کے پہلو میں نماز پڑھی۔ میں امام سے پہلے اٹھتا اور جھکتا تھا۔ جب حضرت ابن عمر نے سلام پھیرا تو حضرت ابن عمر نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے مروڑا اور اپنی طرف کھینچا۔ میں نے پوچھا: حضرت آپ کو کیا ہوا؟ حضرت عبد اللہ بن عمر نے پوچھا: تو کون ہے؟ میں نے کہا: فلاں ابن فلاں۔ پوچھا: تو سچے اہل بیت سے ہے تجھے صحیح نماز پڑھنے سے کون سی چیز مانع ہے؟ میں نے کہا: تو نے مجھے اپنے پہلو میں نماز پڑھتے دیکھا نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: میں نے تجھے دیکھا تو امام سے پہلے اٹھتا اور جھکتا ہے اور اس کی نماز نہیں ہوتی جو امام کی مخالفت کرے۔ حسن بن جی نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو امام سے پہلے رکوع یا سجدہ کرے پھر امام کے رکوع یا سجدہ کرنے سے پہلے سر اٹھالے، تو اس کا رکوع و سجود شمار نہیں ہوگا اور اس کی نماز جائز نہ ہوگی۔

اکثر فقہاء نے فرمایا: جس نے ایسا کیا اس نے غلط کیا اور اس کی نماز فاسد نہ ہوگی کیونکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے اور نماز



میں ائمہ کی اقتدا کرنا سنت حسنة ہے۔ پس جس نے اس کی مخالفت کی، اس کے بعد کہ اس نے اپنی نماز کا فرض، اس کی طہارت، رکوع، سجود اور دوسرے فرائض کے ساتھ ادا کر دیا ہے تو اس پر اعادہ نہیں ہے اگرچہ اس نے اس کی بعض سنن کو ترک بھی کر دیا ہو کیونکہ اگر وہ چاہتا تو منفرد بھی ادا کر سکتا تھا۔ پس اس نے یہ نماز اپنے امام سے پہلے پڑھ لی ہے تو جائز ہو گئی اور اس نے جو جماعت کو ترک کیا ہے وہ اس نے برا کیا ہے۔ علماء نے فرمایا: جو امام کی نماز میں داخل ہوا پھر اس نے امام کے ساتھ رکوع و سجود کیا جبکہ وہ ایک رکعت میں اور امام دوسری رکعت میں نہ تھا تو اس کی اقتدا صحیح ہے اگرچہ وہ امام سے پہلے اٹھتا ہے اور امام سے پہلے جھکتا ہے کیونکہ وہ امام کے رکوع کے ساتھ رکوع کرتا ہے اور امام کے سجدہ کے ساتھ سجدہ کرتا ہے اور اوپر اٹھتا ہے جبکہ اس میں وہ اس کی تبع میں ہے مگر وہ اپنے اس فعل میں گناہگار ہے کیونکہ مقتدی کے لئے جو متفق علیہ سنت ہے اس نے اس کے خلاف کیا۔

میں کہتا ہوں: ابن عبد البر نے جو جمہور علماء سے نقل کیا ہے اس سے یہ شعور ملتا ہے کہ ان کے نزدیک مقتدی کی نماز، امام کی نماز سے مربوط نہیں ہے کیونکہ اتباع حسی اور شرعی مفقود ہے لیکن اکثر علماء کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ اثر و نظر کے اعتبار سے پہلا قول صحیح ہے۔ امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی پیروی کی جائے اور اس کے افعال کی اقتدا کی جائے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا (البقرہ: 124)** یعنی لوگ آپ کی اقتدا کریں گے، اس آیت کا بیان آگے آئے گا۔

یہ امام کی لغت اور شرع میں حقیقت ہے۔ جس نے امام کی مخالفت کی اس نے اس کی پیروی نہیں کی۔ پھر نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا کہ ”جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو (1)“۔ فقہ کے ساتھ ذکر فرمایا جو کسی کام کو پہلے کے بعد کیا جاتا ہے، اور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مراد کو بیان کرنے والے ہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے لئے سخت وعید ذکر فرمائی جو رکوع امام سے پہلے کرتا ہے یا پہلے سر اٹھاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا وہ شخص جو امام سے پہلے سر اٹھاتا ہے وہ ڈرتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا سر گدھے کی طرح پھیر دے یا اس کی صورت گدھے کی صورت میں بنا دے (2)۔ یہ حدیث مؤطا، بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ نے نقل کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: اس کی پیشانی شیطان کے ہاتھ میں ہے (3)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہر عمل جس پر ہمارا امر نہیں وہ مردود ہے (4)“۔ پس جس نے جان بوجھ کر امام کی مخالفت کی یہ جانتے ہوئے کہ اسے امام کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اسے اس کی مخالفت سے روکا گیا ہے تو اس نے نماز کو حقیر جانا اور جو اسے حکم دیا گیا تھا اس کی اس نے مخالفت کی۔ پس واجب ہے کہ اس کی وہ نماز جائز نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 26:** اگر بھول کر امام سے پہلے سر اٹھالیا تو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: بھولنے والے کے لئے سنت یہ ہے کہ جس نے رکوع یا سجود میں ایسا کیا وہ رکوع یا سجدہ کی طرف لوٹ جائے اور امام کا انتظار کرے جس نے ایسا کیا اس نے غلطی کی۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے۔ پس اس پر اختلاف نہ

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 101، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً: کتاب صلوٰۃ، باب ایجاب التکبیر وافتتاح الصلوٰۃ، حدیث 691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 91، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً: کتاب صلوٰۃ، باب التشدید فیمن یرفع قبل الامام، حدیث 528، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب صلوٰۃ، باب ما یفعل من رفع راسه قبل الامام، صفحہ 75 (وزارت تعلیم)

4۔ صحیح بخاری، صفحہ 371، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً: کتاب الصلح، باب اذا اصطلعوا علی صلح جور فالصلح، حدیث 2499، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرو (1)۔ ابن عبدالبر نے کہا: امام مالک کے اس قول کا ظاہر یہ ہے کہ جو جان بوجھ کر ایسا کرے اس پر اعادہ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا: جس نے ایسا کیا اس کی طرف سے خطا ہے اور بھولنے والے سے گناہ اٹھایا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 27:** یہ اختلاف تکبیر تحریمہ اور سلام کے علاوہ میں ہے۔ رہا سلام تو اس پر کلام پہلے گزر چکی ہے، رہی تکبیر تحریمہ تو جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ مقتدی کی تکبیر امام کی تکبیر کے بعد ہو۔ مگر امام شافعی سے ایک قول مروی ہے کہ وہ اپنے امام سے پہلے اگر تکبیر تحریمہ کہے گا تو پھر جائز ہوگی کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کی طرف آئے جب تکبیر کہی تو واپس چلے گئے اور مقتدیوں کو اشارہ فرمایا: تم جیسے ہو اسی طرح ٹھہرے رہو۔ پھر آپ گھر چلے گئے پھر آئے جبکہ سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے نماز پڑھائی، جب سلام پھیرا تو فرمایا: میں جنبی تھا میں غسل کرنا بھول گیا تھا (2) اور حضرت انس کی حدیث میں ہے پھر آپ ﷺ نے تکبیر کہی اور ہم نے آپ کے ساتھ تکبیر کہی۔ اس کا مزید بیان سورہ نساء میں ان شاء اللہ ولا جنباً کے تحت آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 28:** مسلم نے حضرت ابو مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نماز میں ہمارے کندھوں کو چھوتے تھے اور فرماتے تھے: سیدھے ہو جاؤ اور اختلاف نہ کرو ورنہ تمہارے دل مختلف ہو جائیں گے تم میں سے میرے قریب صاحب عقل و دانش لوگ ہوں پھر وہ جو عقل و فکر میں ان کے قریب ہوں پھر وہ جو ان کے قریب ہوں (3)۔ حضرت ابو مسعود نے فرمایا: آج تم پہلے سے زیادہ اختلاف کرتے ہو (یعنی تمہاری صفیں درست نہیں ہوتی ہیں) اور تم بازاروں میں آوازیں اونچی کرنے سے بچو اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ”سیدھے ہو جاؤ“ یہ صفیں سیدھی کرنے کا حکم ہے خصوصاً پہلی صف جو امام کے قریب ہوتی ہے۔ اس کا بیان سورہ الحجرات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس حدیث کے معنی پر بھی توفیق الہی سے گفتگو ہوگی۔ ان شاء اللہ

**مسئلہ نمبر 29:** چونکہ نماز میں بیٹھنے کے متعلق آثار مختلف ہیں اس لئے علماء کا نماز میں بیٹھنے کی کیفیت میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: مصلیٰ (نمازی) اپنی سرین زمین پر رکھے اپنے دائیں پاؤں کو کھڑا کرے اور بائیں پاؤں کو دوہرا کرے۔ اس کی وجہ وہ روایت ہے جو امام مالک نے مؤطا میں یحییٰ بن سعید سے روایت کی ہے کہ قاسم بن محمد نے انہیں تشہد میں بیٹھنے کا طریقہ دکھایا تو انہوں نے اپنے دائیں پاؤں کو کھڑا کیا اور بائیں پاؤں کو دوہرا کیا اور وہ اپنی سرین کے بائیں حصہ پر بیٹھے اور اپنے پاؤں پر نہیں بیٹھے۔ پھر فرمایا: مجھے یہ طریقہ حضرت عبداللہ بن عمر نے دکھایا اور انہوں نے مجھے بیان کیا کہ ان کے والد (حضرت عمر) ایسا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی مسلم کی صحیح میں بھی آیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نماز کا آغاز تکبیر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب انتہام الماموم بالاصنام، صفحہ 177، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن دارقطنی، جلد 1، صفحہ 361 (دارالحسن)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف واقامتھا وفضل الاول منها والاولیٰ حاکم علی الصف الاول، جلد 1، صفحہ 181 (قدیمی کتب خانہ)

سے اور قراءت کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سے کرتے تھے اور جب رکوع کرتے تھے تو سر کو زیادہ بلند نہیں رکھتے تھے اور نہ زیادہ جھکاتے تھے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تھے تو دوسرا سجدہ نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ سیدھے بیٹھ جاتے تھے اور دو رکعتوں پر التحیات پڑھتے تھے اور اپنا بایاں پاؤں بچھاتے تھے اور دایاں پاؤں کھڑا کرتے تھے اور شیطان کی طرح ایڑیوں پر بیٹھنے سے منع فرماتے تھے اور منع فرماتے تھے کہ کوئی شخص اپنے بازو (زمین پر) پھیلائے اور نماز کا اختتام سلام سے کرتے تھے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث کی وجہ سے..... اللہ بہتر جانتا ہے..... حضرت ابن عمر نے فرمایا: نماز کی سنت یہ ہے کہ دائیں پاؤں کو کھڑا کیا جائے اور بائیں کو بچھایا جائے۔ امام ثوری، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، حسن بن صالح بن جی نے کہا: دائیں پاؤں کو کھڑا کرے اور بائیں پاؤں پر بیٹھے ان کی دلیل حضرت وائل بن حجر کی حدیث ہے۔ اسی طرح امام شافعی، احمد اور اسحاق نے درمیانے قعدہ میں بیٹھنے کو کہا ہے اور آخری قعدہ میں ظہر، عصر، مغرب یا عشاء میں ان کا قول امام مالک کے قول کے مطابق ہے۔ اس کی وجہ حضرت ابو حمید ساعدی کی حدیث ہے جسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا جب آپ تکبیر کہتے تو اپنے ہاتھوں کو اپنے کندھوں کے برابر کرتے اور جب رکوع کرتے تو اپنے گھٹنوں کو پکڑتے پھر اپنی پیٹھ کو جھکاتے جب کھڑے ہوتے تو سیدھے کھڑے ہوتے حتیٰ کہ ریڑھ کا ہر ممبرہ اپنی جگہ پر آ جاتا اور جب سجدہ کرتے تو اپنے ہاتھ زمین پر رکھتے نہ تو بازوؤں کو زمین پر پھیلاتے اور نہ بازوؤں کو اکٹھا کرتے اور اپنے قدموں کی انگلیوں کی اطراف کو قبلہ کی طرف۔ جب کرتے تھے جب (پہلی) دو رکعتوں پر بیٹھتے تو بائیں پاؤں پر بیٹھتے اور دائیں پاؤں کو کھڑا کرتے اور جب آخری رکعت میں بیٹھتے تو اپنے بائیں پاؤں کو آگے کرتے اور دائیں پاؤں کو کھڑا کرتے اور اپنی سرین کے بل بیٹھتے (2)۔ طبری نے کہا: اگر اس طرح کرے تو اچھا ہے بیٹھنے کے تمام طریقے نبی کریم ﷺ سے ثابت ہیں۔

**مسئلہ نمبر 30:** مالک نے مسلم بن ابی مریم سے انہوں نے علی بن عبدالرحمن المعادی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبداللہ بن عمر نے مجھے دیکھا جب میں نماز میں کنکریوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ جب انہوں نے سلام پھیرا تو مجھے منع فرمایا اور فرمایا: اس طرح کیا کرو جس طرح رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا: رسول اللہ ﷺ کیسے کرتے تھے؟ فرمایا: جب آپ نماز میں بیٹھتے تھے تو اپنی دائیں ہتھیلی اپنی دائیں ران پر رکھتے تھے اور اپنی تمام انگلیوں کو بند کرتے تھے اور انگوٹھے سے ملی ہوئی انگلی کے ساتھ اشارہ فرماتے تھے اور اپنی بائیں ہتھیلی اور اپنی بائیں ران پر رکھتے تھے اور فرمایا: آپ اسی طرح کرتے تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا: حضرت ابن عمر نے جو یہ بیان فرمایا ہے کہ آپ اپنی دائیں ہتھیلی اپنی دائیں ران پر رکھتے تھے اور اپنے ہاتھ کی تمام انگلیوں کو بند کر دیتے تھے سوائے سبابہ کے اس کے ساتھ آپ اشارہ فرماتے تھے اور اپنی بائیں ہتھیلی اپنی بائیں ران پر رکھتے تھے ہاتھ کی انگلیاں کھلی ہوتی تھیں۔ یہ نماز میں بیٹھنے کا سنت طریقہ ہے اس پر اجماع ہے۔ میری معلومات کے مطابق علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور تیرے لئے یہ کافی ہے لیکن سبابہ

1- صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یجوز من صفة الصلوٰۃ وما یفتی بہ ویختل بہ وصفتہ الركوع الخ صفحہ 95-194، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2- صحیح بخاری، صفحہ 114، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفة الصلوٰۃ، باب سنة الجلوس فی التشہد، حدیث 785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



انگلی کو حرکت دینے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: انگلی کو حرکت دینی چاہئے اور بعض نے کہا: حرکت نہیں دینی چاہئے۔ یہ تمام نبی کریم ﷺ سے صحیح آثار کے ذریعے مروی ہیں اور ہر صورت مباح ہے۔ الحمد للہ

سفیان بن عیینہ نے یہ حدیث مسلم بن ابی مریم سے روایت کی ہے جو اس حدیث کے ہم معنی ہے جو امام مالک نے روایت کیا ہے اس میں کچھ زائد ہے۔ سفیان نے کہا: یحییٰ بن سعید ہمیں بیان فرماتے تھے اور وہ مسلم سے روایت فرماتے تھے پھر میں ان سے ملا تو میں نے ان سے سنا اور انہوں نے مجھے یہ زائد فرمایا: یہ انگلی کا حرکت دینا شیطان کو دور کرنا ہے تم میں سے کوئی بھولے گا نہیں جب تک وہ انگلی سے اشارہ کرتا رہے گا اور وہ اس طرح کہے گا۔

میں کہتا ہوں: ابو داؤد نے حضرت ابن زبیر کی حدیث میں فرمایا کہ نبی کریم ﷺ جب دعا کرتے تھے تو اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے تھے اور اسے حرکت نہیں دیتے تھے۔ یہی بعض عراقی علماء کا نظریہ ہے اور انہوں نے انگلی کو حرکت دینے سے منع کیا۔ ہمارے بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ انگلی کو اٹھانا یہ ہمیشہ کی توحید کی طرف اشارہ ہے۔ امام مالک کے اصحاب وغیرہم میں سے اکثر کا نظریہ ہے کہ انگلی کو حرکت دے مگر علماء کا متواتر حرکت دینے میں اختلاف ہے۔ اس کے متعلق علماء کے دو اقوال ہیں: جو متواتر حرکت دینے کے قائل ہیں انہوں نے اس طرح تاویل کی ہے کہ یہ حرکت دینا نماز میں متواتر حضور کو یاد دلاتی ہے کیونکہ یہ شیطان کو بھگاتی ہے اور اسے دور کرتی ہے جیسا کہ سفیان نے روایت کیا ہے اور جو کلمہ شہادت کے تلفظ کے وقت انگلی کو متواتر حرکت دینے کے قائل نہیں ہیں وہ حرکت میں تاویل کرتے ہیں گویا وہ اپنی اس انگلی کے ساتھ توحید کی گواہی دے رہا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 31:** نماز میں عورت کے بیٹھنے کے بارے میں اختلاف ہے، امام نے فرمایا: یہ مرد کی طرح ہے، اور یہ احرام کے بعد لباس اور بلند آواز سے تہلیل کہنے کے علاوہ کسی معاملے میں مرد سے مختلف نہیں۔ امام ثوری نے کہا: عورت ایک جانب سے اپنی چادر کا سدل کرے گی۔ انہوں نے یہ حضرت ابراہیم نخعی سے روایت کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب نے فرمایا: عورت کے لیے جس طرح آسان ہو گا وہ اس طرح بیٹھے گی۔ یہ شعبی کا قول ہے: وہ بیٹھے گی جس طرح اس کے لیے آسان ہو۔ امام شافعی نے فرمایا: عورت اس طرح بیٹھے گی جس میں اس کے لیے زیادہ پردہ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 32:** مسلم نے حضرت طاؤس سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نے حضرت ابن عباس سے قدموں پر بیٹھنے کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ سنت ہے (1)۔ ہم نے حضرت ابن عباس سے کہا: ہم تو اسے آدمی کے لئے جفا دیکھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نہیں بلکہ یہ تمہارے نبی کریم ﷺ کی سنت ہے پھر علماء کا اقعاع کی صفت میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے۔ ابو عبید نے کہا: اقعاع یہ ہے کہ آدمی اپنی سرین کے بل بیٹھے جبکہ رانیں کھڑی کیے ہوئے ہو جیسے کتا اور درندہ بیٹھتا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: یہ اقعاع مجمع علیہ ہے اس میں علماء کا اختلاف نہیں یہ اہل لغت اور فقہاء کے ایک گروہ کی تفسیر ہے۔ ابو عبید نے کہا: ر ہے اہل حدیث وہ اقعاع یہ بتاتے ہیں کہ انسان اپنی سرین دو سجدوں کے درمیان اپنی ایڑیوں پر رکھے۔ قاضی عیاض نے کہا: میرے نزدیک بہتر اقعاع کی تاویل جس کے بارے میں حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ سنت وہ ہے جس کی تفسیر فقہاء نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب جواز الاقعاع علی العقبین، صفحہ 202، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

دوسجدوں کے درمیان ایڑیوں پر بیٹھنے سے کی ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس سے اس کی تفسیر ملتی ہے کہ سنت یہ ہے کہ تیری ایڑیاں تیری سرین کو چھوئیں۔ ابراہیم بن میسرہ نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے یہ روایت کیا ہے۔ ابو عمر نے اس کا ذکر کیا ہے۔ قاضی نے فرمایا: سلف اور صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ وہ ایسا کرتے تھے مگر عام فقہاء نے یہ نہیں کہا ہے وہ اسے اقعا کا نام دیتے ہیں۔ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرات ابن عمر، ابن عباس اور ابن زبیر کو دیکھا کہ وہ دوسجدوں کے درمیان اقعا کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 33:** جن علماء نے سلام کے وجوب اور عدم وجوب کا قول کیا ہے ان کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ دوسرا سلام فرض نہیں ہے مگر حسن بن حبی سے مروی ہے کہ انہوں نے دونوں سلاموں کو واجب قرار دیا ہے۔ ابو جعفر طحاوی نے فرمایا: ہم نے اہل علم میں سے کسی کو نہیں پایا کہ وہ دوسرے سلام کو نماز کے فرائض سے سمجھتے ہوں۔ ابن عبدالبر نے کہا: حسن بن حبی کی دونوں سلاموں کے وجوب کی دلیل یہ ہے، فرماتے ہیں: اگر پہلے سلام کے بعد کسی کو حدث لاحق ہو جائے جبکہ ابھی دوسرا سلام نہ پھیرا ہو تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: نماز کی تحلیل سلام ہے پھر سلام کی کیفیت بیان فرمائی کہ وہ دائیں اور بائیں طرف سلام پھیرے اور ایک سلام کو واجب کہنے والوں کی حجت میں سے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: تحلیلھا التسلیم۔ یعنی نماز کی تحلیل سلام ہے۔ علماء فرماتے ہیں: ایک سلام پر تسلیم کا اطلاق ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ مسئلہ اس اصل پر مبنی ہے کہ کم از کم اسم کو لیا جائے یا تمام کو لیا جائے۔ جب بالا جماع نماز میں داخل ہونا ایک تکبیر کے ساتھ ہے تو نماز سے نکلنا بھی ایک سلام کے ساتھ ہے مگر سنن ثابتہ وارد ہیں۔ مثلاً حضرت ابن مسعود کی حدیث، حضرت وائل بن حجر حضرمی کی حدیث، حضرت عمار کی حدیث، حضرت براء بن عازب کی حدیث، حضرت ابن عمر کی حدیث، حضرت سعد بن ابی وقاص کی حدیث۔۔۔ کہ نبی کریم ﷺ دو سلام پھیرتے تھے (1)۔ ابن جریج، سلیمان بن بلال، عبدالعزیز ابن محمد در اور دی یہ تمام عمرو بن یحییٰ المازنی سے وہ محمد بن یحییٰ حبان سے وہ اپنے چچا واسع بن حبان سے روایت کرتے ہیں، فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر سے کہا: مجھے رسول اللہ ﷺ کی نماز کا طریقہ بتائیں کہ وہ کیسے تھا؟ حضرت عبداللہ بن عمر نے تکبیر کا ذکر کیا جب آپ سر اٹھاتے تھے اور جب بھی سر کو پست کرتے تھے اور دائیں طرف السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور بائیں طرف بھی السلام علیکم ورحمۃ اللہ کا ذکر فرمایا۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ اسناد مدنی صحیح ہے اور مدینہ طیبہ میں مشہور عمل ایک سلام ہے۔ اہل مدینہ یہ عمل نسل در نسل کرتے آرہے ہیں۔ اس کی مثل سے ہر شہر میں عمل کے ساتھ احتجاج صحیح ہے کیونکہ ہر روز کئی مرتبہ واقع ہونے کی وجہ سے وہ عمل مخفی نہیں رہتا۔ اسی طرح کوفہ وغیرہ میں بھی دو سلاموں پر عمل ہے اور یہ ان کے نزدیک متواتر ہے ہر عمل میں جو اس طرح جاری ہو تو وہ مباح میں اختلاف ہوتا ہے جیسے اذان۔ اسی طرح حجاز، عراق، شام اور مصر کے کسی عالم سے ایک سلام اور دو سلاموں کا انکار مروی نہیں بلکہ ان کے نزدیک سلام معروف ہے۔ ایک سلام والی حدیث کو حضرات سعد بن ابی وقاص، عائشہ، انس بن مالک نے روایت کیا ہے مگر وہ معلول ہے محدثین اسے صحیح قرار نہیں دیتے۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی التسلیم فی الصلوٰۃ، صفحہ 39، جلد 1 (وزارت تعلیم)

**مسئلہ نمبر 34:** دارقطنی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: سنت یہ ہے کہ التحیات آہستہ پڑھا جائے۔ حضرت امام مالک نے حضرت عمر کے تشہد کو اختیار فرمایا۔ وہ یہ ہے کہ التحیات للہ الزکیات للہ الطیبات الصلوٰت للہ السلام علیک ایہا النبی ورحمة اللہ وبرکاتہ السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین، اشہدان لا الہ الا اللہ واشہدان محمداً عبداً ورسولہ (1)۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب، لیث بن سعد نے حضرت ابن عباس کا تشہد اختیار کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ ہمیں تشہد سکھاتے تھے جس طرح قرآن کی سورت سکھاتے تھے۔ آپ فرماتے تھے: التحیات المبارکات الصلوٰت الطیبات للہ، السلام علیک ایہا النبی ورحمة اللہ وبرکاتہ السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین، اشہدان لا الہ الا اللہ واشہدان محمداً رسول اللہ (2)۔ ثوری، کوئی علماء اور اکثر اہل حدیث نے حضرت ابن مسعود کا تشہد اختیار کیا ہے جو مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: نماز میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے یہ کہتے تھے: السلام علی اللہ السلام علی فلان، رسول اللہ ﷺ نے ایک دن فرمایا: بے شک اللہ ہی السلام ہے جب تم میں سے کوئی نماز میں بیٹھے تو اس طرح کہے: التحیات للہ والصلوات والطیبات السلام علیک ایہا النبی ورحمة اللہ وبرکاتہ السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین..... جب یہ کہے گا تو ہر عبد صالح کو سلام پہنچ جائے گا جو بھی آسمان اور زمین میں ہوگا..... اشہدان لا الہ الا اللہ واشہدان محمداً عبداً ورسولہ پھر اسے اختیار ہے جو چاہے اللہ تعالیٰ سے سوال کرے (3)۔

امام احمد، اسحاق اور داؤد کا یہی قول ہے۔ احمد بن خالد نے اندلس میں اسی کو اختیار فرمایا اور اسی کی طرف میلان کیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مرفوعاً اور موقوفاً حضرت ابن مسعود کے تشہد جیسا مروی ہے۔ یہ سب اختلاف مباح میں ہے اس میں سے کوئی چیز واجب نہیں الحد للہ وحدہ یہ تمام احکام امام اور مقتدی کے تھے جن کو **وَإِنَّمَا كُنَّا مَعَهُ التَّوَكُّلِينَ** (البقرہ) کا ارشاد اپنے ضمن میں لئے ہوئے تھا اور نماز میں قیام کا ذکر **قَوْمُوا لِلَّهِ فَنَتَبَّحِنَ** (البقرہ) کے تحت آئے گا۔ مریض امام کا حکم اور نماز کے دوسرے احکام بھی وہاں بیان ہوں گے اور امام کے علاوہ مریض کی نماز کا حکم سورہ آل عمران میں آئے گا اور نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کا حکم صلوٰۃ خوف کے ضمن میں آئے گا۔ اور سورہ مریم میں اس امام کا حکم جو مقتدی سے بلند ہو کر نماز پڑھتا ہے اور اس کے علاوہ نماز کے اوقات، اذان، مساجد کے احکامات وغیرہ بیان ہوں گے۔ یہ سب **وَأَقِمْوُ الصَّلَاةَ** کے ارشاد کا بیان ہے۔ سورت کی ابتدا میں نماز کے جملہ احکام بیان ہو چکے ہیں۔

**أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ** (3)  
”کیا تم حکم کرتے ہو دوسرے لوگوں کو نیکی کا اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو حالانکہ تم پڑھتے ہو کتاب کیا تم اتنا بھی

1۔ موا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، صفحہ 72، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 142، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد، حدیث 828، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد فی الصلوٰۃ، صفحہ 173، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)



نہیں سمجھتے۔“

اس میں نو مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ** یہ استفہام ہے اس کا معنی زجر و توبیخ ہے (1) اور اہل تاویل کے نزدیک اس سے مراد علماء یہود ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مدینہ طیبہ کے یہودی اپنے کسی سسرالی رشتہ والے یا کسی قرابت دار یا کسی رضاعی رشتہ دار کو کہتے جو مسلمانوں میں سے ہوتا تو اس دین پر قائم رہ جس پر تو ہے، جس کا تجھے یہ شخص حکم دیتا ہے اس سے ان کی مراد حضرت محمد ﷺ ہوتے۔ کیونکہ اس کا امر حق ہے وہ لوگوں کو اس کا حکم دیتے تھے اور خود ایسا نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہود کے علماء اپنے مقلدین اور اپنے پیروکاروں کو تورات کی پیروی کا حکم دیتے تھے اور حضرت محمد ﷺ کی صفات کے انکار میں تورات کی مخالفت کرتے تھے (2)۔ ابن جریج نے کہا: علماء یہود لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر ابھارتے تھے اور خود گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ ایک گروہ نے کہا: وہ لوگوں کو صدقہ پر ابھارتے تھے اور خود بخل کرتے تھے (3)۔ یہ تمام معانی قریب قریب ہیں۔ بعض اہل اشارات نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا تم لوگوں سے معافی کے حقائق کا مطالبہ کرتے ہو اور تم اس کے نقوش کے ظاہر کی مخالفت کرتے ہو۔

**مسئلہ نمبر 2:** جس شخص کی یہ صفت ہو وہ سخت عذاب میں ہوگا۔ حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس رات مجھے سیر کرائی گئی میں کچھ لوگوں کے اوپر سے گزرا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کانے جارہے تھے۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے کہا: یہ اہل دنیا کے خطباء ہیں لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں حالانکہ یہ کتاب کی تلاوت کرتے ہیں کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے (4) کہا جائے گا: تم کون ہو؟ وہ کہیں گے: ہم وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور اپنے آپ کو بھول جاتے تھے۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث میں اگرچہ کمزوری ہے کیونکہ اس کی سند میں خصب بن محمد رہے امام احمد اسے ضعیف کہتے تھے۔ اسی طرح ابن معین نے یہ حدیث ابو غالب عن ابی امامہ صدی بن عجلان البابی کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔ ابو غالب وہ جس کے بارے میں یحییٰ بن معین نے بیان کیا ہے کہ حذور القرشی مولیٰ خالد بن عبد اللہ بن اسید ہے۔ بعض نے فرمایا: بابلہ کا غلام تھا بعض نے فرمایا: عبد الرحمن حضرمی کا غلام تھا۔ تجارت کے لئے شام میں آتا جاتا تھا۔ یحییٰ بن معین نے کہا: یہ صالح الحدیث ہے۔ مسلم نے اپنی صحیح میں اس حدیث کے ہم معنی حضرت اسامہ بن زید سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائیگا پھر اسے دوزخ میں ڈالا جائے گا پھر جلدی سے اس کے پیٹ سے انٹریاں باہر آجائیں گی وہ ان کے ارد گرد اس طرح گھومے گا جیسے گدھا چکی کے ارد گرد گھومتا ہے، دوزخی لوگ اس پر جمع ہو جائیں گے اور کہیں گے: اے فلاں! تجھے کیا ہوا کیا تو ہمیں نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور برائی سے منع نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا: کیوں نہیں میں نیکی کا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 136، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ ایضاً

4۔ معالم التنزیل، صفحہ 75، جلد 1 (دار الفکر)

3۔ ایضاً، صفحہ 137، جلد 1

حکم دیتا تھا اور خود نیکی نہیں کرتا تھا اور برائی سے منع کرتا تھا لیکن خود برائی سے رکتا نہیں تھا (1) (آگے مصنف نے حدیث کے الفاظ کا مفہوم بیان کیا ہے میں نے وہ حدیث کے ترجمہ میں لکھ دیا ہے) میں کہتا ہوں: یہ حدیث اور آیت کریمہ کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جو نیکی اور بدی کو جانتا ہے اور ہر ایک کے قیام کے وجوب سے باخبر ہے اسے بے علم سے زیادہ سزا ملے گی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی حرمت کی اہانت کرنے والا ہے اور اس کے احکامات کو خفیف سمجھنے والا ہے اور وہ ان لوگوں سے ہے جو اپنے علم سے نفع حاصل نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن اس عالم کو ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے اپنے علم سے نفع نہیں پہنچایا۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 3:** اے قاری! اللہ تجھے توفیق بخشے! جان لے کہ اس آیت میں تو نیکی کے فعل کے ترک کے سبب سے ہے نہ کہ نیکی کے حکم کے سبب ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس قوم کی مذمت فرمائی ہے جو نیک اعمال کا حکم دیتے ہیں اور ان پر خود عمل نہیں کرتے انہیں سخت تو بیخ فرمائی ہے جو قیامت تک سارا زمانہ پڑھی جائے گی۔ فرمایا: **أَتَا مُرُؤْنَ النَّاسِ بِالْإِذْنِ مَنْصُورِ الْفَقِيهِ** نے کہا اور خوب کہا:

ان قوماً يأمروننا بالذي لا يفعلون

لمجانين وان هم لم يكونوا يصرعونا

بے شک ایک قوم ہمیں اس بات کا حکم دیتی ہے جسے وہ خود نہیں کرتے۔ وہ نادان ہیں اگرچہ وہ گرتے نہیں ہیں۔ ابو العتاہیہ نے کہا:

وصفت التقى حتى كانك ذوتنى و ریح الخطايا من ثيابك تسطع  
تو نے تقویٰ کی اس طرح صفت بیان کی حتیٰ کہ یوں لگا کہ تو صاحب تقویٰ ہے جبکہ تیرے کپڑوں سے گناہوں کی بدبو چھائی ہوئی ہے۔

ابو الاسود الدؤلی نے کہا:

لا تنه عن خلق و اتقى مثله عاز عليك اذا فعلت عظيم

وأبدأ بنفسك فانها عن غيها فان اتتهت عنه فانت حكيم

و هناك يقبل ان و عقت و يقتدى بالقول منك و ينفع التعليم

تو ایسے خالق سے منع نہ کر جبکہ خود تو ایسا کرے، جب تو ایسا کرے گا تو تجھ پر یہ بڑی عار ہوگا۔ تو اپنے نفس سے آغاز کر اسے کمرانی سے روک اگر تیرا نفس کمرانی سے رک جائے گا تو تو حکیم ہوگا۔ اس وقت تیری بات قبول کی جائے گی اگر تو وعظ کرے گا اور تیری بات کی اقتدا کی جائے گی اور تعلیم نفع دے گی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب عقوبة من يامر بالمعروف ولا يفعله وينهى عن المنكر ولا يفعله، صفحہ 412، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ نفع الأعمال، حدیث نمبر 28977، صفحہ 187، جلد 10 (مکتبہ التراث الاسلامی)

ابوعمر بن مطر نے کہا: میں ابو عثمان الحیری الزہدی کی مجلس میں حاضر تھا۔ وہ گھر سے باہر آئے اور اس جگہ بیٹھ گئے جہاں وہ وعظ و نصیحت کے لئے بیٹھا کرتے تھے، وہ خاموش بیٹھے رہے حتیٰ کہ ان کی خاموشی لمبی ہو گئی۔ ایک شخص نے انہیں آواز دی جو ابوالعباس کے نام سے مشہور تھے تو اپنے سکوت میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تو ابو عثمان نے یہ شعر پڑھا:

و غیر تقی یا امر الناس بانتقی

طیب یداعوی و الضییب مریض

جو خود غیر متقی ہے وہ لوگوں کو تقویٰ کا حکم دیتا ہے، طیب لوگوں کا علاج کرتا ہے حالانکہ طیب خود مریض ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** ابراہیم النخعی نے کہا: تین آیات کی وجہ سے میں وعظ و نصیحت ناپسند کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ (الایہ)** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ (الصف)** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مَا أُمِرْتُ أَنْ أُخَافَكُمُ إِلَىٰ مَا أَنهَكُم عَنْهُ (ہود: 88)** (میں ارادہ نہیں کرتا کہ میں تمہاری مخالفت کروں جس سے میں تمہیں منع کرتا ہوں)۔

مسلم بن عمرو نے کہا۔

ما أقبح التزهيد من واعظ

لوكان في تزهيده صادقاً

ان رفض الدنيا فيما باله

والرزق مقسوم على من ترى

يزهد الناس ولا يزهد

اضحى وامسئ بيته المسجد

يستمنح الناس ويسترفد

يناله الأبيض والأسود

اس واعظ کا لوگوں کو زہد کی تلقین کرنا کتنا برا ہے جو لوگوں کو زہد کی تلقین کرتا ہے اور خود زہد اختیار نہیں کرتا، اگر وہ زہد کی تلقین میں سچا ہوتا تو صبح و شام اس کا گھر مسجد ہوتا۔ اگر وہ دنیا کو چھوڑ چکا ہوتا تو وہ لوگوں سے عطیہ طلب نہ کرتا اور بخشش نہ مانگتا۔ رزق تقسیم ہو چکا ہے ان لوگوں پر جنہیں تو دیکھتا ہے، سفید اور سیاہ اسے حاصل کر رہا ہے۔

حسن نے مطرف بن عبد اللہ سے کہا: اپنے دوستوں کو نصیحت کرو۔ مطرف نے کہا: میں وہ کہنے سے ڈرتا ہوں جو میں کرتا نہیں۔ حسن نے کہا: اللہ تجھ پر رحم فرمائے، ہم میں سے کون ہے جو وہی کرتا ہے جو وہ کہتا ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ وہ اپنے اس حال کے ساتھ کامیاب ہو جائے، کوئی شخص نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے منع نہ کرے۔ امام مالک نے ربیعہ بن ابی عبد الرحمن سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن جبیر کو یہ فرماتے سنا کہ اگر آدمی نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے منع نہ کرے تاکہ اس میں کوئی ایسی بات نہ پائی جائے تو پھر کوئی نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے منع نہ کرے۔ امام مالک نے فرمایا، انہوں نے سچ فرمایا، کون ہے وہ جس میں ایسی بات نہ ہو (یعنی ہر شخص نیکی کا حکم دیتا ہے اور خود پوری طرح نیکی نہیں کرتا)۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **بِالْبِرِّ** یہاں البر سے مراد طاعت اور عمل صالح ہے۔ البر کا معنی سچائی بھی ہے۔

البر، لومڑی کے بچے کو بھی کہتے ہیں۔ البر، بکریوں کے ہانکنے کو بھی کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں: لا یعرف هراً من ببر یعنی



بکریوں کے چرواہے نہیں جانتے کہ کون بکریوں کو ہانک کر لے گیا ہے (اور اس کا لفظی معنی ہے: وہ بلی اور چوہے میں فرق نہیں کر سکتا) یہ مشترک لفظ ہے۔ شاعر نے کہا:

لا هم رب ان بکراً دونکا  
یترک الناس و یفجرونکا  
”یترک الناس“ سے شاعر نے یہ ارادہ کیا ہے لوگ تجھے عطیہ دیتے ہیں۔  
مابعد شعر میں البکر کا معنی دل ہے۔

اکون مکان البر منه و دونہ  
واجعل مالی دونہ و ادامرہ  
البر با کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی معروف ہے (یعنی گندم) اور با کے فتح کے ساتھ ہو تو اس کا معنی اجلال اور تعظیم کرتا ہے۔ اسی سے ہے ولد بڑو بار یعنی بچہ اپنے والدین کی تعظیم کرتا ہے اور ان کی عزت کرتا ہے۔  
**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَتَّسِبُونَ أَنْفُسَكُمْ اپنے آپ کو ترک کرتے ہیں۔ النسیان (نون کے کسرہ کے ساتھ) اس کا معنی کبھی ترک کرنا ہوتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ (توبہ: 67) (جب انہوں نے بھلا دیا تو اللہ نے انہیں فراموش کر دیا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ (انعام: 44) (جب انہوں نے بھلا دیا اسے جس کے ساتھ نصیحت کی گئی تھی)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَتَّبِعُوا الْفَضْلَ (البقرہ: 237) اور تم آپس میں فضل کو نہ بھولو۔ یہ یاد اور حفظ کا متضاد ہے۔ اسی مفہوم میں حدیث ہے نَبِيُّ آدَمَ فَنَسِيَتْ ذَرِيَّتَهُ (1)، حضرت آدم بھولے تو آپ کی اولاد بھی بھولی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ کہا جاتا ہے: رجل نسيان، کسی چیز کو بہت زیادہ بھولنے والا شخص۔ وقد نسيت الشيء نسياناً (بکسر نون کہے گا) تو نسياناً نہیں کہے گا۔ کیونکہ النسيان، یہ نسا کا تشبیہ ہے جس کا معنی رگ ہے۔

انفس یہ نفس کی جمع ہے اور جمع قلت ہے۔ النفس کا معنی روح بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: خرجت نفسه اس کی روح نکل گئی۔

ابو خراش نے کہا

نجا سالم و النفس منه بشدقہ  
و لم ينج الاجفن سيف و منوراً  
سالم نے نجات پائی جبکہ اس کی سانس اس کے ہونٹ کے کنارے پر تھی اور اس نے تلوار کی میان اور چادر کے ساتھ نجات پائی۔

النفس سے مراد روح ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: اللَّهُ يَتَوَلَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا (الزمر: 42) (اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے روحوں کو جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے)۔

اکثر علماء کے نزدیک اس آیت میں الانفس سے مراد ارواح ہیں۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب من سورۃ الاحراف، حدیث نمبر 3002، 3290، منیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت بلال نے نبی کریم ﷺ سے کہا تھا: اخذ بنفسی یا رسول اللہ الذی اخذ بنفسک۔ (1) میری روح کو بھی اس نے قبض کر لیا جس نے آپ کی روح کو قبض کر لیا۔۔۔۔۔۔ یہ ابن شہاب کی حدیث میں ہے، اور حضرت زید بن اسلم کی حدیث میں ہے: ان الله قبض ارواحنا ولو شاء لردھا الینا فی حین غیر هذا۔۔۔۔۔۔ (2) اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو قبض کر لیا اگر وہ چاہتا تو اس وقت کے علاوہ ہماری طرف انہیں لوٹا دیتا، یہ دونوں روایات امام مالک نے روایت کی ہیں۔ یہ معنی اولیٰ ہے جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے۔ النفس سے مراد خون بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سالت نفسہ اس کا خون بہہ پڑا۔ شاعر نے کہا:

تسیل علی حد السیوف نفوسنا و لیست علی غیر ظلمات تسیل

ہمارے خون تلواروں کی انیوں پر بہتے ہیں، تلواروں کی انیوں کے بغیر یہ بہتے ہی نہیں۔

ابراہیم نخعی نے کہا: مالیس لہ نفس سائلۃ وہ جانور جس کا بننے والا خون نہیں ہوتا وہ پانی میں مرجائے تو وہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ النفس سے مراد جسد بھی ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

نہت ان بنی سحیم ادخلوا ابیاتہم تامور نفس المنذر

مجھے بتایا گیا ہے کہ بنی سحیم نے اپنے گھروں میں منذر کے جسم کا خون داخل کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ جو سمجھے تو اس کے لئے یہ بڑی توفیق ہے۔ تَتْلُونَ کا معنی پڑھنا ہے۔ الْكِتَاب سے مراد تورات ہے۔ جس نے یہود کی طرح عمل کیا وہ ان کی مثل ہے تلاوت کی اصل اتباع ہے۔ اسی وجہ سے یہ قراءت (پڑھنے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ بعض کلام حروف میں بعض کے تابع ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ ترتیب پر ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: تلوته تلواً میں نے اس کی اتباع کی۔ تلوۃ القرآن تلاوة۔ میں نے قرآن کی تلاوت کی۔ تلوۃ الرجل تلواً کسی کو رسوا کرنا۔ التلیۃ اور التلاوة (تاء کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی بقیہ ہے۔ کہا جاتا ہے: تلیت لی من حق تلاوة وتلیۃ یعنی میں نے اپنے لیے اپنے حق سے باقی رکھا۔

اتلیت، ابقیت (میں نے باقی چھوڑا) تتلیت حق۔ میں نے اپنے حق کا پیچھا کیا حتیٰ کہ اسے پورا وصول کر لیا۔ ابو زید نے کہا: تلی الرجل جب انسان زندگی کے آخری سانسوں میں ہو۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَفَلَا تَعْقِلُونَ یعنی تم اپنے نفسوں کو ہلاکت کی جگہوں سے نہیں روکتے۔ العقل کا معنی روکنا ہے، اسی سے عقال البعیر ہے، اونٹ کی رسی جو اسے حرکت سے روکتی ہے۔ العقل کا معنی دیت ہے کیونکہ وہ مقتول کے دلی کو قاتل کے قتل سے روکتی ہے۔ اسی سے ہے: اعتقال البطن واللسان، پیٹ اور زبان کو روکنا۔ اسی وجہ سے قلعہ کو معقل کہا جاتا ہے۔ العقل، یہ جہالت کی نقیض ہے، العقل اس کپڑے کو بھی کہتے ہیں جسے عربوں کی عورتیں بناتی تھیں اس کے ساتھ ہودج کو لپیٹا جاتا تھا۔ علقمہ نے کہا:

عقلاً و رقناً تکاد الطیر تخطفه کأنه من دم اجواف مدموم

سرخ، منقش کینز اقرب تھا پرندے اسے اچک لیتے، گویا وہ پیٹوں کے خون سے سرخ کیا گیا ہے۔

الدموم سے مراد سرخ ہے اور اس شعر میں یہی معنی مراد ہے، اور الدموم سے مراد چربی سے بھرا ہوا اونٹ وغیرہ کو بھی کہتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ دو چادریں ہیں۔ ابن فارس نے کہا: وہ کپڑا جس کا نقش طول میں ہوا سے عقل کہتے ہیں اور جس کا نقش گول ہوا سے رقم کہتے ہیں۔ زجاج نے کہا: عاقل وہ ہے جو اس پر عمل کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر واجب کیا ہے اور جاہل وہ ہے جو احکام الہیہ پر عمل نہ کرے۔

**مسئلہ نمبر 9:** اہل حق کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عقل مخلوق اور موجود ہے نہ وہ قدیم ہے نہ معدوم ہے کیونکہ اگر معدوم ہوتی تو اس کے ساتھ متصف ہونے کے ساتھ بعض ذوات مختص نہ ہوتیں جب اس کا وجود ثابت ہے تو اس کے قدیم ہونے کا قول محال ہے کیونکہ اس بات پر دلیل قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قدیم نہیں ہے جیسا کہ بیان اسی سورت میں اور دوسری سورتوں میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فلاسفہ کا نظریہ یہ ہے کہ عقل قدیم ہے پھر بعض فلاسفہ کہتے ہیں کہ عقل بدن میں ایک جوہر لطیف ہے اس سے اس کی شعائیں پھیلتی ہیں جس طرح گھر میں چراغ کی شعائیں پھیلتی ہیں۔ اس کے ذریعے معلومات کے حقائق کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جوہر بسیط ہے یعنی غیر مرکب ہے پھر اس کے محل کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: عقل کا محل دماغ ہے کیونکہ دماغ حس کا محل ہے۔ بعض فرماتے ہیں: اس کا محل دل ہے کیونکہ دل حیات کا معدن اور حواس کا مادہ ہے۔ عقل کے بارے میں یہ قول کہ یہ جوہر ہے، یہ فاسد ہے اس حیثیت سے کہ جوہر ہم مثل ہوتے ہیں۔ اگر جوہر عقل ہوتا تو ہر جوہر عقل ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا: عقل اشیاء کا ادراک کرنے والی ہے معانی کے حقائق میں سے اشیاء جس پر قائم ہیں۔ یہ قول اگرچہ پہلے قول کے زیادہ قریب ہے، لیکن اس جہت سے درست ہونے سے دور ہے کہ ادراک زندہ کی صفات سے ہے، اور عقل عرض ہے اس سے یہ چیز محال ہے جیسا کہ اس کا ملحد اور مشتبہی ہونا محال ہے۔

شیخ ابوالحسن اشعری، استاذ ابواسحاق اسفرائینی وغیرہما فرماتے ہیں: عقل، علم ہے اس دلیل سے کہ یہ نہیں کہا جاتا: عقلت و ما علمت و ما عقلت (میں نے سمجھا اور جانا نہیں یا میں نے جانا اور سمجھا نہیں) قاضی ابوبکر نے کہا: واجبات کے وجود، جائزات کے جواز اور مستحیلات کے استحالة کے علوم ضرور یہ کا نام عقل ہے، یہ ابوالمعالی نے ”الارشاد“ میں اختیار فرمایا ہے اور ”البرہان“ میں انہوں نے یہ اختیار فرمایا کہ عقل ایک صفت ہے جس کے ذریعے علوم کا ادراک کیا جاتا ہے۔ انہوں نے قاضی کے مذہب پر اعتراض کیا اور قاضی کے مذہب کے فساد پر استدلال کیا۔ ”البرہان“ میں محاسبی سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: عقل ایک فطرت ہے، استاذ ابوبکر نے امام شافعی، ابو عبد اللہ بن مجاہد سے حکایت کیا ہے کہ ان دونوں نے فرمایا: عقل تمیز کا آلہ ہے۔ ابوالعباس القلاسی سے حکایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: عقل تمیز کی قوت ہے۔ محاسبی سے حکایت کیا کہ انہوں نے فرمایا: عقل انوار اور بصائر ہیں پھر ان اقوال کو مرتب کیا اور چند محال پر انہیں معمول کیا۔ فرمایا: اولیٰ یہ ہے کہ یہ نقل امام شافعی اور ابن مجاہد سے صحیح نہیں ہے کیونکہ آلہ تو مثبت چیز میں استعمال ہوتا ہے اور اعراض میں اس کا استعمال مجازاً



ہے۔ اسی طرح جنہوں نے کہا کہ یہ قوت ہے (یہ بھی صحیح نہیں ہے) کیونکہ قوت سے صرف قدرت سمجھی جاتی ہے۔  
قلابی نے جو اطلاق کیا ہے وہ عبارات میں حجاز کی بناء پر ہے، اسی طرح محاسبی کا قول ہے عقل نہ تو صورت ہے نہ نور ہے بلکہ اس کے ذریعے انوار و بصائر کو حاصل کیا جاتا ہے۔ آیت توحید کے تحت اس کے فائدہ کا بیان ان شاء اللہ اسی سورت میں آئے گا۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۝

”اور مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک نماز ضرور بھاری ہے مگر عاجزی کرنے والوں کے لئے نہیں۔“

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ، الصبر کا لغوی معنی روکنا ہے۔ قتل فلان صبراً، فلاں باندھا گیا اور روکا گیا حتیٰ کہ تلف ہو گیا۔ صبرت نفس علی الشیء میں نے اپنے آپ کو اس کام پر روکا۔ المصبرۃ۔ وہ جس سے منع کیا گیا ہو۔ حدیث میں اس سے مراد وہ جانور ہے جو موت پر روکا گیا ہو، اسی کو المصبرۃ بھی کہتے ہیں۔ عشرہ نے کہا:

فصبرت عارفة لذالك حرة ترسو اذا نفس الجبان تطلعم

میں نے اس وجہ سے آزاد عارفہ سے اپنے آپ کو روکا جو ٹھہری ہوئی تھی جبکہ بز دل کا نفس جھانک رہا تھا۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ نے اطاعت پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے اور کتاب اللہ میں مخالفت سے رکے رہنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: واصبروا۔ کہا جاتا ہے: فلان صابر عن المعاصی جب کوئی گناہوں سے بچے اور طاعت پر قائم رہے، جو کچھ صبر کے بارے میں کہا گیا اس میں سے یہ قول بہتر ہے۔ نحاس نے کہا: جو مصیبت پر صبر کرے اسے صابر نہیں کہا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے صابر علی کذا، اس پر صبر کرنے والا ہے۔ جب مطلق صابر کہا جائے تو پھر اس کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّمَا يُؤَيِّتُ الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (الزمر)

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالصَّلَاةُ تمام عبادات میں سے الصَّلَاةُ (نماز) کو خاص طور پر ذکر فرمایا اس کے ذکر کی بلندی کے لئے۔ نبی کریم ﷺ کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو آپ نماز کی طرف پناہ لیتے۔ اسی سے وہ روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس کو ان کے بھائی قثم کی موت کی خبر دی گئی..... بعض نے فرمایا: ان کی بیٹی کی موت کی خبر دی گئی..... جبکہ وہ سفر میں تھے تو انہوں نے إِنْ شَاءَ اللَّهُ وَإِنَّا إِلَيْهِ لَارْجِعُونَ پڑھا اور کہا یہ پوشیدہ چیز تھی اللہ تعالیٰ نے اسے ڈھانپ دیا۔ یہ مؤنث تھی اللہ تعالیٰ نے اس کی کفایت فرمائی یہ اجر ہے جو اللہ تعالیٰ نے بھیجا۔ پھر راستہ سے ایک طرف ہو گئے اور نماز پڑھی۔ پھر اپنی سواری کی طرف واپس آئے اور یہ پڑھ رہے تھے وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ اس تاویل پر نماز سے مراد شریعت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لغت میں اپنے عرف پر اس کا معنی دعا ہے۔ پس اس تاویل پر یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مشابہ ہوگی إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاشْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ (انفال: 45)

کیونکہ ثبات سے مراد صبر ہے۔ ذکر سے مراد دعا ہے اور تیسرا قول مجاہد نے کیا اس آیت میں الصبر سے مراد روزہ ہے، اسی

وجہ سے رمضان کو شہر الصبر کہا جاتا ہے۔ پس اس قول کی مناسبت سے روزہ اور نماز مناسب ہیں کیونکہ روزہ شہوات سے روکتا ہے اور دنیا میں عدم دلچسپی پیدا کرتا ہے نماز برائیوں اور منکرات سے روکتی ہے اس میں خشوع کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس میں قرآن پڑھا جاتا ہے جو قرآن آخرت کی یاد دلاتا ہے (1)۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4:** اذیتوں پر صبر کرنا اور طاعات پر صبر کرنا یہ نفس کے جہاد سے ہے اور نفس کی شہوات کو ختم کرنے اور لالچ سے اسے روکنے کے باب سے ہے۔ یہ انبیاء کرام اور صالحین کے اخلاق میں سے ہے۔ یحییٰ بن الیمان نے کہا: صبر یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمایا اس کے علاوہ کی تمنانہ کر اور رضایہ ہے تو اپنی دنیا و آخرت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی ہو۔ شعبی نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: صبر کا ایمان سے اس طرح کا تعلق ہے جو سر کا تعلق جسم سے ہے۔ طبری نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان دل کی معرفت، زبان کے اقرار اور عمل بالجوارح کا نام ہے جو عمل بالجوارح پر صبر نہیں کرتا وہ ایمان کے اطلاق کا مستحق نہیں ہوتا اور عمل بالشرائع پر قائم رہنا بالکل ایمان کے ساتھ اس کا وہی تعلق ہے جو سر کا جسم کے ساتھ تعلق ہے کہ انسان کا جسم مکمل نہیں ہوتا مگر یہ کہ سر موجود ہو۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ نے اعمال کی جزا کا ذکر فرمایا اور اعمال کے لئے جزا کی ایک حد ذکر فرمائی۔ فرمایا: مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتَالِهَا (انعام: 160) (جو کوئی لائے گا ایک نیکی تو اس کے لئے دس ہوں گی) اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کی جزا سے زیادہ بیان فرمائی۔ فرمایا: مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ (البقرہ: 261) (مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں ایسی ہے جیسے ایک دانہ) اور صبر کرنے والوں کا اجر بغیر حساب کے بنایا۔ اور صبر کرنے والوں کی مدح بیان فرمائی، فرمایا: اِثْمَانِيُو فِي الصُّبُوْدُنْ اَجْرُهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (الزمر: 40) (صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا)۔ اور فرمایا: وَلَكِنْ صَبَرُوْا غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَهِيَ عَزْمُ الْمُؤْمِنِيْنَ (الشوریٰ: 42) (اور جو شخص (ان مظالم پر) صبر کرے اور (طاقت کے باوجود) معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے)۔

بعض علماء نے فرمایا: اِثْمَانِيُو فِي الصُّبُوْدُنْ (الزمر: 10) میں صابرین سے مراد روزے دار ہیں کیونکہ صحیح سنت سے نبی کریم ﷺ سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد مروی ہے، الصیام لی وانا اجزی بہ (2) (روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا) روزے کا ثواب ذکر نہیں فرمایا جس طرح کہ صبر کی جزا ذکر نہیں فرمائی۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 6:** صبر کی فضیلت..... اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف صبر سے بیان فرمایا جیسا کہ حضرت ابو موسیٰ کی حدیث میں ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے بیان فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لیس احدًا ولیس شیء اصبر علی اذی سبعة من اللہ تعالیٰ انہم لیدعون له ولدًا وانه لیعافیہم ویرزقہم (3)۔ (اللہ تعالیٰ سے کوئی اذیت پر زیادہ صبر کرنے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 137، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 254، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصوم، باب فضل الصوم، حدیث 1761، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، ایضاً، صفحہ 801، جلد 2۔ ایضاً، کتاب الادب، باب الصبر علی الاذی، حدیث 5634، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والا نہیں جسے وہ سنتا ہے، مشرک لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹا ہونے کا قول کرتے ہیں لیکن پھر وہ انہیں عافیت بھی دیتا ہے اور انہیں رزق بھی دیتا ہے۔) اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے صبر کے ساتھ وصف بیان فرمایا تو صبر سے مراد حلم ہے اور حلم سے متصف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سزا کے مستحقین کو فوری سزا نہیں دیتا اس میں تاخیر فرماتا ہے..... اور اللہ تعالیٰ کا صبر کے ساتھ موصوف ہونا قرآن میں وارد نہیں ہے بلکہ حدیث حضرت ابو موسیٰ میں وارد ہے اہل سنت نے صبر کی تاویل حلم سے کی ہے یہ ابن فورک وغیرہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں المصور کا لفظ آیا ہے یہ مجرموں سے حلم میں مبالغہ کے اظہار کے لئے ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ** ضمیر کے مرجع میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مرجع صرف خاص طور پر نماز ہے کیونکہ یہ نفس پر اتنی بھاری ہوتی ہے جتنا روزہ بھاری نہیں ہوتا، یہاں صبر سے مراد روزہ ہے اور نماز میں نفس کی قید ہے اور روزہ میں شہوت کو ختم کرنا ہے۔ پس جو ایک شہوت سے یا دو شہوتوں سے روکا ہوا ہے وہ (۲۱) شخص کی مانند نہیں جو تمام شہوات سے روکا گیا ہے۔ پس روزہ دار کو عورتوں، کھانے اور پینے کی شہوت سے روکا جاتا ہے پھر تمام شہوات کلام، چلنے اور مخلوق سے ملنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں پھر ان اشیاء کی وجہ سے وہ تسلی پاتا ہے جن سے اسے روکا گیا ہوتا ہے، جبکہ نمازی ان تمام شہوات سے رکتا ہے، اس کے تمام اعضاء نماز کے ساتھ مقید ہوتے ہیں اور تمام شہوات سے دور ہوتا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو نماز نفس پر زیادہ بھاری اور مشکل ہوئی، اسی وجہ سے فرمایا: یہ بہت بھاری ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: **إِنَّهَا** کی ضمیر سے مراد دونوں (صبر اور نماز) ہیں لیکن اغلب سے کنایہ فرمایا اور وہ نماز ہے جیسے ارشاد فرمایا: **وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَفْقَهُوا نَفْعًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ** (توبہ: 34) (اور جو لوگ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا، چاندی اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں۔)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِذَا مَرَأُوا اتِّجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا** (الجمعة: 11) (جب دیکھا کسی تجارت یا تماشا کو تو اس کی طرف گئے) پہلی آیت میں ضمیر کو الفضة کی طرف لوٹایا کیونکہ وہ اغلب اور اعم ہے، اور دوسری آیت میں تجارت کی طرف لوٹایا کیونکہ وہ افضل اور اہم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: صبر چونکہ نماز میں داخل ہے اس لئے ضمیر نماز کی طرف لوٹا دی جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے **وَاللَّهُ دَرَسُؤْلُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ** (توبہ: 62) اس آیت میں لم یرضوہا نہیں فرمایا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا میں داخل ہے۔ اسی طرح شاعر نے کہا:

ان شعر الشباب والشعر الاسو د ما لم يعاص كان جنونا

اس شعر میں لم يعاصیا نہیں فرمایا اور ضمیر شباب کی طرف لوٹا دی کیونکہ شعر اس میں داخل ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر ہر ایک کی طرف لوٹائی لیکن اختصاراً حذف کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً** (مومنون: 50) اس آیت میں آیتیں نہیں فرمایا اسی طرح شاعر کا قول ہے:

فمن يك آمنى بالمدينة رحله فأنى و قتيار بها لغريب



اور ایک شاعر نے کہا:

لکل هم من الهموم سعه والصبح واليسى لا فلاح معه

پہلے شعر میں لغریب سے مراد لغریبان ہے اور دوسرے شعر میں لا فلاح معہا مراد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع عبادت ہے جو معنی کے اعتبار سے صبر اور صلاۃ کے ذکر کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع مصدر ہے، اور وہ الاستعانة ہے جس کا تقاضا استعینوا ارشاد کر رہا ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع حضرت محمد ﷺ کی اجابت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ جس چیز کی طرف بلاتے تھے ان میں سے صبر اور صلاۃ بھی ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع کعبہ ہے کیونکہ نماز کا حکم اس کی طرف ہے۔ کبیرۃ سے مراد بھاری اور مشکل ہے اور یہ (ان) کی خبر ہے، غیر قرآن میں وانه لکبیرۃ بھی جائز ہے۔ اِلَّا عَلَى الْخُشُوعِ مگر ڈرنے والوں پر نماز خفیف (ہلکی) ہے۔ ارباب المعانی نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ مگر جن کی ازل میں اجتناء اور ہدایت کے خصائص کے ساتھ تائید کی گئی ان پر بھاری نہیں۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عَلَى الْخُشُوعِ، خاشعون جمع ہے خاشعہ کی اس سے مراد تواضع کرنے والا ہے اور الخشوع نفس کی اس ہیئت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے اعضاء میں سکون اور تواضع ظاہر ہوتی ہے۔ قتادہ نے کہا: خشوع دل میں ہوتا ہے، وروہ نماز میں خوف اور آنکھوں کو جھکانا ہے۔ زجاج نے کہا: الخاشع وہ ہے جس پر خشوع اور ذلت کا اثر دکھائی دے جیسے خشوع الدار بعد الاقواء، یہ اصل ہے۔ نابغہ نے کہا:

رماد ككحل العين لآيا أبينة وثوبى كجذب الحوض اثلثم خاشع

مکان خاشع ایسا مکان جس کے لئے رہنمائی نہ پائی جاسکے۔ خشعت الاصوات، یعنی آواز ساکن ہو گئیں۔

خشعت خراشی صدرہ۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب سینہ سے لیس دار تھوک باہر پھینکے۔ خشع لبصرہ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی اپنی نظر کو جھکا دے۔ الخشعة، زمین کا نرم ٹکڑا۔ حدیث پاک میں ہے: کانت خشعة علی الباء ثم دحیت بعد، کعبہ پانی پر ایک نرم ٹکڑا تھا پھر بعد میں اس سے زمین پھیلائی گئی۔ بلدة خاشعة ایسا شہر جو غبار آلود ہو اس میں کوئی اترنے والا نہ ہو۔ سفیان ثوری نے کہا: میں نے اعمش سے خشوع کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اے ثوری! تو لوگوں کا امام بننا چاہتا ہے اور تو خشوع کو نہیں جانتا۔ میں نے ابراہیم نخعی سے خشوع کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اے اعمش! تو لوگوں کا امام بننا چاہتا ہے اور تو خشوع بھی نہیں جانتا۔ خشوع موٹی خوراک کھانا، موٹا لباس پہننا اور سر جھکانا نہیں ہے بلکہ خشوع یہ ہے کہ تو شریف اور گھٹیا کو حق میں برابر دیکھے اور ہر اس فرض کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو تجھ پر فرض ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے ایک نوجوان کو دیکھا وہ سر جھکائے ہوئے تھا۔ حضرت عمر نے فرمایا: اے فلاں! اپنا سراٹھا کیونکہ خشوع اس سے زائد نہیں ہوتا جو دل میں ہوتا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خشوع دل میں ہوتا ہے تو اپنے ہاتھوں کو مسلم آدمی کے لئے نرم کرے اور تو نماز میں ادھر ادھر متوجہ نہ ہو۔ یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے تحت اچھی طرح آئے گا: قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خُشِعُونَ ۝ (مومنوں) جس نے لوگوں کے لئے اس سے

زیادہ خشوع ظاہر کیا جو اس کے دل میں ہے تو اس نے نفاق پر نفاق ظاہر کیا۔ حضرت سہل بن عبد اللہ نے کہا: خاشع اس وقت تک نہیں ہوگا حتیٰ کہ ہر بال اس کے جسم پر خشوع کا اظہار کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَقَشَّعُ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (الزمر: 23)

میں کہتا ہوں: یہ خشوع محمود ہے، کیونکہ خوف جب دل کو لاحق ہوتا ہے تو ظاہر خشوع کو ثابت کرتا ہے، ایسا شخص ظاہری خشوع کو دور کرنے کا مالک نہیں ہوتا، تو اسے دیکھے گا وہ سر جھکائے ہوئے متادب اور متذلزل ہوگا۔ نیک لوگ اس قسم سے جو ان پر ظاہر ہوتا تھا اسے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ مذموم خشوع وہ ہے جس میں تکلف ہوتا ہے، جان بوجھ کر رونا اور سر جھکانا ہوتا ہے جیسا کہ جبلاء کرتے ہیں تاکہ انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جائے، یہ شیطان کا دھوکا ہے اور انسان کے نفس کا فریب ہے۔ حضرت حسن نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر بن خطاب کے پاس سانس لیا گویا وہ پریشان ہے۔ حضرت عمر نے اسے مکا مارا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بولتے تھے تو اپنی آواز سناتے تھے، جب چلتے تھے تو تیز چلتے تھے جب مارتے تھے تو سخت مارتے تھے آپ سچے احکام پر عمل کرنے والے تھے اور سچا خشوع رکھنے والے تھے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: الخاشعون سے مراد سچے مومن ہیں۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا سَرَاتِهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿٥٣﴾

”جو یقین کرتے ہیں کہ وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب سے اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ، الَّذِينَ مَحَل جَرِّ میں ہے کیونکہ یہ خاشعین کی صفت ہے اور قطع کے اعتبار سے اس کو محل رفع میں کرنا بھی جائز ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک یہاں ظن بمعنی یقین ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَّةٍ ﴿٥٣﴾ (الحاقہ) (مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو پہنچوں گا) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: النَّاسَ فَظَنُّوا أَنَّهُمْ مُوَاعِقُونَ (الكهف: 53) (وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں)۔

درید بن الصممہ نے کہا:

قللت لهم ظنوا بالفی مدجج سراتهم فی الفارسی المستند (1)

شاعر نے یہاں ظن بمعنی یقین استعمال کیا ہے۔

ابوداؤد نے کہا:

رُبُّهُمْ فَرَجَتْهُ بَغْرِيمٌ وَ غِيُوبٌ كَشَفَتْهَا بَظُنُونٌ

یعنی میں نے کتنے ہی غیوب کو یقین کے ساتھ کھولا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس آیت میں ظن اپنے معنی میں صحیح ہے۔ کلام میں ان کے گناہوں کو چھپایا گیا ہے گویا وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی توقع رکھتے ہیں حالانکہ وہ گنہگار ہیں۔ یہ مہدوی اور ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تعسف ہے۔

فراء نے کہا: ظن کبھی جھوٹ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بصری علماء اس معنی کو نہیں جانتے۔ ظن کی اصل اور اس کا فائدہ ”شک ہونا“ ہے جبکہ اپنے معتقدات میں سے کسی ایک کی طرف میلان ہو۔ کبھی ظن یقین کے معنی میں ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت اور دوسری آیات میں ہے لیکن جو امر حس کی طرف نکلے اس کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً عرب جو شخص دکھائی دے رہا ہو موجود ہو اس کے لیے یہ نہیں کہتے اظن هذا انساناً، تو اس کا استعمال اس صورت میں پائے گا جو ابھی حس کے دائرے میں نہ ہو۔ جیسا کہ اس آیت اور شعر میں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الَّذِينَ فَطَنُوا أَتَاهُمْ مَوَاقِعُهَا (الکہف: 53)** کبھی یقین بمعنی ظن ہوتا ہے۔ اس کا بیان سورت کے آغاز میں ہو چکا ہے۔ تو کہتا ہے: سَوَّيْتُ لَكُمُ الْوَسْطَانِ، واسات به الظن (میں نے اسے براگمان کیا) جب معرف باللام ہو تو الف داخل کراتے ہیں اور **فُطِنُوا** انہیں سے مراد ہے جزاء رہیم بعض علماء نے فرمایا: یہ باب مفاعله ہے حالانکہ یہ عمل ایک طرف سے ہے۔ (فرمایا) یہ اس طرح ہے: عَافَاہُ اللہ۔ **أَتَاهُمْ** ہمزہ کے فتح کے ساتھ ہے اس کا پہلے ان پر عطف ہے اور قطع کے اعتبار سے اس پر کسرہ پڑھنا بھی جائز ہے **إِلَيْهِ** سے مراد الی رہیم ہے بعض نے فرمایا الی جزاء ہے۔ **لَمَّا جُؤْنَ** یہ دوبارہ اٹھنے، جزا اور ملک اعلیٰ کے سامنے پیش ہونے کا اقرار ہے۔

**يَبْنِيْ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ كُرُوْا نِعْمَتِيْ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ تَنْكُرُوْنَ**

”اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ میں نے فضیلت دی تھی تمہیں سارے جہان والوں پر۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يَبْنِيْ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ كُرُوْا نِعْمَتِيْ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ** اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ **وَاَنْتُمْ تَنْكُرُوْنَ** علی العلمین اس سے مراد ان کے اپنے زمانہ کے لوگ ہیں اور ہر زمانہ کے لوگ ایک عالم ہیں۔ بعض نے فرمایا: تمام لوگوں پر فضیلت مراد ہے کیونکہ ان میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء بنائے، یہ ان کا خاصہ ہے۔ دوسروں کے لئے یہ شرف نہیں۔

**وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ**

**مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ**

”اور ڈرو اس دن سے جب نہ بدلہ دے سکے گا کوئی شخص کسی کا کچھ بھی اور نہ قبول کی جائے گی اس کے لئے سفارش اور نہ لیا جائے گا اس سے کوئی معاوضہ اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا** یہ امر ہے اور اس کا معنی وعید ہے، تقویٰ پر کلام پہلے گزر چکا ہے۔ **يَوْمًا** سے مراد اس دن کا عذاب اور ہول ہے۔ اس سے مراد قیامت کا دن ہے، **يَوْمًا** کی نصب **اتَّقُوا** کی وجہ سے ہے، غیر قرآن میں یوم لا تجزی اضافت کے ساتھ بھی جائز ہے۔ کلام میں حذف ہے اس میں نحو یوں کا اختلاف ہے۔ بصریوں نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: **يَوْمًا لَا تَجْزِيْ فِيْهِ نَفْسٌ بِمَرْفُوعِهِ** کو حذف کیا گیا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

و یوما شہدناہ سلیماً و عامراً



اس دن سلیم اور عامر قبیلوں میں حاضر تھے۔

اصل میں شہدنا فیہ تھا۔ کسائی نے کہا: یہ خطا ہے فیہ کا حذف جائز نہیں لیکن تقدیر اس طرح ہے: و اتقوا یوما لا تجزیہ نفس تھا پھر ضمیر کو حذف کیا گیا اور ضمیر کا حذف کرنا جائز ہے کیونکہ ظروف کا ان کے نزدیک حذف کرنا جائز نہیں ہے اور فرمایا: یہ کہنا جائز نہیں ہے: هذا رجلاً قصدت ولا رایت رجلاً ارغب۔ جبکہ تیری مراد یہ ہو قصدت الیہ و ارغب فیہ۔ فرمایا: اگر یہ جائز ہوتا تو یہ بھی جائز ہوتا: الذی تکلمت زید۔ یعنی تکلمت فیہ زید۔ فراء نے کہا: ضمیر اور فیہ کا حذف کرنا جائز ہے۔ مہدوی نے حکایت کیا ہے کہ سیبویہ، انخفش اور زجاج کے نزدیک دونوں وجہیں جائز ہیں۔

لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے کے گناہ کی وجہ سے کسی سے مواخذہ نہ ہوگا اور کوئی نفس دوسرے کا دفاع نہیں کر سکے گا۔ جزی عنی هذا الامر جزی جیسے تو کہتا ہے قضی عنی۔ واجتزأت بالشیء اجتزاء کہا جاتا ہے جب تو کسی کی کفایت کرے۔ شاعر نے کہا:

فان الغدر فی الاقوام عارٌ وان الحرام یجزء بالکرام

اقوام میں غدر عار ہے، بے شک آزاد شخص جانور کے بازو پر کفایت کرتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: اذا اجريت الماء على الماء جزئ عنك۔ جب تو پیشاب کے اوپر پانی بہا دے گا تو اس پر مکان کی طہارت کا حکم جاری ہوگا تجھے اس جگہ کو دھونے کی ضرورت نہیں اور کپڑے وغیرہ کے ساتھ پانی کو خشک کرنے کی ضرورت نہیں جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہیں۔ ابو بردہ بن نیار سے قربانی کے بارے میں صحیح حدیث میں ہے لن تجزی عن احد بعدك (1)۔ یعنی تیرے علاوہ کسی کے لئے بکری کا چھوٹا بچہ کفایت نہیں کرے گا۔ لَا تَجْزِي کا معنی لا تقضی، لا تغنی اور لا تکفی ہے۔ یعنی وہ ادا نہیں کرے گا، فائدہ نہیں دے گا اور کفایت نہیں کرے گا اگر اس پر کسی کا حق نہ ہوگا اگر اس پر کسی کا حق ہوگا تو وہ اس کی نیکیوں کے اختیار کے بغیر کفایت کرے گا اور ادا کرے گا اور فائدہ دے گا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اپنے بھائی پر اس کی عزت وغیرہ کے سلسلہ میں ظلم کیا ہو وہ آج ہی اس سے معاف کرا لے اس سے پہلے کہ نہ کوئی دینار ہوگا اور نہ درہم ہوگا، اگر اس کا عمل صالح ہوگا تو اس کے ظلم کی مقدار اس سے عمل صالح لیا جائے گا اگر اس کی نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کے گناہوں میں سے گناہ لے کر ظالم کے نامہ اعمال میں داخل کیے جائیں گے (2)۔ یہ حدیث بخاری نے نقل کی ہے اس کی مثل مفلس کے بارے میں حدیث ہے۔ ہم نے ”تذکرہ“ میں ذکر کر دی ہے۔ اسے مسلم نے تخریج کیا ہے اسے تجزئ تاء کے ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ جزی اور اجزی کا معنی ایک ہے۔ بعض نے ان کے درمیان فرق کیا ہے انہوں نے کہا: جزی بمعنی قضی ہے کافاً اور اجزی بمعنی اغنی و کفی ہے۔ اجزانی الشیء یجزئنی یعنی کفائی اس نے میری کفایت کی۔ شاعر نے کہا:

1۔ صحیح بخاری، کتاب العیدین، باب الاکل یوم النحر، حدیث نمبر 902، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب القصاص یوم القیامہ، حدیث نمبر 6053، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لواجزأت امر العالمین ولم یکن لیجزی الا کامل و ابن کامل

تو نے تمام لوگوں کے معاملات کی کفایت کی اور کوئی کفایت نہیں کرتا سوائے کامل اور ابن کامل کے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ، شَفَاعَةٌ، شَفَعٌ سے مشتق ہے جس کا معنی دو ہے۔ تو کہتا ہے: کان و ترأفشفعتہ شفعاً وہ طاق تھا میں نے اسے جفت بنا دیا۔ اسی سے الشفعہ ہے کیونکہ اپنے شریک کی ملک کو اپنی ملک سے ملا دیتا ہے۔

الشفیع، شفعہ کرنے والے کو کہتے ہیں اور شفاعت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ ناقة شافع ایسی اونٹنی جس کا حمل اور بچہ متواتر جمع ہو جائیں۔ تو کہتا ہے: شفعت الناقة شفعاً۔ ناقة شفعوم اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک ہی مرتبہ دوہنے میں دو برتن بھرنے والی ہو۔ استشفعتہ الی فلان یعنی میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ میری اس کے پاس سفارش کرے۔ تشفعت الیہ فی فلان فشفعنی۔ میں نے اسے فلاں کے پاس سفارش کرنے کے لئے کہا تو اس نے میری سفارش کی۔ پس شفاعت تب ہوگی جب تیرا غیر تیرے مرتبہ اور تیرے وسیلہ کے ساتھ ملے۔ یہ حقیقت میں جس کے پاس سفارش کی گئی ہے اس کے پاس شفیع کی منزلت و مرتبہ کا اظہار ہے اور اس کی منفعت مشفوع (جس کی سفارش کی گئی ہے) کو پہنچاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت حق ہے۔ معتزلہ نے اس کا انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں: گنہگار مومنین جو آگ میں داخل ہوں گے وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے لیکن اخبار ظاہر میں ہے کہ موحّدین گنہگار انبیاء کرام کی امتوں میں سے ہوں گے انہیں ملائکہ، انبیاء، شہداء اور صالحین میں سے سفارش کرنے والوں کی سفارش پہنچے گی۔ قاضی نے معتزلہ کا رد کرتے ہوئے دو چیزوں سے استدلال کیا ہے: (۱) وہ اخبار جو معنی میں متواتر ہیں۔ (۲) ان اخبار کے قبول کرنے پر سلف کا اجماع۔ کسی بھی زمانہ میں کسی شخص سے ان احادیث کا انکار ظاہر نہیں ہوا۔ شفاعت پر مبنی روایات اور ان کی صحت اور قبولیت پر علماء کا اتفاق، اہل حق کے عقیدہ کی صحت اور معتزلہ کے دین کے فساد پر قطعی دلیل ہے۔

اگر وہ کہیں کہ کتاب اللہ میں ایسی نصوص وارد ہیں جو ان اخبار کو رد کرتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَیْثُمْ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ⑤ (غافر) (نہ ہوگا ظالموں کے لئے کوئی دوست نہ ایسا سفارشی جس کی سفارش مانی جائے) وہ کہتے ہیں: گناہ کبیرہ کرنے والے ظالم ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا یُجْزِیْهِ (النساء: 123) (جو عمل کرے گا برے اسے سزا ملے گی) وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (البقرہ: 48) (اس سے شفاعت قبول نہ کی جائے گی) ہم کہتے ہیں: یہ آیات ہر ظالم کے لئے عام نہیں ہیں اور عموم کے لئے وضع نہیں ہے اور یہ آیات ہر برے عمل کرنے والے اور ہر نفس کے لئے نہیں ہیں ان سے مراد کافر لوگ ہیں نہ کہ مومنین۔ اس کی دلیل وہ اخبار ہیں جو شفاعت کے متعلق وارد ہیں، نیز اللہ تعالیٰ نے بعض اقوام کے لئے شفاعت کو ثابت کیا ہے اور بعض اقوام سے شفاعت کی نفی کی ہے۔ کافروں کی صفت میں فرمایا: ⑥ تَقَعُّهُمْ شَفَاعَةُ الشُّفَعَاءِ ⑦ (مدثر) (اور نہ نفع دے گی انہیں سفارش کرنے والوں کی سفارش) اور فرمایا: وَلَا یُشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ (الانبیاء: 28) (اور سفارش نہیں کریں گے مگر اس کیلئے جسے وہ پسند فرمائے) اور فرمایا: وَلَا تَقْعَمُ الشَّفَاعَةُ

عُنْدَكَ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ (سبا: 23) (اور نہ نفع دے گی سفارش اس کے ہاں مگر جس کے لئے اس نے اجازت دی ہو) ہم نے ان تمام آیات سے جان لیا کہ شفاعت مومنوں کو نفع دے گی کافروں کو نفع نہ دے گی اور مفسرین کا اجماع ہے کہ اَتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ سے مراد نفس کافرہ ہے نہ کہ ہر نفس، اگر ہم ہر ظالم گنہگار کے لئے عذاب کے عموم کا قول کریں بھی تو ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ اس کی دلیل وہ اخبار ہیں جو ہم نے روایت کی ہیں اور دوسری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَيَعْفُو مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (النساء: 48) (اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّهُ لَا يَأْتِيَنَّكَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا الْخَيْرُ (يوسف: 23) (یوسف) (بلاشبہ مایوس نہیں ہوتے رحمت الہی سے مگر کافر لوگ۔)

اگر وہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ (الانبیاء: 28) اور فاسق پر تو رضا نہیں ہوتی۔ ہم نہیں گے: اللہ تعالیٰ نے لمن لا یرضی نہیں فرمایا بلکہ لمن اُذِنَ (الانبیاء: 28) فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جن کے لئے شفاعت کو پسند کرے گا وہ توحید پرست ہوں گے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا (مریم) (انہیں کوئی اختیار نہیں ہوگا شفاعت کا بجز ان کے جنہوں نے خداوند رحمن سے کوئی وعدہ لے لیا ہے) نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق سے کیا عہد ہے؟ فرمایا: وہ ایمان لائیں اور اس کے ساتھ کسی کو ریک نہ ٹھہرائیں (1)۔ مفسر نے کہا: مگر جس نے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہا۔ اگر وہ کہیں کہ جس پر اللہ راضی ہوتا ہے وہ توبہ کرنے والا ہے جس نے اللہ کی بارگاہ میں لوٹنے کا عہد کیا اس کی دلیل یہ ہے کہ فرشتے ان کے لئے مغفرت کرتے ہیں۔ اور فرمایا: فَأَعْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ (غافر: 7) (بخش دے انہیں جنہوں نے (کفر سے) توبہ کی ہے اور پیروی کی ہے تیرے راستہ کی) اسی طرح انبیاء کرام کی شفاعت توبہ کرنے والوں کے لئے ہے اہل کبار کے لئے نہیں ہے۔ ہم کہیں گے: تمہارے نزدیک اللہ پر توبہ قبول کرنا واجب ہے جب اللہ تعالیٰ گنہگار کی توبہ قبول کرے گا تو شفاعت اور استغفار کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ اہل تفسیر کا اس بات پر اجماع ہے کہ فَأَعْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا (غافر: 7) سے مراد یہ ہے کہ ان کی مغفرت مہربانوں نے شرک سے توبہ کی وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ (غافر: 7) یعنی مومنین کے راستہ کی اتباع کی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ ان کی مغفرت کرے ان کے گناہوں سے نہ کہ شرک سے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَعْفُو مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (النساء: 48) (اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے۔) اگر وہ کہیں کہ ساری امت نبی کریم ﷺ کی شفاعت میں رغبت رکھتی ہے، اگر یہ اہل کبار کا خاصہ تھی تو ان کا سوال باطل ہوا۔

ہم کہیں گے ہر مسلمان رسول اللہ ﷺ کی شفاعت طلب کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے رغبت رکھتا ہے کہ اسے شفاعت نصیب ہو کیونکہ ہر شخص کا عقیدہ ہے کہ وہ گناہوں سے سلامت نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر جو فرض کیا ہے وہ اسے پوری طرح ادا کرنے والا نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے بارے میں نقص کا معترف ہے اسی وجہ سے ہر شخص سزا سے ڈرتا ہے اور



نجات کی امید رکھتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص نجات نہیں پائے گا مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! ﷺ آپ بھی بغیر رحمت الہیہ کے نجات نہیں پائیں گے؟ فرمایا: ”میں بھی نجات نہیں پاؤں گا مگر مجھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ڈھانپ دیا ہے (1)۔“

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا يُقْبَلُ** ابن کثیر اور ابو عمرو نے تقبل تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ شفاعت مؤنث ہے۔ باقی قراء نے مذکر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ شفاعت بمعنی شفع ہے۔ انفس نے کہا: تذکیر (مذکر کا صیغہ) بہتر ہے کیونکہ تو نے فعل اور فاعل کے درمیان فرق کیا ہے جس طرح کہ پیچھے **فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ** (البقرہ: 37) میں گزرا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا يُوْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ**، **عَدْلٌ** سے مراد فدیہ ہے۔ **العدل** عین کے فتح کے ساتھ ہو تو اس کا معنی الفداء ہے اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی المثل ہے۔ کہا جاتا ہے: **عَدْلٌ** و **عَدِيلٌ** اس لئے بولا جاتا ہے جو وزن اور مقدار میں تیری مثل ہو۔ کہا جاتا ہے: **عدل الشيء** جو چیز قدر و قیمت میں دوسری چیز کے مساوی ہو اگرچہ اس کی جنس سے نہ بھی ہو۔ **العدل** (عین کے کسرہ کے ساتھ) جو چیز اپنی جنس سے دوسری چیز کے مساوی ہو اور جسم میں مساوی ہو۔ طبری نے حکایت کیا ہے عرب عین کے کسرہ کے ساتھ فدیہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں (2) اور اعدال کا واحد **عَدْلٌ** ہی ہے (یعنی عین کے کسرہ کے ساتھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ** ⑤ یعنی ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ **النصر** کا معنی العون (مدد) ہے۔ **الانصار**، **الاعوان**۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: **مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ** (آل عمران: 52) یعنی کون اپنی نصرت کو میری نصرت کے ساتھ ملائے گا، **انتصر الرجل**، آدمی نے انتقام لیا۔ **النصر** کا معنی آنا بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: **نصرت أرض بني فلان**، میں فلاں کی زمین میں آیا۔ شاعر نے کہا:

إذا دخل شهر الحرام فودعي      بلاد تميم وانصري أرض عامر

جب شہر حرام داخل ہو تو تمیم کے شہروں کو الوداع کہہ اور عامر قبیلہ کی زمین میں آ۔

**النصر** کا معنی بارش بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: **نصرت الأرض** زمین پر بارش ہوئی۔ **النصر** کا معنی عطا بھی ہے۔ شاعر نے کہا:

واني واسطار سطران سطران      لقاتل يا نصر نصرًا نصرًا

ان سطور کی قسم جو لکھی گئی ہیں میں کہنے والا ہوں: اے عطا، عطا، عطا۔

اس آیت کا سبب جو علماء مفسرین نے ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور پیارے ہیں اور انبیاء کی اولاد ہیں، ہمارے آباء ہماری سفارش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ قیامت کے روز سفارشات قبول نہیں کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب ان یدخل الجنة احدہم بوحمة اللہ تعالیٰ، صفحہ 377، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والبدوامۃ علی العمل، حدیث نمبر 5982، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 139، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

جائیں گی اور نہ فدیہ لیا جائے گا۔ شفاعت، فدیہ اور نصرت کا خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ ان چیزوں کے بنی آدم دنیا میں عادی ہیں۔ تکلیف میں مبتلا خلاصی نہیں پاتا مگر اس کے ساتھ کہ اس کی سفارش کی جائے، یا اس کی مدد کی جائے یا فدیہ دیا جائے۔

وَإِذْ نَجَّيْنَكُمْ مِنَ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ

وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ⑤

”اور یاد کرو جب نجات بخشی ہم نے تمہیں فرعونوں سے جو پہنچاتے تھے تمہیں سخت عذاب یعنی ذبح کرتے تھے

تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رہنے دیتے تھے تمہاری عورتوں (بیٹیوں) کو اور اس میں بڑی بھاری آزمائش تھی

تمہارے رب کی طرف سے۔“

اس آیت میں تیرہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذْ نَجَّيْنَكُمْ مِنَ آلِ فِرْعَوْنَ، اِذْ حالت نصب میں ہے۔ اس کا اُذ کُروا

نِجَّيْتِ پر عطف ہے۔ یہ اور بعد والی آیات میں بنی اسرائیل کو وہ بعض نعمتیں یاد دلانا ہے جو ان پر تھیں۔ یعنی تم میری نعمت کو یاد

کرو کہ میں نے تمہیں دشمن سے نجات دی اور تم میں انبیاء بنائے۔ یہ خطاب موجودہ لوگوں کو ہے اور مراد ان کے آباء ہیں۔ جیسا

کہ فرمایا: اِنَّا لَنَّا كَعَالِ الْيَمَانِ صَلَّيْنَا فِي الْيَمَانِ ⑥ (الحاقہ) (یعنی ہم نے تمہارے آباء کو کشتی میں سوار کیا) بعض علماء نے

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَجَّيْنَكُمْ کیونکہ آباء کی نجات، موجودہ لوگوں کی نجات کا سبب تھی اور نَجَّيْنَكُمْ کا معنی ہے ہم نے

تمہیں زمین کی اونچی جگہ پر ڈالا، یہ اصل ہے پھر ہر کامیاب ہونے والے کو ناجی کہا گیا۔ پس ناجی وہ ہوتا ہے جو تنگی سے

خوشحالی کی طرف نکلتا ہے اسے اذ انجیتکم بھی پڑھا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ آلِ فِرْعَوْنَ، آلِ مراد اس کی قوم، اس کے تبعین اور اس کے

دین کے پیروکار ہیں۔ اسی طرح آل رسول جو نبی کریم ﷺ کے دین، آپ کی ملت پر تھے کسی زمانہ میں بھی ہوں، خواہ ان کا

نسب تعلق ہو یا نہ ہو، اور جو آپ کے دین اور ملت پر نہ ہو وہ آپ کے اہل اور آل سے نہیں ہے اگرچہ اس کا نسب اور قربت کا تعلق

موجود بھی ہو۔ رافضیوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: آل رسول فقط حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین

ؑ ہیں۔ ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاعْرِضْ عَلٰى آلِ فِرْعَوْنَ (البقرہ: 50) اور یہ ارشاد ہے: اَدْخَلُوا آلَ فِرْعَوْنَ

اَشَدَّ الْعَذَابِ ⑦ (غافر) یعنی آل سے مراد اس کے دین کی آل ہیں جبکہ انہیں اس کے ساتھ بیٹا، بیٹی، چچا، بھائی اور عصبہ

ہونے کا رشتہ نہ تھا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو مومن، موحد نہیں وہ آل محمد ﷺ سے نہیں اگرچہ وہ آپ ﷺ کا

قریبی بھی ہو۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ابولہب اور ابوجہل آل نبی اور اہل نبی ﷺ میں سے نہیں تھے اگرچہ ان دونوں کا

نبی کریم ﷺ سے رشتہ تھا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں فرمایا: اِنَّهُ لَيْسَ

مِنْ اَهْلِكَ ⑧ اِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود: 46)

اور صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے سنا:

خبردار! آل ابی..... یعنی فلان..... میرے اولیاء نہیں ہیں میرا مددگار اللہ تعالیٰ اور نیک مومنین ہیں (1)۔ ایک طائفہ نے کہا: آل سے مراد حضرت محمد ﷺ کی ازواج مطہرات اور آپ کی اولاد ہے۔ کیونکہ حضرت ابو حمید کی حدیث میں ہے، لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ ہم آپ پر درود کیسے پڑھیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس طرح کہو: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اَزْوَاجِهِ وَ ذُرِّيَّتِهِ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ وَ بَارَكْتَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اَزْوَاجِهِ وَ ذُرِّيَّتِهِ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَبِيْبٌ مَّحَبْبٌ (2)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

اہل علم کے ایک گروہ نے کہا: اہل معلوم ہیں اور آل سے مراد قبیعین ہیں۔

پہلا قول صحیح ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی کی حدیث کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب کوئی قوم صدقہ لے کر آتی تو آپ ﷺ دعا فرماتے: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَیْہُمْ۔ میرا باپ صدقہ لے کر آیا تو یہ دعا دی اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی اٰلِ ابی اوفی (3)۔

**مسئلہ نمبر 3:** علمائے نحو کا اس میں اختلاف ہے کہ آل کو شہروں کی طرف مضاف کیا جائے گا یا نہیں۔ کسائی نے کہا: کہا جاتا ہے: آل فلان، آل فلانة، یہ نہیں کہا جاتا: هُوَ مِنْ اٰلِ حِمْصٍ، اور نہ یہ کہا جاتا ہے: مِنْ اٰلِ الْمَدِيْنَةِ۔ انخفش نے کہا: رئیس اعظم کے بارے میں کہا جاتا ہے، جیسے آل محمد ﷺ۔ آل فرعون۔ کیونکہ فرعون گمراہی میں ان کا رئیس تھا۔ انخفش نے کہا: ہم نے شہروں کے بارے میں سنا، وہ کہتے ہیں: اهل البلد۔ آل المدینہ۔

**مسئلہ نمبر 4:** نحو یوں کا اختلاف ہے کہ آل کو ضمیر کی طرف مضاف کیا جائے گا یا نہیں۔ نحاس، زبیدی اور کسائی نے اس سے منع کیا ہے۔ پس صرف یہ کہا جائے گا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ اٰلِ مُحَمَّدٍ (ﷺ) وآلہ نہیں کہا جائے گا۔ درست یہ ہے کہ یہ کہا جائے گا: اہلہ۔ علماء کے ایک طائفہ کا خیال ہے کہ آلہ کہا جائے گا ان علماء میں سے ابن السید بھی ہے اور یہ قول صحیح ہے کیونکہ سماع صحیح اس کی تائید کرتا ہے۔ عبد المطلب کے قول میں ہے:

لا هُمْ اَنْ الْعَبْدُ يَم  
وَانصُرَ عَلٰی اٰلِ الصَّلِي  
نَع رَحْلَهُ فَاَمْنَمَ حَلَالِك  
ب و عَابِدِيْہِ الْيَوْمِ اَلْكَ  
ان اشعار میں آل کو ضمیر کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔  
ندبہ نے کہا تھا:

أَنَا الْفَارِسُ الْحَامِي حَقِيقَةُ وَالِدِي  
وَأَلِي كَمَا تَحْصِي حَقِيقَةُ اَلْكَ  
میں شہسوار ہوں اپنے والد کی عزت و جان کی حفاظت کرنے والا ہوں اور اپنی آل کی حفاظت کرنے والا ہوں جس طرح

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب موالاة المؤمنین ومقاطعة غرہم، صفحہ 115، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ، صفحہ 175، جلد 1۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 3118، خیار القرآن، پہلی کیشنز

3۔ ایضاً، کتاب الزکوٰۃ، باب الدعاء لمن آل بعدتہ، صفحہ 46-45، جلد 1۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 1402، خیار القرآن، پہلی کیشنز



تمہاری آل کی عزت و جان کی حفاظت کرنے والا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 5:** آل کی اصل میں علمائے نحو کا اختلاف ہے۔ نحاس نے کہا: اس کی اصل اہل ہے پھر ہاء کو الف سے بدلا گیا۔ اگر تو اس کی تصغیر بنائے گا تو اس کو اصل کی طرف لوٹائے گا۔ تو کہے گا: اُھیل۔ مہدوی نے کہا: اس کی اصل اول ہے۔ بعض نے فرمایا: اصل اہل تھا ہاء کو ہمزہ سے قلب کیا گیا پھر ہمزہ کو الف سے بدلا گیا۔ اس کی جمع آئون ہے، اس کی تصغیر اویل ہے جیسا کہ نسائی نے بیان کیا ہے دوسرے لوگوں نے اھیل حکایت کیا ہے ہم نے نحاس سے یہ ذکر کیا ہے۔ ابوالحسن بن کیسان نے کہا: جب تو الاء کی جمع بنائے گا تو کہے گا آئون اور جب تو الاء کی جمع بنائے گا جس کا معنی سراب ہے تو تو کہے گا آوال، جیسے مال کی جمع اموال ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِرْعَوْنُ بعض علماء نے فرمایا: اس بادشاہ کا نام ہی فرعون تھا۔ بعض نے فرمایا: عمالقہ کے بادشاہوں میں سے ہر بادشاہ کا اسم فرعون تھا۔ جیسے فارس کے بادشاہ کا لقب کسریٰ ہوتا ہے روم کے بادشاہ کا اسم قیصر ہوتا ہے حبشہ کے بادشاہ کا اسم نجاشی ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے فرعون کا اسم قابوس تھا۔ اہل کتاب کے قول کے مطابق وہب نے کہا: اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا اس کی کنیت ابو مرہ تھی۔ وہ بنی عسلیق بن لاوذ بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام سے تھا۔ سہلی نے کہا: ہر شخص جو قبطیوں اور مصر کا والی بنا وہ فرعون کہلاتا تھا۔ فرعون اہل اصطخر میں سے فارسی تھا۔ مسعودی نے کہا: فرعون کی عربی میں تفسیر معروف نہیں۔ جوہری نے کہا: فرعون، ولید بن مصعب بادشاہ مصر کا لقب ہے۔ ہر سرکش فرعون ہے، العتاق، فراعنہ، قد تغر عن، و هو ذو فرعنہ، یعنی سازشی اور انکاری۔ حدیث پاک میں ہے: أَخَذْنَا فِرْعَوْنَ هَذِهِ الْأُمَّةِ ہم نے اس امت کے فرعون کو پکڑا۔

اس آیت میں فرعون حالت جبری میں ہے لیکن عجمہ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَسْؤُمُونَكَ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: وہ تمہیں چکھاتے ہیں۔ تم پر عذاب کو لازم کرتے ہیں، ابو عبیدہ نے کہا: وہ تمہیں مستحق قرار دیتے ہیں، کہا جاتا ہے: سامہ خطۃ خسف۔ جب کسی ذلت کا مستحق قرار دیا جائے، اسی سے عمرو بن کلثوم کا قول ہے:

اذا ما الملك سام الناس خسفاً ابينا ان نقر الخسف فينا

جب بادشاہ نے لوگوں کو ذلیل کیا تو ہم نے اپنے اندر ذلت کے ٹھہرائے جانے کا انکار کیا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تمہیں ہمیشہ دیتے ہیں۔ السوم کا معنی دوام بھی ہے۔ اسی سے سائۃ الغنم ہے جو ہمیشہ چرنے والی ہوتی ہیں۔ انخس نے کہا: یہ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ نیا کلام ہے۔ اگر تو چاہے تو اسے حال کی حیثیت سے محل نصب میں کر دے۔ یعنی سائین لکم۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سُوءَ الْعَذَابِ۔ یہ يَسْؤُمُونَكَ کا مفعول ثانی ہے، اس کا معنی سخت عذاب ہے اور سوء العذاب کے معنی میں ہونا بھی جائز ہے اور اس کا سوماسینا کے معنی میں نعت ہونا بھی جائز ہے۔ روایت ہے کہ

فرعون نے بنی اسرائیل کو خدام اور اپنے ماتحت کر دیا تھا اور ان میں اپنے کام تقسیم کر دیئے تھے۔ کچھ لوگ مکانات بناتے تھے، کچھ کھیتی باڑی کرتے تھے، کچھ خدمت کرتے تھے۔ اور فرعون کی قوم لشکر اور حکمران تھی اور بنی اسرائیل میں سے جس کا کوئی کام نہ تھا ان پر جزیہ لگایا گیا تھا اور یہی سُوءُ الْعَذَابِ سے مراد ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** يُذْطَحُونْ اٰہْنَاءَ کُمْ یہ یُسُوْمُوْنُکُمْ سے بدل ہونے کی بنا پر بغیرِ آو اعطف کے ہے۔ جیسا کہ سیبویہ نے کہا اور اس شعر سے استشہاد کیا ہے:

متی تاتنا تلمم ہنا فی دیارنا تجد حطباً جزلاً و ناراً تاجبنا

جب ہمارے پاس آئے گا ہمارے شہروں میں اترے گا تو بہت زیادہ لکڑیاں روشن آگ پائے گی۔

فراء وغیرہ نے کہا: يُذْطَحُونْ بغیرِ آو کے یُسُوْمُوْنُکُمْ کی تفسیر کے طور پر ہے جیسے تو کہتا ہے: اتانی القوم زید و عمرو۔ پس تفسیر کی بنا پر زید سے پہلے آو کی ضرورت نہیں۔ اس کی مثال یہ بھی ہے: وَمَنْ یَفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اٰثَمًا ۖ یُضَعَفْ لَہُ الْعَذَابُ (فرقان)

اور سورہ ابراہیم میں ویذبحون و آو کے ساتھ ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں ذبح اور بغیرِ ذبح کے عذاب دیتے ہیں، پس يُذْطَحُونْ اٰہْنَاءَ کُمْ عذاب کی دوسری جنس ہے، ماقبل کی تفسیر نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں یہ احتمال ہے کہ اس میں آواز آئے ہو۔ اس کی دلیل سورہ بقرہ کی آیت ہے کبھی آواز آندہ بھی ہوتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

فلما اجزنا ساحة الحی واتتخی

اس مصرعہ میں آواز آندہ ہے۔ مراد قد اتتخی ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

الی السلك القرم و ابن الھمام ولیث الکتیبة فی المزدحم

یہاں بھی السلك القرم، ابن الھمام، لیث الکتیبة، سے ایک ہی مراد ہے۔ یہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُذْطَحُونْ اکثر قراء شد کے ساتھ پڑھتے ہیں کثرت کا معنی لینے کی بنا پر۔ ابن محیسن نے یا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ الذَّبْح کا معنی الشق (چیرنا) ہے۔ الذَّبْح سے مراد مذبح (ذبح کیا گیا) ہے۔ الذَّبَاح، انگلیوں کی جڑوں میں پھنسن ہو جانا۔ ذبحت الذن میں نے مشکے میں سوراخ کر دیا۔ سعد الذابح ایک سعادت مند۔ المذابح۔ محاریب، المذابح، مذبح کی جمع۔ جب سیلاب آجائے اور زمین کو شق کر دے، تو جو شق بالشت بھر ہوا سے مذبح کہا جاتا ہے۔

فرعون بچوں کو ذبح کرتا تھا اور بچیوں کو باقی رکھتا تھا۔ بچیوں کو مال کے اعتبار سے نساء کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: يُذْطَحُونْ اٰہْنَاءَ کُمْ یعنی مردوں کو ذبح کرتے ہیں انہیں بیٹے کہا گیا جب وہ اسی طرح تھے۔ اہناء سے مراد

مرد لینے والوں نے نساء کم سے دلیل پکڑی ہے، پہلا قول اصح ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 11:** اللہ تعالیٰ نے فعل کو آل فرعون کی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ وہ فرعون کے حکم سے یہ کرتے تھے، چونکہ یہ کام ان کے سپرد تھا، اس لئے فعل کی نسبت ان کی طرف کی۔ نیز اس لئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کام کرنے والا اپنے کام کی وجہ سے مواخذہ کا حقدار ہوگا۔ طبری نے کہا: یہ ارشاد تقاضا کرتا ہے کہ جس کو کسی ظالم نے کسی کو قتل کرنے کا حکم دیا اور اس نے اسے قتل کر دیا تو اس سے مواخذہ ہوگا۔ میں کہتا ہوں: علماء کے اس مسئلہ میں تین اقوال ہیں: دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ ظالم حکم دینے کی وجہ سے اور مامور قتل کرنے کی وجہ سے۔ نخعی نے اسی طرح کہا ہے۔ امام شافعی اور امام مالک کا قول بھی یہی ہے مگر قدرے تفصیل کے ساتھ۔ امام شافعی نے فرمایا: جب سلطان کسی کو دوسرے شخص کے قتل کا حکم دے جبکہ مامور (جس کو حکم دیا گیا) جانتا ہو کہ اس نے اسے ظلماً قتل کرنے کا حکم دیا ہے، مامور اور امام دونوں پر قصاص ہوگا جیسے دونوں اکٹھا قتل کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر امام، مامور کو اس کے قتل پر مجبور کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ اسے ظلماً قتل کر رہا ہے تو صرف ام پر قصاص ہوگا اور مامور کے بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ اس پر قصاص ہوگا اور دوسرا یہ کہ اس پر قصاص نہ ہوگا اور اس پر نصف دیت ہوگی۔ یہ ابن منذر نے بیان کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: مامور کی یا تو یہ کیفیت ہوگی کہ اس پر آمر کی اطاعت لازم ہوگی اور وہ امام کے شر سے خوفزدہ ہوگا جیسے سلطان اور سردار اپنے غلام کے لئے۔ پس اس صورت میں قصاص دونوں کو لازم ہوگا یا ایسا ہوگا کہ اس پر حکم دینے والے کی اطاعت لازم نہ ہوگی، تو اس صورت میں صرف قتل کرنے والے کو قتل کیا جائے گا حکم دینے والے کو نہیں جیسے باپ اپنے بیٹے کو یا استاد کسی لڑکے کو یا کارنگر اپنے شاگرد کو حکم دے جب کہ وہ بالغ ہو۔ اگر وہ بالغ نہ ہو تو قتل حکم دینے والے پر ہوگا اور بچے کی عاقلہ پر نصف دیت ہوگی۔ ابن نافع نے کہا: مالک کو قتل نہیں کیا جائے گا جب وہ اپنے غلام کو کسی انسان کے قتل کا حکم دے اگرچہ وہ غلام عجمی بھی ہو۔ ابن حبیب نے کہا: میں ابن القاسم کے قول کے مطابق کہتا ہوں کہ دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ اگر ایسے شخص نے حکم دیا جس کی مخالفت میں مامور پر کوئی خوف نہیں ہے تو وہ اکراہ (مجبور کرنے) کے ساتھ لاحق نہیں ہوگا بلکہ مامور کو قتل کیا جائے گا آمر کو نہیں اور آمر کو سزا دی جائے گی اور قید کیا جائے گا۔

امام احمد نے اس سردار کے بارے میں فرمایا جو اپنے غلام کو حکم دیتا ہے کہ وہ کسی کو قتل کرے، تو سردار کو قتل کیا جائے گا۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: غلام کو قید میں رکھا جائے گا۔ امام احمد نے فرمایا: غلام کو قید کیا جائے گا اور اسے مارا جائے گا اور ادب سکھایا جائے گا۔ ثوری نے کہا: سردار کو تعزیر لگائی جائے گی۔ حکم اور حماد نے کہا: غلام کو قتل کیا جائے گا۔ قتادہ نے کہا: دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر غلام فصیح تھا، سمجھدار تھا تو اسے قتل کیا جائے گا اور مالک کو سزا دی جائے گی اگر غلام عجمی تھا تو سردار پر قصاص ہوگا۔ سلیمان بن موسیٰ نے کہا: آمر کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کے ہاتھ کاٹے جائیں گے پھر اسے سزا دی جائے گی اور اسے قید کیا جائے گا۔ یہ دوسرا قول ہے۔ مامور کو قتل کیا جائے گا کیونکہ اس نے قتل کا فعل کیا ہے۔ اسی طرح عطا، حکم، حماد، شافعی، احمد اور اسحاق نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو کسی کو دوسرے شخص کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ امام زفر نے کہا: ان میں سے کسی کو بھی قتل



نہیں کیا جائے گا۔ یہ تیسرا قول ہے۔ ابوالعالی نے ”البرہان“ میں بیان فرمایا ہے: ان کا خیال ہے کہ آمر اور مبشر ان میں سے کوئی قصاص میں متعلق نہیں ہے اسی وجہ سے ان کے نزدیک کسی کو بھی قتل نہیں کیا جائے گا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 12:** جمہور نے یُذَبِّحُونَ مبالغہ کے لئے شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن محیسن نے یُذَبِّحُونَ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلا اولیٰ ہے کیونکہ ذبح میں تکرار تھا۔

فرعون نے خواب میں دیکھا کہ ایک آگ بیت المقدس سے نکلی ہے اور اس نے مصر کے گھروں کو جلا دیا ہے۔ اس کے خواب کی یہ تعبیر بتائی گئی کہ بنی اسرائیل سے ایک بچہ بڑا ہوگا، اس کے ہاتھوں فرعون کا ملک تباہ ہوگا۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں جو قریب المعنی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 13:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَفِي ذٰلِكُمْ يَهْتَدِي سُبُلًا مِّنْهُ لَمَن رَّزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا (انفال: 17) تاکہ احسان فرمائے مومنوں پر اپنی جناب سے بہترین احسان (ابوالہیثم نے کہا: بلا کبھی اچھی ہوتی ہے کبھی بری۔ اس کا اصل معنی السحنة، (آزماتا) ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اچھے عمل کے ساتھ آزماتا ہے تاکہ وہ اس کے شکر کا امتحان لے۔ کبھی کسی ناپسندیدہ مصیبت سے آزماتا ہے تاکہ اس کے صبر کا امتحان لے۔ بعض علماء نے فرمایا: اچھائی کے لئے ہلاک اور برائی کے لئے ہلاک یہ ہر دو نے حکایت کیا ہے۔ ایک قوم نے فرمایا: ذٰلِكُمْ کا اشارہ نجات دینے کی طرف ہے تو اس صورت میں بلا خیر میں ہوگا، یعنی تمہیں نجات دینا تم پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ جمہور علماء نے کہا: اشارہ ذبح وغیرہ کی طرف ہے اور البلاء یہاں شر کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہے: ذبح میں مکروہ اور امتحان ہے۔ ابن کیسان نے کہا: خیر کے لئے فعل ابلاء اللہ و بلاء استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

جزی اللہ بالاحسان ما فعلا بکم د ابلاہما خیر البلاء الذی یملو  
اس شعر میں شاعر نے دونوں لغتوں کو جمع کیا ہے۔ اکثر خیر کے لئے ابدیتہ اور شر کیلئے ہلوتہ اور آزمائش کے لئے اہتلیتہ و ہلوتہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ نحاس نے کہا ہے۔

وَ اِذْ قَرَعْنَا بِکُمُ الْبَعْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَاَعْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝

”اور جب پہاڑ دیا ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھر ہم نے تم کو بچا لیا اور ڈبو دیا فرعونوں کو اور تم کنارے پر کھڑے دیکھ رہے تھے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَرَعْنَا بِکُمُ الْبَعْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ، اِذْ محل نصب میں ہے اور قَرَعْنَا کا مطلب ہے ہم نے پہاڑ دیا، ہر حصہ ایک بڑے پہاڑ کی طرح۔ الفرق کا معنی جدا ہونا ہے۔ اسی سے فرق الشعر اسی سے الفرقان ہے کیونکہ قرآن نے حق و باطل کے درمیان جدائی کی۔ اسی سے فالفرقات فرقا ہے یعنی ملائکہ حق و باطل کے درمیان فرق کے ساتھ اترتے ہیں اسی سے یوم الفرقان ہے یعنی جنگ بدر کا دن۔ اس دن حق و باطل کے درمیان فرق ہوا۔ اسی سے وقرآنا فرقنا یعنی

قرآن کو ہم نے بیان کیا اور اسے ہم نے پختہ کیا۔ زہری نے فرشتہ کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہم نے اسے جدا جدا کر دیا۔ لَکُمْ کا معنی لکم ہے۔ با بمعنی لام ہے۔ بعض نے فرمایا: با اپنے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے فَرَقْنَا الْبَحْرَ بَدْ خَوْلِكُمْ اِثَا۔ ہم نے دریا کو پھاڑ دیا تمہارے اس میں داخل ہونے کے ساتھ۔ یعنی وہ دو پانیوں کے درمیان ہو گئے یعنی ان کے ساتھ جدائی ہو گئی۔ یہ اولیٰ ہے فانفلق اس معنی کو بیان کرتا ہے۔

الْبَحْرُ اس کا یہ نام اس کی وسعت کی وجہ سے ہے۔ کہا جاتا ہے: فرس بحر جبکہ گھوڑا زیادہ چلنے والا ہو۔ اسی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مندوب گھوڑے کے بارے میں ہے جو ابو طلحہ کا تھا۔ وَانْ وَجَدْنَا لَبَخْرًا هُمْ نے اسے تیز رفتار پایا (1)۔ البحر، نمکین پانی کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: البحر الباء پانی نمکین ہو گیا۔ نصیب شاعر نے کہا:

وقد عاد ماء الارض بحراً فزادني  
الى مرضى ان ابهر المشرب العذب

زمین کا پانی نمکین ہو گیا اس نے میری مرض میں اضافہ کیا کہ میٹھا پانی نمکین ہو گیا۔

الْبَحْرُ: شہر کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: هذه بحر تناء یعنی یہ ہمارا شہر ہے۔ یہ اموی نے کہا ہے۔ الْبَحْرُ اس زخم کو بھی کہتے ہیں جو انسان کے گردے میں لگ جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں: لقيتہ صحراء بحرًا یعنی میں اس سے بالکل واضح اور کھلے انداز میں ملا۔ کعب الاحبار سے ایک خبر میں مروی ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جس کا نام صندوق فائیل ہے۔ تمام دریا اس کے انگوٹھے کے گڑھے میں ہیں۔ ابو نعیم نے یہ روایت ثور بن یزید عن خالد بن معدان عن کعب کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَأَنْجَيْنَاكُمْ یعنی ہم نے تمہیں اس دریا سے نکالا۔ کہا جاتا ہے: نجوت من كذا نجاء و نجاة میں نے اسے اس سے نکالا۔ اس کا مصدر نجاء (ممدود) اور نجاة (مقصور) دونوں طرح آتا ہے۔ الصدق منجاة و نجات دینے والا ہے۔ انجیت غیری و نجیتہ دونوں طرح پڑھا گیا ہے (وَإِذْ نَحْنُكُمْ وَأَنْجَيْنَاكُمْ) اور فَأَنْجَيْنَاكُمْ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ۔ کہا جاتا ہے: غرق فی الباء غرقا فهو غریق و غارق۔ اسی سے ابوالنجم کا قول ہے:

من بین مقتول و طاب غارق

اغرقه و غرقه فهو مغرق و غریق۔ لجام مغرق بالفضة۔ یعنی چاندی سے مزین لگام۔ التفريق کا مطلب قتل بھی ہے۔ اُشی نے کہا:

الا ليت قيسا غرقته القوابل

(کاش! قیس کو دایہ عورتیں قتل کر دیتیں)

چونکہ دایہ عورت قحط کے سال نومولود کو جلی کے پانی میں غرق کر دیتی تھی خواہ وہ مذکر ہوتا یا مؤنث حتیٰ کہ وہ مر جاتا پھر ہر قتل کو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب شجاعتہ ص 252، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ) ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2434، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تغریق بنایا گیا۔ اسی سے ذوالرمہ کا قول ہے:

اذا غرقت ارباضها ثنى بكفة بتيها لم تصبح رعوماً سلوبها

یعنی جب رسیوں نے جوان اونٹنی کے دوسرے بطن کو قتل کر ڈالا تو وہ تھکاوٹ کی وجہ سے اپنے بچے پر مہربان نہ ہوئی۔

بنی اسرائیل کے نجات پانے کی کیفیت میں علماء کے مختلف اقوال

طبری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ وہ مصر سے بنی اسرائیل کو رات کے وقت لے کر چلیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو کہا کہ وہ قبطیوں سے عاریۃ سامان اور زیورات لیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے یہ حلال کر دیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو رات کے ابتدائی حصہ میں لے کر چلے۔ فرعون کو پتا چلا تو اس نے کہا: کوئی شخص ان کا پیچھا نہ کرے حتیٰ کہ مرغ اذان دے۔ اس رات مصر میں کسی مرغ نے اذان نہ دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس رات بہت سے قبطیوں کے بیٹوں کو موت دی، وہ ان کے دفن میں مشغول ہو گئے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے اس وقت نکلے جب سورج چڑھ چکا تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاتَّبَعُوهُمْ مُشْرِقِينَ (الشعراء)

حضرت موسیٰ علیہ السلام دریا کی جانب چلے تھے حتیٰ کہ اس کے کنارے پر پہنچ گئے۔ بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ سے کچھ زائد تھی اور فرعونیوں کی تعداد بارہ لاکھ تھی (1)۔

بعض علماء نے فرمایا: فرعونیوں نے دس لاکھ گھوڑوں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ ان میں مؤنث گھوڑی کوئی نہیں تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں اپنی اولاد کے ساتھ ۶۷ افراد میں داخل ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کو بڑھایا اور ان کی اولاد میں برکت دی حتیٰ کہ فرعونیوں سے نکل کر دریا کی طرف گئے تو وہ بوڑھوں اور بچوں اور عورتوں کے علاوہ چھ لاکھ تھے۔ ابوبکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں شہابہ بن سوار نے انہوں نے یونس بن اسحاق سے انہوں نے ابواسحاق سے انہوں نے عمرو بن میمون سے انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کر کے بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لے کر رات کو چلے تو فرعون کو خبر پہنچی۔ اس نے ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا۔ ذبح کی گئی۔ پھر اس نے کہا: اس کی کھال اتارنے سے فراغت سے پہلے میرے لئے چھ لاکھ قبطی جمع ہوں۔ فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام چلتے رہے حتیٰ کہ دریا تک پہنچ گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا سے کہا: پھٹ جا۔ دریا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! تو نے تکبر کیا ہے، کیا میں اولاد آدم میں سے کسی کے لئے پھٹا ہوں کہ تمہارے لئے پھٹ جاؤں؟ راوی نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک شخص اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے اللہ کے نبی! کہاں کا حکم ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: مجھے اسی جانب جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس اس شخص نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ وہ گھوڑا تیرتا ہوا باہر نکل گیا۔ پھر اس شخص نے پوچھا: اب کس سمت کا حکم دیا گیا ہے؟ فرمایا: اس طرف کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس شخص نے کہا: اللہ کی قسم! نہ تو نے جھوٹ بولا ہے اور نہ تجھ سے جھوٹ بولا



گیا ہے پھر دوبارہ اس نے گھوڑا دریا میں ڈالا وہ تیرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! کہاں کا حکم دیا گیا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: مجھے اسی طرف جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس شخص نے کہا: اللہ کی قسم! نہ آپ نے جھوٹ بولا اور نہ آپ سے جھوٹ بولا گیا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی۔ اِنْ اَصْرِبْتَ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ (الشعراء: 63) (کہ اپنا عصا دریا پر مارو) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا مارا تو دریا پھٹ گیا اور ہر حصہ بڑے پہاڑ کی طرح تھا اس میں بارہ راستے تھے کیونکہ بارہ قبائل تھے ہر قبیلہ کا ایک راستہ تھا وہ ایک دوسرے کو دکھائی دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پانی کے پہاڑوں میں کھڑکیاں اور سوراخ تھے جس سے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ باہر نکل گئے اور فرعونی ابھی دریا کے اندر تھے تو دریا نے انہیں طمانچے مارے اور انہیں غرق کر دیا۔

ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ بحر قلزم تھا اور وہ شخص جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھا وہ نوجوان یوشع بن نون تھا۔ اللہ تعالیٰ نے دریا کی طرف وحی فرمائی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے پھٹ جائے جب وہ تجھ پر ضرب لگائیں۔ وہ دریا اس رات موجیں مارتا رہا جب صبح ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا کو مارا اور اس کی کنیت ابو خالد رکھی۔

ابن ابی شیبہ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ اکثر مفسرین نے قصص میں یہ معنی بیان کیا ہے اور جوہم نے ذکر کیا ہے وہ کافی ہے۔ مزید بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورہ یونس اور سورہ الشعراء میں آئے گا۔

**فصل:** اللہ تعالیٰ نے نجات دینے اور غرق کرنے کا ذکر فرمایا اور اس دن کا ذکر نہیں فرمایا جس میں یہ سب کچھ ہوا۔ مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ آئے تو یہود کو پایا کہ وہ عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ یہ کون سا دن ہے جس میں تم روزہ رکھتے ہو؟ یہودیوں نے کہا: یہ ایک عظیم دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات عطا فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس دن بطور شکر روزہ رکھا تھا اس لئے ہم بھی روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تم سے زیادہ قریبی ہیں۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اس دن کا روزہ رکھا اور اس دن روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا (1)۔ یہ حدیث بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا: تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے کے ان سے زیادہ مستحق ہو۔ پس تم روزہ رکھو۔

**مسئلہ:** ان احادیث کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اقتدا میں اس دن کے روزے کا حکم دیا جیسا کہ یہود نے اس کے متعلق بتایا۔ حقیقت اس طرح نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے، فرمایا: عاشوراء کے دن قریش زمانہ جاہلیت میں روزہ رکھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ زمانہ جاہلیت میں عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے جب آپ ﷺ مدینہ طیبہ آئے تو خود بھی یہ روزہ رکھا اور اس روزے کا حکم بھی فرمایا۔ جب رمضان فرض ہوا تو عاشوراء کے دن کا روزہ ترک کر دیا اور فرمایا: جو چاہے یہ روزہ رکھے اور جو چاہے یہ روزہ ترک کر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، صفحہ 359، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 1865، فیہ القرآن، پہلی کیشنز

دے (1)۔ بخاری اور مسلم نے یہ حدیث نقل کی ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ احتمال ہے کہ قریش نے یہود کے خبر دینے کی وجہ سے یہ روزہ رکھا ہو کیونکہ وہ ان سے سنتے تھے کیونکہ یہود ان کے نزدیک اہل علم تھے۔ پس نبی کریم ﷺ نے اسی طرح زمانہ جاہلیت میں مکہ میں روزہ رکھا ہو۔ جب آپ مدینہ طیبہ آئے اور یہود کو یہ روزہ رکھتے ہوئے پایا تو فرمایا: ہم تمہاری نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ قریبی اور پیروی کے زیادہ مستحق ہیں (2)۔ پس آپ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع میں روزہ رکھا۔ امر بصریامہ یعنی اس دن کے روزہ کے امر کو مؤکد فرمایا حتیٰ کہ چھوٹے بچے بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ ہم کہیں گے: یہ اس شخص کا شبہ ہے جو کہتا ہے کہ نبی کریم ﷺ شاید حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مکلف تھے حالانکہ حقیقت ایسی نہیں جیسا کہ سورہ انعام آیت 90 میں **فَوَهْدَاهُمْ اَقْتَدَا** کے تحت مزید بیان آئے گا۔

**مسئلہ:** عاشوراء کے دن میں اختلاف ہے۔ کیا یہ نویں محرم الحرام کا دن ہے یا دسویں کا۔ امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ یہ نویں کا دن ہے۔ ان کی دلیل حکم بن اعرج کی حدیث ہے۔ انہوں نے کہا: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گیا وہ زمزم کے پاس اپنی چادر کو تکیہ بنائے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا: مجھے عاشوراء کے روزہ کے متعلق بتاؤ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب تو محرم کا چاند دیکھے تو شمار کر اور تو نویں محرم الحرام کو روزہ سے ہو۔ میں نے پوچھا: کیا حضرت محمد ﷺ اس طرح روزہ رکھتے تھے؟ انہوں نے کہا: ہاں (3)۔ یہ مسلم نے نقل کیا ہے۔ حضرات سعید بن مسیب، حسن بصری، امام مالک اور سلف کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ وہ دسویں کا دن ہے۔ امام ترمذی نے حضرت حکم کی حدیث ذکر کی ہے اور اس پر صحت و حسن کا کوئی حکم بیان نہیں کیا پھر اس کے بعد یہ ذکر کیا: **انبا ناقتیبة انبا نا عبد الوارث عن یونس عن الحسن عن ابن عباس قال امر رسول اللہ ﷺ بصوم عاشوراء یوم العاشرا**۔ یعنی حضرت ابن عباس نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے دسویں کے دن عاشوراء کے روزے کا حکم دیا (4)۔ پھر فرمایا: ابو عیسیٰ نے کہا: حضرت ابن عباس کی حدیث حسن، صحیح ہے۔ امام ترمذی نے کہا: حضرت ابن عباس سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: نویں اور دسویں محرم کا روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔ اس حدیث کی وجہ سے امام شافعی، احمد بن حنبل اور اسحاق بھی یہی کہتے ہیں۔ دوسرے علماء نے کہا: حضرت ابن عباس کا سائل کو یہ کہنا: تو شمار کر اور نویں کے دن روزے سے ہو۔ اس میں دسویں کے روزے کے ترک پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ وعدہ کیا کہ وہ دسویں کے ساتھ نویں کا بھی روزہ رکھے۔ پس دونوں دن روزہ رکھنا دونوں احادیث کو جمع کرنا ہے۔ اور حضرت ابن عباس کا حکم کو جواب جب اس نے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ روزہ رکھتے تھے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ہاں۔ اس کا مطلب ہے اگر آپ زندہ رہتے۔ ورنہ نبی کریم ﷺ نے کبھی نویں محرم کا روزہ نہیں رکھا تھا۔ اس کا بیان اس روایت میں ہے جو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **لَیْسَ**

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، صفحہ 358، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1863، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

2۔ ایضاً، صفحہ 359، جلد 1

4۔ جامع ترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء فی عاشوراء، صفحہ 94، جلد 1 (وزارت تعلیم)

بَقِيتُ إِلَى قَابِلٍ لِأَصُومَ مِنَ الْيَوْمِ النَّاسِ (1) اگر میں آئندہ سال تک باقی رہا تو میں نویں (محرم) کا روزہ ضرور رکھوں گا۔  
 فضیلت: حضرت ابو قتادہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: عاشوراء کے دن کا روزہ، اللہ تعالیٰ سے اس پر امید کی جاتی ہے کہ پچھلے سال کا کفارہ بن جائے (2)۔ اس روایت کو مسلم اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: ہم کسی روایت کو نہیں جانتے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہو کہ عاشوراء کے دن کا روزہ سال کا کفارہ ہے (3) سوائے حضرت ابو قتادہ کی حدیث کے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ یہ جملہ حال ہے۔ اس کا معنی ہے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ فرعونی مردہ حالت میں پانی پر تیرنے لگے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے انہیں غرق ہوتے دیکھا اور اپنی نجات کو بھی دیکھا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فرعونیوں کو ان کے لئے نکالا گیا تھا حتیٰ کہ انہوں نے انہیں دیکھا۔ یہ احسان کے بعد دوسرا احسان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ یعنی تم عبرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، کیونکہ وہ آنکھوں کے ساتھ دیکھنے اور آگاہ ہونے سے غافل تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ تم اس آدمی کی حالت میں تھے جو دیکھنا چاہے تو دیکھ سکے جیسے تو کہتا ہے: هَذَا الْأَمْرُ مِنْكَ لِمَرَأَى وَمَسْمُوعٍ یعنی اس حالت میں ہے کہ تو اسے دیکھ سکے اور سن سکے اگر تو چاہے۔ یہ قول اور پہلا قول بنی اسرائیل کے احوال کے زیادہ مطابق ہے کیونکہ دریا سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل سے جو صادر ہوا اس میں متواتر عبرت نہیں ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انہیں نجات دی اور ان کے دشمن کو غرق کیا تو انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہمارے دل مطمئن نہیں ہیں کہ فرعون غرق ہو گیا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے دریا کو حکم دیا اس نے فرعون کو باہر پھینک دیا اور انہوں نے اسے دیکھا۔

ابو بکر بن ابی شیبہ نے قیس بن عباد سے روایت کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا: فرعون نہیں مرا اور وہ کبھی نہیں مرے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے سنا کہ وہ اس کے نبی کو جھٹلا رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اسے دریا کے کنارے پر پھینک دیا گو یا وہ سرخ نیل ہے۔ بنی اسرائیل نے اسے دیکھا جب وہ مطمئن ہو گئے تو انہیں خشکی کے راستہ سے فرعون کے شہروں کی طرف بھیجا گیا حتیٰ کہ انہوں نے اس کے خزانے منتقل کیے اور نعمتوں میں غرق ہو گئے۔ انہوں نے ایک قوم کو دیکھا کہ وہ بتوں کے پاس معتکف ہے، تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! ہمارے لئے ایک معبود بنائیں جس طرح ان کے لئے معبود ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں جبر کا اور فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ میں تمہارے لئے معبود تلاش کروں؟ اس نے تمہیں اپنے زمانہ کے لوگوں پر فضیلت دی ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں ارض مقدس کی طرف چلنے کا حکم دیا جہاں ان کے آباء و اجداد کے گھر تھے، تاکہ وہ فرعون کی زمین سے پاک ہو جائیں۔ ارض مقدس اس وقت جاہر لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو اس پر غالب تھے۔ پس انہیں اس زمین سے نکالنے کے لئے جنگ کی ضرورت تھی تو بنی اسرائیل نے کہا: (اے موسیٰ!) کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، صفحہ 359، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ جامع ترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء فی الحث علی صوم یوم عاشوراء، صفحہ 94، جلد 1 (دست)

3۔ ایضاً، حدیث 683



تم ہمیں جابر لوگوں کے لئے شکار بنانا چاہتے ہو؟ اگر تم ہمیں فرعون کے ہاتھ میں رہنے دیتے تو ہمارے لئے بہتر تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: يَقْوِمُ اِذْ خُلُوْا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ... اِلَى قَعْدُوْنَ۔ (المائدہ: 21)، (داخل ہو جاؤ اس پاک زمین میں جسے لکھ دیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے..... الخ)

حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے بددعا فرمائی اور انہیں فاسقین کا نام دیا۔ پس وہ ”تہ“ کے صحرا میں چالیس سال بطور سزا رہے پھر ان پر اللہ تعالیٰ نے سلویٰ اور بادل کے ذریعے احسان فرمایا..... جیسا کہ آگے آئے گا..... پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سیناء کی طرف چلے تاکہ ان کے لئے تورات لے آئیں۔ پس انہوں نے پیچھے بچھڑے کو معبود بنالیا..... اس کا بیان آگے آئے گا..... پھر انہیں کہا گیا: تم بیت المقدس پہنچ چکے ہو تو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور حطہ کہتے ہوئے داخل ہو..... اس کا بیان بھی آگے آئے گا..... حضرت موسیٰ علیہ السلام انتہائی حیاء دار اور پردہ پوش تھے۔ بنی اسرائیل نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خصیتین کی بیماری ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام غسل کرنے لگے تو اپنے کپڑے ایک پتھر پر رکھے تو وہ پتھر آپ کے کپڑے لے کر بنی اسرائیل کی مجالس کی طرف بھاگ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام برہنہ اس کے پیچھے دوڑے اور کہہ رہے تھے: اے پتھر! میرے کپڑے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَلْبَسُوا كَالَّذِينَ اٰذَوْا مُوسٰى فَبَدَّ اَللّٰهُ مِنْهَا قَالُوْا (احزاب: 69) (1) اس کا بیان بھی آگے آئے گا..... پھر جب حضرت ہارون کا وصال ہو گیا تو بنی اسرائیل نے کہا: تو نے ہارون کو قتل کیا ہے اور تو نے اس سے حسد کیا ہے حتیٰ کہ ملائکہ ان کی چار پائی لے آئے اور حضرت ہارون علیہ السلام اس پر مردہ تھے۔ اس کا بیان سورہ مائدہ میں آئے گا۔ پھر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ وہ اپنی قربانی کی قبولیت کی نشانی جان لیں۔ پس ایک آگ آسمان سے آتی (اور ان کی قربانیوں کو کھا جاتی) تو یہ ان کی قربانیوں کی قبولیت کی نشانی تھی۔ پھر بنی اسرائیل نے سوال کیا کہ ہمارے لئے آپ دنیا میں گناہوں کے کفارات کو بیان فرمائیں۔ پس جو گناہ کرتا اس کے دروازے پر لکھا جاتا عدلت کذا تو نے ایسا عمل کیا اور اس کا کفارہ اپنے اعضاء میں سے عضو کا کاٹنا ہے۔ اس عضو کا نام لیا جاتا تھا، جس کو پیشاب لگ جاتا تو وہ پاک نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ وہ کپڑے کو کاٹ دیتا تھا اور اپنے بدن سے جلد کو دور کر دیتا تھا پھر انہوں نے تورات کو بدلا اور اللہ تعالیٰ پر افترا باندھا، اپنے ہاتھوں سے تورات میں لکھا اور تورات کے عوض سامان زندگی لیا، پھر یہاں تک پہنچے کہ اپنے انبیاء اور رسل کو قتل کیا یہ ان کے معاملات اپنے رب کے ساتھ تھے اور ان میں ان کا یہ کردار تھا اور یہ ان کا برا اخلاق تھا۔ ان شاء اللہ ان میں سے ہر فصل کا پورا بیان اپنے مقام پر آئے گا۔

طبری نے کہا: ان مغیبات کا حضرت محمد ﷺ کی زبان کے ذریعے قرآن میں بیان جن کا عربوں کو علم نہ تھا اور یہ بنی اسرائیل کے حق میں واقع ہوئے تھے۔ یہ بنی اسرائیل کے پاس حضرت محمد ﷺ کی نبوت کی واضح دلیل تھے (2)۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 42، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الفضل، باب من احتسب عریاناً و حدیث الخلوۃ الخ، حدیث 269، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعَجَلَ مِنْ بَعْدِهَا وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٥٠﴾

”اور یاد کرو جب ہم نے وعدہ فرمایا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر بنالیا تم نے پچھڑے کو (معبود) ان کے بعد اور تم سخت ظالم تھے۔“

اس آیت میں چھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ابوعمر و نے وعدنا بغیر الف کے پڑھا ہے۔ ابوعبید نے اسے اختیار کیا ہے اور اسے رائج قرار دیا ہے اور واعدنا کا انکار کیا ہے۔ انہوں نے کہا: مواعدہ انسان کی طرف سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وعدہ اور وعید میں منفرد ہے۔ اسی پر ہم نے قرآن کے الفاظ کو پایا۔ جیسے ارشاد ہے: وَعَدَ كُمْ وَعَدَ الْحَقِّ (ابراہیم: 22) (جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ وعدہ سچا تھا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (نور: 55) (وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور نیک عمل کیے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ (انفال: 7) (اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دو گروہوں سے کہ وہ تمہارے لئے ہے)۔

مکی نے کہا: الفاظ کا ظاہر بھی اس کی تائید کرتا ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے وعدہ ہے اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے کوئی وعدہ نہیں ہے۔ پس اس کو واحد پر محمول کرنا واجب ہے ظاہر نص کی وجہ سے کیونکہ فعل صرف اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہے۔ یہ حسن، ابورجاء، ابوجعفر، شیبہ اور عیسیٰ بن عمر کی قراءت ہے۔ قتادہ اور ابن ابی اسحاق نے بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ ابوحاتم نے کہا: ہمارے نزدیک عام لوگوں کی قراءت وعدنا بغیر الف کے ہے کیونکہ المواعدہ زیادہ تر دو شخصوں اور دو بدلہ دینے والوں کے درمیان ہوتا ہے ہر ایک دوسرے سے وعدہ کرتا ہے۔ جوہری نے کہا السیعاد کا معنی باہم وعدہ کرنا، وقت اور جگہ ہے۔ مکی نے کہا: المواعدہ اصل میں دو شخصوں کے درمیان ہوتا ہے۔ کبھی کلام عرب میں (باب) مفاعلہ کا صیغہ واحد کے لئے بھی آتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: طَارَقْتُ النَّعْلَ، دَاوَيْتُ الْعَيْلَ، عَاقَبْتُ الْبَيْتَ۔ ان تمام جملوں میں باب مفاعلہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے حالانکہ ایک شخص کی طرف سے فعل ہوا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے مواعدہ کا لفظ خاص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے وعدنا کے معنی کی طرح ہوگا۔ پس دونوں قرأتوں کا ایک معنی ہو جائے گا، واعدنا الف کے ساتھ اختیار کرنا اس لئے ہے کیونکہ یہ وعدنا کے معنی میں ہے اس کے دو معانی میں سے ایک معنی میں، نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے وعدہ یا قبول کرنا ضروری ہے جو وعدہ کے قائم مقام ہے۔ پس مفاعلہ کا استعمال صحیح ہے۔

نحاس نے کہا: واعدنا (الف کے ساتھ) پڑھنا اجود اور احسن ہے۔ یہ مجاہد، اعرج، ابن کثیر، نافع، اعمش، حمزہ اور کسائی کی قراءت ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ واعدنا موسیٰ یہ باب الموافات ہے۔ وعدہ اور وعید میں سے کوئی شے نہیں ہے، یہ تیرے اس قول سے ہے: موعداك يوم

الجميعه موعداً موضع كذا اس میں فصیح واعدتہ کہنا ہے۔ ابواسحاق زجاج نے کہا: یہاں واعدنا الف کے ساتھ بہتر ہے کیونکہ طاعت کا قبول کرنا موعده کے قائم مقام ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے قبول اور اتباع ہے۔ یہ موعده کے قائم مقام ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ابو عبیدہ نے وعدنا کو ترجیح دی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو قبول کرنا اور اس کا التزام کرنا یہ موعده کے مشابہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد مُوسَىٰ يَهْمِي اسْمُہ۔ عجمہ اور تعریف کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ ایک روایت کے مطابق قبلی لوگ پانی کو مو اور درخت کو شا (سا) کہتے ہیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام تابوت میں پانی اور درخت کے پاس پائے گئے تو انہیں موسیٰ کہا گیا (1)۔ سدی نے کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ان پر خوف ہوا تو اس نے انہیں ایک تابوت میں رکھ دیا اور دریا میں پھینک دیا..... جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے الہام کیا تھا..... اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو درختوں کے درمیان فرعون کے گھر کے قریب دریا میں ڈال دیا۔ فرعون کی بیوی آسیہ کی لونڈیاں غسل کرنے کے لئے نکلیں تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پایا۔ پس اس مکان کے نام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ نام رکھا گیا (2)۔ نقاش وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ جس عورت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا تھا اس کا نام صابوت تھا۔ ابن اسحاق نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شجرہ نسب اس طرح ہے۔ موسیٰ بن عمران بن یصہر بن قاہٹ بن لاوی بن یعقوب اسرائیل اللہ بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام (3)۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَرْبَعِينَ لَيْلَةً، اَرْبَعِينَ مَفْعُول ثانی کی بنا پر منصوب ہے اور کلام میں حذف ہے۔ انفس نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: واذا واعدنا موسىٰ تمام اربعین لیلۃ جیسا کہ وَسُئِلَ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) میں مضاف حذف ہے الاربعون تمام اس وعدہ میں داخل ہیں۔

اکثر مفسرین کا قول ہے کہ یہ چالیس دن ذی القعدہ کا مہینہ اور دس دن ذی الحجہ کے تھے اور یہ اس کے بعد ہوا جب آپ نے دریاعبور کر لیا تھا اور آپ کی قوم نے آپ سے مطالبہ کیا کہ اللہ کی طرف سے ہمارے پاس کتاب لے آئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ستر چیدہ افراد لے کر باہر نکلے اور ایک پہاڑ پر چڑھے اور ان سے مکمل چالیس راتوں کا وعدہ فرمایا، تو مفسرین کے قول کے مطابق انہوں نے بیس دن اور بیس راتیں شمار کیں اور کہنے لگے: ہم سے وعدہ خلائی ہوئی ہے۔ پس انہوں نے ایک بچھڑے کو معبود بنالیا۔ سامری نے انہیں کہا: یہ تمہارا خدا ہے اور موسیٰ کا خدا ہے، وہ سامری کی اس بات پر مطمئن ہو گئے۔ حضرت ہارون نے انہیں منع فرمایا اور فرمایا: يَقُولُوا إِنَّمَا أَنتُم بِمُؤْمِنٍ بِهٖ ؕ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاسْمِعُوا لِي ۖ وَأَطِيعُوا أَمْرِي ۚ قَالُوا لَنْ نُّؤْمَرَ عَلَيْهِ عَاقِبَتُنَا حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ۚ (طہ) (اے میری قوم تم تو فتنہ میں مبتلا ہو گئے اس سے اور بلاشبہ تمہارا رب تو وہ ہے جو بے حد مہربان ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو تو قوم نے کہا ہم تو اسی کی عبادت پر جمے رہیں گے یہاں تک کہ لوٹ آئیں ہماری طرف موسیٰ علیہ السلام)۔ حضرت ہارون کی صرف بارہ ہزار نے بات

2۔ التفسیر والعمون، صفحہ 120، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)



مانی باقیوں نے بچھڑے کی عبادت ترک کرنے میں حضرت ہارون کی اتباع نہ کی اور تمام لوگ اس بچھڑے کی عبادت میں گر گئے اور وہ دس لاکھ سے زائد تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو انہیں اس حال میں پایا آپ نے تختیاں نیچے ڈال دیں۔ پس ان میں سے چھ اجزاء اٹھائے گئے اور ایک تختی باقی رہ گئی جس میں حرام، حلال اور جن احکام کی انہیں احتیاج تھی وہ باقی رہ گئی۔ حضرت موسیٰ نے اس بچھڑے کو جلادیا اور اس کی راکھ کو سمندر میں بکھیر دیا، بنی اسرائیل نے بچھڑے کی محبت کی وجہ سے اس دریا کا پانی پیا۔ پس ان کے ہونٹوں پر زردی ظاہر ہوئی اور ان کے پیٹ پھول گئے۔ پھر انہوں نے توبہ کی تو ان کی توبہ قبول نہ ہوئی حتیٰ کہ وہ اپنے آپ کو قتل کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَوْبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ (البقرہ: 54) پس چاہئے کہ توبہ کرو اپنے خالق کے حضور سونقل کرو اپنے آپ کو۔

پس انہوں نے خنجر اور تلواریں اٹھائیں اور سورج کے طلوع ہونے سے چاشت کے بلند ہونے تک ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا کسی والد نے اپنے بیٹے کے بارے میں اور کسی بیٹے نے والد کے بارے میں، اور بھائی نے بھائی کے بارے میں نہ پوچھا جو سامنے آیا اسے تلوار سے قتل کر دیا اسی طرح ہر ایک نے اپنی مثل کو قتل کیا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر التجا کی: یا رب! بنی اسرائیل تو ختم ہو گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور ان پر اپنا فضل فرمایا۔ پس جو باقی بچ گئے ان کی توبہ قبول فرمائی اور جو مارے گئے انہیں شہداء میں شمار کر دیا جیسا کہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اگر کہا جائے کہ راتوں کو ذکر کے ساتھ خاص کیوں کیا گیا دنوں کا ذکر کیوں نہیں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رات دن سے پہلے ہوتی ہے، یہ رتبہ میں دن سے بلند ہے۔ اسی وجہ سے تاریخ راتوں کے ساتھ واقع ہوتی ہے۔ راتیں مہینوں کا آغاز ہیں اور دن ان کے تابع ہیں۔

**مسئلہ نمبر 5:** نقاش نے کہا: اس آیت میں صوم وصال کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر دنوں کا ذکر فرماتا تو یہ اعتقاد ممکن تھا کہ وہ رات کو افطار کرتے تھے۔ جب راتوں پر نص قائم فرمادی تو کلام کی قوت تقاضا کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن، راتوں سمیت صوم وصال رکھا۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نے اپنے باپ سے سنا، وہ فرما رہے تھے: میں نے شیخ، زاہد، امام، واعظ ابو الفضل الجوبہری رحمہ اللہ سے سنا وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ اور نماز میں اس کے قریب ہونے کے بارے میں وعظ فرما رہے تھے کہ نماز کھانے پینے سے غافل کر دیتی ہے اور وہ فرما رہے تھے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا کتنا قرب نصیب ہوگا کہ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کی طرف جاتے ہوئے اپنے نوجوان ساتھی کو کہا تھا: اتنا ہداء نا، اس قول کی وجہ سے انہوں نے زمانہ کے اسی روزے وصال کے ساتھ رکھے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس آیت سے علماء صوفیہ نے وصال پر استدلال کیا ہے اور ان میں افضل چالیس دن ہیں۔ مزید کلام صوم وصال پر، آیت صیام کے تحت اسی سورت میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور اس آیت کے مزید احکام سورہ اعراف میں و

وَعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً (اعراف: 142) کے تحت آئیں گے۔ اور بچھڑے کا قصہ، اس کی کیفیت کا بیان اور اس کا ذکر کرنا وغیرہ کا ذکر سورہ اعراف میں اور سورہ طہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعَجْلَ مِنْ بَعْدِهَا یعنی تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا موسیٰ علیہ السلام کے بعد۔ اتَّخَذْتُمُ اصل میں اتَّخَذْتُمْ تھا یہ الاخذ سے مشتق ہے۔ اس کا وزن افتعلتم ہے دو ہمزوں کے امتناع کی وجہ سے دوسرے ہمزہ میں تسہیل کی گئی پھر اتَّخَذْتُمْ ہوا، اور یا گردان میں مضطرب رہتی ہے یا تخذ میں الف ہو گئی موتخذ میں واو ہو گئی۔ پس یہاں یا کو ایک پختہ حرف سے بدلا گیا جو مابعد کی جنس سے تھا اور وہ تاء ہے پھر ادغام کیا گیا پھر الف وصل کو نطق (بولنے) کے لئے لایا گیا۔ کبھی اس الف سے استغناء کیا جاتا ہے جب کلام کا معنی تقریر ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا (البقرہ: 80) الف تقریر کی وجہ سے الف وصل سے استغناء کیا گیا۔ شاعر نے کہا:

استحدثت الركب عن اشياهم خبراً  
ام راجع القلب من اطرا به طرباً  
اس شعر میں الف وصل ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ الف تقریر موجود تھا۔ اسی طرح قرآن میں ہے: أَظْلَمَ الْغَيْبِ (مریم: 78) أَصْطَفَى الْبَنَاتِ (الصافات: 153) أَسْتَكْبَرَتْ أُمُّ كُنتَ مِنَ الْعَالِينَ ﴿٥﴾ (ص) ان تینوں مثالوں میں تقریر کی وجہ سے الف وصل ذکر نہیں کیا گیا۔ ابوعلی فارسی کا مذہب یہ ہے کہ اتَّخَذْتُمْ یہ تخذ سے ہے نہ کہ اخذ سے ہے۔ وَأَنْتُمْ ظَلِمُونَ یہ جملہ حال ہے، ظلم کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥١﴾

”پھر بھی درگزر فرمایا ہم نے تم سے اس (ظلم عظیم) کے بعد شاید کہ تم شکر گزار بن جاؤ۔“

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ، العفو، اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کو معاف کرنا۔ کبھی عفو سزا کے بعد ہوتا ہے اور کبھی سزا سے پہلے، بخلاف الغفران کے کہ اس کے ساتھ یقیناً عقوبت ہوتی ہے۔ ہر وہ شخص جو عقوبت کا مستحق ہو پھر اسے سزا (عقوبت) نہ دی گئی ہو تو اسے معاف کیا گیا۔ العفو کا مطلب گناہ کو مٹانا ہے، یعنی ہم نے تمہارے گناہوں کو مٹا دیا اور تم سے تجاوز کیا۔ یہ عفت الريح الاثر سے ماخوذ ہے یعنی ہوانے اثر مٹا دیا، عفا الشئ کسی شے کا کثیر ہونا یہ اضداد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَقِّي عَفْوًا (اعراف: 95)

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ یعنی تمہاری بچھڑے کی عبادت کرنے کے بعد۔ بچھڑے کو عجل اس لئے کہا گیا کہ بنی اسرائیل نے اس کی عبادت میں جلدی کی تھی۔ واللہ اعلم

العجل گائے کے بچے کو کہتے ہیں العجول بھی اسی کو کہتے ہیں اس کی جمع العجاجیل اور مؤنث عجلۃ آتی ہے۔ یہ ابو الجراح سے روایت ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ تاکہ تم شکر ادا کرو اللہ تعالیٰ کے عفو کا۔ لعل کا معنی پہلے گزر چکا

ہے، رہا شکر تو لغت میں اس کا معنی ظہور (ظاہر ہونا) ہے۔

دابۃ شکور وہ جانور جس پر موٹا پا اس سے زیادہ ظاہر ہو جائے جتنا اسے چارہ ڈالا جاتا ہے۔ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کی اس نیکی اور اچھائی پر تعریف کرنا جو اس نے تمہارے ساتھ کی ہے جیسا کہ سورہ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔ جوہری نے کہا: الشکر کا مطلب محسن پر اس اچھائی کی وجہ سے تعریف کرنا جو اس نے تمہارے ساتھ کی ہے۔ کہا جاتا ہے: شکر تہ و شکرت لہ۔ لام صلہ الفصح ہے، الشکران، الکفران کا متضاد ہے، تشکرت لہ یہ شکر تہ لہ کی مثل ہے۔

امام ترمذی اور ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لَا يَشْكُرُ اللَّهُ مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ (1) جو لوگوں کا شکر یہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا نہیں کرتا۔

خطابی نے کہا: اس کلام کے دو معانی ہیں: ایک یہ کہ وہ جس کی طبع میں لوگوں کی نعمت کی ناشکری ہے اور ان کے احسان کا شکر ادا نہیں کرتا اس کی عادت سے، اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہے اور اس کے شکر کا ترک ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احسان پر بندے کا شکر قبول نہیں کرتا جب بندہ لوگوں کے احسان کا شکر ادا نہیں کرتا اور لوگوں کے احسان کی ناشکری کرتا ہے کیونکہ ہر ایک امر دوسرے سے متصل ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** شکر کے معنی میں علماء کی عبارات: حضرت سہل بن عبد اللہ نے کہا: شکر کا مطلب، سرا اور علانیہ معصیت سے اجتناب کے ساتھ ساتھ اطاعت کی ادائیگی میں کوشش کرنا ہے۔

ایک اور گروہ نے کہا: شکر کا مطلب انعام کرنے والے کے شکر کی بجا آوری میں تقصیر کا اعتراف ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا (سبا: 13) حضرت داؤد نے کہا تھا: یارب! میں تیرا کیسے شکر ادا کروں؟ شکر بھی تو تیری طرف سے نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب تو نے مجھے پہچان لیا اور تو نے میرا شکر ادا کیا جب تو نے پہچان لیا کہ شکر بھی میری طرف سے نعمت ہے۔ حضرت داؤد نے عرض کی: یارب! مجھے اپنی سب سے زیادہ مخفی نعمتیں دکھا جو تو نے مجھ پر فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے داؤد! سانس لے۔ حضرت داؤد نے سانس لیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کون ہے جو دن رات میں اس نعمت کو شمار کر سکتا ہے (2)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: میں تیرا کیسے شکر ادا کروں؟ چھوٹی سی نعمت جو تو نے اپنی نعمتوں میں سے میرے ہاتھ میں رکھی میرے سارے اعمال اس کا بدلہ نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی: اے موسیٰ! اب تو نے میرا شکر ادا کیا (3)۔ جنید نے کہا: شکر کی حقیقت شکر سے عجز ہے۔ حضرت جنید سے ہی مروی ہے، فرمایا: میں حضرت سری سقطی کے سامنے کھیل رہا تھا جبکہ سات سال کا تھا اور حضرت سری سقطی کے سامنے ایک جماعت شکر کے بارے گفتگو کر رہی تھی۔ حضرت سری سقطی نے مجھے فرمایا: اے لڑکے! شکر کیا ہے؟ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی وجہ سے اس کی نافرمانی نہ کی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی شکر المعروف، حدیث نمبر 4177، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، حدیث 4415

2۔ اشہب للشیخین، حدیث 4623



جائے۔ حضرت سری سقطی نے مجھے فرمایا: یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرا حصہ تیری زبان ہو۔ جنید نے کہا: میں اس ایک کلمہ پر ہمیشہ روتا رہتا ہوں جو میرے متعلق حضرت سری سقطی نے کہا تھا۔ شبلی نے کہا: نیکیوں پر محافظت اور تواضع، شہوات کی مخالفت، طاعات میں دوام، زمین اور آسمان کے ہمارا مراقبہ، شکر ہے۔

حضرت ذوالنون مصری ابوالفیض نے کہا: جو تجھ سے اُند ہے اس کی اطاعت کرنا شکر ہے، ہم مثل کو بدلہ دینا شکر ہے، جو کم مرتبہ ہے اس کے ساتھ احسان اور فضل کا مظاہرہ کرنا شکر ہے۔

### وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٩﴾

”اور جب عطا فرمائی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق و باطل میں تمیز کی قوت تاکہ تم سیدھی راہ پر چلنے لگو۔“

اِذَا ماضی کے لئے اسم ہے اور اِذَا مستقبل کے لئے اسم ہے، اِتَيْنَا کا مطلب ہے ہم نے عطا کیا۔ ان تمام الفاظ کے معانی پہلے گزر چکے ہیں۔ الْكِتَاب سے مراد بالا جماع تورات ہے اور الْفُرْقَان کے بارے اختلاف ہے۔ فراء اور قطرب نے کہا: اس کا معنی ہے: ہم نے موسیٰ کو تورات اور محمد ﷺ کو فرقان عطا کی۔ نحاس نے کہا: یہ اعراب اور معنی میں غلطی ہے، رہا اعراب تو کسی شے پر معطوف اس کی مثل ہوتا ہے اور اس قول کے اعتبار سے کسی شے پر معطوف اس کے خلاف ہوگا۔ رہا معنی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ (الانبياء: 48) ابواسحاق الزجاج نے کہا: فرقان سے مراد کتاب ہی ہے تاکید کے لئے دو اسموں کے ساتھ اس کا ذکر دوبارہ کیا گیا۔

یہ فراء سے حکایت ہے، شاعر کا قول ہے:

و قدمت الادیم لراہشیہ والفی قولہا کذباً و میناً

اس شعر میں کذب اور مین ایک ہی معنی میں ہیں۔ تاکید کے لئے دو اسم ذکر کیے گئے ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

الاحبدا ہند وارض بہا ہند و ہند اقی من دونہا النای والبعد

اس شعر میں النای اور البعد تاکید کے لئے معطوف کیے گئے ہیں۔ عشرہ کا قول ہے:

خییت من طلل تقادم عہدہ اقوی واقفر بعد ام الہیشم

نحاس نے کہا: یہ شعر میں، ہوتا رہتا ہے، سب سے بہتر اس کے متعلق مجاہد کا قول ہے۔ الْفُرْقَان سے مراد حق اور باطل کے

درمیان فرق کرنے کی صلاحیت ہے (1)، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ ابن زید نے کہا: الْفُرْقَان سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریا کا پھٹنا ہے حتیٰ کہ وہ پھٹ گیا تو انہوں نے دریا عبور کر لیا۔ بعض علماء نے فرمایا:

الْفُرْقَان سے مراد مصیبت سے چھٹکارا ہے کیونکہ وہ قبیضوں سے دور ہو گئے تھے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ تَشْكُوْا

اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا (انفال: 29)

بعض علماء نے فرمایا: الْفُرْقَان سے مراد حجت اور بیان ہے۔ یہ ابن بحر نے کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَاَوَزَانْد ہے معنی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب فرقان عطا کی، وَاَوَسْکَی لغت میں زائد بھی ہوتی ہے جیسے عرب کہتے ہیں: فلان حسن و طویل۔ شاعر نے کہا:

الى الملك القمر و ابن الهمام و ليث الكتيبة في المزدحم

اس شعر میں وَاَوَدُونوں جگہ زائد ہے، کیونکہ مراد الملك القمر، ابن الهمام لیث الکتیبہ ہے۔ اس تاویل کی دلیل یہ ارشاد ہے: ثُمَّ اتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ تَمَامًا عَلَى الَّذِي أَحْسَنَ وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (انعام: 154) (پھر عطا فرمائی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تاکہ پوری کر دیں نعمت ان پر جو نیک عمل کرتے ہیں اور تاکہ تفصیل ہو جائے ہر چیز کی) یعنی حلال، حرام، کفر، ایمان، وعدہ، وعید وغیرہ سب کچھ بیان کر دیا۔

بعض علماء نے فرمایا: الْفُرْقَان کا مطلب ان کے اور فرعون کی قوم کے درمیان جدائی ہے۔ یعنی ان کو نجات دے اور فرعونوں کو غرق کیا۔ اس کی مثال یوم الفرقان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد جنگ بدر کا دن ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب کی مدد فرمائی تھی اور ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کیا تھا (1)۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ تاکہ تم گمراہی سے ہدایت پاؤ۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ لِقَوْمِهِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا  
اِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا اَنْفُسَكُمْ ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۚ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ اِنَّهٗ هُوَ  
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿٥٠﴾

”اور یاد کرو جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے اے میری قوم بے شک تم نے ظلم ڈھایا اپنے آپ پر بچھڑے کو (خدا) بنا کر پس چاہئے کہ توبہ کرو اپنے خالق کے حضور ساقط کر دینے آپ کو جنہوں نے شرک کیا یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک پھر حق تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ لِقَوْمِهِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا اِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا اَنْفُسَكُمْ ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۚ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿٥٠﴾

تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (الحجرات: 11) پھر فرمایا: وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ (الحجرات: 11)

زہیر نے کہا:

دما ادری و سوف اخال ادری اقوم آل حصن ام نساء

اس شعر میں اقوم سے مراد شاعر نے مرد لئے ہیں عورتوں کا علیحدہ ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ طَا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ (اعراف: 80) یہاں صرف مرد مراد ہیں عورتیں نہیں کبھی قوم کا اطلاق

مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **إِنَّا أَنزَلْنَاهُ حَآءِ إِلَى قَوْمِهِ (نوح: 1)** اسی طرح ہر نبی کو عورتوں اور مردوں دونوں کی طرف مبعوث کیا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يَقُومِر** منادی مضاف ہے۔ **يَقُومِر** میں یا کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ حذف کا مقام ہے اور کسرہ اس کے حذف پر دلالت کر رہا ہے یہ یا تنوین کے قائم مقام ہوتی ہے۔ پس تو اسے حذف کر دے گا جس طرح تنوین کو مفرد اسم سے حذف کیا جاتا ہے۔ غیر قرآن میں اس کا سکون کے ساتھ اثبات بھی جائز ہے۔ تو کہے گا: یا قوم کیونکہ یہ اسم ہے اور حالت جری میں ہے، اگر تو چاہے تو اس یا کو فتح دے اگر چاہے تو اس کے ساتھ ہا لاحق کر دے۔ تو کہے گا: یا قومینہ اگر چاہے تو اسے الف سے بدل دے کیونکہ یہ اخف ہے اور تو کہے گا: یا قوما اگر چاہے تو تو کہے گا: یا قوم بمعنی یا ایہا القوم، اگر تو اسے نکرہ بنائے تو تو اسے نصب دے گا اور تنوین دے گا، قوم کا واحد امرؤ ہے جو اس کے لفظ پر نہیں ہے تو کہتا ہے: قوم، اقوام، اقوام یہ جمع الجمع ہے، یہاں قوم سے مراد پچھڑے کے پجاری ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کے امر سے خطاب فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ** یہاں جمع کثرت کی جگہ پر جمع قلت کو ذکر کیا اور کبھی جمع کثرت کو جمع قلت کی جگہ رکھا جاتا ہے اور جمع قلت کو کثرت کی جگہ رکھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ثَلَاثَةٌ قُرْآنٌ (البقرہ: 228)** اور ارشاد فرمایا: **فِيهَا مَا نَشْتَهِيهِ الْإِنْسَانُ (الزخرف: 71)**

ان آیات میں جمع قلت کی جگہ جمع کثرت اور کثرت کی جگہ جمع قلت کا وزن ذکر فرمایا ہے۔

جو کوئی فعل کرتا ہے اس کا ضرر (نقصان) اس کی طرف لوٹتا ہے تو کہا جاتا ہے: **انما أسأت الى نفسك**۔ تو نے اپنے نفس پر برا کیا۔ ظلم کا اصل معنی کسی چیز کو غیر موضوع جگہ پر رکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **بِإِثْمَانِكُمْ الْعَجَلُ** بعض ارباب معانی نے کہا: ہر انسان نے اپنے آپ پر جلدی کی جس نے اسے ساقط کر دیا اور نفس کی خواہش کی مخالفت کی وہ اس کے ظلم سے بری ہوا۔ صحیح یہ ہے کہ انہوں نے حقیقت میں پچھڑے کی عبادت کی تھی جیسا کہ قرآن حکیم نے بیان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَتَوَبُّوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ** جب ان سے کہا گیا کہ تم اپنے پروردگار کی طرف توبہ کرو تو انہوں نے کہا: کیسے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ**۔

ارباب الخواطر نے کہا: اپنے نفسوں کو اطاعت کے ساتھ مطیع کرو اور انہیں شہوات سے روکو۔ صحیح یہ ہے کہ حقیقت میں قتل کرنے کا حکم تھا اور قتل کا مطلب حرکت کو مارنا ہے۔ قتل الخیر یعنی پانی کے ساتھ اس کی شدت کو ختم کر دیا۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: توبہ اللہ تعالیٰ کی ان خاص نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے صرف اس امت کو انعام کی، دوسری امتوں کو یہ نعمت عطا نہ فرمائی۔ بنی اسرائیل کی توبہ قتل کرنا تھا۔ اس پر اجماع ہے کہ ان پچھڑے کے بچاریوں میں سے ہر ایک کو اپنے ہاتھ سے اپنے نفس کو قتل کرنے کا حکم نہیں تھا۔

زہری نے کہا: جب انہیں کہا گیا: **فَتَوَبُّوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ** تو وہ دو صفوں میں کھڑے ہو گئے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے حتیٰ کہ انہیں کہا گیا: اب رک جاؤ۔ یہ عمل مقتول کے لئے شہادت تھا اور زندہ کے لئے توبہ تھا، جیسا کہ



پیچھے گزرا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان پر تار کی بھیج دی تو تار کی میں وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی وہ ایک صف میں کھڑے ہوئے اور جنہوں نے عبادت نہیں کی تھی وہ ہتھیار لے کر ان میں داخل ہوئے اور انہیں قتل کر دیا (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ ستر آدمی کھڑے ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے اور انہوں نے بچھڑے کے پجاریوں کو قتل کیا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ والوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی۔

یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت یوشع بن نون ان کے پاس گئے جبکہ وہ سب گھٹنے کھڑے کر کے ہاتھوں یا کپڑے سے کلاوہ مار کر بیٹھے تھے۔ حضرت یوشع نے کہا: وہ ملعون ہوگا جو اپنا کپڑا یا ہاتھ کھولے گا یا اپنے قاتل کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے گا یا اپنے ہاتھ سے بچاؤ کرے گا یا پاؤں سے بچاؤ کرے گا۔ پس ان میں سے کسی نے اپنا کپڑا نہ کھولا حتیٰ کہ ان میں قتل کیا گیا جو قتل کیا گیا اور ہر شخص نے اپنے قریب والے کو قتل کیا۔ یہ نحاس وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ پس جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی پہلے قول کے مطابق انہیں اپنوں کو قتل کرنے کی سزا دی گئی کیونکہ انہوں نے برائی کو روکا نہیں تھا۔ جب وہ غیر اللہ کی عبادت کر رہے تھے اور وہ علیحدہ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ان پر واجب تھا کہ وہ بچھڑے کی عبادت کرنے والوں کو قتل کریں (2)۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے اپنے بندوں میں جب برائی پھیل جائے اور اسے روکا نہ جائے تو تمام کو سزا دی جاتی ہے۔

جریر نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس قوم میں گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے جبکہ وہ اس برائی کو روک سکتے تھے لیکن انہوں نے روکا نہیں تو اللہ تعالیٰ تمام پر عذاب نازل فرماتا ہے (3)۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں نقل فرمایا۔ اس مفہوم پر کلام آگے آئے گی۔ جب ان میں قتل کی کثرت ہو گئی اور وہ ستر ہزار تک پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمایا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے قتل کو اٹھالیا کیونکہ انہیں اپنوں کو قتل کی مشقت دی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ پر اسلام کے بعد توبہ سے افضل انعام نہیں فرمایا۔ قتادہ نے فاقیلوا انفسکم... اقالہ سے مشتق کیا ہے..... یعنی قتل کے ساتھ اپنی لغزش کا بدلہ دو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ہا ہا ہا، الباری کا معنی الخالق یعنی پیدا کرنے والا ہے ان دونوں کے درمیان فرق ہے۔ الباری نئے سرے سے پیدا کرنے والا ہوتا ہے اور الخالق ایک حال سے دوسرے حال کی طرف نقل کرنے والا ہوتا ہے۔ البدیۃ کا معنی الخلق (مخلوق) ہے۔

یہ فعل بمعنی مفعول ہے لیکن اسے ہمزہ نہیں دیا جاتا۔ ابو عمرو نے بارئکم ہمزہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، وہ تمہیں شعور دیتا ہے، تمہاری مدد کرتا ہے اور تمہیں حکم دیتا ہے۔

نحویوں کا اس کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض وصل میں ضمہ اور کسرہ کو ساکن کر دیتے ہیں اور یہ شعر میں ہوتا ہے، ابو العباس المبرد نے کہا: کلام اور شعر میں معرب حرف میں متواتر حرکات کے ساتھ ساکن کرنا جائز نہیں۔ ابو عمرو کی قراءت غلط ہے۔

نحاس وغیرہ نے کہا: یہ قدماء ائمہ نحو نے جائز قرار دیا ہے انہوں نے بطور دلیل یہ اشعار ذکر کیے ہیں۔

اِذَا اعْوَجَّجْنَ قُلْتَ صَاحِبُ قَوْمٍ  
بِالدَّوِّ امْثَالِ السَّفِينِ الْعُومِ  
امروا لقیس نے کہا:

فَالْيَوْمِ اشْرَبْتُ غَيْرَ مُسْتَعْتَبٍ  
اِثْمًا مِنْ اللَّهِ وَلَا وَاغِلٍ  
ایک اور شاعر نے کہا:

قَالَتْ سَلْبِي اِشْتَرَلْنَا سَوِيقًا (1)  
ایک اور نے کہا:

رَحْتُ وَ فِي رَجْلِيكَ مَا فِيْهَا  
وَقَدْ بَدَاهَنَكَ مِنَ الْمُزْرِ (2)

جس نے معرب کے حرف میں سکون دینے کا انکار کیا اس کی حجت یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کیونکہ وہ اعراب کی علامت ہوتا ہے۔ ابوعلی نے کہا: بنا کی حرکت کو توالی الحركات کے ساتھ ساکن کرنے کے جواز میں نحویوں کا اختلاف نہیں ہے۔

برأ، یہ تبدی الشیء من الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی ایک شے کا دوسری چیز سے جدا ہونا ہے..... الخلق عدم سے وجود کی طرف جدا ہوئی۔ اسی سے برأت من المرض برءاً۔ تو مرض سے شفا یاب ہوا دوسرے لوگ کہتے ہیں برئت من المرض برأ اور برأت منك و من الديون، والعیوب براءة۔ میں تجھ سے، قرضوں سے، عیوب سے بری ہوا۔ اسی سے السبارة للسراة۔ عورت کو جدا کرنا ہے۔ قد باراً شریکہ و امرأۃ، اپنے شریک اور اپنی بیوی کو جدا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَّابٌ عَلَيْكُمْ اس کلام میں حذف ہے، اس تقدیر پر یہ ہے: ففعلتم فتاب علیکم یعنی تم نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے تم سے درگزر فرمایا۔ یعنی تم میں سے باقی لوگوں پر نظر کرم فرمائی۔ اِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ الحمد للہ

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰيُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ بِكَ حَتّٰى تَرٰى اِلٰهَ جَهَنَّمَ فَاَخَذَتْكُمُ الصُّعْقَةُ وَاَنْتُمْ

تَنْظُرُوْنَ ۝۵۹ ثُمَّ بَعَثْنَاكَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶۰

”اور یاد کرو جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تجھ پر جب تک ہم نہ دیکھ لیں اللہ کو ظاہر۔ پس اس گستاخی پر آیا تم کو بجلی کی کڑک نے اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے جلد اٹھایا تمہیں تمہارے مرجانے کے بعد کہہیں تم شکر گزار بنو۔“

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰيُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ بِكَ۔ ہم تیری تصدیق نہیں کریں گے۔ حَتّٰى تَرٰى اِلٰهَ جَهَنَّمَ بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ ستر آدمی تھے جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

اختیار کیا تھا۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کام نہیں سنایا تو انہوں نے اس کے بعد کہا: لَنْ تُؤْمِنَ لَكَ اَنْبِيَاءُ پر ایمان لانا ان کے معجزات کے ظہور کے بعد واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر آسمان سے آگ بھیجی اور انہیں جلا دیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ بَعَثْنَاكَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكَ (پھر ہم نے جلد اٹھایا تمہیں مرجانے کے بعد) ان ستر آدمیوں کا واقعہ ان شاء اللہ سورہ اعراف میں آئے گا۔ ابن فورک نے کہا: یہ احتمال ہے کہ ان کی سزا اس وجہ سے ہو کہ انہوں نے روایت کی طلب کو اس کے صحیح طریقہ سے خارج کر دیا تھا کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اَرْنَا اللہ جہرۃً اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قدرت میں نہیں تھا۔ (1)

اللہ تعالیٰ کی روایت (دیکھنے) کے جواز میں اختلاف ہے۔ اکثر بدعتی لوگ دنیا و آخرت میں اس کا انکار کرتے ہیں اور اہل سنت و جماعت دنیا و آخرت میں اس کے جواز کے قائل ہیں اور آخرت میں اس کے وقوع کے قائل ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے روایت کا طلب کرنا محال کا طلب کرنا نہیں بنایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے روایت کا سوال کیا تھا، مزید کلام اس روایت کے متعلق سورہ انعام اور سورہ اعراف میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جَهْرَةً یہ مصدر ہے حال کی جگہ میں اس کا معنی علانیہ (واضح) ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی عیان ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ الجہر کا اصل معنی ظہور (ظاہر ہونا) ہے اسی سے الجہر بالقراءة ہے یعنی قراءت کو ظاہر کرنا المجاہر بالمعاصی۔ علانیہ گناہ کرنے والا۔ رأیت الامیر جہاراً و جہرۃ یعنی میں نے امیر کو دیکھا جبکہ وہ کسی چیز سے چھپا ہوا نہ تھا۔

حضرت ابن عباس نے جہرۃ ہاء کے فتح کے ساتھ پڑھا۔ یہ دونوں لغتیں ہیں مثلاً زہرۃ زہرۃ۔ الجہر میں جو وہ نہیں ہیں ایک یہ صفت ہے ان کے خطاب کی جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا، انہوں نے بھی علانیہ یہ کہا۔ اس ترکیب کلام میں تقدیم و تاخیر ہوگی۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: و اذ اقلتم جہرۃ یا موسیٰ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ صفت ہے اس کی جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کی روایت کا سوال کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو سامنے دیکھ لیں۔ اس صورت میں کلام میں تقدیم و تاخیر نہ ہوگی۔ الجہر کے ساتھ مؤکد فرمایا تا کہ آنکھوں سے دیکھنے اور خواب میں دیکھنے میں فرق ہو جائے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَآخِذْكُمْ الصُّعْقَةُ۔ الصُّعْقَةُ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی نے اسے الصُّعْقَةُ پڑھا ہے، یہ تمام قرآن میں ابن محیسن کی قراءت ہے۔ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ یہ جملہ حال ہے۔ کہا جاتا ہے: كَيْفَ يَمُوتُونَ وَهُمْ يَنْظُرُونَ (وہ مرے کیسے تھے جبکہ وہ دیکھ رہے تھے) اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کہتے ہیں: دَوَّرَ آلَ فُلَانٍ تَرَاءَىٰ یعنی آل فلاں کے گھر آئے سامنے ہیں۔ بعض نے فرمایا: تَنْظُرُونَ کا معنی ہے: تم اپنے حال، موت اور الصُّعْقَةُ کے آثار نازل ہوئے تم انہیں دیکھ رہے تھے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ بَعَثْنَاكَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكَ یعنی ہم نے زندہ کیا۔ قتادہ نے کہا: وہ مر گئے تھے



ان کی رو میں چلی گئی تھیں پھر وہ اپنی عمریں پوری کرنے کے لئے لوٹائے گئے (1)۔ نحاس نے کہا: یہ قریش کے اس شخص کے خلاف حجت ہے جو دوبارہ اٹھنے پر ایمان نہیں رکھتا اور اہل کتاب کے خلاف حجت ہے کیونکہ انہوں نے اس کی خود خبر دی۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ تاکہ تم شکر ادا کرو جو اس نے تمہارے ساتھ کیا کہ مرنے کے بعد زندہ کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ ایسی موت مر گئے تھے کہ اس سے غیر عبرت حاصل کرے۔ پھر انہیں بھیجا گیا۔ البعث کا اصل معنی الادرسال ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: البعث کا اصل معنی کسی شی کو اپنے محل سے اٹھانا ہے۔ کہا جاتا ہے: بعثت الناقة یعنی میں نے اونٹنی کو حرکت دی۔ امرؤ القیس نے کہا:

وفتيان صدق قد بعثت بسحرة  
فقاموا جميعا بين عاث و نشوان  
اس شعر میں بعث بمعنی حرکت دینا، اٹھانا استعمال ہوا ہے۔ عشرہ نے کہا:

و صحابة شم الانوف بعثتهم  
هيلاً و قد مال الكرى بطلاها  
اس میں بھی بعث اٹھانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: بَعَثْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ یعنی ہم نے تمہاری جہالت کے بعد تمہیں تعلیم دی۔ میں کہتا ہوں: پہلا قول اصح ہے کیونکہ اصل حقیقت ہے، وہ موت، سزا کی موت تھی اسی معنی میں یہ ارشاد ہے: أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أَلُوفٌ حَذَّ الرِّمَاطِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ (البقرہ: 243) جیسا کہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 5:** الماوردی نے کہا: اس میں اختلاف ہے کہ جو مرنے کے بعد لوٹا یا گیا اور وہ احوال دیکھنے کے بعد لوٹا یا گیا جو معرفت پر مجبور کر دیتے ہیں کیا وہ مکلف باقی رہے گا؟ اس کے متعلق دو قول ہیں:

- ۱۔ ان کا مکلف ہونا باقی ہے تاکہ کوئی عاقل مکلف ہونے سے خالی نہ ہو۔
  - ۲۔ مکلف ہونے کا سقوط استدلال کے ساتھ معتبر ہے، اضطرار کے ساتھ نہیں۔
- میں کہتا ہوں: پہلا قول صحیح ہے کیونکہ بنی اسرائیل نے جب ہوا میں پہاڑ دیکھا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے اور آگ انہیں گھیرے ہوئے تھی تو اس چیز نے انہیں ایمان کی طرف مجبور کر دیا اور ان پر تکلیف کا باقی ہونا ثابت ہے۔ اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا معاملہ تھا ان کا مکلف نہ ہونا محال ہے۔

وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّٰنَ وَ السَّلْوٰى ۚ كَلُّوْا مِنۡ مَّا رَزَقْنٰكُمْ ۖ وَ مَا ظَلَمُوْا وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

”اور ہم نے سایہ کر دیا تم پر بادل کا اور اتارا تم پر من و سلویٰ۔ کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمہیں عطا کر رکھی ہیں اور انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر زیادتی کرتے رہتے ہیں۔“

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ یعنی ہم نے بادل کو تم پر چھتری کی مانند کر دیا۔ الْغَمَامَ جمع ہے غمامۃ کی جیسے سحابۃ اور سحاب۔ یہ انخفش سعید نے کہا ہے۔ فراء نے کہا: غمام بھی جائز ہے اس سے مراد بادل ہیں کیونکہ وہ آسمان کو ڈھانپ دیتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو ڈھانپنی گئی ہو وہ مغموں ہے۔ اسی سے المغموں علی عقلہ اور غم الہلال ہے جب چاند کو بادل ڈھانپ دے۔ الغین بھی الغیم کی مثل ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: انہ لیعان علی قلبی۔ میرے دل پر چھا جائے۔ صاحب العین نے کہا: غین علیہ کا مطلب اسے ڈھانپا گیا۔ الغین گھنے درختوں کو کہتے ہیں۔ سدی نے کہا: الْغَمَامَ سفید بادلوں کو کہتے ہیں (1)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اس لئے یہ کیا تھا تا کہ دن کے وقت انہیں سورج کی گرمی سے بچائے اور دن کے آخر میں بادل چھٹ جاتا تا کہ وہ چاند سے رات کے وقت روشنی حاصل کریں۔ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ ان پر مصر اور شام کے درمیان تیر کے صحراء میں ہوا تھا جب انہوں نے جبار لوگوں کے شہر میں داخل ہونے اور ان سے جنگ کرنے سے انکار کیا تھا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: فَادْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا (المائدہ: 24) پس انہیں اسی جگہ سزا دی گئی چالیس سال پانچ یا چھ فراخ میں گھومتے رہے۔ روایت ہے کہ وہ دن کو چلتے تھے اور رات کو ٹھہرتے تھے۔ پس وہ وہاں ہی صبح کرتے جہاں گزشتہ کل صبح کرتے تھے، جب وہ تیر میں جمع تھے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ہمارے لئے کھانا کون لائے گا، اللہ تعالیٰ نے ان پر من و سلوی اتارا۔ پھر انہوں نے کہا: ہمیں سورج کی گرمی سے کون بچائے گا اللہ تعالیٰ نے ان پر بادلوں کا سایہ کر دیا۔ پھر انہوں نے کہا: ہم چراغ کس کے ساتھ جلائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے محلے کے درمیان ایک نور کا ستون بنا دیا۔ مکی نے ذکر کیا ہے کہ وہ آگ کا ستون تھا۔ انہوں نے کہا: ہمارے لئے پانی کون لائے گا، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پتھر پر عصا مارنے کا حکم دیا۔ انہوں نے کہا: ہمارے لئے لباس کون لائے گا، انہیں ایسا لباس دیا گیا جو نہ پرانا ہوتا، نہ بوسیدہ ہوتا اور نہ میلا ہوتا اور بچوں کے بڑھنے کے مطابق ان کے کپڑے بڑے ہوتے جاتے۔ واللہ اعلم (2)

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَانْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوٰی۔ الْمَنَّاءَ کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے۔ اس کی تعیین کئی اقوال پر ہے: بعض نے کہا: ترنجبین ہے۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ الطرنبجین (طآ کے ساتھ بھی کہا جاتا ہے) یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الْمَنَّاءُ سے مراد میٹھی گوند ہے۔ بعض نے فرمایا: شہد ہے بعض نے فرمایا: میٹھی شراب ہے۔ بعض نے فرمایا: باریک روئی ہے۔ یہ وہب بن منبہ سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: الْمَنَّاءُ مصدر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بغیر کسی ٹھکن اور کھیتی باڑی کے احسان فرمایا اس تمام کو شامل ہے (3)۔ اسی سے سعید بن زید بن عمرو بن نفیل کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: الْكُمَاةُ مِنَ الْمَنِّ الَّذِي انْزَلَ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَآئِيلَ وَمَاءُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ (4) دنی روایۃ من المن الذي انزل الله على موسى۔ یعنی کھمبی اس من میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر

2۔ ایضاً، والحمر والوجیز زیر آیت ہذا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

4۔ صحیح بخاری، باب وقولہ تعالیٰ وظللنا علیکم الغمام، حدیث 4118، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الحمر والوجیز زیر آیت ہذا

نازل کیا۔ کھمبی کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے۔

ایک روایت میں ہے، اس مَنْ میں سے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ کھمبی اس میں سے ہے جو اللہ نے بنی اسرائیل پر نازل کیا یعنی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیبہ کے صحرا میں پیدا فرمایا تھا۔

ابو عبیدہ نے کہا: کھمبی کو الْمَنْج کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ اس میں بیج ڈالنے، پانی لگانے اور دیکھ بھال کرنے کی مشقت نہیں۔ پس یہ کھمبی بنی اسرائیل کے مَنْ سے ہے کیونکہ یہ بغیر مشقت کے ملی تھی۔ روایت ہے کہ ان پر من فجر کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک اولوں کی طرح اترتا تھا۔ ہر شخص اپنے لئے اس دن کی خوراک لے لیتا تھا، جو اس سے ذخیرہ کرتا تھا وہ خراب ہو جاتا تھا، مگر جمعہ کے دن وہ ہفتہ کے دن کے لئے ذخیرہ کرتے تھے تو وہ خراب نہیں ہوتا تھا، کیونکہ ہفتہ ان کی عبادت کا دن تھا، ہفتہ کے دن ان پر کچھ نازل نہیں ہوتا تھا۔ (1)

**مسئلہ نمبر 3:** نبی کریم ﷺ نے نص فرمائی کہ کھمبی کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے۔ بعض علماء طب نے فرمایا: آنکھ میں جو حرارت ہوتی ہے اس کو ٹھنڈا کرنے کے لیے صرف اس کا پانی استعمال کیا جاتا ہے اور کسی اور مرض کے لئے دوسری دوا میں مرکب ہو کر استعمال ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آنکھ کی ہر مرض کے لئے خالص اس کا پانی استعمال کرنے کا نظریہ رکھتے تھے (2)۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ ابوہریرہ تمام امراض کے لئے شہد استعمال کرتے تھے حتیٰ کہ آنکھوں کی تکلیف کے لئے بھی شہد استعمال کرتے تھے۔ اس کا بیان سورۃ النحل میں ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اہل لغت نے کہا: الکنم واحد ہے، اس کا تشبیہ کسان ہے اور تین ہو تو اکنم کہا جاتا ہے اور جب زیادہ ہوں تو کناۃ (تاء کے ساتھ) آتا ہے۔ شجرة اور شجر کے برعکس استعمال ہوتا ہے۔ الْمَنْج اسم جنس ہے لفظوں میں اس کا واحد نہیں ہے جیسے الخیر اور الشر۔ یہ انفس نے کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: السَّلَوٰی۔ السَّلَوٰی کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بئیر ہے۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: باجماع مفسرین السَّلَوٰی پرندہ ہے۔ ہذلی نے غلطی کی ہے، اس نے کہا:

د قاسمها بالله جهداً لاتم الذ من السلوی اذا ما نشورها

اس نے اس شعر میں سلوی سے شہد مراد لیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابن عطیہ نے مفسرین کے اجماع کا جو دعویٰ کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مؤرج جو لغت اور تفسیر کے علماء میں سے ہے انہوں نے کہا: السَّلَوٰی سے مراد شہد ہے اور اس نے ہذلی کے مذکور شعر سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ لغت کنانہ اس طرح ہے۔ اس کو سلوی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے تسلی ہوتی ہے۔ اسی سے عین السلوان ہے (بیت



المقدس میں ایک چشمہ ہے جس سے برکت حاصل کی جاتی ہے۔ (جیسے شعر میں ہے:

لو اشرب السلوان ما سليت ما بي غنى عنك وان غنيت

اسی طرح جوہری نے کہا: السلوی۔ شہد ہے اس نے بھی ہذلی کا بیت ذکر کیا ہے۔

الذ من السلوی اذا ما نشورها

اور انہوں نے غلطی کا ذکر نہیں کیا۔ السُلوانۃ، یہ ایک پسی ہے۔ لوگ کہتے ہیں جب اس پر بارش کا پانی ڈالا جائے اور پھر عاشق اس کو پی لے تو اسے تسلی ہو جاتی ہے۔

شرابت علی السلوانۃ ماء مزنۃ فلا وجدید العیش یا مَن ما اسلُو

اس پانی کا نام سلوان ہے۔ بعض نے فرمایا: السلوان ایک دوا ہے جس کو غمگین پیتا ہے تو اس کو تسلی ہوتی ہے۔ اطباء اس کو مفرح کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: سلیت و سلوت یہ دو لغتیں ہیں۔ وہونی سلوۃ من العیش، وہ خوشحال زندگی میں ہے۔ یہ ابو زید سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** السَّلَوٰی کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ جمع ہے یا مفرد ہے۔

انفخش نے کہا: یہ لفظ جمع ہے اس کا واحد نہیں ہے جیسے الخیر اور الشہ ہے اور اس کا واحد سلوی بھی جمع سلوی کے مشابہ ہے جیسے کہتے ہیں دفلی یہ واحد اور جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ سمانی اور شکاعی یہ بھی واحد اور جمع کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ خلیل نے کہا: اس کا واحد سلوۃ ہے جیسے اس شعر میں ہے: (1)

ان لتعرونی لذكرک هزؤ کما انتقص السلوۃ من بدل القطر

کسائی نے کہا: السلوی واحد ہے اور اس کی جمع سلاوی ہے۔ (2)

**مسئلہ نمبر 6:** السَّلَوٰی کا عطف، الْمَنْ پر ہے۔ اس میں اعراب ظاہر نہیں ہے کیونکہ اسم مقصور ہے اور اسم مقصور میں اعراب ظاہر نہ کرنا واجب ہوتا ہے کیونکہ ہمیشہ اس کے آخر میں الف ہوتا ہے۔ خلیل نے کہا: الف، ہوائی حرف ہے اس کا کوئی مستقر نہیں ہے یہ حرکت کے مشابہ ہے اس کی حرکت محال ہے۔ فراء نے کہا: اگر الف کو حرکت دی جائے تو یہ ہمزہ ہو جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** کُلُّوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا مَرَدُّ قُلُوبِکُمْ اس میں حذف سے تقدیر کلام اس طرح ہے: وقلنا کُلُّوا۔ اختصاراً ظاہر کی دلالت کی وجہ سے حذف کیا گیا۔ الطیبات کا لفظ یہاں طلال اور لذیذ دونوں معانی میں ہے۔ (3)

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا ظَلَمُوْا اِسَیْءَۃً فَعَصَوْا مَقْدَرًا کیا جائے گا۔ انہوں نے نعمتوں کے مقابل شکر نہ کیا۔ وَلٰکِنْ کَانُوْا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ بلکہ انہوں نے نعمتوں کے مقابلہ میں گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔

وَ اِذْ قُلْنَا اِذْ خُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَۃَ فَکُلُوْا مِنْهَا حٰیثُ شِئْتُمْ رَءَدًا وَاِذْ خُلُوْا الْبَابَ سُجَّدًا



خزایا ولا ندانی (1)... تبویت بتو ابنا یعنی میں نے دربان بنایا۔

ابواب مبوبہ جیسے کہتے ہیں اصناف مصنفہ۔ ہذا شیء من بابتک۔ یہ تمہارے لئے مناسب ہے۔ سجدہ کا معنی گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ الحمد للہ

وہ دروازہ جس سے انہیں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا وہ بیت المقدس میں تھا۔ آج وہ باب حطہ کے نام سے مشہور ہے۔ مجاہد وغیرہ سے یہ مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد اس قبہ کا دروازہ ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نماز پڑھتے تھے۔ سجداً حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کا مطلب رکوع کی حالت میں جھکتے ہوئے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تواضع کرتے ہوئے، کوئی متعین ہیئت مراد نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقُولُوا اس کا عطف اذْخُلُوا پر ہے۔ حِطَّةً جمہور کی قراءت مرفوع ہے اس بنا پر کہ مبتدا محذوف ہے یعنی مسئلتنا حطۃ یا اس کا یہ اعراب حکایت ہے اور اخفش نے کہا: حطہ کو منصوب بھی پڑھا گیا ہے اس تقدیر پر احطط عنا ذنوبنا حطۃ (ہمارے گناہ معاف فرمادے۔) نحاس نے کہا: حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہیں کہا گیا کہ تم لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہو (2)۔ ایک اور حدیث ان سے مروی ہے کہ انہیں کہا گیا: قولوا مغفرة نصب کی تفسیر یعنی قولوا شیئاً یحط ذنوبکم تم ایسی شے کہو جو تمہارے گناہ معاف کر دے۔ جس طرح کہا جاتا ہے: قل خیراً۔ ائمہ قراء اس پر رفع ہی پڑھتے ہیں یہ لغت کے اعتبار سے اولیٰ ہے۔ اس کی وجہ وہ ہے جو عربوں سے بدل کے معنی میں حکایت کیا گیا ہے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: کہا جاتا ہے بذلتہ یعنی میں نے اسے تبدیل کیا اور میں نے اس کی شخصیت کو زائل نہیں کیا ابدلتہ یعنی میں نے اس شخص اور عین کو بدل دیا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

عزل الامیر للامیر البذل

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَ نَائِتٍ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدِّلَهُ (یونس: 15) (اور کہنے لگتے ہیں وہ جو توقع نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی کہ لے آئے (دوسرا) قرآن اس (قرآن) کے علاوہ یا ردوبدل کر دیجئے)۔

حضرت ابن مسعود کی حدیث ہے، انہوں نے کہا حِطَّةً یہ رفع کی بنا پر تفسیر ہے۔ یہ تمام نحاس کے اقوال ہیں۔ حسن اور عکرمہ نے کہا: حطۃ کا معنی حط ذنوبنا ہے۔ انہیں یہ کہے گا حکم دیا گیا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہوتا کہ اس کی وجہ سے ان کے گناہ گر جائیں۔ ابن جبیر نے کہا: اس کا معنی استغفار ہے (3)۔ ابان بن تغلب نے کہا: اس کا مطلب تو یہ ہے۔ شاعر نے کہا:

فاز بالحطة التي جعل الله بها ذنب عبده مغفوراً

اس نے ایسی توبہ پائی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے گناہوں کو معاف فرمایا۔

ابن الفارس نے ”المجمل“ میں کہا کہ حطۃ یہ ایسا کلمہ ہے جس کا بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا۔ اگر وہ یہ کہتے تو ان کے گناہ

2- صحیح بخاری، باب اداء المس من الايمان، حدیث 402، 85، 51 ضیاء القرآن پبلی کیشنز

1- المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3- تفسیر طبری زیر آیت ہذا



معاف ہو جاتے۔ جوہری نے بھی ”الصحاب“ میں یہی کہا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ انہیں بعینہ یہی لفظ کہنے کا مکلف کیا گیا ہو، حدیث سے بھی ظاہر ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کو کہا گیا: دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو (1) اور حِطَّةً کہو تمہارے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ تو انہوں نے اس حکم کو بدل ڈالا وہ دروازے سے اپنی سرینیں گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے اور انہوں نے کہا: حِطَّةً فی شعرة یعنی (جو میں دانہ)۔ یہ حدیث بخاری نے بھی نقل کی ہے۔ فرمایا: انہوں نے حکم کو بدل ڈالا۔ انہوں نے کہا: حِطَّةً حِطَّةً فی شعرة اور صحیحین کے علاوہ میں ہے: حِطَّةً فی شعر۔ اور کہا گیا ہے: انہوں نے کہا: ہٹا سمہاٹا۔ یہ عبرانی لفظ ہے اس کی تفسیر سرخ گندم ہے۔ یہ ابن قتیبہ نے حکایت کیا ہے اور یہ ہروی نے سدی اور مجاہد سے حکایت کیا ہے۔ ان کا مقصد اس کے خلاف کرنا تھا جو اللہ نے انہیں حکم دیا تھا۔ پس انہوں نے نافرمانی کی، سرکشی کی اور استہزاء کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب کے ساتھ سزا دی۔ ابن زید نے کہا: یہ عذاب طاعون تھا ان کے ستر ہزار آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ روایت ہے کہ دروازہ چھوٹا بنایا گیا تھا تا کہ وہ جھکتے ہوئے داخل ہوں تو وہ اپنی سرینیں گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے۔

**مسئلہ نمبر 6:** بعض علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ منصوص علیہا اقوال کو شریعت میں تبدیل کرنا، اس سے خالی نہیں ہوگا کہ اس لفظ کا یا اس کے معنی کا مکلف بنایا گیا ہوگا۔ اگر اس لفظ کا مکلف بنایا گیا ہو تو اس کو تبدیل کرنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم کو تبدیل کرنے والے کی مذمت کی ہے، اور اگر معنی کا مکلف بنایا گیا ہو تو اس کو ایسی چیز سے تبدیل کرنا جائز ہوگا جو اس معنی کو ادا کرے، اسے ایسی چیز سے تبدیل کرنا جائز نہ ہوگا جو اس معنی سے ہی اسے خارج کر دے۔ (2)

علماء کا اس معنی میں اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ سے حکایت کیا گیا ہے کہ عالم کے لئے خطاب کے مواقع پر حدیث بالمعنی کا نقل کرنا جائز ہے لیکن مکمل طور پر معنی کے ساتھ مطابقت ہو، یہ جمہور کا قول ہے، بہت سے علماء نے الفاظ کو بدلنے سے منع کیا ہے۔ ان میں سے ابن سیرین، قاسم بن محمد اور رجا بن حیوہ ہیں۔

مجاہد نے کہا: حدیث میں اگر تو چاہے تو کمی کر لیکن اس میں اضافہ نہ کر۔ حضرت مالک بن انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں تا اور یا میں بھی ختی کرتے تھے۔ اس بنا پر ائمہ حدیث کی ایک جماعت لفظ کو تبدیل کرنا بھی جائز قرار نہیں دیتی حتیٰ کہ وہ غلط سن لیتے تھے اور اس کو جانتے تھے لیکن اسے بدلتے نہیں تھے۔ ابو مجلز نے قیس بن عباد سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے کوئی حدیث سنی پھر اس نے اسے اسی طرح بیان کیا جس طرح اس نے سنی تھی تو وہ سلامت رہا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو اور حضرت زید بن ارقم سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اس طرح تقدیم و تاخیر، کمی بیشی میں اختلاف ہے کیونکہ بعض علماء معنی کا اعتبار کرتے ہیں بعض لفظ کا اعتبار کرتے ہیں بعض اس میں ختی کرتے ہیں اور لفظ کو نہیں چھوڑتے۔ یہ

1۔ صحیح بخاری، باب حدیث الغرض مع مومن علیہما السلام، حدیث نمبر 3151، ضیاء القرآن پبلیکیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی زیر آیت 4

دین میں احوط، اتنی اور اولیٰ ہے لیکن اکثر علماء کی سیرت سے معلوم ہے وہ واقعات کو مختلف الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ اور یہ نہیں تھا مگر اس لئے کہ وہ اپنی توجہ معانی پر رکھتے تھے اور وہ احادیث پر تکرار اور احادیث کے لکھنے کا التزام نہیں کرتے تھے۔ حضرت واہلہ بن اسقع سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: جو کچھ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہم نے تمہاری طرف اسے نقل کیا، تمہارے لئے معنی کافی ہے۔ قتادہ نے حضرت زرارہ بن اوفیٰ سے کہا: میں نبی کریم ﷺ کے کئی صحابہ سے ملا، انہوں نے مجھے الفاظ مختلف بیان کیے لیکن معنی ایک تھا۔ نخی، حسن اور شعبی حدیث بالمعنی بیان کرتے تھے۔

حسن نے کہا: جب تو معنی صحیح بیان کرے تو تیرے لئے کافی ہے۔ سفیان ثوری نے کہا: جب میں تمہیں کہوں کہ میں تمہیں اسی طرح بیان کرتا ہوں جس طرح میں نے سنا تو میری تصدیق نہ کرو وہ معنی ہے۔ وکیع نے کہا: اگر معنی میں وسعت نہ ہوگی تو لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ علماء کا عجیوں کے لئے ان کی زبان میں شریعت کو نقل کرنے پر اور ان کے لئے ترجمہ کرنے پر اجماع ہے۔ یہ نقل بالمعنی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ایسا ہی کیا ہے جو اس نے گزشتہ قوموں کی خبریں بیان کی ہیں۔ پس اس نے قصص بیان کیے۔ بعض قصص کو مختلف جگہوں پر مختلف الفاظ میں بیان فرمایا جبکہ معنی ایک ہے۔ ان قصص کو ان کی زبان میں عربی زبان کی طرف منتقل کیا اور وہ تقدیم و تاخیر، حذف، الغاء، کمی بیشی میں ان کے مخالف ہیں۔ جب عربی کو عجمی زبان میں بدلنا جائز ہے تو عربی میں بدلنا بدرجہ اولیٰ جائز ہے اسی معنی سے حسن اور امام شافعی نے حجت پکڑنی ہے۔ یہ اس بات میں صحیح ہے۔ اگر کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اسے شاداب رکھے جس نے میری بات کو سنا پھر اسے آگے پہنچایا جس طرح اس کو سنا تھا (1)۔ اور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے ایک شخص کو اپنے بستر پر سونے کے وقت کی دعا سکھائی۔ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ وَنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ (2)۔ اس شخص نے دوبارہ یہ الفاظ پڑھے تو اس نے کہا: ورسولك الذي أرسلت۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: وَنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ کہو۔ روایت بالمعنی کے عدم جواز کے قائل علماء کہتے ہیں: کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ نبی کریم ﷺ نے جسے دعا سکھائی اسے لفظ کی مخالفت کی اجازت نہ دی اور فرمایا: اسی طرح ادا کرو جس طرح سنا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فَأَذَاهَا كَمَا سَمِعَهَا کے ارشاد میں مراد اس کا حکم ہے اس کا لفظ نہیں ہے کیونکہ لفظ کا اعتبار نہیں اور تیری رہنمائی کرتا ہے یہ اصول کہ خطاب سے مراد اس کا حکم ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: فَرُبَّ حَامِلٍ فِقْهٍ غَيْرُ فِقْهٍ وَرُبَّ حَامِلٍ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ یعنی بہت سے فقہ حاصل کرنے والے فقہ نہیں ہوتے اور بہت سے فقہ حاصل کرنے والے اس کی طرف پہنچاتے ہیں جو ان سے زیادہ فقہ ہوتا ہے۔ پھر یہ حدیث بعینہ مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے جبکہ معنی ایک ہے اگرچہ تمام الفاظ کا مختلف اوقات میں نبی کریم ﷺ سے صادر ہونا ممکن ہے لیکن اغلب یہی ہے کہ یہ ایک حدیث ہے جو مختلف الفاظ سے نقل کی گئی ہے یہ جواز کی واضح دلیل ہے۔ رہا نبی کریم ﷺ کا اس شخص کو رسولك کے لفظ سے نبیک کی طرف لوٹانا، اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کا لفظ زیادہ مدح کا باعث تھا ان

1۔ البوداد، باب فضل نشر العلم، حدیث نمبر 3175 (مفہوم) ایضاً، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 231، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب فضل من بات علی الوضوء حدیث نمبر 239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دونوں صفات میں ہر صفت کا خاص موقع محل ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ رسول کا اسم تمام پر واقع ہوتا ہے اور نبی کا اسم صرف انبیاء کرام کے لئے بولا جاتا ہے۔ رسولوں کو انبیاء سے فضیلت دی گئی ہے کیونکہ وہ نبوت و رسالت کو جمع کرتے ہیں۔ جب ونبیک فرمایا تو ایسی نعت ذکر فرمائی جو زیادہ مدح کا باعث تھی پھر اسے الذی ارسلت فرما کر رسالت کے ساتھ مقید فرمایا..... پس رسولک کے قول سے نبیک کے قول کی طرف اگر اسے لوٹایا ہے تو یہ اس لئے ہے تاکہ نبوت و رسالت کو جمع کرے۔ یہ کلام کہنا پسندیدہ نہیں ہے کہ تو کہے: هذا رسول فلان الذی ارسله هذا قتیل زید الذی قتله، کیونکہ ان عبارات میں معنی کا تکرار ہے کیونکہ بعد والی کلام پہلے معنی کو ہی مفید ہے۔ یہ کہنا بہتر ہے: هذا رسول عبد اللہ الذی ارسله الی عمرو و هذا قتیل زید الذی قتله بالامس اوفی وقعة کذا۔ یعنی یہ عبد اللہ کا پیغام رساں ہے جسے اس نے عمرو کی طرف بھیجا ہے یہ زید کا مقتول ہے جسے اس نے کل قتل کیا تھا یا فلاں واقعہ میں قتل کیا تھا۔

اگر کہا جائے کہ جب پہلے راوی کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بدلنا جائز ہے تو دوسرے راوی کے لئے راوی کے الفاظ بدلنا بھی جائز ہوگا اور یہ باریک فرق اور خفا کی وجہ سے حدیث کو کلیۃً ختم کرنے کی طرف پہنچا دے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ روایت بالمعنی کا جواز معنی کی مطابقت اور مساوات کے ساتھ مشروط ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، اگر معنی سے مطابقت نہ ہو تو جائز نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس مسئلہ میں اختلاف صحابہ اور تابعین کے زمانہ کی طرف نظیر کرنے سے متصور ہوتا ہے کیونکہ وہ مادری زبان کی معرفت میں برابر تھے۔ رہا بعد والے لوگوں کا حکم ہم اس میں شک نہیں کرتے کہ یہ جائز نہیں ہے کیونکہ طبائع بدل چکی ہے، مفہوم مختلف ہو چکے ہیں، عادتیں تبدیل ہو چکی ہیں یہی حق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ابن عربی نے ایک انوکھی بات کی ہے کیونکہ جب جواز معنی کی مطابقت کے ساتھ مشروط ہے تو پھر صحابہ، تابعین اور دوسرے لوگوں کے درمیان فرق نہ رہا۔ اسی وجہ سے اصولیین اور محدثین میں سے کسی نے یہ تفریق نہیں کی۔ ہاں اگر ابن عربی کہتے کہ ان کے زمانہ میں مطابقت بہت بعید ہے تو یہ بہتر ہوتا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ نافع نے یا مضموم کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن عامر نے تا مضموم کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مجاہد کی قراءت ہے باقی قراء نے نون کے ساتھ پڑھا ہے اور نون پر نصب پڑھی ہے یہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اس سے پہلے وَ اِذْ قُلْنَا اِذْ خُلُوْا ہے۔ پس تَغْفِرْ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینے پر جاری ہے، تقدیر کلام اس طرح ہوگی: قُلْنَا اِذْ خُلُوْا الباب سجداً نغفر۔ نیز بعد میں بھی سنزید نون کے ساتھ آ رہا ہے۔ خَطِيئَتُمْ یہ اکثر کے قول کے مطابق ہے۔ یہ اپنے باب پر ہے اور جن علماء نے تغفرتا کے ساتھ پڑھا ہے ان کی وجہ یہ ہے کہ لفظ خَطِيئَتُمْ مونث ہے اس لئے صیغہ بھی مونث ہوگا، کیونکہ یہ خطیئۃ کی جمع مکسر ہے اور یا پڑھنے کی وجہ سے جب فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ آ گیا تو فعل کا مذکر ذکر کرنا جائز ہوتا ہے جیسا کہ پیچھے فَتَلَقَّى اٰدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ (البقرہ: 37) میں گزرا ہے یا اور تا بہتر ہیں، اگرچہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینے کا ذکر ہے وَ اِذْ قُلْنَا مِیں کیونکہ یہ تو معلوم ہے کہ گناہوں کو بخشنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، پس نون سے استغنا کیا اور فعل کو معاف شدہ خطاؤں کی طرف لوٹایا۔



**مسئلہ نمبر 8:** خطایا جو کہ خطیئہ کی جمع ہے اس کی اصل میں اختلاف ہے۔ خطیئہ ہمزہ کے ساتھ ہے۔ خلیل نے کہا: خطایا اصل میں خطائی تھا پھر قلب کیا گیا او کہا گیا: خطائی یعنی ہمزہ پہلے یا بعد میں پھریا کو الف سے بدلا گیا خطاء ہو گیا جب دو الف جمع ہوئے جن کے درمیان ہمزہ ہے تو ہمزہ الف کی جنس سے بدل گیا پھر گویا تین الف جمع ہو گئے پھر ہمزہ کو یا سے بدلا گیا تو ہو گیا خطایا۔

سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ اصل خطائی ہے پھر یا کو ہمزہ بنایا گیا جس طرح مداین میں یا کو ہمزہ بنایا گیا تو خطائی ہو گیا۔ پھر ایک کلمہ میں دو ہمزے جمع نہیں ہوتے۔ پس دوسرے ہمزہ کو یا سے بدلا گیا تو خطائی ہو گیا پھر پہلی صورت کی طرح عمل کیا گیا۔

فراء نے کہا: خطایا جمع خطیہ (بغیر ہمزہ کے) ہے۔ جیسے تو کہتا ہو: ہدیۃ و ہدایا۔ فراء نے کہا: اگر خطایا، خطیئہ (مہموزہ) جمع ہوتا تو خطاء کہتا۔ کسائی نے کہا: اگر اس کی جمع مہموزہ ہو تو ایک ہمزہ دوسرے ہمزہ میں ادغام ہو جائے گا جیسے تو کہتا ہے: دو اب۔

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَسَتَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ** یعنی جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی ان کے احسان میں ہم اضافہ کر دیں گے۔ کہا جاتا ہے: دوسرے دن کے لئے من و سلوئی جمع کرنے کی خطائیں معاف کر دیں گے اور جس نے دوسرے دن کے لئے من و سلوئی جمع نہیں کیا ان کے احسان میں اضافہ کر دیں گے۔ کہا جاتا ہے: جو گنہگار ہے اس کی خطائیں معاف کر دیں گے اور جو محسن ہے اس کے احسان میں اضافہ کر دیں گے۔ یعنی ہم ان کے پاس سابقہ احسان پر احسان کا اضافہ کر دیں گے۔ محسنین، احسن سے اسم فاعل ہے۔ المحسن وہ ہوتا ہے جس کا توحید کا عقدہ صحیح ہو اور اپنے آپ کو چلانے میں خوبصورت ہو اور اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہو، مسلمانوں سے اپنے شر کو روکے۔ حدیث جبریل میں ہے، احسان کیا ہے؟ فرمایا: تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اگر تو اسے نہ دیکھ سکے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ جبریل نے کہا: آپ نے سچ فرمایا (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔

**فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا أَرْجُزًا**

**مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝۹۱**

”پس بدل ڈالا ان ظالموں نے اور بات سے جو کہا گیا تھا انہیں تو ہم نے اتارا ان ستم پیشہ لوگوں پر عذاب آسمان

سے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔“

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا**، الَّذِينَ محل رفع میں ہے یعنی ان میں سے ظالموں نے بدلا اور بات سے جو انہیں کہا گیا تھا۔ یہ اس طرح ہے کہ انہیں کہا گیا تھا کہ تم کہو: حِطَّةٌ تو انہوں نے کہا حنطة

جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔ انہوں نے ایک حرف کلام سے زیادہ کر دیا۔ پس وہ مصیبت سے دو چار ہوئے، اس میں یہ آگاہی دی کہ دین میں زیادتی اور شریعت میں اپنی ایجاد عظیم خطرہ اور شدید نقصان کا باعث ہے۔ یہ ایک کلمہ کی تبدیلی کی وجہ سے ہوا جو توبہ سے تعبیر تھا وہ ایسے بڑے عذاب کا موجب بنا پھر تمہارا کیا خیال ہے جو معبود کی صفات میں تبدیلی کرتے ہیں۔ یہ قول کی تبدیلی کی سزا تھی حالانکہ قول، عمل سے کم ہوتا ہے، تو جو فعل میں تبدیلی کرتے ہیں ان کا کیا حشر ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَبَدَلْ، بَدَل اور ابدل کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ عَسَى رَبُّنَا أَنْ يُبَدِّلَنَا دُونِ طَرَحٍ پڑھا گیا ہے۔ جوہری نے کہا: ابدلت الشيء غيرة۔ تو نے کسی چیز کو دوسری چیز سے بدل ڈالا۔ بدلہ اللہ من الخوف امنًا، اللہ تعالیٰ نے اس کے خوف کو امن سے بدل دیا، تبدیل الشيء کسی چیز کو تبدیل کرنا اگرچہ اس کا بدل نہ بھی لایا جائے۔ استبدل الشيء بغيره و تبدلہ به۔ جب ایک چیز کی جگہ دوسری چیز بدل دے، البادلہ کا معنی تبادلہ کرنا۔ الابدال، ایسے نیک لوگوں کو کہتے ہیں جن سے دنیا خالی نہیں ہوتی۔ جب ان میں سے کوئی ایک فوت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرے کو ابدال بنا دیتا ہے۔

ابن درید نے کہا، واحد، بدیل ہے اور البدیل کا معنی بدل ہے۔ بدل الشيء غيرة کسی چیز کو دوسری چیز سے بدلنا۔ کہا جاتا ہے: بَدَلْ، بَدَلْ۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ جیسے شَبَهَ، شَبَّهَ۔ مَثَلَ، اور مَثَلَ۔ نَكَلْ، اور نَكَلْ۔ ابو عبید نے کہا: ان چار حروف کے علاوہ فَعَلَ اور فَعَلَ نہیں سنا گیا۔ البدل اس تکلیف کو بھی کہتے ہیں جو دونوں ہاتھوں اور پیروں میں ہوتی ہے۔ بَدَلْ، يَبْدُلْ بَدَلًا بھی استعمال ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا مِائِدًا مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِمْ فَزَكِّهِمْ (البقرہ: 79) پھر بعد میں فرمایا قَلِيلًا قَوْلٌ لَّهِمْ وَمَا كُنْتُمْ تَتْلُونَ (البقرہ: 79) ماسکتبوا نہیں فرمایا۔ ویل کا لفظ ان کے فعل کی تغلیظ کے لئے دوبارہ ذکر فرمایا۔ اسی سے خساء کا قول ہے:

تَعْرِقَنِي الدَّهْرُ نَهْسًا وَ حَزًّا وَ اَوْجَعَنِي الدَّهْرُ قَرَعًا وَ غَمًّا

یعنی زمانہ نے مجھے بڑی بڑی مصیبتوں اور چھوٹی چھوٹی تکلیفوں سے دو چار کیا۔

دوسری قسم تکرار کی یہ ہوتی ہے کہ ضمیر کی جگہ پر کلام کے مکمل ہونے سے پہلے اسم ظاہر کا تکرار کیا جاتا ہے جیسے اَلْعَاقَةُ ۝ مَا اَلْعَاقَةُ ۝ (الحاقہ) اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا اَلْقَارِعَةُ ۝ (القارعة) اگر تعظیم و تفعیم کا ارادہ نہ کیا جاتا تو قیاس کا تقاضا یہ تھا الحاقۃ ماہی، القارعة ماہی۔ اس کی مثل ہے فَاصْطَبْ السَّيْمَةَ ۝ مَا اَصْطَبْ السَّيْمَةَ ۝ (الواقعة) وَ اَصْطَبْ السَّيْمَةَ ۝ مَا اَصْطَبْ السَّيْمَةَ ۝ (الواقعة) اَصْطَبْ السَّيْمَةَ کو ان کے بڑے ثواب کو پانے کی وجہ سے اظہار شان کے لئے مقرر ذکر کیا اور اَصْطَبْ السَّيْمَةَ کو ان کے عذاب الیم کے پانے کی وجہ سے مقرر ذکر کیا ہے۔

اسی قسم سے شاعر کا قول ہے:

كان الغراب مقطع الوداج

ليت الغراب غدا ينعب دائباً

اس شعر میں شاعر نے الغراب کو دو دفعہ ذکر کیا۔

عدی بن زید نے دونوں معانی کو جمع کیا ہے۔ اس نے کہا:

نقص الموت ذا الغنى والفقير

لا ارى الموت يسبق الموت شيء

شاعر نے موت کے لفظ کو تین مرتبہ ذکر کیا۔ یہ پہلی قسم سے ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

و هند اق من دونها النأى والبعد

الاحتذا هند و ارض بها هند

اس میں شاعر نے محبوب کی عظمت شان کے لئے اس کا تین دفعہ ذکر کیا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يَا جُزْأُ جَمْهُورٍ كِرَاتٍ رَجْزُ الرَّاءِ كَسْرُهُ** کے ساتھ ہے اور ابن محیسن نے راء کے

ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الرجز کا معنی عذاب ہے اور سین کے ساتھ رجس ہو تو اس کا معنی بد بو اور گندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے: **فَزَادَ ثَمَّ يَاجُزْأُ** (توبہ: 125) یعنی بد بو کو ان کی بد بو کی طرف زیادہ کر دیا۔ یہ کسائی کا قول ہے۔

فراء نے کہا: الرجز سے الرجس ایک چیز ہے۔ ابو عبید نے کہا: جیسے کہا جاتا ہے السدغ، الزدغ اسی طرح رجس اور رجز ہم

معنی ہیں۔ فراء نے کہا: بعض نے کہا الرجز (راء کے ضمہ کے ساتھ) ایک بت کا نام ہے جس کی وہ عبادت کرتے تھے۔ اس کے

ساتھ بھی اس ارشاد میں پڑھا گیا ہے: **الرَّجْزُ فَاهَجَرُ**۔

اور الرجز (راء اور جیم کے فتح کے ساتھ) یہ شعر کی ایک قسم ہے۔ خلیل نے شعر ہونے کا انکار کیا ہے۔ یہ الرجز سے مشتق ہے

جو اونٹ کے پیچھے حصہ کو لاحق ہوتی ہے جب اسے لاحق ہوتی ہے تو اس کی رانیں کانپنے لگتی ہیں۔

**يَهَاكَ لَوْ اَيُّفُسُقُونَ** یعنی یفسقہم۔ الفسق کا معنی نکلنا ہے۔ یہ پیچھے گزر چکا ہے۔ ابن وثاب اور نخعی نے یفسقون سین

کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

**وَ اِذَا سْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا**

**عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَ اشْرَبُوا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا**

**تَعْمُوا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝۱۰**

”اور یاد کرو جب پانی کی دعا مانگی موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے تو ہم نے فرمایا: مارو اپنا عصا فلاں چٹان پر۔ تو فوراً

بہہ نکلے اس چٹان سے بارہ چشمے۔ پہچان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ۔ کھاؤ اور پیو اللہ کے دیئے ہوئے رزق

سے اور نہ پھر زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے۔“

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔



**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِذَا سَأَلَكَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اتَّقَاءَ سَائِلِينَ** کی وجہ سے ذال کو کسرہ دیا گیا ہے، سین، سوال کے لئے ہے مثلاً استعلم، استخبر، استنصر (علم طلب کرنا۔ خیر طلب کرنا، مدد چاہنا) یعنی اپنی قوم کے لئے پانی پلانا طلب کیا۔ عرب کہتے ہیں: سقیۃ و اسقیۃ یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ شاعر نے کہا:

سقى قومی بنی مجید واسقى نبيًا والقبائل من هلال

اور یہ بھی کہا گیا ہے: سقیۃ یہ سقى الشفة سے مشتق ہے۔ اسقیۃ کا مطلب ہے: میں نے پانی پر اس کی رہنمائی کی۔  
**مسئلہ نمبر 2:** الاستسقاء، پانی کے نہ ہونے اور بارش نہ برسنے پر ہوتا ہے۔ جب صورت حال ایسی ہو تو اس وقت عبودیت، فقر، مسکنت اور ذلت کے اظہار کا حکم ہوتا ہے ساتھ ساتھ خالص توبہ کا بھی حکم ہوتا ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش طلب کی، آپ عید گاہ کی طرف تواضع و انکساری اور تضرع و زاری کرتے ہوئے نکلے (1)۔ یہ تیرے لئے دلیل کافی ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تو ہمارے لئے کتنا ضروری ہوگا، ہماری توبہ بھی نہیں ہوتی مگر یہ کہ ہٹ دھرمی، اللہ تعالیٰ کی مخالفت۔ ہمیں پھر بارش کیسے دی جائے گی۔ لیکن حدیث ابن عمر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لوگوں نے اپنے اموال کی زکوٰۃ کو نہ روکا مگر آسمان سے بارش روک دی گئی۔ اگر چو پائے نہ ہوتے تو انہیں بارش نہ دی جاتی (2)، مکمل حدیث آگے آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 3:** استسقاء کا طریقہ: عید گاہ کی طرف نکلنا ہے..... جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے..... خطبہ اور نماز ہے، یہ جمہور علماء کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی نسبت سے نہ نماز ہے نہ عید گاہ کی طرف نکلنا ہے یہ صرف دعا ہے اور امام ابو حنیفہ نے حضرت انس کی صحیح حدیث سے حجت پکڑی ہے جسے بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے۔

اس حدیث میں امام ابو حنیفہ کے لئے حجت نہیں ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی جو فوراً قبول کی گئی، آپ نے اسی پر اکتفا کیا اور دوسری چیزوں کو چھوڑ دیا۔ اس میں سنت کے بیان کا ارادہ نہ کیا۔ جب سنت کے بیان کا قصد کیا تو اپنے فعل سے اسے بیان کیا جیسا کہ عبد اللہ بن زید المازنی نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید گاہ کی طرف نکلے بارش طلب کی اور اپنی چادر کو الٹا یا اور دو رکعت نماز پڑھی (3)، اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا۔ استسقاء کے مزید احکام سورہ ہود میں آئیں گے۔ ان شاء اللہ

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ، الْعَصَا، ذُنْدَا۔** یہ اسم مقصور مؤنث ہے، اس کا الف واؤ کا بدل ہے۔ شاعر نے کہا:

على عصوبها سابري مشبري

1۔ سنن ابن ماجہ، باب ما جاء في صلاة الاستسقاء، حدیث نمبر 1255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب العقوبات، حدیث نمبر 4008، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، ابواب الاستسقاء، باب تحویل الرداء فی الاستسقاء، حدیث نمبر 956، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(یعنی ڈول کی لکڑیوں پر بار یک پھٹا ہوا کپڑا ہے)

عصا کی جمع عُصَيٌّ و عُصَيٌّ یہ فعول کا وزن ہے عین کو مابعد کسرہ کی وجہ سے کسرہ دیا گیا اور اس کی جمع اُصَص بھی آتی ہے مثلاً زمن اذ من - ضرب المثل ہے: العصا من العصية یعنی بعض امر، بعض سے ہے۔ عربوں کا قول ہے: القی عصاہ۔ یعنی اس نے سفر ترک کر دیا۔ یہ مثال ہے۔ کہا:

فالت عصاها واستقر بها النوى  
كما قر عیناً بالایاب السافر  
قرآن حکیم میں ہے:

وَمَا تَلَكَ بِمِیْنِكَ یُوسُفٰی ﴿۵۰﴾ قَالَ هٰی عَصَیّۃٌ اَتَوَكَّلُ عَلَیْهَا (ط)

عصا کے منافع پر کلام اسی آیت کے تحت ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فراء نے کہا: سب سے پہلی غلطی عراق میں سنی گئی۔ وہ یہ تھی: هذه عصاتی۔ کبھی اجتماع و افتراق کو عصا سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی وجہ سے خوارج کے بارے میں کہا جاتا ہے: شقوا عصا المسلمين یعنی خوارج نے مسلمانوں کے اجتماع کو پھاڑ دیا۔ وانشقت العصا، یعنی اختلاف واقع ہو گیا۔ شاعر نے کہا:

اذا كانت الهیجاء وانشقت العصا  
فحسبك والضحاك سیف مہند

یعنی تجھے اور ضحاک کو تیز تلوار کفایت کرے گی جب بجو شروع ہو جائے اور اختلاف واقع ہو جائے۔

عرب کہتے ہیں: لا ترفع عصاک عن اهلك یعنی ان کو ادب سکھاؤ۔ واللہ اعلم

حجر (پتھر) قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ تھوڑے پتھر ہوں تو اس کی جمع احجار ہو اور زیادہ ہوں تو حجار، حجارة ہو اور الحجارة بہت نادر ہے۔ یہ ہمارے اس قول کی طرح ہے: جبل و جمالہ۔ ذکر و ذکارۃ۔ اسی طرح ابن الفارس اور جوہری نے کہا۔

میں کہتا ہوں: قرآن میں ہے: فِیْ کَالْحِجَارَةِ (البقرہ: 74) وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ (البقرہ: 74) قُلْ کُوْنُوْا حِجَارَةً (الاسراء: 50) تَزْمِیْنٰهُمْ بِحِجَارَةٍ (الفیل: 4) وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهُمْ حِجَارَةً (الحجر: 74) قرآن میں اتنی مرتبہ حجر کی جمع حجارة استعمال ہوئی ہے تو پھر یہ نادر کیسے ہے۔ مگر یہ کہ یہ دونوں یہ مراد لیتے ہوں کہ قیاس میں نادر ہے استعمال میں کثیر فصیح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْفَجَرَتْ اس کلام میں حذف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: فضرب فانفجرت۔ اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر تھا کہ وہ پانی کو نکال دیتا اور بغیر ضرب کے پتھر کو پھاڑ دیتا لیکن اس نے اپنی حکمت کی وجہ سے مسببات کو اسباب کے ساتھ مربوط فرمایا تاکہ اس کے بدلے اپنی مراد تک پہنچ سکیں اور اس پر آخرت میں ان کا ثواب و عقاب مرتب ہو الانفجار کا معنی الانشقاق (پھٹنا) ہے۔ اسی سے ہے: انشق الفجر۔ انفجر الماء انفجاراً یعنی فجر پھوٹ پڑی، پانی کھل گیا، الفجرة اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے پانی نکلے۔ الانبجاس۔ یہ انفجار سے نکل ہوتا ہے کیونکہ پہلے انبجاس ہوتا ہے پھر انفجار ہوتا





حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے بڑا معجزہ ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں صبح و شام پتھروں سے پانی نکل رہا ہے لیکن ہمارے نبی کا معجزہ ایسا تھا جو ہمارے نبی سے پہلے کسی کے لئے نہیں تھا، ہمارے نبی نے گوشت اور خون کے درمیان سے پانی نکالا۔ ائمہ ثقات اور فقہاء اثبات نے حضرت عبد اللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے۔ ہم نے پانی نہ پایا، تو ایک چھوٹا سا پتھر کا پیالہ لایا گیا آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس میں داخل کیا، میں نے دیکھا پانی آپ کی انگلیوں سے نکل رہا تھا اور آپ فرما رہے تھے، آؤ پاکیزہ پانی کی طرف (1)۔ اعمش نے کہا: مجھے سالم بن ابی الجعد نے بیان کیا، فرمایا: میں نے حضرت جابر سے پوچھا: اس وقت تم کتنے لوگ تھے؟ حضرت جابر نے کہا: پندرہ سو۔ یہ نسائی کے الفاظ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ** یعنی ان میں سے ہر ایک قبیلہ کے لئے ایک چشمہ تھا جسے وہ قبیلہ پہچانتا تھا اور وہ کسی دوسرے چشمہ سے نہیں پیتا تھا۔ المشرب، (پینے کی جگہ)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد مشروب ہے۔

اسباط بنی اسرائیل میں عربوں کے قبائل کی طرح تھے۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد تھے۔ ہر سبط کے لئے ایک چشمہ تھا وہ اس سے تجاوز نہیں کرتے تھے (2)۔ عطا نے کہا: اس پتھر کے چار اطراف تھے ہر ایک طرف سے تین چشمے نکلتے تھے ہر سبط کے لئے ایک چشمہ تھا ہر ایک اپنے چشمہ کو ہی استعمال کرتا تھا اور ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ ہر سبط میں پچاس ہزار جنگجو تھے، ان کے گھوڑوں اور چوپایوں کے علاوہ، عطا نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ضرب سے پتھر پر عورت کے پستان کی مثل پہلے ابھار پیدا ہوتا پھر پانی بہنے لگتا۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كُلُوا وَاشْرَبُوا** کلام میں حذف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: **وَقَدْ نَالَهُم كَلَامُ** **الْمَنِّ وَالسَّلْوَىٰ وَاشْرَبُوا الْبَاءَ الْمُتَفَجِّرَ الْفَصْلَ**۔ ہم نے انہیں کہا: **مَنْ** وسلویٰ کھاؤ اور پھوٹنے والا پانی پیو۔

وَلَا تَغْشُوا عِثْرًا يَعْنِي فساد برپا نہ کرو۔ العِثْر، سخت فساد کو کہتے ہیں اس سے انہیں منع فرمایا۔ کہا جاتا ہے: عِثْرٌ يَعِثُ عِثْرًا وَعِثْرًا يَعِثُ عِثْرًا۔ عِثْرٌ يَعِثُ عِثْرًا، معاشاً۔ پہلی لغت قرآن ہے۔ کہا جاتا ہے: عِثْرٌ يَعِثُ (مضاعف) اس کا معنی بھی فساد برپا کرنا ہے۔ اس سے العِثْر ہے، اون چاٹنے والا کیرا۔

مفسرین یہ حال ہے، لفظ کے اختلاف کی وجہ سے تاکیدا معنی کو مکرر ذکر کیا ہے ان کلمات میں نعمتوں کی اباحت، ان کی تعداد، معاصی کی طرف پیش قدمی اور ان سے نہی کا ذکر ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسَىٰ لَنْ نُّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُثْبِتُ  
الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصِلَهَا ۖ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي

1۔ صحیح بخاری، باب علامات النبوة فی الاسلام، حدیث نمبر 3314، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3807

## 2- المحرر الوجيز في آيت هذا

Marfat.com

بعض اوقات طعام کے ساتھ گندم اور کھجور کو خاص کیا جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری کی حدیث میں ہے۔ فرمایا: ہم رسول اللہ کے عہد میں صدقہ فطر ایک صاع طعام یا ایک صاع جو نکالتے تھے (1)۔ عرف اسی سے جاری ہے کہ جب کوئی کہتا ہے: ذہبت الی سوق الطعام تو اس سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ جگہ جہاں کھانے یا پینے کی چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ الطعم (طاء کے فتح کے ساتھ) جو ذائقہ دے۔ کہا جاتا ہے: طعمہ مراں کا ذائقہ کڑوا ہے۔ الطعم جس کی بدخواہی کی جائے۔ کہا جاتا ہے: لیس لہ طعم اس کا کوئی ذوق نہیں ہے۔ وما فلاں بذی طعام، جب کوئی بیکار شخص ہو۔ الطعم (طاء کے ضمہ کے ساتھ) کھانا۔ ابو خراش نے کہا:

ارذ شجاع البطن لو تعلیمینہ و أوتر غیری من عیالک بالطعم  
واغتبق الماء القراح فانتھی اذا الزاد امسی للمزنج ذاطعم

شاعر نے پہلے طعم سے کھانا مراد لیا اور دوسرے طعم سے وہ چیز مراد لی جس کا شوق کیا جاتا ہے۔ طعم یطعم فهو طام، جب کوئی کھائے اور چکھے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي (البقرہ: 249) (یعنی جس نے نہ چکھا) فرمایا قَدْ أَكَلْتُمْ فَأَنْتُمْ قَائِلُونَ (احزاب: 53) (یعنی جب تم کھا چکو)۔

رسول اللہ ﷺ نے زمزم کے بارے میں فرمایا: انھا طعام طعم و شفاء سقم یہ کھانے کا کھانا ہے اور بیمار کے لئے شفاء ہے۔ استطعن فلان الحدیث یعنی اس نے مجھے بات بتائی۔ اور حدیث میں ہے: استطعن فلان الحدیث۔ یعنی اس نے مجھے بات بتائی۔ اور حدیث میں ہے: اذا استطعکم الامام فاطمہ۔ جب امام تم پر اپنے خزانے کھول دے تو تم بھی اس پر کھول دو۔ فلان ما یعظم النوم الا قائماً، وہ شخص کھڑے کھڑے سو لیتا ہے۔ شاعر نے کہا:

نعاماً بوجرة صفر الخدو د ما تطعم النوم الا صياماً

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ غُلْنَا رَبَّكَ يُخْرِجُ لَنَا مِمَّا تُثْبِتُ الْأَرْضُ بَنِي عَامِرٍ كِفْتَ فَادِمِ عَيْنَ كَسْرِهِ کے ساتھ ہے کیونکہ دوساکنوں کا اتقاء ہو گیا ہے۔ وہ معقل کو صحیح کے قائم مقام رکھتے ہیں۔ وہ محذوف کا اعتبار نہیں کرتے۔ اور یُخْرِجُ کو جزم سنہ اور قُلْ لہ کے معنی کی وجہ سے ہے۔ اخراج، یخرج۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ لام کے حذف کی تقدیر کے ساتھ دعا کے معنی میں ہے۔ زجاج نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ وثما میں من اخفش کے قول کے مطابق زائدہ ہے اور سیبویہ کے قول کے مطابق غیر زائدہ ہے کیونکہ کلام موجب ہے۔ نحاس نے کہا: اخفش نے یہ اس لئے کیا کیونکہ اس نے خراج کا مفعول نہیں پایا۔ اس نے ما کو مفعول بنانے کا ارادہ کیا۔ بہتر یہ ہے کہ مفعول محذوف ہو اس پر تمام کلام دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: یخرج لنا مما تنبت الارض ما کولاً۔ اس صورت میں پہلا من بعضیہ ہے اور دوسرا تخصیص کے لئے ہے۔ و من بقلها حرف جر کے اعادہ کے ساتھ یہ ما سے بدل ہے۔ وَقَفَّأ يَهَا، یہ معطوف ہے اسی طرح بعد والی کلام بھی معطوف ہے، البقل۔ ہر وہ سبزی جس کا تنانہ ہو الشجر جس کا تنانہ ہو۔

1۔ صحیح بخاری، باب صدقة الفطر صاع من طعام، حدیث نمبر 1412، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



القشاء یہ معروف ہے۔ کبھی اس میں قاف کو ضمہ دیا جاتا ہے یہ یحییٰ بن وثاب اور طلحہ بن مصرف کی قراءت ہے (1)۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ کسرہ زیادہ ہے۔ بعض نے جمع میں قشائی کہا جیسے علباء کی جمع علابی مگر قشاء واوی ہے تو کہتا ہے: اقشأت القوم یعنی میں نے لوگوں کو کھیرے کھلائے و قشأت القدر جب ہانڈی کے پانی کا ابلنا ختم ہو جائے۔ جعدی نے کہا:

تفور علينا قدرهم فندیہا و نفثوها عنا اذا حمیها غلا

فشأت الرجل جب کسی کو کلام یا کسی اور ذریعے سے توڑ دے اور تو اس کے غصہ کو ٹھنڈا کر دے۔ عداحتی افشأ، یعنی وہ دوڑا ہتی کہ وہ تھک گیا، اور اس نے پوری کوشش کی۔ افشأ الحار، گرمی ڈھیلی پڑ گئی۔ عرب تھوڑی سی نیکی میں مثال دیتے ہیں: ان الرثینۃ تفشأت فی الغضب۔ اس کی اصل یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں سے ناراض ہو اور غصہ کے ساتھ ساتھ وہ بھوکا بھی تھا۔ پس انہوں نے اسے وہی یا لسی پلائی تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ الرثینۃ، کٹھی چیز پر دوہا گیا دودھ تاکہ وہ وہی بن جائے، رثأت اللبن رثاً جب دودھ کو کٹھی چیز پر دوہا جائے تاکہ وہی بن جائے۔ اسم الرثینۃ سے ارتشأ اللبن۔ اس کا معنی ہے: دودھ وہی بن گیا۔

ابن ماجہ نے اپنی سند سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: میری والدہ موٹا پے کے لئے میرا علاج کرتی تھی۔ آپ چاہتی تھیں کہ آپ مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجیں۔ یہ ان کے لئے ممکن نہ ہوا حتیٰ کہ میں نے کھجور کے ساتھ کھیرے کھائے تو میں اچھی طرح موٹی ہو گئی (2)۔ یہ سند صحیح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَفُؤِمَهَا۔ فوم کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ تھوم ہے کیونکہ پیاز کے مشابہ ہے یہ جویر نے ضحاک سے روایت کیا ہے۔ الثاء، فاء سے بدل جاتی ہے جیسے عرب کہتے ہیں: مغافیر اور مغاشیر۔ جَدَثٌ و جَدَفٌ (قبر) حضرت ابن مسعود نے ثاء کے ساتھ ثوم ہی پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہی مروی ہے۔ امیہ بن صلت نے کہا:

كانت منارلهم اذ ذاك ظاهرة فيها الفراء ديس والغومان والبصل

ان کے گھر ظاہر تھے ان میں انگور کی بلیں، تھوم اور پیاز تھے۔

حضرت حسان نے کہا:

وانتم اناس لثام الاصول طعامكم الفوم و الحوقل

تم لوگ اصل کے اعتبار سے لئیم (کینے) ہو تمہارا کھانا تھوم اور سبزیاں ہیں۔

یعنی تھوم اور پیاز ہے۔ یہ کسائی اور نضر بن ہمیل کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الفوم سے مراد گندم ہے۔ حضرت ابن عباس اور اکثر مفسرین سے یہی مروی ہے (3)۔ نحاس نے اس کو پسند کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ معنی بہتر ہے، جس نے یہ معنی کیا ہے وہ اعلیٰ ہے اور اس کی اسانید صحیح ہیں اور جویر کی روایت کے لئے کوئی مثال نہیں ہے اگرچہ کسائی اور فراء

2۔ سنن ابن ماجہ، باب القشاء والرطب یجمعان، حدیث نمبر 3314، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

نے بھی پہلے قول کو پسند فرمایا ہے کیونکہ عرب فا کو ثا سے بدل دیتے ہیں اور ابدال پر قیاس نہیں کیا جاتا۔ اور یہ عربوں کے کلام میں زیادہ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس نے احمیہ بن جراح کا شعر پڑھا اس شخص کے لئے جس نے آپ سے فوم کا مطلب پوچھا جبکہ وہ گندم ہے:

قد كنت اغنى الناس شخصا واجداً      ورد المدينة عن زراعة فوم

ابن درید نے کہا: الفومة سے مراد خوشہ ہے۔ اس نے یہ شعر پڑھا:

وقال ربهم لما اتانا      بكفه فومة او فومتان

ان کے چوکیدار نے کہا: جب وہ ہمارے پاس آیا اس کی ہتھیلی میں ایک خوشہ تھا یا دو تھے۔

اور بکفہ میں حافیر مشبوع حرکت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الفوم سے مراد دال ہے۔ یہ شامی لغت ہے اس کے پیچھے والے کو فامی مغیر عن فوم۔ کیونکہ وہ نسب میں تبدیلی کرتے تھے جیسا کہ سہلی اور دہری نے کہا۔ کہا جاتا ہے: فوموالنا، ہمارے لئے روٹی پکاؤ۔ فراء نے کہا: یہ قدیم لغت ہے۔ عطا اور قتادہ نے کہا: الفوم ہر اس دانے کو کہتے ہیں جس سے روٹی پکائی جائے۔

**مسئلہ:** علماء کا پیاز، تھوم اور بد بودار دوسری سبزیاں کھانے میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء ان کی اباحت کے قائل ہیں کیونکہ ان کے بارے میں احادیث ثابت ہیں اور اہل ظواہر کا ایک گروہ جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض خیال کرتے ہیں وہ ایسی چیزوں کے کھانے سے منع کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ہر وہ چیز جو فرض کی طرف آنے اور فرض کے قیام سے روکے اس کا کرنا حرام ہے اور اس کے ساتھ مشغول ہونا حرام ہے۔ انہوں نے اس سے دلیل پکڑی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو خبیث کہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کا وصف بیان فرمایا کہ يُخْزَمُ الْخَبَائِثُ کہ آپ خبیث چیزوں کو حرام کرتے ہیں اور جمہور کی حجت وہ حدیث ہے جو حضرت جابر سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک تھال لایا گیا جس میں سبزیاں تھیں۔ آپ نے ان سے بو محسوس کی۔ حضرت جابر نے فرمایا: آپ ﷺ کو ان سبزیوں کے متعلق بتایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو ان کے (صحابہ جو آپ کے پاس موجود تھے) قریب کر دو۔ جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ وہ صحابہ بھی اس کا کھانا ناپسند کر رہے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم کھاؤ کیونکہ میں ان سے باتیں کرتا ہوں جن سے تم باتیں نہیں کرتے (۱)۔ اس حدیث کو مسلم اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اس حدیث میں واضح ثبوت ہے کہ یہ آپ کے لئے نہ کھانا خاص تھا اور دوسروں کے لئے مباح تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوایوب سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت ابوایوب کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے لئے کھانا تیار کیا جس میں تھوم بھی تھا۔ جب کھانا واپس حضرت ابوایوب کے گھر بھیجا گیا تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کی انگلیوں کے لگنے کی جگہ پوچھی تو انہیں بتایا گیا کہ آپ ﷺ نے یہ کھانا کھایا ہی نہیں۔ حضرت ابوایوب پریشان ہوئے اور آپ کے پاس اوپر چڑھ گئے۔ پوچھا: حضور! کیا یہ حرام ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نہیں لیکن میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔ حضرت ابوایوب نے کہا میں بھی اسے ناپسند کرتا ہوں جسے آپ ناپسند کرتے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی اکل الثوم، حدیث نمبر 3326، تنبیہ القرآن، جلی کیشنز

ہیں یا فرمایا: جسے آپ نے ناپسند کیا۔ فرمایا: نبی کریم ﷺ کے پاس وحی آتی تھی یہ حرام نہ ہونے پر نص ہے۔ اسی طرح حضرت ابوسعید خدری نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے جب صحابہ نے خیر کے حملہ اور اس کی فتح کے زمانہ میں تھوم کھایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا میں اسے حرام نہیں کر سکتا لیکن یہ ایک درخت (تھوم) ہے جسے میں ناپسند کرتا ہوں۔ یہ تمام احادیث یہ شعور دیتی ہیں کہ یہ حکم آپ کے ساتھ خاص ہے کیونکہ فرشتوں کے ساتھ ہم کلام ہونے میں آپ خاص تھے لیکن حدیث میں اس حکم کو اس طرح پایا کہ آپ ﷺ اور دوسرے لوگ اس میں برابر ہیں۔ جہاں فرمایا: جس نے اس سبزی تھوم سے کھایا..... کبھی فرمایا: میں نے پیاز اور تھوم اور کراٹ (بدبودار سبزی ہے) سے کھایا..... وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ ملائکہ کو بھی اس سے تکلیف ہوتی ہے جس سے بنی آدم کو تکلیف ہوتی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے ایک طویل حدیث میں فرمایا: اے لوگو! تم ان درختوں سے کھاتے ہو میں انہیں خبیث دیکھتا ہوں۔ یہ پیاز اور تھوم ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جب آپ مسجد میں کسی شخص سے ان دو چیزوں (پیاز، تھوم) کی بدبو محسوس کرتے تو اسے نکالنے کا حکم دیتے تو وہ بقیع کی طرف نکال دیا جاتا۔ تو جوان دو (پیاز اور تھوم) میں سے کھائے اسے اچھی طرح پکا کر کھائے۔ (مسلم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَدَسُهَا وَبَصِلُهَا، العدس معروف ہے۔ العدس وہ پھوڑا جوان کو نکلتا ہے اور بعض اوقات اسے قتل کر دیتا ہے۔ عدس نخچر کو جھڑکنے کے لئے بولتے ہیں۔

عَدَسٌ مَالْعِبَادِ عَلَيْكَ اِمَارَةٌ نَجْوَتِ وَ هَذَا تَحْمِلِينَ طَلِيقِ

العدس۔ سختی سے روندنے کو کہتے ہیں اور کوشش کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: عدسہ، عدس فی الارض۔ یعنی زمین میں چلا گیا۔ وعدست الیہ المنیۃ، موت اس کی طرف چلی۔ کیت نے کہا:

اَكْفَهَا هَوْلُ الظَّلَامِ وَ لَمْ اَزَلْ اَحَا اللَّيْلُ مَعْدُوساً اِلَى وَعَادِسا

یعنی میری طرف رات کے وقت اسے چلایا جاتا ہے۔

عدس ایک لغت میں حدس بھی ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: دال کھاؤ کیونکہ یہ برکت والی اور مقدس ہے، یہ دل کو نرم کرتی ہے اور آنسوؤں کو زیادہ کرتی ہے، اس میں ستر انبیاء کی برکت ڈالی گئی ہے۔ ان میں آخری حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں (1)۔ یہ ثعلبی وغیرہ نے ذکر ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز ایک دن زیتون کے تیل کے ساتھ روٹی کھاتے تھے، ایک دن گوشت کے ساتھ اور ایک دن دال کے ساتھ۔ حلیمی نے کہا: دال اور زیتون کا تیل نیک لوگوں کا کھانا ہے، اگر دال کی فضیلت نہ ہوتی، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ضیافت اپنے شہر میں اس سے خالی نہیں ہوتی تھی، اس میں کفایت تھی۔ اس کے فوائد میں سے یہ ہے کہ یہ جسم کو ہلکا کرتی ہے اور بدن عبادت کے

1۔ اس روایت کو ابن جوزی نے الموضوعات جلد 2، صفحہ 197 میں ذکر کیا ہے۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 103



لئے ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس سے شہوات نہیں ابھرتیں جس طرح گوشت سے ابھرتی ہیں اور حنطة، دانوں میں سے دانہ ہے اور صحیح قول کے مطابق یہی قوم (گندم) ہے اور جو اس کے قریب ہے۔ اہل مدینہ کا کھانا گندم تھی جس طرح کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شہر کا کھانا دال تھی۔ پس ان دونوں دانوں میں سے ہر ایک دانہ کے لئے کسی ایک نبی کی وجہ سے فضیلت ہے۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کبھی سیراب نہیں ہوئے درآں حالیکہ آپ ﷺ اور آپ کے گھر والے تین دن متواتر گندم کی روٹی سے سیر نہیں ہوئے۔ یہ معمول رہا مدینہ طیبہ سے لے کر وصال تک (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قَالَ اسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِي هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ**۔ الاستبدال کا مطلب کسی چیز کو دوسری چیز کی جگہ رکھنا۔ اسی سے بدل ہے پہلے اس کا معنی گزر چکا ہے۔ ادنیٰ زجاج کے نزدیک الدنو سے مشتق ہے یعنی قیمت میں قرب۔ یہ عربوں کے اس قول سے ہے: **ثوبٌ مقارب**۔ کم قیمت کپڑا۔ علی بن سلیمان نے کہا: یہ مہوز ہے الدن البین الدناءة سے مشتق ہے یعنی خسیں ترین مگر اس کے ہمزہ میں تخفیف کی گئی۔ بعض نے فرمایا: الدون سے مشتق ہے۔ گراوا۔ اس کی اصل ادون، أفعل ہے پھر اس میں قلب ہوا فاعل ہوا پھر واو کو طرف کلمہ میں ہونے کی وجہ سے الف سے بدلا گیا اور شاذ صورتوں میں ادنیٰ بھی پڑھا گیا ہے (2)۔ آیت کا معنی یہ ہے کیا تم سبزیوں، گلزیوں، تھوم، دال اور پیاز جو ادنیٰ (گھٹیا) ہیں انہیں بدلنا چاہتے ہو من و سلویٰ جگہ جو من و سلویٰ ان سے بہتر ہیں۔

ان وجوہ میں اختلاف ہے جو دوسری چیزوں پر من و سلویٰ کی فضیلت کا موجب ہیں۔

۱۔ سبزیوں کی من و سلویٰ کی نسبت کوئی اہمیت نہ تھی وہ دونوں کھانے افضل تھے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

۲۔ جب من و سلویٰ کا کھانا اللہ تعالیٰ کا ان پر انعام تھا اور اس نے وہ انہیں کھانے کا حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے امر کی ہمیشہ پیروی کرنا اور اس کی نعمت کا شکر کرنا آخرت میں اجر اور ذکر کا موجب تھا اور جو انہوں نے طلب کیا وہ ان خصائل میں عاریہ تھا۔ پس اس وجہ سے وہ کھانا ادنیٰ تھا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے جو ان پر احسان فرمایا وہ زیادہ پاکیزہ اور لذیذ تھا نسبت اس کے جو انہوں نے مطالبہ کیا۔ پس اس وجہ سے لامحالہ جو انہوں نے سوال کیا وہ ادنیٰ تھا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے جو انہیں عطا فرمایا تھا اس میں کوئی کلفت و تھکاوٹ نہ تھی اور جو انہوں نے طلب کیا وہ کھیتی باڑی اور تھکن سے ملتا تھا۔ پس یہ ادنیٰ ہوا۔

۵۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا تھا اس کے حلال ہونے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول کی وجہ سے اس کے خالص ہونے میں کوئی شک نہیں تھا اور باقی تمام دانے اور زمین جن کو بیوع اور غصب لاحق ہوتا اور ان میں شبہ داخل ہوتا ہے اس وجہ سے یہ ادنیٰ تھا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاطعمہ، باب ما کان النبی واصحابہ یأکلون، حدیث نمبر 4996، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز فی آیات ہذا

**مسئلہ:** اس آیت میں طیبات اور متلذذ کھانے کے جواز پر دلیل ہے۔ نبی کریم ﷺ صلی اللہ علیہ وسلم طویٰ اور شہد پسند فرماتے تھے (1) اور ٹھنڈا، میٹھا پانی پیتے تھے۔ یہ مفہوم سورہ مائدہ اور سورہ النحل میں تفصیل کے ساتھ آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِهْبِطُوا مِصْرًا**، ہبوط کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ یہ امر کا صیغہ انہیں عاجز کرنے کے لئے ہے جیسے یہ ہے **قُلْ كُونُوا حِجَابًا أَوْ حَبِيبًا** (الاسراء) کیونکہ وہ تہ میں تھے اور یہ ان کیلئے سزا تھی۔ بعض نے کہا: انہوں نے جو طلب کیا وہ انہیں دیا گیا (2) **مِصْرًا** تنوین کے ساتھ نکرہ یہ جمہور کی قراءت ہے اور یہی قرآن کا خط ہے (3)۔ مجاہد وغیرہ نے کہا: جنہوں نے اس کو منصرف بنایا انہوں نے غیر معین شہر مراد لیا۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: **إِهْبِطُوا مِصْرًا**۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: شہروں میں سے ایک شہر۔ ایک طائفہ جنہوں نے اس کو منصرف بنایا انہوں نے معین فرعون کا شہر مراد لیا۔ پہلے قول والے علماء نے ظاہر قرآن کے مقتضی سے استدلال کیا ہے کہ انہیں شہر میں داخل ہونے کا حکم ہوا تھا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ وہ تہ کے بعد شام میں ٹھہرے تھے۔ اور دوسرے قول کے قائلین نے جو قرآن میں وارد ہے اس سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو آل فرعون کے شہروں اور آثار کا وارث بنایا تھا اور ان علماء نے اس کے منصرف ہونے کو جائز قرار دیا۔ انفس اور کسائی نے کہا: اس کی خفت اور ہندا اور دعد سے مشابہت کی وجہ سے اس کا منصرف ہونا جائز ہے۔ شعر ہے:

لَمْ تَتْلَفْ بِفَضْلِ مِثْرَهَا دَعْدٌ وَلَمْ تَسْقِ دَعْدٌ فِي الْعَلْبِ

دعد نے اپنی اضافی چادر کے ساتھ اپنے آپ کو نہ لپیٹا اور چڑے کے پیالے میں اسے دودھ نہ پلایا گیا۔

اس شعر میں شاعر نے دونوں لغتیں (منصرف اور غیر منصرف) جمع کی ہیں۔ سیبویہ، خلیل اور فراء اس کو جائز قرار نہیں دیتے کیونکہ اگر تو کسی عورت کا نام زید رکھ دے تو وہ منصرف نہیں ہو جائے گا۔ انفس کے علاوہ علماء نے کہا: اس سے مراد مکان ہے اس لئے منصرف ہے۔ حسن، ابان بن تغلب اور طلحہ نے اسے **مِصْرًا** غیر منصرف پڑھا ہے اسی طرح حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں اور حضرت ابن مسعود کی قراءت میں ہے (4)۔ انہوں نے کہا: یہ فرعون کا مصر ہے۔ اشہب نے کہا: مجھے امام مالک نے فرمایا: میرے نزدیک مصر تمہارا شہر ہے جو فرعون کا مسکن تھا۔ یہ ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے (5)۔ مصر کا لغوی معنی الحد ہے۔ مصر الدار (گھر کی حدود) ابن فارس نے کہا: کہا جاتا ہے کہ اہل حجر اپنی شروط میں لکھتے تھے: اشتري فلان الدار بمصورها۔ یعنی فلاں نے گھر حدود سمیت خریدا..... عدی نے کہا:

وَجَاعَلَ الشَّمْسُ مِصْرًا لَا خِفَاءَ بِهِ بَيْنَ النَّهَارِ وَبَيْنَ اللَّيْلِ قَدْ فَصَّلَا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَإِنْ لَكُمْ مَسَآلَتُمْ، مَّا، إِنْ كِي وَجِهَ سَ حَالَتِ نَصَبِ مِی** ہے۔ ابن وثاب اور نخعی نے سألتم

(سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے)۔ کہا جاتا ہے: سألَتْ و سَلَتْ بغير همزة کے، یہ واوی الفاظ میں سے ہے اس کی دلیل عربوں کا قول يتساولان ہے۔ وَضْرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ یعنی وہ ذلت و مسكنت سے ملائے گئے ان پر ان دونوں کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ضرب القباب سے مشتق ہے (1)۔ فرزدق نے جریر کے متعلق کہا تھا:

ضربت عليك العنكبوت بنسجها و قضى عليك به الكتاب المنزل  
تجھ پر مکڑی نے اپنا جال لگا دیا ہے اور اس کا تجھ پر فیصلہ نازل شدہ کتاب نے کیا ہے۔

ضرب الحاکم علی الید۔ یعنی اس سے اٹھایا اور لازم کیا، الذلّة، رسوائی، المسکنۃ غربت۔ کوئی یہودی فقر اور خضوع اور ذلت سے خالی نہیں ہوگا اگرچہ وہ غنی بھی ہو۔ المسکنۃ، سکون سے مشتق ہے یعنی فقر نے اس کی حرکت کو کم کر دیا۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔

ابو عبیدہ نے کہا: الذلہ کا معنی رسوائی ہے: المسکنۃ، المسکین کا مصدر ہے۔ ضحاک بن مزاحم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، وَضْرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ فرمایا: ان سے جز یہ وصول کیا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَاغُوْا یعنی وہ لوٹے اور پلٹے۔ یہ ان کو لازم ہو گیا۔ اسی سے نبی کریم ﷺ کی دعا ہے ابو بنعتک علی (2)۔ یعنی میں تیری نعمت کا اقرار و اعتراف کرتا ہوں اور اپنے نفس پر اسے لازم کرتا ہوں۔ لغت میں اس کا معنی رجوع ہے۔ کہا جاتا ہے: باء بکذا، یعنی اس کے ساتھ لوٹا۔ و باء الی الباء، منزل کی طرف لوٹا۔ البواء قصاص کے ساتھ لوٹنا۔ ہم فی هذا الامر بواء، یعنی وہ اس امر میں برابر ہیں۔ وہ اس امر میں ایک معنی کی طرف لوٹتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

الانتهمی عنا ملوک و تتقی محارمنا لا یبؤد الدم بالدم  
یعنی کیا بادشاہ ہم سے رکے نہیں ہیں اور ہماری محارم سے بچتے نہیں ہیں خود خون خون کو قصاص میں لوٹاتا نہیں  
فابوا بالنہاب و بالسبایا و ابنا بالبلوک مصفدینا  
یعنی وہ لوٹے اور ہم بھی لوٹے۔

الغضب کا معنی پہلے سورہ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ يٰٓعِلٰتِ بِيٰنٍ هٰٓؤُلَآءِ سَوَآءٌ مِّمَّنْ كَانُوْا يٰٓكٰفِرُوْنَ یعنی وہ جھلاتے ہیں بِاٰيٰتِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب کی آیات اور انبیاء کے معجزات جیسے حضرت عیسیٰ، حضرت یحییٰ، حضرت زکریا اور حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام یَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٰنَ، یَكْفُرُوْنَ پر معطوف ہے۔ حسن سے مروی ہے، یقتلون پڑھنا بھی مروی ہے اور ان سے دوسرے قراء کی طرح پڑھنا بھی مروی ہے۔ نافع نے النبیین ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ قرآن میں واقع ہوا ہے مگر سورۃ الاحزاب میں اِنْ وَهَبْتَ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ (الاحزاب: 50) میں اور لَا تَدْخُلُوْا بِيٰوَتِ النَّبِيِّ (الاحزاب: 53)



میں بغیر مد اور بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے ان دونوں جگہوں پر ہمزہ کو ترک کیا کیونکہ دو مکسور ہمزے جمع ہو رہے تھے اور باقی قراء نے پورے قرآن میں ہمزہ کو ترک کیا ہے (1)۔ جنہوں نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ انباء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے خبر دینا۔ اس کا اسم فاعل مُنبئ ہے (2) نبی کی جمع انبیاء ہے اور نبی کی جمع نُبَّاء بھی آئی ہے۔ عباس بن مرداس السلمی نے نبی کریم ﷺ کی مدح میں کہا۔

يا خاتم النبأ انك مرسلٌ بالحق كل هدى السبيل هداكا  
اے خاتم النبیین! تم حق کے ساتھ مبعوث کیے گئے ہو اور ہر ہدایت کا راستہ آپ کی ہدایت سے ہے۔

یہ ہمزہ کی قراءت کا معنی ہے۔ ہمزہ کے ترک کرنے والوں میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: ہمزہ سے اشتقاق کیا پھر ہمزہ میں تسہیل کی۔ بعض نے فرمایا: یہ نبیین (ظاہر ہونا) سے مشتق ہے۔ پس النبی، نبوة سے جس کا معنی بلند ہونا ہے، پس نبی کا مرتبہ بلند ہے بغیر ہمزہ کے نبی سے مراد راستہ بھی ہوتا ہے رسول کو نبی کہا جاتا ہے کہ مخلوق اس سے ہدایت حاصل کرتی ہے جیسے راستہ سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ شاعر نے کہا:

لاصبح رثباً دقاق الحمى مكان النبى من الكائب

رثبت الشیء میں نے اسے توڑ دیا۔ کہا جاتا ہے: رثم انفذ ورثہ، یعنی تا اور ثا دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ الرثم کا مطلب السرتم یعنی ٹوٹا ہوا بھی ہے، الکائب پہاڑ کا نام ہے۔ انبیاء ہمارے زمین میں راستوں کی مانند ہیں۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے کہا: السلام علیک یا نبی اللہ ہمزہ ذکر کیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لست بنبی اللہ۔ لیکن میں نبی اللہ (بغیر ہمزہ کے) ہوں۔ ابوعلی نے کہا: اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے، اور اس کے ضعف کو جو چیز مزید قوت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ مدح کرنے والے نے نبی کریم ﷺ کی اس طرح مدح کی یا خاتم النبأ..... الخ۔ اور اس پر آپ ﷺ کا انکار مروی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَغْذِرُ الْحَقُّ، برائی اور جو انہوں نے جرم کیا تھا اس کی بڑائی بیان کرنا ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ دلیل ہے کہ حق کے ساتھ ان کو قتل کرنا صحیح ہوگا۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ معصوم ہوتے ہیں اس سے کہ ان سے کوئی ایسا قول یا فعل صادر ہو جس کی وجہ سے انہیں قتل کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے حقیقت ایسی نہیں ہے۔ یہ کلام اس انداز میں کیا گیا ہے کہ انبیاء کا قتل ظلم ہے اور حق نہیں ہے۔ ان پر مذمت کی زیادتی کے لئے یہ فرمایا ہے یہ معلوم شدہ ہے کہ کسی نبی کو حق کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا لیکن حق کے خلاف قتل کیا جائے گا۔ یَغْذِرُ الْحَقُّ سے ان کے گناہ کی برائی اور اس کے واضح ہونے کی تصریح فرمائی۔ نبی سے کبھی ایسی بات سرزد نہیں ہوتی کہ اس کے قتل کا موجب بنے۔

اگر یہ کہا جائے کہ کافروں کو انبیاء کے قتل کی کیسے قدرت دی گئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ انبیاء کی کرامت اور ان کے مقامات میں زیادتی کے لئے تھا جیسے مومنین میں سے جو اللہ کے راستہ

میں شہید کیا جاتا ہے (تو اسے مرتبہ ملتا ہے) یہ انبیاء کے لئے خذلان و رسوائی نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن نے کہا: انبیاء میں سے کبھی کوئی نبی شہید نہیں ہوا مگر وہ جسے قتال کا حکم نہیں دیا گیا تھا اور جس نبی کو قتال کا حکم دیا گیا تھا اس کی مدد کی گئی (1)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ**، ذَٰلِكَ پہلے ذَٰلِكَ کی طرف لوٹ رہا ہے اور اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے تاکید ہے۔ ہذا میں باسبب کے لئے ہے (2)۔ انفس نے کہا ما مصدر یہ ہے یعنی بعضی انہم، العصیان، طاعت کا متضاد ہے۔ اعتصمت النواۃ (گٹھلی سخت ہو گئی) الاعتداء کا معنی ہر چیز میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ ظلم اور معاصی میں معروف ہے۔ (3)

**إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِیْنَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرٌ هُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ  
يَحْزَنُونَ** ①

”یقین کرو اسلام کے پیروکار ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی جو کوئی بھی ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر اور نیک عمل کرے تو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے ہاں اور نہیں کوئی اندیشہ ان کے لئے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا یعنی جنہوں نے محمد ﷺ کی تصدیق کی۔

سفیان نے کہا: اس سے مراد منافقین ہیں۔ گویا یوں فرمایا کہ جو ظاہر ایمان لائے تھے اسی وجہ سے ان کا ذکر یہود، نصاریٰ اور صابیوں کے ساتھ کیا، پھر ان تمام کا حکم بیان فرمایا جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے تھے۔ (4)

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَالَّذِينَ هَادُوا** اس کا معنی ہے: وہ یہودی ہو گئے وہ یہود کی طرف منسوب ہیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام کا بڑا بیٹا تھا۔ پھر عربوں نے ذال کو دال سے بدل دیا، جب عجمی زبان، عربی بنائی جاتی ہے تو اس کے لفظ بدل جاتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا: بچھڑے کی عبادت سے توبہ کرنے کی وجہ سے ان کا یہ نام رکھا گیا۔ ہاد کا معنی ہے: تاب۔ (اس نے توبہ کی) الہائد، التائب توبہ کرنے والا۔ شاعر نے کہا:

إِنِّ امْرُؤٌ مِنْ حِبِّ هَائِدٍ (5)

میں اس کی محبت سے توبہ کرنے والا ہوں۔

قرآن حکیم میں ہے: **إِنَّا هَدَيْنَا إِلَيْكَ**۔ یعنی ہم نے توبہ کی۔ ہاد القوم یہودوں کو ہاد ہا ہا اس کا معنی ہے: قوم نے توبہ کی (6)۔ ابن عرفہ نے کہا: **هَدَيْنَا إِلَيْكَ** کا مطلب ہے ہم نے تیرے امر کی طرف سکون حاصل کیا۔ الہوادة کا معنی السكون

والموادعة ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا**۔ ابوالسالم نے ہادوا (دال کے فتح کے ساتھ) پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3: وَالنَّصْرِي** یہ جمع ہے اس کا واحد نصرانی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا واحد نصران (یاء کے اسقاط کے ساتھ) ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ مؤنث نصرانۃ ہے جیسے ندمان کی مؤنث ندمانۃ ہے۔ یہ نکرہ ہے الف، لام کے ساتھ معرفہ بنایا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

صدث كما صد عما لا يحل له      ساقى نصارى قبيل انفسح صوامر  
وہ روکی گئی ہے جیسے روزہ دار نصرانیوں کا ساقی عید الفطر سے پہلے اس چیز سے روکا جاتا ہے جو اس کے لئے حلال نہیں ہوتی۔  
یہاں نکرہ کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا ہے۔ خلیل نے کہا: النصاری کا واحد نصری ہے جیسے مہری اور مہاری ہے۔  
سیبویہ نے اس پر استشہاداً یہ شعر پڑھا ہے:

تراه اذا دار العشا متحنفا      ويضحي لديه و هو نصران شامس (1)  
اور ایک اور شعر لکھا ہے:

فكلتا هما خرت و اسجد راسها      كما أشجذ نصرانة لم تحنف  
دونوں اونٹنیاں گر پڑیں اور انہوں نے اس طرح سر جھکا دیئے جیسے نصرانی عورت سر جھکاتی ہے جس نے اسلام قبول نہ کیا ہو۔  
کہا جاتا ہے: اسجد، یعنی جھک گیا۔ لیکن نصران اور نصرانۃ یائے نسبت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں کیونکہ عرب کہتے ہیں: رجل نصرانی و امراء نصرانية..... نصرانہ اس نے سے نصرانی بنا دیا۔ حدیث میں ہے: ابواہ یہودانہ او ينصرانہ (2)۔ اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی بناتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میرے متعلق اس امت سے کوئی نصرانی اور یہودی نہیں سنے گا پھر اس پر ایمان نہیں لائے گا جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں مگر وہ دوزخی ہوگا ☆۔

واحد کے استعمال کے بغیر جمع استعمال ہوا ہے۔ اس کا قیاس یہ تھا کہ یہ النصرانیون ہوتا۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: اس کو نصاریٰ اس شہر کی وجہ سے کہا جاتا ہے جس کا نام ناصره تھا اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اترے تھے، اس شہر کی طرف ان کی نسبت کی گئی۔ کہا جاتا ہے: عیسیٰ الناصری۔ جب ان کے شہریوں کو اس کی طرف منسوب کیا گیا تو کہنا گیا: النصاری۔ یہ حضرت ابن عباس اور قتادہ کا قول ہے (3)۔ جوہری نے کہا: نصران شام کا شہر ہے جس کی طرف نصاریٰ منسوب ہیں اور اسے ناصره کہا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: النصاری نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ شاعر نے کہا:

لما رایت نبطاً انصاراً      شمرت من ركمی الازارا

كنت لهم من النصاری جارا (4)

2- صحیح بخاری، باب اذا اسلم الصبی فبات هل یصلی علیہ وهل، حدیث 1270، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4- ایضاً

1- تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3- تفسیر طبری زیر آیت ہذا



جب میں نے ایک نہیلی کو انصاری دیکھا تو میں نے اپنے گھٹنے سے ازار اوپر کر لی۔ میں انصاری کا پڑوسی تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس قول کی وجہ سے انہیں انصاری کہا جاتا ہے: مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ (آل عمران: 52)

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الصَّيِّئِينَ یہ صابی کی جمع ہے۔ بعض نے فرمایا: صاب کی جمع ہے۔ اسی وجہ سے ہمزہ میں اختلاف ہے۔ جمہور نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے سوائے نافع کے۔ جنہوں نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسے صبات النجوم سے مشتق کیا ہے جس کا معنی ہے ستارے طلوع ہوئے۔ صبات ثنیۃ الغلام۔ بچے نے دانت نکالے۔ اور جنہوں نے ہمزہ کے ساتھ نہیں پڑھا انہوں نے اسے صبا یصبو سے مشتق کیا ہے۔ جس کا معنی ہے مائل ہونا۔ لغت میں الصابی اسے کہتے ہیں جو ایک دین سے دوسرے دین کی طرف مائل ہو جائے اور نکل جائے۔ اسی وجہ سے جو شخص مسلمان ہو جائے عرب کہتے تھے: قد صبا۔ پس الصائبون وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب کے دین سے نکل گئے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 5:** اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہود و نصاریٰ اہل کتاب ہیں اور ان کی کتاب کی وجہ سے ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے اور ان کا طعام کھانا حلال ہے جیسا کہ سورہ مائدہ میں آئے گا اور ان پر جزیہ لگانا جائز ہے جیسا کہ سورہ برأت میں آئے گا اور الصَّيِّئِينَ کے بارے میں اختلاف ہے۔ سدی نے کہا: یہ اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے۔ یہ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے۔ ابن منذر اور ابن اسحاق نے کہا: صابین کے ذبیحہ میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ اہل کتاب کا ایک طاغیہ ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: ان کے ذبائح اور ان کی عورتوں سے نکاح میں کوئی حرج نہیں۔ خلیل نے کہا: یہ قوم ایسی ہے جن کا دین نصاریٰ کے دین کے مشابہ ہے مگر ان کا قبلہ جنوب ہوا کے چلنے کی طرف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کے دین پر ہیں۔ مجاہد، حسن اور ابن کثیر نے کہا: وہ ایسی قوم ہے جو اپنے دین کو یہود و مجوس کے دینوں کے درمیان سے مرکب کرتی ہے، ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کیا جائے گا۔ حسن اور قتادہ نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ایسی قوم ہے جو ملائکہ کی عبادت کرتی ہے اور قبلہ کی طرف نماز پڑھتی ہے، زبور کی تلاوت کرتی ہے اور پانچ نمازیں پڑھتی ہے۔ زیاد بن ابی سفیان نے ان کو دیکھا تو ان سے نیکس ختم کرنے کا ارادہ کیا۔ جب اس نے جانا کہ یہ ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں (2) اور جو کچھ ہمارے بعض علماء نے ذکر کیا ہے ان کے مذہب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ موحد ہیں ستاروں کی تاثیر کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ ستارے فعال ہیں۔ اسی وجہ سے ابوسعید اصطخری نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا جب ان سے ان کے متعلق سوال کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ آمَنَ۔ یعنی جس نے تصدیق کی۔ مَنْ آمَنَ میں مَنْ، الَّذِينَ سے بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے، اور فَلَهُمْ میں فَا، من میں جوابہام تھا اس کے سبب کی وجہ سے داخل ہوئی ہے۔ فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ مبتدا خبر ہیں پھر جملہ ان کی خبر ہے۔ یہ بھی بہتر ہے کہ من حالت رفع میں ہو مبتدا کی حیثیت سے اور اس کا معنی شرط ہو اور اس شرط کی وجہ سے مجزوم ہو اور الفاء جواب ہو اور لہم اجرہم، من کی خبر ہو پھر جملہ ان کی خبر ہو۔ اور الذین کی طرف عائد

مخدوف ہو تقدیر کلام اس طرح ہو من آمن منهم بالله۔ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان اور آخرت پر ایمان میں ایمان بالرسول والکتاب والبعث بھی داخل ہے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 7:** اگر کوئی کہے کہ لہم اجرہم میں ضمیر جمع کیوں ذکر کی گئی ہے جبکہ اَمِنَ لفظ مفرد ہے جمع نہیں ہے۔ اگر لہ اجرہ ہوتا تو کلام درست ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے مَنْ کا لفظ واحد، تشبیہ، جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پس اس کی طرف، واحد، تشبیہ اور جمع کی ضمیر لوٹنا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْهُمْ مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ (یونس: 42) یہ معنی کے اعتبار سے ہے وَمِنْهُمْ مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ (انعام: 25) لفظ کے اعتبار سے ہے۔ شاعر نے کہا:

أَلَا بَسْلَىٰ عَنكُمَا ان عَرَضْتُمَا      و قولا لَهَا عوجی علی مَنْ تَخَلَّفُوا (2)  
فرزدق نے کہا:

تعال فان عاهدتني لا تخونني      نكن مثل من يا ذئب يسطحبان  
اس میں معنی کا اعتبار کرتے ہوئے تخلفوا کہا۔

پس یہاں معنی پر محمول کرتے ہوئے یسطحبان کہا ہے۔ اگر لفظ پر محمول ہوتا تو یسطحب اور تخلف ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ (النساء: 13) اس میں لفظ کا اعتبار کیا گیا۔ پھر فرمایا: خُلِدُوا فِيهَا (النساء: 13) اس میں لفظ کا اعتبار کیا گیا۔ اگر لفظ کا اعتبار ہوتا تو خالد اُفیہا ہوتا۔ جب مَنْ کا مابعد لفظ پر محمول ہو تو اس کے مابعد میں معنی کے اعتبار سے مخالفت جائز ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور جب مَنْ کا مابعد معنی پر محمول ہو تو بعد میں لفظ کے اعتبار سے مخالفت جائز نہیں ہے کیونکہ الباس کلام میں داخل ہو جائے گا (3)۔ پہلا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (انعام) کے تحت کلام گزر چکا ہے۔ الحمد للہ

**مسئلہ نمبر 8:** حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا کا ارشاد وَمَنْ يَنْتَهِ عَنِ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران: 85) سے منسوخ ہے اور دوسرے علماء نے کہا: یہ منسوخ نہیں ہے یہ اس کے حق میں ثابت ہے جو مومنین میں سے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے پر قائم ہے۔

وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَادْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ⑩ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ⑪

”اور یاد کرو جب ہم نے لیا تم سے پختہ وعدہ اور بلند کیا تم پر طور کو۔ (اور حکم دیا) پکڑ لو جو ہم نے تم کو دیا مضبوطی سے اور یاد رکھنا وہ (احکام) جو اس میں درج ہیں شاید کہ تم پر ہیزگار بن جاؤ۔ پھر منہ موڑ لیا تم نے پختہ وعدہ

کرنے کے بعد۔ تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں میں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ** یہ آیت **وَإِذَا تَتَقْنَا الْجِبِلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ** کے معنی کی تفسیر ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: ہم نے پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلایا اور ہم نے اسے اپنی جگہ سے نکالا (1)۔ فرمایا: ہر وہ چیز جسے تو اکھڑے اور اسے پھینکے تو اس کے لئے تنقہ کا لفظ استعمال کرے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: تنقناہ کا معنی ہے: رفعناہ۔ ابن اعرابی نے کہا: النائق کا معنی الرفع ہے۔ النائق الباسط، النائق الفائق، امرءة نائق ومنتاق ایسی عورت جس کی اولاد زیادہ ہو۔ قتی نے کہا یہ تنق السقاء سے مشتق کیا گیا ہے جس کا معنی ہے: مشکیزہ کو ہلانا حتیٰ کہ اس سے مکھن علیحدہ ہو جائے اور **وَإِذَا تَتَقْنَا الْجِبِلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ** کا مطلب ہے اصل سے اکھڑا گیا۔ (2)

**الطُّورَ** کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اس پہاڑ کا نام ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمائی تھی اور اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی تھی۔ یہ ابن جریج نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ طور وہ پہاڑ ہے جو کچھ اگائے، نہ کہ وہ پہاڑ جو کچھ نہ اگائے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: یعنی یہ پہاڑ تھا۔ مگر مجاہد نے کہا: یہ سریانی زبان میں ہر پہاڑ کو کہتے ہیں۔ یہ ابو العالیہ کا قول ہے (3)۔ کتاب کے مقدمہ میں کلام گزر چکی ہے کہ قرآن حکیم میں غیر عربی زبان کے مفرد الفاظ موجود ہیں یا نہیں۔ الحسد۔ بکری نے کہا: طور بن اسماعیل علیہ السلام کی وجہ سے اسے طور کہا جاتا ہے۔

طور پہاڑ کے اٹھانے کے بارے میں علماء کے اقوال

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے تختیاں لے کر آئے جن میں تورات تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: اس کو لے لو اور اس کو لازم پکڑ لو۔ انہوں نے کہا: نہیں مگر یہ کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم سے اسی طرح کلام کرے جس طرح تجھ سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا۔ پس ان پر بجلی گرائی گئی پھر انہیں زندہ کیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: اس کو پکڑ لو۔ انہوں نے کہا: نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا تو انہوں نے فلسطین کے پہاڑوں سے ایک پہاڑ اکھڑا جس کی لبائی چوڑائی ایک فرسخ تھی۔ بنی اسرائیل کا لشکر اتنا ہی تھا۔ پس اسے ان پر چھتری کی مثل کر دیا گیا اور ان کے پیچھے سے سمندر اور آگے سے آگ کو لایا گیا، انہیں کہا گیا: اب اس کتاب کو پکڑو اور تم پر عہد لازم ہے کہ تم اسے ضائع نہیں کرو گے ورنہ تم پر پہاڑ آ پڑے گا۔ تو بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے ہوئے سجدوں میں گر گئے اور تورات کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

طبری نے بعض علماء سے روایت کیا ہے (4)۔ اگر وہ پہلی دفعہ تورات کو لے لیتے تو ان پر میثاق نہیں تھا اور بنی اسرائیل کا سجدہ پیشانی کی ایک طرف پر تھا کیونکہ وہ خوف کی وجہ سے پہاڑ کو دوسری طرف سے دیکھ رہے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا تو انہوں نے کہا: کوئی سجدہ اس سجدہ سے افضل نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ



نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا۔ پس انہوں نے ایک طرف پر سجدہ کا حکم دیا۔ ابن عطیہ نے کہا: وہ قول جس کے سوا کوئی قول صحیح نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کے وقت ان کے دلوں میں ایمان پیدا فرمادیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مجبوراً ایمان لائے تھے اور ان کے دل مطمئن نہیں تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خُذُوا لِعَنِي هِمَّ نَعْمَ دِيَا كِه اس كو پڙلو۔ مَا اَتَيْنٰكُمْ مَخْرُوفَ هِي بِقُوَّةٍ لِعَنِي كُوشَشٍ اور محنت سے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: نیت اور اخلاص کے ساتھ۔ مجاہد نے کہا: قُوَّة سے مراد ہے اس میں جو احکامات ہیں ان پر عمل کرنے کے ساتھ۔ بعض نے فرمایا: بِقُوَّةٍ لِعَنِي كُوشَشٍ سے پڑھنے کے ساتھ وَادُّ كُرُّوْا صَافِيَه لِعَنِي غُور و فِكر كُرُو، اس کے اوامر اور وعید کی حفاظت کرو اور یاد کرو اور اس کو بھولو نہیں اور اس کو ضائع نہ کرو۔ میں کہتا ہوں: کتب سے یہ مقصود ہے ان کے مقتضاء کے مطابق عمل کرنا، نہ صرف زبان سے تلاوت کرنا اور ترتیل سے پڑھنا، کیونکہ صرف زبان سے پڑھنا اور عمل نہ کرنا تو نہیڈ (پھینکنا) کے زمرہ میں آتا ہے جیسا کہ شعبی اور ابن عیینہ نے کہا ہے۔ ان دونوں حضرات کا قول نَبَذَ قَبِيْطِيٍّ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوْا الْكِتٰبَ (البقرہ: 101) کے تحت آئے گا۔ نسائی نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگوں میں سے فاسق شخص وہ ہے جو قرآن پڑھتا ہے اور اس میں سے کسی حکم کی طرف رجوع نہیں کرتا (یعنی احکام پر عمل پیرا نہیں ہوتا)۔ نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا کہ مقصود عمل کرنا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، امام مالک نے فرمایا: بعض اوقات وہ شخص قرآن پڑھتا ہے جس میں خیر نہیں ہوتی (یعنی صرف پڑھتا ہے عمل نہیں کرتا)۔ پس جو ہم سے پہلے لوگوں پر لازم تھا اور ان سے مطالبہ کیا گیا تھا وہ ہم پر بھی لازم اور واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّبِعُوْا اَحْسَنَ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الزمر: 55) اس میں اپنی کتاب کی اتباع اور اس کے مقتضاء کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ہم نے بھی عمل اسی طرح ترک کر دیا ہے جس طرح یہود و نصاریٰ نے ترک کر دیا تھا۔ صرف کتابوں اور مصاحف کی ذوات باقی ہیں جو کچھ مفید نہیں کیونکہ جہالت، ریاست کی طلب اور خواہش نفس کی اتباع کا غلبہ ہے۔ ترمذی نے جبیر بن نفیر سے، انہوں نے حضرت ابودرداء سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، آپ ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ پھر کہا: یہ وہ وقت ہے جس میں لوگوں سے علم اٹھالیا جائے گا حتیٰ کہ وہ علم میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے۔ زیاد بن لبید انصاری نے عرض کی: ہم سے علم کیسے اٹھالیا جائے گا جبکہ ہم نے قرآن پڑھا۔ اللہ کی قسم! ہم قرآن پڑھتے رہیں گے اور ہم اپنی عورتوں اور بیٹوں کو پڑھائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے زیاد! تجھ پر تیری ماں روئے کہ میں تو تجھے فقہائے مدینہ سے شمار کرتا تھا۔ یہ تورات، انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس موجود ہیں ان کو یہ کچھ فائدہ دیتی ہیں (1)۔ یہ حدیث تفصیل سے آگے آئے گی۔ نسائی نے جبیر بن نفیر عن عوف بن مالک الاشجعی کے سلسلہ صحیح سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے زیاد کو فرمایا: اے زیاد! تیری ماں تجھ پر روئے۔ یہ تورات، انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس موجود ہیں۔ موطا میں حضرت عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے، انہوں نے ایک شخص کو فرمایا: تو ایک ایسے

زمانہ میں ہے جس میں فقہاء کثیر ہیں، قراء قلیل ہیں اس میں قرآن کی حدود کی حفاظت کی جاتی ہے اور حروف کی ادائیگی کا اتنا خیال نہیں رکھا جاتا، سوال کرنے والے تھوڑے ہیں، عطا کرنے والے بہت ہیں، لوگ نماز لمبی پڑھتے ہیں، خطبہ چھوٹا دیتے ہیں، اپنی خواہشات سے پہلے اعمال خیر کا آغاز کرتے ہیں۔ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں فقہاء کم ہوں گے، قراء زیادہ ہوں گے، اس میں حروف کی حفاظت کی جائے گی اور اس کی حدود کو ضائع کیا جائے گا، سوال کرنے والے زیادہ ہوں گے اور عطا کرنے والے کم ہوں گے، خطبے لمبے دیں گے اور نمازیں مختصر کریں گے، اپنے اعمال سے پہلے خواہش نفس پر عمل کریں گے (1)۔ یہ نصوص ہماری اس بات پر دلالت کرتی ہیں جو ہم نے ذکر کی ہے۔ یحییٰ نے کہا: ابن نافع سے میں نے یسعون اھوائہم قبل اعمالہم کا مطلب پوچھا تو انہوں نے کہا لوگ اپنی خواہش نفس پر عمل کریں گے اور اس عمل کو ترک کریں گے جو ان پر فرض ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ پر پہلے کلام گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ، تولى باب تفعّل ہے اس کا اصل معنی جسم میں سے کسی چیز سے اعراض کرنا اور پیٹھ پھیرنا ہے، پھر یہ وسعت و مجاز کی وجہ سے ادا امر، ادا بیان اور معتقدات میں سے اعراض میں استعمال ہوتا ہے۔ قَسَمْتُ بَعْدَ ذَلِكَ یعنی دلیل کے بعد۔ وہ میثاق کا لینا اور پہاڑ کو بلند کرنا ہے۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ، فضل مسبو یہ کے نزدیک متبدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے جس کا اظہار جائز نہیں کیونکہ اس کے اظہار سے مستغنی ہوتے ہیں مگر یہ کہ جب وہ اس کے اظہار کا ارادہ کرنے ہیں تو ان کے ساتھ لاتے ہیں جب وہ ان کے ساتھ لاتے ہیں تو خبر کو حذف نہیں کرتے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ تَدَارَكُكُمْ۔ مَا حَسَنَتْ اس کا عطف فَضْلُ پر ہے۔ یعنی اس کا لطف اور مہلت دینا نہ ہوتا۔

لَكُنْتُمْ يَ لَوْلَا کا جواب ہے قَسَمْتُ الْخُسُوفِ، کنتم کی خبر ہے۔ الخسران کا معنی نقصان ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس کا فضل یہ ہے کہ توبہ قبول کرنا۔ اور مَا حَسَنَتْ سے مراد العفو ہے اور الفضل سے مراد ثابت شدہ پر زیادتی ہے۔ الافصال ایسا فعل کرنا جو واجب نہ ہو۔ ابن فارس نے الجمل میں کہا: الفضل سے مراد زیادتی اور خیر ہے۔ الافصال کا مطلب الاحسان ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝

”اور تم خوب جانتے ہو انہیں جنہوں نے نافرمانی کی تھی تم میں سے سبت کے قانون کی توہم نے حکم دیا انہیں کہ

بن جاؤ بندر پھنکارے ہوئے۔“

اس میں سات مسائل ہیں (☆)۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ، عَلِمْتُمْ اس کا معنی ہے: تم نے ان کے اعیان (اشخاص) کو پہچان لیا۔ بعض علماء نے فرمایا: تم ان کے احکام جان چکے ہو، ان دونوں (علم اور معرفت) میں فرق یہ

☆ متن میں اسی طرح مگر تفصیل میں تین مسائل ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے کہ معرفت ذات مسمیٰ کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور علم مسمیٰ کے احوال کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جب تو کہتا ہے کہ معرفت زیداً اس سے مراد ہے میں نے زید کی شخصیت کو پہچان لیا۔ جب تو کہتا ہے: علمت زیداً اس سے مراد اس کے احوال (فضل یا نقص) وغیرہ کو جان لیا۔ پہلی صورت میں ایک فعل کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے اور علمت بمعنی عرفتم ہے اور دوسری صورت میں دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ انفس نے حکایت کیا ہے: لقد علمت زیداً ولم اعلمہ، اس میں ایک مفعول کی طرف متعدی ہے، قرآن حکیم میں ہے: لا تعلمونہم اللہ یعلمہم۔ یہ تمام معرفت کے معنی میں ہیں۔

اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ، الَّذِيْنَ كَاسَلَهُ۔ الاعتداء کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** نسائی نے حضرت صفوان بن عسال سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک یہودی نے اپنے ساتھی سے کہا: ہم اس نبی کے پاس چلیں۔ دوسرے ساتھی نے کہا: نبی نہ کہو اگر اس نے تجھے (یہ کہتے ہوئے) سن لیا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی۔ (یعنی بہت خوش ہوگا)۔ وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے نو آیات بینات کے بارے میں پوچھا۔ آپ ﷺ نے ان سے کہا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو، اس نفس کو قتل نہ کرو جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ، کسی بری شخص کو سلطان (بادشاہ) کے پاس نہ لے جاؤ، کسی کا تمسخر نہ اڑاؤ، سود نہ کھاؤ، کسی پاکدامنہ پر بہتان نہ لگاؤ، جنگ کے دن پیٹھ نہ پھیرو اور اے یہودیو! خاص تمہارے لئے کہ تم ہفتہ کے دن (کے احکام سے) تجاوز نہ کرو۔ پس انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں چومے اور انہوں نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم نبی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تمہیں میری اتباع کرنے سے کون سی چیز مانع ہے؟ انہوں نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ ان کی اولاد سے ہمیشہ نبی ہو۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم آپ کی اتباع کریں گے تو یہود ہمیں قتل کر دیں گے۔ اس حدیث کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس کے الفاظ سورہ سبحان میں ان شاء اللہ آئیں گے۔

**مسئلہ نمبر 3:** فِي السَّبْتِ اس کا معنی فی یوم السبت ہے، (یعنی ہفتہ کے دن میں)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مراد ہفتہ کے دن کا حکم ہو (1)۔ پہلا قول حسن کا ہے۔ انہوں نے حلال سمجھنے کی جہت سے اس میں مچھلیاں پکڑی تھیں۔ اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: ابن رومان نے کہا: ایک شخص ایک دھاگہ لیتا تھا اور اس میں ایک ایسی رسی لگاتا تھا جو جانور کی گردن میں ڈالی جاتی ہے پھر اسے مچھلی کے دم میں ڈالتا تھا اور دھاگے کی دوسری طرف ایک کیل ہوتا تھا، وہ اتوار کے دن تک اسے اسی طرح چھوڑے رکھتا تھا پھر جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ ایسا کرنے والے کو کسی مصیبت میں گرفتار نہیں کیا گیا تو عام لوگ بھی ایسا کرنے لگے۔ حتیٰ کہ مچھلی کا شکار ہفتہ کے دن میں زیادہ ہو گیا اور مچھلیاں بازار میں آنے لگیں اور فاسق لوگوں نے شکار کا اعلان کر دیا۔ ایک فرقہ اٹھا، انہوں نے ایسے لوگوں کو منع کیا اور برسر منبر انہیں منع کیا اور ایسا کرنے والوں سے جدا ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ منع کرنے والوں نے کہا: ہم تمہارے ساتھ نہیں رہیں گے۔ پس انہوں نے ایک دیوار کے ساتھ شہر کو تقسیم کر دیا۔ ایک دن منع کرنے والے اپنی مجلس میں تھے کہ حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے کوئی باہر نہ نکلا، انہوں نے کہا: لوگوں کو کچھ



ہو گیا ہے۔ انہوں نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا تو وہ بندر بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور ان کے پاس گئے۔ پس بندروں کا نسب انسان سے جانا گیا ہے، لیکن انبان کا نسب بندروں سے معروف نہیں۔ وہ بندر اپنے خاندان والوں میں سے کسی انسان کے پاس آتے، اس کے کپڑے سونگھتے اور رونے لگتے۔ وہ اسے کہتا: کیا ہم نے تمہیں منع نہیں کیا تھا وہ سر سے اشارہ کر کے کہتے: ہاں (1)۔ قادی نے کہا: نوجوان بندر بن گئے تھے، بوڑھے خنزیر بن گئے تھے صرف منع کرنے والے بچے تھے باقی سب ہلاک ہو گئے تھے (2)۔ ان لوگوں کا قول سورہ اعراف میں آئے گا جنہوں نے کہا تھا کہ وہ تین گروہوں میں تھے، اور یہ قول ان لوگوں کے قول سے زیادہ صحیح ہے جنہوں نے کہا: ان کے دو گروہ تھے۔ واللہ اعلم

السَّبْت، السبت سے ماخوذ ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہفتہ کے دن میں اشیاء جدا کی گئی تھیں اور ان کی خلقت مکمل ہوئی تھی۔ بعض نے فرمایا: یہ السبت سے مشتق ہے جس کا معنی راحت اور سکون ہے۔ (3)

علماء کا مسخ شدہ امت کے بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ان کی نسل چلی ہے یا نہیں۔ علماء کے دو قول ہیں: زجاج نے کہا: ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ جائز ہے کہ یہ بندران لوگوں میں سے ہوں۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے۔ جمہور علماء نے کہا: مسخ شدہ امت کی نسل باقی نہیں چلی۔ رہے بندر اور خنازیر وغیرہ اس سے پہلے بھی موجود تھے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے مسخ کیا تھا وہ ہلاک ہو گئے تھے اور ان کی نسل باقی نہیں رہی تھی کیونکہ انہیں سخط اور عذاب لاحق ہوا تھا ان کے لئے دنیا میں تین دن کے بعد قرار نہیں تھا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: کوئی قوم جو مسخ کی گئی تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہی، نہ اس نے کھایا، نہ پیا اور نہ ان کی نسل چلی (4)۔ ابن عطیہ نے کہا (5): نبی کریم ﷺ سے مروی ہے اور ثابت ہے کہ مسخ شدہ کی نسل چلی، نہ کھایا اور نہ پیا اور نہ تین دن سے زیادہ زندہ رہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول دونوں قولوں میں صحیح ہے اور ابن عربی وغیرہ نے پہلے قول کی صحت پر نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے۔ بنی اسرائیل کی ایک امت مفقود ہو گئی۔ معلوم نہیں اس کا کیا ہوا میں نے نہیں دیکھا مگر وہ چوہیا ہے کیا تم اسے دیکھتے نہیں کہ جب اس کے سامنے اونٹنی کا دودھ رکھا جائے تو یہ اسے نہیں چیتی اور اس کے سامنے بکری کا دودھ رکھا جائے تو پی لیتی ہے (6)۔ یہ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے اور دوسری حجت گوہ والی حدیث ہے جو مسلم نے حضرت ابو سعید اور حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ حضرت جابر نے کہا: نبی کریم ﷺ کے پاس گوہ لائی گئی تو آپ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا: میں نہیں جانتا شاید یہ ان قوموں سے ہو جو مسخ کی گئیں۔ یہ روایات منقول ہیں جیسا کہ آگے آئے گا۔

ابن عربی نے کہا: بخاری میں عمرو بن میمون سے مروی ہے، انہوں نے کہا: میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندر یا کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا۔ بندروں نے اسے رجم کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا۔ یہ بخاری کے بعض نسخوں میں ثابت

4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ ایضاً

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

6۔ صحیح بخاری، باب خیر مال المسلم غنم، حدیث نمبر 3360، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے اور بعض میں ساقط ہے۔ حدیث کی نص میں ثابت ہے (اس نے زنا کیا) یہ لفظ بعض سے ساقط ہے۔

ابن عربی نے کہا: اگر کہا جائے کہ چوپائیوں میں شریعت کی پہچان باقی ہے حتیٰ کہ وہ نسل در نسل ان احکام کے وارث بنے رہے حتیٰ کہ عمرو کے زمانہ تک پہنچے؟ ہم کہیں گے: ہاں، اسی طرح تھا کیوں کہ یہود نے رجم میں تبدیلی کی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے مسخ شدہ لوگوں میں اس کو قائم رکھا تا کہ ان لوگوں پر حجت میں مبالغہ ہو جائے جنہوں نے اس کا انکار کیا اور اسے تبدیل کیا تا کہ ان کی کتب اور ان کے علماء اور ان کی مسخ شدہ قومیں ان کے خلاف گواہی دیں تا کہ وہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے جو چھپاتے ہیں اور جو اعلان کرتے ہیں اور وہ سب شمار کیا جا رہا ہے جو وہ تغیر و تبدل کرتے ہیں ان پر حجت قائم فرمائی جہاں سے اسے قیام کا انہیں تصور بھی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی مدد فرماتا ہے اور ان کی مدد نہیں کی جاتی (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ ابن عربی کا کلام احکام میں ہے اور اس میں کوئی حجت نہیں ہے۔ انہوں نے جو عمرو بن میمون کا قصہ ذکر کیا ہے حمیدی نے جمع صحیحین میں ذکر کیا ہے۔ ابو مسعود الدمشقی نے حکایت کیا ہے کہ عمرو بن میمون الاودی کی صحیحین میں حصین کی روایت سے حکایت ہے، عمرو نے کہا: میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندر یاد کیا جس پر دوسرے بندر جمع ہوئے اور اسے رجم کیا میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا۔ اسی طرح حضرت ابو مسعود نے حکایت کیا ہے، اس نے ذکر نہیں کیا کہ کسی جگہ بخاری نے اپنی کتاب میں اس کو نقل کیا ہے ہم نے اس کے متعلق کوشش کی تو ہم نے اسے بعض نسخوں میں پایا نہ کہ تمام نسخوں میں۔ امام بخاری نے اسے ”کتاب ایام الجاہلیہ“ میں ذکر کیا ہے اور نعیمی عن الفربری کی روایت میں بندروں کے بارے میں اس خبر کی کوئی اصل نہیں ہے۔ شاید یہ کتاب البخاری میں مقدمات (گھسیڑی گئی روایات) میں سے ہے اور وہ جو بخاری نے ”تاریخ کبیر“ میں ذکر کیا ہے مجھے نعیم بن حماد نے کہا: ہمیں ہشیم نے ابو بلج سے اور حصین نے عمرو بن میمون سے روایت کر کے بتایا کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندر یاد کیا جس پر بندر جمع تھے انہوں نے اسے رجم کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا۔ اس روایت میں قد زنت۔ (اس نے زنا کیا) کے الفاظ نہیں ہیں اگرچہ روایت صحیح ہو تو امام بخاری نے اسے اس بات پر دلالت کرنے کے لئے روایت کیا کہ عمرو بن میمون نے زمانہ جاہلیت پایا ان کے گمان کی کوئی پرواہ نہیں جو انہوں نے زمانہ جاہلیت کے بارے میں کیا۔ ابو عمرو نے ”الاستیعاب“ میں حضرت عمرو بن میمون کا ذکر کیا ہے ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے کوفیوں میں سے بڑے تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں بندروں کا رجم دیکھا تھا اگر یہ صحیح ہو کیونکہ اس کے راوی مجہول ہیں۔ بخاری نے نعیم بن ہشیم عن حصین عن عمرو بن میمون الاودی کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندر یاد کیا جس نے زنا کیا تھا پھر بندروں نے اسے رجم کیا تھا میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا تھا۔ اس کو عباد بن العوام نے حصین سے روایت کیا جس طرح ہشیم نے مختصر روایت کیا۔ اور رہا یہ قصہ اپنے طول کے ساتھ تو وہ عبد الملک بن مسلم عن عیسیٰ بن حطان پر گھومتا ہے جو دونوں استاد، شاگرد قابل حجت نہیں ہیں۔ یہ اہل علم کی جماعت کے نزدیک منکر ہے کہ زنا کی اضافت غیر مکلف کی طرف کی گئی ہے اور اس میں حدود کو حیوانوں پر قائم کیا گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو یہ جنوں میں

سے ہوں گے دوسرے حیوان نہ ہوں گے۔ رہا حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد میں نے نہیں دیکھا۔ چوہے اور گوہ کے بارے میں فرمایا: میں نہیں جانتا شاید یہ ان قوموں میں سے ہو جو مسخ کی گئی تھی اور اس کی مثل دوسری مثالیں۔ یہ ظن اور خوف کی بنا پر فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ گوہ اور چوہے وغیرہ مسخ شدہ سے ہوں۔ یہ نبی کریم ﷺ نے وحی آنے سے پہلے اپنی طرف سے اظہار فرمایا، جب وحی آگئی تو یہ خوف زائل ہو گیا اور جان لیا کہ گوہ اور چوہے مسخ شدہ قوموں میں سے نہیں ہیں۔ وحی کے آنے کے بعد ہمیں اپنے ارشاد میں بتایا جب آپ سے پوچھا گیا بندروں اور خنازیر کے متعلق کہ کیا یہ مسخ شدہ قوموں میں سے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کسی قوم کو ہلاک نہیں کیا یا عذاب نہیں دیا پھر ان کی نسل چلائی ہو۔ بندر اور خنازیر اس سے پہلے موجود تھے۔ یہ نص صحیح صریح ہے اسے حضرت عبداللہ بن مسعود نے روایت کیا ہے اور اسے مسلم نے کتاب القدر میں نقل کیا ہے اور نصوص ثابت ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی موجودگی اور آپ کے دسترخوان پر گوہ کھائی گئی اور آپ نے انکار نہیں فرمایا۔ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ اس کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہماری توفیق ہے۔

مجاہد سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ صرف ان کے دل مسخ کیے گئے اور ان کے افہام، بندروں کے افہام جیسے بنا دیے گئے (1)، میری معلومات کے مطابق کسی اور مفسر نے یہ نہیں کہا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَجَعَلْنَاهُمْ كُؤُوزًا قَرَدَةً، قَرَدَةً کان کی خبر ہے۔ خُسْبِیْنِ اس کی صفت ہے، اگر تو چاہے تو اسے کان کی خبر بنادے یا کونوا میں ضمیر سے حال بنادے اور خُسْبِیْنِ کا معنی مبعدين دور کیے گئے ہے۔ کہا جاتا ہے: فُخْصًا وَ خُسْوَ و انخسًا یعنی میں نے اسے دور کیا تو وہ دور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَنْقَلِبُ إِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا (الملک: 4) (لوٹ آئے گی تیری طرف) (تیری) نگاہ ناکام ہو کر) اخسوا فیہا۔ یعنی اس میں دور چلے جاؤ۔ تباعد کا معنی ناراض ہونا ہے۔ کسائی نے کہا: خَسًا الرَّجُلُ خَسًا۔ و خَسَاتَهُ خَسًا، اس صورت میں الخاسی کا معنی گھٹیا اور رسوا ہوگا۔ کہا جاتا ہے: قَبِضَ الرَّجُلُ قَبْضًا وَ قَبْضًا مَارَ قَبْضًا یعنی ذلیل و خوار ہوا۔ اقباتہ میں نے اسے رسوا و ذلیل کیا فہو قَبْضِی، فَعِیل کے وزن پر ہے۔

فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَابِیْنِ یَدَیْہَا وَ مَا خَلْفَہَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ①

”پس ہم نے بنادیا اس سزا کو عبرت ان کے لئے جو اس زمانہ میں موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے تھے اور (اسے) نصیحت بنادیا پر ہیزگاروں کے لئے۔“

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا مَّفْعُول ثانی کی بنا پر نَكَالًا منصوب ہے اور عبرت بنانے میں کئی اقوال ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد سزا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد شہر ہے کیونکہ کلام کا معنی اس کا تقاضا کرتا ہے، بعض نے فرمایا: امت جو مسخ کی گئی، بعض نے فرمایا: مچھلیاں۔ اس قول میں بعد ہے۔ النکال کا معنی زجر اور عقاب ہے۔ النکل والانکال، اس سے مراد بیڑیاں ہیں (2)۔ بیڑیوں کو انکال کہتے ہیں کیونکہ یہ آدمی کو روکتی ہیں۔ بھاری لگام کو نکل اور نکل کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جانور کو روکتی ہے نَکَلٌ عَنِ الْمَرِئِئِکُلُ وَ نَکَلٌ یَنْکَلُ جب کوئی رک جائے۔ التَّنْکِیل، دشمن کو ایسی تکلیف پہنچانا کہ



دوسرے لوگوں کو وہ روک دے۔ الا زہری نے کہا: النکال سے مراد عقوبت ہے۔ ابن درید نے کہا: المنکل وہ چیز جو انسان کو روک دے۔

فامر علی اقتنائہم بمنکل۔ تو ان کو گدیوں پر روکنے والی چیز سے مار۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَمَّا بَيَّنَّ يَدَيَّهَا حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: اس سے مراد اس قوم کے پہلے گناہ ہیں۔ وَمَا خَلَفَهَا جو ان کے بعد اس قسم کے گناہ کرے گا۔ فراء نے کہا: مسخۃ کو گزشتہ گناہوں کی وجہ سے عبرت اور سزا بنایا گیا اور جو ان کے بعد عمل کرنے والے ہیں تاکہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے مسخ سے ڈریں۔ ابن عطیہ نے کہا (1): یہ عمدہ قول ہے اور دونوں ضمیریں عقوبت کیلئے ہیں۔ حکم نے مجاہد سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد جو لوگ موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے تھے (2)۔ نحاس نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور کہا: یہ معنی کے زیادہ قریب ہے۔ واللہ اعلم حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ لَمَّا بَيَّنَّ يَدَيَّهَا اور مَا خَلَفَهَا سے مراد شہر ہیں (3)۔ قتادہ نے کہا لَمَّا بَيَّنَّ يَدَيَّهَا سے مراد ان کے گناہ ہیں اور مَا خَلَفَهَا سے مراد پچھلیوں کا شکار ہے۔ (4)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ اس کا عطف نکال پر ہے اس کا وزن مفعلة ہے یہ اتعاظ سے اور انزجار سے ہے۔ الوعظ کا معنی ڈرانا ہے۔ العظة اسم ہے۔ خلیل نے کہا: الوعظ سے مراد خیر کی ایسی نصیحت کرنا جس کے لئے دل نرم ہو جائے۔

الماوردی نے کہا: المتقین کو نصیحت کے لئے خاص کیا گیا ہے اگرچہ یہ تمام لوگوں کے لئے نصیحت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر معاندین سے متقین نصیحت قبول کرنے میں منفرد ہوتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا (5): لفظ ہر امت کے ہر متقی کو شامل ہے۔ زجاج نے کہا مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ یعنی امت محمدیہ کے لئے نصیحت ہے تاکہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے انہیں منع فرمایا ہے وہ ان کے ارتکاب سے بچیں کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں اصحاب السبت جیسا عذاب پہنچے جو انہیں ہفتہ کے دن اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ افعال کے ارتکاب کی وجہ سے پہنچا۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً ۖ قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا

هَٰؤُلَاءِ قَالًا أَعِزُّدُبِ اللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝

”اور یاد کرو جب کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ تم ذبح کرو ایک گائے، وہ بولے کیا آپ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں آپ نے کہا میں پناہ مانگتا ہوں خدا سے کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں (کے گروہ) میں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ** ابو عمرو سے حکایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے یا مڑ کم راء سے ضمہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کر کے پڑھا ہے۔ ابو العباد المبرد نے کہا: یہ جائز نہیں ہے کیونکہ راء حرف اعراب ہے اور ابو عمرو سے صحیح یہ مروی ہے کہ وہ حرکت میں اختلاس کرتے تھے۔ **أَنْ تَذْبَحُوا** یہ یا مڑ کم کی وجہ سے محل نصب میں ہے یعنی بان تذبحوا۔ بقرۃ پر نصب تذبحوا کی وجہ سے ہے ذبح کا معنی پہلے گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا** بقرۃ یہ تلاوت میں مقدم ہے اور **قَتَلْتُمْ** نفسا گائے کے متعلق جو کچھ پہلے ذکر کیا گیا ہے اس پر یہ معنی کے اعتبار سے مقدم ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ **قَتَلْتُمْ** نزول میں مقدم ہو اور ذبح کا امر مؤخر ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ نزول کی ترتیب تلاوت کے مطابق ہو۔ اللہ تعالیٰ نے گویا انہیں گائے کے ذبح کا حکم دیا حتیٰ کہ انہوں نے اسے ذبح کیا پھر قتل کے امر سے جو واقع ہوادہ واقع ہوا۔ پس انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اس کا بعض اس مقتول کو ماریں، پہلے قول کے مطابق معنی کے اعتبار سے **وَإِذْ قَتَلْتُمْ** مقدم ہوگا جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کیونکہ واد ترتیب کا موجب نہیں ہوتی۔ اس کی نظیر نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے جو طوفان اور اس کے ختم ہونے کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ اس قول میں **حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُورُ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ** (ہود) پہلے ان لوگوں کے ہلاک کرنے کا ذکر کیا جو ہلاک ہوئے پھر اس پر اس ارشاد سے عطف فرمایا: **وَقَالَ انْكِسِرُوا فِيهَا لِيُبَيِّنَ اللَّهُ مَآئِدَها وَزُجُجَها** (ہود: 41) خطاب میں رکوب کا ذکر متاخر کیا اور یہ معلوم شدہ ہے کہ ان کا سوار ہونا ہلاکت سے پہلے تھا۔ اسی طرح یہ ارشاد ہے: **الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا قَلِيلًا** (الکہف) اس کی تقدیر اس طرح ہے: **انزل على عبده الكتاب قیماً ولم يجعل له عوجاً**۔ قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3:** علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ بکری کو ذبح کرنا اور اونٹ کو نحر کرنا اولیٰ ہے اور گائے میں اختیار ہے۔ بعض نے فرمایا: ذبح اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ذبح کا ذکر فرمایا نیز منحر کے ذبح کے قرب کی وجہ سے۔ ابن منذر نے کہا: میں کسی عالم کو نہیں جانتا جس نے اس کا کھانا حرام قرار دیا ہو جس کو ذبح کرنا تھا اس کو نحر کیا گیا یا جس کو نحر کرنا تھا اسے ذبح کیا گیا۔ امام مالک نے اس کو مکروہ کہا ہے اور کسی کا کسی شے کو مکروہ قرار دینا اسے حرام قرار دینا نہیں ہے۔ مزید ان شاء اللہ ذبح کے احکام، ذبح کرنے والا اور ان دونوں کی شرائط سورہ مائدہ میں **إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ** کے تحت تفصیل سے آئیں گے۔ ماوردی نے کہا: انہیں صرف گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا کیونکہ ان کے معبود بچھڑے کی جنس سے تھے تاکہ جس چیز کی وہ تعظیم کرتے تھے ان کے نزدیک اس کی اہانت کی جائے۔ نیز اس لئے تاکہ وہ جان لے کہ ان کے نفسوں میں اس کی عبادت کی قبولیت کتنی ہے۔ یہ معنی گائے کے ذبح میں علت ہے اور سائل کے جواب میں علت نہیں ہے لیکن اس کا معنی یہ ہے کہ مقتول، زندہ کے قتل کے ساتھ زندہ ہو جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اشیاء کی ایجاد ان کی اضداد کے ساتھ کرنے میں زیادہ ظاہر کرنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **بَقَرَةَ** یہ مؤنث کا اسم ہے، مذکر کے لئے ثور اسم ہے، جیسے اونٹنی کے لئے ناقۃ اور

اونٹ کیلئے جمل، عورت کے لئے امرأۃ اور مرد کیلئے رجل، البقرة، البقر کا واحد ہے اس میں مذکر، مؤنث برابر ہے، اس کی اصل تیرے اس قول سے ہے: بَقَرًا بَطْنَهُ، اس نے اس کا پیٹ چاک کیا۔ البقرہ (گائے) زمین کو چیرتی اور پھاڑتی ہے اسی سے ابو جعفر محمد بن علی زین العابدین کو الباقر کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے علم کو چیرا اور اس کی اصل کو پہچانا، البقیرۃ وہ کپڑا جو پھاڑا جاتا ہے پھر عورت اسے اپنی گردن میں ڈالتی ہے اس کی آستین نہیں ہوتیں۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں ہدہ کی شان میں ہے۔ فبقر الارض (1) اس نے زمین کو پھاڑا۔ شمر نے کہا: بقر کا مطلب ہے: اس نے پانی کی جگہ کو دیکھا اور زمین کے نیچے پانی کو دیکھا۔ الازہری نے کہا۔ البقر جنس کے لئے اسم ہے اس کی جمع باقر ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: کہا جاتا ہے بقیر، باقر، بیقر۔ عکرمہ اور ابن یعمر نے ان الباقر پڑھا ہے۔ الشور، اس کی جمع ثیران ہے۔ الشور، مردوں میں سے سردار کو کہتے ہیں۔ الشور، پنیر کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ الشور کائی کو بھی کہتے ہیں۔ شور ایک پہاڑ کو بھی کہتے ہیں شور عربوں کا ایک قبیلہ بھی ہے۔ حدیث میں ہے: وقت العشاء ما لم یغیب شور الشفق یعنی عشاء کا وقت اس وقت شروع ہوتا جب شفق کا پھیلاؤ غائب نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: شادیشور شور اوشور انا جب افق میں پھیل جائے۔ حدیث میں ہے: من اراد العلم فلیثور القرآن جو علم کا ارادہ رکھتا ہے اسے قرآن پڑھنا چاہئے۔ شمر نے کہا: اس کا مطلب ہے کہ قرآن کو پڑھنا اور اس کے ساتھ علماء سے علم تلاش کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کا جواب تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ انہوں نے اپنے درمیان ایک مقتول پایا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا نام عامیل تھا۔ ان پر قاتل کا معاملہ مشتبہ ہو گیا اور ان کے درمیان اختلاف واقع ہوا۔ انہوں نے کہا: ہم آپس میں لڑ رہے ہیں جبکہ اللہ کا رسول ہمارے درمیان موجود ہے۔ پس وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور ان سے اس کا بیان پوچھا۔ یہ تو رات میں قسامت کے حکم کے نزول سے پہلے کا واقعہ ہے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دعا کی اور انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سنا جبکہ اس کے ظاہر میں ان کے سوال کا جواب نہیں تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس اس مقتول کے متعلق فیصلہ طلب کرنے لگے۔ کہنے لگے: تو ہمارے ساتھ مزاح کرتا ہے۔ الہدوء، کھیلنا، مزاح کرنا۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

جمہوری نے ایتخذنا ہزواً پڑھا ہے وہ یہ ایک دوسرے سے کہنے لگے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں یہ جواب دیا: اَعُوذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ (میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں) کیونکہ سائل کے جواب سے خروج جہالت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے آپ نے اَعُوذُ بِاللّٰهِ کہا کیونکہ یہ ایسی صفت ہے جو انبیاء کرام میں نہیں پائی جاتی (2)۔ جہالت، علم کی نقیض ہے۔ اس وجہ سے جہالت سے پناہ مانگی جس طرح انہوں نے جہالت کا مظاہرہ کیا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا یہ انہوں نے اسے کہا جو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دے رہا تھا۔ اس قول کا ظاہر ایسا کہنے والے کے اعتقاد کے فساد



پر دلالت کرتا ہے اس شخص کا ایمان صحیح نہیں ہوتا جو ایسے نبی سے ایسی بات کرے جس کے معجزات ظاہر ہو چکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا حکم دیتا ہے، کیا تو ہم سے مزاح کرتا ہے۔ اگر کوئی اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کے متعلق یہ کہے تو اس کی تکفیر واجب ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ ان سے طبعی قساوت، جفا اور معصیت کی بنا پر تھا جیسا کہ خنن کے مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں کسی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ یہ ایسی تقسیم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا گیا (1)۔ اسی طرح ایک اور نے کہا تھا: اعدل یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم عدل کرو (2)۔ یہ تمام جہالت کے نتیجے ہونے پر واضح دلیل ہے اور جہالت مفسد دین ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد هُزُوا یہ دوسرا مفعول ہے، ہمزہ کی تخفیف جائز ہے تو اسے واو اور ہمزہ کے درمیان کر دے۔ حفص نے واو کو مفتوحہ بنایا ہے کیونکہ یہ ہمزہ مفتوحہ ہے جس سے پہلے ضمہ ہے یہ بدل کے طور پر جاری ہے جیسے السفهاء ولکن ہے۔ زاء سے ضمہ کا حذف کرنا جائز ہے جس طرح عضد سے حذف کیا جاتا ہے تو کہتا ہے: هُزُوا جیسا کہ اہل کوفہ نے پڑھا ہے۔ اسی طرح وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ (اخلاص) ہے۔

انفش نے عیسیٰ بن عمر سے حکایت کیا ہے کہ ہروہ اسم جس کے تین حرف ہوں پہلا حرف مضموم ہو تو اس میں دو لغتیں ہوتی ہیں، تخفیف اور تمثیل۔ جیسے عسر، ہزء۔ اس کی مثل وہ تمام جمع کے الفاظ ہیں جو فُعل کے وزن پر ہوتے ہیں جیسے کُتِبَ، دُکْتُبَ، رُسِلَ، دُرُسِلَ، عُوْنٌ، دُعُوْنٌ۔

اور رب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادٍ جُزْءًا (زخرف: 15) یہ ہزء اور کف کی طرح نہیں ہے کیونکہ یہ اصل میں فعل کے وزن پر ہے۔ جیسا کہ ان شاء اللہ اپنی جگہ پر اس کا ذکر آئے گا۔

**مسئلہ:** اس آیت میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین سے اور مسلمانوں کے دین سے اور ایسے شخص سے جس کی تعظیم واجب ہے اس سے استہزاء کرنا منع ہے اور یہ جہالت ہے اور استہزاء کرنے والا وعید کا مستحق ہے۔ مزاح، استہزاء میں سے نہیں ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مزاح فرمایا کرتے تھے اور آپ کے بعد ائمہ بھی مزاح فرمایا کرتے تھے۔ ابن خویزمنداد نے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی کہ ایک شخص عبید اللہ بن الحسن کی طرف گیا۔ اس وقت عبید اللہ، کوفہ کے قاضی تھے۔ عبید اللہ نے اس شخص سے مزاح کیا۔ عبید اللہ نے کہا: تیرا یہ جب بھیڑ کی اون کا ہے یا مینڈھے کی اون کا ہے؟ وہ شخص کہنے لگا: اے قاضی! جہالت کا مظاہرہ نہ کر۔ عبید اللہ نے کہا: تو نے مزاح کو کہاں جہالت پایا ہے؟ پھر یہ آیت اسے سنائی، عبید اللہ نے اس سے اعراض کر لیا کیونکہ اس نے اسے جاہل دیکھا کیونکہ وہ مزاح اور استہزاء میں فرق نہیں جانتا تھا حالانکہ ہر ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔

قَالُوا اذْعُمْنَا رَبِّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ اِنَّهُ يَقُولُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِصٌ وَلَا بَكْرٌ ۚ  
عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ ۚ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦١﴾



لغوی معنی واسع (کھلا) ہے یہ بعض متاخرین کا قول ہے۔ البکر غیر حاملہ چھوٹی گائے کو کہتے ہیں۔ قتی نے کہا: جو بچہ جنم دے چکی ہو۔ البکر پہلے بچہ کو بھی کہتے ہیں۔

یا بکر بکرین و یا غلب الکبد اصبحت منی کذراع من عضد  
اے دونو جوانوں کی پہلی اولاد! اے جگر کی جھلی! تو میرے نزدیک اس طرح ہے جیسے بازو سے ہاتھ کا تعلق ہے۔  
البکر جانوروں اور بنی آدم کی مونث کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کو ابھی ز سے جفتی نہ کیا ہو یا با کے کسرہ کے ساتھ ہے با کے فتحة کے ساتھ ہو تو اونٹ کا جوان بچہ مراد ہوتا ہے۔

العوان، نصف ایسی مادہ جو ایک یا دو بچے جنم دے چکی ہو یہ گاؤں میں سے جو طاق تور اور خوبصورت ہوتی ہے بخلاف گھوڑوں کے، شاعر گھوڑے کی صفت بیان کرتا ہے:

کسیت بهیم اللون ليس بفارض ولا بعوان ذات لون مخصف

سیاہ رنگ والا ہے، نہ بوڑھا ہے اور نہ چھوٹا ہے، کئی رنگوں والا چنگیرا ہے۔

فرش اخصف، چنگیرا گھوڑا۔ مجاہد نے کہا: گائیوں میں سے العوان اسے کہتے ہیں جو یکے بعد دیگرے بچے جنم دے چکی ہو، یہ اہل لغت نے بیان کیا ہے (1)۔ کہا جاتا ہے: ان العوان النحلة الطويلة۔ لمی کھجور کو عوان کہتے ہیں یہ ان کے گمان کے مطابق یعنی لغت ہے۔ حرب عوان، جب اس سے پہلے ایک جنگ ہو چکی ہو۔ زہیر نے کہا:

اذا لقت حرب عوان مضرباً ضروس تهز الناس انيابها عصل

جب جنگ تیز ہو اور نقصان دینے والی ہو۔ داڑھوں والی ہو تو لوگ اس کے ٹیڑھے دانتوں کو ناپسند کرتے ہیں۔  
یعنی وہ گائے نہ چھوٹی ہو نہ بوڑھی ہو یعنی وہ درمیانی عمر کی ہو۔ عوان کی جمع عؤن عین کے ضمہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ۔  
عؤن واؤ کے ضمہ کے ساتھ بھی اس کی جمع سنی گئی ہے جیسے رُسل یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فراء نے حکایت کیا ہے، العوان سے عؤنت تعویناً ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ یہ امر کی تجدید اور تاکید کے لئے ہے اور ہٹ دھرمی ترک کرنے پر تنبیہ ہے۔  
پس انہوں نے اس کو نہ چھوڑا (2)۔ یہ دلیل ہے کہ امر و جواب کے لئے آتا ہے جس طرح کہ فقہاء کہتے ہیں یہ صحیح ہے جو اصول الفقہ میں مذکور ہے اور امر (حکم) فوری طور پر لازم ہوتا ہے۔ یہ اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔ اس کی صحت پر یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے یہ کوتاہی سمجھی جب انہوں نے حکم کو بجالانے میں جلدی نہ کی۔ فرمایا: فَذَبْحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ (البقرہ) بعض علماء نے فرمایا: نہیں بلکہ امر کا وجوب علی التراخی ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تاخیر اور خطاب میں رجوع پر سختی نہیں فرمائی۔ ابن خويز منداد نے یہ کہا ہے۔

قَالُوا اذْعُمْ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْثُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءٌ فَاقِعٌ



## لَوْنُهَا تَسْرُّ النَّظْرَيْنِ ۝

”کہنے لگے: دعا کرو ہمارے لئے اپنے رب سے کہ بتائے ہمیں کیسا رنگ ہو اس کا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ایسی گائے جس کی رنگت خوب گہری زرد ہو جو فرحت بخشے دیکھنے والوں کو۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوا اِذْ عَلَّمْنَا بَكَّ يَبِينُ لَنَا مَالُ لَوْنُهَا، مَا اسْتَفْهَمَ مَبْتَدَاً لَوْنُهَا خَبْرٌ۔ لَوْنُهَا کو بین کے ساتھ نصب دینا بھی جائز ہے اور اس صورت میں مَا زائدہ ہوگا۔ لون کی جمع الالوان ہے یہ ایک ہیئت ہے جیسے کالا، سفید، سرخ۔ اللون کا معنی نوع بھی ہے۔ فلان متلون، رنگین مزاج شخص جو ایک عادت پر اور ایک حال پر نہ رہتا ہو۔ شاعر نے کہا:

کل یوم تتلون غیر هذا بک اجمل  
ہر روز تو بدلتا رہتا ہے مگر پھر بھی یہ عمل تجھ سے خوبصورت لگتا ہے۔

لَوْنُ البسملِ تلوناً جب کھجور میں پکنے کے اثر کا آغاز ہو۔ اللون، کھجور کی ایک قسم ہے۔ انخفش نے کہا: یہ جمع ہے اور اس کا واحد لینۃ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: صَفْرَ آء۔ جمہور مفسرین نے کہا کہ زرد رنگ کی ہو۔ یہ الصفرۃ المعروفہ سے ہے یعنی زرد رنگ جو معروف ہے۔ مکی نے بعض سے روایت کیا ہے حتیٰ کہ اس کے سینگ اور کھر بھی زرد ہوں۔ حسن اور ابن جبیر نے کہا: صرف اس کے سینگ اور کھر زرد ہوں (1)، حسن نے کہا صَفْرَ آء کا معنی سیاہ ہے (2)۔ شاعر نے کہا:

تلك خيل منة و تلك ركبان هن صفر اولادها كالنبيب

یہ میرے گھوڑے اور میری سواریاں اس کی طرف سے ہیں۔ یہ سیاہ ہیں ان کی اولاد کشمش کی طرح ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول صحیح ہے کیونکہ وہ ظاہر ہے اور یہ قول شاذ ہے۔ یہ مجازاً اونٹوں کے لئے استعمال ہوتا ہے (3)۔ اگر یہاں سیاہ رنگ مراد ہوتا تو اس کی تاکید الفقوع کے ساتھ نہ ہوتی کیونکہ فقوع کی صفت کے ساتھ مختص ہے۔ سیاہ رنگ کی صفت اس کے ساتھ نہیں لگائی جاسکتی۔ عرب کہتے ہیں: اسود حالک حُلُوک و حُلُوک و دجوجی و غریب۔ یہ سب کالے رنگ کی صفات ہیں اور سرخ رنگ کی صفت قان۔ کہا جاتا ہے: احمر قان۔ سفید رنگ کے لئے ابیض ناصع، لہق، لہاق و یقق کہا جاتا ہے اور سبز رنگ کے لئے اخضر ناصع اور زرد رنگ کے لئے اصفر فاقع کہا جاتا ہے۔ فقع لونہا یفقع فقوعاً جب خالص زرد رنگ ہو۔ الافقاع بری حالت کو کہتے ہیں۔ فواقع الدھر زمانے کی مصیبتیں، و فقع باصابعم، جب انگلیوں سے آواز نکالے۔ اسی سے حضرت ابن عباس کی حدیث ہے: نہی عن التثقیع فی الصلاة (4)۔ نماز میں چٹکارے نکالنے سے منع فرمایا۔ الفرقۃ انگلیوں کو موڑنا حتیٰ کہ آواز نکلے۔ صَفْرَ آء معروفہ اور نکرہ ہر حالت میں غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ ایضاً

3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

4۔ سنن ابن ماجہ، باب ما یکرہ فی الصلوٰۃ، حدیث 954، نیل القرآن بلی کیشنز

الف تانیث ہے جو لازم ہے اور یہ ہا کے مخالف ہے کیونکہ جس اسم کے آخر میں ہا ہوتی ہے وہ نکرہ ہونے کی صورت میں منصرف ہو جاتا ہے جیسے فاطمہ، عائشہ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاقْصِرْ لَوْنَهَا خالص رنگ مراد ہے اس کی جلد کی رنگت کے علاوہ اس میں کوئی رنگ نہ ہو۔ تَسْرُ الثَّظْرَيْنِ وہب نے کہا: گویا سورج کی شعاعیں اس کی جلد سے نکل رہی ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس نے فرمایا: زرد رنگ نفس کو خوش کرتا ہے۔ انہوں نے زرد جو تاپہنے پر برا بیگنہ کیا۔ یہ نقاش نے ان سے حکایت کیا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: جو زرد چمڑے کا جو تاپہنے کا اس کا غم کم ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: صَفْرًا قَاقِصٌ لَوْنَهَا تَسْرُ الثَّظْرَيْنِ۔ یہ ثعلبی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حکایت کیا ہے۔ حضرت ابن الزبیر، محمد بن ابی کثیر نے سیاہ جو تاپہنے سے منع فرمایا کیونکہ یہ پریشان کرتا ہے۔ تَسْرُ کا معنی اچھا لگنا خوش کرنا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: اس کا معنی ہے اسے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ یہ گائے دو وصفوں والی تھی۔ (1)

قَالُوا اذْعُ لَنَا رَبِّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۚ اِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا ۚ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَبُهْتَدُونَ ۝

”کہنے لگے: پوچھو ہمارے لئے اپنے رب سے کہ کھول کر بیان کرے ہمارے لئے کہ گائے کیسی ہو۔ بے شک گائے مشتبہ ہوگئی ہے ہم پر اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور اس کو تلاش کر لیں گے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا انہوں نے چوتھا سوال کیا اور بیان کے بعد بھی حکم کی پیروی نہیں کی۔ یہاں الْبَقَرَ مذکر ذکر کیا کیونکہ یہ جمع کے معنی میں ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا اِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا۔ الْبَقَرَ کے لفظ کی تذکیر کی وجہ سے فعل کا صیغہ بھی مذکر ذکر فرمایا۔ قطرب نے کہا: البقرة کی جمع باقر، باقور اور بقرا۔ اصمعی نے کہا: الباقر، جمع ہے باقرة کی۔ اور کہا: باقورة بھی بقر کی جمع بنائی جاتی ہے۔ یہ نحاس نے حکایت کیا ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی بقر کی جنس ہے۔ حسن نے اس کے مطابق پڑھا جو نحاس نے ذکر کیا ہے (2) اور اعرج نے اس کے مطابق جو ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ اِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ (تاء اور شین کی شد کے ساتھ) انہوں نے تشابہ کو فعل مضارع اور مؤنث بنایا ہے اصل میں تشابہ تھا۔ پھر تا کو شین میں ادغام کیا گیا ہے۔ مجاہد نے تشبہ جیسا کہ ان دونوں کی قراءت ہے مگر بغیر الف کے پڑھا ہے۔ حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں تشابہت (شین کی تشدید کے ساتھ) ہے۔ ابو حاتم نے کہا: یہ غلط ہے اس بات میں تا ادغام نہیں ہوتی مگر مضارع میں۔ یحییٰ بن یحمر نے ان الباقریشابہ پڑھا ہے (3)۔ انہوں نے اسے فعل مستقبل بنایا ہے بقر کو مذکر تصور کیا اور ادغام کیا۔ ان البقر تشابہ، شین کی تخفیف اور ہا کے ضمہ کے ساتھ۔ یہ ثعلبی نے حسن سے حکایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یشابہ شین اور یا کی تخفیف کے ساتھ جائز نہیں ہے یہ تا میں جائز ہے کیونکہ اصل تشابہ تھا دو تا کے اجتماع کی وجہ سے ایک کو حذف کر دیا۔ البقر، الباقر، البیقور، البقید یہ تمام لغتیں ہیں اور سب کا معنی ایک ہے عرب اس کو مذکر اور مؤنث دونوں

طرح استعمال کرتے ہیں۔ تشابہ میں مختلف قراءت کے معانی اس کی طرف لوٹتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: إِنَّ الْبَقْرَةَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا انہوں نے اس لئے کہا کیونکہ گائیوں کے رنگ ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس سے حضرت حذیفہ بن یمان کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت فرمائی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: فتنے رات کے ٹکڑوں کی طرح اس طرح آئیں گے جیسے گائیوں کے چہرے۔ یعنی بعض، بعض کے مشابہ ہوں گے اور گائیوں کے چہرے مشابہ ہوتے ہیں اسی وجہ سے بنی اسرائیل نے کہا: گائے ہم پر مشابہ ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ یہ ان کی طرف سے استثناء ہے۔ اس آخری میں استثنا کے ذکر کرنے میں ان کی طرف سے قبولیت اور پیروی ہے اور امر کی موافقت نہ کرنے پر شرمندگی کی دلیل ہے (1)۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو کبھی گائے کا پتا نہ پاتے (2)۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: انا لمهتدون ان شاء اللہ۔ اہتداء کو ذکر میں اس کے اہتمام کی وجہ سے مقدم فرمایا۔ شفاء شرط کی جگہ میں ہونے کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔ سیبویہ کے نزدیک اس کا جواب اِنّ اور جس میں وہ عمل کر رہا ہے۔ اور ابو العباس المبرد کے نزدیک جزاء محذوف ہے۔

قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولَ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا لَنْ جِئْنَا بِالْحَقِّ قَدْ بَحَوَّاهَا مَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ⑥

”موسیٰ علیہ السلام بولے: اللہ فرماتا ہے وہ گائے جس سے خدمت نہ لی گئی ہو کہ بل چلائے زمین میں اور نہ پانی دے کھیتی کو، بے عیب بے داغ۔ (عاجز ہو کر) کہنے لگے اب آپ لائے صحیح پتہ۔ پھر انہوں نے ذبح کیا اسے اور وہ ذبح کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے۔“

اللہ تعالیٰ کا شاد ہے: قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولَ جمہور علماء نے لَا ذَلُولَ کو بَقَرَةٌ کی صفت کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ آنفس نے کہا: لَا ذَلُولَ، بَقَرَةٌ کی صفت ہے اور اس پر نصب بھی جائز ہے۔ ابو عبد الرحمن السلمی نے لَا ذَلُولَ کو نفی کی بنا پر منصوب پڑھا ہے اور خبر مضمّر ہے اور یہ تقدیر بھی جائز ہے: لاہی ذلول لاہی تسقی الحراث وہی مسلّمہ۔ لَا ذَلُولَ کا مطلب ہے: اسے کام نے مطیع نہ بنایا ہو۔ کہا جاتا ہے: بقرة مذلة بينة الذل، انتہائی مطیع گائے۔ رجل ذلیل بین الذل (3)، انتہائی مطیع شخص، یعنی وہ گائے سخت ہو اس کو کام پر نہ لگایا گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تُثِيرُ الْأَرْضَ یہ بھی بقرہ کی صفت کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی وہی بقرة لَا ذَلُولَ مشبہ (4)۔ حسن نے کہا: وہ گائے وحشی تھی (5)۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ وصف بیان فرمایا لَا ذَلُولَ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ یعنی کھیتی کو پانی پلانے کے لئے اس کو عادی نہ بنایا گیا ہو اور نہ اس پر پانی لایا جاتا ہو۔ اس پر وقف بہتر ہے۔

3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

5۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

4۔ ایضاً



بعض علماء نے فرمایا: تُثْبِتُ عَلَیْہِ فَعْل ہے۔ اس کا معنی ہے: زمین چیرتی ہو اور اس سے کھیتی کو پانی نہ لگایا جاتا ہو (1)۔ اس تاویل پر لَا ذَلُولٌ پر وقف ہوگا پہلا قول دو وجہ سے اصح ہے۔ ایک وجہ تو وہ ہے جو نحاس نے حضرت علی بن سلیمان سے روایت کی ہے کہ تُثْبِتُ کو علیحدہ کلام بنانا جائز نہیں کیونکہ اس کے بعد لَا تَسْقِي الْحَرْثَ آرہا ہے اگر یہ مستانفہ جملہ ہوتا تو واو اور لا کے ساتھ جمع نہ کیا جاتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر وہ زمین جوتی ہو تو پھر وہ کام کی وجہ سے مطیع ہوگی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا ذَلُولٌ، وہ کام پر لگانے کی وجہ سے مطیع نہ ہو۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ تُثْبِتُ الْأَرْضَ عمل شمار نہ ہوتا ہو اس کے خوش ہونے اور نشاط کی وجہ سے جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا:

یہیل و یذری تریۃ و یثیرۃ اشارة نبات الہواجر مخس

وہ مٹی کو پھاڑتا ہے جس طرح گرمی میں پانچ اونٹوں والا آدمی مٹی کو چیرتا ہے تاکہ گیلی مٹی تک پہنچ جائے۔

اس صورت میں تُثْبِتُ مستانفہ ہوگا۔ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ اس پر معطوف ہوگا۔ اشارة الارض، مٹی کو حرکت دینا، اسے کریدنا۔ اسی سے حدیث پاک ہے: اثيرو القرآن فانه علم الاولین والاخرین، قرآن کو کھولو (پڑھو) کیونکہ یہ پہلے اور پچھلے لوگوں کا علم ہے۔

ایک روایت میں ہے: من اراد العلم فليثور القرآن جو علم کا راہ رکھتا ہے وہ قرآن کی تلاوت کرے۔ پہلے یہ گزر چکی ہے۔ قرآن میں ہے: اثار الارض یعنی انہوں نے کھیتی باڑی کے لئے زمین کو الٹ پلٹ لیا، الحراث وہ زمین جس میں کھیتی باڑی کی جائے۔

**مسئلہ:** اس آیت میں دلیل ہے کہ حیوان کو اس کی صفات سے مقید کیا جاسکتا ہے جب اس کی صفت بیان کر دی جائے اور وہ صفات سے مقید کر دیا جائے تو اس میں بیع سلم جائز ہے۔ یہی قول امام مالک اور ان کے اصحاب کا ہے اور امام اوزاعی، لیث اور امام شافعی کا ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز جس کی صفت بیان ہو سکتی ہے اس کی بیع سلم جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں گائے کا وصف بیان فرمایا جو تعین کے قائم مقام ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت دوسری عورت کا اپنے خاوند کے سامنے اس طرح حلیہ بیان نہ کرے حتیٰ کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے (2)۔ نبی کریم ﷺ نے صفت کو دیکھنے کے قائم مقام رکھا ہے اور آپ ﷺ نے قتل خطا کی دیت کو اس کے ذمہ کیا ہے جس نے دیت کو ایک مدت تک بطور قرض، اپنے اوپر لیا ہے اور فوراً ادا کرنا ضروری قرار نہیں دیا۔

2۔ صحیح بخاری، باب لا تباع المرأة المرأة فتعتها الزوجا، حدیث 4839، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

یہ کوئی علماء، امام ابو حنیفہ (ؒ) اور ان کے اصحاب، ثوری اور حسن بن صالح کے قول کا رد ہے جو کہتے ہیں: حیوان کی بیع سلم جائز نہیں ہے۔ حضرت ابن مسعود، حضرت حذیفہ اور حضرت عبدالرحمن بن سمرہ سے مروی ہے، حیوان کی صفت کی حقیقت پر آگاہی نہیں ہو سکتی جیسے اس کا چلنا اور حرکت کرنا کیونکہ صفات کے اعتبار سے اس کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیع سلم کا حکم اور اس کی شرائط اس سورت کے آخر میں آیت الدین کے ضمن میں آئیں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُسَلَّمَةٌ یعنی مہی مسئلہ۔ اس کا وصف ہونا بھی جائز ہے یعنی وہ گائے لنگڑے پن اور تمام عیوب سے سلامت ہو۔ یہ قتادہ اور ابوالعالیہ کا قول ہے (1)۔ مسئلہ من العمل، عمل سے سلامت نہیں کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی عمل سے نفی فرمائی ہے۔ حسن نے کہا: اس کے پاؤں سلامت ہوں ان میں کام کا کوئی اثر نہ ہو۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا شِيَةَ فِيهَا اس میں ایسا رنگ نہ ہو جو اس کے کثیر رنگ کے مخالف ہو۔ یہ گائے ساری زرد ہو نہ اس میں سفیدی ہو نہ سرخی ہو اور نہ سیاہی ہو۔ جیسا کہ فرمایا: فَاقْعَمْ لَوْنَهَا۔ شِيَةَ اصل میں دُشِيَ تھا واد کو حذف کیا گیا جیسا کہ یثی سے حذف کیا گیا اصل میں یوشی تھا۔ اس کی مثال زنة، عدة اور صلة ہیں۔

الشية، دُشِيَ الشوب سے مشتق ہے جب کپڑ اور رنگوں پر بنا گیا ہو۔ شوڑ موشی جس بیل کے منہ میں اور بانوں میں سیاہی ہو۔ ابن عرفہ نے کہا: الشية سے مراد رنگ ہے، چغلخوڑ کو دُاش نہیں کہا جاتا حتیٰ کہ وہ کلام کو تبدیل کر دے اور اس میں مزید اپنی طرف سے رنگ بھر دے اور اسے مختلف اقسام پر کر دے اور اس میں سے جو چاہے مزین کر دے۔ الوشی، کا معنی کثرت بھی ہے۔ دُشِيَ بنو فلان اس کا مطلب ہے۔ وہ زیادہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے: فراس ابلق، کبش أخرج، تيسس ابرق، غراب ابقع اور شوڑ اشية، ان میں ہر ایک کا معنی چنگبر ہے، یہ اہل لغت کی نص ہے۔ (3)

گائے میں یہ اوصاف ذکر کرنا اس لئے تھا کہ انہوں نے سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی اللہ کا دین آسان ہے۔ انبیاء کرام اور علماء وغیرہ سے بغیر ضرورت سوال کرنا مذموم ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔ اس گائے کے قصص میں بہت سی روایات مروی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا۔ اس کا بچہ پیدا ہوا۔ اس کی ایک بچھڑی تھی اس نے اسے ایک جنگل میں چھوڑ دیا اور کہا: اے اللہ! میں یہ بچھڑی تیری بارگاہ میں ودیعت کرتا ہوں اس بچے کے لئے۔ وہ شخص فوت ہو گیا، جب وہ بچہ بڑا ہوا تو اس کی ماں نے اسے کہا: وہ ماں کا بڑا فرمانبردار تھا، تیرے باپ نے تیرے لئے ایک بچھڑی اللہ کی بارگاہ میں ودیعت کی تھی، تم جاؤ اور وہ لے آؤ۔ وہ لڑکا گیا۔ جب گائے نے اسے دیکھا تو وہ اس کے پاس آگئی حتیٰ کہ اس نے اس کو سینگوں سے پکڑ لیا۔ وہ گائے وحشی بنی ہوئی تھی، اس نے اسے اپنی ماں کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ بنی اسرائیل اسے راستہ میں ملے تو انہوں نے اس گائے کو اس صفت پر پایا جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ انہوں نے اس سے سودا کیا تو اس نے ان سے بہت زیادہ قیمت مانگی۔ عکرمہ کی روایت کے مطابق اس کی قیمت تین دینار تھی۔ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا: یہ شخص ہم سے بہت زیادہ قیمت مانگتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً (1) احناف کے نزدیک بیع سلم کے لیے یہ شرط ہے

کہا: اس کی ملکیت کے بارے میں اسے راضی کرو۔ پس انہوں نے وہ گائے اس سے اس کے وزن کے مطابق خریدی۔ یہ عبیدہ کا قول ہے۔ سدی نے کہا: دس مرتبہ وزن کے ساتھ خریدی۔ بعض نے کہا: اس کی کھال دنانیر سے بھر کر دینے کے بدلے میں خریدی۔ مکی نے ذکر کیا ہے کہ یہ گائے آسمان سے نازل ہوئی تھی وہ زمین کی گائیوں میں سے نہیں تھی۔ (1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قَالُوا الثَّنُ جُنَّتْ بِالْحَقِّ** یعنی تو نے حق کو بیان کیا۔ یہ قتادہ کا قول ہے (2)۔ اخفش نے کہا: **قَالُوا الثَّنُ** الف و صلی کو قطعی بنایا جیسے کہا جاتا ہے: یا اللہ۔ ایک اور وجہ حکایت کی ہے: **قَالُوا الْآنَ**۔ واو کے اثبات کے ساتھ اس کی مثال اہل مدینہ اور ابو عمرو کی قراءت ہے **عَادَ الْوَلَّى** کو فیوں نے **قَالُوا الْآنَ** ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ کی قراءت **قَالَ** لان ہمزہ کی تخفیف کے ساتھ اور اتقائے ساکنین کی وجہ سے واو کے حذف کے ساتھ۔ زجاج نے کہا: **الآن** مبنی برفتحہ ہے یہ باقی تمام کلمات کے مخالف ہے جن میں الف، لام ہوتا ہے کیونکہ الف اور لام غیر عہد کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ تو کہتا ہے: **انت الی الآن** ہنا اس کا معنی ہے: تو اس وقت تک یہاں ہے پس اس کو مبنی بنایا گیا ہے جس طرح **هَذَا** کو مبنی بنایا گیا ہے اور **نُون** کو اتقائے ساکنین کی وجہ سے فتح دیا گیا ہے۔ یہ زمانہ حال سے عبارت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَا كَاذُوَايَفْعَلُونَ** سیبویہ نے کا دان یفعل کو عسو کی مشابہت کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے۔ یہ بحث سورت کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ یہ خبر ہے کہ انہوں نے گائے کے ذبح میں تاخیر کی اور اللہ تعالیٰ کے امر کو جلدی پورا نہ کیا۔ قرظی محمد بن کعب نے کہا: اس کی وجہ قیمت کا مہنگا ہونا تھا۔ بعض نے کہا: اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں خوف تھا کہ قاتل کا پتہ چل جائے گا، یہ حضرت وہب بن منبہ نے کہا ہے۔ (3)

**وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّعَاكُمْ فِيهَا ۚ وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ۝**

”اور یاد کرو جب قتل کر ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر تم ایک دوسرے پر قتل کا الزام لگانے لگے۔ اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا جو تم چھپا رہے تھے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّعَاكُمْ فِيهَا ۚ** یہ کلام قصہ کی ابتدا پر مقدم ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: **وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّعَاكُمْ فِيهَا**، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح کا حکم دیتا ہے، یہ اس ارشاد کی طرح ہے **أَلْحَسَدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا ۝ (الکہف)** اس کی تقدیر اس طرح ہے: **انزل علی عبدہ الکتاب قیماً ولم یجعل له عوجاً**۔ اس کی مثالیں بہت سی ہیں جو ہم نے قصہ کے آغاز میں بیان کر دی ہیں۔

اس شخص کے قتل کے سبب کے متعلق دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ اس شخص کی ایک خوبصورت بیٹی تھی۔ اس نے پسند کیا کہ اس کے چچا کا بیٹا اس سے نکاح کرے لیکن چچا نے اسے منع کیا۔ پس اس نے اسے قتل کر دیا اور پھر اپنے شہر سے اٹھا کر دوسرے شہر میں پھینک دیا۔ بعض نے فرمایا: دونوں شہروں کے درمیان پھینک دیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس نے میراث طلب کرنے کی خاطر اسے قتل کیا۔ وہ فقیر تھا اس نے کسی خاندان پر اس کے قتل کا دعویٰ کر دیا۔ عکرمہ نے کہا: بنی اسرائیل کی ایک

1۔ المحرر الوجیز تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا



مسجد تھی اس کے بارہ دروازہ تھے۔ ہر دروازہ ایک قوم کے لئے تھا۔ وہ اس سے داخل ہوتے تھے۔ پس انہوں نے ایک خاندان میں ایک مقتول پایا، ہر قوم نے دوسری قوم پر دعویٰ کیا پھر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جھگڑتے ہوئے آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذَبُّوا بِقَرَّةٍ (البقرہ: 67)

اداراتم کا معنی ہے: تم نے اختلاف کیا اور جھگڑا کیا۔ یہ مجاہد کا قول ہے (1)۔ تداراتم اس کی اصل ہے تاکہ دال میں ادغام کیا گیا، مدغم کے ساتھ ابتدا کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ ساکن ہوتا ہے اس لئے الف زیادہ کیا گیا..... وَاللَّهُ مُخْرِجٌ۔ یہ مبتدا خبر ہیں۔ مَا كُنْتُمْ يَہُ مُخْرِجٌ کی وجہ سے منصوب ہے۔ اضافت کی وجہ سے تونین کا حذف کرنا بھی جائز ہے۔ تَكْتُونُ یہ کان کی خبر کی جگہ ہے اس میں عائد مخذوف ہے تقدیر کلام اس طرح ہے: تَكْتُونُ۔

اس قول کی بنا پر کہ اس نے میراث کی خاطر قتل کیا تھا تو اس وقت جان بوجھ کر قتل کرنے والا وارث نہیں ہوتا تھا۔ یہ عبیدہ سمانی نے روایت کیا ہے (2)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس شخص نے اپنے چچا کو میراث کی خاطر قتل کیا تھا (3)۔ ابن عطیہ نے کہا: ہماری شریعت میں بھی اسی طرح ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں بیان کیا ہے کہ اخیجہ بن الحلاح کا واقعہ اس کے چچا کے بارے میں یہی قاتل کے وارث نہ ہونے کا سبب بنا تھا۔ پھر اسلام میں یہ قانون ثابت رہا جس طرح بہت سی چیزیں زمانہ جاہلیت کی ثابت رہیں (4)۔ اس میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں کہ جان بوجھ کر قتل کرنے والا دیت اور میراث کا وارث نہ ہوگا مگر ایک فرقہ جمہور سے جدا ہوا وہ سب بدعتی ہیں۔ اور خطا قتل کرنے والا دوسری میراث سے وارث ہوگا، دیت سے وارث نہ ہوگا۔ یہ امام مالک، اوزاعی، ابو ثور اور امام شافعی کا قول ہے کیونکہ ایسے شخص پر تہمت نہیں ہوتی کہ اس کو میراث کے لئے قتل کیا ہے اور مال لینے کے لئے قتل کیا ہے۔ سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: امام شافعی کا بھی دوسرا قول یہی ہے عہد اور خطا قتل کرنے والا نہ مال سے وارث ہوگا نہ دیت سے وارث ہوگا۔ یہی قول شریح، طاووس، شعبی اور نخعی کا ہے۔

شعبی نے حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت زید رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جان بوجھ کر قتل کرنے والا اور خطا قتل کرنے والا کسی چیز کا وارث نہ ہوگا۔ مجاہد سے دونوں قول مروی ہیں۔ بصریوں کے ایک طائفہ نے کہا: قتل خطا میں دیت اور باقی مال دونوں سے وارث ہوگا۔ یہ ابو عمر نے حکایت کیا ہے۔ امام مالک کا قول اصح ہے جیسا کہ آیۃ المواریث میں اس کا بیان آئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذَلِكَ يُخَيِّ اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٦٨﴾

”تو ہم نے فرمایا کہ مارو اس مقتول کو گائے کے کسی ٹکڑے سے۔ (دیکھا) یوں زندہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ مردوں کو۔ اور دکھاتا ہے تمہیں اپنی (قدرت کی) نشانیاں شاید تم سمجھ جاؤ۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا بعض علماء نے فرمایا: بعض سے مراد زبان ہے کیونکہ وہ کلام کا آلہ ہے۔ بعض نے کہا: ریڑھ کی ہڈی، کیونکہ اس سے انسان کی تخلیق مرکب کی جاتی ہے۔ بعض نے فرمایا: ران ہے، بعض نے فرمایا:

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری والحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً زیر آیت ہذا 4۔ الحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کوئی ہڈی ہے، کوئی کاٹا ہوا عضو ہے، جب اسے گائے کا کوئی ٹکڑا لگایا گیا تو وہ زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کے متعلق خبر دی پھر مردہ ہو گیا جس طرح پہلے تھا۔

**مسئلہ:** امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے قسامت کے قول کی صحت پر مقتول کے قول کا (میرا خون فلاں پر ہے یا مجھے فلاں نے قتل کیا ہے) ابن وہب اور ابن قاسم کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ امام شافعی اور جمہور علماء نے مقتول کے قول سے استدلال سے منع کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہی صحیح ہے کیونکہ مقتول کا قول میرا خون فلاں پر ہے یا مجھے فلاں نے قتل کیا ہے یہ ایک خبر ہے جو صدق و کذب کا احتمال رکھتی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مدعی علیہ کا خون معصوم ہے اور اس کو مباح کرنا ممنوع ہے مگر یقین کے ساتھ اور احتمال کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہو سکتا۔ پس مقتول کے قول کا اعتبار باطل ہے۔ رہا بنی اسرائیل کا مقتول تو وہ معجزہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے زندہ کرنے کی خبر دی تھی۔ وہ اپنے قاتل کے متعلق پختہ سچی خبر دینے کا متضمن ہے اس میں کوئی احتمال نہیں ہے۔ پس یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ابن عربی نے کہا: اس شخص کے زندہ کرنے میں معجزہ تھا۔ جب وہ زندہ ہو گیا تو اس کا کلام قبول ورد میں دوسرے لوگوں کے کلام کی طرح ہو گیا۔ یہ ایک دقیق علم کا فن ہے جس کو صرف امام مالک ہی سمجھ سکتے ہیں، قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جب وہ خبر دے گا تو اس کا صدق واجب ہوگا۔ ہو سکتا ہے انہیں اس کے ساتھ قسامت کا بھی حکم دیا ہو۔ امام بخاری، امام شافعی اور علماء کی ایک جماعت نے اس کو بعید سمجھا ہے۔ انہوں نے کہا: خون کے بارے اس کا قول کیسے معتبر ہوگا حالانکہ اس کا قول ایک درہم کے بارے بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

**مسئلہ:** قسامت کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ سالم، ابو قلابہ، عمر بن عبد العزیز اور حکم بن عیینہ سے اس کے حکم کے بارے میں توقف مروی ہے۔ امام بخاری کا میلان بھی اسی طرف ہے کیونکہ انہوں نے قسامت کی حدیث اپنی جگہ پر ذکر نہیں کی۔ جمہور علماء نے کہا: قسامت کا حکم نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے پھر اس کے حکم کی کیفیت میں اختلاف ہے۔

ایک طائفہ نے کہا: پہلے دعویٰ کرنے والے قسمیں اٹھائیں گے۔ جب وہ قسمیں اٹھا دیں گے تو وہ مستحق ہو جائیں گے اگر وہ انکار کریں گے تو مدعی علیہم پچاس قسمیں اٹھائیں گے اور بری ہو جائیں گے۔ یہ اہل مدینہ، لیث، امام شافعی، امام احمد اور ابو ثور کا قول ہے۔ اس کی دلیل حویصہ اور محیصہ والی حدیث ہے۔ اس کو امام مالک وغیرہ نے تخریج کیا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ مدعی علیہم سے پہلے قسم لی جائے گی۔ پس وہ قسمیں اٹھا دیں گے تو وہ بری ہو جائیں گے۔ حضرت عمر بن خطاب، شعبی اور نخعی سے یہی مروی ہے، ثوری اور کوفیوں نے بھی کہا ہے اور ان علماء نے شعبہ بن عبید بن بشیر بن یسار کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جس میں ہے مدعی علیہم پہلے قسمیں اٹھائیں اور وہ یہود تھے۔ اور اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جسے ابو داؤد نے عن الزہری عن ابی سلمہ بن عبد الرحمن عن رجال من الانصار کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہود سے فرمایا: اور پہلے ان سے آغاز کیا، کیا تم میں سے پچاس آدمی قسمیں اٹھائیں گے؟ انہوں نے انکار کیا۔ آپ نے پھر انصار سے فرمایا: (تم قسمیں اٹھا کر) اپنا حق طلب کرو۔ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ ہم غیب پر (کیسے) قسمیں اٹھائیں؟ رسول اللہ ﷺ نے دیت یہود پر لازم فرمائی کیونکہ مقتول ان کے درمیان پایا گیا تھا، اور نبی کریم ﷺ کے اس

ارشاد سے حجت پکڑی ہے کہ ”قسم مدعی علیہ پر ہے (1)۔“ پس مدعی علیہ متعین کیے گئے۔ ان علماء نے فرمایا: یہ قطعی اصل ہے دعویٰ میں جس کی حکمت پر شرع نے تنبیہ فرمائی ہے ”اگر لوگوں کو ان کے دعووں کے متعلق دیا جاتا تو لوگ دوسرے لوگوں کے خون اور مالوں کا دعویٰ کرتے لیکن قسم مدعی علیہ پر ہے۔“

پہلے مقالہ والوں نے ان کا جواب اس طرح دیا ہے کہ سعید بن عبید کی حدیث یہود کے آغاز کرانے میں اہل حدیث کے نزدیک وہم ہے۔ اسے نسائی نے نقل کیا ہے اور انہوں نے فرمایا: اس روایت میں سعید کا متابع کوئی نہیں اور حضرت بشیر بن سہیل کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدین سے آغاز فرمایا۔ حضرات یحییٰ بن سعید، ابن عیینہ، حماد بن زید، عبد الوہاب الشافعی، عیسیٰ بن حماد اور بشیر بن المفضل یہ سات افراد ہیں انہوں نے اس حدیث کو مسند ذکر کیا ہے۔ اگرچہ اس حدیث کو امام مالک نے مرسل ذکر کیا لیکن حفاظ کی ایک جماعت نے اسے متصل ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث سعید بن عبید کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے۔ ابو محمد الاصبغی نے کہا: خبر واحد کے ساتھ ایک جماعت کی خبر پر معارضہ کرنا جائز نہیں اس کے ساتھ ساتھ سعید بن عبید نے اپنی حدیث میں کہا: نبی کریم ﷺ نے صدقہ کے اونٹوں سے سوانٹ اس کی دیت دی اور صدقہ دیت میں نہیں دیا جاتا اور صدقہ کے ذریعے غیر اہل سے صلح نہیں کی جاتی۔ ابوداؤد کی حدیث مرسل ہے اس کے ساتھ احادیث صحیحہ متصلہ کا معارضہ نہیں کیا جاسکتا اور اصل میں تمسک کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ حکم خونوں کی حرمت کے لئے بنفسہ اصل ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بینہ (دلیل) کو مدعی اور قسم کو مدعی علیہ پر جاری فرمایا اور اس کے ظاہر کے ساتھ حکم لگانا واجب ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یا اپنے نبی کی زبان پر کسی چیز کے بارے میں حکم کو خاص کر دے تو اس خبر سے اس کی استثناء کی جائے گی۔ ان چیزوں میں کتاب اللہ جس پر دلالت کرتی ہے مقذوف کی حد، قاذف کو لازم کرنا جب اس کے پاس چار گواہ نہ ہوں جو قاذف کی صداقت کی گواہی دیں۔ اس بارے میں جو اس نے مقذوف پر تہمت لگائی۔ اسی طرح جس نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی تو اسے اس سے حد کو ساقط کرنے کے ساتھ خاص فرمایا جب کہ وہ چار مرتبہ شہادت دے، اور ان دلائل میں سے جس کو سنت نے خاص کیا ان میں نبی کریم ﷺ کا قسامت کے ساتھ فیصلہ کرنا ہے۔ ابن جریج نے عطاء بن ابی ہریرہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: دعویٰ کرنے والے پر گواہ پیش کرنا ہے اور قسم منکر پر ہے مگر قسامت میں (ایسا نہیں) اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ امام مالک نے اس مسئلہ کے لئے مؤطا میں جس دلیل سے حجت پکڑی ہے اس میں کفایت ہے، وہاں غور کرو۔

**مسئلہ:** قسامت کے ساتھ قصاص کے وجوب میں بھی اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے اس کے ساتھ قصاص واجب کیا ہے۔ یہ امام مالک، لیث، احمد اور ابو ثور کا قول ہے۔ اس کی وجہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے جو آپ نے حویصہ محیصہ اور عبد الرحمن کو فرمایا کیا تم قسم اٹھاؤ گے اور تم اپنے ساتھی کے خون کے مستحق ہو جاؤ گے (2)۔ ابوداؤد نے عمرو بن شعیب عن

1۔ صحیح بخاری، باب اذا اختلف الراہن والمرتهن فالبیئۃ علی المدعی والبیئۃ علی المدعی علیہ، حدیث 2331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب المودعة والمصالحة مع المشرکین بالمال ولعورہ واثم من لم یلف بالعہد، حدیث 2937، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بنی نصر بن مالک کے ایک شخص کو قسامت کی وجہ سے قتل کیا۔ دارقطنی نے کہا: عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کا نسخہ صحیح ہے۔ اسی طرح ابو عمر بن عبد البر نے عمرو بن شعیب کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور اس سے حجت پکڑی ہے۔

امام بخاری نے فرمایا: میں نے علی بن مدینی، احمد بن حنبل، حمیدی، اسحاق بن راہویہ کو دیکھا وہ اس حدیث سے حجت پکڑتے تھے۔ دارقطنی نے ”السنن“ میں یہی کہا۔ ایک جماعت نے کہا: قسامت کے ساتھ قصاص نہیں ہے اس سے دیت واجب ہوتی ہے۔ یہ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے یہی نخعی اور حسن کا قول ہے۔ یہی نظریہ ثوری، کوفیوں، امام شافعی اور اسحاق کا ہے۔ ان علماء نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو امام مالک سے ابن ابی لیلیٰ بن عبد اللہ عن ہل بن ابی حثمہ کے سلسلہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انصار کو فرمایا: تم اپنے ساتھی کی دیت دے دو یا اعلان جنگ کرو۔ ان علماء نے فرمایا: یہ دیت پر دلیل ہے نہ کہ قصاص پر اور یہ علماء فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ کا حویصہ وغیرہ کو یہ کہنا کہ تم اپنے ساتھی کے خون کے مستحق ہو جاؤ گے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے مقتول کے خون کی دیت کے مستحق ہو جاؤ گے کیونکہ یہود ان کے اصحاب نہیں تھے اور جو اپنے ساتھی کی دیت کا مستحق ہو گا وہی اس کے خون کا مستحق ہو گا کیونکہ کبھی دیت قتل عمد میں لی جاتی ہے۔ پس یہ خون کا استحقاق ہو گا۔

**مسئلہ:** قسامت کا موجب جب اللوث ہے اس کا ہونا ضروری ہے اور اللوث سے مراد ایسی علامت ہے جو قتل کے مدعی کی سچائی کو ظن پر غالب کر دے۔ مثلاً ایک عادل آدمی کا قتل کے دیکھنے پر گواہی دینا یا مقتول اپنے خون میں لت پت دیکھا گیا اور جس پر تہمت لگائی ہے وہ اسی طرف ہے یا اس کے قریب ہے اس پر قتل کے آثار ہیں۔ اللوث، اس کے متعلق قول میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: وہ مقتول کا قول ہے کہ میرا خون فلاں کے پاس ہے۔

ایک عادل گواہ لوٹ ہے۔ اسی طرح ابن القاسم کی روایت مالک سے ہے۔ اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ ایک غیر عادل شاہد اور ایک عورت کے ساتھ قسم لی جائے گی۔ ابن وہب نے روایت کیا ہے کہ عورتوں کی گواہی لوٹ ہے۔ محمد نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے کہ دو عورتوں کی گواہی لوٹ ہے نہ کہ ایک عورت کی گواہی۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: اللوث میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ مذہب مشہور یہ ہے کہ وہ عادل شاہد ہے۔ محمد نے کہا: یہی میرے نزدیک محبوب ہے۔ فرمایا: ابن القاسم اور ابن عبد الحکم نے اسی کو اختیار کیا۔ عبد الملک بن مروان سے مروی ہے کہ مجروح اور مضروب جب کہے کہ میرا خون فلاں پر ہے اور پھر وہ مرجائے تو قسامت ہے۔ امام مالک اور لیث بن سعد کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک نے بنی اسرائیل کے مقتول سے حجت پکڑی ہے۔ اس نے کہا تھا: مجھے فلاں نے قتل کیا۔ امام شافعی نے فرمایا: اللوث ایک گواہ ہے یا تو وہ دلیل لائے اگرچہ وہ عادل نہ بھی ہوں۔

ثوری اور کوفیوں نے صرف مقتول کے پائے جانے کے ساتھ قسامت کو ثابت کیا ہے اور انہوں نے مقتول کے قول کی رعایت اور ایک گواہ کی کوئی پروا نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں: جب مقتول ایک قوم کے محلہ میں پایا گیا اور اس پر قتل کا اثر بھی ہے تو

اس جگہ کے لوگ حلف اٹھائیں گے کہ انہوں نے اسے قتل نہیں کیا اور دیت ان (اہل محلہ) پر ہوگی اور جب اس پر قتل کا کوئی اثر نہ ہوگا تو عاقلہ پر کچھ نہ ہوگا مگر یہ کہ کسی ایک کے خلاف بینہ (دلیل) قائم ہو جائے۔ سفیان نے کہا: ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے۔ یہ ضعیف قول ہے۔ انہوں نے اہل علم کی مخالفت کی ہے۔ اس میں ان سے پہلے کوئی ایسا قول کرنے والا نہیں ہے۔ یہ قول قرآن و سنت کے مخالف ہے کیونکہ اس میں عاقلہ پر بغیر دلیل اور بغیر اقرار کے مال کو لازم کرنا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا نظریہ یہ ہے کہ مقتول جب کسی قوم کے محلہ میں پایا جائے تو وہ رائیگاں ہے کسی قریبی گھروالے کو نہیں پکڑا جائے گا کیونکہ کبھی مقتول قتل کیا جاتا ہے پھر اسے کسی دوسرے قوم کے دروازے پر ڈال دیا جاتا ہے تاکہ وہ ملوث ہو جائیں۔ پس ایسی صورت میں مؤاخذہ نہیں ہوگا حتیٰ کہ وہ اسباب جو قسامت کے وجوب میں علماء نے مقرر کیے ہیں وہ پائے جائیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا: اس میں فیصلہ کو مؤخر کیا جائے گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس میں فیصلہ فرمائے گا۔

**مسئلہ:** قاسم بن مسعدہ نے کہا: میں نے نسائی سے کہا امام مالک قسامت کا قول نہیں کرتے مگر لوٹ کے ساتھ، پھر انہوں نے قسامت کی حدیث کیوں ذکر کی ہے۔ اس میں لوٹ کا ذکر تو نہیں ہے۔ نسائی نے کہا: مالک نے انصار اور یہود کے درمیان جو عداوت تھی اسے لوٹ کے قائم مقام رکھا ہے اور لوٹ اور میت کے قول کو عداوت کے قائم مقام رکھا ہے۔ ابن ابی زید نے کہا: اس کی اصل بنی اسرائیل کے قصہ میں ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو زندہ فرمایا جس کو گائے کا کوئی حصہ لگایا گیا تھا اور اس نے کہا تھا: مجھے فلاں نے قتل کیا ہے اور عداوت بھی لوٹ (علامت) ہے۔

امام شافعی نے فرمایا: ہم مقتول کے قول کو لوٹ نہیں سمجھتے جیسا کہ پیچھے گزرا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب دو قوموں میں عداوت ظاہر ہو جیسا کہ انصار اور یہود کے درمیان عداوت تھی اور مقتول کسی ایک فریق میں پایا گیا ہو اور ان کے درمیان اور کوئی قوم نہ ہو تو قسامت اس میں واجب ہوگی۔

**مسئلہ:** اس مقتول کے بارے میں اختلاف ہے جو اس محلہ میں پایا گیا جس کے باشندے کرائے دار ہیں۔ اصحاب الرائے نے کہا: قسامت مالکوں پر ہوگی، رہائشی لوگوں پر کچھ نہ ہوگا، اگر وہ مالکان اپنے مکانات بیچ دیں پھر کوئی مقتول پایا گیا تو دیت مشتری پر ہوگی رہنے والوں پر کچھ نہ ہوگا۔ اگر گھروں کے مالکان غائب ہوں اور انہوں نے اپنے گھر کرائے پر دے دیے ہوں تو قسامت اور دیت غائب مالکان پر ہوگی، رہائشیوں پر کچھ نہ ہوگا جن کے درمیان وہ مقتول پایا گیا۔ پھر یعقوب نے اس قول سے رجوع کر لیا۔ اس نے کہا: قسامت اور دیت گھروں میں رہنے والوں پر ہوگی۔ اس قول کو ابن ابی لیلیٰ سے حکایت کیا ہے اور انہوں نے اس سے بھی حجت پکڑی ہے کہ اہل خیبر عمال تھے اور رہائشی تھے (مالکان نہیں تھے) وہ کام کرتے تھے۔ پس مقتول ان میں پایا گیا۔ ثوری نے کہا: ہم کہتے ہیں: وہ اصل مالکوں پر ہوگا۔ امام احمد نے کہا: ابن ابی لیلیٰ کا قول قسامت میں ہے نہ کہ دیت میں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: یہ سب برابر ہیں، نہ دیت ہے نہ قصاص ہے مگر ایسی دلیل کے ساتھ جو قائم ہو جائے یا کوئی ایسی بات پائی جائے جو قسامت کو ثابت کرے تو اولیاء قسم دیں گے۔ ابن منذر نے کہا: یہ قول اصح ہے۔

**مسئلہ:** قسامت میں پچاس سے کم آدمی قسم نہیں اٹھائیں گے کیونکہ حویصہ اور محیصہ کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”تم میں پچاس سے کم آدمی قسم نہیں اٹھائیں گے ان میں سے کسی ایک پر۔“ اگر مستحق پچاس ہوں تو ان میں سے ہر ایک ایک قسم اٹھائے گا۔ اگر ان کی تعداد پچاس سے کم ہو یا ان میں سے کوئی ایسا شخص قسم اٹھانے سے انکار کرے جس کا معاف کرنا جائز نہیں تو ان کی تعداد کے مطابق ان پر قسمیں لوٹائی جائیں گی اور قتل عمد میں دو مردوں سے کم قسم نہیں اٹھائیں گے۔ مردوں میں سے ایک اور عورتیں قسم نہیں اٹھائیں گی، اولیاء قسم اٹھائیں گے جن سے اولیاء مدد طلب کرتے ہوں گے عصبہ میں سے اور یہ پچاس قسمیں اٹھائیں گے۔

یہ امام مالک، امام لیث، امام ثوری، امام اوزاعی، امام احمد اور داؤد کا مذہب ہے۔ مطرف نے مالک سے روایت کیا ہے کہ مدنی علیہ کے ساتھ کوئی قسم نہیں اٹھائے گا اور وہی خود قسمیں اٹھائیں گے جیسا کہ اگر وہ ایک ہو یا زیادہ ہوں تو پچاس قسمیں اٹھائیں گے اور اپنے آپ کو قسموں کے ذریعے بری کریں گے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: قسم نہیں اٹھائے گا مگر وارث خواہ قتل عمد ہو یا قتل خطا ہو۔ مال پر قسم نہیں اٹھوائی جائے گی اور اس کا مستحق نہ ہوگا مگر جس کے لئے بذات خود مالک ہو یا ورثاء میں سے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ملک بنائی ہو اور ورثاء اپنی اپنی میراث کے مطابق قسمیں اٹھائیں گے۔ یہ ابو ثور کا قول ہے۔ ابن منذر نے اس کو اختیار کیا اور یہی صحیح ہے کیونکہ جس پر دعویٰ نہیں کیا گیا اس کے لئے کوئی سبب نہیں ہے کہ اس کی طرف اس میں قسم متوجہ ہو (یعنی اس سے قسم لی جائے)۔ قسم سے مقصود دعویٰ سے برأت ہے اور جس پر دعویٰ ہی نہیں کیا گیا وہ بری ہے۔ امام مالک نے قتل خطا میں فرمایا: اس میں مردوں میں سے اور عورتوں میں سے ایک قسم لی جائے گی۔ جب پچاس قسمیں ایک سے یا زیادہ سے مکمل ہو جائیں گی تو قسم اٹھانے والا میراث کا مستحق ہوگا اور جو قسم سے انکار کرے گا وہ کسی چیز کا مستحق نہ ہوگا۔ اگر وہ آجائے جو غائب تھا اور قسم اٹھا دے جو اس پر واجب تھی تو وہ میراث کا مستحق ہوگا۔ یہ امام مالک کا مشہور قول ہے اور امام مالک سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ وہ قتل خطا میں قسامت نہیں دیکھتے تھے۔

قسامت کے مسائل، اس کی فروع اور احکام اور اختلاف کتب فقہ میں موجود ہیں اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس میں کفایت ہے۔

**مسئلہ:** اس گائے کے قصہ میں دلیل ہے کہ ہم سے پہلے لوگوں کی شریعت ہمارے لئے بھی شریعت ہے۔ متکلمین اور فقہاء کی ایک قوم نے اسے اختیار کیا ہے۔ کرنی نے اسے اختیار کیا ہے۔ ابن بکیر قاضی جو ہمارے علماء سے ہیں انہوں نے اس پر نص قائم کی ہے۔ قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے کہا: یہ وہ ہے جس کا تقاضا مالک کے اصول کرتے ہیں اور ان کا اختلاف ان کی کتب میں موجود ہے۔ امام شافعی کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَيُهْدِيهِمْ لِقَابِئِهِمْ** (انعام: 90) (ان کی ہدایت کی اقتدا کرو)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كَذَلِكَ يُخَيِّ اللَّهُ الْمَوْتَىٰ** یعنی جس طرح اس نے اس شخص کو مرنے کے بعد زندہ کیا اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر مرنے والے کو زندہ کرے گا، اس میں کاف محل نصب میں ہے کیونکہ وہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ **وَيُؤْتِيهِمْ** یعنی اپنی علامات اور اپنی قدرت **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ** تاکہ تم سمجھ جاؤ۔ اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی تم اس کی نافرمانی سے



رک جاؤ۔ عقلت نفسی عن کذا یعنی میں نے اپنے نفس کو اس چیز سے روکا۔ المعامل، قلعے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً وَإِنْ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنْ مِنْهَا لَمَا يَشْقَىٰ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنْ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٥٠﴾

”پھر سخت ہو گئے تمہارے دل یہ منظر دیکھنے کے بعد بھی وہ تو پتھر کی طرح (سخت) ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ (کیونکہ) کئی پتھر ایسے بھی ہیں جن سے بہہ نکلتی ہیں نہریں۔ اور کئی ایسے بھی ہیں کہ وہ پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکلنے لگتا ہے اور کوئی ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں خوف الہی سے اور اللہ بے خبر نہیں ہے ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ، القسوة کا معنی صلابت، شدت اور خشکی ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی آیات کا یقین اور ان کی طرف لوٹنے سے محروم ہونا ہے (1)۔ ابوالعالیہ اور قتادہ وغیرہ نے کہا: اس سے مراد تمام بنی اسرائیل کے دل ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مقتول کے ورناء کے دل مراد ہیں کیونکہ جب وہ زندہ ہوا اور اس نے اپنے قاتل کی خبر دی اور پھر فوت ہو گیا تو انہوں نے اس کے قتل کا انکار کر دیا اور کہا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے اس کے بعد کہ وہ اتنی بڑی نشانی دیکھ چکے تھے، پہلے بھی ان کے دل اتنے اندھے نہ تھے اور کبھی اپنے نبی کی سخت تکذیب نہیں کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم اس کے قتل کے بارے میں نافذ ہو گیا (2)۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر کلام زیادہ نہ کرو کیونکہ کلام کی کثرت، اللہ کے ذکر کے بغیر دل کو سخت کر دیتی ہے اور اللہ سے زیادہ دور سخت دل ہے۔ مسند البزار میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: چار چیزیں شقاوت (بدبختی) سے ہیں: آنکھوں کا جامد ہونا (یعنی آنسو نہ آنا) دل کی سختی، لمبی امید اور دنیا کا لالچ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً بعض علماء نے فرمایا: أَوْ بمعنی واو ہے جس طرح فرمایا اَوْشًا أَوْ كَفُورًا ﴿٥٠﴾ (الدھر) عَنْ رَأَا أَوْ نُذُرًا ﴿٥٠﴾ (المرسلات) ان دونوں آیتوں میں او بمعنی واو ہے۔ شاعر نے کہا:

نال الخلافة او كانت له قدراً

اس مصرعہ میں او بمعنی واو ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: او بمعنی بل ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ ﴿٥١﴾ (الصافات) اس کا معنی بل بیزیدون ہے (3)۔ شاعر نے کہا:

بدت مثل قرن الشمس في رونق الضحى و صورتها او انت في العين امدح

اس شعر میں اذ بمعنی بلی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی مخاطب پر ابہام کرنا ہے۔ اسی سے ابوالاسود الدؤلی کا قول ہے:

احب محمداً حباً شديداً و عباساً و حمزةً او علياً  
فان يك حبههم رشداً اصبه ولست بمخطئى ان كان غياً (1)

میں حضرت محمد ﷺ، عباس، حمزہ اور علی سے شدید محبت کرتا ہوں، اگر ان کی محبت رشد و ہدایت ہے تو میں اسے پالوں گا اور میں خطا کرنے والا نہیں ہوں اگر وہ بہت دور بھی ہوگی۔

ابوالاسود کو کوئی شک نہیں کہ ان نفوس قدسیہ کی محبت رشد و ہدایت ہے اس نے صرف ابہام کا قصد کیا ہے۔ ابوالاسود نے جب یہ شعر کہے تو اس سے پوچھا گیا: تجھے شک ہے؟ اس نے کہا: ہرگز نہیں۔ پھر اس نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استشہاد کیا وَ اِنَّا اَوْثَارُ اَيَّاكُمْ لَعَلَّ هٰذِي اَوْ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (سبا) ہم یا تم (دونوں میں سے ایک ہدایت پر ہے اور دوسرا کھلی گمراہی میں ہے) ابوالاسود نے کہا: جس نے یہ خبر دی ہے (2) کیا اسے شک تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی تخیر ہے یعنی تم ان کو پتھروں کے ساتھ تشبیہ دو تب بھی تم صحیح ہو گے یا پتھروں سے سخت چیز سے تشبیہ دو تب بھی تم صحیح ہو گے۔ یہ اس طرح کا کلام ہے: جالس الحسن او ابن سيرين، تعلم الفقه او الحديث او النحو (حسن کے پاس بیٹھ یا ابن سیرین کے پاس بیٹھ۔ فقہ حاصل کر، یا حدیث، یا نحو)

بعض علماء نے فرمایا: اذ شک کے معنی میں ہے۔ اس کا معنی ہے: اے مخاطبین! تمہاری نظر میں اگر تم ان کی قسوت کو دیکھتے تو تم شک میں مبتلا ہو جاتے کہ کیا یہ پتھروں کی مانند ہیں یا پتھروں سے سخت ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت کا بھی یہی معنی ہے: اِنِّىْ جَاعِلٌ فِىْ هٰذِهِ اٰيٰتٍ لِّىَّۤ اُذِيْزُ يٰۤاٰدُوْنَ ۝ (الصافات) ایک گروہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ مراد لیا ہے کہ ان میں کچھ ایسے ہیں جن کے دل پتھر کی مانند ہیں اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ دو گروہ ہیں (3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ اَشَدُّ، اَشَدُّ، كَالْحِجَارَةِ ۚ میں کاف کی جگہ پر عطف کی وجہ سے مرفوع ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ وہ پتھر کی مثل ہیں یا اس سے زیادہ سخت اور حجارة پر عطف کی وجہ سے اشد پر فتح جائز ہے اور قسوة، تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ ابو حیوہ نے قساوة پڑھا ہے، معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔ (4)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهَارُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقُّ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ، الانفجار کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ يَشَّقُّ اصل میں یتشقق ہے تاء کو شین میں ادغام کیا گیا ہے۔ یہ ان چشموں سے عبارت ہے جو اتنے بڑے نہ ہوں کہ وہ نہریں بن جائیں۔ یا پتھروں سے عبارت ہے جو پھٹ جاتے ہیں اگرچہ ان میں وسیع پانی جاری نہ ہو۔ ابن مصرف نے ینشقق (نون) کے ساتھ پڑھا ہے اور دونوں جگہ لما یتفجر اور لما یتشقق میں لما کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قراءت قائل توجہ نہیں ہے۔ مالک بن دینار نے ینفجر نون اور جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ

نے کہا: پتھر نے عذر پیش کیا اور بنی آدم میں سے شقی لوگوں نے عذر پیش نہ کیا (1)۔ ابو حاتم نے کہا: لما یتفجرتا کے ساتھ بھی جائز ہے اور لما تشقق تاء کے ساتھ جائز نہیں کیونکہ جب کہا: تتفجر تو الانہار کی تانیث کی وجہ سے اسے مؤنث ذکر کیا لیکن تشقق میں ایسی صورت نہیں ہے۔

نحاس نے کہا: جو ابو حاتم نے انکار کیا ہے معنی کے اعتبار سے وہ جائز ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: وان منها لحجارة تشقق۔ اور یشقق کو لفظ ما کے اعتبار سے مذکر ذکر کیا گیا ہے۔ الشق کی جمع الشقوق ہے۔ یہ اصل میں مصدر ہے۔ تو کہتا ہے: بید فلاں ورجلیہ شقوق۔ فلاں کے ہاتھوں اور پاؤں میں دراڑیں ہیں۔ تو شقاق نہ کہہ کیونکہ الشقاق ایک بیماری ہے جو جانوروں کو لاحق ہوتی ہے وہ پھٹن ہے۔ یہ جانوروں کی کلائیوں کو لاحق ہوتی ہے اور کبھی ان کی پنڈلیوں اور ہاتھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ یعقوب سے مروی ہے، الشق سے مراد الصبج بھی ہے اور لما یتفجر میں مائل نصب میں ہے کیونکہ یہ ان کا اسم ہے اور لام تاکید کے لئے ہے۔ منه لفظ ما کے اعتبار سے اور معنی کے اعتبار سے منها بھی جائز ہے۔ اسی طرح وان منها لما یشقق فیخرج منه الباء ہے۔ قتادہ نے ان کو دونوں جگہ مخففہ من مشقلہ پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنَّ مِنْهَا لَمَاءً يَهَيِّطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ۔ یعنی پتھروں میں کچھ ایسے ہیں جو تمہارے دلوں سے زیادہ نفع مند ہیں کیونکہ ان سے پانی نکلتا ہے وہ خشیت سے گر پڑتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: جو پتھر پہاڑ کی چوٹی سے گرتا ہے، جو نہر پتھر سے پھوٹی ہے اور اس سے جو پانی نکلتا ہے سب کچھ اللہ تعالیٰ کی خشیت کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی کے متعلق قرآن نازل ہوا۔ اسی کی مثل ابن جریج سے مروی ہے (2)۔ بعض متکلمین نے وَإِنَّ مِنْهَا لَمَاءً يَهَيِّطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ کے تحت فرمایا: کہ اس سے مراد وہ اولے ہیں جو بادل سے گرتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: مہو (گرنا) یہ مجاز ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ پتھروں کی تخلیق سے دل عبرت حاصل کرتے ہیں ان کی طرف دیکھ کر دلوں میں تواضع پیدا ہوتی ہے۔ تو دیکھنے والے کی تواضع کو ان پتھروں کی طرف مضاف کیا گیا۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں: ناقة تاجرہ۔ یعنی ایسی اونٹنی جو بھیجی جاتی ہے جو اسے دیکھے گا خریدنے کے لئے (3)۔ طبری نے ایک گروہ سے حکایت کیا ہے کہ پتھروں کے لئے خشیت یہ استعارہ ہے جیسے یزید ان ینقص میں دیوار کے لئے استعارہ ہے۔ اسی طرح زید الخیل نے کہا:

لما اتى خبر الزبير تواضعت سور المدينة والجبال الخشع

جب حضرت زبیر کی خبر پہنچی تو مدینہ کی دیواریں اور پہاڑ جھک گئے۔

ابن بحر نے ذکر کیا ہے کہ إِنَّ مِنْهَا میں ضمیر دلوں کی طرف راجع ہے نہ کہ پتھروں کی طرف یعنی دلوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو خشیت الہی کی وجہ سے جھک جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: جو کچھ تاویلات کی گئی ہیں لفظ اس کا احتما ہے، پہا قول صحیح ہے یہ کوئی ممتنع نہیں ہے کہ بعض جمادات کو معرفت عطا کی جائے اور وہ سمجھ جائیں۔ جیسے اس بھور کے خشک تنے کی روایت ہے جس کے ساتھ نبی کریم ﷺ خطبہ



دینے کے لئے ٹیک لگاتے تھے۔ جب آپ ﷺ اس سے دور ہٹ گئے تو وہ رونے لگ گیا (1)۔ اور یہ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک پتھر جو مجھ پر زمانہ جاہلیت میں سلام کرتا تھا میں اب بھی اسے پہچانتا ہوں (2)۔ اسی طرح روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: شیر پہاڑ نے مجھے کہا: اتر جائیں، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ آپ کو میری پشت پر قتل کر دیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ مجھے عذاب دے گا (☆ ☆)۔ غار حرا نے آپ ﷺ کو ندادی تھی یا رسول اللہ! میری طرف تشریف لے آئیں۔ قرآن حکیم میں ہے: **إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ (احزاب: 72)** (ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے) اور فرمایا: **لَوْ أَنزَلْنَاهَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ (الحشر: 21)** (اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپ اس کو دیکھتے کہ وہ جھک جاتا اور پاش پاش ہو جاتا اللہ کے خوف سے) اس کا مزید بیان سورۃ سبحان میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَا لِلَّهِ بِعَافٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ اِبل** حجاز کی لغت پر بغافل محل نصب میں ہے اور تمہیں کی لغت پر محل رفع میں ہے اور باتا کید کے لئے ہے **عَمَّا تَعْمَلُونَ** یعنی تمہارے عمل سے وہ غافل نہیں ہے ہر چھوٹا بڑا جو بھی سرزد ہوتا ہے اسے وہ تم پر شمار کرے گا۔ **فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۖ (الزلزلہ)** (پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے کھ لے گا) اس میں ما، عائد کا محتاج نہیں مگر یہ کہ اسے الذی کے معنی میں کیا جائے۔ اسم کے طول کی وجہ سے عائد کو حذف کیا گیا ہے یعنی من الذی تعملونہ۔ ابن کثیر نے يعملون یا، کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں خطاب حضرت محمد ﷺ کے لئے ہوگا۔ (2)

**أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ**

**يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝**

”(اے مسلمانو!) کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ (یہ یہودی) ایمان لائیں گے تمہارے کہنے سے حالانکہ ایک گروہ

ان میں ایسا تھا جو سنا تھا کلام الہی کو پھر بدل دیتے تھے اسے خوب سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر۔“

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ** یہ استفہام ہے اس میں انکار کا معنی ہے۔ گویا مومنوں کو یہود کے اس ٹولہ کے ایمان سے مایوس کرنا ہے یعنی اگر انہوں نے کفر کیا ہے تو ان کے لئے اس میں پہلے مثال موجود ہے۔ خطاب نبی کریم ﷺ کے اصحاب کو ہے۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ انصار یہود کے اسلام قبول کرنے کے حریص تھے کیونکہ ان کے درمیان حلف اور معاہدہ تھا (3)۔ بعض نے فرمایا: خطاب صرف نبی کریم ﷺ کو ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، یعنی آپ پریشان نہ ہوں اس پر کہ وہ آپ کو جھٹلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو بتا دیا کہ یہ ان برے

1۔ صحیح بخاری، باب علامات النبوة فی الاسلام، حدیث نمبر 3318، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً مسند امام احمد، حدیث نمبر 5886

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 5۔ تفسیر مکرّمہ میں ایک پہاڑ ہے۔

لوگوں میں سے ہیں جو گزر چکے ہیں۔ ان محل نصب میں ہے یعنی فی ان یومنوا۔ یومنوا ان کے ساتھ منصوب ہے۔ اسی وجہ سے نون کو اس سے حذف کیا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے: طمع فیہ طمعاً و طباعیۃ (مخفف) فهو طبعٌ، بروزن فعل۔ اطعمہ فیہ غیرہ، تعجب میں کہا جاتا ہے: طمع الرجل میم کے ضمہ کے ساتھ یعنی وہ زیادہ لالچ والا ہو گیا۔ الطبع لشکر کی خوراک کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: امرہم الامیر باطباعہم یعنی امیر نے لشکر کے رزق کا حکم دیا امرأۃ مطباع ایسی عورت جو لالچ کرتی ہے لیکن غلبہ نہیں پاتی۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ۔ الفرق اسم جمع ہے لفظاً اس کا واحد نہیں ہے اور اس کی جمع قلت افرقة اور جمع کثرت افرقاء ہے۔ یَسْمَعُونَ، کان کی خبر ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ خبر مِّنْهُمْ ہو اور یَسْمَعُونَ فریق کی صفت ہو۔ اس میں بعد ہے۔

کَلَّمَ اللہ۔ یہ جماعت کی قراءت ہے۔ اَعَشَ نے کَلَّمَ اللہ پڑھا ہے یعنی کلمہ کی جمع (1)۔ سیبویہ نے کہا: میں جانتا ہوں کہ ربیعہ کے کچھ لوگ منہم کو میم کے کسرہ کی اتباع میں ہاء کو کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان کے نزدیک درمیان میں ساکن اس اتباع سے روکنے والا نہیں۔

کَلَّمَ اللہ، یَسْمَعُونَ کا مفعول ہے اور اس سے مراد ستر افراد ہیں جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چنا تھا۔ پس انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی نہ کی۔ انہوں نے اپنی قوم کے سامنے اپنی باتوں کو بدل ڈالا۔ یہ ربیعہ اور ابن اسحاق کا قول ہے اور اس قول میں ضعف ہے (2)۔ اور جنہوں نے کہا کہ ستر آدمیوں نے وہ سنا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سنا تھا۔ اس نے غلطی کی ہے۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت اور کلام کرنے کے ساتھ ان کی خصوصیت کو ختم کر دیا ہے (3)۔ سدی وغیرہ نے کہا: وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، ان کے اذہان مختلط ہو گئے۔ انہوں نے امید رکھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کلام سنیں گے اور وہ ان کے لئے لوٹائیں گے۔ جب وہ فارغ ہوئے اور باہر نکلے تو ایک گروہ نے اللہ کے کلام کو بدل ڈالا جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے سنا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجْرُہٗ حَتَّىٰ يَسْمَعَ کَلِمَ اللہ (توبہ: 6) (اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ طلب کرے آپ سے تو پناہ دیجئے اسے تا کہ وہ سنے اللہ کا کلام)

اگر یہ کہا جائے کہ کلبی نے ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے رب سے سوال کریں کہ وہ انہیں اپنا کلام سنائے۔ پس انہوں نے برق کی آواز کی طرح آواز سنی انی انا اللہ لا الہ الا اللہ الحی القيوم اخرجتکم من مصر بید رفیعۃ و ذراع شدیدۃ، میں اللہ ہوں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو حی، قیوم ہے میں نے تمہیں مصر سے نکالا بلند ہاتھوں اور سخت بازوؤں کے ساتھ۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث باطل ہے صحیح نہیں ہے۔ یہ ابن مروان نے کلبی سے روایت کی ہے اور وہ دونوں ضعیف ہیں قابل

حجت نہیں ہے۔ تمام اولاد آدم سے کلام کے ساتھ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خاص کیا گیا تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے کلام کی ہے اور انہیں بھی اپنا کلام سنایا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان پر فضیلت نہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اس کا فرمانا حق ہے۔ اِنِّیْ اَصْطَفٰیْتُكَ عَلٰی النَّاسِ بِرِسَالَتِیْ وَبِكَلَامِیْ (اعراف: 144) یہ زیادہ واضح قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو کیسے پہچانا جبکہ انہوں نے اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا خطاب نہیں سنا تھا بعض علماء نے فرمایا آپ نے کلام سنا جس میں حروف اور آوازیں نہ تھیں اور نہ اس میں تقطیع تھی نہ نفس۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام جان گئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے یہ رب العالمین کا کلام ہے۔ بعض دوسرے علماء نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا کلام سنا جو کسی جہت سے نہیں تھا، اور انسان کا کلام تو چھ جہتوں میں سے کسی جہت سے سنا جاتا ہے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جان گئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ کا پورا جسم قوت سماعت بن گیا تھا حتیٰ کہ اس کے ساتھ آپ نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تو آپ جان گئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ بعض نے فرمایا: معجزہ نے دلالت کی کہ جو انہوں نے سنا ہے وہ اللہ کا کلام ہے۔ اور یہ اس طرح ہے کہ انہیں کہا گیا: اپنا عصا ڈالو تو انہوں نے عصا ڈال دیا وہ بہت بڑا سانپ بن گیا تو یہ صدق حال پر ان کے لئے علامت تھا۔ اور وہ جس نے انہیں کہا اِنِّیْ اَنَا رَبُّكَ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ بعض نے فرمایا: انہوں نے اپنے دل میں کوئی بات چھپائی ہوئی تھی جس پر صرف علام الغیوب ہی واقف ہو سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے خطاب میں اس پوشیدہ بات کی خبر دی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جان گئے جو اس سے مخاطب ہے اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مزید بیان سورہ القصص میں تُؤَدِّیْ مِنْ شَاطِئِیْ الْوَادِیْئِیْنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبَارَکَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ (القصص: 30) کے تحت آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ یَحْزَنُ قَوْمُهُ مَجَہِدًا اور سدی نے کہا: اس سے مراد یہود کے علماء ہیں جو تورات میں تحریف کرتے تھے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرتے تھے اپنی خواہشات کے مطابق (1)۔ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ یعنی پہچاننے اور جاننے کے بعد۔ یہ ان کو تو بخ ہے یعنی یہ یہود، ان کے آباء و اجداد برائی اور عناد کا اظہار کرتے ہوئے گزر گئے یہ ان کے طریقوں پر ہیں پھر تم کیسے ان کے ایمان کی طمع کرتے ہو۔

یہ کلام دلالت کرتا ہے کہ حق جاننے والا معاند، ہدایت سے دور ہوتا ہے کیونکہ وہ وعدہ اور وعید کو جان چکا ہوتا ہے لیکن پھر بھی اسے یہ علم اپنے عناد سے نہیں روکتا۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا اٰمَنَّا ؕ وَاِذَا خَلَا بِبَعْضُہُمْ اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْا اَتَحَدُّوْنَہُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ لَیْحًا جُوْکُمْ بِہٖ عِنْدَ رَبِّکُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰ اَوْ لَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۝۱۱



”اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب تنہا ملتے ہیں ایک دوسرے سے تو کہتے ہیں (ارے) کیا بیان کرتے ہو ان سے جو کھولا ہے اللہ نے تم پر، یوں تو وہ دلیل قائم کریں گے تم پر ان باتوں سے تمہارے رب کے سامنے کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ کیا وہ (یہ) نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا بِمَا آمَنَ بَارِئٌ فِيهِمْ لَقُوا كِي صِلَ لَقِيُوا هَ پَہ۔ یہ گزر چکا ہے۔ وَإِذَا خَلَا بِعَصْفِهِمْ إِلَى بَعْضٍ يَدَّ بَارِئٌ فِيهِمْ لَقُوا كِي صِلَ لَقِيُوا هَ پَہ۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا پھر منافقت کی تھی وہ مومنین کو بیان کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے آباء و اجداد کو عذاب دیا گیا تھا۔ یہود نے انہیں کہا: اَتَّحَدُ ثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ یعنی تم پر اللہ تعالیٰ نے جو عذاب کا فیصلہ فرمایا تاکہ وہ کہیں کہ ہم تم سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ معزز ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس اور سدی سے مروی ہے (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ خیر کی جنگ کے موقع پر قریظہ کے پاس گئے تو آپ نے سنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بک رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! آپ انہیں تبلیغ نہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا۔ پھر فرمایا: میں گمان کرتا ہوں تو نے ان سے میری گستاخی سنی ہے، اگر وہ مجھے دیکھ لیں گے تو رک جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہود کے پاس گئے۔ جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو وہ رک گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: اے بندروں اور خنازیر کی اولاد! تم نے عہد توڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں رسوا کرے اور تم پر اپنا عذاب نازل کرے۔ انہوں نے کہا: آپ جاہل نہیں تھے اور ہم پر جہالت کا اظہار نہ کریں۔ یہ آپ کو کس نے بتایا ہے؟ یہ خبر ہماری طرف سے نکلی ہے یہ معنی مجاہد سے بھی مروی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذَا خَلَا، خَلَا اصل میں خَلَوُا تھا و او متحرک ماقبل مفتوح کی وجہ سے و آو الف سے بدل گئی۔ خلاء کا معنی سورت کے آغاز میں گزر چکا ہے۔ فتح کا معنی حکم (فیصلہ کرنا) اور عربوں کے ہاں الفتح کا لفظ القضاء اور الحکم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ﴿٨٩﴾ (اعراف) اس آیت میں فاتحین کا معنی حاکمین (فیصلہ کرنے والے) ہے۔ میرے اور تیرے درمیان قاضی ہے۔ قاضی کو فتاح کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کرتا ہے۔ الفتح کا معنی مدد کرنا ہی ہے۔ اسی سے ہے: يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا (البقرہ: 89) وہ کافروں کے خلاف مدد طلب کرتے تھے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَ كُفُّ الْفَتْحِ (انفال: 19) چیزوں کے درمیان فرق کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِيُخَاجُّوكُمْ لَامِيٌّ كِي وَجْهٌ مِّنْ صُوبٍ ہے۔ اگر تو چاہے تو ان کے اضمار کے ساتھ نصب دے نصب کی ملامت نون کا حذف ہے۔ یونس نے کہا: عربوں میں سے کچھ لوگ لامی کو فتح دیتے ہیں۔ انہیں نے کہا: کیونکہ فتح اصل

ہے۔ خلف الاحمر نے کہا: یہ بنی العنجر کی لغت ہے۔ لیحاجو کم کا معنی لیعیو کم ہے (وہ تمہیں عار دلائیں گے) وہ کہیں گے ہم اللہ کی بارگاہ میں تم سے زیادہ معزز ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ تم پر تمہارے قول سے حجت پکڑیں گے وہ کہیں گے تم نے اس کا انکار کیا اس کی سچائی پر واقفیت کے بعد۔

بعض علماء نے فرمایا: یہود کا ایک شخص اپنے مسلمان دوست کو یہ تلقین کرتا تھا کہ تم دین محمد ﷺ کو مضبوطی سے پکڑ رہو کیونکہ وہ سچا نبی ہے: **عِنْدَ رَبِّكُمْ** بعض علماء نے فرمایا: یعنی آخرت میں۔ جیسا کہ فرمایا: **ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ** (الزمر)

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے عند ذکر ربکم، بعض نے فرمایا: عند بمعنی فی ہے یعنی وہ تم سے تمہارے رب کے بارے میں جھگڑیں گے۔ پس وہ تم سے زیادہ حقدار ہو جائیں گے تم پر اپنی حجت کے ظہور کی وجہ سے۔ حسن سے مروی ہے، الحجة مطلق سیدھی کلام کو کہتے ہیں۔ اسی سے محجة الطريق ہے (یعنی راستہ کا درمیان) حاجت فلانا فحججته میں نے فلاں سے جھگڑا کیا اور حجت کے ساتھ میں اس پر غالب آ گیا۔ اسی سے حدیث میں ہے: فحجج آدم موسیٰ (1)۔ حضرت آدم علیہ السلام حجت کے ساتھ غالب آ گئے: **اَفَلَا تَعْقِلُونَ** بعض علماء نے فرمایا: یہ احبار (علماء) کا اپنے پیروکاروں کو کلام ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کو خطاب ہے۔ یعنی تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ بنی اسرائیل ایمان نہیں لائیں گے جبکہ وہ ان احوال میں ہیں (2) پھر انہیں توبیخ فرمائی۔ **اَوْ لَا يَعْلَمُونَ** یہ استفہام، توبیخ و تقریع کے معنی میں ہے۔ جمہور علماء نے **يَعْلَمُونَ** یا کے ساتھ پڑھا ہے، ابن محیسن نے تاکے ساتھ پڑھا ہے مومنین کو خطاب ہے وہ جو انہوں نے اپنا کفر چھپا رکھا تھا اور وہ جو انہوں نے اعلانیہ انکار کیا تھا۔ (3)

**وَمِنْهُمْ اٰمِيْنُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ اِلَّا اَمَانِي وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ** (4)

”اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو بجز جھوٹی امیدوں کے اور وہ تو محض وہم و گمان ہی کرتے رہتے ہیں۔“

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1: مِنْهُمْ اٰمِيْنُونَ** یعنی یہود میں سے۔ بعض نے فرمایا: یہود اور منافقین میں سے جو نہ لکھتے تھے نہ پڑھتے تھے۔ امیوں کا دواحد امی ہے۔ یہ الامۃ الامیۃ کی منسوب ہے یعنی جو امت ابنی ماؤں کی ولادت کی اصل پر ہوتے ہوئے، لکھنا پڑھنا نہ سیکھے۔ اسی سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: انا امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب (4)۔ ہم امی امت ہیں نہ ہم لکھتے ہیں نہ حساب لگاتے ہیں۔ انہیں امیوں کہا گیا کیونکہ انہوں نے ام الکتاب کی تصدیق نہیں کی یہ حضرت ابن

1۔ صحیح بخاری، باب واصطفتت لنفسی، حدیث نمبر 4367، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ ایضاً

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

4۔ صحیح بخاری، باب قول النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام لا نکتب ولا، حدیث 1780، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عباس سے مروی ہے (1)۔ حضرت ابو عبیدہ نے کہا: انہیں امیون کہا گیا کیونکہ کتاب کا نزول ان پر ہوا تھا گویا وہ ام الکتاب کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ گویا فرمایا: ومنہم اہل الکتاب لایعلمون الکتاب۔ ان میں سے اہل کتاب جو کتاب کو نہیں جانتے۔ عکرمہ اور ضحاک نے کہا یہ عرب کے نصاریٰ ہیں بعض نے فرمایا: یہ اہل کتاب کی ایک قوم ہے۔ ان کی کتاب ان کے گناہوں کی وجہ سے اٹھالی گئی پس وہ امیین بن گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ مجوسی ہیں۔ میں کہتا ہوں: پہلا قول اظہر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا یَعْلَمُونَ الْکِتَابَ إِلَّا أَمَانِیَّ یہاں إِلَّا بمعنی لکن ہے یہ مستثنیٰ منقطع ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (النساء: 157) نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی)۔ نابغہ نے کہا:

حلفت یمیناً غیر ذی مشنویۃ ولا علیم الا حسن ظن بصاحب  
میں نے قسم اٹھائی جس میں استثناء نہیں اور علم نہیں تھا مگر ساتھی پر حسن ظن کی۔

ابو جعفر، شبیبہ اور اعرج نے إِلَّا امَانِیَّ یاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے ایک یاء کو تخفیف کی خاطر حذف کر دیا۔ ابو حاتم نے کہا: ہر لفظ جو اس طرح ہو کہ ایک مشدد ہو تو اس میں تشدید و تخفیف جائز ہے جیسے اثانی، اغانی، امان وغیرہ۔ انفس نے کہا: یہ اس طرح ہے جیسے مفتاح کی جمع میں کہا جاتا ہے: مفتاح، و مفاتح۔ یہ جمع کی یاء ہے۔ نحاس نے کہا: معتل میں حذف اکثر ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

وہل یوجع التسلیم او یکشف العی ثلاث الاثنی والرسوم البلاقع  
کیا تین چیزیں تسلیم کو لوٹاتی ہیں یا اندھے پن کو کھولتی ہیں، چو لہے کے پتھر، بقیہ بنیادیں جو کھنڈر بن چکی ہیں۔

الامانی، یہ امنیہ کی جمع ہے اس کا معنی تلاوت ہے اصل میں امنیۃ، افعولۃ کے وزن پر تھا و او کو یا میں ادغام کیا گیا یا کی وجہ سے نون کو کسرہ دیا گیا ہے تو امنیۃ بن گیا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِلَّا إِذَا تَنَنَّى أَلْقَى الشَّیْطَانُ فِیْ أَمْنِیَّتِهِ (الحج: 52) یعنی جب وہ تلاوت کرتا ہے تو اس کی تلاوت میں شیطان ڈالتا ہے۔ کعب بن مالک نے کہا تھا:

تمنی کتاب اللہ اول لیلة واخرہ لاقی حمام المقادر  
اس نے رات کے ابتدائی حصہ اور آخری حصہ میں تلاوت کی۔

ایک اور شاعر نے کہا:

تمنی کتاب اللہ اخر لیلة تمنی داؤد الزبور عل رسل  
اس نے رات کے آخری حصہ میں کتاب اللہ کی تلاوت کی جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور کی تلاوت آہستہ آہستہ کی۔



الامانی کا معنی جھوٹ بھی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ماتمنیت منذ اسلمت (1)، جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ کسی عربی نے ابن دأب کو کہا تھا جب وہ بیان کر رہا تھا: أهداشني رويته امرشي وتمنيته۔ کیا یہ وہ چیز ہے جو تم نے کسی سے روایت کی ہے یا تو نے خود گھڑی ہے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے الامانی کی تفسیر اسی مفہوم میں کی ہے (2)۔ الامانی ہر اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کی انسان تمنا اور خواہش کرتا ہے۔ قتادہ نے کہا: الامانی یعنی وہ اللہ تعالیٰ پر ایسی تمنا کرتے ہیں جو ان کے لئے نہیں ہے (3)۔ بعض نے فرمایا: الامانی کا معنی التقدير ہے کہا جاتا ہے: مَنِىْ له یعنی اس کے لئے مقدر کیا گیا۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ ابن بحر نے یہ حکایت کیا ہے۔ شاعر کا قول بیان کیا ہے:

لا تامنن وان امسيت في حرام حتى تلاقى ما بيني لك الباني

تو امن میں نہ ہوا اگرچہ تو شام حرم میں گزارے حتیٰ کہ تو وہ پالے جو تقدیر بنانے والے نے تیری تقدیر میں لکھی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ، ان بمعنی ما نافیہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنْ الْكُفْرُ إِلَّا فِي عُرْوٍ ۝ (الملک) اس آیت میں ان، ما نافیہ کے معنی میں ہے اور يَظُنُّونَ کا معنی ہے وہ جھوٹ بولتے ہیں کیونکہ انہیں اس چیز کی صحت کا علم ہی نہیں ہے جو وہ تلاوت کرتے ہیں۔ وہ تو اپنے علماء کے مقلد ہیں اس میں جو وہ پڑھتے ہیں۔ ابوبکر انباری نے کہا: ہمیں احمد بن یحییٰ نحوی نے بتایا کہ عرب ظن کو علم، شک اور کذب کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ فرمایا: جب علم کے دلائل قائم ہو جائیں اور وہ شک کے دلائل سے زیادہ ہوں تو ظن یقین ہوگا، اور جب یقین کے دلائل اور شک کے دلائل برابر ہوں تو ظن شک ہوگا۔ جب شک کے دلائل یقین کے دلائل سے زیادہ ہوں تو ظن کذب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ یعنی وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 4:** ہمارے علماء نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے علماء یہود کے بارے میں بتایا کہ وہ تحریف کرتے ہیں اور تبدیلی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اس کا قول حق ہے: فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيُّهُمْ آيَةٌ (البقرہ: 79) (سو ہلاکت ہو ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھوں سے)

جب معاملہ ان کی طرف متوجہ ہوا، اور علماء کی رعیت بری ہو گئی اور وہ دنیا پر حرص و لالچ کرنے لگے اور انہوں نے ایسی چیزیں طلب کیں جو لوگوں کے رخ ان کی طرف پھیر دیں تو انہوں نے اپنی شریعت میں بدعتوں کو نکالا اور شریعت کو بدل ڈالا۔ پھر انہیں تورات کے ساتھ لاحق کر دیا۔ اپنے بیوقوف لوگوں کو کہا: یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ وہ ان کی طرف سے یہ قبول کر لیں اور ان کی ریاست مستحکم ہو جائے اور اس کے ذریعے وہ دنیا کا مال و متاع حاصل کریں اور جو کچھ انہوں نے اخراج کیا تھا اس میں یہ بھی تھا کہ انہوں نے کہا پس لیس علینا فی الامیین سبیل وہم العرب یعنی ہم پر امیوں کے بارے میں کوئی گرفت نہیں ہے اور وہ عرب ہیں یعنی جو کچھ ہم ان کے مال سے لے لیں وہ ہمارے لئے حلال ہے اور ان کی

1۔ سنن ابن ماجہ، باب کرہیۃ مس الزکریا لیمین والا ستغناء بالیمین، حدیث نمبر 306، فیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

اختراع میں سے یہ بھی تھا کہ انہوں نے لایضربنا ذنب فنبحن احباءہ و ابناہ۔ ہمیں کوئی گناہ مضرب نہیں ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب اور اس کے بیٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس نازیبا بات سے بلند ہے۔

تورات میں تھا: یا احباری و یا ابناء رسل۔ (اے میرے علماء اور میرے رسولوں کی اولاد) تو انہوں نے اسے بدل ڈالا اور یہ لکھا: یا احباری و یا ابنائی (یعنی اے میرے محبوبو! اے میرے بیٹو!) اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کو نازل فرمایا: وَ قَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ (المائدہ: 18)

یہود نے کہا: ہمیں اللہ تعالیٰ عذاب نہیں دے گا۔ اگر وہ عذاب دے گا تو چالیس دن عذاب دے گا جتنے دن ہم نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: وَقَالُوا لَنْ تَمْسَنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً قُلْ أَتُخَذُكُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا (البقرہ: 80) (اور انہوں نے کہا ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں (دوزخ کی) آگ بجز گنتی کے دن۔ آپ فرمائیے کیا لے رہا ہے تم نے اللہ سے کوئی وعدہ۔)

ابن مقسم نے کہا: عہد سے مراد توحید ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا (مریم: 87) اس آیت میں عہد سے مراد لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ہے۔ فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (البقرہ) تب تو خلاف ورزی نہ کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی یا (یونہی) بہتان باندھتے ہو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں)

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹا ثابت کیا اور فرمایا: بَلَى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (البقرہ) ہاں (ہمارا) قانون یہ ہے (جس نے جان بوجھ کر برائی کی اور گھیر لیا اس کو اس کی خطا نے تو وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہی جنتی ہیں وہ اس جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ دوزخ اور جنت میں غلو د کفر اور ایمان کے اعتبار سے ہے نہ کہ اس اعتبار سے جو انہوں نے کہا۔

فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ۝

”ہنس ہلاکت ہو ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب خود اپنے ہاتھوں سے۔ پھر کہتے ہیں: یہ نوشتہ اللہ کی طرف سے

ہے تاکہ حاصل کر لیں اس کے عوض تھوڑے سے دام۔ سو ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس کے جو لکھا ان کے

ہاتھوں نے اور ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس مال کے جو وہ (یوں) کماتے ہیں۔“

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** فَوَيْلٌ، ویل کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کیا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان نے نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ یہ آگ کا پہاڑ ہے (1)۔ حضرت ابوسعید خدری نے روایت کیا ہے کہ ویل دو پہاڑوں کے

درمیان جہنم میں ایک وادی ہے جس میں گرنے والا چالیس سال گرتا جائے گا۔ (1)

سفیان اور عطاء بن یسار سے مروی ہے کہ اس آیت میں ویل سے مراد ایک وادی ہے جو جہنم کے فنا میں ہے اس میں دوزخیوں کی پیپ چلتی ہے (2)۔ بعض نے فرمایا: جہنم میں ایک حوض ہے۔ الزہراوی نے دوسروں سے حکایت کیا ہے کہ یہ جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے (3)، الویل، عذاب کی تکلیف ہے۔ خلیل نے کہا: اس تکلیف کی شدت ہے۔ اصمعی نے کہا: ویل سے مراد افسوس کا اظہار کرنا ہے۔ اور الویل سے مراد رحم کا اظہار کرنا ہے۔ سیبویہ نے کہا: جو ہلاکت میں واقع ہو اس کے لئے ویل اور جو ہلاکت کے قریب ہو اس کے لئے ویح استعمال ہوتا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا ویل سے مراد غم ہے۔ کہا جاتا ہے: توویل الرجل جب وہ ویل پکارے یہ غم اور مصیبت کے وقت کہا جاتا ہے۔ اس سے ہے قَوْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيِّهِمْ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی اصل ہلاکت ہے ہر وہ شخص جو ہلاکت میں واقع ہوا ہو وہ ویل کو پکارتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يُؤَيِّلَتْ نَمَالٌ هَذَا الْكِتَابِ (الکہف: 49) ویل اور ریلہ دونوں کا معنی ہلاکت ہے اس کی جمع ویلات ہے۔ شاعر نے کہا:

لہ الویل ان امی ولا ام ہاشم

ایک اور نے کہا:

تقالت لك الویلات انك مرجیئ

ویل پر رفع ابتدا کی وجہ سے ہے۔ اس کو مبتدا بنانا جائز ہے اگرچہ نکرہ ہے کیونکہ اس میں دعا کا معنی ہے۔ انفس نے کہا: فعل کے اضمار کی بنا پر نصب بھی جائز ہے یعنی الزمهم اللہ ویلاً۔ فراء نے کہا: الویل اصل میں دینی تھا یعنی غم۔ جیسے تو کہتا ہے: وی لفلان یعنی فلاں کے لئے غم۔ عربوں نے اس کے ساتھ لام ملا دیا اور پھر اس سے اسے مقدر کیا اور اسے اعراب دیا۔ اس میں بہتر یہ ہے کہ جب یہ مضاف نہ ہو تو اس پر رفع ہو کیونکہ یہ وقوع کا تقاضا کرتی ہے اور دعا کے معنی پر نصب بھی صحیح ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

خلیل نے کہا: صرف ان الفاظ کا مبنی ہونا سنا گیا ہے: ویح و دیس و دیہ و دینک و ویل و ویب۔ یہ تمام الفاظ قریب المعنی ہیں، بعض نے ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ یہ مصادر ہیں ان کو عرب فعل کے ساتھ نہیں بولتے۔ الجرمی نے کہا: اور ان کلمات میں سے جن کو نصب مصادر کی نصب کی طرح دی جاتی ہے وہ ویلہ، عولہ، ویحہ اور ویسہ ہیں جب ان کے ساتھ لام کو داخل کرے گا تو رفع دے گا اور کہے گا: ویلہ، وویحہ۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ کتاب معروف ہے اور سب سے پہلے جس نے قلم کے ساتھ لکھا اور قلم کے ساتھ تحریر لکھی وہ حضرت ادریس علیہ السلام تھے اور یہ بات حضرت ابو ذر کی حدیث میں آئی ہے جسے الآجری وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ بعض علماء نے کہا حضرت آدم علیہ السلام کو کتاب کا فن دیا گیا تو وہ آپ کی اولاد میں وراثت ہو گیا۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا



**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا مَالَ الْوَدَّاعِ** (انعام: 38) اس آیت میں جناح کا ذکر تاکید کے لئے ہے ساتھ ہوتی ہے یہ اس ارشاد کی مثل ہے: **وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْوَدَّاعِ** (انعام: 38) اس آیت میں جناح کا ذکر تاکید کے لئے ہے کیونکہ پرندہ اڑتا ہی پروں کے ساتھ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَيَقُولُونَ بَأْوَاهُمْ**۔ وہ اپنے منہوں سے بولتے ہیں تو بولنا تو ہوتا ہی منہ کے ساتھ ہے اس لئے یہاں **افواہہم** تاکید کے لئے ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** ان کے جرم کے بیان کے لئے ہے اور ان کے اعلانیہ یہ کام کرنے کے اثبات کے لئے ہے جو خود کسی کام کو شدت سے سرانجام دیتا ہے وہ ان لوگوں سے ہوتا ہے جس کے وہ کام سپرد نہ ہوا اگرچہ اس کی رائے موجود ہو۔ ابن سراج نے کہا **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** یہ کنایہ ہے کہ یہ ان کی اپنی طرف سے تھا ان پر نازل نہیں کیا گیا تھا۔ اگرچہ ہاتھوں کے لکھنے میں حقیقت نہ تھی۔ (1)

**مسئلہ نمبر 4:** اس آیت اور اس سے پہلے والی آیت میں تبدیلی، تغیر اور شرع میں زیادتی کرنے سے ڈرایا گیا ہے۔ پس جس نے اللہ کے دین میں کوئی بدعت نکالی، کوئی ایسی تبدیلی کی جو دین میں سے نہیں ہے اور دین میں وہ جائز نہ ہو تو وہ اس سخت وعید اور عذاب الیم میں داخل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو ڈرایا جب آپ نے آخر زمانہ میں جو ہونے والا ہے، اسے جان لیا..... فرمایا: خبردار! تم میں سے اہل کتاب بہتر ملتوں میں جدا جدا ہوئے اور یہ امت تہتر ملتوں میں تقسیم ہوگی سوائے ایک کے سب دوزخ کی آگ میں جائیں گے.... اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی طرف سے دین میں کوئی ایسی بات ایجاد کرنا جو قرآن و سنت اور اصحاب کی سنت کے مخالف ہوگی تو وہ لوگوں کو اس کے ساتھ گمراہ کریں گے۔ جس سے نبی کریم ﷺ نے ڈرایا تھا وہ واقع ہوا اور عام ہوا۔ پھیلا اور کثرت سے پھیلا۔ **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ**۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **لِيُشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا** اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو قلت کی صفت سے بیان فرمایا جو وہ لیتے تھے۔ اس لئے کہ یا تو وہ فنا ہونے والی تھی اور اس کو ثبات نہیں تھا یا وہ حرام تھی کیونکہ حرام میں بھی برکت نہیں ہوتی اور وہ اللہ کی بارگاہ میں نہیں بڑھتا۔ ابن اسحاق اور کلبی نے کہا: تورات میں رسول اللہ ﷺ کی یہ صفت ذکر تھی **رَبْعَةُ أَسْبَرٍ** (درمیانہ قد اور گندی رنگ) اور انہوں نے اسے آدم سبطاً طویلاً کے الفاظ سے بدل ڈالا یعنی گندی سیدھے بالوں والا لمبے قد والا۔ وہ اپنے ساتھیوں اور تبعین کو کہتے: اس نبی کی صفت دیکھو جو آخر زمانہ میں مبعوث ہوگا۔ اس کی صفت تو اس کے مشابہ نہیں ہے۔ یہود کے مشائخ اور علماء کے لئے ریاست اور کمائی تھی۔ پس انہیں اندیشہ ہوا کہ اگر وہ صحیح صحیح بیان کریں گے تو ان کے کھانے بند ہو جائیں گے اور ریاست چلی جائے گی اس وجہ سے انہوں نے تحریف کی۔ (2)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **قَوِيلٌ لَّهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ** بعض علماء نے فرمایا: **مِمَّا يَكْسِبُونَ** سے مراد ان کے کھانے ہیں۔ بعض نے فرمایا: گناہ ہیں اور ان کے فعل کی تغلیظ کے لئے ویل کو دوبارہ ذکر کیا۔

**وَقَالُوا لَنْ تَمْسَنَا السَّاعَةُ إِلَّا آيَاتًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ**



دس تک کے اسمائے اعداد کے ساتھ ایام کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجَّةِ (البقرہ: 196)** پھر تین دنوں کے روزے حج میں **تَسْعَوَاتِي دَاسٍ كُمْ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ (ہود: 65)** تم لطف اٹھا لو اپنے گھروں میں تین دن۔ **سَخَّرَ هَاعَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ (الحاقہ: 7)** (مسلط کر دیا اسے ان پر سات راتیں)۔ **ثَنِيَّةَ أَيَّامٍ حُسُومًا (الحاقہ: 7)** (آٹھ دن جو جڑوں سے اکھیرنے والی تھی) تو احناف کو کہا جائے گا اللہ تعالیٰ نے روزے کے بارے میں **أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ** فرمایا اس سے پورا مہینہ مراد ہے۔ اور فرمایا **لَنْ تَسْنَئَا النَّاسُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً (البقرہ: 80)** اس **أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ** سے مراد چالیس دن ہیں اور جب ایام کسی عارض کی طرف مضاف ہوں تو اس سے تعداد کی تحدید مراد نہیں ہوتی بلکہ کہا جاتا ہے: ایام مشیک و سفرک و اقامتک۔ اگرچہ تیس اور بیس دن بھی ہوں، جو عدد تو چاہے مراد لے سکتا ہے۔ شاید وہ مراد لیا جو عورت کے لئے معقود تھا اور عورت کی عادت چھ دن یا سات دن ہوتی ہے۔ پس آپ ﷺ نے کلام اس کے مطابق فرمایا۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قُلْ أَتَّخِذُكُمْ، اتَّخِذْ كُمْ** کے بارے میں کلام گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ **عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا** کیا تم نے پہلے نیک عمل کیا ہے تم ایمان لائے تم نے اطاعت کی کہ تم آگ سے نکلنے کے مستحق ہو۔ یا تم نے اس کی وحی سے پہچانا ہے جس میں اس نے تم سے عہد کیا ہے۔ **فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَآ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝** یہ تو بیخ اور تقریج ہے۔

**بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَاطِبَةُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝**

**وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝**

”ہاں (ہمارا قانون یہ ہے) جس نے جان بوجھ کر برائی کی اور گھیر لیا اس کو اس کی خطا نے تو وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہی جنتی ہیں، وہ اس جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔“

اس میں تین مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **بَلَىٰ** یعنی معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا تم نے ذکر کیا ہے۔

سیہو یہ نے کہا **بَلَىٰ** اور **نعم** اسم نہیں ہیں۔ یہ بل وغیرہ کی طرح دونوں حرف ہیں۔ یہ ان کے قول **لَنْ تَسْنَئَا النَّاسُ** کا رد ہے۔ کوئیوں نے کہا: اس کی اصل بل ہے جس کا معنی پہلی کلام سے اضراب ہوتا ہے۔ اس پر یا کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ وقف عمدہ ہو جائے یا ایجاب اور انعام کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے (1)۔ پس بل انکار کے رد پر دلالت کرتا ہے اور یا مابعد کے ایجاب پر دلالت کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر کوئی کہے: **الْم تَأْخُذُ دِينَارًا؟** (کیا تو نے دینار نہیں لیا؟) تو کہے گا: نعم تو معنی لا ہوگا یعنی میں نے نہیں لیا کیونکہ تو نے نفی کو ثابت کیا اور جب تو کہے: **بَلَىٰ** تو معنی ہوگا میں نے دینار لیا۔ فراء نے کہا: جب کوئی شخص اپنے ساتھی سے کہے: **مَالِكٌ عَلَى شَيْءٍ** (تیرے لئے مجھ پر کچھ نہیں ہے) دوسرا کہے: نعم تو یہ تصدیق ہوگی اس کے



لئے اس پر کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ کہے: بلی تو یہ اس کے قول کا رد ہوگا۔ تقدیر یوں ہوگی: بدی علیک (کیوں نہیں میرے لئے تجھ پر ہے) قرآن میں ہے: اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوا بَلٰی۔ اگر وہ نعم کہتے تو کافر ہوتے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَيِّئَةٌ اَسَیٰ مَرَادُ شَرِّکٍ ہے۔ ابن جریر نے کہا: میں نے عطا سے کہا من کسب سیئۃ؟ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا: شرک (1) اور پھر یہ آیت بطور دلیل پڑھی وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ (النمل: 90) (جو برائی لے کر آئے گا تو ان کو منہ کے بل اوندھا پھینک دیا جائے گا آگ میں) اسی طرح حسن اور قتادہ نے کہا: خطیئۃ کبیرہ ہے۔ (2)

**مسئلہ نمبر 3:** جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِہِ خَطِیئَتُہٗ تَوٰیہٗ دِلِیلٌ ہے کہ دو شرطوں پر یہ حکم معلق ہے، دونوں شرطوں سے کم کے ساتھ حکم مکمل نہیں ہوگا۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا اَرٰیْنَاکُمْ اَللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (فصلت: 30) (بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر (اس پر) استقامت اختیار کی) اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفیان بن عبد اللہ ثقفی کو کہا، جب انہوں نے کہا تھا یا رسول اللہ! مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات بتائیں کہ اس کے متعلق آپ کے بعد کسی سے نہ پوچھوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (تو کہہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا پھر اس پر قائم رہ) اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس مفہوم میں کلام گزر چکی ہے اور جو کچھ علماء نے وَلَا تُقْرَبَا ہٰذِہِ الشَّجَرَةَ فَتَکُوْنَا مِنَ الظَّالِمِیْنَ ۝ (البقرہ: 35) کے ضمن میں فرمایا وہ بھی گزر چکا ہے۔ نافع نے خطیئۃ، یعنی جمع پڑھا ہے باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے اور معنی کثرت ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَاِنْ تَعَدُّوا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْہَا (ابراہیم: 34) یہاں نعمة مفرد ہے لیکن معنی کثرت ہے۔

وَ اِذَا خَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ ۚ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ  
ذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالسَّکِیْنِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَتُوا  
الزَّکٰوۃَ ۚ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

”اور یاد کرو جب لیا تھا ہم نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے (اس بات کا) کہ نہ عبادت کرنا بجز اللہ کے اور ماں باپ سے اچھا سلوک کرنا نیز رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے بھی (مہربانی کرنا) اور کہنا لوگوں سے اچھی باتیں اور صحیح ادا کرنا نماز اور دیتے رہنا زکوٰۃ پھر منہ موڑ لیا تم نے مگر چند آدمی تم سے (ثابت قدم رہے) اور تم روگردانی کرنے والے ہو۔“

اس میں دس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا خَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ اِنَّ الْفَاظَ کے بیان میں کلام گزر چکی

ہے، یہاں جس میثاق کا ذکر ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ مکی نے کہا: یہ وہ میثاق ہے جو اس وقت لیا گیا جب لوگوں کو حیوانیوں کی طرح حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے نکالا گیا۔ بعض نے فرمایا: یہ وہ میثاق ہے جو ان سے لیا گیا جبکہ وہ زندگی میں عقلاء تھے۔ انبیاء کرام کی زبانوں کے ذریعے۔ وہ یہ ارشاد ہے: لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ (1) (تم عبادت نہیں کرنا مگر اللہ کی) اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی توحید کا اثبات ہے اور اس کے رسولوں کی تصدیق ہے اور جو کچھ اس نے اپنی کتب میں نازل کیا اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَعْبُدُونَ سِوَايَہِ نے کہا: لَا تَعْبُدُونَ، قسم کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہے کہ جب تم نے ان سے حلف لیا اللہ کی قسم تم عبادت نہیں کرتے مگر اللہ کی۔ مبرد، کسائی اور فراء نے اس کو جائز قرار دیا۔ حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود نے لَا تَعْبُدُوا نَبِيَّہِ کا صیغہ پڑھا ہے (2) اسی وجہ سے کلام امر کے صیغہ کے ساتھ متصل ہے۔ فرمایا: قوموا و قولوا۔ اقيموا و آتوا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حال ہے یعنی ہم نے ان سے میثاق لیا دریاں حالیکہ وہ توحید کے اظہار کرنے والے تھے یا وہ معاند نہیں تھے۔ یہ قطرب اور مبرد کا قول ہے۔ یہ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی کی قراءت پر یعبدون (یاء کے ساتھ) پر صحیح ہوتا ہے۔

فراء، زجاج اور ایک جماعت نے کہا (3) اس کا معنی ہے اخذنا میثاقہم بالآیعبودوا الا اللہ وہ ان یحسنوا للوالدین و بالا یسفکوا الدماء (ہم نے ان سے میثاق لیا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے یہ کہ وہ والدین سے حسن سلوک کریں گے، یہ کہ وہ خون ریزی نہیں کریں گے) پھر ان اور باکو حذف کیا گیا تو فعل کو رفع دیا گیا ان دونوں کے نہ ہونے کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَأْمُرُوْنَ (الزمر: 64) مبرد نے کہا: یہ خطا ہے جو عربی میں مضمر ہوتا ہے وہ ظاہر عامل کی طرح عمل کرتا ہے تو کہتا ہے: و ببد قطع تعنی رُب ببد۔

میں کہتا ہوں: یہ خطا نہیں ہے بلکہ دونوں وجہیں صحیح ہیں، ان دونوں وجوہ پر سیبویہ نے یہ شعر پڑھا ہے:

الا ایهذا الزاجری احضر الوغی      وان اشهد اللذات هل انت مغلدی

اس شعر میں احضر پر نصب اور رفع دونوں پڑھے گئے ہیں۔ نصب اُن کے اضمار کی بنا پر اور رفع اُن کے حذف کی بنا پر۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا یعنی ہم نے انہیں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے والدین کے حق کو توحید کے ساتھ ذکر کیا ہے کیونکہ انسان کی تخلیق اول اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور تخلیق ثانی (تربیت) والدین کی طرف سے ہوتی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے شکر کو اپنے شکر کے ساتھ ملایا ہے فرمایا: اِنْ اَشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْنِكَ (لقمان: 14)

والدین سے احسان کا مطلب ان سے حسن معاشرت، ان کے لئے تواضع، ان کے حکم کی پیروی، ان کے وصال کے بعد ان کے لئے مغفرت کی دعا، ان سے محبت کرنے والوں سے تعلقات قائم کرنا وغیرہ ہے۔ تفصیلی بیان ان شاء اللہ سورہ اسراء

میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَذِي الْقُرْبَىٰ** اس کا عطف والدین پر ہے **الْقُرْبَىٰ** بمعنی قرابت ہے یہ مصدر ہے جیسے الرجعی، العقبی (1) یعنی ہم نے اپنے قریبی رشتہ داروں سے احسان کا حکم دیا۔ تفصیلی بیان سورۃ القتال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الْيَتَامَىٰ** یہ بھی معطوف ہے۔ یہ یتیم کی جمع ہے جیسے ندامی، ندیم کی جمع ہے۔ انسانوں میں الیتیم باپ کا نہ ہونا ہے اور جانوروں میں ماں کا نہ ہونا ہے (2)۔ ماوردی نے حکایت کیا ہے کہ یتیم اسے کہا جاتا ہے جس کی ماں نہ ہو۔ پہلا قول معروف ہے اس کا اصل معنی جدا ہونا ہے۔ صبی یتیم یعنی وہ بچہ جو اپنے باپ سے جدا ہو گیا۔ بیت یتیم جس کے آگے چھپے کوئی شعر نہ ہو۔ درۃ یتیمۃ، ایسا موتی جس کی مثال نہ ہو۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی الا بطاء (تاخیر کرنا) ہے۔ یتیم کو اس لئے یتیم کہا جاتا ہے کہ نیکی اس سے مؤخر ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: **يَتِّمُ يَتِّمُ يَتِّمُ** جیسے عظم يعظم۔ اور **يَتِّمُ يَتِّمُ يَتِّمُ** جیسے سمع یسمع۔ فراء نے دو جہیں ذکر کی ہیں: **قَدْ اَيْتَمَ اللّٰهُ** اللہ نے اسے یتیم بنایا۔

یہ آیت یتیم پر شفقت کرنے پر اور اس کی کفالت اور اس کے مال کی حفاظت کرنے پر براہیختہ کر رہی ہے۔ اس کا بیان سورۃ نساء میں آئے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے یتیم کی کفالت کرنے والا یا کسی غیر کے یتیم کی کفالت کرنے والا اور میں اور وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح اکٹھے ہوں گے۔ مالک نے سبابہ اور درمیان انگلی کے ساتھ اشارہ کیا۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔ امام حافظ ابو محمد عبد الغنی بن سعید نے حسن بن دینار ابو سعید بصری، جو حسن بن واصل، کی حدیث نقل کی ہے، فرمایا: ہمیں اسود بن عبد الرحمن نے بتایا انہوں نے ہضان سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس قوم کے پیالے پر یتیم نہ بیٹھے ان کے پیالے کے قریب شیطان ہوتا ہے۔ عبد الغنی نے حسین بن قیس کی حدیث بھی نقل کی ہے اور وہ ابو علی جسی ہے۔ انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ایک یتیم مسلمان کو اپنے کھانے اور پینے میں شریک کیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اسے سیر کر دے گا تو اس کے یقیناً سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے مگر یہ کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جو بخشنا نہ جاتا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جس کی دو محبوب چیزیں لے لے گا اور وہ صبر کرے گا اور ثواب کی امید رکھے گا تو اس کے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ صحابہ نے پوچھا: کھینا (دو محبوب چیزوں) سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اس کی آنکھیں اور جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں گی وہ ان پر خرچ کرے گا اور ان سے حسن سلوک کرے گا حتیٰ کہ ان کی شادی ہو جائے یا وہ فوت ہو جائیں تو یقیناً اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے مگر یہ کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جو بخشنا نہ جاتا ہو۔ ایک بدو جس نے ہجرت کی تھی اس نے کہا: یا رسول اللہ! جس کی دو بیٹیاں ہوں اس کا کیا حکم ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خواہ دو بیٹیاں ہوں اس کے لئے بھی یہی حکم ہے۔ حضرت ابن عباس جب یہ



حدیث بیان کرتے تھے تو فرماتے تھے: اللہ کی قسم! یہ حدیث کے غرائب اور غرر سے ہے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 6:** سبابہ وہ انگلی ہوتی ہے جو انگوٹھے سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اسے سبابہ کہا جاتا تھا کیونکہ وہ اس کے ذریعے گالی دیتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت دی تو انہوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور انہوں نے اس کا نام المشیرہ رکھا کیونکہ وہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اشارہ کرتے تھے، اس کو سباحہ بھی کہا جاتا ہے اس کا یہ نام حضرت وائل بن حجر وغیرہ کی حدیث میں آیا ہے لیکن لغت زمانہ جاہلیت میں جو معروف تھا اس کے مطابق چلتی رہی اور وہ غالب رہی۔ رسول اللہ ﷺ کی انگلیوں کے مطابق مروی ہے کہ ان میں سے المشیرہ درمیانی انگلی سے بڑی تھی، اور درمیانی انگلی، المشیرہ سے چھوٹی تھی پھر بنصر درمیانی سے چھوٹی تھی۔ یزید بن ہارون نے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں عبد اللہ بن مقسم الطائفی نے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: مجھے میری پھوپھی سارہ بنت مقسم نے بتایا کہ انہوں نے حضرت میمونہ بنت کردم کو سنا، انہوں نے فرمایا: میں اس حج کے موقع پر نکلی جو رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی سواری پر دیکھا، میرے باپ نے آپ ﷺ سے کچھ چیزوں کے متعلق پوچھا۔ میں نے دیکھا میں تعجب کرتی تھی..... جب کہ میں بچی تھی رسول اللہ ﷺ کی اس انگلی کی لمبائی پر جو انگوٹھے کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے وہ تمام انگلیوں سے بڑی تھی۔

پس نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد انا و هو کھاتین فی الجنة اور دوسری حدیث میں ہے اُخْشَرُ اَنَا و ابوبکر و عمرو يوم القيامة هكذا (میں، ابوبکر اور عمر قیامت کے روز اس طرح اٹھائے جائیں گے) اپنی تین انگلیوں سے اشارہ فرمایا۔ آپ نے مخلوق کی منازل اور مخلوق پر جھانکنے کا ارادہ فرمایا اور فرمایا: ہم اس طرح انھیں گے اور ہم اوپر سے جھانک رہے ہوں گی۔ اسی طرح یتیم کی کفالت کرنے والے کا مرتبہ بلند ہوگا۔ جو رسول اللہ ﷺ کی انگلیوں کی شان کو نہیں جانتا اس نے حدیث کی تاویل انضمام و اقتراب سے کی ہے یعنی درجے ملے ہوئے ہوں گے اور یہ معنی بعید ہے کیونکہ رسل، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی منازل متفرق اور مختلف ہوں گی۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْمَسْكِينُ یہ بھی معطوف ہے یعنی ہم نے انہیں مساکین کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں حاجت نے ساکن کر دیا ہو اور انہیں ذلیل کر دیا ہو۔ یہ صدقہ، مواسات، مساکین کے احوال جاننے اور ضعیفوں کی خبر گیری کرنے کو متضمن ہے (2)۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: بیوہ اور مسکین (کی کفالت کے لئے) کوشش کرنے والا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔ میرا خیال ہے آپ ﷺ نے فرمایا: اور اس قیام کرنے والے کی طرح ہے جو کمزور نہیں پڑتا اور اس روزے دار کی طرح جو افطار نہیں کرتا (3)۔ ابن منذر نے کہا: بہنوں کے لئے محنت مزدوری کرنا اللہ کے راستہ میں جہاد سے افضل ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا، حُسْنًا کو معنی کے اعتبار سے نصب مصدر کی بنا پر ہے

1۔ سنن ابن ماجہ، باب بر الوالد والاحسان الی البنات، حدیث نمبر 3658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز فی آیات ہذا

3۔ صحیح بخاری، باب الساعی علی المسکین، حدیث نمبر 5548، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیونکہ اس کا معنی ہے تمہارا قول اچھا ہو۔ بعض نے فرمایا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: وَقُولُوا لِلنَّاسِ قَوْلًا ذَا حُسْنٍ، یہ مصدر ہے معنی کے اعتبار سے نہیں۔ حمزہ اور کسائی نے حُسْنًا، حاء اور سین کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا: دونوں کا معنی ایک ہے، جیسے بخل اور مَخْل۔ الرشد اور الرشد کا معنی ایک ہے۔ اخفش نے حکایت کیا ہے: حُسْنٌ یعنی بغیر تنوین کے فعل کے وزن پر۔ نحاس نے کہا اور یہ عربی زبان میں جائز نہیں، ایسے صیغہ کو الف، لام کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے جیسے الفصی، الکبریٰ، الحسنى۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے حُسْنًا حاء اور سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

جیسے الحُلْم۔ حضرت ابن عباس نے کہا تم انہیں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہو اور انہیں اس کا حکم دو۔ ابن جریج نے کہا: یعنی تم حضرت محمد ﷺ کے معاملہ میں لوگوں سے سچی بات کہو اور آپ ﷺ کی صفات میں تبدیلی نہ کرو۔ سفیان ثوری نے کہا: لوگوں کو نیکی کا حکم دو اور انہیں برائی سے روکو۔ ابو العالیہ نے کہا: انہیں اچھی بات کہو اور اچھا بدلہ دو اس سے جو تم چاہتے ہو کہ تمہیں بدلہ دیا جائے۔ یہ تمام مکارم اخلاق پر ابھارتا ہے (1)۔ پس انسان کو چاہئے کہ لوگوں کے ساتھ اس کا کلام نرم ہو اس کا چہرہ ہر فاسق و فاجر کے لئے، سنی اور بدعتی کے لئے مسکراتا اور کھلا ہوا ہو لیکن دین میں مدہانت نہ کرے اور ایسی کلام نہ کرے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس کے مذہب سے راضی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا: فَقُولُوا لِلنَّاسِ قَوْلًا لَّيِّنًا (طہ: 44) (اس سے نرم لہجہ میں بات کرو) کوئی قائل، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہما السلام سے افضل نہیں ہے اور کوئی فاجر فرعون سے زیادہ خبیث نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اس کے ساتھ نرم کلام کرنے کا حکم دیا۔

طلحہ بن عمر نے کہا: میں نے عطا سے کہا تیرے پاس مختلف خوابشات کے لوگ جمع ہوتے ہیں اور میرے اندر تیزی اور سختی ہے میں ان کو سخت کلام کہتا ہوں۔ حضرت عطا نے کہا: تم ایسا مت کیا کرو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا اس آیت میں یہود و نصاریٰ بھی داخل ہیں تو پھر حنیفی (مسلمان) کا کیا حکم ہوگا۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: تو فحش کلام کرنے والی نہ ہو جا، کیونکہ بے شک فحش اگر مرد ہوتا تو برا مرد ہوتا۔

بعض علماء نے فرمایا: الناس سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں جیسے اس ارشاد میں ہے: أَمْرٌ يَخْشَدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ (النساء: 54) گویا یوں ارشاد فرمایا: قُولُوا لِلنَّبِيِّ ﷺ حُسْنًا نبی کریم ﷺ سے اچھی بات کہو۔ مہدوی نے قتادہ سے حکایت کیا ہے کہ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا کا ارشاد، آیت السیف (قال والی آیت) سے منسوخ ہے (2)۔ ابونصر عبد الرحیم بن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت ابتدا میں نازل ہوئی پھر اسے آیت السیف نے منسوخ کر دیا۔ ابن عطیہ نے کہا: (3) یہ آیت دلیل ہے کہ ابتداء اسلام میں اس امت کو اس جیسے الفاظ سے خطاب کیا گیا۔ بنی اسرائیل کے متعلق خبر اور جو انہیں حکم دیا گیا وہ اس میں منسوخ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ اس کے بارے میں قول گزر چکا ہے اس میں خطاب بنی اسرائیل کے لئے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: (4) وہ لوگ اپنی زکوٰۃ کو ایک جگہ رکھتے تھے جو قبول ہوتی اس پر آگ





ہیں کہ وہ اسے گھیرے ہوئے ہوتی ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ اَقْدَرْتُمْ یہ اقرار سے ہے۔ یعنی تم نے اس میثاق کا اقرار کیا جو تم سے اور تمہارے پہلوں سے لیا گیا تھا۔ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ یہ الشہادت سے ہے یعنی اس پر تم اپنے دلوں کے گواہ ہو۔ بعض نے فرمایا: شہادت بھی حضور ہے یعنی تم خون ریزی کے وقت اور گھروں سے نکالنے کے وقت موجود تھے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اگر کہا جائے کہ کیا کوئی اپنا خون بہاتا ہے اور اپنے آپ کو گھر سے نکالتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب ان کی ملت ایک تھی اور ان کا معاملہ ایک تھا اور وہ امم میں ایک شخص کی مانند تھے تو بعض کا بعض کو قتل کرنا اور بعض کا بعض کو نکالنا، اپنے آپ کو قتل کرنے اور اپنے آپ کو نکالنے سے بنایا۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد قصاص ہے یعنی کوئی کسی کو قتل کرتا تو اس سے قصاص لیا جاتا یا اس نے اپنا ہی خون بہایا۔ اسی طرح جو زنا کرتا اور جو مرتد ہوتا تو اس کا خون مباح ہو جاتا۔ وہ فساد برپا کرتا تو اسے جلا وطن کیا جاتا، یہ گویا اس نے اپنے آپ کو ہی اپنے گھر سے نکالا۔ یہ اسی تاویل پر ہے جس میں بہت بعد ہے اگرچہ معنی صحیح ہے۔ معاملہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے تورات میں عہد لیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل نہیں کریں گے نہ ایک دوسرے کو جلا وطن کریں گے اور نہ غلام بنائیں گے۔ اسی طرح دوسری طاعات کا ان سے عہد لیا تھا۔ (1)

میں کہتا ہوں: یہ سب کام ہم پر بھی حرام ہیں، یہ تمام فتنے ہم میں بھی واقع ہوئے ہیں۔ فَاَنَّا نَدْعُو اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ۔ قرآن حکیم میں ہے: اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيْعًا وَيُذْنِقَ بَعْضَكُمْ بَآسَ بَعْضٍ (انعام: 65) (خلط ملط کرے تمہیں مختلف گروہوں میں اور چکھائے تم میں سے بعض کو شدت دوسروں کی) اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ابن خویزہ منداد نے کہا: جائز ہے کہ اس سے مراد ظاہر ہو، کوئی انسان خودکشی نہ کرے، اور بیوقوفی کی وجہ سے اپنے گھر سے نہ نکلے جس طرح کہ بندہ اپنے آپ کو قتل کرتے ہیں یا انسان انتہائی پریشانی اور مصیبت کے وقت خودکشی کر لیتا ہے یا صحراء میں گھومتا رہتا ہے، دین سے ناواقف اور عقل میں کمی کی وجہ سے گھروں میں نہیں آتا۔ یہ تمام صورتوں کو حکم شامل ہے۔

روایت ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون نے دس صحابہ کی موجودگی میں بیعت کی اور سب نے یہ عزم کیا کہ وہ بوریہ کا لباس پہنیں گے، صحراء میں گھومیں گے اور گھروں میں نہیں آئیں گے، گوشت نہیں کھائیں گے اور اپنی عورتوں کے پاس نہیں جائیں گے۔ نبی کریم ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ حضرت عثمان بن مظعون کے گھر آئے، اسے گھر پر نہ پایا، ان کی بیوی سے فرمایا: مجھے عثمان کے بارے میں کیا بات پہنچی ہے؟ بیوی نے اپنے خاوند کا راز افشا کرنا اور رسول اللہ ﷺ سے جھوٹ بولنا ناپسند کیا۔ اس نے کہا: یا رسول اللہ! اگر آپ کو کوئی بات پہنچی ہے تو وہ اسی طرح ہے جس طرح آپ کو پہنچی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم عثمان کو کہنا کیا میری سنت کی مخالفت کرتے ہو یا میری ملت کے علاوہ کسی ملت پر ہو۔ میں نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، عورتوں کے پاس بھی جاتا ہوں، گھروں میں بھی پناہ لیتا ہوں۔ گوشت بھی کھاتا ہوں جو میری سنت سے انحراف کرے کا وہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ حضرت عثمان اور آپ کے ساتھی اپنی حالت سے واپس لوٹ آئے۔ (2)

ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِّن دِيَارِهِمْ  
تُظَاهِرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِن يَأْتُواكُمُ أُسْرَىٰ تَقْدُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ  
عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤَمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَن  
يَفْعَلُ ذَلِكَ مِّنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ  
الْعَذَابِ ۚ وَمَا لِلَّهِ بِعَافٍ لِّعَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٣٠﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا  
بِالْآخِرَةِ فَلَا يَخَفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٣١﴾

”پھر تم وہی ہونا (جنہوں نے یہ وعدے کئے) کہ اب قتل کر رہے ہو اپنوں کو اور نکال باہر کرتے ہو اپنے گروہ کو ان کے وطن سے۔ (نیز) مدد دیتے ہو ان کے خلاف (دشمنوں کو) گناہ اور ظلم سے۔ اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی بن کر (تو بڑے پاکباز بن کر) ان کا فدیہ ادا کرتے ہو، حالانکہ حرام کیا گیا تھا تم پر ان کا گھروں سے نکالنا۔ تو کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر اور انکار کرتے ہو کچھ حصہ کا۔ (تم خود ہی کہو) کیا سزا ہے ایسے نابکار کی تم میں سے سوائے اس کے کہ رسوا ہے دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن تو انہیں پھینک دیا جائے گا سخت ترین عذاب میں۔ اور اللہ بے خبر نہیں ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے مول لے لی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے عوض۔ تو نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ، اَنْتُمْ مبتدا ہے اس کو اعراب نہیں دیا جاتا کیونکہ یہ ضمیر ہے۔ اَنْتُمْ میں تا کو ضمہ دیا جاتا ہے، کیونکہ واحد مذکر مخاطب کے صیغہ میں تا مفتوح ہوتی ہے واحد مونث مخاطب میں تا مکسور ہوتی ہے۔ پس جب تو تشبیہ یا جمع کا صیغہ بنائے گا تو صرف ضمہ باقی ہے۔ هَؤُلَاءِ قسمی نے کہا: اس کی تقدیر یا هَؤُلَاءِ ہے۔ نحاس نے کہا: یہ سیبویہ کے قول کے مطابق خطا ہے، اور هذا اقْبَلُ جائز نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: هَؤُلَاءِ بمعنی الذین ہے، تَقْتُلُونَ یہ صلہ میں داخل ہے یعنی ثم اتم الذین تقتلون۔ بعض نے فرمایا: هَؤُلَاءِ مبتدا ہے اور اَنْتُمْ خبر مقدم ہے اور تَقْتُلُونَ، هَؤُلَاءِ سے حال ہے۔ بعض نے فرمایا: اعنی کے اضمار کے ساتھ هَؤُلَاءِ منصوب ہے (1)۔ زہری نے تقتلون پہلی تا مضموم اور دوسری کو شد کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح فلم يقتلون انبیاء اللہ میں پڑھا ہے، یہ خطاب موجودہ لوگوں کو ہے۔ یہ ان کے اسلام کی طرف لوٹانے کا احتمال نہیں رکھتا۔ یہ بنی قینقاع، قریظہ اور نصیر یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ بنو قینقاع، قریظہ کے دشمن تھے اور اوس، بنی قینقاع کے حلیف تھے۔ خزرج، بنی قریظہ کے حلیف تھے۔ نصیر (2)، اوس اور خزرج بھائی تھے اور قریظہ اور نصیر آپس میں بھائی بھائی تھے۔ پھر وہ جدا جدا ہو گئے وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے پھر جنگ ختم ہوتی تو وہ اپنے قیدیوں کا فدیہ دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر شرم دلانی اور فرمایا: وَإِن يَأْتُواكُمُ أُسْرَىٰ تَقْدُوهُمْ (3) (اور اگر آئیں

تمہارے پاس قیدی بن کر (توبڑے پاکباز بن کر) ان کا فدیہ ادا کرتے ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَظَاهَرُونَ اس کا معنی تتعاونون (معاونت کرنا) ہے۔ یہ الظہر سے مشتق ہے کیونکہ بعض بعض کو تقویت دیتا ہے تو وہ اس کے لئے پیٹھ کی طرح ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

تظاہرتم استاہ بیت تجمعت  
عن واحد لا زلتہ قرن واحد  
اس شعر میں تظاہر کا معنی مدد کرنا ہے۔

الاسم اس فعل کو کہتے ہیں جس کا کرنے والا مذمت کا مستحق ہوتا ہے۔ الْعُدْوَانِ ظلم میں زیادتی کرنا اور ظلم میں تجاوز کرنا۔ اہل مدینہ اور اہل مکہ نے تظاہرون ظا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے وہ تا کو ظا میں ادغام کرتے ہیں ان کے قرب کی وجہ سے، اصل میں تظاہرون تھا۔ کوفیوں نے تظاہرون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے پہلی تا کی دلالت کی وجہ سے دوسری تا کو حذف کر دیا اسی طرح وان تظاہرا علیہ کو پڑھا ہے۔ قتادہ نے تظہرون علیہم پڑھا ہے، یہ سب تعاون کے معنی کی طرف راجع ہیں۔ اس سے ہے وَ كَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَأْسِهِ ظَهِيرًا ③ (الفرقان) (اور کافر اپنے رب کے مقابلہ میں (ہمیشہ شیطان کا) مددگار ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمَلِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ ④ (التحریم) (سارے فرشتے اس کے علاوہ مدد کرنے والے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ يَأْتِوكُمُ الْأُسْرَىٰ تَفْدُوهُمْ وَهُمْ مَحْزَمٌ عَلَيْكُمْ اخْرَاجُهُمْ  
اس میں چھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ يَأْتِوكُمُ الْأُسْرَىٰ یہ شرط ہے اور اس کا جواب تَفْدُوهُمْ ہے اور أُسْرَىٰ کی نصب حال کی بنا پر ہے۔ ابو عبید نے کہا: ابو عمرو کہتے تھے جو ان کے ہاتھوں میں تھا وہ أُسْرَىٰ تھا، اور جو قیدی ہو کر آئیں وہ اسریٰ ہیں۔ اہل لغت میں یہ معروف نہیں جو ابو عمرو نے کہا ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: سکاری، سکاری۔ اکثر کی قراءت أُسَارِیٰ ہے۔ حمزہ نے اسے اسریٰ فعلی کے وزن پر پڑھا ہے۔ یہ اسیر کی جمع ہے، اسیر بھی ماسور ہے، فعلی، فعیل کی جمع ہے۔ جیسے تو کہتا ہے قتیل سے قتل، جریح سے جرحی۔ ابو حاتم نے کہا اساریٰ جائز نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: اساریٰ جیسے کہا جاتا ہے سکاری، فعلی ہی اصل ہے اور فعالی اس پر داخل ہے۔

محمد بن یزید سے حکایت ہے، فرمایا: کہا جاتا ہے: اسیر، أسراء، جیسے ظریف سے ظرفاء۔ ابن فارس نے کہا: اسیر کی جمع میں اسریٰ، أساریٰ کہا جاتا ہے دونوں طرح پڑھا گیا ہے بعض نے فرمایا: أساریٰ (حمزہ کے فتح کے ساتھ)

**مسئلہ نمبر 2:** الاسیر، یہ الاسار سے مشتق ہے اس سے مراد وہ چیز ہے کی رسی ہے جس کے ساتھ محمل کو باندھا جاتا ہے، اس کو اسیر اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس کو باندھا جاتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: قد أسر قتبہ، اس نے پالان کو باندھا پھر ہر پکڑی گئی چیز کو اسیر کہتے ہیں اگر چاہے باندھا نہ بھی گیا ہو۔ اعشی نے کہا:

و قیدن الشعر فی بیتہ کما قید الأسرات الحمارا  
مجھے شعر نے اس طرح قید کر دیا ہے جس طرح عورتیں پالان کی لکڑی کو قید کئے ہوئے ہوتی ہیں



یعنی انانی بیتم۔ اس سے اس کی مراد انتہا کو پہنچنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَشَدَّ ذُنَاكَ سِرْهُمُ (الدہر: 28) میں اسر سے مراد خلق ہے۔ اسرۃ الرجل، آدمی کا خاندان، گروہ۔ کیونکہ وہ ان سے قوت حاصل کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تَقْدُوْهُمْ۔ نافع، حمزہ اور کسائی نے اسی طرح پڑھا ہے اور باقی قراء نے تقدوہم پڑھا ہے یہ فداء سے ہے الفداء کا معنی قیدی کا فدیہ طلب کرنا ہے۔ جوہری نے کہا: الفداء کو جب فاکے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ محدود اور مقصور ہوتا ہے اور فتح کے ساتھ پڑھا جائے تو صرف مقصور ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: قم فدی لک اپنی۔ اور عربوں میں سے جو فاکے کسرہ دیتے ہیں اسے فداء تنوین کے ساتھ پڑھتے ہیں خصوصاً جب اس کے ساتھ لام جارہ ہو۔ پس وہ کہتے ہیں: فداء لک۔ کیونکہ یہ نکرہ ہے اس سے وہ دعا کا معنی مراد لیتے ہیں۔ اصمعی نے نابغہ کا یہ شعر پڑھا ہے:

مهلاً فداء لك الاقوام كلهم وما اشر من مال ومن ولي

کہا جاتا ہے: فداء وفاداء تو کوئی عطیہ دے پھر اسے ختم کر دے۔ فداء بنفسه وفداء بغيره جب کہا میں نے تیرا فدیہ دیا۔ تفادوا، یعنی بعض نے بعض کو فدیہ دیا۔ الفدية، الفدى، الفداء تمام کا معنی ایک ہے۔ وفادیت نفسی یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو کوئی چیز دینے کے بعد اسے چھوڑ دے۔ یہ بمعنی فدیہ ہے، اسی سے حضرت عباس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرنا ہے: فادیت نفسی وفادیت عقلاً میں نے اپنا فدیہ دیا ہے اور عقیل کا فدیہ دیا ہے۔ یہ دونوں فعل و مفعولوں کی طرف متعدی ہوتے ہیں، ان میں سے دوسرا حرف جر کے ساتھ ہے۔ تو کہتا ہے: فادیت نفسی بھالی وفادیتہ بھالی (1)۔ شاعر نے کہا:

قنى فادى اسيرك ان قومى و قومك ما ارى لهم اجتماعا

تو ٹھہر جا اور اپنے قیدی کا فدیہ دے دے میری اور تیری قوم میں ان کا اجتماع میں نہیں دیکھتا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ۔ هُوَ مبتدا ہے یہ اخراج سے کنایہ ہے، مُحَرَّمٌ خبر ہے اور إِخْرَاجُهُمْ، هُوَ سے بدل ہے، اگر تو چاہے تو هُوَ ضمیر کو الحمدیث اور القصہ سے کنایہ بنا دے اور اس کا مابعد جملہ خبر ہو، یعنی والا امر محرم علیکم اخراجہم، پس فاخراجہم دوسرا مبتدا ہوگا اور محرم اس کی خبر ہوگی اور پھر جملہ هُوَ کی خبر ہوگا۔ اور محرم میں جو ضمیر نائب فاعل ہے وہ الاخراج کی طرف لوٹ رہی ہے یہ بھی جائز ہے کہ محرم مبتدا ہو اور اخراجہم اس کا نائب فاعل، محرم کی خبر کے قائم مقام ہے پھر جملہ ہو کی خبر ہو۔ فراء نے کہا: هُوَ عماد ہے یہ بصریوں کے نزدیک خطا ہے اس کا کوئی معنی نہیں کیونکہ عماد اول کلام میں نہیں ہوتا اور ضمہ کے ثقل کی وجہ سے ہاء کے سکون کے ساتھ وَهُوَ بھی پڑھا جاتا ہے۔ جس طرح شاعر نے کہا:

فهو لا تنسى رميته ما له لا عذ من نغره

اس میں فهو کو ہاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح اس سے پہلے لام اور ثم لائے تو بھی ہا سا کن کر دے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان سے چار عہد لئے تھے: قتل نہ کرنا، جلاوطن نہ کرنا، مدد نہ کرنا اور قیدیوں کا فدیہ دینا۔ انہوں نے سوائے فدیہ کے حکم کے سب سے اعراض کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں توبہ فرمائی جو پڑھی جاتی ہے۔ فرمایا: اَفْتَوْمُنُونِ بَبَعْضِ الْكِتَابِ (تورات) وَتَكْفُرُونَ بَبَعْضِ۔

میں کہتا ہوں: اللہ کی قسم! ہم نے فتویٰ کی وجہ سے تمام احکام کو ترک کر دیا۔ اور ہم نے ایک دوسرے کی مدد کی مسلمانوں پر افسوس بلکہ کافروں پر افسوس۔ ہم نے اپنے بھائیوں کو ذلیل و رسوا چھوڑ دیا ان پر مشرکین کے احکام جاری ہیں۔ رسول ولا قُوَّةُ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

ہمارے علماء نے فرمایا: قیدیوں کا فدیہ دینا واجب ہے اگرچہ ایک درہم بھی باقی نہ ہو۔ ابن خويز منداد نے کہا: یہ آیت قیدیوں کے چھڑانے کے وجوب کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے، نبی کریم ﷺ کے ارشادات بھی اس کے متعلق وارد ہیں، آپ نے قیدیوں کو چھڑایا اور ان کو چھڑانے کا حکم دیا (1)، اسی پر مسلمان کامل جاری ہے اور اس پر اجماع منعقد ہے۔ بیت المال سے قیدیوں کو چھڑانا واجب ہے اگر بیت المال نہ ہو تو تمام مسلمانوں پر یہ فرض ہے۔ جس نے بھی یہ فریضہ ادا کر دیا باقی لوگوں سے ساقط ہو جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 5:** فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا یہ مبتدا اور خبر ہیں الخزی کا معنی رسوائی ہے۔ جوہری نے کہا: خِزْيٌ یَخْزِي خِزْیاً جب کوئی ذلیل و رسوا ہو جائے۔ ابن سکیت نے کہا: وہ منہیت میں واقع ہوا۔ اخزاء اللہ تعالیٰ نے اسے رسوا کیا۔ خِزْيٌ، یَخْزِي خِزْیَةً جب کوئی حیا کرے۔ فہو خِزْیَانٌ، قوم خِزْیَا و امرؤٌ خِزْیَانٌ۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ الْقِيَمَةِ يُرَدُّونَ مَا قَرَأُوا کی قراءت یردون یا کے ساتھ ہے۔ حسن نے تردد و تاخیر کے ساتھ پڑھا ہے۔

اِنَّ اَشَدَّ الْعَذَابِ وَمَا لِّلّٰهِ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ اس سے پہلے کلام نزر چکی ہے۔ اسی طرح اُولَئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوْا اس پر بھی کلام ہو چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں یوم کو نصب یردون کی وجہ سے ہے۔

وَلَقَدْ اَتَيْنَا مُوسٰی الْكِتٰبَ وَحَقَّقْنٰمِنْۢ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ وَ اَتَيْنَا عِیْسٰی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاٰیٰتُہٗ بِرُوحِ الْقُدُسِ اَفْکَلَمَآ جَآءَکُمْ رَّسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰی اَنْفُسُکُمْ اَسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِیْقًا کَذَبْتُمْ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝

”اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ علیہ السلام و کتاب اور ہم نے پے درپے ان کے پیچھے پیغمبر بھیجے۔ اور میں نے عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں اور ہم نے تقویت دی انہیں جو میں علیہ السلام سے تو کیا بھیجے آئے تمہارے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم جسے تمہارے نفس پسند نہ کرتے تو تم انہیں کئے بغض و تم نے جھٹلایا۔“

کرنے لگے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ، کتاب سے مراد تورات ہے فقینا ہم نے پیچھے بھیجا۔ التقفیتہ پیچھا کرنا، پیچھے بٹھانا۔ یہ اتہام القفا سے ماخوذ ہے، القفا گردن کے پیچھے حصہ کو کہتے ہیں۔ تو کہتا ہے: استفیتہ، جب تو کسی کے پیچھے آئے۔ اسی سے قافیۃ الشعر ہے کیونکہ وہ سارے کلام میں پڑھا جاتا ہے، القافیۃ کا معنی گدی ہے۔ اسی سے حدیث پاک ہے: یعتقد الشیطان علی قافیۃ رأس احدکم (1)۔ شیطان تم میں سے کسی کے سر کی گدی پر گرہ لگاتا ہے۔ القفی، القفارۃ دودھ وغیرہ جو اس شخص کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے جس کا تو اکرام چاہتا ہے۔ قفوت الرجل یعنی میں نے فحور کے ساتھ اسے تہمت لگائی۔ فلان قفوت۔ فلاں میری تہمت ہے۔ وقفوتی یعنی میری خیر ہے۔ ابن درید نے کہا: گویا یہ اضداد میں سے ہے۔ علماء نے فرمایا: یہ آیت اس آیت کی مثل ہے ثُمَّ أَنزَلْنَا رَسُولَنَا نُوحًا (المومنون: 44) ہر رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آیا وہ تورات کے اثبات اور اس کے لزوم کے امر کے ساتھ آیا (2)۔ کہا جاتا ہے: رُسُلٌ وَ رُسُلٌ یہ دونوں لغتیں ہیں، پہلی لغت حجاز ہے اور دوسری لغت تمیم ہے خواہ مضاف ہو یا مضاف نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَآتَيْنَا جِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتِ، بینات سے مراد دلائل و براہین ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران اور سورہ مائدہ میں ذکر کیا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے (3)۔ وَآيَاتُهُ یعنی ہم نے قوت دی۔ مجاہد اور ابن محیسن نے اسے آیدناہ مد کے ساتھ پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ بِرُوحِ الْقُدُسِ ابومالک اور ابوصالح نے ابن عباس اور معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ حضرت حسان نے کہا:

و جبریل رسول الله فينا و روح القدس ليس به خفاء

جبریل ہم میں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے ہیں اور وہ روح القدس ہیں اس میں کوئی خفا نہیں ہے۔

نحاس نے کہا: جبریل کو روح کہا گیا اور پھر القدس کی طرف مضاف کیا گیا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تکوین کے ساتھ روح تھا نہ اس طرح اس کی تکوین تھی جس طرح والد، اولاد کی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہا جاتا ہے۔ غالب بن عبد اللہ نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: القدس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اسی طرح حسن نے فرمایا: القدس اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی روح جبریل ہے۔ ابوروق نے ضحاک سے روایت کیا ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ روح القدس سے مراد وہ اسم ہے جس کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے (4)۔ حضرت سعید بن جبیر اور عبید نے بھی یہی کہا یہ اسم اعظم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد انجیل ہے اس کو روح کہا ہے جس طرح قرآن کو روح کہا ہے وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا قَدِيسًا (الشوری: 52) پہلا قول اظہر ہے۔ واللہ اعلم۔

القدس کا معنی طہارت بھی ہے، یہ پہلے گزر چکا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب عقد الشیطان علی قافیۃ الرأس اذالم یصل بالدلیل، حدیث نمبر 1074، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا



اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰٓ اَنْفُسُكُمْ يَعْزِمُوْا عَلٰى الْوَعْدِ الّٰهِ فَاِنْ لَمْ يَأْتِكُمْ سَبْعَ مَسَارِعٍ فَبَلَّغْنَاكَ الْاَمْرَ وَتَوَدَّدْتَ الْهَالِكِ  
عائد کو اسم کے طول کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔ اصل اس طرح ہے: بِلَا تَهْوَاهُ (استکبرتم) اس کی بات قبول کرنے سے تکبر کیا رسولوں کو حقیر سمجھتے ہوئے اور رسالت کو مستعبد سمجھتے ہوئے۔ الہوی کا اصل معنی کسی چیز کی طرف مائل ہونا ہے اس کی جمع احواء ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے اس کی جمع اھویۃ نہیں آئی باوجود اس کے کہ عرب کہتے ہیں ندی اندیۃ۔

في ليلة من جمادى ذات اندية لا يصير الكلب في ظلماتها الطنبا

جوہری نے کہا: یہ شاذ ہے۔ اور الہوی کو ہوتی اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے ساتھی کو آگ میں گراتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ عام طور پر ایسی بات کے لئے استعمال ہوتا ہے جو حق نہ ہو اور جس میں خیر نہ ہو۔ یہ آیت اسی سے ہے۔ کبھی یہ حق میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ حضرت عمر نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں کہا: ہوی رسول اللہ ﷺ ما قال ابوہکرم ولم یہو ما قلت۔ رسول اللہ ﷺ کا میلان اس طرف ہوا جو ابو بکر نے کہا تھا اس طرف نہ ہوا جو میں نے کہا تھا (1)۔ حضرت عائشہ نے نبی کریم ﷺ سے کہا تھا: واللہ ما اری ربک الا یسارعی ہوا (☆)۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! میں تیرے پروردگار کو دیکھتی ہوں کہ وہ تیری خواہش کو جلدی پورا فرما دیتا ہے۔ ان دونوں احادیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ، كَذَّبْتُمْ کی وجہ سے فریقاً منصوب ہے اور اسی طرح وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ہے۔ پس کچھ ان میں سے جنہوں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد علیہما السلام کو جھٹلایا اور کچھ ان میں سے تھے جنہوں نے حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہما السلام کو قتل کیا۔ اس کا بیان سورہ سبحان میں آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾

”اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر تو غلاف چڑھے ہیں نہیں بلکہ پھنکار دیا ہے انہیں اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے وہ بہت ہی کم ایمان رکھتے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوا لَیْسَ بِیْهِدُ قُلُوبُنَا غُلْفٌ، غُلْفٌ لام کے سکون کے ساتھ ہے اس کی جمع اغلف ہے یعنی ہمارے دلوں پر پردے ہیں۔ یہ اس قول کی مثل ہے: قلوبنا فی اکنۃ مبادعوننا الیہ۔ (ہمارے دل غلافوں میں (لپٹے ہوئے) ہیں اس بات سے جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں)۔ مجاہد نے کہا غلف یعنی ان پر پردہ ہے (2)۔ عکرمہ نے کہا: یعنی ان پر مہر لگی ہوئی ہے۔ اہل لغت نے حکایت کیا ہے: غلفت السیف، میں نے تلوار کے لئے غلاف بنایا۔ فقلبت اغلف یعنی ایسا دل جو فہم و تمیز سے پوشیدہ ہے۔ حضرت ابن عباس، اعرج اور ابن محبصن نے غُلْف لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس کا معنی ہے ہمارے دل علم سے بھرے ہوئے ہیں انہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی دوسرے کے علم کی ضرورت نہیں (3)۔ بعض نے فرمایا: یہ غلاف کی جمع ہے جیسے خمار، خمر۔ یعنی ہمارے دل علم کے برتن ہیں کیا وجہ ہے کہ تمہاری بات کو نہیں سمجھتے حالانکہ ہم نے بہت سا علم محفوظ کر رکھا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کا علم ان سے کیسے پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا: **بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ** (لیکن) (اپنی رحمت سے) دور کر دیا انہیں اللہ نے بوجہ ان کے کفر کے پس نہیں ایمان لائیں گے مگر تھوڑے سے) پھر اس کا سبب بیان فرمایا کہ وہ ایمان سے کیوں بھاگتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے جو انہوں نے کفر کیا اور جرأت کی اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے یہ گناہ پر بڑی سزا ہے۔ اللعن کی اصل دھتکارنا اور دور کرنا ہے بھیڑیے کو لعین کہا جاتا ہے دھتکارے ہوئے شخص کو لعین کہا جاتا ہے۔ الشماخ نے کہا:

ذَعَرْتُ بِهِ الْقَطَا وَ نَفَيْتُ عَنْهُ مَقَامَ الذَّنْبِ كَالرَّجُلِ اللَّعِينِ

اس شعر میں اصل کلام اس طرح تھی: مقام الذنب اللعین كالرجل۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اپنی توفیق اور اپنی ہدایت سے دور کر دیا۔ بعض نے فرمایا: ہر خیر سے دور کر دیا یہ عام ہے۔ **فَقَلِيلًا** مصدر محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: فایماناً قلیلاً یؤمنون (1)۔ معمر نے کہا: اس کا معنی ہے وہ اس میں سے تھوڑے پر ایمان لاتے ہیں جو ان کے ہاتھوں میں ہے اور اس میں سے اکثر کا انکار کرتے ہیں (2)۔ قلیلاً حرف الصفة کے نزاع کے ساتھ منصوب ہے، اور ماصلة ہے یعنی قلیلاً یؤمنون۔ واقدی نے کہا: اس کا معنی ہے نہ وہ تھوڑے پر ایمان لاتے ہیں نہ زیادہ پر جیسے تو کہتا ہے: ما اقل ما یفعل کذا یعنی اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ کسائی نے کہا: عرب کہتے ہیں: مردنا بارض قل ماتنبت الکرات والبصل یعنی ہم ایسی زمین سے گزرے جو کچھ نہیں اگاتی تھی۔

**وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ<sup>۱</sup> وَ كَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ**

**عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا<sup>۲</sup> فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِمْ<sup>۳</sup> فَلَعَنَهُ اللَّهُ عَلَى الْكَافِرِينَ<sup>۴</sup>**

”اور جب آئی ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب (قرآن) جو تصدیق کرتی تھی اس (کتاب) کی جو ان کے پاس تھی اور وہ اس سے پہلے فتح مانگتے تھے کافروں پر (اس نبی کے وسیلے سے)۔ تو جب تشریف فرما ہوا ان کے پاس وہ نبی جسے وہ جانتے تھے تو انکار کر دیا اس کے ماننے سے، سو پھٹکارا ہوا اللہ کی (دانستہ) کفر کرنے والوں پر۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَمَّا جَاءَهُمْ** یعنی یہود۔ (کتاب) یعنی قرآن۔ **مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ** یہ کتاب کی صفت ہے اور غیر قرآن میں اس کو حال کے اعتبار سے منصوب پڑھنا بھی جائز ہے جس طرح حضرت ابی کے مصحف میں نصب کے ساتھ ہے (3) **لِمَا مَعَهُمْ**۔ یعنی تورات، انجیل، یعنی قرآن انہیں بتاتا ہے جو انجیل اور تورات میں ہے **وَ كَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ** یعنی وہ مدد طلب کرتے ہیں الاستفتاح کا معنی مدد طلب ہے۔ استفتحت، میں نے مدد طلب کی۔

حدیث پاک میں ہے: نبی کریم ﷺ محتاج، کمزور، مہاجرین کے وسیلہ سے مدد طلب کرتے تھے یعنی ان کی دعاؤں اور نمازوں کے وسیلہ سے مدد طلب کرتے تھے (4)۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنَّ بِالْفَتْحِ** اَوْ اَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ (المائدہ: 52) (وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ (تمہیں) دے دے فتح کامل یا ظاہر کر دے کامیابی کی کوئی بات

اپنی طرف سے) النصر کا معنی بند چیز کو کھولنا ہے۔ یہ اس قول کی طرف لوٹتا ہے فتحت الباب میں نے دروازہ کو کھولا۔ نسائی نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس امت کی، ان کے ضعیف لوگوں کی دعا، نماز اور اخلاص کی وجہ سے مدد فرمائی۔ نسائی نے حضرت ابوالدرداء سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: میرے لئے کسی ضعیف کو طلب کرو کیونکہ تمہیں تمہارے ضعیفوں کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے اور مدد کی جاتی ہے (1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: خیبر کے یہود غطفان سے جنگ کرتے تھے جب مقابلہ ہوا تو یہود کو شکست ہوئی۔ یہود پھر اس دعا کے ساتھ لوٹے۔ یا یہ معنی ہے کہ اس دعا کی انہوں نے پناہ لی۔ انا نسالک بحق النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجه لنا فی آخر الزمان الاتصرونا علیہم۔ ہم تجھ سے اس امی نبی کے واسطے سے سوال کرتے ہیں جس کا تو نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے کہ تو ہمارے لئے اسے آخر زمانہ میں نکالے گا ان کے خلاف ہماری مدد فرما۔ حضرت ابن عباس نے کہا: جب مقابلہ ہوا تو انہوں نے یہ دعا مانگی تو انہوں نے غطفان کو شکست دے دی۔ جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو انہوں نے انکار کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا یعنی اے محمد! ﷺ تیرے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے۔ فَلَعَنَ اللَّهُ عَلَى الْكَافِرِينَ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَتَجَا۟ءَهُمْ، لَتَا کا جواب فاء اور اس کا مابعد ہے جو اس قول میں ہے فَلَتَجَا۟ءَهُمْ مَّا عَرَفُوا فراء کے قول کے مطابق (2) دوسرے لَتَا کا جواب کفروا ہے۔ انفس سعید نے کہا: لَتَا کا جواب محذوف ہے کیونکہ سامع کو معلوم ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے (3)۔ مبرد نے کہا لَتَا کا جواب کفروا ہے اور لَتَا کو دوبارہ ذکر کیا گیا۔ کلام کے طول کی وجہ سے یہ ذنب (گناہ) کی تقریر اور تاکید کے لئے مفید ہے۔

يُسْمَا۟ا شُرَکَآءَۤہٗٓ اَنۡفُسُہُمۡ اَنۡ يَّکْفُرُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ بَغۡیًا اَنۡ یُّنۡزَلَ اللّٰہُ مِنْ فَضۡلِہٖ عَلٰۤی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖۤ ؕ فَبَآءُ ذَٰلِکَۤ اِلٰی غَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ ۚ وَلِلۡکَافِرِیۡنَ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ۝۱۰

”بہت بری چیز ہے جس کے بدلے سودا چکایا انہوں نے اپنی جانوں کا وہ یہ کہ کفر کرتے ہیں اس (کتاب) کے ساتھ جو اللہ نے نازل کی، حسد کے مارے کہ نازل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنا فضل (وحی) جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں سے پس وہ حقدار ہو گئے مسلسل ناراضگی کے۔ اور کافروں کے لئے ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُسْمَا۟ا شُرَکَآءَۤہٗٓ۔ بنس عرب کلام میں مذمت کے لئے ہے جسے نعم مدح کے لئے ہے ان میں سے ہر ایک کی چار لغات ہیں: بَنَسَ بَنَسَ بَنَسَ، نَعَمَ نَعَمَ نَعَمَ نَعَمَ۔ سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ ما، بنس کا فاعل

1۔ صحیح بخاری، باب من استعان بالضعفاء والصالحین فی الحرب، حدیث نمبر 2681، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

سنن ابوداؤد، باب الاتصاار بہو ذل الخیل والصفعة، حدیث نمبر 2227، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا



ہے اور یہ اسمائے اجناس اور نکرات پر داخل ہوتا ہے اسی طرح نعم ہے تو کہتا ہے: نعم الرجل زید، نعم رجلاً زید جب اس کے ساتھ اسم بغیر الف، لام کے ہو تو اسے ہمیشہ نصب دی جاتی ہے جب اس پر الف لام ہو تو ہمیشہ مرفوع ہوتا ہے رجلاً پر نصب تمیز کی بنا پر ہے اور نعم میں ضمیر تفسیر کی شرط پر مضمّر ہے اور زید دو اعتبار سے مرفوع ہے۔ ایک مبتدا مخذوف کی خبر کے اعتبار سے گویا پوچھا گیا مدوح کون ہے تو تو نے کہا: وہ زید ہے۔ دوسری وجہ مبتدا کی حیثیت سے اور اس کا ماقبل خبر ہے۔ ابوعلی نے جائز قرار دیا ہے کہ اس کے ساتھ موصولہ اور غیر موصولہ ملا ہوا ہو اس حیثیت سے کہ وہ مبہم ہو جو کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ کسی ایک کو خاص نہیں کرتا۔ سیبویہ کے نزدیک تقدیر اس طرح ہے (1): بئس الشيء اشتدوا به انفسهم ان يكفروا۔ پس ان يكفروا محل رفع میں مبتدا ہوگا اور اس کا ماقبل خبر ہوگا جیسے تیرا قول ہے بئس الرجل زید اور اس قول کے مطابق موصولہ ہوگا۔ انفس نے کہا (2): ما تمیز کی بنا پر محل نصب میں ہے جیسے تیرا قول ہے: بئس رجلاً زید پس تقدیر عبارت اس طرح ہو گی: بئس شيئاً ان يكفروا۔ اشتدوا به انفسهم۔ اس قول کے مطابق ما کی صفت ہوگا۔

فراء نے کہا: (3) بئسما ایک شے ہے حبذا کی طرح مرکب کیا گیا ہے اس قول کے مطابق یہ معترضہ ہے۔ کیونکہ فعل بغیر فاعل کے رہ جائے گا۔ کسائی نے کہا: ما اور اشتدوا، ایک اسم کے قائم مقام ہے اور یہ قائم بنفسہ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: بئس اشتدوا هم ان يكفروا۔ یہ قول مردود ہے کیونکہ نعم اور بئس اسم معین معرف پر داخل نہیں ہوتے۔ شفاء ضمیر کی طرف مضاف ہونے کی وجہ سے معرفہ بن گیا ہے۔ نحاس نے کہا: ان اقوال میں سے واضح قول انفس اور سیبویہ کا قول ہے۔ فراء اور کسائی نے کہا: ان يكفروا اگر تو چاہے تو ان کو محل جزم میں کر دے بہ میں شفاء ضمیر کی طرف لوٹاتے ہوئے۔ فراء نے کہا: اس کا مطلب ہوگا اشتدوا انفسهم بان يكفروا ابسا انزل الله۔ فاشترى بمعنى باع اور بمعنى ابتاع ہے۔ مطلب یہ ہے: بئس الشيء الذي اختاروا لانفسهم حيث استبدلوا الباطل بالحق والكفر بالايان۔ (یعنی بری ہے وہ چیز جو انہوں نے اپنے نفسوں کے لئے اختیار کی اس نیثیت سے کہ انہوں نے حق کو باطل سے بدلا اور ایمان کو کفر سے بدلا)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَغْيًا اس کا معنی حسدا ہے یہ قتادہ اور سدی کا قول ہے (4)۔ یہ مفعول لاجلہ ہے۔ یہ حقیقت میں مصدر ہے، اصمعی نے کہا: یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے قد بغى الجرح، زخم خراب ہو گیا۔ بعض نے فرمایا: اس کا اصل معنی طلب کرنا ہے اسی وجہ سے زانیہ کو بغیا کہا جاتا ہے۔ اَنْ يُنْزِلَ اللّٰهُ يَهْلُ نَصْب میں ہے یعنی لان ينزل۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اپنے نبی ﷺ پر فضل نازل کرنے کی وجہ سے۔ ابن کثیر، ابو عمرو، یعقوب اور ابن محیسن نے ان یُنْزِلُ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح پورے قرآن میں تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے سوائے ماینزلہ جو سورہ الحجر میں ہے اور سوائے علی ان یُنْزِلُ آیۃ جو سورۃ الانعام میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَاغُوْهُ وَاُولٰٓئِكَ سَمِعُوا لَكُمْ يَوْمَ الْاُخْرٰى اَن تَقُوْلُوْا اِنَّا نَحْنُ غٰظِيُوْنَ اُولٰٓئِكَ سَمِعُوا لَكُمْ يَوْمَ الْاُخْرٰى اَن تَقُوْلُوْا اِنَّا نَحْنُ غٰظِيُوْنَ۔ اکثر یہ شری میں بولا جاتا ہے یہ پہلے گزر چکا ہے بِغْضٍ عَلٰی غَضَبٍ، غضب اللہ علیہم کا معنی گزر چکا ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: پہلا غضب ان کے بچھڑے کی

عبادت کرنے کی وجہ سے ہے اور دوسرا غضب حضرت محمد ﷺ کا انکار کرنے کی وجہ سے ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ حضرت عکرمہ نے کہا کیونکہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کفر کیا پھر حضرت محمد ﷺ کا انکار کیا یعنی یہود نے ایسا کیا۔ سعید نے قتادہ سے روایت کیا ہے، پہلا غضب ان کا انجیل کے انکار کی وجہ سے تھا، دوسرا قرآن کا انکار کرنے کی وجہ سے تھا۔ بعض نے فرمایا: مراد تائید ہے (1) اور اس حال کی شدت کے لئے دو غصیوں کا ذکر فرمایا نہ کہ دو معصیوں کی تعلیل کے لئے دو غصیوں کا ذکر فرمایا مہینن یہ الہوان سے ہے، یہ ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا منتہی ہے بخلاف مسلمان گنہگار کے خلود کے، کیونکہ مسلمانوں کا آگ میں جانا ان کی طہارت اور تمحیص کے لئے ہوگا جیسے زانی کو رجم کیا جاتا ہے، چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، اس کا بیان سورہ نساء میں حضرت ابوسعید خدری کی حدیث میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُوْمِنُ بِمَا أَنْزَلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا  
وَرَأَوْا هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ  
كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں: ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کیا گیا، ہم پر اور کفر کرتے ہیں اس کے علاوہ (دوسری کتابوں) کے ساتھ حالانکہ وہ بھی حق ہے تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے۔ آپ فرمائیے پھر تم کیوں قتل کرتے رہے اللہ کے پیغمبروں کو اس سے پہلے اگر تم (اپنی کتاب پر ہی) ایمان رکھتے تھے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْنُوا تصدیق کرو بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ یعنی قرآن قَالُوا نُوْمِنُ یعنی ہم تصدیق کرتے ہیں۔ بِمَا أَنْزَلَ عَلَيْنَا یعنی تورات۔ وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَأَوْا یعنی جو تورات کے علاوہ ہے، یہ فراء کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: (2) جو تورات کے بعد ہے۔ یہی قول ابو عبیدہ کا ہے، معنی ایک ہے۔ جو بری نے کہا: وراء بمعنی خلف (پیچھے) ہے کبھی یہ بمعنی قدام (آگے) ہوتا ہے۔ یہ (وراء) اضداد میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ (الکہف: 79) (یعنی آگے بادشاہ تھا) وراء کی تصغیر وریثہ ہے یعنی ہاء کے ساتھ یہ شاذ ہے۔ وراء پر نصب ظرف کی بنا پر ہے۔ انفس نے کہا: کہا جاتا ہے لقیتہ من وراء۔ غایت کی بنا پر اس کو رفع دیا جاتا ہے جب مضاف نہ ہو اسے اسم غیر متمکن بنائے گا، جیسے تیرا قول من قبل من بعد میں ہے۔

اذا انا لم اومن عليك و لم يكن لقاءك الا من وراء وراء

جب مجھے تجھ پر امن نہ ہو تو تیری ملاقات پردے کے پیچھے ہوگی۔

میں کہتا ہوں: حدیث حضرت عائشہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے: انما کنت خلیلاً من وراء وراء۔ میں پردے کے پیچھے خلیل تھا۔

الوداء، پوتے کو بھی کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَهُوَ الْحَقُّ** یہ مبتدا خبر ہیں۔ **مُصَدِّقًا** سیبویہ کے نزدیک حال مؤکدہ ہے **لِمَا مَعَهُمْ**، مآکل جرمیں ہے لام کی وجہ سے اور **مَعَهُمْ**، ما کا صلہ ہے اور **مَعَهُمْ** کو نصب ظرف مستقر کی بنا پر ہے اور جنہوں نے اس کو ساکن کیا ہے انہوں نے اس کو حرف بنایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ** یہ یہود کا رد ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ ایمان لاتے ہیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ اس سے ان کی تکذیب ہے اور انہیں تو بخ ہے۔ معنی یہ ہے کہ تو نے کیسے قتل کیا حالانکہ تمہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ یہ خطاب ان لوگوں کو ہے جو حضرت محمد ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے۔ اور مراد ان کے اسلاف ہیں۔ خطاب ان کے بیٹوں کی طرف متوجہ ہے کیونکہ یہ ان کے پیروکار تھے جنہوں نے قتل کیا تھا جیسے ارشاد فرمایا: **وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوا آلِهَةً** (المائدہ: 91) (اور اگر وہ ایمان لائے ہوتے اللہ پر اور نبی پر اور جو اتارا گیا اس پر تو نہ بناتے ان کو اپنا دوست)

جب یہ بھی ان کے پیچھے چلے تو یہ ان کے قائم مقام ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ یہ ان کے فعل پر راضی اور خوش تھے اس لئے یہ فعل ان کی طرف منسوب کیا گیا۔ **تَقْتُلُونَ** فعل مضارع ہے لیکن مراد ماضی ہے کیونکہ **مِنْ قَبْلُ** کے قول سے اشکال اٹھ گیا۔ جب کوئی اشکال نہ ہو تو ماضی کا مستقل کے معنی اور مستقبل کا ماضی کے معنی میں لانا جائز ہے۔ الحطیئة نے کہا: (1)

شهد الحطیئة يوم يلقى ربه ان الوليد احق بالعدر

اس شعر میں شہد بمعنی یشہد ہے۔

**إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ** اگر تم ایمان کا اعتقاد رکھتے ہو تو پھر انبیاء کے قتل پر کیوں راضی ہو۔ بعض علماء نے فرمایا **إِنْ** بمعنی ما ہے اور لم کی اصل لسا ہے الف کو حذف کیا گیا استفہام اور خبر میں فرق کرنے کے لئے، اس پر وقف مناسب نہیں، کیونکہ اگر اس پر بغیر ہاء کے وقف کیا جائے گا تو غلطی ہوگی اور اگر اس پر ہاء کے ساتھ وقف کیا جائے گا تو تاریکی میں اضافہ ہوگا۔

**وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَى بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ أَنْتُمْ ظَالِمُونَ** ①

”اور بے شک آئے تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام روشن دلیلیں لے کر، پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو (اپنا معبود)

اس کے بعد اور تم جفا کار ہو۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَى بِالْبَيِّنَاتِ** اس میں لام، لام قسم ہے اور البینات سے مراد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ** (الاسراء: 101) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو واضح نشانیاں عطا فرمائیں۔ یہ تھیں: عصا، سخت قحط سالی، ید بیضا، خون، طوفان، بکری، جوئیں، مینڈک اور دریا کا پھٹنا۔

بعض نے فرمایا البینات سے مراد تورات اور اس میں موجود دلالت ہیں۔



اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لَمَّا اتَّخَذْتُمُ الْعَجَلَ اس میں تو بخ ہے، اور لَمَّا تَقَرَّج میں واو سے زیادہ بلند ہے یعنی آیات میں غور و فکر کے بعد اور ان کے آنے کے بعد تم نے پھڑے کو معبود بنایا۔** یہ آیت دلیل ہے کہ انہوں نے آیات میں غور و فکر کی مہلت کے بعد یہ جرم کیا اور یہ ان کا بہت بڑا جرم تھا۔ (1)

**وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا**  
**قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَ مَا يُمِرُّكُمْ بِهِ**  
**إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝**

”اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا اور بلند کیا تمہارے سروں پر کوہ طور (اور تمہیں حکم دیا) کہ پکڑ لو جو ہم نے تمہیں دیا مضبوطی سے اور (خوب غور سے) سنو۔ انہوں نے (زبان سے) کہا: ہم نے سن لیا اور (دل میں) کہا: نہیں مانا۔ سیراب ہو چکے تھے ان کے دل پھڑے (کے عشق) سے، یہ ان کے انکار کی غوست تھی۔ فرمائیے: بہت برا ہے جس کا حکم کرتا ہے تمہیں (یہ) تمہارا (عجیب و غریب) ایمان اگر تم ایمان دار ہو۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا** اس پر کلام گزر چکی ہے۔ **اسْمَعُوا** کا معنی ہے: اطاعت کرو اس سے مراد صرف قول کا ادراک نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ جو تم نے سنا اس پر عمل کرو اور اسے لازم پکڑو۔ اسی سے ہے **سَمِعَ اللَّهُ لَكُمْ حَمْدَهُ** یعنی قبول فرمایا۔

شاعر نے کہا: (2)

دعوت الله حتى خفت الا يكون الله يسمع ما اقول

میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی حتیٰ کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ قبول نہ فرمادے جو میں کہتا ہوں۔  
 الراجز نے کہا:

والسمع والطاعة والتسليم خير و اعفى لى تسم

قبول کرنا، اطاعت کرنا، تسلیم کرنا بنی تمیم کے لئے بہتر و مناسب ہے اور گناہوں کی معافی کا باعث ہے۔

**قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا** اس میں اختلاف ہے کہ ان سے یہ الفاظ حقیقتہً زبان سے ادا ہوئے تھے یا انہوں نے ایسا فعل کیا تھا جو ان کو اس کے قول کے قائم مقام تھا۔ اس صورت میں یہ مجاز ہوگا۔ جیسے شاعر نے کہا:

امتلاً الحوض وقال قطنى مهلاً رويداً قد ملأت بطنى (3)

حوض بھر گیا اور اس نے مجھے کہا: ٹھہر جاؤ میرا پیٹ تو نے بھر دیا ہے۔

انہوں نے جو کہا تھا تو میں بے انزل علیہ اس قول میں ان پر احتجاج (حجت) ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَأَشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعَجَلَ** یعنی بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں راسخ ہوگئی۔ معنی یہ ہے کہ ان کے دلوں نے اس کی محبت کو پینا شروع کیا۔ یہ تشبیہ اور مجاز ہے مراد یہ ہے کہ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت راسخ ہوگئی۔ (1)

حدیث میں ہے تعرض الفتن علی القلوب کالحصیر عوداً عوداً فأتی قلبی اشربها نکت فیہ نکتۃ سوداء۔ (دلوں پر فتنے ڈالے جائیں گے چٹائی کی طرح بار بار، جو دل ان کو پیئے گا اس میں سیاہ نکتہ پیدا ہو جائے گا) اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے، کہا جاتا ہے: **أشرب قلبہ حب کذا**۔ اس کی محبت اس کے دل میں راسخ ہوگئی۔ زہیر نے کہا:

فصحوت عنها بعد حب داخل والحب تشربة فؤادک داع (2)

میں نے اس کی محبت کے دل میں داخل ہونے کے بعد صحت پائی، محبت دل کے لئے بیماری ہے۔

بچھڑے کی محبت کو شرب سے تعبیر فرمایا کھانے سے تعبیر نہیں فرمایا کیونکہ پانی کا پینا اعضاء میں جلدی چلا جاتا ہے حتیٰ کہ پیٹ تک پہنچ جاتا ہے جبکہ کھانا اتنا جلدی اعضا میں نہیں پہنچتا۔ اس معنی پر ایک تابعی نے زیادتی کی ہے اس نے اپنی بیوی عثمہ سے کہا: وہ کسی معاملہ میں اس پر ناراض ہو تو اسے طلاق دے دی حالانکہ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

عثمہ کی محبت میرے دل میں اتر گئی اور جنگل میں خوف زدہ کے ساتھ چلتی ہے۔

وہ محبت وہاں تک سرایت کر گئی ہے جہاں تک نہ کوئی پینا پہنچتا ہے نہ کوئی غم اور نہ کوئی خوشی پہنچتی ہے۔ جب میں اس سے کیا ہوا عہد یاد کرتا ہوں تو میں اڑنے کے قریب پہنچ جاتا ہوں کاش! انسان اڑ سکتا ہوتا۔

سدی اور ابن جریج نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو توڑا اور اسے پانی میں بکھیر دیا۔ آپ نے بنی اسرائیل سے فرمایا: اس پانی سے پیو، وہ سب نے پیا۔ جو اس بچھڑے سے محبت کرتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر سونے کا برادہ نکلا (3)، اور روایت ہے کہ کسی نے وہ پانی نہ پیا تھا مگر وہ مجنون ہو گیا تھا (4)۔ یہ قشیری نے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: دریا میں اس کا بکھیرنا، اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد دلالت کرتا ہے: **ثُمَّ لَنُنَافِقُنَّ فِي الْحَيَمِ نَسْفًا** (طہ)

(پھر ہم بکھیر کر بہا دیں گے اس سمندر میں اس (کی راکھ) کو)۔ اور رہا پانی کا پینا اور ہونٹوں پر سونے کے برادہ کا ظہور، اس کو اللہ تعالیٰ کا قول رد کرتا ہے: **وَأَشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعَجَلَ**۔ سیراب ہو چکے تھے ان کے دل بچھڑے (کے عشق) سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ** یعنی تمہارا وہ ایمان جو تم اپنے زعم سے کہتے ہو **ثُمَّ لَنُنَافِقُنَّ فِي الْحَيَمِ نَسْفًا** بعض نے فرمایا: یہ کلام نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے۔ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ یہود کو تو بیخ کر دے یعنی اے محمد! ﷺ آپ انہیں فرمائیں کہ بری ہیں تمہاری یہ اشیاء جو تم نے کیں اور جن کا تمہارے ایمان نے تمہیں حکم دیا (5)۔ **بِئْسَمَا** پر کلام پہلے گزر چکا ہے۔

**قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ فَتَسَبَّحُوا لَهُ**

إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَلَنْ يَتِمَّنَا أَبَدًا بِمَا قَدَّمْتُمْ إِلَيْنَا وَلِلَّهِ عَالِمُ

بِالظَّالِمِينَ ۝

”آپ فرمائیے: اگر تمہارے لئے ہی دار آخرت (کی راتیں) اللہ کے ہاں مخصوص ہیں تمام لوگوں کو چھوڑ کر تو بھلا آرزو تو کرو موت کی اگر تم سچ کہتے ہو اور وہ ہرگز کبھی بھی اس کی تمنا نہ کریں گے اپنی کارستانیوں کے خوف سے اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔“

جب یہود نے باطل دعوے کیے تو اللہ تعالیٰ نے ان دعوؤں کو اپنی کتاب میں ان کی طرف سے بیان فرمایا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَنْ تَسْنَأَ النَّاسُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً (البقرہ: 80) اور انہوں نے کہا: ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں دوزخ کی آگ بجز گنتی کے چند دن۔ وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرًا (البقرہ: 111) اور انہوں نے کہا: ہرگز داخل نہ ہوں گے جنت میں مگر جو یہودی یا نصرانی ہوں گے) اور انہوں نے کہا: نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (المائدہ: 18) (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں)

اللہ تعالیٰ نے انہیں جھوٹا ثابت کیا اور اس پر حجت لازم فرمائی۔ اور فرمایا: اے پیارے محمد! صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم انہیں کہو۔ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ۔ دار آخرت سے مراد جنت ہے یعنی اگر تمہارے لئے جنت ہے فَتَسْتَوُوا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ تو موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اقوال میں سچے ہو۔ کیونکہ جس کا یہ اعتقاد ہو کہ وہ جنتی ہے تو اس کے نزدیک دنیوی زندگی سے موت محبوب ہوتی ہے کیونکہ اسے وہاں جنت کی نعمتیں ملیں گی اور اس سے دنیا کی تکالیف ختم ہو جائیں گی۔ پس وہ اپنے اعمال کی قباحت اور نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (المائدہ: 18) کے قول کی وجہ سے اپنے کفر کی معرفت کی وجہ سے اور دنیا پر حرص کی وجہ سے موت کی تمنا کرنے سے رک گئے (1)۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے اپنے سچے قول کے ساتھ خبر دی وَلَنْ يَتِمَّنَا أَبَدًا بِمَا قَدَّمْتُمْ إِلَيْنَا وَلِلَّهِ عَالِمُ بِالظَّالِمِينَ ۝ یہ ان کے جھوٹ کی تحقیق کے طور پر فرمایا اگر وہ تمنا کرتے تو مر جاتے اور اپنا ٹھکانا دوزخ میں دیکھ لیتے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے انہیں تمنا کے اظہار سے پھیر دیا اور اس سے روک دیا تاکہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے لئے معجزہ بن جائے۔ یہ تین وجوہ تھیں ان کے تمنا کو ترک کرنے کی۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے فَتَسْتَوُوا الْمَوْتَ کے تحت روایت کیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہم میں سے اور تم میں سے ایک فریق کے جھوٹا ہونے پر موت کی دعا تو کرو (2)۔ تو انہوں نے دعا نہ کی کیونکہ انہیں اپنے جھوٹا ہونے کا علم تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: تمنا کبھی زبان سے ہوتی ہے اور کبھی دل سے ہوتی ہے پھر یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ انہوں نے دل سے تمنا نہیں کی تھی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے متعلق قرآن نے کہہ دیا وَلَنْ يَتِمَّنَا أَبَدًا وہ ہرگز تمنا نہیں کریں گے۔ اگر وہ دلوں کے ساتھ تمنا کرتے تو اسے اپنی زبانوں سے ظاہر کرتے تاکہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی بات کو رد کر دیں اور آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی حجت کو باطل کر دیں۔ یہ بالکل واضح ہے۔



اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَالِصَةً۔ اس کی نصب کان کی خبر کی بنا پر ہے۔ اگر تو چاہے تو اسے حال بنا دے۔ اور عِنْدَ اللہ خبر ہو۔ اَبَدًا نظر زمان ہے قلیل اور کثیر پر واقع ہوتا ہے جیسے صین اور وقت قلیل اور کثیر کے لئے استعمال ہوتے ہیں، عمر کی ابتدا سے موت تک کی مدت یہاں مراد ہے۔ یہاں میں مابعدی الذی ہے اور عائد محذوف ہے۔ تقدیر عبارت ہے: قدمتہ، اور مابعدی یہ ہو تو عائد کی ضرورت نہیں ہے اَیْذِیْہُمْ محل رفع میں ہے یا سے ضمہ حذف کیا گیا ہے کسرہ کے ساتھ اس کے ثقل کی وجہ سے۔ اگر یہ محل نصب میں ہو تو تو اسے نصب دے گا کیونکہ نصب خفیف ہے اور شعر میں ساکن کرنا بھی جائز ہے۔ وَاللّٰہُ عَلَیْہِمْ بِالْظَلَمِیْنِ یہ مبتدا خبر ہیں۔

وَلْتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَیْوَتِهِۦٓ وَمِنَ الَّذِیْنَ أَشْرَكُوا۟ یُوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ یُعْزَرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحَّزِحٍ مِّنَ الْعَذَابِۖ إِنَّ یُعْزَرُ وَاللّٰہُ بِصِیْرٍۭ یَّہْمِلُونَ ﴿۱۱﴾

”اور آپ یقیناً پائیں گے انہیں سب لوگوں سے زیادہ ہوس رکھنے والے زندگی کی۔ حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی (زیادہ جینے پر حریص ہیں) چاہتا ہے ہر ایک ان میں سے کہ زندہ رہنے دیا جائے ہزار سال اور نہیں بچا سکتا اس کو عذاب سے (اتنی مدت) جیتے رہنا اور اللہ ہر وقت دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلْتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَیْوَتِهِۦٓ یعنی یہود زندگی پر لوگوں سے زیادہ حریص ہیں۔ وَمِنَ الَّذِیْنَ أَشْرَكُوا۟ بعض علماء نے فرمایا وَمِنَ الَّذِیْنَ أَشْرَكُوا۟ سے پہلے احرص محذوف ہے کیونکہ انہیں اپنے کرتوتوں کی معرفت تھی۔ اور انہیں معلوم تھا کہ اللہ کی بارگاہ میں ان کے لئے کوئی خیر نہیں ہے اور مشرکین عرب صرف دنیوی زندگی کو جانتے تھے، آخرت کے متعلق انہیں کوئی علم نہ تھا۔ آپ نے ان کے شاعر کا قول ملاحظہ نہیں کیا:

تستم من الدنيا فانك فان من النشوات والنساء الحسان

تو نشہ اور حسین عورتوں سے لطف اندوز ہولے کیونکہ تو فنا ہونے والا ہے۔

أَحَدُهُمْ میں ضمیر اس قول کے مطابق یہود کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض نے فرمایا: حَیْوَتِهِۦٓ پر کلام مکمل ہے، پھر مشرکین کے گروہ کے متعلق نئے سرے سے خبر دی جا رہی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مجوسی ہیں (1) اور چھینک مارنے والے کو اپنی زبان میں دعایتے تھے جس کا معنی ہے: تو ہزار سال زندہ رہ۔ ہزار کا ذکر خصوصی طور پر فرمایا کیونکہ یہ حساب میں عقد کی انتہا ہے (2)۔ حسن کا نظریہ یہ ہے کہ الَّذِیْنَ أَشْرَكُوا۟ سے مراد مشرکین عرب ہیں ان کو خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ۱۱ دوبارہ اٹھنے پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ وہ عمر کے لمبا ہونے کی تمنا کرتے تھے (3)۔ سنۃ کی اصل سنۃ ہے بعض نے فرمایا سنۃ ہے۔ بعض نے فرمایا اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے معنی یہ ہے ولتجدنہم و طائفة من الذین اشركوا احرص الناس من حیاة۔ (تم انہیں اور مشرکین کے ایک طائفہ کو پاؤ گے زندگی پر سب لوگوں سے زیادہ حریص)

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ الحمد للہ چیز زیر آیت ہذا

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يَوْمَ أَحْدَثُ لَهُمْ يُوعِظُوا أَلْفَ سَنَةٍ**، یوڈ اصل میں یوڈ د تھا، دال کو دال میں ادغام کیا گیا تا کہ ایک جنس کے دو متحرک حرف جمع نہ ہو جائیں دال کی حرکت وا کو دی گئی تا کہ یہ دلالت کرے کہ ایسا کیا گیا ہے۔ کسائی نے حکایت کیا ہے **وَدَدْتُ**، اس صورت میں یوڈ، واو کے کسرہ کے ساتھ بھی جائز ہے یوڈ کا معنی تمنا کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَا هُوَ بِمُزَحِّجٍ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَذَّبَ نَحْوِيں کا هُوَ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ احد جو پہلے گزر چکا اس کے لئے ضمیر ہے۔ تقدیر یوں ہوگی: ما احد هم بمزححه۔ اور مبتدا کی خبر مجرور ہے۔ اَنْ يُعَذَّبَ، بمزححه کا فاعل ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: تعمیر کے لئے ضمیر ہے، تقدیر یوں ہوگی وما التعيد بمزححه۔ اور خبر مجرور ہے اَنْ يُعَذَّبَ، اس قول کے مطابق تعمیر کا بدل ہے۔ طبری نے ایک فرقہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا هو عماد ہے (1)، (اسی کو فصل بھی کہتے ہیں)**

میں کہتا ہوں: اس قول میں بعد ہے کیونکہ عماد وہ ہوتی ہے جو دو متلازم چیزوں کے درمیان آجائے۔ مثلاً ان کان هذا هو الحق اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ولكن كانوا هم الظالمين** (پہلی آیت میں کان کے اسم اور خبر کے درمیان ہے اور اسی سرح دوسری مثال میں بھی ہے) بعض علماء نے فرمایا: ما عاملہ حجازیہ ہے، اور هو اس کا اسم ہے اور خبر بمزححه ہے، ایک طائفہ نے کہا: هو ضمیر شان ہے۔ ابن عطیہ نے کہا (2): اس میں بعد ہے کیونکہ نحو یوں سے محفوظ قول یہ ہے کہ ضمیر شان وہ ہوتی ہے جس کی تفسیر ایسے جملہ کے ساتھ کی جاتی ہے جو حرف جر سے سلامت ہو۔ (بمزححه)، الزحرحۃ کا مطلب ہے دور کرنا۔ کہا جاتا ہے: زحرحته میں نے اسے دور کیا۔ فتزخرح، یعنی وہ دور ہوا، اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے متعدی استعمال کیا ہے۔

يا قابض الروح من نفس اذا احتضرت  
وغافر الذنب زحزحني عن النار  
اے نفس سے روح قبض کرنے والے! جب وہ قریب المرگ ہو جائے۔ اے گناہوں کو معاف کرنے والے! مجھے آگ سے بچالے۔

ذوالرمہ نے کہا:

يا قابض الروح عن جسم عمى زمنا  
وغافر الذنب زحزحني عن النار  
اے جسم سے روح قبض کرنے والے! جس نے ایک زمانہ نافرمانی کی۔ اے گناہوں کو بخشنے والے! مجھے آگ سے بچا۔ ایک اور شاعر نے لازم معنی میں استعمال کیا ہے:

خليل ما بال الدجى لا يتوضح  
وما بال ضوء الصبح لا يتوضح

اے میرے دوستو! اس تاریکی کو کیا ہے یہ تو دور ہی نہیں ہوتی اور صبح کی روشنی کو کیا ہے واضح نہیں ہوتی۔

نسائی نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ

کے راستہ میں ایک دن روزہ رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کو آگ سے ستر سال دور کر دے گا ☆۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ** یعنی یہ جو ہزار سال زندہ رہنے کی تمنا کرنے والے ہیں ان کے اعمال کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ جن قراء نے تعلمون تا کے ساتھ پڑھا ہے (1) ان کے نزدیک تقدیر اس طرح ہے: قل لہم یا مد اللہ بصیرٌ بما تعملون۔ اے پیارے محمد! تم انہیں فرماؤ کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بصیر فرمایا۔ اس کا یہ معنی ہے کہ وہ خفیہ امور کو جاننے والا ہے اور البصیر عرب کلام میں اسے کہتے ہیں جو کسی چیز کو جاننے والا ہو اس کے متعلق باخبر ہو۔ عربوں کا قول ہے: فلان بصیر بالطب و بصیر بالفقہ و بصیر بملاقات الرجال، فلاں طب کو جاننے والا ہے فلاں فقہ کو جاننے والا ہے، مردوں سے ملاقات کو جاننے والا ہے۔

شاعر نے کہا:

فان تسألون بالنساء فانی بصیر بادواء النساء طیب

اگر تم مجھ سے عورتوں کے متعلق پوچھو گے تو میں عورتوں کے امراض کو جاننے والا اور طیب ہوں۔

خطابی نے کہا البصیر کا معنی عالم ہے۔ البصیر کا معنی دیکھنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بصیر ذکر فرمایا اس کا مطلب ہے: دیکھی جانے والی اشیاء بنانے والا ہے۔ یعنی ان اشیاء کا ادراک کیا جاتا ہے آنکھوں کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے جو ادراک کرنے والا آلہ اور قوت پیدا فرمائی ہے اس کے ساتھ ان کا ادراک کیا جاتا ہے **وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ** (آل عمران) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھنے والا بنانے والا ہے۔

**قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجَبْرِیْلِ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَدِئَ یَدِیْهِ وَ**

**هُدًی وَبُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ** ⑤

”آپ فرمائیے جو دشمن ہو جبریل علیہ السلام کا (اے معلوم ہونا چاہئے) کہ اس نے اتارا قرآن آپ کے دل پر۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے (یہ) تصدیق کرنے والا ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے اتریں اور سراپا ہدایت اور خوشخبری ہے ایمان والوں کے لئے۔“

اس آیت کے نزول کا سبب یہ کہ یہود نے نبی کریم ﷺ سے کہا: کوئی نبی نہیں آیا مگر اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ایک فرشتہ وحی اور رسالت کے ساتھ آیا، تمہارا ساتھی (فرشتہ) کون ہے تاکہ ہم آپ کی اتباع کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جبریل، انہوں نے کہا: وہ تو جنگ و جدل کو لاتا ہے۔ وہ ہمارا دشمن ہے، اگر آپ میکائیل کا نام لیتے جو بارش اور رحمت لاتا ہے تو ہم آپ کی اتباع کرتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے **لِّلْكَافِرِیْنَ** ⑥ تک یہ آیت نازل فرمائی۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ**، انہ میں ضمیر دو معانی کا احتمال رکھتی ہے پہلا معنی یہ کہ فان اللہ نزل۔ یعنی اللہ

2۔ صحیح بخاری، باب من کان عدو الجبریل، حدیث نمبر 4120، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا



تعالیٰ نے جبریل کو آپ کے دل پر اتارا۔ دوسرا معنی یہ کہ فان جبیل۔ یعنی جبریل نے قرآن کو آپ کے دل پر اتارا۔ قلب کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا کیونکہ یہ عقل، علم اور معرف کے حصول کی جگہ ہے۔ یہ آیت جبریل کے شرف اور اس کے دشمنوں کی مذمت پر دلالت کرتی ہے۔ (1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِإِذْنِ اللَّهِ یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کے علم سے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اس سے مراد تورات ہے۔ وَهَدَىٰ وَبُشِّرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَلَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ①

”جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل علیہ السلام و میکائیل علیہ السلام کا تو اللہ بھی دشمن ہے (ان) کافروں کا۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ہے۔ یہ جبریل کے دشمنوں کے لیے وعید اور مذمت ہے اور یہ اعلان ہے کہ بعض کی عداوت اللہ تعالیٰ کی عداوت کا تقاضا کرتی ہے اور بندے کا اللہ تعالیٰ سے عداوت رکھنا معصیت ہے، اس کی اطاعت سے اجتناب ہے اور اس کے اولیاء سے دشمنی ہے اور اللہ تعالیٰ کا بندے کے لئے دشمنی رکھنا، اسے عذاب دینا، اور اس پر عداوت کے اثر کا اظہار کرنا ہے (2)۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل اور حضرت میکائیل کا خصوصی ذکر کیوں فرمایا اگرچہ ملائکہ کا ذکر ان کو بھی شامل تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے شرف کی وجہ سے خصوصی ذکر فرمایا۔ جیسا کہ فرمایا: فِيهِمَا قَاكِمَةٌ وَنَحْلٌ وَرُمَّانٌ ② (الرحمن) قَاكِمَةٌ (پھل) میں نَحْلٌ (کھجور) اور رُمَّانٌ (انار) کا ذکر تھا لیکن ان کے شرف کے لئے علیحدہ ذکر فرمادیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا خصوصی ذکر کیا کیونکہ یہود نے ان کا ذکر کیا تھا، آیت کا نزول ان کے سبب سے تھا پس ان کا ذکر واجب تھا تا کہ یہود یہ نہ کہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ اور تمام فرشتوں سے عداوت نہیں کی۔ پس اللہ تعالیٰ نے تخصیص کے ذریعے ان کی تاویل کو باطل کرنے کے لئے نص قائم فرمادی، علماء لغت نے جبریل اور میکائیل میں کئی لغات بیان کی ہیں۔ جبریل میں دس لغات ہیں:

- ۱۔ جبریل یہ اہل حجاز کی لغت ہے۔ حضرت حسان نے کہا: وجبیل رسول اللہ فینا (جبریل ہم میں اللہ کے رسول ہیں)۔
- ۲۔ جبیل۔ (جیم کے فتح کے ساتھ) یہ حسن اور ابن کثیر کی قراءت ہے، ابن کثیر سے مروی ہے کہ اس نے کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا آپ جبریل اور میکائیل پڑھ رہے تھے میں ہمیشہ ان کو ایسا ہی پڑھوں گا۔
- ۳۔ جبڑیل (ہمزہ کے بعد یاء کے ساتھ جیسے جبریل) جیسا کہ اہل کوفہ نے پڑھا ہے (3) انہوں نے دلیل کے طور پر یہ شعر پڑھا ہے:

شهدنا فما تلقى لنا من كتيبة مدعى الدهر الا جبڑیل امامہا

(ہم نے دیکھا پس ہمیں ایک زمانہ کوئی لشکر نہ ملا مگر جبریل اس کے آگے تھا) یہ تمیم اور قیس کی لغت ہے۔

۴- جبریل (علی وزن جبرعل) مقصور ہے یہ ابو بکر عن عاصم کی قراءت ہے۔ (1)

۵- اس کی مثل ہے مگر لام پر شد ہے یہ یحییٰ بن یعمر کی قراءت ہے۔ (2)

۶- جبرائل (را کے بعد الف پھر ہمزہ) اس طرح عکرمہ نے پڑھا ہے۔

۷- اس کی مثل ہے لیکن ہمزہ کے بعد یا ہے۔

۸- جبزیل (ہمزہ کے بعد دو یا کے ساتھ) اس طرح اعش اور یحییٰ بن یعمر نے پڑھا ہے۔ (3)

۹- جبزیلین۔ (جیم مفتوحہ، ہمزہ مکسورہ اور اس کے بعد یا اور نون کے ساتھ)

۱۰- جبرین (جیم کے کسرہ، یا کی تسکین اور بغیر ہمزہ کے نون کے ساتھ) یہ بنی اسد کی لغت ہے (4)۔ طبری نے کہا: اس طرح

نہیں پڑھا گیا۔ نحاس نے کہا اور اس نے ابن کثیر کی قراءت ذکر کی ہے..... کلام عرب میں فعلیل معروف نہیں ہے۔

فعلیل ہے۔ جیسے دلیز، قطمیر، برطیل وغیرہ۔ یہ انکار نہیں کیا جاتا کہ جو عجی کلام میں ہو اس کی عرب کلام میں مثال نہیں اور نہ یہ

انکار ہے کہ اس میں تغیر کثیر ہے جیسے عرب کہتے ہیں: ابراہیم، ابرہم، ابراہم و ابراہام۔ بعض علماء نے کہا: جبریل عجی اسم

ہے عربوں نے اسے عربی بنایا اسی وجہ سے اس میں کئی لغات ہیں اور اسی وجہ سے یہ منصرف نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: کتاب کے آغاز میں گزر چکا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ الفاظ عربی ہیں ان کو جبریل واضح عربی زبان میں لے کر

آئے ہیں۔ نحاس نے کہا: جبریل کی جمع مکسر جباریل بنائی جاتی ہے اور میکائیل میں چھ لغات ہیں:

۱- میکائیل۔ یہ نافع کی قراءت ہے۔ میکائیل (ہمزہ کے بعد یا کے ساتھ) یہ حمزہ کی قراءت ہے۔ میکال۔ یہ اہل حجاز کی

لغت ہے اور ابو عمرو و حفص عن عاصم کی قراءت ہے۔

ابن کثیر سے تین وجوہ مروی ہیں۔ کعب بن مالک نے کہا:

و یوم بدر لقینا کم لنا مدد فیه مع النصر میکال و جبریل

جنگ بدر میں ہمارا تم سے مقابلہ ہوا تو ہمارے لئے مدد تھی اور اس مدد میں میکائیل و جبریل تھے۔

ایک اور شاعر نے کہا: (5)

عبدوا الصلیب و کذبوا بسحدا و بجبریل و کذبوا میکالا

انہوں نے صلیب کی عبادت کی اور محمد ﷺ کو جھٹلایا اور جبریل و میکائیل کو جھٹلایا۔

۴- میکئیل جسے میکعیل یہ ابن محیسن کی قراءت ہے۔

۵- میکایل (دو یا) یہ اعش کی قراءت ہے۔ (ان سے اختلاف کے ساتھ)

۶- میکاؤل۔ جیسے کہا جاتا ہے اسراؤل (ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ) یہ عجی اسم ہے اسی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ حضرت ابن

عباس نے ذکر کیا ہے کہ جبر، میکا اور اسراف یہ تمام عجی الفاظ ہیں۔ ان کا معنی عبد، غلام ہے اور ایل اللہ تعالیٰ کا اسم ہے (1)۔ اسی سے حضرت ابو بکر صدیق کا قول ہے جب انہوں نے مسئلہ کذاب کی جمع سنی۔ یہ ایسی کلام ہے جو ایل سے نہیں ہے یعنی اللہ کی طرف سے نہیں ہے (2)۔ قرآن حکیم میں ہے: لَا يَرْجُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلَّا ذَلَالًا وَمَنًّا (توبہ: 10) ایک تاویل کے مطابق اس آیت میں اِلَّا سے مراد اللہ ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

ماوردی نے کہا: جبریل اور میکائیل دو اسم ہیں ایک کا معنی عبد اللہ اور دوسرے کا معنی عبید اللہ ہے کیونکہ اہل سے مراد اللہ تعالیٰ ہے جبر کا معنی عبد ہے اور میکا کا معنی عبید ہے، گویا جبریل کا معنی عبد اللہ اور میکائیل کا معنی عبید اللہ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے مفسرین میں اس کی مخالفت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: بعض مفسرین نے یہ زیادہ کیا ہے: اسرافیل عبد الرحمن (3)۔ نحاس نے کہا: جس نے حدیث کی تاویل کی کہ جبر سے مراد عبد اور ایل سے مراد اللہ ہے تو انہیں یہ کہنا واجب ہے: هذا جبریل، رایت جبریل، مردت بجبریل اور یہ نہیں کہا جاتا۔ تو ثابت ہوا کہ حدیث کا مطلب ہے یہ ممکن ہے۔ دوسرے علماء نے فرمایا: اگر اس طرح ہوتا جس طرح انہوں نے کہا ہے تو یہ منصرف ہوتا۔ اس کا منصرف نہ ہونا دلیل ہے کہ یہ اسم واحد، مفرد ہے، مضاف نہیں ہے۔ عبد الغنی الحافظ نے، افلت بن خلیفہ..... وہ فلیت العامری ہے جو ابو احسان ہے..... عن جسرہ بنت دجاجہ عن عائشہ بنتیہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے دعا کی: اللھم رب جبریل و میکائیل و اسرافیل اعوذ بک من حر النار و عذاب القبر۔ اے اللہ! جبریل، میکائیل اور اسرافیل کے رب میں تجھ سے آگ کی گرمی اور عذاب قبر سے پناہ مانگتا ہوں۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ۝

”اور یقیناً ہم نے اتارے ہیں آپ پر روشن نشان اور کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ان کا بجز نافرمانوں کے“۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ ابن صوریہ کا جواب ہے جب اس نے رسول اللہ ﷺ سے کہا آپ کوئی ایسی چیز نہیں لائے جس کو ہم پہچانتے ہوں۔ آپ پر کوئی واضح آیت نہیں اتری کہ ہم آپ کی اتباع کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی۔ یہ طبری نے ذکر کیا ہے۔ (4)

أَوْ كَلَّمَا عَهْدًا وَعَهْدًا تَبَيَّنَ مِنْهُمْ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

”کیا (یوں نہیں) کہ جب کبھی انہوں نے وعدہ کیا تو پھر توڑ پھینکا اسے انہیں میں سے ایک گروہ نے۔ بلکہ ان کی اکثریت تو (سرے سے) ایمان ہی نہیں لائی“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَوْ كَلَّمَا عَهْدًا وَعَهْدًا يٰهَا وَاَوْعَظُفَ كَلَّمَ لَمْ يَكُنْ اس پر الف استفہام داخل ہوا ہے، جیسے فاء پر داخل ہوتا ہے جیسے افحکم الجاہلیۃ۔ افانت تسمع الضم۔ افتمخذذنه و ذریته، اور جس طرح ضم پر داخل ہوتا ہے۔ اثم اذا ما وقع۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ انفس نے کہا: یہ واو زائدہ ہے، کسائی کا مذہب یہ ہے کہ یہ آؤ تھا تسہیل کے لئے واو کو



حرکت دی گئی۔ ایک قوم نے اُدواؤ ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ بدل کے معنی میں ہوگا، جیسے کوئی کہتا ہے: لا ضربنک پھر جواب دینے والا کہتا ہے: اویکفی اللہ۔ ابن عطیہ نے کہا (1): یہ تمام تکلف ہے۔ صحیح سیبویہ کا قول ہے گلکنا ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ آیت میں مراد مالک بن صیف ہے، اس کو ابن صیف بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا تھا: اللہ کی قسم! ہماری کتاب میں ہم سے کوئی عہد و پیمان نہیں کیا گیا کہ ہم محمد ﷺ پر ایمان لائیں تو یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہود نے عہد کیا تھا کہ اگر حضرت محمد ﷺ مبعوث ہوں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے اور اس کے ساتھ مل کر مشرکین عرب کی مخالفت کریں گے۔ جب آپ ﷺ مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ کا انکار کیا۔ عطا نے کہا: یہ وہ عہد تھے جو نبی کریم ﷺ اور یہود کے درمیان تھے۔ ان کو انہوں نے توڑا۔ جیسے قریظہ اور نصیر نے کیا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرْثَۃٍ ۚ وَهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٠﴾ (انفال)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ النِّبْذَ كَمَا مَعْنٰی پھینکتا ہے، اسی سے النبیذ، المنبوذ پھینکا ہوا۔ ابوالاسود نے کہا:

وخبني من كنت ارسلت انما اخذت كتابي معرضاً بشالكا  
نظرت الى عنوانه فنبذته كنبتك نعلأ اخلقت من نعالكا  
مجھے اس نے بتایا جسے میں نے بھیجا تھا تو نے میری کتاب اعراض کرتے ہوئے لی۔ اور تو نے اس کے عنوان کو دیکھا تو تو نے اسے اس طرح پھینک دیا جس طرح تو پرانی جوتی پھینکتا ہے۔  
ایک اور شاعر نے کہا:

ان الذين امرتهم ان يعدلوا نبذوا كتابك واستحلوا المحرمات  
بے شک وہ لوگ جنہیں تو نے عدل کرنے کا حکم دیا انہوں نے تیری کتاب کو پھینک دیا اور حرام کو حلال کیا۔  
یہ مثال اس شخص کے لئے دی جاتی ہے جو کسی شے کو حقیر سمجھے اور اس پر عمل نہ کرے۔ عرب کہتے ہیں: اجعل هذا خلف ظهرك دبراً منك وتحت قدمك یعنی اس کام کو چھوڑ دے اور اس سے اعراض کر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّخِذْ لِنُفُوسِكَ  
وَرَأَى كُمْ ظَهْرِيَّآ (ہود: 92) (اور تم نے ڈال دیا ہے اسے پس پشت) فراء نے یہ شعر پڑھا ہے:  
تسيم بن زيد لا تكونن حاجتي بظهر فلا يعيا على جوابها  
اے تمسیم بن زید! میری حاجت کو پشت کے پیچھے نہ ڈال مجھے اس کا جواب عاجز نہیں کرے گا۔  
بَلْ أَكْثَرُهُمْ يَبْتَدِءُ لَا يُؤْمِنُونَ فَعَلْ مُسْتَقْبَلُ خَيْرٍ هُوَ۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَاسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اٰوْتُوا  
الْكِتٰبَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ وَرَأٰهُ ظُهُوْرُهُمْ لَمَّا مَعَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥١﴾

”اور جب آیا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تو

پھینک دیا ایک جماعت نے اہل کتاب سے اللہ کی کتاب کو اپنی پشتوں کے پیچھے جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ یہ رسول کی نعت ہے اور حال کی بنا پر اسے منصوب پڑھنا جائز ہے نَبَذَ فَرِيقٌ يَهُودَ لَمَّا كَانُوا أَهْلَ الْكِتَابِ كِتَابَ اللَّهِ، نبذ کی وجہ سے منصوب ہے، مراد تورات ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا انکار اور آپ کو جھٹلانا، یہ کتاب اللہ (تورات) کو پھینکنا ہے۔ سدی نے کہا: انہوں نے تورات کو چھوڑ دیا اور آصف کی کتاب اور ہاروت و ماروت کے جادو کو لے لیا (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: کِتَابُ اللَّهِ سے قرآن مراد لینا بھی جائز ہے۔ شعبی نے کہا: قرآن ان کے ہاتھوں میں تھا اسے پڑھتے تھے لیکن اس پر عمل انہوں نے ترک کر دیا۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: انہوں نے اسے ریشم و دیباچ میں لپیٹ دیا اور اسے سونے اور چاندی سے مزین کر دیا لیکن اس کے حلال کو حلال نہ کیا اور اس کے حرام کو حرام نہ کیا۔ یہی نبذ ہے، اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

كَانَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ بے علموں کے ساتھ انہیں تشبیہ دی۔ جب انہوں نے جاہلوں والا فعل کیا۔ یہ لفظ بھی آئیں گے کہ انہوں نے علم کے باوجود کفر کیا۔ (2)

وَ اتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمٍ ۖ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٌ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ  
كَفَرُوا يَعْلَمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ ۖ وَ مَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَ مَا رُوتَ ۖ  
وَ مَا يَعْلَمِينَ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا  
يُفَرِّقُونَ بَيْنَ الْبَرِّ وَ الرَّجَاءِ ۖ وَ مَا هُمْ بِضَآئِرِينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ  
وَ يَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ ۖ وَ لَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ  
خَلَاقٍ ۖ وَلَيْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝

”اور پیروی کرنے لگے اس کی جو پڑھا کرتے تھے شیطان سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں حالانکہ سلیمان علیہ السلام نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے ہی کفر کیا، سکھایا کرتے تھے لوگوں کو جادو۔ نیز وہ بھی جو اتارا گیا دو فرشتوں پر (شہر) بابل میں (جن کے نام) ہاروت اور ماروت تھے۔ اور (کچھ) نہ سکھاتے تھے وہ دونوں کسی کو جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو تیری آزمائش ہیں (ان پر عمل کر کے) کفر مت کرنا۔ (اس کے باوجود) لوگ سیکھتے رہے ان دونوں سے وہ منتر جس میں جدائی ڈالتے تھے خاوند اور اس کی بیوی میں اور وہ ضرر نہیں پہنچا سکتے اپنے جادو منتر سے کسی کو بغیر اللہ کے ارادہ کے اور وہ سیکھتے ہیں وہ چیز جو ضرر رساں ہے ان کے لئے نہیں نفع پہنچا سکتی انہیں اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس نے اس کا سودا کیا اس کے لئے آخرت میں (رحمت الہی سے) کوئی حصہ نہیں

اور بہت بری ہے وہ چیز بیچا ہے انہوں نے جس کے عوض اپنی جانوں (کی فلاح) کو۔ کاش! وہ کچھ جانتے۔“  
اس میں چوبیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاتَّبِعُوا مَا تَشْكُرُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مَلَكٍ سُلَيْمٍ**۔ یہ اس گروہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے جنہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے میں جادو کی اتباع کی، وہ یہود تھے۔ سدی نے کہا: یہود نے حضرت محمد ﷺ سے تورات کے ساتھ معارضہ کیا تو تورات اور قرآن عقائد و نظریات میں متفق نکلے تو انہوں نے تورات کو چھوڑ دیا اور آصف کی کتاب اور ہاروت و ماروت کے جادو کو لے لیا۔ محمد بن اسحاق نے کہا: جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلیمان کا رسولوں میں ذکر کیا تو ان کے کسی عالم نے کہا: محمد کہتا ہے کہ ابن داؤد نبی تھا اللہ کی قسم! وہ تو جادوگر تھا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ كَفَرُودَا (1)** یعنی شیطانوں نے بنی آدم کے دلوں میں ڈالا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جو سمندر پر سوار ہوتے ہیں، پرندوں اور جنوں کو مسخر کیے ہوئے ہیں یہ سب جادو کے بل بوتے پر ہے۔ کلبی نے کہا: شیطانوں نے جادو اور تلبیس کا عمل لکھا آصف کی زبان پر جو حضرت سلیمان کا کاتب تھا۔ انہوں نے ان کتب کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے مصلیٰ کے نیچے دفن کر دیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں بادشاہی بخشی اور حضرت سلیمان کو اس کا علم نہ تھا جب حضرت سلیمان کا وصال ہوا تو انہوں نے اس جادو کو نکالا اور لوگوں کو کہا: اس علم کے ذریعے سلیمان تم پر حکومت کرتے تھے۔ پس لوگوں نے اس جادو کو سیکھا۔

بنی اسرائیل کے علماء نے کہا: معاذ اللہ! یہ حضرت سلمان علیہ السلام کا علم نہیں ہو سکتا اور بے وقوف نے کہا: یہی حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم ہے۔ پس لوگ اس جادو کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے اپنے انبیاء کی کتب کو چھوڑ دیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ پر حضرت سلیمان کا عذر نازل فرمایا اور جو ان پر تہمت لگائی گئی تھی اس کی براءت کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَاتَّبِعُوا مَا تَشْكُرُوا الشَّيْطَانُ**۔ عطا نے کہا تَشْكُرُوا کا معنی تقدیر ہے یعنی تلاوت کرنا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا تَشْكُرُوا کا معنی تتبہم اور پیروی کرنا ہے، جیسے تو کہتا ہے: جاء القوم يتلوا بعضهم بعضاً بعض کے پیچھے آئے۔ (2)

طبری نے کہا: **اتَّبِعُوا** بمعنی فضلوا (فضیلت دینا) (3) میں کہتا ہوں: ہر وہ شخص جو کسی کی اتباع کرتا ہے اسے اپنے آگے کرتا ہے تو وہ اسے فضیلت دیتا ہے۔ تتلوا کا معنی تلت یعنی ماضی کے معنی میں ہے۔ شاعر نے کہا:

داذا مرت بقبره فاعقر به      کوم الہجان و کل طرف ساہج  
وانضح جوانب قبره بدمائها      فلقد یكون اخدام و ذہابج  
جب تو اس کی قبر کے پاس سے گزرے تو عمدہ اور تیز رفتار اونٹنیوں کو ذبح کر اور قبر کی ہر طرف ان کا خون چھڑک دے تحقیق

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ تفسیر طبری والحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا



وہ خون بہانے والا اور ذبح کرنے والا تھا۔

اس شعر میں قد یکن بمعنی کان ہے، اور (ما) اتباع کا مفعول ہے یعنی کچھ شیطانوں نے حضرت سلیمان کے خلاف کیا اس کی انہوں نے پیروی کی۔ بعض علماء نے فرمایا: ما نافیہ ہے لیکن یہ نظم کلام کے اعتبار سے کلام کی صحت کے اعتبار سے درست نہیں۔ یہ ابن عربی نے کہا ہے۔

عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمَانَ سَلِيمًا سے مراد ان کی شرع اور ان کی نبوت ہے (1)۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے: علی عہد ملک سلیمان اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی فی ملک سلیمان ہے۔ یعنی ان کے قصص، صفات اور اخبار میں (2)۔ فراء نے کہا: ایسی جگہ پر علی اور نبی درست ہیں۔

علی فرمایا اور بعد نہیں فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلَقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ (الحج: 52)

اس حدیث میں امنیتہ کا معنی ہے: اس کی تلاوت میں۔ شیطان کا معنی اور اس کا اشتقاق پہلے گزر چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: یہاں شیطان سے مراد شیاطین الجن ہیں۔ اس اسم سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس سے مراد انسانوں کے شیاطین ہیں جو گمراہی میں سرکشی کرتے ہیں جیسے جریر کا قول ہے۔

ایام یدعوننی الشیطان من غلی و کن یھوینی اذ کنت شیطاناً

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ اللَّهُ تَعَالَىٰ نے حضرت سلیمان کی برأت فرمائی کسی آیت میں یہ نہیں گزرا کہ کسی نے حضرت سلیمان کی طرف کفر کی نسبت کی ہو لیکن یہود نے آپ کی طرف جادو کی نسبت کی لیکن جب جادو کفر تھا تو یہ ایسے ہو گیا جیسے انہوں نے کفر کی طرف ان کی نسبت کی۔

پھر فرمایا: وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ كَفَرُوا اللَّهُ تَعَالَىٰ نے جادو کی تعلیم کی وجہ سے ان کے کفر کو ثابت کیا (3)۔ يُعَلِّمُونَ یہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے اور خبر ثانی کے اعتبار سے محل رفع میں ہونا بھی جائز ہے، عاصم کے سوا کو فیوں نے وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ یعنی لکن کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الشیاطین کے نون کو رفع دیا ہے۔ اسی طرح سورۃ انفال میں ہے لَكِنَّ اللَّهَ رَافِعٌ (انفال: 17) ابن عامر نے ان سے موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے تشدید اور نصب کے ساتھ پڑھا ہے لکن اس کے دو معانی ہیں۔ ماضی کی خبر کی نفی اور مستقبل کی خبر کا اثبات۔ یہ تین کلمات سے بنایا گیا ہے۔ لام، کاف، ان لافنی ہے۔ لک خطاب ہے اور ان اثبات و تحقیق ہے۔ استمقال کی وجہ سے ہمزہ ختم ہو گیا ہے۔ یہ کبھی مشقلہ اور مخففہ ہوتا ہے جب مشقلہ ہو تو نصب دیتا ہے جیسے ان مشقلہ نصب دیتا ہے اور جب مخففہ ہو تو رفع دیتا ہے جیسے ان مخففہ عن المشقلہ سے رفع دیا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** السِّحْرُ (جادو)۔ بعض علماء نے فرمایا: سحر کا معنی حیلوں اور خیالوں سے چیز کو کچھ اور بنا کر دکھانا،

ساحر (جادوگر) کچھ اشیاء اور معانی کرتا ہے وہ جس کے لئے جادو کیا گیا ہوتا ہے اسے وہ اپنی حقیقت کے خلاف تصور کرتا ہے جیسے وہ شخص جو دور سے سراب کو دیکھتا ہے اور وہ اسے پانی تصور کرتا ہے۔ جیسے چلنے والی کشتی میں بیٹھا ہوا شخص یہ خیال کرتا ہے کہ درخت اور پہاڑ اس کے ساتھ چل رہے ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ سحر الصبی سے مشتق ہے جب تو اسے دھوکا دے اور تو اسے کھیل میں ڈال دے۔ التسخیر اس کی مثل ہے۔

لبید نے کہا:

فان تسالینا فیم نحن فائتینا عصا فیر من هذا الانام المسخر  
اگر تو ہمارے متعلق پوچھے کہ ہم کس حیثیت میں ہیں تو ہم اس مسخر مخلوق میں سے چڑیاں ہیں۔  
ایک اور نے کہا:

أرانا موضعین لامر غیب و نسخ بالطعام و بالشراب  
عصافیر و ذبان و دود اجراً من مجلعة الذئاب  
ہم موت کے لئے جلدی کرنے والے ہیں اور ہمیں کھانے پینے کے ساتھ جادو کیا گیا ہے۔ چڑیاں کھیاں اور کیڑے ہیں اور جری بھیڑیے سے زیادہ جری ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انما انت من السحرین۔ کہا جاتا ہے: السحر وہ ہوتا ہے جو سحر والا پیدا کیا گیا ہو کبھی اس کا معنی البعلتین بھی کیا جاتا ہے یعنی ایسے لوگوں سے جو طعام کھاتے ہیں مشروب پیتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل الخفاء ہے کیونکہ جادو خفیہ عمل کرتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا اصل معنی الصرف ہے کہا جاتا ہے: ما سحرک عن کذا یعنی کس چیز نے تجھے اس سے پھیر دیا۔

التسخیر، جو اپنی جہت سے پھیرا گیا ہو۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل الاستتار ہے فقد سحرک اس نے تجھے مائل کیا۔ بعض نے فرمایا: بل نحن قوم مسحورون یعنی ہم پر جادو کیا گیا ہے تخمیل کی وجہ سے ہماری معرفت زائل کر دی گئی ہے۔ جوہری نے کہا: التسخیر کا معنی الأخذہ ہے۔ ہر وہ چیز جس کا ماخذ لطیف ہو اور بار یک ہو وہ سحر ہے۔ سحرۃ یسحرۃ سحرأ والساحر، سحرۃ کا معنی دھوکا دینا بھی ہے۔ یہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: ہم زمانہ جاہلیت میں السحر کو البعضہ کہتے تھے اور عربوں کے نزدیک البعضہ کا مطلب بہت زیادہ طمع سازی کرنا اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کو کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

اعوذ بہ من النافثات فی عضہ العاضہ البعضہ

میں اپنے رب سے جادو میں پھونکنے مارنے والیوں سے پناہ مانگتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 4:** کیا جادو کی حقیقت ہے یا نہیں۔ غزنوی حنفی نے ”عیون المعانی“ میں ذکر کیا ہے کہ معتزلہ کے نزدیک سحر دھوکا ہے اس کی کوئی اصل نہیں۔ امام شافعی کے نزدیک یہ وسوسہ اور امراض ہیں۔ فرمایا: ہمارے نزدیک اس کی اصل طلسم

ہے جو ستاروں کی تاثیر پر مبنی ہوتا ہے جیسے فرعون کی لاثیموں کے بارے میں سورج کی تاثیر۔ یا اس میں شیاطین کی تعظیم ہوتی ہے تاکہ وہ اس کی مشکل کو آسان کر دیں۔

میں کہتا ہوں: ہمارے نزدیک یہ حق ہے اور اس کی حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ پھر جادو میں کچھ وہ ہوتا ہے جو ہاتھ کی صفائی سے ہوتا ہے جیسے الشعوذہ (مداری کا تماشا)۔ پھرتی سے کرب دکھانے والے کو الشعوذی کہا جاتا ہے۔ ابن فارس نے ”المجل“ میں کہا: الشعوذہ بادیہ نشینوں کے کلام سے نہیں ہے۔ یہ ہاتھوں میں پھرتی ہوتی ہے یہ جادو کی طرح ہے۔ اس سے کلام کچھ ہوتا ہے جو محفوظ کیا جاتا ہے اور دم ہوتے ہیں جو اللہ کے اسماء سے پڑھے جاتے ہیں کبھی یہ شیاطین کے عہود سے ہوتا ہے کبھی دواؤں سے اور دعوؤں وغیرہ سے ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** رسول اللہ نے کلام میں فصاحت اور زبان میں طاقت کو سحر کہا ہے۔ فرمایا: ان من البیان لسحراً (بیان میں سے بعض جادو ہوتے ہیں) اس حدیث کو امام مالک وغیرہ نے روایت کیا ہے کیونکہ اس میں بھی باطل کو درست کرنا ہوتا ہے حتیٰ کہ سامع اسے حق سمجھنے لگتا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد ان من البیان لسحراً (☆)، فصاحت و بلاغت کی مدح اور بیان کی تفضیل کے لئے یہ ارشاد فرمایا ہے۔ یہ اہل علم کی ایک جماعت کا قول ہے پہلا قول اصح ہے اور اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: فلعل بعضکم ان یکون الحن بحجۃ من بعض (1) (شاید کوئی تم میں سے دوسرے سے اپنی حجت کو بیان کرنے میں زیادہ فصیح و بلیغ ہو) اور فرمایا: ان ابغضکم الی الثرثارون المتفہقون تم میں سے میرے نزدیک مبغوض لوگ زیادہ بولنے والے ہیں۔ الثرثرة، کلام کی کثرت اور اسے گھمانا ہے۔ کہا جاتا ہے: فہو ثرثار مہذار زیادہ باتیں کرنے والا، ہنسانے والا۔ المتفہق بھی اسی طرح ہے۔ ابن زید نے کہا: فلان یتفہق فی کلامہ۔ وہ اپنے کلام میں وسعت رکھتا ہے۔ اس نے کہا اس کی اصل الفہق ہے جس کا معنی بھرنا ہے۔ گویا ایسا شخص کلام کے ساتھ اپنے منہ کو بھر دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں: وہ معنی جو ہم نے بیان کیا ہے اس کی تفسیر عامرا شعبی جو حدیث کے راوی ہیں اور صعصعہ بن صوحان نے کی ہے، دونوں حضرات نے کہا: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ان من البیان لسحراً ایک شخص پر حق ہوتا تھا (2) اور وہ حقدار سے زیادہ چرب زبان ہوتا تھا وہ اپنے بیان سے قوم کو مسحور کر دیتا تھا تو وہ حق لے جاتا حالانکہ اس پر حق ہوتا تھا۔ علماء نے بلاغت اور لسانت کی تعریف کی ہے جب وہ لمبی گفتگو کرنے اور باطل کو حق ثابت کرنے کی حد تک نہ پہنچے۔ یہ واضح ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** جادو کچھ ایسا ہوتا ہے جس کا کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ مثلاً جو لوگوں کی صورتوں میں تبدیلی کرنے اور جانوروں کی ہیئت میں ان کو نکالنے، اور ایک مہینہ کی مسافت ایک رات میں طے کرنے، ہوا میں اڑنے کا دعویٰ کرتے ہیں، جو اس قسم کا فعل کرے تاکہ لوگوں کو وہم دلائے کہ یہ حق ہے تو اس کی طرف سے کفر ہوگا۔ یہ ابو نصر عبد الرحیم قشیری کا قول ہے۔ ابو

1۔ صحیح بخاری، باب من اقام البینۃ بعد البین، حدیث نمبر 2483، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4651

2۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی الشعر، حدیث نمبر 4359، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



عمر و نے کہا: جو یہ کہتا ہے کہ ساحر حیوان کو ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف تبدیل کرتا ہے وہ انسان کو گدھا بنا دیتا ہے اور وہ اجساد کو نقل کرنے، انہیں ہلاک کرنے اور انہیں تبدیل کرنے پر قادر ہے وہ ایسے ساحر کے قتل کا نظریہ رکھتے ہیں کیونکہ وہ انبیاء سے کفر کرنے والا ہے وہ ان کی آیات اور معجزات کی مثل دعویٰ کرنے والا ہے اس طرح تو نبوت کی صحت کا علم درست نہیں رہے گا کیونکہ جب اس کی مثل حیلہ سے حاصل ہو جائے گا اور رہا وہ جو کہتا ہے کہ جادو، دھوکا، تمویہات، تخیلات اور جھوٹ کا نام ہے وہ جادو گر کو قتل کرنے کو واجب نہیں کہتا مگر یہ کہ اگر جادو گر اپنے فعل میں کسی کو قتل کر دے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 7:** اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ جادو ثابت ہے اس کی حقیقت ہے۔ عام معتزلہ اور شوافع میں سے ابو اسحاق استر آبادی کا نظریہ ہے کہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ تمویہ اور تخیل ہے اور وہ ہم دلا نا ہے کہ چیز اپنی حقیقت پر نہیں ہے۔ یہ شعبہ بازی اور ہاتھوں کی پھرتی کی ایک صورت ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **يُخَيِّلُ إِلَيْهِمْ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنْهَآ تَسْعَى** ① (طہ) (یوں دکھائی دینے لگیں ان کے جادو کے اثر سے جیسے وہ دوڑ رہی ہوں)۔

یہ نہیں فرمایا کہ یہ حقیقت میں دوڑ رہے تھے بلکہ فرمایا: **يُخَيِّلُ إِلَيْهِ** (اسے خیال گزرتا تھا) اسی طرح فرمایا: **سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ** (الاعراف: 116)۔ (انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا)۔ اس میں کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ تخیل وغیرہ جادو میں سے ہے لیکن اس کے بعد ایسے امور ثابت ہیں عقل جن کو جائز قرار دیتی ہے اور نقل بھی ان کے متعلق وارد ہے۔ اسی وجہ سے اس آیت میں جادو اور اس کی تعلیم کا ذکر آیا ہے اگر اس کی حقیقت نہ ہوتی تو اس کی تعلیم نہ ہوتی، نہ اللہ تعالیٰ خبر دیتے کہ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ یہ چیز دلیل ہے کہ اس کی حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے جادو گروں کے واقعہ میں فرمایا: **وَجَاءُوا بِسِحْرِ عَظِيمٍ** ② (اعراف) (اور مظاہرہ کیا انہوں نے بڑے جادو کا) اور سورہ فلق میں اس کا ذکر فرمایا۔ مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سورت کے نزول کا سبب لبید بن اعصم کا جادو تھا۔ جس کا ذکر بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، حضرت عائشہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ پر بنی زریق کے یہودیوں میں سے ایک یہودی نے جادو کیا جس کو لبید بن اعصم کہا جاتا تھا (1)۔ اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب جادو ختم ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا دی شفاء علت کے ختم ہونے اور مرض کے زائل ہونے کے ساتھ ہوتی ہے۔

یہ دلیل ہے کہ اس کی حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کی اخبار اس کے وجود اور وقوع پر قطعی ہیں۔ اور صاحب عقل لوگوں کا اس پر اجماع ہے۔ چند معتزلیوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور ان کی اہل حق کی مخالفت قابل اعتناء نہیں، جادو عام ہو گیا ہے اور گزشتہ زمانہ میں بھی پھیلا ہوا تھا اور لوگوں نے اس کے بارے میں کلام کیا۔ صحابہ اور تابعین میں سے کسی نے اس کی اصل کا انکار نہیں کیا۔ سفیان نے ابوالاعور سے انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: مصر کے شہروں میں سے ایک شہر میں جادو سیکھا گیا جس کو الفرم کہا جاتا تھا۔ پس جس نے اس کی تکذیب کی وہ کافر ہے اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلانے والا ہے اور ایک مشاہدہ شدہ چیز کا انکار کرنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** ہمارے علماء نے فرمایا: اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جادوگر کے ہاتھ پر خارق للعادة عمل ظاہر ہو جو انسان کی قدرت میں نہیں ہوتا مثلاً مرض میں مبتلا کر دے، مرض کو ختم کر دے، عقل زائل ہو جائے، کوئی عضو میڑھا کر دے۔ اس کے علاوہ چیزیں جن کا بندوں بے سرزد ہونا محال ہوتا ہے۔ علماء نے فرمایا: جادو میں یہ بعید نہیں کہ جادوگر کا جسم اتنا بار یک ہو جائے کہ وہ کسی سوراخ یا چھوٹی سی کھڑکی میں داخل ہو جائے، بانس کے سرے پر کھڑا ہو جائے، بار یک دھاگے پر چلنے لگے، ہوا میں اڑنے لگے، پانی پر چلنے لگے، کتے وغیرہ پر سوار ہو جائے، لیکن اس کے باوجود جادو نہ اس کا موجب ہوگا نہ اس عمل کے وقوع کی علت ہوگا نہ سبب مولد ہوگا اور نہ جادوگر اس میں مستقل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہی ان اشیاء کو پیدا فرماتا ہے اور جادو کے پائے جانے کے وقت وہ اسے تخلیق فرمادیتا ہے جس طرح کھانے کے وقت سیر ہونا پیدا فرماتا ہے پانی پینے کے وقت سیرابی پیدا فرماتا ہے۔ سفیان نے عمار ذہبی سے روایت کیا ہے کہ ایک جادوگر ولید بن عقبہ کے پاس ایک رسی پر چل رہا تھا وہ گدھے کی دبر سے داخل ہوتا اور اس کے منہ سے نکل جاتا، جندب نے اس پر تلواریں سونتی اور اسے قتل کر دیا۔ یہ جندب بن کعب ازدی تھے جنہیں الجلی کہا جاتا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: (میری امت میں ایک شخص ہوگا جس کو جندب کہا جائے گا وہ تلواریں مارے گا حق اور باطل کے درمیان فرق کر دے گا) اس کو جندب خیال کرتے تھے یہ جادوگر کا قاتل ہے۔ علی بن مدینی نے کہا: ان سے حارثہ بن مضرب نے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ جادو کے وقت جو کچھ کرتا ہے جیسے کڑی کا اتارنا، جوؤں اور مینڈک، دریا کا پھٹنا، عصا کا سانپ میں تبدیل ہونا، مردوں کو زندہ کرنا، جانوروں کو بلوانا اور اسی قسم کی دوسری آیات جو رسل سے ظاہر ہوئیں، یہ جادو میں سے نہیں ہیں۔ یہ معجزات اور ایسی دوسری چیزیں جن کا حکم قطعی ہے کہ وہ نہ ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ جادوگر کے ارادہ کے وقت ایسا نہیں کرے گا۔ قاضی ابوبکر بن طیب نے کہا: ہم اسے اجماع کی وجہ سے تسلیم نہیں کرتے اگر اجماع نہ ہوتا تو ہم جائز قرار دیتے۔

**مسئلہ نمبر 10:** جادو اور معجزہ کے درمیان فرق: ہمارے علماء نے فرمایا: جادو جادوگر وغیرہ سے پایا جاتا ہے کبھی اس کو ایک جماعت جانتی ہے اور ان کے لئے ایک وقت میں اس کا لانا ممکن ہوتا ہے اور معجزہ وہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مثل اور اس کا معارض پیش کرنے کی کسی کو قدرت ہی نہیں دیتا، پھر جادوگر نبوت کا دعویٰ نہیں کرتا پس اس سے جو صادر ہوتا ہے وہ معجزہ سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ معجزہ کے لئے نبوت کا دعویٰ اور اس کا چیلنج شرط ہے جیسا کہ کتاب کے مقدمہ میں گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11:** فقہاء کا مسلم اور ذمی جادوگر کے حکم میں اختلاف ہے۔ امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمان جب ایسے کلام سے جادو کرے جو کفر ہو تو اسے قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی اور نہ اس کی توبہ قبول کی جائے گی کیونکہ یہ ایسا امر ہے جس کے ساتھ وہ خوش ہوتا ہے جیسے زندیق اور زانی ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے جادو کو کفر کہا ہے۔ فرمایا: وَ مَا يُعَلِّمِينَ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا هُنَّ قَوْلُنَا فَلَا تَكْفُرْ (البقرہ: 102) (اور) (کچھ) نہ سکھاتے تھے وہ دونوں کسی کو جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو تیری آزمائش ہیں (ان پر عمل کر کے) کفر مت کرنا

یہ امام احمد بن حنبل، ابو ثور، اسحاق، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن عمر، حضرت حفصہ، حضرت ابو موسیٰ، حضرت قیس بن سعد اور سات تابعین سے جادوگر کا قتل کرنا مروی ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، جادوگر کی حد تلواریں سے مارنا ہے۔ یہ ترمذی نے نقل کی ہے اور یہ قوی نہیں ہے۔ اسماعیل بن مسلم منفرد ہے اور وہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ ابن عیینہ نے اسماعیل بن مسلم عن الحسن کے سلسلہ میں مرسل روایت کی ہے اور بعض علماء نے عن الحسن عن الجندب کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا: ہم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے آپ نے ایک جادوگر کو پیچھا کرتی تھی جس نے جادو کیا تھا اور اس کی قیمت غلاموں کے آزاد کرنے میں لگائی تھی۔ ابن منذر نے کہا: جب کوئی شخص اقرار کرے کہ اس نے ایسے کلام سے جادو کیا ہے جو کفر تھا تو اس کا قتل کرنا واجب ہے اگرچہ وہ توبہ نہ بھی کرے اسی طرح اگر اس پر گواہوں سے ثابت ہو جائے اور وہ گواہ کلام کی ایسی صفت بیان کریں جس سے کفر لازم آتا ہے تو اس کا بھی یہی حکم ہے..... اگر وہ کلام جو اس نے ذکر کیا ہے، جس کے ساتھ اس نے جادو کیا ہے، وہ کفر نہیں ہے تو اس کا قتل کرنا جائز نہیں۔ اگر اس نے مسحور میں کوئی جنایت پیدا کر دی جو قصاص کا موجب ہے تو اس نے یہ عمل عدا کیا ہے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ اگر وہ ایسی جنایت ہے جس میں قصاص نہیں ہے تو اس میں اس کی دیت ہوگی..... ابن منذر نے کہا: جب کسی مسئلہ میں نبی کریم ﷺ کے صحابہ کا اختلاف ہو تو اس قول کی اتباع واجب ہے جو کتاب و سنت کے زیادہ موافق ہو اور یہ جائز ہے کہ جو جادو جس کے کرنے والے کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا وہ ایسا جادو ہو جو کفر ہو تو یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے موافق ہے اور یہ احتمال ہے کہ حضرت عائشہ نے جس جادوگر کو پیچھا کرتی تھی اس کا حکم فرمایا وہ جادو کفر نہ ہو اور اگر کوئی جندب کی حدیث سے حجت پکڑے جو حضرت جندب نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے جادوگر کی حد، اسے تلواریں سے مارنا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو احتمال ہے کہ اس جادوگر کے قتل کا حکم ہو جس کا جادو کفر ہو۔ تو یہ ان اخبار کے موافق ہوگا جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں مگر تین چیزوں میں سے ایک چیز پائے جانے کے ساتھ۔ (1)

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے مسلمانوں کے خون بہانا ممنوع ہیں ان کو یقین کے بغیر مباح نہیں کیا جاسکتا اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

بعض علماء نے فرمایا کہ اہل فن نے کہا: جادو مکمل نہیں ہوتا مگر کفر اور تکبر کے ساتھ یا شیطان کی تعظیم کے ساتھ۔ پس اس تقدیر پر جادو کفر پر دال ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

امام شافعی سے مروی ہے کہ جادوگر کو قتل نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ اپنے جادو سے کسی کو قتل کر دے اور وہ کہے کہ میں نے جان بوجھ کر قتل کیا ہے۔ اگر وہ کہے کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا اور اس میں قتل خطا کی طرح دیت ہوگی۔ اگر اس نے جادو کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو اسے اس کے نقصان کی مقدار ادب سکھایا جائے گا۔ ابن عربی نے کہا: یہ دوا اعتبار سے باطل ہے ایک یہ کہ اسے جادو کا علم نہیں تھا اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ مؤلف کلام ہے جس کے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ ان النفس بالنفس والعین بالعين۔۔۔ الآیہ، حدیث نمبر 6370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



غیر اللہ کی تعظیم کی جاتی ہے اور ان کی طرف مقادیر اور کائنات کی نسبت کی جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تصریح فرمائی کہ یہ کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ یعنی حضرت سلیمان نے جادو کے قول کے ساتھ کفر نہیں کیا۔ وَلٰكِنَّ الشَّيْطٰنَ كَفَرٌ ذٰلِیْطٰنٌ یعنی شیاطین نے جادو کر کے اور اس کی تعلیم کے ساتھ کفر کیا۔ ہاروت و ماروت کہتے تھے ہم فتنہ ہیں، تو کفر نہ کر۔ یہ بیان کی تاکید ہے۔

امام مالک کے اصحاب نے حجت پکڑی ہے کہ اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ جادو ایک پوشیدہ عمل ہے اس کا کرنے والا اسے ظاہر نہیں کرتا۔ پس اس کی توبہ معروف نہیں ہوگی جیسے زندیق ہے۔ جو مرتد ہو کر کفر کا اظہار کرے اس سے توبہ طلب کی جائے گی۔

امام مالک نے فرمایا: اگر جادو گر یا زندیق توبہ کر لے، اس سے پہلے کہ اس کے خلاف گواہی دی جائے، تو ان کی توبہ قبول ہوگی۔ اس کی حجت یہ ارشاد ہے: فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاسًا (غافر: 85) (انہیں نفع نہ دیا ان کے ایمان نے۔ جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا) یہ دلیل ہے کہ عذاب کے نزول سے پہلے ان کا ایمان انہیں نفع دیتا تھا۔ اسی طرح یہ دونوں (ساحر، زندیق) ہیں۔

**مسئلہ نمبر 12:** رہا ذمی جادو گر، بعض علماء نے فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا۔ امام مالک نے فرمایا: اسے قتل نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ اپنے جادو سے کسی کو قتل کر دے، اور جو اس نے جنایت کی ہوگی اس کا ضمان دے گا۔ اگر کوئی ایسا کافر شخص جادو کرے جس کے ساتھ معاہدہ نہیں ہے تو اسے قتل کیا جائے گا (1)، ابن خويز منداد نے کہا: اگر جادو گر ذمی ہو تو امام مالک سے اس کے متعلق روایت مختلف ہے۔ کبھی فرمایا: اس سے توبہ طلب کی جائے گی اور اس کی توبہ اسلام کا اقرار ہے، کبھی فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا اگرچہ وہ اسلام قبول کر بھی لے۔ رہا حرابی تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا جب وہ توبہ کر لے۔ اسی طرح امام مالک نے اس ذمی کے بارے فرمایا جو نبی کریم ﷺ کی شان میں بدزبانی کرے اس سے توبہ طلب کی جائے گی اور اس کی توبہ اسلام قبول کرنا ہے بھی فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی جیسے مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے۔ امام مالک نے ذمی کے بارے میں فرمایا: جب وہ جادو کرے، تو اسے سزا دی جائے گی مگر یہ کہ وہ اپنے جادو کے ساتھ کسی کو قتل کرے یا کوئی اور جنایت کر دے تو اس کے جرم کی مقدار اس سے مؤاخذہ کیا جائے گا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا کیونکہ اس نے عہد کو توڑا اور جادو گر کا وارث، جادو گر کی میراث نہیں پائے گا کیونکہ جادو گر کافر ہے، مگر یہ کہ اس کا جادو کفر نہ ہو..... امام مالک نے اس عورت کے متعلق فرمایا جو اپنے خاوند کو اپنے جادو کے ذریعے روک لیتی ہے یا کسی اور سے روک لیتی ہے تو اسے عبرت ناک سزا دی جائے گی اور اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 13:** اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا ساحر (جادو گر) سے جادو کو دور کرنے کا سوال کیا جائے گا؟ حضرت سعید بن مسیب نے اس کو جائز قرار دیا جیسا کہ امام بخاری نے ذکر کیا ہے اور اسی کی طرف مزنی کا میلان ہے۔ حضرت حسن

بھری نے اس کو ناپسند کیا ہے۔ شعبی نے کہا: تعویذ اور دم سے علاج کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن بطال نے کہا: وہب بن منبہ کی کتاب میں ہے کہ ہزسات پتے بیری کے لے پھر اسے دو پتھروں کے درمیان پیس دے پھر اسے پانی میں ملائے اور اس پر آیہ الکرسی پڑھے پھر اس سے تین گھونٹ پی لے اور بقیہ پانی کے ساتھ غسل کرے، اس عمل سے جو کچھ اسے ہوگا وہ دور ہو جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہ ایک عمدہ عمل ہے اس شخص کے لئے جسے اپنے اہل سے حقوق زوجیت سے روکا گیا ہو۔

**مسئلہ نمبر 14:** معتزلہ کے علماء نے شیاطین اور جنوں کا انکار کیا ہے۔ ان کا انکار ان کی کم فکری اور دین کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔ ان کے اثبات میں کوئی عقلی محال نہیں ہے کتاب و سنت کی نصوص ان کے اثبات پر دلالت کرتی ہے اور عقلمند اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے والے پر حق ہے کہ جس کا عقل تقاضا کرے اس کے جواز کو ثابت کرے۔ شرع نے اس کے ثبوت پر نص قائم فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا (شیطانوں نے کفر کیا) اور فرمایا: وَمِنَ الشَّيَاطِينِ مَنْ يَغُوصُونَ لَهُ (الانبیاء: 82) (شیطانوں میں سے جو (سمندروں میں) غوطہ زنی کرے) اس کے علاوہ دوسری آیات اور سورہ جن ان کے ثبوت کا تقاضا کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ان الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم (1)۔ (شیطان ابن آدم میں خون کی طرح چلتا ہے) اس خبر کا بہت سے لوگوں نے انکار کیا ہے اور انہوں نے ایک جسم میں دو خون کا ہونا محال قرار دیا ہے جبکہ عقل انسانی میں ان کے چلنے کو محال قرار نہیں دیتی جبکہ شیطانوں کے اجسام رقیق اور بسیط ہیں جیسا کہ بعض لوگ بلکہ اکثر لوگ کہتے ہیں..... اگر ان کے جسم کثیف بھی ہوتے تو بھی صحیح تھا جیسا کہ کھانا، پینا جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کیڑے بنی آدم میں ہوتے ہیں جبکہ وہ بھی زندہ ہوتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 15:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ، مَآئِنِی کے لئے ہے وادو عاطفہ ہے اس کا عطف وَمَا كَفَرَا سُلَيْمٰنُ پر ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ یہود نے کہا اللہ تعالیٰ نے جبریل و میکائیل کو جادو کے ساتھ اتارا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی نفی فرمائی (2)۔ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: وَمَا كَفَرَا سُلَيْمٰنُ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يعلمون الناس السحر ببابل ہاروت وماروت اور ماروت وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا میں الشَّيَاطِينَ سے بدل ہے (3)۔ جن صورتوں پر یہ آیت محمول کی گئی ہے ان میں سے یہ صورت اولیٰ ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے اصح ہے اور اس کے سوا کسی قول کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔ جادو، شیاطین کے جوہر کی لطافت اور ان کے افہام کی دقت کی وجہ سے ان سے حاصل کیا جاتا ہے اکثر انسانوں میں سے اسے عورتیں کرتی ہیں خصوصاً حیض کی حالت میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمِنْ شَرِّ النَّفَثَاتِ فِي الْعُقَدِ (فلق)

شاعر نے کہا:

اعوذ بہن من النافثات

1۔ صحیح بخاری، باب هل یدرأ المعتکف عن نفسه، حدیث نمبر 1898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

میں پھونکیں مارنے والیوں سے اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 16:** اگر کوئی یہ کہے کہ جمع سے تنبیہ کیسے بدل ہو سکتا ہے حالانکہ مبدل منہ اور بدل ایک جیسے ہوتے ہیں۔

اس کا جواب تین اعتبار سے ہے: (۱) تنبیہ پر جمع کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَإِنْ كَانَ لَكَ إِخْوَةٌ فَلَا تُؤْتِي السُّدُسَ (النساء: 11)** اور ماں کو ثلث (۱/۳) سے السدس (۱/۶) کی طرف صرف دو بھائی یا دو سے زیادہ ہی محبوب کرتے ہیں جیسا کہ سورہ نساء میں آئے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ دو جب تعلیم میں اصل تھے تو ان پر نص قائم فرمادی۔ ان کے قبیعین کا ذکر نہ کیا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (مدثر)** (اس پر نو فرشتے مقرر ہیں) تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کا خصوصی ذکر کیا ان کے ترمرد و سرکشی کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فِيهِمَا فَكِهَةٌ وَنَحْلٌ وَرُمَّانٌ (الرحمن)** (ان باغوں میں پھل، کھجور اور انار ہیں) اور (جبریل و میکائیل) کا قول۔ یہ قرآن میں اور عرب کلام میں کثرت سے ہے کہ عموم میں سے بعض کو خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے ان کے شرف کی وجہ سے اور ان کی فضیلت کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّ أَوَّلَى الْثَّامِسِ بِإِبْرَاهِيمَ لِلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ (آل عمران: 68)** (بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم علیہ السلام سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز اور جبریل و میکائیل ان کے ذکر کی حکمت یا تو ان کی اعلیٰ طہارت کی وجہ سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاكِهَةٌ وَنَحْلٌ وَرُمَّانٌ (الرحمن)** یا اکثریت کی وجہ سے جیسے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **جعلت لي الارض مسجداً وتريتها طهوراً (1)**۔ میرے لئے زمین سجدہ گاہ اور اس کی مٹی طہارت کا باعث بنائی گئی ہے یا ترمرد و سرکشی کی وجہ سے ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ واللہ اعلم

بعض علماء نے فرمایا: ما کا عطف السحر پر ہے اور یہ مفعول ہے اس بنا پر ما، الذی کے معنی میں ہوگا اور جادو، دو فرشتوں پر لوگوں کے فتنہ اور آزمائش کے لئے اتارا گیا تھا (2) اور اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ چاہے اپنے بندوں کو آزمائے اس کی شان کو زیبا ہے۔ جیسے اس نے طالوت کو نہر سے آزمایا تھا اسی وجہ سے وہ فرشتے کہتے: **إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ (ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہیں)** ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ جادوگر کا عمل کفر ہے اگر تو ہماری اطاعت کرے گا تو نجات پائے گا اور اگر ہماری نافرمانی کرے گا تو ہلاک ہوگا۔

حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، کعب احبار، سدی اور کلبی سے اس کا معنی مروی ہے۔ جب اولاد آدم میں فساد زیادہ ہو گیا تھا..... یہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں تھا..... ملائکہ نے انہیں عار دلائی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم ان کی جگہ ہوتے اور تم میں ان عناصر کی ترکیب ہوتی جو ترکیب ان میں ہے تو تم بھی ان جیسے اعمال کرتے۔ فرشتوں نے کہا: تیری ذات پاک ہے ہمارے لئے تو یہ مناسب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اپنے اعلیٰ فرشتوں میں سے دو فرشتوں کا انتخاب کرو۔ انہوں نے ہاروت و ماروت کو چنا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین میں اتارا اور ان میں شہوات کا عنصر رکھ دیا، ان پر ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہو گئے اس عورت کا نام نبطی زبان میں (بیدخت)

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ فلم تجدوا ماء فتيمموا صعيدا طيبا۔ الآیہ، حدیث 323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا



فارسی میں ناہیل اور عربی میں زہرہ تھا، وہ ان کے پاس جھگڑالے کر آئی اور ان دونوں فرشتوں نے اس سے خواہش پوری کرنی چاہی تو اس نے انکار کیا، مگر یہ کہ وہ دونوں اس کے دین میں داخل ہو جائیں، شراب پیئیں اور اس نفس کو قتل کریں جس کو اللہ نے حرام کیا ہے۔ انہوں نے اس کی شرائط قبول کر لیں اور انہوں نے شراب پی۔ وہ جب اس کے پاس گئے تو انہیں ایک شخص نے دیکھ لیا انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ ان فرشتوں سے اس عورت نے اس اسم کے بارے پوچھا جس کے ذریعے وہ آسمان پر چڑھ جاتے تھے۔ وہ بھی انہوں نے اسے سکھا دیا۔ اس نے وہ کلمہ پڑھا اور اوپر چڑھ گئی۔ اسے ایک ستارہ کی شکل میں مسخ کر دیا۔

سالم نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ مجھے کعب النجری نے بتایا کہ ان دونوں فرشتوں نے اپنا دن مکمل نہ کیا حتیٰ کہ انہوں نے وہ سب کام کر دیئے جو اللہ تعالیٰ نے حرام کیے تھے۔ اس حدیث کے علاوہ میں ہے۔ ان فرشتوں کو دنیا کے عذاب اور آخرت کے عذاب میں اختیار دیا گیا تو انہوں نے دنیا کا عذاب اختیار کیا۔ انہیں بابل میں ایک سرنگ میں عذاب دیا جا رہا ہے۔ بعض نے کہا: بابل سے مراد بابل عراق میں ہے۔ بعض نے کہا: بابل نہاوند ہے (1)، عطا سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر جب زہرہ ستارہ اور سہیل ستارہ کو دیکھتے تو انہیں برا بھلا کہتے اور فرماتے: سہیل یمن میں عشر وصول کرتا تھا اور لوگوں پر ظلم کرتا تھا اور زہرہ ہاروت و ماروت کی دوست تھی۔

ہم کہتے ہیں: یہ سب حضرت ابن عمر وغیرہ سے بعید اور ضعیف ہے کوئی چیز بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس قول کو ان فرشتوں کے متعلق اصول رد کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی وحی پر امین ہیں اس کے رسولوں کے سفیر ہیں لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (التحریم) (نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جس کا اس نے انہیں حکم دیا ہے اور فوراً بجالاتے ہیں جو حکم نہیں فرمایا جاتا ہے) بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ (لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِ رَبِّهِمْ يَعْمَلُونَ) (الانبیاء) (بلکہ وہ تو (اس کے) معزز بندے ہیں نہیں سبقت کرتے اس سے بات کرنے میں اور وہ اس کے حکم پر کاربند ہیں) يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ (الانبیاء) (وہ اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں رات دن اور وہ اکتاتے نہیں)

رہی عقل تو وہ فرشتوں کے معصیت میں واقع ہونے کا انکار نہیں کرتی۔ عقلا ان سے اس کا خلاف پایا جاسکتا ہے جن کا انہیں مکلف کیا گیا ہے ان میں شہوات پیدا کی جاسکتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء، اولیاء، فضلاء، علماء کا خوف تھا لیکن اس جائز کے وقوع کا ادراک نہیں ہو سکتا مگر نقل کے ساتھ۔ اور وہ نقل صحیح نہیں ہے ایک اور چیز جو اس واقعہ کی عدم صحت پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو پیدا فرمایا اور ان کو اکب کو پیدا فرمایا جب آسمان کو پیدا فرمایا۔ حدیث میں ہے: جب آسمان کو پیدا کیا گیا تو اس میں سات گردش کرنے والے ستارے پیدا کیے: زحل، مشتری، بہرام، عطارد، زہرہ، سورج اور چاند۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد كُلُّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (الانبیاء) کا یہی معنی ہے اس سے ثابت واکہ زہرہ اور سہیل یہ آدم کی تخلیق سے پہلے موجود تھے پھر فرشتوں کا یہ قول جو نقل کیا گیا ہے کہ ”ہمارے لئے یہ مناسب نہیں“ باعث عار ہے تو ہمیں آزمانے پر قادر نہیں یہ کفر ہے ہم اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ مانگتے ہیں اور معزز فرشتوں کی

طرف ایسی نسبت کرنے سے پتہ مانگتے ہیں ہم ان کی پاکیزگی اور طہارت بیان کرتے ہیں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اور جو کچھ مفسرین نے نقل کیا ہے اس سے فرشتے پاک ہیں: سبحان ربك رب العزة عما يصفون۔

**مسئلہ نمبر 17:** حضرت ابن عباس، ابن ابزی، ضحاک اور حسن نے المَلِکِیْن (لام کے کسرہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔ ابن ابزی نے کہا: وہ داود اور سلیمان میں اس قول کے مطابق مانا فیہ ہے نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ حسن نے کہا: یہ دو عجمی کافر تھے بابل کے بادشاہ تھے اس قول کے مطابق مامفعلو ہوگا نافیہ نہ ہوگا۔ (1)

**مسئلہ نمبر 18:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **یٰۤاٰیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا السَّوْءَ الَّذِیْ فِی السَّوْءِ** اور تعریف اور عجز کی وجہ سے غیر منصرف ہے یہ زمین کا ایک قطر ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد عراق اور اس کے ارد گرد کا علاقہ ہے۔ حضرت ابن مسعود نے اہل کوفہ سے کہا: تم حیرہ اور بابل کے درمیان ہو۔ قتادہ نے کہا: یہ نصیبین سے اس العین تک کا علاقہ ہے۔ ایک قوم نے کہا: یہ مغرب ہے۔ ابن عطیہ نے کہا (2): یہ ضعیف ہے ایک قوم نے کہا: نہاوند کا پہاڑ ہے۔ بابل نام رکھنے کی وجہ میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ اس میں زبانیں گڈمڈ ہوتی تھیں جب نمرود کا محل گرا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ نام اس لئے رکھا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب ارادہ فرمایا کہ بنی آدم کی زبانوں کے درمیان اختلاف پیدا فرمائے تو اس نے ایک ہوا بھیجی تو اس نے لوگوں کو آفاق سے بابل تک جمع کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی زبانوں کو گڈمڈ کر دیا پھر اس ہوا نے انہیں شہروں میں جدا جدا کر دیا۔ الببلۃ کا معنی ہے، جدا جدا کرنا۔ فرمایا: اس کا معنی الخلیل ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: جو کچھ الببلۃ کے بارے میں کہا گیا اس میں سے سب سے بہتر وہ روایت ہے جو داؤد بن ابی ہند نے علیاء بن احمر سے انہوں نے حضرت عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جب جو دی پہاڑ سے نیچے اترے تو انہوں نے ایک شہر بنایا جس کا نام ثمانین (۸۰) رکھا۔ ایک دن صبح کی تو اس میں اتنی زبانیں بولی جارہی تھیں ان میں سے ایک عربی زبان تھی۔ لوگ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھ رہے تھے۔

**مسئلہ نمبر 19:** عبد اللہ بن بشر مازنی نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دنیا سے بچو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! یہ دنیا ہاروت و ماروت سے بھی زیادہ جادوگر ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: دنیا ان سے زیادہ جادوگر ہے کیونکہ دنیا تجھے اپنے دھوکے کے ساتھ مسحور کرتی ہے، اپنے فتنہ کو تجھ سے چھپاتی ہے۔ پس یہ تجھے اپنے حرص اور اپنے حصول کے لئے مقابلہ کی دعوت دیتی ہے، اس کے لئے جمع کرنا اور منع کرنا ہے حتیٰ کہ تیرے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے درمیان جدائی کر دیتی ہے تیرے اور حق تعالیٰ کی رویت اور اس کی رعایت کے درمیان فرق کر دیتی ہے۔ پس دنیا ان دونوں سے زیادہ مسحور کن ہے۔ یہ تیرے دل کو اللہ تعالیٰ اور اس کے حقوق ادا کرنے اور وعدہ اور وعید سے روک لیتی ہے دنیا کا جادو، اس کی محبت، اس کی شہوات، تیرا لذت حاصل کرنا اور جھوٹی تمناؤں کے ساتھ تیرا تمنا کرنا ہے حتیٰ کہ تیرے دل کو یہ چیزیں گھیر لیتی ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حبك الشؤن يعصى ويصم۔ تجھے کسی شے کی محبت

اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 20:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **هَٰمُوتٌ وَمَٰمُوتٌ** یہ غیر منصرف ہیں کیونکہ یہ عجمی اور معرفہ ہیں ان کی جمع ہواریت اور مواریت ہے جیسے طواغیت، کہا جاتا ہے ہوارتہ و ہوارد و موارتہ و موار اس کی مثل جالوت اور طالوت ہے، یہ پیچھے گزر چکا ہے کہ یہ دونوں فرشتے تھے یا اس کے علاوہ تھے۔ اس میں اختلاف ہے زجاج نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرشتوں پر جو اتارا گیا تھا اور فرشتے جادو سے ڈرانے کی تعلیم لوگوں کو دیتے تھے نہ ان کی طرف دعوت دینے کی تعلیم دیتے تھے۔ زجاج نے کہا: یہ اکثر اہل لغت اور اہل نظر لوگوں کا قول ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس سے رکنے کی تعلیم دیتے تھے وہ انہیں کہتے تھے کہ ایسا نہ کرو ایسا حیلہ نہ کرو تا کہ تم مرد اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کر دو۔ اس پر نبی (روکنا) اتارا گیا تھا وہ گویا لوگوں سے کہتے ایسا عمل نہ کرو۔ **يُعَلِّمَانِ** بمعنی **يُعَلِّمَانِ** (آگاہ کرتے تھے) جیسا کہ فرمایا **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ** (الاسراء: 70) اس میں کرم بمعنی اکرام ہے۔

**مسئلہ نمبر 21:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ**، من تاکید کے لئے زائدہ ہے تقدیر اس طرح ہے: **وَمَا يُعَلِّمَانِ أَحَدًا**، **حَتَّى يَقُولَا** حتیٰ کہ وجہ سے نصب دی گئی ہے اسی وجہ سے **نُون** حذف کیا گیا ہے ہذیل اور ثقیف کی لغت عقی (یعنی عین غیر معجبہ کے ساتھ) ہے اور **يُعَلِّمَانِ** میں ضمیر ہاروت و ماروت کے لئے ہے (1)۔ **يُعَلِّمَانِ** کے بارے میں دو قول ہیں: (1) یہ تعلیم سے اپنے باب سے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اعلام سے ہے، **التعليم** سے نہیں ہے۔ پس **يُعَلِّمَانِ** بمعنی **يُعَلِّمَانِ** ہوگا۔ کلام عرب میں **تعلم** بمعنی **اعلم** آیا ہے۔ ابن الاعرابی (2) اور ابن الانباری نے یہ ذکر کیا ہے۔

کعب بن مالک نے کہا:

تعلم رسول الله انك مدركي وان وعيدا منك كالاخذ باليد  
رسول الله ﷺ نے آگاہ کیا کہ تو مجھے پانے والا ہے اور تیری وعید، ہاتھ سے پکڑنے کی طرح ہے۔  
القطامي نے کہا:

تعلم ان بعد الغي رشدا وان لذلك الغي انقشاعا  
اس نے آگاہ کیا کہ گمراہی کے بعد ہدایت ہے، اس گمراہی کو (ایک دن) چھٹنا ہے۔  
زہیر نے کہا:

تعلمن ها لعبر الله ذاقسا فاقدر بذرعك وانظر اين تنسلك  
ایک اور شاعر کا قول ہے:

تعلم انه لا طير الا على متطير و هو الشور  
ان تمام اشعار میں **تعلم** بمعنی **اعلم** استعمال ہوا ہے۔



إِثْمَانُ خُنُ فُتْنَةٌ جب فرشتوں نے اپنا فتنہ ہونا بتا دیا تو دنیا ان سے زیادہ مسحور کن ہوئی جبکہ وہ اپنے فتنہ کو چھپاتی ہے۔  
فَلَا تَكْفُرُ ایک جماعت نے کہا: جادو کی تعلیم کے ساتھ کفر نہ کر، ایک فرقہ نے کہا: جادو کے استعمال کے ساتھ کفر نہ کر۔  
مہدوی نے کہا: یہ استہزا ہے کیونکہ وہ دونوں اسے یہ کہتے جس کی گمراہی متحقق ہوتی۔ (1)

**مسئلہ نمبر 22:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا سَيُؤَيِّدُ بَعْضُهُمَ الْبَعْضَ وَمَا يَعْلَمَانِ (وما یعلمان) اگر اس پر مانا فیہ داخل ہوا ہے تو اس کے ضمن میں تعلیم میں ایجاب ہے (2)۔ فراء نے کہا یہ قول یُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ کی طرف لوٹا یا گیا ہے یعنی وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور سیکھتے تھے۔ اور فَيَتَعَلَّمُونَ کا قول إِثْمَانُ خُنُ فُتْنَةٌ کے قول سے متصل ہوگا۔ پس وہ آتے تھے اور سیکھتے تھے۔ سدی نے کہا: وہ دونوں کہتے تھے جو بھی ان کے پاس آتا تھا ہم آزمائش ہیں تو کفر نہ کر اگر وہ لوٹنے سے انکار کرتا تو وہ اسے کہتے راہ لے آ اور اس میں پیشاب کر جب وہ پیشاب کرتا تو اس سے ایک نور نکلتا جو آسمان کی طرف چڑھ جاتا۔ یہ ایمان ہوتا تھا۔ پھر اس سے سیاہ دھواں نکلتا تھا وہ اس کے کان میں داخل ہو جاتا تھا یہ کفر تھا۔ جب وہ انہیں اس کے متعلق بتاتا جو اس نے دیکھا ہوتا تو وہ اسے جادو بتاتے جس کے ساتھ وہ میاں بیوی میں جدائی کرتا (3)۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ جادو گر اس سے زیادہ پر قادر نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے تفریق کے متعلق بتایا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جادو کی مذمت اور اس کی تعلیم کی غایت کا اظہار کرنے کے لئے اس کو ذکر کیا ہے، اگر وہ اس سے زیادہ پر قادر ہوتا تو اسے بھی ذکر فرماتا۔

ایک طائفہ نے کہا: یہ اغلب سے ذکر کیا ہے۔ اس کا انکار نہیں کہ جادو کی دلوں میں تاثیر ہوتی ہے، محبت، بغض اور شر پیدا کرنے کے اعتبار سے حتیٰ کہ جادو گر میاں، بیوی کے درمیان تفرقہ ڈال دیتا ہے۔ اور وہ مرد اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ یہ تکالیف کے داخل کرنے اور بڑی بڑی بیماریوں میں مبتلا کرنے کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ سب مشاہدہ سے پایا گیا ہے اور اس کا انکار ہٹ دھرمی ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 23:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا هُمْ بِضَآئِرٍ يَمَيِّنُ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ، مَا هُمْ يَ جَادُوْغُرُوْں کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے فرمایا: یہود کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے کہا: شیاطین کی طرف اشارہ ہے بِضَآئِرٍ يَمَيِّنُ بِهِ، یہ کی ضمیر جادو کی طرف لوٹ رہی ہے مِنْ أَحَدٍ میں مِنْ زائدہ ہے۔ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ اللہ کے ارادہ اور اس کی قضا سے نہ کہ اس کے امر سے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ برائیوں کا حکم نہیں دیتا اور اس کے ساتھ اپنی مخلوق پر فیصلہ فرماتا ہے۔ زجاج نے کہا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ کا مطلب ہے الا بعلم اللہ (یعنی اللہ کے علم سے)۔

نحاس نے کہا ابواسحاق کا قول، إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ، الا بعلم اللہ کے معنی میں ہے، غلط ہے کیونکہ علم میں وقد أذنت أذن کہا جاتا ہے، لیکن ان کے اور اس کے درمیان یہ حلال نہیں تھا اور وہ ایسا کرتے تھے تو گویا اس نے مجازاً مباح کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 24:** وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ یعنی آخرت میں نقصان دے گی۔ اگرچہ انہوں نے دنیا میں اس کے ساتھ

تھوڑا سا نفع حاصل کیا۔ بعض نے فرمایا: دنیا میں وہ اسے نقصان دے گا کیونکہ جادو کا نقصان اور تفریق دنیا میں جادوگر پر لوٹتی ہے جب وہ دریافت ہو جائے، کیونکہ اسے تادیب کی جاتی ہے اور اسے جھڑکا جاتا ہے اور اسے جادو کی نحوست لاحق ہوتی ہے۔ باقی آیات واضح ہیں کیونکہ ان کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَلَقَدْ عَلِمُوا فِي لَامِ تَاكِيْدٍ هِيَ لَتَيْنِ اسْتَوِيْدُ لَامِ قِسْمِ كِ لَئِیْ هِیْ یَیْهِیْ تَاكِيْدِ كِ لَئِیْ هِیْ اَوْر مِّنْ مَّجْل رَفْعِ مِیْ مَبْتَدَا هِیْ كِیَوْنِكِ لَامِ كَا مَقْبَلِ اس كِیْ مَابَعْدِ مِیْ عَمَلِ نَہِیْ كِرْتَا۔ اَوْر مِّنْ بِمَعْنِیِ الذی ہِیْ۔ فَرَاۤءِ نِیْ كِبَا: یَیْهِیْ مَجَازَاتِ كِ لَئِیْ هِیْ۔ زَجَا جِ نِیْ كِبَا: یَیْهِیْ شَرْطِ كِیْ جَگَہِیْ ہِیْ اَوْر مِّنْ بِمَعْنِیِ الذی ہِیْ جِیْہِیْ تَوَكَبْتَا ہِیْ: عَلِمْتَ لَمِنْ جَاءَكَ مَالُهُ عَقْلٌ - (مِنْ خَلَاقِ) مِّنْ زَاكِدِہِیْ ہِیْ تَقْدِیْرِ اس طَرَحِ ہِیْ مَالِہِیْ فِی الْاٰخِرَةِ خَلَاقِ اَوْر مَبْتَدَا كَلَامِ مِیْ مِّنْ زَاكِدِہِیْ ہِیْ۔ یَیْہِیْوِیْ كَا قَوْلِ ہِیْ۔ كُفِیْوِیْ نِیْ كِبَا: كَبْہِیْ مَبْتَدَا مِیْ ہِیْ زَاكِدِہِیْ ہِیْ اَوْر اَنہِیْوِیْ نِیْ اس قَوْلِ سِیْ اسْتِدْلَالِ كِیَا ہِیْ: وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (آل عمران: 31)

الخلاقی کا معنی حصہ ہے۔ یہ مجاہد کا قول ہے (1)۔ ز جاج نے کہا: اہل لغت کے نزدیک اسی طرح ہے مگر یہ خیر کے حصہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس ارشاد کے متعلق پوچھا گیا: وَلَقَدْ عَلِمُوا لَتَيْنِ اسْتَوِيْدُ مَالِہِیْ فِی الْاٰخِرَةِ مِّنْ خَلَاقِ پہلے بتایا کہ وہ جان چکے تھے پھر فرمایا وَلَتُنْسِ مَا شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُوْنَ بتایا کہ وہ نہیں جانتے اس کا جواب وہ ہے جو قطرب اور اخفش نے دیا ہے۔ جو جانتے تھے وہ شیاطین تھے اور جنہوں نے اپنے نفسوں کو بیچا وہ انسان تھے جو نہیں جانتے تھے۔ ز جاج نے کہا: علی بن سلیمان نے کہا: میرے نزدیک عمدہ یہ ہے کہ وَلَقَدْ عَلِمُوا یہ فرشتوں کے لئے ہو کیونکہ وہ جاننے کے زیادہ مستحق ہیں اور فرمایا عَلِمُوا (حالانکہ وہ دوتھے) تو یہ ایسے ہے جیسے کہا جاتا ہے الزیدان قاموا۔ ز جاج نے کہا: جنہوں نے جانا وہ علماء یہود ہیں۔ لیکن کہا گیا ہے: لَوْ كَانُوا يَعْلَمُوْنَ پس وہ اس شخص کی جگہ داخل ہوئے جس کو کہا جاتا ہے: لست بعالم تو عالم نہیں ہے کیونکہ انہوں نے اپنے علم کے مطابق اپنا عمل ترک کر دیا اور ان سے رہنمائی حاصل کی جنہوں نے جادو کا عمل کیا تھا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوا وَاَتَّقُوا لَشَوْا ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۱﴾

”اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگار بنتے تو (اس کا) ثواب اللہ کے ہاں بہت اچھا ہوتا۔ کاش! وہ کچھ جانتے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوا وَاَتَّقُوا لَشَوْا ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُوْنَ۔ یہ بعض علماء کے نزدیک لو کا جواب ہے۔ اخفش سعید نے کہا: یہاں لو کا جواب لفظاً نہیں ہے لیکن معنی ہے۔ اس کا معنی ہے لاشیبا۔ انہم میں اُن کا محل رفع ہے یعنی لو دقع ایسا انہم۔ کیونکہ لو کے ساتھ ہمیشہ فعل ظاہر یا مضر متصل ہوتا ہے کیونکہ یہ حروف شرط کے قائم مقام ہے کیونکہ اس کے لئے جواب ضروری ہے اور (ان) اس کے ساتھ فعل متصل ہوتا ہے۔ محمد بن زید نے فرمایا: لو کے ساتھ مجاز جائز نہیں کیونکہ تمام حروف مجازات ماضی کو مستقبل کے معنی میں کر دیتے ہیں جب لو میں یہ معنی نہیں ہے تو اس سے مجازات بھی جائز نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاَسْمِعُوا ۚ وَلِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ

الْيَمِّ ﴿۳۲﴾

1۔ تفسیر طبری زیر آیت 32

”اے ایمان والو! (میرے حبیب سے کلام کرتے وقت) مت کہا کرو ”راعنا“ بلکہ کہو ”انظرنا“ اور (ان کی بات پہلے ہی) غور سے سنا کرو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔“  
اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا يَهُودُ كِي جہالتوں میں سے ایک اور چیز کو ذکر فرمایا۔ اور مقصود مسلمانوں کو اس کی مثل سے روکنا ہے۔ راعنا کی حقیقت لغت میں أَرْعِنَا و لَنْرَعُنَا۔ کیونکہ باب مفاعلہ دو آدمیوں سے ہوتا ہے۔ پس یہ رعنا اللہ سے مشتق ہوگا یعنی تو ہماری حفاظت کر اور ہم تمہاری حفاظت کریں گے و ارقبنا و لَنْرَقِبُنَا۔ آپ ہمارا خیال کریں ہم تمہارا خیال کریں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارعنا سمعنا سے مشتق ہو یعنی آپ ہماری کلام کے لئے اپنے سننے کو فارغ کریں۔ اس خطاب میں جفاء ہے۔ پس مومنین کو حکم دیا کہ الفاظ میں اچھے الفاظ استعمال کریں اور معافی میں سے لطیف معافی اختیار کریں (1)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: مسلمان نبی کریم ﷺ سے عرض کرتے راعنا یعنی وہ رغبت و طلب کی جہت سے عرض کرتے کہ آپ ہماری طرف نظر التفات فرمائیں اور یہ یہود کی زبان میں بددعا تھا۔ یعنی تم سنو تو کبھی نہ سنے، پس یہود نے موقع کو غنیمت جانا اور کہا: پہلے ہم اسے مخفی طور پر بددعا دیتے تھے اب ہم اسے جہراً بددعا دیں گے وہ نبی کریم ﷺ کو اس لفظ سے مخاطب کرتے تھے اور آپس میں ہنستے تھے۔ حضرت سعد بن معاذ نے ان سے یہ کلمہ سنا، حضرت سعد ان کی لغت جانتے تھے۔ حضرت سعد نے یہود سے کہا: تم پر اللہ کی لعنت ہو اب اگر میں نے تم میں سے کسی کو نبی کریم ﷺ کو ایسے کہتے سنا تو میں اس کی گردن اتار دوں گا۔ یہود نے کہا: کیا تم یہ کلمہ نہیں کہتے ہو تو یہ آیت نازل ہوئی۔ مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا تا کہ لفظ میں یہود اقتدا نہ کریں اور اس سے وہ فاسد معنی کا قصد نہ کریں۔

**مسئلہ نمبر 2:** اس آیت میں دو دلیل ہیں: (1) ایسے الفاظ استعمال کرنے سے اجتناب کرنا جس میں تنقیص شان اور عظمت میں کمی کا اشارہ ہو، اور اس سے تعریضاً قذف کا سمجھنا نکلتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حد کا موجب ہے جبکہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور ان کے اصحاب کے نزدیک حد واجب نہیں۔ انہوں نے تعریض (اشارۃ کلام کرنا) قذف اور غیر قذف کا احتمال رکھتی ہے اور حد شبہات سے ساقط ہو جاتی ہے۔ تفصیلی بیان ان شاء اللہ سورۃ النور میں آئے گا۔ (2) سد ذرائع کو مضبوطی سے پکڑنا اور آپ کی حمایت کرنا۔ یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کا مسلک ہے اور ایک روایت امام احمد بن حنبل سے بھی یہی ہے اس اصل پر کتاب و سنت دلالت کرتی ہے ذریعہ اس امر کو کہتے ہیں جو فی نفسہ ممنوع نہیں ہوتا لیکن اس کے کرنے سے ممنوع کام میں وقوع کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کتاب اللہ کی دلیل تو یہ آیت کریمہ ہے، اس سے تمسک کی وجہ یہ ہے کہ یہود یہ لفظ استعمال کرتے تھے ان کی لغت میں یہ بددعا تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ جان لیا تو مطلقاً اس لفظ کے استعمال سے ہی منع فرما دیا کیونکہ یہ بددعا کا ذریعہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام: 108)



اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے بتوں کو گالی دینے سے منع فرمایا اس اندیشہ سے کہ مقابلہ میں وہ اللہ تعالیٰ کو گالی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَسَأَلْنَهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ الْآيَةِ (الاعراف: 163)** اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن شکار حرام کر دیا۔ ہفتہ کے دن مچھلیاں پانی کی سطح پر ظاہر ہو کر آتی تھیں وہ انہیں ہفتہ کے دن روک دیتے تھے اور اتوار کے دن پکڑ لیتے تھے۔ پس روکنا شکار کا ذریعہ تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندروں اور خنازیر میں انہیں مسخ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ہمارے لئے تحذیر کے لئے ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم و حوا کو فرمایا: **وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ (البقرہ: 35)** یہ پہلے گزر چکا ہے۔

رہیں احادیث، تو اس مفہوم میں بہت سی احادیث صحیحہ ثابت ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حضرت ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے ایک کنیہ کا ذکر کیا جو انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا اس میں تصاویر تھیں۔ انہوں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ لوگ تھے ان میں کوئی نیک شخص ہوتا تھا پھر وہ مرجاتا تھا تو یہ اس کی قبر پر مسجد بناتے تھے اور اس میں ان نیک لوگوں کی تصویریں بناتے تھے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک برے ترین لوگ ہیں (1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: ان کے پہلے لوگوں نے یہ عمل اس لئے کیا تھا تا کہ ان تصویروں کو دیکھ کر انس حاصل کریں اور ان کے احوال صالحہ کو یاد کریں اور یہ بھی ان کی طرح کوشش اور محنت کریں اور ان کی قبور کے پاس اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ پس ان پر جب عرصہ دراز گزر گیا پھر ان کے بعد کے لوگ آئے جو پہلے لوگوں کی اغراض سے جاہل تھے۔ شیطان نے ان میں دوسوہ ڈالا کہ تمہارے آباء و اجداد ان تصویروں کی عبادت کرتے تھے۔ پس انہوں نے ان کی عبادت شروع کر دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مثل سے منع فرمایا اور جو ایسا کرے اس پر سخت انکار اور وعید فرمائی اور جو کام اس عمل تک پہنچانے والے تھے ان سے بھی روک دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہے جس نے اپنے انبیاء اور نیک لوگوں کی قبور کو مساجد بنایا اور فرمایا: اے اللہ! میری قبر کو ایسا بت نہ بنانا جس کی عبادت کی جائے۔ مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے ان کے درمیان متشابہات امور ہیں جو ان شبہات سے بچے گا وہ اپنے دین اور اپنی عزت کو بچالے گا اور جو شبہات میں واقع ہوگا وہ حرام میں واقع ہوگا جیسے چرواہا چراگاہ کے ارد گرد (مویثی) چراتا ہے قریب ہے کہ وہ اس میں واقع ہو جائے۔ (الحديث) (2)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شبہات کی طرف جانے سے منع فرمایا اس خوف سے کہ وہ محرمات میں واقع ہو جائے گا۔ یہ سد ذرائع ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ متیقن میں سے نہیں ہوتا حتیٰ کہ وہ اس چیز کو ترک نہ کر دے جس میں کوئی حرج نہیں احتیاط کرتے ہوئے کہ یہ ان چیزوں میں سے ہو جس میں حرج ہے (3)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کبیرہ گناہوں میں سے اپنے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب بناء المسجد علی القبر، حدیث نمبر 1255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الحلال بیون والحرام بیون و بینہما مشبہات، حدیث نمبر 1910، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، باب الورع والتقوی، حدیث نمبر 4204، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والدین کو گالی دینا ہے۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دیتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ ایک شخص دوسرے کے والد کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے۔ وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے جو دوسرے کے والدین کو گالی دیتا ہے اسے اپنے والدین کو گالی دینے والا فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم بیع عینہ کرو گے اور گائیوں کے دموں کو پکڑو گے اور کھیتی پر خوش ہو گے اور جہاد کو ترک کر دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت کو مسلط فرمائے گا اور یہ ذلت تم سے دور نہیں کرے گا حتیٰ کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ (1)۔ ابو عبید اللہ روئے نے کہا: بیع عینہ یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے شخص کو معلوم قیمت کے ساتھ مخصوص مدت تک ایک چیز فروخت کرتا تھا پھر بیچنے والا اس خریدنے والے سے وہی چیز اس سے کم قیمت میں خرید لیتا تھا۔

فرمایا: اگر بیع عینہ طلب کرنے والے کی موجودگی میں سامان کسی دوسرے شخص سے معلوم ثمن کے ساتھ خریدے۔ پھر وہ قبضہ کرے پھر وہ عینہ طلب کرنے والے کو اس قیمت سے زیادہ پر بیچ دے، جس میں اس نے خریدی تھی ایک معین مدت تک، پھر یہ مشتری پہلے بائع کو نقد فروخت کرے کم قیمت پر تو یہ بھی بیع عینہ ہوگی۔ یہ پہلی صورت سے زیادہ آسان ہے اور بعض کے نزدیک یہ جائز ہے، اس کو بیع عینہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ صاحب عینہ کو نقدی حاصل ہوتی ہے، یہ اس لئے ہے کہ حاضر مال موجود ہے مشتری اسے خریدتا ہے تاکہ عین حاضر مال کے ساتھ اسے بیچے جو اسے جلدی مل جائے۔

ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ حضرت زید بن ارقم کی ام ولد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ذکر کیا کہ اس نے زید کو ایک غلام آٹھ سو میں ادھار بیچا ہے پھر اس سے نقد چھ سو میں خرید لیا ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: برا ہے جو تو نے بیچا ہے اور برا ہے جو تو نے خریدا ہے۔ زید کو یہ پہنچاؤ کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں کیے ہوئے جہاد کو باطل کر دیا اگر اس نے اس بیع سے توبہ نہ کی۔ یہ حضرت عائشہ نے یقیناً اپنی رائے سے نہیں کہا ہوگا کیونکہ اعمال کا باطل کرنا، اس کی معرفت صرف وحی سے ہو سکتی ہے، تو ثابت ہوا کہ یہ مرفوع حدیث ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سود اور شک (والی بیع) کو چھوڑو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دراہم کی دراہم کے ساتھ بیع کرنے سے منع فرمایا جن کے درمیان حریزہ ہو۔

میں کہتا ہوں: یہ ہمارے سد ذرائع پر دلائل ہیں، اس پر مالکی علماء نے بیوع وغیرہ میں کتاب الآجال وغیرہ مسائل کی بنیاد رکھی ہے۔ شوافع کے نزدیک کتاب الآجال (مدت کے بارے میں مسائل) نہیں کیونکہ یہ ان کے نزدیک مختلف مستقل عقود ہیں۔ انہوں نے کہا: اشیاء کی اصل ظواہر پر ہے نہ کہ ظنون (گمان) پر ہے۔ مالکی علماء نے اس سامان کو زیادہ دراہم کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے اور یہ عین رہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَقُولُوا رَاعِنَا۔ یہ نبی تحریمی ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ حضرت حسن نے راعنا پڑھا یہ یعنی تنوین کے ساتھ اور فرمایا: اس کا مطلب ہے: نامناسب بات۔ یہ مصدر ہے قول کی وجہ سے اسے نصب دی گئی ہے۔ یعنی لَا تَقُولُوا رَاعُونَ۔ اور زر بن حبیش اور اعش نے راعونا پڑھا ہے، یہ پہاڑ کی چوٹی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جبل

1۔ سنن ابی داؤد، باب لی النہی عن العینۃ، حدیث نمبر 3003، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ارعن چوٹی والا پہاڑ، جیش ارعن یعنی متفرق لشکر۔ اسی طرح رجل ارعن، متفرق جتوں والا جس کی عقل مجتمع نہ ہو، نحاس سے یہ مروی ہے۔ ابن فارس نے کہا رعن الرجل یروعن رعنًا فهو أرعن، محتاج شخص، المرأة رعناء، بلند عورت، بصرہ کو رعناء کہتے ہیں کیونکہ وہ پہاڑ کی بلندی کے مشابہ ہے۔ ابن درید نے یہی کہا ہے۔ فرزدق نے کہا ہے:

لو لا ابن عتبہ عمرو والرجاء له ما كانت البصرة الرعناء لی وطناً  
اگر ابن عتبہ عمرو نہ ہوتا اور اس کی امید نہ ہوتی تو بصرہ رعناء میرا وطن نہ ہوتا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقُولُوا انْظُرْنَا مسلما نون کو حکم دیا گیا کہ حضرت محمد ﷺ کو عزت و احترام سے مخاطب کرو۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری طرف توجہ فرمائیں، ہماری طرف نظر کرم فرمائیں۔ تعدیہ کا حرف حذف کیا گیا ہے یعنی تقدیر یوں ہے: وانظر الینا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ظاہرات الجمال والحسن ينظر ن كما ينظر الاراك الظباء  
ظاہری حسن و جمال والی دیکھی جاتی ہیں جس طرح ہرنیاں اراک بان کے درخت کو دیکھتی ہیں۔  
اس شعر میں عبارت الی الاراک تھا۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہمیں سمجھائیے اور ہمارے لئے بیان فرمائیے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے ہمارا انتظار فرمائیے اور ہمارے ساتھ آہستہ آہستہ کلام فرمائیے۔ شاعر نے کہا:

فانكما ان تنظرانی ساعة من الدهر ينفعنی لدی امر جندب  
تم دونوں اگر ایک گھڑی میری طرف دیکھ لو تو مجھے ام جندب کے سامنے یہ نفع دے گا۔  
ظاہر اس کا مطلب آنکھ سے دیکھنے کی استدعا ہے جو دیکھنا تدبر حال سے مقترن ہو۔ یہ داعنا کا معنی ہے، مومنین کے لئے لفظ بدل دیا گیا اور یہود کا تعلق زائل ہو گیا۔ اعمش وغیرہ نے انظرنا ہمزہ قطعی اور ظاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ہمیں مہلت دیجئے حتیٰ کہ ہم آپ کی بات سمجھ جائیں اور آپ سے مفہوم حاصل کر لیں۔ (1)  
شاعر نے کہا:

ابا هندب فلا تعجل عیدنا وانظرنا نخبرک الیقینا  
اے ابوہند! ہم پر جلدی نہ کر اور ہمیں مہلت دے، ہم تجھے یقینی خبر دیں گے۔  
**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاسْمَعُوا پہلے نہیں فرمائی اب حکم دیا۔ سننے کا حکم دیا جس کے ضمن میں اطاعت ہے۔ جان لو! جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرے گا وہ کافر ہوگا عذاب الیم کا مستحق ہوگا۔ (2)

مَا يَوْذَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ



مِنْ رَبِّكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٥٠﴾

”نہیں پسند کرتے وہ لوگ جو کافر ہیں اہل کتاب سے اور نہ مشرک کہ اتاری جائے تم پر کچھ بھلائی تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص فرما لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا فضل (فرمانے والا ہے)۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا يَوْذُ یعنی خواہش نہیں کرتے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ، وَلَا الْمُشْرِكِينَ، اہل پر معطوف ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وَلَا الْمُشْرِكِينَ کا عطف الَّذِينَ پر ہو۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ اَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ، من زائدہ ہے خیر فعل مجہول کا اسم ہے اَنْ بجل نصب میں ہے، یعنی بان یُنزل - وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ - یعنی بنبوۃ - یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے ساتھ مختص فرمایا (1)۔ ایک قوم نے کہا: الرحمة سے مراد قرآن ہے (2)۔ بعض نے فرمایا: اس آیت میں رحمت عام ہے ان تمام انواع رحمت کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر پہلے فرمائیں اور جواب فرما رہا ہے (3)۔ کہا جاتا ہے: رحم یرحم جب کوئی نرم ہو جائے، الرحم والرحمة والرحمة تمام کا ایک معنی ہے۔ ابن فارس نے یہ کہا ہے: رحمة الله لعباده، الله تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انعام فرمانا اور انہیں معاف کرنا مراد ہے وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔ ذُو بمعنی صاحب ہے۔

مَا نُنَسِّخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلَهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ

شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٥١﴾

”جو آیت ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش کر دیتے ہیں تو لاتے ہیں (دوسری) بہتر اس سے یا (کم از کم) اس جیسی کیا تجھے علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے۔“

اس میں پندرہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا نُنَسِّخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلَهَا کا عطف تنسخ پر ہے، جزم کی وجہ سے یا کو حذف کیا گیا ہے اور جنہوں نے تنسأھا پڑھا ہے انہوں نے جزم کی وجہ سے ہمزہ کو حذف کر دیا ہے اس کا معنی آگے آئے گانات یہ جواب شرط ہے۔ یہ احکام میں ایک عظیم آیت ہے اس کا سبب یہ ہے کہ یہود نے جب مسلمانوں سے کعبہ کی طرف منہ کرنے میں حسد کیا اور اس کی وجہ سے اسلام پر طعن کیا اور کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اپنے اصحاب کو ایک چیز کا حکم دیتا ہے پھر اس سے منع کر دیتا ہے۔ پس قرآن ان کی طرف سے ہے اسی وجہ سے قرآن کا بعض، بعض کے مخالف ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَإِذَا بَلَغْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ (نحل: 101) اور مَا نُنَسِّخْ مِنْ آيَةٍ کا ارشاد نازل فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 2:** اس باب کی معرفت بڑی مؤکد ہے اور اس کا عظیم فائدہ یہ ہے کہ اس کی معرفت سے علماء کو بھی استغناء نہیں اس کا انکار صرف غبی جہلاء ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس پر بہت احکام مرتب ہوتے ہیں حرام سے حلال کی معرفت ہوتی ہے۔ ابوالخثری نے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے جبکہ وہاں ایک شخص لوگوں کو ڈرا رہا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یہ اجتماع کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا: ایک شخص لوگوں کو وعظ و نصیحت کر رہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ شخص لوگوں کو نصیحت نہیں کر رہا بلکہ یہ کہہ رہا ہے: میں فلاں ابن فلاں ہوں مجھے پہچانو! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے بلایا اور پوچھا: کیا تو ناسخ، منسوخ کا علم رکھتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہماری مسجد سے نکل جا اس میں تو وعظ و نصیحت نہ کر۔ دوسری روایت میں ہے، کیا تو ناسخ و منسوخ کو جانتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو خود بھی ہلاک ہوا اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

اس کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** عرب کلام میں نسخ دو وجوہ سے ہے:

۱۔ ایک اس کا معنی نقل کرنا ہے جیسے ایک کتاب سے دوسری کتاب کو نقل کرنا، اس معنی کے اعتبار سے پورا قرآن منسوخ ہوگا یعنی یہ لوح محفوظ سے نقل ہوا ہے اور بیت العزت کی طرف آسمان دنیا میں اترتا ہے۔ اس آیت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **إِنَّا كُنَّا نَسْتَنسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ** (الباقیہ) یعنی ہم اس کے لکھنے اور اس کے اثبات کا حکم دیتے ہیں۔ (1)

۲۔ نسخ کا دوسرا معنی ابطال اور زائل کرنا ہے۔ یہاں یہی مقصود ہے اور یہ لغت میں پھر دو قسموں میں منقسم ہے: (۱) کسی شے کو ختم کر دینا اور زائل کر دینا اور دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کر دینا۔ اس سے **نسخت الشمس الظل**، جب سورج سائے کو مٹا دے اور اس کے قائم مقام دوسرے سائے کو کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہی معنی ہے: **مَا نُنَسِخُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا**، اور صحیح مسلم میں ہے: **لَمْ تَكُنْ نُبُوَّةَ قَطٍ إِلَّا تَنَاسَخَتْ** یعنی نبوت ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پھرتی رہی یعنی امت کا معاملہ پھرتا رہا۔ ابن فارس نے کہا: نسخ کا معنی کتاب کا نقل کرنا، اور انسخ کا معنی کسی ایسے امر کو ختم کر دینا جس پر پہلے عمل ہو رہا تھا پھر تو اسے کسی حادثہ کی وجہ سے ختم کر دے، جیسے کسی خاص امر کے لئے ایک آیت نازل ہوتی پھر دوسری آیت کے ساتھ وہ منسوخ ہو جاتی۔ ہر وہ چیز جو کسی شے کے قائم مقام ہو جائے تو اس نے اسے منسوخ کر دیا۔ کہا جاتا ہے: **اتنسخت الشمس الظل**، الشیب الشباب سورج نے سائے کو ختم کر دیا، بڑھاپے نے جوانی کو ختم کر دیا۔ **تناسخ الورثة** ورثاء دوسرے ورثاء کے بعد مر گئے، اور میراث کی اصل قائم ہے۔ تقسیم نہیں ہوئی۔ اسی طرح **تناسخ الازمنة والقرون** ہے یعنی ہر زمانہ اور ہر قوم پہلے زمانہ اور پہلی قوم کو ختم کر دیتی ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ چیز کو ختم کر دینا اور اس کے قائم مقام دوسری چیز نہ رکھنا۔ جیسے **نسخت الريح الاثر** (2) ہوائے اثر مٹا

دیا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ (الحج: 52)** (جو شیطان ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ختم کر دیتا ہے) اس کی تلاوت تمہیں کی جاتی اور اس کا بدل مصحف میں ثابت نہیں ہوتا۔ ابو عبید نے کہا: یہ نسخ کی دوسری قسم تھی کہ نبی کریم ﷺ پر ایک سورت نازل ہوتی تھی پھر وہ اٹھالی جاتی تھی نہ اس کو پڑھا جاتا تھا اور نہ اس کو لکھا جاتا تھا۔

میں کہتا ہوں: اسی سے وہ روایت ہے جو حضرت ابی بن کعب اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورہ احزاب، طوالت میں سورہ بقرہ کے برابر تھی جیسا کہ سورہ احزاب میں یہ تفصیل سے بیان ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس پر ایک دلیل یہ بھی ہے جو ابو بکر انباری نے بیان کی۔ فرمایا: مجھے میرے باپ نے بیان کیا، انہوں نے فرمایا: ہمیں نصر بن داؤد نے بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں ابو عبید نے بیان کیا ہمیں عبداللہ بن صالح نے بیان کیا انہوں نے لیث سے انہوں نے یونس اور عقیل سے انہوں نے ابن شہاب سے روایت کیا، فرمایا: مجھے ابو امامہ بن سہل بن حنیف نے حضرت سعید بن مسیب کی مجلس میں بیان کیا کہ ایک شخص رات کو اٹھاتا کہ قرآن کی سورت تلاوت کرے تو وہ اس میں سے کچھ بھی پڑھنے پر قادر نہ ہوا۔ دوسرا اٹھا تو وہ بھی کوئی آیت پڑھنے پر قادر نہ ہوا، تیسرا اٹھا تو وہ بھی اس سورت میں سے کچھ پڑھنے پر قادر نہ ہوا۔ وہ صبح رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ ایک نے کہا میں یا رسول اللہ! کھڑا ہوتا کہ قرآن کی سورت پڑھوں تو میں اس کی کوئی آیت پڑھنے پر قادر نہ ہوا، دوسرا اٹھا اس نے کہا: یا رسول اللہ! تیسرا اٹھا اس نے کہا: اللہ کی قسم! یا رسول اللہ! میری بھی یہی کیفیت تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ سورت گزشتہ رات اللہ تعالیٰ نے منسوخ کر دی۔ ایک روایت میں ہے، سعید بن مسیب سنتے تھے جو ابو امامہ بیان کرتے تھے اور انکار نہیں کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 4:** متاخرین علماء اسلام کے ایک طائفہ نے اس کے جواز کا انکار کیا ہے اور ان کے خلاف یہ حجت پیش کی گئی ہے کہ سلف صالحین کا اجماع ہے کہ شریعت میں نسخ واقع ہوا ہے۔ اسی طرح یہود کے ایک گروہ نے بھی نسخ کا انکار کیا ہے، اس کے خلاف یہ حجت پیش کی گئی ہے کہ ان کے اپنے خیال کے مطابق تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی سے نکلنے کے وقت فرمایا: ہر چو پایہ تمہارے لئے اور اولاد کے لئے خوراک ہے اور میں نے یہ تمہارے لئے مطلق رکھا ہے جیسے نبات تمہارے لئے حلال کی ہیں لیکن خون حلال نہیں ہے اسے نہ کھانا پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور بنی اسرائیل پر بہت سے حیوان حرام کر دیئے۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام بھائی کی بہن سے شادی کرتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء پر اس کو حرام کر دیا اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا پھر فرمایا تو اسے ذبح نہ کر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ اپنے ان لوگوں کو قتل کریں جو چھڑے کی پوجا کرتے ہیں پھر ان سے تلوار اٹھانے کا حکم دیا، پہلے وہ اپنی نبوت کے ساتھ مکلف نہ تھے پھر اس کے بعد اس کے ساتھ مکلف ہوئے۔ یہ البداء سے نہیں ہے بلکہ یہ بندوں کو ایک عبادت سے دوسری عبادت کی طرف نقل کرنا ہے اور ایک حکم کو دوسرے حکم کی طرف نقل کرنا ہے اس میں کوئی خاص حکمت ہوتی ہے، جس کا اظہار مقصود ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مملکت کا کمال مقصود ہوتا ہے۔ اس میں عقلاء کا کوئی اختلاف نہیں کہ انبیاء کرام کی شریعتوں سے مخلوق کے دنیوی اور اخروی مصالح کا



قصد کیا گیا ہے، بداء تو تب لازم آتی جب وہ امور کے انجام کو جاننے والا نہ ہوتا اور جو انجام کو جاننے والا ہوتا ہے وہ مصالح کی تبدیلی کے مطابق اپنے خطابات کو تبدیل کرتا ہے، جیسے طبیب اپنے مریض کے احوال کے مطابق خطابات کو بدلتا ہے اس نے اپنی مشیت اور ارادہ سے اپنی مخلوق میں یہ تبدیلی رکھی ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کا خطاب بدلتا ہے۔ اس کا علم اور اس کا ارادہ تبدیل نہیں ہوتا اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کی جہت سے محال ہے۔

یہود نے نسخ اور بداء کو ایک چیز بتایا ہے اسی وجہ سے انہوں نے نسخ کو جائز قرار نہیں دیا، پس وہ گمراہ ہوئے (1)۔ نحاس نے کہا: نسخ اور البداء کے درمیان فرق یہ ہے کہ نسخ کا مطلب ہے ایک عبادت کو دوسری عبادت کی طرف بدلنا، (مثلاً) پہلے ایک چیز حلال تھی اسے حرام کر دیا، پہلے ایک چیز حرام تھی پھر اسے حلال کر دیا اور البداء یہ ہے کہ پہلے جس چیز پر عزم کیا گیا ہے اسے ترک کر دینا جیسے تو کہتا ہے تم آج فلاں کے پاس جاؤ پھر تو کہتا ہے اس کے پاس نہ جاؤ۔ تیرے لئے پہلے قول سے عدول ظاہر ہوتا ہے یہ انسان کو لاحق ہوتا ہے ان کے نقصان اور کمی کی وجہ سے۔ اسی طرح اگر تو کہے اس سال تو یہ چیز کاشت کر پھر تو کہے یہ نہ کر، تو یہ البداء ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** نسخ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہے مجازاً خطاب شرعی کو نسخ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے نسخ واقع ہوتا ہے (2)۔ جس طرح مجازاً محکوم فیہ کو نسخ کا نام دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رمضان کے روزوں نے عاشوراء کے روزہ کو منسوخ کر دیا۔ منسوخ وہ ہوتا ہے جو زائل کیا جاتا ہے اور منسوخ عنہ وہ ہوتا ہے جو زائل کی گئی عبادت کا مکلف ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** ہمارے ائمہ کی عبارات نسخ کی تعریف میں مختلف ہیں۔ اہل سنت میں سے ماہر علماء کی رائے یہ ہے کہ پہلے حکم شرعی کو بعد میں آنے والے خطاب سے زائل کرنا ہے۔ قاضی عبدالوہاب اور قاضی ابوبکر نے بھی اسی طرح تعریف کی ہے اور انہوں نے یہ زیادہ لکھا ہے اگر یہ والا حکم نہ آتا تو پہلا حکم ہی باقی رہتا (3)۔ ان دونوں حضرات نے نسخ کے لغوی معنی کا بھی لحاظ رکھا ہے کیونکہ نسخ کا لغوی معنی اٹھا دینا اور زائل کرنا ہے اور انہوں نے حکم عقلی سے احتراز کیا ہے۔ خطاب کا لفظ ذکر کیا تا کہ وجہ دلالت نص، ظاہر، مفہوم وغیرہ کو شامل ہو جائے۔ اور قیاس اور اجماع کو خارج کر دے کیونکہ قیاس اور اجماع میں نہ تو نسخ متصور ہو سکتا ہے نہ ان کے ساتھ نسخ ہو سکتا ہے اور تراخی کے ساتھ مقید کیا ہے کیونکہ اگر بعد والا حکم پہلے سے متصل ہو تو وہ حکم کا بیان ہوتا ہے۔ نسخ نہیں ہوتا یا دوسرا کلام، پہلے کلام کو اٹھانے والا ہوتا ہے۔ جیسے قم لا تقم، تو کھڑا ہو تو کھڑا نہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 7:** منسوخ ہمارے اہل سنت کے ائمہ کے نزدیک وہ حکم ہوتا ہے جس کی ذات ثابت ہو نہ اس کی مثل جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں کہ وہ خطاب، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مستقبل میں ثابت حکم کی مثال آنے والی نص سے زائل ہونے والا ہے اور اس قول کی طرف ان کی رہنمائی ان کے مذہب نے کی ہے کہ اوامر مراد ہوتے ہیں اور حسن، حسن کی ذاتی صفت ہے اور اللہ کی مراد حسن ہے اس کو ہمارے علماء نے اپنی کتب میں رد کیا ہے۔ (4)

**مسئلہ نمبر 8:** ہمارے علماء کا اختلاف ہے کہ کیا اخبار میں نسخ داخل ہوتا ہے یا نہیں؟ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ نسخ،

او امر و نواہی کے ساتھ خاص ہے اور خبر میں نسخ داخل نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کذب محال ہے (1)۔ بعض نے فرمایا: خبر جب حکم شرعی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہو تو اس کا نسخ جائز ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا (النمل: 67)** اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 9:** عموم سے تخصیص وہم دلاتی ہے کہ یہ نسخ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا کیونکہ مخصص کو عموم شامل ہی نہیں ہوتا، اگر عموم کسی شے کو شامل ہو پھر اس شے کو عموم سے نکالا جائے تو یہ نسخ ہوگا تخصیص نہ ہوگی (2)۔ اور متقدمین علماء مجازاً تخصیص پر نسخ کا اطلاق کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 10:** کبھی شرع میں ایسی اخبار وارد ہوتی ہے جن کا ظاہر مطلق اور استغراق ہوتا ہے اور ان کی تفسیر دوسری جگہ وارد ہوتی ہے، پس وہ اطلاق اٹھ جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (البقرہ: 186)** جب پوچھیں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق تو (انہیں بتاؤ) میں (ان کے) بالکل نزدیک ہوں قبول کرتا ہوں دعا، دعا کرنے والے کی)۔

اس آیت میں حکم کا ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دعا کرنے والے کی دعا ہر حال میں قبول فرماتا ہے لیکن دوسرے مقام پر اس کی قید آئی ہے: **فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِن شَاءَ (انعام: 41)**

وہ شخص جسے بصیرت نہیں ہوتی وہ گمان کرتا ہے کہ یہ اخبار میں نسخ کے باب سے ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اطلاق اور تفسیر کے باب سے ہے۔ اس مسئلہ کا زیادہ بیان اپنے مقام پر آئے گا۔ ان شاء اللہ۔

**مسئلہ نمبر 11:** ہمارے علماء نے فرمایا (3): **اثقل (بھاری حکم) کا نسخ اخف (ہلکے حکم) کی طرف جائز ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے دس کے مقابلہ میں ایک شخص کے ٹھہرے رہنے کے حکم کو دو کے مقابلہ میں ایک شخص کے ٹھہرے رہنے کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ اور اخف حکم سے اقل کی طرف نسخ بھی جائز ہے جیسے عاشوراء کے حکم کو رمضان کے روزوں سے منسوخ کر دیا۔ اس کا بیان روزوں والی آیت میں آئے گا۔ کبھی ایک حکم کو اس جیسے حکم سے منسوخ کیا جاتا ہے جیسے ایک قبلہ کو دوسرے قبلہ سے منسوخ کر دیا۔ کبھی ایک چیز کو منسوخ کیا جاتا ہے اور اس کا بدل نہیں دیا جاتا جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ قرآن کو قرآن کے ساتھ منسوخ کیا جاتا ہے اور سنت کو عبارت سے منسوخ کیا جاتا ہے اور عبارت سے مراد "الخبر المتواتر القطعی" ہے اور خبر واحد کو خبر واحد سے منسوخ کیا جاتا ہے۔**

ماہرین ائمہ کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن، سنت سے بھی منسوخ ہوتا ہے اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں موجود ہے: لا وصیۃ لوارث کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے (4)۔ یہ امام مالک کے ظاہر مسائل سے ہے۔ امام شافعی (5) اور ابو الفرج مالکی نے اس کا انکار کیا ہے۔ پہلا قول صحیح ہے، اس دلیل سے کہ یہ سب اللہ کا حکم ہے اور اللہ کی طرف سے ہے اگرچہ اسما میں

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً

5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

4۔ سنن ابن ماجہ، باب لا وصیۃ لوارث، حدیث نمبر 2703، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اختلاف ہے۔ مثلاً شادی شدہ زانی جس کو رجم کیا جاتا ہے اس سے کوڑوں کی سزا ساقط ہے اور یہ سنت سے نبی کریم ﷺ کے فعل سے ساقط ہے اور یہ واضح ہے۔ ماہرین علماء کا یہ بھی نظریہ ہے کہ سنت، قرآن کے ساتھ منسوخ ہوتی ہے اور یہ قبلہ کی تحویل میں موجود ہے کیونکہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا کتاب اللہ میں نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ (الممتحنہ: 10) ان عورتوں کا رجوع، نبی کریم ﷺ کا قریش سے صلح کی بنا پر ہوا تھا۔

ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ عقلاً خبر واحد سے قرآن کا نسخ جائز ہے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ یہ شرعاً واقع ہوا ہے یا نہیں۔ ابوالعالی وغیرہ کا خیال ہے کہ مسجد قبا کے واقعہ میں واقع ہوا تھا اس کا بیان آگے آئے گا۔ ایک قوم نے اس کا انکار کیا ہے۔ قیاس کے ساتھ نص کا نسخ صحیح نہیں ہے، کیونکہ قیاس کی شرائط میں سے ہے کہ وہ نص کے مخالف نہ ہو۔

یہ نسخ سب نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں تھا، لیکن نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد اور شریعت کے استقرار کے بعد، امت کا اجماع ہے کہ نسخ نہیں ہے اسی وجہ سے اجماع نہ منسوخ ہوتا ہے نہ اس کے ساتھ نسخ واقع ہوتا ہے کیونکہ اجماع کا انعقاد وحی کے ختم ہونے کے بعد واقع ہوا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا اجماع پاتے ہیں جو نص کے مخالف ہوتا ہے تو پھر یہ جانا جائے گا کہ اجماع کسی نسخ نص کی طرف منسوب ہے جسے ہم نہیں جانتے..... مخالف نص ایسی ہوتی ہے جس پر عمل چھوڑا جاتا ہے اور اس کا مقتضی منسوخ ہوتا ہے لیکن اس کی تلاوت منسوخ نہیں ہوتی جیسے قرآن میں سال کی عدت والی آیت تلاوت کی جاتی ہے، اس میں غور کرو یہ ایک نفیس گفتگو ہے۔ کبھی حکم منسوخ ہوتا ہے، تلاوت منسوخ نہیں ہوتی جیسے نبی کریم ﷺ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم، کبھی تلاوت منسوخ ہوتی ہے حکم منسوخ نہیں ہوتا جیسے آیت رجم۔ کبھی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوتے ہیں اور اس سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قول ہے ہم پڑھتے تھے: لَا تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ فَانَّهُ كُفْرٌ۔ (اپنے آباء سے انحراف نہ کرو کیونکہ یہ کفر ہے)۔ اس کی مثالیں کثیر ہیں۔

ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ جس کو نسخ کا حکم نہ پہنچا ہو وہ پہلے حکم کا مکلف ہے اس کا بیان تحویل قبلہ میں آئے گا۔

ماہرین کے نزدیک حکم، عمل سے پہلے بھی منسوخ ہو سکتا ہے۔ یہ ذبیح کے واقعہ میں موجود ہے اسی طرح نمازیں پچاس فرض تھیں عمل سے پہلے پانچ نمازوں سے منسوخ کر دی گئیں جیسا کہ سورۃ الاسراء اور سورۃ الصافات میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 12:** نسخ کی پہچان کے طرق: (۱) نص کے الفاظ نسخ پر دلالت کرتے ہوں جیسے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: کنت نہیتکم عن زیارة القبور، فزورواھا (۱)۔ (میں نے تمہیں قبور کی زیارت سے منع کیا تھا۔ پس (اب) زیارت کیا کرو)۔ میں نے تمہیں مشروب پینے سے منع کیا تھا مگر چڑے کے برتنوں میں۔ پس اب ہر برتن میں مشروب پیو مگر نشہ دینے والا مشروب نہ پیو۔ (۲) راوی تاریخ ذکر کردے۔ مثلاً وہ کہے: میں نے خندق کے سال سنا تو اس سے پہلے والا حکم منسوخ معلوم ہو جائے گا یا کہے کہ فلاں فلاں حکم منسوخ ہے۔ (۳) امت کا اجماع ہو جائے کہ یہ حکم منسوخ ہے اور اس کا نسخ بعد میں آنے والا ہے۔ یہ اصول فقہ میں تفصیلی مباحث موجود ہیں ہم نے بقدر ضرورت ذکر کر دیا ہے۔ واللہ الموفق

۱۔ سلم شریف، جلد 1، صفحہ 314 کتاب الجنائز، باب فصل فی جواز زیارة القبور، فی الذہاب الی زیارة القبور (قدیمی کتب خانہ)



للہدایۃ۔ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت کی توفیق بخشنے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13:** جمہور قراء نے مانتسخہ نون کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اس معنی پر ظاہر دلالت کرتا ہے کہ ہم کسی آیت کا حکم اٹھا دیتے ہیں اور اس کی تلاوت کو باقی رکھتے ہیں جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ اس معنی کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ ہم آیت کا حکم اور تلاوت اٹھا دیتے ہیں جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ ابن عامر نے نسخہ نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ انسخت الکتاب سے مشتق ہے اس معنی پر کہ میں نے اسے منسوخ پایا۔ ابو حاتم نے کہا: یہ غلط ہے۔ الفارسی ابو علی نے کہا: یہ لغت نہیں ہے کیونکہ نسخ اور نسخ ایک معنی میں ہیں۔ یہ نہیں کہا جاتا مگر یہ کہ اس کا معنی ہو ہم اس کو منسوخ نہیں پاتے۔ جیسے تو کہتا ہے: احدث الرجل وابخلتہ، یعنی میں نے اسے محمود اور بخیل پایا۔ ابو علی نے کہا: ہم اسے منسوخ نہیں پاتے مگر یہ کہ ہم اسے منسوخ کر دیں۔ معنی میں دونوں قراءتیں متفق ہیں اور لفظ میں مختلف ہیں۔ بعض نے فرمایا: مَا نُنَسِّخُ کا مطلب ہے ہم تیرے لئے جسے نسخ کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: نسخت الکتاب جب تو کتاب کو لکھ لے۔ و انتسختہ غیری جب تو اس کے لئے لکھ دے۔ مکی نے کہا: ہمزہ کا متعدی کے لئے ہونا جائز نہیں کیونکہ اس طرح معنی تبدیل ہو جاتا ہے۔ معنی پھر یہ ہو جائے گا: اے محمد! منسوخ ہے ہم کوئی آیت تجھ پر اتارتے اور انساخہ ایسا، کا مطلب ہے: انزالہا علیہ۔ معنی یہ ہوگا: ہم تجھ پر کوئی اتارتے ہیں یا ہم اسے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کی مثل لاتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا کہ ہر آیت جو نازل ہوئی اس سے بہتر لائی گئی، تو اس طرح سارا قرآن منسوخ ہو جائے گا اور یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ قرآن کا تھوڑا حصہ منسوخ ہوا ہے جب فعل اور فعل کا ہم معنی ہونا ممتنع ہوا کیونکہ ایسا سنا نہیں گیا تو معنی کے فساد کی وجہ سے ہمزہ کا متعدی ہونا بھی ممتنع ہوتا۔ پس یہی صورت باقی رہتی ہے کہ یہ اس باب سے ہو: احدثتہ و ابخلتہ (میں نے اسے محمود اور بخیل پایا)۔

**مسئلہ نمبر 14:** اللہ تعالیٰ کا اشد ہے: اَوْنُسَّهَا ابو عمر و ابن کثیر نے نون کے فتح، سین اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابو عمر، حضرت ابن عباس، حضرت عطاء، حضرت مجاہد، حضرت ابی بن کعب، عبید بن عمیر، النخعی، ابن محیسن وغیرہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ اس کا معنی تاخیر کرنا ہے۔ یعنی ہم اس کے الفاظ کے نسخ کو مؤخر کرتے ہیں یعنی ہم اسے ”ام الکتاب“ میں چھوڑ دیتے ہیں پس وہ منسوخ نہیں ہوتی۔ یہ عطا کا قول ہے اور عطا کے علاوہ کا قول ہے کہ او نُسَّھا کا معنی ہے: ہم وقت معلوم تک نسخ کو مؤخر کرتے ہیں۔ یہ عربوں کے قول نسأت هذا الامر سے مشتق ہے یعنی جب تو کام کو مؤخر کر دے۔ اس سے یہ قول ہے: بعثتہ نسأ۔ جب تو اس میں تاخیر کر دے (1)۔ ابن فارس نے کہا: عرب کہتے ہیں: نسأ الله فی اجلک و نسأ الله اجلک۔ اللہ تعالیٰ تیری عمر میں اضافہ کرے، قد انتسأ القوم، جب قوم دور ہو جائے، نسأتهم، میں نے اسے پیچھے کر دیا۔ معنی یہ ہے کہ ہم اس کے نزول کو مؤخر کرتے ہیں یا اسے منسوخ کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم تم سے اس طرح اسے لے جائیں گے کہ تم نہ پڑھو گے اور نہ یاد کرو گے۔ باقی قراء نے نسخہ نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، نسیان سے مشتق کیا ہے جس کا معنی ترک ہے، یعنی ہم اسے چھوڑ دیں گے نہ تبدیل کریں گے اور نہ منسوخ کریں گے۔ یہ حضرت ابن

عباس اور سدی کا قول ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ (توبہ: 67) یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑا، پس اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب میں چھوڑ دیا۔ اس قراءت کو ابو عبید اور ابو حاتم نے پسند کیا۔ ابو عبید نے کہا: میں نے نعیم القاری کو یہ کہتے ہوئے سنا، میں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے خواب میں ابو عمرو کی قراءت پڑھی تو آپ نے مجھ پر صرف دو حرفوں کی تبدیلی فرمائی۔ فرمایا: میں نے پڑھا اُذْنا تو آپ نے فرمایا اُرْنا۔ ابو عبید نے کہا: دوسرا حرف میں اوتنسا ہا خیال کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اَوْ نُنْسِيهَا۔ الازہری نے نُنْسِيهَا حکایت کیا ہے۔ یعنی ہم اسے چھوڑنے کا حکم دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: انسیتہ الشئ یعنی میں نے اسے ترک کرنے کا حکم دیا۔ نسیتہ، میں نے اسے ترک کر دیا۔ شاعر نے کہا:

ان عن عقبه اقصيها لست بناسيها ولا منسيها

اگر میں اپنے اوپر اونٹوں کو چرانے کا فیصلہ کروں گا تو میں اسے ترک نہیں کروں گا اور نہ اسے ترک کا حکم دوں گا۔ زجاج نے کہا: نون کے ضمہ کے ساتھ قراءت اس میں ترک کے معنی کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ یہ نہیں کہا جاتا: انسی بمعنی ترک ہے اور جو علی بن ابی طلحہ بن عباس سے روایت کیا ہے اَوْ نُنْسِيهَا فرمایا: ہم اسے چھوڑتے ہیں اسے تبدیل نہیں کرتے (2) یہ صحیح نہیں ہے۔ شاید حضرت ابن عباس نے فرمایا ہون تو رکھا اور ضبط نہ کیا گیا ہو۔ اہل لغت میں سے اکثر کا قول یہ ہے کہ اَوْ نُنْسِيهَا کا معنی ہے: ہم تمہارے لئے اس کا ترک مباح کرتے ہیں۔ یہ نسی سے مشتق ہے جب کوئی کسی چیز کو چھوڑ دے پھر تعدیہ کیا گیا۔ ابو علی وغیرہ نے فرمایا: اور یہ قابل توجہ ہے۔ کیونکہ اس کا معنی ہے: ہم تجھے بنادیں گے کہ تم اسے چھوڑ دو (3)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ نسیان سے ہے جس کا معنی ہے یاد نہ ہونا، اس معنی پر اوتنسا رکھا یا محمد فلا تذکرھا۔ اے محمد! ﷺ ہم یہ بھلا دیں گے پس آپ اسے یاد نہیں کریں گے۔ ہمزہ کے ساتھ نقل کیا گیا اور فعل کو دو مفعولوں کی طرف متعدی کیا گیا اور وہ نبی کریم ﷺ اور ہاشمیر ہیں لیکن نبی کریم ﷺ کا اسم محذوف ہے۔

**مسئلہ نمبر 15:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثَابِتٌ بِخَيْرٍ مِّنْهَا يَهَا خَيْرٌ كَالْفَضْلِ كَالصِّغَةِ۔ معنی یہ ہے کہ اے لوگو! اس جلدی میں تمہارے لئے زیادہ نفع ہے اگر ناخ اخف ہو اور تاخیر میں تمہارے لئے زیادہ نفع ہے اگر ناخ (آیت) زیادہ مشکل ہو اور اگر ناخ و منسوخ برابر ہوں تو اس کی مثل میں تمہارے لئے زیادہ نفع ہے (4)۔ امام مالک نے فرمایا: منسوخ کی جگہ محکم آیت تمہارے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آخرت کے اعتبار سے زیادہ نفع بخش ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ایک دوسرے پر فضیلت نہیں رکھتا۔ اس کی مثال یہ ہے: من جاء بالحسنة فله عشر منھا۔ یعنی جو نیکی کرے گا اس کے لیے اس سے بہتر نفع اور اجر ہوگا۔ اس خیر سے مراد افضل نہیں ہے اور پہلے قول کی دلیل او مثلاً کے کلمات ہیں۔

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَ

لَا نَصِيرٍ ۝

”کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کیلئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی یار و مددگار نہیں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَمْ تَعْلَمْ، لَمْ کی وجہ سے اسے جزم دی گئی ہے اور حروف استفہام عامل کے عمل میں تبدیلی نہیں کرتے۔ اُن کو فتح دیا گیا ہے کہ یہ کُل نصب میں ہے۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی ایجاد و اختراع، ملک و سلطان، امر و ارادہ سب زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کا چلتا ہے۔ ملک پر رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے اور لہ اس کی خبر ہے اور پورا جملہ ان کی خبر ہے۔

یہاں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد امت ہے کیونکہ آگے ارشاد ہے وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ اِلٰحَ بَعْضُ عُلَآءِ نِے فرمایا: اس کا معنی ہے: اے محمد! ﷺ ان سے کہہ دیجئے کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کے لئے حکمرانی اور سلطانی ہے۔ آسمانوں اور زمین میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں ہے۔ وَاِنَّ يٰۤاٰمِرًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَشَيْءٌ مِّنْهُ لَكُنْزٌ لَّكَ اِن تَعْلَمَ اَنَّكَ لَمِنَ الْغٰلِبِيْنَ (1) اور معاملہ کی دیکھ بھال کی۔ اسی سے وَفِی الْعَهْدِ ہے یعنی مسلمانوں کے جو معاملات اس کے سپرد کئے گئے ہیں ان کی نگرانی کرنے والا۔ وَمِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا معنی ہے اللہ کے سوا، اللہ کے بعد۔ جیسے امیہ بن الصلت نے کہا: (1)

یا نفس مالک دون اللہ من واق وما علی حدثان الدھر من باق  
اے نفس! اللہ کے سوا تجھے کوئی بچانے والا نہیں اور زمانے کے واقعات میں سے کوئی باقی رہنے والا نہیں۔  
جمہور قراء نے ولا نصیر جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ ولی پر اس کا عطف کیا ہے اور نصیر ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ ولی کے  
مقام پر عطف کی حیثیت سے کیونکہ اس کا معنی ہے: مالکم من دون اللہ ولی ولا نصیر۔

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سَأَلَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ ۖ وَمَنْ يَتَّبِعِ الْكُفْرَ  
بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿٥٠﴾

”کیا تم (یہ) چاہتے ہو کہ پوچھو اپنے رسول میں نیچا بہم سے (ایسے سوال) جیسے پوچھے گئے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے پہلے اور جو بدل لیتا ہے کفر کو ایمان سے وہ (قسمت کا مارا) تو بھٹک گیا سیدھے راستہ سے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْرٌ تُرِيدُونَ فِيْهِ اَنْ تَسْأَلُوْا، تُرِيدُونَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے گمّا سئل کاف مصدر مخذوف کی لغت کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔  
یعنی سوال کیا۔

مُؤَلّی نائِب فاعل کی حیثیت سے محل رفع میں ہے مِنْ قَبْلُ ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال یہ تھا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات عیاں دکھائیں اور اس امت کے لوگوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو سامنے لے آئیں۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد سے مروی ہے کہ انہوں نے سوال کیا کہ ان کے لئے صفا پہاڑی کو سونا بنا دیں (2)۔ حسن نے کہا سبیل پڑھا ہے، یہ ان لوگوں کی لغت ہے جو کہتے ہیں: سَلَتْ أَسْأَلُ۔ یہ بھی جائز ہے کہ ہمزہ کا بدل یا ء ساکن ہو اور بغیر قیاس کے ہو۔ پھر اس سے پہلے سین کو کسرہ دیا گیا ہو۔ نحاس نے کہا: ہمزہ کا بدل بعید ہے۔



السواء ہر چیز کے وسط کو کہتے ہیں۔ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: فی سواء الجحیم۔ (جحیم کے وسط میں) عیسیٰ بن عمر نے حکایت کیا ہے، فرمایا: ما زلت اکتب حتی انقطع سواقی (میں لکھتا رہا حتیٰ کہ میرا درمیان ٹوٹ گیا) حضرت حسان نے نبی کریم ﷺ پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا:

یا ویح اصحاب النبی درھطہ بعد المغیب فی سواء السلحد (1)

نبی کریم ﷺ کے اصحاب اور آپ کے گروہ پر افسوس قبر کے درمیان چھپائی گئی ذات کے بعد۔

بعض علماء نے فرمایا السواء کا معنی قصد کرنا ہے۔ فراء سے مروی ہے: ذهب عن قصد الطريق و سنتہ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے راستہ سے ہٹ گیا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس آیت کا شان نزول یہ تھا کہ رافع بن خزیمہ (2) اور وہب بن زید نے نبی کریم ﷺ سے کہا: ہمارے پاس آسمان سے کتاب لے آؤ جسے ہم پڑھیں اور ہمارے لئے نہریں جاری کرو تو ہم آپ کی پیروی کریں گے۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۖ حَسَدًا مِّنْ عِندِ  
أَنفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا ۚ حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۚ إِنَّ  
اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۱۰ وَ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَ آتُوا الزَّكَاةَ ۚ وَ مَا تُقَدِّمُوا  
لِأَنفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۱۱

”دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب کہ کسی طرح پھر بتادیں تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر (ان کی آرزو)

بوجہ اس حسد کے ہے جو ان کے دلوں میں ہے (یہ سب کچھ) اس کے بعد اور جب کہ خوب واضح ہو چکا ہے ان پر

حق۔ پس (اے غلامانِ مصطفیٰ) معاف کرتے رہو اور درگزر کرتے ہو یہاں تک کہ بھیج دے اللہ (ان کے بارے

میں) اپنا حکم۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور جو کچھ آئے بھیجو گے

اپنے لئے نیکیوں سے ضرور پاؤ گے اس کا ثمر اللہ کے ہاں یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب دیکھ رہا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۖ حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِمْ

مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** وَدَّ کا معنی تمنا کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ كُفَّارًا یہ يَرُدُّونَكُمْ کا مفعول ثانی ہے مِّنْ عِندِ

أَنفُسِهِمْ بعض علماء نے فرمایا: یہ یوز کے متعلق ہے۔ بعض نے فرمایا: حَسَدًا کے متعلق ہے اور كُفَّارًا پر وقف ہے اور

حَسَدًا، وَدَّ كَامْفَعُولٍ لہ ہے یا مصدر ہے اپنے ماقبل پر دلالت کرتا ہے اور قِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ کا معنی ہے اپنی طرف سے، نہ یہ کتاب میں پاتے ہیں اور نہ انہیں اس کا حکم دیا گیا ہوتا ہے حسد کا لفظ یہ مفہوم دیتا ہے اور عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ بطور تاکید اور الزام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ (آل عمران: 167) اسی طرح يَكْتُتُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ (البقرہ: 79) اور اسی طرح وَلَا تَطْرُقُ عَيْنُكَ بِنَجَاحِهِ (انعام: 38) ان تینوں آیات میں بِأَفْوَاهِهِمْ، بِأَيْدِيهِمْ اور بِنَجَاحِهِ تاکید کے لئے ہے۔ یہ آیت کریمہ یہود کے متعلق ہے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 2:** حسد کی دو قسمیں ہیں: (۱) مذموم، (۲) محمود۔ مذموم یہ ہے کہ تو اپنے مسلمان بھائی سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کے زوال کی تمنا کرے، خواہ تو نے یہ تمنا کی ہو کہ تیری طرف وہ نعمت لوٹ آئے یا تو نے یہ تمنا نہ کی ہو۔ اس قسم کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ممانعت فرمائی ہے: أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ (النساء: 54)

یہ حسد مذموم ہے کیونکہ اس میں حق سبحانہ تعالیٰ کی تقسیم کو درست نہ سمجھنا ہے کہ اس نے (گویا) غیر مستحق پر انعام کر دیا ہے۔ اور حسد کی محمود صورت وہ ہے جس کا ذکر صحیح حدیث میں آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حسد صرف دو شخصوں سے کرنا چاہئے: ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ قرآن عطا فرماتا ہے اور وہ رات کے اوقات میں اور دن کے اوقات میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور وہ اسے رات کے اوقات میں اور دن کے اوقات میں خرچ کرتا ہے (2)۔ یہ وہ حسد ہے جس کا معنی غبطہ (رشک) ہے، اسی طرح اس پر امام بخاری نے باب باندھا ہے: باب الاغْتِبَاطِ فِي الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو تمنا کرے کہ تیرے لئے بھی وہ خیر اور نعمت ہو جو تیرے مسلمان بھائی کے پاس ہے اور اس سے خیر زائل نہ ہو۔ اس کو منافسہ کہنا بھی جائز ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ﴿۱﴾ (المطففين) اس کے لئے سبقت لے جانے کی کوشش کریں سبقت لے جانے والے قِنْ بَعْضٍ مَّا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (یعنی اس کے بعد کہ ان کے لئے حق ظاہر ہو چکا ہے)۔ حق سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں اور قرآن ہے جو آپ ﷺ لے کر آئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا اس میں دو مسئلے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** فَاعْفُوا اصل میں اعفوا تھا ضمہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کیا گیا پھر واو کو اتقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا۔ العفو سے مراد گناہ پر مواخذہ کو ترک کرنا ہے۔ الصفح کا معنی نفس سے گناہ کے اثر کو زائل کرنا ہے۔ صفحت عن فلان کا معنی ہے: میں نے اس کے گناہ سے اعراض کیا۔ ضربت عنه صفحا میں نے اس سے اعراض کیا اور اسے چھوڑ دیا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَفَتَضْرِبُ عَنْكُمْ الذِّكْرَ صَفْحًا (الزخرف: 5) (کیا ہم روک لیں گے تم سے اس ذکر کو)

**مسئلہ نمبر 2:** یہ آیت منسوخ ہے اس ارشاد کے ساتھ قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ

صَغُرُونَ ﴿٢٩﴾ (توبہ: 29) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ روز قیامت پر..... اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں) یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی تائید فَاَقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ ہے (1)۔ ابو عبیدہ نے کہا: ہر وہ آیت جس میں قتال کا ترک ہے وہ مکی ہے اور قتال کے حکم کے ساتھ منسوخ ہے (2)۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کا یہ حکم کہ یہ آیت مکی ہے ضعیف ہے کیونکہ یہود کی مخالفتیں تو مدینہ میں تھیں۔

میں کہتا ہوں: یہ بات صحیح ہے۔ بخاری اور مسلم نے حضرت اسامہ بن زید سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ گدھے پر سوار ہوئے جس کے اوپر فدک کا بنا ہوا کپڑا تھا اور حضرت اسامہ آپ کے پیچھے سوار تھے۔ آپ بنی حارث بن خزرج میں حضرت سعد بن عبادہ کی عیادت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ یہ واقعہ بدر سے پہلے کا ہے۔ پس وہ دونوں چلے حتیٰ کہ اس مجلس کے پاس سے گزرے جس میں عبد اللہ بن ابی بن سلول تھا۔ یہ عبد اللہ کے ظاہر اسلام قبول کرنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ مجلس میں مسلمان، مشرک، بت پرست اور یہود جمع تھے۔ مسلمانوں میں سے حضرت عبد اللہ بن رواحہ بھی تھے۔ جب مجلس پر گدھے کا غبار چھانے لگا تو عبد اللہ بن ابی نے اپنا ناک اپنی چادر سے ڈھانپ دیا اور کہا: ہم پر غبار نہ اڑاؤ۔

رسول اللہ ﷺ نے سلام کیا پھر آپ ٹھہرے اور گدھے سے اترے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور ان پر قرآن پڑھا۔ عبد اللہ بن ابی بن سلول نے کہا: اے شخص! یہ انداز اچھا نہیں جو آپ کہتے ہیں اگر حق بھی ہے تو ہمیں ہماری مجالس میں اس کے ساتھ اذیت نہ دے، اپنی منزل کی طرف لوٹ جا جو تیرے پاس آئے اسے بیان کر۔ حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ آپ ہماری مجالس میں تشریف لائیں ہم اس پیغام کو پسند کرتے ہیں۔ مشرکوں، مسلمانوں اور یہود کے درمیان گالی گلوچ شروع ہو گئی حتیٰ کہ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے قریب ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ انہیں خاموش کراتے رہے حتیٰ کہ وہ خاموش ہو گئے پھر آپ ﷺ اپنی سواری پر سوار ہوئے اور چل پڑے حتیٰ کہ حضرت سعد بن عبادہ کے پاس پہنچے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے سعد! کیا تو نے نہیں سنا جو ابو حباب..... آپ کی مراد عبد اللہ بن ابی تھا..... نے کہا ہے اس نے ایسا ایسا کہا ہے۔ حضرت سعد نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ اس کو معاف کر دیں اور اس سے درگزر فرمائیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی۔ اللہ آپ کے پاس حق لایا جو اس نے آپ پر اتارا، مدینہ طیبہ کے لوگوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ عبد اللہ بن ابی کو تاج پہنائیں گے اور اس کے سر پر پگڑی باندھیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس حق کے ساتھ اس معاملہ کو رد کر دیا جو آپ کو عطا فرمایا تو یہ غصہ میں ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے اس نے کہا جو آپ نے دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے معاف کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب مشرکوں اور اہل کتاب کو معاف کر دیتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا اور اذیت پر صبر کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَتَسْمَعَنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا (آل عمران: 186) (اور یقیناً تم سنو گے ان سے جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا اذیت





ایک اور نے کہا:

وَلَدَتِكَ اِذَا وَلَدَتِكَ اَمَكَ بَاكِياً  
فَاعْمَلْ لِيَوْمٍ تَكُونُ فِيهِ اِذَا بَكَوْا  
تیری والدہ نے تجھے جنم دیا جبکہ تو رو رہا تھا اور قوم تیرے ارد گرد خوشی سے ہنس رہی تھی۔ تو اس دن کے لئے عمل کر جس میں  
لوگ تیری موت پر رو رہے ہوں جبکہ تو اس میں خوشی سے ہنس رہا ہو۔

ایک اور نے کہا:

سَابِقُ اِلَى الْخَيْرِ وَبَادِرُ بِهِ  
فَانَا خَلْفَكَ مَا تَعْلَمُ  
وَقَدَمُ الْخَيْرِ فَكُلْ اَمْرِي  
تو نیکی کی طرف سبقت کر اور اس میں جلدی کر تیرے پیچھے وہ ہوگا جس کو تو جانتا ہے۔ اور نیکی کو آگے بھیج ہر شخص اس پر ہوگا  
جو وہ آگے بھیجے گا۔

ان تمام سے خوبصورت ابوالعتاہیہ کا قول ہے:

اَسْعَدُ بِمَا لَكَ فِي حَيَاتِكَ اِنَّمَا  
وَاِذَا تَرَكْتَ لِنَفْسِكَ لَمْ يَبْقَ  
وَاِنْ اَسْتَطَعْتَ فَكُنْ لِنَفْسِكَ وَاَرِثاً  
یقینی ورائے مصلحہ او مفسد  
و اخو الصلاح قليله يتزید  
ان الموت نفسه لیسدد  
تو اپنی زندگی میں اپنے مال سے سعادت حاصل کر لے تیرے پیچھے نیکو کار ہوگا یا فسادی ہوگا۔ جب تو اپنا مال فساد کے  
لئے چھوڑے گا تو وہ اسے نہیں چھوڑے گا اور نیکو کار کا تھوڑا بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اگر تو طاقت رکھتا ہے تو اپنے لئے وارث بنا  
وارث بنانے والا ہی پختہ ہوتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَمَّا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرًا ۚ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۚ قُلْ هَاتُوا  
بُرْهَانَكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٠١﴾ بَلَىٰ ۚ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ  
عِنْدَ رَبِّهِ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٠٢﴾

”انہوں نے کہا: نہیں داخل ہوگا جنت میں (کوئی بھی) بغیر ان کے جو یہودی ہیں یا عیسائی۔ یہ ان کی من گھڑت  
باتیں ہیں۔ آپ (انہیں) فرمائیے لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو۔ ہاں جس نے بھی جھکا دیا اپنے آپ کو اللہ  
کے لئے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس کے لئے اس کا اجر ہے اپنے رب کے پاس۔ نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ ہی وہ  
غمگین ہوں گے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرًا** مطلب یہ ہے کہ یہود نے کہا: جنت میں داخل نہ ہوگا مگر وہ جو یہودی ہوگا اور نصاریٰ نے کہا: جنت میں داخل نہ ہوگا مگر جو نصرانی ہوگا۔ فرما: **فَرَأَىٰ جَاوِزٌ قَرَارًا يَدْعُوهُ هُوَ** بمعنی یہودی اور یہ جمع ہے ہانڈ کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ من کا معنی جمع ہے۔ **تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ** اس پر کلام پہلے گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ**، **هَاتُوا** اصل میں **هَاتُوا** تھا، ضمہ کو اس کے نقل کی وجہ سے حذف کیا گیا پھر یا کو التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا واحد مذکر کے لئے کہا جاتا ہے: **هَات** جیسے رام اور مونث کے لئے **هَاتِي** جیسے رامی۔

البدھان سے مراد وہ دلیل ہوتی ہے جو یقین کو واقع کرتی ہے یعنی جس سے یقین حاصل ہوتا ہے۔ بدھان کی جمع بدھانین ہے جیسے قربان و قربانین، سلطان و سلاطین۔ طبری نے کہا: یہاں دلیل طلب کرنا غور و فکر کے اثبات کا تقاضا کرتا ہے (1) اور جو اس کی نفی کرتا ہے اس کا رد کرتا ہے۔ **إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ** یعنی اگر تم اپنے ایمان میں یا اپنے قول میں سچے ہو کہ تم ہی جنت میں داخل ہو گے۔ یعنی جو تم نے کہا ہے اسے دلیل سے بیان کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **بَلَىٰ** یہ ان کا رد ہے اور انہیں جھٹلانا ہے یعنی ایسا نہیں ہے جیسا تم کہتے ہو۔ بعض نے فرمایا: معنی پر محمول ہے، گویا کہ کہا گیا ہے کیا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا؟ تو کہا گیا: **بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ**، **أَسْلَمَ** کا معنی سرنگوں ہونا اور سر تسلیم خم کرنا ہے، بعض نے فرمایا: اپنے عمل کو خالص کرنا ہے، **الوجه** (چہرہ) کا خصوصی ذکر کیا کیونکہ انسان کا جو حصہ نظر آتا ہے اس میں سے معزز ترین حصہ ہے، اور اس لئے کہ یہ جو اس کی جگہ ہے، اس میں عزت و ذلت ظاہر ہوتی ہے عرب چہرہ کا ذکر کر کے پوری چیز کی خبر دیتے ہیں اس آیت میں وجہ سے مراد مقصد ہونا بھی صحیح ہے **وَهُوَ مُحْصًى** یہ جملہ حال ہے، ضمیر، **وَجْهَهُ** کی طرف لوٹ رہی ہے اور **لَهُ** کی ضمیر من کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اسی طرح اجرہ ہے علیہم میں ضمیر جمع معنی کے اعتبار سے ہے اسی طرح یحزنون بھی معنی کے اعتبار سے جمع ہے۔ یحزنون کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

**وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ وَقَالَتِ النُّصْرَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝**

”اور کہتے ہیں یہودی کہ نہیں ہیں عیسائی سیدھی راہ پر اور کہتے ہیں عیسائی نہیں ہیں یہودی سیدھی راہ پر حالانکہ وہ سب پڑھتے ہیں (آسمانی) کتابیں۔ اسی طرح کہی ان لوگوں نے جو کچھ نہیں جانتے ان کی سی بات تو (اب) اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جن باتوں میں وہ جھگڑتے رہتے تھے۔“

یعنی ہر فریق دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا مقابل کسی چیز (دین) پر نہیں ہے اور وہ اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا زیادہ مستحق ہے (2)۔ **وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ** یعنی وہ تورات اور انجیل کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ جملہ حال ہے اور **الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ** سے



مراد جمہور کے نزدیک عرب کے کفار ہیں کیونکہ ان کے پاس کتاب نہ تھی۔ عطا نے کہا ہے: اس سے مراد وہ قومیں ہیں جو یہود و نصاریٰ سے پہلے تھیں (1)۔ ربیع بن انس نے کہا: مطلب یہ ہے کہ یہود نے نصاریٰ سے پہلے یہ کہا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اہل نجران نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، تو ان کے پاس یہود کے علماء بھی آئے، اور نبی کریم ﷺ کے پاس جھگڑنے لگے، ہر ایک گروہ نے دوسرے سے کہا: تم کسی دین پر نہیں ہو۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ (2)

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا  
أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَاۤفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي  
الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

”اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو روک دے اللہ کی مسجدوں سے کہ ذکر کیا جائے ان میں اس کے نام (پاک) کا اور کوشاں ہو ان کی ویرانی میں ان کے لئے مناسب نہیں تھا کہ داخل ہوتے مسجدوں میں مگر ڈرتے ڈرتے۔ ان کے لئے دنیا میں (بھی بڑی) ذلت ہے اور ان کے لئے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔“  
اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ، مَنْ مَبْتَدَا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور أَظْلَمُ خبر ہے مطلب یہ ہے کہ لا احد اظلم کوئی زیادہ ظالم نہیں ہے۔ اور اَنْ مَحَل نصب میں ہے۔ مَسْجِدَ سے بدل کے اعتبار سے۔ اور یہ تقدیر بھی جائز ہے: کراہیۃ ان یُذْكَرَ پھر حذف کیا گیا۔ اور یہ تقدیر بھی جائز ہے: مَنْ اَنْ یُذْكَرَ فیہا۔ اور حرف جر کو طول کلام کی وجہ سے ان سے پہلے حذف کیا گیا اور یہاں مَسْجِدَ سے مراد بیت المقدس اور اس کی محرابیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: کعبہ ہے اور جمع ذکر کیا گیا ہے کیونکہ کعبہ مساجد کا قبلہ ہے یا تعظیم کے لئے جمع ذکر کیا گیا۔ بعض نے فرمایا: مَسْجِدَ سے مراد تمام مساجد ہیں، ان کا واحد مسجد (جیم کے کسرہ کے ساتھ)۔ عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: مسجد (جیم کے فتح کے ساتھ) (3)۔ فراء نے کہا ہے: ہر فعل جو فعل یَفْعُلُ کے وزن پر ہو مثلاً دخل یدخل تو اس سے مَفْعَلُ فتح کے ساتھ آتا ہے خواہ وہ اسم ہو یا مصدر ہو۔ اس میں فرق واقع نہیں ہوتا۔ مثلاً دخل یدخل مدخلا۔ هذا مدخلۃ۔ مگر چند الفاظ ایسے ہیں جن پر کسرہ پڑھا جاتا ہے: مسجد، مطیع، المغرب، المشرق، المسقط، المفرق، المجزر، المسکن، المرفق۔ (یہ رفق یرفق سے ہے) النبت، النسیک (یہ نسک ینسک سے ہے) کسرہ کو اسم کی علامت بنایا ہے۔ بعض اوقات بعض عرب اسم میں فتح دیتے ہیں وہ المسجد (جیم کے فتح کے ساتھ) انسان کی پیشانی جہاں سجدہ کے لیے پہنچتی ہے: الآراب، وہ سات اعضاء جو سجدہ میں زمین پر لگتے ہیں۔ یہ جوہری کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اس آیت سے مراد کیا ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے اور یہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ بخت نصر کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ اس نے بیت المقدس کو خراب کیا تھا۔ حضرت ابن عباس وغیرہ

نے کہا: یہ نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ معنی یہ ہے کہ تم کیسے دعویٰ کرتے ہو اے نصاریٰ! کہ تم اہل جنت میں سے ہو حالانکہ تم نے بیت المقدس کو خراب کیا اور اس میں نمازیوں کو نماز پڑھنے سے روکا۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا: نصاریٰ کے فعل پر تعجب کا اظہار ہے کہ انہوں نے بیت المقدس کے ساتھ یہ کیا حالانکہ وہ اس کی تعظیم بھی کرتے تھے اور انہوں نے یہود سے عداوت کی۔

سعید نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: یہ اللہ کے دشمن نصاریٰ ہیں، یہود کے بعض نے انہیں ابھارا کہ انہوں نے بخت نصر بابل کی مجوسی کی بیت المقدس کی تخریب میں معاونت کی۔ (2)

روایت ہے کہ یہ تخریب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک باقی رہی۔ بعض نے فرمایا: یہ مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے نمازیوں کو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو روکا اور حدیبیہ کے ساتھ انہیں مسجد حرام میں داخل نہ ہونے دیا (3)۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے بھی قیامت تک کسی مسجد سے کسی کو روکا۔ یہ قول صحیح ہے کیونکہ لفظ عام ہے اور جمع کے صیغہ کے ساتھ وارد ہے۔ بعض مساجد کے ساتھ تخصیص اور بعض اشخاص کے ساتھ خاص کرنا ضعیف ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3:** مساجد کا خراب کرنا کبھی حقیقتہً ہوتا ہے جیسے بخت نصر اور نصاریٰ نے بیت المقدس کی تخریب کی تھی جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل سے اپنے کسی بادشاہ کے ساتھ مل کر جنگ کی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا نام نطوس بن اسوسانوس رومی تھا جیسا کہ غزنویوں نے ذکر کیا ہے۔ پس انہوں نے بنی اسرائیل کو قتل کیا اور انہیں قیدی بنایا، تورات کو جلادیا اور بیت المقدس میں غلاظت پھینکی اور اسے خراب کیا۔

اور کبھی تخریب مسجد مجازاً ہوتی ہے، جیسے مشرکین کا مسلمانوں کو منع کرنا۔ جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے روک دیا۔ پس نماز اور شعائر اسلام کی مساجد میں ادائیگی سے روک دینا یہ اسے خراب کرنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** ہمارے علماء نے فرمایا: اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں: عورت کو حج کرنے سے روکنا جائز نہیں ہے جب اس نے حج نہ کیا ہو خواہ اس کا محرم ہو یا نہ ہو اور اسے مساجد میں نماز پڑھنے سے بھی نہ روکا جائے جب اس پر فتنہ کا خوف نہ ہو۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ (4)۔ تم اللہ کی بندویں کو مساجد سے نہ روکو۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: مسجد کو توڑنا جائز نہیں ہے اور نہ اس کا بیع کرنا اور معطل کرنا جائز ہے اگرچہ محلہ خراب بھی ہو جائے اور مسجد بنانے سے بھی نہیں روکا جائے مگر یہ کہ لوگوں کا ارادہ اختلاف اور جھگڑا ہو مثلاً وہ ایک مسجد کے پہلو میں دوسری مسجد بنائیں اور ان سے مقصود پہلی مسجد کے لوگوں میں جدائی ڈالنا ہو اور خراب کرنا ہو اور اختلاف پیدا کرنا ہو۔ اگر ایسی صورت ہو تو دوسری مسجد کو توڑا جائے گا اور اس کے بنانے سے منع کیا جائے گا۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: ایک شہر میں دو جامع مسجد ہونی جائز نہیں ہیں اور نہ ایک مسجد کے لئے دو امام جائز ہیں اور نہ ایک مسجد میں دو جماعتیں جائز ہیں۔ اس کا مزید بیان ان شاء اللہ سورہ براءت میں

آنے گا اور سورہ نور میں مساجد اور ان کی بنا کا حکم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بیان کیا جائے گا۔ یہ آیت نماز کے امر کی تعظیم پر دلالت کرتی ہے۔ جب نماز افضل عمل ہے اور اجر کے اعتبار سے عظیم ہے تو اس کا منع کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** ہر جگہ جہاں اللہ کی عبادت کرنا ممکن ہو اور اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا جاتا ہو اسے مسجد کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جعلت لی الارض مسجداً وطهوراً (میرے لئے زمین سجدہ گاہ اور پاکیزگی کا باعث بنائی گئی ہے) اس حدیث کو ائمہ نے تخریج کیا ہے (1)۔ امت کا اس پر اجماع ہے کہ وہ جگہ جو زبان کے ساتھ نماز کے لئے متعین کی گئی ہو تو وہ مالک کی ملکیت سے خارج ہو جاتی ہے اور وہ تمام مسلمانوں کے لئے ہو جاتی ہے اگر کوئی شخص اپنے گھر میں مسجد بنائے اور لوگوں کو اس سے روکے اور اسے اپنے لئے مختص کرے تو وہ اس کی ملکیت پر رہے گی اور وہ مسجد کی تعریف میں نہیں آئے گی۔ اگر وہ تمام لوگوں کے لئے اس میں نماز پڑھنا مباح کر دے تو پھر اس کا حکم عام مساجد جیسا ہو جائے گا اور ملکیت سے نکل جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 6:** أُولَئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَافِينَ، أُولَئِكَ مبتدا ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے خَافِينَ حال ہے یعنی مسلمان جب اس پر غالب آ جائیں اور وہ مسلمانوں کی سلطنت کے تحت آ جائے تو اس وقت ان مساجد میں کافر کا داخلہ ممکن نہ ہوگا۔ اگر کافر اس میں داخل ہوں گے تو انہیں خوف ہوگا کہ مسلمان انہیں نکال دیں گے اور اس میں داخل ہونے پر سزا دیں گے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ کافر کے لئے مسجد میں داخل ہونا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے جیسا کہ سورہ برأت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جنہوں نے اس آیت کو نصاریٰ کے بارے تصور کیا اس نے روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کی اسلام میں تعمیر فرمائی تو اس کے بعد ایک زمانہ گزر گیا کہ کوئی نصرانی اس میں داخل نہیں ہوتا تھا مگر اسے سزا دی جاتی تھی، اس کے بعد کہ وہ ان کی عبادت گاہ تھی (2) اور جنہوں نے اسے قریش کے بارے تصور کیا۔ اس نے کہا: نبی کریم ﷺ کے حکم سے یہ اعلان کیا گیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور کوئی بیت اللہ کا طواف نہ کرے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ خبر ہے اور اس سے مقصود امر ہے یعنی تم کافروں سے جہاد کرو اور انہیں جڑ سے اکھیڑ دو حتیٰ کہ ان میں سے کوئی مسجد حرام میں داخل نہ ہو مگر ڈرتے ہوئے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ (احزاب: 53) یہ حقیقت میں نہیں ہے جو خبر کے لفظ کے ساتھ وارد ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللَّهُ تَعَالَى کا ارشاد ہے: لَهُمْ فِي الدُّنْيَا جُزْءٌ بعض علماء نے فرمایا: یہ حربی کو قتل کرنا ہے اور ذمی کے لئے جزیہ ہے، قتادہ اور سدی سے مروی ہے، الخزی لہم فی الدنیا سے مراد مہدی کا قیام، عموریہ، رومیہ، قسطنطنیہ اور ان کے دوسرے شہروں کی فتح ہے۔ جیسا کہ ہم نے ”الحذکرہ“ میں ذکر کیا ہے اور جنہوں نے کہا یہ قریش کے متعلق ہے انہوں نے الخزی سے مراد فتح مکہ لیا ہے اور آخرت میں عذاب ہے اس کے لئے جو کافر ہو کر مرے گا۔

وَاللَّهُ الْمَشْرِقِيُّ وَالْمَغْرِبِيُّ فَأَيُّ شَأْنٍ لَكُمْ وَجْهَ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

”اور مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی سوجھ بھر بھی تم رخ کرو وہیں ذات خداوندی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ



فراخ رحمت والا خوب جاننے والا ہے۔“

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَالْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ**، **الْمَشْرِقُ** سے مراد طلوع کی جگہ اور **الْمَغْرِبُ** سے مراد غروب ہونے کی جگہ ہے۔ یعنی مشرق و مغرب اور ان کے درمیان کی جہات اور مخلوق کی ایجاد و اختراع اللہ کے لئے ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ مشرق و مغرب کو خصوصی ذکر فرمایا ان کو شرف دینے کے لئے، جیسے بیت اللہ۔ ناقۃ اللہ۔ کیونکہ آیت کا سبب اس کا تقاضا کرتا ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 2:** **فَإَيْنَمَا تَوَلَّوْا** یہ شرط ہے اسی وجہ سے **نُون** حذف کیا گیا ہے۔ این عاملہ ہے اور ماز اندہ ہے۔ اور جواب **فَتَمَّ وَجْهُ اللَّهِ** ہے۔ حسن نے تَوَلَّوْا تاء اور لام کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اصل میں تَتَوَلَّوْا تھا اور ثہ ظرف کی بنا پر محل نصب میں ہے اس کا معنی بعد ہے، مگر یہ جتنی پر فتح ہے معرب نہیں ہے کیونکہ یہ مبہمہ ہے۔ یہ بعد کے لئے ہناک کے قائم مقام ہے اگر تو قرب کا ارادہ کرے گا تو تَوَلَّوْا کہے گا۔

**مسئلہ نمبر 3:** **فَإَيْنَمَا تَوَلَّوْا** کس معنی میں نازل ہوا؟ اس میں علماء کے پانچ مختلف اقوال ہیں: حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہ نے کہا: یہ آیت اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس نے تاریک رات میں غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ امام ترمذی نے حضرت عبداللہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تاریک رات میں سفر پر تھے ہمیں معلوم نہ تھا کہ قبلہ کہاں ہے ہر شخص نے اپنی سمت پر نماز پڑھی۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے یہ نبی کریم ﷺ کے سامنے ذکر کیا، تو یہ آیت نازل ہوئی: **فَإَيْنَمَا تَوَلَّوْا فَجْهَ اللَّهِ ابْوَيْسَى** نے کہا: یہ حدیث ایسی ہے جس کی سند قابل حجت نہیں ہے ہم اس کو اشعث السمان کی حدیث سے جانتے ہیں اور اشعث بن سعید ابوالریع حدیث میں ضعیف شمار کیا جاتا ہے۔ (1)

اکثر اہل علم کا یہی نظریہ ہے۔ وہ کہتے ہیں: جب بادل کی صورت میں غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے پھر بعد میں اسے علم ہو کہ اس نے غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے تو اس کی نماز جائز ہوگی۔ حضرات سفیان، ابن المبارک، احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔

میں کہتا ہوں: امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا یہی قول ہے مگر امام مالک فرماتے ہیں: پھر وقت میں اس نماز کا اعادہ مستحب ہے اور اس پر اعادہ واجب نہیں ہے کیونکہ اس نے فرض تو ادا کر لیا جیسا اسے حکم دیا گیا تھا اور کمال وقت میں پایا جاسکتا ہے۔ یہ امام مالک نے سنت سے استدلال کیا ہے اس شخص کے بارے میں جس نے تنہا نماز پڑھی پھر اس نے اس نماز کو وقت کے اندر جماعت کے ساتھ پایا تو وہ لوگوں کے ساتھ نماز دوبارہ پڑھے اور وقت میں استجاباً اعادہ نہ کرے مگر وہ جو قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز پڑھے یا مشرق یا مغرب کی طرف اپنی پوری کوشش کے بعد نماز پڑھے۔ اور جس نے قبلہ کی تھوڑی دائیں یا بائیں

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب من سورۃ البقرہ، جلد 2، صفحہ 120 (وزارت تعلیم)

جانب کوشش سے نماز پڑھی اس پر وقت کے اندر اور وقت کے بعد اعادہ نہیں ہے۔ مغیرہ اور امام شافعی نے کہا: نماز جائز نہیں ہے کیونکہ قبلہ کی سمت ہونا نماز کی شرط میں سے ہے (جب شرط نہ پائی گئی تو نماز ہی نہ ہوئی)۔ جو امام مالک نے کہا ہے وہ اصح ہے کیونکہ قبلہ کی جہت کو ضرورت، جنگ کی حالت میں اس کے ترک کو مباح کر دیتی ہے اور حالت سفر میں رخصت اس کو مباح کر دیتی ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: یہ آیت مسافر کے بارے نازل ہوئی وہ نفل پڑھ سکتا ہے جدھر بھی اس کی سواری کا رخ ہو۔ یہ مسلم نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ مکہ سے مدینہ کی طرف جاتے ہوئے سواری پر نفل نماز پڑھتے تھے جدھر بھی سواری کا رخ ہوتا تھا (1)۔ فرمایا: اس کے متعلق **فَأَيُّكُمْ شَوَّكَوْا فِئْتُمْ وَجْهَ اللَّهِ نَازِلَ هُوَ**۔ علماء کا سواری پر نفل پڑھنے میں اس حدیث کی وجہ سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور کسی کے لئے جان بوجھ کر بغیر شدت خوف کے قبلہ کو ترک کرنا جائز نہیں ہے۔

مریض کے بارے میں امام مالک کا قول مختلف ہے جو محمل پر نماز پڑھتا ہے۔ کبھی فرمایا: وہ اونٹ کی پیٹھ پر فرض ادا کرے اگرچہ مرض شدید بھی ہو۔ جنون نے کہا: اگر وہ ایسا کرے گا تو اعادہ کرے گا۔ یہ الباجی نے حکایت کیا ہے۔ کبھی کہا: اگر وہ ایسا شخص ہے جو زمین پر نماز نہیں پڑھ سکتا مگر اشارہ کے ساتھ تو وہ اونٹ کے اوپر نماز پڑھ لے اس کے بعد اس کے اونٹ کو روکا جائے اور منہ قبلہ کی طرف کیا جائے۔ اور اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ کسی صحیح آدمی کے لئے فرض ادا کرنا جائز نہیں ہیں مگر زمین پر، مگر خوف شدید ہو تو پھر سواری پر فرض نماز ادا کر سکتا ہے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

فقہاء کا اس مسافر کے بارے میں اختلاف ہے جو ایسا سفر کرتا ہے جس میں نماز قصر نہیں کی جاتی۔ امام مالک اور ان کے اصحاب اور ثوری نے فرمایا کہ سواری پر نفل نہ پڑھے مگر ایسے سفر میں جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ انہوں نے فرمایا: وہ سفر جو رسول اللہ ﷺ سے حکایت کئے جاتے ہیں کہ ان میں آپ نوافل سواری پر پڑھتے تھے، وہ وہ سفر تھے جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، حسن بن حبی، اللیث بن سعد، داؤد بن علی نے کہا: شہر سے باہر ہر سفر میں سواری پر نفل نماز پڑھنا جائز ہے خواہ اس سفر میں نماز قصر کی جاتی ہو یا نہ کی جاتی ہو کیونکہ آثار ایسے ہیں جن میں کسی خاص سفر کا ذکر نہیں۔ ہر سفر میں نفل نماز جائز ہے مگر یہ کہ کسی سفر کو ایسی روایت کے ساتھ خاص کیا گیا ہو جو واجب التسلیم ہو۔ امام ابو یوسف نے فرمایا: شہر میں بھی سواری پر اشارے سے نماز پڑھ سکتا ہے کیونکہ یحییٰ بن سعید کی حدیث حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ انہوں نے مدینہ طیبہ کی گلیوں میں گدھے پر اشارے سے نماز پڑھی۔ طبری نے کہا: ہر سوار اور پیدل کے لئے جائز ہے جو وہ مقیم ہو یا مسافر ہو سواری پر اور چلتے ہوئے نفل نماز اشارے سے پڑھے۔ بعض اصحاب شافعی سے حکایت ہے کہ ان کا مذہب سفر و حضر میں سواری پر نفل پڑھنے کے جواز کا ہے۔ الاثرم نے کہا: احمد بن حنبل سے حضر میں سواری پر نماز کے بارے پوچھا گیا تو امام احمد نے فرمایا: سفر کے بارے تو میں نے سنا ہے لیکن حضر کے بارے نہیں سنا۔ ابن القاسم نے کہا:

1۔ سنن نسائی، کتاب القبلة، باب الحال التي يجوز عليها استقبال غير القبلة، حدیث نمبر 735، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً صحیح بخاری، باب الوتولی السفر، حدیث نمبر 945، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو محل میں نفل پڑھے تو بیٹھ کر نماز پڑھے اس کا قیام چوڑی مار کر بیٹھنا ہے وہ اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے رکوع کرے پھر اپنے سر کو اٹھائے۔ قتادہ نے کہا: یہ نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب وہ فوت ہوا تو نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو اس کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے مدینہ طیبہ سے باہر بلایا۔ صحابہ نے عرض کی: ہم اس شخص پر کیسے نماز پڑھیں گے جو فوت ہو چکا ہے اور وہ ہمارے قبلہ کے علاوہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا تھا (1)۔ نجاشی حبشہ کا بادشاہ تھا، اس کا نام اصمہ تھا عربی میں اس کا معنی عطیہ ہے۔ وہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہوا تھا حالانکہ قبلہ تبدیل ہو چکا تھا اور قبلہ کعبہ اس کا معنی عطیہ ہے۔ وہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہوا تھا حالانکہ قبلہ تبدیل ہو چکا تھا اور قبلہ کعبہ بن چکا تھا تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس کے بارے میں نازل ہوا: وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ (آل عمران: 199) یہ نجاشی کے لئے عذر تھا۔ (2)

نبی کریم ﷺ نے نو ہجری میں اپنے اصحاب کے ساتھ یہ نماز پڑھی تھی۔ اس سے غائب پر نماز جنازہ پڑھنے پر امام شافعی نے استدلال کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: میت پر نماز کے مسائل میں سے غریب ترین مسئلہ وہ ہے جو امام شافعی نے کہا کہ غائب پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ میں بغداد میں فخر الاسلام کی مجلس میں تھا۔ ان کے پاس خراسان سے ایک شخص آیا اس سے فخر الاسلام نے پوچھا: فلاں کا کیا حال ہے؟ اس شخص نے کہا: وہ تو فوت ہو گیا ہے۔ فخر الاسلام نے کہا: اِنَّ اللّٰهَ وَاِنَّا اِلَيْهِ لَمَرْجِعُونَ۔ پھر ہمیں فرمایا: اٹھو میں تمہیں نماز پڑھاؤں۔ پس وہ کھڑے ہوئے اور ہمیں اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ اس کے مرنے کے چھ ماہ بعد نماز جنازہ پڑھی گئی اور درمیان میں چھ ماہ کی مدت تھی۔

شوافع کے نزدیک اس کی اصل نجاشی پر نبی کریم ﷺ کا نماز جنازہ پڑھنا ہے۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ تین وجوہ کی وجہ سے اس کے ساتھ خاص تھے۔ (1) نبی کریم ﷺ کے لئے زمین جنوباً شمالاً ہموار کر دی گئی تھی حتیٰ کہ نجاشی کا جنازہ آپ ﷺ کے سامنے تھا، جس طرح زمین شمالاً جنوباً ہموار کر دی گئی تھی حتیٰ کہ آپ نے مسجد اقصیٰ دیکھ لی۔ مخالف نے کہا: اس روایت میں کیا فائدہ ہے؟ آپ کی برکت کے لاحق ہونے کا فائدہ ہے۔ (2) نجاشی کے لئے وہاں مومنین میں سے کوئی ولی نہ تھا جو اس کی نماز جنازہ پڑھتا۔ مخالف نے کہا: یہ عادتہ محال ہے، بادشاہ ایک دین پر ہو اور اس کا کوئی پیروکار نہ تھا، محال کے ساتھ تاویل محال ہے (3) نبی کریم ﷺ نے نجاشی پر نماز جنازہ پڑھنے میں اس پر رحمت داخل کرنے اور اس کے بعد والے بادشاہوں کی الفت چاہنے کا ارادہ کیا تھا جب زندہ اور مردہ حالت میں اس کا اہتمام دیکھیں گے۔ مخالف نے کہا: دعا کی برکت نبی کریم ﷺ سے اور دوسروں سے میت کو بالاتفاق لاحق ہوتی ہے۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک نبی کریم ﷺ کے نجاشی پر نماز جنازہ پڑھنے کی حکمت یہ تھی کہ نجاشی اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے انہیں میت پر نماز پڑھنے کا علم نہیں تھا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ وہ بغیر نماز کے ہی اسے دفن کر دیں گے تو آپ نے اس کی نماز کی طرف جلدی کی۔ میں کہتا ہوں: پہلی تاویل احسن ہے کیونکہ جب آپ نے اسے دیکھ لیا تو غائب پر نماز نہ ہوئی بلکہ حاضر اور مرنے پر نماز جنازہ پڑھی۔ غائب وہ ہوتا ہے جو نظر نہ آئے۔ واللہ اعلم



چوتھا قول: ابن زید نے کہا: یہود نبی کریم ﷺ کے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو اچھا سمجھتے تھے اور کہتے تھے: ہدایت نہیں پائی مگر ہمارے ذریعے۔ جب کعبہ کو قبلہ بنایا گیا تو یہود نے کہا: کس چیز نے پھیر دیا انہیں جس پر (پہلے) وہ تھے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: **وَاللّٰهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (1)** (اللہ کے لیے ہے مشرق و مغرب) اس قول پر وجہ نظم یہ ہے کہ یہود نے جب قبلہ کے امر کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے اپنے بندوں کو جس قبلہ کا چاہے مکلف بنا دے۔ اگر وہ چاہے تو انہیں بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دے، اگر چاہے تو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دے۔ اس کے فعل کے خلاف حجت پیش نہیں کی جاسکتی۔ جو وہ کرتا ہے اس کے بارے اس سے پوچھا نہیں جاتا اور لوگوں سے ان کے افعال کے متعلق پوچھا جائے گا۔

پانچواں قول: یہ آیت، اس آیت **وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّواْ وُجُوْكُمْ شَرْقًا (البقرہ: 144)** سے منسوخ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس نے ذکر کیا ہے گویا ابتداء اسلام میں جائز تھا کہ جدھر چاہے آدمی منہ کر کے نماز پڑھ لے پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ قتادہ نے کہا۔ اس آیت کا نسخہ یہ ارشاد ہے **قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (البقرہ: 149)** (یعنی اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو) یہ ابو عیسیٰ ترمذی نے بیان کیا ہے۔

چھٹا قول: مجاہد اور ضحاک سے مروی ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مشرق میں ہو یا مغرب میں ہو ادھر ہی اللہ تعالیٰ ہے اس نے استقبال قبلہ کا حکم دیا ہے (2)۔ مجاہد اور ابن جبیر سے مروی ہے جب ادعون استجب لکم نازل ہوا تو لوگوں نے کہا کہ ادھر منہ کر کے مانگیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی **فَاَيُّهَا تَوَلَّوْا فِیْہِ وَجْہُ اللّٰہِ**۔

حضرت ابن عمر اور نخعی سے مروی ہے، تم اپنے سفروں میں اور گردشوں میں جہاں بھی ہو ادھر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت کا تعلق **وَمَنْ أَظْلَمُ لِمَا خَلَقَ** کے ساتھ ہے۔ معنی یہ ہے: اے مومنو! اللہ کے شہر تمہیں سما سکتے ہیں، تمہیں اس شخص کی تخریب قبلہ کی طرف منہ کرنے سے نہ روکے، جو اللہ کی مساجد کی تخریب کرتا ہے، تم زمین میں جہاں بھی ہو۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ اس وقت آیت نازل ہوئی جب حدیبیہ کے سال رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ کے قریب جانے سے روکا گیا تھا، تو مسلمان اس پر مغموم ہوئے (3)۔ یہ دس اقوال ہیں۔ اور جن علماء نے اسے منسوخ کیا ہے ان پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ یہ خبر ہے اور خبر منسوخ نہیں ہوتی کیونکہ خبر، امر کے معنی کا احتمال رکھتی ہے اور اس معنی کا احتمال ہے کہ تم اپنے چہرے اللہ کی طرف کر لو۔ یہ آیت وہ ہے جو حضرت سعید بن جبیر نے تلاوت کی تھی جب حجاج نے زمین کی طرف منہ کر کے استنجہ کرنے کا حکم دیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 4:** قرآن و حدیث میں **وَجْہُ اللّٰہِ** کی طرف مضاف ہوتا ہے اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ ماہرین نے کہا: یہ وجود کی طرف راجع ہے یہ کلام میں مجاز ہے ذات کو اس سے اس لئے تعبیر فرمایا کیونکہ یہ اعضاء میں ظاہر ترین مضمون ہے اور قدر و منزلت میں عظیم ہے (4)۔ ابن فورک نے کہا: بعض دفعہ صفت ذکر کی جاتی ہے اور مجازاً موصوف مراد ہوتا ہے

1۔ الحرمہ الوجہ زیر آیت ہذا

2۔ ایضاً، تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ الحرمہ الوجہ زیر آیت ہذا

4۔ ایضاً

جیسے کوئی کہنے والا کہتا ہے: میں نے آج فلاں کا علم دیکھا، میں نے فلاں کے علم کی طرف دیکھا۔ اس سے مراد ہوتا ہے کہ میں نے عالم دیکھا اور عالم کی طرف دیکھا۔ اسی طرح یہاں وَجْہُ ذکر ہے اور مراد وجود ہے۔

اسی تاویل پر یہ ارشاد ہے: **إِنَّمَا نُنْظِرُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ** (الدہر: 9) اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کے لئے وَجْہ ہے اس طرح یہ آیت ہے: **إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى** (اللیل) یعنی وہ ذات جس کے لئے وجہ ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا وَجْہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جیسا کہ ارشاد ہے: **وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ** (الرحمن) بعض ائمہ نے فرمایا: یہ نقل سے صفت ثابتہ ہے اور ان صفات سے زائد ہے جن کو عتول واجب قرار دیتی ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا (۱): اس قول کو ابوالمعالی نے ضعیف قرار دیا ہے یہ اسی طرح ضعیف ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وجود ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں الوجہ سے مراد وہ جہت ہے جس کی طرف ہمیں متوجہ کیا گیا ہے یعنی قبلہ، بعض نے فرمایا: الوجہ سے مراد قصد ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

استغفر الله ذنبنا لست مُخْصِيه رب العباد اليه الوجه والعمل

میں اللہ تعالیٰ سے ان گناہوں کی معافی مانگتا ہوں جو بے شمار ہیں بندوں کے رب کی غرض ہی قصد اور عمل ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: معنی ہے: قسم رضا اللہ و ثوابہ، یعنی ادھر اللہ کی رضا اور ثواب ہے جیسا کہ فرمایا: **إِنَّمَا نُنْظِرُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ** (الدہر: 9) ہم اللہ کی رضا اور اس کے ثواب کی طلب میں تمہیں کھلاتے ہیں۔ اسی سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **من بنى مسجداً يبتغي به وجه الله بنى الله له مثله في الجنة** (۲)۔ جس نے مسجد بنائی اور اس سے اس کا مقصود اللہ کی رضا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کی مثل جنت میں (گھر) بنائے گا۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: قیامت کے روز مہر شدہ محیفوں کو لایا جائے گا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: ان کو پھینک دو اور ان کی طرف توجہ کرو۔ فرشتے عرض کریں گے: اے ہمارے رب! تیری عزت کی قسم! ہم تو انہیں خیر دیکھتے تھے اللہ بہتر جانتا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ان ہذا کان لغیر وجهی ولا اقبل من العمل الا ما ابتغى به وجهی۔ یہ اعمال میری رضا کے لئے نہ تھے اور میں صرف وہی عمل پسند کرتا ہوں جو میری رضا کے لئے ہو۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مراد قسم اللہ ہے الوجہ زائد ہے۔ یہ اس ارشاد کی طرح ہے: **وهو معكم**۔ یہ کبھی، کبھی کا قول ہے۔ معز لہ کا قول بھی اسی طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ** یعنی وہ اپنے بندوں پر ان کے دین میں وسعت فرماتا ہے اور انہیں ایسی تکلیف نہیں دیتا جو ان کی طاقت میں نہ ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: **وَاسِعٌ** کا معنی ہے: اس کا علم ہر چیز گھیرے ہوئے ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا: **وَسِعَ كُلُّ شَيْءٍ عِلْمًا** (ط)

فراء نے کہا: الواسع اس سخی کو کہتے ہیں جس کی عطا ہر چیز کو شامل ہو، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَسَخَّيْتُ**

وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف: 156)

اور بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد مغفرت میں وسعت رکھنے والا ہے، کوئی گناہ اس مغفرت سے بڑا نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اپنے بندوں پر فضل فرمانے والا اور ان کے اعمال سے بے نیاز ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان یسع مایسئل، یعنی فلاں عطا فرماتا ہے جو اس سے مانگا جاتا ہے یعنی بخل نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهِ (الطلاق: 7) یعنی غنی کو اس سے خرچ کرنا چاہئے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا۔ ہم اپنی کتاب الاسفی میں اس کا ذکر کیا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَنَهُ ۖ بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ كُلُّ لَّهُ

قُنُوتٌ ۝۱۱

”اور یہ کہتے ہیں کہ بنا لیا ہے اللہ نے (اپنا) ایک بیٹا، پاک ہے وہ (اس تہمت سے) بلکہ اسی کی ہے جو چیز

آسمانوں میں ہے اور زمین میں۔ سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔“

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا یہ نصاریٰ کے متعلق خبر ہے۔ انہوں نے کہا تھا: المسیح ابن اللہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے) نعوذ باللہ من ذالک۔ بعض نے فرمایا: عرب کے کفار کے متعلق خبر ہے کہ انہوں نے کہا: الملائکۃ بنات اللہ (ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں) اسی طرح کی اخبار جاہل کفار کے متعلق ہیں کہ انہوں نے حضرت مریم اور انبیاء کرام کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھا۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سُبْحَنَهُ ۖ بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یہ روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ابن آدم نے مجھے جھٹلایا اور اسے یہ مناسب نہ تھا، ابن آدم نے مجھے گالی دی اور اسے یہ چاہیے نہیں تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا: میں اسے دوبارہ لوٹانے پر قادر نہیں ہوں جس طرح وہ پہلے تھا اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا: میرا بیٹا ہے میری ذات کسی کو بیوی یا بیٹا بنانے سے پاک ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 3:** سُبْحَنَهُ مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس کا معنی ہے: پاک کرنا، بری کرنا، ہر نقص سے علیحدہ کرنا۔ لوگوں نے کہا: اللہ نے بیٹا بنایا، نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں یکتا ہے، اپنی صفات میں یگانہ ہے۔ نہ تو اس نے کسی کو پیدا کیا ہے کہ وہ بیوی کا محتاج ہو۔ اَنّی یُکُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ یُکُنْ لَهُ صَاحِبَةٌ ۖ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ (انعام: 101) (کیونکر ہو سکتا ہے اس کا کوئی لڑکا حالانکہ نہیں ہے اس کی کوئی بیوی اور پیدا فرمایا ہے اس نے ہر چیز کو)

وَلَمْ یُولَدْ، نہ وہ پیدا کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے کوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و بالا ہے اس سے جو ظالم اور منکر کہتے ہیں بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، صابغہ کی حیثیت سے مرفوع ہے اور خبر مجرور ہے یعنی ایجاد و اختراع کے اعتبار سے ہر چیز اس کی ملکیت میں ہے، اور جو یہ کہنے والا ہے کہ اس نے بیٹا بنایا یہ جملہ آسمانوں اور زمین میں داخل ہے (2)۔ سبحان اللہ کا معنی



اللہ تعالیٰ کو ہر نقص اور عیب سے پاک جانتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** بچہ، والد کی جنس سے ہوتا ہے۔ پس حق سبحانہ تعالیٰ کے لئے اپنی مخلوقات میں سے بیٹا بنانا کیسے درست ہوگا جبکہ کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **إِنَّ كُلَّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِيَ الرَّحْمَنِ عَبْدًا** (مریم) (کوئی ایسی چیز نہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے مگر وہ حاضر ہوگی رحمن کی بارگاہ میں بندہ بن کر) اسی طرح فرمایا: **بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** (بلکہ اسی کا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے)۔ اولاد ہونا جنسیت اور حدوث کا تقاضا کرتا ہے اور قدیم ہونا وحدانیت اور ثبوت کا تقاضا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم، ازلی اور یکتا ہے تنہا اور بے نیاز ہے۔ وہ وہ ہے جس نے نہ کسی کو جنا ہے نہ وہ جنا گیا ہے، اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔ پھر بیٹا: غلامی اور عبودیت کے منافی ہے جیسا کہ اس کا بیان سورہ مریم میں ان شاء اللہ آئے گا۔ پس بیٹا عبد کیسے ہوگا۔ یہ محال ہے اور جو چیز محال تک پہنچائے وہ بھی محال ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كُلُّ لَهٗ قُنُوتٌ** یہ مبتدا خبر ہیں۔ تقدیر عبارت کلہم ہے پھر ہا اور میم کو حذف کیا گیا۔ **قُنُوتٌ** کا معنی اطاعت کرنے والے اور عجز کا اظہار کرنے والے ہیں۔ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتی ہے۔ جمادات کی اطاعت ان پر اور ان میں اس کی صنعت کے ظہور میں ہے۔ قنوت کا معنی اطاعت اور سکوت ہے (1)۔ اسی سے حضرت زید بن ارقم کا قول ہے ہم نماز میں کلام کرتے تھے۔ آدمی اپنے قریب والے شخص سے بات کرتا رہتا تھا، حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: **وَقُومُوا لِلّٰهِ قُنُوتًا** (البقرہ: 238) ہمیں سکوت کا حکم دیا گیا اور ہمیں کلام سے منع کیا گیا۔ القنوت کا معنی نماز بھی ہے۔ شاعر کا قول ہے:

قَاتَا يَتْلُو كَتَبَهُ د عَلَى عَمَدٍ مِّنْ اعْتَزَل

اس شعر میں قاتسا نماز پڑھنے والے کے معنی میں ہے۔

سدی وغیرہ (2) نے **كُلُّ لَهٗ قُنُوتٌ** کے تحت لکھا ہے کہ قیامت کے دن تمام اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے ہوں گے۔ حسن نے کہا: جو بھی اللہ تعالیٰ کی گواہی دینے والا ہے وہ اس کا عبد ہے۔ القنوت کا لغوی معنی قیام ہے۔ اسی سے حدیث پاک میں ہے: **افضل الصلوة طول القنوت** (3)۔ نماز میں سے افضل نماز وہ ہے جس کا قیام لمبا ہو۔ یہ زجاج نے کہا ہے ساری مخلوق اس کی عبودیت کو قائم کرنے والی ہے خواہ اقرار کے ساتھ یا کسی اور طریقہ سے۔ اس کی صنعت کا قرآن پر ظاہر ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل اطاعت ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَالْقُنُوتُ وَالْقُنُوتُ** (احزاب: 35) مزید تفصیل **وَقُومُوا لِلّٰهِ قُنُوتًا** (البقرہ: 238) کے تحت آئے گی۔

**بَيِّنَةُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ** (۴)

”موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اور جب ارادہ فرماتا ہے کسی کام کا تو صرف اتنا حکم دیتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ ہو

جاتا ہے۔

اس میں چھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **بَيِّنَاتٍ السَّنَوَاتِ**۔ مبالغہ کے لئے فعیل کا وزن ہے، مبتدا محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ اسم فاعل مبدع ہے۔ بصیر سے مبصر ہے ابدعت الشیء لاعتن مثالی یعنی میں نے بغیر کسی مثال کے چیز کو پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ **بَيِّنَاتٍ السَّنَوَاتِ** سے یعنی ان کو پیدا کرنے والا، ان کا موجد، ان کو نئے سرے سے بنانے والا اور بغیر کسی مثال اور حد کے ایجاد کرنے والا ہے۔ ہر وہ شخص جو کوئی نئی چیز پیدا کرے جس سے پہلے وہ چیز کسی نے پیدا نہ کی ہو تو اسے مبدع کہا جاتا ہے۔ اسی سے اصحاب البدع ہیں۔ بدعت کو بدعت اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ کہنے والا اپنے امام کی کلام اور فعل کے بغیر کہتا ہے۔ بخاری میں ہے: **نَعْتِ الْبِدْعَةِ هَذِهِ**۔ یعنی رمضان کا قیام اچھی بدعت ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** ہر وہ بدعت جو مخلوق سے صادر ہو اس کی دو صورتیں ہوں گی یا تو اس کی شرع میں اصل ہوگی یا شرع میں اس کی اصل نہ ہوگی۔ اگر تو اس کی کوئی اصل ہو، وہ اس عموم کے تحت واقع ہو جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے دعوت دی ہے اور اس پر رسول اللہ ﷺ نے براہیجہ کیا ہے تو وہ مدح کے مقام پر ہوگی اگرچہ اس کی مثال موجود نہ ہو جیسے جو دو سخا کی نوع، اور نیکی کا کوئی فعل، تو یہ فعل، افعال محمودہ سے ہوگا۔ اگرچہ اس سے پہلے کوئی کرنے والا نہ بھی ہو۔ اس قول کی تائید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول کرتا ہے: **نَعْتِ الْبِدْعَةِ هَذِهِ (1)** یہ اچھی بدعت ہے جب وہ بدعت افعال خیر میں سے تھی اور مدح کے تحت داخل تھی۔ قیام رمضان نبی کریم ﷺ نے کیا تھا مگر اسے ترک کر دیا تھا اور اس پر دوام اختیار نہیں فرمایا تھا اور نہ لوگوں کو جمع کیا تھا۔ پس حضرت عمر کی اس پر محافظت اور لوگوں کو اس پر جمع کرنا اور انہیں اس کی طرف بلانا، بدعت تھا لیکن یہ بدعت محمودہ مدوحہ تھی۔ اگر وہ کوئی ایسا عمل ہو جو اللہ اور اس کے رسول کے امر کے خلاف ہو تو وہ مذمت و انکار کے مقام میں ہوتا ہے۔ یہ معنی خطابی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: نبی کریم ﷺ کے ارشاد جو خطبہ میں فرمایا اس کا یہی معنی ہے: **وَشَرُّ الْأُمُورِ مُحَدَّثَاتُهَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (2)** برے امور بدعتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ یعنی ایسی بدعت جو کتاب و سنت کے موافق نہ ہو یا صحابہ کے عمل کے موافق نہ ہو اور اس حقیقت کو اپنے اس ارشاد میں بیان فرمایا: **مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً كَانَ لَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَجْرِ مَنْ شَرَعَ مِنْ سُنَنِ الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِمْ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَجْرِ مَنْ شَرَعَ (3)**۔ یعنی جس نے اسلام میں کوئی اچھا کام شروع کیا تو اسے اس کا اجر اور اس کے بعد اس پر عمل کرنے والوں کا اجر ملے گا اور ان کے اجر میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی اور جس نے اسلام میں کوئی برا

1۔ الموطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ باب ما جاء في قیام رمضان، صفحہ 97 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحجۃ فصل فی عطیۃ الحجۃ، جلد 1، صفحہ 285 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی الصدقۃ لوبشقی تیرہ اوکلیہ طیبہ، جلد 1، صفحہ 327 (قدیمی کتب خانہ)

عمل شروع کیا تو اس پر اس کا گناہ ہوگا اور ان لوگوں کا گناہ ہوگا جو اس کے بعد اس پر عمل کریں گے، ان کے گناہوں میں کمی کئے بغیر۔ یہ اشارہ ہے جو قبیح یا حسن بدعت شروع کی جاتی ہے۔ یہ اس باب کی اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عصمت و توفیق کا سوال ہے اور اس کے علاوہ کوئی پالنے والا نہیں۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذَا قُضِيَ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ جب کسی امر کے احکام اور اتقان کا ارادہ فرماتا ہے..... جیسا کہ اس کے علم میں پہلے تھا..... تو اسے کُن فرماتا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: قضاء الشی کا مطلب اس کا احکام اور اس کا جاری کرنا اور اس سے فارغ ہونا ہے، اسی وجہ سے قاضی کو قاضی کہتے ہیں کیونکہ جب وہ فیصلہ فرماتا ہے تو جھگڑا کرنے والوں کے جھگڑا سے فارغ ہو جاتا ہے۔ الا زہری نے کہا: لغت میں قضیٰ کنی معانی ہیں اس کا مرجع کسی چیز کو ختم کرنا اور مکمل کرنا ہے۔ ابو ذؤیب نے کہا:

و علیہا مسودتان قضاهما داؤد او صنع السوابغ تبع

ان کے اوپر دو زریں ہیں جنہیں داؤد نے بنایا ہے یا تبع نے مکمل کی ہیں۔

شاخ نے حضرت عمر بن خطاب کے بارے میں فرمایا:

قضیت اموراً ثم غادرت بعدها  
بوائق فی اکمامها لم تفتق  
تو نے کاموں کو مکمل کیا لیکن۔

ہمارے علماء نے فرمایا: قضی کا لفظ مشترک ہے کبھی یہ خلق کے معنی میں ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَآوَاتٍ فِی یَوْمَئِذٍ (فصلت: 12) یہ قضی بمعنی خلق (پیدا کرنا) ہے کبھی یہ اعلام کے معنی میں ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِی إِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتَآبِ (الاسراء: 4) یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو آگاہ کیا۔ کبھی یہ امر (حکم) کے معنی میں ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ (الاسراء: 23) یعنی تمہارے رب نے حکم دیا..... کبھی الزام اور احکام کو جاری کرنے کے معنی میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا قُضِيَ مَوْسَىٰ إِلَّا جَلَّ (القصص: 29) (جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی) کبھی ارادہ کے معنی میں ہوتا ہے جیسے وَإِذَا قُضِيَ أَمْرًا..... الخ جب اللہ کسی شے کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا (1): قضی بمعنی قَدَّر (اندازہ کرنا) اور کبھی بمعنی اَمْضَىٰ بھی آتا ہے۔ اہل سنت کے مذہب پر اس آیت میں یہ دونوں معانی مراد ہو سکتے ہیں یعنی ازل میں مقدر فرمایا اور اپنا حکم نافذ فرمایا اور معتزلہ کے مذہب پر خلق اور ایجاد حکم نافذ فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَمْرًا، الامرواحد ہے اس کی جمع الامور ہے یہ امر یا امر کا مصدر نہیں ہے (2)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: قرآن میں امر چودہ معانی میں استعمال ہوا ہے۔



- (۱) دین: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حَتَّىٰ جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ (توبہ: 48) حتیٰ کہ حق آیا اور اللہ کا دین اسلام ظاہر ہوا۔
- (۲) قول: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِذَا جَاءَ أَمْرُنَا (المومنون: 28) یعنی جب ہمارا قول آئے۔
- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَنَّا زُجَرَ أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ (طہ: 62) یہاں بھی امر بمعنی قول ہے۔
- (۳) عذاب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ (ابراہیم: 22) یعنی جب دوزخیوں کے بارے عذاب کا فیصلہ ہو گیا۔
- (۴) عیسیٰ علیہ السلام: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِذَا قُضِيَ أَمْرًا (البقرہ: 117) یعنی عیسیٰ علیہ السلام کا فیصلہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ بغیر باپ کے ہوں گے۔
- (۵) بدر میں قتل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ (غافر: 78) یعنی بدر میں قتل اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَمَّا قُضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا (انفال: 42) اس آیت میں مکہ کے کفار کا قتل مراد ہے۔
- (۶) فتح مکہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ (توبہ: 24)۔ یہاں امر سے مراد فتح مکہ ہے۔
- (۷) قریظہ کا قتل اور بنی نضیر کی جلا وطنی: فَأَعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ (البقرہ: 109) اس آیت میں امر سے مراد قتل قریظہ اور بنی نضیر کی جلا وطنی ہے۔
- (۸) قیامت: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آتَىٰ أَمْرُ اللَّهِ (النحل: 1) اللہ کا امر (قیامت) آ گیا۔
- (۹) القضاء: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُدْخِلُ الْأَمْرَ (السجدہ: 5) اس میں امر بمعنی فیصلہ ہے۔
- (۱۰) وحی: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُدْخِلُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ (السجدہ: 5) وہ آسمان سے زمین کی طرف وحی نازل فرماتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَتَكَوَّلُ الْأَمْرَ بَيْنَهُنَّ (طلاق: 12)
- (۱۱) امر الخلق: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِلَّا إِلَى اللَّهِ تُصِيرُ الْأُمُورُ (الشوریٰ) یعنی مخلوق کے امور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے ہیں۔
- (۱۲) النصر (مدد، نصرت): اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ (آل عمران: 154) (کہتے: کیا ہمارا بھی اس کام میں کچھ دخل ہے)
- (۱۳) الذنب (گناہ): اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا (الطلاق: 9) یعنی اپنے گناہ کی سزا۔
- (۱۴) شان اور فعل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا أَمْرُهُمْ بِشَيْءٍ (ہود) اس میں امر سے مراد فعل اور شان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَحْذَرِ الْآيِنِ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ (نور: 63) اس آیت میں بھی امر سے مراد فعل ہے۔
- مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَنْ يَغْنَىٰ عَنْهُمْ كَيْفُ سَعْيِهِمْ سَوْفَ لَا يَكْفِيهِمْ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ كَالْهِيَاطِ الَّتِي تَمْشِي سَرْعًا وَهِيَ تَكْذِبُ عَنِ السَّيْلِ (سجدة: 17) کیونکہ وہ اپنے سہل و آسہل سے بے پروا ہیں اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے یہ بہت سے کلمات ہو گئے۔ اس پر دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت ابوذر سے مروی ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے

روایت کی ہے اور آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عطائی کلام و عذاب کلام میری عطا کلام ہے اور میرا عذاب کلام ہے۔ ان الفاظ کو ایک طویل حدیث میں امام ترمذی نے نقل کیا ہے کلمہ، کلمات کے معنی میں بھی ہوتا ہے لیکن جب ایک کلمہ تمام اوقات میں تمام امور میں جدا جدا ہو یہ بہت سے کلمات ہو گئے اور ان کا مرجع ایک کلمہ ہے، اور تافہ فرمایا کیونکہ اہل لغت کے نزدیک کم از کم کلام کے تین حروف ہوتے ہیں۔ ایک حرف جس سے آغاز کیا جاتا ہے ایک حرف جس کے ساتھ کلمہ جمع کیا جاتا ہے اور ایک حرف جس پر سکوت کیا جاتا ہے جب کسی کلمہ کے دو حرف ہوں تو وہ ان کے نزدیک ناقص ہوتا ہے جیسے ید، دم، ضم یہ علت کی وجہ سے ناقص ہیں۔ یہ کلمات آدمیوں کی طرف سے منقوصات میں سے ہیں کیونکہ یہ دو حرفوں پر مشتمل ہیں نیز کیونکہ یہ ادوات کے ساتھ تلفظ کئے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تامہ ہیں کیونکہ یہ بغیر ادوات کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مخلوق کی شبہ سے بلند و بالا ہے۔

مسنلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَيَكُونُ يَه نون کے رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے علیحدہ کلام کے اعتبار سے (1)۔  
سیبویہ نے کہا: یہ فہو یکون ہے یا فانه یکون ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ یقول پر معطوف ہے (2)۔ پہلی صورت میں یہ  
امر کے بعد ہوگا اگرچہ پہلے معدوم ہوگا، کیونکہ یہ موجود کے قائم مقام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ معلوم ہے اس کا بیان  
آگے آئے گا اور دوسری صورت میں امر کے ساتھ موجود ہوگا، اس کو طبری نے پسند کیا ہے۔ فرمایا اس نے کسی شے کو کُن کے  
ساتھ حکم دیا جاتا ہے وہ حکم کے ساتھ موجود ہوتی ہے اور کوئی شے موجود نہیں ہوتی مگر وہ جسے وجود کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس کا بیان  
آگے آئے گا۔ اس کی مثال، لوگوں کا قبور سے کھڑا ہونا ہے اللہ تعالیٰ کے بلا واسطے نہ مقدم ہوں گے نہ مؤخر۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا  
ارشاد ہے: حَتْمًا إِذَا دَعَا كُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْأَمْثَلِ إِذَا آتَيْتُمُ تَخَرُّجُونَ ﴿٥﴾ (الرّوم)

ابن عطیہ نے اس قول کو ضعیف کہا ہے اور فرمایا: یہ معنی کی جہت سے غلط ہے کیونکہ یہ قول تقاضا کرتا ہے کہ قول، تکوین اور وجود کے ساتھ ہے۔ (3)

اس آیت میں عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ معدومات کا ہمیشہ سے آمر ہے ان کے وجود کی شرط کے ساتھ۔ مقدورات کے تاخر کے ساتھ قادر ہے۔ معلومات کے تاخر کے ساتھ عالم ہے۔ پس آیت میں ہر وہ چیز جو استقبال کا تقاضا کرتی ہے وہ مامورات کے اعتبار سے ہے کیونکہ محدثات نہ ہونے کے بعد ہوتی ہیں، ہر وہ صفت جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے قدرت اور علم سے وہ قدیم اور ہمیشہ ہوتی ہے (4)، پس (کن) کی عبارت جس معنی کا تقاضا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قدیم اور قائم بالذات ہے۔

ابو الحسن الماوردی نے کہا: اگر کہا جائے کس حال میں وہ اسے کن کہتا ہے کہ وہ ہو جاتی ہے کیا عدم کی حالت میں یا اس کے وجود کی حالت میں۔ اگر تو وہ حالت عدم میں ہوتی ہے تو حکم کرنا محال ہے مگر مامور کو۔ جیسے محال ہوتا ہے امر ہونا مگر آمر کی طرف سے۔ اگر وہ حالت وجود میں ہے تو یہ ایسی حالت ہے جس میں وجود اور حدوث کا امر جائز ہی نہیں ہے کیونکہ وہ موجود حادث

ہے۔ اس سوال کے تین جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے اس کی موجود مخلوق میں اس کے ادا امر کے نفوذ کی، جیسے اس نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ دھتکارے ہوئے بندر بن جائیں اور یہ معدومات کی ایجاد میں وارد نہیں ہوتا۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ ہونے والا ہے اس کے ہونے سے پہلے اسے جانتا ہے۔ پس وہ اشیاء جو موجود نہیں وہ اس کے علم میں اپنے ہونے سے پہلے ان چیزوں کے مشابہ ہیں جو موجود ہیں۔ پس انہیں کوئی کہنا جائز ہے۔ وہ انہیں حالت عدم سے حالت وجود کی طرف نکلنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ وہ حالت عدم میں ان کو جانتا ہے۔

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے جس کو اس نے پیدا کرنا ہے تمام کو شامل ہے جب وہ اس کی پیدائش اور تخلیق کا ارادہ فرماتا ہے وہ پیدا ہو جاتی ہے اور پائی جاتی ہے بغیر اس کے کہ وہاں اسے قول فرمائے۔ یہ اس کا فیصلہ ہے جو وہ چاہتا ہے، اس کو قول سے تعبیر فرمایا ہے اگرچہ قول نہ بھی ہو۔ جیسے ابوالنجم کا قول ہے۔

قد قالت الانساع للبطن الحق (۱)

یہ کوئی قول نہیں ہے، اس نے ارادہ کیا کہ پیٹھ پیٹ کے ساتھ لاحق ہو گئی ہے۔ جیسے عمرو بن حمہ الدوسی نے کہا:

فاصبحت مثل النساء طارت فراخه اذا رام تطياراً يقال له قع  
میں گدھ کی طرح ہو گیا جس کے بچے اڑ گئے۔ جب وہ اڑنے کا ارادہ کرتی ہے تو اسے قع کہا جاتا ہے۔  
اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا:

قالت جناحاً لساقبه الحقا و نجيا لحكما ان يزقا

اس کے پروں نے اس کی پنڈلیوں کو کہا: مل جاؤ اور اپنے گوشت کو پھٹنے سے بچالو۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَنْزِيلُنَا آيَةً ۖ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ

قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۖ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۸۰﴾

”اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کہ کیوں نہیں کلام کرتا ہمارے ساتھ (خود) اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی نشانی۔ اسی طرح کہی تھی ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے تھے، ان کی طرح بے سرو پا بات۔ ملتے جلتے ہیں ان سب کے دل بے شک ہم نے صاف صاف بیان کر دی ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد یہود ہیں۔ مجاہد نے کہا: نصاریٰ ہیں۔ طبری نے اس کو راجح کہا ہے کیونکہ پہلی آیت میں ان کا ذکر ہے۔ ربیع، سدی اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد عرب کے مشرک ہیں دلولا بمعنی ہلا ہے۔ یہ حرف تفضیض (۲) (ابھارتا) ہے۔ جیسے اشہب بن رمیلہ نے کہا:



تعدون عقرا نیب افضل مجدکم بنی صوطری لولا الکمی المقنعا (1)

اس شعر میں لولا بمعنی ہلا ہے۔

یہ وہ لولا نہیں ہے جو ایک چیز کے پائے جانے کی وجہ سے دوسری چیز کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے (یعنی شرط کے پائے جانے کی وجہ سے جزا کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے) ان دونوں کے درمیان علماء لغت کے درمیان یہ فرق ہے کہ لولا جو تخصیض کے معنی میں ہوتا ہے، اس کے ساتھ فعل ظاہر یا فعل مقدر ملا ہوا ہوتا ہے اور جو امتناع کے لئے ہوتا ہے اس کے ساتھ مبتدا ملا ہوا ہوتا ہے اور عادت جاری ہے کہ خبر حذف ہوتی ہے (2)۔ کلام کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متعلق ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا تا کہ ہم جان لیں کہ وہ نبی ہے پھر ہم اس پر ایمان لے آئیں یا ہمارے پاس وہ کوئی نشانی کیوں نہیں لے آتے جو ان کی نبوت کی علامت ہو۔ الایۃ کا معنی دلالت اور علامت ہے۔ الذین من قبلہم جن علماء نے الذین لا یعلمون سے مراد کفار قریش لئے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور جنہوں نے الذین لا یعلمون سے مراد یہود و نصاریٰ لئے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد پہلی قومیں ہیں، اور جنہوں نے الذین لا یعلمون سے مراد نصاریٰ لئے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد یہود ہیں۔ تشابہت قلوبہم بعض علماء نے فرمایا: ان کے دل ہٹ دھرمی، اقتراح اور ترک ایمان میں ان کے مشابہ ہیں۔ فراء نے کہا: ان کے دل کفر میں متفق ہونے میں مشابہ ہیں۔ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُؤْتُونَ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ۝

”بے شک ہم نے بھیجا ہے آپ کو (اے حبیب! صلی اللہ علیہ وسلم) حق کے ساتھ (رحمت کی) خوشخبری دینے والا،

(عذاب سے) ڈرانے والا اور آپ سے باز پرس نہیں ہوگی ان دوزخیوں کے متعلق“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا حال کی بنا پر منصوب ہے اور نَذِيرًا اس پر معطوف ہے۔

ان کا معنی گزر چکا ہے۔

وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ مقاتل نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ یہود پر عذاب نازل کرتا تو یہ ایمان لے آتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ۔ تسأل کے رفع کے ساتھ یہ جمہور کی قراءت ہے بشیرا، نذیرا پر عطف کی بنا پر محل نصب میں ہوگا۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا دران حالیکہ آپ بشارت دینے والے، ڈرانے والے اور غیر مسؤل ہیں۔ سعید خفش نے کہا: لا تسأل (تاء کے فتح اور لام کے ضمہ کے ساتھ) اور بَشِيرًا پر عطف کی بنا پر محل نصب میں ہے (3)۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا دران حالیکہ آپ بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں، دوزخیوں کے متعلق آپ پوچھنے والے نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے متعلق ان کے ڈرانے کے بعد آپ کو آگاہ کر دیا تو آپ ان کے متعلق سوال کرنے سے مستغنی ہیں۔ غیر سائل کا یہ معنی ہے

اور غیر مسئول کا معنی یہ ہے کہ جو بشارت اور انداز کے بعد کفر کرے گا اس کے کفر کی وجہ سے آپ سے نہیں پوچھا جائے گا۔ حضرت ابن عباس اور حضرت محمد بن کعب نے فرمایا: ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کاش! معلوم ہوتا کہ میرے والدین کے ساتھ کیا ہوا، تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ یہ اس شخص کی قراءت پر ہے جنہوں نے لا تسأل جزم کے ساتھ نبی کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ صرف نافع کی قراءت ہے اس میں دو وجہیں ہیں: اس شخص کے بارے سوال کرنے سے نبی ہے زندہ لوگوں میں سے جس نے نافرمانی کی اور کفر کیا کیونکہ حالت تبدیل ہوتی رہتی ہے، کبھی کفر سے ایمان کی طرف منتقل ہوا جاتا ہے اور معصیت سے اطاعت کی طرف منتقل ہوا جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے جو زیادہ واضح ہے کہ اس کے متعلق سوال سے نبی ہے جو کفر اور معصیت پر فوت ہو گیا، اس کی حالت کی بڑائی اور شان کی تغلیظ کی وجہ سے یہ اس طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے: تو فلاں کے متعلق نہ پوچھ یعنی وہ تیرے گمان سے زیادہ تک پہنچ گیا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے لن تسأل پڑھا ہے اور ابی نے و ما تسأل پڑھا ہے۔ ان کا معنی جمہور کی قراءت کے موافق ہے اس کی نفی کی کہ آپ سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ نے سوال کیا تھا کہ میرے والدین میں سے کون از روئے موت قریب ہے (2) تو یہ آیت نازل ہوئی، ہم نے اپنی کتاب ”الہد کرہ“ میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے والدین کو آپ کے لئے زندہ کیا تھا اور وہ دونوں آپ پر ایمان لائے تھے، ہم نے حضور علیہ السلام کا قول بھی ذکر کیا ہے جو آپ نے ایک شخص سے فرمایا تھا کہ (میرا باپ اور تیرا باپ آگ میں ہیں) ہم نے اس کی وضاحت کی ہے۔ الحمد للہ۔

وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۚ قُلْ إِنْ هَدَى اللَّهُ هُودًا  
الْهُدَىٰ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۚ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ  
مِنْ دَوَاقٍ وَلَا نَصِيرٍ ۝

”اور ہرگز خوش نہیں ہوں گے آپ سے یہودی اور نہ عیسائی یہاں تک کہ آپ پیروی کرنے لگیں ان کے دین کی۔ آپ (انہیں) کہہ دیجئے کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس علم کے بعد بھی جو آپ کا ہے (تو پھر) نہیں ہوگا آپ کے لئے اللہ (کی گرفت) سے بچانے والا کوئی یار اور نہ کوئی مددگار۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اس کا معنی یہ ہے کہ اے پیارے محمد! جو یہ آیات کا مطالبہ کرتے ہیں ان کی غرض ایمان لانے کی نہیں ہے بلکہ اگر آپ وہ سب کچھ لے بھی آئیں جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں تو پھر بھی یہ آپ سے راضی نہ ہوں گے۔ انہیں تو صرف یہی چیز راضی کرے گی کہ آپ جس دین اسلام پر ہیں اس کی پیروی چھوڑ دیں۔ کہا جاتا ہے: رَضِيَ يَرْضَى رِضًا رِضًا وَ رِضْوَانًا وَ رِضْوَانًا وَ مَرْضَاةً۔ یہ واوی ہے، تشبیہ میں رضوان کہا جاتا ہے۔ کسائی نے رضیان حکایت کیا ہے۔ مدد بھی حکایت کیا گیا

ہے۔ گویا یہ راضی یراضی و رضاۃ و رضائی کا مصدر ہے۔ نتبع، ان کی وجہ سے منصوب ہے لیکن حتیٰ کے ساتھ ان ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ خلیل نے کہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حق اسم کو جردیتا ہے جیسے ارشاد ہے: **حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ** (القدر) جو اسم میں عامل ہوتا ہے وہ فعل میں عامل نہیں ہوتا۔ اور جو اسم کو جردیتا ہے وہ فعل کو نصب نہیں دیتا۔ نحاس نے کہا نتبع، حتیٰ کی وجہ سے منصوب ہے اور حتیٰ، ان سے بدل ہے۔ الملة اس کا اسم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی کتب میں اور اپنے رسولوں کی زبان پر اپنے بندوں کے لئے مشروع فرماتا ہے۔

پس ملت اور شریعت برابر ہیں۔ رہا دین تو اس کے اور ملت و شریعت کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ شریعت وہ ہوتی ہے جس کے کرنے کی طرف اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بلاتا ہے اور دین وہ ہوتا ہے جس کو بندے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ادا کرتے ہیں۔  
**مسئلہ نمبر 2:** اس آیت سے علماء کی ایک جماعت، امام ابو حنیفہ، امام شافعی، داؤد اور امام احمد بن حنبل نے دلیل پکڑی ہے کہ کفر ملت واحدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَمِلَّتْهُمْ**، ملت کو واحد ذکر فرمایا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اَکْفُم دِیْنَكُمْ وَلِیَا دِیْنِ** (الکافرون: 4) تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے (اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یتوارث اهل الملتین (1)۔ (دو مختلف ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے)۔ یہاں ملتین سے مراد اسلام اور کفر ہیں۔ اس کی دلیل بزرگ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لا یرث المسلم الکافر۔ مسلمان، کافر کا وارث نہیں ہوتا۔

امام مالک اور ایک روایت امام احمد سے یہ ہے کہ کفر کی بہت سی ملتیں ہیں۔ پس یہودی، نصرانی کا وارث نہ ہوگا اور یہودی اور نصرانی، مجوسی کے وارث نہیں ہوں گے۔ امام مالک اور امام احمد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر قول لا یتوارث اهل ملتین کو لیا ہے۔ رہا اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں **وَمِلَّتْهُمْ** اس سے مراد کثرت ہے اگرچہ لفظاً مفرد ہے کیونکہ کثرت کی ضمیر کی طرف مضاف ہے جیسے تو کہتا ہے: اخذت عن علماء اهل المدینہ علیہم۔ سعت علیہم حدیثہم۔ ان مثالوں میں علومہم اور احادیثہم مراد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قُلْ اِنَّ هُدٰی اللّٰهُ هُوَ الْهُدٰی** معنی یہ ہے کہ اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم جس ہدایت پر آپ ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے ہے جس کے دل میں وہ چاہتا ہے اسے رکھ دیتا ہے، وہی حقیقی ہدایت ہے نہ کہ وہ جس کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلٰیۤنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ**، الہواء، جمع ہے ہوی کی جیسے تو کہتا ہے: جبل و اجمال۔ جب خواہشات مختلف تھیں تو جمع الہواء ذکر کیا اگر ملت کے افراد پر محمول کیا جاتا تو ہواہم ہوتا (3)۔ اس خطاب میں دو وجہیں ہیں: (1) یہ خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے کیونکہ خطاب آپ کی طرف متوجہ ہے۔ (2) خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے اور اس

1۔ سنن ابی داؤد، باب اهل یرث المسلم الکافر، حدیث 2523، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب موارث اهل الاسلام من اهل الشراک، حدیث 2720، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا



سے مراد امت ہے۔ پہلی صورت میں اس میں امت کے لئے تادیب ہے کیونکہ ان کا مرتبہ، رسول کریم ﷺ سے کم ہے۔ اس آیت کا سبب یہ ہے کہ لوگ صلح و آشتی کا سوال کرتے تھے اور نبی کریم ﷺ سے اسلام قبول کرنے کا وعدہ کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو آگاہ کر دیا کہ وہ آپ سے راضی نہ ہوں گے حتیٰ کہ آپ ان کی ملت کی پیروی کریں اور آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ان سے جہاد کا حکم دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مِنَ الْعِلْمِ** امام احمد سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو کہتا ہے قرآن مخلوق ہے۔ امام احمد نے فرمایا: وہ کافر ہے، پوچھا گیا: آپ نے اسے کیسے کافر کہا۔ امام احمد نے فرمایا: کتاب اللہ کی آیات کی وجہ سے۔ **وَلَٰكِن اَنْتُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ**۔ قرآن اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ یہ مخلوق ہے وہ کافر ہے۔

**الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ ۖ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ۝۱۰۱** **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذْ كُرُوْا نِعْمَتِ اللّٰهِ اَلَّتِيْ اَنْعَمَتْ عَلَيْكُمْ وَاَلٰى فَضْلٍ كَثِيْرٍ ۖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۲** **وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝۱۰۳**

”جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہی ایمان لاتے ہیں اس کے ساتھ اور جو کوئی انکار کرتا ہے اس کا تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔ اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری وہ نعمت جو میں نے تم پر فرمائی اور (خصوصاً یہ کہ) میں نے تم کو فضیلت دی (اس زمانہ کے) سب لوگوں پر۔ اور ڈرو اس دن سے کہ نہ پکڑا جائے گا کوئی آدمی کسی کے عوض اور نہ قبول کیا جائے گا اس سے مالی تاوان اور نہ نفع دے گی اسے کوئی سفارش اور نہ ہی ان کی امداد کی جائے گی۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ** قادمہ نے فرمایا: اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے اصحاب ہیں۔ اور اس تاویل پر **الْكِتَابَ** سے مراد قرآن ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بنی اسرائیل میں سے اسلام لائے تھے۔ اس تاویل پر **الْكِتَابَ** سے مراد تورات ہے۔ اور آیت عام ہے (1)۔ **الَّذِينَ** محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے۔ **اَتَيْنَهُمُ** اس کا صلہ ہے۔ **يَتْلُونَهُ** مبتدا کی خبر ہے۔ اگر تو چاہے تو خبر **اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ** کو بنا دے۔

**يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ** اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ پیروی کرتے ہیں جیسے اس کی پیروی کرنے کا حق ہے یعنی اس کے امر و نہی کی پیروی کرنے کے ساتھ، اس کے حلال کو حلال کرتے ہیں اور اس کے حرام کو حرام کرتے ہیں اور جو احکامات اس میں ہیں ان پر عمل کرتے ہیں۔ یہ عکرمہ کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں سنا: **وَالْقَبْرُ اِذَا ثَلَمَهَا** (الشمس) (جب چاند اس کے پیچھے آتا ہے)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود کے قول کا یہی معنی

ہے (1)۔ شاعر نے کہا:

قد جعلت دلوٰی تستلینٰی میرا ڈول میرے پیچھے آیا۔

نصر بن عیسیٰ نے مالک سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے یَسْتَلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ کے تحت روایت کیا ہے فرمایا: یَتَّبِعُوْنَہٗ حَقَّ اتِّبَاعِہٖ۔ یعنی وہ اس کی پیروی کرتے ہیں جس طرح پیروی کا حق ہے اس کی سند میں بہت سے مجہول راوی ہیں جیسا کہ خطیب ابوبکر احمد نے ذکر کیا ہے، لیکن اس کا معنی صحیح ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے کہا: جو قرآن کی پیروی کرتا ہے وہ اس کے ساتھ جنت کے باغیچوں پر اترے گا۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کسی رحمت والی آیت سے گزرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے ہیں اور جب عذاب والی آیت سے گزرتے ہیں تو اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ یہی معنی نبی کریم ﷺ سے بھی مروی ہے جب آپ آیت رحمت سے گزرتے تو رحمت کا سوال کرتے اور جب آیت عذاب سے گزرتے تو پناہ مانگتے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن کی محکم آیات پر عمل کرتے ہیں اور متشابہہ پر ایمان لاتے ہیں اور جو مشکل ہوتا ہے وہ اس کے جاننے والے کے سپرد کرتے ہیں (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے (3)۔ میں کہتا ہوں: اس میں بعد۔ مگر یہ کہ معنی یہ ہو کہ وہ اس کے الفاظ کو ترتیل سے پڑھتے ہیں اور اس کے معانی کو سمجھتے ہیں۔ معانی کا سمجھنا اتباع ہوتا ہے اس لئے جس کو توفیق دی گئی ہوتی ہے۔

وَإِذْ أَبَتْنَا إِبْرٰہِمَ رَبُّہٗ بِکَلِمَتٍ فَأَتَتْہُنَّ ؕ قَالَ إِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ؕ قَالَ وَ

مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظَّالِمِیْنَ ؕ

”اور یاد کرو جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں سے تو انہیں پورے طور پر بجالایا۔ اللہ نے فرمایا: بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا۔ عرض کی: میری اولاد سے بھی؟ فرمایا: نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں تک۔“

اس میں بیس مسائل ہیں (☆)۔

**مسئلہ نمبر 1:** جب کعبہ اور قبلہ کا ذکر جاری تھا تو اس کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرما دیا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کو بنایا تھا۔ یہود کا حق تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے انحراف نہ کرتے کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے۔ الابتلاء کا معنی آزمائش کرنا ہے۔ اس کا معنی حکم دینا ہے اور مکلف بنانا ہے۔ ابراہیم، اس کی سریانی زبان میں تفسیر وہ ہے جو ماوردی نے ذکر کی ہے اور عربی میں وہ ہے جو ابن عطیہ نے ذکر کی ہے اب رحیم (4) (مہربان باپ)

4۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ ایضاً

2۔ ایضاً

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

☆ متن میں اسی طرح ہے حالانکہ تفصیل میں تیس مسائل ہیں۔

سہیلی نے کہا: اکثر سریانی اور عربی زبان میں اتفاق واقع ہوتا ہے یا لفظ میں ایک دوسری کے قریب واقع ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ابراہیم کی تفسیر اب راحم (مہربان باپ) بچوں پر ان کی شفقت کی وجہ سے ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت سارہ قیامت تک مومنوں کے ان بچوں کے کفیل ہیں جو بچپن میں فوت ہو گئے ہیں۔ میں کہتا ہوں: اس پر بخاری کی حدیث دلالت کرتی ہے، حضرت سمرہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، یہ ایک لمبا خواب ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک باغ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا ان کے ارد گرد لوگوں کی اولاد تھی۔ ہم نے اس پر تفصیلی گفتگو کتاب ”التذکرہ“ میں کی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شجرہ نسب یہ ہے ابراہیم بن تارخ بن تاخور۔ یہ بعض مؤرخین کے قول کے مطابق ہے (1) اور قرآن حکیم میں ہے: واذ قال ابراہیم لایہیہ آذرہ (جب ابراہیم نے اپنے باپ آذر سے کہا) اسی طرح صحیح بخاری میں بھی ہے۔ ان میں اختلاف اور تناقض نہیں ہے جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورہ انعام میں آئے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار بیٹے تھے۔ اسماعیل، اسحاق، مدین، مدائن۔ جیسا کہ سہیلی نے ذکر کیا ہے۔ اس آیت میں مفعول کو اہتمام کی خاطر مقدم کیا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی حضرت ابراہیم کو آزمانے والا تھا۔ فاعل کے ساتھ ضمیر کا متصل ہونا عربی میں مفعول کی تقدیم کا موجب ہوتا ہے اس اہتمام پر کلام کی بنیاد رکھی گئی ہے (2)۔ عام قراءت ابراہیم نصب کے ساتھ ہے ربہ رفع کے ساتھ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ جابر بن زید سے مروی ہے انہوں نے اس کا الٹ پڑھا ہے اور انہوں نے کہا کہ حضرت ابن عباس نے انہیں اسی طرح پڑھایا۔ معنی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا دعا مانگی۔ اس میں ہکملہ میں باء کی وجہ سے بعد ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یجئکم یہ کلمہ کی جمع ہے ان کی تحقیق اللہ تعالیٰ کے کلام کی طرف لوٹتی ہے لیکن یہاں کلمات سے مراد وہ وظائف ہیں جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مکلف بنایا گیا تھا جب ان وظائف کی تکلیف کلام کے ساتھ تھی اس لئے اسے کلمات سے تعبیر فرمایا جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا کیونکہ وہ کن کے کلمہ سے صادر ہوئے۔ کسی شے کا اس کے مقدمہ کے ساتھ نام رکھنا مجاز کی ایک قسم ہے۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** الکلمات کی مراد میں علماء کا اختلاف ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد شرائع اسلام ہیں اور یہ تیس ہیں۔ دس کا ذکر سورہ برأت میں ہے اَلْاٰیٰتُ الْاَلٰیٰمٰتِ الْاَلٰیٰمٰتِ الْاَلٰیٰمٰتِ... الیٰ اخرہ۔ دس کا ذکر سورہ احزاب میں ہے اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ الْاَخِ۔ دس کا ذکر سورہ المومنون میں ہے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ... عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ① تک اور سورہ سال سائل میں اِلَّا الْمُسْلِمِیْنَ ② سے لے کر وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ③ تک ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کلمات کے ساتھ جس کو بھی آزمایا تو صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پورا کیا۔ اسلام کے ساتھ آزمایا تو حضرت ابراہیم نے اسے مکمل کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے برأت لکھی۔ فرمایا: وَابْرٰهٖمَ



الَّذِي وَكَّلَ (النجم: 37) (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: کلمات سے مراد امر ونہی ہے، بعض نے فرمایا: اپنے بیٹے کا ذبح کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: رسالت کی ادائیگی ہے۔ یہ معانی قریب قریب ہیں۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: میں تجھے ایک امر سے آزمانے والا ہوں۔ حضرت ابراہیم نے عرض کی: تو مجھے لوگوں کے لئے امام بنا دے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔

حضرت ابراہیم نے عرض کی: مِنْ ذُرِّيَّتِي میری اولاد سے بھی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: تو اپنے گھر کو لوگوں کے لوٹنے کی جگہ بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: امن والا بنائے گا۔ فرمایا: ہاں۔ تو ہمیں مناسک دکھائے گا اور ہم پر نظر کرم فرمائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ عرض کی: اس کے باسیوں کو پھلوں سے رزق دے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ اس قول کے مطابق اللہ تعالیٰ مکمل فرمانے والا ہوگا (2)۔ اس سے زیادہ صحیح وہ روایت ہے جو عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے وَاِذَا بَنِيَ ابْنُ اِبْرٰهٖمَ رَآئِهٖ وَكَلَّتْ فَأَتَتْهُنَّ فَتَمَّ لِهِنَّ كَيْدَهُنَّ کے تحت روایت کی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو طہارت کے ساتھ آزمایا۔ پانچ چیزیں سر میں تھیں اور پانچ پورے جسم میں تھیں: مونچھوں کا کاٹنا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا، مانگ نکالنا اور جسم میں یہ چیزیں تھیں: ناخن کاٹنا، زیر ناف بال صاف کرنا، ختنہ کرنا، بغلوں کے بال اکھیرنا، پیشاب، پاخانہ کی جگہ کو پانی کے ساتھ دھونا (3)، اس قول پر حضرت ابراہیم علیہ السلام مکمل کرنے والے ہوں (4)۔ یہی قرآن کا ظاہر ہے۔ مطر نے ابوالجبل سے روایت کیا ہے کہ یہ بھی دس کلمات تھے۔ انہوں نے مانگ کی جگہ اعضاء کے جوڑوں کو دھونا، اور استنجاء کی جگہ زیر ناف بال صاف کرنے کو رکھا ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ خاص مناسک حج ہیں۔ حسن نے کہا: یہ چھ خلال ہیں: ستارہ، چاند، سورج، آگ، ہجرت اور ختنہ کرنا۔ ابواسحاق الزجاج نے کہا: یہ اقوال ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں ان تمام کے ساتھ حضرت ابراہیم کو آزمایا گیا۔ میں کہتا ہوں: مؤطا وغیرہ میں یحییٰ بن سعید سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن مسیب کو یہ فرماتے سنا: ابراہیم علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے ختنہ کیا اور پہلے شخص ہیں جنہوں نے مہمان نوازی کی، پہلے شخص ہیں جنہوں نے زیر ناف بال صاف کئے، پہلے شخص ہیں جنہوں نے ناخن تراشے، پہلے شخص ہیں جنہوں نے مونچھیں کاٹیں، پہلے شخص ہیں جن کے بال سفید ہوئے، جب سفید بالوں کو دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ وقار ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: یا رب! میرے وقار میں اضافہ فرما..... ابوبکر بن ابی شیبہ نے سعید بن ابراہیم سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: سب سے پہلے جس نے منبر پر خطبہ دیا وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے، دوسرے علماء نے فرمایا: سب سے پہلے جس نے ثرید (سالن میں روٹی کے ٹکڑے ڈال کر کھانا) بنائی، جس نے سب سے پہلے تلوار چلائی، جس نے سب سے پہلے مسواک کیا، جس نے سب سے پہلے پانی سے استنجا کیا، جس نے سب سے پہلے شلوار پہنی وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے۔ حضرت معاذ بن جبل

2- تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

4- المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

1- تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3- تفسیر طبری زیر آیت ہذا

سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر میں منبر بناؤں تو میرے باپ ابراہیم نے منبر بنایا تھا، اگر میں لاٹھی پکڑوں تو میرے باپ ابراہیم نے لاٹھی پکڑی تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ ایسے احکام ہیں جن کا بیان اور جن پر آگاہی اور جن پر کلام کرنا ضروری ہے، ان میں سے پہلا ختنہ کرنا ہے اور اس کے متعلق جو روایات آئی ہیں۔ یہی مسئلہ ہے؟

**مسئلہ نمبر 4:** علماء کا اجماع ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تھا، جس عمر میں آپ نے ختنہ کیا اس میں اختلاف ہے۔ مؤطا میں حضرت ابو ہریرہ سے موقوفاً مروی ہے ختنہ کرنے کے وقت آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی اور اس کے بعد آپ اسی سال زندہ رہے۔ اس قسم کی روایت، اپنی رائے سے نہیں ہو سکتی۔ اوزاعی نے مرفوعاً یحییٰ بن سعید سے انہوں نے حضرت سعید بن مسیب سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تو آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی پھر اس کے بعد آپ اسی سال زندہ رہے۔ یہ ابو عمر نے ذکر کیا ہے۔ یحییٰ کے علاوہ کئی واسطوں سے مسند مرفوع روایت کی ہے کہ انہوں نے ختنہ کیا جب آپ کی عمر اسی سال کو پہنچ گئی تھی اور تیسے کے ساتھ آپ نے ختنہ کیا تھا۔ اسی طرح صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ آپ کی عمر اسی سال تھی یہی حدیث بخاری میں اور حدیث اعرج عن ابی ہریرہ عن النبی ﷺ سے محفوظ ہے (1)۔ حضرت عکرمہ نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تو آپ کی عمر اسی سال تھی۔ اس کے بعد ملت ابراہیم پر کسی نے بیت اللہ کا طواف نہ کیا مگر وہ مختون تھا۔ اسی طرح عکرمہ نے کہا اور مسیب بن رافع نے کہا ہے۔ مروزی نے یہ ذکر کیا ہے۔ القدوم (حمیہ) یہ دال کی تشدید اور تخفیف کے ساتھ ہے۔ ابوالزناد نے کہا: القدوم دال کی شد کے ساتھ ہو تو اس سے مراد جگہ کا نام ہے۔ (2)

**مسئلہ نمبر 5:** ختنہ کرنے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مؤکدہ سنن میں سے ہے اور فطرت اسلام میں سے ہے۔ مردوں کو اس کے ترک کی گنجائش نہیں ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یہ فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أَن تَشْبِغَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا** (النحل: 123)

قتادہ نے کہا: اس سے مراد ختنہ کرنا ہے۔ بعض مالکیوں کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے، ابن سرج نے اس کے وجوب پر شرمگاہ کی طرف دیکھنے کی حرمت سے استدلال کیا ہے۔ اس نے کہا: اگر ختنہ کرنا فرض نہ ہوتا تو مختون کی شرمگاہ کو دیکھنا مباح نہ ہوتا۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے جسم کی مصلحت کے لئے یہ مباح ہوتا ہے جیسے طبیب کے لئے دیکھنا مباح ہوتا ہے اور طب بالا جماع واجب نہیں۔ مزید بیان ان شاء اللہ سورۃ النحل میں آئے گا۔ ہمارے بعض اصحاب نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو حجاج بن ارطاة نے ابوالحسین سے اور انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے شداد بن اوس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (ختنہ کرنا مردوں کے لئے سنت ہے اور عورتوں کے لئے اچھا عمل ہے) حجاج

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراہیم علیہ السلام حلیلاً، حدیث 3107، ضیاء القرآن پبلیکیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الختان بعد الکبر وتلف الابسط، حدیث 5824، ضیاء القرآن پبلیکیشنز

قابل حجت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں جس حدیث سے حجت پکڑی جاتی ہے وہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: فطرت پانچ چیزیں ہیں: ختنہ کرنا..... الحدیث۔ آگے تفصیل سے آئے گی۔ ابو داؤد نے حضرت ام عطیہ سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت مدینہ طیبہ میں عورتوں کے ختنے کرتی تھیں۔ اسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کاٹنے میں مبالغہ نہ کیا کر کیونکہ یہ عورت کے لئے اچھا ہے اور خاوند کے لئے پسندیدہ ہے۔ ابو داؤد نے کہا: یہ حدیث ضعیف ہے اس کا راوی مجہول ہے (1)۔ وہ روایت جس کو رزین نے ذکر کیا ہے اس میں مبالغہ نہ کر کیونکہ چہرہ کے لئے زیادہ نور کا باعث ہے اور مرد کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اگر بچہ مختون پیدا ہو تو دوبارہ ختنہ کی ضرورت نہیں۔ میمون نے کہا: مجھے احمد نے کہا: یہاں ایک شخص ہے اس کا مختون بچہ پیدا ہوا ہے وہ اس وجہ سے شدید غمگین ہوا، میں نے اسے کہا جب اللہ تعالیٰ نے خود تیری اس مسئلہ میں کفایت فرمائی ہے تو تو پریشان کس لئے ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** ابو الفرج جوزی نے کہا: مجھے حضرت کعب الاحبار سے بتایا گیا ہے، فرمایا: تیرے انبیاء کرام مختون پیدا ہوئے تھے۔ حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت ادریس، حضرت نوح، حضرت سام، حضرت لوط، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت شعیب، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ اور نبی کریم ﷺ و علیہم اجمعین۔ محمد بن حبیب ہاشمی نے کہا: وہ چودہ انبیاء کرام تھے۔ حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت زکریا، حضرت عیسیٰ، حضرت حنظلہ بن صفوان (یہ اصحاب الرس کے نبی تھے) اور حضرت محمد ﷺ و علیہم اجمعین۔

میں کہتا ہوں: نبی کریم ﷺ کے متعلق روایات مختلف ہیں۔ ابو نعیم الحافظ نے اپنی کتاب ”الحلیۃ“ میں اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ مختون پیدا ہوئے تھے۔ ابو عمرو نے ”التمہید“ میں اس سند، حدیثنا احمد بن محمد بن احمد حدیثنا محمد بن عیسیٰ حدیثنا یحییٰ بن ابوب بن بادی العلاف حدیثنا محمد بن ابی السری العسقلانی حدیثنا الولید بن مسلم عن شعیب عن عطاء الخراسانی عن عکرمہ عن ابن عباس کے ساتھ روایت کیا ہے۔ عبدالمطلب نے ساتویں دن نبی کریم ﷺ کا ختنہ کیا تھا اور دسترخوان لگایا تھا اور آپ ﷺ کا نام (محمد) رکھا تھا۔ ابو عمرو نے کہا: یہ حدیث مسند غریب ہے۔ یحییٰ بن ایوب نے کہا: میں نے یہ حدیث تلاش کی تو مجھے ان محدثین میں سے کسی کے پاس نہیں ملی جن سے میری ملاقات ہوئی ہے مگر ابن ابی السری کے پاس ملی۔ ابو عمرو نے کہا: یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ مختون پیدا ہوئے تھے۔

**مسئلہ نمبر 8:** علماء کا اختلاف ہے کہ بچے کا ختنہ کب کیا جائے۔ اخبار میں علماء کی ایک جماعت سے ثابت ہے وہ کہتے ہیں: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ تیرہ سال کی عمر میں کیا تھا، اپنے بیٹے اسحاق کا ختنہ

1۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی الختان، حدیث 4587، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



ساتویں روز کیا تھا۔ حضرت سیدہ فاطمہ سے مروی ہے کہ وہ اپنی اولاد کا ساتویں روز ختنہ کرتی تھی۔ امام مالک نے اس کا انکار کیا اور کہا یہ یہود کا عمل ہے۔ مالک سے ابن وہب نے یہ ذکر کیا ہے۔ لیث بن سعد نے کہا: بچے کا ختنہ سات سال سے دس سال تک کے درمیان کیا جائے۔ ابن وہب نے مالک سے اس طرح روایت کیا ہے۔ احمد نے فرمایا: اس کے متعلق میں نے کچھ نہیں سنا۔ بخاری میں سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرمایا: حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا: تم کتنی عمر کے تھے جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تھا؟ حضرت ابن عباس نے کہا: میں اس وقت مختون تھا۔ فرمایا: اور لوگ مرد کا ختنہ نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جاتا یا قریب البلوغ ہوتا۔ (1)

بڑا آدمی جو اسلام قبول کرے علماء نے اس کا ختنہ کرنا مستحب قرار دیا ہے۔ عطا کہتے تھے: اس کا اسلام مکمل نہ ہوگا حتیٰ کہ اس کا ختنہ کیا جائے اگرچہ وہ اسی سال کو پہنچ جائے۔ حسن سے مروی ہے: وہ بوڑھے شخص کو ختنہ نہ کرنے کی رخصت دیتے تھے جو مسلمان ہوتا تھا اور اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتے تھے اور اس کی شہادت، اس کا ذبیحہ، اس کے حج اور نماز میں بھی کوئی حرج نہیں دیکھتے تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا: اکثر اہل علم کا یہی نظریہ ہے اور غیر مختون کے حج کے بارے میں حضرت بریدہ کی حدیث ثابت نہیں۔ حضرت ابن عباس، حضرت جابر بن زید اور عکرمہ سے روایت ہے کہ غیر مختون کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا اور اس کی شہادت جائز نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** اول من استحدّ کا قول۔ استحداد کا مطلب ہے زیر ناف بالوں کو صاف کرنے کے لئے لوہا استعمال کرنا۔ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نورہ (چونا) استعمال کرتے تھے تو زیر ناف بالوں کے لئے اپنے ہاتھ سے نورہ استعمال کرتے تھے (2)۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کو نورہ لگایا حتیٰ کہ جب زیر ناف تک پہنچا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا: تو یہاں سے چلا جا پھر اپنے ہاتھ سے زیر ناف نورہ لگایا۔ حضرت انس نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نورہ نہیں لگاتے تھے جب زیر ناف بال زیادہ ہوتے تو انہیں مونڈ دیتے۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ دلیل ہے کہ آپ کا اکثر فعل حلق تھا اور نورہ کبھی استعمال کرتے تھے، یہ اس لئے تاکہ دونوں حدیثوں کو جمع کرنا صحیح ہو۔

**مسئلہ نمبر 10:** تقليم الاظفار (ناخن کاٹنا)۔ قلامہ اس حصہ کو کہتے ہیں جو ناخن سے تراشا جاتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں عورتوں کے لئے ناخن کاٹنا اور زیر ناف بال صاف کرنا پسند کرتا ہوں جس طرح مردوں پر ہے۔ یہ حارث بن مسکین اور محنون نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔ حکیم ترمذی نے ”نواور الاصول“ میں الاصل التاسع والعشرون فصل میں ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں عمر بن ابی عمر نے بتایا فرمایا ہمیں ابراہیم بن العلاء زبیدی نے بتایا انہوں نے عمر بن بلال فرازی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت عبد اللہ بن بشیر مازنی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے ناخن کاٹو اور ناخنوں کے تراشوں کو دفن کرو، اپنے جوڑوں کو صاف کرو، کھانے سے اپنے مسوڑھوں کو صاف کرو، مسواک کرو

1۔ صحیح بخاری، باب الختان بعد الکبر و تکلیف الاطباء، حدیث 5825، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب الاطلام بالنورۃ، حدیث 3741، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور میرے پاس پہلے دانتوں اور بدبو کے ساتھ نہ آیا کرو۔ پھر اس حدیث پر کلام فرمائی اور عمدہ کلام فرمائی۔ امام ترمذی نے فرمایا: رہا ناخن کا ٹائیہ اس لئے ہے کیونکہ اس سے خراش لگتی ہے اور نقصان ہوتا ہے اور ان میں میل جمع ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان جنبی ہو جاتا ہے اور اس میل کی وجہ سے پانی جلد تک نہیں پہنچتا اور وہ ہمیشہ جنبی رہتا ہے۔ جو آدمی جنبی ہو اور غسل کرنے کے بعد سوئی کی جگہ بھی خشک رہ جائے تو وہ اپنی حالت پر جنبی ہی ہوتا ہے حتیٰ کہ پورے جسم کا غسل کر لے۔ اسی وجہ سے ناخن کاٹنے کی ترغیب دی۔ اظفار جمع ہے اظفر کی۔ اور الاظفار جمع ہے الظفر کی۔

رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں ہے: جب آپ نماز میں بھول گئے فرمایا: مجھے کیا ہے کہ میں نہ وہم کروں جبکہ تم میں سے کسی کے ناخنوں اور پوروں کے درمیان میل ہوتی ہے تم میں سے کوئی مجھ سے آسمان کی خبر کے متعلق پوچھتا ہے جبکہ اس کے ناخنوں میں جنابت اور میل ہوتی ہے (1)۔ اس خبر کو ابوالحسن علی بن محمد الطبری المعروف الکلیا نے ”احکام القرآن“ میں سلیمان بن فرح ابوداؤد اصل سے روایت کر کے ذکر کیا ہے۔ فرمایا: میں حضرت ابویوب کے پاس آیا میں نے ان سے مصافحہ کیا تو انہوں نے میرے لمبے ناخن دیکھے۔ حضرت ابویوب نے فرمایا: ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آسمان کی خبر کے متعلق پوچھنے کے لئے آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی آسمان کی خبر کے متعلق پوچھنے کے لئے آتا ہے جب کہ اس کے ناخن پرندوں کے ناخنوں کی طرح ہوتے ہیں حتیٰ کہ ان میں میل کچیل جمع ہو جاتی ہے (2)۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ادفنوا قلاماتکم ناخنوں کے تراشے دفن کر دو کیونکہ مومن کا جسم حرمت والا ہے، جو مومن کے جسم سے ساقط ہو اور زائل ہو اس کی بھی حرمت قائم ہے (3)۔ پس اسے دفن کر دینا چاہئے جیسے مومن جب مر جاتا ہے تو اسے دفن کیا جاتا ہے۔ اور جب اس کا بعض حصہ مر جائے تو دفن کر کے اس کی حرمت قائم کی جائے گی تاکہ وہ بکھر نہ جائے، آگ میں نہ گرے یا کسی گندی جگہ نہ گرے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا خون دفن کرنے کا حکم دیا جب آپ نے پچھنے لگوائے تھے تاکہ اسے کتے نہ پیئیں۔ اس کے متعلق میرے والد رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیں بتایا اور کہا: ہمیں موسیٰ بن اسماعیل نے بتایا فرمایا: ہمیں مفید بن قاسم بن عبد الرحمن بن ماغر نے بتایا فرمایا: میں نے عامر بن عبد اللہ بن زبیر کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ان کے والد نے انہیں بتایا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے جبکہ آپ پچھنے لگوارہے تھے۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا: اے عبد اللہ! یہ خون لے جاؤ اور ایسی جگہ انڈیل دو جہاں تجھے کوئی نہ دیکھے۔ جب رسول اللہ ﷺ سے اوچھل ہو گئے تو انہوں نے آپ ﷺ کا خون پی لیا، جب وہ واپس آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عبد اللہ! تو نے اس خون کو کیا کیا؟ حضرت عبد اللہ نے کہا: میں نے اسے مخفی جگہ رکھ دیا ہے۔ میرا گمان ہے وہ لوگوں سے مخفی رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لعلک شریبتہ۔ شاید تو نے وہ پی لیا ہے۔ حضرت عبد اللہ نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تو نے خون کیوں پیا ہے؟ لوگوں کے لئے تجھ سے ہلاکت ہے اور تیرے لئے لوگوں سے ہلاکت ہے۔

میرے باپ نے مجھے بتایا، فرمایا: مالک بن سلیمان ہروی نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا: ہمیں داؤد بن عبد الرحمن نے بتایا

انہوں نے ہشام بن عروہ سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ انسان کی سات چیزوں کو دفن کرنے کا حکم دیتے تھے: بال، ناخن، خون، حیض، دانت، قلفہ (وہ حصہ جو ختنہ کرنے والا کاٹا جاتا ہے) اور تے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: نَقُوا بِرَاجِمِكُمْ اپنے جوڑ صاف کرو جہاں میل جمع ہو جاتی ہے۔ براجم کا مفرد بُرْجَمۃ ہے ہر جوڑ کی گرہ۔ پس ہر گرہ کی پیٹھ کو ہرجمہ کہا جاتا ہے اور جو دو گرہوں کے درمیان ہو اسے راجبۃ کہتے ہیں اس کی جمع رواجب ہے۔ یہ وہ حصہ ہوتا ہے جو ظاہر سے ملا ہوا ہوتا ہے یہ انگلی کا قصبہ ہے ہر انگلی کے دو ہرجم اور تین رواجب ہوتے ہیں سوائے انگوٹھے کے اس کا ایک ہرجم اور دو رواجب ہیں۔ آپ ﷺ نے ان کی صفائی کا حکم دیا تا کہ میل نہ ہو اور جنابت باقی نہ رہے اور میل، پانی اور جلد کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: نَظَفُوا لِسَاتِكُمْ (اپنے مسوڑوں کو صاف کرو)۔ لِسۃٌ واحد ہے اور اس کی جمع لِسَات ہے۔ یہ وہ گوشت ہوتا ہے جو دانتوں کے اوپر اور دانتوں کے نیچے ہوتا ہے دانتوں کے نکلنے کی جگہ اور الْعُضُد اس تھوڑے سے گوشت کو کہتے ہیں جو دانتوں کے درمیان ہوتا ہے، اس کا مفرد عُضْر ہے۔ ان کے صاف کرنے کا حکم دیا تا کہ اس میں کھانے کا کوئی ٹکڑا باقی نہ رہے اور اس میں بد بو نہ پیدا ہو جائے اور فرشتوں کو کوئی تکلیف ہو۔ کیونکہ یہ قرآن کا راستہ ہے اور فرشتوں کے بیٹھنے کی جگہ بڑے دانتوں کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق) کے تحت خبر روایت کی گئی ہے کہ فرشتہ آدمی کے بڑے دانتوں کے پاس ہے۔ محمد بن علی الشافعی نے ہمیں یہ بیان کیا، فرمایا: میں نے اپنے باپ کو سفیان بن عیینہ سے یہ ذکر کرتے ہوئے سنا۔ انہوں نے بہت عمدہ ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ لفظ، ہونٹوں کا عمل ہے وہ کلام کو اپنی زبان سے باہر پھینکتا ہے لدیہ سے مراد اس کے پاس ہے۔ لدی اور عند کا معنی لغت میں ایک ہے اسی طرح لدن ہے، اس میں نون زائدہ ہے۔ گویا آیت سے معلوم ہوتا ہے سخت کلام کرنے والے کے پاس تاثر نے والا سخت موجود ہے اور وہ بڑا دانت ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: تَسْنُوْا يَہِ السِّنَّ سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے مسواک کرو، یعنی دانت صاف کرو۔ لَا تَدْخُلُوا عَلٰی قَعْرِ ابْخَرٍ امیرے نزدیک محفوظ قحلاً و قحلاً ہے۔ یعنی میرے پاس پیلے دانتوں اور منہ کی بد بو کے ساتھ نہ آؤ۔ میں نے جارود کو نصر سے روایت کرتے ہوئے سنا کہ اقدم اس شخص کو کہتے ہیں جس کے دانت پیلے ہوں حتیٰ کہ ان کے اندر سے بد بو آئے۔ میں القحہ نہیں جانتا، البخرا اس شخص کو کہتے ہیں جس کے جسم سے بد بو آئے۔ کہا جاتا ہے: رجل ابخرا، رجال ابخرا۔

ہمیں جارود نے بتایا، فرمایا: ہمیں جریر نے بتایا انہوں نے منصور سے انہوں نے ابو علی سے انہوں نے ابو جعفر بن تمام بن عباس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسواک کرو تمہیں کیا ہے تم میرے پاس پیلے دانتوں کے ساتھ آتے ہو۔

**مسئلہ نمبر 11:** قص الشارب (موچھوں کا کاٹنا) موچھیں اتنی کاٹنا کہ ہونٹ کی طرف ظاہر ہو جائے۔ بالکل نہ مونڈ



دے کہ اپنے آپ کو مثلہ کر دے (1)۔ امام مالک نے بھی فرمایا۔ ابن عبدالحکم نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں دیکھتا ہوں کہ جو مونچھوں کا حلق (مونڈ دے) کرائے اسے ادب سکھایا جائے۔ اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: مونچھیں مونڈنا بدعت ہے جو ایسا کرے اسے سزا دی جائے۔ ابن خویز منداد نے کہا: امام مالک نے فرمایا: جو مونچھوں کا حلق کرے اسے مار کر تکلیف دینی چاہئے گویا وہ اسے مثلہ دیکھتے تھے، حلق کی نسبت مونچھوں کو چھوٹا کرنا امام مالک کے نزدیک اولیٰ ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ کے بال لمبے تھے۔ آپ کے صحابہ میں سے کسی کے بال لمبے ہوتے تھے اور کسی کے چھوٹے ہوتے تھے۔ عمرہ اور حج کے موقع پر آپ ﷺ نے سر کا حلق کرایا تو صحابہ نے بھی حلق کرایا۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کی طرف جانے سے پہلے ناخن اور مونچھیں کاٹتے تھے۔ امام طحاوی نے فرمایا: ہم امام شافعی سے اس کے بارے میں کوئی نص نہیں پاتے اور ان کے اصحاب جن کو ہم نے دیکھا مرنے اور ربیع یہ اپنی مونچھوں کو خوب پست کرتے تھے۔ یہ دلیل ہے کہ انہوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ عمل لیا ہوگا۔ فرمایا: امام ابو حنیفہ، امام زفر، امام ابو یوسف اور امام محمد کا مذہب سر کے بالوں اور مونچھوں کے بارے میں یہ تھا کہ تقصیر سے احفاء افضل ہے۔ یعنی بال اور مونچھیں چھوٹی کرنے سے بالکل مونڈ دینا افضل ہے۔ ابن خویز منداد نے امام شافعی سے روایت کیا ہے کہ ان کا مذہب مونچھوں کو حلق (مونڈنے) کرنا امام ابو حنیفہ کے مذہب کے مطابق ہے۔ ابو بکر اثرم نے کہا: میں نے امام احمد بن حنبل کو دیکھا وہ مونچھوں کو انتہائی پست کرتے تھے۔ میں نے سنا کہ ان سے مونچھوں کے انتہائی پست کرنے کے سنت ہونے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اسی طرح انتہائی پست کی جائیں جس طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا: احفوا الشوارب مونچھوں کو انتہائی پست کرو۔ ابو عمر نے کہا: اس باب میں دو اصل ہیں۔ ایک لفظ ہے اُحْفُوا مونچھوں کو انتہائی پست کرو۔ یہ لفظ تاویل کا احتمال رکھتا ہے دوسرا لفظ قص الشارب ہے یہ لفظ مفسر ہے اور مفسر، مجمل پر غالب ہوتا ہے۔ یہی اہل مدینہ کا عمل ہے یعنی (مونچھوں کو کاٹنا) اور جو کچھ اس کے متعلق کہا گیا ہے اس میں سے یہ بہتر ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، رسول اللہ ﷺ مونچھوں کو کاٹتے تھے اور فرماتے تھے: ابراہیم خلیل الرحمن ایسا کرتے تھے (2)۔ فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: فطرت پانچ چیزیں ہیں: ختنہ کرنا، زیر ناف بال صاف کرنا، مونچھیں کاٹنا، ناخن کاٹنا، بغلوں کے بال نوچنا (3)۔ حضرت ابن عمر سے ترمذی میں مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مشرکین کی مخالفت کرو مونچھوں کو انتہائی پست کرو، داڑھیوں کو بڑھاؤ اور عجی لوگ اپنی داڑھیوں کو کاٹتے ہیں اور مونچھوں کو بڑھاتے ہیں یا دونوں کو اکٹھا بڑھاتے ہیں۔ یہ جمال اور نظامت کے برعکس ہے۔ رزین نے نافع سے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمر اپنی مونچھوں کو اتنا پست کرتے تھے کہ ان کی جلد نظر آتی تھی، اور مونچھوں اور داڑھی کو کاٹتے تھے۔

1۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع، باب ما جاء في الفطرة، صفحہ 712 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، ابواب الاداب، باب ما جاء في قص الشارب، جلد 2، صفحہ 100 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، باب عصال الفطرة، جلد 1، صفحہ 129 (قدیمی کتب خانہ)

بخاری میں ہے حضرت ابن عمر جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی داڑھی جو قبضہ سے زائد ہوتی اسے کاٹ دیتے۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی داڑھی کو عرض اور طول سے کاٹتے تھے (1)۔ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔

**مسئلہ نمبر 12:** بغلوں کے بال نوچنا سنت ہے جس طرح زیر ناف بالوں کا حلق (مونڈنا) سنت ہے اگر کوئی اس کا الٹ کر دے تو بھی جائز ہوگا کیونکہ نظافت حاصل ہوگئی۔ پہلا طریقہ بہتر ہے اور آسان و معتاد ہے۔

**مسئلہ نمبر 13:** فرق الشعر (بالوں کی مانگ نکالنا)۔ نبی کریم ﷺ کی صفت میں ہے۔ جب آپ کے بندھے ہوئے بال بکھر جاتے تو آپ مانگ نکالتے۔ کہا جاتا ہے: فرقت الشعر افرقه فرقا بالوں کو جدا جدا کرنا۔ کہتے ہیں: ان انفرق شعر راسه فرقه فی مفرقه۔ سر کے بال بکھر جاتے تو اسے اپنی مانگ میں علیحدہ علیحدہ کر دیتے اور اگر بکھرتے نہیں تھے تو سر پر اکٹھا رکھتے۔ نسائی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے بالوں کو پیشانی پر ڈالے رکھتے تھے جب کہ مشرک لوگ اپنے بالوں کی مانگ نکالتے تھے۔ آپ ﷺ ہر اس کام میں اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے جس میں آپ کو کوئی حکم نہیں دیا گیا ہوتا تھا پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ بالوں میں مانگ نکالتے تھے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے حضرت انس سے روایت کی ہے (2)۔ قاضی عیاض نے کہا: سدل الشعر کا مطلب بالوں کو کھلا چھوڑ دینا اور اس حدیث میں علماء کے نزدیک بالوں کو پیشانی پر چھوڑنا ہے اور ان کا گچھا بنانا ہے۔ بال میں مانگ نکالنا سنت ہے کیونکہ اس طرف نبی کریم ﷺ نے رجوع کیا تھا، روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جمعہ سے واپس آتے تھے تو مسجد کے دروازے پر اپنے سپاہیوں کو کھڑا کرتے تھے اور ہر اس شخص کی پیشانی کے بال کاٹ دیتے تھے جو اپنے بالوں کی مانگ نکالے ہوئے نہ ہوتا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت تھی۔

**مسئلہ نمبر 14:** سفید بال نور ہیں اور ان کا نکالنا مکروہ ہے۔ نسائی اور ابوداؤد میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سفید بال نہ نوچو، جس مسلمان کے اسلام میں بال سفید ہوتے ہیں وہ قیامت کے روز اس کے لئے نور ہوں گے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک نیکی لکھے گا اور اس سے گناہ معاف فرمائے گا۔

میں کہتا ہوں: جس طرح سفید بال نوچنا مکروہ ہے اسی طرح سفید بالوں کو سیاہی میں بدلنا بھی مکروہ ہے لیکن سیاہی کے علاوہ کسی رنگ سے بدلنا جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ابو قحافہ کے حق میں فرمایا:..... انہیں لایا گیا تھا جب ان کے بال ٹغامہ بوٹی کی طرح سفید تھے..... اس کو کسی چیز سے تبدیل کر دو، اور سیاہ (خضاب) سے اجتناب کرو۔ کتنا خوبصورت شعر کہا ہے جس نے کہا ہے

یسود اعلاھا و یبیض اصلھا ولا یخیر فی الاصل اذا فسد الاصل

1۔ جامع ترمذی، ابواب الادب، باب ما جاء فی الاخذ من اللحية، جلد 2، ص 2

2۔ صحیح بخاری، صفۃ النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام، حدیث 3294، خیار القرآن، بلی کوشنر

اوپر سے سیاہ اور اصل سفید ہے، اوپر والے رنگ میں کوئی بھلائی نہیں جب اصل بری ہو۔  
ایک اور شاعر نے کہا:

يا خاضب الشيب بالحناء تستره سل المليك له ستراً من النار  
اے مہندی کے ساتھ سفید بالوں کو خضاب کر کے چھپانے والے! اللہ تعالیٰ سے آگ سے پردہ کا سوال کر۔

**مسئلہ نمبر 15:** الثريد (سالن میں ٹکڑے بھگو کر چوری بنا کر کھانا) یہ عمدہ کھانا ہوتا ہے اور زیادہ برکت والا ہوتا ہے۔ یہ عربوں کا کھانا ہے نبی کریم ﷺ نے تمام کھانوں پر اس کھانے کی فضیلت کی گواہی دی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت تمام عورتوں پر اس طرح ہے جس طرح ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر ہے (1)۔ صحیح البستی میں حضرت اسماء بنت ابی بکر سے مروی ہے کہ وہ جب ثرید بناتی تھیں تو اسے کسی چیز سے ڈھانپ دیتی تھیں حتیٰ کہ اس کی گرمی ختم ہو جائے اور فرماتی تھیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے یہ بڑی برکت والا کھانا ہے۔

**مسئلہ نمبر 16:** میں کہتا ہوں: یہ سب اس روایت کا مفہوم تھا جو عبد الرزاق نے حضرت ابن عباس سے روایت کی اور جو سعید بن مسیب وغیرہ نے کہا، کلی، ناک میں پانی ڈالنا اور مسواک کا ذکر سورہ النساء میں آئے گا اور استنجا کا حکم سورہ برأت میں اور ضیافت کا حکم سورہ ہود میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: مونچھیں کاٹنے، ناخن تراشنے، بغلوں کے بال نوچنے، زیر ناف بال مونڈنے کا ہمارے لئے وقت متعین کیا گیا ہے کہ چالیس راتوں سے زیادہ انہیں نہ چھوڑے رکھیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: چالیس راتیں یہ اکثر مدت کی حد ہے۔ مستحب یہ ہے کہ ہر جمعہ کو یہ صفائی کی جائے۔ یہ حدیث جعفر بن سلیمان نے روایت کی ہے۔ عقیلی نے کہا: اس کی حدیث میں نظر ہے۔ ابو عمر نے اس کے متعلق کہا: جعفر بن سلیمان اپنے حافظہ کی خرابی اور غلطیوں کی کثرت کی وجہ سے حجت نہیں ہے۔ نقل کے اعتبار سے یہ حدیث قوی نہیں ہے لیکن ایک قوم نے اس کا قول کیا ہے اور اکثر علماء کا خیال ہے کہ اس کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔ وبالله التوفیق

**مسئلہ نمبر 17:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، الامام کا معنی، قُذُوہ ہے۔ اسی سے خیط البناء کو امام کہا جاتا ہے، راستہ کو بھی امام کہا جاتا ہے کیونکہ چلنے کے لئے اس کا قصد کیا جاتا ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم تجھے لوگوں کے لئے امام بنائیں گے۔ ان خصال میں وہ تیری اقتداء کریں گے، نیک لوگ تیری پیروی کریں گے اللہ تعالیٰ نے انہیں اہل اطاعت کے لئے امام بنایا۔ اسی وجہ سے تمام امتوں کا آپ کے بارے میں اجتماعی دعویٰ ہے کہ آپ باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف مائل ہونے والے تھے۔ (2)

**مسئلہ نمبر 18:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ اللہ کی بارگاہ میں رغبت کی جہت سے دعا ہے۔ یعنی اے میرے حب! میری اولاد سے بھی امام بنا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اولاد کے متعلق استقبہام کی جہت سے ہے یعنی اے میرے

1۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب من فضل عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، جلد 2، صفحہ 228 (وزارت تعلیم)  
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا



رب! میری اولاد سے کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ان میں گنہگار، ظالم ہوں گے وہ امامت کے مستحق نہ ہوں گے (1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا کہ ان کی اولاد سے امام بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کیا کہ اس کی اولاد میں نافرمان بھی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

**مسئلہ نمبر 19:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمِنْ ذُرِّيَّتِي**، ذریۃ یہ الذر سے فُعْلِيۃ کا وزن ہے کیونکہ انسانی مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے ذروں کی طرح نکالا تھا جب انہیں ان کے نفسوں پر گواہ بنایا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ ذر اللہ الخلق یذروہم ذرءاً سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: اللہ نے انہیں پیدا کیا، اسی سے الذریۃ ہے جس کا معنی ہے جن و انس کی نسل لیکن عربوں نے اس کا ہمزہ ترک کر دیا، اس کی جمع الذراری ہے (2)۔ حضرت زید بن ثابت نے ذریۃ ذال کے کسرہ کے ساتھ اور ذریۃ ذال کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن جنی ابوالفتح عثمان نے کہا: اس حرف کی اصل چار الفاظ کا احتمال رکھتی ہے: (1) ذرأ (2) ذرر (3) ذرو (4) ذری۔ ہمزہ والی صورت ہو تو یہ ذرأ اللہ الخلق سے مشتق ہوگا ذرر ہو تو الذر کے لفظ سے ماخوذ ہوگا۔ یہ اس لئے ہے کہ خبر میں وارد ہے کہ مخلوق ذروں کی مانند تھی۔ واداء ریاء سے ہو تو یہ ذروت الحب و ذریتہ سے ہوگا یہ دونوں اکٹھے بولے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَأَصْحَابُ هَشِيمًا تَذُرُوهُ الْوَلِيَّامُ** (الکہف: 45)

یہ اس کے لطاف اور خفت کی وجہ سے ہوگا یہ دانے کی حالت ہے۔ جوہری نے کہا: ذرر الريح التراب وغیرہ تذروہ و تذریۃ ذرواد ذریاً یعنی ہوانے مٹی کو اڑایا۔ اسی سے ہے: ذری الناس الحنطة۔ لوگوں نے دانوں کو اڑایا۔ اذریۃ الشی۔ جب تو کسی چیز کو پھینکے جیسے تو کھیتی کے لئے دانے کو پھینکتا ہے۔ و طعنه فا ذرأه عن ظهر دابته۔ اس نے اسے نیزہ مارا اور سواری کی پیٹھ سے پھینک دیا۔ خلیل نے کہا: اسے ذریۃ کہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی مخلوق کو زمین پر اس طرح پھینک دیا جس طرح کسان دانے پھینکتا ہے۔ بعض نے کہا ذریۃ کی اصل ذرورۃ ہے لیکن جب تضعیف زیادہ ہوئی تو ایک را کو یا سے بدل دیا گیا تو ذریۃ ہو گیا پھر واد کو یا میں ادغام کیا گیا تو ذریۃ ہو گیا، یہاں ذریت سے مراد بیٹے ہی ہیں۔ کبھی اس کا اطلاق آباء اور ابناء دونوں پر ہوتا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَآيَةٌ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمُ** (یسین: 41) یہاں ذریت سے مراد آباء ہیں۔

**مسئلہ نمبر 20:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لَا يَتَّالِ عَهْدِي الظَّالِمِينَ** عہد کے مراد میں علماء کا اختلاف ہے، ابوصالح نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد نبوت ہے۔ سدی نے بھی یہی کہا ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد امامت ہے۔ قتادہ نے کہا: ایمان ہے۔ عطاء نے کہا: رحمت ہے۔ شحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ کا دین ہے، بعض نے کہا: اس کا امر ہے (3)۔ عہد کا اطلاق امر پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّ اللَّهَ عَاهِدَ الْبَيْتِ** (آل عمران: 183)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا۔ فرمایا: **أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ** (یس: 60)۔ یعنی میں نے پہلے تمہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ جب عہد سے مراد اللہ تعالیٰ کا امر ہو تو لا یاتل عہدی الظالمین کا مطلب ہوگا کہ یہ جائز نہیں ہے کہ ظالم لوگ ان کی جگہ آئیں جو اللہ کے اوامر کو

قبول کرتے ہیں وہ ان کو قائم نہیں کریں گے۔ اس کا بیان ابھی قریب ہی ان شاء اللہ آئے گا۔ معمر نے قتادہ سے اس ارشاد لا یَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ کے تحت روایت کیا ہے کہ قتادہ نے فرمایا: اللہ کا عہد آخرت میں ظالموں کو نہیں ملے گا (1)۔ رہا دنیا میں تو ظالم نے اس کو پایا، اس کے ساتھ اس نے امن پایا، کھایا، زندہ رہا اور دیکھا۔

زجاج نے کہا: یہ عمدہ قول ہے لاینال امانی الظالمین یعنی میں انہیں اپنے عذاب سے امن نہیں دوں گا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: یہاں ظالم سے مراد شرک ہے۔ حضرت ابن مسعود، طلحہ بن مصرف نے لاینال عہدی الظالمون پڑھا ہے یعنی ظالمون کے رفع کے ساتھ۔ اور باقی قراء نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے، حمزہ، حفظ اور ابن محیسن نے عہدی میں یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے یا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 21:** اس آیت سے علماء کی ایک جماعت نے استدلال کیا ہے کہ امام عادل، محسن اور فضل والا ہونا چاہئے ساتھ ساتھ اس کو عدل کے قیام کی قوت بھی ہو۔ اس کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا: الاینا زعوا الامر اھلہ۔ یعنی جو حکمرانی کے حقدار ہیں ان سے جھگڑانہ کر دو گے، اس کے متعلق گفتگو گزر چکی ہے۔ رہے فاسق، ظالم اور جابر لوگ وہ حکمرانی کے اہل نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا یَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ اسی وجہ سے حضرت ابن زبیر اور امام حسین رضی اللہ عنہما نے خروج کیا تھا، اہل عراق میں سے نیک لوگوں نے اور عراقی علماء نے حجاج بن یوسف پر خروج کیا تھا۔ اہل مدینہ نے بنی امیہ پر خروج کیا تھا اور ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ حرہ کا واقعہ جو ان پر مسلم بن عقبہ نے واقع کیا تھا۔ یہی وجہ تھی اکثر علماء کا یہ خیال ہے کہ ظالم امام کی اطاعت پر صبر کرنا، خروج سے اولیٰ ہے کیونکہ اس سے لڑنے اور اس پر خروج کرنے میں امن کو خوف سے بدلنا ہے اور خون بہانا ہے اور بیوقوفوں کے ہاتھ کو کھولنا ہے اور مسلمانوں پر حملہ کا دروازہ کھولنا ہے اور زمین میں فساد کا شروع کرنا ہے۔ پہلا مسلک معتزلہ کے ایک گروہ کا ہے یہی خوارج کا مذہب ہے۔

**مسئلہ نمبر 22:** ابن خویر منداد نے کہا، جو ظالم ہو وہ نہ نبی ہوتا ہے نہ خلیفہ نہ حاکم ہوتا ہے نہ مفتی۔ نہ نماز کا امام ہوتا ہے اور نہ اس سے کوئی روایت قبول کی جاتی ہے جو وہ صاحب شریعت سے روایت کرتا ہے، نہ احکام میں اس کی گواہی قبول ہوتی ہے مگر وہ اپنے فسق کی وجہ سے معزول نہیں کیا جاتا حتیٰ کہ اسے دانشمند لوگ معزول کریں۔ جو اس نے پہلے احکام دیئے وہ صحیح احکام تھے تو وہ جاری و نافذ ہوں گے وہ نہیں ٹوٹیں گے۔ امام مالک نے خوارج اور باغیوں کے متعلق اس پر نص قائم کی ہے کہ ان کے احکام نہیں ٹوٹیں گے جب وہ ان میں اجتہاد کے ساتھ صحیح سمت پر پہنچے ہوں اور انہوں نے اجماع کو نہ توڑا ہو اور نصوص کی مخالفت نہ کی ہو۔ یہ ہم نے صحابہ کے اجماع کی وجہ سے کہا ہے، واقعہ یہ ہے کہ خوارج نے صحابہ کے ایام میں خروج کیا، نہ کوئی منقول ہے کہ ائمہ نے ان کے احکام کی جستجو کی تھی اور نہ ان میں سے کسی چیز کو توڑا اور نہ دوبارہ زکوٰۃ لی، نہ دوبارہ حدود کو قائم کیا، جو کچھ خوارج نے کہا تھا اسے ہی قائم رکھا۔ پس یہ دلیل ہے کہ اجتہاد کی وجہ کو انہوں نے صحیح پایا ہو تو ان کے احکام سے تعارض نہ کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 23:** ابن خویز مند اد نے کہا: ظالم حکمرانوں سے تنخواہ لینا، اس کے تین احوال ہیں اگر جوان کے قبضہ میں ہے وہ شریعت کے مطابق انہوں نے حاصل کیا ہے تو پھر اس کا لینا جائز ہے۔ صحابہ اور تابعین نے حجاج وغیرہ کے ہاتھ سے مال لیا تھا اگر ملا جلا مال ہو حلال بھی ہو اور حرام بھی جیسا کہ آجر کے امراء کے ہاتھ میں ہے تو تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ نہ لیا جائے۔ اور محتاج کے لئے اس کا لینا جائز ہے وہ چور کی مانند ہے اس کے ہاتھ میں چوری کا مال بھی ہے اور پاکیزہ حلال مال بھی ہے ایک شخص نے اس مال کا اسے وکیل بنایا ہے۔ چور نے اس مال سے کسی انسان پر صدقہ کر دیا تو اس سے صدقہ لینا جائز ہے۔ اگرچہ جائز تھا کہ چور نے چوری شدہ سے کچھ صدقہ کیا ہو جبکہ کوئی چیز چوری شدہ مال سے معروف نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی چیز بیچے یا خریدے تو عقد صحیح لازم ہوگی اگرچہ تقویٰ یہ ہے کہ اس سے بچا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اموال بذات خود حرام نہیں ہوتے بلکہ اپنی جہات کی وجہ سے حرام ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں جو کچھ ہے اگر صراحۃً ظلم لیا گیا ہو تو پھر ان سے لینا جائز نہیں اور اگر ان کے ہاتھوں میں غصب شدہ مال ہو مگر اس مال کا مالک اور مطالبہ کرنے والا معروف نہ ہو تو وہ اسی طرح ہے اگر وہ چوروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں پایا جائے اسے بیت المال میں رکھا جائے گا اور بقدر اجتہاد اس کے طالب کا انتظار کیا جائے گا جب معلوم نہ ہوگا تو امام اسے مسلمانوں کے مصالح پر خرچ کر دے گا۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَا

إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ①

”اور یاد کرو جب ہم نے بنایا اس گھر (خانہ کعبہ) کو مرکز لوگوں کے لئے اور امن کی جگہ اور (انہیں حکم دیا کہ) بنا لو ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جائے نماز اور ہم نے تاکید کر دی ابراہیم اور اسماعیل کو کہ خوب صاف ستھرا رکھنا میرا گھر طواف کرنے والوں، اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** جَعَلْنَا بمعنی صیغہ ہے کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ البیت سے مراد کعبہ ہے۔ مَثَابَةٌ کا معنی ہے مرجع کہا جاتا ہے ثاب يشوب مشابنا و مثابة و ثوبنا و ثوبانا۔ مثابة مصدر ہے اس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے اس سے مراد وہ جگہ ہے جس کی طرف لوٹا جاتا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے کعبہ کے بارے میں کہا:

مثابنا لا فناء القبائل كلها تغيب اليها البعلات الذوامل (1)

کعبہ تمام قبائل کا مرجع ہے اس کی طرف اونٹ آہستہ چلنے والے آتے ہیں۔

اعمش نے مشابہات جمع پڑھا ہے (2)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ثواب سے ہو یعنی لوگوں کو وہاں ثواب دیا جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا: کوئی شخص اس سے اپنا مطلوب پورا نہیں کرتا۔ شاعر نے کہا:

جعل البيت مثابنا لهم ليس منه الدهر يقضون الوطر



کعبہ کو لوگوں کے لئے لوٹنے کی جگہ بنایا گیا ہے لوگ اس سے اپنی خواہش پوری نہیں کرتے۔

اصل میں مشوبہ تھا و اس کی حرکت تا کو دی گئی پھر وادشاب یثوب کی اتباع میں الف سے بدل گئی اور اسے مفعول ثانی کی وجہ سے نصب دی گئی ہے، مبالغہ کے لئے ءکا اضافہ کیا گیا ہے کیونکہ کثرت سے لوٹنے والے ہوتے ہیں بہت کم ہے کہ کوئی بیت اللہ سے جدا ہوتا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ ابھی اس نے اپنی حاجت پوری نہیں کی۔ یہ نسابہ اور علامۃ کی طرح ہے۔ یہ انفس کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ مصدر کی تانیث کی ہاء ہے، مبالغہ کے لئے نہیں ہے۔ (1)

اگر کہا جائے کہ ہر شخص جو دوبارہ اس کی طرف نہیں آتا۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ لوٹنا ایک مرتبہ آنے والے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ لوگوں سے خالی نہیں ہوتا لوگوں سے قصد کرنے والے معدوم نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمَّا اِمَامٌ اَبُو حَنِيفَةَ اور فقہاء کی ایک جماعت نے اس سے استدلال کیا ہے کہ محسن اور چور پر حرم کی حدود میں حد قائم نہیں کی جائے گی جب وہ حرم میں پناہ لے گا۔ اور اپنے قول کی تائید اس آیت سے کی ہے: وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ اِمِنًا (آل عمران: 97) گویا فرمایا: جو بیت اللہ میں داخل ہو جائے اسے امن دو۔ اور صحیح حرم میں حدود کا قائم کرنا ہے۔ یہ منسوخ ہے کیونکہ اس میں اتفاق ہے کہ بیت اللہ میں قتل نہیں کیا جائے گا اور بیت اللہ سے باہر قتل کیا جائے گا۔ اختلاف اس میں ہے کہ قتل کیا جائے گا یا نہیں۔ حرم پر بیت کے اسم کا اطلاق حقیقتہً نہیں ہوتا اور علماء کا اجماع ہے کہ اگر حرم میں کوئی قتل کرے گا اسے حرم میں قتل کیا جائے گا اگر کسی نے حد کا موجب جرم کیا تو اس سے جرم میں بدل لیا جائے گا۔ اگر حرم میں کوئی جنگ کرے گا تو اس سے جنگ کی جائے گی اس کی جگہ اسے قتل کیا جائے گا۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: جو حرم کی طرف پناہ لے گا اسے حرم میں قتل نہیں کیا جائے گا نہ اس کا پیچھا کیا جائے گا اسے ہمیشہ تنگ کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ مرجائے یا حرم سے باہر آجائے۔

اور ہم اسے تلوار سے قتل کرتے ہیں اور وہ اسے بھوک کے ذریعے قتل کرتے ہیں۔ پس اس سے سخت قتل کون سا ہے؟ اَمَّا یہ استقبال کعبہ کے امر کی تاکید ہے یعنی بیت المقدس میں یہ فضیلت نہیں ہے نہ لوگ اس کا حج کرتے ہیں، جو حرم میں پناہ لے تو وہ حملہ سے امن میں ہو جاتا ہے، مزید بیان سورہ مائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰہِیْمَ مُصَلًّی اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** وَاتَّخِذُوا نَافِع اور ابن عامر نے خبر کے اعتبار سے خاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبعین میں سے جنہوں نے مقام ابراہیم کو مصلی بنایا ان کے متعلق خبر ہے۔ اس کا عطف جَعَلْنَا پر ہے۔ یعنی جعلنا البیت مشابۃ واتخذوا مصلی۔ ہم نے بیت اللہ کو لوٹنے کی جگہ بنایا اور لوگوں نے اسے مصلی بنایا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اذ کی تقدیر پر معطوف ہے، گویا یوں فرمایا: واذ جعلنا البیت مشابۃ واذ اتخذوا۔

پہلی ترکیب پر کلام ایک جملہ ہے اور دوسری ترکیب پر دو جملے ہیں۔ جمہور قراء نے اسے اتخذوا امر کے صیغہ کے اعتبار سے

خاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے پہلے کلام سے اسے الگ کیا ہے اور انہوں نے جملہ کا جملہ پر عطف کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: اذ کروا انعمتی پر اس کا عطف جائز ہے گویا یہ یہود سے فرمایا جا رہا ہے۔ یا اس کا عطف اِذْ جَعَلْنَا کے معنی پر ہے کیونکہ اس کا معنی ہے اذ کروا اذ جعلنا یا اس کا عطف مشابہ کے معنی پر ہے کیونکہ مشابہ کا معنی ہے ثوبوا۔ (1) (لوٹ کر آؤ)

**مسئلہ نمبر 2:** حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے تین باتوں میں اپنے رب کی موافقت کی ہے۔ مقام ابراہیم میں، پردے کے بارے میں اور بدر کے قیدیوں کے بارے میں۔ اس روایت کو مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ بخاری نے یہ روایت حضرت انس سے روایت کی ہے، فرمایا: حضرت عمر نے فرمایا: میں نے تین چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی موافقت کی ہے یا فرمایا: میرے رب نے تین چیزوں میں میری موافقت کی ہے..... الحدیث..... ابو داؤد الطیالسی نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں حماد بن سلمہ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں علی بن زید نے بتایا انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے چار چیزوں میں اپنے رب کی موافقت کی۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اگر آپ مقام کے پیچھے نماز پڑھیں تو یہ آیت نازل ہوگئی وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر آپ اپنی ازواج مطہرات کو پردے کا حکم دے دیں کیونکہ ان کے پاس نیک اور فاجر ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: وَإِذَا سَأَلَكَ تُهْمٌ مَتَاعًا فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ (احزاب: 53) اور یہ آیت نازل ہوئی: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ (المومن) جب یہ نازل ہوئی تو میں نے کہا: تبارک اللہ احسن الخالقین تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ الفاظ نازل ہوئے: فَتَلَوَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (المومن)

میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے پاس گیا۔ میں نے کہا: تم رک جاؤ ورنہ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے بہتر دوسری عورتیں عطا فرمادے گا تو یہ آیت نازل ہوئی: عَلَي رَابِئَةٍ إِنْ طَلَّقْتُنَّ (التحریم: 5) (2) میں کہتا ہوں: اس روایت میں بدر کے قیدیوں کا ذکر نہیں ورنہ پانچ چیزوں میں حضرت عمر کی موافقت ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ مَّقَامٍ، الْمَقَامُ لَغْتٌ فِي قَدَمَيْهِ جَكَ كَوَيْتِهِ هِيَ۔ نحاس نے کہا: مقام، یہ قام یقوم سے ہے۔ مصدر ہوگا اور جگہ کا اسم ہوگا اور مقام، اقام سے ہے۔ زہیر کا قول ہے:

وَانْدِيَّةٌ يَنْتَابُهَا الْقَوْلُ وَالْفِعْلُ

ان میں اہل مقام ہیں جن کے چہرے خوبصورت ہیں اور مجالس ہیں جن میں قول و فعل پے درپے ہوتا ہے۔

اس شعر میں مقامات سے مراد اہل مقامات ہیں۔

المقام کی تعیین میں بہت سے مختلف اقوال ہیں۔ ان میں سے اصح یہ ہے کہ وہ پتھر آج لوگ جس کو پہچانتے ہیں جن کے پاس لوگ طواف قدوم کی دو رکعتیں پڑھتے ہیں یہ حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ وغیرہ کا قول

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب واتخذوا من مقام ابراہیم مصلی، حدیث 4123، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے (1)۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر کی طویل حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب بیت اللہ کو دیکھا تو رکن کو استلام کیا پھر تین چکروں میں رمل کیا، اور چار چکر آرام سے چلے پھر مقام ابراہیم کی طرف گئے اور یہ آیت پڑھی۔ **وَاشْخُذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى**۔ پھر رکعتیں پڑھیں ان میں سورۃ قل ھو اللہ اَحَدٌ اور قُلْ يَٰٓأَيُّهَا الْكَافِرُونَ پڑھی۔ یہ دلیل ہے کہ طواف کی دور رکعتیں اور دوسری نمازیں اہل مکہ کے لئے افضل ہیں اور من وجہ یہ دلیل ہے کہ مسافروں کے لئے طواف افضل ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ بخاری میں ہے: مقام سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام چڑھے تھے جب ان پتھروں کو اٹھانے سے کمزور پڑ گئے تھے جو کعبہ کی تعمیر میں حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کو پیش کرتے تھے، آپ کے قدم اس پتھر میں دھنس گئے تھے۔ حضرت انس نے کہا: میں نے المقام میں حضرت ابراہیم علیہ کی انگلیوں، ایزھی اور قدموں کے نیچے اٹھی ہوئی جگہ کا نشان دیکھا، لیکن لوگوں کے ہاتھوں کے چھونے نے اس نشان کو ختم کر دیا ہے۔ قشیری نے یہ بیان کیا ہے (2)۔ سدی نے کہا: المقام سے مراد وہ پتھر ہے جو حضرت اسماعیل کی بیوی نے حضرت ابراہیم کے قدموں کے نیچے بکھا تھا۔ جب اس نے حضرت ابراہیم کا سر دھویا تھا (3)۔ حضرات ابن عباس، مجاہد، عکرمہ اور عطا سے مروی ہے، مقام سے مراد مکمل حج ہے۔ عطا سے مروی ہے، عرفہ، مزدلفہ اور جمار ہے۔ یہ شعبی اور نخعی کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: پورا حرم مقام ابراہیم ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح پہلا قول ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں ثابت ہے۔ ابو نعیم نے محمد بن سوقة عن محمد بن السنکدر عن جابر کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر نے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو رکن اور مقام یا دروازے اور مقام کے درمیان دیکھا وہ دعا مانگ رہا تھا اے اللہ! فلاں کو بخش دے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا: یہ کیا ہے؟ اس شخص نے کہا: مجھے ایک شخص نے اس مقام میں دعا کرنے کے لئے کہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، لوٹ جا تیرے ساتھی کی بخشش ہو گئی۔ ابو نعیم نے اس سند سے بھی یہ روایت نقل کی ہے: حدثنا احمد بن محمد احمد بن ابراہیم القاضي، قال حدثنا محمد بن عاصم بن يحيى الكاتب. قال حدثنا عبد الرحمن بن القاسم القطان الكوفي، قال حدثنا الحارث بن عمران الجعفري عن محمد بن سوقة۔

ابو نعیم نے کہا: اسی طرح یہ عبدالرحمن نے حارث سے انہوں نے محمد سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ حارث کی حدیث محمد بن عکرمہ عن ابن عباس کی سند سے معروف ہے۔ **مُصَلًّى** کا معنی ایسی جگہ جہاں دعا کی جائے۔ یہ مجاہد کا قول ہے بعض نے فرمایا: نماز کی جگہ جس کے قریب نماز پڑھی جائے۔ یہ قتادہ کا قول ہے (4)۔ بعض نے فرمایا: قبلہ جس کے پاس امام کھڑا ہوتا ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَعَهْدُنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ طَهَرَا بَيْنَنَا لِلطَّافِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالزَّكَّاءِ السُّجُودِ** اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** **وَعَهْدُنَا** بعض نے فرمایا: اس کا معنی امرنا (ہم نے حکم دیا) ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی او حینا



(ہم نے وحی کی) اَنْ كَلَّهَ، اَنْ حرف جر کے حذف کی تقدیر کے ساتھ محل نصب میں ہے۔

سیبویہ نے کہا: اَنْ بمعنی ای مفسرہ ہے اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں ہے۔ کوئیوں نے کہا: عَهْدًا بمعنی قول ہے۔ طَلَّہَا بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: بتوں سے پاک کرو۔ یہ مجاہد اور زہری سے مروی ہے۔ حضرات عبید بن عمیر اور سعید بن جبیر نے کہا: آفات اور ریب سے پاک کرو۔ بعض نے فرمایا: کفار سے پاک کرو۔ سدی نے کہا: طہارت اور طہارت کی نیت سے اس کی بنیاد رکھو اور تعمیر کرو۔ اس قول کی مثل اُتس علی التقویٰ ہے۔ یمان نے کہا: اس کا معنی ہے: اسے خوشبو لگاؤ اور دھونی دو (1)۔ بیتی، بیت کی اضافت اپنی طرف کی، یہ شرف و تکریم بخشنے کے لئے ہے، یہ مخلوق کی خالق کی طرف اور مملوک کی مالک کی طرف اضافت ہے (2)۔ حضرات حسن، ابن ابی اسحاق، اہل مدینہ، ہشام اور حفص نے بیتی یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، دوسرے قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِلَّطَّافِیْنِ اس کا ظاہر مطلب تو یہ ہے کہ جو بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں، یہ عطا کا قول ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: اس کا معنی ہے مسافروں کے لئے جو مکہ میں وارد ہوتے ہیں (3)۔ اس میں بعد ہے وَالْعَافِیْنِ جو اس شہر کے ہیں اور جو مسافر ہیں۔ یہ عطا سے مروی ہے۔ اسی طرح کا قول لِلَّطَّافِیْنِ کے بارے میں ہے لغت میں عکوف لزوم اور کسی شے کی طرف متوجہ ہونے کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

عكف النبیط یلعبون الفنزجا (4)

نبٹی لوگ رقص کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔

مجاہد نے کہا: العاکفون سے مراد مجاور ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نمازی ہیں۔ بعض نے فرمایا: جو بغیر طواف کے بیٹھنے والے ہیں۔ یہ تمام معانی قریب قریب ہیں۔ الزُّكُومُ السُّجُودُ کعبہ کے پاس نماز پڑھنے والے۔ رکوع و سجود کو خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ یہ دونوں احوال نمازی کو اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب کرنے والے ہوتے ہیں۔ رکوع و سجود کا لغوی معنی پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَنْ كَلَّهَ اِیَّتِیْ اس میں اللہ تعالیٰ کے تمام گھر شامل ہیں۔ ان کا حکم بھی تطہیر و نظافت میں اس جیسا ہوگا، کعبہ کا خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ اس وقت وہاں اور کوئی گھر نہ تھا یا اس لئے کہ اس کی حرمت زیادہ ہے۔ پہلا معنی اظہر ہے۔ قرآن میں ہے: فِی بُیُوتِ اٰذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ (النور: 36) اس آیت کے تحت دوسری مساجد کا حکم آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے مسجد میں ایک شخص کی آواز سنی۔ حضرت عمر نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ کیا تو جانتا ہے تو کہاں ہے؟ حضرت حذیفہ نے کہا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی، ڈرانے والوں کے بھائی، اے رسولوں کے بھائی! اپنی قوم کو ڈراؤ کہ وہ میرے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہ ہوں مگر سلیم دلوں

کے ساتھ، سچی زبانوں کے ساتھ، پاکیزہ ہاتھوں کے ساتھ، صاف شرمگاہوں کے ساتھ اور میرے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہ ہوں جب تک کہ انہوں نے کسی پر ظلم کیا ہو۔ کیونکہ میں اس پر لعنت کرتا ہوں جب تک وہ میرے سامنے کھڑا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ ظلم سے چھینی ہوئی چیز مظلوم کو واپس کر دے۔ پس میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، میں اس کی بصارت بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے اور وہ میرے اولیاء و اصفیاء میں سے ہو جاتا ہے اور انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ میرا پڑوسی بن جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اس آیت میں امام شافعی، امام ابو حنیفہ، ثوری اور سلف کی جماعت نے بیت اللہ کے اندر فرض نماز اور نفل نماز کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر بیت اللہ کے درمیان کسی دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا تو اس کی نماز جائز ہوگی۔ اگر اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جبکہ دروازہ کھلا ہوا تھا تو اس کی نماز باطل ہے۔ اسی طرح جس نے کعبہ کی چھت پر نماز پڑھی تو اس کی نماز باطل ہے کیونکہ کعبہ کا کوئی حصہ اس کے سامنے نہ تھا۔ امام مالک نے فرمایا: اس کے اندر فرض اور سنن ادا نہیں کی جائیں گی۔ اس میں نفل پڑھے جائیں گے مگر اس نے فرض کعبہ کے اندر پڑھے تو وقت میں دوبارہ پڑھے گا۔ صبح نے کہا: وہ ہمیشہ لوٹائے گا۔

میں کہتا ہوں: یہی صحیح ہے کیونکہ مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے (1)، فرمایا: مجھے حضرت اسامہ بن زید نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ جب بیت اللہ میں داخل ہوئے تو اس کی تمام اطراف میں دعا مانگی اور اس میں نماز نہ پڑھی حتیٰ کہ کعبہ سے نکل آئے۔ جب باہر آئے تو کعبہ کی طرف منہ کر کے دو رکعتیں پڑھیں اور فرمایا: یہ قبلہ ہے اور یہ نص ہے۔

اگر کہا جائے کہ بخاری میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ، حضرت اسامہ بن زید، حضرت بلال، حضرت عثمان بن طلحہ جمعی بیت اللہ میں داخل ہوئے اور اپنے اوپر دروازہ بند کر لیا۔ جب دروازہ کھولا تو میں پہلا شخص تھا جو اندر داخل ہوا۔ میں حضرت بلال سے ملا۔ میں نے ان سے پوچھا: کیا اندر رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تھی؟ حضرت بلال نے کہا: ہاں دو یمنی ستونوں کے درمیان پڑھی تھی۔ مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اس میں دوستوں کو اپنی بائیں جانب اور ایک ستون کو دائیں جانب اور تین ستونوں کو پیچھے رکھا، اس وقت بیت اللہ چھ ستونوں پر تھا۔

ہم کہتے ہیں: ہو سکتا ہے صنیٰ بمعنی دعا ہو۔ جس طرح حضرت اسامہ نے کہا کہ آپ ﷺ نے دعا کی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ صنیٰ سے مراد نماز ہی ہو، جب اس میں احتمال آگیا تو اس سے احتجاج ساقط ہو گیا۔

اگر کہا جائے کہ ابن منذر وغیرہ نے حضرت اسامہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ نے کعبہ میں تصاویر دیکھیں تو میں ڈول میں آپ کے پاس پانی لے آیا۔ آپ ﷺ نے وہ پانی ان تصاویر پر مارا۔ اس حدیث کو ابو داؤد طیالسی نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں ابن ابی ذئب نے عبدالرحمن بن مہران سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: ہمیں عمیر مولیٰ ابن عباس نے حضرت اسامہ بن زید سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس کعبہ میں داخل ہوا۔ آپ ﷺ نے

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ واتخذوا من مقام ابراہیم مصلیٰ، حدیث 383، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تصاویر دیکھیں، فرمایا: آپ ﷺ نے پانی کا ڈول منگوا یا۔ میں آپ کے پاس پانی لے کر آیا تو آپ ان تصاویر کو مٹانے لگے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ اس قوم کو قتل کرے جو ان کی تصاویر بناتے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کرتے۔

اس میں احتمال ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس وقت نماز پڑھی ہو جب حضرت اسامہ پانی لینے گئے ہوں اور حضرت بلال نے وہ عمل دیکھا ہو جو حضرت اسامہ نے نہ دیکھا۔ پس جو ثابت کرنے والا ہوتا ہے وہ نئی کرنے والے سے اولیٰ ہوتا ہے۔ حضرت اسامہ نے خود کہا: لوگوں نے حضرت بلال کے قول کو لیا اور میرے قول کو چھوڑ دیا۔ مجاہد نے حضرت عبداللہ بن صفوان سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت عمر بن خطاب سے پوچھا رسول اللہ ﷺ جب کعبہ میں داخل ہوئے تو کیسے عمل کیا؟ حضرت عمر نے کہا: دو رکعت نماز پڑھی۔

ہم کہتے ہیں: یہ نوافل پر محمول ہے ہم کعبہ میں نوافل کی صحت میں علماء کا اختلاف نہیں جانتے۔ بے فرض تو اس کے ہم قائل نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہت کو اپنے ارشاد **فَوَلُّوْا وُجُوْہَکُمْ شَطْرَہٗ** میں متعین فرمایا۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور نبی کریم **صلی اللہ علیہ وسلم** کا ارشاد، جب آپ باہر نکلے، **ہذہ القبلة**۔ تو آپ نے اس کی تعیین فرمائی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تعیین فرمائی تھی۔ اگر کعبہ کے اندر فرض صحیح ہوتے تو آپ **ہذہ القبلة** نہ فرماتے۔ اس طرح احادیث کو جمع کرنا صحیح ہو جاتا ہے۔ اور یہ بعض احادیث کو ساقط کرنے سے اولیٰ ہے۔ پس کوئی تعارض نہیں ہے۔ **الحمد للہ**

**مسئلہ نمبر 5:** اسی طرح کعبہ کی چھت پر نماز پڑھنے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی نے تو وہی فرمایا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جو کعبہ کی چھت پر نماز پڑھے وہ وقت میں دوبارہ پڑھے۔ اور بعض اصحاب مالک سے مروی ہے کہ وہ ہر حال میں اعادہ کرے (خواہ وقت موجود ہو یا وقت گزر چکا ہو) امام ابو حنیفہ نے فرمایا: جس نے کعبہ کی چھت پر نماز پڑھی اس پر کچھ واجب نہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ بیت اللہ کے پاس نماز پڑھنا افضل ہے یا اس کا طواف کرنا افضل ہے۔ امام مالک نے فرمایا: باہر سے آنے والوں کے لئے طواف افضل ہے اور اہل مکہ کے لئے نماز افضل ہے، یہ حضرات ابن عباس، عطاء اور مجاہد سے ذکر کیا گیا ہے۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ نماز افضل ہے، حدیث میں ہے۔ اگر خشوع کرنے والے مرد، رکوع کرنے والے بوزھے، دودھ پینے والے بچے اور چرنے والے جانور نہ ہوتے تو ہم تم پر عذاب نازل کرتے۔

ابو بکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے اپنی کتاب (السابق واللاحق) میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم میں خشوع کرنے والے مرد، چرنے والے جانور، دودھ پینے والے بچے نہ ہوتے تو مجرموں پر عذاب نازل کر دیا جاتا۔ اس میں بوڑھے رکوع کرنے والوں کا ذکر نہیں ہے۔ حضرت ابو ذر کی حدیث میں ہے: نماز بہتر چیز ہے تو زیادہ پڑھ یا کم پڑھ (تیری مرضی) اس کو الا پر جری نے ذکر کیا ہے۔ نماز اور سجدہ کی فضیلت میں اخبار بہت زیادہ ہیں جو جمہور کے قول کی تائید کرتی ہیں۔ واللہ اعلم

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ



مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمِتُّهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ  
النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٦﴾

”اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے رب! بنا دے اس شہر کو امن والا اور روزی دے اس کے باشندوں کو طرح طرح کے پھلوں سے (یعنی) جو ان میں سے ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر۔ اللہ نے فرمایا: (ان میں سے) جس نے کفر بھی کیا اسے بھی فائدہ اٹھانے دوں گا چند روز پھر مجبور کروں گا اسے دوزخ کے عذاب کی طرف اور یہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلَدًا آمِنًا اس سے مراد مکہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد اور دوسرے لوگوں کے لئے امن اور خوشحال زندگی کی دعا مانگی (1)۔ روایت ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے جبریل سے فرمایا: شام سے طائف کو اکھڑ۔ پس جبریل نے طائف کے ساتھ بیت اللہ کے ارد گرد سات چکر لگائے۔ طائف کو طائف اسی لئے کہا جاتا ہے (2)۔ پھر طائف کو تہامہ میں اتارا، مکہ اور اس کے قریب کا علاقہ اس وقت چنیل تھا۔ نہ پانی تھا نہ کوئی نبات۔ پس اللہ تعالیٰ نے مکہ کے ارد گرد کے علاقہ جیسے طائف وغیرہ میں برکت ڈال دی اور اس میں قسم قسم کے پھل اگائے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ سورہ ابراہیم میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 2:** علماء کا اختلاف ہے کہ مکہ حضرت ابراہیم کے سوال سے حرم بنایا پہلے سے ہی حرم تھا۔ اس میں دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ یہ ہمیشہ جابر مسلطین سے، خسوف اور زلزلوں سے اور دوسرے تمام حوادث سے جو شہروں پر نازل ہوتے ہیں سے حرم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سرکش نفوس میں اس کی تعظیم اور ہیبت ڈال دی جس کی وجہ سے مکہ کے رہنے والے دوسرے لوگوں سے امن کی وجہ سے ممتاز ہو گئے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر ایک بہت بڑی علامت رکھ دی جس کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اس میں کتا اور شکار جمع ہوتے ہیں اور کتا شکار پر حملہ نہیں کرتا اور نہ شکار اس سے ڈرتا ہے، حتیٰ کہ جب وہ دونوں حرم سے نکل جاتے ہیں تو کتا اس شکار پر حملہ کرتا ہے اور وہ بھاگنے لگتا ہے۔

حضرت ابراہیم نے دعا مانگی تھی کہ مکہ کو قحط، بنجر ہونے اور حملوں سے امن والا بنا اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق عطا فرما۔ اس کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا کہ اس کا خون بہانا بھی منع ہے جس کا قتل کرنا لازم ہو چکا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم کے مقصود سے بہت بعید ہے حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے دعا مانگی تھی کہ ان کی شرع میں اس شخص کا قتل کرنا حرام ہو جو حرم میں پناہ لے۔ یہ انتہائی بعید قول ہے۔

دوسرا قول۔ مکہ حضرت ابراہیم کی دعا سے پہلے دوسرے شہروں کی طرح حلال تھا اور آپ کی دعا سے حرم بنا جیسا کہ مدینہ طیبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریم سے امن والا بنا اس سے پہلے حلال تھا۔

پہلے مقالہ والوں نے حضرت ابن عباس کی حدیث سے استدلال کیا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا: یہ شہر وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے دن حرمت والا بنایا یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت کی وجہ سے حرام ہے، اس میں جنگ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھی اور نہ میرے لئے حلال ہے مگر دن کی ایک گھڑی۔ یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ حرام ہے، اس کا نہ کاٹنا توڑا جائے گا نہ اس کا شکار ڈرایا جائے گا نہ اس کی گری پڑی چیز اٹھائی جائے گی مگر جو اس کا اعلان کرے اور نہ اس کی خشک گھاس کاٹی جائے گی۔ حضرت عباس نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! اذخر گھاس کی استثنا فرمائیں کیونکہ وہ ہمارے لوہاروں کے لئے اور ہمارے گھروں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے اذخر گھاس کی استثنا فرمادی۔ (1)

اسی طرح کی حدیث ابو شریح کی ہے۔ ان دونوں حدیثوں کو مسلم نے نقل کیا ہے (2)۔ صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن زید بن عاصم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا اور اہل مکہ کے لئے دعا کی، میں نے مدینہ کو حرم بنایا جس طرح حضرت ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا، میں نے اس کے صاع اور اس کے مد کے لئے اس کے دو مثل کی دعا کی جو حضرت ابراہیم نے اہل مکہ کے لئے دعا کی۔ ابن عطیہ نے کہا: ان دونوں احادیث میں کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ پہلی حدیث اس کے متعلق خبر دے رہی ہے جو مکہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم سابق میں تھا اور اس کے فیصلہ میں تھا اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کی مدت ہے اور ایمان کے ساتھ افاق کو آباد کرنے کے اوقات کی حرمت ہے۔

اور دوسری حدیث میں حضرت ابراہیم کا اس کی حرمت کی تجدید اور اس کے مٹنے کے بعد، اس کے اظہار کی خبر ہے۔ پہلا قول نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے دن مومنوں پر مکہ کی حرمت کی تعظیم کی خبر دیتے ہوئے فرمایا اور اس کی تحریم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی اور مدینہ طیبہ کی تحریم کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بطور مثال ذکر فرمایا۔ لامحالہ مدینہ کی تحریم بھی اللہ کی طرف سے ہوگی اور اس کی قضا کے نفاذ سے اور اس کے سابق علم سے ہوگی۔ طبری نے کہا (3): مکہ حرام تھا اس کا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو مکلف نہ کیا حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا سوال کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے حرم بنا دیا۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَأَمْرُ ذِي أَهْلَةٍ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ أَمِنَ**، رزق کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ ثمرات، ثمرہ کی جمع ہے یہ بھی پہلے گزر چکا ہے **مَنْ أَمِنَ** یہ اہل سے بدل ہے اور کل سے بدل بعض ہے۔ الا یہاں کا معنی تصدیق ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ **قَالَ وَمَنْ كَفَرَ**، مَنْ کل نصب میں ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: **وَأَمْرُ ذِي أَهْلَةٍ مَنْ كَفَرَ**۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو مبتدا کی حیثیت سے اور یہ شرط ہے اور خبر فامتنعہ ہو اور یہ جواب ہے۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ قول اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے ہے۔ حضرت ابی بن کعب اور اسحاق وغیرہا نے کہا (4): یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور انہوں نے فامتنعہ ہمزہ کے ضمہ، میم کے فتح اور تا کی

1۔ علم شریف، کتاب الحج، باب تحریم مکہ و تحریم صیدھا و علاھا و شجرھا، جلد 1، صفحہ 437 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ ایضاً

3۔ تفسیر طبری زیر آیت مذکور

4۔ صحیح بخاری، باب فیمن صید النعماء، حدیث 1702، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ثم اضطرّ ہمزہ کے قطع اور را کے ضمہ کے ساتھ۔ ابن عامر کے سوا قراء سبعہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ ابن عامر نے میم کے سکون اور تا کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابواسحاق الزجاج نے حکایت کیا ہے کہ ابی کی قراءت میں فنستعہ قلیلاً ثم نضطرّ یعنی نون کے ساتھ ہے (1)۔ حضرات ابن عباس، مجاہد اور قتادہ نے کہا: یہ قول حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے انہوں نے فامتعة کو ہمزہ کے فتح اور میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ پھر ثم اضطرّ کو الف کے وصل اور را کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مومنین کے حق میں دعا فرمائی اور کفار کے خلاف دعا کی (2)۔ اس صورت میں قال کی ضمیر کا مرجع حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں گے اور قال کو دوبارہ ذکر کیا کلام کی طوالت کی وجہ سے یا اس لئے کہ آپ مومنین کے لئے دعا مانگنے نکلے اور کفار کے خلاف دعا کرنے میں داخل ہوئے۔ جمہور قراءت پر قال کا فاعل اللہ تعالیٰ کا اسم ہے۔ نحاس نے اس کو اختیار کیا۔ ہمزہ کے فتح اور میم کے سکون اور الف کے وصل کے ساتھ قراءت شاذ ہے، نسق کلام اور تفسیر دونوں اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہے۔ رہا نسق کلام تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے کہا: رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا اے میرے رب! اس کو امن والا شہر بنا۔ پھر یہ عرض کی: وَارْزُقْ اَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ ان دونوں کے درمیان قال کے ساتھ فاصلہ نہیں کیا پھر اس کے بعد فرمایا: قَالَ وَمَنْ كَفَرَ يَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کی طرف سے جواب تھا۔ اس کے بعد قال ابراہیم نہیں فرمایا۔

رہی تفسیر تو حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت محمد بن کعب سے صحیح مروی ہے۔ حضرت ابن عباس کے الفاظ یہ ہیں: حضرت ابراہیم نے جو لوگ ایمان لائے تھے صرف ان کے لئے دعا فرمائی کفار کے لئے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ کافروں کو بھی اسی طرح رزق دے گا جس طرح ایمان والوں کو رزق دے گا اور وہ انہیں تھوڑا عرصہ لطف اندوز کرے گا پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف مجبور کرے گا۔ ابو جعفر نے کہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَلَّا لَنُبَدِّلَنَّهُ هَؤُلَاءِ وَهَؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ (اسراء: 20) (ہر ایک کی ہم امداد کرتے ہیں) جو طالب دنیا ہیں) اور ان کی بھی (جو طالب آخرت ہیں)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَمَّا سَنَتُهُمْ (کچھ تو میں ہوں گی ہم لطف اندوز کریں گے انہیں)۔

ابواسحاق نے کہا: حضرت ابراہیم کو معلوم تھا کہ ان کی اولاد میں کفار بھی ہوں گے اس لئے آپ نے دعا میں مومنین کو خاص فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا لَا يَتَّالِ عَنَدِي الظَّالِمِينَ (نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں تک)

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾

”اور یاد کرو جب اٹھارہ تھے ابراہیم (علیہ السلام) بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل (علیہ السلام) بھی۔ اے

ہمارے پروردگار! قبول فرما ہم سے (یہ عمل) بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ، القواعد سے مراد اس کی بنیادیں ہیں۔ یہ ابو



عبیدہ اور فراء کا قول ہے۔ کسائی نے کہا: اس سے مراد یواریں ہیں، معروف بنیاد ہے۔

حدیث میں ہے: بیت اللہ کو جب گرایا گیا تو اس سے بڑے بڑے پتھر نکلے۔ ابن زبیر نے کہا: یہ وہ پتھر ہیں جن سے حضرت ابراہیم نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی۔ بعض نے فرمایا: وہ بنیادیں مٹ گئی تھیں پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان پر مطلع فرمایا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: بیت اللہ کو ان ارکان پر رکھا گیا تھا جو آپ نے دیکھے تھے اور دنیا کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے۔ پھر زمین کو اس کے نیچے سے پھیلا یا گیا۔

القواعد کا واحد قاعدۃ ہے اور القواعد من النساء کا واحد قاعدۃ ہے (1)۔ علماء کا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے کعبہ کی بنیاد رکھی۔ بعض نے فرمایا: ملائکہ نے سب سے پہلے اس کی بنیاد رکھی۔ جعفر بن محمد سے مروی ہے، فرمایا: میرے باپ سے بیت اللہ کی تخلیق کے آغاز کے بارے میں پوچھا گیا جب کہ میں بھی موجود تھا تو میرے والد صاحب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جب فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ: 30) (میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں) تو فرشتوں نے کہا: کیا تو اس میں اسے خلیفہ بناتا ہے جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خوزیری کرے گا جبکہ ہم تیری حمد کے ساتھ پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری تقدیس کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں پر ناراض ہوا تو انہوں نے اس کے عرش کے ذریعے پناہ طلب کی۔ انہوں نے عرش کے ارد گرد سات چکر لگائے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: میرے لئے زمین میں ایک گھر بناؤ۔ بنی آدم میں سے جس پر میں ناراض ہوں گا وہ اس کی پناہ لے گا اور اس کے ارد گرد طواف کرے گا جس طرح تم نے میرے عرش کے ارد گرد طواف کیا۔ پس میں اس سے راضی ہو جاؤں گا جس طرح میں تم سے راضی ہوا، پس فرشتوں نے بیت اللہ بنایا۔

عبدالرزاق نے ابن جریج سے انہوں نے عطا اور ابن مسیب وغیرہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ جب تو نیچے زمین پر اترے تو میرے لئے ایک گھر بنا پھر اس کو گھیر لے جس طرح تو نے ملائکہ کو دیکھا کہ انہوں نے میرے عرش کو گھیرا تھا جو آسمان میں تھا۔

عطا نے کہا: لوگوں کا خیال ہے حضرت آدم علیہ السلام نے کعبہ کو پانچ پہاڑوں سے بنایا: حراء، طور سینا، لبنان، جودی اور طور سینا۔ اس کی ربض حراء سے تھی (2)۔ خلیل نے کہا: الربض سے یہاں مراد پتھر سے بنی ہوئی بیت اللہ کی گول بنیاد ہے۔ اسی وجہ سے مدینہ کے ارد گرد کی جگہ کو ربض کہا جاتا ہے۔ ماوردی نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین کی طرف اترے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: اے آدم! تو جا اور میرے لئے ایک گھر بنا اور اس کا طواف کر اور اس کے پاس مجھے یاد کر جس طرح تو نے ملائکہ کو میرے عرش کے ارد گرد کرتے دیکھا۔ حضرت آدم علیہ السلام چلتے ہوئے آئے اور زمین ان کے لئے لیٹی گئی تھی اور جنگل ان کے لئے سیکڑے گئے تھے آپ جہاں قدم رکھتے تھے وہ جگہ آباد ہو جاتی تھی حتیٰ کہ آپ بیت حرام کی جگہ پر پہنچے۔ جبریل نے اپنے پر زمین پر مارے اور مٹی

ساتویں زمین پر قائم بنیاد کو ظاہر کر دیا۔ پس ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف پتھر پھینکے۔ وہ اتنے بڑے تھے کہ تیس آدمی انہیں نہیں اٹھا سکتے تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے پانچ پہاڑوں سے کعبہ بنایا جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔

بعض اخبار میں مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے جنت کے خیموں سے ایک خیمہ اتارا گیا وہ عصبہ کی جگہ پر لگایا گیا تاکہ آپ اس سے سکون حاصل کریں اور اس کا طواف کریں وہ خیمہ باقی رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی روح قبض فرمائی تو پھر اٹھایا گیا۔ یہ حضرت وہب بن منبہ کے طریق سے ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ایک بیت (گھر) اتارا گیا آپ اس کا طواف کرتے تھے اور آپ کی اولاد میں سے مومنین، غرق کے زمانہ تک طواف کرتے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اٹھایا تو وہ آسمان میں ہو گیا اسی گھر کو بیت المعمور کہا جاتا ہے۔ قتادہ سے روایت ہے جسے طلحی نے اپنی کتاب ”منہاج القرآن“ میں ذکر کیا ہے (1)۔ انہوں نے فرمایا: جو معنی قتادہ نے بیان کیا وہ جائز ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ایک گھر اتارا گیا یعنی وہ طولاً، عرضاً اور بلندی کے اعتبار سے بیت المعمور کی مقدار کا تھا پھر حضرت آدم علیہ السلام سے کہا گیا: اتنا بناؤ اور کوشش کرو کہ یہ اس کے بالمقابل ہو، وہ کعبہ کی جگہ کے سامنے تھا۔ پس آپ نے اس میں کعبہ بنایا۔ رہا وہ خیمہ یہ جائز ہے کہ وہ اتارا گیا ہو اور کعبہ کی جگہ لگایا گیا ہو۔ جب کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا گیا تو آپ نے کعبہ تعمیر کیا اور کعبہ کے ارد گرد حضرت آدم علیہ السلام کے دل کے لئے طمانیت تھی جب تک آپ زندہ رہے وہ خیمہ قائم رہا پھر اسے اٹھایا گیا۔ پس یہ اخبار اس طرح متفق ہو جاتی ہیں۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی بنا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے بنایا۔ ابن جریج نے کہا: لوگوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ایک بادل بھیجا جس میں ایک سر تھا۔ اس سر نے کہا: اے ابراہیم! تیرا رب تجھے حکم دیتا ہے کہ تو اس بادل کی مقدار لے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اسے دیکھنا شروع کیا اور اس کی مقدار خط کھینچ دیا۔ پھر اس سر نے کہا: تو نے کر دیا۔ پھر آپ نے اس جگہ کی کھدائی کی اور زمین میں قائم اساس کو ظاہر کیا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت ابراہیم کو بیت اللہ کی تعمیر کا حکم دیا تو آپ شام سے نکلے اور آپ کے ساتھ آپ کا بیٹا اسماعیل اور اس کی ماں ہاجرہ بھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ سکینت (ہوا) کو بھیجا جس کی ایک زبان تھی جس کے ساتھ وہ کلام کرتی تھی۔ صبح کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے ساتھ چلتے جب وہ چلتی اور اس کے ساتھ آپ واپس آ جاتے جب وہ واپس آتی، حتیٰ کہ وہ سکینت حضرت آدم علیہ السلام کو لے کر مکہ تک پہنچ گئی۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا: میری جگہ پر بنیاد رکھو۔ پس حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے دیواریں بلند کیں حتیٰ کہ حجر اسود کی جگہ پہنچ گئے۔ حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل سے کہا: اے میرے بیٹے! میرے لئے ایک پتھر تلاش کر جسے میں لوگوں کے لئے علامت بناؤں۔ حضرت اسماعیل ایک پتھر لے آئے جسے آپ نے پسند نہ فرمایا اور فرمایا اور کوئی پتھر تلاش کرو۔ آپ تلاش کرتے رہے پھر آپ خود آئے اور حجر اسود لے آئے اور اسے اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ حضرت اسماعیل نے کہا: اے میرے ابا جان! یہ پتھر تمہارے پاس کون لایا ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا: وہ جو مجھے تیرے سپرد نہیں کرتا (2)۔ حضرت

ابن عباس نے کہا: جبل ابوقیس نے پکارا اے ابراہیم، اے خلیل الرحمن! تیرے لئے میرے پاس ایک ودیعت ہے وہ تم لے لو۔ تو وہ جنت کے یا قوت میں سے ایک سفید پتھر تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے اتر تھا۔ جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے بیت اللہ کی بنیادیں بلند کیں تو چکور شکل کا ایک بادل آیا جس میں ایک سر تھا اس بادل نے آواز دی میری مقدار پر بلند (تعمیر) کرو۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر ہے۔ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بیت اللہ تعمیر کرنے پر جزا عطا فرمائی۔

حکیم ترمذی نے روایت کیا ہے کہ ہمیں عمر بن ابی عمر نے بتایا انہوں نے کہا: مجھے نعیم بن حماد نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں عبد الوہاب بن ہمام نے بتایا جو عبد الرزاق کے بھائی تھے، انہوں نے ابن جریج سے انہوں نے ابن ابی ملیکہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: پہلے گھوڑے بھی دوسرے وحشی جانوروں کی طرح وحشی تھے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل کو بنیادیں بلند کرنے کی اجازت دی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تم دونوں کو ایک خزانہ دینے والا ہوں جو میں نے تم دونوں کے لئے ذخیرہ کر رکھا ہے پھر حضرت اسماعیل کو وحی فرمائی کہ تم اجیاد کی طرف جاؤ اور دعا مانگو تمہارے پاس خزانہ آجائے گا آپ اجیاد کی طرف گئے..... وہاں گھوڑے رہتے تھے..... آپ نہیں جانتے تھے کہ دعا کیا ہے اور خزانہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو الہام فرمایا۔ پس سطح زمین پر کوئی گھوڑا باقی نہ رہا جو عرب کی زمین پر رہتا تھا مگر وہ آپ کے پاس آگیا۔ تمام گھوڑوں کی اپنی پیشانیوں پر آپ کو قدرت بخشی اور ان کو آپ کا مطیع کر دیا۔ پس تم ان پر سوار ہو اور انہیں چارہ ڈالو کیونکہ یہ برکت ہیں یہ تمہارے باپ اسماعیل کی میراث ہیں۔ الفرس کو عربی اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اسماعیل علیہ السلام کو دعا کا حکم دیا گیا تھا اور آپ نے دعا فرمائی۔

عبد النعم بن ادریس نے حضرت وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے فرمایا: جس نے سب سے پہلے مٹی اور پتھر سے کعبہ بنایا وہ حضرت شیث علیہ السلام تھے، رہی قریش کی تعمیر کعبہ تو وہ مشہور ہے اور اس میں سانپ کی خبر مذکور ہے۔ سانپ انہیں کعبہ گرانے سے روکتا تھا، حتیٰ کہ تمام قریش مقام ابراہیم کے پاس جمع ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑ گڑائے اور عرض کی: اے ہمارے پروردگار! ہمیں نہ ڈراہم تیرے گھر کی تشریف و تزئین کا ارادہ رکھتے ہیں اگر تو اس سے راضی ہے تو فہماور نہ جو تو چاہے کر۔ انہوں نے آسمان سے پرندے کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنی۔ دیکھا تو گدھ سے بڑا ایک پرندہ تھا جس کی پیٹھ سیاہ تھی پیٹ اور پاؤں سفید تھے اس نے اپنے پنجے سانپ کی گدی میں گاڑھے پھر اس کو لے کر اڑا وہ سانپ اتنی بڑی دم کھینچتا گیا حتیٰ کہ وہ پرندہ اسے اجیاد کی طرف لے گیا۔ پھر قریش نے کعبہ کو گرایا اور پھر اسے وادی کے پتھروں سے بنانے لگے جن کو قریش اپنی گردنوں پر اٹھا کر لاتے تھے۔ قریش نے اس کو آسمان کی طرف بیس ہاتھ بلند کیا، اسی اثنا میں نبی کریم ﷺ اجیاد سے پتھر اٹھا کر لارہے تھے آپ کے اوپر ایک چادر تھی۔ چادر آپ پر تنگ ہو گئی۔ آپ نے چادر کو کندھے پر اٹھانا شروع کیا تو چادر کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے شرمگاہ ظاہر ہو گئی، ندا آئی اے محمد! ﷺ اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ لے۔ اس کے بعد آپ ﷺ کبھی برہنہ نہ دیکھے گئے۔ کعبہ کی تعمیر اور نزول قرآن کے درمیان پانچ سال کا فاصلہ تھا۔ آپ کی ہجرت اور تعمیر کعبہ کے



درمیان پندرہ سال کا فاصلہ تھا۔

یہ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عثمان سے انہوں نے ابوالطفیل سے روایت کیا ہے۔ معمر عن الزہری سے مروی ہے حتیٰ کہ جب قریش نے کعبہ بنالیا اور حجر اسود رکھنے کی جگہ پہنچے تو قریش اس کو رکھنے میں جھگڑنے لگے کہ کون سا قبیلہ اسے اٹھا کر رکھے گا؟ حتیٰ کہ ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا: آؤ ہم اس کا فیصلہ تسلیم کر لیں جو اس گلی سے سب سے پہلے ہمارے پاس آئے گا، اس پر صلح ہو گئی۔ نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے آپ ابھی جوان تھے آپ کے اوپر ایک دھاری دار چادر تھی۔ انہوں نے آپ کو ثالث مقرر کر دیا۔ آپ نے پتھر کو ایک کپڑے میں رکھنے کا حکم دیا پھر ہر قبیلہ کے سردار کو حکم دیا اور اسے کپڑے کی ایک طرف عطا فرمائی پھر آپ اوپر چڑھے۔ تمام سرداروں نے وہ پتھر آپ کو اٹھا کر دیا اور آپ ﷺ نے اسے اپنی جگہ پر لگا دیا۔

ابن اسحاق نے کہا: مجھے یہ بیان کیا گیا ہے کہ قریش نے حجر اسود میں، سریانی زبان میں لکھی ایک تحریر پائی وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کیا ہے حتیٰ کہ ایک یہودی نے انہیں پڑھ کر سنائی۔ اس میں یہ لکھا تھا، میں اللہ ہوں، مکہ کا مالک۔ میں نے اس کو اس دن پیدا کیا تھا جس دن میں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا اور چاند اور سورج کو صورت بخشی تھی اور میں نے اسے سات املاک سے گھیرا ہوا ہے، یہ زائل نہ ہوگا حتیٰ کہ اس کے ابوبقیس اور احمر پہاڑ زائل ہو جائیں گے۔ اس کے رہنے والوں کے لئے پانی اور دودھ میں برکت رکھی گئی ہے۔ ابو جعفر محمد بن علی سے مروی ہے، فرمایا: کعبہ کا دروازہ عمالقہ، جرہم اور حضرت ابراہیم کے دور میں زمین پر تھا حتیٰ کہ قریش نے اسے تعمیر کیا (تو دروازہ اونچا کر دیا)۔

مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یہ کعبہ کے ساتھ والی دیوار کعبہ سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ میں نے عرض کی: انہوں نے اس کو کعبہ میں داخل کیوں نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا: تیری قوم کے پاس خرچ کم ہو گیا تھا۔ میں نے عرض کی: اس کا دروازہ باند کیوں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری قوم نے یہ اس لئے کیا تھا تا کہ جنہیں چاہیں داخل کریں اور جنہیں چاہیں منع کریں اگر تمہاری قوم کا زمانہ جاہلیت قریب نہ ہوتا مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ ان کے دل انکار کریں گے تو میں اس دیوار کو کعبہ میں داخل کر دیتا، اور اس کے دروازے کو زمین سے ملا دیتا (1)۔ حضرت عبداللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے، فرمایا: میری خالہ حضرت عائشہ نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! اگر تیری قوم کا زمانہ شرک قریب نہ ہوتا تو میں کعبہ کو گرا دیتا اور اس کو زمین سے ملا دیتا اور اس کے دو دروازے بناتا۔ ایک مشرق سے اور ایک مغرب سے اور اس میں چھ ہاتھ حطیم سے زیادہ کرتا کیونکہ قریش نے اسے چھوٹا بنایا تھا جہاں انہوں نے کعبہ بنایا تھا۔

عروہ اپنے باپ سے اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تمہاری قوم کا زمانہ کفر قریب نہ ہوتا تو میں کعبہ کو توڑ دیتا اور اسے ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر بناتا کیونکہ قریش نے جب کعبہ تعمیر کیا تو

1۔ مسلم شریف، کتاب الحج، باب نقض الکعبۃ دہناھا، جلد 1، صفحہ 30-429 (قدیمی کتب خانہ)

چھوٹا کر دیا اور میں اس کا خلف بناتا (1)۔ بخاری میں ہشام بن عروہ نے کہا: یعنی (باباً) دروازہ بناتا۔ بخاری میں یہ بھی ہے کہ میں اس کے دو دروازے بناتا یہ قریش کی بنا ہے پھر جب اہل شام نے حضرت عبداللہ بن زبیر پر حملہ کیا اور ان کے جلاؤ نے کعبہ کو کمزور کر دیا۔ تو حضرت ابن زبیر نے اسے گرایا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق بنایا۔ اس میں پانچ ہاتھ حطیم سے زیادہ کیا حتیٰ کہ وہ بنیاد ظاہر کر دی اور لوگوں نے اسے دیکھا اور اس پر کعبہ کی تعمیر کی۔ کعبہ کا طول اٹھارہ ہاتھ تھا جب اس میں زیادتی کی تو لمبائی کم کر دی پھر اس کی لمبائی میں دس ہاتھ کا اضافہ کیا اور اس کے دو دروازے بنائے۔ ایک میں سے لوگ داخل ہوتے دوسرے سے نکل جاتے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں ہے۔ حدیث کے الفاظ مختلف ہیں۔

سفیان نے داؤد بن شایبہ عن مجاہد کے سلسلہ سے ذکر کیا ہے کہ مجاہد نے کہا: جب حضرت ابن زبیر نے کعبہ کو گرانے اور دوبارہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے لوگوں کو کہا: کعبہ کو گرا دو۔ لوگوں نے اسے گرانے سے انکار کیا اور وہ ڈر گئے کہ کہیں عذاب نہ آجائے۔ مجاہد نے کہا: ہم منیٰ کی طرف نکل گئے اور ہم وہاں تین دن ٹھہرے رہے اور عذاب کا انتظار کرتے رہے۔ فرمایا: حضرت عبداللہ بن زبیر خود کعبہ کی دیوار پر چڑھے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ آپ کو کچھ نہیں ہوا تو لوگوں نے حوصلہ باندھا۔ فرمایا: لوگوں نے کعبہ کو گرایا۔ جب اسے حضرت عبداللہ بن زبیر نے بنایا تو اس کے دو دروازے بنائے۔ ایک دروازے سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے سے نکل جاتے اور اس میں دیوار والی طرف سے چھ ہاتھ کا اضافہ کیا اور اس کے طول میں نو ہاتھ کا اضافہ کیا۔ مسلم نے اپنی حدیث میں کہا: جب حضرت عبداللہ بن زبیر شہید ہوئے تو حجاج نے عبدالملک بن مروان کو اس کے متعلق بتانے کے لئے خط لکھا اور اسے بتایا کہ ابن زبیر نے کعبہ کو اس بنیاد پر تعمیر کیا جس کی طرف اہل مکہ میں سے عادل لوگوں نے دیکھا۔ عبدالملک نے اس کی طرف لکھا کہ ہم ابن زبیر کی کسی چیز کو باقی رکھنے والے نہیں جو اس نے اس کی لمبائی میں زیادتی کی ہے اس کو برقرار رکھو اور جو اس نے حطیم سے زیادتی کی، اس کو پہلی بنا پر لوٹا دو اور جو اس نے دروازہ کھولا تھا اسے بند کر دو۔ پس حجاج نے اسے توڑا اور پہلی بنا پر لوٹا دیا۔

ایک روایت میں ہے، عبدالملک نے کہا: میں گمان نہیں کرتا کہ اباضیہ (ابن زبیر) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا ہے جو وہ کہتا ہے کہ اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا ہے۔ حارث بن عبداللہ نے کہا: کیوں نہیں میں نے یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا تھا، اس نے کہا: تو نے اسے کیا کہتے ہوئے سنا؟ انہوں نے کہا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہاری قوم نے بیت اللہ کی عمارت کم کر دی ہے۔ اگر ان کے شرک کا زمانہ قریب نہ ہوتا تو میں اسے لوٹا دیتا جو انہوں نے چھوڑ دیا تھا اگر میرے بعد تیری قوم کو اسے دوبارہ تعمیر کرنے کا خیال آئے تو ادھر آؤ میں تجھے دکھاؤں جو انہوں نے کعبہ میں سے چھوڑ دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو سات ہاتھ کے قریب دکھایا۔

ایک اور روایت میں ہے، عبدالملک نے کہا: اگر میں اس کے گرانے سے پہلے یہ حدیث سن لیتا تو میں اسے حضرت ابن زبیر کی بنیاد پر چھوڑ دیتا۔ یہ کعبہ کی تعمیر کے بارے میں آثار مروی ہیں۔ روایت ہے کہ رشید نے حضرت مالک بن انس کے

1۔ صحیح بخاری، باب فضل مکہ و بنیائہا، حدیث 1482، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سامنے ذکر کیا کہ وہ حجاج کی تعمیر کعبہ کو گرانا چاہتا ہے اور اسے حضرت ابن زبیر کی تعمیر پر لوٹانا چاہتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے اور حضرت ابن زبیر نے اس کی پیروی کی تھی۔ امام مالک نے رشید کو کہا: اے امیر المومنین! میں تجھے اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ تم اس گھر کو بادشاہوں کے لئے کھلو مانہ بناؤ، ہر آنے والا بیت اللہ کو توڑ دے گا اور نئی تعمیر کرے گا اور اس کی ہیبت لوگوں کے دلوں سے چلی جائے گی۔

واقدی نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں معمر نے ہام بن منبہ سے روایت کر کے بتایا کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے اسعد حمیری کو گالی دینے سے منع فرمایا۔ یہ تیج تھا یہ پہلا شخص تھا جس نے بیت اللہ کو غلاف پہنایا تھا اور یہ دوسرا تیج تھا۔ ابن اسحاق نے کہا: پہلے قبایلی کپڑے پہنائے جاتے تھے پھر یمنی چادریں بنائی جاتی تھیں اور جس نے سب سے پہلے دیباچ (ریشم) کا کپڑا پہنایا وہ حجاج تھا۔ علماء نے فرمایا: کعبہ کے غلاف سے کوئی چیز نہیں لینی چاہئے کیونکہ وہ کعبہ کو ہدیہ کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی چیز کم نہیں کی جائے گی۔ حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ کعبہ کی خوشبو میں سے کوئی چیز لینا شفا حاصل کرنے کے لئے مکروہ ہے۔ جب وہ خادم کو کوئی چیز لیتے ہوئے دیکھتے تو اسے سر کے پیچھے طمانچہ مارتے وہ اسے تکلیف پہنچانے میں کمی نہیں کرتے تھے۔ عطا نے کہا: ہم میں سے کوئی جب اس سے شفا طلب کرنے کا ارادہ کرتا تو وہ خوشبو لے آتا اس کو پتھر کے ساتھ مس کرتا پھر اسے اٹھا لیتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا مَعْنٰی ہے وہ دونوں کہہ رہے تھے: رَبَّنَا تَقَبَّلْ يَقُولَان کو حذف کیا گیا ہے۔ حضرت ابی اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کی قراءت میں اسی طرح ہے: وَاذِیْرَفَعْ اِبْرٰهٖمَ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمَاعِیْلَ وَّ یَقُولَان رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا (1)۔ اسماعیل کی تفسیر یہ ہے: اسمع یا اللہ (اے اللہ! سن لے) کیونکہ ایل، سریانی زبانی میں اللہ کو کہتے ہیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے رب سے دعا مانگی تو کہا: اسمع یا ایل (اے اللہ! سن لے میری فریاد) جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور بچہ عطا فرمایا تو اس کا نام اپنی دعا کے ساتھ رکھا۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے دو اسم ہیں۔ ان کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ میں کر دی ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةٌ مُّسْلِمَةٌ لَّكَ وَ اٰرِثْنَا مَنَاسِكَنَا وَ تَبَّ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ الثَّوَابُ الرَّحِیْمُ ۝

”اے ہمارے رب! بنادے ہم کو فرمانبردار اپنا اور ہماری اولاد سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا جو تیری فرمانبردار ہو اور بتادے ہمیں ہماری عبادت کے طریقے اور توجہ فرما ہم پر (اپنی رحمت سے) بے شک تو ہی بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔“



اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَٰثِبْنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ يٰہَا وَاجْعَلْنَا بِمَعْنٰی صِدْقًا ہے اور مُسْلِمِينَ مفعول ثانی ہے۔ دونوں (ابراہیم و اسماعیل) نے ثبات اور دوام کی دعا مانگی۔ یہاں اسلام سے مراد ایمان اور اعمال دونوں ہیں (1)۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران: 19) اس آیت میں دلیل ہے ان علماء کی جو کہتے ہیں کہ ایمان اور اسلام ایک شے ہیں۔

ایک اور آیت سے انہوں نے اپنے اس قول کو قوت دی ہے: فَاَخْرَجْنَا مَن كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲﴾ (الذاریات) (ہم نے نکال لیا وہاں کے تمام ایمانداروں کو پس نہ پایا ہم نے اس ساری بستی میں بجز ایک مسلم گھر کے)۔

حضرت ابن عباس اور عوف اعرابی نے مسلمین جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةٌ مُّسْلِمَةٌ لَّكَ یعنی ہماری اولاد سے بنا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر نبی نے اپنے لئے اور اپنی امت کے لئے دعا مانگی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لئے، اپنی امت کے لئے اور اس امت (محمدیہ) کے لئے دعا مانگی۔ مِنْ ذُرِّيَّتِنَا میں تبغیضیہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کر دیا تھا کہ آپ کی اولاد میں سے کچھ ظالم ہوں گے۔ طبری نے حکایت کیا ہے کہ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا سے خاص عرب مراد ہیں (3)۔ سہیلی نے کہا: ان دونوں کی اولاد عرب ہیں کیونکہ عرب نبوت بن اسماعیل کی اولاد ہیں یا بنو تیمن بن اسماعیل کی اولاد ہیں۔ کہا جاتا ہے: قیدر بن نبوت بن اسماعیل ..... العدنانیہ یہ نبوت کی اولاد ہیں اور قحطانیہ قیدر بن نبوت بن اسماعیل کی اولاد ہیں یا ایک قول کے مطابق تیمن کی اولاد ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا (4): یہ ضعیف ہے کیونکہ آپ کی دعوت عربوں میں ظاہر ہوئی تھی اور ان لوگوں میں جو عربوں کے علاوہ تھے۔

اُمَّة کا یہاں معنی جماعت ہے ایک شخص کو بھی امت کہا جاتا ہے خیر میں جس کی اقتدا کی جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ (النحل: 120) (بلاشبہ ابراہیم ایک مرد کامل تھے اللہ کے مطیع تھے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن عمرو بن نفیل کے بارے میں فرمایا تھا وہ ایک امت کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا کیونکہ کوئی دوسرا اس کے دین میں شریک نہ تھا۔ واللہ اعلم

کبھی لفظ اُمَّة کا اطلاق دوسرے معانی میں بھی ہوتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰی اُمَّةٍ (زخرف: 22) یعنی ہم نے اپنے آباء کو ایک دین اور ملت پر پایا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ هٰذِهِ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (الانبیاء: 92) کبھی الحین اور الزمان کے معنی میں ہوتا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ كُنَّا بَعْدَ اُمَّةٍ (یوسف: 45) (یعنی کچھ عرصہ کے بعد یاد آیا) کہا جاتا ہے ہذا امة زید۔ یعنی یہ زید کی ماں ہے۔ اُمَّة کا معنی قامت بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان حسن الامہ یعنی خوبصورت قامت والا ہے۔ شاعر نے کہا:

وان معاویۃ الاکرمیۃ ن حسان الوجوۃ طوال الامم

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضا 4۔ المحرر الوجیز تفسیر طبری زیر آیت ہذا

بعض علماء نے فرمایا: الامۃ اس زخم کو بھی کہتے ہیں جو دماغ کی اصل تک پہنچ جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل ماموم د امیم، ایسا شخص جسے دماغ پر زخم لگا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَرْثَانَا مَنَاسِكُنَا، اَرِثَانَا، یہ آنکھ سے دیکھنے سے ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ رویت قلب سے ہے، یہ کہنے والے پر لازم ہے کہ فعل اس کی طرف سے تین مفاعیل کی طرف متعدی ہو۔ ابن عطیہ نے کہا (1): کبھی ہمزہ کے باوجود رویت قلب سے دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جس طرح بغیر ہمزہ کے دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ حطائط بن یعفر اخوالا سود بن یعفر نے کہا:

ارینی جواداً مات هزلاً لاننی اری ما ترین او بخيلاً مختلاً  
حضرت عمر بن عبدالعزیز، حضرت قتادہ، حضرت ابن کثیر، حضرت ابن محیسن، سدی اور روح نے یعقوب اور رولیس السوی نے اذن قرآن میں راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے۔ ابو عمرو نے راء کے کسرہ کے اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے اس کو اختیار کیا ہے، اصل میں اُذُنَا ہمزہ کے ساتھ تھا، جنہوں نے راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے کہا: ہمزہ اور اس کی حرکت ختم ہو گئی اور راء اپنی حالت پر ساکن باقی رہی اور انہوں نے شاعر کے قول سے استدلال کیا ہے:

ارنا اداوة عبدالله نسلوها من ماء زمزم ان القوم قد ظمئوا  
ہمیں عبد اللہ کا لوٹا دکھاؤ ہم زمزم کے پانی سے اسے بھریں گے کیونکہ قوم پیاسی ہے۔  
شاعر نے اسے اُزنا پڑھا ہے۔

اور جن علماء نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے وہ ہمزہ محذوف کی حرکت نقل کر کے را کو دیتے ہیں۔ ابو عمرو نے خفت کو طلب کیا ہے۔ شجاع بن ابی نصر سے مروی ہے، وہ امین اور سچے تھے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا تھا انہوں نے ابو عمرو کے حروف سے بہت سی اشیاء کا ذکر کیا تو صرف دو حروف کی تصحیح فرمائی۔ ایک یہ اُزنا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ارنا اور دوسرا ما تنسخ من آية او تنساها (مہوز)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنَاسِكُنَا کہا جاتا ہے: لغت میں النسك کا معنی غسل ہے۔ کہا جاتا ہے: نسك ثوبہ جب کوئی اپنے کپڑے کو دھوئے۔ یہ شرع میں عبادت کا اسم ہے کہا جاتا ہے رجل ناسك، جب کوئی شخص عابد ہو۔

علماء کا اختلاف ہے کہ المناسك سے کیا مراد ہے۔ بعض نے فرمایا مناسك حج اور اس کی علامات مراد ہیں۔ یہ قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ مجاہد، عطاء، ابن جریج نے کہا المناسك سے مراد ذبح کی جگہیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: تمام عبادات ہیں (2) ہر وہ عمل جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے اسے منسك اور منسك کہا جاتا ہے۔ المناسك سے مراد عابد ہے۔ نحاس نے کہا نَسَكٌ يَنْسُكُ۔ اس صورت میں منسك کہنا واجب ہے۔

لیکن عرب کلام میں مفعول نہیں ہے۔ زہیر بن محمد سے مروی ہے، فرمایا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت الحرام کی بناء سے فارغ ہوئے تو عرض کی: اے رب! میں فارغ ہو چکا ہوں تو ہمیں مناسک دکھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف جبریل امین کو بھیجا، پس آپ نے جبریل امین کے ساتھ حج کیا حتیٰ کہ جب عرفہ سے لوٹے اور دسویں کا دن آیا تو ابلیس آپ کے سامنے آیا جبریل امین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا اسے کنکریاں مارو، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے سات کنکریاں ماریں پھر اگلے دن اور تیسرے دن کنکریاں ماریں۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام شیر پہاڑ پر چڑھے اور کہا: اے اللہ کے بندو، اجیبوا (جواب دو) پس سمندروں کے درمیان جو بھی ایسا شخص موجود تھا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان تھا اس نے آپ کی دعوت کو سن لیا۔ اور اس نے کہا: لبیک اللہم لبیک۔ فرمایا: سطح زمین پر ہمیشہ سات یا اس سے زائد مسلمان ہوں گے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو زمین اور اس کے رہنے والے ہلاک ہو جاتے۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پکار کا جواب اہل یمن نے دیا۔ ابو مجلز سے مروی ہے، فرمایا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو جبریل امین آپ کے پاس آئے اور انہیں بیت اللہ کا طواف دکھایا۔ فرمایا: میرا خیال ہے انہوں نے فرمایا: الصفا والمروة پھر دونوں جمرہ عقبہ کی طرف چلے سامنے شیطان آیا، جبریل امین نے سات کنکریاں اٹھائیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سات کنکریاں دیں، پہلے جبریل امین نے کنکری ماری اور تکبیر کہی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا، کنکری مارو اور تکبیر کہو پس دونوں نے کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی حتیٰ کہ شیطان چلا گیا پھر جمرہ وسطیٰ کی طرف چلے۔ شیطان پھر سامنے آیا، جبریل نے سات کنکریاں لیں اور ابراہیم علیہ السلام کو بھی سات کنکریاں دیں۔ جبریل امین نے کہا: کنکری مارو اور تکبیر کہو دونوں نے کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی۔ حتیٰ کہ شیطان چلا گیا۔ پھر جمرہ قصویٰ پر آئے، شیطان سامنے آیا، جبریل امین نے سات کنکریاں لیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سات کنکریاں دیں اور کہا: کنکری مارو اور تکبیر کہو۔ دونوں نے کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی حتیٰ کہ شیطان چلا گیا پھر دونوں مزدلفہ میں آئے اور جبریل امین نے کہا: یہاں لوگ اپنی نمازوں کو جمع کریں گے پھر جبریل امین، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لے کر عرفات میں آئے اور کہا: عرفات (تو نے جان لیا؟) حضرت ابراہیم نے کہا: ہاں۔ اسی وجہ سے اس جگہ کو عرفات کہا جاتا ہے۔ روایت ہے، جبریل امین نے تین مرتبہ کہا عرفات، عرفات، عرفات۔ یعنی منیٰ، مزدلفہ اور اس جگہ کو پہچان لیا۔ حضرت ابراہیم نے کہا: ہاں۔ اسی وجہ سے اس مکان کو عرفات کہا جاتا ہے۔ خصیف بن عبد الرحمن سے مروی ہے کہ مجاہد نے انہیں بتایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وَآمَنَّا بِمَا سَكَّنَا یعنی الصفا والمروة۔ یہ نص قرآنی سے اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں پھر جبریل امین آپ کو لے کر نکلے جب جمرہ عقبہ سے گزرے تو اس پر شیطان بیٹھا تھا۔ جبریل امین نے حضرت ابراہیم سے کہا: تکبیر کہو اور اسے کنکری مارو، ابلیس، جمرہ وسطیٰ پر چڑھ گیا۔ جبریل امین نے کہا تکبیر کہو اور اسے کنکری مارو پھر جمرہ قصویٰ پر اسی طرح ہوا۔ پھر وہ اسے مشعر حرام کی طرف لے گئے۔ پھر عرفہ میں لے آئے۔ پھر جبریل امین نے حضرت ابراہیم سے کہا کیا تو نے پہچان لیا جو میں نے تجھے دکھایا؟ حضرت ابراہیم نے کہا: ہاں۔ اسی وجہ سے عرفات کو عرفات کہا جاتا ہے۔ جبریل امین نے کہا: تم لوگوں میں حج کا



اعلان کرو۔ حضرت ابراہیم نے کہا: میں کیسے کہوں؟ جبریل امین نے کہا: تم کہو: اے لوگو! اپنے رب کا حکم قبول کرو۔ یہ تین مرتبہ اعلان کرو۔ حضرت ابراہیم نے ایسا ہی کیا۔ لوگوں نے کہا: لبیک اللہم لبیک۔ فرمایا: اس دن جس نے جواب دیا وہ حج کرے گا۔ دوسری روایت میں ہے جب آپ نے آواز دی تو آپ گھوڑے اور ہر طرف ندادی۔ مشرق و مغرب ہر طرف سے لوگوں نے لبیک کہا۔ پہاڑ جھک گئے حتیٰ کہ آپ کی آواز دور تک چلی گئی۔ محمد بن اسحاق نے کہا: جب حضرت ابراہیم خلیل الرحمن صلوٰۃ اللہ علیہ بیت الحرام کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو جبریل امین آپ کے پاس آئے اور کہا: اس کے ساتھ چکر لگاؤ۔ حضرت ابراہیم نے اس کے ساتھ چکر لگائے اور حضرت اسماعیل بھی آپ کے ساتھ تھے، ہر طواف میں ہر رکن کا استلام کیا جب سات چکر دونوں نے مکمل کر لئے تو مقام کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی۔ فرمایا: جبریل امین کھڑے ہوئے اور تمام مناسک دکھائے، صفا، مروہ، منیٰ اور مزدلفہ۔ فرمایا: جب منیٰ میں داخل ہوئے اور عقبہ سے اترے تو شیطان سامنے آیا، جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے تمام ارکان کا استلام کرتے تھے اور فرمایا: شام سے حضرت اسحاق اور سارہ علیہما السلام نے حج کیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر سال براق پر حج کرتے تھے ان کے بعد انبیاء اور امم نے حج کیا۔ محمد بن سابط نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہر نبی جب اس کی امت ہلاک ہو جاتی تھی تو وہ مکہ میں آ جاتا تھا اور یہاں وہ اور اس پر ایمان لانے والے عبادت کرتے تھے، حتیٰ کہ وہ فوت ہو جاتے تھے۔ مکہ میں حضرت نوح، حضرت ہود اور حضرت صالح علیہم السلام کا وصال ہوا اور ان کی قبور زمزم اور حطیم کے درمیان ہیں (1)۔ ابن وہب نے ذکر کیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کے مومن ساتھی مکہ میں فوت ہوئے تھے ان کی قبور مکہ کی غربی جانب دار الندوہ اور بنی سہم کے درمیان ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: مسجد میں صرف دو قبریں ہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر۔ حضرت اسماعیل کی قبر حطیم میں ہے اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر حجر اسود کے مقابل ہے۔ عبد اللہ بن ضمیر السلوٰی نے کہا: رکن اور مقام کے درمیان ننانوے انبیاء کی قبور ہیں جو حج کے لئے آئے تھے یہاں دفن ہوئے۔ صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَثُبَّ عَلَيْنَا حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے اس قول کے معنی میں اختلاف ہے۔ ثُبَّ عَلَيْنَا کہا حالانکہ انبیاء گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ ایک گروہ نے کہا: انہوں نے اس دعا سے تثبیت اور دوام کو طلب کیا، نہ اس لئے کہ ان کا کوئی گناہ تھا۔ میں کہتا ہوں: یہ اچھا جواب ہے اور اس سے احسن جواب یہ ہے کہ جب ان دونوں نے مناسک کو جان لیا اور بیت اللہ کو تعمیر کر لیا تو ان دونوں نے ارادہ کیا کہ وہ لوگوں کے لئے بیان کریں اور لوگوں کو بتائیں کہ یہ جگہ اور دوسرے مناسک حج گناہوں سے طہارت اور توبہ طلب کرنے کی جگہیں ہیں (2)۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم میں سے جو ظالم ہیں ان کی توبہ قبول فرما۔ عصمت انبیاء پر کلام حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں گزر چکی ہے اور إِنَّكَ أَنْتَ الثَّوَابُ الرَّجِيمُ کے معنی میں بھی کلام گزر چکا ہے پس اعادہ کی ضرورت نہیں۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ  
وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٣١﴾

”اے ہمارے رب! بھیج ان میں ایک برگزیدہ رسول انہیں میں سے تاکہ پڑھ کر سنائے انہیں تیری آیتیں اور سکھائے انہیں یہ کتاب اور دانائی کی باتیں اور پاک صاف کر دے انہیں۔ بے شک تو ہی بہت زبردست (اور) حکمت والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا، رسول سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں۔ حضرت ابی کی قراءت میں ہے و ابعث فی آخرہم رسولاً منہم حضرت خالد بن معدان نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اصحاب کی ایک جماعت نے آپ سے عرض کی: یا رسول اللہ! ہمیں اپنی ذات کے بارے میں بتائیے۔ فرمایا: ہاں میں اپنے باپ ابراہیم کی دعوت ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں (1)۔ اور رسول بمعنی مرسل (بھیجا گیا) ہے یہ رسالت سے مفعول کا وزن ہے۔ ابن انباری نے کہا: ہو سکتا ہے کہ عربوں کے اس قول سے ہو: ناقۃ ورسال ورسلة۔ جب اونٹنی آرام سے چلنے والی ہو دوسری اونٹنیوں کے آگے چلنے والی ہو اور مہمل جماعت کے لئے الرسالة کہا جاتا ہے۔ رسل کی جمع ارسال ہے۔ کہا جاتا ہے: جاء القوم ارسالاً۔ یعنی لوگ ایک دوسرے کے پیچھے آئے، اسی سے دودھ کو دسل کہا جاتا ہے کیونکہ وہ کھیری سے متواتر نکالا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، الْكِتَاب سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد دین کی معرفت، اور فہم ہے جو تاویل میں سمجھ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خصلت اور نور ہے۔ یہ مالک نے کہا ہے۔ یہ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور ابن زید نے بھی یہی کہا ہے۔ قتادہ نے کہا: حکمت سے مراد سنت اور شریعت کا بیان ہے (2)۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد حکم اور قضا ہے، سب کا معنی قریب قریب ہے۔ تعلیم کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی ہے کیونکہ آپ وہ تمام امور عطا فرماتے ہیں جن میں غور و فکر کیا جاتا ہے آپ غور و فکر کے طرق کی تعلیم دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ آپ کو وحی کے ذریعے عطا فرماتا تھا۔ (3)

وَيُزَكِّيهِمْ یعنی شرک کی میل سے انہیں پاک کرتا ہے۔ ابن جریج (4) وغیرہ سے مروی ہے، زکوٰۃ کا مطلب پاک کرنا ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض نے فرمایا: آیات سے مراد ظاہر الفاظ کی تلاوت ہے، کتاب سے مراد الفاظ کے معانی ہیں اور حکمت سے مراد حکم ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے خطاب کی مراد ہے کہ وہ مطلق ہے، مقید ہے، مفسر ہے، مجمل ہے، عموم و خصوص ہے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

الْعَزِيزُ اس کا معنی ہے وہ محفوظ ذات جس کو نہ پایا جاسکتا ہے اور نہ مغلوب کیا جاسکتا ہے۔ ابن کیسان نے کہا: اس کا معنی ہے جس کو کوئی چیز عاجز نہ کرے۔ اس کی دلیل یہ ہے: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ (فاطر: 44)۔ الکسانی نے کہا: الْعَزِيزُ کا معنی غالب ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعِزِّي فِي الْخَطَابِ۔

4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ الحمد للہ وجز تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ الحمد للہ وجز زیر آیت ہذا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ضرب المثل ہے: مَنْ عَزِيْزٌ یعنی جو غالب آیا اس نے سلب کیا۔ بعض نے فرمایا: الْعَزِيْزُ وہ ہے جس کی کوئی مثال نہ ہو، اس کا بیان ہے: لیس کشلہ شق۔ ہم نے اس معنی کو الْعَزِيْزُ کے اسم کے تحت اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ میں زیادہ بیان کیا ہے۔ الْحَكِيْمُ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ الحمد للہ

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ ۚ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ

فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳﴾

”اور کون روگردانی کر سکتا ہے دین ابراہیم سے بجز اس کے جس نے احمق بنا دیا ہو اپنے آپ کو اور بے شک ہم

نے چن لیا ابراہیم کو دنیا میں اور بلاشبہ قیامت کے دن نیکو کاروں میں ہوں گے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ، مَنْ استفہامیہ ہے۔ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ یرغب، مَنْ کا صلہ ہے اور اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ یہ خبر کی جگہ ہے، یہ تفریع اور توخ ہے اس میں نفی کا معنی ہے۔ یعنی وہ مایرغب کا معنی ہے یہ نحاس کا قول ہے۔ یعنی دین اور شرع ابراہیمی سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ اور اس سے پہلے نفس کو دور رکھتا ہے جس نے اپنے نفس کو بیوقوف بنایا۔

قنادہ نے کہا: اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں انہوں نے ملت ابراہیمی سے اعراض کیا اور یہودیت و نصرانیت خود ایجاد کی وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے (1)۔ زجاج نے کہا: سفہ کا معنی ہے اپنے نفس کے امر سے جاہل رہا اور اس میں غور و فکر نہ کیا۔ ابو عبیدہ نے کہا: اس کا معنی ہے اس نے اپنے نفس کو ہلاک کیا۔ ثعلب اور مبرد نے حکایت کیا ہے کہ سِفْعَاء کے کسرہ کے ساتھ اسی طرح متعدی ہے جس طرح سفہ فاء کے فتح اور تشدید کے ساتھ متعدی ہے (2)۔ یعنی اس نے اپنے نفس کے ساتھ ایسا فعل کیا کہ وہ سفیہ بن گیا۔ ان سے مروی ہے، یہ ایک لغت ہے جو بمعنی سفہ ہے۔ یہ مہدوی نے حکایت کیا ہے۔ پہلا قول ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ رہا سَفْعَاء فاء کے ضمہ کے ساتھ یہ متعدی نہیں ہوتا۔ یہ مبرد اور ثعلب کا قول ہے۔ کسائی نے انخفش سے حکایت کیا ہے کہ اس کا معنی ہے: جہل فی نفسہ۔ نی کو حذف کیا گیا اور نفسہ کو منصوب پڑھا گیا۔

انخفش نے کہا: اس کی مثل عقدۃ النکاح ہے یعنی علی عقدۃ النکاح۔ (علی کو حذف کیا گیا) یہ سیبویہ کے مذہب پر جاری ہے اس سے عربوں سے حکایت کیا ہے ضرب فلان الظهر والبطن۔ اصل میں فی الظهر والبطن تھا نی کو حذف کیا گیا (3)۔ فراء نے کہا: نفسہ تمیز کی حیثیت سے منصوب ہے۔ ابن بحر نے کہا: اس کا معنی ہے کہ وہ اپنے نفس سے اور جو اس میں دلالت اور آیات ہیں ان سے غافل رہا جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس نفس کا ایک صانع (بنانے والا) ہے جس کی مثل کوئی نہیں ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کو جان لیتا۔

میں کہتا ہوں: یہ زجاج کے قول کا معنی ہے۔ وہ اپنے نفس میں غور و فکر کرتا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے پکڑا ہے اور اپنے قدموں سے چلتا ہے، آنکھوں سے دیکھتا ہے، کانوں سے سنتا ہے، زبان سے بولتا ہے، دودھ سے غنی ہونے کے وقت اس کی داڑھیں



پیدا فرمائیں تاکہ وہ اس سے کھانے کو چبائے، معدہ بنایا گیا وہ غذا کو پکانے کے لئے ہے، جگر ہے جس کی طرف اس غذا کو صاف مال جاتا ہے اور اس کی نیس اور رگیں ہیں جن کے ذریعے مختلف اطراف میں خون پہنچتا ہے۔ انتڑیاں ہیں جن کی طرف غذا کا فضلہ جاتا ہے اور نیچے والے بدن سے نکل جاتا ہے، اس سے انسان استدلال کر سکتا تھا کہ اس کا کوئی خالق، قادر، علیم اور حکیم ہے۔ یہی معنی ہے اس آیت کا وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿٥﴾ (الذاریات) (تمہارے وجود میں بھی (نشانیوں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں)۔

اس کی طرح خطاب نے اشارہ کیا ہے اس کا مزید بیان سورہ الذاریات میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس آیت سے استدلال کیا ہے اس نے جس نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت ہماری شریعت ہے مگر جو اس سے منسوخ ہو گیا یہ اس قول کی مانند ہے: وَمَلَأْنَا أَبْنَاءَ إِبْرَاهِيمَ (الحج: 78)۔ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت اِنَّا نَشِيعُ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ (النحل: 123)۔ آپ ابراہیم کی ملت کی اتباع کریں۔ مزید بیان آگے آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَا فِي الدُّنْيَا إِبْرَاهِيمَ نَحْنُ وَآلُ هَارُونَ وَآلُ يُونُسَ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَطَّيَّرْنَا لَهُ نَوْحَ نُوحٍ وَخَصَّصْنَا لَهُ الْوَسْطَى مِنَ الْغُرَىٰ فَاتَّخَذَ مِنْهُمْ أَئِمَّةً وَبَارَكْنَا فِيهِمُ الْغُرَىٰ (مائدہ: 61)۔ صاف بنایا۔ اصطفینا اصل میں اصطفینا تھا۔ تاہم کو طاس سے بدلاتا کہ اطباق میں صاف کے ساتھ مناسبت ہو جائے یہ لفظ الصفوة سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے: جو زیادہ صاف ہو اس کا اختیار کرنا۔ (1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنَّ فِي الْآخِرَةِ لَمَنِ الصَّالِحِينَ، الصالحین فی الآخرۃ سے مراد کامیاب ہونے والا ہے۔ پھر یہ سوال کیا گیا ہے کہ فی الآخرۃ کو مقدم کیسے کیا گیا ہے حالانکہ یہ صلہ میں داخل ہے؟ نحاس نے کہا: اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی تقدیر اس طرح نہیں ہے: إِنَّهُ لَمَنِ الصَّالِحِينَ فِي الْآخِرَةِ کہ صلہ مقدم ہو۔

اہل عرب کے اس کے متعلق تین اقوال ہیں: (1) یہ کہ اس کا معنی ہے وہ آخرت میں صالح ہے پھر کلام میں حذف کیا گیا۔ بعض نے فی فرمایا: فی الآخرۃ، مصدر محذوف۔ کہ متعلق ہے یعنی صلاحۃ فی الآخرۃ۔ تیسرا قول یہ ہے کہ الصالحین، الدین صلحوا کے معنی میں نہیں ہے۔ یہ اسم قائم بنفسہ ہے جیسے کہا جاتا ہے: الرجل، الغلام۔

میں کہتا ہوں: چوتھا قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: إِنَّهُ فِي عِلِّ الْآخِرَةِ لَمَنِ الصَّالِحِينَ کلام مضاف کے حذف پر ہے (2)۔ حسین بن فضل نے کہا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ کلام اس طرح ہے: وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَإِنَّهُ لَمَنِ الصَّالِحِينَ۔

حجاج بن حجاج نے روایت کیا ہے، یہ حجاج بن الاسود ہے اور وہی حجاج الاحول ہے جو زق العسل (شہد کا مشکیزہ) سے معروف تھا۔ فرمایا: میں نے معاویہ بن قرۃ سے سنا۔ انہوں نے فرمایا: اللہم ان الصالحین انت اصلحتهم و رزقتهم ان عملوا بطاعتك فرضيت عنهم۔ اللہم کما اصلحتهم فاصلحننا و کما رزقتهم ان عملوا بطاعتك فرضيت عنهم فادرزقنا ان نعمل بطاعتك وارض عنا۔ اے اللہ! صالحین کو تو نے صالحیت بخشی تو نے انہیں توفیق بخشی کہ وہ تیری طاعت

کے اعمال کریں اور تو ان سے راضی ہوا۔ اے اللہ! جس طرح تو نے انہیں صالحیت بخشی ہمیں بھی صالحیت عطا فرما اور جس طرح تو نے انہیں اپنی طاعت کی توفیق بخشی اور تو ان سے راضی ہوا ہمیں بھی اپنی طاعت کی توفیق عطا فرما اور ہم سے راضی ہو۔

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمَ<sup>۱</sup> قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ<sup>۲</sup>

”اور یاد کرو جب فرمایا اس کو اس کے رب نے (اے ابراہیم!) گردن جھکا دو۔ عرض کی: میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنے۔“

إِذْ كَاعِلِ اصْطَفَيْنَهُ كاقول ہے۔ یہ قول اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان کی ستارے، چاند اور سورج سے آزمائش کی (1)۔ ابن کیسان اور کلبی نے فرمایا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی توحید کے ساتھ اپنے دین کو خالص کر۔ بعض نے فرمایا: أَسْلِمَ کا معنی ہے خضوع و خشوع کر۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت فرمایا جب آپ سرنگ سے نکلے تھے۔ جیسا کہ سورۃ الانعام میں اس کا ذکر آئے گا۔ اسلام یہاں تمام وجوہ کے ساتھ ہے۔ کلام عرب میں اسلام کا معنی خضوع اور انقیاد ہے۔ ہر اسلام، ایمان نہیں ہے اور ہر ایمان، اسلام ہے کیونکہ جو اللہ پر ایمان لایا اس نے اللہ تعالیٰ کے لئے سر جھکا دیا اور اس کی اطاعت کی۔ اور ہر اسلام لانے والا ایمان لانے والا نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے اس نے تلوار کے خوف سے کلمہ پڑھا ہو اور یہ ایمان نہیں ہوگا۔ قدر یہ اور خوارج کا قول اس کے خلاف ہے (☆)۔ انہوں نے کہا: اسلام ہی ایمان ہے۔ ہر مومن، مسلم ہے اور ہر مسلم، مومن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران: 19) یہ دلیل ہے کہ اسلام، دین ہے اور جو مسلمان نہیں وہ مومن نہیں۔

اور ہماری دلیل یہ ارشاد ہے: قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا (الحجرات: 14)

اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ فرمائیے تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت اختیار کر لی۔

اللہ تعالیٰ نے اس میں بیان فرمایا کہ ہر مسلمان، مومن۔ نہیں پس یہ دلیل ہے کہ ہر مسلمان، مومن نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو فرمایا: جب انہوں نے عرض کی تھی: حضور! فلاں کو عطا فرمائیں وہ مومن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا بلکہ تم کہو مسلم ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ ایمان اسلام نہیں ہے کیونکہ ایمان باطنی چیز ہے اور اسلام ظاہر ہے۔ یہ واضح ہے کہ کبھی ایمان، اسلام کے معنی میں ہوتا۔ اسلام بولا جاتا ہے اور مراد ایمان ہوتا ہے کیونکہ ہر ایک دوسرے کو لازم ہے۔ جیسے اسلام جو ایمان کا ثمرہ، اور ایمان کی صحت پر دلیل ہے (یہی نقطہ نظر ماترید یہ کا ہے)۔

وَوَضَّيْ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ<sup>۳</sup> لِيَبْنِيَ<sup>۴</sup> إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى<sup>۵</sup> لَكُمْ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔

1۔ الحجر والوجیز زیر آیت ہذا

☆۔ یہ قول قابل توجہ ہے کیونکہ شرح عقائد نفسی میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ معبود اور خوارج کے نزدیک اعمال ایمان کا جز ہیں اس لیے وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو ایمان سے خارج کرتے ہیں۔ جہاں تک ایمان اور اسلام کا تعلق ہے لغوی اعتبار سے توفیق ہے لیکن کسی کے لیے ایک کا ثبوت اور دوسرے کی نفی کرنا ممکن نہیں اہلسنت میں سے یہ ماترید یہ کی رائے ہے مفسر کا اس کی تعبیر کرنا درست نہیں۔

## إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٣٢﴾

”اور وصیت کی اسی دین کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے اے میرے بچو! بے شک اللہ نے پسند فرمایا ہے تمہارے لئے یہی دین سو تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَوَضِيَ بِهَا إِبْرَاهِيمُ، ہاضمیر سے مراد ملت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہ کلمہ ہے اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٣٢﴾ یہ زیادہ درست ہے کیونکہ یہ قریب مذکور ہے (1) یعنی تم اسلمنا کہو۔ وَوَضِيَ اور اوصی دونوں ہم معنی قریش کی لغتیں ہیں۔ مثلاً کہ منا اور اکہ منا۔ اوصی اور وصى دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ حضرت عبد اللہ کے مصحف میں وصی تھا اور حضرت عثمان کے مصحف میں اوصی تھا۔ یہ اہل مدینہ، شام اور دوسرے قراء کی قراءت ہے۔ وصی اس میں کثرت کا معنی ہے (2)۔ لفظ ابراہیم کو اس کے فعل کی وجہ سے رفع دیا ہے اور یعقوب، ابراہیم پر معطوف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ علیحدہ کلام ہے اس کا معنی ہے: و اوصی یعقوب۔ (3) مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی اور ان کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔

حضرت ابراہیم کے بیٹے، ایک حضرت اسماعیل تھے۔ ان کی والدہ ہاجرہ قبلیہ تھی یہ آپ کے بڑے بیٹے تھے۔ حضرت ابراہیم نے انہیں مکہ کی طرف منتقل کیا تھا جبکہ یہ ماں کا دودھ پیتے تھے۔ بعض نے فرمایا: اس وقت ان کی عمر دو سال تھی۔ بعض نے فرمایا: چودہ سال تھی۔ پہلا قول اصح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورہ ابراہیم میں ان شاء اللہ آئے گا۔ حضرت اسماعیل اپنے بھائی اسحاق سے چودہ سال پہلے پیدا ہوئے تھے اور ان کا وصال ہوا تو ان کی عمر ایک سو تہتر سال تھی۔ بعض نے فرمایا: ایک سو تیس سال تھی اور جب آپ کے والد حضرت ابراہیم کا وصال ہوا تو ان کی عمر ۸۹ سال تھی۔ ایک قول کے مطابق حضرت اسماعیل ذبح تھے۔ یہ اصح قول ہے جس طرح کہ اس کا بیان سورہ الصافات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آپ کی اولاد سے روم، یونان، ارمن اور جوآن کے پیچھے آئے اور بنی اسرائیل تھے۔ حضرت اسحاق ایک سو اسی سال زندہ رہے، ارض مقدسہ میں ان کا وصال ہوا اور اپنے باپ حضرت ابراہیم کے پاس دفن کئے گئے پھر جب حضرت سارہ کا وصال ہوا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قنطورا بنت یقطن کنعانیہ سے نکاح کیا اس سے آپ کی یہ اولاد ہوئی۔ مدین، مدائن، ہشمان، زمران، نشیق، شبوخ۔ پھر آپ کا وصال ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وصال اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے درمیان دو ہزار چھ سو سال کا فاصلہ تھا۔ یہود اس سے چار سو سال کم کرتے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا ذکر سورہ یوسف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

عمر و بن فائد اسواری اور اسماعیل بن عبد اللہ کی نے یعقوب، بنیہ پر عطف کی بناء پر منصوب پڑھا ہے (4)۔ اس صورت میں جن کو وصیت کی گئی ان میں حضرت یعقوب بھی داخل ہوں گے (5)۔ قشیری نے کہا: یعقوب پر بنیہ پر عطف کی بناء پر نصب پڑھی گئی ہے اور یہ بعید ہے کیونکہ جب حضرت ابراہیم نے وصیت کی تھی تو حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی اولاد کے درمیان موجود نہ تھے۔ یہ منقول نہیں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے دادا ابراہیم علیہ السلام کو پایا تھا۔ وہ حضرت



ابراہیم کے وصال کے بعد پیدا ہوئے تھے، اور حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی جس طرح حضرت ابراہیم نے وصیت کی تھی۔ حضرت یعقوب کی اولاد کے اسماء ان شاء اللہ آئندہ آئیں گے۔

کلبی نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ بتوں کی آگ کی اور گائے کی عبادت کرتے ہیں آپ نے اپنی اولاد کو جمع کیا اور ان پر آپ کو اندیشہ ہوا۔ فرمایا: تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے۔ کہا جاتا ہے: یعقوب کا یہ نام اس لئے رکھا گیا تھا کہ آپ اور آپ کے بھائی عیص جڑواں پیدا ہوئے تھے اور آپ اپنے بھائی عیص کی عقب (ایڑھی) کو پکڑے ہوئے تھے۔ لیکن اس قول میں نظر ہے کیونکہ یہ عربی اشتقاق ہے اور یعقوب عجمی اسم ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ نام رکھنے میں عربی میں موافقت ہے جسے تحمل پرندے کا جو مذکر ہوتا ہے اسے یعقوب کہا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک سو پینتالیس سال زندہ رہے تھے اور مصر میں آپ کا وصال ہوا تھا۔ آپ نے وصیت کی تھی کہ انہیں ارض مقدسہ کی طرف لے جایا جائے اور ان کے باپ حضرت اسحاق کے قریب دفن کیا جائے، تو حضرت یوسف علیہ السلام آپ کو ادھر لے گئے تھے اور ان کے والد حضرت اسحاق کے پہلو میں انہیں دفن کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰبَنَیَّ اس کا معنی ہے ان یا بنی، اسی طرح حضرت ابی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ضحاک کی قراءت میں ہے (۱)۔ فراء نے کہا ان کو لغو کیا گیا ہے کیونکہ توصیۃ قول کی طرح ہے ہر کلام جو قول کے معنی کی طرف راجع ہو، اس میں ان کا دخول جائز ہوتا ہے اور اس کا لغو کرنا بھی جائز ہے۔ فراء نے کہا: نحو یوں کا قول کہ (آن) کا ارادہ فرمایا اور ان کو لغو کیا گیا یہ کچھ نہیں ہے۔ نحاس نے کہا: یٰبَنَیَّ نداء مضاف ہے۔ یہ یاء النفس ہے اس پر فتح ہی جائز ہے کیونکہ اگر اس کو ساکن کیا جائے تو دوساکنوں کا جمع ہونا لازم آئے گا۔ اس کی مثال بصرخی ہے إِنَّ اللہَ میں إِنَّ کو کسرہ دیا گیا ہے کیونکہ اوصی اور قال ایک معنی میں ہیں۔ بعض نے فرمایا: قول کے اضمار کی وجہ سے إِنَّ پر کسرہ پڑھا گیا ہے۔ اصطفیٰ کا معنی اختیار ہے۔ راجز نے کہا:

یا بن ملوک وزثوا الاملاکا خلافة الله التي اعطاک

لک اصطفیٰ ہا ولہا اصطفاک

اے بادشاہوں کے بیٹے اور انہوں نے تجھے املاک کا وارث بنایا۔ اللہ کی خلافت وہ ہے جو تجھے عطا کی۔ تیرے لئے اس کو اس نے چنا ہے اور اس کے لئے تجھے اس نے چنا ہے۔

لَکُمُ الدِّینُ، الدِّینُ سے مراد اسلام ہے۔ الدِّینُ پر الف، لام عہد کے لئے ہے کیونکہ وہ اس دین کو جانتے تھے۔ فَلَا تُمَوِّنُ إِلَّا دَانْتُمْ مُسْلِمُونَ اس میں ایجازِ بلیغ ہے۔ اس کا معنی ہے اسلام کو لازم پکڑو اور اس پر دوام اختیار کرو اور اس سے جدا نہ ہو حتیٰ کہ تم فوت ہو جاؤ مختصر الفاظ ذکر فرمائے جن کے ضمن میں مقصود موجود ہو اور وعظ اور موت کی یاد بھی اس کے ضمن میں ہے۔ یہ اس لئے کہ ہر انسان کو یہ یقین ہے کہ وہ فوت ہوگا اور یہ نہیں جانتا کہ کب مرے گا۔ جب کسی کو کسی ایسے امر کا حکم دیا جائے کہ اسے موت نہ آئے مگر اسی امر پر تو خطاب امر کے وقت سے ہمیشہ کے لئے متوجہ ہوتا ہے (۲)۔ (لا نہیں ہے اور

تَمُوتُنَّ نَہی کی وجہ سے محل جزم میں ہے نون ثقیلہ کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے اور واو کو اتقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُونَ یہ مبتدا اور خبر محل حال میں ہیں یعنی تم اپنے رب پر اچھا گمان کرنے والے ہو۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: مخلصون (یعنی تم مخلص ہو)۔ بعض نے فرمایا: مفوضون (تم اپنا آپ اپنے رب کے سپرد کرنے والے ہو) بعض نے فرمایا: مومنون (تم ایمان لانے والے ہو)۔

اَمْرٌ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ ۚ اِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْۢ بَعْدِي ۖ قَالُوا نَعْبُدُ الْهَكَ وَالْهَآ اَبَا يَكْ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ الْهَآ وَاَحَدًا ۭ وَنَحْنُ لَهُۥ مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۱﴾

”بھلا کیا تم (اس وقت) موجود تھے جب آپ اپنی یعقوب کو موت۔ جب پوچھا اس نے اپنے بیٹوں سے کہ تم کس کی عبادت کرو گے میرے (انتقال کر جانے کے) بعد۔ انہوں نے عرض کی: ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے بزرگ ابراہیم و اسماعیل اور اسحق کے خدا کی جو خدائے وحدہ لا شریک ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْرٌ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ، شہد آء، کان کی خبر ہے غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں الف تانیث ہے اور یہ الف جمع کی تانیث کے لئے داخل ہوتی ہے جس طرح حاد داخل ہوتی ہے۔ خطاب، یہود و نصاریٰ کو ہے جو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت نہیں کی تھی اور وہ یہودیت اور نصرانیت پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کا رد فرمایا۔ یہ ارشاد تو بیخ کی جہت سے ہے: تم یعقوب کے پاس موجود تھے اور جو انہوں نے وصیت کی تھی تمہیں اس کا علم تھا جس کی بنا پر تم یہ دعویٰ کرتے ہو۔ یعنی تم اس وقت موجود نہ تھے بلکہ تم یہ جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ اور امر بمعنی ہل ہے۔ یعنی بلکہ کیا تمہارے اسلاف یعقوب کے پاس موجود تھے۔ پہلے اِذْ کا عامل شہادت کا معنی ہے اور دوسرا اِذْ پہلے کا بدل ہے شُہَدَآءَ، شاہد کی جمع ہے۔ جس کا معنی ہے حاضر اور حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ کا معنی ہے حضرت یعقوب پر موت کے مقدمات اور اسباب موجود تھے وگرنہ آگے موت آ جاتی تو اس کے لئے یہ کہنا ممکن نہ ہوتا۔ المعبود کو ما کے ساتھ تعبیر فرمایا۔ مَنْ نہیں فرمایا کیونکہ انہیں آزمانے کا ارادہ کیا تھا۔ اگر مَنْ فرماتے تو اس کا مقصود یہ ہوتا کہ آپ ان میں ہدایت یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کا مقصود ان کا تجربہ تھا آپ نے ماذکر فرمایا اللہ تعالیٰ کے علاوہ متعارف معبودان باطلہ جمادات تھے جیسے بت، آگ، سورج، اور پتھر پس آپ نے پوچھا کہ کس کی عبادت کرو گے؟ اور مَنْ بَعْدِي کا معنی ہے میرے وصال کے بعد۔ حکایت کیا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اختیار دیا گیا جس طرح انبیاء کو اختیار دیا جاتا ہے تو آپ نے موت کو اختیار فرمایا اور فرمایا: مجھے مہلت دو حتیٰ کہ میں اپنے بیٹوں اور اپنے گھروالوں کو وصیت کروں۔ آپ نے اپنے بیٹوں کو جمع فرمایا اور انہیں یہ فرمایا۔ پس وہ ہدایت یافتہ تھے انہوں نے کہا نَعْبُدُ الْهَكَ الْاٰیۃ اور بیٹوں نے دین پر اپنے ثبوت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت دکھائی (۱)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوا كَعْبِدُ الْهَكَ وَالْهَآبَا بِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ، ابرہیم، اسماعیل اور اسحاق یہ بدل کی حیثیت سے محل جرم میں ہیں یہ غیر منصرف ہیں کیونکہ یہ عجمی ہیں۔ کسائی نے کہا: اگر تو چاہے تو اسحاق کو منصرف بنا دے اور تو اسے السحق سے مشتق کرے اور یعقوب کو منصرف کرے اور تو اسے پرندوں سے بنائے۔

اللہ تعالیٰ نے چچا اور دادا تمام کو اباء سے تعبیر فرمایا اور دادا کا ذکر پہلے فرمایا پھر اسماعیل چچا کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ اسحاق سے بڑے تھے۔ اِلٰہَا یَہِ الْهَک سے بدل ہے اور یہ معرفہ سے نکرہ بدل ہے اس کو وحدانیت کی صفت کے فائدہ کے لئے اس کا تکرار فرمایا، بعض نے فرمایا اِلٰہَا حَال ہے۔ ابن عطیہ نے کہا یہ حسن کا قول ہے کیونکہ غرض وحدانیت کی حالت کا اثبات ہے۔ حسن یعمر، حمد ری اور ابور جاء عطار دی نے والہ ایبک پڑھا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں:

(۱) مفرد ذکر کیا اور مراد صر: حضرت ابرہیم ائے اور اسماعیل کو اب بنانا پسند نہ کیا کیونکہ وہ چچا تھے۔ ثناس نے کہا: یہ واجب نہیں ہے کیونکہ عرب چچا کو اب کہتے ہیں۔

(۲) سیبویہ کے مذہب کے مطابق ایبک جمع سالم ہوگی۔ سیبویہ نے اب کی جمع ابون اور ابین حکایت کی ہے۔ شاعر نے کہا:

فَقَلْنَا اسْلَمُوا اَنَا اِخْوٰکُمْ  
اس میں اصل اخون تھا اضافت کی وجہ سے نون گر گیا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا

فَلَمَّا تَبَيَّنَ اَصْوَاتُنَا بَكَيْنَ وَ فَدَيْنَا بِالْاَبِيْنَآ (۱)

اس میں ابین، اب کی جمع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ یہ مبتدا خبر ہیں۔ اور یہ حال ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ اس میں عامل نعبد ہے (۲)۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ؕ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَنْهَا کَاُنُوْا

یَعْمَلُوْنَ ﴿۳﴾

”یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی انہیں فائدہ دے گا جو (نیک عمل) انہوں نے کمایا اور تمہیں نفع دیں گے جو (نیک اعمال) تم نے کمائے اور نہ پوچھے جاؤ گے تم اس سے جو وہ کیا کرتے تھے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ، تِلْكَ مبتدا ہے اور اُمَّةٌ خبر ہے اور قَدْ خَلَتْ، اُمَّةٌ کی صفت ہے اگر تو چاہے تو قَدْ خَلَتْ کو خبر بنا دے اور اُمَّةٌ، تِلْكَ سے بدل ہوگا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ، مَا محل رفع میں ہے یا کو فیوں کے ایک قول کے مطابق صفت ہے وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ یہ لَهَا مَا كَسَبَتْ کی مثل ہے۔ خیر اور شر کا ارادہ فرمایا ہے (۳)۔ اس میں دلیل



ہے کہ اعمال اور اکساب کی نسبت بندے کی طرف کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر اسے قدرت دی ہے اگر وہ اچھے اعمال پر اچھی جزا دے تو یہ اس کا فضل ہوتا ہے اور برے اعمال پر سزا دے تو یہ اس کا عدل ہے۔ یہ اہل سنت کا مذہب ہے قرآن میں اس مفہوم کی آیات کثیر ہیں۔ بندہ اپنے افعال کا مکتب ہے اس معنی پر کہ فعل کے متصل اللہ تعالیٰ اس کے لئے قدرت پیدا فرما دیتا ہے اس کے ساتھ حرکت اختیاری اور حرکت رعبہ کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ یہی قدرت اور تکلیف کا مدار ہے۔ جبر یہ فرقہ نے بندے کے اکساب کی نفی کی ہے وہ کہتے ہیں: بندہ نبات کی طرح ہے ہوائیں اسے گردش دیتی رہتی ہیں قدریہ اور معتزلہ کا قول ان دونوں قولوں کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: بندہ اپنے افعال کا خالق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَسْأَلُونَنَا عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ یعنی کسی کے گناہ کی وجہ سے دوسرے سے مؤاخذہ نہ ہوگا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (انعام: 164) یعنی کوئی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۚ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ

الشُّرَکِيِّينَ ﴿١٣٠﴾

”اور (یہودی) کہتے ہیں یہودی بن جاؤ (عیسائی کہتے ہیں) عیسائی بن جاؤ (تب) ہدایت پالو گے۔ آپ فرمائیے

میرا دین تو دین ابراہیم ہے جو باطل سے منہ موڑنے والا حق پسند تھا اور وہ نہیں تھا شرک کرنے والوں سے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ہر فرقہ نے اس کی طرف بلایا جس پر وہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا، فرمایا: بَلْ مِلَّةَ یعنی اے محمد ﷺ تم کہو ہم ملت ابراہیم کی اتباع کریں گے اسی وجہ سے مِلَّةٌ کو نصب دی گئی ہے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے بل نہتدی بملۃ ابراہیم جب حرف جر حذف کیا گیا تو مِلَّةٌ منصوب ہو گیا اعرج اور ابن ابی عسلہ نے بل مِلَّةٌ رفع کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ تقدیر عبارت بل الہدی مِلَّةٌ یا ملتتا دین ابراہیم۔ (یعنی اللہ ہدایت تو ملت ابراہیمی ہے یا ہماری ملت دین ابراہیم ہے) حَنِيفًا تمام ناپسندیدہ دینوں سے انحراف کر کے دین حق، دین ابراہیم کی طرف مائل ہونے والا۔ یہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ زجاج نے کہا: یعنی بل نتبع مِلَّةَ ابراہیم فی ہذا الحالۃ یعنی اس حال میں ہم ملت ابراہیمی کی اتباع کرتے ہیں۔ علی بن سلیمان نے کہا: یہ اعنی کی بنا پر منصوب ہے اور حال بنانا خطا ہے۔ یہ جائز نہیں ہے: جاءنی غلام ہند مسرعة۔ حضرت ابراہیم کو حنیف کہا گیا کیونکہ وہ اللہ کے دین اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے۔ الحنف کا معنی مائل ہونا ہے۔ اسی سے ہے رجل حنفاء، رجل حنف۔ یہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے قدموں میں سے ہر ایک دوسرے کی طرف انگلیوں کے ذریعے مائل ہوتا ہے۔

ام الاحنف نے کہا:

والله لولا حنف برجله ما كان لي فتیانکم من مثله

اللہ کی قسم! اگر اس کے پاؤں میں میلان نہ ہوتا تو تمہارے بچوں میں اس کی مثل نہ ہوتا۔  
شاعر نے کہا:

اذا حول الظل العشى رأيتُه حنيفاً د في قرن الضحى يتنصرُ  
الحرباء سورج ڈھلنے کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرتی ہے اور صبح کے وقت مشرق کی طرف منہ کرتی ہے۔ یہ نصاریٰ کا قبلہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الحنف کا معنی استقامت ہے۔ دین ابراہیم کو اس کی استقامت کی وجہ سے حنیف کہا جاتا ہے۔ نیز صی مانگوں والے کو استقامت سے قال پکڑتے ہوئے اخف کہا جاتا ہے جس طرح سانپ کے ڈسے ہوئے کو سلیم کہا جاتا ہے اور ہلاکت کی جگہ کو مفازۃ کہا جاتا ہے۔ یہ اکثر کا قول ہے۔

قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرٰهٖمَ وَ إِسْحٰقَ  
وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا  
نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٥١﴾

”کہہ دو ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا ہماری طرف اور جو اتارا گیا ابراہیم و اسماعیل و اسحق و یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اور جو عطا کیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو عنایت کیا گیا دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم فرق نہیں کرتے ان میں سے کسی پر ایمان لانے میں اور ہم تو اللہ کے فرماں بردار ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: اہل کتاب عبرانی زبان میں تورات پڑھتے تھے اور اہل اسلام کے لئے عربی میں تفسیر بیان کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو بلکہ تم کہو: ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو نازل کیا گیا (1)۔ محمد بن سیرین نے کہا: جب تجھے کہا جائے تو مومن ہے؟ تو تو کہہ: آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرٰهٖمَ وَ إِسْحٰقَ وَالْأَسْبَاطِ۔

اکثر سلف نے کسی کے لئے یہ کہنا ناپسند کیا: اَنَا مُؤْمِنٌ حَقًّا میں یقیناً مومن ہوں (2)۔ اس کا بیان سورۃ الانفال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ حقد میں سے کسی سے پوچھا گیا: کسی شخص سے پوچھا جائے کیا تو فلاں نبی پر ایمان لاتا ہے، اس نے اس نبی کا نام لیا جسے وہ شخص جانتا نہیں تھا۔ اب اگر وہ ہاں کہہ دے ہو سکتا ہے وہ نبی نہ ہو، تو وہ غیر نبی کی نبوت کی شہادت دینے والا ہوگا اور اگر وہ نہیں کہہ دے تو ہو سکتا ہے وہ نبی ہو تو وہ ایک نبی کا انکار کرنے والا ہوگا۔ اب وہ شخص کیا کرے؟ اس عالم نے فرمایا: اسے یوں کہنا چاہئے کہ اگر وہ نبی تھا تو میں اس پر ایمان لایا۔ اس آیت میں خطاب اس امت کو ہے جنہیں ایمان سکھایا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہود کا ایک گروہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور سوال کیا کہ انبیاء میں سے کس پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قول اللہ تعالیٰ قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ، حدیث 4125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ یہ قول محل نظر ہے کیونکہ شرح عقائد نفسی میں ہے جب بندے سے تصدیق اور اقرار پایا جائے تو اس کے لئے یہ کہنا صحیح ہے اَنَا مُؤْمِنٌ حَقًّا

ایمان لایا جائے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا ہم حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر اور جو اس پر ایمان لایا اس پر ایمان نہیں لاتے (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ اِلَىٰ اٰبِهٖمْ وَاسْمٰعِيْلَ وَاسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ، ابراہیم کی جمع براہیم ہے۔ اسماعیل کی جمع اسماعیل ہے۔ یہ خلیل اور سیبویہ کا قول ہے۔ کوفیوں نے بھی یہی کہا ہے۔ انہوں نے براہیمہ اور سماعلہ جمع بھی حکایت کی ہے اور انہوں نے براہیم اور سماعل بھی حکایت کیا ہے۔ محمد بن زید نے کہا یہ غلط ہے کیونکہ ہمزہ زیادت کی جگہ نہیں ہے لیکن میں کہتا ہوں: اُپارہ اور اسماع جمع ہے اور اباریہ و اسماع جمع بھی جائز ہے۔ احمد بن یحییٰ نے براہ کو جائز قرار دیا ہے جیسے تصغیر میں کہا جاتا ہے بُریہ۔ اسحاق کی جمع اسحاق ہے۔ کوفیوں نے اسحاقہ اور اسحاق جمع بھی حکایت کیا ہے۔ اسی طرح یعقوب کی جمع یعاقیب و یعاقبہ و یعاقب حکایت کی ہے۔ نحاس نے کہا: رہا اسرائیل۔ ہم کوئی ایسا عالم نہیں جانتے جس نے اس کی ابتدا سے ہمزہ حذف کیا ہو۔ کہا جاتا ہے اساریل۔ کوفیوں نے اسارلہ اور اسارل حکایت کیا ہے ان تمام میں جمع سالم بنائی جائے اور کہا جائے: ابراہیمون، اسحاقون، یعقوبون اور جمع سالم میں عمل نہیں ہے۔

الْاَسْبَاطُ سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے، آپ کے بارہ بیٹے تھے، ان میں سے ہر ایک کی بہت سی اولاد تھی، اس میں سے ہر ایک سبط تھا۔ بنی اسرائیل میں سبط حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے قبیلہ کے قائم مقام تھا ان کو الْاَسْبَاطُ کہا جاتا تھا۔ یہ سبط سے ہے جس کا معنی ہے درپے ہونا وہ جماعت جو ایک دوسرے کی متابعت کرے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل السَّبَطُ سے ہے۔ اس سے مراد درخت ہے یعنی وہ کثرت میں درخت کے قائم مقام تھے۔ اس کا مفرد سبطہ ہے۔ ابواحق زجاج نے کہا: تیرے اس چیز کو یہ سند بیان کرتی ہو، جو ہمیں محمد بن جعفر انباری نے بیان کی، فرمایا: ہمیں ابونجید الدقاق نے بیان کی فرمایا: ہمیں اسود بن عامر نے بیان کیا۔ فرمایا: ہمیں اسرائیل نے بیان کیا انہوں نے ساک سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا، فرمایا: تمام انبیاء بنی اسرائیل سے تھے سوائے دس کے۔ حضرت نوح، حضرت شعیب، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت اسماعیل اور حضرت محمد ﷺ اور کسی کے دو نام نہ تھے سوائے حضرت عیسیٰ اور حضرت یعقوب کے۔ السبط کا مطلب جماعت اور قبیلہ ہے۔ ایک اصل کی طرف لوٹنے والے۔ شعر سَبَطٌ وَسَبَطٌ۔ سیدھے بال جو گھٹھریا لے نہ ہوں لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْهُمْ۔ فراء نے کہا: اس کا مطلب ہے: ہم بعض پر ایمان نہیں لاتے اور نہ بعض کا انکار کرتے ہیں جیسے یہود و نصاریٰ نے کیا ہے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِوَسْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدْ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقِ ۚ  
فَسَيَكْفِيْهُمْ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۷۶﴾



”تو اگر یہ بھی ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تب تو ہدایت پائیں گے اور اگر وہ منہ پھیریں تو (معلوم ہو گیا کہ) وہی مخالفت پر کمر بستہ ہیں۔ تو کافی ہو جائے گا آپ کو ان کے مقابلے میں اللہ اور وہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا** یہ خطاب حضرت محمد ﷺ اور آپ کی امت کو ہے۔ اس کا معنی ہے: اگر وہ ایمان لائیں تمہارے ایمان کی مثل اور تصدیق کریں تمہاری تصدیق کی طرح تو وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ دونوں ایمانوں کے درمیان مماثلت ہے۔ بعض نے فرمایا: باء زائدہ مؤکدہ ہے۔ ابن عباس اس طرح پڑھتے تھے جس طرح طبری نے حکایت کیا ہے۔ **فَإِنْ آمَنُوا بِالذِّیْ آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا**۔ یہ قراءت کا معنی ہے اگرچہ مصحف کے مخالف ہے۔ مثل کا لفظ زائدہ ہے جیسے اس قول میں ہے: **لَیْسَ کَوْثِلِهِمْ شِئٌ** (الشوریٰ: 11) (یعنی لیس کھوشی) میں مثل زائدہ ہے (1)۔ شاعر نے کہا:

فَصِيدُوا مِثْلَ كَعَصِفٍ مَّاكُولٍ

اس مصرعہ میں بھی مثل زائدہ ہے۔

بقیہ نے روایت کیا ہے کہ ہمیں شعبہ نے ابو حمزہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: تم یہ نہ کہو: **فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ**۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مثال نہیں ہے بلکہ تم کہو: بالذی آمنتم بہ (2)۔ علی بن نصر جہضمی نے شعبہ سے روایت کرنے میں بقیہ کی متابعت کی ہے۔ یہ بیہقی نے ذکر کیا ہے۔ معنی یہ ہے: اگر وہ تمہارے نبی پر اور تمام انبیاء پر ایمان لائیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں جس طرح تم نے تفریق نہیں کی تو وہ ہدایت پائیں گے اگر وہ اس کا انکار کریں سوائے تفریق کے وہ دین سے منہ پھیر کر شقاق کی طرف جانے والے ہیں **فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ** اہل نظر میں سے ایک جماعت نے حکایت کیا ہے۔ فرمایا **لَیْسَ کَوْثِلِهِمْ شِئٌ** (الشوریٰ: 11) میں کاف زائدہ ہے۔ فرمایا: اور حضرت ابن عباس سے جو قراءت عامہ سے نہیں مذکور ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تشبیہ کی نفی میں مبالغہ کے لئے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ حضرت ابن عباس سے تفسیر کے طور پر ہے یعنی اس طرح تاویل کرنی چاہئے۔

بعض نے فرمایا: مثل اپنے معنی پر ہے یعنی نازل شدہ کی مثل اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: **وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ** اور یہ ارشاد ہے: **وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ** (العنکبوت: 46) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِنْ تَوَلَّوْا يَكُنْ لَكُمْ فُتْرًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ** (وہ مخالفت پر کمر بستہ ہیں) زید بن اسلم نے فرمایا شقاق کا معنی جھگڑا ہے۔ بعض نے فرمایا: شقاق کا معنی جھگڑا کرنا ہے، مخالفت کرنا اور دشمنی کرنا ہے۔ اس کی اصل الشق سے ہے جس کا معنی جانب ہے۔ گویا ہر فریق اپنے مخالف کی دوسری شق (طرف) میں ہوتا ہے (3)۔ شاعر نے کہا:

2- تفسیر طبری، صفحہ 659، جلد 1 (دار احیاء التراث العربی)

1- تفسیر المیزان، صفحہ 163، جلد 1 (دار الفکر)

3- المحرر الوجیز فی آیات ہذا

الی کم تقتل العلماء قسراً و تفجر بالشقاق و بالنفاق  
ایک اور شاعر نے کہا:

و الا فاعلموا انا و اتم بغاۃ ما بقینا فی شقاق  
بعض نے فرمایا: شقاق، مشکل کام سے ماخوذ ہے، دونوں فریقوں میں سے ہر فریق دوسرے پر مشکل پیدا کرنے کا  
حریص ہوتا ہے۔ (1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی طرف سے اس کے دشمن کو کافی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا  
اپنے نبی سے وعدہ ہے کہ وہ ہر معاند و مخالف کی طرف سے مومنین کے ذریعے کفایت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا  
فرمایا۔ یہ بنی قینقاع، بنی قریظہ کے قتل اور بنی نضیر کی جلاوطنی میں پورا ہوا (2)۔ کاف، ہا، میم محل نصب میں، دونوں مفعول ہیں،  
اور غیر قرآن میں فسیکفیک ایاہم بھی جائز ہے۔ اس حرف فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون گرا تھا جب  
شہید ہوئے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شہادت کی خبر دی تھی۔ السَّيِّئُ وہ کہنے والے کی بات کو سننے والا ہے الْعَلِيمُ  
اپنے بندوں میں جو نافذ کرتا ہے اور ان پر جاری کرتا ہے، حکایت ہے کہ ابودلامہ، منصور کے پاس گیا، اس کے اوپر ایک لمبی  
ٹوپی تھی اور ان کے کندھوں کے درمیان جبہ کے اوپر فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّيِّئُ الْعَلِيمُ لکھا ہوا تھا اور اس کی کمر میں  
تلوار لٹک رہی تھی۔ منصور نے لشکر کو اس لباس کا حکم دیا تھا۔ منصور نے کہا: اے ابودلامہ تیرا کیا حال ہے؟ ابودلامہ نے کہا  
اے امیر المومنین! بری حالت ہے۔ اس نے کہا: یہ کیسے؟ اس نے کہا: تیرا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جس کا چہرہ  
اس کے وسط میں ہو، جس کی تلوار اس کی سرین میں ہو اور کتاب اللہ کو پیٹھ کے پیچھے ڈالا ہوا ہو..... منصور اس پر ہنسا اور اس لباس  
کو اسی وقت تبدیل کرنے کا حکم دیا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَبِيدُونَ ﴿٣٨﴾

”(ہم پر) اللہ کا رنگ (چڑھا ہے) اور کس کا رنگ خوبصورت ہے اللہ کے رنگ سے۔ ہم تو اسی کے عبادت  
گزار ہیں۔“

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ اخفش وغیرہ نے کہا: اس سے مراد اللہ کا دین ہے یہ ملت سے بدل  
ہے۔ کسائی نے کہا: یہ اتبعوا کی تقدیر پر منصوب ہے یا اغراء کی بناء پر منصوب ہے یعنی الزموا صبغة اللہ۔ اللہ کے دین کو  
لازم پکڑو۔ اگر اسے مرفوع پڑھا جائے تب بھی جائز ہے۔ یعنی صِبْغَةَ اللّٰهِ۔ شیبان نے قتادہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا:  
یہود اپنے بیٹوں کو یہودا رنگ کرتے تھے اور نصاریٰ اپنے بیٹوں کو نصاریٰ رنگ چڑھاتے تھے۔ اور اللہ کا رنگ اسلام  
ہے (3)۔ زجاج نے کہا: یہ دلیل ہے کہ صبغة، ملت سے بدل ہے۔

1- تفسیر طبری زیر آیت 1

2- المحرر الوجیز زیر آیت 1

3- تفسیر طبری، صفحہ 660، جلد 1 (دار احیاء التراث العربی)

مجاہد نے کہا: اس سے مراد فطرۃ اللہ التي فطر الناس علیہا۔ ابو احق نے کہا: مجاہد کا یہ قول اسلام کی طرف راجع ہے کیونکہ فطرۃ، مخلوق کی ابتدا ہے، اور جس پر وہ ابتدا پیدا کئے گئے ہیں وہ اسلام ہے۔ مجاہد، حسن، ابو العالیہ اور قتادہ سے مروی ہے کہ الصبغة سے مراد دین ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ نصاریٰ اپنے بچوں کو پانی میں رنگتے تھے اسے وہ معمور یہ کہتے تھے اور کہتے: یہ ان کے لئے تطہیر ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نصاریٰ کا جب کوئی بچہ پیدا ہوتا اور اس پر سات دن گزر جاتے تو وہ اسے پانی میں داخل کرتے جسے وہ اس کے لئے معمور یہ کا پانی کہتے تھے وہ اس پانی میں بچے کو رنگتے تاکہ اس کے ساتھ اس کے ختنہ کی جگہ کو پاک کریں کیونکہ ختنہ کرنا تطہیر ہے۔ جب وہ ایسا کر دیتے تو کہتے اب یہ پکا نصرانی ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا اس پر رد فرمایا۔

ارشاد ہوا: صِبْغَةُ اللّٰهِ یعنی اللہ کا رنگ بہتر رنگ ہے اور وہ اسلام ہے۔ دین کو استعارۃ اور مجازاً صِبْغَةُ کہا گیا ہے کیونکہ اس کے اعمال ظاہر ہوتے ہیں اور دیندار پر اس کی نشانی واضح ہوتی ہے جس طرح کپڑے پر رنگ کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ بعض شعراء ملوک ہمدان نے کہا:

و کل أناس لهم صبغة و صبغة همدان خير الصبغ

صبغنا علی ذاک ابتناءنا فاکرم بصبغتنا فی الصبغ

تمام لوگوں کا اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے اور ہمدان کا رنگ بہتر رنگ ہے۔ ہم نے اس پر اپنے بیٹوں کو رنگ کیا اور رنگوں میں کتنا بہتر ہمارا رنگ ہے۔

بعض نے فرمایا: الصبغة سے مراد غسل کرنا ہے اس کے لئے جو اسلام میں داخل ہونے کا ارادہ کرے۔ نصاریٰ کے معمور یہ کا یہ بدل ہے۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس تاویل پر کافر کا غسل کرنا واجب ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 2:** صِبْغَةُ اللّٰهِ کا معنی ہے: تم اسلام قبول کرنے کے وقت وہ غسل کرو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر واجب کیا ہے۔ اس معنی میں قیس بن عاصم اور ثمامہ بن اثال کی احادیث بھی آئی ہیں جب انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ ابو حاتم سبکی نے اپنی مسند صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ ثمامہ حنفی کو قید کیا گیا تو نبی کریم ﷺ ایک دن اس کے پاس سے گزرے تو اس نے اسلام قبول کیا۔ اسے رسول اللہ ﷺ نے ابوطحہ کے باغ کی طرف بھیجا اور اسے غسل کا حکم دیا۔ پس اس نے غسل کیا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے ساتھی کا اسلام خوب صورت ہے (1)۔

حضرت قیس بن عاصم سے مروی ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کیا تو نبی کریم ﷺ نے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل کرنے کا حکم دیا (2)۔ یہ حدیث نسائی نے ذکر کی ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ کی قربت

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الطہارت، باب الکافر یمیتقل، صفحہ 171، جلد 1 (دار الفکر)

2۔ سنن نسائی، کتاب الطہارت، ذکر ما یوجب الغسل وما لا یوجبہ، حدیث نمبر 188، منیاء القرآن پبلی کیشنز



کو صبغہ کہا جاتا ہے۔ ابن فارس نے ”المجمل“ میں یہ حکایت کیا ہے۔ جوہری نے کہا: صبغة الله سے مراد اللہ کا دین ہے۔ بعض نے فرمایا: صبغة سے مراد ختنہ کرنا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تو ختنہ پر صبغہ جاری ہوا کیونکہ بچوں کو پانی میں رنگا جاتا تھا۔ یہ قراء کا قول ہے: وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ یہ مبتدا خبر ہیں۔

قُلْ أَتُحَايُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ﴿١٧﴾

”آپ فرمائیے کیا تم جھگڑے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک، اور ہمیں ہمارے اعمال اور تمہیں تمہارے اعمال فائدہ پہنچائیں گے ہم تو اسی کی اخلاص سے عبادت کرتے ہیں۔“

حسن نے کہا: ان کا جھگڑنا یہ تھا کہ انہوں نے کہا: ہم تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے قریبی ہیں کیونکہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا ہم تم سے زیادہ اللہ کے قریبی ہیں کیونکہ ہمارے آباء اور ہماری کتب مقدم ہیں۔ اور اس لئے کہ ہم نے بتوں کی عبادت نہیں کی۔ آیت کا معنی یہ ہے: اے محمد! ﷺ ان سے کہو: یعنی ان یہود و نصاریٰ کو کہو جو یہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ تم سے اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریبی ہیں اپنے آباء اور اپنی کتب کے مقدم ہونے کی وجہ سے، اس میں دین کی تقدیم کی کیا تاثیر ہے (1)۔ فی اللہ کا معنی ہے: اللہ کے دین میں، اس کے قرب میں۔ اکثر قراء کی قراءت اتحا جونا ہے ایک جنس کے دو متحرک حروف کا اجتماع جائز ہے۔ کیونکہ دوسرا حرف منفصل کی طرح ہے۔ ابن محیسن نے اتحا جونا ایک جیسے حروف کے اجتماع کو ادغام کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ جائز ہے لیکن اکثر علماء کے قول کے مخالف ہے۔ اتحا جونا دوسرے نون کے حذف کے ساتھ بھی جائز ہے جس طرح نافع نے فہم تبشاد ن پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ یعنی عبادت میں مخلص ہیں۔ اس میں توبخ کا معنی ہے یعنی تم مخلص نہیں ہو پھر تم کیسے دعویٰ کرتے ہو کہ ہم تم سے زیادہ اللہ کے قریبی ہیں۔ اخلاص کا معنی ہے مخلوق کے ملاحظہ سے فعل کو پاک اور صاف کرنا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں بہتر شریک ہوں۔ پس جس نے میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا (کسی عمل میں) تو وہ عمل میرے شریک کے لئے ہے۔ اے لوگو! اپنے اعمال خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کرو۔ اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا مگر وہ جو اس کے لئے خالص ہو، اور یہ نہ کہو کہ یہ اللہ کے لئے ہے اور رحم کے لئے ہے۔ پس وہ رحم (صلہ رحمی) کے لئے ہے اس میں سے اللہ کے لئے کچھ نہیں ہے اور یہ نہ کہو: یہ اللہ کے لئے اور تمہارے مونہوں کے لئے ہے۔ وہ تمہارے مونہوں کے لئے ہے، اس میں سے اللہ کے لئے کچھ نہیں ہے (2)۔ یہ حضرت ضحاک بن قیس الغمری نے روایت کی ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا..... آگے یہ حدیث ذکر کی ہے۔ اس کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ رویم نے کہا: اخلاص یہ ہے

کہ آدمی اس عمل پر دارین میں عوض نہ چاہتا ہو نہ فرشتوں سے کوئی حصہ چاہتا ہو۔

جنید نے کہا: اخلاص بندے اور اللہ کے درمیان راز ہے جسے فرشتہ بھی نہیں جانتا کہ وہ اسے لکھ لے..... اور نہ شیطان جانتا ہے کہ وہ اسے خراب کر دے۔ اور نہ خواہش جانتی ہے کہ وہ اسے مائل کر دے۔ ابوالقاسم قشیری وغیرہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے جبریل امین سے پوچھا: اخلاص کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نے اللہ رب العزت سے اخلاص کے متعلق پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ میرے رازوں میں سے ایک راز ہے میں اسے اپنے بندوں میں سے اس کے دل میں رکھتا ہوں جسے میں پسند کرتا ہوں (1)۔

أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ  
نَصْرًا قُلْ أَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمْرًا اللَّهُ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَ اللَّهِ مِنَ اللَّهِ  
وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

”کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی تھے یا عیسائی۔ فرمائیے: کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو چھپاتا ہے گواہی جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے اور اللہ بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَمْ تَقُولُونَ یہ بمعنی قالوا ہے۔ حمزہ، کسائی اور عاصم نے اور ایک روایت میں حفص نے تقولون تاء کے ساتھ پڑھا ہے یہ عمدہ قراءت ہے کیونکہ کلام مفصل ہے۔ گویا معنی ہے: کیا تم اللہ کے دین کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو یا تم کہتے ہو انبیاء کرام تمہارے دین پر تھے۔ یہ ام متصل ہے اور جنہوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی قراءت پر ام منقطعہ ہے، پس یہ دو کلام ہوں گے۔ اور ام بمعنی بل ہوگا۔

هُودًا یہ کان کی خبر ہے اور ان کی خبر جملہ میں ہے اور غیر قرآن میں هُودًا کو رفع ان کی خبر کی حیثیت سے جائز ہے اور کان ملغہ ہوگا۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ أَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمْرًا اللَّهُ یہ تقریر اور ان کے دعویٰ پر توخیج ہے کیونکہ وہ یہود یا نصاریٰ تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ وہ انہیں تم سے زیادہ جانتا ہے یعنی تم یہود و نصاریٰ نہ تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ أَظْلَمُ یہ لفظ استفہام ہے اور معنی ہے زیادہ ظالم نہیں ہے۔ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً مطلب یہ ہے کہ یہ جانتے تھے کہ انبیاء کرام اسلام پر تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو انہوں نے حضرت محمد ﷺ کی صفت سے چھپایا تھا۔ یہ قنادہ کا قول ہے۔

سیاق کلام کے اعتبار سے پہلا معنی زیادہ درست ہے۔ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ یہ وعید ہے اور آگاہ کرنا ہے کہ اس

کا معاملہ اللہ تعالیٰ رائیگاں نہیں چھوڑے گا بلکہ انہیں ان کے اعمال پر جزا دے گا۔ غافل وہ ہوتا ہے جو امور کو جانتا نہیں ہے ان سے غفلت کی وجہ سے۔ یہ الارض الغفل سے ماخوذ ہے۔ یہ وہ زمین ہوتی ہے جس میں کوئی علامت نہیں ہوتی اور عمارت کا کوئی اثر نہیں ہوتا (1)۔ ناقۃ غفل ایسی اونٹنی جس کی علامت نہ ہو۔ رجل غفل جو امور کا تجربہ نہ رکھتا ہو۔ کسائی نے کہا: ارض غفل، جس پر بارش نہ ہو۔ غفلت عن الشئ غفلة وغفلاً و اغفلت الشئ۔ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣١﴾

”وہ ایک امت تھی جو گزر چکی اسے ملے گا جو اس نے کمایا اور تمہیں ملے گا جو تم نے کمایا۔ اور تم سے نہ پوچھا جائے گا اس سے جو وہ کیا کرتے تھے۔“

اس آیت کو دوبارہ ذکر فرمایا کیونکہ یہ تہدید و تحویف کا معنی ضمن میں لئے ہوئے ہے یعنی جب یہ انبیاء اپنی امامت اور فضل کے باوجود اپنے کسب کی جزا پائیں گے تو تم اس کے زیادہ لائق ہو۔ پس تاکید واجب تھی اس لئے اس کا تکرار فرمایا (2)۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَهُمْ عَن قِبَلِهِمُ الَّذِينَ كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلَّهِ الشَّرِيقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿١٣٢﴾

”اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا ان (مسلمانوں) کو اپنے قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے۔ آپ فرمائیے: اللہ ہی کا ہے مشرق بھی اور مغرب بھی۔ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف۔“

اس آیت میں گیارہ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ مومنین کے شام سے کعبہ کی طرف پھرنے میں وہ کہیں گے کہ انہیں کس چیز نے پھیرا ہے (3)۔ اور سَيَقُولُ بمعنی قال ہے اور ماضی کی جگہ مضارع کو رکھتا کہ اس کی ہمیشگی پر دلالت کرے اور وہ اس قول پر ہمیشہ رہیں گے۔ ومن الناس کے ساتھ خاص فرمایا کیونکہ بے وقوف جمادات و حیوانات میں بھی ہوتے ہیں اور السفہاء سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے ما ولاہم کہا۔ السفہاء جمع ہے اس کا واحد سفیہ ہے جس کی عقل کم ہو۔ یہ عربوں کے اس قول سے ہے ثوب سفیہ جب کپڑا کمزور بنا ہوا ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور النساء سفائہ استعمال ہوتا ہے۔ المورج نے کہا: السفیہ وہ ہوتا ہے جو بہت زیادہ بہتان لگانے والا ہو، جھوٹ بولنے والا ہو اور اپنے علم کے خلاف کا ارادہ کرنے والا ہو۔ قطرب نے کہا: السفیہ سے مراد بہت زیادہ ظلم کرنے والا، جاہل ہے۔ السفہاء سے مراد یہاں مدینہ طیبہ کے یہود ہیں۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ سدی نے کہا منافقون ہیں۔ زجاج نے کہا: قریش کے کفار ہیں جب انہوں نے تحویل قبلہ کا انکار کیا تو کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیدائش کی جگہ کا اشتیاق رکھتا



ہے۔ عن قریب تمہارے دین کی طرف لوٹ آئے گا، یہود نے کہا: اس پر معاملہ ملتبس ہو گیا ہے اور یہ حیران ہے۔ منافقوں نے کہا: مَا وَلَهُمْ عَنْ قِبَلَتِهِمْ اور مسلمانوں سے استہزاء کیا۔ وَلَهُمْ کا معنی ہے: انہیں پھیر دیا۔

**مسئلہ نمبر 2:** ائمہ نے روایت کیا ہے اور یہ لفظ امام مالک کے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے لوگ صبح کی نماز میں قباء میں تھے اچانک ایک آنے والا آیا اور کہا: رسول اللہ ﷺ پر آج رات قرآن نازل ہوا ہے اور انہیں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس تم کعبہ کی طرف منہ کر لو۔ ان صحابہ کے چہرے پہلے شام کی طرف تھے تو وہ کعبہ کی طرف پھر گئے (1)۔ امام بخاری نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سولہ ماہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی اور آپ پسند فرماتے تھے کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ ہو۔ آپ ﷺ نے پہلی نماز جو کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھی وہ عصر کی نماز تھی اور صحابہ کرام نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی پھر جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تھی ان میں ایک کسی اور مسجد والوں کے پاس سے گزرا جبکہ وہ رکوع میں تھے تو اس نے کہا: میں اللہ کی گواہی دیتا ہوں میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے تو وہ صحابہ اسی حالت میں بیت اللہ کی طرف گھوم گئے اور جو تحویل قبلہ سے پہلے فوت ہو گئے تھے اور شہید ہو گئے تھے ہم نہیں جانتے کہ ان کے بارے میں کیا کہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی وَمَا كَانَ لِلَّهِ لِيُضَيِّعَ آيَاتِنَا لَكُمْ (البقرہ: 143) (2) اس روایت میں نماز عصر کا ذکر ہے۔

امام مالک کی روایت میں صبح کی نماز کا ذکر ہے، بعض علماء نے فرمایا: نبی کریم ﷺ پر تحویل قبلہ کا حکم بنی سلمہ کی مسجد میں نازل ہوا تھا جبکہ آپ ظہر کی نماز میں دو رکعت پڑھ چکے تھے تو آپ نماز میں ہی پھر گئے تھے اس مسجد کو مسجد قبلتین کہا جاتا ہے (3)۔ ابو الفرج نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عباد بن نہیک نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ یہ نماز پڑھی تھی۔ ابو عمر نے ”التمہید“ میں حضرت نوبلہ بنت اسلم رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور یہ مبايعات (بیعت کرنے والیوں) میں سے تھیں فرماتی ہیں: ہم ظہر کی نماز میں تھے۔ عباد بن بشر بن قنیطی آیا اور کہا: رسول اللہ ﷺ نے قبلہ کی طرف منہ کر لیا ہے یا کہا: بیت حرام کی طرف منہ کر لیا ہے۔ پس مرد عورتوں کی جگہ پھر گئے اور عورتیں، مردوں کی جگہ پھر گئیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت نماز کے علاوہ حالت میں نازل ہوئی۔ یہ اکثر کا قول ہے۔ کعبہ کی طرف پہلی نماز، نماز عصر پڑھی گئی۔ واللہ اعلم

روایت ہے کہ جب قبلہ کی تحویل ہوئی تو پہلی نماز جس نے کعبہ کی طرف پڑھی وہ ابوسعید بن معلی تھے۔ حضرت ابوسعید مسجد سے گزر رہے تھے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپ منبر پر لوگوں کو تحویل قبلہ کے بارے میں خطبہ دے رہے تھے اور آپ یہ آیت تلاوت کر رہے تھے: قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ (البقرہ: 144) حتیٰ کہ آپ آیت سے فارغ ہوئے تو میں (ابوسعید) نے اپنے ساتھی سے کہا: آؤ ہم رسول اللہ ﷺ کے منبر سے اترنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لیں۔ پس ہم پہلے کعبہ

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب القبلة، باب ما جاء في القبلة، صفحہ 182 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قول الله تعالى سيقول السفهاء من الناس، حدیث 4126، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ معالم التنزیل، صفحہ 172، جلد 1 (دار الفکر)

کی طرف نماز پڑھنے والے ہوں گے۔ پس ہم نے جانوروں کو چھپا دیا اور ہم نے دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ اترے اور اس دن آپ نے لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائی۔ ابو عمر نے کہا ابو سعید بن معلی کے لئے اس حدیث کے علاوہ کوئی حدیث نہیں ہے حالانکہ سورہ فاتحہ کی فضیلت میں کنت اصلی والی حدیث موجود ہے (1) جو بخاری نے نقل کی ہے، یہ پہلے گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** مدینہ طیبہ تشریف لانے کے کتنے عرصہ بعد تحویل قبلہ ہوا؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: سولہ ماہ بعد یا سترہ ماہ بعد قبلہ تبدیل ہوا (2)۔ جیسا کہ بخاری میں ہے۔ دارقطنی نے بھی یہ حدیث حضرت براء سے نقل کی ہے۔ فرمایا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے مدینہ طیبہ آنے کے بعد سولہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی خواہش دیکھی تو یہ آیت نازل ہوئی: قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ (البقرہ: 144) (3) اس روایت میں بغیر شک کے سولہ ماہ کا ذکر ہے۔ مالک نے یحییٰ بن سعید عن سعید بن مسیب کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ تحویل قبلہ غزوہ بدر سے دو ماہ پہلے ہوا تھا۔ ابراہیم بن اسحاق نے کہا ہجرت کے دوسرے سال رجب میں قبلہ کی تبدیلی ہوئی تھی۔ ابو حاتم سبکی نے کہا: مسلمانوں نے بیت المقدس کی طرف سترہ ماہ اور تین دن متواتر نماز پڑھی۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ آپ ﷺ مدینہ طیبہ بارہ ربیع الاول کو آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے استقبال کعبہ کا حکم منگل کے دن پندرہ شعبان کو دیا تھا

**مسئلہ نمبر 4:** علماء کا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی کیفیت میں تین مختلف اقوال ہیں:

۱۔ حسن نے کہا کہ یہ رائے اور اجتہاد سے تھا۔ عکرمہ اور ابو العالیہ کا یہ قول ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کو بیت المقدس اور کعبہ کے درمیان اختیار دیا گیا تھا تو آپ نے یہود کے ایمان لانے اور ان کے مائل کرنے کے لئے بیت المقدس کو اختیار فرمایا۔ یہ طبری کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: مشرکین کی آزمائش کے لئے بیت المقدس کی طرف منہ کیا کیونکہ وہ کعبہ سے الفت رکھتے تھے۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے، یہ جمہور کا قول ہے اور حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کی وحی کے ساتھ بیت المقدس کی طرف منہ کیا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ کر دیا اور کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اور جمہور نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ الْآيَةُ (اور نہیں مقرر کیا ہم نے بیت المقدس کو قبلہ جس پر آپ (اب تک) رہے مگر اس لئے کہ ہم دیکھ لیں کہ کون پیروی کرتا ہے (ہمارے) رسول کی (اور) کون مڑتا ہے الٹے پاؤں)۔

**مسئلہ نمبر 5:** اس میں اختلاف ہے کہ جب ابتدا میں نماز مکہ میں فرض ہوئی تو کیا بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا یا مکہ کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا؟ علماء کی ایک جماعت نے کہا: بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا اور مدینہ طیبہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب فضل الفاتحہ، حدیث نمبر 4114، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، کتاب التفسیر، ولکل وجهة مولیہا، حدیث نمبر 4132، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن دارقطنی، باب تعویل الی الکعبہ، صفحہ 273، جلد 1 (دار صادر)

میں بھی سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی طرف قبلہ پھیر دیا۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: ابتدا میں نماز کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھنا فرض کی گئی تھی آپ مکہ میں رہائش کے درمیان کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، جس پر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی نماز تھی۔

جب آپ مدینہ طیبہ آئے تو سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو کعبہ کی طرف پھیر دیا۔ ابو عمر نے کہا: یہ میرے نزدیک اصح قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ آئے تو آپ نے یہود کی الفت چاہی تو آپ ﷺ ان کے قبلہ کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ یہ چیز ان کو اسلام کی طرف بلانے کا باعث ہو جب ان کا عناد ظاہر ہوا اور آپ ان سے مایوس ہو گئے تو آپ نے کعبہ کی طرف پھرنا پسند کیا۔ آپ آسمان کی طرف دیکھتے تھے اور آپ کی محبت کعبہ کی طرف تھی کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا، یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ یہ عربوں کو اسلام کی طرف بلانے کا زیادہ باعث تھا۔ بعض نے فرمایا: اس میں یہود کی مخالفت تھی، یہ مہابد سے مروی ہے (1)۔ ابو العالیہ الریاحی سے مروی ہے، فرمایا: حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد اور ان کا قبلہ کعبہ تھا، فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کعبہ کی طرف صخرہ کی جانب نماز پڑھتے تھے (2) یہ تمام انبیاء کا قبلہ تھا۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

**مسئلہ نمبر 6:** اس آیت میں واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ناسخ و منسوخ ہیں۔ اس پر امت کا اجماع ہے مگر جس نے علیحدہ راہ اختیار کی۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ قبلہ اول قرآن سے منسوخ کیا گیا اور یہ دو مرتبہ منسوخ ہوا۔ ایک قول کے مطابق جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** یہ آیت قرآن کے ساتھ سنت کے منسوخ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، جبکہ یہ قرآن میں حکم نہیں تھا اور یہ حکم سنت کی جہت سے تھا پھر یہ قرآن کے ساتھ حکم منسوخ ہوا اور اس اعتبار سے کنت علیہا معنی انت علیہا ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 8:** اس میں خبر واحد کے ساتھ قطعی علم کے جواز پر دلیل ہے، کیونکہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنا صحابہ کے نزدیک قطعی تھا پھر اہل قباء کے پاس آنے والا آیا اور انہیں بتایا کہ قبلہ مسجد حرام کی طرف پھر گیا ہے، تو انہوں نے اس کا قول قبول کیا اور وہ کعبہ کی طرف پھر گئے پس خبر واحد کے ساتھ انہوں نے متواتر کو ترک کر دیا حالانکہ خبر واحد ظنی ہوتی ہے۔

علماء کا اس کے عقلاً جواز میں اور اس کے وقوع میں اختلاف ہے۔ ابو حاتم نے کہا: مختار اس کا عقلاً جواز ہے اگر اس کے ساتھ شرع مکلف کرے، اور رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں قباء کے قصہ کی دلیل کے ساتھ اس کا وقوع بھی ہوا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک شخص کو کسی علاقہ کا دالی بنا کر بھیجتے تھے اور وہ ناسخ و منسوخ کا حکم پہنچاتے تھے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد ممنوع ہے کیونکہ صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن اور متواتر معلوم، خبر واحد کے ساتھ نہیں اٹھایا جائے گا۔ سلف و خلف میں سے کوئی بھی اس کے جواز کا قائل نہیں ہے اور جو منع کرتے ہیں انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ یہ چیز



محال تک پہنچاتی ہے اور وہ ہے ظن کے ساتھ قطعی امر کو اٹھانا۔ رہا اہل قبا کا قصہ اور نبی کریم ﷺ کا والی بھیجنا وہ علم کے افادہ کے قرائن پر یا تو نقلاً اور تحقیقاً محمول ہے یا احتمالاً اور تقدیراً اس سوال و جواب کی مکمل تفصیل اصول فقہ میں موجود ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** اس میں دلیل ہے کہ جس کو ناخ نہ پہنچا ہو تو وہ پہلے حکم کا مکلف ہے، بخلاف اس کے جس نے کہا کہ پہلا حکم ناخ کے وجود کے ساتھ ساتھ اٹھ جاتا ہے نہ کہ علم کے ساتھ۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ اہل قبا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ آنے والا آیا اور اس نے انہیں ناخ کے متعلق بتایا تو وہ کعبہ کی طرف پھر گئے۔ پس ناخ کا وجود پایا گیا تو وہ لا محالہ اٹھانے والا ہے لیکن اس کے علم کی شرط کے ساتھ۔ لیکن ناخ خطاب ہے اور وہ اس کے حق میں خطاب نہیں ہوتا جسے خطاب نہ پہنچا ہو۔ اس اختلاف کا فائدہ عبادات میں ظاہر ہوتا ہے جو ناخ کے بعد ادا کی گئیں اور ناخ کے پہنچنے سے پہلے ادا کی گئیں، کیا ان کا اعادہ ہوگا یا نہیں؟ اسی پر مبنی ہے وکیل کے تصرف کا مسئلہ جو مؤکل کے معزول کرنے کے بعد تصرف کرتا ہے یا مؤکل کے مرنے کے بعد تصرف کرتا ہے یا اسے علم پہنچنے سے پہلے تصرف کرتا ہے۔ اس کے متعلق دو قول ہیں: اسی طرح مضارب کا مسئلہ ہے اور حاکم جس کو والی بنائے جب وہ مر جائے یا معزول کیا گیا ہو تو صحیح یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے ہر ایک کا فعل نافذ ہوگا اور اس کا حکم رد کیا جائے گا۔ قاضی عیاض نے کہا: اس شخص کے احکام میں کوئی اختلاف نہیں جس کو آزاد کیا گیا ہو اور اسے آزادی کا علم نہ ہو اس کے اور لوگوں کے درمیان احکام آزاد والے ہوں گے اور اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اس کے احکام جائز ہوں گے۔ اور اس میں اختلاف نہیں کہ آزادی گئی عورت آزادی کے بعد پڑھی گئی نماز جو اس نے بغیر ستر کے، آزادی کے علم سے پہلے پڑھی تھی اس کا اعادہ نہیں کرے گی۔ انہوں نے اختلاف کیا ہے اس شخص کے بارے میں جس پر کوئی ایسا موجب طاری ہو جو اس کی عبادت کے حکم کو تبدیل کر دے جب کہ وہ اس کی عبادت میں ہو، قبا کے مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے۔ پس جس نے ایک حال پر نماز پڑھی پھر نماز مکمل کرنے سے پہلے اس کی وہ حالت بدل گئی تو وہ اپنی نماز کو مکمل کرے اور توڑے نہیں اور اس کی پہلی نماز ہو چکی ہے۔ اسی طرح جس نے برہنہ نماز پڑھی پھر نماز کے اندر ہی اسے کپڑا مل گیا یا حالت صحت میں نماز شروع کی پھر وہ مریض ہو گیا یا مریض تھا پھر صحیح ہو گیا یا بیضا تھا پھر قیام پر قادر ہو گیا یا لونڈی نماز کے اندر ہی آزاد ہو گئی تو وہ اپنا پردہ لے لے اور سابقہ نماز پر بناء کرے۔

میں کہتا ہوں: جیسے کوئی تیمم کر کے نماز میں داخل ہوا پھر اس نے پانی پالیا تو وہ نماز کو نہ توڑے جیسا کہ امام مالک اور امام شافعی نے کہا ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ نماز توڑ دے یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 10:** اس میں خبر واحد کے قبول پر دلیل ہے اور اس پر سلف کا اجماع ہے اور نبی کریم ﷺ کی عادت سے تواتر کے ساتھ معلوم ہے کیونکہ آپ والیوں کو اور مبلغین کو بھیجتے تھے جو ایک ایک ہوتے تھے تاکہ وہ لوگوں کو دین سکھائیں اور انہیں رسول اللہ ﷺ کے اوامر و نواہی بتائیں۔

**مسئلہ نمبر 11:** اس میں دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر قرآن تھوڑا تھوڑا اترتا رہا اور ایک حال کے بعد دوسرے حال میں ضرورت کے مطابق اترتا رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دین مکمل کیا جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ

لَكُمْ دِينُكُمْ (مائدہ: 3)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ حَتَّىٰ تَقَامَ فَرَمَائِیْ یعنی مشرق و مغارب کی ملکیت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ پس اس کے لائق ہے جس جہت کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ یَا شَارِہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کی طرف ہدایت دی۔ الصراط سے مراد راستہ ہے المستقیم جس میں ٹیڑھا پن نہ ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّ سَطًا لِّتَكُونُوْا شُهَدَآءَ عَلٰی النَّاسِ وَ یَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَہِیْدًا ۚ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّتَّقِلْبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ۚ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلٰی الَّذِیْنَ هَدٰی اللّٰهُ ۚ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لَیُضِلَّ اٰیْمَانَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳﴾

”اور اسی طرح ہم نے بنادیا تمہیں (اے مسلمانو!) بہترین امت تاکہ تم گواہ بنو لوگوں پر اور (ہمارا) رسول تم پر گواہ ہو اور نہیں مقرر کیا ہم نے (بیت المقدس کو) قبلہ جس پر آپ (اب تک) رہے مگر اس لئے کہ ہم دیکھ لیں کہ کون پیروی کرتا ہے (ہمارے) رسول کی (اور) کون مڑتا ہے اٹھے پاؤں۔ بے شک یہ (حکم) بہت بھاری ہے مگر ان پر (بھاری نہیں) جنہیں اللہ نے ہدایت فرمائی اور نہیں اللہ کی یہ شان کہ ضائع کر دے تمہارا ایمان۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بہت ہی مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّ سَطًا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کعبہ زمین کے درمیان ہے اسی طرح تمہیں امت وسط بنایا یعنی تمہیں انبیاء سے کم درجہ اور دوسری امتوں سے بلند درجہ بنایا۔ الوسط کا مطلب العدل ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ اچھی چیز درمیانی چیز ہوتی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کہنے کے لئے کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّ سَطًا کے تحت روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: عدلاً یعنی وسط سے مراد عدل ہے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ قرآن میں ہے: قَالَ اَوْسَطُهُمْ یعنی درمیان والے اور بہتر شخص نے کہا۔ زہیر نے کہا:

اذا نزلت احدى الیالی بعظم (2)

هم وسط یوضی الانام بحکمهم

ایک اور شاعر نے کہا:

بصغیر الامر او احدى الکبر

اتم اوسط حق علموا

ایک اور شاعر نے کہا:

لَا تَذْهَبَنَّ فِي الْأُمُورِ فَرَطًا لَا تَسْأَلَنَّ إِنْ سَأَلْتَ شَطَطًا  
وَكُنْ مِنَ النَّاسِ جَمِيعًا وَسَطًا

ان تمام اشعار میں وَسَطًا بہتر اور عمدہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وسط الوادی وادی کی بہتر جگہ کو کہتے ہیں جس میں گھاس اور پانی زیادہ ہو۔ جب وسط میں نہ کی ہوتی ہے نہ زیادتی تو وہ محمود ہوتا ہے۔ یعنی اس امت میں نہ تو نصاریٰ کا غلو ہے جو وہ انبیاء کرام کے بارے کرتے تھے اور نہ یہود کی طرح کوتاہی ہے جو وہ انبیاء کی شان میں کرتے تھے۔ حدیث پاک میں ہے: خیر الامور اوسطها۔ (1) بہتر کام اچھا کام ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: علیکم بالنمط الاوسط۔ تم پر بہتر جماعت کو پکڑنا لازم ہے۔ بہتر جماعت وہ ہوتی ہے، بلند جس کی طرف اترتا ہے اور نیچے والا اس کی طرف بلند ہوتا ہے۔ فلان من اوسط قومہ، فلاں اپنی قوم سے بہتر ہے۔ وانہ لو اوسط قومہ ووسط قومہ۔ یعنی وہ اپنی قوم سے بہتر ہے ان میں سے اہل حسب میں سے ہے۔ قد وسط و ساطة وسطہ۔ الوسط سے نہیں ہے جو دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے الوسط (سین کے سکون کے ساتھ) ظرف ہے تو کہتا ہے: صلیت وسط القوم، جلست وسط الدار کیونکہ یہ اسم ہے۔ جوہری نے کہا: ہر وہ جگہ جہاں بین رکھنا صحیح ہو وہاں وسط ہوگا اور اگر جہاں بین رکھنا صحیح نہ ہو تو وہ وسط (حرکت کے ساتھ) ہوگا اور کبھی سین کو ساکن کیا جاتا ہے اس کی کوئی وجہ نہیں۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَتَكُونُوا لَامَنَةً كِي وَجْهٍ مِنْ صَوْبٍ هِيَ لَان تَكُونُوا۔ شہداء، کان کی خبر ہے۔ عَلَى الثَّلَاثِينَ یعنی محشر میں امتوں کے خلاف انبیاء کے گواہ بنو، جیسا کہ بخاری میں حضرت ابو سعید خدری سے ثابت ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز حضرت نوح علیہ السلام کو پکارا جائے گا۔ وہ کہیں گے: لبیک وسعدیک یا رب۔ اے رب! میں حاضر ہوں، تیری سعادت سے سعادت حاصل کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نے پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: ہاں۔ پھر ان کی امت سے پوچھا جائے گا، کیا اس نے تمہیں پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تیری گواہی کون دے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام کہیں گے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت۔ پس یہ گواہی دیں گے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے تبلیغ کی تھی۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم پر گواہی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا یہی مطلب ہے: وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرُّسُلُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔ (2)

ابن مبارک نے اس حدیث کو طویل ذکر کیا ہے۔ اس حدیث میں ہے: امتیں کہیں گی وہ ہمارے خلاف کیسے گواہی دیں گے جنہوں نے ہمیں پایا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: تم ان کے خلاف کیسے گواہی دو گے جن کو تم نے پایا ہی نہیں۔ امت محمدیہ کے لوگ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہماری طرف تو نے رسول مبعوث فرمایا، ہماری طرف تو نے اپنا عہد اور اپنی

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب صلاۃ الخوف، صفحہ 273، جلد 3 (دار الفکر)

2۔ صحیح بخاری، باب وکذا لک جعلناکم امة وسطا، صفحہ 645، جلد 2 (وزارت تعلیم)



کتاب نازل فرمائی، تو نے خود ہم پر بیان کیا کہ انہوں نے پیغام پہنچایا تھا۔ پس جو تو نے ہمیں عہد دیا تھا اس کی بنا پر ہم نے گواہی دی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: انہوں نے سچ کہا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے: وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا... الوَسَط سے مراد عدل ہے..... لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔

ابن انعم نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ قیامت کے روز حضرت محمد ﷺ کی امت گواہی دے گی مگر وہ گواہی نہیں دے گا جس کے دل میں اپنے بھائی کے بارے میں عداوت ہوگی (1)۔ ایک طائفہ نے کہا آیت کا معنی ہے: بعض بعض کے مرنے بعد گواہی دیں گے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب آپ کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو اس پر خیر سے تعریف کی گئی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس پر واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔ پھر ایک جنازہ گزرا جس کی برائی بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔ حضرت عمر نے عرض کی: میرا باپ اور میری ماں آپ پر قربان ہوں۔ جنازہ گزرا اس کی خیر کے ساتھ تعریف کی گئی تو آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔ پھر ایک جنازہ گزرا جس کی برائی بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔ واجب ہوگئی؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کی تم نے خیر کے ساتھ تعریف کی اس کے لئے جنت واجب ہوگئی اور جس کی تم نے برائی بیان کی اس کے لئے آگ واجب ہوگئی۔ تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو، تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو، تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو (2)۔ بخاری نے اس کے ہم معنی روایت کی ہے۔ بخاری اور مسلم کے علاوہ میں کئی طرق میں ہے پھر یہ آیت تلاوت فرمائی لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔

ابان اور لیث نے شہر بن حوشب سے انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت کو ایسی تین چیزیں عطا کی گئی ہیں جو سوائے انبیاء کے کسی کو عطا نہیں کی گئیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث فرمایا تو اسے فرمایا: مجھ سے دعا مانگ میں تیری دعا قبول کروں گا اور اس (میری) امت کو فرمایا اِذْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) تم مجھ سے مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ اور جب کسی نبی کو بھیجا تو اسے فرمایا: تم پر دین میں کوئی حرج نہیں اور اس امت کو بھی فرمایا: وَمَا جَعَلْ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) اور جب اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو اسے اپنی قوم پر شہید بنایا اور اس امت کو تمام لوگوں پر گواہ بنایا۔ اس حدیث کو حکیم ابو عبد اللہ نے "نوادرا اصول" میں نقل کیا ہے (☆)۔

**مسئلہ نمبر 3:** ہمارے علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ہمیں اپنے خاص فضل سے آگاہ فرمایا کہ اس نے ہمیں عدالت کے اسم سے موسوم فرمایا اور تمام مخلوق پر گواہی کا مرتبہ عطا فرمایا۔ اس نے مرتبہ کے اعتبار سے ہمیں اول بنایا اور زمانہ کے اعتبار سے آخر بنایا جس طرح فرمایا: نحن الآخرون الاولون۔ (3) ہم زمانہ کے اعتبار سے آخری ہیں اور مرتبہ کے

1- تفسیر طبری، صفحہ 15، جلد 1 (دار احیاء التراث العربی) 2- صحیح مسلم، باب فی وجوب الجنت والنار بشہادۃ، صفحہ 308، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

☆ نوادر الاصول، صفحہ 391

3- ایضاً، کتاب الجمعہ، صفحہ 282، جلد 2

اعتبار سے اول ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ عادل ہی صرف گواہی دیں گے غیر پر غیر کا قول نافذ نہ ہوگا مگر جب کہ وہ عادل ہو۔ عدالت کا بیان اور اس کا حکم ان شاء اللہ سورت کے آخر میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اس میں اجماع کی صحت اور اس کے ساتھ حکم کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ جب وہ عادل ہوں گے وہ لوگوں پر گواہی دیں گے، ہر ہر زمانہ کے لوگ بعد والوں پر گواہ ہیں۔ صحابہ کا قول تابعین پر حجت اور شاہد ہے اور تابعین کا قول بعد والوں پر حجت ہے۔ جب امت شہداء (گواہ) ہے تو اس کا قول قبول کرنا واجب ہے۔ اس شخص کے قول کا کوئی اعتبار نہیں جس نے کہا کہ اس سے پوری امت مراد ہے کیونکہ پوری امت کا اجماع تو قیامت تک ثابت نہ ہوگا۔ اصول فقہ کی کتب میں اس کا بیان ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے قیامت کے روز رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے اعمال پر گواہ ہوں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: عَلَيْكُمْ بمعنی لکم ہے یعنی تمہارے لئے ایمان کی گواہی دے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: تمہارے لئے تم پر تبلیغ کی گواہی دے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا بعض علماء نے فرمایا: یہاں قبلہ سے قبلہ اولیٰ مراد ہے کیونکہ فرمایا كُنْتَ عَلَيْهَا بعض نے فرمایا: دوسرا قبلہ مراد ہے اور کاف زائدہ ہے یعنی انت الآن علیہا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: 110) یعنی اتم خیر امة۔ یہ بعض علماء کا قول ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُولَ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لِنَعْلَمَ کا معنی ہے لنری۔ (ہم دیکھ لیں) اور عرب رویت کی جگہ علم کو اور علم کی جگہ رویت کو استعمال کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ (الفیل: 1) اس میں اَلَمْ تَرَ بمعنی الم تعلم ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے مگر تا کہ تم جان لو کہ ہم جانتے ہیں کیونکہ منافقین شک میں تھے کہ اللہ تعالیٰ اشیاء کے پائے جانے سے پہلے انہیں جانتا ہے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے ہم یقین والوں کو شک کرنے والوں سے ممتاز کر دیں۔ یہ ابن فورک نے بیان کیا ہے اور طبری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے تا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ قمعین جان لیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی جس طرح کہا جاتا ہے، امیر نے ایسا کیا حالانکہ وہ کام اس کے قمعین نے کیا ہوتا ہے۔ یہ مہدوی نے بیان کیا ہے اور عمدہ قول ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جان لیں۔ علم کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی تخصیص اور تفضیل کے لئے جس طرح اپنے اس ارشاد میں اپنی ذات کی طرف اشارہ فرمایا: اے ابن آدم! میں مریض تھا تو نے میری عیادت نہیں کی (1)۔ پہلا قول زیادہ واضح ہے کیونکہ اس کا معنی معاينة کا علم ہے جو جزا کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ غیب اور شہادت کو جاننے والا ہے وہ کسی چیز کے پائے جانے سے پہلے بھی اسے جانتا ہے۔ معلومات پر احوال مختلف ہوتے ہیں اور اس

کا علم مختلف نہیں ہوتا بلکہ تمام کے ساتھ ایک تعلق کے ساتھ معلق ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں جو اس معنی کی آیات موجود ہیں ان کا یہی معنی ہے مثلاً وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ (آل عمران: 140)، وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجْتَهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ (محمد: 31)۔ (یہ اس لئے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے اور بنائے تم میں سے کچھ شہید اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں تاکہ ہم دیکھ لیں تم میں سے جو مصروف جہاد رہتے ہیں اور صبر کرنے والے ہیں) اور اس کے مشابہ آیات۔

یہ آیت قریش کے قول مَا وَلَّيْنَاهُمْ عَنْ قِبَلِهِمُ الَّذِي كَانُوا عَلَيْهِمْ کا جواب ہے قریش کعبہ سے محبت کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر مالوف سے آزمایا تاکہ ظاہر ہو جائے جو رسول کی اتباع کرتا ہے اس سے جو اتباع نہیں کرتا۔ زہری نے الا لِيُعْلَمَ پڑھا ہے۔ اس قراءت میں مَنْ مَحَلِّ رَفْعٍ میں ہوگا کیونکہ فعل مجہول کا نائب فاعل ہے اور جمہور کی قراءت پر مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے يَتَّخِذُ الرَّسُولُ یعنی استقبال قبلہ کا جو حکم دیا گیا ہے اس میں رسول مکرم ﷺ کی پیروی کرتا ہے۔ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (آل عمران: 102)۔ کیونکہ قبلہ جب تبدیل ہوا تو مسلمانوں میں سے کچھ مرتد ہو گئے تھے اور ایک قوم منافق ہو گئی تھی۔ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةٌ لِّعَنَّا قَبْلَهُ تَبَدَّلَ لَهَا بَدَلٌ كَبِيرٌ (آل عمران: 84)۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ کا یہ قول ہے۔ عربی میں تقدیر یوں ہوگی۔ وَإِنْ كَانَتْ التَّحْوِيلَةُ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةٌ لِّعَنَّا قَبْلَهُ۔ فراء کا خیال ہے: اِنْ اور لام، بمعنی ما اور الا ہے۔ بصری کہتے ہیں: اِنْ ثَقِيلَةٌ کو مخففہ کیا گیا ہے۔ انفس نے کہا: یعنی قبلہ، یا تحویلہ یا تولیہ بھاری ہے۔ اِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ یعنی اس نے ہدایت کو پیدا کیا۔ اس سے مراد دلوں میں ایمان ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ (مجادلہ: 22)۔ یہ وہ لوگ ہیں نقش کر دیا ہے اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ أَيْمَانَكُمْ عَمَّا أَتَقُوا (آل عمران: 76)۔ یہ ان کے متعلق نازل ہوئی جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہو گئے تھے جیسا کہ بخاری میں حضرت براء بن عازب کی حدیث سے ثابت ہے۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب نبی کریم ﷺ کو قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا تو صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے ان بھائیوں کا کیا ہوگا جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ أَيْمَانَكُمْ (آل عمران: 76)۔ یہ حدیث حسن (1)، صحیح ہے۔ نماز کو ایمان کہا گیا ہے کیونکہ یہ نیت، قول اور عمل پر مشتمل ہے۔

امام مالک نے فرمایا میں اس آیت کے ساتھ مرجئة کا قول ذکر کرتا ہوں کہ جو کہتے ہیں کہ نماز، ایمان میں سے نہیں ہے۔ محمد بن اسحاق نے کہا: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ أَيْمَانَكُمْ یعنی قبلہ کی طرف متوجہ ہونے اور اپنے نبی کی تصدیق کی وجہ سے تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا۔ مسلمانوں کی اکثریت اور اصولین کا نظریہ یہی ہے۔



ابن وہب، ابن قاسم، ابن عبدالحکم اور اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيَّانَكُمْ فرمایا: ایمان سے مراد نماز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَشَرُّؤُفٍ تَرَجِّمُ، الرَّافَةُ، رحمت سے زیادہ ہوتی ہے۔ ابو عمرو بن العلاء نے کہا: الرَّافَةُ اکثر من الرحمة۔ ہم نے اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی میں اس کا لغوی معنی، اس کے اشعار اور معانی کا ذکر کیا ہے۔ کوفیوں اور ابو عمرو نے لَرَّؤُفٌ، فَعُل کے وزن پر پڑھا ہے یہ بنی اسد کی لغت ہے۔ اسی سے ولید بن عقبہ کا قول ہے:

و شَرُّ الطَّالِبِينَ فَلَا تَكُنْ يَقَاتِلُ عَنْهُ الرَّؤُفُ الرَّحِيمُ

کسائی نے حکایت کیا ہے کہ بنی اسد کی لغت فَعُل کے وزن پر لَرَّؤُف ہے۔ ابو جعفر بن القعقاع نے لَرَّؤُف بغیر ہمزہ کے ثقیل پڑھا ہے۔ اسی طرح کتاب اللہ میں ہر ہمزہ کو تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے جو ساکن ہے یا متحرک ہے۔

قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ  
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا  
الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٤﴾

”ہم دیکھ رہے ہیں بار بار آپ کا منہ کرنا آسمان کی طرف تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ (لو) اب پھیر لو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو پھیر لیا کرو اپنے منہ اس کی طرف اور بے شک وہ جنہیں کتاب دی گئی ضرور جانتے ہیں کہ یہ حکم برحق ہے ان کے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔“

علماء نے فرمایا: یہ آیت، سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ کے قول پر نزول کے اعتبار سے مقدم ہے۔ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ کا معنی ہے: تیرا آسمان کی طرف اپنا چہرہ پھیرنا۔ یہ طبری کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: آسمان کی طرف آپ کا نظریں پھیرنا۔ دونوں معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ السماء کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا کیونکہ یہ جو چیز اس کی طرف منسوب ہوتی ہے اس کی تعظیم کے ساتھ مختص ہے اور آسمان سے نازل ہوتی ہے مثلاً بارش، رحمت اور وحی۔ ترضاه یعنی آپ جس کو پسند کرتے ہیں۔ آپ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو پسند فرماتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ۔

ابو اسحاق نے حضرت براء سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی اور رسول اللہ ﷺ کعبہ کی طرف منہ کرنا پسند کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ (البقرہ: 144) (1) اس کا معنی اور اس پر کلام گزر چکا ہے۔ الحمد للہ ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قُولِ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد **قُولِ** یہ امر کا صیغہ ہے۔ **شَطْرَ** سے مراد طرف ہے **الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** سے مراد کعبہ ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: پورے کعبہ کے سامنے..... یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: کعبہ کے پرنا لہ کے سامنے۔ یہ ابن عطیہ کا قول ہے۔ اور میزاب یہ مدینہ طیبہ اور اہل شام کا قبلہ ہے اور اہل اندلس کا قبلہ ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: ابن جریج نے عطا سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیت اللہ اہل مسجد کے لئے قبلہ ہے اور مسجد اہل حرم کے لئے قبلہ ہے اور حرم، میری امت کے مشرق و مغرب میں رہنے والے اہل زمین کا قبلہ ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ**، الشطر کے کئی محمل ہیں۔ طرف، جہت جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ یہ ظرف مکان ہے جیسے تو کہتا ہے: **تَلْقَاءُ وَجْهَتِهِ**۔ ظرف کی حیثیت سے نصب دی گئی ہے یہ مفعول بہ کے قائم مقام ہے، فعل اس میں واقع ہوا ہے۔ داؤد بن ابی ہند نے فرمایا: حضرت ابن مسعود کے مصحف میں اس طرح ہے: **فَوَلِّ وَجْهَكَ تَلْقَاءَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** شاعر نے کہا:

صدر العیس شطر بنی تمیم

اقول لام زنباع اقیسی

ایک اور شاعر نے کہا:

هول له ظلم یغشا کم قطعاً

و قد اظلمک من شطر ثغرم

ایک اور شاعر نے کہا

و ما تغنی الرسالة شطر عمرو

الا من مبلغ عمراً رسولاً

اور شطر الشی کا معنی ہے: اس کا نصف۔ اسی سے حدیث ہے: **الطهور شطر الایمان** (3)۔ طہارت ایمان کا نصف ہے۔ یہ اضداد میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: شطر الی کذا جب کوئی چیز کی طرف متوجہ ہو۔ شطر عن کذا جب کسی سے اعراض کیا گیا ہو۔ شاطر اس شخص کو کہتے ہیں جو نیڑی راہ اختیار کرے اور وہ اپنے اہل کو خست کی وجہ سے عاجز کر دے۔ **شَطْرُ** و **شَطْرُ** شطارت۔ بعض علماء سے شاطر کا معنی پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: جو اس کام کو اختیار کرے جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اس میں علماء کا اختلاف نہیں کہ ہر اقل میں کعبہ، قبلہ ہے اور اس پر اجماع ہے جو کعبہ کو دیکھ رہا ہو اس پر عین قبلہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے۔ اگر اس نے اس کا استقبال ترک کر دیا جبکہ وہ کعبہ کو دیکھنے والا تھا اور اس کی جہت کا عالم تھا تو اس کی نماز نہ ہوگی جو اس نے نماز پڑھی ہوگی اس کا اعادہ لازم ہوگا۔ ابو عمرو نے ذکر کیا ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ جو کعبہ سے غائب

2۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، صفحہ 10، جلد 2 (دار الفکر)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 222، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

3۔ صحیح مسلم، باب فضل الوضوء، صفحہ 118، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ہے وہ کعبہ کی طرف منہ کرے، اگر اس پر کعبہ کی جہت مخفی ہو تو ستاروں، ہواؤں، پہاڑوں وغیرہ سے استدلال کرے اور جو مسجد حرام میں بیٹھا ہو اس کا چہرہ کعبہ کی طرف ہونا چاہئے اور اس کی طرف ایمان اور ثواب کی نیت سے دیکھے۔ روایت ہے کہ کعبہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے (۱)۔ عطا اور مجاہد کا یہ قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اس میں اختلاف ہے غائب کا عین کعبہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے یا جہت کعبہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے؟ بعض علماء کا پہلا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ ایسی تکلیف ہے جس تک پہنچنا ممکن نہیں۔ بعض نے جہت کا قول کیا ہے۔ یہ تین وجوہ سے صحیح ہے: (۱) ممکن وہ ہے جس کے ساتھ تکلیف مرتب ہو۔ (۲) قرآن میں اس کا حکم ہے قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ<sup>۱</sup> وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ<sup>۲</sup>۔ یعنی زمین کے مشرق یا مغرب میں ہو قَوْلُوا وُجُوهَكُمْ شَطْرًا۔ (۳) علماء نے لمبی صف سے حجت پکڑی ہے جو قطعی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ وہ بیت اللہ کی عرض سے دگنی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اس آیت میں امام مالک اور ان کے موافق قول کرنے والوں کے نظریہ کی واضح حجت ہے کہ نمازی سامنے دیکھے، سجدہ کی جگہ نہ دیکھے۔ ثوری، امام ابو حنیفہ، امام شافعی، حسن بنی حنی نے کہا: اپنے سجدہ کی جگہ کی طرف دیکھے۔ شریک قاضی نے کہا: قیام میں سجدہ کی طرف دیکھے اور رکوع میں قدموں کی طرف دیکھے اور سجدہ میں اپنے ناک کی جگہ کی طرف دیکھے اور قعدہ میں اپنی گود کی طرف دیکھے۔ ابن عربی نے کہا: سامنے دیکھے کیونکہ اگر وہ اپنے سر کو ٹیڑھا کرے گا تو اس کا سر میں جو قیام فرض تھا وہ ضائع ہو گیا، حالانکہ سر تمام اعضاء سے معزز عضو ہے اگر سر کو سیدھا کرے گا اور تکلیف سے زمین کی طرف دیکھے گا تو اسے بہت زیادہ مشقت اور حرج لاحق ہوگی اور دین میں ہم پر حرج نہیں رکھی گئی، لیکن جو اس پر قادر ہو اس کے لئے یہ افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں لِيَعْلَمُونَ أَنَّ الْحَقَّ مِنْ رَبِّهِمْ<sup>۱</sup> یعنی بیت المقدس سے قبلہ کا پھرنا حق ہے۔ اگر کہا جائے کہ وہ کیسے جانتے تھے جبکہ یہ نہ ان کے دین میں تھا اور نہ ان کی کتاب میں تھا؟ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ جب انہوں نے اپنی کتاب سے جان لیا تھا کہ حضرت محمد ﷺ نبی ہیں تو انہوں نے یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ حق کہتے ہیں اور حق کا حکم دیتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے: انہوں نے اپنے دین سے نسخ کا جواز جان لیا تھا اگرچہ بعض نے اس کا انکار کیا ہے۔ پس وہ قبلہ کے جواز کو جاننے والے ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ ابن عامر، جزہ اور کسائی نے تعلیمون کے ساتھ پڑھا ہے یہ اہل کتاب یا حضرت محمد ﷺ کی امت کو خطاب ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف آگاہ کیا گیا ہے کہ وہ بندوں کے اعمال کو مہمل نہیں چھوڑے گا اور ان سے غافل نہیں ہوگا اور اس کے ضمن میں وعید ہے۔ باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَلَيْنَ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قَهْلَكَ<sup>۱</sup> وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ



قَبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قَبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا  
جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۚ إِنَّكَ إِذًا لِّنَ الظَّالِمِينَ ۝

”اور اگر آپ لے آئیں اہل کتاب کے پاس ہر ایک دلیل (پھر بھی) نہیں پیروی کریں گے آپ کے قبلہ کی اور نہ آپ پیروی کرنے والے ہیں ان کے قبلہ کی اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے ہیں اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم تو یقیناً آپ اس وقت ظالموں میں (شمار) ہوں گے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قَبْلَتَكَ کیونکہ انہوں نے کفر کیا ہے حالانکہ ان کے لئے حق واضح ہو چکا ہے، انہیں آیات و علامات نفع نہیں دیں گی۔ قبلہ کی جمع مکسر قبل ہے اور جمع سالم قبلات ہے اور کسرہ کو فتح سے بدلنا جائز ہے اور تو کہے قبلات اور کسرہ کو حذف کرنا اور باکو ساکن کرنا جائز ہے اور لٹن کا جواب لو کے جواب کے ساتھ دیا گیا ہے۔ یہ اس کی ضد ہے کیونکہ لو اپنے جواب میں ماضی اور وقوع کو طلب کرتا ہے اور لٹن استقبال کو طلب کرتا ہے۔

فراء اور اخفش نے کہا: لو کے جواب کے ساتھ جواب دیا گیا ہے کیونکہ اس کا معنی ہے لو اتیت۔ اسی طرح لٹن کے جواب کے ساتھ لو کا جواب دیا جاتا ہے تو کہتے ہیں لو احسنت احسن الیک اسی کی مثل قرآن میں ہے: وَلَئِنِ اسْأَلْنَا رِیْحًا فَرَأَوْهُ مُصَفًّیًا (روم: 51) یعنی لو اسلنا ریحاً۔ سیبویہ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ اس نے کہا: لٹن کا معنی لو کے مخالف ہے ایک دوسرے پر داخل نہیں ہوتا۔ اس کا معنی یہ کہ اگر آپ اہل کتاب کے پاس کوئی بھی نشانی لے آئیں وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ سیبویہ نے کہا: وَلَئِنِ اسْأَلْنَا رِیْحًا فَرَأَوْهُ مُصَفًّیًا (روم: 51) کا معنی لیظٹن ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قَبْلَتَهُمْ یہ لفظ خبر ہے لیکن اپنے ضمن میں امر کو لئے ہوئے ہے یعنی اس میں سے کسی شے کی طرف مائل نہ ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہود، نصاریٰ کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں اور نصاریٰ، یہود کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں۔ یہ سدی اور ابن زید سے مروی ہے۔ یہ ان کے اختلاف، تدابر اور گمراہی کے متعلق آگاہ کیا گیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا یہ معنی ہے کہ جو ان میں سے اسلام لے آئے ہیں وہ ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں جو اسلام نہیں لائے۔ اور جو اسلام نہیں لائے وہ اسلام لانے والوں کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں (1) اور پہلا معنی زیادہ واضح ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۚ إِنَّكَ إِذًا لِّنَ الظَّالِمِينَ اس آیت میں خطاب حضرت محمد ﷺ کو ہے اور مراد آپ ﷺ کی امت کے وہ لوگ ہیں جن کا خواہش کی پیروی کرنا جائز ہے اور خواہش کی پیروی کرنے سے ظالم ہو جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے لئے ایسا عمل کرنا جائز ہی نہیں ہے جس کی وجہ سے آپ ظالم ہو جائیں نبی کریم ﷺ کی عصمت اور آپ سے ایسے اعمال سرزد نہ ہونے کی قطعیت کی وجہ سے امت کے ارادہ پر

محمول ہے۔ معاملہ کی بڑائی کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کو خطاب کیا گیا، نیز اس لئے کہ آپ پر یہ حکم نازل ہوا۔ الاھواء جمع ہے ہوئی کی۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اسی طرح علم کی تفسیر بھی گزر چکی ہے اعادہ کا فائدہ نہیں۔

الَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابُ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨٩﴾

”جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ پہچانتے ہیں انہیں جیسے وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور بے شک ان میں سے ایک گروہ چھپاتا ہے حق کو جان بوجھ کر۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابُ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ، الَّذِينَ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور يَعْرِفُونَهُ خبر ہے۔ الظَّالِمِينَ کی صفت ہونے کی بنا پر محل جر میں ہونا بھی صحیح ہے اور يَعْرِفُونَهُ کا حال ہونا صحیح ہے یعنی وہ آپ ﷺ کی نبوت اور آپ کی رسالت کی صداقت کو جانتے ہیں۔ ضمیر کا مرجع حضرت محمد ﷺ ہیں۔ یہ مجاہد اور قتادہ وغیرہما کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے وہ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ کا پھرنا جانتے تھے کہ وہ حق ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، ابن جریج، ربیع اور قتادہ کا قول ہے۔ (1)

معرفت میں آبْنَاءَ (بیٹوں) کو ذکر کیا ہے ان کے نفسوں کا ذکر نہیں کیا اگرچہ نفس زیادہ قریب ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان پر ایک ایسا وقت گزرتا ہے کہ وہ اپنے نفس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور کوئی ایسا وقت انسان پر نہیں گزرتا جس میں وہ اپنے بیٹے کو نہ جانتا ہو۔ روایت ہے کہ حضرت عمر نے عبد اللہ بن سلام سے کہا کیا تو حضرت محمد ﷺ کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح اپنے بیٹے کو جانتا ہے؟ عبد اللہ بن سلام نے کہا: ہاں میں آپ کو اپنے بیٹے سے زیادہ جانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آسمان میں امین کو اپنی زمین میں اپنے امین کی طرف اس کی نعت کے ساتھ بھیجا پس میں اسے جان گیا۔ اور میرا بیٹا میں نہیں جانتا اس کی ماں سے کیا ہوا۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ یعنی محمد ﷺ۔ یہ مجاہد، قتادہ اور خصیف کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: الْحَقَّ سے مراد استقبال کعبہ ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ يَعْلَمُونَ یہ عناد ان کے انکار کی صحت میں ظاہر ہے (3)۔ اسی طرح ہے: وَجَعَلُوا بَيْنَهُمَا سِتْرًا لَّهُمَا تَفْتَنَ الْفُتُنَ (النمل: 14)

اور ارشاد ہے: فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ (البقرہ: 89)

الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٩٠﴾

”یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تو ہرگز نہ بن جانا شک کرنے والوں سے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ، الْحَقُّ سے مراد استقبال کعبہ ہے۔ نہ وہ جو یہود نے آپ کو اپنا قبلہ بنایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے الحق کو منصوب پڑھا، يَعْلَمُونَ کی وجہ سے یعنی وہ حق کو جانتے ہیں اور الزم

الحق کی تقدیر پر بھی اس کی نصب صحیح ہے اور رفع مبتدا ہونے کے اعتبار سے ہے یا مبتدا کے اضمار کی بنا پر ہے۔ تقدیر عبارت ہوگی ہو الحق، یا فعل کے اضمار پر ہوگا یعنی جاء الحق..... نحاس نے کہا: سورۃ الانبیاء میں الْحَقُّ فَهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿۱۰﴾ ہم کسی کو نہیں جانتے کہ اس نے منصوب کے علاوہ پڑھا ہو۔ ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ سورہ بقرہ میں آیت کے آغاز میں جبکہ سورہ انبیاء میں ایسا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿۱۰﴾۔ الْمُمْتَرِينَ کا معنی ہے: شک کرنے والے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد امت ہے، کہا جاتا ہے: امتی فلان فی کذا جب کسی کو کبھی یقین حاصل ہو اور کبھی شک لاحق ہو، اور وہ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے سے دور کرے، اس سے البراء (جھگڑنا) ہے، ہر شخص اپنے مقابل کے قول میں شک کرتا ہے۔ الامتراء فی الشیء، کسی شے میں شک کرنا، اسی طرح التماری ہے۔ طبری نے استشہاد کے طور پر ائشی کا قول ذکر کیا ہے کہ ممتین کا معنی شاکون ہے۔

تدر علی أسوق الممتري ن رخصاً اذا ما السحاب ارحجن

ابن عطیہ نے کہا: اس میں اسے وہم ہوا ہے کیونکہ ابو عبیدہ وغیرہ نے کہا: الممتدون۔ شعر میں جو استعمال ہوا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے پیروں کے ساتھ گھوڑوں کو تیز چلاتے ہیں۔ شعر میں شک کے معنی میں نہیں ہے جیسا کہ طبری نے کہا ہے (۱)۔ میں کہتا ہوں: اس میں شک کا معنی موجود ہے کیونکہ مالک اپنے گھوڑے کو آزماتا ہے کہ یہ چلنے کی عادت پر قائم ہے یا نہیں تاکہ اسے کوئی مصیبت لاحق نہ ہو، یا یہ ابتدا میں خریدنے کے وقت ہوتا ہے وہ اسے چلاتا ہے تاکہ اس کے چلنے کی مقدار جان لے۔ جوہری نے کہا صریت الفرس جب تو کوڑے وغیرہ کے ساتھ اس کا چلنا نکالے۔ اسم المریۃ ہے یہ میم کے کسرہ کے ساتھ ہے کبھی میم کو ضمہ دیا جاتا ہے، مریۃ الناقة مریاً جب تو اس کی کھیری کو مس کرے تاکہ دودھ دو ہے، أمرث جب اس کا دودھ اتر آئے۔ اسم المریۃ ہے میم کے کسرہ کے ساتھ اور میم کو ضمہ دینا غلط ہے۔ المریۃ کا معنی شک ہے کبھی اس کو ضمہ دیا جاتا ہے یہ ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

وَلِكُلٍّ وَّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۸﴾

”اور ہر قوم کے لئے ایک سمت (مقرر) ہے وہ اسی کی طرف منہ کرتی ہے۔ پس آگے بڑھ جاؤ دوسروں سے

نیکیوں میں تم کہیں بھی ہو، لے آئے گا اللہ تعالیٰ تم سب کو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔“

اس میں چار مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر ۱:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِكُلٍّ وَّجْهَةٌ، الوجهۃ کا وزن فعلۃ ہے اور یہ المواجهۃ سے ہے۔

الوجهۃ، الجہۃ اور الوجهہ کا ایک معنی ہے۔ اس سے مراد قبلہ ہے یعنی وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور آپ ان کے



قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے خواہ حق ہے یا خواہش نفس ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **هُوَ مَوْلِيَّهَا**، **هُوَ** ضمیر لفظ کل کی طرف لوٹ رہی ہے نہ کہ اس کے معنی کی طرف

کیونکہ اگر معنی کی طرف راجع ہوتی تو ہم مولیٰ ہوتا۔ **هُوَ** ضمیر مفعول اول ہے اور دوسرا مفعول مولى کا محذوف ہے۔ عبارت

یوں ہوتی ہو مولیٰ ہوا وجہ و نفسہ، مطلب یہ ہے کہ ہر صاحب ملت کا ایک قبلہ ہے۔ صاحب قبلہ اپنا چہرہ ادھر پھیرنے والا

ہے۔ یہ واحد کا صیغہ لفظ کل کے اعتبار سے ہے۔ یہ ربیع، عطا اور حضرت ابن عباس کا قول ہے، حضرت علی بن سلیمان نے کہا:

مولیٰ ہا کا معنی ہے: متولیٰ ہا۔ ابن عباس اور ابن عامر نے مولا ہا مجہول پڑھا ہے (1)۔ اس قرأت پر ضمیر واحد کی طرف

لوٹنے کی یعنی لوگوں میں سے ہر ایک کے لئے قبلہ ہے۔ الواحد مولا ہا یعنی ہر ایک اس کی طرف پھیرا گیا ہے۔ یہ زجاج کا

قول ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جمہور کی قراءت پر **هُوَ** ضمیر اللہ تعالیٰ کا اسم، اگرچہ پہلے اس کا ذکر نہیں ہے کیونکہ یہ معلوم ہے

کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کرنے والا ہے معنی یہ ہوگا کہ ہر صاحب ملت کا ایک قبلہ ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کی طرف پھیرنے والا ہے۔

طبری نے حکایت کیا ہے کہ ایک قوم نے دلکل وجہ پڑھا ہے یعنی کل کو وجہ کی طرف مضاف کیا ہے۔ ابن عطیہ نے

کہا: طبری نے غلطی کی ہے (2)، جبکہ یہ تعبیر قابل توجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر جہت کی نیکی میں سبقت کر جس کی طرف

تمہیں اس نے پھیرا ہے اور اپنے معاملہ میں اس اور اس کے چکر میں نہ پڑو۔ یعنی تم پر تمام امور میں اطاعت لازم ہے۔ لکل

وجہ کو فاستبقوا پر مقدم کیا گیا ہے الوجہ کے اہتمام کی وجہ سے جیسا کہ مفعول کو مقدم کیا جاتا ہے۔ ابو عمرو دانی نے یہ

قرأت حضرت ابن عباس سے ذکر کی ہے وجہ میں وادسلامت رہی ہے عداۃ اور زنتہ اور اس کے درمیان فرق کرنے کے

لئے کیونکہ جہہ ظرف ہے اور یہ مصادر ہیں۔ ابو علی نے کہا ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ بھی مصدر ہے اور خلاف قیاس ہے۔ ایک

قوم کا خیال ہے کہ یہ اسم ہے مصدر نہیں ہے۔ ابو علی کے علاوہ علماء نے کہا جب تو اس سے مصدر مراد لے تو وجہ کہے گا اور

ظرف میں بھی کبھی الجہہ کہا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ** یعنی الی الخیرات حرف جر کو حذف کیا گیا یعنی اللہ تعالیٰ نے

البیت الحرام کی طرف منہ کرنے کا جو تمہیں حکم دیا ہے اس میں جلدی کرو۔ اگرچہ یہ اپنے ضمن میں تمام طاعات کی طرف جلدی

کرنے کا معنی لئے ہوئے ہے۔ آیات کے سیاق کی وجہ سے استقبال قبلہ مراد لیا گیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ نماز کو اول وقت میں

پڑھنے کے لئے جلدی کرو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ نسائی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نماز کی

طرف جلدی جانے والا اس شخص کی مثل ہے جو اونٹ قربانی دیتا ہے پھر اس کے پیچھے آنے والا اس کی مانند ہے جو گائے قربانی

دیتا ہے پھر اس کے پیچھے آنے والا اس شخص کی مانند ہے جو مینڈھا قربانی دیتا ہے پھر وہ جو اس کے پیچھے آنے والا ہے وہ اس کی

طرح ہے جو مرغی قربانی دیتا ہے پھر جو اس کے پیچھے آنے والا ہے اس کی طرح ہے جو انڈا قربانی دیتا ہے (3)۔ دارقطنی نے

2۔ البحر الوعز، صفحہ 224، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

1۔ معالم التنزیل، صفحہ 175، جلد 1 (دارالفکر)

3۔ سنن نسائی، کتاب الامالۃ والجماعۃ، صفحہ 138، جلد 1 (وزارت تعلیم)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی نماز کو اپنے وقت پر پڑھتا ہے حالانکہ اس نے پہلے وقت میں اس کو ترک کر دیا تھا جو اس کے اہل اور مال سے بہتر تھا (1)۔

مالک نے یحییٰ بن سعید سے ان کا قول نقل کیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الصلاة في اول وقتها (2) بہتر عمل نماز کو وقت پر ادا کرنا ہے۔ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں اول وقتہا ہے۔ اس میں پہلے ہی حرف جر نہیں ہے۔

ابراہیم بن عبد الملک نے حضرت ابو مخذومہ سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اول وقت اللہ کی رضا ہے اور درمیانی وقت اللہ کی رحمت ہے اور آخر وقت اللہ کا عفو ہے (3)، ابن عربی نے زائد ذکر کیا ہے۔ ابوبکر نے کہا: اللہ کی رضا ہمیں اللہ تعالیٰ کی عفو سے زیادہ محبوب ہے، کیونکہ اس کی رضا محسنین کے لئے ہے اور اس کا عفو کوتاہی کرنے والوں کے لئے ہے یہ امام شافعی کا اختیار ہے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا آخری وقت افضل ہے کیونکہ یہ وجوب کا وقت ہے، امام مالک کے قول میں تفصیل ہے۔ صبح اور مغرب میں پہلا وقت افضل ہے۔ صبح میں افضلیت حضرت عائشہ کی حدیث کی وجہ سے ہے کہ فرمایا: رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز پڑھتے تھے عورتیں اپنی چادروں میں لپیٹی ہوئی لوٹتی تھیں وہ اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہیں جاتی تھیں (4)۔ اور رہی مغرب کی پہلے وقت میں افضلیت تو وہ حضرت سلمہ بن اکوع کی حدیث کی وجہ سے ہے۔ آپ مغرب کی نماز پڑھتے تھے جب سورج غروب ہوتا تھا اور پردے میں چھپ جاتا تھا (5)۔ ان دونوں حدیثوں کو مسلم نے نقل کیا ہے اور نماز عشاء میں تاخیر افضل ہے جو دیر سے پڑھنے پر قادر ہو۔ حضرت ابن عمر نے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم ایک رات عشاء کی نماز کے لئے رسول اللہ ﷺ کا انتظار کرتے رہے، آپ ہمارے پاس تشریف لائے جب کہ رات کا تیسرا حصہ یا اس کے بعد کا وقت گزر چکا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں آپ اپنے گھر والوں میں مشغول رہے یا کسی اور وجہ سے مشغول رہے۔ آپ جب باہر نکلے تو فرمایا: تم نماز کا انتظار کر رہے ہو تمہارے علاوہ کوئی اہل دین اس کا انتظار نہیں کر رہا۔ اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں انہیں اس وقت نماز پڑھاتا (6)۔ بخاری میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ نے عشاء کی نماز کو نصف رات تک مؤخر فرمایا پھر نماز پڑھی (7)۔

حضرت ابو ہریرہ نے کہا: نبی کریم ﷺ عشاء کی نماز میں تاخیر کو پسند فرماتے تھے، اور رہی ظہر کی نماز کیونکہ یہ لوگوں کی غفلت کے وقت آتی ہے۔ پس اس میں تھوڑی تاخیر مستحب ہے تاکہ لوگ تیار ہو جائیں اور جمع ہو جائیں۔ ابو الفرج نے کہا امام مالک نے فرمایا ہر نماز میں افضل وقت پہلا وقت ہے مگر سخت گرمی میں ظہر کی نماز کے لئے تاخیر افضل ہے۔ ابن ابی اویس

1۔ سنن دارقطنی، النہی عن الصلاة بعد صلاة الفجر وبعد صلاة العصر، صفحہ 248، جلد 1 (دارالحسن) 2۔ ایضاً، صفحہ 247، جلد 1 (دارالحسن)

3۔ ایضاً، صفحہ 250، جلد 1 4۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، صفحہ 230، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

5۔ ایضاً، صفحہ 228، جلد 1 6۔ ایضاً، صفحہ 229، جلد 1

7۔ صحیح بخاری، کتاب مواقیب الصلاة، باب وقت العشاء الى نصف الليل، صفحہ 81، جلد 1 (وزارت تعلیم)

نے کہا امام مالک زوال کے وقت ظہر کی نماز پڑھنا ناپسند فرماتے تھے۔ لیکن اس کے بعد پڑھتے اور فرماتے وہ خوارج کی نماز ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح ترمذی میں حضرت ابوذر غفاری سے مروی ہے، فرمایا: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، مؤذن نے ظہر کی اذان دینے کا ارادہ کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ٹھنڈا کرو۔ پھر اس نے اذان دینے کا ارادہ کیا تو پھر آپ نے فرمایا: ٹھنڈا کرو حتیٰ کہ ہم نے ٹیلوں کا سایہ دیکھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: گرمی کی شدت جہنم کی بھڑک سے ہے جب گرمی شدید ہو تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو (1)۔

صحیح مسلم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ظہر کی نماز پڑھتے تھے جب سورج ڈھل جاتا تھا (2) اور دونوں حدیثوں کو حضرت انس کی روایت جمع کرتی ہے کہ جب گرمی شدید ہوتی تو نماز ٹھنڈی کر کے پڑھتے تھے اور جب سردی ہوتی تو جلدی پڑھتے۔

ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا: اہل علم کی ایک جماعت نے سخت گرمی میں ظہر کی نماز میں تاخیر کو پسند کیا ہے۔ یہ ابن مبارک، احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: ظہر کی نماز کو ٹھنڈا کرنا چاہیے جب مسجد کے نمازی دور سے آتے ہوں، جو تنہا نماز پڑھنے والا ہے اور وہ جو اپنی قوم کی مسجد میں نماز پڑھنے والا ہے میں اس کے لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ سخت گرمی میں بھی نماز کو مؤخر نہ کرے۔ ابو عیسیٰ نے کہا: جن علماء کا سخت گرمی میں ظہر کو مؤخر کرنے کا نظریہ ہے وہ اتباع کے زیادہ قریب ہے اور رہا امام شافعی کا قول کہ دور سے آنے والوں کے لئے اور لوگوں پر مشقت کی وجہ سے رخصت ہے کیونکہ حضرت ابوذر کی حدیث امام شافعی کے قول کے خلاف پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت ابوذر نے کہا: ہم ایک سفر میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے حضرت بلال نے ظہر کی اذان دینے کا ارادہ فرمایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے بلال! ٹھنڈا کرو، ٹھنڈا کرو، اگر معاملہ اس طرح ہوتا جس طرح امام شافعی نے کہا ہے تو یہاں وقت کو ٹھنڈا کرنے کا کوئی معنی نہیں تھا کیونکہ سفر میں سب لوگ جمع تھے، دور سے آنے کے محتاج نہ تھے (3) اور رہی عصر کی نماز تو اس کو جلدی پڑھنا افضل ہے۔ ہمارے مذہب میں کوئی اختلاف نہیں کہ جماعت کی امید کرتے ہوئے نماز کو مؤخر کرنا اس کو مقدم کرنے سے افضل ہے۔ اور جماعت کی فضیلت معلوم ہے، اول وقت کی فضیلت مجہول ہے اور معلوم کی تحصیل اولیٰ ہے اور یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَهْدِيكُمْ اللَّهُ نَجَاتِكُمْ يَاسُورٌ** اور اس کا جواب **يَا أَيُّهَا اللَّهُ جَبَّيْعًا** ہے۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تم سب کو لے آئے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف ہر چیز پر قدرت کے ساتھ بیان فرمایا تا کہ مرنے کے بعد اور بوسیدگی کے بعد اعادہ کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کے ساتھ صفت مناسب ہو جائے۔

**وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ**

1۔ صحیح بخاری، کتاب مواقیب الصلوٰۃ، صفحہ 77، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب اوقات الصلوٰۃ، صفحہ 223، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء من تأخير الظہر، صفحہ 23، جلد 1 (وزارت تعلیم)



رَبِّكَ ۚ وَمَا لِلَّهِ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١١٥﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ  
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ لِئَلَّا يَكُونَ  
لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۚ وَلَا تَمَّ  
يَعْنِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١١٦﴾

”اور جہاں سے بھی آپ (باہر) نکلیں تو موڑ لیا کریں (نماز کے وقت) اپنا رخ مسجد حرام کی طرف اور بے شک  
یہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور جہاں سے آپ (باہر)  
نکلیں تو موڑ لیا کریں اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو پھیر لیا  
کر اپنے منہ اس کی طرف تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم پر اعتراض (کی گنجائش) بجز ان لوگوں کے جو نا انصافی کریں  
ان میں سے۔ سو نہ ڈرو تم ان سے (بلکہ صرف) مجھ سے ڈرا کرو تاکہ میں پورا کر دوں اپنا انعام تم پر تاکہ راہ  
راست پر ثابت قدم رہو۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بعض علماء نے فرمایا: یہ استقبال کعبہ  
کے امر کی تاکید اور اس کے اہتمام کے لئے ہے کیونکہ تحویل کا موقع لوگوں کے نفوس میں مشکل تھا تو معاملہ کو مؤکد فرمایا تاکہ  
لوگ اس کے اہتمام کو دیکھیں اور ان پر تخفیف ہو جائے اور ان کے نفوس کو تسکین حاصل ہو جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: پہلے  
فَوَلِّ وَجْهَكَ سے مراد کعبہ کی سمت ہے یعنی جب اسے دیکھ رہا ہو تو عین اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے پھر فرمایا حَيْثُ مَا  
كُنْتُمْ مسلمان جو دوسری تمام مساجد میں ہیں مدینہ طیبہ وغیرہ میں وہ کعبہ کی سمت منہ کریں۔ پھر فرمایا: وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ  
یعنی سفر میں استقبال کعبہ واجب ہے۔ پس زمین کی تمام اطراف میں تمام جگہوں میں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا یہ حکم تھا۔ یہ قول  
پہلے قول سے بہتر ہے کیونکہ اس میں ہر آیت کو ایک فائدہ پر محمول کیا گیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت انس بن مالک سے روایت  
کیا ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ جب سفر میں ہوتے اور اپنی سواری پر نماز پڑھنے کا ارادہ کرتے تو قبلہ کی طرف منہ کرتے اور  
تکبیر کہتے پھر نماز پڑھتے رہتے خواہ جدھر بھی سواری کا رخ ہوتا (1)۔ ابو داؤد نے بھی اسے روایت کیا ہے (2)۔ امام شافعی،  
امام احمد اور ابو ثور کا یہی قول ہے۔ امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ استقبال کعبہ لازم نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عمر کی حدیث میں ہے  
فرمایا، رسول اللہ ﷺ مکہ میں مدینہ طیبہ آتے ہوئے سواری پر نماز پڑھتے تھے۔ فرمایا: اس کے متعلق نازل ہوا: فَأَيُّهَا  
تَوَلَّوْا فَمَنْ وَجَّهَ اللَّهُ (البقرہ: 115) (3) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: ان احادیث کے درمیان تعارض نہیں ہے کیونکہ یہ مطلق اور مقید کے باب سے ہیں۔ امام شافعی کا قول اولیٰ

1۔ سنن دارقطنی، صفة صلاة التطوع في السفر، صفحہ 396، جلد 1 (دارالحسن)

2۔ سنن ابی داؤد، باب التطوع على الرحلة والوتر، صفحہ 173، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، باب وما جعلنا القبلة، صفحہ 645، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ہے اور اس کے متعلق حضرت انس کی حدیث صحیح ہے۔ روایت ہے کہ جعفر بن محمد سے قرآن میں تکرار کے بارے پوچھا گیا؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ تمام لوگ سارا قرآن یاد نہیں کریں گے: اگر قصص مکرر نہ ہوتے تو یہ بعض کے پاس ہوتے اور بعض کے پاس نہ ہوتے تکرار کیا گیا تاکہ جو کچھ حصہ یاد کرے اس کے پاس بھی یہ قصص ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِيُثَبِّتُ لَكُمْ حُجَّتُكُمْ عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا مِمَّا بَيْنَ يَدَيْكُمْ (1): اس سے مراد عرب کے مشرک ہیں ان کی حجت سے مراد ان کا قول ہے کہ آپ نے ہمارے قبلہ کی طرف رجوع کر لیا تو انہیں اس ارشاد قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (البقرہ: 42) سے جواب دیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: لِيُثَبِّتُ لَكُمْ حُجَّتُكُمْ کا معنی ہے تاکہ تم نہ کہو کہ تمہیں استقبال کعبہ کا حکم دیا گیا تھا حالانکہ تم اسے خیال نہیں کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (البقرہ: 144) تو پہلے حکم نوزاں کر دیا۔ ابو عبیدہ نے کہا الا یہاں واو کے معنی میں ہے یعنی والذین ظلموا۔ یہ استثناء واو کے معنی میں ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

ما بالمدينة دار غير واحدة      دار الخليفة الا دار مردانا  
گویا اس شعر میں کہا: الادار الخليفة ودار مردان۔

اسی طرح یہ ارشاد ہے: اِلَّا الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ اُجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (التین) یعنی والذین آمنوا زجاج نے اس قول کو باطل قرار دیا ہے (2)۔ اس نے کہا یہ حذاق نحویوں کے نزدیک غلط ہے اور اس میں معافی کا بطلان ہے اور اِلا اور اس کا مابعد، اپنے ذکر سے مستغنی ہو جائیں گے۔ نحویوں کے نزدیک قول یہ ہے کہ یہ پہلے کلام سے استثناء نہیں ہے، یعنی جن لوگوں نے ان میں سے ظلم کیا وہ حجت پکڑتے ہیں۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: یعنی اللہ تعالیٰ نے قبلہ کے متعلق احتجاج کا امر اپنے فرمان وَ لِكُلٍّ وُجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا میں بتایا تاکہ لوگوں کے لئے تم پر حجت نہ رہے مگر جو ایک واضح امر میں احتجاج کر کے ظلم کرے۔ جیسے تو کہتا ہے: مالک عن حجة الا الظلم او الا ان تظلمنی، یعنی مجھ پر تیرے لئے یقیناً کوئی حجت نہیں۔ لیکن تو مجھ پر ظلم کرتا ہے۔ اس کے ظلم کو حجت کہا کیونکہ اس ظالم سے حجت پکڑنے والے نے اسے حجت کہا ہے۔ اگرچہ زنا کر ہونے والی حجت ہے۔ قطرب نے کہا یہ بھی جائز ہے کہ معنی یہ ہو کہ تم پر لوگوں کے لئے حجت نہ ہو مگر ان پر جنہوں نے ظلم کیا، الذین، علیکم میں کم ضمیر سے بدل ہوگا۔ ایک گروہ نے کہا الا الذین مستثنیٰ متصل ہے۔ اس کا معنی حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے۔ طبری نے اس کو اختیار کیا ہے اور کہا اللہ تعالیٰ نے نفی فرمائی کہ کسی کے لئے استقبال قبلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ پر حجت ہو۔ معنی یہ ہے کہ تم پر کسی کے لئے حجت نہیں ہے مگر باطل حجت..... اس حیثیت سے کہ انہوں نے کہا: انہیں کس چیز نے پھیر دیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دین میں متحیر ہے۔ وہ ہمارے قبلہ کی طرف متوجہ نہیں ہوا مگر اس لئے کہ ہم اس سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں، اس کے علاوہ وہ اقوال جو بت پرستوں، یہودیوں یا منافقوں سے صادر ہوتے تھے۔ جنت سے مراد مخالفت اور جھگڑنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حجت کہا اور اس کے فساد کا حکم لگایا کیونکہ یہ ظالموں کی طرف سے

تھی۔ ابن عطیہ نے کہا: بعض علماء نے کہا (1): یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا کہ الناس سے مراد یہود ہوں۔ پھر عرب کے کفار کی استثناء کی گویا فرمایا: لیکن جنہوں نے ظلم کیا جو تم سے جھگڑتے ہیں۔ لیکن مِنْهُمْ کا قول اس تاویل کو رد کرتا ہے معنی یہ ہے کہ: لیکن جنہوں نے ظلم کیا یعنی کفار قریش نے اپنے اس قول میں ظلم کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے قبلہ کی طرف لوٹ آیا ہے وہ ہمارے پورے دین کی طرف لوٹ آئے گا۔ اور اس میں ہر وہ شخص داخل ہوگا جس نے بھی یہود کے علاوہ نازل ہونی والی آیت میں کلام کیا۔ حضرت ابن عباس، زید بن علی اور ابن زید نے الا الذین ظلموا پڑھا ہے۔ یعنی ہمزہ کے فتح اور لام کی تخفیف کے ساتھ۔ اس معنی پر کہ یہ نیا کلام ہے اس صورت میں الذین ظلموا مبتدا ہوگا یا اغراء کے معنی پر ہوگا۔ اس صورت میں الذین فعل مقدر کے ساتھ منصوب ہوگا (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَخْشَوْهُمْ۔ یعنی لوگوں سے نہ ڈرو وَاخْشَوْنِ، خشیت کا اصل معنی وہ طمانیت ہے جو کسی تکلیف سے بچنے پر دل میں پیدا ہوتی ہے اور خوف کا مطلب دل کا گھبرانا ہے اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اعضاء کی خفت کی وجہ سے اسے خوف کہا جاتا ہے۔ آیت کا معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کی تحقیر کرنا ہے، اللہ کے سوا ہر ایک کے امر کو چھوڑنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے امر کی رعایت کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَمْنَعْنِي عَلَيْكُمْ يَهْلِكُ الْيَكُونُ پر معطوف ہے۔ یعنی لا اتم۔ یہ انخس کا قول ہے بعض نے فرمایا: یہ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور اس کی خبر مضمَر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: وَلَا تَمْنَعْنِي عَلَيْكُمْ عَنْ فَتْكُمُ قَبْلَتِي۔ یعنی میں تمہیں اپنے قبلہ کی معرفت عطا کر کے اپنی نعمت کو مکمل کر دوں۔ یہ زجاج کا قول ہے، نعمت کے مکمل کرنے سے مراد قبلہ کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: اتمام نعمت سے مراد جنت کا دخول ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: بندے پر اللہ تعالیٰ کی نعمت مکمل نہ ہوگی حتیٰ کہ اسے جنت میں داخل کر دے گا۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَ

الْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿٥﴾

”جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہارے پاس رسول تم میں سے، پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تمہیں اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب و حکمت اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ایسی باتوں کی جنہیں تم جانتے ہی نہیں تھے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمَا أَرْسَلْنَا كَافٍ مِّنْهُم مَّخْرُوفٍ كِ صِفَتِ كِ اعتبار سے محل نصب میں ہے۔ معنی یہ ہے لا تم نعستی علیکم اتسماً مثلاً ما ارسلنا۔ یہ فراء کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تمام اقوال میں سے بہتر قول ہے۔ یعنی تم پر ابراہیم کی سنت کے بیان میں اپنی نعمت مکمل کر دوں جس طرح ہم نے رسول مبعوث کیا (3)۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ اهتداءً مثلاً ما ارسلنا، تاکہ تم ہدایت پاؤ ایسی ہدایت جو ہمارے رسول بھیجنے کی طرح تھی۔ بعض نے فرمایا: یہ محل نصب میں بحیثیت حال ہے۔ معنی ہے میں تم پر اس حال میں اپنی نعمت مکمل کر دوں۔ تشبیہ اس طرح واقع ہے کہ

3۔ ایضاً، صفحہ 226، جلد 1

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 225، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا



قبلہ میں نعمت، رسالت میں نعمت کی طرح ہے۔ ذکر جس کا حکم دیا گیا ہے وہ بڑائی میں نعمت کی بڑائی کی طرح ہے۔ بعض نے فرمایا: کلام کے معنی میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی مجھے یاد کرو جس طرح ہم نے رسول بھیجا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسے زجاج نے پسند کیا ہے یعنی جس طرح ہم نے تم میں رسول بھیجا جسے تم سچائی کے ساتھ پہچانتے ہو۔ پس تم مجھے توحید کے ساتھ اور اسے تصدیق کے ساتھ یاد کرو۔ اس قول پر تہمت دون پر وقف جائز ہوگا۔

میں کہتا ہوں: اسی کو حکیم ترمذی نے اپنی کتاب میں اختیار کیا ہے، یعنی جس طرح میں نے تم پہ احسان کئے ہیں جن کو میں نے تم پر شمار کیا ہے۔ پس تم شکر کے ساتھ مجھے یاد کرو میں مزید نعمت کے ساتھ تجھے یاد کروں گا کیونکہ تمہارے اس ذکر میں میرے لئے شکر ہے اور میں نے شکر پر تم سے مزید کا وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَا زِيدَنَّكُمْ (ابراہیم: 7) یہاں کما میں کاف اور سورت انفال میں كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ (انفال: 5) میں کاف اور سورہ حجر کے آخر میں كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِبِينَ (الحجر) میں کاف، اپنے مابعد کے متعلق ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿٥٦﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا

بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٥٧﴾

”سو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور شکر ادا کیا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کیا کرو۔ اے ایمان والو! مدد

طلب کیا کرو صبر اور نماز (کے ذریعہ) سے بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ یہ امر اور جواب امر ہے۔ اس میں مجازا کا معنی ہے۔ اس وجہ سے اسے جزم دی گئی ہے۔ ذکر کی اصل مذکور کے لئے دل کا متنبہ ہونا اور اس کے لئے دل کا بیدار ہونا۔ ذکر باللسان کو ذکر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ذکر قلبی پر دلالت کرتا ہے لیکن جب زبانی ذکر پر کثرت سے ذکر کا اطلاق ہوا تو یہی ذکر سمجھا جانے لگا۔ آیت کا معنی ہے: تم اطاعت کے ساتھ میرا ذکر کرو میں تمہارا ثواب اور مغفرت کے ساتھ ذکر کروں گا۔ یہ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے اور اسی طرح فرمایا: ذکر، اللہ کی اطاعت ہے جس نے اس کی اطاعت نہ کی اس نے اس کا ذکر نہیں کیا، اگرچہ وہ کثرت سے تسبیح، تہلیل اور قرآن کی تلاوت کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اس نے اللہ کا ذکر کیا اگرچہ اس کی نماز اور روزہ کم بھی ہوں اور خیر کے اعمال تھوڑے بھی ہوں اور جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وہ اللہ تعالیٰ کو بھول گیا، اگرچہ نماز، روزہ اور خیر کے کام زیادہ بھی ہوں۔ ابو عبید اللہ محمد بن خویز مند اد نے ”احکام القرآن“ میں اس کو ذکر کیا ہے..... ابو عثمان نہدی نے کہا: میں اس گھڑی کو جانتا ہوں جب اللہ تعالیٰ ہمارا ذکر کرتا ہے، ان سے پوچھا گیا تم یہ کیسے جان لیتے ہو؟ ابو عثمان نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا) سدی نے کہا: جو بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتا ہے، جو مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے یاد کرتا ہے اور کوئی کافر اسے یاد نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ اسے عذاب سے یاد کرتا ہے (1)۔ ابو عثمان سے پوچھا گیا کہ ہم اللہ کا ذکر کرتے ہیں لیکن ہم اپنے دلوں

میں کوئی مٹھاس اور ذوق نہیں پاتے؟ ابو عثمان نے کہا: تم اللہ تعالیٰ کی اس پر حمد کرو کہ اس نے تمہارے ظاہری اعضاء کو اطاعت کے ساتھ مزین کیا۔ حضرت ذوالنون مصری نے کہا: جس نے حقیقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا وہ اپنے پہلو میں ہر چیز کو بھول گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر ہر چیز کی حفاظت کی اور اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر چیز سے عوض ہوگا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا: ابن آدم نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے زیادہ نجات دینے والا ہو۔

ذکر کی فضیلت اور اس کے ثواب میں احادیث کثیر ہیں جن کو ائمہ حدیث نے ذکر کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت عبد اللہ بن بسر سے روایت کیا ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: اسلام کی شرائع (احکام) بہت سے ہیں مجھے ان میں سے کوئی ایسی چیز بتائیں جس کو میں مضبوطی سے پکڑ لوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری زبان ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر ہو (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے، اور اس کے ہونٹ میرے ذکر کے ساتھ متحرک ہوتے ہیں (2)۔ اس عنوان کی احادیث اور ذکر کا مزید بیان **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا** (احزاب) کے تحت آئے گا ذکر سے مراد دل کا ذکر ہے جو عمومی حالات میں ہمیشہ رہنا واجب ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَأَشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ** (فراء) نے کہا: کہا جاتا ہے: شکرتک و شکرت لک نصحتک و نصحت لک۔ پہلا فصیح ہے۔ شکر کا مطلب احسان کو جاننا اور اس کو بیان کرنا ہے اس کا لغوی معنی ظاہر ہوتا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بندے کا اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احسان کو یاد کر کے اس کی شاکر رہے اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اطاعت پر اپنے بندے کی تعریف فرماتا ہے مگر بندے کا شکر زبان سے اور دل سے طاعات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے انعام کو یاد کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تَكْفُرُونِ** یہ نہی ہے اسی وجہ سے جمع کا نون حذف کیا گیا ہے اور یہ نون متکلم کا ہے اور یا کو حذف کیا گیا کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے اور غیر قرآن میں اس کا اثبات احسن ہے، یعنی میری نعمت اور میرے احسان کا انکار نہ کرو۔ یہاں کفر سے مراد جھٹلانا نہیں بلکہ نعمت کا چھپانا ہے۔ کفر کے لغوی معنی کی تحقیق گزر چکی ہے اور صبر اور نماز سے استعانت کا معنی بھی گزر چکا ہے۔ اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

**وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ** (۵۴)

”اور نہ کہا کرو انہیں جو قتل کئے جاتے ہیں اللہ کی راہ میں کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم (اسے) سمجھ نہیں سکتے۔“

یہ اس آیت کی مثل ہے: **وَلَا تَحْزَنُوا الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ** (آل

عمران) اس آیت کے تحت شہید اور شہداء کے احکام کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

جب اللہ تعالیٰ شہداء کو ان کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے تاکہ انہیں رزق دے تو جائز ہے کہ وہ کفار کو زندہ کرے تاکہ

انہیں عذاب دے۔ اس آیت میں عذاب قبر پر دلیل ہے۔ شہداء زندہ ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ زندہ ہوں گے۔ اگر یہ معنی ہوتا تو شہداء اور دوسرے لوگوں میں فرق نہ ہوتا کیونکہ آئندہ تو ہر ایک زندہ ہوگا۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ بھی دلالت کرتا ہے۔ مومنین جانتے ہیں کہ وہ زندہ ہوں گے۔ اموات کو مبتدا کے اضمار کی بنا پر رفع دیا گیا ہے اسی طرح بَلْ اَحْيَاؤُہُمْ اَحْيَاءُ کی ترکیب ہے، یعنی ہم اموات و ہم احياء۔ ان میں قول کو عمل کرانا صحیح نہیں کیونکہ قول اور اس کے درمیان مناسبت نہیں ہے۔ جس طرح تیرے اس قول میں صحیح ہے: قُلْتُ كَلَامًا وَحِجَّةً۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ

وَالْثَّمَرَاتِ ۚ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿۱۵۵﴾

”اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں کسی ایک چیز کے ساتھ یعنی خوف اور بھوک اور کمی کرنے سے (تمہارے)

مالوں اور جانوں اور پھلوں میں اور خوشخبری سنائیں ان صبر کرنے والوں کو“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِهٖ وَاَوْفَتْحٰہ ہے۔ سیبویہ کے نزدیک کیونکہ اتقائے ساکنین پایا گیا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: جب وَاَوْفَتْحٰہ کے ساتھ ملائی گئی تو فعل مبنی ہو گیا۔ پس یہ خمسۃ عشر کے قائم مقام ہو گیا۔ بلاء کبھی اچھی ہوتی ہے کبھی بری۔ اس کا اصل معنی محبت ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں آزمائیں گے تاکہ ہم مجاہد اور صابر کو آنکھوں سے دیکھنے والے کے علم کی طرح علم حاصل کر لیں تاکہ اس پر جزا واقع ہو جیسا کہ گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کے ساتھ آزمائے گئے تاکہ بعد والوں کے لئے نشانی بن جائیں اور وہ جان لیں کہ انہوں نے اس پر صبر کیا جب ان کے لئے حق واضح ہو گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: انہیں اس سے آگاہ کیا تاکہ انہیں یقین ہو جائے کہ انہیں مصائب سے دو چار ہونا پڑے گا۔ پس اس پر وہ اپنے نفسوں کو تسکین دیں اور جزع و فزع سے دور رہیں۔ اس آیت میں عزم اور نفس کو تسکین دینے میں جلدی ثواب ملنے کا مشرودہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِشَيْءٍ یہ لفظاً مفرد ہے اور اس کا معنی جمع ہے۔ ضحاک نے ہا شیاء جمع پڑھا ہے۔ جمہور نے مفرد پڑھا ہے یعنی کچھ خوف سے کچھ بھوک سے۔ پہلے کے ساتھ شے کے ذکر پر اختصار کی وجہ سے اکتفا کیا۔ مِّنَ الْخَوْفِ یعنی دشمن کا خوف اور جنگ کی گھبراہٹ۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ وَالْجُوعِ یعنی قحط سالی کے ساتھ۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا رمضان کے مہینہ کی بھوک مراد ہے۔ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ کفار سے جنگ لڑنے کے ساتھ۔ بعض نے فرمایا: مال کے ضیاع کے ساتھ۔ امام شافعی نے فرمایا فرض زکوٰۃ کے ساتھ۔ الْاَنْفُسِ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جہاد میں قتل اور موت کے ساتھ ہم جانوں میں کمی کر کے آزمائیں گے۔ امام شافعی نے فرمایا: امراض کے ساتھ الثَّمَرَاتِ امام شافعی نے فرمایا اس سے مراد بچوں کی موت ہے۔ انسان کی اولاد اس کے دل کا ثمرہ ہوتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد نبات کی قلت اور برکات کا انقطاع ہے۔



اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ** صبر پر ثواب کی بشارت دو۔ الصبر کا اصل معنی روکنا ہے۔ کا ثواب غیر مقدر ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے لیکن صبر، پہلے صدمہ کے وقت ہوتا ہے جیسا کہ بخاری نے حضرت انس سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: صبر پہلے صدمہ کے وقت ہے (1)۔ مسلم نے اس سے مکمل ذکر کی ہے۔ صبر جو نفس پر شاق ہوتا ہے اور اس پر بہت بڑا ثواب ہوتا ہے وہ مصائب کے هجوم اور ان کی حرارت کے وقت ہے یہ دل کی قوت اور صبر کے مقام پر ثابت قدم رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ جب مصیبت کی حرارت ٹھنڈی ہو جاتی ہے تو اس وقت ہر ایک صبر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے، عقلمند پر واجب ہے کہ وہ مصیبت کے وقت اس کیفیت کو لازم پکڑے جو احمق کی تین دن کے بعد ہوتی ہے۔ سہل بن عبد اللہ ستیری نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا **وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ** تو صبر زندگی بن گیا۔ صبر کی دو قسمیں ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کی معصیت (نافرمانی) سے صبر کرنا، یہ مجاہد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرنا (2)، یہ عابد ہے۔ جب آدمی اللہ تعالیٰ کی معصیت سے صبر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنی قضا پر رضا کا وارث بنا دیتا ہے۔ رضا کی علامت، نفس پر مکروہات اور محبوبات وارد ہونے پر دل اپنی جگہ سکون میں رہے۔ خواص نے کہا: صبر، کتاب و سنت کے احکام پر ثابت رہنا ہے۔ رویم نے کہا: صبر، شکوہ کا ترک کرنا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری نے کہا: صبر، اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا ہے۔ اساذ ابو علی نے کہا: صبر کی تعریف یہ ہے کہ تقدیر پر معترض نہ ہو۔ رہا شکوہ کے بغیر مصیبت کا اظہار، یہ صبر کے منافی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب کے قصہ میں فرمایا: **إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ** (ص: 44) (بے شک ہم نے پایا انہیں صبر کرنے والا بڑا خوبوں والا بندہ) اس کے ساتھ یہ بھی ان کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے کہا: **مَسْنِي الطَّرِيقِ** (الانبیاء: 83)

**الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** ⑤ **أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ**

**صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَاحَةٌ** ⑥ **وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ** ⑦

”جو کہ جب پہنچتی ہے انہیں کوئی مصیبت تو کہتے ہیں: بے شک ہم صرف اللہ ہی کے ہیں اور یقیناً ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن پر ان کے رب کی طرح طرح کی نوازشیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ثابت قدم ہیں۔“

اس میں چھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مُصِيبَةٌ** ہر وہ چیز جو مومن کو اذیت اور تکلیف دیتی ہے وہ مصیبت ہے۔ کہا جاتا

ہے: **اَصَابَهُ**، **اَصَابَتْهُ** و **مَصَابَةٌ** و **مَصَابًا**۔ اور **مُصِيبَةٌ** کی جمع مصائب ہے۔

**المُصِيبَةُ** (صاد کے ضمہ کے ساتھ) مصیبت کی مثل ہے۔ عرب ہمزہ کے ساتھ جمع بناتے ہیں۔ **المصائب** اس کی اصل و آو ہے گویا انہوں نے اصلی کو زائد کے ساتھ مشابہت دی۔ اس کی جمع مصادب بھی آتی ہے یہ اصل ہے۔ **المصاب** **الاصابة**۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، صفحہ 301، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الصبر عند الصدمة الاولى، صفحہ 174، جلد 1 (وزارت تعلیم)

شاعر نے کہا:

أَسْلِمَ انْ مَصَابِكُمْ رَجُلًا      أَهْدَى السَّلامِ تَحِيَّةَ ظَلَمٍ

و صاب السهم القرطاس، يصيب صيباً به، اصاب کے معنی میں ہے۔ المصيبة۔ النكبة ينكبها الانسان۔ اور یہ شعر میں استعمال ہوتا ہے۔ حضرت عکرمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک رات چراغ بجھ گیا تو آپ ﷺ نے پڑھا: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿۱﴾ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! کیا یہ بھی مصیبت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں ہر وہ چیز جو مومن کو اذیت دے وہ مصیبت ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی صحیح حدیث میں ثابت ہے جو مسلم نے حضرت ابوسعید اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے، ان دونوں حضرات نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ مومن کو جو مصیبت، تھکن، بیماری، غم، حتیٰ کہ دل کا روگ جو اسے پریشان کرتا ہے، لاحق ہوتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے گناہ مٹائے جاتے ہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر 2:** ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اپنی سند کے ساتھ حضرت فاطمہ بنت حسین سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو کوئی مصیبت لاحق ہوئی ہو پھر اس نے اپنی مصیبت کو یاد کیا اور پھر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿۱﴾ پڑھا ہو اگرچہ اس مصیبت کو بہت ساعرہ گزر چکا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسی طرح کا اجر لکھ دیتا ہے جس دن اسے مصیبت پہنچی تھی (2)۔

**مسئلہ نمبر 3:** مصائب میں سے بڑی مصیبت دین کی مصیبت ہے۔ ابو عمر نے فریابی سے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں فطر بن خلیفہ نے بیان کیا، فرمایا: ہمیں حضرت عطاء بن ابی رباح نے بیان کیا، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو مصیبت پہنچے تو میری وجہ سے جو اسے مصیبت پہنچی ہے اسے یاد کرنا چاہئے کیونکہ یہ بہت بڑی مصیبت ہے (3)۔ یہ سمرقندی ابو محمد نے اپنی مسند میں نقل کی ہے۔ ابو نعیم نے ہمیں بتایا، ہمیں فطر نے بتایا..... پھر اسی طرح حدیث بیان کی ہے۔ اسی طرح مکحول سے مرسل روایت کی ہے۔ حضرت ابو عمر نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا کیونکہ آپ سے جدائی کی مصیبت ہر مصیبت سے بڑی ہے جو آپ ﷺ کے بعد قیامت تک بندہ مومن کو پہنچنے والی ہے۔ آپ ﷺ کے جانے سے وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا، نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ سب سے پہلا شر جو ظاہر ہوا وہ عربوں وغیرہ کا ارتداد تھا۔

یہ خیر کا پہلا انقطاع اور پہلا نقصان تھا۔ حضرت ابوسعید نے کہا ہم نے رسول اللہ ﷺ کی قبر کی مٹی سے ہاتھ نہیں جھاڑے تھے حتیٰ کہ ہمارے دلوں نے انکار کیا۔ ابو العتاہیہ نے اپنی نظم میں اس حدیث کے معنی کو کتنا حسین انداز میں پیش کیا ہے۔

اصبر لكل مصيبة و تجلد و اعلم بان المرء غير مخلص

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب ثواب المومن، صفحہ 319، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، ما جاء في الصبر على المصيبة، صفحہ 116 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن دارمی، باب وفاة النبی ﷺ، صفحہ 40، جلد 1 (دارالحسن)

و ترى النية للعباد برصد  
هذا سبيل لست فيه باوحد  
فا ذكر مصابك بالنبي محمد ﷺ

اوما ترى ان المصائب جمة  
من لم يصب من ترى بمصيبة  
فاذا ذكرت محمد و مصابه

تو ہر مصیبت اور تکلیف پر صبر کر اور جان لے کہ انسان ہمیشہ رہنے والا نہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ مصیبتیں بہت سی ہیں اور موت بندوں کی تاڑ میں ہے۔ کون ہے جن کو مصیبت نہیں پہنچی، تو اس راستہ میں اکیلا نہیں ہے۔ جب تو حضرت محمد ﷺ کے ساتھ یاد کرو۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ لَرٰجِعُونَ** اللہ تعالیٰ نے ان کلمات کو مصیبت زدہ کے لئے پناہ گاہ بنایا ہے اور آزمائش میں مبتلا کئے گئے لوگوں کے لئے حفاظت کا باعث بنایا ہے، کیونکہ یہ مبارک معافی کا جامع ہے کیونکہ **إِنَّا لِلّٰهِ** کا قول توحید اور عبودیت کا اقرار ہے اور اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کا اقرار ہے اور **وَإِنَّا إِلَيْهِ لَرٰجِعُونَ** کا ارشاد اپنے نفسوں پر ہلاکت کا اقرار ہے اور قبور سے اٹھنے کا اقرار ہے اور اس پر یقین کا اظہار ہے کیونکہ تمام امور کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا یہ کلمات، ہمارے نبی سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کئے گئے۔ اگر حضرت یعقوب علیہ السلام اس کو پہچان لیتے تو یہ نہ کہتے یا اسفی علی یوسف۔

**مسئلہ نمبر 5:** ابوسفیان نے کہا: میں نے اپنے بیٹے سان کو دفن کیا جبکہ ابوطلحہ خولانی قبر کے کنارہ پر کھڑے تھے۔ جب میں نے قبر سے نکلنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے میرے ہاتھ سے پکڑا اور مجھ سے محبت کا اظہار کیا اور کہا: اے ابوسان! کیا میں تجھے بشارت نہ دوں۔ محمد ضحاک نے حضرت ابوموسیٰ سے روایت کر کے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب بندے کا بیٹافوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتا ہے: کیا تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کر لی ہے؟ فرشتے کہتے ہیں: ہاں۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے: کیا تم نے اس کے دل کا پھل توڑ لیا ہے؟ وہ کہتے ہیں: ہاں۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے: میرے بندے نے (اس صدمہ پر) کیا کہا؟ فرشتے کہتے ہیں: اس نے تیری حمد کی اور **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ لَرٰجِعُونَ** پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے کے لئے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو (1)۔

مسلم نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مسلمان کو جو مصیبت پہنچتی ہے پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ لَرٰجِعُونَ** اللہم اجرنی فی مصیبتی و اخلف لی خیراً منها، کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس سے بہتر بدلہ دیتا ہے (2)۔ یہی تنبیہ ہے **وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ** کے ارشاد پر۔ یا تو نعم البدل مل جائے گا جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ام سلمہ کو رسول اللہ ﷺ کی ذات عطا فرمائی تھی، جب ان کا خاوند ابوسلمہ فوت ہوا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ یا بڑا ثواب عطا فرماتا ہے جیسا کہ حضرت ابوموسیٰ کی حدیث میں ہے اور کبھی یہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، باب فضل المصیبة، صفحہ 121، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، صفحہ 300، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)



دونوں چیزیں ملتی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ** یہ صبر کرنے والوں اور **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** کہنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بندے پر صلاۃ کا مطلب، اس کا عفو، رحمت، برکت اور دنیا و آخرت میں شرف بخشنا ہے۔ زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلاۃ کا مطلب بخشنا اور اچھی تعریف ہے۔ اسی سے میت پر صلاۃ ہے۔ یہ اس کی تعریف اور اس کے لئے دعا ہے۔ رحمت کا لفظ دوبارہ ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ تاکید اور معنی کا اشباع ہے کیونکہ لفظ مختلف ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا **مِنَ الْبَيْنَاتِ وَالْهُدَىٰ**۔ اور ارشاد ہے: **أَمْ يَخْشَوْنَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ** (زخرف: 80) شاعر نے کہا:

صلی علی یحییٰ و اشیاعہ رب کریم و شفیع مطاع

یحییٰ اور اس کے گروہ پر رب کریم اور شفیع مطاع نے صلاۃ بھیجی۔

بعض علماء نے فرمایا: رحمت سے مراد مصیبت کا دور کرنا اور حاجت کو پورا کرنا ہے۔

بخاری میں ہے، حضرت عمر نے فرمایا: **نعم العداۃ: الذین إذا أصابتهم مصیبة قالوا إنا لله وإنا إليه راجعون** **أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ** **وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ** (بقرہ) (1) عدلان سے مراد الصلاۃ اور رحمت ہے اور علاوہ سے مراد **أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ** ہے۔ (عدلان، اونٹ کے دونوں طرفوں کے بوجھ کو کہتے ہیں اور علاوہ وہ بوجھ ہوتا ہے جو اونٹ کی پیٹھ پر ہوتا ہے) بعض علماء نے فرمایا: رحمت سے مراد ثواب کا استحقاق اور اجر کا بڑا کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: مصائب کا آسان کرنا اور حزن میں تخفیف کرنا ہے۔

**إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ**

”بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ پس جو حج کرے اس گھر کا یا عمرہ کرے تو کچھ حرج نہیں اسے

کہ چکر لگائے ان دونوں کے درمیان اور جو کوئی خوشی سے نیکی کرے تو اللہ تعالیٰ بڑا قدر دان خوب جاننے والا ہے۔“

اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** بخاری نے عاصم بن سلیمان سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت انس بن مالک سے صفا و مروہ

کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ہم دیکھتے تھے کہ صفا و مروہ زمانہ جاہلیت کے امور سے ہیں۔ جب اسلام آیا تو ہم ان

کے طواف سے رک گئے، اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل کیا: **إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ**..... الخ (2)۔

ترمذی نے حضرت عروہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت عائشہ سے کہا: میں کسی پر کوئی گناہ نہیں دیکھتا جو صفا و

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الصبر عند الصدمة الاولى، صفحہ 174، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ ایضاً کتاب التفسیر، سورہ بقرہ، صفحہ 646، جلد 1

مروہ کے درمیان طواف نہ کرے اور میں بھی کوئی پروا نہیں کرتا کہ میں ان کے درمیان طواف نہ کروں۔ حضرت عائشہ نے کہا: اے میرے بھانجے! تو نے بری بات کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صفا و مروہ کا طواف کیا اور مسلمانوں نے طواف کیا جو منات بت کے لئے احرام باندھتا تھا، جو مثل میں تھا تو صفا و مروہ کے درمیان طواف نہیں کرتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا**۔ اگر بات اس طرح ہوتی جس طرح تو نے کہا ہے تو عبارت اس طرح ہوتی۔ **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ إِلَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا**۔ زہری نے کہا: میں نے روایت ابر بکر بن عبد الرحمن بن حارث کے سامنے ذکر کی تو انہوں نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا: یہ علم ہے۔

میں نے بہت سے اہل علم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو عربوں میں سے صفا و مروہ کا طواف نہیں کرتے تھے وہ کہتے تھے: ہمارا طواف ان دو پہاڑوں کے درمیان امر جاہلیت سے تھا اور انصار میں سے کچھ لوگوں نے کہا: ہمیں بیت اللہ کے طواف کا حکم دیا گیا ہے، صفا و مروہ کے طواف کا حکم نہیں دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ** ابو بکر بن عبد الرحمن نے کہا: میرا خیال ہے یہ آیت ان لوگوں اور ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور فرمایا یہ حدیث حسن، صحیح ہے (1)۔ بخاری نے اس کا معنی نقل کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ**۔ کے الفاظ کے بعد یہ ہے، حضرت عائشہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے صفا و مروہ کے درمیان طواف کی سنت قائم فرمائی، اور کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان کا طواف چھوڑ دے۔ پھر میں نے ابو بکر بن عبد الرحمن کو بتایا تو انہوں نے کہا: جو تو نے سنا ہے یہ علم ہے۔ میں نے اہل علم سے سنا ہے وہ ذکر کرتے تھے کہ لوگ..... مگر جن کا حضرت عائشہ نے ذکر کیا، منات بت کے لئے احرام باندھتے تھے وہ تمام صفا و مروہ کے درمیان طواف کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا ذکر کیا اور قرآن میں صفا و مروہ کا ذکر نہیں کیا۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ ہم صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا ذکر نازل کیا ہے اور صفا کا ذکر نہیں کیا۔ کیا ہم پر کوئی حرج ہے کہ ہم صفا و مروہ کا طواف کریں؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ** الایہ، ابو بکر نے کہا یہ آیت دونوں فریقوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کے بارے میں بھی جو زمانہ جاہلیت میں صفا و مروہ کے درمیان طواف کرنے سے اجتناب کرتے تھے اور ان کے بارے میں جو پہلے طواف کرتے تھے پھر دور اسلام میں ان کا طواف کرنے سے اجتناب کرتے تھے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا حکم دیا ہے اور صفا کا ذکر نہیں کیا ہے حتیٰ کہ بیت اللہ کے طواف کے بعد اس کا ذکر کیا (2)۔

ترمذی نے عاصم بن سلیمان الاحول سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت انس بن مالک سے صفا و مروہ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: یہ دونوں جاہلیت کے شعائر سے تھیں جب اسلام آیا تو ہم ان کے طواف سے رک گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا**

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورہ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب وجوب الصفا والمروة، صفحہ 222، جلد 1 (وزارت تعلیم)

فرمایا یہ تطوع ہے..... وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ..... فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ یہ بخاری نے نقل کی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: زمانہ جاہلیت میں شیاطین ساری رات صفا و مروہ کے درمیان طواف کرتے رہتے تھے اور صفا و مروہ کے درمیان بت رکھے ہوئے تھے۔ جب اسلام ظاہر ہوا تو مسلمانوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم صفا و مروہ کے درمیان طواف نہیں کرتے کیونکہ یہ شرک ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ شعبی نے کہا: زمانہ جاہلیت میں صفا پر ایک بت تھا جس کو اساف کہا جاتا تھا۔ اور مروہ پر ایک بت تھا جسے نائلہ کہا جاتا تھا (2)۔ جب لوگ طواف کرتے تو ان بتوں کو چھوتے تھے۔ مسلمان اس وجہ سے ان کے درمیان طواف کرنے سے رک گئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

**مسئلہ نمبر 2:** لغت میں الصفا، صاف پتھر کو کہتے ہیں۔ مکہ میں یہ ایک معروف پہاڑ ہے اسی طرح مروہ بھی ایک پہاڑی ہے، اسی وجہ سے دونوں کو معرف بالام ذکر کیا۔ الصفا ذکر کیا ہے کیونکہ اس پر حضرت آدم علیہ السلام ٹھہرے تھے تو ان کے نام سے اسے موسوم کیا گیا اور حضرت حوا مروہ پر ٹھہری تھیں تو اسے عورت کے اسم سے تعبیر کیا۔ اس وجہ سے اسے مؤنث ذکر کیا۔ شعبی نے کہا: صفا پر ایک بت تھا جس کو اساف کہا جاتا تھا اور مروہ پر ایک بت تھا جس کو نائلہ کہا جاتا تھا، اسی اعتبار سے ان کی تذکیر و تانیث جاری ہوئی (3)۔ مذکر کو مقدم کیا۔ یہ عمدہ ہے کیونکہ احادیث اس معنی پر دلالت کرتی ہیں اور جو لوگ ان میں طواف ناپسند کرتے تھے اس کی وجہ بھی یہی تھی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں حرج کو اٹھا دیا۔ اہل کتاب کا خیال ہے کہ اساف اور نائلہ نے کعبہ میں زنا کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں پتھروں میں مسخ کر دیا۔ انہیں صفا و مروہ پر رکھا گیا تاکہ لوگ ان سے عبرت حاصل کریں جب عرصہ زیادہ گزر گیا تو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی عبادت ہونے لگی۔ واللہ اعلم

الصَّفَا (مقصود ہے) یہ صفا کی جمع ہے اس سے مراد صاف پتھر ہے۔ بعض نے فرمایا: الصفا، مفرد اسم ہے اس کی جمع صُفَعٌ اور اصفاء ہے جسے از جاء جمع ہے۔ راجز نے کہا:

كَأَنَّ مَتْنِيَهُ مِنَ النَّفْيِ مَوَاقِعَ الطَّيْرِ عَلَى الصُّفَى (4)

بعض علماء نے فرمایا: صفا کی شروط میں سے سفیدی اور صلابت ہے اور یہ صفا صفو سے مشتق ہے یعنی مٹی سے پاک۔ المروہ یہ البرد کا واحد ہے، یہ چھوٹے چھوٹے پتھر جن میں نرمی ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ سخت پتھر ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ مروہ پتھر ہے۔

شاعر نے کہا:

د تولى الارض عفا ذاهلاً فاذا ما صادف البرد رضح (5)

شاعر نے مروہ کو پتھر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب سورہ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ ایضاً

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 229، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

5۔ ایضاً

4۔ تفسیر طبری، صفحہ 54، جلد 2 (دار احیاء التراث العربی)



ابوزویب نے کہا:

حقى كانى للحوادث مروءة  
بصفا المشقر كل يوم تفرع

شاعر نے یہاں بھی پتھر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بعض نے فرمایا: یہ کالے پتھر ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ سفید چمکدار پتھر ہیں جن میں آگ ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ** یہ عبادت کی جگہوں میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے

ہے۔ یہ شعیرہ کی جمع ہے۔ الشعائر وہ جگہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے علامات بنایا۔ جیسے موقف، سعی اور نحر۔

شعار کا مطلب علامت ہے۔ کہا جاتا ہے: اشعر الہدی۔ لوہے کی نوک سے اونٹ کی کوہان میں علامت بنانا، یہ

تیرے قول اشعر سے ہے میں نے علامت بنائی۔ کیت نے کہا:

نقتلهم جيلاً فجيلاً تراهم  
شعائر قربان بهم يتقرب (1)

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ حَبَّ الْبَيْتَ**۔ حَبَّ کا معنی قَصَد ہے الحج کا معنی قصد کرنا ہے۔ شاعر

نے کہا:

فاشهد من عرف حلولا كثيرة  
يحبون سب الزبرقان المزعفرا

السب، یہ مشترک لفظ ہے۔ ابو بیدہ نے کہا: السب (کسرہ کے ساتھ) بہت زیادہ گالی دینے والا۔ سَبَكَ، جو تجھے گالی

دے۔ شاعر نے کہا:

لا تسبني فليست بسبي  
ان سبي من الرجال الكريم (2)

السب کا معنی دوپٹہ بھی ہے اسی طرح عمامہ بھی اس کا معنی ہے۔ مخبل سعدی نے کہا:

يحبون سب الزبرقان المزعفرا

وہ زعفران سے رنگے ہوئے عمامے باندھے ہوئے حج کرتے ہیں۔

لغت ہزیل میں السب، رسی کو بھی کہتے ہیں۔ ابو ذؤیب نے کہا:

تدلى عليها بين سب و خيطة  
بجرداء مثل الوكف يكبو غرابها

السبوب، رسیاں۔ روئی کا باریک دھاگہ۔ السببية اس کی مثل ہے جمع السبوب و السبائب۔ یہ جوہری کا قول ہے۔

حج الطبيب الشجة، جب طبیب سرچو کے ساتھ زخم کی پیمائش کا قصد کرے۔

شاعر نے کہا:

يحب مأمومة في قعرها لجف

وہ دماغ کے زخم کا علاج کرتا ہے جس کی گہرائی خوفناک ہے۔ اللجف، دھنسنے کو کہتے ہیں تلجفت البركنوئیں کا نچلا حصہ

دھنس گیا۔ پھر یہ اسم بیت اللہ کی طرف افعال مخصوصہ کے ساتھ قصد کرنے کے لئے خاص ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أَوْاعْتَمِرْ لِعَنَى زِيَارَتِ كَرْنَا۔ الْعِمْرَةُ** کا معنی زیارت ہے۔ شاعر نے کہا:

لقد ساء ابن معمر حين اعتمر مغزى بعيداً من بعيد و ضبر

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ** یعنی اس پر گناہ نہیں ہے۔ اس کی اصل جنوح سے ہے۔ اس کا معنی مائل ہونا ہے اسی سے الجوانح ہے۔ اعضاء کو ان کے ٹیڑھے ہونے کی وجہ سے جوارح کہا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ کی تاویل اس آیت کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس میں قول کی تحقیق یہ ہے کہ کہنے والے کا قول لا جناح عليك ان تفعل کا مطلب فعل کا مباح کرنا ہے اور لا جناح عليك الاتفعل کا مطلب ہے فعل کے ترک کی اباحت۔ جب عروہ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا: **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا۔** فرمایا: یہ دلیل ہے کہ طواف کا ترک کرنا جائز ہے۔ پھر شریعت کو اس پر پایا کہ طواف چھوڑنے میں رخصت نہیں پھر ان دو متعارض کو جمع کرنا طلب کیا۔ حضرت عائشہ نے عروہ سے کہا: **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا۔** طواف کے ترک کی دلیل نہیں ہے۔ یہ ترک کی دلیل تب ہوتا اگر عبارت اس طرح ہوتی: **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ إِلَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا۔**

پس یہ لفظ طواف کے ترک کی اباحت کے لئے نہیں آیا، اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ طواف کی اباحت کے افادہ کے لئے آیا ہے اس شخص کے لئے جو جاہلیت میں اجتناب کرتے تھے یا جو جاہلیت میں ان کا طواف کرتے تھے ان بتوں کا قصد کرتے ہوئے جو ان پہاڑوں کے اوپر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ طواف ممنوع نہیں ہے جب طواف کرنے والا باطل کا قصد نہ کرے۔

اگر کہا جائے کہ عطا نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فلا جناح عليه الا يطوف بهما پڑھا ہے اور یہی حضرت ابن مسعود کی قراءت ہے اور روایت ہے کہ حضرت ابی کے مصحف میں بھی اسی طرح ہے۔ حضرت انس سے اس کی مثل مروی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب اس کے خلاف ہے جو مصحف میں ہے اس لئے ایک قراءت کی وجہ سے اس کو نہیں چھوڑا جاسکتا جو مصحف میں ہے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ قراءت صحیح ہے یا نہیں ہے۔ عطا بغیر سماع کے حضرت ابن عباس سے مرسل روایات نقل کرتے ہیں اور حضرت انس سے جو روایت ہے وہ بھی ثقہ نہیں ہے یا (لا) تاکید کے لئے زائد ہوگا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

وما ألوم البيض الا تسخرا لباً رابن الشيط القفندرا

اس شعر میں الا تاکید کے لئے زائد ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** ترمذی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مکہ میں آئے تو بیت اللہ کے سات چکر لگائے اور پھر یہ آیت پڑھی: **وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (البقرہ: 125)** پھر مقام کے پیچھے نماز پڑھی پھر حجر اسود کے پاس آئے اسے استلام کیا پھر فرمایا: ہم وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے اللہ تعالیٰ نے آغاز فرمایا آپ نے صفا سے

شروع فرمایا اور فرمایا: صفا اور مروہ شعائر اللہ سے ہیں۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ اس پر اہل علم کے نزدیک عمل ہے صفا سے آغاز کرے۔ اگر مروہ سے پہلے شروع کیا تو یہ جائز نہ ہوگا پھر صفا سے شروع کرے۔

**مسئلہ نمبر 8:** صفا و مروہ کے درمیان سعی کے وجوب میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے فرمایا: یہ رکن ہے۔ یہ امام مالک کا مشہور مذہب ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سعی کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی فرض کی ہے (2)۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ اور کتب بمعنی اوجب ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (البقرہ: 183) تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کی ہیں (3)۔ ابن ماجہ نے شیبہ کی ام ولد سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے دیکھا آپ فرما رہے تھے: ”درمیانی وادی کو تیز چل کر طے کیا جائے گا (4)“۔ جو سعی کو چھوڑ دے یا ایک چکر بھول کر یا جان بوجھ کر چھوڑ دے تو وہ اپنے شہر سے لوٹ آئے یا جہاں سے اسے یاد آئے مکہ کی طرف لوٹ آئے طواف کرے اور سعی کرے کیونکہ سعی ہمیشہ طواف کے ساتھ متصل ہوتی ہے۔ امام مالک کے نزدیک یہ برابر ہے خواہ حج میں ہو یا عمرہ میں ہو۔ اگرچہ عمرہ میں فرض نہیں۔ اگر اس نے حقوق زوجیت ادا کر لئے ہوں تو اس پر امام مالک کے نزدیک تمام مناسک پورے کرنے کے باوجود اس پر عمرہ اور ہدی ہوگی۔

امام شافعی نے فرمایا: اس پر ہدی ہوگی عمرہ کا کوئی معنی نہیں جب وہ لوٹ آئے طواف کرے اور سعی کرے۔ امام ابو حنیفہ نے اور ان کے اصحاب، ثوری اور شعبی نے کہا: سعی واجب نہیں ہے اگر کوئی حاجی سعی چھوڑ دے حتیٰ کہ وہ اپنے شہر چلا جائے تو اس کا نقصان دم سے پورا کیا جائے گا کیونکہ سعی حج کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ یہ امام مالک کا قول العتبیۃ میں ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن زبیر، حضرت انس بن مالک اور ابن سیرین سے روایت ہے کہ سعی تطوع (نفل) ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا حَزْرًا اور کسائی نے بطوع مضارع مجزوم پڑھا ہے اسی طرح فسن تطوع خیراً فہو خیر لہ میں پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ماضی کا صیغہ تطوع پڑھا ہے۔ تطوع سے مراد وہ نیک عمل ہوتا ہے جو مومن اپنی طرف سے کرتا ہے پس جو نوافل ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی قدر دانی فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندے کے لئے شکر یہ ہے کہ وہ اسے اپنی اطاعت پر ثابت رکھتا ہے۔ صحیح وہ ہے جو امام شافعی کا نظریہ ہے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: مجھ سے اپنے مناسک (حج) سیکھ لو (5)۔

پس یہ حج کے مجمل کا بیان ہو گیا۔ پس فرض ہونا واجب ہے جس طرح نماز کی رکعات تعداد بیان فرمائی۔ جو اس طرح ہو تو

2۔ مسند امام احمد بن حنبل، صفحہ 421، جلد 6 (دار صادر)

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورہ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، صفحہ 201، جلد 1 (وزارت تعلیم)

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب السعی بین الصفا والمروۃ، صفحہ 221 (وزارت تعلیم)

5۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الحج، صفحہ 125، جلد 5 (دار الفکر)



اتفاق نہیں ہوتا کہ سنت ہے یا نفل ہے۔

طلیب نے کہا: حضرت ابن عباس نے ایک قوم کو صفاد مردہ کے درمیان طواف کرتے دیکھا تو فرمایا: یہ تمہیں تمہاری ماں ام اسماعیل نے وراثت میں دیا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح بخاری میں ثابت ہے جیسا کہ اس کا بیان سورہ ابراہیم میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 9:** کسی کے لئے بیت اللہ کا طواف اور صفاد مردہ کے درمیان سعی سوار ہو کر نی جائز نہیں مگر عذر ہو تو جائز ہے۔ اگر عذر کی بناء پر سوار ہو کر طواف کیا تو اس پر دم ہوگا اور اگر غیر معذور نے سوار ہو کر طواف کیا تو وہ دوبارہ ادا کرے اگر بیت اللہ کے قریب ہو اور اگر دور جا چکا ہو تو ہدی دے۔ یہ ہم نے اس لئے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود طواف کیا اور فرمایا: خذوا عني مناسككم۔ مجھ سے مناسک حج سیکھ لو۔ اور عذر کی بناء پر ہم نے جائز قرار دیا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اونٹ پر سوار ہو کر کیا تھا اور اپنی کھوٹی سے حجر اسود کو استلام کیا تھا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا: جب انہوں نے اپنی تکلیف کی شکایت کی: لوگوں کے پیچھے طواف کر دریاں حالیکہ تو سوار ہو (1)۔

ہمارے اصحاب نے اونٹ پر طواف کرنے اور انسان کی پیٹھ پر طواف کرنے کے درمیان فرق کیا ہے اگر انسان کی پیٹھ پر طواف کرے گا تو جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت وہ طواف کرنے والا نہ ہوگا بلکہ اٹھانے والا طواف کرنے والا ہوگا جب اونٹ پر طواف کرے گا تو وہ خود طواف کرنے والا ہوگا۔ ابن خویز مند اد نے کہا: یہ اختیار کا تفرقہ ہے۔ رہا کفایت کرنا تو یہ کفایت کر جائے گا۔ جیسے اگر کسی پر غشی طاری ہو اور اسے اٹھا کر طواف کرایا جائے یا اٹھا کر عرفات میں اسے وقوف کرایا گیا تو اس کی طرف سے جائز ہو جائے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۖ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّعْنُونَ ﴿٥١﴾

”بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ان چیزوں کو جو ہم نے نازل کیں روشن دلیلوں اور ہدایت سے اس کے بعد بھی کہ ہم نے کھول کر بیان کر دیا انہیں لوگوں کے واسطے (اپنی) کتاب میں، یہی وہ لوگ ہیں کہ دور کرتا ہے انہیں اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت سے) اور لعنت کرتے ہیں انہیں لعنت کرنے والے۔“

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جو نازل شدہ بینات اور ہدایت کو چھپاتا ہے وہ ملعون ہے۔ اس کی مراد میں اختلاف ہے بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہود اور عیسائی راہب ہیں جو حضرت محمد ﷺ کے امر کو چھپاتے تھے۔ یہود نے رحم کے امر کو چھپایا۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے حق کو چھپایا یہ ہر شخص میں عام ہے (خواہ) جس نے دین کے علم کو چھپایا جبکہ اس کے پھیلانے کی ضرورت تھی۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد میں اس کی تفسیر کی گئی ہے جس سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، باب السریض بطوف را کیا، ص 221، جلد 1 (وزارت تعلیم)

کوئی علمی بات پوچھی گئی جس کو وہ جانتا تھا پھر اس نے اسے چھپایا تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز آگ کی لگام سے لگام دے گا۔ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص نے روایت کیا ہے (1)۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود کا قول اس کے معارض ہے: تو کسی قوم کے سامنے ایسی حدیث بیان کرے جن تک ان کی عقل نہیں پہنچیں گی تو وہ بعض لوگوں کے لئے فتنہ کا باعث ہوگی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کو وہ بیان کرو جس کو وہ سمجھتے ہوں کیا تم پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے (2)۔ یہ بعض علوم پر محمول ہے۔ جس طرح علم کلام ہے یا ایسا علم جس کے سمجھنے میں تمام لوگ برابر نہ ہوں۔ عالم کا حکم یہ ہے کہ وہ وہ چیز بیان کرے جو سمجھی جائے اور ہر انسان کو اس کے مرتبہ کے مطابق ذیل کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

**مسئلہ نمبر 2:** حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسی آیت کا ارادہ فرمایا تھا جب آپ نے فرمایا تھا: اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں آیت نہ ہوتی تو میں تمہیں کوئی حدیث بیان نہ کرتا (3)۔ اس سے علماء نے علم حق کی تبلیغ کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ عمومی طور پر علم کو بیان کرنا اس پر اجرت لئے بغیر کیونکہ اس پر اجرت لینے کا مستحق نہیں ہوتا جس کا اس پر کرنا لازم ہو۔ جس طرح اسلام پر اجرت کا مستحق نہیں ہوتا۔ اس پر کلام گزر چکی ہے۔

آیت کی تحقیق یہ ہے کہ عالم جب علم کو چھپانے کا قصد کرے گا تو نا فرمان ہوگا اور جب علم چھپانے کا قصد نہ کرے تو تبلیغ لازم نہیں۔ جب اسے معلوم ہو کہ غیر کے پاس یہ علم ہے اور جس سے کوئی بات پوچھی جائے تو اس آیت اور حدیث کی وجہ سے اس پر تبلیغ کرنا واجب ہے اور کافر کو قرآن اور علم سکھانا جائز نہیں حتیٰ کہ وہ مسلمان ہو جائے۔ اسی طرح جھگڑا بدعتی اور جھگڑا الو آدمی کو تعلیم دینا جائز نہیں تاکہ اہل حق سے جھگڑے۔ اور کسی خصم کو ایسی حجت نہ سکھائی جائے جس کے ذریعے مال ظلماً لے لے۔ اور بادشاہ کو ایسی تاویل نہ سکھائے جس کے ذریعے وہ رعیت کو تکلیف دے اور بے وقوف لوگوں میں ایسی رخصت نہ پھیلانے کہ وہ اس کو ممنوعات کے ارتکاب اور واجبات کے ترک کا راستہ بنائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حکمت کو اس کے اہل سے مت روکو ورنہ تم ان پر ظلم کرو گے اور غیر اہل لوگوں کو حکمت نہ سکھاؤ ورنہ تم حکمت پر ظلم کرو گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے، فرمایا: (موتیوں کو خنازیر کی گردنوں میں نہ لٹکاؤ (4)) یعنی فقہ کی تعلیم ایسے شخص کو نہ دو جو اس کا اہل نہیں۔ سخون نے کہا: حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عمرو بن العاص کی حدیث شہادت کے بارے میں ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں ہے ”جس سے علم کے متعلق پوچھا گیا (5)“ یہ نہیں فرمایا جس نے شہادت کو بیان نہیں کیا۔ ظاہر پر باقی رکھا جاتا ہے حتیٰ کہ اس پر کوئی ایسی چیز وارد ہو جو اس کو زائل کر دے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، باب من سئل من علم فکتبه، صفحہ 23 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، صفحہ 24، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء، صفحہ 121، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم، صفحہ 22، جلد 1 (وزارت تعلیم) 4۔ تاریخ بغداد، صفحہ 350، جلد 9 (دارالکتب المصریہ)

5۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، باب لی کتمان العلم، صفحہ 89، جلد 2 (وزارت تعلیم)

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مِنَ الْبَيْتِ وَالْهُدٰی** یہ منصوص علیہ اور مستنبط کو شامل ہے کیونکہ ہدی کا اسم تمام کو شامل ہے۔ اس میں ایک شخص کے قول کے عمل کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ اس پر بیان واجب نہیں مگر اس کے قول کا قبول کرنا واجب ہے۔ فرمایا: **إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنَّا** (البقرہ: 160) ان کی خبر کے ساتھ بیان کے وقوع کا حکم لگایا۔ اگر کہا جائے کہ یہ جائز ہے کہ ہر ایک کو علم چھپانے سے منع کیا گیا ہو اور بیان کا حکم دیا گیا ہو تا کہ خبر دینے والے کثیر ہوں اور ان کی خبر متواتر ہو۔ ہم کہتے ہیں: یہ غلط ہے کیونکہ کتمان سے منع نہیں کیا گیا مگر انہیں جن پر اتفاق جائز ہو اور جن کا کتمان پر اتفاق جائز ہے ان کی خبر علم کا موجب نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

**مسئلہ نمبر 4:** جب **مِنَ الْبَيْتِ وَالْهُدٰی** فرمایا: تو یہ دلیل ہے کہ بینات اور ہدایت کے علاوہ جو علم ہے اس کا چھپانا جائز ہے، خصوصاً جب اس کے اظہار میں خوف ہو تو اس کا چھپانا مزید مؤکد ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کو ترک فرمایا جب انہیں خوف تھا۔ فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو برتن (علم کے) یاد کئے۔ ایک برتن کو میں نے پھیلا دیا اور دوسرا برتن اگر میں اسے پھیلاؤں تو میرا گلا کاٹ دیا جائے۔ اس روایت کو بخاری نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت ابو عبد اللہ نے فرمایا: بلعوم، کھانے والی نالی کو کہتے ہیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ وہ علم تھا جس کو حضرت ابو ہریرہ نے نہیں پھیلا یا اور انہیں اس کے پھیلانے میں فتنہ اور قتل کا خوف تھا۔ یہ علم فتنوں کے امر کے متعلق تھا منافقین اور مرتدین کی شخصیات پر نص کے متعلق تھا۔ ہر وہ علم کہ بینات اور ہدی کے متعلق نہ ہو اس کا یہی حکم ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ، بَيِّنَاتٍ** میں ضمیر کا مرجع بینات اور ہدایت ہیں۔ الکتاب اسم جنس ہے اور اس سے مراد تمام کتب منزلہ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ** یعنی اللہ تعالیٰ ان سے بری ہوتا ہے اور ان کو ثواب سے دور رکھتا ہے اور انہیں کہتا ہے تم پر میری لعنت ہو جس طرح شیطان لعین کو کہا **وَان عَلٰیكَ لَعْنَتِيْ**۔ لغت میں لعن کا معنی دور کرنا اور دھتکارنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ** قتادہ اور ربیع نے کہا: اللاعنون (لعنت کرنے والے) سے مراد فرشتے اور مومنین ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ واضح اور کلام کے معنی پر جاری ہے۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: اس سے مراد حشرات الارض اور جانور ہیں جنہیں علماء سو جو علم کو چھپانے والے ہوتے ہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے خشکی اور قحط سالی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پس وہ انہیں لعنت کرتے ہیں۔ زجاج نے کہا: درست قول ان علماء کا ہے جو کہتے ہیں کہ اللاعنون سے مراد فرشتے اور مومنین ہیں۔ اور یہ کہ اس سے مراد زمین کے جانور ہیں اس کی حقیقت پر آگاہی صرف نص یا خبر لازم سے ہو سکتی ہے اور ان میں سے ہم کوئی چیز نہیں پاتے۔



میں کہتا ہوں: اس کے متعلق ایک خبر وارد ہے جسے حضرت براء بن عازب نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعُنُونَ کے تحت فرمایا: دواب الارض یعنی اللاعنون سے مراد زمین کے جانور ہیں (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے محمد بن الصباح سے روایت کیا ہے ہمیں عمار بن محمد نے لیث سے انہوں نے ابو المنہال سے انہوں نے زاذان سے انہوں نے حضرت براء سے روایت کی ہے۔ اس کی سند حسن ہے۔ اگر کہا جائے کہ عقول اور غیر عقول کو کیسے جمع کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ غیر عقول کی طرف عقول والوں کا فعل منسوب کیا جیسا کہ ارشاد فرمایا: مَا آتٰهُمْ لِيْ سَجْدَیْنِ (یوسف: 4)۔ یہاں ساجدات نہیں فرمایا۔ فرمایا: لَمْ شَهِدْتُمْ عَلَیْنَا۔ اور فرمایا: وَتَرٰهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ (اعراف: 198) اس کی مثالیں کثیر ہیں۔ ان شاء اللہ آگے وضاحت آئے گی۔

حضرت براء بن عازب اور حضرت ابن عباس نے کہا اللّٰعُنُونَ سے مراد جن وانس کے علاوہ تمام مخلوق ہے۔ یہ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کافر کو جب قبر میں مارا جاتا ہے تو وہ چیختا ہے اس کی چیخ جن وانس کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے اور ہر سننے والا اس کو لعنت کرتا ہے (2)۔ حضرت ابن مسعود اور سدی نے کہا: ایک شخص اپنے ساتھی کو لعنت کرتا ہے پھر وہ لعنت آسمان کی طرف بلند ہو جاتی ہے پھر وہ نیچے آتی ہے تو وہ اس شخص میں اس کی اہلیت نہیں پاتی تو وہ پھر لعنت کرنے والے کی طرف لوٹ جاتی ہے اسے بھی اس کا اہل نہیں پاتی تو وہ ان یہود پر واقع ہوتی ہے جنہوں نے نازل شدہ کلام کو چھپایا (3)، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان یَلْعَنُهُمُ اللّٰعُنُونَ سے یہی مراد ہے۔ پس ان میں سے جو مر جاتا ہے اس سے لعنت اٹھ جاتی ہے اور جو باقی یہود ہوتے ہیں ان میں موجود رہتی ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۱﴾

”البتہ جو لوگ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں (جواب تک چھپاتے رہے) تو ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہوں اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہوں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا اللّٰهُ تَعَالٰی نے توبہ کرنے والوں، اچھے اعمال کرنے والوں اور توبہ کی طرف لوٹنے والوں کی استثنا فرمائی۔ ہمارے علماء کے نزدیک توبہ میں صرف یہ کہنا (میں نے توبہ کی) کافی نہیں ہے حتیٰ کہ اس سے پہلے قول و عمل کے خلاف دوسرا قول و فعل ظاہر ہوا اگر وہ مرتد تھا تو وہ اسلام کی طرف لوٹ آئے۔ شرائع اسلام کو ظاہر کرنے والا ہو۔ اگر وہ گنہگاروں سے ہو تو اس سے نیک عمل ظاہر ہو اور اہل فساد اور ان احوال سے کنارہ کش ہو جس پر پہلے وہ تھا اگر وہ بت پرستوں میں سے تھا تو وہ بت پرستوں سے علیحدہ ہو جائے اور اہل اسلام سے مل جائے۔ اسی طرح پہلے جس حالت پر تھا اس کا عکس ظاہر کرے۔ توبہ کا بیان اور اس کے احکام ان شاء اللہ سورہ نساء میں آئیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَبَیَّنُوْا سے مراد شراب

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب لعنوبات، صفحہ 300 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب جاء فی عذاب القبر، صفحہ 184، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی اللعن، صفحہ 316، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کے مسئلے توڑ دینا اور شراب کو بہا دینا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد تورات میں حضرت محمد ﷺ کی نبوت اور آپ کی اتباع کا وجوب جو موجود ہے اسے بیان کرنا ہے۔ عموم اولیٰ ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے یعنی جس حالت پر تھے اس کے خلاف ظاہر کرنا۔ فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَآمَنُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ

أَجْمَعِينَ ﴿٣٠﴾ خُلِدَ يَنْ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٣١﴾

”بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور مرے اس حال پر کہ وہ کافر تھے یہی وہ لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی۔ ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ كُفَّارٌ وَأَوْحَالِيہ ہے۔ ابن عربی نے کہا: مجھے میرے اکثر مشائخ نے بتایا کہ معین کافر پر لعنت جائز نہیں کیونکہ اس کی وفات کی حالت معلوم نہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لعنت کے اطلاق میں کفر پر وفات شرط رکھی ہے۔ اور وہ روایت جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے متعین کفار پر لعنت کی (1)۔ تو یہ اس لئے تھا کہ نبی کریم ﷺ کو ان کے انجام کا علم تھا۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک ظاہر حال کی وجہ سے لعنت کرنا اور اسے قتل کرنا اور اس سے قتال کرنا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! عمرو بن العاص نے میری ہجو کی اسے معلوم ہے کہ میں شاعر نہیں ہوں تو اس پر لعنت کر اور اس کی ہجو کر جتنی اس نے میری ہجو کی (2)، آپ ﷺ نے عمرو بن العاص پر لعنت کی، اگرچہ ایمان، دین اور اسلام اس کا انجام تھا۔ آپ ﷺ نے انصاف فرمایا کہ عرض کی: جتنی اس نے میری ہجو کی ہے اتنی اس کی ہجو فرما، زیادتی نہیں کی تاکہ وہ عدل و انصاف کو جان لے اور ہجو کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا یہ باب الجزاء سے ہے۔ اس وصف سے ابتدا نہیں کی۔ جس طرح مکر، استہزاء اور خدیعہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و بالا ہے اس سے جو ظالم کہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: بغیر تعین کے تمام کفار پر لعنت کرنے میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ امام مالک نے داؤد بن حصین کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اعرج کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے لوگوں کو پایا کہ وہ رمضان میں کفار پر لعنت کرتے تھے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: خواہ کفار ذمی ہوں یا ذمی نہ ہوں یہ واجب نہیں۔ لیکن جو کفار پر لعنت کرے اس کے لئے مباح ہے کیونکہ انہوں نے حق کا انکار کیا اور دین اور دینداروں سے عداوت کی۔ اسی طرح جو سرعام گناہ کرے جیسے شراب پینے والے، سود کھانے والے اور جو عورتوں میں سے مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں اور مردوں میں سے جو عورتوں کی مشابہت

1۔ احکام القرآن لابن عربی، صفحہ 50، جلد 1 (دار الفکر)

2۔ الہندی فی کنز العمال، صفحہ 548، جلد 13، حدیث نمبر 37431 (مکتبۃ التراث الاسلام)

اختیار کرتے ہیں ان کے علاوہ جن کے متعلق احادیث میں لعنت وارد ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** کافر کو لعنت کرنا کفر پر زجر کے اعتبار سے نہیں بلکہ وہ کفر پر جزا اور اس کے کفر کے قبح کے اظہار کے طور پر ہے کافر مردہ ہو یا مجنون ہو۔ سلف کی ایک قوم نے کہا: جو کافر مجنون ہے یا جو کافر مر چکا ہے اس کو لعنت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں یہ بطریق جزا جائز ہے اور نہ بطریق زجر کیونکہ وہ اس سے متاثر نہیں ہوتا۔

اس معنی کے اعتبار سے آیت سے مراد یہ ہوگا کہ لوگ قیامت کے دن اسے لعنت کریں گے تاکہ وہ اس سے متاثر ہو اسے نقصان پہنچے اور اس کا دل دکھے..... تو یہ اس کے کفر پر جزا ہوگی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ** (عنکبوت: 25)

اس قول پر دلیل ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینا ہے کہ وہ ان پر لعنت کرتا ہے یہ بطور امر نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا: معین گنہگار کو لعنت کرنا بالاتفاق جائز نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ ایک بار شراب پینے والے کو لایا گیا تو مہرود لوگوں میں سے کسی نے کہا اللہ اس پر لعنت کرے اسے کتنی بار لایا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی کے خلاف شیطان کے معاون نہ ہو۔ آپ نے اس کے لئے اخوت کی حرمت کا ذکر کیا، یہ شفقت کا موجب ہے، یہ حدیث صحیح ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: بخاری اور مسلم نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے معین گنہگار کو لعنت کرنے میں جواز کا قول کیا ہے۔ انہوں نے کہا: نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد نعیمان کے حق میں فرمایا جبکہ اس پر حد قائم ہو چکی تھی۔ اور جس پر اللہ تعالیٰ کی حد قائم ہو جائے اسے لعنت کرنا مناسب نہیں اور جس پر حد قائم نہ ہو اسے لعنت کرنا جائز ہے۔ خواہ اس کا نام لیا گیا ہو یا متعین کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ لعنت نہیں فرماتے تھے مگر اس پر جس پر لعنت واجب ہوتی ہے جب تک وہ اس لعنت کی موجب حالت پر باقی رہتا، جب وہ اس جرم سے توبہ کر لیتا اور اس کو ختم کر دیتا، اور حد اسے پاک کر دیتی تو لعنت اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ اس کو نبی کریم ﷺ کے اس فرمان نے واضح کیا ہے: جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے تو اسے حد لگاؤ اور اسے برا نہ کہو (2)..... یہ حدیث اپنی صحت کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تشریب (برا بھلا کہنا) اور لعنت کرنا حد لگنے سے پہلے اور توبہ کرنے سے پہلے ہے۔ اللہ تعالیٰ اعلم

ابن عربی نے کہا: گنہگار پر مطلقاً لعنت کرنا بالاتفاق جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے جو انڈا چوری کرتا ہے پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے (3)۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ** یعنی اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے دور کرتا ہے۔ اللعن کا اصل معنی دھتکارنا اور دور کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بندوں کی طرف سے لعنت، دھتکارنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت عذاب ہے۔ حسن بھری نے والملائكة والناس اجمعون حالت رقی میں پڑھا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 50، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الزنا، صفحہ 70، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب لعن السارق، صفحہ 1003، جلد 2 (وزارت تعلیم)



ہے (1) اس کی تاویل یہ ہے: اولئك جزاءهم ان يلعنهم الله ويلعنهم الملائكة ويلعنهم الناس اجمعون۔ جیسے تو کہتا ہے: کرہت قیام زید و عمرو و خالد کیونکہ اس کا معنی ہے کرہت ان قام زید۔ حسن کی قراءت مصاحف کے مخالف ہے۔ اگر کہا جائے: تمام لوگ تو لعنت نہیں کرتے کیونکہ ان کی قوم تو انہیں لعنت نہیں کرتی۔ اس کے تین جواب دیئے گئے ہیں: (۱) اکثر لوگوں کی طرف سے لعنت ہوتی ہے اس لئے تمام لوگوں کی لعنت کا اطلاق کیا گیا۔ اکثر کو اقل پر غلبہ دیا گیا۔ (۲) سدی نے کہا: ہر ایک ظالم پر لعنت کرتا ہے جب کا فر ظالم پر لعنت کرتا ہے تو وہ اپنے آپ پر لعنت کرتا ہے۔ (۳) ابو العالیہ نے کہا: اس سے مراد قیامت کے دن کی لعنت ہے تمام لوگوں کے ساتھ ان کی قوم بھی انہیں لعنت کرے گی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا (عنکبوت: 25)

پھر فرمایا: خُلِدَ يَوْمَئِذٍ فِيهَا لَعْنَتٌ مِّنْ لَّعْنَتِ الْكَافِرِينَ۔ بعض نے فرمایا ان کا لعنت میں خلود ہمیشہ ہے۔ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ یعنی کسی وقت بھی عذاب سے مؤخر نہیں کئے جائیں گے خُلِدَ يَوْمَئِذٍ، علیہم میں ہا اور میم سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اس میں عامل علیہم کا قول ظرف ہے۔ کیونکہ اس میں لعنت کے استقرار کا معنی ہے۔

وَالْهَيْكَلُ إِلَهٌ وَاحِدٌ ۚ لَّا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ﴿٣٧﴾

”اور تمہارا خدا ایک خدا ہے نہیں کوئی خدا بجز اس کے بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْهَيْكَلُ إِلَهٌ وَاحِدٌ جب اللہ تعالیٰ نے حق کو چھپانے سے ڈرایا تو یہ بیان فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جس کا اظہار واجب ہے اور جس کا چھپانا جائز نہیں وہ توحید کا امر ہے اور اس کو برہان کے ذکر سے ملایا، نظر و فکر کا طریقہ سکھایا اور وہ کائنات کے عجائب میں غور و فکر ہے تاکہ وہ جان لے کہ اس کائنات کے لئے کوئی فاعل ہونا ضروری ہے جس کے مشابہ کوئی شئی نہ ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا قریش کفار نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے لئے اپنے رب کا نسب بیان کرو تو اللہ تعالیٰ نے سورہ اخلاص اور یہ آیت نازل فرمائی۔ اور مشرکین کے لئے تین سو ساٹھ بت تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ ایک ذات ہے (2)۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَّا إِلَهَ إِلَّا هُوَ یہی اور اثبات ہے اس کا اول کفر ہے اور اس کا آخر ایمان ہے۔ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

شبلی سے حکایت ہے کہ وہ فرماتے تھے: اللہ اللہ کہتے اور لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ نہیں کہتے تھے، اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: مجھے ڈر رہتا ہے کہ میں نفی کا کلمہ کہوں اور اقرار کا کلمہ نہ کہہ سکوں۔

میں کہتا ہوں: یہ ان علوم دقیقہ میں سے ہے جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس معنی کو اپنی کتاب میں نفی اور اثبات میں ذکر فرمایا اور اس کا تکرار فرمایا اور اپنے نبی کی زبان کے ذریعے اس کے کہنے والے کے لئے بہت بڑے ثواب

کا وعدہ فرمایا۔ موطا، بخاری اور مسلم وغیرہم نے نقل فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کا آخری کلام لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا (1) اور اس سے مقصود دل سے یہ تسلیم کرنا ہے، زبان سے کہنا نہیں ہے۔ اگر کسی نے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہا اور وہ فوت ہوا جبکہ اس کا اعتقاد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ان تمام صفات پر تھا جو اللہ تعالیٰ کے لئے واجب ہیں تو اہل سنت کا اتفاق ہے کہ وہ جنتی ہے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے اسم واحد اور لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ اور الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ کا معنی اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنى میں بیان کر دیا ہے۔ والحمد للہ

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿١٣﴾

”بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی گردش میں اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں اٹھائے جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو اور جو اتار اللہ تعالیٰ نے بادلوں سے پانی پھر زندہ کیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور پھیلا رہے ہیں اس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلتے رہنے میں اور بادل میں، جو حکم کا پابند ہو کہ آسمان اور زمین کے درمیان (لٹکتا رہتا) ہے۔ (ان سب میں) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔“

اس میں چودہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** عطانے کہا: جب وَاللَّهُمَّ إِلَهَ وَاحِدٌ کا ارشاد نازل ہوا تو کفار قریش نے کہا: ایک خدا سب لوگوں کی باتیں کیسے سنا ہے تو یہ آیت نازل ہوئی إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ یہ سفیان نے اپنے باپ سے انہوں نے ابوالفضی سے روایت کیا ہے فرمایا: جب وَاللَّهُمَّ إِلَهَ وَاحِدٌ کا ارشاد نازل ہوا تو انہوں نے کہا اس پر کوئی دلیل بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ، (2) گویا انہوں نے نشانی طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے توحید کی دلیل بیان فرمائی کہ یہ عالم اور اس کی عجیب تخلیق کا ضرور کوئی بانی اور صانع ہے۔ اور سموت کو جمع ذکر فرمایا کیونکہ یہ مختلف اجناس ہیں اور ہر آسمان کی جنس، دوسرے سے مختلف ہے اور زمین کو مفرد ذکر فرمایا کیونکہ تمام مٹی ہی ہیں۔ واللہ اعلم

آسمانوں کا نشانی ہونا اس اعتبار سے ہے کہ یہ بلند ہیں اور نہ تو ان کے نیچے کوئی ستون ہے اور نہ ان کے اوپر رسی ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور خرق عادت پر دلیل ہے۔ اگر ایک نبی آئے وہ ہوا میں ایک پہاڑ کو بغیر کسی سہارا کے ٹھہرانے کا چیلنج کرے تو یہ معجزہ ہوگا۔ پھر آسمان میں سورج، چاند اور چلتے والے ستارے اور مشرق و مغرب میں چمکتے اور روشن ستارے اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب التلقین، صفحہ 88، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر طبری، صفحہ 75، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیہ)

چھپے ہوئے ستارے دوسری نشانی ہیں۔

اور زمین کا نشانی ہونا اس اعتبار سے ہے کہ اس کے دریا، اس کی نہریں، اس کی معدنیات، اس کے درخت، اس کا ہموار ہونا اور اس کے نشیبی علاقے یہ سب صانع کی قدرت کی دلیل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اٰخْتَلَفَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ** بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ایک کا آنا اور دوسرے کا جانا ہے اس حیثیت سے کہ معلوم نہیں کہاں جاتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا اوصاف میں مختلف ہونا ہے جیسے نور و ظلمت میں، طول و قصر میں۔ الدلیل یہ لیلة کی جمع ہے۔ جیسے تمر و تمر، نخلة و نخل اور لیلة کی جمع لیالی اور لیالی بھی آتی ہے دونوں کا معنی ایک ہے۔ یہ جمع کے قیاس سے جدا ہے، جسے شبه و مشابہ، حاجة و حوائج، ذکر و مذاکر، گویا قیاساً لیالی کی جمع لیلة ہوتی۔ لیلة کو شعر میں استعمال کیا گیا ہے۔ فرمایا:

فی کل یوم وکل لیلة  
ایک اور شاعر نے کہا:

فی کل یوم ما وکل لیلة  
یا ویحة من جبل ما اشقاء

ابن فارس نے ”المجمل“ میں کہا: کہا جاتا ہے کہ کسی پرندے کو بھی لیلا کہا جاتا ہے اور میں اسے نہیں جانتا۔ النهار کی جمع نھڑ و آنھڑ۔ احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا: نہر کی جمع نھڑ ہے اور یہ نہار کی جمع النجج ہے۔ بعض نے فرمایا: النهار ایسا اسم مفرد ہے جس کی جمع نہیں بنائی جاتی کیونکہ یہ مصدر کے معنی میں ہے۔ جس طرح تیرا قول الضیاء ہے یہ قلیل و کثیر پر واقع ہوتا ہے۔ پہلا اکثر ہے۔ شاعر نے کہا:

لولا الثریدان هلکنا بالفسر  
ثرید لیل و ثرید بالنھر (1)

ابن الفارس نے کہ النهار معروف ہے اور اس کی جمع نہر اور انھار ہے اور کہا جاتا ہے النهار کی جمع نہر بنائی جاتی ہے۔ النهار سے مراد طلوع فجر اور غروب شمس کے درمیان کی روشنی ہے۔ رجل نھڑ، صاحب نہار کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: النهار، حباری (چکور) پرندے کے بچے کو کہتے ہیں۔ نصر بن حمیل نے کہا: نہار کا آغاز سورج کے طلوع سے ہے اور سورج کے طلوع ہونے سے پہلے وقت کو نہار سے شمار نہیں کیا جاتا۔ ثعلب نے کہا: عربوں کے نزدیک اس کا اول سورج کا طلوع ہونا ہے اور اس نے امیہ بن ابی الصلت کے شعر سے استشہاد کیا ہے۔

والشمس تطلع کل آخر لیلہ  
حراء یصبح لونھا یتوزد  
اور عدی بن زید کا شعر ہے:

و جاعل الشمس مصراً لا خفاء بہ  
بین النهار و بین الدیل قد فصلا



اور کسائی نے یہ شعر لکھا ہے:

اذا طلعت شمس النهار فانها امارؤ تسليمي عليك فسلي

اور زجاج نے ”کتاب الانواء“ میں کہا ہے: دن کا آغاز سورج کے بلند ہونے کے ساتھ ہے (1)۔

ابن انباری نے زمانے کی تین اقسام بنائی ہیں: ایک کو اس نے محض رات بنایا ہے اور وہ سورج کے غروب ہونے سے لے کر فجر کے طلوع ہونے تک کا وقت ہے اور دوسری قسم کو محض دن بنایا ہے اور وہ سورج کے طلوع ہونے سے اس کے غروب ہونے تک کا وقت ہے ایک اور قسم دن اور رات کے درمیان مشترک بنائی ہے اور وہ فجر کے طلوع ہونے اور سورج کے طلوع ہونے کے درمیان کا وقت ہے یہ رات کی تاریکی کا بقایا ہے اور دن کی روشنی کا آغاز ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ دن فجر کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کا وقت ہے، جس طرح کہ ابن فارس نے اجماع میں روایت کیا ہے اور اس پر دلیل صحیح مسلم میں حضرت عدی بن حاتم کی روایت ہے، فرمایا: جب یہ ارشاد **حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ** (البقرہ: 187) نازل ہوا تو عدی نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے تکیہ کے نیچے دو دھاگے رکھتا ہوں ایک دھاگہ سفید اور ایک دھاگہ سیاہ، ان کے ساتھ دن سے رات کی پہچان کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمہارا تکیہ بڑا چوڑا ہے اس سے مراد رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی ہے (2)۔ یہ حدیث تقاضا کرتی ہے کہ دن فجر کے طلوع ہونے سے سورج کے غروب ہونے تک کا وقت ہے۔ قسموں میں فقہ کا مقتضا بھی یہی ہے اور اسی پر احکام مرتب ہوتے ہیں۔ پس جو قسم اٹھائے کہ لایحکم فلانا نہاراً میں فلاں سے پورا دن کلام نہیں کروں گا تو وہ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے بھی کلام کرے گا تو حانث ہوگا، اور پہلے قول کے مطابق حانث نہ ہوگا۔ اور نبی کریم ﷺ کا قول اس میں فیصل اور حکم ہے۔ اور رہالفت کے ظاہر اور سنت کے اعتبار سے تو روشنی کے وقت کو کہتے ہیں جب دن کا وقت وسیع ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

ملکت بها كفى فانهرت فتتها يري قائم من ددنها ما وراها

اور حضرت حذیفہ سے مروی حدیث بھی اسی قول پر دلالت کرتی ہے جس کو نسائی نے نقل فرمایا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ روزوں کی آیات کے ضمن میں آئے گی۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَالْفُلُكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ، الْفُلُكِ** سے مراد کشتیاں ہیں۔ مفرد اور جمع کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے اور مذکر اور مؤنث کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے (3)۔ لیکن مفرد اور جمع کی حرکات ایک جیسی نہیں ہیں بلکہ ایسی ہیں کہ گویا جمع کی دوسری بنا ہے۔ اور اس پر دلیل ثننیہ کا درمیانی حرف ہے۔ عرب کہتے ہیں: **فُلُكَانِ، الْفُلُكِ** مفرد مذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فِي الْفُلُكِ السَّحُونِ** (یاسین) یہاں مذکر استعمال ہوا ہے اور فرمایا:

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، صفحہ 349، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 233، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

3۔ تفسیر طبری، صفحہ 77، جلد 1 (دار احیاء التراث العربیہ)

وَالْفُلُكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ۔ یہاں مونث ہے۔ یہ واحد اور جمع دونوں کا احتمال رکھتا ہے اور فرمایا: إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَجَرْتُمْ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ (یونس: 22) اس آیت میں جمع استعمال ہوا ہے گویا جب یہ واحد ہو اور مرکب کے معنی میں ہو تو مذکر ہوتا ہے اور سفینہ کے معنی میں ہو تو مونث ہوتا ہے۔ فلك السماء۔ جس پر ستارے گردش کرتے ہیں۔ فلك الجارية جب بچی کے پستان گول ہو جائیں۔ اسی سے ہے فلكة المغزل، چرخہ کا پرملہ۔ کشتی کو فلك کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پانی کے ساتھ آہستہ آہستہ گھومتی ہے۔ آیت میں الْفُلُكِ کو بطور قدرت کی نشانی پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مسخر کر دیا ہے حتیٰ کہ پانی کی سطح پر چلتی ہے اور اتنی بوجھل ہونے کے باوجود پانی کے اوپر ٹھہرتی ہے سب سے پہلے کشتی حضرت نوح علیہ السلام نے بنائی جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے اور جبریل امین نے انہیں کہا: پرندے کے سینہ پر بنا تو حضرت نوح علیہ السلام نے اسے بنایا جس طرح جبریل امین نے آپ کو دکھایا جبکہ یہ عالمین میں وراثت ہے، کشتی ایک الٹا پرندہ ہے پانی اس کے نیچے ہے جس طرح ہوا اس کے اوپر ہے۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** یہ آیت اور اس کی مثل آیات سمندر پر سوار ہونے کے جواز کی دلیل ہیں خواہ وہ سوار ہونا تجارت کے لئے ہو یا عبادت کے لئے ہو جیسے حج اور جہاد۔ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے، انہوں نے کہا: ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! ہم سمندر پر سوار ہوتے ہیں اور ہمارے پاس تھوڑا سا پانی ہوتا ہے (1)۔ اور حضرت انس بن مالک کی حدیث ام حرام کے واقعہ کے متعلق ہے۔ ان دونوں احادیث کو امام مالک وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس کی حدیث کو ان میں سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اسحاق بن عبد اللہ بن ابی طلحہ سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔

اس حدیث کو بشر بن عمر نے امام مالک سے انہوں نے اسحاق سے انہوں نے حضرت انس سے انہوں نے حضرت ام حرام سے روایت کیا ہے، انہوں نے اسے مسند ام حرام میں شامل کیا ہے نہ کہ حضرت انس کی مسند میں۔ اسی طرح حضرت انس سے بندار محمد بن بشار نے اس کو بیان کیا ہے اس میں جہاد کے لئے مردوں اور عورتوں کے لئے سمندر پر سوار ہونے کی واضح دلیل ہے۔ جب جہاد کے لئے سوار ہونا جائز ہے تو فرض حج کے لئے سوار ہونا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عمر بن عبد العزیز سے سمندر پر سوار ہونے سے منع کرنا مروی ہے جبکہ قرآن وحدیث اس قول کا رد کرتے ہیں۔ اگر اس کا سوار ہونا مکروہ ہوتا یا جائز نہ ہوتا تو نبی کریم ﷺ ان لوگوں کو منع فرمادیتے جنہوں نے کہا تھا: ہم سمندر پر سوار ہوتے ہیں (2)۔ یہ آیت اور اس کی مثل آیات اس غرض سے نص ہیں۔ ان کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا اور اس کی تاویل کی جائے گی جو حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے کہا ہے وہ احتیاط اور طلب دنیا اور کثرت دنیا کی طلب کے لئے سوار ہونے پر محمول

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب الوضوء بماء البیض، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)

جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، باب ما جاء فی ماء البیض، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، ما جاء فی ماء البحر، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ہوگا، فرائض کی ادائیگی پر محمول نہیں ہوگا۔ اور معنی کی جہت سے اس کے اوپر سوار ہونے کے جواز پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو زمین کے درمیان رکھا اور باقی مخلوق کو زمین کے کناروں پر رکھا۔ اور منافع کو دونوں جہتوں کے درمیان تقسیم فرمایا اور ان منافع کو حاصل نہیں کیا جاسکتا مگر سمندر عبور کرنے کے بعد۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کا راستہ کشتی کے ذریعے آسان فرمایا۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک عورت کے لئے حج کی خاطر سمندری سفر کو ناپسند کرتے تھے اور جہاد کے لئے زیادہ مکروہ ہوگا۔ قرآن و سنت اس قول کو رد کرتے ہیں مگر بعض اہل بصرہ نے کہا: امام مالک نے اس لئے مکروہ فرمایا کیونکہ حجاز میں کشتیاں چھوٹی تھیں، عورتیں اس میں پردہ نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ وہ تنگ ہوتی تھیں اور لوگوں کی ان میں بھیڑ ہوتی تھی اور مدینہ سے مکہ کی طرف جانے کا خشکی کا راستہ بھی موجود تھا، اس لئے امام مالک نے اس کو ناپسند فرمایا۔ بڑی کشتیاں جیسے اہل بصرہ کی کشتیاں ہیں ان میں کوئی حرج نہیں اور فرمایا: اصل یہ ہے کہ حج آزاد، بالغ آدمیوں میں سے حج کی استطاعت رکھنے والے پر فرض ہے خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد ہوں، جبکہ راستہ امن والا ہو۔ اس میں سمندری یا بری راستہ کی تخصیص نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: کتاب و سنت اور معنی ان دونوں سفروں کے لئے اس پر سوار ہونے کی اباحت پر دلالت کرتا ہے خواہ وہ عبادت ہو یا تجارت ہو پس یہ حجت ہے اور اس میں نمونہ ہے مگر سمندر پر سوار ہونے میں لوگوں کے احوال مختلف ہیں، بہت سے سواروں پر اس پر سوار ہونا آسان ہوتا ہے اور ان کے لئے دشوار نہیں ہوتا، جبکہ بعض دوسروں پر اس کا عبور کرنا دشوار ہوتا ہے اور اس مسئلہ میں کمزور ہوتے ہیں جیسا کہ بعض لوگ جو سمندر پر سوار ہوتے ہیں تو ان پر غشی طاری ہو جاتی ہے اور جو ایسی حالت میں فرائض ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتے، پس پہلے لوگوں کے لئے جائز ہے اور دوسرے لوگوں پر حرام ہے اور ممنوع ہے اور اہل علم کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

**مسئلہ نمبر 5:** سمندر جب طغیانی میں ہو تو کسی کے لئے بھی اس پر سوار ہونا جائز نہیں اور اس زمانہ میں بھی سوار ہونا جائز نہیں جبکہ غالب گمان عدم سلامتی کا ہو۔ ان کے نزدیک ایسے زمانہ میں سوار ہونا جائز ہے جس میں غالب گمان سلامتی کا ہو وہ لوگ جو سلامتی کی حالت میں سمندر پر سوار ہوتے ہیں اور نجات پاتے ہیں ان کو کوئی روکنے والا نہیں اور وہ جو اس میں ہلاک ہوتے ہیں وہ روکے جاتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ** یعنی تجارت اور دوسرے مقاصد جس کے ساتھ لوگوں کے احوال درست ہوتے ہیں وغیرہ منافع کے ساتھ چلتی ہے۔ سمندر پر سوار ہونے کے ساتھ نفع حاصل کیا جاتا ہے اور جو اس میں سامان اٹھاتا ہے وہ نفع اٹھاتا ہے اور جنہوں نے دین میں طعن کیا ہے انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ تمہاری کتاب میں فرماتا ہے **مَا كَرَّ طَائِفٌ مِّنْ شَيْءٍ** (انعام: 38)

پس جو کھانے کی مصلحت کی چیزیں ہیں مثلاً نمک، کالی مرچ وغیرہ میں ان کا ذکر کہاں ہے تو اس کو **يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ** کے ساتھ جواب دیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَا أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِثْلًا** یعنی بارشیں جن کے ساتھ عالم کی



بڑھوتری ہے، نباتات اور خوراک کا پیدائش ہے (1) اور اس سے کچھ جمع کیا جاتا ہے تاکہ بارشوں کے نہ ہونے کے وقت فائدہ اٹھایا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَأَسْكَنْهُ فِي الْأَرْضِ (المومنون: 18)**

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ**، بَثَّ کا معنی تفریق کرنا اور پھیلانا ہے۔ اسی سے **كَافَرَأَشِ الْمَبْثُوثِ (القارعة)** ہے **دَابَّةٍ** کا لفظ تمام حیوانوں کو جامع ہے۔ بعض نے ان سے پرندوں کو نکالا ہے وہ مردود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ يَرْزُقُهَا (هود: 6)** پرندہ بعض حالات میں اپنے پیروں پر چلتا ہے۔ اعشی نے کہا:

دبيب قطا البطحاء في كل منهل

علقمہ بن عبدہ نے کہا:

صواعقها لطيرهن دبيب

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ** ہواؤں کا چلنا۔ تَصْرِيف سے مراد انہیں عقیم اور بار بردار کر کے چلانا ہے اور کچھ کو مدد کرنے والی اور ہلاک کرنے والی بنا کر چلانا ہے، کچھ کو ٹھنڈی اور کچھ کو گرم بنا کر چلانا ہے، کچھ کو نرم اور کچھ کو سخت بنا کر چلانا ہے۔ بعض نے فرمایا: **تَصْرِيفِ الرِّيحِ** سے مراد ان کا جنوباً شمالاً (مشرق و مغرب) چلانا ہے۔ نقصان دہ اور فائدہ مند بنا کر چلانا ہے اور یکبارگی ہوا کا چلانا ہے اس سے مراد وہ ہوا ہے جو ان دونوں ہواؤں کے درمیان ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: **تَصْرِيفِ** سے مراد ان ہواؤں کا اتنی مقدار میں چلانا ہے جتنی کہ وہ کشتیاں سامان اٹھائے ہوئے ہوتی ہیں، ان کو برداشت کر لیں۔ اسی طرح چھوٹی کشتیوں کے لئے ان کے مطابق ہواؤں کو چلانا ہے اور ان سے ان ہواؤں کو روکنا ہے جو انہیں نقصان دیتی ہیں۔ ان کے بادبانوں کے بڑے اور چھوٹے ہونے کا کوئی اعتبار نہیں اگر ہوا ایک جسم بن کر آتی تو اس کے بادبانوں کو پھاڑ دیتی اور انہیں غرق کر دیتی۔

**الرِّيحِ**، یہ ریح کی جمع ہے، اس کا یہ نام اس لئے ہے کہ عام طور پر رحمت کو لاتی ہیں۔ ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ **الريح من روح الله تأتي بالرحمة وتأتي بالعذاب** فاذا رأيتها فلا تسبوها واسألوا الله عذرها واستعينوا بالله من شرها۔ (2) (یعنی ہوا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے، کبھی یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو لاتی ہے اور کبھی عذاب کو لاتی ہے، جب تم ہوا کو دیکھو تو اسے برا مت کہو اور اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو)۔ اسی حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہوا کو برا مت کہو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے، کبھی یہ رحمت لاتی ہے اور کبھی عذاب لاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو (3)۔ نبی کریم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، صفحہ 339، جلد 2 (وزارت تعلیم)

1۔ البحر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، صفحہ 273 (وزارت تعلیم)

سُفِّیٰ تَحْتَیْلَم سے مروی ہے، فرمایا: ہوا کو برامت کہو کیونکہ یہ رحمن کے نفس سے ہے (1)۔ معنی یہ ہے: اس نے ہواؤں میں تفریق، تنقیس اور ترویج رکھی اور اضافت، فعل کے طریق سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسا بنایا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نصرت بالصبا و اهدکت عاد بالذبور۔ (2) (صبا کے ساتھ میری مدد کی گئی اور عاد کو دبور کے ساتھ ہلاک کیا گیا)۔ حدیث میں جو آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے جنگ احزاب میں ہوا کے ذریعے تکلیف کو دور فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَأَنزَلْنَا عَلَيْهِم رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا (احزاب: 9) (پس ہم نے بھیج دی ان پر آندھی اور ایسی فوجیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے) کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ نے فلاں سے دنیا کی مصیبتوں سے ایک مصیبت کو دور فرمایا۔ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ جس نے کسی مسلمان سے دنیا کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو دور کیا اللہ تعالیٰ قیامت کی مصیبتوں میں اس کی ایک مصیبت کو دور کرے گا (3)۔ شاعر نے کہا:

كَانَ الصَّبَا رِيحًا إِذَا مَا تَنَسَّيْتُ عَلَى كَبِدٍ مَّهْجُومٍ تَجَلَّتْ هَبْومَهَا

ابن عربی نے کہا: النسيم ہوا کے چلنے کی ابتدا کو کہتے ہیں۔ الريح کی اصل روح ہے اسی وجہ سے جمع قلت ارواح آتی ہے اریاح نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ واوی ہے کثرت کی جہت سے اور یا کی مناسبت کی طلب کی وجہ سے ریاہ کہا جاتا ہے اور حضرت حفصہ کے مصحف میں وتصریف۔ رواح ہے۔

**مسئلہ نمبر 10:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَضَرِّفُ الْوَيْلِجِ حَمْرَهُ اور کسائی نے الريح مفرد پڑھا ہے۔ اسی طرح سورہ اعراف، کہف، ابراہیم، النمل، الروم، فاطر، شوری اور جاثیہ میں پڑھا ہے ان کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور حمزہ اور کسائی کی ابن کثیر نے سورہ اعراف، النمل، الروم، فاطر اور شوریٰ میں موافقت کی ہے اور حمزہ نے الريح لواقع کو مفرد پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے ہوالذی ارسل الريح کو سورہ الفرقان میں مفرد پڑھا ہے۔ باقی قراء نے تمام جگہوں پر جمع کا صیغہ پڑھا ہے سوائے ان الفاظ کے جو سورہ ابراہیم اور شوریٰ میں ہیں۔ ان کو نافع کے سوا کسی نے جمع نہیں پڑھا۔ ان مواقع کے علاوہ میں ساتوں قراء کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور جو سورہ روم میں ہم نے ذکر کیا ہے وہ دوسرا مقام ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِي يُرْسِلُ الْوَيْلِجَ (روم: 48) اور الریاح مبشرات میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ ابو جعفر یزید بن القعقاع نے پورے قرآن میں الریاح کو جمع پڑھا ہے جب اس پر الف لام آیا ہے، سوائے ان مقامات کے تھوی بہ الريح۔ الريح العقیم اور اگر الف، لام اس پر نہ ہو تو مفرد پڑھا ہے۔ اور جنہوں نے الریاح کو مفرد پڑھا ہے ان کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسم جنس ہے، قلیل و کثیر پر دلالت کرتا ہے اور جنہوں نے جمع پڑھا ہے وہ اس اعتبار سے ہے کہ ہوائیں مختلف جہات سے چلتی ہیں اور بعض نے رحمت والی ہواؤں کو جمع پڑھا ہے اور عذاب والی ہوا کو واحد پڑھا ہے۔ انہوں نے اس میں قرآن کے اغلب قول کا اعتبار کیا ہے جیسے

1۔ المسند رک للماکم، کتاب التفسیر، صفحہ 298، جلد 2 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقواء، صفحہ 141، جلد 1 (وزارت تعلیم) و صحیح مسلم، کتاب الاستقواء، صفحہ 295، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن، صفحہ 345، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

الرياح مبشرات - الريح العقيم - قرآن میں رحمت کے ساتھ جمع اور عذاب کے ساتھ مفرد کا ذکر ہے سوائے سورہ یونس کے ان الفاظ کے - وجرین بہم بريح طيبة -

روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ جب ہوا چلتی تو آپ یہ دعا پڑھتے: اللہم اجعلہا ریاخا ولا تجعلہا ریحاً (1)۔ (یا اللہ! اسے رحمت بنا اور اسے ریح نہ بنا)۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عذاب کی ہوا سخت ہوتی ہے، اس کے اجزاء ملے ہوئے ہوتے ہیں گویا وہ ایک جسم ہے جبکہ رحمت کی ہوا نرم اور جدا جدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ان ہواؤں کو الريح کہا جاتا ہے اور سورہ یونس میں الفلک کے ساتھ مفرد آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کشتیوں کو چلانے والی ہوا یہ ایک متصل ہوا ہوتی ہے پھر طیب کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا جاتا ہے تو ان کے درمیان اور عذاب کی ریح (ہوا) کے درمیان اشتراک زائل ہو گیا۔

**مسئلہ نمبر 11:** علماء نے فرمایا: الريح تو ہوا کو حرکت دیتی ہے کبھی وہ سخت ہوتی ہے اور کبھی کمزور ہوتی ہے، جب ہوا کی حرکت قبلہ کے سامنے سے ظاہر ہوتی ہے قبلہ کی سمت جاتی ہے تو اس ہوا کو صبا کہا جاتا ہے۔ جب ہوا کی حرکت قبلہ کے پیچھے سے ظاہر ہوتی ہے اور قبلہ کی سمت جاتی ہے تو اسے دبور کہا جاتا ہے۔ جب ہوا کی حرکت قبلہ کی دائیں طرف سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ قبلہ کی بائیں جانب کو چلتی ہے تو اسے ریح الجنوب کہا جاتا ہے۔ جب ہوا کی حرکت قبلہ کی بائیں جانب سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کی دائیں طرف کو چلتی ہے تو اسے ریح الشمال کہا جاتا ہے، ان میں سے ہر ہوا کی ایک خاص طبع ہے، اس کی منفعت اس کی طبع کے مطابق ہوتی ہے۔ صبا گرم خشک ہوتی ہے دبور ٹھنڈی تر ہوتی ہے۔ جنوب گرم تر ہوتی ہے اور شمال ٹھنڈی خشک ہوتی ہے۔ ان کی طبع کا اختلاف سال کے موسموں کے طبائع کے اختلاف کی طرح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمانہ کے لئے چار موسم بنائے۔ ان کا مرجع ہوا کے احوال کی تبدیلی کی طرف ہے۔ موسم ربیع بنایا جو موسموں کا آغاز ہے اسے گرم تر بنایا اور اس میں نمو اور بڑھوتری ہوتی ہے، اس میں بارشیں نازل ہوتی ہیں اور زمین اپنا نکھار نکالتی ہے اور اس کا سبزہ ظاہر ہوتا ہے لوگ درخت لگاتے ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں، اس میں حیوان پیدا ہوتے ہیں اور دودھ زیادہ ہوتے ہیں۔ جب موسم ربیع ختم ہوتا ہے تو اس کے پیچھے موسم گرما ہوتا ہے یہ ایک طبع میں موسم ربیع کے مشابہ ہے اور وہ حرارت ہے اور رطوبت میں اس کے مخالف ہے کیونکہ گرمیوں میں ہوا گرم اور خشک ہوتی ہے اس میں پھل پکتے ہیں اور موسم ربیع میں کھیتوں کے دانے خشک ہوتے ہیں۔ جب موسم گرما ختم ہوتا ہے تو موسم خزاں اس کے پیچھے آتا ہے وہ ایک طبع میں موسم گرما کے مشابہ ہوتا ہے اور وہ ہے خشکی اور حرارت میں مختلف ہوتا ہے کیونکہ موسم خزاں میں ہوا ٹھنڈی اور خشک ہوتی ہے۔ اس میں پھلوں کی صلاح اپنی انتہا کو پہنچتی ہے اور وہ خشک ہوتے ہیں اور سوکھ جاتے ہیں اور ذخیرہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں، پھل اس موسم میں توڑے جاتے ہیں اور انکو رکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور تمام درختوں سے فراغت حاصل کی جاتی ہے۔ جب موسم خریف ختم ہوتا ہے تو موسم سرما پیچھے آتا ہے وہ ایک طبع یعنی برودت میں موسم خریف کے موافق ہوتا ہے اور دوسری طبع خشکی میں مخالف ہوتا ہے کیونکہ ہوا سردیوں میں ٹھنڈی اور تر ہوتی ہے۔ پس اس میں بارشیں اور ازلے زیادہ ہوتے ہیں۔ زمین آرام پانے والے جسم



کی طرح ہوتی ہے اور حرکت نہیں کرتی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف موسم ربیع کی حرارت کو لوٹا دے، جب وہ رطوبت کے ساتھ جمع ہوتی ہے تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے اذن سے نمودار بڑھوتری ہوتی ہے، کبھی کبھی ہوائیں زیادہ چلتی ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے مگر اصول یہی چار ہیں۔ ہر ہوا، دو ہواؤں کے درمیان چلتی ہے۔ پس اس کا حکم اس ہوا والا ہوتا ہے جو اس کے مکان کے قریب ہوتی ہے اس ہوا کو النکباء کہا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 12:** السَّحَابُ الْمُسَخَّرُ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، السَّحَابُ کو یہ نام اس لئے دیا جاتا ہے کیونکہ ہوا میں یہ چلتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: سحبت ذیلی مسحباً، تسحب فلان علی فلان جرأت کرنا۔ السحب کا مطلب زیادہ کھانا، پینا ہے۔ المسخر، مطیع۔ بادل کی تسخیر کا مطلب: اسے ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف چلانا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: بادل کی تسخیر کا مطلب بغیر کسی سہارا کے آسمان اور زمین کے درمیان اس کا ٹھہرنا ہے (1)۔ پہلا معنی اظہر ہے کبھی بادل پانی کے ساتھ اور کبھی عذاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک شخص صحرا میں اپنی زمین میں تھا۔ اس نے بادل میں ایک آواز سنی کہ فلاں کے باغ کو سیراب کر، پس وہ بادل چلا اور اپنا پانی ایک نیلے پر بہا یا وہاں ایک نالی تھی، وہ پانی سے بھر گئی۔ متواتر پانی چلتا رہا وہ شخص اپنے باغ میں اپنی کسی کے ساتھ پانی ادھر ادھر پھیر رہا تھا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے بندے! تیرا کیا نام ہے؟ اس نے کہا: فلاں۔ اس نے وہ نام بتایا جو اس نے بادل میں سنا تھا۔ اس نے اسے کہا: اے اللہ کے بندے! تو نے میرا نام کیوں پوچھا؟ اس نے کہا: میں نے اس بادل میں آواز سنی جس کا یہ پانی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا: فلاں کے باغ کو سیراب کر تیرا نام لیا۔ تو اس باغ میں کیا کرتا ہے؟ اس نے کہا: جب تو نے یہ کہا ہے تو میں اس کی پیداوار کا انتظار کرتا ہوں میں اس کی تہائی صدقہ کرتا ہوں اور تہائی خود اور اپنے عیال کو کھلاتا ہوں اور تہائی پھر اسی زمین میں کاشت کرتا ہوں (2)۔ ایک روایت میں ہے: میں تہائی مساکین، سائلین اور مسافروں کے لئے رکھوں گا (3)۔ قرآن حکیم میں ہے: وَاللَّهُ الَّذِي مَقَّى أَمْرًا سَلَّ الزَّيْلَ فَنُثِرَ سَحَابًا فَسُقْنُهُ إِلَىٰ بَلَدٍ مَّوْتٍ (فاطر: 9) (اللہ تعالیٰ وہ ہے جو بھیجتا ہے: دواؤں کو وہ اٹھالاتی ہیں بادل کو پھر ہم لے جاتے ہیں بادل کو مردہ شہر کی طرف) اور فرمایا حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنُهُ لِبَلَدٍ مَّوْتٍ (اعراف: 57) (یہاں تک کہ جب وہ اٹھالاتی ہیں بھاری بادل تو ہم لے جاتے ہیں اسے کسی دیران شہر کی طرف)

ابن ماجہ نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب آفاق میں سے کسی افق میں سے بادل کو آتا ہوا دیکھتے تو اپنا کام چھوڑ دیتے تھے اگرچہ نماز میں ہی ہوتے حتیٰ کہ آپ اس کی طرف متوجہ ہو کر یہ دعا مانگتے: اے اللہ! ہم اس شر سے پناہ مانگتے ہیں جس کے ساتھ اس (بادل) کو بھیجا گیا ہے۔ اگر بارش نازل ہوتی تو آپ یہ دعا کرتے: اللھم سیباً نافعاً (نفع بخش بارش دے) دو یا تین مرتبہ کہتے اگر اللہ تعالیٰ اس بادل کو ختم کر دیتا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے (4)۔ مسلم

2- صحیح مسلم، کتاب الزہد، باب فضل الانفاق علی المسکین، صفحہ 411، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

1- البحر الوجیز زیر آیت ہذا

4- سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، صفحہ 286 (وزارت تعلیم)

3- ایضاً

نے اس حدیث کے ہم معنی حدیث حضرت عائشہ سے نقل کی ہے، فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ جب ہوا اور بادل والادن ہوتا تو آپ کے چہرہ سے پریشانی معلوم ہو جاتی آپ آگے پیچھے آتے جاتے۔ جب بارش ہو جاتی تو آپ خوش ہو جاتے اور آپ کی پریشانی دور ہو جاتی۔ حضرت عائشہ نے کہا: میں نے آپ سے پریشانی کی وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہیں یہ عذاب نہ ہو جو میری امت پر مسلط کیا گیا ہو۔ اور جب آپ بارش کو دیکھتے تو کہتے: رحمت (1)۔ ایک روایت میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! شاید جس طرح قوم عاد نے کہا تھا: فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَّتِهِمْ قَالُوا هَذَا عَارِضٌ مُّطَرٌ نَّآ (احقاف: 24) (2)

یہ احادیث اور آیات پہلے قول کی صحت پر دلیل ہیں اور تسخیر السحاب سے مراد بادل کا زمین و آسمان کے درمیان ثبوت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کیونکہ ثبوت تو عدم انتقال پر دلالت کرتا ہے۔ اگر ثبوت سے مراد اس کا ہوا میں ہونا مراد لیا گیا ہوتا نہ کہ آسمان اور زمین میں تو یہ صحیح تھا کیونکہ بین استعمال ہوا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ مسخرہ محمولہ ہے۔ یہ قدرت کی عظیم نشانی ہے جیسے پرندہ ہوا میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوْاءِ السَّمَاءِ مَا يَتَّبِعُنَّ إِلَّا اللَّهَ (النحل: 79) (کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا پرندوں کی طرف کہ وہ مطیع اور فرمانبردار بن کر اڑ رہے ہیں فضاء آسمانی میں کوئی چیز انہیں تھامے ہوئے نہیں بجز اللہ کے)۔

اور فرمایا: أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ قَوْقُهُمْ صَلَّتْ وَيَقْبُضْنَ مَا يَتَّبِعُنَّ إِلَّا اللَّهَ (الملك: 19) (کیا انہوں نے پرندوں کو اپنے اوپر (اڑتے) کبھی نہیں دیکھا پر پھیلاتے ہوئے اور کبھی پر سمیٹ بھی لیتے ہیں نہیں روکے ہوئے انہیں کوئی (فضا میں) بجز رحمن کے)۔

**مسئلہ نمبر 13:** کعب الاحبار نے کہا: بادل، بارش کی چھلنی ہے۔ اگر بادل نہ ہوتا تو جب آسمان سے پانی نازل ہوتا تو زمین کے جس حصہ پر گرتا اسے خراب کر دیتا۔ یہ کعب نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا۔ خطیب ابو بکر احمد بن علی نے معاذ بن عبد اللہ بن ضبيب الجبلی سے کہا: میں نے حضرت ابن عباس کو دیکھا وہ خچر پر گزر رہے جبکہ میں بنی سلمہ میں تھا۔ ان کے پاس سے کعب کی بیوی کا بیٹا بھیج گزرا۔ اس نے حضرت ابن عباس کو سلام کیا۔ حضرت ابن عباس نے اس سے پوچھا: کیا تو نے کعب احبار سے بادل کے بارے کچھ کہتے سنا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: بادل بارش کے لئے چھاننی ہے۔ اگر بادل نہ ہوتا تو جب آسمان سے پانی نازل ہوتا تو زمین کے جس حصہ پر گرتا اسے خراب کر دیتا۔ انہوں نے کہا: کیا تو نے کعب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ زمین ایک سال ایک نبات اگاتی ہے اور دوسرے سال دوسری نبات اگاتی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں، میں نے ان کو یہ کہتے سنا ہے کہ بیج آسمان سے اترتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: میں نے یہ کعب سے سنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 14:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَأْتِي أَيْسَى دَلَالَاتٍ هِيَ جِوَاللَّهِ تَعَالَى كِي وَحْدَانِيَّتِهِ اور اس کی قدرت پر

دلالت کرتی ہیں اسی وجہ سے ان امور کو وَاللّٰهُمَّ اِلٰهَ وَّاحِدٌ کے بعد ذکر کیا ہے تاکہ ان سے پہلے جو اللہ کی وحدانیت، اس کی رحمت کے ذکر اور اس کی مخلوق پر رافت، ذکر کی ہے اس کی سچائی پر دلالت کرے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: اس شخص کے لئے ہلاکت ہے جس نے اس آیت کو پڑھا اور اس میں غور و فکر نہیں کیا (1)۔ اگر کہا جائے کہ اس میں انکار نہیں ہے کہ یہ چیزیں خود بخود پیدا ہوتی ہیں۔ کہا جائے گا: یہ محال ہے اگر یہ خود پیدا ہوئی ہیں تو پھر ان کا دو حالتوں سے خالی ہونا جائز نہیں یا تو یہ موجود ہوں گی یا موجود نہیں ہوں گی۔ اگر یہ بعد میں پیدا ہوئی ہیں پہلے موجود نہیں تھیں تو یہ محال ہے کیونکہ کسی چیز کے عدم سے وجود میں آنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ حی، عالم، قادر اور مرید ذات کی تخلیق سے ہو اور جو پہلے موجود نہ ہو اس کا اس سے وصف صحیح نہیں۔ اگر یہ پہلے موجود تھیں تو پھر ان کا موجود ہونا ان کے پیدا کرنے سے انہیں غنی کر دے گا۔ پس جو کچھ انہوں نے کہا جائز ہو تو خود بخود پیدا ہونا جاری ہوگا۔ اسی طرح چیرنا اور بننا ہے، یہ محال ہے اور جو چیز محال تک پہنچائے وہ محال ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت میں صرف اخبار پر اکتفا نہیں فرمایا حتیٰ کہ اس نے قرآن کی آیات میں غور و فکر کے ساتھ اس کو ملایا۔ اپنے نبی مکرم ﷺ کو فرمایا: قُلْ اَنْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (یونس: 101) (فرمائیے غور سے دیکھو کیا کیا (عجائبات) ہیں آسمانوں اور زمین میں) اور یہ کفار کو خطاب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ التَّنْذِرُ عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (یونس) (اور فائدہ نہیں پہنچاتیں آیتیں اور ڈرانے والے اس قوم کو جو ایمان نہیں لانا چاہتے اور فرمایا۔ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا اَنَّا مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (اعراف: 185) (کیا انہوں نے غور سے نہیں دیکھا آسمانوں اور زمین کی وسیع مملکت میں) یعنی ملکوتی آیات میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اور فرمایا: وَ فِيْ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی نشانیاں ہیں کیا تمہیں نظر نہیں آتیں) فرمایا کیا انہوں نے تفکر و تدبر کی نظر سے نہیں دیکھا حتیٰ کہ یہ استدلال کرتے کہ یہ چونکہ حوادث و تغیرات کا محل ہیں تو یہ حادث ہیں اور حادث چیز اپنے صانع سے مستغنی نہیں ہوتی اور وہ صانع حکیم، عالم، قدیر، مرید، مسجع، بصیر اور متکلم ہے کیونکہ اگر اس میں یہ صفات نہ ہوں تو انسان اس سے کامل ہوگا، یہ محال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلٰتٍ مِّنْ طِينٍ ۝ (المومنون) یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو ہم نے پیدا فرمایا پھر ہم نے اس کی نسل اور اولاد بنائی نطفہ فی قرار مکین ..... تب عشون، انسان جب اس تنبیہ کے ساتھ غور و فکر کرے گا اس عقل کے ساتھ جو اسے عطا کی گئی ہے تو وہ اسے غور و فکر کرنے والا پائے گا اور مختلف احوال پر پھرتا ہوا پائے گا۔ وہ پہلے نطفہ تھا پھر جما ہوا خون تھا پھر گوشت کا لوتھڑا پھر گوشت اور ہڈیاں تھا، تو وہ جان لے گا کہ حالت نقص سے حالت کمال کی طرف خود بخود پھرنے والا نہیں کیونکہ وہ خود اس پر قادر نہیں کہ وہ اس افضل حالت میں پیدا ہو جو اس کی عقل کا کمال ہے اور اس کے اعضاء کامل اور مضبوط ہوں۔ انسان اس پر قدرت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے اعضاء میں کسی عضو کا اضافہ کرے۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ اپنی حالت نقص میں اور اپنے ضعف کے وقت میں کسی فعل سے زیادہ عاجز ہے۔ کبھی اپنے آپ کو جوان دیکھتا ہے، کبھی ادھیڑ عمر میں دیکھتا ہے، کبھی بوڑھا دیکھتا ہے۔ وہ خود بخود



حالت شباب اور قوت سے بڑھاپے کی حالت کو نہیں پہنچتا۔ نہ وہ خود اختیار کرتا ہے اور نہ اس کی وسعت میں ہے کہ وہ بڑھاپے کی حالت کو زائل کر کے پھر جوانی کی قوت کو لوٹا لے۔ پس وہ جان لے گا کہ وہ ایسا نہیں ہے جو ان افعال کو خود کر سکے، اس کا کوئی صانع ہے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نقل کرنے والا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے احوال بلا ناقل و مدبر تبدیل نہ ہوتے۔ بعض حکماء نے کہا: اس عالم کبیر میں جو چیز بھی ہے اس کی عالم صغیر میں ایک مثال ہے اور عالم صغیر سے مراد انسان کا بدن ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ (التین)

بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (عقل و شکل کے اعتبار سے) بہترین اعتدال پر۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی نشانیاں ہیں کیا تمہیں نظر نہیں آتیں) انسان کے حواس چمکنے والے ستاروں سے اشرف ہیں، سمع اور بصر مدركات کے ادراک میں سورج اور چاند کے قائم مقام ہیں اور اس کے اعضاء بوسیدگی کی حالت میں زمین کی جنس سے مٹی ہو جاتے ہیں۔ اس میں پانی کی جنس سے رگیں اور دوسری بدن کی رطوبات ہیں اور ہوا کی جنس سے اس میں روح اور نفس ہے اور آگ کی جنس سے اس میں زرد پتہ ہے اور اس کی رگیں زمین کی نہروں کے قائم مقام ہیں اور اس کا چکران چشموں کی مانند ہے نہریں جن سے مدد حاصل کرتی ہیں اور رگیں جگر سے مدد حاصل کرتی ہیں۔ اس کا مثانہ دریا کے قائم مقام ہے۔ بدن کے برتن میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس میں جاتا ہے جس طرح نہریں دریا میں جاتی ہیں اور اس کی ہڈیاں پہاڑوں کی طرح ہیں جو زمین کے کیل ہیں اور اس کے اعضاء، درختوں کی طرح ہیں جس طرح ہر درخت کے پتے ہوتے ہیں یا پھل ہوتے ہیں اسی طرح ہر عضو کا فعل یا اثر ہوتا ہے اور بال بدن پر نباتات اور گھاس کی مانند ہیں پھر انسان اپنی زبان سے ہر حیوان کی آواز کو حکایت کرتا ہے اور اپنے اعضاء کے ساتھ ہر حیوان کے کام کو حکایت کرتا ہے۔ یہ عالم صغیر، عالم کبیر کے ساتھ مخلوق ہے صانع واحد کا پیدا کردہ ہے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرُونَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ۝

”اور کچھ لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اوروں کو اللہ کا مد مقابل محبت کرتے ہیں ان سے جیسے اللہ سے محبت کرنا چاہئے اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اللہ سے اور کاش! (اب) جان لیتے جنہوں نے ظلم کیا (جو وہ اس وقت جانیں گے) جب (آنکھوں سے) دیکھ لیں گے عذاب کہ ساری قوتوں کا مالک اللہ ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔“

جب اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت میں ایسی چیز کی خبر دی جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت اور عظیم سلطانی پر دلیل تھی۔ تو آپ نے بتایا کہ ان آیات قاہرہ کے باوجود ذوی عقول میں سے کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کا مد مقابل بناتے ہیں۔ انداد کا

واحدند ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس سے مراد وہ بت اور مورتیاں ہیں جن کی وہ اس طرح عبادت کرتے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے حالانکہ وہ عاجز ہیں۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ** یعنی وہ اپنے بتوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح مومنین اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: انداد سے مراد وہ رؤساء ہیں جن کی پیروی کی جاتی تھی وہ اللہ کی نافرمانی میں ان کی اطاعت کرتے تھے۔ **يُحِبُّونَهُمْ** میں ضمیر اس قول کے مطابق اصل پر ہے اور پہلے قول کے مطابق ضمیر بتوں کے لئے ہے۔ یہ غیر اصل پر ہے۔ ابن کیسان اور زجاج نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ محبت میں بتوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان برابری کرتے ہیں (1)۔ ابواحق نے کہا یہ صحیح قول ہے اور اس کی صحت پر دلیل **وَالَّذِينَ آمَنُوا أَكْثَرُ حُبًّا لِلَّهِ** ہے۔

ابورجاء نے **يحبونهم** یاہ کی فتح کے ساتھ پڑھا ہے، اس طرح جہاں بھی قرآن میں آیا ہے یہ بھی ایک لغت ہے۔ کہا جاتا ہے۔ **حببت الرجل فهو محبوب**۔ فراء نے کہا: ابوتراب نے کہا:

احب لحبها السودان حتى حببت لحبها سود الكلاب

میں اس کی محبت کی وجہ سے کالے لوگوں سے محبت کرتا ہوں حتیٰ کہ اس کی محبت کی وجہ سے کالے کتوں سے بھی محبت کرتا ہوں۔ اور **مَنْ**، **مَنْ** یتخذ میں مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور یتخذ واحد کا صیغہ **مَنْ** کے لفظ کے اعتبار سے ہے۔ اور غیر قرآن میں **مَنْ** کے اعتبار سے یتخذون بھی جائز ہے اور **يُحِبُّونَهُمْ** معنی کے اعتبار سے ہے اور **يحبهم** لفظ کے اعتبار سے ہوگا اور یہ یتخذ میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی محبین کے معنی میں ہے۔ اگر تو چاہے تو انداد کی نعت بنا دے یعنی محبوبۃ کے معنی میں۔ کعب میں کاف محذوف کی صفت ہے یعنی **يحبونهم** حباً کعب اللہ۔

**وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ** یعنی بت پرست جتنی اپنے بتوں اور تابعین اپنے متبوعین سے محبت کرتے ہیں مومنین اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ محبت کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: **وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ** کیونکہ اللہ تعالیٰ پہلے ان سے محبت کرتا ہے پھر وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ پس جو محبت کی وجہ سے اس کی محبت کی گواہی دیتا ہے اس کی محبت اتم ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ** (المائدہ: 54) مومنین کی اللہ تعالیٰ سے محبت اور اللہ تعالیٰ کی مومنین سے محبت کا بیان سورہ آل عمران میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَنُيَرِيَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ**۔ اہل مدینہ اور اہل شام کی قراءت تا کے ساتھ ہے۔ اہل مکہ، اہل کوفہ اور ابو عمرو نے یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ابو عبید کا اختیار ہے۔ اس آیت میں اشکال اور حذف ہے۔ ابو عبید نے کہا: اس کا معنی ہے اگر ظالم دنیا میں آخرت کا عذاب دیکھ لیتے تو جان لیتے جب وہ اسے دیکھتے کہ ساری قوت اللہ کے لئے ہے۔ اور اس بنا پر یری بصر کی رویت پر محمول ہوگا۔ (2)

نحاس نے معانی قرآن میں کہا ہے: یہ قول وہ ہے جس پر اہل تفسیر کا نظریہ ہے اور اعراب القرآن میں فرمایا: محمد بن یزید

سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: یہ تفسیر جو ابو عبید نے کی ہے بعید ہے۔ اس کی عبارت اس میں عمدہ نہیں ہے کیونکہ کلام مقدر کی جاتی ہے۔ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ۔ گویا اس نے اس کو مشکوک بنایا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو واجب کیا ہے۔ لیکن تقدیر عبارت اس طرح ہے اور یہی انفس کا قول ہے..... وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ۔ اور یہی بمعنی يعلم ہے یعنی اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قوت کی حقیقت اور اس کے عذاب کی شدت کی حقیقت کو جان لیتے تو حقیقت وہ جان لیتے کہ قوت اللہ کے لئے ہے اور یہ دو مفعولوں کے قائم مقام ہیں۔ والذین، یروی کا فاعل ہے۔ اور لو کا جواب محذوف ہے تاکہ انہیں خدا بنانے کا نقصان واضح ہو جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَوْ تَرَى إِذْ دُفُّوا عَلَى رَءُسِهِمْ (انعام: 30) وَلَوْ تَرَى إِذْ دُفُّوا عَلَى النَّارِ (انعام: 27) اور لو کا جواب نہیں ہے۔

زہری اور قتادہ نے کہا: اضمار، وعید کے لئے سخت ہے اس کی مثال، قائل کا قول ہے: لو رایت فلاناً والسیاط تاخذہ!۔ اور جنہوں نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی تقدیر یہ ہے: وَلَوْ تَرَى يَا مُحَمَّدُ الَّذِينَ ظَلَمُوا۔ یعنی اے پیارے محمد! مَنَظَرِیْہِمُ اگر تم ظالموں کو اس حال میں دیکھتے جب وہ عذاب کو دیکھتے اور اس سے گھبراہٹ کے وقت انہیں دیکھتے اور اس کی عظمت کو دیکھتے تو یہ اقرار کرتے کہ قوت اللہ کے لئے ہے۔ پس جواب اس طریق پر مضمر ہے اور وہی ان کا عامل ہے۔ دوسری تقدیر یہ ہے کہ اے محمد! مَنَظَرِیْہِمُ اگر آپ ظالموں کو اس کے عذاب دیکھنے اور اس سے گھبراہٹ کی حالت میں دیکھتے تو آپ جان لیتے کہ ساری قوت اللہ کے لئے ہے۔ نبی کریم مَنَظَرِیْہِمُ نے اس کو جان لیا تھا لیکن خطاب آپ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے کیونکہ ان میں سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے علم کی تقویت کے لئے اس قسم کا مشاہدہ کے محتاج ہوتے ہیں اور یہ معنی ہونا بھی جائز ہے۔ اے محمد! مَنَظَرِیْہِمُ اس ظالم کو فرمائیے۔ بعض نے فرمایا: ان مفعول لاجلہ کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی اَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا سیبویہ نے استشہاداً یہ شعر پڑھا ہے۔

واغفر عوراء الکہیم ادخارہ و اعرض عن شتم اللہیم تکرمہ

یہ ادخار، لادخار کے معنی میں ہے۔ معنی ہے کہ اے محمد! مَنَظَرِیْہِمُ اگر آپ ظالموں کو عذاب دیکھنے کی حالت میں دیکھتے کیونکہ قوت اللہ کے لئے ہے تو آپ ان کی سزا کا مبلغ جان لیتے اور جو عذاب ان پر نازل ہوا اس کو عظیم جانتے۔ ادخار، داخل ہوا ہے جب کہ ماضی میں امر ثابت کرنے کے لئے آتا ہے مقصود امر کو قریب ثابت کرنا اور اس کے وقوع کی تصحیح ہے۔ ابن عامر نے یرون یا، کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن، یعقوب، شیبہ، سلام اور ابو جعفر نے ان القوۃ اور ان اللہ کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نئے کلام کے اعتبار سے یا قول کی تقدیر پر۔ یعنی اگر تو ظالموں کو دیکھے جب عذاب کو دیکھیں گے تو وہ کہیں گے: ساری قوت اللہ کے لئے ہے۔ اس آیت سے ثابت ہے کہ قوت اللہ کے لئے ہے بخلاف معتزلہ کے قول کے وہ صفات قدیرہ کے معانی کی نفی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول سے بلند و بالا ہے۔

اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ رَأَوْا الْعَذَابَ وَلَكَلَّمَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۝

”(خیال کرو) جب بیزار ہو جائیں گے وہ جن کی تابعداری کی گئی ان سے جو تابعداری کرتے رہے اور دیکھ لیں



گے عذاب کو اور ٹوٹ جائیں گے ان کے تعلقات۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا اس** سے مراد سردار اور رؤساء ہیں وہ کفر پر اپنے متبعین سے براءت کریں گے۔ حضرت قتادہ، عطا اور ربیع سے مروی ہے۔ قتادہ اور سدی کا یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد گمراہ کرنے والے شیاطین ہیں جو انسانوں سے براءت کریں گے (1)۔ بعض نے فرمایا: یہ برمتبوع میں عام ہے **وَرَأَوْا الْعَذَابَ** یعنی اتباع کرنے والے اور جن کی اتباع کی گئی۔ بعض نے فرمایا: دنیا میں عذاب کو آنکھوں سے دیکھنے کے وقت۔ بعض نے فرمایا: آخرت میں پیشی اور سوال کے وقت۔

میں کہتا ہوں: یہ دونوں ہوں گے۔ وہ موت کے وقت اس ذلت کو دیکھیں گے جس کی طرف وہ لوٹے جائیں گے اور آخرت میں عذاب الیم کا مزہ چکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَقَدْ ظَعَنَ بِهِمُ الْأَسْبَابُ** اسباب سے مراد وہ تمام تعلقات ہیں جن کے ذریعے وہ دنیا سے ملتے ہیں خواہ وہ رشتہ داری کے تعلقات ہیں یا کوئی اور۔ یہ مجاہد وغیرہ سے مروی ہے۔ اسباب کا واحد سبب ہے اور اس کا معنی خلق ہے۔ السبب کا اصل معنی وہ رسی ہے جس کے ساتھ کسی شے کو باندھا جاتا ہے اور پھر اسے کھینچا جاتا ہے۔ پھر ہر اس چیز کے لئے استعمال ہونے لگا جو کسی چیز کو کھینچے۔

سدی اور ابن زید نے کہا: اسباب سے مراد اعمال ہیں اور سبب کا معنی کنارہ بھی ہے۔ اس سے زہیر کا قول ہے:

وَمِنْ هَابِ اسباب النایا یبنہ و لو رام اسباب الساء یسٹم  
جو موت کے اسباب سے ڈرا انہوں نے اسے پالیا۔ اگر وہ آسانی اسباب کا قصد کرتا تو سلامت رہتا۔

**وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا كَذَلِكَ يُرِيهِمُ**

**اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخُرُجِينَ مِنَ النَّارِ** (۱۵)

”اور کہیں گے تابع داری کرنے والے کاش! ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم بھی بیزار ہو جاتے ان سے

جیسے وہ (آج) بیزار ہو گئے ہیں ہم سے۔ یونہی دکھائے گا اللہ تعالیٰ انہیں ان کے (برے) اعمال کہ باعث

پشیمانی ہوں گے ان کے لئے اور وہ (کسی صورت میں) نہ نکل پائیں گے آگ (کے عذاب) سے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً**، ان محل رفع میں ہے یعنی اگر ہمارے لئے لوٹنا ہوتا۔ **فَنَتَبَرَّأَ**

**مِنْهُمْ** یہ تمنا کا جواب ہے۔

الکرۃ، سے مراد ایک حالت کی طرف لوٹنا ہے یعنی اتباع کرنے والے کہیں گے: اگر ہمیں دنیا کی طرف لوٹایا جاتا حتیٰ کہ

ہم نیک عمل کرتے اور ان سے بری ہو جاتے۔ **كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا** کاف مصدر محذوف کی صفت کے اعتبار سے محل نصب میں

ہے۔ اس کا حال کے اعتبار سے منصوب ہونا بھی جائز ہے۔ متبرئین اس کی تقدیر ہوگی۔ التبرء کا معنی ہے: جدا ہونا۔

1۔ تفسیر معالم التنزیل، صفحہ 193، جلد 1 (دار الفکر)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَذَلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ کاف رفع میں ہے یعنی امر اسی طرح ہے یعنی جس طرح اللہ انہیں عذاب دکھائے گا اسی طرح اللہ انہیں ان کے اعمال دکھائے گا یُرِيهِمُ اللہ بعض علماء نے فرمایا یہ آنکھ سے دیکھنا ہے۔ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے پہلا مفعول ہم ضمیر ہے اور دوسرا أَعْمَالَهُمْ ہے اور حَسَرَاتٍ حال ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ رویۃ قلب سے ہو اس صورت میں حَسَرَاتٍ تیسرا مفعول ہوگا۔ أَعْمَالَهُمْ۔ ربیع نے کہا: اس سے مراد ان کے برے اعمال ہیں جن کا انہوں نے ارتکاب کیا پس ان کے لئے ان اعمال کی وجہ سے دوزخ واجب ہے، حضرت ابن مسعود اور سدی نے کہا: اس سے مراد اعمال صالحہ ہیں جن کو انہوں نے چھوڑ دیا، پس وہ جنت سے محروم ہو گئے۔ اس قول میں احادیث روایت کی گئی ہیں۔ سدی نے کہا: ان کے لئے جنت بلند کی جائے گی۔ پس وہ اسے دیکھیں گے اور جنت میں اپنے گھروں کو دیکھیں گے (۱)۔ اگر وہ اللہ کی اطاعت کرتے تو انہیں وہ گھر ملتے، پھر ان کے گھر مومنین کے درمیان تقسیم کئے جائیں گے تو اس وقت وہ شرمندہ ہوں گے۔ یہ اعمال ان کی طرف مضاف کئے گئے ہیں کیوں کہ انہیں ان کا حکم دیا گیا تھا اور اعمال فاسدہ کی ان کی طرف نسبت اس اعتبار سے ہے کہ انہوں نے ان کا ارتکاب کیا۔ الحسرة کی جمع الحسرات ہے جیسے تسرة اور تسرات، جفنة اور جففات، شهوة اور شهوات۔ یہ اس صورت میں ہے جب اسم ہو۔ جب تو اسے نعت بنائے گا تو تو اس کو ساکن کرے گا جیسے ضخمۃ و ضحمت، عبلۃ و عبلات۔ الحسرة غوت شدہ چیز پر اعلیٰ درجہ کی ندامت کو کہتے ہیں۔ التحسار کا معنی افسوس کا اظہار کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: حسرت علیہ، سین کے کسرہ کے ساتھ۔ احسرا حسرا و حسرة۔ یہ اس چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے جو تھک جائے اور اس کی قوت ختم ہو جائے جیسے اونٹ تھک جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حسرا سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: بکل جانا، اسی سے الحاسر فی الحب ہے وہ شخص جنگ میں جس کے پاس زرہ نہ ہو۔ الانحسار کا معنی انکشاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا هُمْ بِظُرٍّ بِشَيْءٍ مِنَ النَّاسِ يَكْفُرُ كَهِمِشَ دُوزَخٍ مِّنْ رَّهْنٍ كِ دَلِيلٍ هِ، کفار دوزخ سے کبھی نہیں نکلیں گے۔ یہ اہل سنت کے علماء کا قول ہے اور ان کی دلیل یہ آیت ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ فِي سِتْرٍ الْخِيَاطِ (اعراف: 40) (اور نہ داخل ہوں گے جنت میں جب تک نہ داخل ہو اونٹ سوئی کے ناکہ میں)۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِن مَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ

عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿١٩١﴾

”اے انسانو! کھاؤ اس سے جو زمین میں ہے حلال (اور) پاکیزہ (چیزیں) اور شیطان کے قدموں پر قدم نہ

رکھو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت ثقیف، خزاعہ اور بنی مدلج کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر جانوروں میں سے کچھ حرام کئے تھے۔ لفظ عام ہے اور یہاں طیب سے

مراد حلال ہے یہ لفظ کے اختلاف کی وجہ سے تاکید ہے۔ یہ طیب کے بارے میں امام مالک کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: طیب سے مراد ہے جس سے لذت حاصل کی جائے۔ یہ ترویج ہے اسی وجہ سے گندے حیوان کے کھانے سے منع کیا گیا ہے (1)۔ اس کا بیان سورہ انعام اور سورہ اعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **حَلَالًا طَيِّبًا، حَلَالًا حَالٌ** ہے۔ بعض نے فرمایا: مفعول ہے حلال کو حلال کہنے کی وجہ یہ ہے اس سے منع کی گڑھ کھل جاتی ہے۔ حضرت سہل بن عبد اللہ نے کہا: نجات تین چیزوں میں ہے: حلال کھانا، فراغت ادا کرنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا، ابو عبد اللہ ساجی نے کہا: اس کا نام سعید بن زید تھا..... پانچ خصال کے ساتھ مکمل ہوتا ہے: (1) اللہ تعالیٰ کی معرفت (2) حق کی معرفت (3) اللہ تعالیٰ کے لئے عمل میں اخلاص (4) سنت پر عمل (5) حلال کھانا۔ اگر ان میں سے ایک خصلت بھی نہ پائی جائے تو عمل بلند نہیں ہوتا۔ حضرت سہل نے کہا: حلال کھانا ہو ہی نہیں سکتا مگر عزم کے ساتھ۔ اور مال حلال نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ وہ چھ چیزوں سے پاک ہو: سود، حرام، السحت یہ مجمل اسم ہے..... خیانت، مکروہ اور شبہ۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تَتَّبِعُوا** یہ نبی ہے۔ **خُطُوبِ الشَّيْطَانِ، خُطُوبِ جَمْعٍ** ہے خُطُوة اور خُطُوة کی دونوں کا معنی ایک ہے۔ فراء نے کہا الخطوات خُطُوة کی (خاء کے فتح کے ساتھ) جمع ہے خُطُوة (خاء کے ضمہ کے ساتھ) دو قدموں کے درمیان کے فاصلہ کو کہتے ہیں۔ جوہری نے کہا: جمع قلت خُطُوات، خُطُوات اور خُطُوات ہے اور جمع کثرت خطا ہے اور الخطوة (خاء کے فتح کے ساتھ) مصدر ہے۔ جمع خطوات اور خطاء ہے جیسے رکوع اور رکاء ہے۔ امرء القیس نے کہا:

لها وثبات كوثب الظباء فواد خطاء و دوا مطر

ابو الساء الحدوی اور عبید بن عمیر نے خطوات (خاء اور طاء کے فتح کے ساتھ) پڑھا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب، قتادہ، اعرج، عمرو بن میمون اور اعمش نے خطوات خاء اور طاء کے ضمہ اور واء پر ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انفس نے کہا: قراءت کرنے والوں کا نظریہ یہ ہے کہ یہ خطیئہ کی جمع ہے یہ الخطاء سے ہے الخطو سے نہیں ہے۔ جمہور کی قراءت پر معنی یہ ہوگا: شیطان کے پیچھے نہ چلو اور اس کے اعمال پر نہ چلو۔ اور جس عمل کے بارے شرع کا حکم وارد نہیں وہ شیطان کی طرف منسوب ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: خطوات الشیاطین سے مراد شیطانی اعمال ہیں۔ مجاہد نے کہا: شیطان کی خطائیں ہیں (2)۔ سدی نے کہا: اس سے مراد شیطان کی اطاعت ہے۔ ابو مجبلو نے کہا: یہ گناہوں کی نذریں ہیں۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ عام ہے۔ سنن اور شرائع کے علاوہ تمام بدعات اور گناہوں کو شامل ہے۔ شیطان کے بارے تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ** اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ شیطان دشمن ہے اور اللہ تعالیٰ کی خبر حق اور سچ ہے۔ عقلمند پر واجب ہے کہ وہ اس دشمن سے بچے جس کی عداوت حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے ظاہر ہے۔ اس نے اپنی پوری عمر انسان کے احوال کے خراب کرنے میں خرچ کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے بچنے کا حکم فرمایا۔



ارشاد فرمایا: وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ۔ اور نہ پیروی کرو شیطان کے قدموں کی بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٦٨﴾ (البقرہ) ”وہ تو حکم دیتا ہے تمہیں فقط برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ بہتان باندھو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں۔“

اور فرمایا: الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ (البقرہ: 268)

شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿٢٦٩﴾ (النساء)

”چاہتا ہے شیطان کہ بہکا دے انہیں بہت دور تک۔“

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَيْرِ وَالْيُسْرِ وَيُصَدِّكُمْ عَنْ ذِكْرِ

اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ﴿٢٧٠﴾ (المائدہ)

”یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعے اور روک دے تمہیں یاد الہی سے اور نماز سے۔“

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّهُ عَدُوٌّ مُضِلٌّ مُبِينٌ ﴿٢٧١﴾ (القصص) ”وہ دشمن کھلا گمراہ کرنے والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ۚ إِنَّمَا يَدْعُو حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السُّعُورِ ﴿٢٧٢﴾ (فاطر)

”یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے (اپنا) دشمن سمجھا کرو وہ فقط اس لئے (سرکشی کی) دعوت دیتا ہے اپنے گروہ کو

تا کہ وہ جہنمی بن جائیں۔“

یہ ڈرانے میں حد ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں کثیر ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر نے فرمایا: شیطان ٹحلی زمین میں باندھا

ہوا ہے جب وہ حرکت کرتا ہے تو زمین میں ہر دو شخصوں یا زیادہ کے درمیان شر اس کے تحرک سے ہوتا ہے۔ ترمذی نے حضرت

ابو مالک اشعری کی حدیث نقل کی ہے، اس میں ہے: میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کو یاد کرو کیونکہ اس کی مثال اس شخص

کی مثل ہے جس کے پیچھے دشمن جلدی سے نکلتا ہے حتیٰ کہ وہ شخص ایک محفوظ قلعہ میں آتا ہے اور دشمنوں سے اپنے آپ کو بچا لیتا

ہے۔ اسی طرح بندہ شیطان سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا مگر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ (1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث

حسن صحیح غریب ہے۔

إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٦٨﴾

”وہ تو حکم دیتا ہے تمہیں برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ بہتان باندھو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿٢٦٩﴾ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ، سَوْكُوسًا لِّئَلَّا يُقَالُ لَكَ: إِنَّكَ لَا تَعْلَمُ ۚ

1۔ جامع ترمذی، ابواب الامثال، باب ما جاء من مثل الصلوة والصيام، ص 110-109، جلد 2 (وزارت تعلیم)

انجام سے پریشان کرتا ہے۔ سوء، ساء یسؤ سوء اور مساء کا مصدر ہے، جب کوئی کسی کو پریشان کرے۔ سوؤتہ فسیئ جب اس نے اسے پریشان کیا تو وہ پریشان ہو گیا۔  
 اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَيِّئَتْ وَجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا (الملک: 27)  
 شاعر نے کہا:

ان يك هذا الدهر قد ساعن  
 فطالما قد ستنى الدهر  
 الامر عندي فيهما واحد  
 لذاك شكر و لذاك صبر

اگر اس زمانہ نے مجھے پریشان کیا ہے تو اس نے مجھے خوش بھی کیا تھا۔ میرے نزدیک دونوں حالتوں میں معاملہ ایک ہے۔  
 خوشی کے لئے شکر ہے اور تکلیف اور پریشانی کے لئے صبر ہے۔  
 الفحشاء برے منظر کو کہتے ہیں۔ جیسے شاعر نے کہا:

و جيد كجيد الروم ليس بفاحش

(اور اس کی گردن، ہرن کی گردن کی طرح ہے وہ بری نہیں ہے۔)

پھر یہ لفظ برے معانی کے لئے استعمال ہونے لگا۔ شرع ہی کسی چیز کو حسین اور قبیح بناتی ہے، ہر وہ چیز جس سے شریعت نے منع فرمایا وہ فحشاء میں سے ہے۔ مقاتل نے کہا: قرآن میں فحشاء کا ذکر جہاں بھی آیا ہے اس سے مراد زنا ہے سوائے اس ارشاد کے الشَّيْطَانُ يَعِدُّكُمْ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ (البقرہ: 268) یہاں فحشاء سے مراد زکاۃ نہ دینا ہے۔ میں کہتا ہوں: اس بناء پر بعض علماء نے کہا السؤ وہ جرم ہے جس میں حد نہیں اور الفحشاء وہ گناہ ہے جس میں حد ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے یہ مروی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ أَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ طبری نے کہا: کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو انہوں نے بحیرہ اور سائبہ میں سے حرام کی تھیں اور انہیں اپنی طرف سے شرع بنایا تھا (1)۔ وَ أَنْ تَقُولُوا بِالْسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ پر عطف کی بنا پر محل جرم میں ہے۔

وَ إِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوْ لَوْ

كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝

”اور جب کہا جاتا ہے ان سے پیروی کرو اس کی جو نازل فرمایا ہے اللہ نے تو کہتے ہیں: (نہیں) بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھ سکتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔“

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ، ہم ضمیر سے مراد کفار عرب ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ یہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ طبری کا قول ہے: لَّهُمْ میں ضمیر، یا ایہا الناس میں جو الناس ہے اس کی طرف راجع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: من يتخذ من دون الله میں جو مَنْ ہے اس کی طرف راجع ہے (1) اور اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ اللَّهُ یعنی قول و عمل میں قرآن کی اتباع کرو۔ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا، اَلْفَيْنَا کا معنی ہے ہم نے پایا۔ شاعر نے کہا:

فَالْفَيْتَهُ غَيْرَ مُسْتَعْتَبٍ وَلَا ذَاكَرَ اللَّهِ إِلَّا قَلِيلًا (2)

میں نے اسے نہ تو بہ کرنے والا اور نہ اللہ کا ذکر کرنے والا پایا مگر تھوڑا۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أُولَٰئِكَ كَانُوا لِبَنِي إِسْرَٰءِيلَ نَذِيرًا۔ اور وہ لوگوں کو فتنہ دیا گیا ہے کیونکہ یہ عاطفہ ہے، جملہ کا عطف جملہ پر ہے کیونکہ فساد کی غایت التزام میں یہ ہے کہ وہ کہیں ہم اپنے آباء کی پیروی کریں گے اگرچہ وہ نہ بھی سمجھتے تھے۔ پس انہوں نے اپنے نظریہ سے چمٹے رہنے اور اس کے التزام کو ثابت کیا کیونکہ یہی ان کے آباء کی حالت تھی۔

**مسئلہ:** ہمارے علماء نے فرمایا: اس آیت کے الفاظ کی قوت، تقلید کے ابطال کا تقاضا کرتی ہے اس کی مثل یہ آیت بھی ہے۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَىٰ الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا (المائدہ: 104) (جب کہا جاتا ہے انہیں کہ آؤ اس کی طرف جو نازل کیا ہے اللہ نے اور آؤ (اس کے) رسول کی طرف تو کہتے ہیں: کافی ہے ہمیں جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادا کو)۔

یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت اپنے ماقبل سے متصل ہیں۔ یہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کی جہالت کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے اپنی بیوقوفانہ آراء سے بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ جانوروں کی حرمت کا فیصلہ کیا۔ اور انہوں نے حجت اس سے پکڑی کہ یہ ایک ایسا امر ہے جس پر انہوں نے اپنے آباء کو پایا اور اس میں ان کی اتباع کی اور اس کو چھوڑ دیا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل کیا اور جس کا اس نے اپنے دین میں حکم دیا۔ پس لہم میں ضمیر دونوں آیتوں میں کفار عرب کی طرف لوٹے گی۔

**مسئلہ نمبر 3:** بعض علماء نے اس آیت کی وجہ سے تقلید کی مذمت کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی مذمت فرمائی کیونکہ انہوں نے باطل میں اپنے آباء کی اتباع کی تھی اور کفر و معصیت میں ان کی پیروی کی تھی۔ یہ مذمت تقلید باطل میں تو صحیح ہے لیکن حق میں تقلید کرنا اصول دین میں سے ایک اصل ہے اور مسلمانوں کی عصمتوں میں سے ایک عصمت (حفاظت) ہے۔ جاہل جو خود غور و فکر سے قاصر ہوتا ہے وہ اس کی طرف پناہ لیتا ہے۔ علماء کا اصول کے مسائل میں اس کے جواز میں اختلاف ہے جیسا کہ آگے آگے اور فروعی مسائل میں اس کا جواز صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** علماء کے نزدیک تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کے قول کو بغیر دلیل کے قبول کرنا۔ اس معنی کے اعتبار سے



جس نے نبی کریم ﷺ کے معجزات میں غور و فکر کے بغیر نبی کریم ﷺ کا قول قبول کیا وہ مقلد ہے اور جس نے معجزات میں غور و فکر کر کے آپ کے قول کو قبول کیا وہ مقلد نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو کسی کے قول کی صحت کو نہیں جانتا اس کے فتویٰ کی صحت کا اعتقاد کرنا تقلید ہے۔ لغت میں یہ قِلَادَةُ الْبَعِيد (اونٹ کا ہار) سے ماخوذ ہے۔ عرب کہتے ہیں: قِلَدْتُ الْبَعِيدَ، جب تو اس کے گلے میں ایسی رسی ڈالے جس کے ساتھ اس کو چلایا جائے۔ گویا مقلد اپنے تمام امور اپنے قائد کے سپرد کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے شاعر نے کہا:

وَقَدْ دَاوَا أَمْرَكُمْ اللَّهُ دَرْكُمُ ثَبَتَ الْجَنَانُ بِأَمْرِ الْحَرْبِ مُضْطَلَعًا

**مسئلہ نمبر 5:** تقلید یہ تو علم کا طریق ہے، نہ علم تک یہ پہنچانے والی ہے، نہ اصول میں ہے، نہ فروع میں ہے۔ یہ جمہور عقلاء اور علماء کا قول ہے جبکہ حشو یہ اور تعلیہ جہال سے حکایت ہے کہ یہ (تقلید) حق کی معرفت کا ذریعہ ہے اور یہ واجب ہے اور غور و فکر حرام ہے۔ اور ان پر ہمارے علماء نے جو حجت پیش کی ہے وہ کتب اصول میں ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** عام آدمی پر فرض ہے کہ وہ احکام کے استنباط میں احکام کے اصول میں مشغول نہ ہو کیونکہ اسے اس کی اہلیت نہیں ہے اور یہ حکم اس کے لئے ہر اس دینی معاملہ میں ہے جس کو وہ خود نہیں جانتا اور وہ محتاج ہوتا ہے اپنے زمانہ اور اپنے شہر کے بڑے عالم کی طرف جانے کا..... پس وہ ہر نئے مسئلہ کو اس سے پوچھے اور اس کے فتویٰ کی پیروی کرے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ لَوْ أَهْلَ الدِّيَارِ لَإِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٥٠﴾ (النحل) (پوچھو اہل علم سے اگر تم (خود حقیقت حال کو) نہیں جانتے)۔

اس شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے وقت کے بڑے عالم سے پوچھنے کی کوشش کرے تاکہ اکثر لوگوں کا اس پر اتفاق واقع ہو اور عالم پر بھی فرض ہے کہ وہ کسی بھی جدید مسئلہ میں کسی دوسرے عالم کی تقلید کرے جس میں دلیل و نظر کی وجہ اس پر مخفی ہو گئی ہے وہ اس میں غور و فکر کرنے کا ارادہ کرے حتیٰ کہ وہ مطلوب تک پہنچ جائے۔ پس اس کے پاس وقت تنگ ہو اور اسے عبادت کے فوت ہونے کا خوف ہو یا حکم کے ضیاع کا خوف ہو، خواہ وہ دوسرا مجتہد صحابی ہو یا کوئی اور ہو۔ قاضی ابوبکر اور محققین کی جماعت کا یہی قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** ابن عطیہ نے کہا: عقائد میں تقلید کے ابطال پر امت کا اجماع ہے (1)۔ قاضی ابوبکر بن عربی، ابو عمرو عثمان بن عیسیٰ بن درباس الشافعی جیسے علماء کا قول اس کے خلاف ذکر کیا ہے۔ ابن درباس نے اپنی کتاب ”الانتصار“ میں کہا ہے کہ بعض علماء نے کہا: توحید کے امر میں تقلید جائز ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِثْنَاوَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ (زخرف: 22) اللہ تعالیٰ نے ان کی اپنے آباء کی تقلید پر اور رسل کی اتباع ترک کرنے پر ان کی مذمت کی ہے جیسے اہل بدعت نے اپنے بڑوں کی تقلید کی اور دین میں حضرت محمد ﷺ کی اتباع کو ترک کیا کیونکہ ہر مکلف پر توحید کے امر کا سیکھنا فرض ہے اور ضروری ہے اور یہ کتاب و سنت سے ہی حاصل ہوتا ہے جس طرح آیت توحید میں ہم نے بیان کیا تھا۔ اللہ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ﴿٥١﴾ (الحج)

ابن درباس نے کہا: اکثر اہل زلیخ کا قول یہ ہے کہ جو کتاب وسنت کو مضبوطی سے پکڑتا ہے وہ مقلد ہے۔ یہ ان کی خطا ہے بلکہ یہ ان کے زیادہ لائق ہے ان کے مذہب کے مناسب ہے، کیونکہ انہوں نے اپنے رہنماؤں اور بڑوں کے قول کو قبول کیا جن میں انہوں نے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت اور اجماع صحابہ کی مخالفت کی ہے۔ پس یہ ان میں داخل ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے مذمت کی ہے۔ رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَّرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ۖ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنُتُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ۝ (سورہ احزاب) (اے ہمارے رب ہم نے پیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی پس ان ظالموں نے ہمیں بہکا دیا سیدھی راہ سے الٹ)۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَكُمْ عَلَىٰ أُمَمٍ وَثَاقًا ۖ وَإِنَّا عَلَىٰ أَثَرِهِمْ مُهْتَدُونَ ۝ (زخرف) پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا۔ قُلْ أَوْ لَوْ جِئْتُكُمْ بِآهِدٍ مُّبِينٍ ۖ وَمَا وَجَدْتُكُمْ عَلَىٰ أُمَّةٍ ۚ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۝ (زخرف) (اس نبی نے فرمایا: اگر میں لے آؤں تمہارے پاس زیادہ درست چیز اس سے جس پر پایا ہے تم نے اپنے باپ دادا کو (تب بھی؟) انہوں نے جواب دیا: ہم جو دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے اس کو نہیں مانتے۔ پھر نبی کریم ﷺ کو فرمایا: فَاتَّقِنَا مِنْهُمْ ۖ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَىٰ الظَّالِمِينَ ۖ (سورہ احزاب) (انہوں نے انتقام لیا ان سے۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ہدایت ان احکام میں ہے جو رسل علیہم السلام لے کر آئے۔

اہل اثر کا قول ان کے عقائد کے بارے میں نہیں ہے کہ ہم نے اپنے ائمہ اور آباء اور لوگوں کو کتاب وسنت اور صالحین کے اجماع پر پایا۔ اور کفار نے کہا: ہم نے اپنے آباء کو پایا اور ہم نے اپنے سادات اور بڑوں کی ایک راستہ میں اطاعت کی۔ چونکہ مسلمانوں نے اپنی اطاعت کو قرآن اور متابعت رسول کی طرف منسوب کیا جبکہ کافروں نے اپنے جھوٹ کو اہل باطل کی طرف منسوب کیا پس وہ گمراہی میں زیادہ ہو گئے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف فرمائی۔ ارشاد فرمایا: إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ۝ وَاشْتَعَتْ مِلَّةَ آبَائِي ابْرَهِيمَ وَاسْحَقَ وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نَشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ (یوسف) (میں نے چھوڑ دیا ہے دین اس قوم کا جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر نیز وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں اور میں تو پیروکار بن گیا اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کا، نہیں روا ہمارے لئے کہ ہم شریک ٹھہرائیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو) (توحید پر ایمان) تو اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے)۔

جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے آباء وحی کے قبیعین تھے اور یہی دین خالص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پسند کیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے آباء کی پیروی کرنا ان کی مدح کی صفات سے ہے۔ اور آپ وہ نہیں لائے جو وہ لائے تھے، اعراض کا ذکر اور اعراض کا جواہر کے ساتھ تعلق اور ان کا ان سے بدلنا پس یہ دلیل ہے کہ ان میں ہدایت نہیں اور نہ ان کے وضع کرنے والوں میں ہدایت ہے۔

ابن حصار نے کہا: ان کے ساتھ تلفظ دو سو سال بعد مامون کے زمانہ میں ظاہر ہوا تھا جب پہلی کتب کے ترجمے کئے گئے اور ان میں عالم کے قدم اور حدوث میں اختلاف ظاہر ہوا اور جوہر اور اس کا ثبوت، عرض اور اس کی ماہیت میں اختلاف ظاہر ہوا۔

پس بدعتیوں اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں کجی تھی، انہوں نے ان اصطلاحات کی حفاظت کی طرف جلدی کی اور ان کے ذریعے اہل سنت پر اغراب کا قصد کیا اور اہل ملت میں سے کمزور لوگوں پر شبہات کو داخل کرنے کا ارادہ کیا۔ معاملہ اسی طرح چلتا رہا حتیٰ کہ بدعت غالب آئی اور بدعتی ایک گروہ بن گیا اور سلطان پر معاملہ ملتیس ہو گیا حتیٰ کہ امیر نے خلق قرآن کا قول کیا اور لوگوں کو اس پر مجبور کیا اور امام احمد بن حنبل کو اس کی مخالفت پر سزا دی۔ اہل سنت کے علماء شیخ ابوالحسن اشعری، عبد اللہ بن کلاب اور ابن مجاہد، محاسبی اور دوسرے ان جیسے علماء نے ان کو جواب دینے کا بیڑا اٹھایا اور بدعتیوں کے ساتھ ان کی اصطلاحات میں غور و خوض کیا پھر ان کے ساتھ جنگ کی اور ان کے ہتھیاروں کے ساتھ انہیں قتل کیا جو مسلمان کتاب و سنت کو پکڑنے والے تھے اور ملحدین کے شبہات سے اعراض کرنے والے تھے۔ انہوں نے جوہر اور عرض میں غور نہ کیا اور اسی پر سلف صالحین تھے۔

میں کہتا ہوں: جس نے اب متکلمین کی اصطلاح میں غور و فکر کیا حتیٰ کہ اس کے ساتھ دین کا دفاع کیا اس کا مرتبہ انبیاء کے مرتبہ کے قریب ہے..... اور جو غالی متکلمین میں سے ان لوگوں کے راستہ پر چلا جنہوں نے اثر کو مضبوطی سے پکڑا اور علم کلام کی کتب کے درس پر برا بیختہ کیا اور وہ حق کو صرف ان اصطلاحات کے واسطے سے پہچانتا تھا تو وہ مذموم ہو گیا کیونکہ انہوں نے سابقہ ائمہ کے راستہ کو چھوڑ دیا..... دلیل اور حجت کے ساتھ جھگڑنا یہ تو قرآن میں واضح ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

وَمَثَلُ الْإِذْيِ كَقَرُوءِ الْإِذْيِ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۖ صُمُّ

بُكْمٌ عَنْهُمْ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٥١﴾

”اور مثال ان کی جنہوں نے کفر (اختیار) کیا ایسی ہے جیسے کوئی چلا رہا ہو ایسے (جانوروں) کے پیچھے جو نہیں سنتے سوائے خالی پکار اور آواز کے یہ لوگ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سودہ کچھ نہیں سمجھتے۔“

اللہ تعالیٰ نے کفار کو وعظ کرنے والے اور ان کو دعوت دینے والے کو اس چرچا کے ساتھ تشبیہ دی جو بکریوں اور اونٹوں کو آواز دیتا ہے..... وہ داعی حضرت محمد ﷺ تھے..... اور وہ جانور صرف اس کی آواز اور ندا کو سنتے ہیں اور جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتے نہیں ہیں اسی طرح حضرت ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، سدی، زجاج، فراء اور سیبویہ نے اس کی اسی طرح تفسیر کی ہے۔ یہ انتہائی ایجاز کے ساتھ کلام ہے (1)۔ سیبویہ نے کہا: ان کفار کو پکارنے والے سے تشبیہ نہیں دی بلکہ جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اے محمد! منہ نہ کھولیں تیری مثال اور کفار کی مثال ان جانوروں کو آواز دینے والے اور ان جانوروں کی ہے جو سمجھتے نہیں ہیں۔ پس معنی کی دلالت کو حذف کیا گیا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس کا معنی ہے کہ کفار کی اپنے پتھر کے خداؤں کو پکارنے کی مثال رات کے درمیان میں چیخنے والے کی ہے۔ پس صدی اس کو جواب دیتی ہے وہ ان کو آواز دیتا ہے جو سنتے نہیں ہیں اور وہ ایسا جواب دیتا ہے جس کی حقیقت نہیں ہے اور نفع بخش نہیں ہے (2)۔ قطرب نے کہا: اس کا معنی ہے کفار کا انہیں پکارنا جو ان کی بات سمجھتے ہی نہیں ہیں جس طرح چرواہا اپنی بکریوں کو آواز دیتا ہے وہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں۔ طبری نے کہا: اس سے مراد کافروں کا اپنے بتوں کو پکارنے کی مثال اس شخص کی ہے جو دور سے کسی چیز کو پکارتا ہے اور دوری کی وجہ سے



اس کی آواز نہیں سنی جاتی۔ پس پکارنے والے کے لئے صرف پکار اور ندا ہے جو اسے مشقت اور تھکن میں ڈالتی ہے۔ ان تینوں تاویلات میں کفار کو پکارنے والے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور بتوں کو جانوروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ النعیق کا معنی بکریوں کو جھڑکنا اور ان کو آواز دینا ہے۔ کہا جاتا ہے: نَعَقَ الرَّاعِي بَغْنَمَهُ يَنْعِقُ نَعِيقًا وَنَعَقًا وَنَعَقَانًا۔ یعنی چرواہا اپنی بکریوں پر چلایا اور انہی جھڑکا۔ اخطل نے کہا:

انْعَقَ بَضَانُكَ يَا جَرِيرُ فَانْمَا مَمْتَكُ نَفْسِكَ فِي الْخَلَاءِ ضَلَالًا

شاعر نے یہاں آواز دینے کے معنی میں یہ لفظ استعمال کیا۔ یعنی اے جریر! اپنی بکریوں کو آواز دے۔

قتبی نے کہا: جریر بھیڑیں چرانے والا نہیں تھا۔ اس نے یہ ارادہ کیا کہ بنی کلب کو بھیڑیں چرانے کی وجہ سے عار دلائی جاتی تھی اور جریر ان میں سے تھا، وہ ان کی جہالت میں تھا۔ عرب جہالت میں بکریوں کے چرواہے سے مثال دیتے تھے وہ کہتے تھے: اجہل من راعی الضان، وہ بھیڑیں چرانے والے سے بھی زیادہ جاہل ہے۔ قتبی نے کہا: جو اس آیت کا یہ معنی بیان کرتا ہے یہ اس کا اپنا مذہب ہے مگر ہماری معلومات کے مطابق علماء میں سے کسی کا یہ نظریہ نہیں۔

ندا بعید کے لئے اور دعا قریب کے لئے ہوتی ہے اسی وجہ سے نماز کی اذان کو ندا کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دور والوں کے لئے ہوتی ہے۔ ندا کو بھی نون کے ضمہ کے ساتھ بولا جاتا ہے جبکہ اصل نون پر کسرہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کفار کو تشبیہ دی کہ وہ گونگے، بہرے اور اندھے ہیں۔ یہ سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿٣١﴾

”اے ایمان والو! کھاؤ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں اور شکر ادا کرو اللہ تعالیٰ کا اگر تم صرف اسی کی عبادت کرتے ہو۔“

یہ پہلے امر کی تاکید ہے اور یہاں تفضیل کے لئے مومن کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا اور کھانے سے مراد ہر اعتبار سے انتفاع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اکل سے مراد معروف کھانا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ قبول نہیں فرماتا مگر پاک کو اور اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اسی بات کا حکم فرمایا جو اس نے رسولوں کو فرمایا تھا۔ ارشاد فرمایا: يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِن الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٣١﴾ (المومن) اے میرے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھے کام کرو بے شک میں جو اعمال تم کر رہے ہو ان سے خوب واقف ہوں۔ اور ارشاد فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ۔ اے ایمان والو! کھاؤ ان پاک چیزوں کو جو ہم نے دی ہیں تمہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص لباس کرتا ہے، پراگندہ بال ہے، غبار آلود ہے وہ ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کرتا ہے اور کہتا ہے: یارب یارب! جبکہ اس کا کھانا حرام ہے اور مشروب حرام ہے اور اس کا لباس

حرام ہے اور حرام کی غذا دی گئی ہے تو اس کی دعا کیسے قبول ہوگی (1)۔ **وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُونَ** شکر کا معنی گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

**اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخَنَازِيرِ وَمَا اَهْلٌ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنْ اضْطُرَّ**

**غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** (2)

”اس نے حرام کیا تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور بلند کیا گیا ہو جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام۔ لیکن جو مجبور ہو جائے در آنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بہت گناہ بخشنے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔“

اس میں چوتیس مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ**، **اِنَّمَا** کا کلمہ حصر کے لئے وضع کیا گیا ہے نفی اور اثبات کو متضمن ہے، خطاب جس کو شامل ہوتا ہے اسے ثابت کرتا ہے اور ماعدہ کی نفی کرتا ہے یہاں تحریم کی حصر کی نفی ہے خصوصاً تحلیل کے بعد آئی ہے۔ پہلے فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ**۔ اس میں مطلقاً اباحت ہے پھر حرام کا ذکر **اِنَّمَا** کے کلمہ کے ساتھ کیا۔ پس یہ دونوں قسموں کے ایجاب کا تقاضا ہے۔ پس کوئی حرام اس آیت سے خارج نہیں۔ یہ آیت مدنی ہے، اس کو دوسری آیت کے ساتھ مؤکد کیا۔ روایت ہے کہ یہ عرفہ میں نازل ہوئی۔ **قُلْ لَا اَجِدُ فِي مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُعْذَرًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّتَعْطَنُ**..... (الانعام: 45) آپ فرمائیے میں نہیں پاتا اس (کتاب) میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی چیز حرام کھانے والے پر جو کھاتا ہے اسے۔ پس اول و آخر بیان مکمل ہوا۔ یہ ابن عربی کا قول ہے اس پر مزید کلام سورۃ الانعام میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 2:** **الْمَيْتَةَ** اس کو حرام کی وجہ سے نصب دی گئی ہے اور ما کافہ ہے اور اسے الذی کے معنی میں کرنا بھی جائز ہے جو لکھنے میں جدا ہوتا ہے اور ان کی خبر کی حیثیت سے المیتۃ، الدم اور لحم الخنزیر کو رفع دیا جائے گا۔ یہ ابن ابی عمیر کی قراءت ہے اور حرام میں ضمیر الذی کی طرف لوٹے گی..... اور اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **اِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدًا سَاجِدًا** (طہ: 69) ابو جعفر نے ضمیر ماء کے ضمہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بعد والے اسماء کو رفع دیا گیا ہے یا نائب فاعل کی حیثیت سے یا ان کی خبر کی حیثیت سے۔ ابو جعفر بن قعقاع نے المیتۃ (2) تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ طبری نے کہا ہے: لغوی علماء کی جماعت نے کہا: میت اور میتہ تشدید اور تخفیف دونوں لغتیں ہیں۔ ابو حاتم وغیرہ نے کہا: جو فوت ہو چکا ہو اس میں میت اور میت کہا جاتا ہے اور جو ابھی تک فوت نہ ہوا ہو اس کے لئے میت تخفیف کے ساتھ نہیں بولا جاتا اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُونَ** (زمر: 30)۔ شاعر نے کہا:

اِنَّمَا الْمَيْتَ مَيْتٌ الْاَحْيَاءُ

لَيْسَ مِنْ مَّاتٍ فَاسْتَدَامَ بَيْتٌ

2۔ المحرر الوجيز، صفحہ 239، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

1۔ مجمع مسلم، کتاب الزکوٰۃ، صفحہ 326، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

جوفوت ہو گیا اور راحت پا گیا وہ میت نہیں میت تو زندوں کا میت ہے۔

جب تک فوت نہ ہوا ہو اس کے لئے کسی نے تخفیف کے ساتھ نہیں پڑھا، مگر جو بڑی نے ابن کثیر سے روایت کیا ہے وہ ماہو بیت اس سے مشہور تحقیق ہے۔ رہا شاعر کا قول:

اذا مات میت من تميم فساك ان يعيش فجنى بزاز  
جب تميم میں سے کوئی میت مرتا ہے تو تجھے خوش کرتا ہے کہ وہ زندہ رہے اور زاد راہ لایا جائے۔

میں مکمل جو نہیں کر سکتا کیونکہ اس نے حقیقتاً میت کا ارادہ کیا اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے شارف الموت (قریب الموت) کا ارادہ کیا ہے۔ پہلا معنی اشر ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** النبیۃ جو چیز ذبح کی جاتی ہے اگر ذبح کے بغیر اس کی روح نکل جائے تو اسے النبیۃ کہتے ہیں اور جو چیز کھائی نہیں جاتی اس کی ذبح اس کی موت کی طرح ہے جس طرح درندے وغیرہ ہیں۔ اس کا بیان آگے آئے گا اور سورہ انعام میں بھی آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4:** یہ آیت عام ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے ساتھ تخصیص داخل ہوئی ہے۔ ہمارے لیے دو مردے حلال کئے گئے ہیں: مچھلی اور مکڑی اور دو خون حلال کئے گئے ہیں: جگر اور تلی (1)۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ اسی طرح عنبر (مچھلی) کے بارے میں حضرت جابر کی حدیث ہے۔ قرآن کا عموم اس کی سند کی صحت کی وجہ سے خاص کیا گیا ہے۔ بخاری اور مسلم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (المائدہ: 96) (2) کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا ہے اس کا بیان ان شاء اللہ آئندہ آئے گا۔

اکثر اہل علم سمندر کے تمام جانور زندہ اور مردے کھانے کے جواز کے قائل ہیں یہ امام مالک کا مذہب ہے اور پانی کے خنزیر کے بارے میں جواب دینے سے توقف کیا ہے اور فرمایا: تم کہتے ہو: خنزیر۔ ابن القاسم نے کہا: میں اس سے بچتا ہوں اور میں اسے حرام خیال نہیں کرتا۔

**مسئلہ نمبر 5:** علماء کا کتاب کی تخصیص سنت (حدیث) سے کرنے میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کے باوجود اس پر اتفاق ہے کہ ضعیف حدیث کے ساتھ قرآن کی تخصیص جائز نہیں۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ کبھی اس آیت کی تخصیص پر صحیح مسلم کی روایت سے استدلال کیا جاتا ہے جو حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰ سے مروی ہے (3)، فرمایا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں سات غزوات میں شرکت کی، ہم آپ ﷺ کے ساتھ مکڑی کھاتے تھے۔ اس کا ظاہر معنی یہ ہے کہ اسے کھایا جائے جیسے بھی وہ مرے پکڑنے سے یا خود بخود ابن نافع، ابن عبد الحکم اور اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ امام شافعی اور امام ابو

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمہ، صفحہ 246 (وزارت تعلیم) صحیح بخاری، حدیث نمبر 4013، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الذبائح والصید، صفحہ 826، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الذبائح والصید، صفحہ 152، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

صحیح بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب اکل الجراد، حدیث 5071، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



حنیفہ (ل) وغیرہا کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب میں سے اکثر نے اس دریائی جانور کو کھانے سے منع کیا ہے جو طبعی موت مر جائے کیونکہ وہ خشکی کے شکار سے ہے، کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ محرم جب اسے قتل کرے گا تو اس کی جزا دے گا۔ پس وہ ہرن کے مشابہ ہے۔ اشہب نے کہا: اگر وہ پاؤں یا پر کے کاٹنے کی وجہ سے مر جائے تو اسے نہیں کھایا جائے گا کیونکہ یہ ایسی حالت تھی جس کے ساتھ وہ زندہ رہ سکتا تھا اور اس کی نسل جاری ہو سکتی تھی۔ مکڑی کے حکم کا مزید بیان سورہ اعراف میں اس کے ذکر کے وقت آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 6:** علماء کا اختلاف ہے کیا میت سے نفع حاصل کرنا اور نجاسات میں سے کوئی فائدہ اٹھانا جائز ہے یا نہیں۔ امام مالک کے اس مسئلہ میں مختلف اقوال ہیں۔ کبھی فرمایا: ان سے نفع اٹھانا جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ حضرت میمونہ کی (مردہ) بکری کے پاس سے گزرے تو فرمایا تم نے اس کی کھال کیوں حاصل نہیں کی (1) (الحمدیٹ) اور کبھی فرمایا: مردہ چیز ساری کی ساری حرام ہے، کسی اعتبار سے بھی اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں اور نہ نجاستوں میں سے کسی نجاست سے نفع اٹھانا جائز ہے۔ حتیٰ کہ ناپاک پانی سے کھیتی کو سیراب کرنا اور کسی حیوان کو پلانا جائز نہیں اور جانوروں کو نجاستوں کا چارہ نہیں کھلایا جائے گا، مردار کتوں اور درندوں کو بھی نہیں کھلایا جائے گا۔ اگر حیوان ناپاک چیز کھائیں تو انہیں منع کیا جائے گا۔ اس قول کی وجہ کو خاص نہیں فرمایا۔ یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ یہ خطاب مجمل ہے، کیونکہ مجمل وہ ہوتا ہے جس کے ظاہر سے مراد سمجھی نہیں جاتی۔ عربوں نے اس فرمان حُرْمَتُ عَلَیْکُمُ الْمَیِّتَہُ (مائدہ: 3) کا مراد سمجھا اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا مردار کی کسی چیز سے نفع نہ اٹھاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عکیم کی حدیث میں ہے ”مردار کی کھال اور پٹھوں سے نفع نہ اٹھاؤ (2)“۔ اور یہ ارشاد آپ نے وصال سے ایک ماہ قبل فرمایا تھا۔ ان اخبار کا بیان اور ان پر کلام سورہ النحل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 7:** رہی وہ اونٹنی یا گائے یا بکری جو ذبح کی گئی اور اس میں مردہ بچہ تھا تو بغیر ذبح کئے اس کا کھانا جائز ہے مگر یہ کہ وہ زندہ نکلے تو اسے ذبح کیا جائے گا۔ اس کے لئے اس کے نفس کا حکم ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مردہ بچہ جب ذبح کئے بعد مردہ نکلا تو وہ اس جانور کے اعضاء میں سے ایک عضو کے قائم مقام ہے۔ اور اس کی وضاحت اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص بکری بچے اور اس کے پیٹ کی چیز کا استثناء کرے تو جائز نہیں ہے جس طرح اگر کوئی جانور کے کسی عضو کی استثناء کرے تو جائز نہیں ہوتا۔ جو کچھ جانور کے پیٹ میں ہوتا ہے وہ دوسرے تمام اعضاء کی طرح اس کا تابع ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی لونڈی کو آزاد کرے جبکہ اس کے پیٹ والی چیز پر آزادی کو واقع نہ کرے تو بھی وہ آزاد ہو جائے گا لیکن اگر بچہ ماں سے جدا ہو تو وہ بیع، عتق (آزادی) میں تابع نہ ہوگا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے گائے اور بکری کے بارے پوچھا گیا جنہیں ذبح کیا جاتا ہے اور اونٹنی جسے نحر کیا جاتا ہے اور اس کے پیٹ میں مردہ بچہ ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذبائح والصید، صفحہ 158، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) صحیح بخاری، حدیث نمبر 1397، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب اللباس، صفحہ 206، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ایضاً، سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب روی ان لا ینتفع باہاب المیتۃ، حدیث 3598، ضیاء القرآن پبلی کیشنز (1) امام ابو حنیفہ کی یہ رائے نہیں

فرمایا: اگر تم چاہو تو اس مردہ بچے کو کھاؤ کیونکہ اس کا ذبح اس کی ماں کا ذبح ہے۔ ابو داؤد نے اس کا معنی حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے (1)، یہ نص ہے جو احتمال نہیں رکھتی ہے اس کا مزید بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 8:** امام مالک سے مردار کی کھال کے متعلق روایات مختلف ہیں، کیا اس کو دباغت کے ساتھ پاک کیا جائے گا یا نہیں؟ امام مالک سے ایک روایت یہ ہے کہ اسے پاک نہیں کیا جائے گا یہ ان کا ظاہر مذہب ہے۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ اسے پاک کیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کھال کی دباغت کی جائے گی وہ پاک ہو جائے گی (2)۔ اور پاک نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مردار کا جز ہے اگر بحالت حیات اس کی کھال اتاری جاتی تو وہ نجس ہوتی۔ پس واجب ہے کہ دباغت بھی اسے پاک نہ کرے جس طرح گوشت دباغت سے پاک نہیں ہوتا اور جو اخبار طہارت کے متعلق ہیں انہیں اس پر محمول کیا جائے گا کہ جلد سے دباغت میل کچیل کو زائل کر دیتی ہے حتیٰ کہ اس سے خشک چیزوں میں اور اس پر بیٹھنے کا نفع اٹھایا جاسکتا ہے اور مشکیزہ بنا کر پانی میں بھی اس سے نفع اٹھایا جاسکتا ہے کیونکہ پانی طہارت کی اصل پر ہے جب تک اس کا وصف نہ بدلے۔ اس کا حکم سورہ فرقان میں آئے گا۔ طہارت لغت میں میل کچیل کو دور کرنے کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس طرح طہارت شرعیہ کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** مردار کے بال اور اس کی اون پاک ہے، کیونکہ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مردار کی کھال میں کوئی حرج نہیں جب اس کی دباغت کی جائے اور اس کی صوف اور بالوں میں کوئی حرج نہیں جب وہ دھوئے جائیں (3) کیونکہ وہ ظاہر تھے اگر وہ زندہ حالت میں جانور سے لئے جاتے پس واجب ہے کہ موت کے بعد بھی اسی طرح ہوں مگر گوشت جب حالت حیات میں نجس تھا تو موت کے بعد بھی اسی طرح ہوگا۔ پس اون کا حکم موت کی حالت میں گوشت کے خلاف ہوگا جیسا کہ حالت حیات میں اس کا حکم گوشت سے مختلف تھا۔ یہ استدلال بالعکس کے اعتبار سے ہے۔ اس پر دودھ اور مردہ مرغی سے نکلنے والے انڈے کا حرام ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ ہمارے نزدیک موت کے بعد بھی دودھ پاک ہے اسی طرح انڈا بھی پاک ہے لیکن وہ ناپاک برتن سے حاصل ہوئے تو برتن کی مجاورت کی وجہ سے ناپاک ہو گئے نہ کہ وہ موت سے نجس ہوئے۔ مزید تفصیل اس مسئلہ کی اور اس سے پہلے والے مسئلہ کی اور علماء کا اختلاف ان شاء اللہ سورۃ النحل میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 10:** وہ چیز جس میں چوہا گر جائے اس کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت یہ ہے کہ چوہا زندہ نکل آئے گا تو وہ پاک ہوگا اور اگر اس میں چوہا مر جائے تو اس کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت یہ کہ وہ چیز مائع ہوگی تو وہ ساری ناپاک ہو جائے گی۔ ایک حالت یہ کہ وہ چیز جامد ہوگی تو جو حصہ اس چوہے کے ساتھ متصل ہوگا وہ ناپاک ہوگا پس جو اس کے قریب ہوگا اسے پھینک دیا جائے گا اور باقی سے نفع اٹھایا جائے گا وہ پاک ہوگا۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے چوہے کے متعلق پوچھا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، صفحہ 35، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اللہاس، صفحہ 266 (وزارت تعلیم) و جامع ترمذی، کتاب اللہاس، صفحہ 208، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن دارقطنی، صفحہ 47، جلد 1 (دارالحاس)

گیا جو گھی میں گر کر مر جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اگر وہ گھی جامد ہو تو اسے اور اس کے ارد گرد کے گھی کو پھینک دو اور اگر وہ مائع ہو تو اسے بہا دو (1)۔“ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جب اسے دھویا جائے؟ بعض علماء نے فرمایا: وہ دھونے سے پاک نہ ہوگا کیونکہ نجس مائع ہے وہ خون، شراب، پیشاب اور دوسری نجاستوں کے مشابہ ہے۔

ابن قاسم نے فرمایا: دھونے کے ساتھ پاک ہو جائے گا کیونکہ وہ جسم تھا جو نجاست کی مجاورت کی وجہ سے ناپاک ہو گیا۔ پس وہ کپڑے کے مشابہ ہے، اس سے خون کا پاک ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ وہ نجس عین ہے اور شراب اور پیشاب، ان کو دھونا ان کو ہلاک کر دیتا ہے انہیں دھویا نہیں جاسکتا۔

**مسئلہ نمبر 11:** جب ہم غسل کے ساتھ طہارت کا حکم کریں گے تو وہ طہارت میں اور تمہا وجوہ انتفاع میں پہلی حالت کی طرف لوٹ آئے گا لیکن اسے بیچے گا نہیں حتیٰ کہ اسے بیان کرے کیونکہ یہ لوگوں کے نزدیک عیب ہے اور نفوس اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اور بعض علماء اس کی تحریم اور نجاست کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس کا بیچنا جائز نہیں حتیٰ کہ عیب کو بیان کرے جس طرح کہ دوسری معیوب اشیاء ہیں اور غسل سے پہلے اس کا بیچنا کسی حال میں جائز نہیں کیونکہ ان کے نزدیک نجاست کا بیچنا جائز نہیں۔ نیز یہ نجس مائع ہے یہ شراب کے مشابہ ہے۔ نیز نبی کریم ﷺ سے شراب کی قیمت کے بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ یہود پر لعنت کرے ان پر چربی حرام کی گئی تھی پھر انہوں نے اسے پگھلایا اور اسے بیچا اور اس کی اٹمان کو کھایا (2)۔“ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام کرتا ہے تو اس کی ثمن کو حرام کرتا ہے۔ یہ مائع نجاست کی وجہ سے حرام کی گئی تھی پس اس کی ثمن کا ظاہر حکم کی وجہ سے حرام کرنا واجب ہے۔

**مسئلہ نمبر 12:** جب ہانڈی میں کوئی حیوان پرندہ وغیرہ گر جائے اور مر جائے تو ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہانڈی میں جو کچھ تھا اسے نہیں کھایا جائے گا۔ مردار کی مخالطت سے وہ ناپاک ہو چکا ہے۔ ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: گوشت کو دھویا جائے گا اور شور بہ انڈیل دیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس سے اس مسئلہ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: گوشت کو دھویا جائے گا اور اسے کھایا جائے گا اور شور بہ کے متعلق ان کے شاگردوں میں سے کوئی مخالف نہیں یعنی اسے انڈیل دیا جائے گا۔ یہ ابن خويز منداد نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13:** رہا مردار کے معدہ کا پیر اور مردار کا دودھ، تو امام شافعی نے فرمایا یہ نجس ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (المائدہ: 3) عام ہے۔ امام ابوحنیفہ نے ان دونوں چیزوں کی طہارت کا کہا ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ خلقت کی جگہ کا اس چیز کے پلید کرنے میں کوئی اثر نہیں جس میں خلقت کا عمل ہوا ہے اسی وجہ سے وہ گوشت کھایا جاتا ہے جس میں رگیں ہوتی ہیں حالانکہ ان رگوں میں خون داخل ہوتا ہے اور نہ اس کو دھویا جاتا ہے اور نہ اس کی تطہیر کی جاتی ہے۔ امام مالک کا قول بھی امام ابوحنیفہ کے قول کی طرح ہے۔ یہ موت کے ساتھ ناپاک نہیں ہوتا بلکہ ناپاک برتن کی مجاورت کی وجہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، صفحہ 181، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب تحریم بیع الخمر والمیتۃ، صفحہ 23، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)



سے ناپاک ہوتا ہے اور ان چیزوں میں سے ہے جس کو دھویا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح مرغی سے جو انڈا اس کے مرنے کے بعد نکلتا ہے اس کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ انڈا مرغی سے نکلنے سے پہلے مانع کے حکم میں ہوتا ہے یہ ہوا کے ساتھ سخت ہو جاتا ہے۔

ابن خويز منداد نے کہا: اگر کہا جائے کہ تمہارا قول اجماع کے خلاف تک پہنچاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے بعد مسلمان پنیر کھاتے تھے جو ان کے پاس عجمیوں کی زمین سے لایا جاتا تھا اور یہ معلوم ہے کہ عجمی مجوسی تھے ان کا ذبیحہ مردار ہے۔ صحابہ کرام یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ یہ مردار جانور کے معدہ کا پنیر ہے یا ذبح کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے: خشک دودھ میں جو پنیر کی مقدار واقع ہوتی تھی وہ تھوڑی ہوتی تھی اور تھوڑی نجاست معاف ہے جبکہ وہ کثیر مانع میں مل جائے۔ یہ ایک روایت کے مطابق جواب ہے اور دوسری روایت پر یہ جواب ہے کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا اور یہ کسی کے لئے نقل کرنا ممکن نہیں کہ صحابہ کرام نے عجمیوں کی زمین سے لایا گیا پنیر کھایا تھا بلکہ پنیر عربوں کے طعام سے نہیں تھا جب مسلمان عجم کی زمین میں فتوحات کے ذریعے پھیل گئے تو ذبائح ان کے لئے ہو گئے پھر ہمارے لئے کہاں سے ہے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ نے پنیر کھایا تھا چہ جائیکہ وہ عجم کی زمین سے لایا گیا ہو اور وہ ان کے ذبائح کے معدہ سے بنایا گیا ہو۔

ابو عمر نے کہا: بت پرستوں، مجوسیوں کے کھانے کو کھانے میں کوئی حرج نہیں اور باقی تمام کفار کے کھانے میں کوئی حرج نہیں جبکہ وہ کھانا ان کے ذبائح سے نہ ہو اور نہ اسے ذبح کی احتیاج ہو مگر وہ پنیر جس میں مردار کے معدہ کا پنیر ہو۔ سنن ابن ماجہ میں ہے: پنیر اور گھی۔

حضرت سلمان فارسی سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ سے گھی، پنیر اور فراء (ایسی پوستیں جس کا اندرونی حصہ لومڑی بلی وغیرہ کی کھال سے تیار کیا جاتا ہے) کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: حلال وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا اور جس سے سکوت اختیار کیا گیا وہ معاف ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 14:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ** (المائدہ: 1)۔ نفع اٹھایا جائے گا، ابن خويز منداد نے کہا: خون حرام ہے جب تک اس میں عموم بلوئی نہ ہو اور عموم بلوئی کی وجہ سے جو خون معاف ہوتا ہے اس سے مراد وہ خون ہے جو گوشت اور رگوں میں ہوتا ہے یہ بدن میں اور کپڑے میں تھوڑا ہو اس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ ہم نے یہ اس وجہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **حُذِرَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ** (المائدہ: 3) دوسری جگہ فرمایا: **قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مُسْفُوحًا** (انعام: 145)

(آپ فرمائیے میں نہیں پاتا اس کتاب میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی چیز حرام کھانے والے پر جو کھاتا ہے اسے مگر یہ کہ مردار ہو یا رگوں کا بہتا ہوا خون)۔

پس بہنے والا خون حرام ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ہانڈی پکاتے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، باب اکل الجبن والسنن، صفحہ 249 (وزارت تعلیم)

تھے خون کی وجہ سے زردی بلند ہوتی تھی ہم کھاتے تھے اور ہم اسے ناپسند نہیں کرتے تھے (1)۔ اس سے بچنا بوجھ ہے اور اس میں مشقت ہے اور دین میں بوجھ اور مشقت اٹھالی گئی ہے۔ یہ شرع میں اصل ہے۔ جب عبادت کی ادائیگی میں امت کو حرج لاحق ہوا اور اس پر بوجھ ہوا تو عبادت ساقط کر دی۔ آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ مضطر مردار کھاتا ہے، مریض افطار کرتا ہے اور مرض میں تیمم کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے یہاں مطلقاً خون کا ذکر کیا اور سورۃ الانعام میں قَسْفُوْحًا کے ساتھ مقید فرمایا۔ علماء نے یہاں مطلق کو مقید پر محمول فرمایا ہے یہاں خون سے مراد بہنے والا خون ہے کیونکہ جو گوشت کے ساتھ متصل ہوتا ہے وہ بالا جماع حرام نہیں ہے اسی طرح جگر اور تلی کی حلت پر بھی اجماع ہے اور مچھلی کے خون میں اختلاف ہے۔ قاسمی سے مروی ہے کہ یہ پاک ہے۔ اس کی طہارت سے لازم آتا ہے کہ یہ حرام نہیں ہے (2)۔ یہ ابن عربی کا اختیار ہے۔ فرمایا: اگر مچھلی کا خون نجس ہوتا تو اس کی زکاة (ذبح کرنا) مشروع ہوتی۔

میں کہتا ہوں: یہ مچھلی کے خون کے بارے میں امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔ میں نے بعض حنفیوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اس کے پاک ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جب اس کا خون خشک ہوتا ہے تو سفید ہو جاتا ہے بخلاف دوسرے خونوں کے، وہ سیاہ ہو جاتے ہیں یہ نکتہ شوافع پر احناف کی طرف سے حجت ہے۔

**مسئلہ نمبر 15:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَهُمُ الْخِزْيِيرُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے خنزیر کے گوشت کا ذکر کیا تاکہ اس کے عین کی تحریم پر دلالت کرے خواہ ذبح کیا گیا ہو یا ذبح نہ کیا گیا ہو، تاکہ چربی اور دوسری بھر بھری ہڈیوں وغیرہ کو شامل ہو جائے۔ (3)

**مسئلہ نمبر 17:** اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خنزیر سارا حرام ہے سوائے بالوں کے۔ اس کے بالوں کے ساتھ جوتی سینا جائز ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے خنزیر کے بالوں کے ساتھ جوتا سینے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ ابن خویز مند اد نے اس کو ذکر کیا ہے۔ فرمایا: کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اس کے ساتھ جوتیاں سی جاتی تھیں، اس کے بعد بھی یہ عمل موجود تھا، ہمیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد کسی امام نے اس کا انکار کیا ہو۔ اور رسول اللہ ﷺ نے جس کو جائز قرار دیا وہ ابتداء الشریع کی طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 18:** خشکی کے خنزیر کی حرمت میں کوئی اختلاف نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اور پانی کے خنزیر میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے اس کے بارے میں کچھ جواب دینے سے انکار کیا اور فرمایا: تم خنزیر کہتے ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس کا بیان سورہ مائدہ میں ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 19:** اکثر لغوی علماء کا خیال ہے کہ خنزیر کا لفظ رباغی ہے۔ ابن سیدہ نے بعض سے روایت کیا ہے کہ یہ خنزیر العین سے مشتق ہے کیونکہ وہ اس طرح دیکھتا ہے، اس صورت میں لفظ ثلاثی ہوگا (1) اور ”الصباح“ میں ہے تغاظر الرجل، اپنی پلک کو تنگ کرنا تاکہ نظر کو تیز کرے۔ الخور، آنکھ کا تنگ ہونا اور چھوٹا ہونا۔ رجل الخور بین الخور۔ اور کہا جاتا ہے: گویا وہ انسان آنکھ کے آخری حصہ سے دیکھتا ہے۔ خنزیر کی جمع خنازیر ہے۔ خنازیر ایک معروف بیماری بھی ہے یہ ایک سخت زخم ہوتا ہے جو گردن میں ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 20:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا أَهْلُ بَيْتِ لَعْنِ اللَّهِ۔ یعنی جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اس سے مراد مجوسی، بت پرست اور معطل کا ذبیحہ ہے کیونکہ بت پرست بت کے لئے ذبح کرتا ہے مجوسی آگ کے لئے ذبح کرتا ہے اور معطل، وہ کسی ذات کا اعتقاد نہیں رکھتا وہ اپنے لئے ذبح کرتا ہے۔ علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے مجوسی جسے آگ کے لئے ذبح کرتا ہے، بت پرست جو اپنے بت کے لئے ذبح کرتا ہے اسے نہیں کھایا جائے گا اور ان کا ذبیحہ امام مالک، اور امام شافعی وغیرہما کے نزدیک نہیں کھایا جائے گا اگرچہ وہ آگ اور بت کے لئے نہ بھی ہو۔ ابن مسیب اور ابو ثور نے ان کا ذبیحہ جائز قرار دیا ہے جو وہ مسلمان کے لئے اس کے حکم سے ذبح کرے۔ اس کا مزید بیان سورہ مائدہ میں آئے گا۔ الاہلال کا معنی آواز کو بلند کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: اہل بکذا یعنی اس نے اپنی آواز کو بلند کیا۔ ابن احر، صحرا کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

یہل بالفرقد رکبانہا کما یہل الراكب البعیر

قافلہ والے فرقہ میں اس طرح آواز بلند کرتے ہیں جس طرح عمرہ کرنے والا سوازا آواز نکالتا ہے۔

نابغہ نے کہا:

او درقا صدقۃ غواصہا بہج متی یرہا یہل و یسجد

یا صدف والا موتی جس کا غواص خوش ہوتا ہے جب اسے دیکھتا ہے آواز نکالتا ہے اور جھکتا ہے۔



اسی سے اہلال الصبی واستہلالہ ہے ولادت کے وقت بچے کا چیخنا۔ حضرت ابن عباس وغیرہ نے کہا: اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو بتوں اور تھانوں کے لئے ذبح کی جاتی ہیں (1)۔ اس سے مراد وہ نہیں ہے جس پر مسیح کا نام ذکر کیا جاتا ہے اس کا بیان سورہ مائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور عربوں کی عادت تھی کہ ذبیحہ سے مقصود اسم کا اعتبار کرتے ہیں اور اس استعمال میں یہ غالب ہو گیا نیت کا اعتبار ہی نہیں کیا جو تحریم کی علت ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان اونٹوں میں نیت کا اعتبار کیا جن کو غالب ابو فرزدق نے نحر کیا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ ان جانوروں سے ہے جو غیر اللہ کے لئے ذبح کئے جاتے ہیں۔ پس لوگوں نے اس کو ترک کر دیا۔ ابن عطیہ نے کہا، میں نے حسن بن ابی حسن کی اخبار میں دیکھا، ان سے ایک مال دار عورت کے متعلق پوچھا گیا جس نے اپنی دل لگی کے لئے ایک شادی کا اہتمام کیا اور اس نے کئی اونٹ ذبح کئے۔ حضرت حسن نے فرمایا اس کا کھانا حلال نہیں یہ بت کے لئے ذبح کئے گئے ہیں۔

میں کہتا ہوں: اس معنی میں وہ روایت ہے جو ہم نے یحییٰ بن یحییٰ تمیمی مسلم کے شیخ سے روایت کی ہے فرمایا: ہمیں جریر نے قابوس سے روایت کر کے بتایا، کہ میرے باپ نے ایک عورت کو حضرت عائشہ بنتی نبیہ کے پاس بھیجا اور اسے کہا کہ پہلے حضرت عائشہ بنتی نبیہ کو اس کی طرف سے سلام کہنا اور پھر ان سے پوچھنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون سی نماز زیادہ پسند تھی اور کس نماز پر آپ دوام اختیار فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ بنتی نبیہ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے جن میں قیام لمبا فرماتے تھے اور رکوع و سجود خوب اچھا کرتے تھے اور ربی وہ نماز جس کو آپ صحت، مرض، سفر و حضر میں کبھی نہیں چھوڑتے تھے وہ صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتیں ہیں۔ ایک عورت نے عرض کی: اے ام المومنین! ہمارے لئے عجمیوں میں سے کچھ مہربان ہیں ان کی ایک عید ہوتی ہے اس موقع پر وہ ہمیں تحائف بھیجتے ہیں کیا اس میں سے ہم کچھ کھا سکتے ہیں؟ حضرت عائشہ نے فرمایا: جو اس دن کے لئے ذبح کیا گیا ہے اسے نہ کھاؤ اور ان کے درختوں کے پھلوں سے کھاؤ۔

**مسئلہ نمبر 21:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمِنْ اضْطُرَّ** یہ اتباع کی وجہ سے نون کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ کسرہ اصل ہے کیونکہ التقاء ساکنین ہوا ہے۔ اس میں اضمار ہے یعنی ان محرمات میں سے کسی چیز کی طرف کوئی مجبور ہے۔ اضطر۔ یہ ضرورت سے بات افتعال ہے۔ ابن محیسن نے فمن اضطر ضاد کو طام میں ادغام کر کے پڑھا ہے اور ابوسالم نے طام کے کسرہ کے ساتھ فمن اضطر پڑھا ہے اور اس کی اصل اضطر ہے جب ادغام کیا گیا تو را کی حرکت طام کی طرف نقل کی گئی۔

**مسئلہ نمبر 22:** اضطرار یا تو ظالم کے مجبور کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے یا بھوک کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جمہور فقہاء اور علماء کا اس آیت میں اس معنی پر اتفاق ہے کہ وہ بھوک کی وجہ سے مجبور ہو۔ اور یہی صحیح ہے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے جو ان محرمات کے کھانے پر مجبور کیا گیا ہو۔ مجاہد نے کہا یعنی کسی کو مجبور کیا گیا ہو مثلاً ایک شخص کو دشمن پکڑ لیتا ہے اور وہ اسے خنزیر وغیرہ کا گوشت

کھانے پر مجبور کرتا ہے مگر یہ اکراہ مجبور کرنا اس کے کھانے کو اس وقت مباح کرے گا جب ۱۱ اکراہ مجبور کرنا انتہا کو پہنچ جائے۔ وہ بھوک یا تو وہ دائمی ہوگی یا دائمی نہیں ہوگی۔ اگر بھوک دائمی ہو تو مردار سے بھوک مٹانے کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں مگر مردار کا کھانا اس کے لئے حلال نہیں جبکہ وہ کسی مسلمان کا مال پاتا ہو جس میں اس کو قطع ید کا خوف نہ ہو مثلاً لنگی ہوئی کھجوریں اور حریسۃ الجبل (پہاڑ کی چھوڑی گئی بکری) اور اس قسم کی چیزیں جن میں ہاتھ نہیں کاٹے جاتے اور اذیت نہیں دی جاتی، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے، فرمایا: ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے ہم نے ایک اونٹنی دیکھی جس کی کھیری درخت کے کانٹوں سے باندھی گئی تھی تو ہم اس کی طرف لوٹے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں پکارا تو ہم آپ کی طرف لوٹ آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اونٹ مسلمانوں کے گھروالوں کے لئے ہیں یہ ان کی خوراک ہیں اور ان کی برکت ہیں..... کیا تمہیں اچھا لگے گا اگر تم اپنے مشکیزوں کی طرف جاؤ اور تم دیکھو کہ جو کچھ ان میں تھا وہ ختم ہو چکا ہے کیا تم اس کو عدل سمجھتے ہو۔ صحابہ نے عرض کی: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اسی طرح حرام ہے۔ ہم نے کہا: آپ فرمائیے اگر ہمیں کھانے پینے کی ضرورت ہو تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم کھاؤ اور ساتھ نہ لے جاؤ، پیو اور ساتھ نہ لے جاؤ (۱)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور فرمایا: یہ میرے نزدیک اصل ہے، ابن منذر نے اس کو ذکر کیا ہے۔ فرمایا: ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب ہم سے کوئی شخص مجبور ہو جائے تو اس کے لئے اپنے بھائی کے مال سے کیا حلال ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ کھائے اور ساتھ نہ لے جائے، پیئے اور ساتھ نہ لے جائے (۲)۔ ابن منذر نے کہا: تمام چیزیں جن میں اس کے بعد اختلاف ہو گا وہ تحریم کی طرف لوٹائی جائیں گی۔

ابو عمر نے کہا: اس کے متعلق قول یہ ہے کہ مسلمان پر جب کھانا کھلانا متعین ہو جائے تو وہ اتنی مقدار میں کھائے جس سے اس کی روح لوٹ آئے اور اس مسلمان پر کھانا کھلانا فرض ہوگا۔ مگر یہ اس صورت میں ہے جبکہ وہاں کوئی اور نہ ہو، تو اس پر آدمی کی روح کو لوٹانے کا فیصلہ کیا جائے گا اور جس کو ایسی حالت میں کھانے سے روکا گیا ہو اس کے لئے اس سے لڑنا جائز ہے جو اسے کھانے سے منع کرے، اگرچہ یہ چیز اس کے اپنے خلاف ہی چلی جائے۔ اہل علم کے نزدیک اس صورت میں ہے جب صرف ایک شخص وہاں موجود ہو اس پر فرض کا تعین ہو جائے گا۔ اگر بہت سے لوگ ہوں پھر ان پر کھانا کھلانا فرض کفایہ ہوگا اور اس میں پانی اور دوسری چیز جو مسلمان کے نفس لوٹاتی اور قائم رکھتی ہیں برابر ہیں، مگر اس شے کی قیمت کے وجوب میں اختلاف ہے، جس کے ساتھ اس کی روح لوٹ آئی ہے، بعض نے قیمت کو واجب قرار دیا ہے اور بعض نے اس کا انکار کیا ہے۔ ہمارے مذہب میں دو قول ہیں: متقدمین اور متاخرین علماء کے درمیان مسلمان کی روح لوٹانے کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں جب کہ اس کے تلف ہونے کا اندیشہ ہو، کسی تھوڑی سی چیز کے ساتھ جس میں اس کے مالک کا نقصان نہ ہو اور اس میں گزارہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 23:** ابن ماجہ نے دو سندوں کے ساتھ حضرت عباد بن شریبیل سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں ایک سال بھوک کا سامنا کرنا پڑا تو میں مدینہ طیبہ آیا پھر میں ایک باغ میں آیا۔ میں نے ایک خوشہ پایا، میں نے اسے توڑا اور اسے کھایا

اور میں نے اسے اپنی چادر میں رکھ دیا۔ باغ کا مالک آیا، اس نے مجھے مارا اور مجھ سے میرا کپڑا چھین لیا۔ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور سارا واقعہ عرض کیا۔ آپ ﷺ نے اس شخص کو فرمایا: تو نے اسے نہ کھلایا جب یہ بھوکا تھا اور تو نے اسے نہ علم سکھایا جب وہ جاہل تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اسے حکم دیا کہ وہ اسے کپڑا لوٹا دے اور اسے طعام کا ایک دسق یا نصف دے (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث صحیح ہے اور بخاری و مسلم اس کے رجال پر متفق ہیں مگر ابن ابی شیبہ، وہ صرف مسلم کا راوی ہے عباد بن شریب الغبری۔ شکر بن بخاری اور مسلم نے اس سے کوئی چیز نقل نہیں کی، اس کے لئے نبی کریم ﷺ سے اس واقعہ کے علاوہ کوئی چیز مروی نہیں ہے۔ ابو عمر نے جو ذکر کیا ہے یہ حدیث بھوک کی حالت میں قطع ید اور تنبیہ کرنے کی نفی کرتی ہے۔ ابو داؤد نے حسن سے انہوں نے حضرت سمرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی کسی جانور کے پاس آئے اگر اس کے پاس اس کا مالک ہو تو وہ اس سے اجازت لے پھر وہ اگر اسے اجازت دے تو وہ دودھ دوہ لے اور پی لے۔ اگر مالک نہ ہو تو تین دفعہ آواز دے اگر تو مالک جواب دے تو اس سے اجازت طلب کرے۔ اگر وہ اسے اجازت دے تو قبھا ورنہ وہ دودھ دوہے اور پی لے لیکن اٹھا کر ساتھ نہ لے جائے (2)۔

ترمذی نے یحییٰ بن سلیم سے انہوں نے عبید اللہ سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جو کسی باغ میں داخل ہو تو کھالے اور جھولی میں نہ ڈال لے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے نہیں جانتے مگر یحییٰ بن سلیم کی حدیث سے۔ اور امام ترمذی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے لٹکے ہوئے پھلوں کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: کسی ضرورت مند نے ان پھلوں میں سے کچھ لے لیا جبکہ وہ جھولی میں ڈالنے والا نہ ہو تو اس پر کچھ نہیں ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے اور حضرت عمر کی حدیث میں ہے جب تم میں سے کوئی باغ سے گزرے تو اسے ضرورت کے مطابق کھالینا چاہئے اور کپڑے میں نہیں ڈالنا چاہئے (یعنی ساتھ نہ لے جائے)۔ ابو عبید نے کہا: ابو عمرو نے کہا ثبانا اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز ڈالی جاتی ہے اگر تو اسے اپنے آگے اٹھائے تو وہ ثبانا ہے۔ کہا جاتا ہے: قد تثبت ثبانا، اگر تو اسے اپنی پیٹھ پر اٹھائے تو ابھی اس کا وہی ثبانا نام ہے۔ اسی سے جب چادر کو لپیٹ کر اس میں کوئی چیز ڈالی جائے اور پیٹھ پر اٹھائی جائے تو ثبانا کہا جاتا ہے۔ اگر تو اسے اپنی جھولی میں ڈال لے تو اسے خبنة کہا جاتا ہے، اسی سے عمرو بن شعیب کی مرفوع حدیث ہے۔ ولا يتخذ خبنة، (3) جھولی میں نہ ڈالے۔ کہا جاتا ہے: خبنت اخبن خبنا۔ ابو عبید نے کہا: اس حدیث میں بھوکے مجبور کے لئے رخصت ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو جس کے ساتھ وہ کچھ خرید سکے اور وہ نہ اٹھائے مگر اتنی مقدار جتنی اس کے پیٹ میں طاقت ہے۔

میں کہتا ہوں: وہ اصل جس پر اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ غیر کا مال حرام ہے مگر یہ کہ غیر خوشی سے دے۔ اگر معاشرہ میں اس عمل کی عادت ہو جس طرح اسلام کے ابتدائی دور میں تھا یا اب بعض شہروں میں ہے تو یہ جائز ہے اور کبھی اسے بھوک اور ضرورت

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، صفحہ 352، جلد 1 (وزارت تعلیم)

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارۃ، صفحہ 167 (وزارت تعلیم)

3۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، صفحہ 154، جلد 1 (وزارت تعلیم)



کے اوقات پر محمول کیا جاتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور اگر بھوک دائمی نہ ہو کسی وقت میں ہو تو اس میں علماء کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ وہ کھائے حتیٰ کہ سیر ہو جائے اور خوب سیر ہو جائے، اور اگر آئندہ اس صحرا اور جنگل میں ضرورت کا خدشہ ہو تو ساتھ لے جائے، جب اس سے مستغنی ہو جائے تو اسے پھینک دے۔ یہی معنی امام مالک نے اپنے مؤطا میں بیان کیا اور یہی قول امام شافعی اور کثیر علماء کا ہے۔ حجت یہ ہے کہ ضرورت، حرمت کو اٹھا دیتی ہے۔ پس اباحت لوٹ آتی ہے اور ضرورت کی مقدار، خوراک نہ ہونے کی حالت میں خوراک کے موجود ہونے تک ہوتی ہے۔ العنبر (مچھلی) والی حدیث اس میں نص ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کے اصحاب جب سفر سے لوٹ کر آئے تو ان کا زادراہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ ساحل سمندر تک چلے تو ان کے لئے ساحل سمندر پر ایک بہت بڑے ٹیلے کی طرح (مچھلی) ظاہر ہوئی۔ جب وہ اس کے پاس آئے تو وہ ایک جانور تھا جس کو عنبر کہا جاتا تھا۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ جو لشکر کے امیر تھے، انہوں نے کہا: مردار ہے۔ پھر فرمایا: نہیں بلکہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیغام رساں ہیں اور اللہ کے راستہ میں ہیں اور تم بھوک کی وجہ سے مجبور ہو۔ پس تم اسے کھاؤ۔ راوی فرماتے ہیں: ہم ایک مہینہ اسے کھاتے رہے اور ہم تین سو آدمی تھے حتیٰ کہ ہم مرنے ہو گئے۔ (الحديث)

صحابہ نے اسے کھایا اور سیر ہوئے (رضی اللہ عنہم) اس کے باوجود کہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ مردار ہے اور وہ اس میں سے مدینہ طیبہ کی طرف بھی لے گئے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: وہ حلال ہے اور فرمایا: اس کے گوشت میں سے کچھ تمہارے پاس ہے تو ہمیں بھی کھلاؤ۔ صحابہ نے اس میں سے گوشت رسول اللہ ﷺ کو بھیجا تو آپ ﷺ نے اسے کھایا (1)۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ وہ اتنی مقدار کھائے کہ اس کی زندگی بچ جائے۔ ابن ماجہون اور ابن حبیب کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی کے اصحاب نے مسافر اور مقیم کے درمیان فرق کیا ہے وہ فرماتے ہیں: مقیم اتنا کھائے جس سے اس کی زندگی بچ جائے اور مسافر سیر ہو کر کھائے اور ساتھ بھی لے جائے جب اس سے غنا پائے تو اسے پھینک دے، اگر کوئی مجبور پائے تو اسے ذے دے اور اس سے عوض نہ لے کیونکہ مردار کو بیچنا جائز نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 24:** اگر کوئی شراب پینے پر مجبور ہو۔ اگر شراب پینے پر مجبور کیا گیا ہو تو اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ شراب پی لے۔ اگر بھوک یا پیاس کی وجہ سے مجبور ہو تو نہ پیئے۔ یہ امام مالک کا العتبۃ میں قول ہے۔ فرمایا: شراب، پیاس میں اضافہ کرتی ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو مطلقاً حرام فرمادیا اور مردار کو ضرورت نہ ہونے کی شرط کے ساتھ حرام کیا۔ ابہری نے کہا: اگر شراب اس کی بھوک یا پیاس کو مٹائے تو اسے پی لے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے بارے فرمایا: یہ ناپاک ہے پھر ضرورت کے لئے مباح کیا اور شراب کے بارے فرمایا: یہ ناپاک ہے۔ پس خنزیر اباحت میں ضرورت کی وجہ سے داخل ہوگا اس جلی معنی کی وجہ سے جو قیاس سے زیادہ قوی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ سیر کرے گا اگرچہ ایک گھڑی کے لئے ہی سیر کرے گا اور بھوک کو مٹائے گا اگرچہ تھوڑی سی مدت کے لئے۔

**مسئلہ نمبر 25:** اصحیح نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجبور خون پی لے اور شراب نہ پیئے۔ مردار کھا لے اور کسی کے گم شدہ اونٹوں کے قریب نہ جائے۔ یہ ابن وہب کا قول ہے۔ پیشاب پی لے اور شراب نہ پیئے، کیونکہ شراب میں حد لازم ہوتی ہے۔ معلوم ہوا یہ زیادہ سخت ہے۔ اس پر امام شافعی کے اصحاب کی نص ہے۔

**مسئلہ نمبر 26:** اگر کسی کو لقمہ پھنس جائے تو کیا وہ شراب کے ساتھ اسے نگلے یا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: نہیں۔ اس خوف سے کہیں وہ عادی نہ ہو جائے۔ اور ابن حبیب نے اس کی اجازت دی ہے کیونکہ یہ ضرورت کی حالت ہے۔ ابن عربی نے کہا: جس کو لقمہ پھنس جائے اس کے اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان جو معاملہ ہے اس کے اعتبار سے جائز ہے اور رہا ہمارے درمیان کا مسئلہ تو ہم اسے دیکھیں گے اور اگر ہم پر قرآن کی وجہ سے پھنسنے کی صورت مخفی نہیں ہوگی تو ہم اس کی تصدیق کریں گے جب یہ ظاہر ہو جائے گا اور اگر پھنسنے کی صورت ظاہر نہ ہوگی تو ہم ظاہر کی بنا پر اسے حد لگائیں گے اور اللہ کی بارگاہ میں باطنا عقوبت سے محفوظ رہے گا۔ پھر جب مجبور شخص مردار، خنزیر اور آدمی کا گوشت پائے تو وہ مردار کھا لے کیونکہ وہ حلال ہے، جبکہ خنزیر اور آدمی کسی حالت میں حلال نہیں ہیں۔ بلکہ تحریم کو اختیار کرنا بہتر ہے نسبت بھاری تحریم میں داخل ہونے کے۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنی بہن یا کسی اجنبی عورت سے وطی کرنے پر مجبور کیا جائے تو وہ اجنبی عورت سے وطی کر لے کیونکہ بہن کسی صورت میں حلال نہیں۔ یہی ان احکام میں ضابطہ ہے۔ انسان کا گوشت نہ کھائے اگرچہ مر بھی جائے۔ یہ ہمارے علماء کا قول ہے اور یہی امام احمد اور داؤد نے کہا ہے۔ امام احمد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے کہ ”مردہ آدمی کی ہڈی توڑنا، زندہ کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے (1)“۔ امام شافعی نے فرمایا: آدمی کا گوشت کھا لے اور اس کے لئے کسی ذمی کو قتل کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ محترم الدم ہے اور نہ کسی مسلمان اور نہ قیدی کو قتل کرے کیونکہ وہ غیر کا مال ہے۔ اگر حربی یا زانی شادی شدہ ہو تو اس کا قتل کرنا اور اس سے کھانا جائز ہے۔ ابو داؤد نے مزنی پر سخت تنقید کی ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: انبیاء کرام کا گوشت کھانا مباح ہے۔ ابن شریح نے بھی اس پر سخت جرح کی ہے کہ تو انبیاء کرام کے قتل تک پہنچ گیا ہے جبکہ تو نے کافر کے کھانے سے منع کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ وہ آدمی کا گوشت نہ کھائے مگر جب اسے یقین ہو کہ یہ اسے مرنے سے بچا لے گا اور زندگی کا باعث بنے گا۔

**مسئلہ نمبر 27:** امام مالک سے پوچھا گیا کہ مجبور مردار کھا سکتا ہے جبکہ وہ غیر کا مال کھجور، کھیتی یا بکریاں پائے۔ امام مالک نے فرمایا: اگر اسے اپنے بدن پر ضرر کا اندیشہ نہ ہو مثلاً اسے چور شمار نہیں کیا جائے گا اور اس کے قول کی تصدیق کی جائے گی تو وہ جو چیز پائے اس سے کھا لے جو اس کی بھوک کو مٹائے لیکن اس میں سے ساتھ نہ لے جائے۔ میرے نزدیک مردار کھانے سے یہ کھانا بہتر ہے۔ یہ مفہوم پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے اور اگر اسے اندیشہ ہو کہ لوگ اس کی تصدیق نہیں کریں گے اور اسے چور شمار کریں گے اگر وہ مردار کھا لے تو میرے نزدیک جائز ہے۔ اس مقام پر مردار کھانے میں اس کے لئے وسعت ہے۔

**مسئلہ نمبر 28:** ابو داؤد نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت جابر بن سمرہ سے مروی ہے، ایک شخص پتھر پیلے

ٹیلے پر اترا اور اس کے ساتھ اس کے گھروالے اور بچے بھی تھے۔ ایک شخص نے کہا: میری اونٹنی گم ہو گئی ہے اگر تو اسے پائے تو اسے روک لینا۔ پس اسے اونٹنی مل گئی لیکن اس کا مالک اسے نہ ملا۔ وہ اونٹنی مریض ہو گئی۔ بیوی نے اسے کہا: تو اسے نخر کر دے لیکن اس شخص نے انکار کیا حتیٰ کہ وہ مر گئی۔ بیوی نے کہا: اس کی کھال اتار لے تاکہ ہم اس کے گوشت اور چربی کو خشک کریں اور اسے کھائیں۔ اس شخص نے کہا: نہیں حتیٰ کہ میں رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ پوچھ لوں۔ وہ آپ ﷺ کے پاس آیا پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تیرے پاس اتنی غذا ہے جو تجھے مستغنی کر دے۔ اس نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تم اسے کھا لو۔ فرمایا: پھر اس کا مالک آیا تو اس نے اسے پورا قصہ بتایا، اس نے کہا: تو نے اسے نخر کیوں نہیں کیا تھا؟ اس نے کہا: مجھے تجھ سے حیا آ گیا تھا۔ ابن خویز منداد نے کہا: اس حدیث میں دود لیلیں ہیں: ایک یہ کہ مجبور، مردار میں سے کھالے اگرچہ اسے تلف (ضائع) ہونے کا اندیشہ نہ بھی ہو کیونکہ آپ ﷺ نے اس سے غنا کے متعلق پوچھا تھا، اس سے اپنے نفس پر خوف کے متعلق نہیں پوچھا تھا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ کھائے، سیر ہو کر کھائے، ذخیرہ بھی کرے اور ساتھ بھی لے جائے کیونکہ آپ ﷺ نے ادخار (ذخیرہ کرنا) کو مباح کیا اور اس پر سیر نہ ہونے کی شرط بھی نہیں لگائی۔ ابوداؤد نے اپنی سند سے صحیح عامری سے روایت کیا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور پوچھا: ہمارے لئے کون سا مردار حلال ہے؟ فرمایا: جو تمہارا کھانا ہے۔ ہم نے کہا: نغبتیق و نصطبج۔ ابو نعیم نے کہا: اس کا مطلب ہے: ہم ایک پیالہ صبح پیتے ہیں اور ایک شام کو پیتے ہیں۔ فرمایا: میرے باپ کی قسم! یہ بھوک ہے۔ فرمایا: حضور ﷺ نے اس حالت میں مردار کو ان کے لئے حلال کیا (1)۔

ابوداؤد نے کہا: الغبوق سے مراد دن کا آخری حصہ ہے اور الصبح سے مراد دن کا ابتدائی حصہ ہے۔ خطاب نے کہا: الغبوق سے مراد شام کا کھانا ہے اور الصبح سے مراد صبح کا کھانا ہے یعنی صبح کے وقت ایک دودھ کا پیالہ اور شام کے وقت دودھ کا پیالہ زندگی کو باقی رکھتا ہے اور نفس کو قائم رکھتا ہے اگرچہ جسم کو مکمل غذا اور تام سیرابی نہ دے، ان کے لئے اس کے ہوتے ہوئے مردار کھانے کو مباح کیا۔ یہ دلالت ہے کہ مردار کا کھانا مباح ہے یہاں تک کہ وہ نفس خوراک سے اپنی ضرورت حاصل کر لے۔ یہی امام مالک کا نظریہ ہے، یہی امام شافعی کا ایک قول ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: جب صبح و شام دودھ کا پیالہ پینا جائز ہے تو سیر ہونا اور زور راہ ساتھ لے جانا بھی جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ کا قول اور امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے لئے مردار کا کھانا جائز نہیں ہے مگر جو اس کی زندگی بچالے۔ مزنی کا بھی یہی نظریہ ہے۔ انہوں نے فرمایا: اگر ابتدا میں یہ حالت ہو تو اس سے کھانا جائز نہیں اسی طرح جب اس کو کھانے کے بعد اس حال پر پہنچ جائے اسی طرح حسن سے مروی ہے قتادہ نے فرمایا: سیر ہو کر نہ کھائے۔ مقاتل بن حبان نے کہا: تین لقموں سے زیادہ نہ کھائے، صحیح اس کے خلاف ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 29:** ان چیزوں کے ساتھ علاج کرنا، ان کے استعمال کی دو صورتیں ہیں: یا تو ان کے عین کو باقی رکھ کر انہیں استعمال کیا جائے گا یا جلا کر استعمال کیا جائے گا۔ اگر جلانے کے ساتھ بدل جائیں تو ابن حبیب نے کہا: ان کے ساتھ علاج کرنا اور نماز پڑھنا جائز ہے۔ ابن ماجشون نے اس کی تخفیف کی اس بنا پر کہ جلانا، صفات کی تبدیلی کے لئے تطہیر ہے۔ اور العتبیۃ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، ص 178، جلد 2 (وزارت تعلیم)



میں امام مالک نے کہا: مَرْتَن (دواء) دوا جو مردار کی ہڈیوں سے بنائی جاتی ہے جب اسے زخم پر رکھا جائے تو اس کے ساتھ نماز نہ پڑھے حتیٰ کہ اسے دھو لے۔ اگر مردار قائم بعینہ ہو تو سحون نے کہا: اس کے ساتھ اور خنزیر کے ساتھ کسی حالت میں علاج نہ کیا جائے کیونکہ ان کا بدل حلال موجود ہوتا ہے بخلاف بھوک کے۔ اگر ان کا بھوک میں بھی عوض پایا جائے تو پھر مردار کو نہیں کھایا جائے گا۔ اسی طرح شراب سے علاج نہیں کیا جائے گا۔ یہ امام مالک کا قول ہے اور امام شافعی کا ظاہر بھی یہی ہے۔ یہ ابن ابی ہریرہ جو امام شافعی کے اصحاب میں سے ہیں ان کا بھی یہی مختار ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: دوا کے طور پر پینا جائز ہے، پیاس کے لئے پینا جائز نہیں۔ یہ اصحاب شافعی میں قاضی طبری کا مختار مذہب ہے اور یہی ثوری کا قول ہے۔ شوافع میں سے بعض بغدادیوں نے کہا: پیاس کے لئے پینا جائز ہے، دوا کے لئے جائز نہیں کیونکہ پیاس کا نقصان جلدی پہنچنے والا ہے بخلاف علاج کے۔

بعض علماء نے فرمایا: دونوں کے لئے پینا جائز ہے۔ بعض اصحاب شافعی نے ہر حرام چیز سے علاج کرنے سے منع کیا ہے سوائے اونٹوں کے پیشاب کے۔ کیونکہ اس کے متعلق عزمین والی حدیث موجود ہے۔ بعض علماء نے ہر حرام چیز سے علاج کرنے سے منع کیا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ نے میری امت کی شفا اس چیز میں نہیں رکھی جو ان پر حرام کی گئی ہے (1) اور نبی کریم ﷺ نے حضرت طارق بن سوید سے کہا: جب انہوں نے شراب کے متعلق پوچھا تو آپ نے اسے منع فرمایا تھا یا شراب بنانے کا ناپسند فرمایا تھا۔ اس نے کہا: میں اسے دوا کے لئے بناتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ دوا نہیں ہے بلکہ یہ بیماری ہے (2)۔ مسلم نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ یہ احتمال ہے کہ یہ حالت اضطرار کے ساتھ مقید ہو۔ کیونکہ زہر کے ساتھ علاج کرنا جائز ہے اور اس کا پینا جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 30:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غَيْرَ بَاغٍ، غَيْرَ كُنُصٍ حال کی بنا پر ہے۔ بعض نے فرمایا: استثنا کی بنا پر ہے، جب تو غَيْرَ کو دیکھے کہ اس کی جگہ فی صحیح ہوتا ہے تو یہ حال ہوتا ہے اور جب اس کی جگہ الّا کھنا صحیح ہو تو یہ استثنا ہوتا ہے۔ اس پر قیاس کر لو۔ باغِ اصل میں باغی تھا ضمہ یا پردشوار تھا اسے ساکن کر دیا گیا پھر تنوین اور یا ساکن جمع ہوئے تو یا کو حذف کیا گیا اور کسرہ یا کے حذف پر دلالت کرتا ہے۔ قتادہ، حسن، ربیع، ابن زید اور عکرمہ نے کہا غَيْرَ بَاغٍ کا معنی ہے وہ حاجت سے زیادہ کھانے والا نہ ہو وَلَا عَادٍ۔

اور سدی نے کہا غَيْرَ بَاغٍ کا مطلب ہے: وہ شہوت و لذت کے لئے کھانے والا نہ ہو اور وَلَا عَادٍ سیر ہونے کی حد تک پورا کھانے والا نہ ہو۔ مجاہد، ابن جبیر وغیرہا نے کہا غَيْرَ بَاغٍ کا معنی ہے: مسلمانوں پر بغاوت کرنے والا نہ ہو وَلَا عَادٍ اور ان پر تجاوز کرنے والا نہ ہو۔ باغی اور عادی میں ڈاکو، سلطان پر خروج کرنے والا، قطع رحمی میں سفر کرنے والا، اور مسلمانوں پر حملہ کرنے والا داخل ہے۔ یہ صحیح ہے، کیونکہ لغت میں البغی کا معنی فساد کا قصد کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: بغت السراقۃ تبغی بغاء، جب عورت بدکاری کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكْفُرْ هُوَ افْتَتَبْتُمْ عَلَى الْغِيَاءِ (النور: 33)

کبھی البغی فساد کے علاوہ کسی چیز کو طلب کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: تو کہتا ہے: خرج الرجل فی

2۔ صحیح مسلم، کتاب الاشریہ، صفحہ 163، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاشریہ، صفحہ 840، جلد 2 (وزارت تعلیم)

بغاء ابل له، وہ اونٹوں کی تلاش میں نکلا۔ شاعر کا قول ہے:

لا ينعك من بغا ع الخير تعقاد الرثائم  
ان الأشائم كالآيا من والأيا من كالأشائم

خیر کی تلاش تجھے نہ روکے۔ دھاگے باندھے جاتے ہیں۔ بائیں، دائیں کی طرح ہیں اور دائیں بائیں کی طرح ہیں۔

**مسئلہ نمبر 31:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا عَادٍ، عاد کی اصل عائد ہے اور یہ مقلوب سے ہے جیسے شاک السلاح، حار اور لاث (1)۔ اصل میں شائك، هائو، لاث یہ لشت العمامة سے مشتق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اضطراری حالت میں تمام محرمات کو مباح قرار دیا کیونکہ یہ تمام مباحت سے عاجز تھا۔ پس مباح چیز کا نہ ہونا حرام چیز کی اباحت کے لئے شرط ہے۔

**مسئلہ نمبر 32:** علماء کا اختلاف ہے جب اس کی ضرورت کے ساتھ معصیت متصل ہو مثلاً ڈاکہ ڈالنے والا ہو، یا مسافروں کو خوف دلانے والا ہو۔ امام مالک اور امام شافعی نے ایک قول میں معصیت کی وجہ سے منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مباح کیا بطور مدد اور گنہگار کی مدد کرنا حلال نہیں۔ اگر کھانے کا ارادہ کرے تو اسے توبہ کرنا چاہئے اور کھانا چاہئے۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی نے دوسرے قول میں ان کے لئے بھی مباح کیا ہے۔ انہوں نے معصیت اور اطاعت کے درمیان مباحث میں برابری کی ہے۔ ابن عربی نے کہا: عجب ہے ان کے لئے جو گنہگار کے لئے بھی اس کو مباح کرتا ہے میں کسی کو یہ کہنے والا خیال نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایسا کہے تو وہ قطعاً غلطی کرنے والا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کا خلاف صحیح ہے کیونکہ سفر معصیت میں اپنے آپ کو ضائع کرنا اس معصیت سے زیادہ ہے جس میں وہ مبتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ (النساء: 29) یہ عام ہے۔ شاید وہ دوسری حالت میں توبہ کرے اور توبہ اس کے گناہ کو منادے۔ مسروق نے کہا: جو مردار، خون اور خنزیر کا گوشت کھانے کی طرف مجبور ہو اور وہ نہ کھائے حتیٰ کہ مر جائے تو وہ دوزخ میں داخل ہو گا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے۔ ابوالحسن طبری المعروف بالکلیانے کہا: ضرورت کے وقت مردار کھانا رخصت نہیں بلکہ عزیمت واجبہ ہے۔ اگر کوئی مردار کے کھانے سے رک جائے گا تو وہ گنہگار ہو گا۔ مردار کا کھانا سفر کی رخصت نہیں ہے یا سفر سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ ضرورت کے نتائج سے ہے خواہ وہ سفر میں ہو یا حضر میں ہو۔ مقیم گنہگار کے افطار کی طرح ہے جب وہ مریض ہوتا ہے اور اسی طرح گنہگار مسافر کا تیمم کرنا پانی کے نہ ہونے کے وقت۔ فرمایا: ہمارے نزدیک یہ صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں: اس کے بارے میں امام مالک سے روایات مختلف ہیں ان کا مشہور مذہب جو الباجی نے "المشتقی" میں ذکر کیا ہے۔ سفر معصیت میں اس کے لئے کھانا جائز ہے اور سفر معصیت میں نماز قصر کرنا اور روزہ افطار کرنا جائز نہیں۔ ابن خویز مند اد نے کہا: اضطرار کی حالت میں کھانا، اس میں اطاعت شعار اور گنہگار برابر ہیں، کیونکہ سفر و حضر میں مردار کا کھانا جائز ہے۔ گناہوں کی طرف نکلنے والوں سے مقیم کا حکم اس سے ساقط نہیں ہوتا بلکہ مقیم ہونے سے بھی بری حالت میں ہوتا ہے، یہ فطر اور قصر اس طرح نہیں ہیں کیونکہ یہ دونوں رخصتیں سفر سے متعلق ہیں۔ جب سفر، سفر معصیت ہو تو اس میں قصر

کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ رخصت سفر کے ساتھ مختص ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: وہ سفر معصیت میں پانی کے نہ ہونے کے وقت تیمم کرے کیونکہ تیمم سفر و حضر میں برابر ہے اس کو مردار کھانے اور تیمم کرنے سے معصیت کی وجہ سے منع کرنا جائز ہے جس معصیت کا اس نے ارتکاب کیا ہے۔ مردار کو نہ کھانے میں جان کا ضیاع ہے اور یہ سب سے بڑا گناہ ہے اور تیمم کے ترک میں نماز کو ضائع کرنا ہے کیا یہ کہنا جائز ہے؟ تو نے ایک گناہ کا ارتکاب کیا ہے اب دوسرا گناہ کر۔ کیا شراب پینے والے کو یہ کہنا جائز ہے کہ تو زانی کو کیا کہنا جائز ہے کہ تو کفر کر یا دونوں کو کہا جاسکتا ہے کہ تم دونوں نماز ضائع کرو؟ یہ تمام مسائل انہوں نے اپنی کتاب ”احکام القرآن“ میں بیان کئے ہیں۔ امام مالک اور ان کے اصحاب میں سے کسی کا خلاف ذکر نہیں کیا۔ الباجی نے کہا: زیاد بن عبد الرحمن اندلسی نے روایت کیا ہے کہ گنہگار اپنے سفر میں نماز کو قصر کرے اور رمضان میں افطار کرے اور یہ حکم تمام لوگوں میں برابر ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کسی کو اپنی جان کو مردار کے کھانے سے رک کر تلف کرنا جائز نہیں کیونکہ اسے وجوب کے طور پر مردار کے کھانے کا حکم دیا گیا ہے اور جو معصیت کے سفر میں ہو اس سے فرائض واجبات، روزہ، نماز ساقط نہیں ہوتے بلکہ ان کا ادا کرنا اس پر لازم ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ معافی سفروں میں لوگوں کی حاجت کے لئے مباح ہیں۔ اس کے لئے ان سے گناہوں پر مدد حاصل کرنا مباح نہیں تھا اور اس کو اپنے نفس کو قتل کرنے کی حاجت نہیں۔ ابن حبیب نے کہا: وہ پہلے گناہ سے توبہ کرے پھر توبہ کے بعد مردار کا گوشت کھائے۔ ابن حبیب نے اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے تعلق جوڑا ہے: **فَمَنْ أَضْطَرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ ضَرُورَتِ** کے لئے مردار کی اباحت میں شرط رکھی ہے کہ وہ باغی نہ ہو اور حراۃ، ذاکہ، قطع رحمی، گناہ کا طالب باغی اور حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔ ان میں اباحت کی شرائط نہیں پائی جاتی ہیں۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں: یہ استدلال خطاب کے مفہوم سے ہے اور اس میں اصولی علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ آیت کا نظم یہ ہے کہ مضطر باغی نہیں ہے اور حد سے تجاوز کرنے والا نہیں اور اس پر گناہ نہیں ہے اور اس کے علاوہ سے خاموشی کی گئی ہے۔ اصل عموم خطاب ہے۔ جس نے کسی امر کے لئے اس کے زوال کا دعویٰ کیا اس پر دلیل لانا لازم ہے۔

(☆) **مسئلہ نمبر 34:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ** یعنی اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔ پس جس میں رخصت دی گئی ہے اس سے مؤاخذہ نہ ہونا بدرجہ اولیٰ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے کہ اس نے رخصت دی۔

**إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ**

عَذَابٌ أَلِيمٌ

”بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور خرید لیتے ہیں اس کے بدلے حقیر سا معاوضہ۔ سو وہ نہیں کھا رہے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے اور بات تک نہ کرے گا ان سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اور

☆ متن میں اسی طرح ہے جب کہ تفصیل میں (33) مسائل ہیں۔



نہ (ان کے گناہ بخش کر) انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ** اس سے مراد علماء یہود ہیں۔ تورات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اور رسالت کی صحت کے متعلق جو اللہ نے نازل کیا تھا اسے انہوں نے چھپایا۔ **أَنزَلَ** بمعنی اظہر ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَمَنْ قَالَ سَأُنْزِلَ مِثْلَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ** اس آیت میں سأنزل بمعنی سأظہر ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ نزول کے معنی میں ہی ہے۔ یعنی جو ملائکہ نے اس کے رسل پر اتارا۔ **وَيَشْتَرُونَ بِهِ**، یہ میں ضمیر کا مرجع چھپائی گئی بات ہے۔ **ثُمَّ نَأْتِي الْقَلِيلَ** یعنی رشوت لیتے ہیں۔ اس کو قلیل فرمایا کیونکہ اس کی مدت ختم ہونے والی ہے اور اس کا انجام برا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو وہ رشوت لیتے تھے وہ تھوڑی ہوتی تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ آیت اگرچہ علماء یہود کے متعلق ہے یہ مسلمانوں کو بھی شامل ہے جو دنیا کے حصول کی خاطر حق کو چھپاتے ہیں۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فِي بُطُونِهِمْ** یہ بطون کا ذکر کھانے کی حقیقت پر تاکید اور دلالت کے لئے ہے، کبھی یہ مجاز استعمال ہوتا ہے مثلاً اکل فلان ارضی ونحوہ (فلاں نے میری زمین کو کھایا) اور بطون کے ذکر میں ان کی نادانی پر تنبیہ ہے۔ انہوں نے اپنی آخرت کو اپنے اس کھانے کے بدلے فروخت کیا جس کا کوئی مقام نہیں (1)۔ **إِلَّا الثَّانِي** کا معنی یہ ہے کہ وہ حرام ہے اللہ تعالیٰ اس پر انہیں آگ کا عذاب دے گا۔ جو انہوں نے رشوت کھائی اسے آگ فرمایا کیونکہ وہ انہیں آگ تک پہنچانے والا تھا۔ اکثر مفسرین نے اسی طرح کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ انہیں حق کو چھپانے کی وجہ سے جہنم میں حقیقۃً آگ کھانے کے ساتھ عذاب دے گا۔ اس نے مال کے مطابق حال کے ساتھ خبر دی (2)۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالِ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ ثَارًا** (النساء: 10) یعنی ان کا انجام اسی کی طرف پھیرا جائے گا۔ اسی سے عربوں کا قول ہے:

لِدَوِّ اللَّمُوتِ وَابْنِ الْخَرَابِ مَوْتُكَ لَيْسَ بِمَوْتٍ خَرَابِي لَيْسَ بِخَرَابٍ

ایک اور نے کہا:

فَلِلْمَوْتِ مَا تَدِدُ الْوَالِدَةُ جِوْمًا جَنَمٌ دَتِي هُوَ مَوْتُكَ لَيْسَ هُوَ

ایک اور نے کہا:

وَدِدُّنَا لَخَرَابِ الدَّهْرِ نَبْنِيهَا بِمِثْلِ غَرَمَانِي خَرَابِي لَيْسَ بِنَابِي

اس قسم کی مثالیں قرآن اور اشعار میں کثیر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا يَكْتُمُهُمُ اللَّهُ** یہ ان پر ناراضگی اور رضا کے زوال سے عبارت ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان لایکلم فلاناً، جب تو کسی سے ناراض ہو۔ طبری نے کہا: **لَا يَكْتُمُهُمُ** یعنی ایسی کلام نہیں فرمائے گا جس کو وہ پسند کرتے ہوں گے۔ قرآن

حکیم میں ہے: اَحْسُوا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنَ ۝ (المومن) (پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ) بعض علماء نے فرمایا: وہ فرشتوں کو ان کی طرف سلام کے ساتھ نہیں بھیجے گا۔ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ یعنی ان کے برے اعمال کی اصلاح نہیں فرمائے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ زجاج نے کہا: وہ ان کی خیر کے ساتھ تعریف نہیں فرمائے گا اور نہ ان کو ازکیاء کہے گا۔ اَلَيْسَ بِمَعْنٰی مَوْلٰی (وردناک) ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کلام نہیں فرمائے گا اور نہ ان کا ترکیہ کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا: (۱) بوڑھا زانی (۲) جھوٹا بادشاہ (۳) متکبر غریب (۱)۔ ان کو عذاب الیم اور سخت سزا کے ساتھ خاص فرمایا محض مخالفت کی وجہ سے اور اس استخفاف کی وجہ سے جس نے انہیں ان جرموں پر برا بیچتے کیا کیونکہ اس پر انہیں کسی حاجت نے نہیں ابھارا اور نہ کسی ضرورت نے اس کی طرف انہیں بلایا جس طرح ضرورت انہیں بلاتی ہے جو ان کی مثل نہ ہوں لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ کا معنی ہے وہ ان پر نہ رحم کرے گا اور نہ مہربانی کرے گا۔ مزید بیان سورہ آل عمران میں آئے گا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اسْتَرَوْا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۖ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلٰى

الثَّامِي ۝

”یہ وہ (بد نصیب) ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے عوض اور عذاب کو نجات کے بدلے (تعجب ہے) کس چیز نے صابر بنادیا ہے انہیں آگ (کے عذاب) پر“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اسْتَرَوْا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ اس پر کلام گزر چکی ہے۔ جب عذاب ضلالت کے تابع ہے اور مغفرت اس ہدایت کے تابع ہے جس کو انہوں نے ترک کر دیا تو یہ دونوں شراء کے مجاز میں داخل ہوں۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلٰى الثَّامِي جمہور کا مذہب..... جن میں حسن اور مجاہد بھی ہیں کہ اس کا معنی تعجب ہے۔ یہ مخلوق کی طرف راجع ہے۔ گویا فرمایا: انہوں نے ان کے آگ پر صبر کرنے پر اور آگ پر ٹھہرے رہنے پر تعجب کیا۔ قرآن حکیم میں ہے: قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا أَكْفَرًا ۝ (عبس) غارت ہو (منکر) انسان! وہ کتنا احسان فراموش ہے۔ واسمع بہم و ابصر (اس دن) یہ خوب سننے لگیں گے اور خوب دیکھنے لگیں گے۔ اس معنی کی بنا پر ابو علی نے لکھا ہے کہ حسن، قتادہ، ابن جبیر اور ربیع نے کہا: اللہ کی قسم! آگ پر انہیں صبر نہیں ہے لیکن وہ کتنے آگ پر جرأت کرنے والے ہیں (3)۔ یہ یہی لغت ہے۔ فراء نے کہا: مجھے کسائی نے بتایا، فرمایا: مجھے یمن کے قاضی نے بتایا کہ دو جھگڑے والے ان کے پاس جھگڑا لے کر آئے تو ان میں سے ایک پر قسم واجب ہوئی تو اس نے قسم اٹھا دی۔ دوسرے مخالف نے اسے کہا: تو اللہ تعالیٰ پر کتنا جرأت کرنے والا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ آگ پر کتنے بہادر ہیں کیونکہ وہ ایسے اعمال کرتے ہیں جو انہیں آگ تک پہنچاتے ہیں۔ زجاج نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب غلط تعہد اسباب الازار، صفحہ 71، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اس کا معنی ہے وہ آگ پر کتنے باقی رہنے والے ہیں۔ یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہے: ما اصبر فلاناً علی الحبس، یعنی وہ کتنا حبس (قید) میں باقی رہنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا آگ سے جزع فزع کتنا کم ہے۔ جزع کی قلت کو صبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کسائی اور قطرب نے کہا: اس کا معنی ہے وہ دوزخیوں کے عمل پر کتنا دوام اختیار کرنے والے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ما استقہام ہے اس کا معنی تو بخ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس (1)، سدی، عطاء، ابو عبیدہ، معمر بن شنی کا قول ہے۔ اس کا معنی ہے: کس چیز نے انہیں دوزخیوں کے عمل پر صبر دیا ہے (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان کی استہانت اور ان کے امر کے استخفاف (ہلکا سمجھنا) کی بناء پر ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۚ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اَخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ ۝۱۱

”یہ سزا اس وجہ سے ہوگی کہ اللہ نے تو اتاری کتاب حق کے ساتھ اور بے شک جو لوگ اختلاف ڈال رہے ہیں کتاب میں وہ دور دراز کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ یہ محل رفع میں ہے اور حکم کی طرف اشارہ ہے۔ گویا فرمایا: ذٰلِكَ الْحَكَمُ بِالنَّارِ۔ زجاج نے کہا: تقدیر عبارت ہے: الامر ذٰلِكَ یا ذٰلِكَ الامر یا ذٰلِكَ الْعَذَابُ لَهُمْ۔ اور ذٰلِكَ کی خبر مضمّر ہے اس کا معنی ہے: یہ ان کو معلوم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ محل نصب میں ہے۔ اس کا معنی ہے: فعلنا ذٰلِكَ بِهِمْ (ہم نے یہ ان کے ساتھ کیا) بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ یہاں الْكِتٰبَ سے مراد قرآن ہے۔ بِالْحَقِّ سے مراد سچ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد حجت ہے۔ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اَخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ یہاں الْكِتٰبَ سے مراد تورات ہے۔ نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفت ہے اور یہود نے آپ کی صفت سے انکار کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے اپنے آباء اور سلف کی مخالفت کی تورات سے حجت پکڑنے میں۔ بعض نے فرمایا: جو تورات میں حضرت محمد ﷺ کی صفت تھی اس میں مخالفت کی اور اس میں اختلاف کیا۔ بعض نے فرمایا: الْكِتٰبَ سے مراد قرآن ہے اور جنہوں نے اختلاف کیا وہ کفار قریش تھے۔ ان میں سے بعض نے کہا: یہ قرآن جادو ہے۔ بعض نے کہا یہ پہلے لوگوں کے قصے ہیں۔ بعض نے کہا: یہ گھڑا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور شِقَاقٍ کے معنی پر گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

لَيْسَ الْبِرُّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ  
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیِّنَ ؕ وَاٰتٰی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهِ ذَوٰی الْقُرْبٰی وَ  
الْيَتٰى وَالْمَسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ؕ وَالسَّآءِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ؕ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآٰتٰی  
الزَّكٰوةَ ؕ وَ الْمَوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ؕ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاسِآءِ وَالضَّرَآءِ  
وَحِیْنَ الْبَاسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝۱۲



”نیک (بس یہی) نہیں کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنے رخ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف بلکہ نیک (کا کمال) تو یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر اور دے اپنا مال اللہ کی محبت سے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مانگتے والوں کو اور (خرچ کرے) غلام آزاد کرنے میں اور صحیح صحیح ادا کیا کرے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب کسی سے وعدہ کرتے ہیں اور کمال نیک ہیں جو صبر کرتے ہیں مصیبت میں اور سختی میں اور جہاد کے وقت۔ یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں اور یہی لوگ حقیقی پرہیزگار ہیں۔“

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْسَ الْبِرُّ اس خطاب کی مراد میں اختلاف ہے۔ قتادہ نے کہا: ہمیں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے نیکی کے متعلق پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور فرائض کے نازل ہونے سے پہلے جو ان لا الہ الا اللہ اور ان محمد اعبدا رسولہ کی گواہی دیتا اور پھر فوت ہو جاتا تو اس کے لئے جنت واجب تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ربیع اور قتادہ نے یہ بھی کہا کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ کے لئے ہے کیونکہ وہ قبلہ کی طرف منہ پھیرنے میں اختلاف کرتے تھے۔ یہود کہتے تھے: قبلہ مغرب کی طرف بیت المقدس ہے اور نصاریٰ کہتے تھے مشرق کی طرف سورج کے طلوع ہونے کی جگہ ہے اور انہوں نے قبلہ کی تبدیلی میں بھی کلام کیا، ہر فرقہ نے اپنے قبلہ کی فضیلت بیان کی۔ ان سے کہا گیا یہ نیکی نہیں ہے جس میں تم ہو بلکہ نیکی تو یہ ہے: مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ... الخ۔ (1)

**مسئلہ نمبر 2:** حمزہ اور حفص نے البر کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ لیس، کان کے اخوات سے ہے۔ اس کے بعد دو معرّفے واقع ہوں تو تو جس کو چاہے اسم بنادے یا خبر بنادے۔ اور جب لیس کے بعد البر واقع ہوا تو اسے تو نے نصب دی اور اَنْ تُولُوا کو اسم بنایا اور مصدر کا اسم ہونا اولیٰ ہے کیونکہ وہ نکرہ نہیں بنتا۔ اور البر کبھی نکرہ بن جاتا ہے اور فعل تعریف میں قوی ہوتا ہے۔ باقی قراء نے البر کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ لیس کا اسم ہے اور اس کی خبر اَنْ تُولُوا ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے: لیس البر تولیتکم و جوہکم۔ یعنی نیکی تمہارا اپنے قبلہ کی طرف مونہوں کو پھیرنا نہیں۔ اور پہلی ترکیب کے اعتبار سے معنی ہوگا تمہارا منہ پھیرنا نیکی نہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا كَانَ حُجَّتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا (الجماعیہ: 25) ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ بجز اس کے کہ وہ کہتے ہیں: لَمْ يَكُنْ عَاقِبَةُ الَّذِينَ اسَاءُوا الشُّؤْءَ أَنْ كَذَّبُوا (روم: 10) (آخر کار ان کا انجام جنہوں نے برائی کی تھی بہت برا ہوا کیونکہ انہوں نے جھٹلایا) فَكَانَ عَاقِبَتُهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ (الحشر: 17) (ان دونوں کا انجام یہ ہوگا کہ دونوں آگ میں ڈالے جائیں گے)

یہ رفع کی قرأت قوی ہے کیونکہ دوسری آیت میں بالاجماع خبر پر با آئی ہوئی ہے لَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا (البقرہ: 189) اس آیت میں صرف البر پر رفع جائز ہے۔ پہلی آیت کو دوسری پر محمول کرنا اولیٰ ہے بنسبت مخالفت

کے۔ اسی طرح حضرت ابی کے مصحف میں با کے ساتھ ہے لیس البدیان تولوا۔ اسی طرح حضرت ابن مسعود کے مصحف میں بھی ہے۔ اکثر قراء کا نظریہ یہی ہے۔ یہ دونوں قراءتیں بہتر ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ، الْيَوْمِ الْآخِرِ کے لئے اسم جامع ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ۔ مضاف کو حذف کیا گیا ہے۔ جیسے اس آیت میں مضاف حذف ہے وَنُسِّلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) اصل میں اهل القرية تھا۔ وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعُجْلَ (البقرہ: 93) اس میں بھی مضاف محذوف ہے۔ یہ فراء، قطرب اور زجاج کا قول ہے۔ شاعر نے کہا:

فانبا هي اقبال و ادبا

یہ اصل میں ذات اقبال و ذات ادبار ہے۔

نابغہ نے کہا:

و كيف تواصل من اصبت خلاصه کابى مرحب

اس شعر میں اصل کخلاصۃ ابی مرحب ہے۔ پس اس میں حذف کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: لکن ذالبر۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُمْ ذَرَجَتْ عِنْدَ اللَّهِ (آل عمران: 163) یہ اصل میں ذود درجات ہے۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اور فرائض، فرض کئے گئے اور قبلہ، کعبہ کو بنایا گیا اور حدود مقرر کی گئیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ فرمایا: کامل نیکی یہ نہیں کہ تم نماز پڑھو اور اس کے علاوہ عمل نہ کرو بلکہ نیکی والا وہ ہے جو اللہ پر ایمان لائے..... الخ۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد، ضحاک، عطاء، سفیان اور زجاج کا قول ہے (1)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ البر، الباز اور البر کے معنی میں ہو۔ فاعل کو کبھی مصدر کے معنی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: رجل عدل، رجل صوم و فطر قرآن حکیم میں ہے: إِنَّ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا (الملک: 30) اس میں غور بمعنی غائر ہے۔ یہ ابو عبیدہ کا اختیار ہے (2)۔ مبرد نے کہا: اگر میں قرآن کے قاریوں میں سے ہوتا تو میں ولکن البر۔ یعنی با کے فتح کے ساتھ پڑھتا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمُؤْمِنُونَ بَعْدَهُمْ إِذَا غُذُوا وَالصَّابِرِينَ بعض علماء نے فرمایا: المؤمنون کا عطف مَنْ پر ہے کیونکہ من جمع کے معنی میں اور محل رفع میں ہے گویا اس طرح فرمایا ولکن البر المؤمنون والمؤمنون۔ یہ فراء اور خفش کا قول ہے۔ الصابرين پر نصب مدح کی بنا پر یا فعل کے اضمار کے ساتھ ہے عرب مدح اور ذم کی بنا پر نصب دیتے ہیں۔ گویا وہ اس سے مدوح اور مذموم کے افراد کا ارادہ کرتے ہیں اور وہ اسے پہلے کلام کا تابع نہیں کرتے بلکہ اسے نصب دیتے ہیں۔ مدح کی مثال یہ ارشاد ہے: وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ (3) (النساء: 162) نسائی نے یہ اشعار پڑھے ہیں

الا نبيها اطاعت امرها وبيها

والقائلون لمن دار نخلها

وكل قوم اطاعوا امر مرشد هم

الظاعنين ولما يظعنوا احدا

ہر قوم نے اپنے مرشد کے حکم کی اطاعت کی سوائے نمیر کے۔ انہوں نے اپنے گمراہ کرنے والے کے امر کی اطاعت کی۔ وہ کوچ کرنے والے ہیں انہوں نے کسی کو کوچ نہیں کرایا اور جس کا گھر اس کے کہنے والے ہیں کہ ہم اسے خالی کرتے ہیں۔ ابو عبیدہ نے یہ شعر پڑھے ہیں:

لا یبعدن قومی الذین ہم سم العدوۃ وآفة الجزر  
النازلین بكل معترک والطیبون معاقد الأثر

ان اشعار میں النازلین کو بطور مدح نصب دی گئی ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

نحن بنی ضبۃ اصحاب الجمل

اس میں بھی بنی ضبہ کو نصب مدح کے طور پر ہے۔ ذم کی مثالیں یہ ہیں: مَلْعُونِینَ ۚ اَیُّنَا تُقِفُوۡا (احزاب: 1) (ان پر لعنت برس رہی ہوگی جہاں پائے جائیں گے)۔

عروہ بن الورد نے کہا:

سقونی الخمرثم تکفونی عداۃ اللہ من کذب وزور

اس میں عداۃ اللہ کو نصب بطور ذم دی گئی ہے۔

یہ سلسلہ نعوت میں عام ہے، اعراب کی جہت سے اس میں طعن نہیں کیا جاتا۔ کلام عرب میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ وہ لوگ جو کلام میں ہٹ دھرمی کرتے ہیں انہوں نے کہا: لکھنے میں کاتبوں سے غلطی ہوئی ہے جب انہوں نے قرآن کا نسخہ لکھا تھا اور کہا کہ اس پر وہ روایت ہے جو حضرت عثمان (1) سے مروی ہے کہ انہوں نے قرآن کا نسخہ دیکھا تو انہوں نے کہا اس میں غلطی ہے عرب اپنی زبانوں کے ساتھ اس کو درخت کر لیں گے۔ اسی طرح سورہ النساء میں وَالْمُتَّقِیْنَ الصَّلٰوۃَ (النساء: 162) اور سورہ المائدہ میں الصائبون کے بارے میں کہا۔ اس کا جواب وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا (کہ عرب کلام میں بطور مدح یا ذم، صفت کو اعراب میں جدا کر دیا جاتا ہے جیسا کہ مثالوں سے واضح کیا گیا ہے)۔

بعض علماء نے فرمایا: الموفون کو رفع مبتدا کی حیثیت سے دیا گیا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت وہم الموفون ہے۔ کسائی نے کہا والصابرین کا عطف ذوی القربیٰ پر ہے گویا فرمایا و آتی الصابرین۔ نحاس نے کہا: یہ قول غلط ہے اور خطا واضح ہے۔ کیونکہ جب تو الصابرین کو نصب دے گا اور اس کا عطف ذوی القربیٰ پر کرے گا تو یہ (من) کے صلہ میں داخل ہو جائے گا۔ اور جب تو الموفون کو من پر عطف کی وجہ سے رفع دے گا تو تو نے صلہ کے مکمل ہونے سے پہلے من پر عطف کر دیا اور تو نے معطوف کے ساتھ صلہ اور موصول کے درمیان فرق کر دیا۔ کسائی نے کہا: حضرت عبد اللہ کی قراءت میں الموفین

1۔ حضرت عثمان کے قول کی صحت کا محققین علماء نے انکار کیا ہے۔ علامہ محمدری، ابو حیان اور آلوسی وغیرہ نے اس قول کی حضرت عثمان کی طرف نسبت کا شذوذ سے انکار کیا ہے۔ یہ داضمین کی کارستانی ہے۔



والصابرین ہے۔ نحاس نے کہا: دونوں ذوالقربیٰ پر معطوف ہیں یا بطور مدح منصوب ہیں۔ فراء نے کہا: عبد اللہ کی قراءت میں سورہ النساء میں وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ وَالْمُؤْتُونَ الزَّكَاةَ (النساء: 162) ہے۔ یعقوب اور اعمش نے الموفون والصابرون پڑھا ہے یعنی دونوں کو رفع کے ساتھ (1)۔ جحدری نے بعہودہم پڑھا ہے (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: الموفون کا عطف اس ضمیر پر ہے جو آمن میں ہے۔ ابو علی نے اس کا انکا کیا ہے اور کہا کہ معنی اس پر نہیں ہے کیونکہ اس سے مراد ان البربر من آمن باللہ هو الموفون۔ یعنی ہم تمام پر ایمان لائے جیسے تو کہتا ہے: الشجاع من اقدمہود عمرو۔ اور من آمن کے قول کے بعد جو کچھ ہے وہ من آمن کے افعال کو اور ان کے اوصاف کو شمار کرنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** ہمارے علماء نے کہا: یہ آیت عظیمہ امہات الاحکام میں سے ہے کیونکہ یہ سولہ قواعد اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ، اس کے اسماء اور صفات پر ایمان..... ہم نے اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کی وضاحت اپنی کتاب ”الاسنی“ میں کر دی ہے..... نشر، حشر، میزان، صراط، حوض، شفاعت، جنت، دوزخ ان کا ذکر ہم نے اپنی کتاب ”التذکرہ“ میں کر دیا ہے..... ملائکہ، نازل شدہ کتب یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق ہیں..... جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے..... انبیاء کرام، مال خرچ کرنا، واجبی طور پر اور نفلی طور پر قرہبی رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا۔ ان سے قطع تعلقی کو ترک کرنا، یتیم کی دیکھ بھال کرنا ان کو بے یار و مددگار نہ چھوڑنا اسی طرح مساکین کی خیر خواہی کرنا، مسافروں کی رعایت کرنا۔ ابن السبیل سے مراد بعض نے فرمایا: جو راستہ سے پیچھے رہ جانے والے ہوں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مہمان ہے..... سوال کرنا، غلاموں کو آزاد کرانا..... اس کا بیان آیت الصدقات میں آئے گا..... نماز کی حفاظت کرنا، زکوٰۃ دینا، عہد کو پورا کرنا، تکلیف میں صبر کرنا، ان قواعد میں سے ہر قاعدہ ایک کتاب کا محتاج ہے، اکثر پر تنبیہ پہلے گزر چکی ہے۔ باقی کا بیان ان شاء اللہ ان کے مواقع پر آئے گا۔

علماء کا اختلاف ہے کہ کیا نفلی صدقہ سے یتیم کو صلہ رحمی کے طور پر یتیم ہونے کی وجہ سے صدقہ دیا جائے گا اگرچہ وہ غنی بھی ہو یا نہیں دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ فقیر ہو۔ اس کے متعلق عطا کے دو قول ہیں: یہ واجب زکوٰۃ کے علاوہ مال دینے کی بنا پر ہے، جیسا کہ ابھی ہم بیان کریں گے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَآتَى النَّالَ عَلَىٰ حُجْمِ جَنَہوں نے یہ کہا کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے، انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے اور نیکی کا کمال اسی کے ساتھ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی اللہ کے راستہ میں دیا جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے (3)۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ دارقطنی نے فاطمہ بنت قیس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے پھر یہ آیت تلاوت کی لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ الْخِ ابْن ماجہ نے اپنی سنن میں، ترمذی نے اپنی جامع میں اس حدیث کو نقل کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث ایسی ہے کہ اس کی سند ایسی نہیں ہے۔

ابو حمزہ میمون اعور کو ضعیف کہا گیا ہے، بیان اور اسماعیل بن سالم نے شعبی سے یہ قول روایت کیا ہے اور یہ اصح ہے۔ میں کہتا ہوں: حدیث میں اگرچہ کلام کیا گیا ہے اس کی صحت پر آیت کا معنی ہی دلالت کرتا ہے۔ فرمایا: وَأَقَامَ الصَّلَاةَ

وَآتَى الزَّكَاةَ۔ نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر کر دیا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ سے مراد فرضی زکوٰۃ نہیں ہے (کیونکہ زکوٰۃ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) ورنہ تکرار ہو جائے گا (1) واللہ اعلم۔ علماء کا اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد مسلمانوں کو کوئی ضرورت پڑ جائے تو اس میں مال کا خرچ کرنا واجب ہے۔ امام مالک نے فرمایا: لوگوں پر اپنے قیدیوں کا فدیہ دینا واجب ہے اگرچہ ان کا سارا مال بھی اس میں غرق ہو جائے۔ اس پر اجماع بھی ہے اور یہ اس قول کو تقویت دیتا ہے جو ہم نے اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلَى حُبِّهِ، حُبِّهِ میں ضمیر کے مرجع میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: مال دینے والے کی طرف راجع ہے۔ مفعول کو حذف کیا گیا ہے اور وہ مال ہے۔ ذوی القربیٰ کو حُبِّهِ کی وجہ سے نصب دینا جائز ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: عَلَى حُبِّهِ الْمَعْطَى ذَوِ الْقَرْبَى۔ بعض نے فرمایا: یہ ضمیر مال کی طرف لوٹ رہی ہے مصدر مفعول کی طرف مضاف ہوگا۔ ابن عطیہ نے کہا (2): اور عَلَى حُبِّهِ کا قول، کلام کے درمیان اعتراض بلیغ ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کی مثال یہ ارشاد ہے: وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا (الدھر: 8) یہ دونوں معانی کو جامع ہے الاعتراض اور مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کرنا۔ یعنی عَلَى حُبِّهِ الطَّعَامِ۔ اعتراض کی مثال یہ ہے: وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ (النساء: 124) اس کو تتمیم کہا جاتا ہے اور یہ بلاغت کی ایک قسم ہے احترا اس و احتیاط کہا جاتا ہے۔ پس عَلَى حُبِّهِ کے قول کے ساتھ تتمیم کی اور وہ مومن کے قول کے ساتھ تتمیم کی۔ اسی سے زہیر کا قول ہے:

يَلْقَى السَّاحَةَ مِنْهُ وَالنَّدَى خَلْقًا

مَنْ يَلْقَى يَوْمًا عَلَى عِلَاتِهِ هَرَمًا

اس شعر میں عَلَى عِلَاتِهِ تتمیم حسن ہے۔

اور امرء القیس نے کہا:

أَفَانِينَ جَرِيٍّ غَيْرِ كَثْرٍ وَلَا وَانٍ

عَلَى هَيْكَلٍ يُعْطِيكَ قَبْلَ سَوَالِهِ

اس شعر میں قَبْلَ سَوَالِهِ، تتمیم حسن ہے۔

اسی طرح عشرہ کا قول ہے:

سَهْلٌ مُخَالَفَتِي إِذَا لَمْ أَظْلَمْ

أَشْنَىٰ عَنْ بِنَا عَلِمَتْ فَانِي

اس شعر میں لَمْ أَظْلَمْ، تتمیم حسن ہے۔

طرف نے کہا:

صَوَّبَ الرَّبِيعَ وَ دِيَةَ تَهَى

فَسَقَى دِيَارَكَ غَيْرَ مَفْسَدَهَا

اس میں غَيْرَ مَفْسَدَهَا تتمیم اور احترا اس ہے۔

ربیع بن ضبع الفزاری نے کہا:

فنیث و ما یفنی صنیع و منطقی و کل امرئ الا احادیثہ فان  
اس شعر میں الا احادیثہ تنمیم اور احتراس ہے۔

ابو ہفان نے کہا:

فأفنی الردی ارداحنا غیر ظالم وأفنی الندی اموالنا غیر عائب  
اس میں غیر ظالم اور غیر عائب تنمیم اور احتیاط ہے۔ شعر میں یہ کثیر ہوتا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: حُبِّہ کی ضمیر کا مرجع الایتناء ہے کیونکہ فعل اپنے مصدر پر دلالت کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا أَنْتَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِمْ هُوَ خَيْرٌ أَلَهُمْ (آل عمران: 80) یعنی بخل ان کے لئے بہتر ہے جب کوئی حاجت لاحق ہو یا فاقہ لاحق ہو تو مال کا عطا کرنا انہیں محبوب ہے (1)۔ بعض نے فرمایا: حبہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کا اسم ہے جو مَنَ اَمَّنَ بِاللَّهِ میں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان ان وجوہ میں خرچ کرے جبکہ وہ صحیح ہو (اس مال پر) بخیل ہو فقر کا اندیشہ ہو اور بقا کی امید رکھتا ہو۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمُؤْتُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور بندوں سے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرتے ہیں۔

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ، الْبَأْسَاء سے مراد شدت اور فقر ہے اور الضَّرَّاء سے مراد مرض اور پانچ پن ہے۔ یہ حضرت ابن مسعود کا قول ہے (2)۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندوں میں سے کوئی بندہ جسے میں اس کے بستر میں بیماری میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ اپنے بیمار داروں سے شکوہ نہیں کرتا تو میں اس کے گوشت سے بہتر گوشت اور اس کے خون سے بہتر خون عطا کرتا ہوں، اگر میں اس کی روح قبض کر لیتا ہوں تو اپنی رحمت میں داخل کرتا ہوں، اگر میں اسے عافیت دیتا ہوں تو اسے عافیت دیتا ہوں جبکہ اس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! اس کے گوشت سے کون سا گوشت بہتر ہے؟ فرمایا: وہ گوشت جس نے گناہ نہیں کیا ہوتا۔ عرض کی گئی: اس کے خون سے بہتر خون کون سا ہے؟ فرمایا: ایسا خون جس نے گناہ نہیں کیا الْبَأْسَاء وَالضَّرَّاء۔ دونوں فعلاء کے وزن پر ہیں۔ ان کا فعل نہیں ہے کیونکہ یہ اسم ہیں اور صفت نہیں ہیں وَحِينَ الْبَأْسِ اس سے مراد جنگ کا وقت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ یعنی وہ اپنے امور میں سچ اور تقویٰ کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے امور کو پورا کرتے ہیں۔ وہ دین میں کوشش کرنے والے ہیں یہ انتہائی تعریف اور ثناء ہے۔ صدق کا متضاد کذب ہے۔ کہا جاتا ہے: صدقوہم القتال انہوں نے قتال کی تصدیق کی۔ الصدیق جو صدق کو لازم پکڑتا ہے اور حدیث میں ہے: علیکم بالصدق فان الصدق یہدی الی البعد ان البعد یہدی الی الجنة وما یزال الرجل یصدق و



یتحرى الصدق حتى يكتب عند الله صديقاً ☆۔ (تم پر سچ بولنا لازم ہے۔ سچ، نیکی کی طرف ہدایت دیتا ہے نیکی جنت کی طرف ہدایت دیتی ہے انسان سچ بولتا ہے اور سچ کی کوشش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں سچا لکھا جاتا ہے)۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ - أَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى - فَمَنْ عَفَى لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ - ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ - فَمَنِ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ٥

”اے ایمان والو! فرض کیا گیا ہے تم پر قصاص جو (ناحق) مارے جائیں۔ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ پس جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی (مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ چیز تو چاہے کہ طلب کرے (مقتول کا وارث) خون بہا دستور کے مطابق اور (قاتل کو چاہئے) کہ اسے ادا کرے اچھی طرح۔ یہ رعایت ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت ہے۔ تو جس نے زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

اس میں سترہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** بخاری (1)، نسائی اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: بنی اسرائیل میں صرف قصاص (بدلہ) تھا ان میں دیت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو کہا: کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ - أَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى - فَمَنْ عَفَى لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ، العفو سے مراد قتل عمد میں دیت کو قبول کرنا ہے۔ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ وہ معروف طریقہ سے طلب کرے اور وہ احسان کے ساتھ ادا کرے۔ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ جو تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ فَمَنِ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ جس نے دیت کی قبولیت کے بعد قتل کیا تو اس پر عذاب الیم ہے۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ حمیدی نے ہمیں بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں سفیان نے بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں عمرو نے بیان کیا، فرمایا: میں نے مجاہد کو یہ کہتے ہوئے سنا انہوں نے کہا: میں نے حضرت ابن عباس کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ شعبی نے أَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى کے تحت فرمایا: یہ عربوں کے دو قبائل کے بارے میں تری جو آپس میں لڑے تھے۔ انہوں نے کہا ہم اپنے غلام کے بدلے میں فلاں بن فلاں کو قتل کریں گے اور ہم اپنی لونڈی کے بدلے میں فلاں بنت فلاں کو قتل کریں گے۔ اسی طرح قتادہ سے مروی ہے۔ (2)

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ، کُتِبَ کا معنی فُرِضَ اور اثبت ہے۔ اسی سے عمر بن

1۔ صحیح بخاری، باب یا ایہا الذین آمنوا کتب علیکم القصاص۔۔۔ الا یہ، حدیث نمبر 4138، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ابی ربیعہ کا قول ہے:

کتب القتل والقتال علینا و علی الغانیات جلالہ  
ہم پر قتل اور قتال فرض کیا گیا ہے اور گانے والیوں پر دامنوں کو گھسیٹنا۔

بعض علماء نے فرمایا: کُتِبَ یہاں خبر دینا ہے اس کے متعلق جو لوح محفوظ پر رکھا گیا ہے اور جس کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے القصاص۔ یہ قص الاثر سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے پیچھا کرنا۔ اسی سے القصاص ہے کیونکہ وہ آثار اور اخبار کی اتباع کرتا ہے۔ قص الشعر اس کے اثر کی اتباع کرنا۔ گویا قاتل قتل کے راستہ پر چلتا ہے تو اس میں اس کا پیچھا کیا جاتا ہے اور اس میں اس کے راستہ پر چلا جاتا ہے (1)۔ اسی سے ہے: فارتدّ اعلیٰ اثارہا قصصاً، وہ اپنے قدموں کے نشانوں پر پیچھے آئے۔ بعض علماء نے فرمایا: القص کا معنی کاٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے: قصت ما بینہما۔ اسی سے قصاص لینا ہے کیونکہ اسے اس کی مثل زخم لگایا جاتا ہے جو اس نے لگایا تھا یا اسے قتل کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: اقض الحاکم فلاناً من فلان و ابناء قاہ فامثلہ فامثل بہ یعنی حاکم نے فلاں سے قصاص لیا۔

**مسئلہ نمبر 3:** قصاص کی صورت یہ ہے کہ قاتل پر فرض ہے کہ جب ولی قتل کا ارادہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کے امر کو تسلیم کرے اور قصاص شرعی کی پیروی کرے اور ولی پر فرض ہے کہ وہ قاتل کو ہی قتل کرے، اس کے ولی کو قتل نہ کرے اور غیر پر تعدی نہ کرے جیسا کہ عرب تعدی کرتے تھے وہ غیر قاتل کو قتل کرتے تھے (2)۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا یہی معنی ہے کہ لوگوں میں سے اللہ کی بارگاہ میں قیامت کے روز تین شخص زیادہ نافرمان ہوں گے: ایک وہ جس نے غیر قاتل کو قتل کیا، جس نے حرم میں قتل کیا، وہ جس نے جاہلیت کی دشمنی کا بدلہ لیا۔ شعبی اور قتادہ وغیرہا نے کہا: اہل جاہلیت میں برائی اور شیطان کی اطاعت تھی۔ ایک قبیلہ جس میں عزت اور قوت ہوتی تھی پھر اس کا غلام قتل کیا جاتا تھا تو اس کے مقابل والے کہتے: ہم اس کے بدلے میں آزاد کو قتل کریں گے۔ جب ان کی عورت قتل ہوتی تو کہتے: ہم اس کے بدلے میں مرد کو قتل کریں گے جب ان کا کوئی کم مرتبہ شخص قتل ہوتا تو وہ کہتے: ہم اس کے بدلے میں شریف کو قتل کریں گے اور کہتے: قتل، قتل سے بچانے والا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حد سے تجاوز کرنے سے منع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقَصَاصُ فِی الْقَتْلِ اَلْحَرْ بِالْحَرْ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ۔ اور فرمایا: وَلَکُمْ فِی الْقَصَاصِ حَیْوةٌ وَبَلَاغَتٌ فِیْ اَنْ دَوْنُوں کے کلاموں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اس میں کوئی اختلاف نہیں قتل کا فیصلہ اولی الامر حاکم کرے گا۔ ان پر قصاص کا قائم کرنا اور حدود کا قائم کرنا فرض کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مومنین کو قصاص کے ساتھ خطاب فرمایا۔ پھر تمام مسلمان تو قصاص پر جمع نہیں ہو سکتے تو انہوں نے سب کے قائم مقام سلطان کو کیا کہ وہ قصاص اور حدود کو قائم کرے۔ القصاص لازم نہیں ہے بلکہ لازم یہ ہے کہ قصاص اور دوسری حدود زیادتی تک تجاوز نہ کریں (3)۔ جب قصاص کے بدلے میں دیت یا معافی کے ساتھ مقتول کے

اولیاء راضی ہو جائیں تو یہ مباح ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد **كُتِبَ عَلَيْكُمُ** کا معنی ہے: تم پر فرض کیا گیا اور لازم کیا گیا ہے تو پھر قصاص کیسے واجب ہوگا؟ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے جب تم ارادہ کرو جان لو کہ قصاص جھڑے کے وقت غایت ہے۔ القتل، قتل کی جمع ہے اور مونث کا لفظ، جماعت کی تانیث ہے یہ ان افعال میں سے ہیں جو لوگوں پر کرہا (ناپسندیدگی) داخل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس بنا پر یہ الفاظ آئے ہیں جیسے جَزْئِي، زَمَنِي، حَقِّي، صَرَعِي، غَرَقِي، اور اس کے مشابہ الفاظ۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأَنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ** اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا یہ آیت نوع کے حکم کو بیان کر رہی ہے جب کوئی اپنی نوع کو قتل کرے۔ اس آیت سے آزاد کا حکم بیان کیا جب وہ آزاد کو قتل کرے، غلام جب غلام کو قتل کرے، عورت جب عورت کو قتل کرے، ایک نوع جب دوسری نوع کو قتل کر دے تو اس سے تعرض نہیں کیا۔ یہ آیت محکم ہے اور اس میں اجمال ہے جس کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان کر رہا ہے: **وَكُتِبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ** الخ۔ (المائدہ: 45) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت سے بیان فرمایا جب ایک یہودی نے ایک عورت کو قتل کر دیا تھا (1)۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ یہ ابو عبید نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے یہ آیت سورۃ مائدہ کی آیت سے منسوخ ہے۔ یہ اہل عراق کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** کوفیوں اور ثوری نے کہا: آزاد کو غلام کے بدلے، مسلم کو ذمی کے بدلے قتل کیا جائے گا اور انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ**۔ یہ حکم عام ہے اور اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے **وَكُتِبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ** (المائدہ: 45) وہ فرماتے ہیں: حرمت میں مسلمان اور ذمی برابر ہیں۔ جس میں قصاص ہوتا ہے وہ ہے خون کی حرمت جو ہمیشہ کے لئے ثابت ہے۔ ذمی بھی ہمیشہ محفوظ الدم ہوتا ہے اور اسی طرح مسلمان بھی۔ دونوں دارالاسلام کے اہل سے ہو گئے اور اس چیز کو یہ امر بھی ثابت کرتا ہے کہ ذمی کا مال مسلمان کے مال کے برابر ہے۔ پس خون کی مساوات کی یہ دلیل ہے کیونکہ مال کی حرمت، مالک کی حرمت کے ساتھ ہوتی ہے، امام ابو حنیفہ اور ان کے ساتھی، ثوری، ابن ابی لیلیٰ کا اتفاق ہے کہ آزاد کو غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا جس طرح غلام کے بدلے غلام کو قتل کیا جاتا ہے۔ یہ داؤد کا قول ہے اور یہ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ سعید بن مسیب، قتادہ، ابراہیم نخعی اور حکم بن عمیر کا قول ہے۔ جمہور علماء غلام کے بدلے آزاد کو قتل نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں: آیت میں تنویع و تقسیم کے لئے حکم ہے۔ ابو ثور نے کہا: جب تمام علماء کا اتفاق ہے کہ نفوس سے کم میں غلاموں اور آزاد لوگوں میں قصاص نہیں ہے تو نفوس اس کے زیادہ لائق ہیں اور جنہوں نے ان کے درمیان فرق کیا ان کے کلام میں تناقض ہے۔ اس شخص کے بارے میں اجماع ہے جو غلام کو خطا قتل کر دے تو اس پر غلام کی قیمت واجب ہے۔ پس جس طرح غلام قتل خطا میں آزاد کے مشابہ نہیں ہے قتل عمد میں بھی مشابہ نہیں ہے۔ اسی طرح غلام سامانوں میں سے ایک سامان ہے اور بیچا جاتا ہے اور خریدا جاتا ہے اور اس میں مرضی سے تصرف کیا جاتا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الاشخاص والخصومة بین المسلم، حدیث 2236، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



پس غلام اور آزاد کے درمیان کوئی مساوات نہیں ہے اور کوئی برابری نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ اجماع صحیح ہے۔ رہا پہلا قول (جب تمام علماء کا اتفاق ہے) اس کی کلام میں تناقص ہے (ابن ابی لیلیٰ اور داؤد نے نفس میں اور تمام اعضاء میں آزاد اور غلام کے درمیان قصاص کا قول کیا ہے اور داؤد نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: المسلمون تتكافأ دمائهم (1) (مسلمانوں میں خون برابر ہیں) اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد اور غلام کی کوئی تفریق نہیں کی۔ اس کا بیان سورہ النساء میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 7:** جمہور علماء کا نظریہ ہے کہ مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ بخاری نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت نقل کی ہے (2) اور اس کے مخالف جو حدیث ربیعہ سے روایت کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن ایک مسلمان کو کافر کے بدلے قتل کیا۔ یہ حدیث اس لئے صحیح نہیں کیونکہ یہ منقطع ہے اور ابن البیہقی کی حدیث جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ ابن البیہقی ضعیف ہے۔ دارقطنی نے کہا: ابراہیم بن ابی یحییٰ کے علاوہ کسی نے اس کو مسند نہیں بنایا اور ابراہیم مترک الحدیث ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عن ربیعہ عن ابن البیہقی مرسل ہے ابن البیہقی ضعیف الحدیث ہے۔ جب حدیث کو متصل بیان کرے تب بھی اس کی حدیث حجت نہیں ہوتی تو پھر اس کی مرسل کیسے حجت ہوگی۔ میں کہتا ہوں: اس باب میں بخاری کی حدیث کے علاوہ کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے عموم کی تخصیص کرتی ہے یعنی كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقَصَاصُ فِي الْقَتْلِ اور النفس بالنفس کے عموم کو خاص کرتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** حضرت علی بن ابی طالب، حسن بن ابی حسن بصری سے روایت ہے کہ یہ آیت مذکورین کے حکم کو بیان کرتی ہے تاکہ ان کے درمیان اور ان کے درمیان جو آزاد، غلام کو قتل کر دے یا غلام، آزاد کو قتل کر دے یا مذکر، مؤنث کو قتل کر دے، مؤنث، مذکر کو قتل کر دے فرق پر دالالت کرے۔ ان دونوں حضرات نے فرمایا: جب کوئی مرد، عورت کو قتل کر دے اگر اس عورت کے اولیاء اس کو قتل کرنا چاہیں تو اس کے ورثاء کو نصف دیت دے دیں اور اگر اس عورت کے اولیاء اسے زندہ رکھنے کا ارادہ کریں تو اس سے نصف دیت لے لیں۔ اور اگر کوئی عورت مرد کو قتل کر دے پھر اگر اس مرد کے اولیاء اس عورت کو قتل کرنا چاہیں تو اسے قتل کر دیں اور نصف دیت لے لیں۔ وگرنہ اپنے ساتھی کی دیت لے لیں اور عورت کو زندہ چھوڑ دیں (3)۔ شعبی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ امام شعبی نے حضرت علی سے ملاقات نہیں کی تھی۔ حضرت حکم نے حضرت علی اور حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب مرد، عورت کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کا قصاص ہوگا۔ یہ روایت شعبی کی حضرت علی سے روایت کے مخالف ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ کانا اور ایک ہاتھ جس کا شل ہو جب وہ کسی سلامت اعضاء والے کو قتل کر دے تو اس کے ولی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کانے شخص کو قتل کر دے اور نصف دیت لے لے۔ اس وجہ سے کہ اس نے دو آنکھوں والے کو قتل کیا تھا اور یہ کانا تھا اور اس نے دو ہاتھوں والے کو قتل کیا جب کہ اس کا

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی السریۃ تروى عن أهل العسکر، حدیث نمبر 2371، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب کتابۃ العلم، حدیث نمبر 108، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ایک ہاتھ ہے۔ یہ دلیل ہے کہ نفس، نفس کا مقابل ہے بچے کا نفس بڑے کے نفس کا مقابل ہے۔

اور یہ کہنے والے کو کہا جائے گا کہ آدمی، عورت کا مقابل نہیں ہوتی اور نہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد (مسلمانوں کے خون برابر ہیں) کے تحت داخل ہے۔ پھر تم نے اس عورت کے بدلے میں مرد کو کیوں قتل کر دیا جبکہ وہ مرد کے برابر نہیں ہے؟ پھر تم نصف دیت بھی لیتے ہو۔ علماء کا اجماع ہے کہ دیت قصاص کے ساتھ جمع نہیں ہوتی۔ جب دیت قبول کی جائے گی تو خون حرام ہو جائے گا اور قصاص اٹھ جائے گا۔ پس تیرا یہ قول اس کی نہ اصل ہے نہ قیاس۔ یہ ابو عمر کا قول ہے جب آزاد غلام کو قتل کرے گا تو پھر اگر غلام کا مالک چاہے تو آزاد کو قتل کرے اور آزاد کی دیت دے دے مگر غلام (مقتول) کی قیمت منہا کر لے اگر چاہے تو آزاد کو زندہ چھوڑ دے اور غلام کی قیمت لے لے۔ یہ حضرت علی اور حضرت حسن بن علی سے مروی ہے۔ اس روایت نے بھی پہلے لوگوں کا انکار کیا۔ (1)

**مسئلہ نمبر 9:** علماء کا اجماع ہے کہ عورت کے بدلے مرد کو اور مرد کے بدلے عورت کو قتل کیا جائے گا اور جمہور علماء کسی شے کے ساتھ رجوع کا نظریہ نہیں رکھتے۔ ایک فرقہ اضافی دیتوں کا نظریہ رکھتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ثوری اور ابو ثور نے کہا: اسی طرح نفس سے کم میں بھی ان کے درمیان قصاص ہوگا۔ حماد بن ابی سلیمان اور امام ابو حنیفہ نے کہا: نفس سے کم میں مرد اور عورت کے درمیان قصاص نہیں ہے۔ قصاص نفس کے بدلے نفس کا ہے ان پر حجت اس طرح پیش کی گئی ہے کہ جب نفس کے بدلے نفس ہے تو اس سے کم میں بدلہ بدرجہ اولیٰ ہوگا جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10:** ابن عربی نے کہا: لوگوں میں جہالت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ لوگوں نے کہا: آزاد کو اپنے غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا اور اس کے متعلق انہوں نے حسن عن سمرہ کے سلسلے سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اسے قتل کریں گے (2)۔ یہ حدیث ضعیف ہے اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **مَنْ قَتَلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيهِ سُلْطٰنًا فَلَا يَسْرِفُ فِي الْقَتْلِ (اسراء: 33)**۔ یہاں ولی سے مراد سردار اور مالک ہے اس کے لئے اپنے نفس پر سلطان کیسے ہوگی؟ علماء کا اتفاق ہے کہ مالک اگر خطا اپنے غلام کو قتل کر دے تو مالک سے غلام کی قیمت بیت المال کے لئے نہیں لی جائے گی۔ عمرو بن شعیب سے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے جان بوجھ کر اپنے غلام کو قتل کر دیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوزے لگائے اور ایک سال تک اسے جلاوطن کیا مسلمانوں سے اس کا حصہ ختم کر دیا اور اس غلام کے بدلے میں اس سے قصاص نہ لیا۔ (3)

اگر کہا جائے کہ جب مرد اپنی بیوی کو قتل کر دے تو پھر تم کیوں کہتے ہو کہ خاوند سے قصاص دور کرنے میں شبہ نکاح ہے کیونکہ نکاح غلامی کی ایک قسم ہے۔ یہ لیث بن سعید نے کہا ہے۔ ہم کہتے ہیں: نکاح عورت کے لئے خاوند پر منعقد ہوتا ہے۔ جس طرح مرد کے لئے عورت پر منعقد ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خاوند نہ تو اپنی بیوی کی بہن سے نکاح کر سکتا ہے اور نہ

2۔ سنن ابن ماجہ۔ باب هل يقتل الحر بالعبد۔ حدیث نمبر 2652۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

1۔ المحرر الوجیز فی تراثیت ہذا

3۔ ایضاً، حدیث نمبر 2653

چار عورتوں سے زائد سے نکاح کر سکتا ہے۔ عورت خاوند سے وطی کے حق کا مطالبہ کر سکتی ہے جس طرح مرد اس سے مطالبہ کر سکتا ہے لیکن مرد کو عورت پر قوامت کی فضیلت حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ نے مرد کے لئے بنائی ہے کیونکہ وہ اپنے مال سے اس پر خرچ کرتا ہے یعنی اس پر مہر اور نفقہ واجب ہوتا ہے اگر شبہ ہوگا تو دونوں طرف سے ہوگا۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث جس کو ابن عربی نے ضعیف کہا ہے وہ صحیح ہے۔ نسائی اور ابوداؤد نے اس کو نقل کیا ہے۔ اس کا مکمل متن یہ ہے: جو غلام کا ناک کاٹنے کا ہم اس کا ناک کاٹیں گے اور جو اس کو خسی کرے گا ہم اسے خسی کریں گے۔ بخاری نے علی بن مدینی سے روایت کیا ہے کہ حسن کا سرہ سے سماع صحیح ہے اور انہوں نے اس حدیث کو لیا ہے۔ بخاری نے کہا: میں اسی کی طرف جاتا ہوں (یعنی میرا مذہب یہی ہے) اگر یہ حدیث صحیح نہ ہوتی تو یہ دونوں امام اس کو اپنا مذہب نہ بناتے۔ تیرے یہ دونوں امام کافی ہیں۔ آزاد کو اپنے غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ نخعی اور ثوری نے ایک قول میں یہی کہا۔ بعض محدثین نے کہا: حسن نے حضرت سرہ سے نہیں سنا سوائے عقیقہ کی حدیث کے۔ واللہ اعلم۔ غلاموں کے درمیان نفس سے کم میں قصاص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے یہ عمر بن عبدالعزیز، سالم بن عبداللہ زہری، قران، امام مالک، امام شافعی اور ابو ثور کا قول ہے شعبی، نخعی، ثوری اور امام ابو حنیفہ نے کہا: ان کے درمیان قصاص نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: پہلا قول اصح ہے۔

**مسئلہ نمبر 11:** دارقطنی، ابو عیسیٰ ترمذی نے سراقہ بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے

پاس حاضر تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: باپ بیٹے سے قصاص لے گا اور بیٹا باپ سے قصاص لے گا۔ ابو عیسیٰ نے کہا: اس حدیث کو ہم سراقہ کی حدیث سے نہیں جانتے مگر اس طریق سے۔ اس کی سند صحیح نہیں ہے۔ اس کو اسماعیل بن عباس سے ثنی بن صباح سے روایت کیا ہے اور ثنی حدیث میں ضعیف ہے۔ اس حدیث کو ابو خالد احمر نے حجاج سے انہوں نے عمرو بن شعیب سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے اس کے دادا سے انہوں نے حضرت عمر سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے، یہ حدیث عمرو بن شعیب سے مرسل بھی مروی ہے۔ اس حدیث میں اضطراب ہے اہل علم کے نزدیک علم اس پر ہے کہ باپ جب بیٹے کو قتل کر دے گا تو اس کے بدلے میں باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ جب باپ بیٹے پر تہمت لگائے گا تو اسے حد نہیں لگائی جائے گی۔ ابن منذر نے کہا: اہل علم کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو جان بوجھ کر اپنے بیٹے کو قتل کرتا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اس پر قصاص نہیں ہے اور اس پر دیت ہے۔ یہ امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔ عطا اور مجاہد سے بھی یہی مروی ہے۔ امام مالک، ابن نافع، ابن عبدالحکم نے کہا: باپ کو بیٹے کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ ابن منذر نے کہا: ہم کتاب و سنت کے ظاہر کی وجہ سے یہی کہتے ہیں: ظاہر کتاب یہ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقَصَاصُ فِي الْقَتْلِ "اَلْحَرْبُ بِالْحَرْبِ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ" اور رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے المومنون تتكافأ دمائهم "مومنوں کے خون برابر ہیں" اور ہم کوئی خبر ایسی نہیں جانتے جس میں باپ کی استثناء ثابت ہو۔ اس کے متعلق ہم نے جو اخبار روایت کی ہیں ثابت نہیں ہیں۔ الکلیا طبری نے عثمان البقی سے حکایت کیا ہے کہ والد کو بیٹے کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ قرآن میں قصاص کے متعلق عام حکم ہے۔ اس کی مثل امام مالک سے مروی ہے۔ شاید وہ قرآن کی عموماً کے مقابلہ میں اخبار احاد کو قبول نہیں کرتے۔



میں کہتا ہوں: امام مالک کے مذہب میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب کوئی جان بوجھ کر اپنے بیٹے کو قتل کر دے مثلاً اسے لٹائے اور ذبح کر دے یا اسے باندھ دے جبکہ اس کے لئے اس میں کوئی عذر نہ ہو اور اس کے خطا کے دعویٰ میں کوئی شبہ نہ ہو تو اس کے بدلے میں باپ کو قتل کیا جائے گا۔ یہ ایک قول ہے۔ رہا وہ شخص جو ادب سکھانے کے لئے اسے ہتھیار سے مارے یا گلا دبا کر اسے قتل کر دے تو اس میں دو قول ہیں: اس کو اس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اسے قتل نہیں کیا جائے گا (1)۔ ابن عربی نے کہا: میں نے اپنے شیخ فخر الاسلام الشاشی سے سنا وہ فرما رہے تھے: باپ کو بیٹے کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ اس کے وجود کا سبب تھا پس بیٹا اس کے عدم کا سبب کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ قول اسی سے باطل ہو جاتا ہے کہ جب کوئی اپنی بیٹی سے بدکاری کرے تو اسے رجم کیا جاتا ہے حالانکہ وہ اس بچی کے وجود کا سبب تھا اور یہ اس کے عدم کا سبب ہوئی ہے۔ پھر یہ کس فقہ کے تحت ہے، وہ اس کے عدم کا سبب کیوں نہ ہو۔ جب اس کے متعلق اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: والد سے بیٹے کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔ یہ حدیث باطل ہے (2)۔ ان کے متعلق ہے کہ حضرت عمر نے بیٹے کے قاتل کے بارے میں دیت مغلطہ کا فیصلہ فرمایا اور کسی صحابی نے ان پر انکار نہیں کیا۔ تمام فقہاء نے مطلق مسئلہ کو لیا اور کہا کہ والد کو بیٹے کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا اور امام مالک نے مسئلہ کو محکمہ مفصلہ لیا اور فرمایا: اگر اس نے اس پر تلوار سونپی تو یہ حالت قتل کے قصد کا بھی احتمال رکھتی ہے اور عدم قصد کا بھی احتمال رکھتی ہے۔ ابوہ کی شفقت ایک قائم شبہ ہے۔ قتل کے قصد کے نہ ہونے کا شاہد شبہ ہے۔ پس قصاص ساقط کیا جائے گا۔ اور جب وہ اپنے بیٹے کو لٹا دے تو اس کے قصد سے پردہ اٹھ گیا پس وہ اصل کے ساتھ لاحق ہو جائے گا۔ ابن منذر نے کہا: امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق کہتے ہیں بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اس کے بدلے میں بیٹے کو قتل کیا جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 12:** امام احمد بن حنبل نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ایک شخص کے بدلے میں پوری جماعت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مساوات کی شرط رکھی ہے اور جماعت اور ایک آدمی کے درمیان کوئی مساوات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ (المائدہ: 45) اس کا جواب یہ ہے کہ قصاص سے مراد آیت میں جس نے کسی کو قتل کیا ہے اسے قتل کرنا ہے۔ اس میں عربوں کا رد ہے جو اس کو قتل کرنے کا ارادہ کرتے تھے جس نے قتل کیا ہوتا تھا اور ایک کے مقابلہ میں سو کو قتل کرتے تھے، اپنی جاہ و حشمت کا اظہار اور فخر کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عدل اور مساوات کا حکم دیا کہ جو قتل کرے صرف اسے قتل کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صنعا میں ایک شخص کے بدلے میں سات شخصوں کو قتل کیا اور فرمایا: اگر اہل صنعا اس کو قتل کرنے میں شریک ہوتے تو میں سب کو قتل کر دیتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن خطاب کے بدلے میں خارجیوں کو قتل کیا۔ حضرت عبداللہ بن خطاب کو انہوں نے بکری کی طرح ذبح کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر دی گئی تو آپ نے کہا: اللہ اکبر۔ آپ نے فرمایا: انہیں کہو کہ حضرت عبداللہ بن خطاب کے قاتل کو ہمارے سامنے نکالو۔ انہوں نے کہا: ہم سب نے قتل کیا ہے۔ تین مرتبہ یہ کہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

2۔ سنن ابن ماجہ، باب لا يقتل الوالد بولده، حدیث نمبر 2650، خیاء القرآن پبلی کیشنز

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

نے اپنے اصحاب سے کہا: اس قوم کو پکڑو۔ تھوڑی ہی دیر میں حضرت علی اور ان کے ساتھیوں نے خارجیوں کو قتل کر دیا۔ یہ دونوں حدیثیں دارقطنی نے اپنی سنن میں نقل کی ہیں اور ترمذی میں حضرت ابوسعید اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر سارے آسمان والے اور سارے زمین والے ایک مومن کے خون میں شریک ہوں تو اللہ تعالیٰ سب کو آگ میں اوندھا کر اے گا۔ اس حدیث کے متعلق فرمایا یہ حدیث غریب ہے اگر ایک جماعت کو معلوم ہوگا کہ جب وہ ایک شخص کو قتل کریں گے تو انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔

اس قاعدہ کی رعایت کرنا، الفاظ کی رعایت کرنے سے اولیٰ ہے۔ ابن منذر نے کہا: زہری، حبیب بن ابی ثابت اور ابن سیرین نے کہا: دو شخصوں کو ایک کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ ہم نے یہ حضرت معاذ بن جبل، ابن زبیر اور عبد الملک سے روایت کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ اصح ہے۔ جس نے ایک کے بدلے میں جماعت کو قتل کرنا مباح کیا ہے اس کے پاس کوئی حجت نہیں حالانکہ حضرت ابن زبیر سے ثابت ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 13:** ائمہ نے ابوشریع کعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خبردار! اے خزاعہ کے گروہ! تم نے ہذیل کا یہ شخص قتل کیا ہے اور میں اس کی دیت دینے والا ہوں۔ پس میری اس گفتگو کے بعد جس کا کوئی شخص قتل کیا جائے گا اس کے ورثا کو دو چیزوں میں اختیار ہوگا یا تو وہ دیت لے لیں یا قاتل کو قتل کریں۔ یہ ابو داؤد کے لفظ ہیں (1)۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابوشریع خزاعی سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس کا کوئی شخص قتل ہو جائے تو اسے قتل کرنے یا معاف کرنے یا دیت لینے کا اختیار ہے۔ بعض اہل علم کا یہی نظریہ ہے اور یہ امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 14:** جان بوجھ کر قتل کرنے والے کے بارے میں دیت لینے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: مقتول کے ولی کو اختیار ہے اگر چاہے تو قصاص لے لے اگر چاہے تو دیت لے لے۔ اگر چہ قاتل راضی نہ بھی ہو۔ یہ سعید بن مسیب، عطاء، حسن سے مروی ہے اس کو اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے۔ لیث، امام اوزاعی، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابو ثور نے بھی یہی فرمایا ہے۔ ان کی حجت ابوشریع کی حدیث ہے اور جو اس کے ہم معنی احادیث ہیں یہ اختلاف کی جگہ میں نص ہے۔ نیز نظر کے طریق سے اس کی رضا کے بغیر اس پر دیت لازم ہے کیونکہ اس پر فرض، نفس کا احیاء تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ (النساء: 29) نہ قتل کرو اپنے نفسوں کو اور ارشاد ہے: فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ - یعنی جو اپنا خون ترک کر دے۔ (یہ تاویل کے مطابق) اور اس سے دیت لینے میں راضی ہو۔ فَأَتْبَاعُكُمْ بِالْمَعْرُوفِ یعنی جس نے دیت لینی ہے وہ معروف طریقہ سے مطالبہ کرے اور قاتل پر ضروری ہے کہ وہ عمدہ طریقہ سے ادا کرے۔ مال منول نہ کرے اور ادائیگی کے وقت سے تاخیر نہ کرے۔ ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ - ہم سے پہلے لوگوں پر قصاص کے علاوہ کچھ فرض نہ تھا اس امت پر دیت کے ساتھ فضل فرمایا جبکہ مقتول کا وارث راضی ہو۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: مقتول کے ولی کے لئے صرف قصاص ہے وہ دیت نہیں لے گا مگر جب قاتل راضی ہو۔ ابن القاسم نے مالک سے یہ روایت کیا

۱۔ سنن ابی داؤد، باب دلی العدید برضی بالمدیة، حدیث نمبر 3905، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ ان کا مشہور قول یہی ہے۔ ثوری اور کوفیوں نے یہی کہا ہے۔ اور انہوں نے حضرت انس کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جو ربیع کے واقعہ کے متعلق ہے جب اس نے ایک عورت کا دانت توڑ دیا تھا۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے قصاص کا فیصلہ فرمایا اور فرمایا: کتاب اللہ کا فیصلہ قصاص ہے، کتاب اللہ کا فیصلہ قصاص ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو اختیار نہیں دیا جس پر جنایت کی گئی تھی کہ وہ قصاص لے یا دیت لے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے عمد (جان بوجھ کر جنایت کرنے) میں قصاص ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے ابو شریح کی مذکور حدیث کی وجہ سے۔ ربیع نے امام شافعی سے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے ابو حنیفہ بن سہاک بن فضل شہابی نے بتایا، فرمایا: اور مجھے ابن ابی ذئب نے بتایا، انہوں نے مقبری سے انہوں نے ابو شریح کعبی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے سال فرمایا: جس کا کوئی آدمی قتل ہو جائے اسے دو چیزوں میں اختیار ہے اگر پسند کرے تو دیت لے، اگر پسند کرے تو اس کے لئے قصاص (بدلہ) ہے۔ ابو حنیفہ نے کہا: میں نے ابن ابی ذئب سے کہا۔ اے ابو الحارث! تو اس پر عمل کرتا ہے۔ اس نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور بلند آواز سے مجھے کہا: میں تجھے رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تو کہتا ہے: تو اس پر عمل کرتا ہے۔ ہاں میں اس پر عمل کرتا ہوں۔ یہ مجھ پر اور سننے والے پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو لوگوں سے منتخب فرمایا اور آپ کے ذریعے ہدایت دی اور آپ کے ہاتھوں پر ہدایت دی اور لوگوں کے لئے وہ پسند کیا جو آپ ﷺ کے لئے پسند کیا اور آپ کی زبان پر پسند کیا۔ مخلوق پر لازم ہے کہ وہ آپ ﷺ کی خوشی سے یا ذلیل ہو کر اطاعت کریں۔ مسلمان کے لئے اس سے خروج کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ابو حنیفہ نے کہا: ابن ابی ذئب مجھ سے خاموش نہ ہوئے حتیٰ کہ میں نے خواہش کی کہ وہ خاموش ہو جائیں۔

**مسئلہ نمبر 15:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعُ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَّ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ،

مَنْ اور عَفِيَ کی تاویلات میں پانچ اقوال ہیں:

۱- مَنْ سے مراد قاتل ہے اور عَفِيَ، عافیا کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے اور وہ مقتول کا ولی ہے۔ الاخ سے مراد مقتول ہے اور شئی سے مراد وہ خون ہے جو اس کو معاف کیا گیا ہے اور دیت لینے کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، قتادہ، مجاہد اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے اور العفو اس قول میں اپنے معنی پر ہے اور وہ ہے: ترک کرنا۔ معنی یہ ہے کہ قاتل کو جب مقتول کا ولی خون معاف کر دے اور قصاص ساقط کر دے تو وہ دیت لے، وہ معروف طریقہ سے مطالبہ کرے اور قاتل اچھے طریقہ سے دیت ادا کرے۔

۲- یہ امام مالک کا قول ہے۔ مَنْ سے مراد ولی ہے اور عَفِيَ کا معنی آسانی کرنا ہے یہ العفو کے معنی میں نہیں ہے اور الاخ سے مراد قاتل ہے اور شئی سے مراد دیت ہے یعنی ولی جب قصاص معاف کر کے دیت لینے کی طرف مائل ہو تو قاتل کو اختیار ہے کہ وہ اسے دیت دے یا اپنا آپ حوالے کر دے۔ ایک مرتبہ اس پر آسانی کی گئی ہے اور ایک مرتبہ آسانی نہیں کی گئی۔ امام مالک کے علاوہ علماء فرماتے ہیں: جب اولیاء دیت پر راضی ہوں تو قاتل کو کوئی اختیار نہیں بلکہ اس پر دیت لازم ہے۔ امام مالک سے یہ قول



بھی مروی ہے ان کے اصحاب میں سے اکثر نے اس کو ترجیح دی ہے (1)۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: عُنْفٍ کا معنی بُذِلَ ہے، خرچ کیا گیا اور العفو کا لغوی معنی : بذل ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خذ العفو وھو لھو آسان ہو۔ ابوالاسود الدؤلی نے کہا:

خذي العفو مني تستدیی مودق

تو مجھ سے جو آسان ہے وہ لے تو میری محبت کو ہمیشہ پائے گی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نماز کا پہلا وقت اللہ کی رضا ہے اور اس کا آخری وقت اللہ کی معافی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر گواہی دی۔ گویا فرمایا: دیت میں سے جو خرچ کیا گیا ہو وہ اسے قبول کرے اور معروف طریقہ سے مطالبہ کرے اور ایک قوم نے کہا: قاتل اسے اچھے طریقہ سے ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے مال لینے کو کہا جب قاتل کی جہت سے یہ آسان ہو اور بتایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے جیسا کہ سورہ مائدہ میں قصاص کے ذکر کے بعد فرمایا: فَمَنْ تَصَدَّقْ بِهِ فَهُوَ كَفَّارًا لَهُ (المائدہ: 45) پس عفو اور صدقہ کی رحمت کی طرف بلایا۔ اسی طرح اس آیت میں دیت کے قبول کرنے کی طرف راہنمائی فرمائی جبکہ مجرم دیت ادا کرے۔ پھر ولی کو عمدہ طریقہ سے مطالبہ کرنے اور قاتل کو اچھے طریقہ سے ادا کرنے کا حکم دیا۔

ایک قوم نے کہا: یہ الفاظ ان کے بارے میں ہیں جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور جن کے درمیان برابری ہے ان کے درمیان دیتوں کو ساقط کر دیا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ ان دیات میں سے کسی اعتبار سے دونوں طائفوں میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت ہو۔ اس صورت میں عُنْفٍ بمعنی فَضْل (فضیلت دیا گیا) ہوگا۔

سفیان بن حسین بن شوعب نے شعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: عربوں کے دو قبیلوں کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ ایک قبیلہ سے کچھ لوگ قتل ہوئے اور دوسرے قبیلہ سے بھی کچھ لوگ قتل ہوئے۔ ایک قبیلہ والوں نے کہا: ہم راضی نہ ہوں گے حتیٰ کہ عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کیا جائے گا اور مرد کے بدلے عورت کو قتل کیا جائے گا۔ پس وہ اپنا معاملہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سب مقتول برابر ہیں۔ پس انہوں نے دیات پر صلح کی۔ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر زیادتی دی گئی۔ کتب سے فَمَنْ عُنْفٍ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ تک یہی مراد ہے یعنی جس کی اپنے بھائی پر دیت زائد ہو تو وہ اسے معروف طریقہ سے ادا کرے۔ شعبی نے آیت کے نزول کے سبب کے بارے میں بتایا اور سفیان نے یہاں عفو کا معنی زیادہ ذکر کیا ہے اور لفظ اس معنی کا احتمال رکھتا ہے۔

پانچویں تاویل۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حسن کا قول ہے۔ مرد اور عورت کی دیت اور آزاد اور غلام کی دیت میں فرق ہے یعنی جس کے لئے دیت زیادہ ہو وہ معروف طریقہ سے طلب کرے۔ اس قول میں بھی عُنْفٍ بمعنی فَضْل ہے۔ (2)

**مسئلہ نمبر 16:** اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیت کا مطالبہ کرنے والے کو حسن تقاضا پر ابھارا ہے اور ادا کرنے والے کو بھی عمدہ طریقہ سے ادا کرنے پر ابھارا ہے (3)۔ کیا یہ وجوب پر ہے یا استحباب پر؟ رفع کی قراءت وجوب پر دلالت کرتی ہے کیونکہ معنی ہے فعلیہ اتباع المعروف یعنی اس پر واجب ہے کہ وہ عمدہ طریقہ سے مطالبہ کرے۔ نحاس نے کہا فَمَنْ

عُفِيَ لَهُ شَرْطٌ هُوَ اور فَاتِبَاعٌ جزا ہے اس کو مبتدا کی حیثیت سے رفع دیا گیا ہے۔ تقدیر اس طرح ہے فعلیہ اتباع بالمعروف اور غیر قرآن میں فاتبعاً واداء بھی جائز ہے یعنی دونوں کو مصدر بنایا جائے۔ ابن عطیہ نے کہا (1): ابراہیم بن ابی عبیدہ نے فاتبعاً نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ رفع، واجبات کے لئے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فامساک بمعروف۔ رہا مندوب تو وہ منصوب آتا ہے جیسے فضرَبَ الرقاب۔

**مسئلہ نمبر 17:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ اٰلِ تُوْرَاتِ کے لئے صرف قتل کرنا تھا ان کے لئے اور کوئی صورت نہ تھی اور اہل انجیل کے لئے عفو تھا ان کے لئے قصاص اور دیت نہ تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے تخفیف فرمائی پس جو چاہے قتل کرے اور جو چاہے دیت لے لے اور جو چاہے معاف کر دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاِنَّهٗ يَشْرُطُ اور جواب ہے یعنی دیت لینے کے بعد اور خون معاف کرنے کے بعد زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ حسن نے کہا: زمانہ جاہلیت میں جب کوئی شخص کسی کو قتل کرتا تو وہ اپنی قوم کی طرف بھاگ جاتا پھر اس کی قوم دیت کے ساتھ صلح کرتی اور مقتول کا دلی کہتا میں دیت قبول کرتا ہوں حتیٰ کہ قاتل امن میں ہو جاتا اور وہ باہر نکلتا تو اسے قتل کر دیتا اور پھر دیت انہیں واپس کر دی جاتی۔

علماء کا اختلاف ہے کہ جس نے دیت لینے کے بعد قاتل کو قتل کیا۔ ایک جماعت نے کہا جن میں امام مالک اور امام شافعی بھی ہیں: وہ ابتداء قتل کرنے والے کی طرح ہے۔ اگر اس کا دلی چاہے تو اسے قتل کر دے اگر چاہے تو معاف کر دے اور آخرت میں اس کے لئے عذاب ہوگا۔ حضرات قتادہ، عکرمہ اور سدی نے کہا: اس کا عذاب یہ ہے کہ اسے یقیناً قتل کیا جائے گا۔ حاکم ولی کو معاف کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ابو داؤد نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے جس سے دیت لینے کے بعد قتل کیا اس کا مال زیادہ نہ ہو۔ حسن نے کہا: اس کا عذاب یہ ہے کہ صرف دیت لوٹائی جائے گی اور قتل کا گناہ آخرت کے عذاب تک اس پر رہے گا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے کہا: اس کا معاملہ امام کے سپرد ہے جو دیکھے وہ کرے۔ سنن دارقطنی میں ابو شریح خزاعی سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس کو خون کی مصیبت پہنچائی گئی یا لنگڑا کر دیا گیا تو اسے تین باتوں میں اختیار ہے اگر وہ چوتھی کا ارادہ کرے تو اس کے ہاتھوں کو پکڑ لو۔ وہ قصاص لے۔ یا معاف کر دے یا دیت لے۔ اگر ان چیزوں میں سے جو قبول کر لی پھر اس کے بعد اس نے تجاوز کیا تو اس کے لئے دوزخ کا عذاب ہے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّٰۤاُولِیْ الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٥٠﴾

”اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے علمندو! تاکہ تم (قتل کرنے سے) پرہیز کرنے لگو۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ یہ بلغ مگر مختصر کلام ہے۔ اس کا معنی ہے: بعض بعض کو

قتل نہ کریں۔ یہ سفیان نے سدی سے انہوں نے ابومالک سے روایت کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قصاص جب قائم کیا جائے گا اور حکم قاتل میں ثابت ہو جائے گا تو وہ دوسرے کے قتل کے ارادہ سے باز رہے گا اس خوف سے کہ اس سے قصاص لیا جائے گا۔ پس اس سے وہ دونوں زندہ رہیں گے۔ عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص دوسرے کو قتل کرتا تھا تو دونوں کے قبیلے گرم ہو جاتے اور آپس میں جنگ کرتے اور یہ چیز بہت زیادہ لوگوں کے قتل کا باعث بنتی جب اللہ تعالیٰ نے قصاص مشروع فرمایا تو تمام اس پر قناعت کرنے والے ہو گئے اور جنگ ترک کر دی، پس ان کے لئے اس میں زندگی ہے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 2:** ائمہ فتویٰ کا اتفاق ہے کہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ سلطان کے بغیر خود اپنے حق میں قصاص لے۔ لوگوں کے لئے ایک دوسرے سے قصاص لینا جائز نہیں۔ یہ کام سلطان کے سپرد ہے یا اس کے سپرد ہے جس کو سلطان مقرر کرے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سلطان بنایا تاکہ وہ لوگوں کے ہاتھوں کو روکے۔

**مسئلہ نمبر 3:** علماء کا اجماع ہے کہ سلطان سے بھی قصاص لیا جائے گا اگر وہ اپنی رعیت میں سے کسی پر تعدی کرے گا۔ کیونکہ سلطان بھی ان میں سے ایک ہے، اسے لوگوں کی دیکھ بھال کی فضیلت ہے جیسے وصی اور وکیل ہوتا ہے۔ یہ چیز قصاص سے مانع نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام میں حاکم اور عام لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **عَلَيْكُمْ الْقَصَاصُ فِي الْقَتْلِ** (البقرہ: 178) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ آپ نے اس شخص سے کہا جس نے شکایت کی تھی کہ عامل نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا ہے، میں تیرا اس سے قصاص لوں گا اگر تو سچا ہوگا۔ نسائی نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ کوئی چیز تقسیم فرما رہے تھے۔ ایک شخص آپ کے اوپر جھکا تو رسول اللہ ﷺ نے کھجور کی اس چھڑی سے چوک دی جو آپ کے پاس تھی، وہ شخص چیخا، رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا: ادھر آ اور اپنا بدلہ لے لے۔ اس شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے معاف کیا۔ ابوداؤد طیالسی نے ابوفراس سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر بن خطاب نے خطبہ دیا اور کہا: خبردار! امیر جس پر ظلم کرے وہ اپنا مقدمہ میرے پاس لے آئے تو میں اس کا اس امیر سے قصاص لوں گا۔ حضرت عمرو بن عامر کھڑے ہوئے اور کہا: اے امیر المؤمنین! اگر ہم میں سے کوئی اپنی رعیت میں سے کسی کو تادیب کرے تو آپ اس سے قصاص لیں گے؟ حضرت عمر نے کہا: میں اس سے قصاص کیسے نہیں لوں گا؟ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ اپنے نفس سے لوگوں کو قصاص لیتے دیتے۔ ابوداؤد سجستانی کے لفظ یہ ہیں، فرمایا: ہمیں حضرت عمر بن خطاب نے خطاب فرمایا اور فرمایا: میں نے اپنے عمال اس لئے نہیں بھیجے کہ وہ تمہارے چمڑوں پر ضربیں لگائیں اور نہ اس لئے بھیجے کہ وہ تم سے تمہارے اموال لیں۔ جو کسی کے ساتھ ایسا کرے وہ اپنا مقدمہ میرے پاس لے آئے میں اس سے قصاص لوں گا۔ اس کے ہم معنی حدیث ذکر کی۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ** اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں مراد ہے تم قتل سے بچ جاؤ اور قصاص سے سلامت رہو پھر یہ تقویٰ کی دوسری اقسام کی طرف داعی ہوگا۔ اللہ اطاعت پر اطاعت کے ساتھ ثواب دیتا



ہے۔ ابوالجوزاء اوس بن عبداللہ الربیع نے ولکم فی القصص حیاء پڑھا ہے (1)۔ نحاس نے کہا: ابوالجوزاء کی قراءت شاذہ ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ بھی احتمال ہے کہ یہ قصاص کی طرح مصدر ہو (2)۔ بعض نے فرمایا: القصص سے مراد قرآن ہے یعنی تمہارے لئے کتاب اللہ میں حیات ہے جس میں قصص کو بیان کیا گیا ہے۔ حیاء سے مراد نجات ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا<sup>۱</sup> الْوَصِيَّةَ لِلْوَالِدَيْنِ وَ  
الْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ<sup>۲</sup> حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ<sup>۳</sup>

”فرض کیا گیا ہے تم پر جب قریب آجائے تم میں سے کسی کو موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال کہ وصیت کرے اپنے ماں باپ کے لئے اور قریبی رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ۔ ایسا کرنا ضروری ہے پرہیزگاروں پر۔“  
اس میں اکیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ آیت وصیت ہے۔ قرآن میں اور وصیت کا کہیں ذکر نہیں ہے مگر اس آیت میں اور سورہ النساء میں من بعد وصیة اور سورہ مائدہ میں حین الوصیة اور جو سورہ بقرہ میں ہے وہ اتم اور اکمل ہے یہ فرائض اور موارث کے نزول سے پہلے نازل ہوئی۔ جیسا کہ آگے بیان آئے گا۔ کلام میں واو عطف کی تقدیر ہے۔ یعنی و کتب علیکم۔ جب کلام طویل ہوگئی تو واو ساقط کردی گئی اور اس کی مثل بعض اقوال میں ہے: لَا يَصْلُهَا إِلَّا الْأَشَقُّ<sup>۴</sup> الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّى<sup>۵</sup> (اللیل)۔ یعنی والذی۔ یہاں بھی واو کو حذف کیا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب ذکر کیا کہ مقتول کے ولی کے لئے قصاص لینا ہے پس جس سے قصاص لیا جانا ہے وہ قصاص اس کی موت کا سبب ہے گویا موت اس پر حاضر ہے اور یہ وصیت کا وقت ہے اس آیت کا تعلق ما قبل آیت سے ہے اسی وجہ سے واو عطف ساقط ہوگئی ہے۔ کُتِبَ کا معنی فرض اور اثبت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ حضور الموت۔ سے مراد موت کے اسباب کا آنا ہے اور جب سبب موجود ہو تو عرب اسے مسبب سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

يا ايها الراكب المزجي مطيته      سائل بني اسد ما هذه الصوت  
و قل لهم بادروا بالعدر والتسوا      قولا يبرئكم ان انا الموت  
اے سوار! جو اپنی سواری کو آہستہ آہستہ چلانے والا ہے بنی اسد سے پوچھ یہ آواز کیسی ہے۔ اور انہیں کہو کہ عذر پیش کرنے میں جلدی کرو اور کوئی ایسی بات تلاش کرو جو تمہیں بری کر دے کہ میں (تمہارے لئے) موت بنوں۔  
عشرہ نے کہا:

دان الموت طوع يدي اذا ما      وصلت بنانها بالهندوان  
موت میرے ہاتھوں کی خوشی ہے جب ان کے پورے ہندوان تک پہنچ جائیں۔  
جریر نے فرزدق کی ہجو میں کہا:

انا الموت الذی حدثت عنه فلیس لہارب منی نجا

وہ موت جس کے متعلق میں نے بتایا، مجھ سے بھاگنے والے کے لئے نجات نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اگر کہا جائے کہ کُتِبَ فرمایا، اور۔ کُتِبَ نہیں فرمایا، حالانکہ وصیت مؤنث ہے۔ کہا جائے گا کہ یہاں وصیت سے مراد الایصاء ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ ہے اور فاصل تاء تانیث کے عوض کی طرح ہے۔ عرب کہتے ہیں: حضر القاضي الیوم امراًؑ یہاں بھی فاصلہ کی وجہ سے فعل مذکر اور فاعل مؤنث ہے۔ سیبویہ نے حکایت کیا ہے: قام امراًؑ۔ لیکن اس ”کتب“ فعل کے ذکر لانے کا حسن، حائل کے طول کے ساتھ ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ تَرَكَ خَيْرًاؑ، اِنْ شرط ہے اس کے جواب میں ابوالحسن اور اخفش کے دو قول ہیں: اخفش نے کہا: تقدیر فالوصیۃ ہے پھر فاء کو حذف کیا گیا۔ جیسے شاعر نے کہا:

من یفعل الحسنات اللہ یشکرہا والشا بالشا عند اللہ مثلاً

جو نیکیاں کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدر دانی فرماتا ہے اور اللہ کے نزدیک شر کے بدلے شر برابر ہے۔

دوسرا جواب: ماضی کا جواب اس سے پہلے اور اس کے بعد ہونا جائز ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: الوصیۃ للوالدین والاقربین ان ترک خیراً۔ اگر تو فاء کو مقدر مانے کا تو الوصیۃ کو رفع ابتدا کی وجہ سے ہوگا۔ اگر فاء کو مقدر نہیں مانے کا تو اس کو ابتداء کی وجہ سے رفع دینا جائز ہے اور نائب الفاعل کی حیثیت سے رفع دینا بھی جائز ہے۔ یعنی کتب علیکم الوصیۃ۔ جمہور نحو یوں کے نزدیک الوصیۃ کا اذا میں عمل کرنا صحیح نہیں کیونکہ وہ مصدر کے صلہ کے حکم میں ہے جو الوصیۃ ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اس کا اپنے سے پہلے میں عمل کرنا جائز نہیں اور یہ جائز ہے کہ اذا میں عامل کتب ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایجاب کا تمہاری طرف متوجہ ہونا اور کتاب کے مقتضی کا متوجہ ہونا ہے جب موت حاضر ہو۔ ایجاب کی توجہ کو کتب سے تعبیر فرمایا تاکہ اس معنی کی طرف منظم ہو جائے کہ یہ حکم ازل میں لکھا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اذا میں عامل الایصاء مقدر ہو جو وصیت پر دلالت کر رہا ہو۔ معنی ہوگا: کتب علیکم الایصاء اذا۔ (1)

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَيْرٌ اس آیت میں خیر سے مراد مال ہے اور اس کی مقدار میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مال کثیر ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ انہوں نے سات سو دینار میں بھی فرمایا کہ یہ قلیل ہے۔ قتادہ نے حسن سے روایت کیا ہے الخیر سے مراد ہزار دینار اور اس سے زائد مال ہے۔ شعبی نے کہا: پانچ سو دینار سے ہزار تک ہے (2)۔ الوصیۃ ہر اس چیز سے عبارت ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور زندگی میں اور موت کے بعد اس کا خیال کیا جاتا ہے۔ عرف نے اس کو اس کے ساتھ خاص کر دیا ہے جس کے کرنے کا عہد کیا جاتا ہے اور مرنے کے بعد اس کو نافذ کیا جاتا ہے۔ وصیۃ کی جمع وصایا ہے جیسے قضیۃ کی جمع قضایا ہے۔ الوصی وصیت کرنے والا ہوتا ہے اور جس کو وصیت کی جاتی ہے اس کی اصل وَصَى سے ہے۔

تواصي النبت تواصياً، جب کھیتی متصل ہو۔ ارض و اصیۃ، جس کی کھیتی متصل ہو۔ اوصیت له بشیء و اوصیت الیہ، جب تو کسی کو اپنا وصی مقرر کرے۔ اس کا اسم الوصایۃ اور الوصایۃ ہے یعنی واو کے کسرہ اور فتح کے ساتھ۔ اوصیتہ و وصیتہ توصیۃ ہم معنی ہیں، اسم، الوصایۃ ہے۔ تواصي القوم اوصی بعضهم بعضاً۔ بعض نے بعض کو وصیت کی۔ حدیث پاک میں ہے: استوصوا بالنساء خیراً فانھن عوان عندکم (1)۔ عورتوں کے متعلق خیر کی وصیت قبول کرو وہ تمہارے پاس قیدی ہیں۔ و وصیت الشئ بكذا جب تو کسی چیز کو دوسری چیز سے ملا دے۔

**مسئلہ نمبر 5:** علماء کا وصیت کے وجوب میں اختلاف ہے جو مال چھوڑ جائے اور اس پر اجماع ہے کہ جس پر ودیعتیں ہوں اور جس پر قرض ہو اس کا وصیت کرنا واجب ہے۔ اکثر علماء فرماتے ہیں: وصیت اس پر واجب نہیں ہے جس پر ودیعت اور قرض وغیرہ نہ ہوں، یہ امام مالک، امام شافعی اور ثوری کا قول ہے خواہ وصیت کرنے والا امیر ہو یا فقیر ہو۔ ایک طائفہ نے کہا: ظاہر قرآن کے مطابق وصیت واجب ہے، یہ زہری اور ابو جہل کا قول ہے (2) مال تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ ابو ثور نے کہا: وصیت واجب نہیں ہے مگر اس پر جس پر قرض ہو یا اس کے پاس کسی قوم کا مال ہو۔ اس پر واجب ہے کہ وہ اپنی وصیت کو لکھے اور جو کچھ اس پر کسی کا حق ہے اس کے متعلق بتائے۔ رہا وہ جس پر نہ قرض ہے اور نہ ودیعت ہے، اس پر وصیت کرنا واجب نہیں مگر وہ چاہے تو۔ ابن منذر نے کہا: یہ بہتر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امانات کی ادائیگی فرض کی ہے اور جس پر کوئی حق نہیں ہے اور کوئی امانت نہیں ہے اس پر وصیت کرنا واجب نہیں ہے۔ پہلے نظریہ کے حاملین نے اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جو ائمہ نے حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کا حق نہیں کہ اس کے لئے کوئی چیز ہو جس کے متعلق وہ وصیت کرنا چاہتا ہو وہ دو راتیں گزارے مگر اس کی وصیت لکھی ہوئی ہو۔ ایک روایت میں ہے، وہ تین راتیں گزارے۔ اس کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے مجھ پر ایک رات بھی نہیں گزری مگر میرے پاس میری وصیت (لکھی ہوئی) ہے اور جن علماء نے وصیت کو واجب نہیں کہا انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ اگر وصیت واجب ہوتی تو اس کو وصیت کرنے والے کے ارادہ پر نہ چھوڑا جاتا، اس پر ہر حال میں وصیت کرنا لازم ہوتا۔ پھر اگر تسلیم کیا جائے کہ اس کا ظاہر وجوب ہے تو وجوب کا قول اسے رد کرتا ہے۔ یہ اس کے متعلق ہے جس پر لوگوں کے حقوق ہو ان کے ضیاع کا خوف ہوگا جیسا کہ ابو ثور نے کہا۔ اسی طرح جس کے لئے لوگوں کے پاس حقوق ہوں گے ورثہ پر اس کے تلف ہونے کا خوف ہوگا، اس صورت میں اس پر وصیت کرنا واجب ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کُتِبَ عَلَیْکُمْ، کُتِبَ بمعنی فرض ہے تو یہ وصیت کے وجوب کی دلیل ہے۔ اس کے متعلق جواب پہلے گزر چکا ہے۔ اس کا معنی ہے: جب تم وصیت کا ارادہ کرو۔ نخعی نے کہا: رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا اور وصیت نہیں کی اور حضرت ابو بکر نے وصیت کی۔ اگر وصیت کرے تو یہ اچھا ہے اگر وصیت نہ کرے تو اس پر کچھ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جس مال سے وصیت کرنی ہے اس کی مقدار بیان نہیں کی۔ فرمایا: اِنْ



تَرَكَ خَيْرًا<sup>۱۲</sup>، الخیر سے مراد مال ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تَشْفَقُوا مِنْ خَيْرٍ (البقرہ: 272) وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ (العدایات: 8) ان آیات میں خیر سے مراد مال ہے۔ اس کی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے پانچویں حصہ کی وصیت کی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مسلمانوں کے مال غنیمت سے خمس (پانچویں حصہ) ہے۔

معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے چوتھائی کی وصیت کی، یہ بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے (1) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: میرے نزدیک خمس کی وصیت کرنا چوتھائی وصیت کرنے سے زیادہ محبوب ہے اور چوتھائی وصیت کرنا ثلث وصیت کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔

علماء کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ جس کا مال تھوڑا ہو اور اس کے ورثاء ہوں تو اس کے لئے وصیت نہ کرنا بہتر ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ابن ابی ملیکہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ ابن ابی ملیکہ نے حضرت عائشہ سے کہا: میں وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عائشہ نے کہا: تمہارا کتنا مال ہے؟ اس نے کہا: تین ہزار۔ حضرت عائشہ نے پوچھا: تمہارے عیال کتنے ہیں؟ اس نے کہا: چار۔ حضرت عائشہ نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِنْ تَرَكَ خَيْرًا<sup>۱۳</sup> اور یہ تمہارا مال تھوڑا ہے۔ یہ اپنے عیال کے لئے چھوڑ دے کیونکہ تیرے لئے یہی افضل ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** جمہور علماء کا خیال ہے کہ کسی کے لئے ثلث سے زیادہ کی وصیت کرنا جائز نہیں مگر امام ابو حنیفہ اور اس کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ موصی اگر ورثاء نہ چھوڑے تو اس کے لئے پورے مال کی وصیت کرنا جائز ہے۔ احناف فرماتے ہیں: وصیت میں ثلث پر اکتفا اس لئے ہے کہ ورثاء کو اغنیاء چھوڑے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تیرا اپنے ورثاء کو غنی چھوڑنا ان کو فقیر چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے (2)۔ اور جس کا وارث نہ ہو وہ اس حدیث میں مراد نہیں ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہے۔ ابو عبیدہ اور مسروق کا بھی یہی قول ہے۔ اسحاق اور امام مالک کا بھی ایک قول یہی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے۔ اختلاف کا سبب ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے۔ بیت المال میں اختلاف ہے کہ کیا وہ وارث ہے یا حافظ ہے اس مال کا جو اس میں رکھا جائے۔ اس میں دو قول ہیں۔

**مسئلہ نمبر 8:** علماء کا اجماع ہے کہ جو فوت ہو جائے اور اس کے ورثاء ہوں تو اس کے لئے تمام مال کی وصیت کرنا جائز نہیں۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے اپنے بیٹے عبد اللہ کو فرمایا: جب ان کی موت کا وقت قریب آیا کہ میں وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عبد اللہ نے کہا: آپ وصیت فرمائیں، آپ کا مال میرے مال میں ہے۔ حضرت عمرو نے کاتب کو بلایا اور اسے وصیت لکھوائی۔ حضرت عبد اللہ نے کہا میں نے انہیں کہا میں نہیں دیکھتا ہوں مگر یہ کہ آپ نے میرے اور اپنے مال کی وصیت کر دی ہے اگر میں اپنے بھائیوں کو بلاؤں تو ان سے یہ حلال کروالوں۔

1۔ صحیح بخاری، الوصیۃ بالثلث، حدیث نمبر 2538، فیاء القرآن، ہلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب قول النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اللھم امض لاصحاب ہجرتھم وورثتھم لمن مات حکمہ، حدیث 3843، فیاء القرآن، ہلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 9:** علماء کا اجماع ہے کہ انسان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی وصیت میں تبدیلی کرے اور اس میں سے جتنا چاہے رجوع کرے مگر مدبر غلام کے بارے میں اختلاف ہے۔

امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ وصیت کرنے والا حالت صحت میں یا حالت مرض میں ایسی وصیت کرے جس میں غلاموں میں سے کسی غلام کو آزاد کرنا ہو یا اس کے علاوہ کوئی امر ہو تو جو چاہے اس میں تبدیلی کرے اور جو چاہے اس میں عمل کرے حتیٰ کہ وہ فوت ہو جائے۔ اگر وہ اس وصیت کو ختم کرنا چاہے تو ایسا کر سکتا ہے مگر یہ کہ اس کے غلام کو مدبر بنایا جائے اگر غلام کو مدبر بنائے تو اس میں اس کو تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کا حق نہیں کہ اس کے لئے کوئی چیز ہو جس میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو وہ دو راتیں گزارے مگر یہ کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو۔ ابو الفرج مالکی نے کہا: قیاس میں مدبر بھی ایک مہینہ تک آزاد کئے جانے والے غلام کی طرح ہے موت لامحالہ آنے والی ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ وہ مدت تک آزاد کرنے اور عتق کی قسم جو ایک مدت تک اس نے اٹھائی ہے اس میں رجوع نہیں کر سکتا اسی طرح مدبر بھی ہے۔ امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے امام شافعی، احمد اور اسحاق نے کہا: یہ وصیت ہے اور یہ بھی ثلث میں ہوگا جس طرح دوسرے وصایا کا حکم ہے اور مدبرہ (لونڈی) سے ان کا وطی کی اجازت دینا ان کے مدبر کو ایک مدت تک عتق پر قیاس کرنے کو توڑتا ہے..... حالانکہ یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدبر غلام کو فروخت کیا (1)۔ حضرت عائشہ بنت جحش نے اپنی لونڈی کو مدبرہ بنایا پھر اسے فروخت کیا یہ تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: انسان اپنی وصیت میں جو چاہے تبدیلی کر سکتا ہے مگر آزادی میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شعبی، ابن سیرین، ابن شبرمہ اور نخعی نے کہا ہے۔ یہ سفیان ثوری کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 10:** اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جو اپنے غلام کو کہتا ہے: تو میرے مرنے کے بعد آزاد ہے اور وصیت کا ارادہ کیا تو امام مالک کے نزدیک اس کو رجوع کا حق ہے اور اگر کہا: فلاں میری موت کے بعد مدبر ہے تو اس میں اس کے رجوع کا حق نہیں ہے اور اگر پہلے قول سے تدبیر کا ارادہ کیا ہوگا تو اسے اکثر اصحاب مالک کے نزدیک رجوع کا حق نہ ہوگا۔ امام شافعی، احمد، اسحاق کے نزدیک یہ وصیت ہے کیونکہ یہ ثلث میں ہے اور جو ثلث میں ہو وہ وصیت ہے مگر امام شافعی نے کہا: مدبر میں رجوع نہیں مگر یہ کہ اسے فروخت کرے یا ہبہ کے ساتھ اپنی ملکیت سے نکال دے۔ اور صرف یہ کہنا (میں نے رجوع کیا) رجوع نہیں ہے اور اگر مدبر کو اپنی ملکیت سے نہ نکالا حتیٰ کہ وہ فوت ہو گیا تو اس کے مرنے کے ساتھ غلام آزاد ہو جائے گا۔ امام شافعی کا پہلا قول یہ ہے کہ وہ مدبر میں اسی طرح رجوع کر سکتا ہے جس طرح وصیت میں رجوع کر سکتا ہے۔ مزنی نے اس کو اختیار فرمایا۔ انہوں نے علماء کی اس بات کے اجماع پر قیاس کیا ہے کہ جو عتق کی وصیت کرے وہ رجوع کر سکتا ہے۔ ابو ثور نے کہا: اگر اس نے کہا: میں نے اپنے مدبر میں رجوع کیا تو اس کی تدبیر باطل ہوگئی اگر وہ مر گیا تو غلام آزاد نہ ہوگا۔ ابن القاسم اور اشہب نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے کہا: میرا غلام میرے مرنے کے بعد آزاد ہے اور اس نے اس قول سے وصیت اور

تدبیر کا ارادہ نہیں کیا۔ ابن القاسم نے کہا: یہ وصیت ہے، اشہب نے کہا: وہ مدبر ہے اگرچہ اس نے وصیت کا ارادہ نہ کیا ہو۔

**مسئلہ نمبر 11:** علماء کا اس آیت کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ منسوخ ہے یا محکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ محکم ہے اس کا ظاہر عموم ہے اور اس کا معنی ان والدین کے بارے میں خاص ہے جو وارث نہیں ہوتے جیسے والدین کافر ہوں اور غلام ہوں اور ان رشتہ داروں کے بارے میں خاص ہے جو وارث نہ ہوں (1)۔ یہ ضحاک، طاؤس اور حسن کا قول ہے۔ طبری نے اس کو اختیار کیا ہے۔ زہری سے مروی ہے کہ وصیت زیادہ اور کم ہر مال میں واجب ہے۔ ابن منذر نے کہا: اہل علم کا اجماع ہے کہ ان والدین کے لئے وصیت ہے جو وارث نہیں ہوتے اور ان قریبی رشتہ داروں کے لئے جو وارث نہیں ہوتے۔ حضرت ابن عباس، حسن اور قتادہ کا قول ہے کہ یہ آیت عامۃ ہے اس کا حکم ایک تھوڑے سے عرصہ کے لئے ثابت رہا پھر جو رشتہ دار آیت فرائض کے ذریعے وارث ہو ان میں سے ہر ایک منسوخ ہو گیا (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: آیت الفرائض نے اس کو مستقل منسوخ نہیں کیا بلکہ ایک دوسرے ضمیمہ کے ساتھ منسوخ ہوئی اور یہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا فرمایا، وارث کے لئے وصیت نہیں (3)۔“

اس حدیث کو حضرت ابو امامہ نے روایت کیا ہے اور اسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ آیت کا نسخ سنت ثابتہ سے ہے نہ کہ ارث سے۔ علماء کے اقوال میں سے صحیح قول کے مطابق اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو ان دونوں آیتوں کو اس طرح جمع کرنا ممکن ہوتا کہ میت سے وصیت کے ذریعے مال حاصل کریں اور اگر وصیت نہ کی ہو تو میراث کے ذریعے حاصل کریں یا جو وصیت کے بعد باقی بچے لیکن اس سے مانع یہ حدیث اور اجماع ہے۔ امام شافعی اور ابو الفرج اگرچہ کتاب کا سنت کے ساتھ نسخ تسلیم نہیں کرتے، لیکن صحیح اس کا جواز ہے اس دلیل کی وجہ سے کہ ہر ایک اللہ کا حکم ہے اور اسی کی طرف سے ہے اگرچہ اسماء میں اختلاف ہے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ ہم کہتے ہیں: اگرچہ یہ خبر ہمیں احاداً پہنچی ہے لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کا اجماع مل گیا ہے کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ پس ظاہر ہوا کہ قریبی وارثوں کے لئے وصیت کا وجوب سنت کے ساتھ منسوخ ہے اور علماء کے اجماع سے اس کو تائید حاصل ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن نے کہا: والدین کے لئے وصیت اس فرض کے ساتھ منسوخ ہے جو سورۃ النساء میں ہے اور ان قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت ثابت ہے جو وارث نہیں ہوتے۔ یہ امام شافعی اور اکثر مالکیوں اور اہل علم کا مذہب ہے۔ بخاری میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: مال بچے کے لئے تھا اور وصیت والدین کے لئے تھی۔ پس اس نے جو پسند کیا اسے منسوخ کر دیا۔ پھر دو عورتوں کے حصہ کی مثل ایک مذکر کے لئے حصہ مقرر کیا اور والدین میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ مقرر کیا اور عورت کے لئے آٹھواں اور چوتھا حصہ مقرر کیا، خاوند کے لئے نصف اور چوتھا حصہ مقرر کیا۔

حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زید نے کہا: یہ ساری آیت منسوخ ہے اور وصیت نہ با باقی ہے۔ امام

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ جامع ترمذی، کتاب الوصایا، باب ما جاء لا وصیۃ لوارث، حدیث نمبر 2046، خطباء القرآن، بلی کیشنز



مالک کا قول اسی طرح ہے۔ نحاس نے یہ شعبی اور نخعی سے ذکر کیا ہے۔ ربیع بن خثیم نے کہا: وصیت نہیں ہے، عروہ بن ثابت نے کہا: میں نے ربیع بن خثیم سے کہا مجھے اپنے مصحف کی وصیت کیجئے۔ ربیع نے اپنی اولاد کی طرف دیکھا اور یہ آیت پڑھی **وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ** (انفال: 75) حضرت ابن عمر نے اسی طرح کیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 12:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَالْأَقْرَبُونَ** یہ اقرب کی جمع ہے ایک قوم نے کہا: اقربین کے لئے وصیت کرنا، اجنبیوں کے لئے وصیت کرنے سے اولیٰ ہے کیونکہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے نص قائم فرمائی ہے۔ حتیٰ کہ ضحاک نے کہا: اگر کسی نے اپنے قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی تو معصیت کی وجہ سے اس کا عمل ختم ہو گیا۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنی ام ولد لونڈیوں کے لئے وصیت کی، ہر ایک کے لئے چار ہزار کی وصیت کی۔ روایت ہے کہ حضرت عائشہ نے اپنی لونڈی کے لئے گھر کے سامان کی وصیت کی۔ حضرت سالم بن عبد اللہ سے اس کی مثل مروی ہے (1)۔ حسن نے کہا: اگر قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی تو وصیت اقربین کے لئے پھیری جائے گی۔ اگر اجنبی کے لئے وصیت ہوگی تو وہ ان کے ساتھ ہوگا۔ قریبی رشتہ داروں کو چھوڑ کر غیروں کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں۔ جب ابو العالیہ فوت ہوئے تو لوگوں نے کہا: اس کے لئے تعجب ہے اس کو ریاح قبیلہ کی ایک عورت نے آزاد کیا تھا اور اس نے اپنے مال کی بنی ہاشم کے لئے وصیت کی۔ شعبی نے کہا: یہ اس کے لئے جائز نہیں تھا۔ نہ کرامت تھی۔ طاؤس نے کہا: اگر قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی ہوگی تو اسے قرابتداروں کی طرف پھیرا جائے گا اور اس کا فعل توڑ دیا جائے گا۔ یہ حضرت جابر بن زید کا قول ہے (2) اس کی مثل حسن سے مروی ہے۔ اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور اس کے اصحاب، امام اوزاعی، امام احمد بن حنبل نے فرمایا: جس نے قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی اور اپنے قرابتداروں کو ترک کر دیا تو اس نے برا کیا اور اس کا فعل جائز ہوگا اور جس کے لئے اس نے وصیت کی ہوگی غنی، فقیر، قریب، بعید، مسلمان، کافر سب کے لئے نافذ ہوگی۔ یہی معنی حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ یہی حضرت ابن عمر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول احسن ہے۔ رہا ابو العالیہ کا فعل، شاید اس نے دیکھا کہ بنی ہاشم اس کے آزاد کرنے والوں سے زیادہ مستحق ہیں، حضرت ابن عباس کی صحبت کی وجہ سے اور حضرت ابن عباس کے تعلیم دینے کی وجہ سے اور اسے دنیا و آخرت میں علماء کے درجہ پر فائز کرنے کی وجہ سے۔ یہ ابو کا گرچہ معنوی ہے حقیقت میں یہی حقیقی ہے۔ اور اس کی آزاد کرنے والی نے دنیا میں اسے احرار کے ساتھ لاحق کیا تھا۔ پس اس نے اپنے عتق سے ثواب کی نیت کی تھی اس کے لئے اس کا ثواب کافی ہے۔

**مسئلہ نمبر 13:** جمہور علماء کا نظریہ ہے کہ مریض پر اس کے مال میں حجر کیا جائے گا اور اہل ظاہر نے اس پر سختی کی اور کہا: اس پر حجر نہیں کیا جائے گا اور یہ صحیح کی طرح ہے۔ حدیث اور معنی جمہور کا رد کرتا ہے۔ حضرت سعد نے فرمایا: حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے میری اس تکلیف میں بیمار پرسی کی جس میں موت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے وہ تکلیف پہنچ چکی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں اور میں مالدار آدمی ہوں اور میری وارث صرف ایک بیٹی ہے۔ کیا

میں اپنے مال کا دوثلث صدقہ کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کی: نصف صدقہ کر دوں؟ فرمایا: نہیں۔ تیسرا حصہ صدقہ کرو اور تیسرا حصہ بھی زیادہ ہے اگر تم اپنے ورثاء کو غنی چھوڑ جاؤ تو یہ ان کے غریب چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

اہل ظاہر نے ثلث سے زیادہ وصیت کرنے سے منع کیا ہے اگرچہ ورثاء جائز بھی قرار دیں اور باقی تمام علماء نے اس کو جائز قرار دیا جب ورثاء جائز قرار دیں۔ یہ صحیح ہے کیونکہ مریض تو ثلث سے زیادہ وصیت کرنے سے، وارث کے حق کی وجہ سے منع کیا گیا ہے جب ورثاء نے اپنا حق خود ساقط کر دیا تو یہ جائز اور صحیح اور یہ ان کی طرف سے ہبہ کی طرح ہے۔ دارقطنی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ہے مگر یہ کہ ورثاء چاہیں۔ حضرت عمرو بن خارجہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وارث کے لئے وصیت نہیں مگر یہ کہ ورثاء اجازت دیں۔

**مسئلہ نمبر 14:** موصی کی زندگی میں وارث کے لئے وصیت کو جائز کرنے والے کے اس کے مرنے کے بعد رجوع میں اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ ان پر جائز ہے، اس میں ان کے لئے رجوع جائز نہیں۔ یہ عطاء بن ابی رباح، طاؤس، حسن، ابن سیرین، ابن ابی لیلیٰ، زہری، ربیعہ اور اوزاعی کا قول ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: اگر وہ چاہیں تو رجوع کر سکتے ہیں۔ یہ حضرت ابن مسعود، شریح، حکم، طاؤس، ثوری، حسن بن صالح، امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور ابو ثور کا قول ہے، ابن منذر نے اس کو پسند کیا ہے۔ امام مالک نے فرق کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب وہ حالت صحت میں اجازت دیں تو ان کے لئے رجوع کرنا جائز ہے اگر وہ اس کی حالت مرض میں اجازت دیں جب اسے مال میں تصرف سے روکا جاتا ہے تو یہ ان کے لئے جائز ہے۔ یہ اسحاق کا قول ہے پہلے مقالہ والوں نے حجت پیش کی ہے کہ منع ورثاء کی وجہ سے تھا، جب وہ جائز قرار دیں تو جائز ہے، علماء کا اتفاق ہے کہ جو وہ ثلث سے زیادہ اجنبی کے لئے وصیت کرے تو ورثاء کی اجازت سے جائز ہے اسی طرح یہاں ہے۔ اور دوسرے قول والوں نے یہ حجت پیش کی ہے کہ انہوں نے اس کی اجازت دی جبکہ اس وقت وہ مالک نہیں تھے۔ اس کی وفات کے بعد وہ مالک ہوں گے۔ کبھی وارث جو پہلے اجازت دینے والا تھا وہ فوت ہو جاتا ہے اور وہ وارث نہیں ہوتا ہے کبھی کوئی اور وارث ہو جاتا ہے کبھی وہ اجازت دیتا ہے جس کا اس مال میں کوئی حق نہیں ہوتا تو اس سے کوئی چیز لازم نہیں ہوتی۔ امام مالک نے اس قول سے حجت پیش کی ہے کہ ایک شخص جب صحیح ہوتا ہے تو وہ اپنے مال کا زیادہ مقدار ہوتا ہے جو چاہے اس میں تصرف کرے۔ جب انہوں نے اس کو اس کی حالت صحت میں اجازت دی تو انہوں نے ایسی چیز کو چھوڑا جو ان کے لئے واجب نہ تھی۔ اور جب انہوں نے اس کی حالت مرض میں اجازت دی تو انہوں نے ایسی چیز کو ترک کیا جو ان کے لئے ثابت تھی۔ پس ان کے لئے اس میں رجوع نہیں جب وہ کر چکا ہے کیونکہ وہ فوت ہو چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 15:** اگر مریض اس کو نافذ نہ کرے تو وارث کے لئے اس میں رجوع ہے کیونکہ سفید کے ساتھ فوت نہ ہوا۔ یہ ابہری کا قول ہے۔ ابن منذر نے اسحاق بن راہویہ سے روایت کیا ہے کہ اس مسئلہ میں امام مالک کا قول سنت کے زیادہ مشابہ ہے۔ ابن منذر نے کہا: امام مالک، ثوری، کوفیوں، امام شافعی اور ابو ثور کا قول متفق ہے کہ جب اس کی وفات کے

بعد جائز قرار دیں تو انہیں لازم ہو جائے گا۔

**مسئلہ نمبر 16:** علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو بعض کے لئے مال کی وصیت کرے اور اپنی وصیت میں کہے: اگر ورثاء نے اجازت دی تو یہ اس کے لئے ہوگا اگر وہ اجازت نہیں دیں گے تو وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جائے گا۔ پس ورثاء نے اجازت نہ دی۔ امام مالک نے فرمایا: اگر ورثاء اس کی اجازت نہ دیں تو ورثاء کی طرف لوٹ آئے گا۔ امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور معمر (صاحب عبدالرزاق) کے قول میں اللہ کے راستہ میں خرچ ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 17:** بالغ، عاقل غیر مجبور علیہ کی وصیت میں کوئی اختلاف نہیں اور دوسروں میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ جس کی عقل میں ضعف ہو، سفیہ اور وہ شخص جو کبھی دماغی تکلیف میں افاقہ پاتا ہو ان کے وصایا جائز ہیں جب کہ وہ اتنی عقل رکھتے ہوں کہ جو وہ وصیت کر رہے ہوں انہیں جانتے ہوں۔ اسی طرح چھوٹا بچہ جب اس چیز کو سمجھتا ہو جس کی وصیت کر رہا ہے اور کوئی غلط نہ کرے تو اس کی وصیت جائز اور نافذ ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اتھیوں نے کہا: بچے کی وصیت جائز نہیں۔ مزنی نے کہا: یہ امام شافعی کے قول کا قیاس ہے۔ میں نے امام شافعی کی اس کے متعلق کوئی چیز نہیں پائی جو انہوں نے ذکر کی ہو اور اس پر نص قائم ہو۔ شوافع کے اصحاب کے دو قول ہیں: ایک امام مالک کے قول کی طرح ہے اور دوسرا امام ابو حنیفہ کے قول کی طرح ہے اور ان کی حجت یہ ہے کہ اس کی طلاق اور غلام آزاد کرنا جائز نہیں ہے اور نہ جنایت میں اس سے قصاص لیا جاتا ہے اور نہ قذف میں اسے حد لگائی جاتی ہے۔ وہ بالغ مجبور علیہ کی طرح نہیں ہے، اسی طرح اس کی وصیت جائز ہے اور یہ معلوم شدہ ہے کہ بچوں میں سے جو اپنی وصیت کو سمجھتا ہے اس کا حال اس کے مال میں مجبور علیہ کے حال کی طرح ہے اور حجر کی علت مال میں اسراف اور اسے تلف (ضائع) کرنا ہے۔ یہ علت اس سے موت کے ساتھ اٹھ گئی ہے اور مجبور علیہ اپنے مال میں اس مجنون کے مشابہ ہے جو عقل نہیں رکھتا۔ پس اس امر کے ساتھ اس کی وصیت واجب ہے جس کے متعلق حضرت عمر سے روایت مروی ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک مدینہ طیبہ میں اس پر اجماع ہے۔ محمد بن شریح نے کہا: جس نے وصیت کی بڑا ہوا چھوٹا ہو اس نے حق کو پالیا اللہ تعالیٰ نے اس کی زبان پر فیصلہ فرمایا اور حق کو کوئی دور کرنے والا نہیں۔

**مسئلہ نمبر 18:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْمَعْرُوفِ یعنی عدل کے ساتھ، نہ اس میں کمی ہو نہ اس میں زیادتی ہو۔ یہ میت کے اجتہاد اور موصی کی نظر پر منحصر ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان پر اس کی تقدیر بیان فرمائی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تہائی اور تہائی بھی زیادہ ہے۔ اس کے متعلق علماء کے اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہاری وفات کے وقت اموال کے ثلث کو صدقہ کیا ہے یہ تمہاری نیکیوں میں زیادتی ہے تاکہ اس کو تمہارے لئے زکوٰۃ بنادے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے حضرت ابو امامہ سے روایت کیا ہے انہوں نے حضرت معاذ بن جبل سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ حسن نے کہا: وصیت جائز نہیں مگر تہائی میں۔ بخاری کا نظریہ بھی یہی ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں حجت پکڑی ہے۔ وَأَن آخِذْتُمْ بِبَيْتِهِمْ بِمَا آتَزَّلَ اللَّهُ (المائدہ: 49) (اور تم فیصلہ کرو ان کے درمیان اس کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا)۔ اور نبی کریم ﷺ کا حکم ہے۔ کہ ثلث (تہائی) کثیر ہے یہ وہ حکم ہے جو اللہ تعالیٰ نے



اتارا ہے اور جس نے اس حد سے تجاوز کیا جو رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمائی اور تہائی سے زائد وصیت کی تو اس نے وہ کام کیا جس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ کے حکم کو وہ جاننے والا ہو تو وہ اس فعل میں گنہگار ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے الثلث کشید اس سے آپ نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ یہ قلیل نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 19:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **حَقًّا** اس سے مراد ثبوت ہے لیکن فرض اور وجوب کا ثبوت مراد نہیں ہے کیونکہ آگے ارشاد فرمایا **عَلَى الْمُتَّقِينَ** یہ دلیل ہے کہ اس کا ہونا بطور استحباب ہے اگر یہ فرض ہوتا تو تمام مسلمانوں پر ہوتا جب اللہ تعالیٰ نے متقی کو خاص فرمایا یعنی جو کوتاہی اور گناہ کا خوف کرتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ یہ لازم نہیں ہے مگر اس صورت میں جس میں اسے تلف ہونے کی توقع ہو۔ اگر فوت ہو جائے اس صورت میں اس پر بطور فرض لازم ہوگا وہ لکھنے اور وصیت میں جلدی کرے کیونکہ اگر وہ خاموش رہے گا تو وہ ضائع کرنے والا اور کوتاہی کرنے والا ہوگا۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے..... **حَقًّا** مصدر مؤکد کی بنا پر منصوب ہے اور غیر قرآن میں حق بھی جائز ہے یعنی **ذالک حق**۔

**مسئلہ نمبر 20:** علماء نے فرمایا: وصیت کو جلدی لکھنا یہ آیت سے ماخوذ نہیں ہے۔ یہ حضرت ابن عمر کی حدیث سے ہے۔ اس کا فائدہ یقین کی زیادتی میں مبالغہ کرنا ہے اور اس کا لکھا ہوا ہونا اس کی گواہی دی گئی ہے اور اس وصیت پر عمل کرنے میں اتفاق ہے۔ اگر عادل آدمیوں کو گواہ بنالے اور گواہ اس شہادت کو لفظاً قائم کریں تو اس کے مطابق عمل کیا جائے گا اگرچہ لکھی نہ گئی ہو۔ اگر وہ اپنے ہاتھ سے لکھے اور گواہ نہ بنائے تو امام مالک کا قول مختلف نہیں ہے۔ اس پر عمل نہیں کیا جائے گا مگر ایسی صورت میں جس میں اس شخص کے لئے حق کا اقرار ہو جس کے بارے میں اس پر تہمت نہ ہو تو اس کا نفاذ لازم ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 22:** دارقطنی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: لوگ اپنے وصایا کے آغاز میں یہ لکھتے تھے: **هَذَا مَا أوصى به فلان بن فلان انه يشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له، وان محمداً عبده ورسوله، وان الساعة آتية لا ريب فيها، وان الله يبعث من في القبور، وادعى من ترك بعدة من اهله بتقوى الله حق تقاته وان يصلحوا ذات بينهم، ويطيعوا الله ورسوله ان كانوا مؤمنين، وادعىهم بسا وصى به ابراهيم بنيم ويعقوب بن بنى ان الله اصطفى لكم الدين فلا تموتن الا واثم مسلمون۔** ترجمہ:- میں فلاں بن فلاں کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد ﷺ اس کے (برگزیدہ) بندے اور رسول ہیں اور (وہ گواہی دے کہ) قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ تعالیٰ اٹھائے گا انہیں جو قبور میں ہیں اور میں اسے بھی وصیت کرتا ہوں، جو وہ اپنے گھروالوں میں سے چھوڑے، اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے کی جس طرح اس کے تقویٰ کا حق ہے اور میں وصیت کرتا ہوں کہ وہ لوگوں کے درمیان صلح کرائیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اگر وہ مومن ہیں اور میں انہیں اس کے ساتھ وصیت کرتا ہوں جو ابراہیم علیہ السلام نے اور یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔ (اے میرے بچو! بے شک اللہ نے پسند فرمایا ہے تمہارے لئے یہی دین سو ہرگز نہ مرنے کا حال میں کہ تم مسلمان ہو۔)

**فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَبِيحٌ عَلِيمٌ ۝**

”پھر جو بدل ڈالے اس وصیت کو سن لینے کے بعد تو اس کا گناہ انہی بدلنے والوں پر ہوگا۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** فَمَنْ بَدَّلَهُ يَشْرَطُ ہے اور اس کا جواب قَائِمًا اِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُوْنَهُ ہے۔ ماکافہ ہے یعنی ان کو عمل سے روکنے والا ہے۔ اثمہ کو رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے، علی الذین یبدلونہ خبر ہے۔ بدلہ میں ضمیر کا مرجع بھی ایسا ہے۔ یہ اس ارشاد کی طرح ہے فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَبِّهِ۔ اس میں مَوْعِظَةٌ بمعنی وعظ ہے۔ اور ارشاد ہے: اِذَا حَضَرَ الْقِسَّةَ (النساء: 8) یعنی مال۔ اس کی دلیل منہ کا قول ہے..... اس کی مثل شاعر کا قول ہے: ما هذه الصوت، یعنی الصيحة۔ امرء القیس نے کہا:

برهمة رودة رخصة كخروبة البانة المنقط

نرم جلد، خوبصورت جوان، ملائم الحلق، نرم ٹہنی، کھلنے والا بان کا درخت۔

سَبْعَةٌ یہ احتمال رکھتا ہے اس نے وصی سے خود سنا ہو اور احتمال ہے کہ اس نے ان سے سنا ہو جن کے پاس وہ ثابت ہے۔ یہ دو عادل آدمی ہیں اثمہ میں ضمیر کا مرجع التبدیل ہے یعنی تبدیلی کا گناہ تبدیل کرنے والے پر ہے، میت پر نہیں ہے۔ کیونکہ موصی وصیت کے ساتھ ملامت سے خارج ہو گیا۔ اور ملامت وارث پر یا ولی پر متوجہ ہوئی۔

بعض علماء نے فرمایا: اس موصی نے جب تبدیلی کی اور وصیت کو ترک کر دیا یا اس نے اس طرح اس کو جاری نہ کیا جو شرع میں اس کے لئے لکھا گیا تھا اس پر گناہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اس آیت میں دلیل ہے کہ جب میت دین (قرض) کی وصیت کرے تو وہ ذمہ سے بری ہو گیا اور ولی سے مطالبہ کیا جائے گا اس کی ادائیگی میں اس کے لئے اجر ہوگا اور تاخیر میں گناہ بھی اس پر ہوگا۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: یہ اس صورت میں صحیح ہے جب میت نے قرضہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی ہو مگر جب وہ ادائیگی پر قادر تھا اور پھر ادائیگی کو ترک کیا پھر اس کی وصیت کی تو ولی کی کوتاہی اس کے ذمہ سے اس کو زائل نہیں کرے گی۔

**مسئلہ نمبر 3:** اس میں اختلاف نہیں کہ جب کسی ایسی چیز کی وصیت کرے جو جائز نہ ہو مثلاً شراب یا خنزیر یا کسی گناہ کی وصیت کرے تو اس کو تبدیل کرنا جائز ہے، اس کا پورا کرنا جائز نہیں جس طرح تہائی سے زائد کا پورا کرنا جائز نہیں۔ یہ ابو عمر کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيْمٌ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں ان کے ہوتے ہوئے وصیت کرنے والے کا ظلم کرنا اور حد سے تجاوز کرنے والوں کا تبدیلی کرنا مخفی نہیں ہے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مَّقْصِدٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاصْلَحْ بَيْنَهُمْ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

رَحِيْمٌ

”اور جسے اندیشہ ہو وصیت کرنے والے سے کسی طرفداری یا گناہ کا پس وہ صلح کرادے ان کے درمیان تو کچھ گناہ نہیں اس پر بے شک اللہ تعالیٰ غفور (اور) رحیم ہے۔“

اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ خَافَ، مَنْ شَرَطِيہ ہے اور خاف کا معنی ہے: ڈرنا۔ بعض نے فرمایا: خَاف کا معنی جاننا ہے خاف اصل میں خَوْف تھا، واو متحرک ماقبل مفتوح کی وجہ سے الف سے بدل گئی۔ اہل کوفہ خاف میں اِمالہ کرتے ہیں تاکہ کسرہ پر دلالت کرے۔ یہ فَعَلَ سے ہے۔ مِنْ مُؤْصٍ عاصم، حمزہ اور کسائی سے ابو بکر نے تشدید کے ساتھ قرأت روایت کی ہے۔ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ تخفیف زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ اکثر نحوی کہتے ہیں: موص، تکثیر کے لئے ہے اور کزمرہ و اکہم کی مثل ہونا بھی جائز ہے۔ جنفاً۔ یہ جنف یجنف سے ہے جس کا معنی ظلم کرنا، اس سے اسم جنف و جانف ہے۔ نحاس سے یہ مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الجنف کا معنی مائل ہونا ہے۔ اعشی نے کہا:

تجانف عن حجر الیمامة ناقتی وما قصدت من اهلها لسوائکا (1)

میری اونٹنی یمامہ کے پتھر سے مائل ہوگئی، اس نے تیرے سوا اپنے اہل کا قصد نہ کیا۔

الصحاح میں ہے الجنف کا معنی مائل ہونا ہے۔ جنف یجنف کا معنی ہے: مائل ہونا، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ خَافَ مِنْ مُؤْصٍ جَنَفًا۔

شاعر نے کہا: (2)

هم المولى دان جنفوا علينا وانا من لقائهم لزور

وہ سردار ہیں اگرچہ وہ ہم پر ظلم کریں ہم ان کی ملاقات سے قوت حاصل کرنے والے ہیں۔

ابو عبید نے کہا: یہاں المولیٰ، موالی کی جگہ ہے۔ اس سے مراد چچا کے بیٹے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (الحج: 5) پھر نکالا تمہیں (شکم مادر سے بچہ بنا کر) لبید نے کہا:

ان امرء منعت ادومة عامر ضیعی و قد جنفت عن خصومی

میں ایسا شخص ہوں عامر کی اصل نے مجھے میرے ظلم سے روکا اور میرے خصم میری طرف مائل ہوئے۔

ابو عبیدہ نے کہا: اسی طرح الجانی (ہمزہ کے ساتھ) اس کا معنی بھی مائل ہونے والا ہے۔ کہا جاتا ہے: اجنف الرجل یعنی زیادتی لایا۔ جیسے کہا جاتا ہے: آلام، یعنی ایسا عمل کیا جس پر ملامت کی جاتی ہے۔ اَعَشَّ یعنی خسیں کام کیا۔ تجانف لایثم گناہ کی طرف مائل ہوا۔ رجل اجنف (پشت کوز) جنفی فَعَلُ (فاء کے ضمہ اور عین کے فتح کے ساتھ) کے وزن پر ہے۔ یہ جگہ کا نام ہے اور ابن السکیت سے مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حیفاً پڑھا (حاء اور یاء کے ساتھ) اس



کا معنی ہے ظلماً۔

مجاہد نے کہا: فَمَنْ خَافَ یعنی جسے موسیٰ کے ظلم کرنے اور بعض لوگوں کو میراث سے محروم کرنے اور اذیت پہنچانے کا اندیشہ ہو یا بلا ارادہ اذیت دینے کا اندیشہ ہو۔ یہ جنف بغیر گناہ کے ہے۔ اگر ارادہ ہو تو گناہ میں مائل ہونا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جس کو نصیحت کی گئی اور وہ لوٹا اور اس نے اس کے اور ورثاء کے درمیان اصلاح کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں اِنَّ اللہَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ یعنی اللہ تعالیٰ موسیٰ کو بخشنے والا ہے جب اس نے موعظت پر عمل کیا اور اذیت کے ارادہ سے باز آیا۔ حضرت ابن عباس، قتادہ اور ربیع وغیرہم نے بتایا کہ آیت کا معنی ہے: موسیٰ کے مرنے کے بعد جو اسے علم تھا اسے اس نے بیان کیا کہ موسیٰ نے بعض ورثاء کو اذیت دینے کا ارادہ کیا تھا پھر اس نے ورثاء کے درمیان جو جھگڑا تھا اس کی اصلاح کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ پہلے تبدیل کرنے والے کا گناہ اس کو لاحق نہ ہوگا اگرچہ اس فعل میں تبدیلی ہے اور یہ ضروری ہے لیکن یہ تبدیلی مصلحت کے لئے ہے وہ تبدیلی جس میں گناہ ہے وہ وہ ہے جو خواہش نفس سے تبدیل ہو۔ (1)

**مسئلہ نمبر 2:** فَمَنْ خَافَ کا خطاب تمام مسلمانوں کے لئے ہے، انہیں کہا گیا: اگر تمہیں موسیٰ سے وصیت میں حق سے میل اور عدول کا خوف ہو اور گناہ میں واقع ہونے کا اندیشہ ہو اور تمہیں خوف ہو کہ وہ معروف طریقہ سے وصیت نہیں کرے گا..... یہ اس طرح ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے خاوند کے لئے مال کی وصیت کرے یا اپنی بیٹی کی اولاد کے لئے وصیت کرے تاکہ مال اس کی بیٹی کی طرف یا پوتے کی طرف لوٹ آئے..... اس کی غرض یہ ہے کہ مال اس کے بیٹے کی طرف لوٹ آئے یا وہ اپنے غلاموں کے لئے وصیت کرے اور قریبی رشتہ داروں کو چھوڑ دے تو ان کے درمیان اصلاح میں جلدی کرو۔ جب صلح واقع ہوگی تو مصلح سے گناہ ساقط ہو جائے گا۔ اصلاح کرنا فرض کفایہ ہے جب لوگوں میں سے کوئی اصلاح کر دے گا تو باقی لوگوں سے فرض ساقط ہو جائے گا۔ اگر سب اصلاح نہیں کریں گے تو سب گنہگار ہوں گے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اس آیت میں ظن کے ساتھ حکم لگانے پر دلیل ہے کیونکہ جب فساد کے قصد کا گمان ہو تو اصلاح میں سعی واجب ہے جب فساد متحقق ہو تو صلح نہیں ہوتی بلکہ دفع کا حکم ہوتا ہے۔ فساد کو ختم کرنا ہوتا ہے اور فساد کو کاٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ اس کا عطف خاف پر ہے۔ ضمیر سے مراد ورثاء ہیں اور ان کا ذکر پہلے نہیں ہوا ہے کیونکہ معنی معروف ہے اور جواب شرط فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ زندگی میں اور صحت میں صدقہ کرنا، موت کے وقت صدقہ کرنے سے افضل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے، آپ سے پوچھا گیا کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تو صدقہ کرے جب کہ توجیح ہو اور اس پر بخل کرنے والا ہو (2)۔ (الحدیث) بخاری و مسلم نے اسے نقل کیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انسان کا اپنی زندگی میں ایک درہم صدقہ کرنا موت کے وقت

2۔ صحیح بخاری، باب فضل صدقة الشحيح الصحيح، حدیث نمبر 1330، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

سورہ ہم صدقہ کرنے سے افضل ہے (1)۔ نسائی نے حضرت ابوالدرداء سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو موت کے وقت خرچ کرتا ہے یا صدقہ کرتا ہے وہ اس شخص کی مثل ہے جو سیر ہونے کے بعد ہدیہ دیتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اور جو اپنی وصیت میں کسی کو نقصان نہ دے تو اس کی یہ وصیت اس کی طرف سے اس زکوٰۃ کا کفارہ ہوگی جو اس نے ادا نہ کی تھی۔ دارقطنی نے حضرت معاویہ بن قرۃ سے وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس پر موت آنے کا وقت قریب ہو پھر وہ وصیت کرے اور اس کی وصیت کتاب اللہ کے حکم کے مطابق ہو تو اس کی سابقہ زکوٰۃ جو اس نے ادا نہیں کی تھی اس کے لئے کفارہ ہوگی اور اگر وہ وصیت میں کسی کو نقصان پہنچائے تو پھر یہ صورت ہوگی۔

**مسئلہ نمبر 6:** دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: وصیت میں کسی کو نقصان پہنچانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک مرد یا عورت ساٹھ سال اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ عمل کرتا رہتا ہے پھر ان پر موت آتی ہے وہ وصیت میں کسی کو نقصان پہنچاتے ہیں تو ان کے لئے دوزخ واجب ہوتی ہے۔ نسائی نے باب باندھا ہے: الصلاة على من جنف في وصيته۔ پھر اپنی سند سے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے چھ غلام اپنی موت کے وقت آزاد کئے جبکہ اس کے پاس اور کوئی مال نہیں تھا۔ نبی کریم ﷺ کو اس بات کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ اس سے ناراض ہوئے اور فرمایا: میں نے ارادہ کیا کہ میں اس پر نماز جنازہ نہ پڑھوں۔ پھر آپ ﷺ نے اس کے غلاموں کو بلایا ان کے تین حصے بنائے پھر ان کے درمیان قرعہ ڈالا، دو کو آزاد فرمایا اور چار کو غلام بنایا۔ مسلم نے اس حدیث کا معنی بیان کیا ہے مگر انہوں نے آخر میں فرمایا: آپ ﷺ نے اسے سخت کلام کہی جبکہ پہلی حدیث میں تھا کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۖ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۗ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾

”اے ایمان والو! فرض کئے گئے ہیں تم پر روزے جیسے فرض کئے گئے تھے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے کہ تم پر ہیزگار بن جاؤ۔ یہ گنتی کے چند روز ہیں پھر جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے۔ اور جو لوگ اسے بہت مشکل سے ادا کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ یہ ہے ایک مسکین کا کھانا اور جو خوشی سے زیادہ

1۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء في كراهية الاضراء في الوصية، حدیث نمبر 2482، فیہ القرآن جلی کوثر

نیکی کرے تو وہ اس کے لئے زیادہ بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا ہی بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو۔  
اس میں چھ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ**۔ جب مکلفین پر قصاص اور وصیت کے فرض ہونے کا ذکر کیا تو ان پر روزوں کے فرض ہونے کا بھی ذکر کیا اور ان پر روزوں کو بھی لازم کیا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور حج کرنا (1)۔ اس حدیث کو حضرت ابن عمر نے روایت کیا ہے۔ صوم کا لغوی معنی رکنا اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل نہ ہونا ہے۔ خاموشی کو بھی صوم کہا جاتا ہے کیونکہ یہ کلام سے رکنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کے متعلق خبر دیتے ہوئے فرمایا: **إِنِّي نَذَرْتُ لِلَّهِ حَیْنُ صَوْمًا** (مریم: 26) یعنی کلام نہ کرنے کی میں نے نذر مانی ہے۔ الصوم کا معنی ہوا کا رک جانا بھی ہے، ہوا کا چلنے سے رک جانا، گھوڑا اپنی رسی پر ٹھہرا رہے یعنی وہ ٹھہر جائے اور چارہ نہ کھائے۔ صام النہار کا معنی ہے: دن کا معتدل ہونا۔ مصام الشمس، نصف النہار کے وقت میں سورج کا برابر ہونا۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

خیل صیام و خیل غیر صائتہ      تحت العجاج و خیل تعلق اللجبا  
یعنی گھوڑے کھڑے ہوئے ہیں چلنے سے اور حرکت کرنے سے رکے ہوئے ہیں۔

امرو القیس نے کہا:

کان الثیا علق فی مصامھا  
گویا ستارے اپنی جگہوں میں ٹھہرے ہوئے ہیں منتقل نہیں ہوتے ہیں۔  
ایک اور کا قول ہے:

والہکرات شہن الصائتہ  
جوان اونٹنیاں ان کی برائی یہ ہے کہ وہ چلتی اور گھومتی نہیں ہیں۔  
امرو القیس نے کہا:

فدعھا و سل الہم عنک بجسارۃ  
ذمویل اذا صام النہار و هجراً  
یعنی سورج منتقل ہونے سے اور چلنے سے ست پڑ گیا۔ پس سستی کی وجہ سے وہ رکنے والے کی طرح ہے۔  
ایک اور شاعر نے کہا:

حق اذا صام النہار و اعتدل      و سال للشمس لعباً فنزل  
جب دن درمیان میں تھا اور سورج کے لئے لعب چکا تو وہ ڈھل گیا۔

1۔ صحیح بخاری، کیف کان ہدہ الوحی الی رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام، حدیث نمبر 7، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



ایک اور نے کہا:

نَعْبًا بوجرة صفر الخدو د ما تطعم النوم الا صياماً

شرع میں روزہ کا معنی، طلوع فجر سے سورج کے غروب ہونے تک نیت کے ساتھ روزہ کو توڑنے والی چیزوں سے رکنا ہے اور اس کا تمام اور کمال ممنوعہ چیزوں سے اجتناب کرنا اور محرمات میں واقع نہ ہونا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: من لم يدع قول الزور والعمل به فليس لله حاجة في ان يدع طعامه وشرابه (1)۔ (جو جھوٹ کے قول کو اور اس پر عمل کو ترک نہ کرے تو اللہ کو اس کے کھانے، پینے کے چھوڑنے کی ضرورت نہیں)۔

### مسئلہ نمبر 2: روزہ کی عظیم فضیلت اور بڑا ثواب

اس کے متعلق کثرت سے صحیح اور حسن احادیث آئی ہیں جن کا ذکر ائمہ نے اپنی اپنی مسانید میں کیا ہے بعض کا ذکر آگے آئے گا۔ تیرے لئے اب اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے جس طرح نبی کریم ﷺ کی حدیث سے ثابت ہے، نبی کریم ﷺ نے رب کریم کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ابن آدم کا ہر عمل اس کے لئے ہے سوائے روزے کے یہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا (2)۔ (الحديث) روزے کو خاص فرمایا کہ وہ اس کے لئے ہے اگرچہ تمام عبادات اس کے لئے ہیں۔ دو امور کی وجہ سے روزے کا مرتبہ باقی تمام عبادات سے بلند ہے۔ پہلا امر یہ ہے کہ روزہ نفس کو لذتوں اور شہوات سے روکتا ہے جبکہ ان چیزوں سے دوسری عبادات اتنا نہیں روکتی ہیں۔ دوسرا امر یہ ہے کہ روزہ بندے اور اس کے رب کے درمیان راز ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر ظاہر نہیں ہوتا اسی وجہ سے اس کے ساتھ مختص ہے اور دوسری عبادات ظاہر ہیں۔ بعض اوقات انسان اسے تصنع اور ریاکاری کے طور پر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے روزے کو دوسری عبادات سے خاص فرمایا۔ اس کے علاوہ بھی روزے کی عظمت کے متعلق اقوال ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: گَمَّا كُتِبَ كَاف مَفْت کے اعتبار سے محل نصب میں ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: کتابنا کیا صوما کیا۔ یا یہ صیام سے حال کی بنا پر منصوب ہے یعنی روزے تم پر فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھے، بعض نحو یوں نے فرمایا: کاف صیام کی صفت ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے کیونکہ اس کی تعریف محض نہیں ہے اس اجمال کی وجہ سے جو اس میں ہے جس کے ساتھ شریعت نے تفسیر بیان کی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی کما کے ساتھ صفت جائز ہے کیونکہ صفت ہمیشہ نکرہ کی لگائی جاتی ہے۔ یہ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کے قائم مقام ہے اس قول کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ ما محل جر میں ہے اور اس کا صلہ کُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ ہے۔ اور کتب میں ضمیر ما کی طرف راجع ہے۔ اہل تاویل کا تشبیہ کے مقام پر اختلاف ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** شعبی اور قتادہ وغیرہ نے کہا: تشبیہ روزے کے وقت اور روزے کی قدر کی طرف لوثی ہے۔ اللہ تعالیٰ

1۔ صحیح بخاری، باب من لم يدع قول الزور والعمل به في الصوم، حدیث نمبر 1770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب هل يقول ان صائم اذا شتم، حدیث نمبر 1771، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی قوم پر رمضان کے روزے فرض کئے پھر انہوں نے اس میں تبدیلی کی۔ ان کے علماء نے ان پر دس ایام زیادہ کر دیئے۔ پھر ایک عالم بیمار ہوا تو اس نے نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے شفا دی تو وہ دس روزوں کا اضافہ کرے گا تو اس نے ایسا ہی کیا۔ نصاریٰ کے روزے پچاس دن ہو گئے۔ پھر گرمی میں روزے رکھنا ان پر مشکل ہوئے تو انہوں نے اپنے روزوں کو موسم بہار کی طرف منتقل کر دیا (1)۔ اس قول کو نحاس نے اختیار کیا ہے اور فرمایا: یہ آیت کے مفہوم کے مشابہ ہے۔ اس کے متعلق ایک حدیث ہے جو اس کی صحت پر دلالت کرتی ہے، حضرت دغفل بن حظلہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: نصاریٰ پر ایک مہینہ کے روزے فرض تھے، ان کا ایک شخص مریض ہوا تو لوگوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ اسے شفا دے گا تو ہم دس دنوں کا اضافہ کریں گے پھر دوسرا ایک شخص تھا جس نے گوشت کھایا اور اس کے منہ کو تکلیف ہوئی۔ انہوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ اسے شفاء دے گا تو ہم سات دنوں کا اضافہ کریں گے پھر ایک اور بادشاہ کا دور آیا۔ لوگوں نے کہا: ہم ان سات ایام کو مکمل کریں گے اور ہم روزے موسم بہار میں رکھیں گے۔ فرمایا: پس پچاس روزے ہو گئے۔

مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہر امت پر رمضان کے مہینہ کے روزے فرض کئے تھے۔ بعض نے فرمایا: انہوں نے عہد کیا کہ تیس دنوں سے پہلے ایک دن اور ایک دن بعد ہر سال روزہ رکھتے رہیں گے حتیٰ کہ ان کے پچاس دن مکمل ہو جائیں گے پھر گرمیوں میں ان پر مشکل ہوئی تو انہوں نے روزوں کو موسم بہار کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کے بارے میں حضرت دغفل بن حظلہ، حسن بصری اور سدی سے حدیث مروی ہے۔ (2)

میں کہتا ہوں: اسی وجہ سے..... حقیقت حال اللہ بہتر جانتا ہے..... شک والے دن (اتیس شعبان کے بعد والے دن) کا روزہ اور عید الفطر کے متصل چھ روزوں کو مکروہ کیا گیا ہے۔ شعبی نے کہا: اگر میں پورا سال روزہ رکھتا تو شک والے دن پھر بھی افطار کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ پر رمضان کے مہینہ کے روزے فرض کئے گئے تھے جس طرح ہم پر فرض کئے گئے ہیں۔ پس انہوں نے موسم بہار کی طرف روزوں کو پھیر دیا کیونکہ یہ روزے کبھی گرمیوں میں آ جاتے تھے۔ پھر انہوں نے تیس دن شمار کئے۔ پھر اس کے بعد ان پر ایک زمانہ آیا انہوں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ وہ تیس دنوں سے پہلے اور بعد ایک ایک دن روزہ رکھیں گے پھر..... حتیٰ کہ ان کے روزے پچاس ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہی مطلب ہے: **كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا مِنْ قَبْلِكَ** بعض علماء نے فرمایا: تشبیہ اصل وجوب کی طرف راجع ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے نہ وقت میں تشبیہ ہے نہ کیفیت میں۔ بعض علماء نے فرمایا: تشبیہ اس روزے کی صفت میں واقع ہے جو ان پر فرض تھا کہ کھانا، پینا، حقوق زوجیت ادا کرنا منع تھا۔ جب افطار کا وقت ہوتا تو جو سو جاتا وہ یہ کھانا، پینا بھی نہیں کرتا تھا۔

نصاریٰ بھی ابتدا میں اسی طرح تھے اور ابتدائے اسلام میں بھی اسی طرح تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے پہلا

حکم منسوخ کر دیا۔ فرمایا: **أُجِّلَ لَكُمْ لَيْلَةُ الصِّيَامِ الزَّكَاةُ إِلَى نِسَاءِ يَوْمِكُمْ**۔ (البقرہ: 187) جیسا کہ آگے اس کا بیان آئے گا یہ سدی، ابو العالیہ اور ربیع کا قول ہے (1)۔ حضرت معاذ بن جبل اور عطاء نے کہا: تشبیہ صرف روزے پر واقع ہے نہ صفت میں ہے نہ تعداد میں ہے۔ اگرچہ دونوں روزے زیادہ اور کمی میں مختلف تھے۔ **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** کا معنی یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہر مہینہ میں تین دن اور عاشوراء کے دن کا روزہ فرض تھا **كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ**۔ یعنی جس طرح یہود پر روزہ فرض تھا۔ حضرت ابن عباس کے قول کے مطابق تین دن اور عاشوراء کا روزہ ان پر فرض تھا پھر اس امت میں رمضان کے مہینہ کے ساتھ یہ حکم منسوخ ہو گیا (2)۔ حضرت معاذ بن جبل نے کہا اس کو **أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ** کے ساتھ منسوخ کیا گیا پھر ایام کو رمضان کے ساتھ منسوخ کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ**، لعل ان کے حق میں ترجی (امید) کے لئے ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ **تَتَّقُونَ** بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہاں کمزور ہونا ہے کیونکہ جب کم کھایا جاتا ہے تو شہوت کم ہوتی ہے، جب شہوت کم ہوتی ہے تو گناہ کم ہوتے ہیں۔ یہ خوبصورت وجہ مجاز ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تاکہ تم گناہوں سے بچ جاؤ۔ بعض نے فرمایا: یہ عموم پر ہے کیونکہ روزہ، نبی کریم ﷺ کے ارشاد **الصيام جنّة** (3) (روزہ ڈھال ہے اور شہوت کو ختم کرتا ہے) کے مطابق تقویٰ کا سبب ہے کیوں یہ شہوات کو ماردیتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ**، **أَيَّامًا**، **كُتِبَ** کا مفعول ثانی ہے یہ فراء کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: **كُتِبَ** کی ظرف کی بنا پر منصوب ہے یعنی تم پر روزے ایام میں فرض کئے گئے ہیں۔ اور **أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ** سے مراد رمضان کا روزہ ہے۔ یہ حضرت معاذ سے جو مروی ہے اس کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ**

اس میں سولہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مَرِيضًا** مریض کی دو حالتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ کسی حال میں بھی روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا اس پر تو افطار کرنا واجب ہے دوسری حالت یہ ہے کہ وہ ضرر اور مشقت کے ساتھ روزہ پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کے لئے افطار مستحب ہے اور ایسی صورت میں صرف جاہل ہی روزہ رکھتا ہے۔ ابن سیرین نے کہا: جب انسان کو ایسی حالت لاحق ہو جس کی وجہ سے وہ مریض کہا جاسکتا ہو تو اس کے لئے افطار کرنا صحیح ہے اس کو مسافر پر قیاس کیا گیا ہے کیونکہ اس میں سفر کی علت کی وجہ سے افطار کرنا صحیح ہے اگرچہ افطار کی ضرورت نہ بھی ہو۔ طریف بن تمام الطعطاروی نے کہا: میں رمضان میں محمد بن سیرین کے پاس گیا تو وہ کھانا کھا رہے تھے جب کھانے سے فارغ ہوئے تو فرمایا: میری اس انگلی میں تکلیف ہے۔ جمہور علماء نے فرمایا: جب اسے کوئی ایسی مرض ہو جو اسے تکلیف دیتی ہو یا اس کے بڑھنے کا اندیشہ ہو تو اس کے لئے افطار

2- تفسیر طبری زیر آیت ہذا

1- تفسیر طبری، المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3- صحیح بخاری، باب فضل الصوم، حدیث نمبر 1761، ضیاء القرآن پبلیکیشنز



کرنا صحیح ہے۔ ابن عطیہ نے کہا (1): یہ اصحاب مالک کے ماہر علماء کا مذہب ہے، اس کے ساتھ وہ مناظرے کرتے تھے۔ رہے امام مالک کے الفاظ کہ وہ مرض جو آدمی کو تکلیف دیتی ہو اور اسے انتہا تک پہنچاتی ہو۔ ابن خويز منداد نے کہا: امام مالک سے ایسی مرض کے بارے میں اختلاف ہے جو افطار کو مباح کرتی ہے۔ کبھی فرمایا: روزے سے تلف ہونے کا خوف ہو، کبھی فرمایا: شدت مرض اور مرض میں زیادتی، سخت مشقت۔ یہ صحیح مذہب ہے اور ظاہر کا مقتضا ہے کیونکہ کوئی مرض خاص نہیں ہے۔ یہ ہر مرض میں مباح ہے مگر جس کو دلیل خاص کرے جیسے سر درد، تھوڑا سا بخار یا کوئی تھوڑی سی مرض جس کے ہوتے ہوئے روزے میں تکلیف نہ ہو۔ حسن نے کہا: ایسی مرض جس میں کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو وہ روزہ افطار کرے۔ یہ نخی کا قول ہے (2)۔ ایک فرقہ نے کہا: کسی مرض میں افطار نہ کرے مگر ایسی مرض جس کی ضرورت افطار کی داعی ہو، جب اس مرض کے ساتھ ضرورت کا احتمال ہو تو افطار نہ کرے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ (3)

میں کہتا ہوں: اس باب میں ابن سیرین کا قول زیادہ مناسب ہے۔ امام بخاری نے فرمایا: میں رمضان میں تھوڑا سا بیمار تھا، اسحاق بن راہویہ اپنے ساتھیوں کی معیت میں میری عیادت کے لئے آئے۔ انہوں نے مجھے فرمایا: اے ابو عبد اللہ! تو نے افطار کیا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ انہوں نے کہا: تجھے اندیشہ تھا کہ تو رخصت کے قبول کرنے سے کمزور ہو جائے گا۔ میں نے کہا: ہمیں عبدان نے بتایا انہوں نے ابن المبارک سے روایت کیا انہوں نے ابن جریج سے روایت کیا، فرمایا: میں نے عطا سے پوچھا میں کس مرض کی وجہ سے افطار کروں؟ انہوں نے فرمایا: جو بھی مرض ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا۔ بخاری نے فرمایا یہ حدیث اسحاق کے پاس نہ تھی۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: جب انسان کو اپنے نفس پر خوف ہو جبکہ وہ روزہ سے ہوا اگر وہ افطار نہیں کرے گا تو اس کی آنکھ کی تکلیف بڑھ جائے گی یا بخار شدید ہو جائے گا تو وہ افطار کرے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَوْ عَلَى سَفَرٍ علماء کا اس سفر کے بارے اختلاف ہے جس میں افطار اور قصر جائز ہے۔ اس پر اجماع ہے کہ وہ سفر اطاعت ہو جیسے حج اور جہاد۔ ان دونوں سفروں کے ساتھ صلہ رحمی کا سفر، ضروری معاش کی طلب کا سفر متصل ہے، رہا تجارت کا سفر اور مباحات کا سفر اس میں منع اور اجازت کا اختلاف ہے، جواز کا قول ارنج ہے اور رہا سفر گناہ اس کے متعلق بھی علماء کا جواز و منع میں اختلاف ہے۔ منع کا قول رائج ہے۔ یہ ابن عطیہ کا قول ہے (4)۔ سفر کی مسافت امام مالک کے نزدیک وہی ہے جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ علماء کا اس مقدار میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ایک دن اور ایک رات کی مسافت ہے پھر انہوں نے رجوع کیا اور فرمایا: اڑتالیس میل کی مسافت ہے۔ ابن خويز منداد نے کہا: یہ امام مالک کا ظاہر مذہب ہے۔ کبھی فرمایا: بیالیس میل ہے، کبھی فرمایا: چھتیس میل ہے، کبھی فرمایا: ایک دن اور ایک رات کی مسافت ہے۔ ان سے دو درجہ بھی مروی ہیں۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ کبھی خشکی اور سمندری سفر کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ فرمایا: سمندری راستہ میں ایک دن اور ایک رات ہے اور خشکی کے راستہ میں اڑتالیس میل ہے اور مذہب میں تیس میل ہے اور غیر مذہب میں تین دن ہیں۔ حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور ثوری

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

4۔ ایضاً

نے کہا: افطار تین دنوں کے سفر میں ہے۔ یہ ابن عطیہ نے حکایت کیا ہے (1)۔ میں کہتا ہوں: بخاری میں ہے حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس چار برد کے سفر میں افطار کرتے تھے اور یہ چار برد، سولہ فرسخ ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3:** علماء کا اختلاف ہے کہ رمضان میں سفر کرنے والے کے لئے فطر کی نیت کرنا جائز نہیں کیونکہ مسافر نیت کے ساتھ مسافر نہیں ہوتا بخلاف مقیم کے۔ مسافر عمل کرنے اور اٹھ کر جانے کے ساتھ ہی مسافر ہو جاتا ہے اور مقیم عمل کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ جب وہ اقامت کی نیت کرتا ہے تو اسی وقت مقیم ہو جاتا ہے کیونکہ اقامت عمل کی محتاج نہیں ہوتی۔ پس یہ دونوں جدا جدا ہیں اس میں بھی علماء کا اختلاف نہیں کہ جو سفر کی امید رکھتا ہے تو اس کے لئے نکلنے سے پہلے افطار جائز نہیں اگر افطار کرے تو ابن حبیب نے کہا: اگر وہ سفر کے لئے تیاری کر چکا تھا اور سفر کے اسباب لے چکا تھا تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔ یہ صبح اور مابینوں سے حکایت کیا گیا ہے۔ اگر سفر سے اسے کوئی عارضہ روک لے تو اس پر کفارہ ہوگا اور اگر سفر کرے تو کفارے سے بچ جائے گا۔ عیسیٰ نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے: اس پر ایک دن کی قضا لازم ہے کیونکہ وہ فطر میں تاویل کرنے والا تھا۔ اشہب نے کہا: اس پر کوئی کفارہ نہیں خواہ سفر کرے یا نہ کرے۔ سحنون نے کہا: اس پر کفارہ ہے خواہ سفر کرے یا نہ کرے یہ اس عورت کی طرح ہے جو کہتی ہے کل مجھے حیض آجائے گا اس لئے وہ افطار کر دیتی ہے۔ پھر سحنون نے عبد الملک اور اصبع کے قول کی طرف رجوع کر لیا اور فرمایا: عورت کی طرح نہیں ہے کیونکہ مرد جب چاہتا ہے سفر کرتا ہے اور عورت حیض خود نہیں لاتی۔

میں کہتا ہوں: ابن القاسم اور اشہب کا قول کفارہ کی نفی میں بہتر ہے کیونکہ اس نے وہ فعل کیا جو اسے کرنا جائز تھا اور ذمہ بری ہے اور اس میں کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی مگر یقین کے ساتھ اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوتا۔ پھر آؤ علی سفقہ کے ارشاد کا یہی مقتضا ہے۔ ابو عمر نے کہا یہ اس مسئلہ میں صحیح ترین قول ہے۔ کیونکہ وہ روزے کی حرمت کو توڑنے والا نہیں تھا اس نے اس کا قصد اور ارادہ کیا ہوا تھا۔ پس متاؤل تھا۔ اگر کھانا سفر کی نیت کے ساتھ ہو تو اس پر کفارہ واجب ہے کیونکہ یہ سفر کی طرف نکلنے سے پہلے تھا ابھی تک خروج نے اس سے اس کو ساقط نہیں کیا تھا۔ پس تو اس میں غور کرے گا تو تو بھی اسی طرح پائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ دارقطنی نے روایت کیا ہے، حضرت محمد بن کعب سے مروی ہے انہوں نے کہا: میں رمضان میں حضرت انس بن مالک کے پاس آیا، وہ سفر کا ارادہ کئے ہوئے تھے اور ان کی سواری بھی تیار کر دی گئی تھی اور وہ سفر والا لباس پہن چکے تھے اور سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ انہوں نے کھانا منگوایا اور اس سے کھایا پھر سوار ہو گئے۔ میں نے پوچھا: کیا یہ سنت ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: مجھے حضرت ابو موسیٰ نے کہا: کیا میں تجھے نہ بتاؤں جب تو نکلے گا تو روزہ سے نکلے گا اور جب تو داخل ہوگا تو روزہ سے داخل ہوگا۔ جب تو سفر پر نکلے تو افطار کر کے نکل جب تو گھر میں داخل ہو تو افطار کرتے ہوئے داخل ہو۔ حسن نے کہا: جس دن سفر کا ارادہ ہو اس دن گھر میں اگر چاہے تو افطار کرے۔ احمد نے کہا جب وہ گھروں سے نکل جائے تو افطار کرے۔ اسحاق نے کہا: نہیں۔ بلکہ جب سواری پر کجاوہ رکھے تو افطار کرے۔ ابن منذر نے کہا: احمد کا قول صحیح ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں جو حالت صحت میں صبح کرے پھر بیمار ہو تو وہ بقیہ دن

افطار کرے۔ اسی طرح جیب حضر میں صبح کرے پھر سفر کی طرف نکلے تو اس کے لئے افطار کرنا جائز ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: اس دن افطار نہ کرے اگرچہ سفر شروع بھی کر دے۔ اسی طرح زہری، مکحول اور یحییٰ انصاری، امام اوزاعی، امام شافعی، ابو ثور اور اصحاب رائے کا یہی قول ہے۔ اگر وہ افطار کر دے تو اس میں اختلاف ہے۔ پھر تمام کہتے ہیں کہ وہ قضا کرے گا اور کفارہ نہیں دے گا۔ امام مالک نے فرمایا: سفر چونکہ طاری عذر ہے۔ یہ مرض کی طرح ہے جو انسان کو لاحق ہو جاتی ہے۔ بعض اصحاب مالک سے مروی ہے کہ وہ قضا کرے اور کفارہ بھی دے۔ یہ ابن کنانہ اور مخزومی کا قول ہے۔ الباجی نے امام شافعی سے حکایت کیا ہے، ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے اور یہی کہا ہے۔ فرمایا: سفر عذر ہے جو عبادت کے لزوم کے بعد لاحق ہوا ہے۔ یہ مرض اور حیض کے مخالف ہے کیونکہ مرض اس کے لئے افطار کو مباح کرتی ہے۔ حیض اس پر روزے کو حرام کر دیتا ہے اور سفر یہ اس کے لئے مباح نہیں کرتا اس پر روزے کی حرمت توڑنے کی وجہ سے کفارہ واجب ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ کچھ نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت میں اس کے لئے افطار کو مباح کیا ہے۔ رہا علماء کا یہ قول کہ وہ افطار نہ کرے یہ اس کا استحباب ہے جس کا اس نے عہد کیا تھا۔ اگر وہ اللہ کی رخصت کو لے گا تو اس پر قضا ہوگی۔ رہا کفارہ تو اس کی کوئی وجہ نہیں، جس نے کفارہ واجب کیا ہے اس نے اس چیز کو واجب کیا جس کو اللہ اور اس کے رسول نے واجب نہیں کیا۔ حضرت ابن عمر سے اس مسئلہ میں مروی ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس دن افطار کرے جب وہ سفر پر نکلے۔ یہ شعبی، امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: امام بخاری نے اس مسئلہ پر یہ باب باندھا ہے: من افطر فی السفر لیراہ الناس اور حضرت ابن عباس سے حدیث نقل کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ سے مکہ کی طرف نکلے تو روزہ رکھے رہے، حتیٰ کہ عسفان تک پہنچ گئے پھر پانی منگوایا اور اپنے ہاتھوں کو بلند کیا تا کہ لوگوں کو دکھائیں کہ آپ نے افطار کیا ہے حتیٰ کہ مکہ مکرمہ آئے اور یہ رمضان کا مہینہ تھا (1)۔ مسلم نے بھی یہ حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، اس میں فرمایا: پھر برتن منگوایا جس میں مشروب تھا دن کے وقت وہ مشروب پیا تا کہ لوگ آپ کو دیکھ لیں پھر آپ نے افطار کیا تا کہ مکہ میں داخل ہو جائیں۔ یہ اس باب میں نص ہے۔ پس مخالف قول ساقط ہوا۔ وبالله التوفیق۔ اس میں جو یہ کہتا ہے کہ روزہ سفر میں منعقد نہیں ہوتا، حضرت عمر، حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: جو سفر میں روزہ رکھے تو حضر میں قضا کرے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف سے مروی ہے سفر میں روزہ رکھنے والا حضر میں افطار کرنے والے کی طرح ہے (2)۔

اہل ظواہر کی ایک قوم نے یہی کہا ہے اور انہوں نے اس قول سے حجت پکڑی ہے فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ اس کا بیان آگے آئے گا۔ حضرت کعب بن عاصم سے روایت ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔ اس میں اس کے قول کی حجت ہے جو کہتا ہے: جو سفر میں رات کو روزہ کی نیت کرے تو اس کے لئے افطار کرنا جائز ہے اگرچہ عذر نہ بھی ہو۔ مطرف کا خیال بھی یہی ہے۔ یہ امام شافعی کا ایک قول ہے اور یہی اہل ظواہر کی ایک جماعت کا قول

1۔ صحیح بخاری، باب من افطر فی السفر لیراہ الناس، حدیث نمبر 1812، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب ما جاء فی الافطار فی السفر، حدیث نمبر 1655، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



ہے۔ امام مالک ایسے شخص پر قضا اور کفارہ واجب کرتے تھے۔ امام مالک سے یہ بھی مروی ہے کہ اس پر کفارہ نہیں ہے یہ عبد الملک کے سوا اکثر اصحاب مالک کا قول ہے۔

عبد الملک نے کہا: اگر جماع کے ساتھ افطار کرے گا تو کفارہ دے گا کیونکہ اس میں سفر پر نہ قوت حاصل کرتا ہے اور نہ اسے کوئی عذر ہے، مسافر کے لئے افطار اس لئے مباح ہوتا ہے تاکہ اپنے سفر پر قوت حاصل کرے، عراق اور حجاز کے تمام فقہاء نے کہا: اس پر کفارہ نہیں۔ ان میں سے ثوری، امام اوزاعی، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور تمام کوفہ کے فقہاء ہیں۔ یہ حضرت ابو عمر کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اس میں علماء کا اختلاف ہے سفر میں افطار افضل ہے یا روزہ افضل ہے؟ امام مالک اور امام شافعی نے بعض روایات میں فرمایا: روزہ افضل ہے جو روزہ کی طاقت رکھتا ہو اور امام مالک کا مذہب اختیار کا ہے۔ اسی طرح امام شافعی کا مذہب ہے۔ امام شافعی اور دوسرے ان کے قبیعین علماء نے کہا: اسے اختیار ہے اور انہوں نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ اسی طرح ابن علیہ نے کہا: کیونکہ حضرت انس کی حدیث ہے، فرمایا: ہم نے رمضان میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ سفر کیا تو روزہ دار نے افطار کرنے والے پر عیب نہیں لگایا اور افطار کرنے والے نے روزہ دار پر عیب نہیں لگایا۔ (1)

اس حدیث کو بخاری، مسلم اور مالک نے روایت کیا ہے۔ حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی اور حضرت انس بن مالک رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نے کہا: سفر میں روزہ افضل ہے اس کے لئے جو اس پر قدرت رکھتا ہو (2)۔ یہ امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کا قول ہے۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رخصت افضل ہے۔ حضرت سعید بن مسیب، شعبی، عمر بن عبد العزیز، مجاہد، قتادہ، اوزاعی، احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔ یہ تمام علماء کہتے ہیں: افطار افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ: 185)**

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ** اس کلام میں حذف ہے یعنی تم میں سے جو مریض یا مسافر ہو وہ افطار کرے اور قضا کرے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: اہل شہر جب انتیس دن روزے رکھیں اور شہر میں کوئی مریض آدمی ہو اور صحیح نہ ہو تو وہ انتیس دن روزے رکھے۔ ایک قوم نے کہا: ان میں سے حسن بن صالح بن جی ہے۔ انہوں نے کہا: ایک مہینہ کے بدلے میں ایک مہینہ روزے رکھے ایام کی تعداد کا اعتبار کئے بغیر۔ الکیا طبری نے کہا: یہ بعید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ**۔ یہ نہیں فرمایا کہ دوسرے ایام سے ایک مہینہ روزے رکھو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد **فَعِدَّةٌ** جو اس نے افطار کیا ہے اس کی تعداد پوری کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کچھ دن رمضان کے افطار کیا ہو تو ان کی تعداد کے مطابق قضا کرنا واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح پورا مہینہ افطار کیا ہو تو اس کا اعتبار ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَعِدَّةٌ** اس کو رفع مبتدا کی خبر کے اعتبار سے ہے اس کی تقدیر **الحکم بالواحب**

1۔ صحیح بخاری، باب لم یحب اصحاب النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بعضهم بعضا فی الصوم والافطار، حدیث 1811، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

عدۃ ہے۔ فعلیہ عدۃ بھی صحیح ہے (1)۔ کسائی نے کہا: فعدۃ بھی جائز ہے۔ یعنی فلیصم عدۃ من ایام۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے اس پر روزوں کی تعداد ہے۔ مضاف کو حذف کیا گیا ہے اور عدۃ کو اس کی جگہ رکھا گیا ہے۔ عدۃ۔ یہ العد سے فعلۃ کے وزن پر ہے یہ بمعنی معدود ہے جیسے طحن بمعنی مطحون ہوتا ہے تو کہتا ہے: اسبع جعجعة ولا رى طحنا (یہ اس شخص کی مثال دی جاتی ہے جو کثرت سے کلام کرتا ہے اور عمل نہیں کرتا) اسی سے عورت کی عدت ہے۔

قن آیام آخر، آخر سیبویہ کے نزدیک غیر منصرف ہے کیونکہ یہ الف لام سے پھیرا گیا ہے۔ کیونکہ اس باب سے فعل کے وزن پر الف لام کے ساتھ آتا ہے جیسے الکبر، الفضل۔ کسائی نے کہا: یہ آخر سے معدول ہے۔ جیسے تو کہتا ہے حمراء، حمراء اسی وجہ سے یہ غیر منصرف ہے۔ بعض نے فرمایا یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ جمع کے وزن پر ہے، یہ ایام کی صفت ہے آخری نہیں آیا تاکہ یہ شبہ نہ ہو کہ یہ عدۃ کی صفت ہے۔ بعض نے فرمایا: آخر یہ آخری کی جمع ہے گویا ایام آخری پھر کثرت کی وجہ سے ایام آخر کہا گیا۔ بعض نے فرمایا: اگر یہ ایام کی صفت ہوتا تو مونث ہوتا اسی وجہ سے آخر کے ساتھ نعت لگائی گئی ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** لوگوں کا قضا روزے متواتر رکھنے کے متعلق اختلاف ہے۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں: دونوں وار قطنی نے اپنی سنن میں ذکر کئے ہیں۔ حضرت عائشہ بنتی شہا سے مروی ہے، فرمایا فعدۃ من ایام آخر متشابہات نازل ہوا ہے پھر متشابہات ساقط ہو گیا اور یہ فرمایا: یہ اسناد صحیح ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس پر رمضان کے روزے ہوں وہ متواتر رکھے اور ان میں انقطاع نہ کرے۔ اس کی سند میں عبدالرحمن بن ابراہیم ضعیف الحدیث ہے۔ حضرت ابن عباس سے قضا روزوں کے متعلق مروی ہے، صہ کیف شئت۔ تو جیسے چاہے روزے رکھ۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: صہ کما افطرتہ۔ جیسے تو نے افطار کئے اسی طرح روزے رکھ۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح، حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عمرو بن عاص سے مسند مروی ہے۔ محمد بن منکدر نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے رمضان کے (قضا) روزے علیحدہ علیحدہ قضا کرنے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ تجھ پر منحصر ہے تم بتاؤ اگر تم میں سے کسی پر قرض ہو ایک درہم، وہ دو درہم ادا کرے تو کیا وہ ادائیگی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے اور بخشنے کا زیادہ حقدار ہے۔ اس کی سند حسن ہے مگر مرسل ہے اور متصل ثابت نہیں ہے۔ مؤطا امام مالک میں نافع سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے تھے: رمضان کے متصل روزے رکھے جو مرض یا سفر کی وجہ سے متواتر افطار کرے۔ الباجی نے ”المشتقی“ میں فرمایا یہ احتمال ہے کہ وجوب کے متعلق خبر ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ استحباب کے متعلق خبر ہو، جمہور کا قول استحباب پر ہے۔ اگر وہ جدا جدا بھی رکھے تب بھی جائز ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا یہی قول ہے۔ اس قول کی صحت پر دلیل یہ ارشاد ہے فعدۃ قن آیام آخر۔ یہاں متفرق اور متواتر کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی۔ جب متفرق رکھے گا تو دوسرے دنوں کی گنتی پوری کر دی پس اس کا جائز ہونا واجب ہے۔ ابن عربی نے کہا: (رمضان کے) مہینہ میں متواتر واجب ہے کیونکہ وہ معین ہے اور قضا میں تعیین واجب نہیں۔ پس تفریق جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** یہ قضا کے وجوب پر بغیر زمانہ کی تعیین کی دلیل ہے کیونکہ لفظ زمانہ کے متعلق عام ہے بعض، بعض کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: مجھ پر رمضان کے روزے ہوتے تھے میں شعبان سے پہلے قضا نہیں کر سکتی تھی رسول اللہ ﷺ سے مشغولیت کی وجہ سے۔ ایک روایت میں ہے رسول اللہ ﷺ کے مرتبہ کے خیال سے (1)۔ یہ نص ہے اور آیت کا بیان ہے۔ یہ داؤد کے قول کا رد کرتی ہے۔ اس پر دو شوال سے قضا واجب ہے تو جس نے دو شوال کو روزہ نہ رکھا پھر وہ مر گیا تو ان کے نزدیک وہ گنہگار ہے اور انہوں نے اس پر بنیاد رکھی ہے کہ جس پر غلام کا آزاد کرنا واجب تھا پھر اس نے غلام پایا جو شمن کے ساتھ بیچا جاسکتا تھا تو اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس سے تجاوز کرے اور کوئی دوسرا خریدے کیونکہ اس پر پہلا غلام آزاد کرنا واجب تھا جو اس نے پایا تھا دوسرا غلام جائز نہیں ہے۔ اگر اس کے پاس غلام ہو تو اس کے لئے دوسرا خریدنا جائز نہیں اگر وہ مر جائے جو اس کے پاس ہے تو عتق باطل نہ ہوگا جس طرح اس کے حق میں عتق باطل ہو جاتا ہے جو معین غلام کو آزاد کرنے کی نذر مانے پھر وہ مر جائے تو اس کی نذر باطل ہو جائے گی اور یہ اس کے قول کو فاسد کرتا ہے۔ بعض اصولی علماء نے کہا: جب شوال کے دوسرے دن کے گزرنے کے بعد وہ مر جائے تو عزم کی شرط پر گنہگار نہ ہوگا۔ صحیح یہ ہے کہ اس صورت میں وہ نہ تو گنہگار ہوگا اور نہ وہ کوتاہی کرنے والا شمار ہوگا۔ یہ جمہور کا قول ہے لیکن جلدی قضا کرنا مستحب ہے تاکہ کہیں اسے موت نہ آجائے اور اس پر فرض باقی ہو۔

**مسئلہ نمبر 9:** جس پر رمضان کے قضا روزے ہوں اور اس پر عید الفطر کے بعد اتنے ایام گزر گئے جن میں اس کا روزے رکھنا ممکن تھا اس نے روزوں کو موخر کیا پھر اس کو کوئی مانع لاحق ہوا جس نے اسے دوسرے رمضان تک قضا کرنے سے روک رکھا تو اس پر کوئی کھانا کھانا نہیں ہے کیونکہ وہ تاخیر کے جواز کی وجہ سے کوتاہی کرنے والا نہیں ہے۔ یہ مالکیوں میں سے بغدادی علماء کا قول ہے اور وہ "السدونہ" میں ابن قاسم کا قول روایت کرتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 10:** اگر آئندہ شعبان تک بھی قضا روزے نہ رکھے تو کیا اس وجہ سے اس پر کوئی کفارہ واجب ہے یا نہیں؟ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق نے کہا: ہاں، اس پر قضا ہے۔ امام ابو حنیفہ، حسن، نخعی اور داؤد نے کہا: نہیں۔

میں کہتا ہوں: امام بخاری کا خیال بھی یہی ہے کیونکہ انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس سے مرسل مروی ہے کہ وہ کھانا کھلائے اور اللہ تعالیٰ نے کھانا کھلانے کا ذکر نہیں کیا بلکہ فرمایا **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ**۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابو ہریرہ سے مسند اس شخص کے بارے میں مروی ہے جو رمضان کے قضا روزوں میں کوتاہی کرتا ہے حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ جاتا ہے۔ فرمایا: وہ لوگوں کے ساتھ اس رمضان کے روزے رکھے اور جن روزوں میں کوتاہی کی ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کو دارقطنی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ سند صحیح ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جس نے رمضان کے مہینہ کے روزے کسی مرض کی وجہ سے نہیں رکھے پھر وہ صحیح ہو گیا اور پھر بھی روزے نہیں رکھے حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ گیا تو وہ اس رمضان کے روزے رکھے پھر اس

1۔ صحیح بخاری، باب متى يقطع رمضان، حدیث نمبر 1814، فیما القرآن پہلی کیشنز



مہینہ کے روزے رکھے جس کے روزے افطار کئے تھے یا یہ ہردن کے لئے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کی سند میں ابن تافع اور ابن وجیہ دو ضعیف راوی ہیں۔

**مسئلہ نمبر 11:** اگر کسی کا مرض لمبا ہو گیا اور وہ صحیح نہ ہوا حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ گیا تو دارقطنی نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ وہ ہردن کے بدلے ایک مسکین کو ایک مد گندم کھلائے پھر اس پر قضا نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا: جب دو رمضانوں کے درمیان صحیح نہ ہو تو اس رمضان کے روزے رکھے اور دوسرے رمضان کی طرف سے کھانا کھلائے اور اس پر قضا نہیں ہے۔ جب صحیح ہو اور روزہ نہ رکھا حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ جائے تو اس رمضان کے روزے رکھے اور گزشتہ رمضان کی طرف سے کھانا کھلائے جب افطار کرے تو قضا کرے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: صحابہ کے اقوال سے قیاس کے خلاف حجت پکڑی جاتی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور پوچھا: میں دو رمضان بیمار رہا۔ اسے حضرت ابن عباس نے فرمایا: تمہاری مرض متواتر رہی ہے یا درمیان میں تو صحیح بھی ہوا تھا؟ اس شخص نے کہا: میں صحیح ہوا تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: دونوں رمضانوں کے روزے رکھ اور ساٹھ مسکین کو کھانا کھلا۔ یہ حضرت ابن عباس کے اس قول کا بدل ہے: اگر اس کے ساتھ مرض بڑھ جائے تو اس پر قضا نہیں ہے۔ یہ حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کے بارے میں ان کے۔ ہب کے مشابہ ہے کہ وہ کھانا کھلائیں اور ان پر قضا نہیں ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 12:** پھر جن علماء نے کھانا کھانا واجب کیا ہے، اس کھانے کی مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت ابو ہریرہ، قاسم بن محمد، امام مالک، امام شافعی فرماتے ہیں: ہردن کی طرف سے ایک مد کھلائے۔ ثوری نے کہا: ہردن کے بدلے نصف صاع کھلائے۔

**مسئلہ نمبر 13:** پھر اس شخص کے بارے اختلاف ہے جو رمضان کے قضا روزوں میں افطار کرے یا جماع کرے اس پر کیا واجب ہے؟ امام مالک نے فرمایا: جس نے بھول کر رمضان کے قضا روزوں میں سے کوئی روزہ توڑ دیا تو اس پر بغیر قضا کے کچھ واجب نہیں ہے۔ اس کے لئے مستحب ہے کہ اختلاف کی وجہ سے اس روزے کو پورا کرے پھر اس کی قضا کرے اور اگر جان بوجھ کر افطار کیا تو گنہگار ہوگا اور اس پر اس دن کی قضا کے علاوہ کچھ نہ ہوگا اور اس روزہ کی پابندی نہ کرے کیونکہ اس کو ان چیزوں سے روکنے کا اب کوئی معنی نہیں جن سے روزہ دار رکتا ہے کیونکہ جان بوجھ کر توڑنے کی وجہ سے علماء کے نزدیک وہ روزہ دار نہیں رہا۔ رہا کفارہ تو امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک اس میں کفارہ واجب نہیں ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جس نے بیوی سے حقوق زوجیت ادا کر کے یا اس کے علاوہ کسی طرح رمضان کا قضا روزہ توڑا تو اس پر کفارہ نہیں ہے، اس پر اس دن کی قضا ہے۔ قتادہ نے کہا: جس نے رمضان کے قضا روزے میں جماع کیا اس پر قضا اور کفارہ ہے۔

ابن القاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ جس نے رمضان کا قضا روزہ توڑ دیا تو اس پر دودن کی قضا ہے۔ ابن القاسم پہلے بھی فتویٰ دیتے تھے پھر اس سے رجوع کر لیا تھا پھر فرمایا: اگر قضا کی قضا میں جان بوجھ کر افطار کیا تو اس کی جگہ دودنوں کے روزے رکھے گا جیسے جس نے اپنا حج اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کرنے کے ساتھ فاسد کر دیا، پھر اس نے آئندہ سال حج

کیا پھر اسے اپنی بیوی سے جماع کرنے کے ساتھ فاسد کر دیا تو اس پر دو حج ہوں گے۔ ابو عمرو نے کہا: ابن وہب اور عبد الملک نے حج میں اس کی مخالفت کی ہے۔ مختلف فیہ میں اصل پر قیاس واجب نہیں ہے۔ میرے نزدیک..... واللہ اعلم صحیح یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں ایک دن کی قضا واجب ہے کیونکہ یہ ایک دن تھا اس نے اسے دو مرتبہ فاسد کیا۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کے ارشاد قَعِدْتَ قَوْمًا يَأْتِيهِمْ أَخْرَ کا یہی مقتضا ہے جب اس نے قضا رمضان میں افطار کی وجہ سے ایک پورا دن روزہ رکھ لیا تو اس نے واجب ادا کر دیا اس پر اس کے علاوہ کچھ واجب نہیں ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 14:** جمہور علماء کا قول ہے کہ جو کسی بیماری کی وجہ سے رمضان کا روزہ توڑ دے پھر وہ اسی بیماری کی وجہ سے مرجائے یا وہ سفر کرے اور اسی سفر میں مرجائے تو اس پر کچھ واجب نہیں۔ طاؤس اور قتادہ نے اس مریض کے بارے میں فرمایا جو صحیح ہونے سے پہلے مرجائے کہ اس کی طرف سے کھانا کھلایا جائے۔

**مسئلہ نمبر 15:** اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس پر رمضان کے روزے تھے اور ابھی قضا نہیں کئے تھے۔ امام مالک، امام شافعی اور ثوری نے کہا: کوئی کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے۔ امام احمد، اسحاق، ابو ثور، لیث، ابو عبید اور اہل ظواہر نے کہا: اس کی طرف سے روزہ رکھا جائے مگر انہوں نے اس کو نذر کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اسی طرح امام شافعی سے مروی ہے۔ امام احمد اور اسحاق نے رمضان کے قضا روزوں کے متعلق بتایا کہ اس کی طرف سے کھانا کھلایا جائے۔ جنہوں نے روزہ رکھنے کا قول کیا ہے انہوں نے مسلم کی حضرت عائشہ بنت نبیؓ کی مروی سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مرجائے اور اس پر روزہ ہو تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے (1) مگر یہ ارشاد روزہ میں عام ہے اور مسلم کی حضرت ابن عباس سے روایت اس کی خاص کرتی ہے۔ فرمایا: ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! میری والدہ فوت ہو گئی ہے اور اس پر نذر کا روزہ تھا۔ ایک روایت میں ہے کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھوں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم بتاؤ اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو تو اسے ادا کرتی تو کیا وہ اس کی طرف سے ادا ہو جاتا؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو اپنی ماں کی طرف سے روزہ رکھ۔ امام مالک اور ان کے ہم مذہب لوگوں نے اس قول سے حجت پکڑی ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى (فاطر: 18) (کوئی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (النجم) (انسان کے لئے نہیں ہے مگر جو اس نے کوشش کی) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا (انعام: 164)

اور اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جو نسائی نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے، فرمایا: کوئی کسی کی طرف سے نماز نہ پڑھے اور کوئی کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے بلکہ اس کی طرف سے ہر دن کے بدلے ایک مدگندم کھلائی جائے۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث عام ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ لایصوم احد عن احد سے مراد رمضان کا روزہ ہو۔ رہا نذر کا روزہ

1۔ صحیح بخاری، باب من مات وعليه صوم، حدیث نمبر 1816، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو وہ جائز ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ کی حدیث کی دلیل کی وجہ سے۔ صحیح مسلم میں حضرت بریدہ کی حدیث حضرت ابن عباس کی حدیث کی طرح ہے اور اس کے بعض طرق میں سے دو مہینوں کے روزے تھے۔ کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی طرف سے روزہ رکھو۔ پھر اس عورت نے کہا: اس نے کبھی حج نہیں کیا تھا، کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تو اس کی طرف سے حج کر۔ اس عورت کا قول کہ دو مہینے کے روزے تھے، یہ رمضان کے روزے ہونے کی نفی کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔ سب سے قوی دلیل جو امام مالک کی طرف سے پیش کی جاتی ہے وہ اہل مدینہ کا عمل ہے اور قیاس جلی اس کی تائید کرتا ہے اور یہ عبادت بدنی ہے اس میں مال کا کوئی دخل نہیں ہے پس جس پر بدنی عبادت جیسے نماز واجب ہو تو دوسرا اس کی طرف سے ادا نہیں کرے گا اور یہ قول، حج کرنے کے قول سے نہیں ٹوٹا کیونکہ اس میں مال کا دخل ہے (☆)۔

**مسئلہ نمبر 16:** اس آیت میں ان علماء نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ سفر میں روزہ منعقد ہی نہیں ہوتا اس پر ہمیشہ قضا ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ**۔ یعنی اس پر تعدا ہے کلام میں نہ حذف ہے، نہ اضمار ہے اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ سفر میں روزہ نیکی میں سے نہیں ہے۔ فرمایا: جو نیکی میں سے نہ ہو گا وہ گناہ ہوتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ رمضان کا روزہ سفر میں جائز نہیں۔

جمہور علماء کہتے ہیں: فاقطع محذوف ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور یہی قول صحیح ہے کیونکہ حضرت انس کی حدیث میں ہے: ہم نے رمضان میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کیا کسی روزہ دار نے افطار کرنے والے پر اور کسی افطار کرنے والے نے روزہ دار پر عیب نہ لگایا۔ اس کو مالک نے حمید الطویل سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے اس کو مسلم نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نے رسول اللہ ﷺ سے مل کر ایک جنگ میں شرکت کی رمضان کے سولہ دن گزر گئے تھے ہم میں سے بعض نے روزہ رکھا تھا اور بعض نے افطار کیا تھا۔ روزہ دار نے افطار کرنے والے پر اور افطار کرنے والے نے روزہ دار پر عیب نہیں لگایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۚ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ** ⑤

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** **وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ** جمہور علماء نے طا کے کسرہ اور یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس کی اصل بطوقونہ تھی کسرہ کو طا کی طرف نقل کیا گیا اور وا کو ما قبل کسرہ کی وجہ سے کسرہ سے بدلا گیا۔ حمید نے اصل پر بغیر اعلال کے پڑھا ہے اور قیاس اعلال ہے (1)۔ حضرت ابن عباس کی مشہور قراءت بطوقونہ طاء مخففہ کے فتح اور واو کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے وہ تکلیف اٹھاتے ہیں۔ مجاہد سے بطوقونہ طاء کے بعد یاء کے ساتھ یکیلونہ کے لفظ پر پڑھا ہے۔

☆ امر احناف کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا



یہ باطل اور محال ہے کیونکہ فعل طوق سے ماخوذ ہے اس میں واولا لازم اور واجب ہے اس مثال میں یا کا کوئی دخل نہیں ہے۔  
ابو بکر انباری نے کہا: احمد بن یحییٰ نحوی نے ابن ذؤب کا یہ شعر پڑھا ہے:

قفیل تحمل فوق طوقك انها مطبعة من ياتها لا يفيدها

طوق میں واو کو ظاہر کیا، اس کی وجہ سے صحیح یہ ہے کہ واو کی جگہ یا کو رکھنے والا صواب (صحیح رائے) سے دور ہے۔ ابن انباری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، یطيقونه یا کے فتح، طا کی تشدید اور فتح کے ساتھ، پھر یا کی تشدید اور فتح کے ساتھ بمعنی یطيقونه کہا جاتا ہے طاق، اطاق، اطيع سب کا ایک معنی ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ، حضرت طاؤس اور حضرت عمرو بن دینار سے یطوقونه یا مفتوحہ، طامشودہ مفتوحہ کے ساتھ مروی ہے۔ لغت میں یہ درست ہے کیونکہ اس کی اصل لیتطوقونه ہے تا کو ساکن کر کے طامیں ادغام کیا گیا تو طامشودہ ہوگی اور یہ قرآن سے نہیں ہے خلاف اس کے جس نے اس قراءت کو قرآن ثابت کیا ہے۔ یہ تفسیر کی بنا پر قراءت ہے۔ اہل مدینہ اور شام نے۔ فُذِيَّةٌ طَعَامٌ مضاف کر کے پڑھا ہے اور مساکین جمع پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس نے طعام مسکین، مفرد پڑھا ہے جیسا کہ بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے عطا سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے (1)۔ یہ عمدہ قراءت ہے کیونکہ اس نے ایک دن میں جو حکم تھا اس کو بیان کیا۔ ابو عبید نے اس کو اختیار کیا یہ ابو عمرو، حمزہ اور کسائی کی قرأت ہے۔ ابو عبید نے کہا اس قرأت نے بیان کیا کہ ہر دن کے لئے ایک شخص کو کھانا کھلانا ہے اور واحد جمع کی ترجمانی کرتا ہے جبکہ جمع، واحد کی ترجمانی نہیں کرتی۔ مساکین جمع ہو تو معلوم نہیں ہوتا ان میں سے کتنے ایک دن میں مگر کسی دوسری آیت سے اور مساکین میں جمع کی قراءت اس کو ظاہر کرتی ہے۔ کیونکہ الذین یطيقونه جمع اور ان میں سے ہر ایک کو ایک مسکین لازم تھا پس اس کا لفظ جمع لایا گیا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ الَّذِينَ يَزْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَلَاثِينَ جَلْدَةً (النور: 4) یعنی ہر ایک کو اسی کوڑے لگاؤ۔ اسی کوڑے ان تمام میں متفرق طور پر نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کے لئے اسی کوڑے ہیں۔ ابو علی نے یہ معنی بیان کیا (2)۔ جمع کی قراءت نحاس نے اختیار کی۔ فرمایا: ابو عبید نے جو اختیار کیا وہ مردود ہے کیونکہ یہ دلالت سے پہچانی گئی ہے۔ اور عَلَيَّ الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فُذِيَّةٌ طَعَامٌ مُسْكِينٍ کا معنی یہ ہے کہ ہر دن کے لئے ایک مسکین ہے اس قراءت کا اختیار جمع پر جمع کو رد کرتا ہے۔ نحاس نے کہا: ابو عبید نے فذیۃ طعام پڑھنا پسند کیا ہے فرمایا: طعام سے مراد فدیہ ہے پس طعام کا صفت ہونا جائز نہیں کیونکہ یہ جو ہر ہے لیکن بطور بدل جائز ہے۔ فذیۃ طعام اضافت کے ساتھ پڑھنا اس سے زیادہ واضح ہے کیونکہ فذیۃ مبہم ہے طعام وغیرہ کے لئے واقع ہوتا ہے۔ پس یہ تیرے قول ہذا شوب عی کی طرح ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** آیت کی مراد میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ منسوخ ہے۔ بخاری نے روایت کیا ہے، ابن نمیر نے فرمایا: ہمیں امش نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں عمرو بن مرہ نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں ابن ابی لیلیٰ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ رمضان کا حکم نازل ہوا تو لوگوں پر گراں گزرا۔ پس جس نے ہر دن

1۔ سنن ابی داؤد، باب نسخ قولہ تعالیٰ وعل الذین یطيقونه فذیۃ، حدیث نمبر 1972، ضیاء القرآن پبلی کیشنز  
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ایک مسکین کو کھانا کھلایا اس نے روزہ چھوڑ دیا ان لوگوں میں سے جو روزہ رکھنے کی طاقت بھی رکھتے تھے۔ پہلے ان کو اس کی رخصت دی گئی تھی پھر اس کو **وَ اَنْ تَصُوْمُوْا حَتّٰی تَكُوْمُوْا** نے منسوخ کر دیا۔ اسی پر جمہور کی قراءت یطیقونہ ہے یعنی وہ روزہ کی طاقت رکھتے تھے۔ کیونکہ روزے کا فرض اسی طرح تھا جو چاہتا روزہ رکھتا اور جو چاہتا مسکین کو کھانا کھلاتا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت شیوخ اور بوڑھے لوگوں کے لئے رخصت تھی جب کہ وہ افطار کرنا چاہیں اگرچہ وہ روزے کی طاقت بھی رکھتے ہوں۔ پھر یہ آیت اس قول **فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** (البقرہ: 185) سے منسوخ ہو گئی۔ پس یہ رخصت ختم ہو گئی مگر اس کے لئے باقی ہے جو ان میں سے روزہ رکھنے سے عاجز ہے۔ (1)

فراء نے کہا: یطیقونہ میں ضمیر کا مرجع صیام ہونا بھی جائز ہے۔ یعنی ان پر جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں وہ جب افطار کریں تو کھانا کھلائیں پھر یہ **وَ اَنْ تَصُوْمُوْا** کے ساتھ منسوخ ہو گیا اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مرجع فدیہ ہو یعنی جو فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں اور وہی یطیقونہ کی قراءت اس کا معنی ہے: وہ مشقت جو ان کو لاحق ہوئی ہے اس کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں جیسے مریض اور حاملہ عورت وہ دونوں اس پر قدرت رکھتے ہیں لیکن مشقت کے ساتھ جو انہیں لاحق ہوئی ہے، اگر وہ روزہ رکھ لیں تو بھی جائز ہے اور اگر وہ فدیہ دیں تو یہ بھی ان کے لئے جائز ہے۔ حضرت ابن عباس نے یطیقونہ کی تفسیر بتکفونہ سے بیان فرمائی ہے۔ اگر ان سے اسناد صحیح ہو۔ بعض نقل کرنے والوں نے اسے قرآن میں داخل کر دیا۔ ابو داؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے (2)، **وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فَرَمَا يَهِ حَبِلٌ (حاملہ عورت) اور دودھ پلانے والی عورت کے لئے ثابت ہے اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فَرَمَا يَهِ طَعَامٌ مِّسْكِينٍ** بوڑھے اور بوڑھی عورت کے لئے رخصت تھی حالانکہ وہ روزہ رکھ سکتے تھے وہ افطار کریں اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں اور حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کو جب اپنی اولاد پر خوف ہو تو وہ افطار کریں اور کھانا کھلائیں (3)۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے یہ بھی روایت کیا ہے، فرمایا: بوڑھے آدمی کے لئے رخصت دی گئی ہے کہ وہ افطار کرے اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور اس پر قضا نہیں ہے۔ یہ صحیح سند ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے، فرمایا: **وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فَرَمَا يَهِ طَعَامٌ** یہ منسوخ نہیں ہے۔ اس سے مراد بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت ہیں جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے وہ ہر دن کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ یہ صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے آپ نے اپنی ام ولد کو فرمایا جو حاملہ تھی یا دودھ پلانے والی تھی، تو ان لوگوں میں سے ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے تم پر جزا ہے، قضا نہیں ہے۔ یہ اسناد صحیح ہے۔ ایک روایت میں ہے، آپ کی ام ولد دودھ پلاتی تھی (بغیر شک کے ہے) اس کو تکلیف ہوئی تھی تو آپ نے اسے افطار کرنے کا حکم دیا اور قضا نہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس سے صحیح اسناد کے ساتھ ثابت ہے کہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ یہ جن کا ذکر کیا گیا ہے ان

2۔ سنن ابی داؤد، باب من قال فی مشیئة للشیخ، حدیث 1973، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

1۔ المحرر الوجیز تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ سنن ابی داؤد، باب من قال فی مشیئة للشیخ، حدیث 1974، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے حق میں محکم ہے۔ پہلا قول بھی صحیح ہے مگر یہ احتمال ہے کہ نسخ وہاں تخصیص کے معنی میں ہو۔ متقدمین اکثر تخصیص کے معنی میں نسخ کو استعمال کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ حضرات حسن بھری، عطاء بن ابی رباح، ضحاک، نخعی، زہری، ربیعہ، اوزاعی اور اصحاب رائے نے فرمایا: حاملہ اور دودھ پلانے والی دونوں روزہ افطار کریں اور ان پر کھانا نہیں ہے۔ یہ مریض کی طرح ہیں وہ افطار کرتا ہے اور قضا کرتا ہے۔ یہ ابو عبید اور ابو ثور کا قول ہے۔ یہ ابو عبید نے ابو ثور سے حکایت کیا ہے۔ ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔ یہ امام مالک کا قول حاملہ کے بارے میں ہے اگر وہ افطار کرے۔ ربیعہ دودھ پلانے والی اگر وہ افطار کرے تو اس پر قضا اور کھانا کھانا ہے۔ امام شافعی اور امام احمد نے فرمایا: وہ افطار کریں گی اور کھانا کھائیں گی اور قضا کریں گی۔ اور اس پر اجماع ہے کہ بوڑھے مرد اور عورتیں جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے اور سخت مشقت کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں وہ افطار کریں اور جوان پر واجب ہے اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ ربیعہ اور مالک نے کہا: ان پر کچھ واجب نہیں ہے۔ لیکن امام مالک نے کہا: اگر وہ ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں تو میرے نزدیک محبوب ہے۔ حضرت انس، حضرت ابن عباس، حضرت قیس بن السائب اور حضرت ابو ہریرہ نے کہا: ان پر فدیہ ہوگا۔ یہ امام شافعی اور اصحاب رائے کا مسلک ہے۔ انہوں نے تمام صحابہ کے قول کی اتباع کرتے ہوئے کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** پھر فرمایا **وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ** یہ لوگ نہ مریض ہیں اور نہ مسافر ہیں ان پر فدیہ واجب ہے اور امام مالک کے قول کی دلیل ہے کہ یہ عذر کی وجہ سے افطار کرنے والا ہے جو اس میں موجود ہے اور وہ بوڑھا ہوتا ہے اور بڑی عمر کا ہوتا ہے۔ پس کھانا کھانا لازم نہ ہو گا جیسے مسافر اور مریض پر کھانا کھانا نہیں ہے۔ یہ ثوری، مکحول سے مروی ہے، ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** علماء کا فدیہ کی مقدار میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا ہر دن کے بدلے ایک مد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مد کے برابر دے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: ہر دن کا کفارہ ایک صاع کھجور یا نصف صاع گندم ہے۔ حضرت ابن عباس سے نصف صاع گندم مروی ہے۔ یہ دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: جو بوڑھا ہو اور روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس پر ہر دن کے لئے ایک مد گندم ہے۔ حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ وہ ایک سال روزہ رکھنے سے کمزور ہو گئے تو آپ نے کھانے کا ایک تھال تیار کیا پھر تیس مساکین کو بلایا اور انہیں سیر کر کے کھلایا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ** ابن شہاب نے فرمایا: جو روزے کے ساتھ کھانا کھلانے کا ارادہ کرے اور مجاہد نے کہا: جو کھانے میں مد پر زیادتی کرے (1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا **فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا** دوسرے مسکین کو کھلائے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے۔ یہ دارقطنی نے ذکر کیا ہے اور کہا: اس کی سند صحیح ثابت ہے اور دوسرا حدیث، اسم تفصیل ہے اسی طرح تیسرا اور پہلا بھی (2)۔ عیسیٰ بن عمر اور یحییٰ بن وثاب، حمزہ اور کسائی نے یطوع خیراً مشدود پڑھا ہے اور عین کو جزم دی ہے یطوع کے معنی میں اور باقی قراء نے تطوع تا اور طا کی تخفیف اور عین کے فتح کے ساتھ ماضی کا صیغہ پڑھا ہے۔



**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَأَنْ تَصُومُوا** یعنی روزہ تمہارے لئے بہتر ہے اسی طرح الی نے پڑھا ہے (1) یعنی فدیہ کے ساتھ افطار سے روزہ رکھنا بہتر ہے یہ نسخ سے پہلے تھا۔ بعض نے فرمایا **وَأَنْ تَصُومُوا** یعنی سفر اور مرض میں بغیر تکلیف کے روزہ رکھنا، واللہ اعلم۔ یہ روزے رکھنے پر ابھارنے کا تقاضا کرتا ہے یعنی تم یہ جان لو اور روزہ رکھو۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى  
وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَ مَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ  
فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۚ وَلِتُكْمِلُوا  
الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٢٠﴾

”ماہ رمضان المبارک جس میں اتارا گیا قرآن اس حال میں کہ یہ راہ حق دکھاتا ہے لوگوں کو اور (اس میں) روشن دلیلیں ہیں ہدایت کی اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو تو وہ یہ مہینہ روزے رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تمہارے لئے سہولت اور نہیں چاہتا تمہارے لئے دشواری اور (چاہتا ہے) تم گنتی پوری کر لیا کرو اور اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کیا کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر گزاری کیا کرو۔“

اس میں اکیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **شَهْرُ رَمَضَانَ** اہل تاریخ نے کہا: سب سے پہلے رمضان کا روزہ حضرت نوح علیہ السلام نے رکھا جب وہ کشتی سے باہر نکلے تھے۔ مجاہد کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت پر رمضان فرض کیا تھا اور یہ معلوم ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے بھی امتیں تھیں۔ واللہ اعلم۔ الشہر یہ الاشہار سے مشتق ہے کیونکہ یہ مشہور ہوتا ہے کسی پر اس کا علم مشکل نہیں ہوتا جو اس کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: شہرت السیف (جب کوئی تلوار سونت لے) رمضان رمض الصائم یرمض سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ہے: شدت پیاس کی وجہ سے روزہ دار کا پیٹ گرم ہو گیا۔ الرمضاء (ممدودة) سخت گرمی کو کہتے ہیں۔ اس سے حدیث ہے: صلاة الاوابین اذا رمضت الفصال۔ اوابین کی نماز اس وقت ہے جب گرمی سے پاؤں جلنے لگ جائیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ رمض الفصال کا مطلب ہے: گرمی اونٹوں کے پاؤں جلادے اور وہ گرمی کی وجہ سے بیٹھ جائیں۔ رمضان گرمی میں واقع ہوا۔ یہ رمضاء سے ماخوذ ہے جو ہری نے کہا: شہر رمضان اس کی جمع رمضانات اور رمضاء آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لوگوں نے مہینوں کے اسماء لغت قدیرہ سے نقل کئے ہیں اور انہوں نے ان کے نام اس زمانہ کے ساتھ رکھے جس میں وہ مہینہ واقع ہوا۔ یہ مہینہ شدید گرمی میں واقع ہوا تو اس وجہ سے اس کا نام رمضان رکھا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: رمضان کو رمضان اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ

گناہوں کو جلا دیتا ہے۔ یعنی اعمال صالحہ کے ساتھ گناہوں کو جلا دیتا ہے یہ الارماض سے ہے جس کا معنی جلاتا ہے۔ اس سے رمضت قدمہ ہے۔ یہ الرمضاء سے ہے یعنی اس کا پاؤں جل گیا۔ ارمضتفی الرمضاء یعنی گرمی نے مجھے جلا دیا۔ اسی سے کہا جاتا ہے ارمضنی الامر۔ معاملہ نے مجھے جلا دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس مہینہ میں دل موعظت اور آخرت کے امر میں فکر کی حرارت حاصل کرتے ہیں جس طرح ریت اور پتھر سورج کی گرمی حاصل کرتے ہیں۔ الرمضاء۔ گرم پتھر۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ رمضت النصل ارمضہ وارمضہ رمضاً سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے دو پتھروں کے درمیان تیر کے بھالے کو کوٹنا تاکہ باریک ہو جائے۔ اسی سے نصل رمیض و مرموض ہے۔ یہ ابن السکیت سے مروی ہے۔ رمضان کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ رمضان میں اپنے ہتھیاروں کو تیز کرتے تھے تاکہ ان کے ساتھ حرمت والے مہینوں کے داخل ہونے سے پہلے شوال میں جنگ کریں۔ ماوردی نے حکایت کیا ہے کہ اس کا نام زمانہ جاہلیت میں ناتق تھا۔

و فی ناتق اجلت لدی حومة النوغی وولت علی الادبار فرسان خشعا

اس شعر میں ناتق رمضان کے مہینہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

شہر پر رفع ابتدا کی بنا پر ہے اور خبر الذی انزل فیہ القرآن ہے یا یہ مبتدا کے اضاار کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے: المفروض علیکم صومہ شہر رمضان، تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔ رمضان کے مہینہ کا روزہ یا یہ معنی کہ تم پر رمضان کا مہینہ فرض کیا گیا اور یہ بھی جائز ہے کہ شہر مبتدا ہو اور الذی انزل فیہ القرآن صفت ہو اور خبر فمن شهد منکم الشہر ہو (1)۔ الشہر کا ذکر تعظیماً لوثایا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَاقَّةُ ۝ مَا الْحَاقَّةُ ۝ (الحاقہ) اور جائز ہے کہ جزا کا معنی اس میں داخل ہو کیونکہ شہر رمضان اگرچہ معرفہ ہے لیکن بعینہ معرفہ نہیں کیونکہ ہر آنے والے مہینہ میں عام ہے۔ یہ ابو علی کا قول ہے۔ مجاہد اور شہر بن حوشب سے شہر کا نصب بھی مروی ہے۔ اس کو ہارون اعور نے حضرت ابو عمرو سے روایت کیا ہے (2)۔ اس کا معنی ہے: الزموا شہر رمضان یا صوموا، اور الذی انزل فیہ القرآن اس کی نعت ہے اور تصوموا کے ساتھ اس کو نصب دینا جائز نہیں تاکہ صلہ اور موصول کے درمیان ان کی خبر کے ساتھ فاصلہ نہ ہو جائے اور وہ عید لکم ہے۔ رمانی نے کہا اس پر ایاماً معدودات کے قول سے بدل کے اعتبار سے نصب بھی جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اس میں اختلاف ہے کہ کیا شہر کے بغیر رمضان کہا جائے یا نہیں۔ مجاہد نے اس کو ناپسند کیا ہے اس نے کہا: اسی طرح کہا جائے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا (3) شہر رمضان اور حدیث میں ہے: رمضان نہ کہو کیونکہ اس کو منسوب کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے منسوب کیا اور فرمایا شہر رمضان فرماتے تھے: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے وہ اس معنی کی وجہ سے اس کے لفظ کی جمع بنانا پسند کرتے تھے اور اس روایت سے حجت پکڑتے تھے۔ رمضان اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ ابو معشر نجیح کی حدیث سے ہے اور یہ ضعیف ہے۔ بغیر اضافت کے رمضان کہنا بھی صحیح ہے جیسا کہ صحاح میں ثابت ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب رمضان آتا ہے تو رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کئے جاتے ہیں اور شیطان جکڑے جاتے ہیں۔ البستی کی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب رمضان ہوتا ہے تو اس کے لئے رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کئے جاتے ہیں اور شیاطین زنجیروں میں جکڑے جاتے ہیں (1)۔ ابن شہاب عن انس بن ابی انس کے سلسلہ سے مروی ہے کہ ان کے والد نے انہیں بتایا کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ کو یہ فرماتے سنا..... پھر یہ حدیث بیان کی۔ البستی نے کہا: انس بن ابی انس یہ مالک بن انس کا والد ہے۔ ابوانس کا نام مالک بن ابی عامر ہے یہ مدینہ طیبہ کے ثقہ لوگوں سے ہے ان کا سلسلہ نسب یہ ہے مالک بن ابی عامر بن عمرو بن حارث بن عثمان بن جثیل بن عمرو بن عیسیٰ بن قباکل میں سے ذی الحج سے تھا۔

نسائی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس رمضان آیا ہے، مبارک مہینہ ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر اس کے روزے فرض کئے ہیں اس میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور اس میں دوزخ کے دروازے بند کئے جاتے ہیں اور اس میں سرکش شیطانوں کو جکڑ دیا جاتا ہے اس میں اللہ کی ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے جو اس کی خیر سے محروم رہا وہ محروم ہو گیا۔ ابو حاتم البستی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور فرمایا: سرکش شیطانوں کا جو ذکر آیا ہے پہلے جو مطلق احادیث میں ہے کہ شیطان کو باندھ دیا جاتا ہے اس کے لئے یہ تقیید ہے۔ نسائی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری عورت کو فرمایا: اذا كان رمضان فاعتمري فان عسرة فيه تعدل حجة۔ جب رمضان آئے تو تو عمرہ کر کیونکہ اس میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے۔ نسائی نے حضرت عبدالرحمن بن عوف سے روایت کیا ہے (2)، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کئے ہیں اور اس کا قیام تمہارے لئے سنت بنایا ہے۔ جو اس کا روزہ رکھے گا اور اس کا قیام کرے گا ایمان کی حالت میں اور ثواب کی نیت سے تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح نکل جائے گا جیسے جس دن بچے کو ماں جنم دیتی ہے (اور اس پر گناہ نہیں ہوتا) اس کے متعلق آثار کثیر ہیں۔ ان تمام احادیث میں رمضان کے ساتھ شہر کا لفظ نہیں ہے۔ عرب اکثر رمضان سے شہر کا ذکر ساقط کر دیتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

جارية لي درعها الغضاض ابيض من اخت بني اباض  
جارية في رمضان الباض تقطع الحديث بالاباض  
کھلی قمیص میں لڑکی تھی بنی اباض کی بہن سے سفید تھی۔ گزشتہ رمضان میں لڑکی تھی چمک کی وجہ سے بات کا نئی تھی۔  
رمضان کی فضیلت عظیم ہے اور ثواب بڑا ہے۔ اشتقاق کا معنی اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ گناہوں کو جلانے والا ہے اور اس کے علاوہ احادیث جو ہم نے ذکر کی ہیں وہ اس کی فضیلت پر دلیل ہیں۔

1۔ صحیح بخاری، باب مول یقال رمضان او شہور رمضان ومن رأى كفه واستعا، حدیث نمبر 1766، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب ما جاء في قيام شهر رمضان، حدیث نمبر 1317، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کئے یعنی رمضان کے چاند کی مدت کی وجہ سے اس کو شہر بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: فان غنى عليكم الشهر اگر تم پر چاند ابرا آلود ہو جائے۔ شاعر نے کہا:

اخوان من نجد على ثقة والشهر مثل قلامة الظفر

حقى تكامل فى استدارته فى اربع زادت على عشر

نجد سے بھائی پر اعتماد تھے چاند ناخن کے تراشے کی طرح تھا۔ حتیٰ کہ وہ گولائی میں مکمل ہوا چودھویں کی رات کو بڑھا۔ چاند ابرا آلود ہو تو شعبان کے تیس دنوں کو مکمل کرنا فرض ہے اور رمضان کے تیس دن مکمل کرنا فرض ہے تاکہ ہم عبادت میں یقین سے داخل ہوں اور یقین سے خارج ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا: وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ الَّذِي كَرَّمْنَا بِالنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل: 44) (اور ہم نے نازل کیا آپ کی طرف یہ ذکر (قرآن) تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے جو نازل کیا گیا اس کی طرف)۔

ائمہ کرام نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: چاند کو دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند کو دیکھ کر افطار کرو۔ اگر تم پر مطلع ابرا آلود ہو تو تعداد کو مکمل کرو (1)۔ ایک روایت میں ہے، اگر تم پر مہینہ ابرا آلود ہو جائے تو تیس دن شمار کرو۔ مطرف بن عبد اللہ بن شخیر جو کبار تابعین میں سے تھے اور ابن قتیبہ جو لغت کے علماء میں سے تھے ان دونوں حضرات نے کہا: رمضان کے روزہ میں بادل کے وقت منازل کی تقدیر منازل کے حساب سے حساب لگایا جائے گا حتیٰ کہ اگر مطلع صاف ہوتا تو دیکھا جاتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم پر مطلع ابرا آلود ہو تو تم اس کی منازل سے استدلال کرو (2) اور مہینہ کی تکمیل کا اندازہ اس کے حساب سے لگاؤ۔ جمہور نے کہا: فاقدر روا کا معنی ہے: مقدار کو مکمل کرو۔ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث اس کی تفسیر بیان کرتی ہے: فاكملوا العدة۔ داؤدی نے کہا ہے کہ فاقدر روا الہ کے معنی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ منازل کا اندازہ کرو۔ ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے یہ معنی کیا ہو۔ مگر بعض اصحاب شوافع نجومیوں کے قول کا اعتبار کرتے ہیں۔ اس پر اجماع حجت ہے۔ ابن نافع نے امام مالک سے ”الامام“ میں روایت کیا ہے: چاند کی رویت سے نہ روزہ رکھے نہ افطار کرے بلکہ حساب پر روزہ رکھے اور افطار کرے۔ اس قول کی نہ اقتداء کی جاتی ہے نہ اتباع۔ ابن عربی نے کہا: بعض اصحاب شافعی سے لغزش ہوئی ہے انہوں نے امام شافعی سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے حساب پر اعتماد کیا ہے یہ لغزش ہے۔ اللہ تعالیٰ ٹھوکر سے محفوظ رکھے۔

**مسئلہ نمبر 4:** امام مالک، امام شافعی کا اختلاف ہے کہ ایک شخص کی شہادت سے رمضان کا چاند ثابت ہو گا یا دو گواہوں سے ثابت ہو گا۔ امام مالک نے فرمایا: اس میں ایک شخص کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ چاند پر گواہی ہے اور اس میں دو سے کم افراد کی گواہی قبول نہیں ہوتی۔ اس کی اصل شوال اور ذی الحجہ کے چاند پر شہادت ہے۔ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ نے کہا: ایک شخص کی خبر قبول کی جائے گی کیونکہ ابو داؤد نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے (3)، فرمایا: لوگوں

1۔ منہج بخاری، باب قول النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اذا راہتم الهلال فصوروا ما ذار اہتموا فافطروا، حدیث نمبر 1776، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، حدیث نمبر 1773 3۔ سنن ابی داؤد، باب شہادۃ الواحد علی رؤیۃ ہلال رمضان، حدیث 1995، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے چاند دیکھا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ پس آپ ﷺ نے روزہ رکھا اور لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ دارقطنی نے اس کو نقل کیا ہے اور فرمایا: اس میں مروان بن محمد نے ابن وہب سے روایت کیا ہے اور وہ ثقہ ہے۔ دارقطنی نے روایت کیا ہے ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس رمضان کا چاند دیکھنے کی گواہی دی تو آپ نے روزہ رکھا۔ میرا خیال ہے آپ نے فرمایا: لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا اور حضرت علی نے فرمایا: شعبان کا میں ایک دن روزہ رکھوں۔ یہ میرے نزدیک رمضان کا ایک روزہ چھوڑنے سے زیادہ محبوب ہے۔ امام شافعی نے کہا: اگر عام لوگوں نے رمضان کا چاند نہ دیکھا ہو اور ایک عادل شخص نے دیکھا ہو تو میرا خیال ہے کہ میں اسے اثر اور احتیاط کی وجہ سے قبول کر لوں گا۔ امام شافعی نے اس کے بعد کہا: رمضان پر شہادت دینے کے لئے بھی دو گواہ ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: ہمارے بعض اصحاب نے کہا: میں اس پر دو گواہ ہی قبول کروں گا۔ یہ ہر مغیب پر قیاس ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** علماء کا اختلاف ہے اس شخص کے بارے میں جس نے صرف رمضان کا چاند دیکھا ہو یا صرف شوال کا چاند دیکھا ہو۔ ربیع نے امام شافعی سے روایت کیا ہے: جس نے تنہا رمضان کا چاند دیکھا وہ روزہ رکھے اور جس نے تنہا شوال کا چاند دیکھا وہ افطار کرے اور اس کو پوشیدہ رکھے۔ ابن وہب نے مالک سے اس شخص کے بارے میں روایت کیا ہے جس نے تنہا رمضان کا چاند دیکھا وہ روزہ رکھے کیونکہ اس کے لئے افطار کرنا مناسب نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ دن رمضان کے مہینہ سے ہے اور جس نے تنہا شوال کا چاند دیکھا وہ افطار نہ کرے کیونکہ لوگ تہمت لگائیں گے کہ اس نے افطار کیا جو مامون نہیں پھر جب یہ لوگ غالب آجائیں گے تو کہیں گے ہم نے چاند دیکھا۔ ابن منذر نے کہا: یہی قول لیث بن سعد، امام احمد بن حنبل کا ہے۔ عطا اور اسحاق نے کہا: نہ وہ روزہ رکھے اور نہ افطار کرے۔ ابن منذر نے کہا: وہ روزہ رکھے اور افطار کرے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جب کوئی شخص کسی شہر میں چاند نظر آنے کی خبر دے پھر وہ شہر قریب ہوگا یا دور ہوگا اگر وہ شہر قریب ہے تو اس کا حکم ایک ہے اور اگر وہ شہر دور ہے تو ہر شہر والوں کے لئے اپنی روایت کا اعتبار ہے۔ یہ عکرمہ، قاسم اور سالم سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور اسحاق نے بھی یہی کہا ہے۔ اس کی طرف بخاری نے اشارہ کیا ہے جہاں اس نے باب باندھا ہے کہ ہر شہر والوں کے لئے اپنی روایت کا اعتبار ہے اور دوسرے علماء نے کہا جب لوگوں کے نزدیک ثابت ہو جائے کہ فلاں شہر والوں نے چاند دیکھا تھا تو ان پر اس روزے کی قضا لازم ہے جو انہوں نے چھوڑا تھا۔ اسی طرح لیث بن سعد اور امام شافعی نے کہا: ابن منذر نے کہا: میں یہ نہیں جانتا مگر مرنی اور کوئی کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: الکیا طبری نے اپنی کتاب ”احکام القرآن“ میں ذکر کیا ہے: امام ابو حنیفہ کے اصحاب نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جب کسی شہر والوں نے چاند دیکھ کر تیس دن روزے رکھے ہوں اور دوسرے شہر والوں نے اسی روزے رکھے ہوں تو جنہوں نے اسی روزے رکھے ہوں گے وہ ایک دن کی قضا کریں گے۔ اصحاب شافعی کا یہ نظریہ نہیں ہے۔ کیونکہ شہروں کے مطالع کا مختلف ہونا جائز ہے۔ احناف کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ۔ ایک شہر والوں کی روایت سے ثابت ہوا کہ تعداد تیس ہے، پس ان پر ان کا مکمل کرنا واجب تھا اور ان کے مخالف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول سے حجت پکڑتے ہیں

کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو (الحديث) اور یہ ہر قوم کی ان کے شہر میں عادت کے اعتبار کو ثابت کرتی ہے۔ ابو عمرو نے اجماع حکایت کیا ہے کہ دور والے شہروں کی رویت کی رعایت نہیں کی جائے گی۔ جیسے اندلس، خراسان سے دور ہے اور فرمایا: ہر شہر والوں کی اپنی رویت کا اعتبار ہے مگر جو بڑا شہر ہو اس کے قطر مسلمانوں کے دوسرے شہروں کے قریب ہوں تو پھر سب کے لئے ایک ہی رویت کافی ہوگی۔ مسلم نے کرب سے روایت کیا ہے کہ حضرت ام فضل بنت حارث نے حضرت امیر معاویہ کی طرف انہیں شام کی طرف بھیجا۔ کرب نے کہا: میں شام میں آیا اور اپنی ضرورت کو پورا کیا مجھ پر وہاں رمضان کا چاند طلوع ہو گیا جبکہ میں ابھی شام میں ہی تھا میں نے جمعہ کی رات چاند دیکھا تھا پھر میں مہینہ کے آخر میں مدینہ آیا تو مجھ سے حضرت عبداللہ ابن عباس نے پوچھا پھر چاند کا ذکر ہوا تو پوچھا: تم نے چاند کب دیکھا، میں نے کہا: ہم نے جمعہ کی رات چاند دیکھا تھا۔ حضرت عبداللہ نے پوچھا تو نے خود چاند دیکھا تھا؟ میں نے کہا: ہاں لوگوں نے چاند دیکھا، لوگوں نے روزہ رکھا اور حضرت معاویہ نے بھی روزہ رکھا۔ حضرت عبداللہ نے کہا ہم نے تو ہفتہ کی رات چاند دیکھا تھا۔ ہم روزہ رکھتے رہیں گے حتیٰ کہ ہم تیس دن مکمل کریں گے یا ہم خود چاند دیکھ لیں گے۔ میں نے کہا: تمہارے لئے حضرت معاویہ کی رویت اور اس کا روزہ کافی نہیں؟ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا: نہیں۔ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح حکم دیا ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح حکم دیا ہے، یہ نبی کریم ﷺ کے حکم کی تصریح ہے۔ یہ حجت ہے کہ شہر جب دور ہوں جیسے شام، حجاز سے دور ہے تو ہر شہر والوں پر اپنی رویت پر عمل کرنا واجب ہے۔ دوسروں کی رویت کا اعتبار نہیں۔ اگرچہ امام اعظم کے نزدیک ثابت ہو جبکہ وہ لوگوں کو اس پر مجبور نہ کرے، اگر وہ لوگوں کو مجبور کرے تو اس کی مخالفت جائز نہیں۔ الکیا طبری نے کہا: حضرت ابن عباس کا قول کہ ”ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے۔“ یہ احتمال ہے کہ اس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد صوموا الرویتہ و افطروا الرویتہ کی تاویل کی ہو۔ ابن عربی نے کہا: حضرت ابن عباس کے اس قول کی تاویل میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے اس کو رد کیا کیونکہ یہ خبر واحد تھی۔ بعض نے فرمایا: اس لئے رد کیا کیونکہ مطالع میں قطر مختلف تھے۔ یہ صحیح ہے کیونکہ قریب نے گواہی نہیں دی تھی۔ انہوں نے اس حکم کے متعلق بتایا تھا جو شہادت کے ساتھ ثابت تھا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حکم ثابت میں خبر واحد بھی جائز ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ اغاث میں چاند کا دیکھنا جمعہ کی رات ثابت ہو اور اشبیلیہ میں ہفتہ کی رات کو نظر آئے تو ہر شہر والوں کی اپنی رویت کا اعتبار ہوگا کیونکہ ہل ستارہ اغاث میں نظر آتا ہے اور اشبیلیہ میں نظر نہیں آتا یہ اختلاف مطالع کی دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں: امام مالک کا مذہب اس مسئلہ میں یہ ہے کہ ابن وہب اور ابن قاسم نے امام مالک سے ”الجموعہ“ میں روایت کیا ہے کہ جب اہل بصرہ رمضان کا چاند دیکھیں پھر کوفہ، مدینہ، یمن والوں کو یہ خبر پہنچے تو ان پر روزہ یا قضاء لازم ہے اگر ادافوت ہو جائے۔ قاضی ابواسحاق نے ابن ماجشون سے روایت کیا ہے کہ اگر ایک عام امر کے ساتھ بصرہ میں چاند ثابت ہو جائے جو شہادت اور تعدیل سے مستغنی ہو تو دوسرے شہر والوں پر بھی لازم ہوگی۔ اگر چاند کا ثبوت حاکم کے پاس دو آدمیوں کی شہادت سے ہو تو پھر ان شہروں پر روزہ رکھنا لازم ہوگا جو اس حاکم کی ولایت میں ہیں اور اگر چاند امیر المومنین کے پاس



ثابت ہو تو تمام مسلمانوں پر قضا لازم ہے۔ فرمایا: یہ امام مالک کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** جمہور لوگوں نے شہر کورفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ مضر مبتدا کی خبر ہے یعنی ذلکم شہر الافتراض علیکم صیامہ شہر رمضان۔ یا الصوم شہریا الايام شہر۔ اس کی تقدیر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کتب کا نائب فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ یعنی کتب علیکم شہر رمضان۔ اور رمضان غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں نون زائدہ ہے اور مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہونا بھی جائز ہے اور اس کی خبر الذی اُنزل فیہ القرآن ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی خبر فسن شہد ہے الذی اُنزل اس کی صفت ہے بعض نے فرمایا الصیام سے بدل کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ جس نے کہا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصَّیَامُ میں الصَّیَامُ سے مراد تین روزے اور عاشورا کا روزہ ہے اس نے مبتدا ہونے کا قول کیا ہے اور جنہوں نے کہا الصَّیَامُ سے مراد رمضان ہے تو انہوں نے ابتدا یا الصیام سے بدل کی حیثیت سے مرفوع کہا ہے یعنی کتب علیکم شہر رمضان (1)۔ مجاہد، اشبر بن حوشب نے شہر کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی نے کہا۔ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصَّیَامُ کا معنی دان تصوموا شہر رمضان ہے۔ فراء نے کہا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصَّیَامُ یعنی ان تصوموا شہر رمضان۔ نحاس نے کہا: شہر رمضان کو تصوموا کے ساتھ نصب دینا جائز نہیں کیونکہ یہ صلہ میں داخل ہوگا پھر صلہ اور موصول کے درمیان تفریق کرے گا۔ اسی طرح صیام کے ساتھ نصب دینی بھی جائز نہیں لیکن اغراء کی بنا پر نصب دینا جائز ہے۔ اسی الزموا شہر رمضان، و صوموا شہر رمضان۔ یہ قول بھی بعید ہے کیونکہ شہر کا ذکر پہلے نہیں ہوا تا کہ اس پر اغراء (ابھارنا) کیا جائے میں کہتا ہوں: کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصَّیَامُ۔ یہ الشہر پر دلالت کرتا ہے پس اغراء جائز ہے۔ یہ ابو عبیدہ کا اختیار ہے۔ اخفش نے کہا: ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ حسن اور ابو عمرو سے راء کا راء میں ادغام حکایت کیا ہے یہ جائز نہیں تا کہ دوسا کن جمع نہ ہوں (2) اور را کی حرکت کو ہا پر بدلنا جائز ہے ہا کو ضمہ دیا جائے گا پھر ادغام کیا جائے گا یہ کو فیوں کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الذی اُنزل فیہ القرآن یہ نص ہے کہ قرآن رمضان میں نازل ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کو بیان کرتا ہے: حَمْدٌ وَالْکِتَابِ الْمُبِیْنِ ۝ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِی لَیْلَةِ مُبَرَّکٍ (دخان) حَمْدٌ حق کو واضح کرنے والی کتاب کی قسم ہم نے اتارا ہے اسے ایک بابرکت رات میں اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِی لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝ (القدر) ہم نے نازل کیا اسے قدر والی رات میں۔ یہ دلیل ہے کہ لیلة القدر رمضان میں ہے کسی اور مہینہ میں نہیں ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن لوح محفوظ سے لیلة القدر میں اکٹھا نازل ہوا۔ پھر آسمان دنیا میں بیت العزۃ میں رکھا گیا۔ پھر جبریل ادا امر، نواہی اور اسباب کے مطابق تھوڑا تھوڑا اتارتے رہے۔ یہ بیس سال میں اترا (3)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: قرآن لوح محفوظ سے یکبارگی آسمان دنیا میں فرشتوں کی طرف اتارا گیا پھر جبریل اسے مختلف اوقات میں اکیس سال میں اتارتے رہے۔ مقاتل نے شہر رمضان الذی اُنزل فیہ القرآن کے بارے میں فرمایا: لوح محفوظ سے ہر سال لیلة القدر میں آسمان دنیا کی طرف اتارا گیا پھر بیس مہینوں میں ملائکہ کی طرف اتارا گیا۔ جبریل بیس سال میں اس کو لے کر آیا۔

میں کہتا ہوں: مقاتل کا یہ قول اجماع کے خلاف ہے قرآن اکٹھا نازل ہوا تھا۔ واللہ اعلم  
حضرت واثلہ بن اسقع نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے یکم رمضان کو  
نازل کئے گئے تھے تو رات چھ رمضان کو، انجیل تیرہ رمضان کو اور قرآن چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔ (1)  
میں کہتا ہوں: اس حدیث میں حسن کے قول کی دلیل ہے کہ لیلۃ القدر چوبیس رمضان کو ہوتی ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ  
آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد: الْقُرْآنُ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا اسم ہے اور یہ بمعنی المقرء (پڑھا گیا) ہے جیسے  
مشروب کو شراب کہا جاتا ہے، المکتوب کو کتاب کہا جاتا ہے اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ یہ قرء یقرء قراءۃ وقرآن کا مصدر ہے  
قراءت اور قرآن کا معنی ایک ہے۔ شاعر نے کہا:

ضخوا بأشبط عنوان السجود به يقطع الدليل تسبيحاً و قرآناً

اس شعر میں قرآن بمعنی قراءت ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ سمندر میں شیطان بندھے ہوئے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام  
نے ان کو باندھا ہے قریب ہے وہ نکلیں اور لوگوں پر قراءت کریں، قرآن حکیم میں ہے: وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ  
كَانَ مَشْهُودًا ⑩ (الاسراء) یعنی فجر کی قراءت مقروءہ کو قراءۃ کہا جاتا ہے۔ مفعول کو مصدر کا نام دینا عربوں کی عادت ہے  
جس طرح وہ معلوم کو علم، مضروب کو ضرب اور مشروب کو شرب کا نام دیتے ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے پھر اس میں استعمال  
مشہور ہوا اور اس کے ساتھ عرف شرعی متصل ہو گیا۔ پس قرآن اللہ کے کلام کا اسم بن گیا حتیٰ کہ جب کہا گیا القرآن غیور  
مخلوق تو اس سے مراد المقرء لیا گیا ہے نہ کہ اس کی قراءت اور وہ مصحف جس میں اللہ کا کلام لکھا جاتا ہے اس کو قرآن کہا جاتا  
ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: دشمن کی زمین کی طرف قرآن کے ساتھ سفر نہ کرو۔ یہاں قرآن سے مراد مصحف ہے۔ یہ  
قراءت الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: جمع کرنا۔ بعض علماء نے کہا: یہ اللہ کی کتاب کا علم ہے۔ یہ غیر مشتق ہے جیسے تورات  
اور انجیل یہ امام شافعی سے حکایت کیا اور صحیح یہ ہے کہ تمام میں اشتقاق ہے۔ مزید بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 10:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُدًى لِّلنَّاسِ، هُدًى قرآن سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے،  
یعنی لوگوں کے لئے ہدایت دینے والا ہے وَبَيِّنَاتٍ، هُدًى پر معطوف ہے۔ الہدی کا مطلب الارشاد اور البیان ہے جیسا  
کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی لوگوں کے لئے بیان اور ارشاد ہے، اس سے مراد پورا قرآن ہے۔ محکم، قشابہ، ناسخ و منسوخ ذکر اور  
تخصیص سے شرف بخشا البینات سے مراد حلال، حرام، مواعظ اور احکام ہیں۔ بینات، بینہ کی جمع ہے یہ ہان الشیء و بین  
سے مشتق ہے کسی چیز کا واضح ہونا۔ الْقُرْآنُ جوق اور باطل کے درمیان فرق کرے (2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 11:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ لَام کی جزم کے ساتھ عام قراءت کی قراءت

ہے۔ حسن اور اعرج نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے (1) یہ لام امر ہے اور اس کا حق کسرہ ہے جب علیحدہ ہو جب یہ کسی چیز کے ساتھ ملایا گیا ہو تو اس میں دو صورتیں ہوتی ہیں: جزم اور کسرہ۔ اور تین حروف کے ساتھ یہ ملایا جاتا ہے۔ فاء جیسے ارشاد ہے: فلیعبہ، فلیعبدوا و اوجیے و لیوفوا اور ثم، جیسے: ثم لیقضوا۔ شہد کا معنی حضر ہے۔ اس میں اضمار ہے یعنی من شہد منکم البصر فی الشہر عاقلًا بالغًا صحیحاً مقیماً فلیعبہ۔ جو تم میں سے رمضان کے مہینہ میں شہر میں موجود ہو جبکہ وہ عاقل، بالغ، صحیح، مقیم ہو تو وہ روزے رکھے۔ کہا جاتا ہے: یہ عام ہے اس کی تخصیص اس قول سے ہے فسن کان منکم مریضاً او علی سفر، الشہر مفعول بہ نہیں بلکہ ظرف زمان ہے اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت سید بن غفلہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابو مجلز لاحق بن حمید اور عبیدہ السلمانی نے کہا: جو رمضان کے مہینہ کے آغاز میں اپنے شہر میں اور اپنے گھر والوں میں موجود ہو اسے اپنے روزوں کو مکمل کرنا چاہئے۔ اس کے بعد وہ سفر کرے یا مقیم ہو اور سفر میں افطار کرے جس پر رمضان داخل ہو جبکہ وہ سفر میں ہو۔ ان علماء کے نزدیک معنی یہ ہے کہ جس نے رمضان کو سفر کی حالت میں پایا وہ افطار کرے اور اس پر دوسرے دنوں سے تعداد پوری کرنا لازم ہے اور مقیم حالت قیام میں رمضان کو پائے تو اسے روزہ رکھنا چاہئے۔ جمہور امت نے کہا: جو رمضان کے مہینہ میں آغاز اور آخر میں مقیم ہو جب تک وہ مقیم رہے تو روزہ رکھے۔ اگر سفر کرے تو افطار کرے (2)۔ یہ قول صحیح ہے۔ اس پر اخبار ثابۃ دلالت کرتی ہیں۔ امام بخاری نے پہلے کا رد کرتے ہوئے یہ باب باندھا۔ باب اذا صام ایاماً من رمضان ثم سافر۔ امام بخاری نے اس باب کے تحت اپنی سند سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں مکہ کی طرف نکلے آپ نے روزہ رکھا حتیٰ کہ آپ کدید کے مقام پر پہنچے تو روزہ رکھنا چھوڑ دیا۔ پس لوگوں نے بھی روزہ رکھنا چھوڑ دیا حضرت ابو عبیدہ اللہ نے کہا الکدید، عسفلان اور قدید کے درمیان ہے (3)۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے موافقین کے قول کو سفر مندوب پر محمول کیا جائے جیسے فضلاء او ر صالحین کا بھائیوں کی زیارت کرنے کے لئے سفر کرنا یا سفر مباح پر محمول ہو جیسے کفایت پر زائد رزق کی طلب کے لئے سفر کرنا۔ رہا ضروری خوراک کے لئے واجب سفر کرنا یا کسی شہر کو فتح کرنے کے لئے سفر کرنا جبکہ اس کی فتح یقینی ہو۔ یا دشمن کو دور کرنے کا سفر ہو تو اس صورت میں اسے اختیار ہے اسے روزہ رکھنا واجب نہیں بلکہ قوت کے لئے اس میں افطار افضل ہے اگرچہ وہ رمضان کے مہینہ میں اپنے شہر میں موجود بھی ہو اور اس میں بعض روزے رکھ بھی لئے ہوں۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس وغیرہ کی حدیث ہے، اس میں ان شاء اللہ کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

امام ابو حنیفہ اور ان کے ساتھیوں نے کہا: مکلف ہونے کی شرط کے ساتھ جو رمضان کے مہینہ میں موجود ہو مجنون اور بیہوش بھی نہ ہو تو اسے روزہ رکھنا چاہئے اور جس پر رمضان آئے جبکہ وہ مجنون ہو اور اس کا جنون پورا مہینہ طاری رہے تو اس پر قضا

2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ صحیح بخاری، باب اذا صام ایاماً من رمضان ثم سافر، حدیث نمبر 1808، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



نہیں ہے کیونکہ اس نے رمضان کے مہینہ کو اس صفت پر نہیں پایا جس کے ساتھ روزے واجب ہوتے ہیں اور جس کو مہینہ کی ابتدا میں اور آخر میں جنون لاحق ہو تو وہ جنون کے دنوں کی قضا کرے۔ اس تاویل پر شہر کو نصب شہد کے مفعول بہ کی حیثیت سے صریح ہے۔ (1)

**مسئلہ نمبر 12:** یہ ثابت شدہ امر ہے کہ روزے کی فرضیت اسلام، بلوغ اور رمضان کے مہینہ کے علم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ جب فجر سے پہلے کوئی کافر مسلمان ہو یا بچہ بالغ ہو تو ان پر اس دن کا روزہ لازم ہوگا اور اگر فجر کے بعد بالغ ہو یا مسلمان ہو تو دونوں کے لئے کھانے پینے وغیرہ سے رکاز ہنا مستحب ہے اور ان پر رمضان کے گزشتہ دنوں کی اور اس دن کی جس میں بچہ بالغ ہو اور کافر مسلمان ہو، قضا لازم نہیں ہے اور علماء کا اس کافر کے بارے میں اختلاف ہے جو رمضان کے آخری دن میں مسلمان ہو گیا اس پر سارے رمضان کی قضا لازم ہے یا نہیں؟ کیا اس پر اس دن کی قضا لازم ہے جس میں وہ مسلمان ہوا؟ امام مالک اور جمہور علماء نے کہا: اس پر گزشتہ دنوں کی قضا نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنے اسلام کے وقت رمضان کا مہینہ پایا۔ امام مالک نے فرمایا: میرے نزدیک اس دن کی قضا کرنا محبوب ہے جس دن وہ مسلمان ہوا۔ عطا اور حسن نے کہا: وہ باقی دنوں کے روزے رکھے اور گزشتہ دنوں کی قضا کرے۔

عبدالملک بن ماجشون نے کہا: اس دن کھانے سے رکاز ہے اور اس کی قضا کرے۔ امام احمد اور اسحاق نے اس کی مثل کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا: اس پر مہینہ کے گزشتہ دنوں کی اور اس دن کی قضا لازم نہیں ہے۔ الباجی نے کہا: ہمارے علماء میں سے جنہوں نے کہا کفار شرائع الاسلام کے مخاطب ہیں..... یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کے قول کا مقتضا ہے..... انہوں نے اس پر بقیہ دن کھانے پینے سے رکاز بنے کو واجب کہا ہے۔ ابن نافع نے امام مالک سے ”المدونہ“ میں اس کو روایت کیا ہے یہی شیخ ابوالقاسم کا قول ہے اور ہمارے علماء میں سے جنہوں نے کہا کہ کفار مخاطب نہیں ہیں، انہوں نے کہا: بقیہ دن رکاز ہنا لازم نہیں ہے۔ یہ اشہب، عبدالملک بن ماجشون کے قول کا مقتضا ہے۔ یہ ابن القاسم کا قول ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا۔ اس میں صرف مومنین کو خطاب فرمایا کسی اور کو خطاب نہیں فرمایا یہ واضح ہے پس بقیہ دن اس پر رکاز ہنا واجب نہیں اور گزشتہ دنوں کی قضا بھی نہیں۔ پہلے وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ کے تحت کلام گزر چکی ہے۔

**مسئلہ نمبر 13:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ، الْيُسْرَ یہ جماعت کی قرأت ہے الیسرا (سین کے ضمہ کے ساتھ) یہ دونوں لغتیں ہیں اسی طرح العسرا میں دونوں لغتیں ہیں (2)۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا (3): الیسرا سے مراد سفر میں افطار اور العسرا سے مراد سفر میں روزہ ہے۔ لفظ کا عموم تمام امور دینیہ کو شامل ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُم فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) نبی کریم ﷺ سے مروی ہے دین اللہ یسرا (اللہ کا دین) آسان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یسروا ولا تعسروا۔ آسانی کرو، تنگی نہ کرو۔ الیسرا، سہولت سے ہے اور اسی سے غناء کے لئے یسار

استعمال ہوتا ہے، بائیں ہاتھ کو الید الیسری کہا جاتا ہے یا تو قال پکڑنے کے لئے یا اس لئے کہ دائیں ہاتھ کی یہ معاونت کرتا ہے تو معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔ اور وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ کا معنی يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ ہے۔ تاکید کے لئے تکرار فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 14:** یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے قدیم، ازلی ذات پر زائد ارادہ کے ساتھ ارادہ فرمانے والا ہے۔ یہ اہل سنت کا مذہب ہے جس طرح وہ علم کے ساتھ عالم ہے، اپنی قدرت کے ساتھ قادر ہے، حیات کے ساتھ زندہ ہے، سمیع کے ساتھ سمیع ہے، بصر کے ساتھ بصیر ہے، کلام کے ساتھ متکلم ہے۔ یہ تمام معانی موجود، ازلی ذات پر زائد ہیں۔

فلاسفہ اور شیعہ اس کی نفی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ذاتین کے قول اور مہملین کے ابطال سے بلند و بالا ہے اور جو بات ان اہل تعطیل کی جز کا تھی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے صاحب ارادہ ہونے کی تصدیق نہ کی جائے تو صادق آئے گا کہ وہ صاحب ارادہ نہیں ہے اور اگر یہ صحیح ہو تو بہرہ ذات جو صاحب ارادہ نہ ہو وہ اس کی نسبت ناقص ہوگی جو صاحب ارادہ ہوگی۔ بے شک جس کی صفات ارادہ یہ ہوں اس کے لئے جائز ہوتا ہے کہ کسی شے کو خاص کرے اور اس کے لئے یہ بھی جائز ہوتا ہے کہ اسے خاص نہ کرے۔ پس عقل سلیم تقاضا کرتی ہے کہ ارادہ کمال ہوتا ہے نہ کہ نقص حتیٰ کہ اگر وہ ہم کے ساتھ اندازہ کیا گیا ہو اور اس سے یہ امر سلب کیا گیا ہو تو اس کا پہلا حال دوسرے حال کی نسبت اکمل ہوگا۔ پس یہی باقی رہ جائے گا کہ جو ارادہ سے متصف نہیں وہ ناقص ہے اس۔ جو ارادہ سے متصف ہے اور اس میں جو محال ہے وہ مخفی نہیں، یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ مخلوق خالق سے اکمل ہو اور خالق اس سے کم مرتبہ ہو؟ بداہت اس کا رد اور ابطال کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنا وصف بیان کیا ہے کہ وہ مرید ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَعَالٌ لِّمَآ يُرِيدُ** (البروج) کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔

**يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ**۔ ارادہ فرماتا ہے اللہ تم سے آسانی کا اور نہیں ارادہ فرماتا تم سے تنگی کا **يُرِيدُ اللّٰهُ اَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمُ (النساء: 28)** اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے تم سے تخفیف کرنے کا **اِذَا آاَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ** (یس: 82) جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو: ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے پھر یہ عالم حکمت، پختگی، انتظام اور احکام پر مبنی ہے، اس کے باوجود اس کا ہونا اور اس کا نہ ہونا جائز ہے اور وہ ذات جس نے وجود کے ساتھ اس کو خاص کیا اس کے لئے اس کا ارادہ کرنے والا ہونا، اس پر قادر ہونا اور اس کا عالم ہونا واجب ہے اگر وہ عالم، قادر نہ ہو تو اس سے کسی شے کا صدور صحیح نہیں اور جو عالم نہ ہو اگرچہ قادر ہو اس سے حکمت و اتقان پر اشیاء کا صدور ممکن نہیں اور جو مرید نہ ہو بعض جائزات کی بعض احوال اور اوقات کے ساتھ تخصیص اولیٰ نہ ہو۔ کیونکہ ان کی نسبت ان کی طرف ایک نسبت ہے۔ علماء فرماتے ہیں: جو اس کا قادر، مرید ہونا ثابت ہو تو اس کا زندہ ہونا بھی ثابت ہوا کیونکہ زندہ ہونا ان صفات کی شرط ہے۔ زندہ ہونے سے لازم آتا ہے کہ وہ سمیع، بصیر اور متکلم بھی ہو اگر اس کے لئے یہ صفات ثابت نہ ہوں تو لامحالہ ان صفات کی اضداد سے متصف ہوگا جیسے اندھا، بہرہ اور گونگا ہونا جیسا کہ اس عالم شہادت میں معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے ان تمام صفات سے جو اس کی ذات میں نقص کا موجب ہوں۔

**مسئلہ نمبر 15:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلْيَتْلُوْا اِلَيْهَا** اس میں دو تاویل ہیں: (۱) جس نے سفر یا مرض میں

روزے چھوڑے ان کی تعداد پوری کرنا (۲) چاند کی تعداد پوری کرنا خواہ وہ اتیس دنوں کا ہو یا تیس دنوں کا ہو۔ حضرت جابر بن عبد اللہ نے کہا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مہینہ اتیس دنوں کا ہوتا ہے اس میں اس شخص کی تاویل کا رد ہے جس نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد شہرا عید لا ینقصان رمضان و ذوالحجۃ (۱) کی تاویل کی کہ تیس دنوں سے یہ دو مہینے کم نہیں ہوتے۔ ابو داؤد نے اس کو نقل کیا ہے اور جمہور علماء نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ دو مہینے اجر اور خطاؤں کی تکفیر میں کم نہیں ہوتے خواہ یہ اتیس دنوں کے ہوں یا تیس دنوں کے ہوں۔

**مسئلہ نمبر 16:** تیس رمضان کو دن کے وقت چاند نظر آئے تو وہ شوال کا نہیں ہوگا بلکہ وہ آئندہ رات کا ہوگا یہ صحیح قول ہے۔ حضرت عمر سے اس مسئلہ کو روایت کرنے والے مختلف ہیں، دارقطنی نے شقیق سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمارے پاس حضرت عمر کا خط آیا جبکہ ہم خائفین میں تھے۔ حضرت عمر نے اپنے خط میں فرمایا: چاند بعض، بعض سے بڑے ہوتے ہیں۔ جب تم دن کے وقت چاند کو دیکھو تو افطار نہ کرو حتیٰ کہ دو گواہ گواہی دیں کہ انہوں نے کل چاند دیکھا تھا۔

ابو عمر نے عبد الرزاق عن معمر عن الاعمش عن ابی وائل کی سند سے روایت کیا ہے، ابو وائل نے کہا: حضرت عمر نے ہماری طرف لکھا..... آگے سابقہ کلام ذکر کیا۔ حضرت ابو عمر نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے جو عبد الرزاق نے ذکر کیا ہے۔ یہی قول حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر اور حضرت انس بن مالک کا ہے اور یہی قول امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ، امام محمد بن حسن، لیث اور اوزاعی کا ہے اور یہی قول امام احمد اور اسحاق کا ہے۔ سفیان ثوری اور امام ابو یوسف نے کہا: اگر زوال کے بعد چاند دیکھا گیا تو وہ آئندہ رات کا ہوگا اگر زوال سے پہلے چاند دیکھا گیا تو وہ گزشتہ رات کا ہوگا۔ حضرت عمر سے اس کی مثل قول مروی ہے۔ عبد الرزاق نے ثوری سے انہوں نے مغیرہ سے انہوں نے شاک سے انہوں نے ابراہیم سے یہ روایت ذکر کی ہے، فرمایا: حضرت عمر نے عتبہ بن فرقہ کو لکھا کہ جب تم دن کے وقت سورج کے زوال سے پہلے چاند کو دیکھو تو تیس دن مکمل ہونے کی وجہ سے تم افطار کرو اور جب تم سورج کے زوال کے بعد چاند دیکھو تو افطار نہ کرو حتیٰ کہ شام ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسناد کی جہت سے اس مسئلہ میں کوئی چیز صحیح مروی نہیں ہے۔ سلیمان بن ربیعہ سے ثوری کے قول کی مثل مروی ہے۔ عبد الملک بن حبیب کا بھی یہی خیال ہے وہ قرطبہ میں اسی کے ساتھ فتویٰ دیتے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز سے اس مسئلہ میں مختلف اقوال مروی ہیں۔ ابو عمر نے کہا: حضرت عمر سے جو حدیث مروی ہے جس کے مطابق امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ کا قول ہے وہ متصل ہے اور وہ حدیث جو ثوری کے مذہب کے مطابق مروی ہے وہ منقطع ہے۔ پس متصل کی طرف رجوع کرنا اولیٰ ہے۔ جن علماء نے ثوری کا مذہب اختیار کیا انہوں نے اس قول سے حجت پکڑی ہے مگر حضرت اعمش کی حدیث مجمل ہے اس میں زوال سے پہلے اور بعد کی کوئی تخصیص نہیں ہے اور حضرت ابراہیم کی حدیث مفسر ہے پس اس کے ساتھ قول کرنا اولیٰ ہے۔

میں کہتا ہوں: جو حضرت عمر سے متصل موقوفاً مروی ہے اسی معنی میں مرفوع بھی مروی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو



روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ تیس رمضان کی صبح روزے سے تھے آپ نے دن کے وقت شوال کا چاند دیکھا تو افطار نہ کیا حتیٰ کہ شام ہو گئی اس کو واقدی کی حدیث سے دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: واقدی نے کہا: ہمیں معاذ بن محمد انصاری نے بیان کیا، فرمایا: میں نے زہری سے شوال کے چاند کے مطابق پوچھا جب وہ جلدی دیکھا جائے۔ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت سعید بن مسیب کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اگر شوال کا چاند فجر کے طلوع ہونے سے لے کر عصر تک یا سورج کے غروب ہونے کے درمیان تک دیکھا جائے تو وہ آنے والی رات کا ہوگا۔ ابو عبد اللہ نے کہا اس پر اجماع ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 17:** دارقطنی نے حضرت ربیع بن خراش سے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی سے روایت کیا ہے، فرمایا: لوگوں کا رمضان کے آخری دن کے بارے میں اختلاف ہوا۔ دود یہاں آئے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس گزشتہ شام چاند دیکھنے کی گواہی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو روزہ افطار کرنے کا حکم دیا اور صبح عید گاہ کی طرف جانے کا حکم دیا۔ دارقطنی نے کہا: یہ اسناد حسن سے ثابت ہے۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک اور اصحاب مالک سے کوئی اختلاف مروی نہیں (2)۔ عید کی نماز عید کے علاوہ کسی دن نہیں پڑھی جائے گی اور نہ عید کے دن زوال کے بعد پڑھی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ سے یہی قول حکایت کیا گیا ہے۔ امام شافعی کا قول اس مسئلہ میں مختلف ہے کبھی امام مالک کے قول کے مطابق فرمایا اس کو مزنی نے اختیار کیا ہے اور فرمایا: جب عید کے دن زوال کے بعد عید کی نماز پڑھنی جائز نہیں تو دوسرا دن عید کے وقت سے زوال سے بھی زیادہ دور ہے اس لئے دوسرے دن بدرجہ اولیٰ نہیں پڑھی جائے گی اور امام شافعی سے دوسری روایت مروی ہے کہ دوسرے دن چاشت کے وقت عید کی نماز پڑھی جائے گی۔ بویطی نے کہا: عید کی نماز نہیں پڑھی جائے گی مگر جب اس کے بارے میں کوئی حدیث ثابت ہو۔ ابو عمر نے کہا: اگر نماز عید وقت کے بعد ادا کی جائے گی تو یہ فرائض کے مشابہ ہو جائے گی اور علماء کاسنن کے بارے میں اجماع ہے کہ ان کی قضا نہیں کی جاتی۔ اور یہ نماز عید سنن کی مثل ہے۔ امام ثوری، امام اوزاعی اور امام احمد بن حنبل نے کہا: دوسرے دن وہ نکلیں گے۔ امام ابو یوسف نے ”الاملاء“ میں اسی طرح فرمایا۔ حسن بن صالح بن حمی نے فرمایا: عید الفطر میں نہیں نکلیں گے، عید الاضحیٰ میں (دوسرے دن) نکلیں گے۔ امام ابو یوسف نے فرمایا: عید الاضحیٰ میں امام تیسرے دن نماز عید پڑھائے گا (اگر پہلے دو دنوں میں کسی وجہ سے نہ پڑھ سکے ہوں) ابو عمر نے کہا: اضحیٰ ایام عید ہیں اور یہ نماز عید ہے۔ اور فطر کی عید صرف ایک دن ہے جب پہلے دن عید الفطر نہیں پڑھی ہوگی تو دوسرے دن قضا نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ فرض نہیں ہے کہ اسے قضا کیا جائے۔ لیث بن سعد نے کہا: دوسرے دن عید الفطر اور عید الاضحیٰ پڑھی جائے گی۔ (اگر وہ پہلے دن نہیں پڑھ سکے ہوں گے)

میں کہتا ہوں: ان شاء اللہ دوسرے دن پڑھنے کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس کے متعلق سنت ثابت ہے اور شارع علیہ السلام سنن میں سے جس کو چاہیں مستثنیٰ کر دیں اور اس کے وقت کے نکلنے کے بعد اس کی قضا کا حکم دے دیں، اس میں کوئی مانع نہیں۔ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے فجر کی دو رکعتیں

(سنتیں) ادا نہیں کیں وہ انہیں سورج طلوع ہونے کے بعد ادا کرے (1)۔ ابو محمد نے اس کو صحیح کہا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: بعض اہل علم کے نزدیک اس پر عمل ہے اور اس کے مطابق سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور حضرت ابن المبارک کا قول ہے اور حضرت عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے فرمایا: جس پر وقت تنگ ہو اور وہ صبح کی نماز (فرض) پڑھ لے اور فجر کی دو رکعتیں (سنتیں) چھوڑ دے تو وہ اگر چاہے تو سورج طلوع ہونے کے بعد ادا کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ اس وقت ادا نہ کرے پھر جب ہم نے کہا کہ وہ انہیں سورج طلوع ہونے کے بعد پڑھے تو کیا وہ یہ قضا پڑھے گا یا ان دو رکعتوں کا ثواب، فجر کی سنتوں کے ثواب کے قائم مقام ہو جائے؟ شیخ ابوبکر نے کہا: یہ اصل مذہب پر جاری ہے اور قضا کا ذکر مجازاً ہے۔

میں کہتا ہوں: کوئی بعید نہیں کہ دوسرے دن نماز عید الفطر کا حکم اسی اصل پر ہو خصوصاً جبکہ یہ نماز سال میں ایک مرتبہ ہوتی ہے نیز سنت سے بھی ثابت ہے۔ نسائی نے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے عمرو بن علی نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں یحییٰ نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں شعبہ نے بتایا فرمایا: مجھے ابوبشر نے بتایا انہوں نے ابو عمیر بن انس سے روایت کیا، انہوں نے اپنے چچوں سے روایت کیا کہ ایک قوم نے چاند دیکھا اور وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے انہیں سورج بلند ہونے کے بعد افطار کرنے کا حکم دیا اور حکم دیا کہ دوسرے دن عید کے لئے نکلیں ایک روایت میں ہے، وہ عید گاہ کی طرف دوسرے دن نکلیں۔ (1)

**مسئلہ نمبر 18:** ابوبکر نے عاصم سے اور ابو عمرو نے (بعض روایات میں جو ان سے مروی ہیں (2)) اور قتادہ، حسن اور اعرج نے وَ لَتَكْمِلُوا الْعِدَّةَ پڑھا ہے یعنی میم کی شد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی نے تخفیف کو پسند کیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ (المائدہ: 3) نحاس نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَهَلْ الْكُفْرَيْنِ اَمْ هَلْهُمْ مُؤْمِنًا (طارق) (اس میں مقل اور امہلہم دونوں لغتیں ہم معنی ہیں) اور وَ لَتَكْمِلُوا الْاَمَّ کے سکون کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں اور اس کے اور اس سے پہلے والے لام میں فرق پہلے لزر چکا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: ویرید لان تکلموا اور ان اور کسرہ کا حذف کرنا جائز نہیں۔ یہ بصریوں کا قول ہے اسی طرح کثیر ابو صخر کا قول ہے: ارید لانسی ذکرہا میں اس کا ذکر بھولنا چاہتا ہوں۔

یہ اصل میں لان انسی ہے۔ یہ لام مفعول پر داخل ہوتا ہے جیسے تیرے اس قول میں ہے ضربت لوبد۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ تعداد کے مکمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے العدة رخص لكم هذه الرخصة۔ یہ کوفیوں کا قول ہے نحاس نے یہ قول فراء سے روایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ حسن قول ہے۔ و کذالك نرى ابراهيم ملكوت السموات والارض و ليكون من الموقنين، ای و ليكون من الموقنين فعلنا ذالك۔

1۔ ہاشم بن علی کتاب ابواب الاذان باب ما جاء في اعادة التماس حدیث نمبر 388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ الحرف الواو جزیر آیت ہذا

بعض علماء نے فرمایا: یہ واسفحہ ہے، بعض نے فرمایا: یہ بھی احتمال ہے کہ لام، لام امر ہو اور وادو عاطفہ ہو جملہ کلام کا جملہ کلام پر عطف ہو (1)۔ ابواسحق برائیم ابن السری نے کہا: یہ معنی پر محمول ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: فعل الله ذالك يسهل عليكم ولتكملا العدد۔ ابواسحاق نے کہا: سبویہ نے اس کی مثل یہ شعر کہے ہیں:

بادت غیر آہن مع البلی الا رواكد جمرهن هباء  
ومشجع اما سواء قذاله فبدا و غیب ساره المعزاء

اس کا معنی ہے: بادت الا رواكد بہا رواكد۔ گویا یوں فرمایا: وبہا مشجع او ثم مشجع۔ یعنی شہر ہلاک ہو گئے بوسیدگی کے ساتھ ان کے نشان تبدیل ہو گئے سوائے چولہوں کے نشانات کے، ان کے انگارے غبار ہیں پھر نیموں کے کیل ان کا درمیان برابر ہے۔ پس وہ ظاہر ہوا اور پتھر ملی زمین نے اس کا چلنا غائب کر دیا۔

**مسئلہ نمبر 19:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِتُكْمِلُوا اللّٰهَ۔ اس کا وَلِتُكْمِلُوا پر عطف ہے اس کا مطلب جمہور علماء کے قول کے مطابق رمضان کے آخر میں تکبیر پر براہیجنت کرنا ہے اس کی حد کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی نے فرمایا سعید بن مسیب، عروہ، ابوسلمہ سے مروی ہے کہ یہ لوگ عید الفطر کی رات تکبیریں کہتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے۔ اور فرمایا: یہ لیلة النحر (قربانی والی رات) کے مشابہ ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: مسلمانوں پر حق ہے کہ جب شوال کا چاند دیکھیں تو تکبیریں کہیں اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ انسان چاند دیکھنے سے لے کر خطبہ کے ختم ہونے تک تکبیریں کہے اور امام کے ظاہر ہونے کے وقت رک جائے اور اس کی تکبیر کے ساتھ تکبیر کہے۔ ایک قوم نے کہا: چاند دیکھنے سے لے کر امام کے نماز کے لئے ظاہر ہونے تک تکبیریں کہے۔ سفیان نے کہا: یہ فطروالے دن کی تکبیر ہے۔ حضرت زید بن اسلم نے کہا: لوگ جب عید گاہ کی طرف نکلتے تو تکبیریں کہتے جب نماز ختم ہو جاتی ہے تو عید ختم ہو جاتی ہے (2)۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔ امام مالک نے فرمایا: یہ تکبیریں گھر سے نکلنے سے لے کر امام کے نکلنے تک ہیں۔ ابن قاسم اور غلی بن زیاد نے روایت کیا ہے کہ اگر سورج طلوع ہونے سے پہلے گھر سے نکلے تو راستہ میں تکبیریں نہ کہے اور بیٹھے ہوئے تکبیر کہے حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جائے اگر سورج طلوع ہونے کے بعد گھر سے جائے تو راستہ میں عید گاہ کی طرف جاتے ہوئے تکبیر کہے اور جب بیٹھ جائے تب بھی تکبیریں پڑھتا رہے حتیٰ کہ امام نقل کرے۔ امام مالک کے نزدیک اس مسئلہ میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ برابر ہیں۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے اور امام ابو حنیفہ نے فرمایا: عید الاضحیٰ میں تکبیریں کہے اور عید الفطر میں تکبیریں نہ کہے اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلِتُكْمِلُوا اللّٰهَ کیونکہ یہ عید کا دن ہے اور سال میں اس کا تکرار نہیں ہوتا۔ پس اس کی طرف نکلنے میں تکبیر سنت ہے جس طرح عید الاضحیٰ میں جاتے ہوئے تکبیر کہنا سنت ہے۔ دارقطنی نے ابو عبد الرحمن سے روایت کیا ہے، فرمایا: لوگ عید الفطر میں تکبیریں، عید الاضحیٰ سے بھی زیادہ شدت سے کہتے تھے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر کے دن اپنے گھر سے نکلنے کے



وقت تکبیر کہتے حتیٰ کہ عید گاہ پہنچ جاتے اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ جب وہ عید الاضحیٰ اور عید الفطر کی طرف جاتے تو بلند آواز سے تکبیریں کہتے حتیٰ کہ عید گاہ میں پہنچ جاتے۔ پھر آپ تکبیر کہتے رہتے حتیٰ کہ امام آ جاتا۔ نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے اکثر اہل علم عید الفطر میں تکبیریں کہنے کا نظریہ رکھتے تھے۔ یہ ابن منذر نے نقل کیا ہے، فرمایا: یہ امام اوزاعی نے الیاس سے ذکر کیا ہے۔ امام شافعی فرماتے تھے: جب کسی کو شوال کا چاند نظر آ جائے تو میں پسند کرتا ہوں کہ لوگ اکٹھی اور علیحدہ علیحدہ تکبیریں کہیں۔ وہ متواتر تکبیریں کہتے رہیں اور تکبیروں کو ظاہر کریں حتیٰ کہ جنازہ گاہ کو چلے جائیں اور جب امام نکل آئے تو تکبیریں کہنا بند کر دیں۔ اسی طرح جس نے حج نہیں کیا اس کے لئے تکبیریں کہنا پسند ہے۔ عیدوں کی نماز کا حکم اور ان میں تکبیر کا حکم سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی (اعلیٰ) اور سورہ الکوتر میں آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 20:** امام مالک اور علماء کی ایک جماعت کے نزدیک تکبیر کے الفاظ یہ ہیں: اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر تین مرتبہ کہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے، بعض علماء فرماتے ہیں: تکبیروں کے درمیان میں لَا اِلهَ اِلَّا اللّٰهُ اور سبحان اللہ بھی کہے۔ بعض فرماتے ہیں: یہ الفاظ کہے: اللہ اکبر کبیراً، الحمد للہ کثیراً و سبحان اللہ بکراً واصیلاً۔ حضرت ابن مبارک جب عید الفطر کے لئے نکلتے تھے تو یہ کہتے تھے: اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر واللہ الحمد اللہ اکبر علی ما ھدانا۔ ابن منذر نے کہا: امام مالک نے اس کی کوئی حد متعین نہیں فرمائی۔ امام احمد نے فرمایا: اس میں وسعت ہے۔ ابن عربی نے فرمایا: ہمارے علماء نے مطلق تکبیر کو اختیار کیا یہی ظاہر قرآن ہے اور میرا میلان بھی اسی طرف ہے۔

**مسئلہ نمبر 21:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰی مَا هَدٰیْکُمْ بَعْضُ عُلَآءِیْنَ فَرَمَیَا: اپنے روزے میں تبدیلی کر کے نصاریٰ اس میں بھٹک گئے۔ بعض نے فرمایا: جو وہ زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء پر فخر کرتے تھے اور اپنے حسب ظاہر کرتے تھے اور اپنے مناقب شمار کرتے تھے اس کے بدلے میں جو ہدایت دی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس نے تمہاری شرائع کی طرف جو رہنمائی فرمائی ہے اس پر تم اس کی عظمت بیان کرو۔ یہ عام ہے (۱) اور لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ۚ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۚ

فَلِیْسَتْ جُنُوبِیْ وَلِیُّوْا مِنِّیْ لَعَلَّہُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۹﴾

”اور جب پوچھیں آپ سے (اے میرے جیب) میرے بندے میرے متعلق تو (انہیں بتاؤ) میں (ان کے) بالکل نزدیک ہوں قبول کرتا ہوں دعا، دعا کرنے والے کی جب وہ دعا مانگتا ہے مجھ سے پس انہیں چاہیے کہ میرے حکم مانیں اور ایمان لائیں مجھ پر تاکہ وہ کہیں ہدایت پا جائیں۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا سَاَلَکَ اس کا معنی ہے جب یہ آپ سے معبود کے بارے میں پوچھیں تو انہیں بتاؤ کہ وہ قریب ہے وہ اطاعت پر ثواب دیتا ہے اور دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہے اور بندہ جو صوم و صلاۃ میں

سے کرتا ہے اسے وہ جانتا ہے۔ اس آیت کے سبب نزول میں اختلاف ہے۔ مقاتل نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے تو اس پر بہت شرمندہ ہوئے اور رونے لگے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور صورت حال عرض کی اور پریشان ہو کر واپس آئے اور رخصت کے نزول سے پہلے یہ مسئلہ تھا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: **وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ**۔

**مسئلہ نمبر 2:** بعض علماء نے فرمایا: جب ابتدا میں سونے کے بعد کھانا ترک کرنا واجب ہوا تو بعض نے سونے کے بعد کھانا کھالیا پھر پریشان ہوا تو توبہ کی قبولیت میں یہ آیت نازل ہوئی اور پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ کلبی نے ابو صالح عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: یہود نے کہا ہمارا رب ہماری دعا کیسے سنتا ہے جبکہ تمہارا خیال ہے کہ ہمارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور پھر ہر آسمان کی موتائی بھی اتنی ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حسن نے کہا: اس کا سبب یہ ہے کہ ایک قوم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اس سے مناجات کریں یا دور ہے کہ ہم اسے پکاریں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ عطا اور قتادہ نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی **وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ** (غافر: 60) تو ایک قوم نے کہا ہم کس وقت اسی سے دعا مانگیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ** یعنی جو میری عبادت کرتا ہے میں اس کی عبادت قبول کرتا ہوں۔ دعا بمعنی عبادت ہے، اجابت کا معنی قبول کرنا ہے۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو ابو داؤد نے حضرت نعمان بن بشیر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، فرمایا: دعا عبادت ہے تمہارے رب نے فرمایا: تم میری عبادت کرو میں تمہاری عبادت قبول کروں گا۔ دعا کو عبادت کہا جاتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ ذَٰلِذِينَ** (غافر: 60) (جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر۔)

اللہ تعالیٰ نے دعا کا حکم دیا اور اس پر ابھارا اور اس کو عبادت فرمایا اور دعا مانگنے والوں کی دعا کو قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ لیث نے شہر بن حوشب سے انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: میری امت کو تین چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو کسی کو عطا نہیں کی گئیں سوائے انبیاء کرام کے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کوئی نبی مبعوث فرمایا تو ارشاد فرمایا: تو مجھ سے دعا کر میں تیری دعا قبول کروں گا اور اس امت کو بھی یہی فرمایا: **ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ** (غافر: 60) تم مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا، جب بھی کوئی نبی مبعوث فرمایا تو ارشاد فرمایا تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی اور اس امت کو بھی فرمایا تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی اور جب اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو اسے اپنی قوم پر گواہ بنایا اور اس امت کو تمام لوگوں پر گواہ بنایا۔ خالد الربعی فرماتے تھے اس امت کے لئے **ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ** میں تعجب کرتا ہوں۔ خود ہی اللہ نے انہیں دعا کا حکم فرمایا اور خود ہی قبولیت کا وعدہ فرمایا اور ان کے درمیان کوئی شرط نہیں ہے۔ کسی

کہنے والے نے ان سے کہا اس کی مثل کیا ہے۔ فرمایا: اس کی مثال یہ ارشاد ہے: **وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (البقرہ: 25)** یہ شرط ہے اور **وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ (یونس: 2)** میں عمل کی شرط نہیں ہے۔ اور **قَدْ عَوَّاهُ اللَّهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (غافر: 14)** یہاں شرط ہے اور **ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ** میں شرط نہیں ہے۔ پہلی امتیں اپنی ضروریات میں اپنے انبیاء کی بارگاہ میں پناہ لیتی تھیں حتیٰ کہ ان کے انبیاء ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے سوال کرتے تھے۔

اگر کہا جائے کہ بہت سے دعا کرنے والے دعا مانگتے ہیں لیکن دعا قبول نہیں ہوتی۔ پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان اجیب اور استجب ہر دعا مانگنے والے کی دعا کو مطلقاً قبول کرنے کا تقاضا نہیں کرتا اور ہر مطلوب کو عطا کرنے کا تقاضا نہیں کرتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا: **ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ (اعراف)** (دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ بے شک اللہ نہیں دوست رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو) ہر وہ شخص جو جانتے ہوئے گناہ کبیرہ پر مصر ہے یا جہالت کی وجہ سے گناہ کبیرہ کرنے والا ہے اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، پس اس کی دعا کیسے قبول کرے گا اور حد سے تجاوز کرنے کی بہت سی اقسام ہیں۔ ان کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورہ اعراف میں آئے گا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے اگر میں چاہوں گا تو قبول کروں گا جیسے ارشاد فرمایا: **فَيُكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ (انعام: 41)** (تو دور کر دے گا وہ تکلیف پکارا تھا تم نے جس کے لئے اگر چاہے) پس یہ مطلق و مقید کے باب سے ہوگا۔ نبی کریم ﷺ نے تین دعائیں مانگیں اور دو آپ کو عطا کی گئیں اور ایک سے روکا گیا۔ اس کا بیان ان شاء اللہ سورہ انعام میں آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان اخبار کا مقصود تمام مومنین کی تعریف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیان میں فرمایا کہ وہ فی الجملہ دعا کرنے والوں کی دعا کو قبول فرماتا ہے، وہ اپنے بندے کے قریب ہے، اس کی دعا کو سننا ہے اور اس کے اضطراب کو جانتا ہے اور جو چاہتا ہے قبول فرماتا ہے اور جیسے چاہتا ہے۔ **وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ (احقاف: 5)** (اور کون زیادہ گمراہ ہے اس (بد بخت) سے جو پکارتا ہے اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبود کو جو قیامت تک اس کی فریاد قبول نہیں کر سکتا۔)

مالک اپنے غلام کی بات کبھی قبول کرتا ہے، والد اپنے بیٹے کی بات کبھی قبول کرتا ہے پھر اس کا سوال اسے عطا نہیں کرتا۔ پس دعا کے پائے جانے کے وقت قبولیت لا محالہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اجیب اور استجب خبر ہیں اور خبر منسوخ نہیں ہوتی ورنہ منجر جھوٹا ہو جائے گا۔ اس تاویل پر حضرت عبداللہ کی حدیث دلالت کرتی ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کے لئے دعا میں (دروازہ) کھولا گیا اس کے لئے قبولیت کے دروازے کھولے گئے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ تم میرے بندوں میں سے ظالموں کو کہو مجھ سے مت مانگو کیونکہ میں نے اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں گا جو مجھ سے دعا مانگے گا اور میں جب ظالموں کی دعا قبول کروں گا تو میں ان پر لعنت کروں گا۔ ایک قوم نے کہا: اللہ تعالیٰ ہر دعا قبول فرماتا ہے یا تو اس کی قبولیت دنیا میں ظاہر



فرماتا ہے یا اس دعا کو گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے یا آخرت میں اس کے لئے ذخیرہ کر دیتا ہے۔ کیونکہ حضرت ابو سعید خدری نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مسلمان دعا مانگتا ہے جب کہ اس میں گناہ اور قطع رحمی کا سوال نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے تین چیزوں میں سے ایک چیز عطا فرماتا ہے یا تو جلدی اس کی دعا کو (قبول فرما کر) پورا کر دیتا ہے یا اس کے لئے اسے ذخیرہ فرما دیتا ہے یا اس سے اس کی مثل تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔ صحابہ نے عرض کی: پھر تو ہم زیادہ دعا کریں گے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ اس سے زیادہ قبول کرنے والا ہے اور عطا کرنے والا ہے۔

ابو عمر بن عبد البر نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح کہا ہے اور موطا میں یہ منقطع ہے۔ ابو عمر نے کہا یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد اذْ عُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) کی تفسیر میں نقل کی جاتی ہے۔ یہ سب اجابت (قبولیت) پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو بندہ دعا کرتا ہے میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ اگر جو دنیا میں اپنے لئے رزق کی دعا کرتا ہے تو وہ اسے عطا کیا جاتا ہے اگر اسے دنیا میں نہیں دیا جاتا تو اس کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابو سعید کی حدیث اگرچہ تین صورتوں میں سے ایک صورت میں قبولیت کی دلیل ہے لیکن گزر چکا ہے کہ وہ حد سے تجاوز کرنے سے اجتناب کرنے والا ہو جو قبولیت سے مانع ہے۔ ارشاد فرمایا: جب وہ گناہ یا قطع رحمی کا سوال نہ کرے۔ اور مسلم میں یہ زائد ہے کہ جب وہ جلدی نہ کرے۔ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ سے نبی کریم ﷺ نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک کہ وہ گناہ اور قطع رحمی کی دعا نہ مانگے، جب تک وہ جلدی نہ کرے۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ جلدی کرنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا بندہ کہے میں نے دعا کی اور میں نے دعا کی میں نے نہیں دیکھا کہ میری دعا قبول ہوئی پس وہ اس دعا کو نہیں مانگتا اور دعا چھوڑ دیتا ہے (1)۔ بخاری، مسلم اور ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک وہ جلدی نہ کرے۔ کہے کہ میں نے دعا کی اور میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ ہمارے علماء نے فرمایا: حدیث کے الفاظ یستجاب لاحدکم (ہر ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے) قبولیت کے وقوع کے وجوب کے متعلق خبر دینے اور قبولیت کے وقوع کے جواز کے متعلق خبر دینے کا احتمال رکھتے ہیں۔ جب وجوب کے متعلق خبر دینے کا معنی ہو تو قبولیت مذکورہ تین چیزوں کے مفہوم کے ساتھ ہوگی۔ جب وہ کہے: میں نے دعا مانگی اور قبول نہیں ہوئی تو ان تین چیزوں میں سے ایک کا وقوع باطل ہوا اور دعا سب چیزوں سے خالی ہوگئی اور اگر قبولیت کے جواز کے معنی میں ہو تو جو اس نے مانگا اس کے فعل کے ساتھ خاص ہوگی اور دعا کرنے والے کا یہ کہنا کہ میں نے دعا مانگی اور میری دعا قبول نہیں ہوئی اسے مانع ہے کیونکہ مایوسی، ضعف، تعین اور ناراضگی کے باب سے ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی طرح دعا کی قبولیت سے حرام کا کھانا بھی مانع ہے اور جو چیز حرام کے مفہوم میں ہو وہ بھی دعا کی قبولیت سے مانع ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے پراگندہ بال اور پراگندہ حال وہ اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کرتا ہے (عرض کرتا ہے) یا رب یا رب! حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے اور اس کا پینا حرام ہے اور اس کا لباس حرام

1۔ صحیح بخاری، باب یستجاب للعبد ما لم یعجل، حدیث نمبر 5865، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور اسے حرام کے ساتھ غذا دی گئی ہے پھر اس کی دعا کیسے قبول کی جائے گی؟ سوالیہ انداز میں فرمایا کہ جو اس صفت پر ہو اس کی دعا کا قبول ہونا بہت بعید ہے کیونکہ دعا کی قبولیت کے لئے داعی (دعا کرنے والا) میں، دعا میں اور جس چیز کا سوال کیا گیا ہے ان میں چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ داعی (دعا کرنے والا) میں یہ شرط ہے کہ وہ جاننے والا ہو کہ اس کی حاجت پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے اور سارے وسائل اس کے قبضہ میں ہیں اور اس کی تسخیر کے ساتھ مسخر ہیں اور وہ سچی نیت اور حضور قلب کے ساتھ دعا مانگے کیونکہ اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعا قبول نہیں فرماتا اور وہ حرام کھانے سے اجتناب کرنے والا ہو اور دعا سے اکتانے والا نہ ہو اور جو چیز مانگی جا رہی ہے اس کی شرط سے یہ ہے کہ ایسے امور سے جو جس کا طلب کرنا جائز ہو اور وہ فعل شرعی ہو جیسے ارشاد فرمایا جب تک وہ گناہ اور قطعی رجمی کا سوال نہ کرے۔ پس گناہ میں ہر گناہ داخل ہے جس کے ساتھ انسان گنہگار ہوتا ہے اور قطع رجمی میں مسلمانوں کے تمام حقوق اور مظالم داخل ہیں۔ حضرت سہل بن عبد اللہ تستری نے فرمایا: دعا کی سات شرائط ہیں (۱) تضرع (۲) خوف (۳) امید (۴) ہیبت (۵) خشوع (۶) عموم (۷) حلال کھانا۔

ابن عطاء نے کہا: دعا کے ارکان، پر، اسباب اور اوقات ہیں اگر اس کے ارکان پائے جائیں تو وہ قوی ہو جاتی ہے۔ اگر اسے پر مل جائیں تو وہ آسمان کی طرف اڑ جاتی ہے، اگر اسے وقت سے موافقت ہو جائے تو کامیاب ہو جاتی ہے، اگر اسباب سے موافقت کر جائے تو کامیاب ہو جاتی ہے، دعا کے ارکان حضور قلب، رافت، عجز اور خشوع ہے اس کے پر سچائی ہے، اس کا وقت سحری کا وقت ہے اس کے اسباب حضرت محمد ﷺ پر درود پڑھنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی چار شرائط ہیں (۱) تنہائی کے وقت، دل کی حفاظت کرنا، مخلوق کے ساتھ ہوتے ہوئے زبان کی حفاظت کرنا اور ایسی چیزوں کی طرف دیکھنے سے آنکھ کی حفاظت کرنا جن کا دیکھنا حلال نہیں اور حرام چیز سے پیٹ کی حفاظت کرنا۔ بعض علماء نے فرمایا: دعا کی شرائط میں سے ہے کہ وہ غلطی سے سلامت ہو۔ بعض نے کہا:

ینادی ربہ باللحن لیث کذا لک اذا دعاء لا یجیب

لیث اپنے رب سے غلطی کے ساتھ دعا مانگتا ہے اس طرح جو وہ دعا مانگتا ہے تو وہ قبول نہیں کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم سے پوچھا گیا: کیا وجہ ہے کہ ہم دعا مانگتے ہیں اور ہماری دعا قبول نہیں کی جاتی؟ فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا لیکن تم نے اس کی اطاعت نہ کی، تم نے رسول کریم ﷺ کو پہچانا اور اس کی سنت کی اتباع نہ کی، تم نے قرآن کو پہچانا اور اس کے مطابق عمل نہ کیا، تم نے اللہ کی نعمتوں کو کھایا اور ان کا شکر ادا نہیں کیا، تم نے جنت کو پہچانا اور اس کو طلب نہیں کیا، تم نے آگ کو پہچانا اور اس سے بھاگے نہیں ہو، تم نے شیطان کو پہچانا اور اس سے تم نے جنگ نہیں کی ہے بلکہ تم نے اس سے موافقت کی ہے، تم نے موت کو پہچانا اور تم نے اس کے لئے تیاری نہیں کی، تم نے مردوں کو دفن کیا اور تم نے عبرت حاصل نہیں کی، تم نے اپنے عیوب کو ترک کیا اور لوگوں کے عیوب کے ساتھ مشغول ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نوف البرکالی کو کہا: اے نوف! اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی کی تھی کہ بنی اسرائیل کو کہو کہ وہ میرے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہ ہوں مگر پاک دلوں کے ساتھ، جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ، پاک ہاتھوں کے ساتھ، میں ان میں سے

کسی کی دعا قبول نہیں کروں گا جب تک میری مخلوق میں سے کسی کے لئے ظلم موجود ہوگا۔ اے نوف! نہ تو شاعر بن، نہ تو پیغام پہنچانے والا بن، نہ سپاہی بن، نہ ٹیکس وصول کرنے والا بن اور نہ تو عشر وصول کرنے والا بن کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام رات کی ایک گھڑی میں کھڑے ہوئے اور فرمایا: یہ ایسا وقت ہے جو بندہ دعا مانگتا ہے اس کے لئے دعا قبول کی جاتی ہے مگر یہ کہ وہ بادشاہوں کو پیغام پہنچانے والا ہو یا سپاہی ہو یا ٹیکس وصول کرنے والا ہو یا عشر وصول کرنے والا ہو یا ظنور بجانے والا ہو یا طبل بجانے والا ہو۔ ہمارے علماء نے فرمایا: دعا کرنے والا یہ نہ کہے، اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے عطا کر، اے اللہ! اگر تو چاہے تو میری مغفرت کر اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر بلکہ اپنی دعا اور اپنے رسول کو چاہنے کے قول سے خالی کرے۔ اور اس شخص کے سوال کی طرح سوال کرے جو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں کرتا مگر جو چاہتا ہے (اگر تو چاہے) کے قول میں اس کی مغفرت، عطا اور رحمت سے استغنا کی ایک قسم ہے جیسے کوئی کہنے والا کہتا ہے اگر تو چاہے کہ مجھے عطا کر تو ایسا کر۔ یہ استغنا اور عدم ضرورت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے مجبور شخص تو اپنے سوال میں عزم و یقین رکھتا ہے وہ اس فقیر کی طرح سوال کرتا ہے جو اپنے سوال کی طرف مجبور ہوتا ہے۔

ائمہ نے روایت کیا ہے، یہ بخاری کے الفاظ کا ترجمہ ہے حضرت انس بن مالک نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی دعا مانگے تو عزم کے ساتھ سوال کرے۔ یہ نہ کہے: اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے عطا کر کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کوئی مجبور کرنے والا نہیں (1)۔ مؤطا میں ہے (2) یہ نہ کہے: اے اللہ! میری مغفرت فرما اگر تو چاہے، اے اللہ! مجھ پر رحم فرما اگر تو چاہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: (عزم سے سوال کرے) یہ قول دلیل ہے کہ مومن کو دعا میں کوشش کرنی چاہئے اور وہ قبولیت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ وہ کریم ذات سے دعا مانگ رہا ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: کسی کو کسی دعا سے منع نہیں کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں سے بدترین ابلیس کی دعا کو بھی قبول فرمایا۔ اس نے عرض کی تھی: اَنْظُرْنِي اِلٰى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ (اعراف: 14) مہلت دے مجھے اس دن تک جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے (اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ) (اعراف: 15) بے شک تو مہلت دیئے ہوؤں میں سے ہے)

دعا کے لئے کچھ اوقات اور احوال ہیں جن میں غالب طور پر قبول ہوتی ہے جیسے سحری کا وقت، افطاری کا وقت، اذان اور اقامت کے درمیان، بدھ کے روز ظہر اور عصر کے درمیان، اضطراب کے وقت، سفر اور مرض کی حالت میں، بارش کے نزول کے وقت اور اللہ کے راستہ میں مجاہدین کی صف میں کھڑے ہونے کے وقت ان اوقات میں سے ہر وقت کے بارے میں آثار مروی ہیں ان کا بیان اپنے مقام پر آئے گا۔ حضرت شہر بن حوشب نے روایت کیا ہے کہ حضرت ام الدرداء نے انہیں کہا: اے شہر! کیا تم کپکپی محسوس نہیں کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں میں کپکپی محسوس کر رہا ہوں۔ فرمایا: اللہ سے دعا مانگو کیونکہ کپکپی کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔ (3)

1۔ صحیح بخاری، باب ليعزم المسلمانه فانه لا يمكنه، حدیث نمبر 5863، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ ایضاً، حدیث نمبر 5864



حضرت جابر بن عبد اللہ نے فرمایا: مسجد الفتح میں تین دن دعا مانگی، سوموار، منگل اور بدھ اور بدھ کے روز دو نمازوں (ظہر اور عصر) کے درمیان آپ کی دعا قبول کی گئی میں نے آپ کے چہرہ اقدس میں خوشی دیکھی۔ حضرت جابر نے فرمایا: مجھ پر کبھی انتہائی مشکل امر نازل نہیں ہوا مگر میں نے اس گھڑی کی کوشش کی پھر میں نے اس میں دعا مانگی تو میں قبولیت کو جان گیا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي ابور جاخر اسانی نے کہا: اس کا معنی ہے مجھ سے مانگو (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کا معنی ہے انہیں طلب کرنا چاہئے کہ میں ان کی دعا قبول کرتا ہوں۔ یہ باب استفعال سے ہے یعنی اس نے چیز کو طلب کیا مگر جو سخت تھی جیسے استغنی اللہ۔ مجاہد وغیرہ نے کہا: اس کا معنی ہے وہ قبول کریں ایمان جس کی طرف میں نے انہیں بلایا ہے یعنی اطاعت اور عمل..... کہا جاتا ہے اجاب اور استجاب ہم معنی ہیں۔ شاعر کا قول ہے۔

فلم يستجبه عند ذالك مجيب۔ اس وقت قبول کرنے والے نے اس کی بات قبول نہ کی۔ (2)  
سین زائدہ ہے اور لام، لام امر ہے اسی طرح وَلِيُوْا لَامِ امر نے فعل کو جزم دی کیونکہ یہ فعل کو مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے۔ پس یہ ان شرطیہ کے مشابہ ہے۔ بعض نے فرمایا کیونکہ یہ صرف فعل پر واقع ہوتا ہے۔ الرشاد، یہ الغی (گمراہی) کا متضاد ہے۔ وقد رُشد يرشد رُشداً اور رُشد يرشد رُشداً اس میں ایک لغت ہے اور ارشاد اللہ، البراشد، مقاصد الطرق۔ راستوں کے مقاصد۔ الطريق الارشد جیسے الطريق الاقصیٰ ہے۔ تو کہتا ہے هو لرشداً ویرے قول زینۃ کے خلاف ہے، امر راشد، چوہیا کی کنیت ہے۔ بنو رشد ان عربوں کے قبائل۔ جوہری سے مروی ہے، ہروی نے کہا: الرُشد، الرشد و الرشاد سب کا معنی ہدایت و استقامت ہے اسی سے ہے: لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ۔

أَجَلْ لَكُمْ لَيْلَةُ الصِّيَامِ الرَّفْتُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ ۗ  
عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ  
وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ  
الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۚ ثُمَّ أَتُوا الصِّيَامَ إِلَى الْبَيْلِ ۚ وَلَا تَبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ  
عَاكِفُونَ ۚ فِي الْمَسَاجِدِ ۚ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ  
الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝

”حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لئے رمضان کی راتوں میں اپنی عورت کے پاس جانا۔ وہ تمہارے لئے پردہ، زینت اور آرام ہیں اور تم ان کے لئے پردہ، زینت اور آرام ہو۔ جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اپنے آپ سے۔ پس اس نے نظر کرم فرمائی تم پر اور معاف کر دیا تمہیں سوا ب تم ان سے طوطاؤں اور طلب کرو جو (قسمت میں) لکھ دیا ہے اللہ نے تمہارے لئے اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے سفید

دُورِ اسیاہ دُور سے صبح کے وقت پھر پورا کرو روزہ کو رات تک اور نہ مباشرت کرو ان سے جب کہ تم اعتکاف بیٹھے ہو مسجدوں میں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں ان (کو توڑنے) کے قریب بھی نہ جانا۔ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کر لیں۔“

اس میں چھتیس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أَجَلٌ لَّكُمْ لَفْظٌ أَجَلٌ** اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس سے پہلے یہ عمل حرام تھا پھر منسوخ کیا گیا (1)۔ ابو داؤد نے ابن ابی لیلیٰ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمارے اصحاب نے ہمیں بیان کیا، فرمایا: ایک شخص جب روزہ افطار کرتا تھا پھر کچھ کھانے سے پہلے سو جاتا تھا تو وہ صبح تک نہیں کھاتا تھا۔ فرمایا: حضرت عمر آئے اور اپنی بیوی سے حقوق زوجیت کا ارادہ کیا تو بیوی نے کہا: میں سو چکی تھی۔ حضرت عمر نے کہا: ویسے کہہ رہی ہے۔ حضرت عمر نے اس سے حقوق زوجیت ادا کئے۔ ایک انصاری آیا اس نے کھانے کا ارادہ کیا۔ گھر والوں نے کہا: ہم تیرے لئے کھانا گرم کرتے ہیں۔ وہ شخص سو گیا جب صبح ہوئی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں ہے: **أَجَلٌ لَّكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ**۔

بخاری نے حضرت براء سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت محمد ﷺ کے اصحاب میں سے جب کوئی روزہ رکھتا تھا پھر افطاری کے وقت افطار کرنے سے پہلے سو جاتا تھا تو وہ اس رات اگلے دن شام تک کچھ نہ کھاتا تھا، قیس بن صرمہ انصاری روزہ دار تھا..... ایک روایت میں ہے وہ دن کے وقت کھجوروں کے باغ میں کام کرتا رہتا اور وہ روزے سے تھا..... وہ افطار کے وقت حاضر ہوا تو وہ اپنی بیوی کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: کیا تیرے پاس کھانا ہے؟ اس نے کہا: نہیں لیکن میں جاتی ہوں اور تیرے لئے کھانا طلب کرتی ہوں۔ وہ سارا دن کام کرتا رہا تھا پس اسے نیند آگئی اس کی بیوی آئی تو اس نے اسے سویا ہوا دیکھا تو کہا: ہائے تیرے لئے خسارہ۔ جب آدھا دن گزرا تو اس پر غشی طاری ہوگئی۔ اس چیز کا ذکر نبی کریم ﷺ سے کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی: **أَجَلٌ لَّكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ**۔ تو صحابہ کرام بہت خوش ہوئے اور یہ ارشاد نازل ہوا: **وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ**۔

اور بخاری میں حضرت براء سے مروی ہے، فرمایا: جب رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا تو لوگ پورا رمضان عورتوں کے قریب نہ جاتے تھے اور کچھ لوگ اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا: **عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ**۔

کہا جاتا ہے: خان اور اختان، خیانت سے مشتق ہیں اور ہم معنی ہیں یعنی روزوں کی راتوں میں مباشرت کی وجہ سے اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے اور جس نے اللہ کی نافرمانی کی اس نے اپنے نفس سے خیانت کی اپنے نفس کی طرف اس عذاب کو کھینچا۔ قہی نے کہا: خیانت کی اصل یہ ہے کہ کسی کو کسی شے کا امین بنایا جائے اور وہ اس امانت کو صحیح ادا نہ کرے۔ طبری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر نبی کریم ﷺ کی بارگاہ سے واپس آئے اور حضرت عمر آپ کے پاس ایک رات دیر تک باتیں

کرتے رہے۔ واپس آئے تو بیوی کو سویا ہوا پایا۔ حضرت عمر نے بیوی سے حقوق زوجیت ادا کرنے کا ارادہ کیا تو بیوی نے حضرت عمر سے کہا: میں تو سو گئی تھی۔ حضرت عمر نے کہا: تو نہیں سوئی تھی۔ حضرت عمر نے حقوق زوجیت ادا کئے۔ حضرت کعب بن مالک نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ حضرت عمر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: میں اللہ تعالیٰ اور آپ کی بارگاہ میں معذرت کرتا ہوں، میں نفس کے دام میں پھنس گیا اور میں نے اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے۔ کیا میرے لئے کوئی رخصت ہے؟ آپ ﷺ نے مجھے فرمایا: اے عمر! تو اس کا حق نہیں رکھتا تھا جب حضرت عمر اپنے گھر پہنچے تو آپ ﷺ نے اس کو بلا بھیجا۔ پس آپ ﷺ نے اسے عذر کی قبولیت قرآن کی آیت کے ذریعے سنائی۔

نحاس اور مکی نے بھی یہ واقعہ ذکر کیا ہے۔ حضرت عمر سو گئے پھر اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے اور وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور اس کے متعلق خبر دی تو یہ آیت نازل ہوئی (1): عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوا أَنْفُسَكُمْ (جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اپنے آپ سے۔ پس اس نے نظر کرم فرمائی تم پر اور معاف کر دیا تمہیں سوا ب تم ان سے ملو ملاؤ)۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْلَةُ الْقِيَامِ الرَّفَثُ، لَيْلَةُ كَوْنِ ظَرْفٍ كِي وَجْهٍ سَے ہے۔ یہ اسم جنس ہے اسی وجہ سے مفرد ذکر کی گئی ہے۔ الرَّفَثُ، یہ جماع سے کنایہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کریم ہے کنایہ فرماتا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا ہے (2) اور زجاج نے کہا: الرَّفَثُ ایک ایسا کلمہ ہے جو ہر اس عمل کا جامع ہے جس کا مرد اپنی بیوی سے ارادہ کرتا ہے۔ یہ الازہری کا قول بھی ہے۔ ابن عرفة نے کہا: یہاں الرَّفَثُ سے مراد جماع ہے۔ الرَّفَثُ صراحةً جماع کا ذکر کرنا ہے اور اس کا واضح ذکر کرنا ہے۔ شاعر نے کہا:

و يرين من انس الحديث زوانيا ديهن عن رفث الرجال نفاً

یہاں رفث کو شاعر نے صراحةً جماع کے ذکر کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: الرَّفَثُ کا اصل معنی فحش کلام ہے۔ کہا جاتا ہے: رفث، ارفث جب کوئی فحش کلام کرے۔

اسی سے شاعر کا قول ہے:

و رب اسراب حبيج كظم عن اللغا و رفث التكلم (3)

یہاں رفث فحش کلام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

الرَّفَثُ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ال کے ساتھ متعدی ہے جبکہ تو رفثت ال النساء نہیں کہتا لیکن یہاں یہ الافضاء پر محمول ہے جس سے مراد ملا بست لی جاتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَدْ أَفْضَى بَعْضُكُمْ إِلَى بَعْضٍ (النساء: 21) (مل جل چکے ہو تم تنہائی میں ایک دوسرے سے) اسی معنی سے ہے: وَإِذَا خَلَوْا إِلَى شُيُطَانِهِمْ (البقرہ: 14) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: يَوْمَ يُخْضَى عَلَيْهَا (توبہ: 35) یہاں یخسى، یوقد پر محمول ہے کیونکہ تو کہتا ہے: احسب



الحديد في النار۔ یعنی احیٰ کا صلہ فی استعمال ہوتا ہے جبکہ پہلی آیت میں علی استعمال ہوا ہے۔ مزید بیان آگے آئے گا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ (النور: 63) اس آیت میں یخالفون کو ینحرفون کے معنی پر محمول کیا گیا ہے جس کا صلہ عن استعمال ہوتا ہے یا یروغون عن امرہ کے معنی پر محمول ہے۔ کیونکہ تو کہتا ہے خالفت زیداً یعنی خالف کا صلہ استعمال ہی نہیں ہوتا اس کی مثل یہ ارشاد ہے: وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحيماً (احزاب) یہاں رحیم، رؤف کے معنی پر محمول ہے جیسے ارشاد ہے بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحيماً (توبہ) کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا کہ تو کہتا ہے رؤفت بہ۔ یعنی رؤف کا صلہ استعمال ہوتا ہے تو رحمت بہ نہیں کہتا جب اس کا معنی رؤف کے موافق ہو تو متعدی ہونے میں اس کے قائم مقام ہوا۔ اسی قسم سے ابو کبیر ہذلی کا قول ہے۔

حلت بہ فی لیلۃ مزودۃ کرہا و عقد نفاقہا لم یحل

اس شعر میں حل کو با کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے حالانکہ اس کا حق یہ ہے کہ بغیر صلہ کے متعدی ہو، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے حَلَّتْهُ اُمُّهُ كُرْها وَضَعَتْهُ كُرْها (احقاف: 15) لیکن شاعر نے حلت بہ کہا کیونکہ یہ حلت بہ کے معنی میں ہے۔  
**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ یہ مبتدا خبر ہیں اور هُنَّ میں نون کو مشدد کیا گیا ہے کیونکہ یہ مذکر میں جو واد اور میم ہے اس کے قائم مذ م ہے وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ، لِبَاسٌ اصل میں کپڑے میں استعمال ہوتا ہے پھر میاں، بیوی کے ملنے کو لباس کہا گیا کیونکہ ان کے جسم بھی آپس میں مل جاتے ہیں، کپڑے کے ساتھ انہیں تشبیہ دی گئی ہے۔  
 تابعہ جعدی نے کہا:

اذا ما الضجیع ثنی جیدھا تداعت فکانت علیہ لباسا (1)

جب پہلو میں سونے والے نے اس کی گردن دوہری کی اس نے اسے بلایا تو وہ اس پر لباس تھی۔ اور کہا:

لبست أناساً فافنیتم و افنیتم بعد أناس أناساً

میں کئی لوگوں سے ملا اور میں نے انہیں فنا کر دیا اور کئی لوگوں کے بعد انہی لوگوں کو فنا کر دیا۔

بعض نے کہا: ہر اس چیز کو لباس کہا جاتا ہے جو کسی چیز کو ڈھانپ لے اور اس کا گھیراؤ کر لے۔ یہ بھی جائز ہے کہ میاں، بیوی میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے لئے حرام سے پردہ بن جاتا ہے جیسا کہ خبر میں وارد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: میاں، بیوی میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے لئے حقوق زوجیت ادا کرنے کی صورت میں لوگوں کی آنکھوں سے پردہ ہوتا ہے۔ ابو عبیدہ وغیرہ نے کہا: عورت کو کہا جاتا ہے، یہ تیرا لباس ہے، تیرا بستر ہے اور تیرا ازار ہے، ایک شخص نے حضرت عمر بن خطاب سے کہا تھا۔

الا ابدغ ابا حفص رسولا فدی لك من احی ثقة ازاری

ابو عبیدہ نے کہا: اس شعر میں ازار سے مراد عورتیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد نفسی ہے۔

ربیع نے کہا: یہ تمہارے لئے بچھونا ہیں اور تم ان کے لحاف ہو۔ مجاہد نے کہا: تمہارے لئے سکون ہے یعنی بعض، بعض سے

سکون حاصل کرتے ہیں۔ (1)

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ سونے کے بعد روزوں کی راتوں میں کھانے، پینے اور جماع جیسی ممنوع چیزوں میں مشورہ کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ (البقرہ: 85) یعنی ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مراد ہو کہ ہر ایک اپنے نفس سے خیانت کرتا ہے، اپنے نفس سے خیانت کرنے والا اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کا نقصان اس کی اپنی طرف ہی لوٹنے والا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَتَابَ عَلَيْكُمْ یہ دو معانی کا احتمال رکھتا ہے: (۱) اپنے نفسوں سے خیانت سے ان کی توبہ قبول کرنا (۲) رخصت و اباحت کے ساتھ ان سے تخفیف کرنا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلِمَ أَنْ لَنْ تُحْصَوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ (مزل: 20) یعنی اس نے تم سے تخفیف فرمائی۔ یعنی قتل خطا کے بعد۔ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ (النساء: 92) یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف ہے۔ کیونکہ جو خطا قتل کرنے والا ہے اس نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس کی وجہ سے اسے توبہ لازم ہو اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ (توبہ: 117) یہاں بھی تَابَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اگرچہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے کوئی ایسی چیز واجب نہیں ہوئی تھی جو توبہ کا موجب تھی۔ وَعَفَا عَنْكُمْ یہ گناہ کو معاف کرنے کا بھی احتمال رکھتا ہے اور توسع و تسہیل کا بھی احتمال رکھتا ہے جیسے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اول وقت اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور آخر وقت اللہ تعالیٰ کا عفو ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے وسعت فرمائی اور آسانی فرمائی عَلِمَ اللَّهُ کا معنی تم سے اس کا وقوع مشاہدہ جان لیا فَتَابَ عَلَيْكُمْ یعنی اس میں وقوع کے بعد اس نے تم پر تخفیف فرمائی۔ وَعَفَا یعنی آسانی فرمائی۔ تَخْتَانُونَ یہ خیانت سے ہے جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ابن عربی نے کہا: علماء زہد نے فرمایا: عنایت اور شرف منزلت اس طرح ہوا کہ حضرت عمر نے اپنے نفس سے خیانت کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے شریعت بنادیا اور ان کی وجہ سے پوری امت سے تخفیف فرمادی۔ رضى الله عنه وارضاه۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَالَّذِينَ بَاتُوا بُرْءًا مِنْهُمْ يَبْتَغُوا الْفِتْنَةَ يَكْفُرُ اللَّهُ عَنْهُمْ يَسْتَنْصِفُ اللَّهُ عَنْهُمْ وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ يَنْصِفُ اللَّهُ عَنْهُمْ (البقرہ: 18) اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں دو جلدیں آپس میں مل جاتی ہیں۔ ابن عربی نے کہا: یہ دلیل ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب حضرت عمر کا حقوق زوجیت ادا کرنا ہے نہ کہ حضرت قیس کی بھوک ہے کیونکہ اگر حضرت قیس کی بھوک سبب ہوتی تو ارشاد ہوتا: فَلَا تَنْكُرُوا لَكُمْ يَوْمَئِذٍ يَكْفُرُ اللَّهُ عَنْكُمْ يَسْتَنْصِفُ اللَّهُ عَنْكُمْ وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ يَنْصِفُ اللَّهُ عَنْكُمْ (البقرہ: 18) کلام کا آغاز اس سے فرمایا کیونکہ یہی اہم امر تھا جس کے لئے آیت نازل ہوئی۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ حضرت ابن عباس، مجاہد، حکم بن عیسیٰ، عکرمہ، حسن، سدی، ربیع اور ضحاک نے فرمایا: اس کا معنی ہے: اولاد طلب کرو (2)۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فَالَّذِينَ بَاتُوا بُرْءًا مِنْهُمْ کے بعد اس کا ذکر ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھا وہ قرآن ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے قرآن کو طلب کرو جو تمہارے لئے اس میں مباح کیا گیا ہے اور تمہیں جس کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت معاذ بن جبل

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے: لیلۃ القدر کو طلب کرو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: رخصت اور وسعت طلب کرو۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا (1): یہ قول حسن ہے۔ بعض نے فرمایا: لونڈیاں اور بیویاں طلب کرو۔ حسن بصری اور حسن بن قرقہ نے کہا: اتباع طلب کرو۔ حضرت ابن عباس نے اس کو جائز قرار دیا اور ابتغوا کو الا بتغاء سے ترجیح دی۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكُلُوا وَاشْرَبُوا یہ جواب حضرت قیس کے بارے نازل ہوا اور پہلا حضرت عمر کا جواب تھا۔ پہلے حضرت عمر کا جواب نازل ہوا کیونکہ وہ زیادہ اہم تھا اور وہ مقدم تھا۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ، حتی یہ تبیین کی غایت کے لئے ہے اور کسی ایک کے لئے ظہور کا وقوع صحیح نہیں ہے اور اس پر کھانا حرام نہیں ہے فجر کے طلوع ہونے کی مقدار گزر چکی ہے اور اس حد میں اختلاف ہے جس کے ظہور کے ساتھ کھانے پینے سے رکنا واجب ہو جاتا ہے۔ جمہور نے کہا: وہ فجر جوافق میں دائیں بائیں پھیلتی ہے اس کے متعلق اخبار آئی ہیں اور علماء اسی پر بھروسہ کرتے رہے ہیں۔ (2)

مسلم نے حضرت سمرہ بن جندب سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حضرت بلال کی اذان تمہیں سحری کھانے سے دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ وہ افق کی لمبی سفیدی جو اس طرح اوپر نیچے پھیلتی ہے۔ حماد نے ہاتھوں سے اشارہ کر کے اس کو حکایت کیا۔ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں ہے: فجر وہ نہیں جو اس طرح ہوتی ہے اپنی انگلیوں کو جمع کیا پھر زمین کی طرف اس کو جھکایا۔ لیکن صبح وہ ہوتی ہے جو اس طرح ہوتی ہے۔ اپنی مسجہ انگلی کو دوسری مسجہ انگلی پر رکھا اور اپنے ہاتھوں کو پھیلا یا (۳۶)۔

دارقطنی نے حضرت عبدالرحمن بن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فجر کی دو قسمیں ہیں وہ جو اس طرح ہوتی ہے گویا بھیڑیے کی دم ہے وہ نہ تو کسی چیز کو حلال کرتی ہے اور نہ حرام کرتی ہے۔ اور وہ جوافق میں عرضاً پھیلتی ہے اس میں نماز حلال ہوتی ہے اور کھانا (روزوں میں) حرام ہوتا ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ فجر کے طلوع ہونے کے بعد جس کے ساتھ راستوں اور گھروں میں روشنی ہو جاتی ہے۔ حضرت عمر، حضرت حذیفہ، حضرت ابن عباس، حضرت طلق بن علی، حضرت عطاء بن ابی رباح، عیش سلیمان وغیرہم سے مروی ہے۔ راستوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر فجر کے ظاہر ہونے کے ساتھ کھانے، پینے سے رکنا واجب ہو جاتا ہے۔ مسروق نے کہا: وہ تمہاری فجر کو فجر شمار نہیں کرتے تھے وہ اس فجر کو شمار کرتے تھے جو گھروں کو روشنی سے بھر دیتی ہے۔ نسائی نے عاصم سے انہوں نے زر سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم نے حذیفہ سے کہا: تم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کس وقت سحری کھائی؟ فرمایا: وہ دن تھا مگر سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ دارقطنی سے حضرت طلق بن علی سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے نبی نے فرمایا: کھاؤ، پیو اور تمہیں اوپر بلند ہونے والی صبح دھوکے میں نہ ڈالے۔ کھاؤ، پیو حتیٰ کہ تمہارے لئے سرخی عرضاً پھیل جائے۔ دارقطنی نے کہا قیس بن طلق

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

1۔ المحرر الوجیز تفسیر طبری زیر آیت ہذا

☆ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان قبل الفجر، حدیث نمبر 586، ضیاء القرآن پبلی کیشنز





ابوداؤد ابادی نے کہا:

فلما اضاءت لنا سدفه ولاح من الصبح خيط اناراً (1)

جب ہمارے لئے رات کی تاریکی روشن ہوئی اور صبح سے دھاگہ ظاہر ہوا۔

ایک اور شاعر نے کہا:

قد كاد يبدو و بدت تباشرة و سدف الليل البهيم سائرة

قریب تھا کہ روشنی ظاہر ہو اور کالی رات کی تاریکی چھپانے والی تھی۔

فجر کو الصدیع بھی کہا جاتا ہے۔ اسی سے عرب کہتے ہیں: انصدع الفجر، فجر پھوٹی۔ بشر بن ابی خازم یا عمرو بن

معد یکرب نے کہا:

تري السرحان مفتشاً يديه كان بياض لبتة صديع

تو نے بھیڑیے کو دیکھا جو اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے تھا اس کی گردن کی سفیدی دھاگے کی مانند تھی۔

ثماخ نے سر کی مانگ کو فجر سے تشبیہ دی ہے:

اذا ما الليل كان الصبح فيه اشق كمنق الراس الدهين

جب رات میں صبح ہوتی ہے تو وہ اس طرح پھوٹی ہے جس طرح تیل لگے ہوئے سر میں مانگ ہوتی ہے۔

واضح امر کو بھی الفجر کہتے ہیں۔ یہ صبح کے پھوٹنے کی طرح واضح ہے۔ شاعر نے کہا:

فوردت قبل انبلاج الفجر و ابن اذكاء كامن في كفر

فجر کے طلوع ہونے سے پہلے وارد ہوئی اور صبح تاریکی میں چھپنے والی تھی۔

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ آتَيْنَا الضِّيَامَ إِلَى التَّيْلِ اللہ تعالیٰ نے رات کو کھانے، سونے اور جماع کے

لئے ظرف بنایا اور دن کو روزے کے لئے ظرف بنایا۔ دونوں زمانوں کے احکام بیان فرمانے اور ان دونوں کے درمیان فرق

کیا۔ دن کے وقت کوئی چیز جائز نہیں ہے جس کو رات کے وقت مباح فرمایا مگر مسافر اور مریض کے لئے جائز ہے۔ جیسا کہ

بیان گزر چکا ہے۔ جس نے رمضان میں روزہ افطار کیا (مسافر اور مریض کے علاوہ) تو پھر یا تو وہ جان بوجھ کر یا بھول کر

توڑنے والا ہوگا۔ اگر پہلی صورت ہو تو امام مالک نے فرمایا: جس نے جان بوجھ کر کھایا، پیایا جماع کیا تو اس پر قضا اور کفارہ

ہے۔ جیسا کہ امام مالک نے مؤطا میں روایت کیا ہے اور مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص

نے رمضان میں افطار کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو غلام آزاد کرنے یا دو ماہ کے روزے رکھنے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا

کھلانے کا کفارہ دینے کا حکم دیا۔ (الحديث) یہی امام شعبی نے فرمایا: امام شافعی وغیرہ نے فرمایا: یہ کفارہ اس شخص کے ساتھ

خاص ہے جو جماع کے ساتھ روزے کو توڑے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے، فرمایا: ایک شخص رسول اللہ ﷺ

کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: تجھے کس چیز نے ہلاک کیا، اس نے کہا: میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کیا ہے (1) (الحديث) اس میں کفارہ کا بیان ترتیب سے ہے۔ یہ حدیث مسلم نے روایت کی ہے۔ یہ قضیہ پہلے قضیہ پر علماء نے محمول کیا ہے۔

انہوں نے کہا: یہ ایک واقعہ ہے اور یہ غیر مسلم ہے بلکہ یہ دو قضیے ہیں جو مختلف ہیں کیونکہ دونوں کا انداز مختلف ہے۔ جس نے افطار کیا کفارہ کو اس پر قیود سے معلق نہیں فرمایا تو مطلقاً لازم ہے۔ یہی قول امام مالک، ان کے اصحاب، اوزاعی، اسحاق، ابو ثور، طبری اور ابن منذر کا ہے۔ یہ ایک روایت میں عطا سے مروی ہے۔ حسن اور زہری سے مروی ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول لازم ہے۔ احوال کے تعارض کے باوجود تفصیل کا ترک کرنا حکم کے عموم پر دلالت کرتا ہے۔ امام شافعی نے اس پر قضا کے ساتھ عقوبت (سزا) کو واجب کیا کیونکہ اس نے رمضان کی حرمت کو توڑا۔

**مسئلہ نمبر 10:** اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ عورت جس سے خاوند رمضان میں وطی کرے، امام مالک، امام ابو یوسف اور اصحاب رائے نے فرمایا: اس عورت پر بھی خاوند کی طرح کفارہ ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس پر ایک کفارہ واجب ہے خواہ اس نے خوشی سے خاوند کی اطاعت کی ہو یا خاوند نے اسے مجبور کیا ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایک کفارہ کے ساتھ سائل کا جواب دیا اور تفصیل نہیں فرمائی۔ امام ابو حنیفہ سے مروی ہے: اگر اس نے خوشی سے خاوند کی اطاعت کی ہوگی تو ہر ایک پر کفارہ ہوگا اور اگر خاوند نے اسے مجبور کیا ہو تو پھر صرف مرد پر کفارہ ہوگا۔ یہ یحییٰ بن سعید مالکی کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس پر دو کفارے ہیں۔ یہی امام مالک کے پیروکاروں کی جماعت کے نزدیک امام مالک کے مذہب کا حاصل ہے۔

**مسئلہ نمبر 11:** علماء کا اختلاف ہے جس نے روزہ کی حالت میں بھول کر جماع کیا یا بھول کر کھایا۔ امام شافعی، امام ابو حنیفہ ان کے اصحاب اور اسحاق نے فرمایا: دونوں صورتوں میں اس پر کوئی چیز واجب نہیں نہ قضا ہے نہ کفارہ ہے۔ امام مالک، لیث اور امام اوزاعی نے کہا: اس پر کفارہ نہیں ہے، قضا ہے۔

اس کی مثل عطا سے مروی ہے۔ اور عطا سے مروی ہے، اس پر کفارہ ہے اگر جماع کرے اور انہوں نے فرمایا: ایسی بات نہیں بھولتی۔ اہل ظاہر کی ایک قوم نے کہا: خواہ بھول کر وطی کی ہو یا جان بوجھ کر اس پر قضا اور کفارہ دونوں ہیں۔ یہ ابن ماجہ بن عبد الملک کا قول ہے۔ امام احمد بن حنبل کا نظریہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ حدیث کفارہ کو ثابت کرتی ہے اس میں بھولنے والے اور جان بوجھ کر توڑنے والے کے درمیان فرق نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: اس پر کوئی شے نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 12:** امام مالک، امام شافعی، ابو ثور اور اصحاب رائے نے کہا: جب بھول کر کھائے پھر یہ خیال کرے کہ روزہ تو ٹوٹ گیا ہے پھر جان بوجھ کر جماع کر لیا تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ المذہب میں فرمایا: اس پر قضا اور کفارہ ہے اگر اس نے روزے کی حرمت کو توڑنے کا ارادہ کیا ہے۔ ابو عمر نے کہا: مالک کی اصل پر واجب ہے کہ وہ کفارہ نہ دے کیونکہ جس نے بھول کر کوئی چیز کھائی تو وہ ان کے نزدیک افطار کرنے والا ہے وہ اس دن

1۔ صحیح بخاری، باب قوله نعماني قد فرغ من الله لكم تحلة ايمانكم والله مولاكم وهو العليم الحكيم۔۔۔۔۔ حدیث نمبر 8215، نیاء القرآن جلی کیشنز



کی قضا کرنے والا ہے۔ اس نے حرمت توڑنے کا ارادہ کیا ہے دراصل حالیکہ وہ افطار کرنے والا ہے۔ امام مالک کے علاوہ علماء کے نزدیک جس نے بھول کر روزے میں کوئی چیز کھائی وہ افطار کرنے والا نہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے جس نے بھول کر کھایا یا پیا تو اس پر قضا نہیں اور اس کا روزہ مکمل ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب روزہ دار بھول کر کھائے یا بھول کر پیے تو وہ روزہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا اور اس پر قضا نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے: وہ روزے کو مکمل کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے کھلایا اور پلایا۔

اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: اس کی سند صحیح ہے اور اس کے راوی تمام ثقہ ہیں۔ ابو بکر اثرم نے کہا: میں نے حضرت ابو عبد اللہ سے سنا ان سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو بھول کر رمضان میں کچھ کھائے۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ابو ہریرہ کی حدیث کی بنا پر اس پر کچھ نہیں ہے پھر ابو عبد اللہ مالک نے فرمایا اور لوگوں نے کہا: امام مالک کہتے ہیں: اس پر قضا ہے اور ہنس پڑے۔ ابن منذر نے کہا: اس پر کوئی شے نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جس نے بھول کر کھایا یا پیا، وہ اپنے روزے کو مکمل کرے اور جب فرمایا یتیم صومہ (وہ روزہ مکمل کرے) پس اس نے روزہ مکمل کیا تو اس کا روزہ مکمل ہے۔

میں کہتا ہوں: جس نے بھول کر روزہ افطار کیا اس پر قضا نہیں ہے اور اس کا روزہ مکمل ہے اور جس نے جان بوجھ کر جماع کیا اس پر قضا اور کفارہ ہے..... واللہ اعلم..... اس طرح جس نے بھول کر افطار نہیں کیا، ہمارے علماء نے قضا کے ایجاب پر اس طرح حجت پکڑی ہے کہ مطلوب پورا روزہ ہے جس میں کسی قسم کی دراڑ نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ پھر اتوا الصیام الی اللیل۔ رات تک روزہ مکمل کرو۔ یہ روزہ اس نے مکمل نہیں کیا۔ بس وہ اس پر باقی ہے۔ شاید یہ حدیث نفلی روزہ کے متعلق ہو کیونکہ اس میں تخفیف ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے جو بھول گیا حالانکہ وہ روزہ سے تھا اس نے کھا، پی لیا تو وہ اپنے روزہ کو مکمل کرے (1)۔ آپ ﷺ نے قضا کا تذکرہ نہیں فرمایا بلکہ آپ نے مواخذہ کے ستوط اور روزہ پر جاری رہنے اور اسے مکمل کرنے کا ذکر فرمایا۔ یہ اگرچہ واجب تھا۔ پس یہ قضا کی دلیل ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ رہا نفلی روزہ تو اس میں قضا نہیں ہے جس نے بھول کر کھایا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس پر قضا نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے جس چیز سے حجت پکڑی ہے وہ صحیح ہے اگرچہ شارع علیہ السلام سے اس کا مروی ہونا صحیح نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ نص صریح میں آیا ہے اور اس کو حضرت ابو ہریرہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا: جس نے بھول کر رمضان کے مہینہ میں روزہ افطار کیا اس پر قضا اور کفارہ نہیں ہے۔ اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ابن مرزوق اس میں منفرد ہے اور وہ ثقہ ہے اس نے انصاری سے روایت کیا ہے۔ پس احتمال زائل ہو گیا اور اشکال اٹھ گیا۔ الحمد للہ ذی الجلال والکمال۔

**مسئلہ نمبر 13:** جب اللہ تعالیٰ نے روزے میں ممنوع چیزوں کا ذکر کیا وہ کھانا، پینا، جماع ہیں لیکن اس مباشرت کا

1۔ صحیح بخاری، باب الصائم اذا اکل او شرب ناسیا، حدیث نمبر 1797، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ذکر نہیں فرمایا جس کا معنی ہے: جلد کا جلد سے مل جانا جیسے بوسہ دینا، چھونا وغیرہ۔ یہ دلیل ہے کہ جس نے بوسہ دیا اور جسم کے ساتھ جسم ملایا اس کا روزہ صحیح ہے کیونکہ کلام کا انداز اس چیز کی حرمت پر دلالت کرتا ہے جس کو رات نے مباح کیا اور وہ تین چیزیں ہیں۔ اس میں کسی اور چیز پر دلالت نہیں ہے بلکہ یہ دلیل پر موقوف ہے۔ اسی وجہ سے اس میں اختلاف ہے۔ علماء متقدمین کا اختلاف ہے، اسی سے مباشرت ہے۔ ہمارے علماء نے کہا: جس کو اپنے نفس پر ضبط نہ ہو اس کے لئے مکروہ ہے تاکہ روزے کے فساد کا سبب نہ بن جائے۔ مالک نے نافع سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روزہ دار کو بوسہ اور مباشرت سے منع فرمایا۔ یہ اس خوف کی وجہ سے ہے جو ان سے فساد پیدا ہوگا۔ اگر بوسہ دے اور سلامت رہے تو اس پر کوئی حرج نہیں اسی طرح اگر مباشرت کرے۔ بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بوسہ لیتے تھے اور مباشرت (جسم سے جسم ملانا) کرتے تھے حالانکہ آپ روزے سے ہوتے تھے، جنہوں نے روزہ دار کے لئے بوسہ کو مکروہ کیا۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عروہ بن زبیر بھی ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، وہ ایک دن اس کی جگہ قضا کرے اور حدیث ان پر حجت ہے۔ ابو عمر نے فرمایا: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اس شخص کے لئے مباشرت اور بوسہ کی رخصت دی ہو جس پر روزے کا فساد پیدا ہوتا ہو اور جس نے بوسہ دیا اور اس کی منی نکل آئی تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ، اور آپ کے اصحاب، ثوری، حسن اور امام شافعی کا قول ہے۔ ابن منذر نے اس کو پسند کیا ہے۔ اور فرمایا: جس نے کفارہ واجب کیا ہے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ ابو عمر نے کہا: اگر بوسہ دیا اور مذی نکل آئی تو ان کے نزدیک اس پر کچھ نہیں ہے۔ امام احمد نے فرمایا: جس نے بوسہ دیا اور اسے مذی آگئی یا منی نکل آئی تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے مگر جس نے جماع کیا اور بھول کر یا جان بوجھ کر آلہ تناسل کو داخل کیا تو اس پر کفارہ بھی ہے۔ ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ جس شخص نے بوسہ دیا، مباشرت کی..... اس سے کوئی پانی نہ نکلا تو اس پر قضا ہے۔ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ اس پر قضا نہیں ہے حتیٰ کہ اس سے مذی نکلے۔ قاضی ابو محمد نے فرمایا: ہمارے اصحاب کا اتفاق ہے کہ ایسے شخص پر کفارہ نہیں ہے اگر منی نکلے تو کیا قضا کے ساتھ کفارہ لازم ہوگا۔ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک: بوسہ دیا ہوگا، پھر انزال ہو گیا ہوگا یا اس نے بوسہ دیا ہوگا پھر اس نے لذت اٹھائی اور پھر دوبارہ بوسہ لیا پھر انزال ہو گیا۔ اگر اس نے ایک بوسہ دیا یا ایک مرتبہ مباشرت اور چھو تو اشہب اور محنون نے کہا: اس پر کفارہ نہیں ہے حتیٰ کہ وہ بار بار یہ عمل کرے۔

ابن قاسم نے کہا: وہ تمام صورتوں میں کفارہ دے گا مگر نظر کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر کفارہ نہیں حتیٰ کہ بار بار یہ عمل کرے اور جنہوں نے کفارہ کے وجوب کا قول کیا ہے جب وہ بوسہ دے یا مباشرت کرے یا اپنی بیوی سے ملاست کرے یا فرج کے علاوہ میں جماع کرے پھر اسے منی آجائے۔ ان میں حسن بصری، عطاء، ابن المبارک، ابو ثور اور اسحاق ہیں۔ یہ ”مدونہ“ میں امام مالک کا قول ہے اور اشہب کے قول کی حجت یہ ہے کہ چھونے، بوسہ دینے اور مباشرت فی نفسہا روزہ توڑنے والی چیزیں نہیں ہیں معاملہ کو اسی کی طرف پھیرا جائے گا جن سے افطار ہوتا ہے جب اس نے ایک مرتبہ یہ عمل کیا اور انزال اور افسا و صوم کا ارادہ نہیں کیا تو اس پر کفارہ نہیں ہے جس طرح عورت کی طرف دیکھنا ہے۔ جب اس نے اس عمل کا تکرار کیا تو اس نے روزہ

کے افساد کا قصد کیا پس اس پر کفارہ لازم ہے جیسا کہ اگر بار بار دیکھے۔ نخعی نے کہا: دیکھنے سے انزال کی صورت میں علماء کا اتفاق ہے کہ اس پر کفارہ نہیں مگر یہ کہ وہ بار بار کرے۔ اصل یہ ہے کہ کفارہ واجب نہیں مگر اس پر جس نے روزہ توڑنے کا قصد کیا اور روزہ کی حرمت تار کرنے کا ارادہ کیا۔ جب یہ صورت ہو تو جس کو انزال ہو جاتا ہو یا اس کی عادت مختلف ہو، کبھی انزال ہوتا ہو اور کبھی انزال نہ ہوتا ہو تو میں اس پر کفارہ دیکھتا ہوں کیونکہ ایسا کرنے والا روزہ توڑنے کا ارادہ کرنے والا ہے اور اگر اس کی عادت سلامتی ہو تو اندازہ کیا جائے گا کہ عادت کے خلاف ہو تو اس پر کفارہ نہیں ہے۔ امام مالک کا قول کفارہ کے وجوب کا احتمال رکھتا ہے کیونکہ یہ جاری نہیں ہوتا مگر اس سے جس کی طبع ہو اور ظاہر پر اکتفا کیا۔ اشہب نے لوگوں کے غالب امر پر محمول کیا کہ وہ اس سے سلامت ہوتے ہیں اور نظر میں ان کا قول اس پر دلیل ہے۔

میں کہتا ہوں: نظر میں جو اتفاق حکایت کیا ہے اور اس کو اصل بنایا ہے، حقیقت اس طرح نہیں ہے۔ الباجی نے ”المستعفی“ میں حکایت کیا ہے۔ اگر ایک نظر دیکھا اس سے مقصود لذت تھی پھر اسے انزال ہو گیا تو شیخ ابوالحسن نے کہا: اس پر قضاء، کفارہ ہے۔ الباجی نے کہا: میرے نزدیک یہی صحیح ہے کیونکہ جب اس سے اس نے لطف اٹھانے کا قصد کیا تو وہ بوسہ ہے اور دوسری استمتاع کی قسموں کی طرح ہے۔ واللہ اعلم۔ جابر بن زید، ثوری، امام شافعی، ابو ثور اور اصحاب رائے نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے عورت کی طرف بار بار دیکھا حتیٰ کہ اس سے منی نکل آئی تو اس پر قضاء و کفارہ نہیں ہے۔ یہ ابن منذر کا قول ہے۔ الباجی نے کہا: مدینہ میں ابن نافع نے مالک سے روایت کیا ہے کہ اگر برہنہ عورت کو دیکھا پھر لذت محسوس کی اور انزال ہو گیا تو اس پر قضاء ہے کفارہ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 14:** جمہور علماء کا قول ہے کہ جنبی حالت میں جس پر فجر طلوع ہو اس کا روزہ صحیح ہے۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: یہ بالا جماع جائز ہے۔ صحابہ کے درمیان اس میں کلام واقع ہوئی پھر اس پر معاملہ ٹھہر گیا کہ جو جنبی ہونے کی حالت میں صبح کرے اس کا روزہ صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: صحابہ کے درمیان کلام کے وقوع کے متعلق جو ذکر کیا گیا ہے وہ صحیح اور مشہور ہے۔ یہ حضرت ابو ہریرہ کا قول ہے: جس نے جنبی ہونے کی حالت میں صبح کی اس کا روزہ نہیں اس کو مؤطا وغیرہ نے نقل کیا ہے (1)۔ نسائی کی کتاب میں ہے جب حضرت ابو ہریرہ نے رجوع کیا تو فرمایا: اللہ کی قسم! میں نے نہیں کہا یہ اللہ کی قسم! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا۔ اس سے حضرت ابو ہریرہ کے رجوع کے متعلق اختلاف ہے اہل علم کے نزدیک حضرت ابو ہریرہ کا مشہور قول یہ ہے کہ اس کا روزہ نہیں۔ یہ ابن منذر نے حکایت کیا ہے۔ حسن بن صالح سے روایت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے ایک تیسرا قول بھی مروی ہے، فرمایا: جب اسے جنابت کا علم ہو پھر سو جائے حتیٰ کہ صبح ہو جائے تو وہ افطار کرنے والا ہے اگر وہ نہ جانے حتیٰ کہ وہ صبح کر لے تو روزہ دار ہے۔ یہ عطاء، طاؤس اور عروہ بن زبیر سے مروی ہے۔ حسن اور نخعی سے مروی ہے کہ یہ نوافل میں جائز ہوگا فرض میں قضا کرے گا۔ میں کہتا ہوں: یہ علماء کے اس شخص کے بارے میں چار اقوال ہیں جو جنبی ہونے کی حالت میں صبح کرے ان میں سے صحیح

1۔ صحیح بخاری، الصائم یصبح جنباً، حدیث نمبر 1791، نسیاء القرآن پبلی کیشنز



قول جمہور علماء کا ہے حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح کے وقت بغیر احتلام کے جماع سے جنبی ہوتے تھے پھر روزہ رکھتے تھے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ رمضان میں بغیر احتلام کے جنبی ہونے کی حالت میں صبح کرتے تھے پھر غسل کرتے تھے اور روزہ رکھتے تھے۔ ان دونوں حدیثوں کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے (1) **فَالَّذِينَ بَاتُوا بِهِنَّ وَهُنَّ** کے ارشاد سے ضرورتاً یہ مفہوم ثابت ہوتا ہے کیونکہ جب طلوع فجر تک جماع کرتا رہے تو ضرورتاً معلوم ہوا کہ اس پر فجر طلوع ہوگی تو وہ جنبی ہوگا۔ غسل فجر کے بعد ہی ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر ذکر عورت کی شرمگاہ میں داخل ہو وہ اسے فجر طلوع ہونے کے ساتھ نکالے تو اس پر قضا نہیں ہے۔ مزنی نے کہا: اس پر قضا ہے کیونکہ یہ مکمل جماع ہے۔ پہلا قول صحیح ہے اور وہی ہمارے علماء کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 15:** علماء کا حیض والی عورت کے بارے میں اختلاف ہے جو فجر سے پہلے پاک ہو اور پھر وہ غسل نہ کرے حتیٰ کہ صبح ہو جائے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: اس پر روزہ واجب ہے خواہ اس نے جان بوجھ کر روزہ ترک کیا ہو یا بھول کر جس طرح جنبی کا حکم ہے۔ یہ امام مالک اور ابن قاسم کا قول ہے۔ عبد الملک نے کہا: جب عورت فجر سے پہلے پاک ہو اور پھر وہ غسل کو مؤخر کرے حتیٰ کہ فجر طلوع ہو جائے تو اس کا وہ دن افطار کا دن ہے کیونکہ وہ دن کے بعض حصہ میں پاک نہیں تھی وہ جنبی کی طرح نہیں ہے کیونکہ احتلام روزے کو نہیں توڑتا جبکہ حیض کا خون روزے کو توڑ دیتا ہے۔ اسی طرح ابو الفرج نے اپنی کتاب میں عبد الملک سے روایت کیا ہے۔ اوزاعی نے کہا: اس نے چونکہ غسل کرنے میں کوتاہی کی ہے اس لئے وہ قضا کرے گی۔ ابن الجلاب نے عبد الملک سے روایت کیا ہے کہ اگر وہ فجر سے پہلے ایسے وقت میں پاک ہوتی جس میں غسل کرنا اس کے لئے ممکن تھا پھر اس نے کوتاہی کی اور غسل نہ کیا حتیٰ کہ صبح ہو گئی تو اسے کچھ ضرر نہیں جیسے جنبی کا حکم ہے۔ اگر وقت تنگ ہو جس میں وہ غسل نہیں کر سکتی تو اس کا روزہ جائز نہیں اور اس کا وہ دن افطار کا دن ہے۔ یہی قول امام مالک کا ہے۔ یہ اس عورت کی مانند ہے جس پر فجر طلوع ہو جبکہ وہ حیض سے ہو۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے ایسی عورت کے بارے فرمایا وہ روزہ بھی رکھے اور قضا بھی کرے۔ جیسا کہ اوزاعی کا قول ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے اور ان کا یہ قول شاذ ہے۔ انہوں نے فجر سے پہلے پاک ہونے والی عورت پر کفارہ اور قضا کو واجب کیا ہے جبکہ اس نے سستی کی ہو اور صبح تک غسل نہ کیا ہو۔

**مسئلہ نمبر 16:** جب عورت رمضان میں رات کو پاک ہو اور اس کو معلوم نہ ہو کہ کیا اسے طہارت فجر سے پہلے ہوئی یا بعد تو وہ اس دن روزہ رکھے اور احتیاطاً اس دن کے روزہ کی قضا بھی کرے اور اس پر کفارہ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 17:** نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: پچھنے لگانے والا اور پچھنے لگوانے والا افطار کرے۔ یہ حضرت ثوبان کی حدیث، حضرت شداد بن اوس اور حضرت رافع بن خدیج کی حدیث سے ثابت ہے۔ یہی امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ احمد نے شداد کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور علی بن الدینی نے حضرت رافع بن خدیج کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور ثوری نے کہا: اس پر قضا نہیں ہے مگر یہ تغیر (کمزوری کے اندیشہ) کی بنا پر اس کے لئے مکروہ

ہے (1)۔ صحیح مسلم میں حضرت انس کی حدیث ہے کہ حضرت انس سے پوچھا گیا: کیا تم کچھ لگوانے روزہ دار کے لئے مکروہ جانتے تھے؟ حضرت انس نے فرمایا: نہیں مگر ضعف کی بناء پر (2)۔ ابو عمر نے کہا: شداد اور رافع اور ثوبان کی حدیث ہمارے نزدیک منسوخ ہے اور اس کی ناسخ حضرت ابن عباس کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے روزے اور احرام کی حالت میں کچھ لگوائے۔ کیونکہ حضرت شداد وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ فتح مکہ کے سال رسول اللہ ﷺ ایک شخص کے پاس سے گزرے جو اٹھارہ رمضان کو کچھ لگوا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کچھ لگانے والا اور جس کو کچھ لگانے گئے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے سال احرام اور روزہ کی حالت میں خود کچھ لگوائے جب آپ ﷺ کا حج، حجۃ الوداع کا سال تھا تو یہ لامحالہ پہلی حدیث کی ناسخ ہے کیونکہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے رمضان پایا ہی نہیں تھا کیونکہ ربیع الاول میں آپ ﷺ کا وصال ہو گیا تھا۔

**مسئلہ نمبر 18:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ أَتَمُوا الصِّيَامَ إِلَى الْبَيْتِ یہ امر ہے اور وجوب کا مقتضا ہے اگر میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور الی غایت کے لئے ہے جب اس کا مابعد اس کے ماقبل کی جنس سے ہو تو وہ ماقبل کے حکم میں داخل ہوتا ہے جیسے تیرا قول ہے اشتريت الفدان الی حاشیتہ (میں نے چار سو مربع زمین حاشیہ سمیت خریدی) یا اشتريت منك من هذه الشجرة الی هذه الشجرة۔ مبيع شجر ہے اور آخری درخت بھی اس مبيع میں داخل ہے۔ بخلاف تیرے اس قول کے: اشتريت الفدان الی الدار۔ اس میں دار، مبيع میں داخل نہ ہوگا کیونکہ وہ زمین کی جنس سے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رات کے ظہور تک روزہ کو مکمل کرنے کی شرط رکھی ہے جیسا کہ کھانا جائز قرار دیا حتیٰ کہ دن ظاہر ہو جائے۔ (3)

**مسئلہ نمبر 19:** روزے کی تکمیل میں سے نیت کا متصل ہونا بھی ہے۔ اگر دن کا بعض حصہ روزے کی نیت نہ کی اور فطر کی نیت کی مگر اس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ تو ”مدونہ“ میں اسے افطار کرنے والا بنایا ہے اور اس پر قضا لازم ہے۔ ابن حبیب کی کتاب میں ہے کہ وہ اپنے روزے پر ہے اور روزے میں اسے کوئی چیز خارج نہیں کرتی مگر بالفعل افطار کرے اور نیت بھی نہ ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس پر قضا اور کفارہ ہے۔ سخون نے کہا: جس نے رات کو افطار کی نیت کی وہ کفارہ دے اور جس نے دن میں روزے کی نیت کی اسے کوئی نقصان نہیں لیکن وہ استحساناً قضا کرے۔ میں کہتا ہوں: یہ بہتر ہے۔

**مسئلہ نمبر 20:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِلَى الْبَيْتِ جب رات ظاہر ہو جائے تو افطار کرنا شرعاً سنت ہے خواہ کچھ کھائے یا نہ کھائے۔ ابن عربی نے کہا: امام ابواسحاق شیرازی سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے تین طلاق کی قسم اٹھائی کہ وہ گرم، سرد چیز پر روزہ افطار نہیں کرے گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ سورج کے غروب ہونے کے وقت افطار کرے گا تو اس پر کچھ واجب نہ ہوگا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے قول سے حجت پکڑی ہے۔ جب رات ادھر سے آئے اور دن ادھر سے چلا جائے تو روزہ افطار کر دے (4)۔ امام ابو نصر بن صباغ صاحب الشامل سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: اسے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الصائم یجتم، حدیث نمبر 2020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الحجامة والتقن للصائم، حدیث نمبر 1804، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح بخاری، باب من یحل فطر الصائم، حدیث نمبر 1818، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

گرم یا سرد چیز پر افطار کرنا ضروری ہے اور امام ابو اسحاق نے جو جواب دیا وہ اولیٰ ہے کیونکہ وہ کتاب و سنت کے مطابق ہے۔

**مسئلہ نمبر 21:** اگر کسی نے بادل کی وجہ سے یہ گمان کیا کہ سورج غروب ہو چکا ہے، پھر اس نے روزہ افطار کر دیا پھر

سورج ظاہر ہو گیا تو اکثر علماء کے قول کے مطابق اس پر قضا ہے۔ بخاری میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا:

ہم نے بادل والے دن رسول اللہ ﷺ کے عہد میں روزہ افطار کر دیا، پھر سورج طلوع ہو گیا۔ ہشام سے پوچھا گیا: انہیں قضا کا

حکم دیا گیا تھا؟ فرمایا: انہیں قضا لازم ہے۔ حضرت عمر نے اس مسئلہ میں فرمایا: مسئلہ آسان ہے۔ ہم نے وقت میں اجتہاد کیا۔

آپ نے قضا مراد لی۔ حضرت عمر سے مروی ہے، فرمایا: اس پر قضا نہیں ہے۔ حسن بصری کا بھی یہی قول ہے، فرمایا: اس پر

بھولنے والے کی طرح قضا نہیں ہے۔ یہی قول اسحاق اور اہل ظاہر کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلٰی الْاٰیٰتِ اس قول کو رد کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 22:** اگر روزہ افطار کیا در اس حالیکہ اسے سورج کے غروب ہونے میں شک تھا تو وہ قضا کے ساتھ کفارہ

دے۔ یہ امام مالک کا قول ہے مگر یہ کہ اس کا غالب گمان سورج کے غروب ہونے کا ہو۔ اور جسے فجر کے طلوع ہونے کا شک ہو

تو اسے کھانے، پینے سے رکنا لازم ہے۔ اگر اس نے شک کے ساتھ کھایا تو اس پر قضا ہوگی جیسے بھولنے والے کا حکم ہے۔ اس

میں کوئی اختلاف نہیں۔ اہل مدینہ وغیرہ کے علماء میں سے بعض اس پر کوئی چیز نہیں دیکھتے تھے حتیٰ کہ اس کے لئے فجر کا طلوع

ہونا واضح ہو جائے۔ ابن منذر کا یہی قول ہے۔ الکلیا طبری نے کہا: ایک قوم نے گمان کیا کہ جب اس کے لئے اول فجر تک

افطار مباح ہے جب اس نے اس گمان پر کھایا کہ فجر طلوع نہیں ہوئی تو اس نے شرع کی اجازت سے کھانے کے جواز کے

وقت میں کھایا۔ پس اس پر قضا نہیں ہے۔ اسی طرح مجاہد اور جابر بن زید نے کہا ہے اور قضا کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں

ہے۔ جب رمضان کی پہلی رات میں چاند مطلع کے ابراؤد ہونے کی وجہ سے نظر نہ آئے پھر اس نے کھایا۔ اس کے بعد ظاہر ہوا

کہ آج رمضان کا دن تھا ہم بھی اس جیسے مسئلہ میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اسی طرح دارالحرب میں قیدی نے جب شعبان کا دن

گمان کرتے ہوئے کچھ کھایا پھر اس کے خلاف ظاہر ہوا۔

**مسئلہ نمبر 23:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلٰی الْاٰیٰتِ اس میں صوم وصال سے نبی کا تقاضا پایا جاتا ہے کیونکہ رات

روزے کی غایت ہے۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے (1)۔ اس میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر، ابراہیم

الیتی، ابوالجوزاء، ابوالحسن دینوری وغیرہم صوم وصال رکھتے تھے۔ حضرت ابن زبیر سات دن وصال کا روزہ رکھتے تھے۔ جب

افطار کرتے تھے تو کبھی گھی اور مصبر پیتے تھے حتیٰ کہ انتڑیاں بھر جاتی تھیں۔ فرمایا: ان کی انتڑیاں خشک ہوتی تھیں۔

ابوالجوزاء سات دنوں اور سات راتوں کا صوم وصال رکھتے تھے، اگر وہ کسی سخت آدمی کے بازو کو پکڑتے تو اس کا بازو توڑ

دیتے۔ قرآن و سنت کا ظاہر صوم وصال سے منع کا تقاضا کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب سورج ادھر سے غروب ہو

اور رات ادھر سے آجائے تو روزہ دار افطار کر دے۔ اس کو مسلم نے حضرت عبداللہ بن ادنیٰ کی حدیث سے نقل کیا ہے اور نبی

کریم ﷺ نے صوم وصال سے منع فرمایا، جب انہوں نے صوم وصال سے رکنے سے انکار کیا تو کئی دن آپ ﷺ نے



ان کے ساتھ صوم وصال رکھا پھر عید الفطر کا چاند نظر آ گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر چاند نظر نہ آتا تو میں اور زیادہ تمہیں صوم وصال رکھواتا، یہ آپ ان پر انکار کے طور پر فرما رہے تھے جب انہوں نے صوم وصال سے رکنے سے انکار کیا۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ حضرت انس کی حدیث میں ہے: اگر ہمارے لئے مہینہ لمبا ہوتا تو ہم متواتر صوم وصال رکھتے رہتے تاکہ اعمال میں شدت کرنے والے شدت چھوڑ دیتے۔

اس کو مسلم نے روایت کیا ہے (1)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: صوم وصال سے اجتناب کرو صوم وصال سے اجتناب کرو۔ یہ صوم وصال سے منع میں تاکید کے طور پر فرمایا۔ اور بخاری نے اس حدیث کو نقل فرمایا ہے۔ صوم وصال کو اس لئے ناپسند فرمایا کیونکہ اس میں قویٰ میں ضعف آ جاتا ہے اور بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ جمہور علماء میں سے بعض نے صوم وصال کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس میں ظاہر کی مخالفت ہے اور اہل کتاب سے مشابہت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہمارے روزے اور اہل کتاب کے روزے کے درمیان فرق سحری کا کھانا ہے۔ اس حدیث کو مسلم اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ بخاری میں حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ صوم وصال نہ رکھو جو وصال کا ارادہ کرے وہ سحری تک وصال کرے۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمہاری ہیئت کی طرح نہیں ہوں میں رات گزارتا ہوں میرا کھلانے والا ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور میرا پلانے والا ہے جو مجھے پلاتا ہے۔ علماء نے کہا: سحری تک فطر کی تاخیر میں اباحت ہے اور یہ وصال کی غایت ہے جو وصال کرنا چاہے اور ایک دن کو دوسرے دن کے ساتھ ملانے سے منع ہے۔ یہی امام احمد، اسحاق، ابن وہب (جو مالک کے شاگرد ہیں) کا قول ہے اور جنہوں نے وصال کے جواز پر حجت پکڑی ہے۔ انہوں نے کہا: وصال سے اس لئے نبی فرمائی تھی کہ لوگوں کا زمانہ اسلام قریب قریب تھا تو رسول اللہ ﷺ کو اندیشہ ہوا کہ وہ وصال کی تکلیف اٹھائیں گے اور اعلیٰ مقامات کی کوشش کریں گے اور جہاد اور دشمن پر قوت جو اس سے زیادہ نفع بخش ہے اس میں کمزور پڑ جائیں گے اس وقت انہیں قوت و جہاد کی ضرورت ہے۔ جو نبی کریم ﷺ صوم وصال اور طاعات کے اعلیٰ مقام کو لازم پکڑتے تھے جب صحابہ نے وصال کے بارے میں پوچھا تو اپنے اور ان کے درمیان فرق ظاہر فرمایا اور انہیں بتایا کہ اس سلسلہ میں ان کی حالت، عام لوگوں کی حالت سے مختلف ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمہاری مثل نہیں ہوں میں رات گزارتا ہوں میرا رب مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔ جب صحابہ کے دلوں میں ایمان مکمل ہو گیا اور ان کے سینوں میں مستحکم و راسخ ہو گیا اور مسلمانوں کی کثرت ہو گئی اور دشمنوں پر غالب آ گئے تو اولیاء اللہ نے صوم وصال رکھا اور اپنے لئے اعلیٰ مقامات کو لازم پکڑا۔

میں کہتا ہوں: اسلام کے ظہور اور دشمنوں کے مغلوب ہونے کے باوجود صوم وصال کو ترک کرنا اولیٰ ہے اور یہ اعلیٰ درجہ اور ارفع مقام ہے۔ اس کی دلیل وہی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اور رات صوم شرعی کا زمانہ نہیں ہے حتیٰ کہ اگر کوئی رات کو نیت کے ساتھ روزہ رکھے تو اسے اس پر ثواب نہ ہوگا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے متعلق خبر دی کہ آپ صوم وصال رکھتے ہیں۔ صحابہ نے

1۔ صحیح بخاری، باب صلیب جوز من اللہ وحدیث نمبر 6700، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ گمان کیا تو کہا: آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں آپ ﷺ نے بتایا کہ آپ کو کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا ظاہر یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو جنت کا کھانا، پینا دیا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان معانی اور لطائف پر محمول ہے جو آپ کے دل پر وارد ہوتے تھے۔ جب کوئی لفظ حقیقت و مجاز کا احتمال رکھتا ہو تو اصل حقیقت ہوتی ہے حتیٰ کہ کوئی دلیل وارد ہو جو حقیقت کو زائل کر دے پھر جب صحابہ نے صوم وصال سے رکنے سے انکار کیا تو آپ نے ان کے ساتھ صوم وصال رکھا آپ کی تو عادت تھی جیسا آپ نے اپنے متعلق خود خبر دی اور صحابہ ایسی عادت پر تھے حتیٰ کہ وہ کمزور ہو جائیں گے اور ان کا صبر کم ہو گا تو وہ صوم وصال نہیں رکھیں گے۔ یہ ہے آپ کے انکار کی حقیقت تاکہ وہ تعمق (انتہائی گہرائی) کو چھوڑ دیں اور اس شدت کو ترک کر دیں جس کا انہوں نے ارادہ کیا تھا۔ اگر ہم (میں کھلایا اور پلایا جاتا ہو) کا اپنا معنی مراد لیں تو آپ حکماً افطار کرنے والے ہوں گے جیسے جس نے روزے میں چغلی کھائی یا جھوٹ کی گواہی دی تو وہ حکماً افطار کرنے والا ہے اور ان دونوں کے درمیان فرق نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا، پینا ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔ (1)

**مسئلہ نمبر 24:** روزہ دار کے لئے مستحب ہے کہ جب وہ افطار کرے تو کھجوروں، چھوہاروں اور پانی کے گھونٹوں سے افطار کرے جیسا کہ ابو داؤد نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نماز پڑھنے سے پہلے کھجوروں سے روزہ افطار کرتے تھے۔ اگر کھجوریں نہ ہوتیں تو چھوہاروں سے افطار کرتے اگر چھوہارے بھی نہ ہوتے تو پانی کے گھونٹ بھرتے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: اس کی سند صحیح ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ جب افطار کرتے تو یہ دعا مانگتے: لَكَ صَمْنًا وَعَلَى رِزْقِكَ افطرنَا فاقْبَلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ ”ہم نے تیری رضا کے لئے روزہ رکھا، تیرے رزق پر افطار کیا تو ہماری طرف سے قبول فرما بے شک تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔“ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب افطار کرتے تو یہ کہتے: پیاس چلی گئی، رگیں تر ہو گئیں اور ان شاء اللہ اجر ثابت ہے۔

اس حدیث کو ابو داؤد نے بھی نقل کیا ہے۔ دارقطنی نے کہا: حسین بن واقد اس میں منفرد ہیں اس کی سند حسن ہے (2)۔ ابن ماجہ نے حضرت عبد اللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ کے پاس روزہ افطار کیا تو یہ کہا: افطر عندکم الصائمون واکل طعامکم الابرار و صلت علیکم السلام (تمہارے پاس روزہ داروں نے روزہ افطار کیا، تمہارا کھانا نیکو کاروں نے کھایا اور تم پر فرشتوں نے درود بھیجا)۔ حضرت زید بن خالد جہنی سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے روزہ دار کو روزہ افطار کرایا اسے ان جیسا اجر ملے گا اور ان کے اجر میں سے بھی کچھ کم نہ ہو گا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روزہ دار کے لئے افطار کے وقت کی دعا رد نہیں کی جاتی۔ ابن ابی ملیکہ نے کہا: میں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو کو یہ فرماتے سنا کہ جب وہ افطار کرتے تو یہ دعا

1۔ صحیح بخاری، باب من لم یدم قول اللہ و العمل بہ، حدیث نمبر 1770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب القول عند الافطار، حدیث نمبر 2010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مانگتے۔ اللہم انی اسألك برحمتك التي وسعت كل شيء ان تغفر لي (اے اللہ! میں تجھ سے تیری اس رحمت کے طفیل اپنی مغفرت کا سوال کرتا ہوں جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے)۔ صحیح مسلم میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں جن سے وہ خوش ہوتا ہے جب افطار کرتا ہے تو افطاری سے خوش ہوتا ہے اور جب اپنے رب سے ملاقات کرے گا تو اپنے روزے سے خوش ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 25:** شوال کے چھ روزے رکھنا مستحب ہے جیسا کہ مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت ابویوب انصاری سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے پیچھے شوال کے روزے رکھے اس کے لئے پورے زمانہ کے روزوں کے ثواب کی طرح ثواب ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت سعد بن سعید انصاری مدنی کی حدیث ہے اور یہ ان لوگوں میں سے ہے جن سے بخاری نے کوئی چیز نقل نہیں کی۔ اور ابو اسماء الرجی عن ثوبان مولی النبی ﷺ کے سلسلہ سے عمدہ سند کے ساتھ تفسیر سے یہ حدیث مروی ہے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کے بدلے دس نیکیاں رکھی ہیں، رمضان کا مہینہ دس مہینوں کا بدل ہے اور عید الفطر کے بعد چھ ایام پورے سال کا بدل ہیں (1)۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ ان ایام کے روزوں میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں مکروہ کہا ہے اس خوف سے کہ جاہل لوگ رمضان کے ساتھ اس چیز کو نہ ملا دیں جو رمضان میں سے نہیں ہے اور جس کا خوف امام مالک نے کیا وہ واقع بھی ہوا حتیٰ کہ خراسان کے بعض شہروں میں رمضان کی عادت کے مطابق سحری کے وقت اٹھتے تھے۔ مطرف نے مالک سے روایت کیا ہے کہ امام مالک خود یہ روزے رکھتے تھے۔ امام شافعی نے ان روزوں کو مستحب کہا ہے، امام ابو یوسف نے ان کو مکروہ کہا ہے۔

**مسئلہ نمبر 26:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جماع اعتکاف کو فاسد کر دیتا ہے۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ جو اعتکاف کی حالت میں جان بوجھ کر جماع کرے گا وہ اپنے اعتکاف کو فاسد کرنے والا ہوگا پھر جب کوئی ایسا کرے تو اس پر جو ہوگا اس میں اختلاف ہے۔ حسن بصری اور زہری نے کہا: ایسے شخص پر وہی ہوگا جو رمضان میں اپنی اہلیہ سے جماع کرنے والے پر ہوتا ہے اور وہی بغیر جماع کے مباشرت اگر اس سے تلمذ کا قصد کیا ہوگا تو یہ مکروہ ہے۔ اگر تلمذ کا قصد نہیں کیا تو مکروہ نہیں ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے سر کو کنگھی کرتی تھی جبکہ آپ محکف ہوتے تھے (2) لامحالہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بدن کو اپنے ہاتھ سے چھوتی ہوں گی۔ یہ دلیل ہے کہ بغیر شہوت کے مباشرت ممنوع نہیں ہے۔ یہ عطاء، امام شافعی اور ابن منذر کا قول ہے۔ ابو عمر نے کہا: علماء کا اجماع ہے کہ محکف نہ مباشرت کرے نہ بوسہ دے۔ اگر ایسا کرے تو اس پر حد ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔

امام مالک اور امام شافعی نے کہا: اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔ یہ مزنی کا قول ہے۔ مسائل

1۔ سنن ابن ماجہ، باب ثواب من فطر صائما، حدیث نمبر 1705، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب المعتکف یدخل رأسہ النبیۃ للغسل، حدیث نمبر 1905، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



اعتکاف میں انہوں نے دوسری جگہ فرمایا: وطی سے اعتکاف فاسد نہیں ہوتا مگر ایسی وطی جو حد کو واجب کرتی ہے۔ مرنی نے حج اور روزے میں اس کی اصل پر قیاس کرتے ہوئے یہ اختیار کیا۔

**مسئلہ نمبر 27:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَأَنْتُمْ عَٰكِفُونَ** یہ جملہ حال ہے۔ لغت میں اعتکاف کا معنی ملازمت ہے۔ کہا جاتا ہے: عكف علی الشئ جب کوئی کسی چیز کو لازم پکڑ لے اور اس کی طرف متوجہ ہو۔ راجز نے کہا: عكف النبیط یلعبون الفنزجا (نبطی نے رقص، کھیل کو لازم پکڑا۔) ایک اور شاعر نے کہا:

وظل بنات اللیل حول عکفا عکوف البواکی بینہن (1) صریح

خیالات میرے ارد گرد جھے رہے، رونے والیوں کے بیٹھنے کی طرح جن کے درمیان قبر ہو۔

جب معتکف اعتکاف کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے عمل کو لازم پکڑتا ہے تو اسے یہ اسم لازم ہوتا ہے اور عرف شرع میں اعتکاف سے مراد مخصوص جگہ میں مخصوص شرط پر مخصوص وقت میں مخصوص اطاعت کو لازم پکڑنا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ اعتکاف واجب نہیں ہے۔ یہ قربتوں میں سے ایک قربت ہے اور نوافل میں سے ایک نفل ہے۔ رسول اللہ ﷺ، آپ کے اصحاب اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے اعتکاف کا عمل کیا اور اگر اپنے نفس پر لازم کرے گا تو اس پر لازم ہو جائے گا۔ اس شخص کے لئے اعتکاف کرنا مکروہ ہے جسے اعتکاف کے حقوق پورے کرنے سے عجز کا اندیشہ ہو۔

**مسئلہ نمبر 28:** علماء کا اجماع ہے کہ اعتکاف صرف مسجد میں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فِی الْمَسْجِدِ** پھر علماء کا مساجد کی مراد میں اختلاف ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ اس سے مراد مساجد کی ایک خاص قسم ہے اور وہ وہ ہے جسے کسی نبی نے تعمیر کیا ہو جیسے مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد ایلیماء (بیت المقدس) حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت سعید بن مسیب سے مروی ہے۔ ان کے نزدیک اعتکاف ان مساجد کے علاوہ کسی مسجد میں جائز نہیں۔ دوسرے علماء نے کہا: اعتکاف صرف جامع مسجد میں جائز ہے کیونکہ ان کے نزدیک آیت میں اس جنس کی مساجد کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن مسعود سے بھی یہی مروی ہے۔ یہ عروہ، حکم، حماد، زہری، ابو جعفر محمد بن علی کا قول ہے اور امام مالک کا ایک قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: اعتکاف ہر مسجد میں جائز ہے۔ یہ قول سعید بن جبیر اور ابو قلابہ وغیرہم سے مروی ہے۔ یہ امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ ان کی حجت آیت کو عموم پر محمول کرنا ہے ہر اس مسجد میں اعتکاف جائز ہے جس میں امام اور مؤذن ہو۔ امام مالک کا ایک قول بھی یہی ہے۔ ابن علیہ، داؤد بن علی طبری اور ابن منذر کا قول بھی یہی ہے۔ دارقطنی نے ضحاک سے انہوں نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ہر وہ مسجد جس میں مؤذن اور امام ہو اس میں اعتکاف صحیح ہے۔ دارقطنی نے کہا: ضحاک نے حضرت حذیفہ سے نہیں سنا ہے۔

**مسئلہ نمبر 29:** امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک کم از کم اعتکاف ایک دن اور ایک رات ہے۔ اگر کسی نے کہا: مجھ

پر اللہ کیلئے اعتکاف ہے تو اس پر ایک دن اور ایک رات کا اعتکاف لازم ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک دن کے اعتکاف کی نذر مانی تو ایک دن اور ایک رات کا اعتکاف لازم ہوگا۔ سخون نے کہا: جس نے ایک رات کے اعتکاف کی نذر مانی اس پر کوئی چیز نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اگر ایک دن کی نذر مانی تو بغیر رات کے دن کا اعتکاف لازم ہوگا اور اگر رات کی نذر مانی تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں جیسا کہ سخون نے کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس پر وہی ہے جو اس نے نذر مانی اگر رات کی نذر مانی تو رات کا اعتکاف ہوگا، اگر دن کی نذر مانی تو دن کا اعتکاف ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: کم از کم ایک لحظہ کا اعتکاف ہے اس کے اکثر کی کوئی حد نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ کے بعض اصحاب نے کہا: ایک ساعت (گھڑی) کا اعتکاف بھی صحیح ہے۔ اس قول کی بناء پر اعتکاف کی شرط سے روزہ نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبل سے ایک قول مروی ہے اور یہی قول داؤد بن علی اور ابن علیہ کا ہے، ابن منذر اور ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اعتکاف رمضان میں ہوتا تھا اور یہ محال ہے کہ رمضان کا روزہ رمضان کے لئے اور دوسرے دنوں کے لئے ہو۔ اگر معتکف نے رمضان میں اپنے روزے سے نفل اور فرض روزے کی نیت کی تو اس کا روزہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک فاسد ہے۔ یہ معلوم ہے کہ معتکف کو اعتکاف کی رات میں عورتوں سے مباشرت۔ اجتناب لازم ہے جس طرح دن میں اجتناب لازم ہے اور اعتکاف کی رات اس کے اعتکاف میں داخل ہے اور رات روزے کا کچھ نہیں ہے اسی طرح دن بھی روزے کا محتاج نہیں ہے۔ اگر وہ روزہ رکھے تو بہتر ہے۔ امام مالک، امام ابو حنیفہ اور امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ روزے کے بغیر اعتکاف صحیح نہیں ہے۔

حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور مؤطا میں قاسم بن محمد اور نافع مولیٰ حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ اعتکاف روزے کے ساتھ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا کُلُوا وَاشْرَبُوا حَلٰلًا يَكْتَبَنَّ لَكُمْ الْحَيْضُ الْاَبْيَظُّ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ آتُوا الصِّيَامَ اِلَى الْاَيْلٍ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَ اَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ۔ اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کا ذکر روزے کے ساتھ کیا ہے۔ یحییٰ نے کہا: امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک معاملہ اسی پر ہے اور انہوں نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو عبد اللہ بن بدیل نے عمرو بن دینار سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زمانہ جاہلیت میں ایک رات اور دن کے اعتکاف کی (کعبہ کے پاس) نذر مانی۔ پھر نبی کریم ﷺ سے مسئلہ پوچھا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اعتکاف کر اور روزہ رکھ۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے کہا: ابن بدیل، عمرو سے روایت کرنے میں منفرد ہے اور یہ ضعیف ہے (1)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اعتکاف بغیر روزے کے نہیں ہے۔ دارقطنی نے کہا: سوید بن عبد العزیز نے سفیان بن حسین سے انہوں نے زہری سے انہوں نے حضرت عروہ سے انہوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور انہوں نے کہا: ہمارے نزدیک روزے کی شرط سے نہیں ہے کہ وہ اعتکاف کے لئے ہو بلکہ اعتکاف کے لئے روزہ ہو، رمضان کے لئے ہو، نذر کے لئے ہو اور کسی اور وجہ سے ہو۔ صحیح یہ ہے کہ اگر نذر ماننے والے نے نذر مانی تو اس کی نذر کو اصل شرع میں

1۔ صحیح بخاری، باب من لم یز علیہ صوما اذا اعتکف۔ حدیث نمبر 1901، فیما، القرآن، جلی کیشنز

اس کے مقتضا کی طرف پھیرا جائے گا۔ یہ اس شخص کی طرح ہے جس نے نماز کی نذر مانی تو وہ اس پر لازم ہے اس پر خاص اس نماز کے لئے پاک ہونا ضروری نہیں بلکہ جائز ہے کہ کسی دوسری چیز کے لئے کی گئی طہارت سے بھی اسے ادا کرنا جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 30:** معتکف کے لئے اپنی اعتکاف کی جگہ سے نکلنا جائز نہیں مگر وہ کام جو اس کے لئے ضروری ہو جیسا کہ

ائمہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف کرتے تھے تو اپنے سر کو میرے قریب کرتے تھے میں آپ کو کنگھی کیا کرتی تھی اور گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے مگر حاجت انسانی کے لئے (1) (یعنی پیشاب،

پاخانہ کے لئے)۔ اس مسئلہ میں ائمہ اور امت کا کوئی اختلاف نہیں جب معتکف ضرورت کے لئے باہر نکلے تو ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً واپس آجائے اور اپنے سابقہ اعتکاف پر بنا کرے اور اس پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی اور ضرورت میں سے واضح

مرض اور حیض ہے۔ ان کے علاوہ امور کے لئے نکلے گا تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک کے مذہب کو اس کے متعلق ہم ذکر کر چکے ہیں اسی طرح امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔ حضرت سعید بن جبیر، حسن، نخعی مریض کی عیادت کرتے تھے

اور جنازوں میں شریک ہوتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، لیکن ان سے ثابت نہیں۔ اسحاق نے واجب اعتکاف اور نفل اعتکاف میں فرق کیا ہے۔ واجب اعتکاف کے بارے میں فرمایا: اس میں مریض کی عیادت نہ کرے اور جنازوں میں

شرکت نہ کرے اور نفلی اعتکاف کے بارے میں فرمایا: وہ اعتکاف کی ابتدا میں جنازوں میں حاضر ہونے، مریضوں کی عیادت کرنے اور جمعہ پڑھنے کی شرط لگا لے۔ امام شافعی نے فرمایا: مریض کی عیادت، جنازوں میں حاضری اور دوسری ضروریات

کے لئے اعتکاف سے نکلنے کی شرط لگانا صحیح ہے۔ اس مسئلہ میں امام احمد نے مختلف روایات بیان کی ہیں کبھی منع فرمایا، کبھی فرمایا: مجھے امید ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ امام اوزاعی نے امام مالک کی طرح فرمایا ہے: اعتکاف میں شرط نہیں ہے۔ ابن منذر

نے کہا: معتکف اعتکاف سے نہ نکلے مگر جس کے لئے نکلنا ضروری ہو۔ نبی کریم ﷺ حاجات ضروریہ کے لئے نکلتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 31:** معتکف کا جمعہ کے لئے نکلنا اس میں بھی اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے کہا: جمعہ کے لئے نکلے اور سلام پھیرنے کے ساتھ ہی واپس آجائے کیونکہ وہ ایک فرض کے لئے نکلا تھا اور اس کا اعتکاف نہیں ٹوٹا۔ یہ ابن الجہم نے امام

مالک سے روایت کیا ہے۔ یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ ابن عربی اور ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ جو دس دنوں کے اعتکاف کا ارادہ کرے یا دس دنوں کی نذر مانے تو وہ جامع مسجد میں اعتکاف کرے جب

کسی دوسری مسجد میں اعتکاف کرے تو جمعہ کے لئے جانا اس کو لازم ہے اور اس کا اعتکاف باطل ہے۔ عبد الملک نے کہا: جمعہ کے لئے نکلے، جمعہ میں حاضر ہو اور پھر اپنی جگہ واپس آجائے اس کا اعتکاف صحیح ہوگا۔

میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَأَنْتُمْ عَلَيْكُمْ فِي الْمَسْجِدِ یہ ارشاد عام ہے۔ علماء کا اتفاق ہے کہ اعتکاف واجب نہیں سنت ہے اور جمہور ائمہ کا اجماع ہے کہ جمعہ ذوات پر فرض ہے۔ جب دو واجب کسی پر جمع ہو جائیں اور ان میں سے ایک دوسرے سے مؤکد ہو تو مؤکد کو مقدم کیا جاتا ہے۔ جب مندوب اور واجب جمع ہوں تو پھر کیا کیفیت ہوگی

1۔ صحیح بخاری، باب لا یدخل البیت الا لحاجة، حدیث نمبر 1889، ضیاء القرآن پبلی کیشنز



کسی نے بھی جمعہ کو ترک کرنے کا قول نہیں کیا۔ جمعہ کی طرف نکلنا یہ حاجت سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 32:** معتکف جب کبیرہ گناہ کرے گا تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا کیونکہ کبیرہ گناہ عبادت کی ضد ہے جس طرح کہ حدیث، طہارت اور نماز کی ضد ہے۔ اور جن اعمال کو اللہ تعالیٰ نے اس پر حرام کیا ہے ان کا چھوڑنا اعتکاف کی عبادت میں اعلیٰ منازل میں سے ہے۔ یہ ابن خویز مند اد نے مالک سے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 33:** مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف کرنے کا ارادہ فرماتے تو صبح کی نماز پڑھتے پھر اپنی اعتکاف کی جگہ میں داخل ہو جاتے۔ (الحديث)

معتکف کے اعتکاف میں داخل ہونے کے وقت میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام اوزاعی نے اس حدیث کے ظاہر کے مطابق کہا ہے، ثوری اور لیث سے ایک قول یہی مروی ہے۔ ابن منذر اور تابعین کے ایک طائفہ کا یہی قول ہے۔ ابو ثور نے کہا: یہ وہ شخص کرے جس نے دس دنوں کی نذر مانی ہو۔ اگر دس سے زیادہ کی نذر مانی ہو تو سورج غروب ہونے سے پہلے داخل ہو جائے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: جب اس نے ایک مہینہ کا اعتکاف اپنے اوپر واجب کیا ہو تو وہ اس دن کی رات سے سورج غروب ہونے سے پہلے مسجد میں داخل ہو جائے۔ امام مالک نے فرمایا: اسی طرح جس نے ایک دن یا زیادہ دنوں کے اعتکاف کی نیت کی ہو۔ یہی امام ابو حنیفہ، ابن ماجہ، ابن ماجہ اور عبد الملک کا قول ہے کیونکہ پہلی رات اعتکاف کے دنوں میں داخل ہے وہ اعتکاف کا زمانہ ہے۔ دن کی طرح اس کا بعض حصہ چھوڑا نہیں جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: جب کسی نے کہا مجھ پر اللہ کے لئے ایک دن (کا اعتکاف) ہے وہ طلوع فجر سے پہلے داخل ہو اور سورج غروب ہونے کے بعد نکلے۔ یہ ان کا قول مہینے والے اعتکاف کے بارے میں قول کے خلاف ہے۔ لیث نے ایک قول میں اور زفر نے کہا: فجر کے طلوع ہونے سے پہلے داخل ہو۔ مہینہ، اور ایک دن ان کے نزدیک حکم میں برابر ہیں اسی طرح امام ابو یوسف سے مروی ہے۔ قاضی عبدالوہاب کا بھی یہی قول ہے۔ رات اعتکاف میں تجاوز داخل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اعتکاف بغیر روزے کے نہیں ہے اور رات روزے کا زمانہ نہیں ہے۔ ثابت ہوا کہ اعتکاف سے مقصود دن ہے رات نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں حضرت عائشہ کی حدیث ان اقوال کو رد کرتی ہے تنازع کے وقت یہ حجت ہے یہ ایسی حدیث ہے جو ثابت ہے اس کی صحت میں کوئی اختلاف نہیں۔

**مسئلہ نمبر 34:** امام مالک نے اس شخص کے لئے مستحب قرار دیا ہے کہ جو دس دنوں کا اعتکاف کرے وہ عید الفطر کی رات مسجد میں گزارے حتیٰ کہ صبح یہاں سے عید گاہ کی طرف جائے۔ یہی امام احمد کا قول ہے۔ امام شافعی اور امام اوزاعی نے کہا: جب سورج غروب ہو تو نکل جائے۔ یہ سحنون نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کیونکہ مہینہ کے ختم ہونے کے ساتھ دس دن بھی ختم ہو گئے اور رمضان شریف کے آخری دن کے سورج کے غروب ہونے کے ساتھ مہینہ ختم ہو جاتا ہے۔ سحنون نے کہا: یہ وجوب کے طور پر ہے۔ پس جو عید الفطر کی رات نکلے گا تو اس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔

ابن ماجہ نے کہا: ہم نے جو مہینہ کے ختم ہونے کے متعلق کہا ہے وہ اس قول کا رد کرتا ہے اگر عید الفطر کی رات ٹھہرنا

اعتکاف کی شرط سے ہوتا تو وہ اعتکاف صحیح نہ ہوتا جو فطر کی رات سے متصل نہ ہوتا اور اس کے جواز پر اجماع ہے کہ عید الفطر کی رات ٹھہرنا معتکف کے لئے اعتکاف کی صحت کے لئے شرط نہیں ہے۔ یہ روزے کے احکام اور اعتکاف جو آیات کے متعلق تھے کافی دشانی ہیں، جو ان پر انحصار کرنے والا ہے اس کے لئے کفایت ہے اور اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دینے والا ہے۔

**مسئلہ نمبر 35:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ** یہ احکام اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں پس ان کی مخالفت نہ کرو۔ **تِلْكَ**، ان اوامر و نواہی کی طرف اشارہ ہے۔ **الحدود** سے مراد رکاوٹیں ہیں اور **الحد** سے مراد منع کرنا ہے۔ اسی وجہ سے لوہے کو حدید کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہتھیار کو بدن تک پہنچنے سے روکتا ہے، چوکیدار اور جیل کے داروغے کو حداد کہا جاتا ہے کیونکہ جو گھر کے اندر ہوتے ہیں ان کو نکلنے سے روکتا ہے اور باہر والوں کو اندر جانے سے روکتا ہے۔ ان احکام کو اللہ کی حدود اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ ان چیزوں کو داخل ہونے سے روکتے ہیں جو ان میں سے نہیں ہوتے اور جو ان سے ہوتے ہیں ان کو خروج سے روکتے ہیں۔ اسی سے گناہوں کی حدود ہیں جو گناہ کرنے والوں کو دوبارہ گناہ کرنے سے روکتی ہیں۔ اسی طرح عدت والی عورت کو حاد کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زیب و زینت سے رک جاتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 36:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لِّلنَّاسِ لِيَعْلَمُوا** یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان حدود کو بیان فرمایا اسی طرح تمام احکام کو بیان فرماتا ہے تاکہ تم ان سے تجاوز کرنے سے بچو۔ **الآیات** سے مراد وہ علامات ہیں جو حق کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ **لَعَلَّهُمْ** لوگوں کے حق میں ترجی (امید) ہے اس کا ظاہر عموم ہے اور اس کا معنی اس شخص میں خاص ہے جس کیلئے اللہ تعالیٰ ہدایت کو آسان فرماتا ہے ان آیات کی دلالت کی وجہ سے جن کے ضمن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ (1)

**وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِمَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ**

”اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طریقہ سے اور نہ رسائی حاصل کرو اس مال سے (رشوت دے کر) حاکموں تک تاکہ یوں کھاؤ کچھ حصہ لوگوں کے مال کا ظلم سے حالانکہ تم جانتے ہو (کہ اللہ نے یہ حرام کیا ہے)۔“

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ** بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت عبدان بن اشوع حصری کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس نے امراء القیس کنڈی پر مال کا دعویٰ کیا تھا۔ دونوں اپنا مقدمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے۔ امراء القیس نے انکار کیا۔ اس نے قسم اٹھانے کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ وہ قسم سے رک گیا۔ اس نے اپنی زمین کا فیصلہ عبدان کے سپرد کر دیا اور اس سے جھگڑا نہ کیا (2)۔

**مسئلہ نمبر 2:** اس آیت سے خطاب حضرت محمد ﷺ کی تمام امت کو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض، بعض کا مال ناحق نہ کھائے۔ اس میں جوا، دھوکا، غصب، حقوق سے انکار اور ایسی چیز جس کے دینے پر مالک خوش نہیں ہے یا ایسی چیز جس کو شریعت نے حرام کیا ہے اگرچہ مالک خوشی سے دینے پر راضی بھی ہو جیسے زانیہ کی کمائی، کاہن کا نذرانہ، شرابوں اور خنازیر کی قیمتیں وغیرہ داخل ہیں۔ اور بیع میں غبن داخل نہیں جبکہ بائع اس چیز کی حقیقت بتا دے جو اس نے بیچی کیونکہ اس صورت میں غبن (زیادتی) گویا ہبہ ہے۔ جیسا کہ اس کا بیان سورہ نساء میں آئے گا۔ اموال کو ان لوگوں کی ضمیر کی طرف مضاف کیا گیا ہے جن کو منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایسا ہے جس کو روکا گیا ہے اور جس سے روکا گیا ہے جیسا فرمایا: تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ (البقرہ: 85) ایک قوم نے کہا: اس آیت سے مراد کھیلوں میں جو مال لگائے جاتے ہیں، گانے والیوں کے مال، شراب کی قیمت اور برے لوگوں رشوت خور وغیرہ کے اموال ہیں۔

**مسئلہ نمبر 3:** جس نے کسی کا مال شرع کی اجازت کے بغیر لیا اس نے باطل ذریعہ سے کھا یا وہ مال بھی باطل شمار ہوگا جس کا فیصلہ قاضی تیرے حق میں کر دے جبکہ تو جانتا ہے کہ تو باطل پر ہے۔ قضا قاضی سے حرام، حلال نہیں ہو جاتا کیونکہ قاضی تو ظاہر حال کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ یہ اموال کے بارے میں اجماع ہے اگرچہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قاضی کی قضا فروج (شرمگاہوں) میں باطناً بھی نافذ ہو جاتی ہے۔ جب قضا قاضی اموال میں باطن کے حکم کو تبدیل نہیں کرتی تو فروج میں بدرجہ اولیٰ تبدیلی نہیں کرے گی (☆)۔ ائمہ نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میرے پاس جھڑالے کر آتے ہو شاید تم میں سے کوئی دوسرے سے حجت بیان کرنے میں زیادہ فصیح ہو میں اس کے مطابق فیصلہ کر دوں جو میں نے (گواہیاں، دلائل) سنے تو میں اس کے بھائی کے مال سے کوئی چیز اس کے لئے کر دوں تو وہ نہ لے میں اس کے لئے آگ کا ایک ٹکڑا سے دینے والا ہوں گا (1)۔ ایک روایت میں ہے: وہ اس کو اٹھا لے یا اس کو چھوڑ دے۔ اس حدیث کے مطابق جمہور علماء اور ائمہ فقہاء کا قول ہے۔ یہ نص ہے کہ حاکم کا حکم ظاہر پر ہوتا ہے باطن کے حکم کو تبدیل نہیں کرتا خواہ وہ مال، خون اور شرمگاہوں کے متعلق ہو۔ مگر امام ابوحنیفہ سے فروج کے متعلق جو قول حکایت کیا گیا ہے کہ باطن میں حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اگر دو جھوٹے گواہ کسی شخص کے بارے میں گواہی دیں کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے اور حاکم ان کی گواہی کے مطابق فیصلہ کر دے کیونکہ وہ گواہ اس کے نزدیک عادل ہیں تو اس عورت کی شرمگاہ عدت کے بعد نئے نکاح کرنے والے کے لئے حلال ہو جائے گی۔ جو یہ جانتا بھی ہے کہ فیصلہ غلط تھا۔ اسی طرح اگر ان گواہوں میں سے بھی ایک اس سے نکاح کر لے تو امام صاحب کے نزدیک اس کا نکاح جائز ہوگا کیونکہ جب وہ ظاہر میں تمام مردوں کے لئے حلال ہو گئی تو گواہ اور دوسرے سب برابر ہیں۔ کیونکہ قاضی کی قضا نے اس کی عصمت کو ختم کر دیا اور اس میں تحلیل و تحریم کی ظاہر و باطن میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، صفحہ 1062، جلد 2 (وزارت تعلیم)

☆۔ ائمہ احناف کا کہنا یہ ہے کہ جب عورت ایسی ہے جو مرد پر حرام نہیں اور اس کے عقد میں آسکتی ہے تو قاضی کے فیصلہ سے پہلے بطور اقتضاء انہیں نکاح تسلیم کیا جائے گا تا کہ دونوں کا ایک دوسرے سے انتفاع درست ہو جائے۔ ہدایہ۔ کتاب النکاح۔



ایک نئی صورت پیدا کر دی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دوسرے خاوندوں کے لئے حلال نہ ہوتی اور امام ابو حنیفہ نے لعان سے حجت پکڑی ہے۔ انہوں نے فرمایا: بیوی جھوٹے لعان کی وجہ سے اپنے خاوند سے جدائی تک پہنچ گئی۔ جس کے بارے میں اگر قاضی کو اس کے کذب کا علم ہو جاتا تو وہ اسے حد لگاتا، ان دونوں کے درمیان فرق نہیں کیا۔ اور پس یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں جس کے لئے اس کے بھائی کے حق سے کسی چیز کا فیصلہ کر دوں تو وہ اسے نہ لے، کے عموم میں شامل نہیں (1)۔ (الحديث)

**مسئلہ نمبر 4:** اس آیت سے ہر موافق و مخالف دلیل پکڑنے والا ہے اپنے حکم کے بارے میں جو وہ اپنے لئے دعویٰ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: یہ جائز نہیں ہے اور اسی آیت سے استدلال کرتا ہے: وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ اس کا جواب یہ ہے کہ اسے کہا جائے گا ہم تسلیم نہیں کرتے کہ وہ باطل ہے حتیٰ کہ دلیل کے ساتھ واضح کرے۔ اس وقت اس عموم میں داخل ہوگا۔ یہ دلیل ہے کہ معاملات میں باطل جائز نہیں۔ اس میں باطل کی تعیین نہیں۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْبَاطِلِ لَعْنَتٌ مِّنْ رَبِّكَ يُؤْتِيهِهَا لِمَن يَشَاءُ لَعْنَةُ رَبِّكَ بِالْبَاطِلِ أَلَّتْ كَلْبَتُهَا أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لا یتاہد الباطل۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد ابلیس ہے۔ وہ قرآن میں کی، بیشی نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هو الله الباطل۔ یعنی شرک۔ البطلة، جادو گروں کو کہتے ہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتُذَلُّوا بِهَا إِلَى الْحُكْمِ بِحُكْمِ بَعْضِ عُلَمَاءِ نے فرمایا: اس سے مراد ودیعت ہے اور ایسی چیز ہے جس میں دلیل نہ ہو۔ حضرت ابن عباس اور حسن سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا یہ یتیم کا مال ہے جو اوصیاء کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ وہی حکام کے پاس معاملہ لے جاتا ہے جب اس سے اس مال کا مطالبہ کیا جاتا ہے تاکہ اس کا کچھ حصہ ہتھیا لے اور ظاہر اس کے لئے حجت بھی ہو۔ زجاج نے کہا: تم اس کے مطابق عمل کرتے ہو احکام کا ظاہر جس کو ثابت کرتا ہے اور تم اس کو ترک کرتے ہو جس کے بارے تم جانتے ہو کہ یہ حق ہے۔ کہا جاتا ہے: ادل الرجل بحجته او بالامر الذی یرجو النجاح بہ (اس شخص نے اپنی حجت پیش کی یا وہ امر پیش کیا جس کے ساتھ وہ نجات کی امید رکھتا ہے) اس کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی جو کنویں میں اپنا ڈول پھینکتا ہے (2)۔ کہا جاتا ہے: ادلی دلوة اس نے ڈول چھوڑا دلاھا، ڈول نکالا۔ الدلو، الدلاء کی جمع ادلی و دلا و دلی۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ باطل کے ذریعے مال کھانے اور حکام تک جج باطلہ کے ساتھ معاملات کو لے جانا جمع نہ کرو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ (البقرہ: 42) یہ تیرے اس قول کے قبیل سے ہے: لا تأکل السمک و تشرب اللبن مچھلی کا کھانا اور دودھ کا پینا جمع نہ کر۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تم اپنے اموال کے ساتھ حکام سے تعلق نہ جوڑو اور انہیں رشوت نہ دو تاکہ وہ تمہارے لئے اس سے زیادہ کا فیصلہ کریں۔ پس باء مطلق ملانے کے لئے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول رائج ہے کیونکہ حکام رشوت لینے والے ہوتے ہیں مگر جسے اللہ محفوظ رکھے اور وہ بہت کم ہیں۔ دونوں الفاظ مناسب ہیں۔ تدلوا، ارسال الدلو سے مشتق ہے الرشوة، الرشام سے ہے۔ وہ اس

ری کو لمبا کرتا ہے تاکہ حاجت کو پورا کرے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس قول کو تدلوا بھا کا قول قوت دیتا ہے تدلوا، تاکلوا پر عطف کی بناء پر مجزوم ہے جیسا ہم نے ذکر کیا ہے۔ مصحف حضرت ابی میں ہے ولا تدلوا حرف نہی کے تکرار کے ساتھ ہے۔ یہ قراءت تدلوا کے جزم کی تائید کرتی ہے جو اکثر کی قراءت ہے۔ بعض نے فرمایا تدلوا ظرف کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ اور سیبویہ کے نزدیک اس جیسی مثال میں ناصب ان مضمرہ ہوتا ہے اور بھا میں ضمیر کا مرجع اموال ہیں اور پہلے قول کے مطابق اس کا مرجع حجت ہے اور اس کا ذکر پہلے نہیں ہوا ہے دوسرے قول کو اموال کا ذکر بھی قوت دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔ الصحاح میں ہے: الرشوة معروف ہے الرشوة بھی اس کی مثل ہے اس کی جمع رُشعی و رِشعی ہے۔ رشاکہ یرشوة، وارتشعی کا معنی رشوت لینا ہے استرشعی فی حکمہ۔ یعنی حکم پر اس نے رشوت طلب کی۔ میں کہتا ہوں: اس دور میں حکام سراپا رشوت ہیں۔ ان کے بارے رشوت لینے کا گمان نہیں بلکہ یقیناً رشوت لیتے ہیں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِمَا كَلُمَا، لام کی وجہ سے منصوب ہے فَرِيقًا کَلُمَا، جز کو کہتے ہیں۔ فَرِيقًا کَلُمَا اور بعض سے تعبیر فرمایا۔ الفریق بکریوں کا چھوٹا سا ریوڑ جو بڑے ریوڑ سے جدا ہو جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے لتاکلوا اموال فریق من الناس۔ بالاولیٰ اس کا معنی ظلم اور تعدی ہے اس کو اثم اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ ظلم کرنے والے کے ساتھ گناہ متعلق ہوتا ہے اَنْتُمْ تَعْلَمُونَ یعنی تم اس کا بطلان اور گناہ جانتے ہو۔ یہ جرأت و معصیت میں مبالغہ ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** اہل سنت کا اتفاق ہے کہ جس نے وہ چیز لی جس پر مال کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ ہو، اس کی وجہ سے اسے فاسق کہا جائے گا کیونکہ اس پر اس کا لینا حرام تھا۔ لیکن بشر بن معتمر اور اس کے متبعین معتزلیوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ انہوں نے کہا: مکلف کو فاسق نہیں کہا جائے گا مگر دوسو درہم لینے کے ساتھ۔ اس سے کم میں فاسق نہیں کیا جائے گا۔ ابن الجبائی کا قول اس کے خلاف ہے اس نے کہا: دس درہم لینے کے ساتھ فاسق کہا جائے گا دس سے کم میں فاسق نہیں کہا جائے گا۔ ابن ہذیل کا قول اس کے خلاف ہے۔ اس نے کہا: پانچ درہم لینے کے ساتھ فاسق کہا جائے گا۔ اور بعض بصرہ کے قدریوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ اس نے کہا: ایک درہم لینے کے ساتھ فاسق کہا جائے گا اس سے کم میں نہیں۔ یہ تمام اقوال قرآن و سنت سے اور امت کے علماء کے اتفاق سے مردود ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے خون، تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں (2) (الحديث) اس کی صحت پر اتفاق ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآيَةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ النَّاسِ وَالْحَجَّ ۚ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا  
الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۚ وَأَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا  
اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٧﴾

1۔ البحر الرغیز، صفحہ 260، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، کتاب القسامۃ، باب تغلیظ تحريم الدماء، صفحہ 61، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

”دریافت کرتے ہیں آپ سے نئے چاندوں کے متعلق (کہ یہ کیونکر گھٹتے بڑھتے ہیں) فرمائیے: یہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے اور یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم داخل ہو گھروں میں ان کے پچھاڑے سے ہاں نیکی تو یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے اور آیا کرو گھروں میں ان کے دروازوں سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اس امید پر کہ کامیاب ہو جاؤ۔“

اس میں بارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَهْلِ يَوْمَئِذٍ قُلِ الْاَهْلُ يَوْمَئِذٍ اُولُو الْقَرْبَىٰ وَالْاَهْلُ يَوْمَئِذٍ اُولُو الْقَرْبَىٰ وَالْاَهْلُ يَوْمَئِذٍ اُولُو الْقَرْبَىٰ۔ انہوں نے اس کے ساتھ نبی کریم ﷺ پر اعتراض کیا تھا۔ حضرت معاذ نے عرض کی: یا رسول اللہ! مسلمانوں کے یہودی ہم پر غالب آ گئے وہ ہم سے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ چاند کو کیا ہے کہ یہ باریک سا ظاہر ہوتا ہے پھر بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ برابر اور گول ہو جاتا ہے پھر گھٹنا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ پہلی حالت پر ہو جاتا ہے؟ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کے نزول کا سبب مسلمان قوم کا نبی کریم ﷺ سے چاند کے متعلق سوال تھا۔ اس چاند کے آخری راتوں میں چھپنے، اس کے مکمل ہونے اور سورج کی حالت سے مختلف ہونے کا سبب کیا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، قتادہ اور ربیع وغیرہم کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَنِ الْاَهْلِ اَهْلُهُ جَمْعٌ هَلَالٌ كِي۔ اس کو جمع ذکر کیا گیا ہے حالانکہ چاند حقیقت میں ایک ہے اس حقیقت سے کہ ایک مہینہ میں ایک ہوتا ہے اور دوسرے مہینہ میں دوسرا ہوتا ہے۔ مہینہ کے تمام احوال چاندوں سے ہوتے ہیں اور اہلہ سے مراد مہینے ہیں، کبھی شہر سے چاند مراد ہوتا ہے کیونکہ چاند مہینہ میں وارد ہوتا ہے۔ جیسے شاعر نے کہا:

اخوان من نجد على ثقة والشهر مثل قلامة الظفر

اس شعر میں شہر سے مراد چاند ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: چاند کو شہر اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ ہاتھ اس کی رویت کی جگہ کی طرف اشارہ کر کے اس کو شہرت دیتے ہیں اور اس پر دلالت کرتے ہیں اور ہلال کے لفظ کا اطلاق مہینہ کی آخری دو راتوں اور آغاز کی دو راتوں پر بھی ہوتا ہے۔ بعض نے کہا: پہلی تین راتوں کو کہا جاتا ہے۔ اصمعی نے کہا: ہلال وہ ہوتا ہے جو باریک دھاگے کی طرح گول ہوتا ہے۔ بعض نے کہا: ہلال وہ ہوتا ہے جو اپنی روشنی کے ساتھ آسمان کو روشن کرتا ہے اور یہ ساتویں کی رات میں ہوتا ہے (2)۔ ابو العباس نے کہا: چاند کو ہلال اس لئے کہا جاتا ہے کہ لوگ اس کے متعلق خبر دینے کے لئے اپنی آوازوں کو بلند کرتے ہیں۔ اسی سے استہل الصبی ہے جب بچے کے چیخنے کے ساتھ اس کی زندگی ظاہر ہو۔ استہل وجہہ فر جاؤ تہمل جب اس میں سرور ظاہر ہو۔ ابو کبیر نے کہا:

داذا نظرت الى اسرة وجهه برقت كبرق العارض المتهلل

کہا جاتا ہے: اہلنا الہلال جب ہم مہینہ میں داخل ہوں، جوہری نے کہا: اہل الہلال واستہل۔ مجہول کا میغہ استعمال ہوتا ہے استہل بمعنی تبین (ظاہر ہونا) بھی بولا جاتا ہے۔ اہل نہیں کہا جاتا، کہا جاتا ہے: اہلنا عن لیلة کذا اور

1۔ زاد المسیر، صفحہ 169، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ البحر الرائق، صفحہ 281، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)



اهلناہ فہل نہیں کہا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: ہم نے اسے داخل کیا تو وہ داخل ہو گیا۔ یہ اس کا قیاس ہے۔ ابو نصر عبد الرحیم القشیری نے اپنی تفسیر میں کہا جاتا ہے: اهل الهلال واستهل واستهلنا الهلال واستهلنا۔

**مسئلہ نمبر 3:** ہمارے علماء نے فرمایا: جس نے قسم اٹھائی کہ وہ قرضہ ادا کرے گا یا ایسا کرے گا فی الهلال اور رأس الهلال او عند الهلال۔ پھر اس نے وہ کام چاند دیکھنے کے دو دن بعد یا ایک دن بعد کیا تو وہ حاث نہیں ہوگا۔ اور تمام مہینے تمام عبادات و معاملات کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَاجَّةِ اس آیت میں چاند کے بڑھنے اور کم ہونے کی حکمت بیان ہو رہی ہے۔ مدتوں، معاملات، قسموں، حج، تعداد، روزہ، عید، مدت حمل، اجارات، کرایوں کے علاوہ دوسرے بندوں کی مصلحتوں سے اشکال کو دور کرنے کے لئے یہ گھٹتا اور بڑھتا ہے اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات ہیں: وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَاتٍ لِّلَّذِينَ يَذْكُرُونَ وَجَعَلْنَا الشَّمْسُ مِيزَانًا لِّبَحْرِنَا لِيَتَّبِعُوا أَفْضَلَ مِم مَّا يَكْتُمُونَ وَجَعَلْنَا السَّيِّئَاتِ رِجْزًا وَجَعَلْنَا الصَّالِحِينَ كَلَامًا (الاسراء: 12) اس آیت کی وضاحت آگے آئے گی اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَرًا لِّمَنَازِلٍ لِّيَتَّبِعُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابِ (یونس: 5) چاندوں کا شمار کرنا، دنوں کے شمار سے آسان ہوتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** جو ہم نے ثابت کیا ہے اس پر اہل ظواہر اور ان کے ہمنواؤں کا رد ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ مساقات (درختوں کو پانی لگانا) کا عمل مجہول عدل تک غیر معلوم سالوں تک جائز ہے اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نصف کھیتی اور کھجوروں پر یہود کو عامل مقرر کیا جب تک رسول اللہ ﷺ چاہیں گے بغیر کسی وقت کے تعیین کے۔ اس میں اہل ظواہر کی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے یہود کو کہا تھا: میں تمہیں ان زمینوں پر باقی رکھوں گا جب تک اللہ تعالیٰ تمہیں باقی رکھے گا (1)۔ یہ بڑی واضح دلیل ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت تھی آپ اس فیصلہ میں اپنے رب کے منتظر تھے کسی دوسرے کے لئے جائز نہیں۔ شریعت نے اجازت اور تمام معاملات کے معافی و مطالب کو پختہ و مضبوط کر دیا ہے۔ یہی علماء امت کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَوَاقِيتُ یہ میقات کی جمع ہے جس کا معنی ہے: وقت۔ بعض نے فرمایا: میقات، وقت کا منتہی ہے اور مواقیت غیر منصرف ہے کیونکہ یہ جمع ہے جس کی احاد میں کوئی مثال نہیں یہ جمع ہے اور جمع کی نہایت ہے، کیونکہ اس کی جمع نہیں بنائی جاتی۔ پس یہ ایسی ہوگی جس میں گویا بکرا رہو چکا ہے اور قواریر منصرف ہے کیونکہ وہ آیت کے سرے پر واقع ہوا ہے اس کو تنوین دی گئی ہے جس طرح قوافی کو تنوین دی جاتی ہے۔ یہ تنوین الصرف نہیں جو کسی اسم کے معرب ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْحَاجَّةِ جمہور کی قراءت میں حاء پر فتح ہے۔ ابن ابی اسحاق نے پورے قرآن میں اسے حاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح حج البیت جو سورہ آل عمران میں ہے اس میں بھی حاء کے کسرہ کے ساتھ

پڑھا ہے۔ سیبویہ نے کہا: الْحَجَّ جیسے الرد اور الشَّد۔ اور الْحَجَّ جیسے الذِّکر۔ یہ دونوں مصدر ہیں اور ہم معنی ہیں بعض نے فرمایا: حاء کے فتح کے ساتھ مصدر ہے اور حاء کے کسرہ کے ساتھ اسم ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ نے حج کا ذکر علیحدہ فرمایا کیونکہ یہ ان چیزوں میں سے ہے جس میں وقت کی معرفت کی احتیاج ہے۔ اس میں وقت سے تاخیر جائز نہیں بخلاف عربوں کے نظریہ کے وہ عدد اور مہینوں کی تبدیلی کے ساتھ حج کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول اور فعل کو باطل کر دیا۔ اس کا بیان سورہ برأت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 8:** امام مالک اور امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے استدلال کیا ہے کہ اس آیت کی وجہ سے حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں حج کا احرام باندھنا صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام چاندوں کو اس کے لئے ظرف بنایا ہے۔ پس تمام مہینوں میں حج کا احرام باندھنا صحیح ہے۔ امام شافعی نے اس میں مخالفت کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ (البقرہ: 197) جیسا کہ آگے آئے گا، اس آیت کا معنی ہے بعض چاند لوگوں کے لئے وقت ہیں، بعض حج کے لئے وقت ہیں یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: الجاریۃ لزید و عمرو۔ یہ لونڈی زید اور عمرو کے لئے ہے یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ لونڈی کا بعض زید کے لئے ہے اور بعض عمرو کے لئے ہے۔ یہ کہنا جائز نہیں کہ تمام لونڈی زید کے لئے ہے اور تمام عمرو کے لئے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ هُنَّ مَوَاقِيتٌ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تمام چاند لوگوں کے لئے وقت ہیں اور تمام چاند حج کا وقت ہیں۔ اگر بعض مراد ہوتا تو عبارت یوں ہوتی: بعضها مَوَاقِيتٌ لِلنَّاسِ و بعضها مَوَاقِيتٌ لِلْحَجِّ۔ یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: ان شہر رمضان مِيقَاتٌ لِّصُومِ زَیْدٍ و عُمَرَ و مِيقَاتٌ لِّمَہِیْنَةِ زَیْدٍ و عُمَرَ کے روزے وقت ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ تمام رمضان ہر ایک کے روزے کے وقت ہے اور جو انہوں نے لونڈی کی مثال دی تھی وہ صحیح ہے کیونکہ پوری لونڈی کا زید کے لئے ہونا اور پوری لونڈی کا عمرو کے لئے ہونا محال ہے۔ اور ہمارے مسئلہ میں ایسا نہیں ہے کیونکہ زمانہ کا زید کے لئے وقت ہونا اور عمرو کے لئے وقت ہونا صحیح ہے، پس جو انہوں نے کہا: وہ باطل ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس نے کوئی سامان بیچا معلوم سامان معلوم قیمت کے ساتھ عربوں کے مہینوں سے معلوم مدت تک یا ایسے ایام تک جن کی تعداد معروف ہو، بیع جائز ہے۔ اسی طرح معلوم مدت تک بیع سلم کے بارے میں کہا ہے۔ اس میں اختلاف ہے جس نے فصل کاٹنے تک یا گھنے تک یا عطا تک یا اس کے مشابہ کوئی غیر معین وقت تک کے لئے کوئی چیز بیچی۔ امام مالک نے فرمایا: یہ جائز ہے کیونکہ یہ معروف ہے۔ ابو ثور کا بھی یہی قول ہے۔ امام احمد نے کہا: میں امید کرتا ہوں اس میں کوئی حرج نہیں ہوگی۔ اس طرح نمازیوں کے واپس آنے تک کوئی چیز بیچی تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ وہ عطا کرنے تک کوئی چیز خریدتے تھے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر فرمایا ہے اور وقت کو ان کی بیوع اور مصالح میں ان کی علامت بنایا ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس نے کہا: یہی امام شافعی اور نعمان کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: حضرت ابن عباس کا قول صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 10:** جب چاند بڑا دکھائی دے تو ہمارے علماء نے کہا: اس کے بڑے یا چھوٹے ہونے کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ وہ اسی رات کا ہوگا۔ مسلم نے ابوالختری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم عمرہ کے لئے نکلے۔ جب ہم نخلہ کے بطن میں اترے۔ فرمایا: ہمیں چاند نظر آیا۔ بعض لوگوں نے کہا: یہ تین راتوں کا ہے، بعض نے کہا: دو راتوں کا ہے۔ فرمایا: ہم حضرت ابن عباس سے ملے۔ ہم نے کہا: ہم نے چاند دیکھا۔ بعض نے کہا: تین راتوں کا ہے بعض نے کہا: دو راتوں کا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: کس رات تم نے اسے دیکھا تھا؟ ہم نے کہا: فلاں رات، حضرت ابن عباس نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے چاند کو دیکھنے کے لئے لمبا کیا وہ اسی رات کا ہے جس رات کو تم نے اسے دیکھا (1)۔

**مسئلہ نمبر 11:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا اس مسئلہ کو حج کے وقت کے ذکر ساتھ ملایا کیونکہ چاندوں کے متعلق اور گھروں کے پیچھے سے داخل ہونے کے متعلق اکٹھے سوال ہوئے تھے۔ پس یہ آیت دونوں مسئلوں کے متعلق نازل ہوئی، انصار جب حج کرتے تھے تو وہ اپنے گھروں کو لوٹتے تھے تو ان کے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ وہ جب حج یا عمرہ کا احرام باندھتے تھے وہ شرعاً التزام کرتے تھے کہ ان کے اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو جب ان سے کوئی شخص احرام باندھنے کے بعد گھر سے نکلتا تھا پھر کسی حاجت کے لئے لوٹا تھا تو وہ حجرہ کے دروازہ سے داخل نہ ہوتا تھا بلکہ گھر کی چھت سے داخل ہوتا تھا تا کہ اس کے اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو وہ اپنے گھر کے پیچھے دیواروں پر ایک کوہان بناتا تھا پھر وہ اپنے حجرہ میں کھڑا ہوتا تھا اور اپنی حاجت کا حکم دیتا تھا پھر اس کے گھر سے وہ چیز اس کی طرف نکالی جاتی تھی اور وہ اس عمل کو نیکی اور عبادت سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ کئی چیزوں کو عبادت سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں ان کا رد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نیکی اس کے حکم کی پیروی میں ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابوصالح کی روایت میں ہے فرمایا: لوگ زمانہ جاہلیت میں اور اسلام کے ابتدائی دور میں (اس طرح تھے) کہ ان میں سے کوئی جب حج کا احرام باندھتا تھا اگر وہ کچے مکانوں والوں میں سے ہوتا تھا تو وہ اپنے گھر کے پیچھے سے سوراخ کرتا تھا اس سے داخل ہوتا تھا اور اس سے خارج ہوتا تھا یا وہ سیزھی رکھتا تھا اس سے چڑھتا تھا اور اس سے اترتا تھا اگر وہ خیمہ والوں میں سے ہوتا جو وہ خیمہ کے پیچھے سے داخل ہوتا تھا مگر جو خمس (قریش) میں سے ہوتا تھا وہ ایسا نہیں کرتا تھا (2)۔

زہری نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے زمانہ میں عمرہ کا احرام باندھا اور آپ اپنے حجرہ میں داخل ہوئے اور بنی سلمہ میں سے ایک انصاری بھی آپ کے پیچھے دروازہ سے داخل ہو گیا، اس نے اپنی قوم کی عادت کو توڑ دیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے پوچھا: تو کیوں دروازہ سے داخل ہوا جبکہ تو نے احرام باندھا ہوا تھا؟ اس نے کہا: حضور! آپ داخل ہوئے تو میں بھی آپ کے داخل ہونے کے ساتھ داخل ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تو خمس ہوں یعنی ایسی قوم سے ہوں جو اس کو دین نہیں سمجھتے۔ اس شخص نے کہا: میں اپنے اور تمہارے دین پر ہوں تو یہ آیت نازل ہوئی (3)۔ یہ حضرات

1- صحیح مسلم، کتاب الصیام، صفحہ 348، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2- معالم التنزیل، صفحہ 233، جلد 1 (دار الفکر)

3- تفسیر طبری، علی قولہ تعالیٰ ویستلذونک عن الاہلہ، صفحہ 225، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیہ)



ابن عباس، عطا اور قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ شخص قطبہ بن عامر انصاری تھا۔

الحسن قریشی، کنانہ، خزاعہ، ثقیف، جشم، بنو عامر بن صعصعہ، بنو نصر بن معاویہ کو کہا جاتا ہے۔ ان کو حسن اس لئے کہا جاتا ہے: یہ اپنے دین میں بہت سخت تھے۔ الحساسہ کا معنی شدت ہے۔ حجاج نے کہا: و کم قطعنا من قفاف حسن، ہم نے حسن کی کتنی سخت جگہوں کو کاٹا؟ پھر اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ بعض نے وہ کہا جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے کہا: یہ تاخیر کرنا ہے اور حج کو مؤخر کرنا مراد ہے حتیٰ کہ وہ حلال مہینہ کو حج کی تاخیر کے لئے حرام بنا دیتے تھے اور حرام مہینہ کو حلال بنا دیتے تھے تاکہ حج کو اس سے مؤخر کریں تو بیوت کا ذکر اس بنا پر ہے حج میں واجب کی مخالفت اور حج کے مہینوں میں مخالفت کی یہ مثال ہے۔ تاخیر کرنے کا بیان ان شاء اللہ سورہ برأت میں آئے گا۔ ابو عبیدہ نے کہا: یہ آیت ضرب المثل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیکی یہ نہیں کہ تم جاہلوں سے پوچھو بلکہ تم اللہ سے ڈرو اور علماء سے پوچھو۔ یہ ایسے ہے جیسے تو کہتا ہے: اتیت هذا الامر من بابہ۔ اس کام کو میں نے اس کے تقاضا کے مطابق کیا۔ مہدوی اور مکی نے ابن انباری سے، ماوردی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت عورتوں کے جماع میں مثال ہے حکم دیا کہ ان کی قبل میں وطی کرو، دبر میں وطی نہ کرو۔ عورتوں کو بیوت (گھر) کہا گیا ہے کیونکہ عورتوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جس طرح گھروں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے ابن عطیہ نے کہا: یہ بعید ہے اور کلام کے انداز کو بدلنا ہے۔ حسن نے کہا: وہ فال پکڑتے تھے، پس جو سفر کرتا اور اس کی حاجت پوری نہ ہوتی تو وہ خسارہ سے فال پکڑتے ہوئے گھر کے پیچھے سے آتا تو انہیں کہا گیا کہ بدشگونی میں نیکی نہیں ہے بلکہ نیکی تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس پر توکل کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں: ان اقوال میں سے پہلا قول صحیح ہے کیونکہ حضرت براء نے روایت کیا ہے، فرمایا: انصار جب حج کرتے تھے تو وہ اپنے گھروں کے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: ایک انصاری شخص آیا اور اپنے دروازے سے داخل ہو گیا۔ اس کو اس کے متعلق کہا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی (1) وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا۔ یہ بیوت کے بارے میں حقیقی نص ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ رہے دوسرے اقوال وہ دوسری جگہ سے لئے گئے ہیں۔ آیت سے ماخوذ نہیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کے طور پر ذکر کی گئی ہے کہ نیکی کو اس کے تقاضا کے مطابق کرو اور تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے اس کے مطابق کرو۔ گھروں کے دروازوں سے آنے کا ذکر بطور مثال ہے تاکہ اشارہ ہو جائے کہ ہم امور کو اس طریقہ سے ادا کریں جس طرح اللہ نے ہمیں ادائیگی کا حکم دیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس بنا پر جو اقوال ذکر کئے گئے ہیں سب صحیح ہیں۔ البیوت جمع ہے بیت کی۔ البیوت کو با کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ تقویٰ اور فلاح اور لعل کا معنی گزر چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

**مسئلہ نمبر 12:** اس آیت میں بیان ہے کہ جس کام کو اللہ نے قربت نہیں بنایا اور اس کی طرف اس نے بلایا نہیں تو وہ قربت نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کوئی قربت حاصل کرنے والا قربت حاصل کرے۔ ابن خويز منداد نے کہا: جب کسی کام کے قربت ہونے اور قربت نہ ہونے کا اشکال ہو تو اس عمل کو دیکھا جائے گا اگر تو اس کی فرائض و سنن میں کوئی مثال ہے تو وہ جائز ہو

گا اور اگر مثال نہ ہو تو نہ وہ نیکی ہوگا نہ قربت۔ فرمایا: اس کے متعلق آثار نبی کریم ﷺ سے مروی ہیں۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں ذکر ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے جبکہ ایک شخص دھوپ میں کھڑا تھا۔ اس کے متعلق آپ نے پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ یہ ابواسرائیل ہے اس نے نذر مانی ہے کہ کھڑا رہے گا، نہ بیٹھے گا، نہ سایہ حاصل کرے گا، نہ بولے گا اور روزہ رکھے گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کو کہو کہ یہ کلام کرے، سایہ حاصل کرے اور بیٹھے اور اپنے روزے کو مکمل کرے (1)۔ نبی کریم ﷺ نے ان تمام کاموں کو باطل کر دیا جو قربت نہیں تھے، جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں تھی اور اس قربت کو صحیح قرار دیا جس کی فرائض و سنن میں مثال تھی۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ⑩

”اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور (ان پر بھی) زیادتی نہ کرنا۔ بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا زیادتی کرنے والوں کو۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَاتِلُوا یہ پہلی آیت ہے جو قتال کے حکم میں نازل ہوئی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ہجرت سے پہلے ان ارشادات کی وجہ سے قتال ممنوع تھا۔ اِذْ قُم بِالَّذِي هِيَ اَحْسَنُ (المومنون: 96) (دور کر دو اس چیز سے جو بہت بہتر ہے) قَاعُفْ عَنْهُمْ وَاَصْفَحْ (المائدہ: 13) (معاف فرماتے رہئے اور درگزر فرمائیے)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ⑪ (مزل) (اور ان سے الگ ہو جائیے بڑی خوبصورتی سے)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِضَیْطٍ ⑫ (الغاشیہ) (آپ ان کو جبر سے منوانے والے تو نہیں ہیں) اس قسم کے دوسرے ارشادات جو مکہ میں نازل ہوئے۔ جب آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو آپ کو قتال کا حکم دیا گیا یہ ارشاد نازل ہوا: وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ (البقرہ: 190) یہ حضرت ربیع بن انس وغیرہ کا قول ہے (2)۔ حضرت ابوبکر صدیق سے مروی ہے کہ پہلی آیت قتال کے بارے میں یہ نازل ہوئی (3): اُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا (الحج: 39) پہلا قول زیادہ ہے۔ اذن والی آیت عام مثال کے بارے میں نازل ہوئی مشرکین میں سے جو قتال کرے اور جو نہ کرے ہر ایک سے جنگ کرنے کا اذن ہوا۔ نبی کریم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف عمرہ کے لئے نکلے تھے جب مکہ کے قریب حدیبیہ میں اترے..... حدیبہ ایک کنویں کا نام ہے، اس کنویں کے نام کی وجہ سے اس جگہ کو بھی حدیبیہ کہا جاتا ہے..... مشرکوں نے آپ کو بیت اللہ کی طرف جانے سے روکا۔ آپ ایک مہینہ حدیبیہ میں ٹھہرے رہے پھر مشرکوں نے آپ سے صلح کی کہ آپ اس سال واپس لوٹ جائیں جس طرح آئے ہیں آئندہ سال ان کے لئے تین دن مکہ خالی کر دیا جائے گا اور اس شرط پر صلح کی کہ دس سال ان کے درمیان قتال نہ ہوگا۔ آپ ﷺ مدینہ طیبہ واپس آ گئے۔ جب اگلا سال آیا تو آپ نے عمرہ القضاء

1۔ صحیح بخاری، باب النذر فیما لا یمکنک ولی معصیۃ، حدیث نمبر 6210، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

کی تیاری کی۔ مسلمانوں کو کفار کے دھوکا کا خوف ہوا۔ مسلمانوں نے حرم میں اور حرمت والے مہینہ میں لڑنا ناپسند کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی تمہارے لئے قتال حلال ہے اگر کفار تم سے قتال کریں۔ یہ آیت حج کے ذکر اور گھروں کے پیچھے سے آنے کے گزشتہ ذکر کے ساتھ متصل ہے۔ نبی کریم ﷺ اس سے جنگ کرتے تھے جو آپ سے جنگ کرتا تھا اور اس سے جنگ نہیں کرتے تھے جو آپ سے جنگ نہیں کرتا تھا (1) حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: **فَاَقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ** (توبہ: 5)

پس یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ یہ علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ابن زید اور ربیع نے کہا اس کو **قَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَاقْتُلُوا** (توبہ: 36) نے منسوخ کیا تمام کفار سے جنگ کرنے کا حکم ہوا۔ حضرت ابن عباس، حضرت عمر بن عبدالعزیز اور مجاہد نے کہا: یہ آیت محکم ہے یعنی تم ان سے جہاد کرو جو تم سے لڑے ہیں اور عورتوں اور بچوں اور راہبوں کے قتل میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ابو جعفر نخاس نے کہا: یہ سنت اور نظر میں اصح قول ہے۔ سنت میں ابن عربی کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی جنگ میں عورت کو مقتول نہ دیکھا تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا اور عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا (2)۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے۔ رہی نظر تو فاعل کا صیغہ عام طور پر دو شخصوں سے پایا جاتا ہے جیسے مقاتلہ، مشاتبہ، مخاصمہ، جھگڑنا، گالی دینا، لڑنا وغیرہ۔ قتال عورتوں، بچوں اور ان کے مشابہہ لوگوں میں نہیں ہوتا جیسے راہب، اپانج، بوڑھے اور مزدور لوگ۔ پس یہ لوگ قتل نہیں کئے جائیں گے۔ حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت یزید بن ابی سفیان کو یہی وصیت کی تھی جب اسے شام کی طرف بھیجا تھا مگر یہ کہ یہ لوگ اذیت دینے والے ہوں تو ان کو قتل کیا جائے گا۔ اس کو مالک وغیرہ نے نقل کیا ہے اور علماء کی اس میں چھ صورتیں ہیں۔

(1) عورتیں اگر قتال کریں تو انہیں قتل کیا جائے گا۔ سحون نے کہا: جنگ کی حالت میں اور جنگ کے بعد (3) ایسی عورتوں کو قتل کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد عام ہے: **وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ** (اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں) **وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ** (ان کو قتل کرو جہاں تم انہیں پاؤ) اور عورت کے لئے جنگ میں آثار عظیمہ ہوتے ہیں مثلاً اموال سے امداد، جنگ پر ابھارنا کبھی عورتیں اپنے بال کھولے ہوئے، ندبہ کرتے ہوئے، ابھارتے ہوئے اور فرار پر عار دلاتے ہوئے نکلتی ہیں۔ اس صورت میں ان کا قتل کرنا مباح ہے مگر جب قیدی ہو جائیں تو انہیں لونڈیاں بنانا زیادہ نفع بخش ہے کیونکہ وہ جلدی اسلام قبول کر لیتی ہیں اور اپنے ادیان سے رجوع کر لیتی ہیں اور ان کا اپنے اوطان کی طرف بھاگ جانا مشکل ہوتا ہے بخلاف مردوں کے۔

(2) بچوں کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ بچوں کے قتل سے یہی ثابت ہے کیونکہ ان پر تکلیف نہیں یعنی مکلف نہیں ہیں۔ اگر بچہ

1۔ الکشاف، صفحہ 235، جلد 1 (مکتبہ الاعلام الاسلامی بیروت)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب قتل النساء فی الحرب، صفحہ 423، جلد 1 (وزارت تعلیم)  
موطا امام مالک، کتاب الجہاد، النہی عن قتل النساء والولدان، صفحہ 465 (وزارت تعلیم)

3۔ احکام القرآن، صفحہ 104، جلد 1 (دار الفکر)



جنگ میں شریک ہو تو اسے قتل کیا جائے گا (1)۔

(۳) راہبوں کو نہ قتل کیا جائے گا نہ انہیں غلام بنایا جائے گا بلکہ ان کے اموال وغیرہ بھی چھوڑ دیئے جائیں گے جن سے وہ زندگی گزارتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب وہ اہل کفر سے جدا رہیں کیونکہ حضرت ابوبکر نے حضرت یزید کو کہا تھا: اور تم ایسی قوم پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نفسوں کو اللہ کے لئے روک رکھا ہے۔ انہیں چھوڑ دو اور جو وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے لئے اپنے نفسوں کو روک رکھا ہے۔ اسے بھی چھوڑ دو..... اگر وہ کفار کے ساتھ کنائس میں ہوں تو پھر قتل کئے جائیں گے۔ اگر عورت راہبہ بن چکی ہو تو اشہب نے کہا: اسے نہیں ڈرایا جائے گا۔ سحنون نے کہا: راہبہ ہونا اس کے حکم کو نہیں بدلے گا۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا کہ میرے نزدیک صحیح اشہب کی روایت ہے کیونکہ وہ اس قول کے تحت داخل ہے انہیں چھوڑ دو اور جنہوں نے اپنے نفسوں کو اللہ کے لئے روکا ہوا ہے (2)۔

(۴) اپاچ: سحنون نے کہا: ان کو قتل کیا جائے گا۔ ابن حبیب نے کہا: انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ صحیح یہ ہے کہ ان کے احوال کا اعتبار کیا جائے گا، اگر وہ اذیت دینے والے ہوں تو انہیں قتل کیا جائے گا ورنہ انہیں چھوڑ دیا جائے گا اور اس کے راستہ میں بیٹھنے والے ہیں وہ ایسے لوگوں میں سے ہو جائیں گے جن کے حال پر وحشت نہیں ہے (3)۔

(۵) الشیوخ: مالک نے محمد کی کتاب میں فرمایا: شیوخ (بوڑھوں) کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس پر جمہور کا نظریہ ہے اگر کوئی بوڑھا شخص ہو جو قتال کی طاقت نہ رکھتا ہو نہ اس کی رائے سے نفع اٹھایا جاتا ہو اور وہ دفاع کرنے والا ہو تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی قول امام مالک اور امام ابو حنیفہ کا ہے۔ امام شافعی کے دو قول ہیں: (۱) جمہور کے قول کی مثل ہے اور دوسرا یہ ہے کہ راہب کو قتل کیا جائے گا۔ صحیح پہلا قول ہے کیونکہ سیدنا ابوبکر نے حضرت یزید کو یہی کہا تھا اور اس قول کا کوئی مخالف نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس پر اجماع ہے۔ نیز یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو جنگ نہیں کرتے اور نہ دشمن کی مدد کرتے ہیں۔ پس اس کا قتل کرنا جائز نہیں جیسے عورت ہے مگر ایسا بوڑھا جس کے نقصان کا خوف ہو وہ جنگ کرتا ہو یا رائے دیتا ہے یا مال دیتا ہے پھر یہ جب قیدی ہو جائے گا تو امام کو اس میں اختیار ہوگا۔ قتل کرے، احسان کرے یا فدیہ لے یا غلام بنالے یا جزیہ کی ادائیگی پر ذمہ کا عقد کرے۔

(۶) عسقاء: مزدور لوگ اور کسان لوگ ہیں۔ مالک نے محمد کی کتاب میں فرمایا: انہیں قتل نہیں کیا جائے گا (4)۔ امام شافعی نے فرمایا: کسانوں، مزدوروں اور بوڑھے لوگوں کو قتل کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ اسلام قبول کر لیں یا جزیہ ادا کریں۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ رباع بن ربیع کی حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: خالد بن ولید سے مل جاؤ اور کسی بچے اور مزدور کو قتل نہ کرنا (5)۔ حضرت عمر نے فرمایا: بچوں اور ان کسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو جو تمہارے لئے جنگ کھڑی نہیں کرتے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کسان کو قتل نہیں کرتے تھے۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔

1۔ احکام القرآن، صفحہ 104، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجہاد، باب النہی عن قتل النساء والولدان، صفحہ 465 (و، ت)

3۔ احکام القرآن، صفحہ 105، جلد 1 (دار الفکر) 4۔ ایضاً، صفحہ 106، جلد 1

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، فی قتل النساء، صفحہ 6، جلد 2 (و، ت)، ایضاً، حدیث 2295، سنن ابن ماجہ، حدیث 2831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

**مسئلہ نمبر 2:** اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ **وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ** سے مراد اہل مدینہ ہیں جنہیں ان سے قتال کا حکم دیا گیا تھا جو ان سے قتال کریں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ تمام مسلمانوں کو خطاب ہے ہر ایک کو حکم دیا کہ وہ ان سے جہاد کریں جو ان سے جنگ کرے۔ جب کوئی اور صورت ممکن نہ ہو۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کیسے سورہ برأت میں بیان فرمایا **وَالَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ** (توبہ: 123)

پہلا مقصود اہل مکہ تھے۔ پس ان سے آغاز متعین ہو گیا جب اللہ تعالیٰ نے مکہ کو فتح فرمایا تو پھر ان سے متصل لوگوں سے جنگ تھی جو اذیت دیتے تھے حتیٰ کہ دعوت عام ہو جائے اور کلمۃ اللہ تمام آفاق میں پہنچ جائے اور کفار میں سے کوئی باقی نہ رہے۔ یہ حکم قیامت تک جاری رہے گا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک خیر رکھی گئی ہے، اجر اور مال غنیمت (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی غایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہے۔ یہ پہلی حدیث کے موافق ہے کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تَعْتَدُوا** اس کی تاویل میں وہی کہا گیا ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یہ محکم آیت ہے اور رہے مرتد لوگ تو ان کے لئے قتل ہے یا توبہ ہے۔ اسی طرح گمراہ لوگوں کے لئے تلواریں توبہ ہے۔ اور جس نے باطل اعتقاد کو چھپایا پھر ظاہر ہو گیا تو وہ زندیق کی طرح قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی۔ رہے ائمہ عدل پر خوارج سے جنگ کرنا واجب ہے حتیٰ کہ وہ حق کی طرف لوٹ آئیں۔ ایک قوم نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ جیسے حمیت، شہرت کا حصول وغیرہ بلکہ اللہ کے راستہ میں ان سے جہاد کرو جو تم سے لڑتے ہیں اور مقصود دین کی سر بلندی ہو اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کا اظہار ہو۔ بعض نے فرمایا: **وَلَا تَعْتَدُوا** یعنی جو تم سے نہیں لڑتا اس سے نہ لڑو، اس صورت میں تمام کفار سے جنگ کرنے کے حکم کے ساتھ یہ آیت منسوخ ہوگی۔ واللہ اعلم

**وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُم وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ**

**مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تَقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ**

**فَأَقْتُلُوهُمْ ۚ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكُفْرِينَ ۝ فَإِنْ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝**

”اور قتل کرو انہیں جہاں بھی انہیں پاؤ اور نکال دو انہیں جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور فتنہ انگیزی تو قتل سے بھی زیادہ سخت ہے اور نہ جنگ کرو ان سے مسجد حرام کے قریب یہاں تک کہ وہ (خود) تم سے وہاں جنگ کرنے لگیں۔ سوا کہ وہ لڑیں تم سے تو پھر قتل کرو انہیں۔ یہی سزا ہے (ایسے) کافروں کی۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں (تو جان لو کہ) اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“

اس میں پانچ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد: **ثَقِفْتُمُوهُمْ** کہا جاتا ہے **ثَقِفْ يَتَقَفُ ثَقْفًا وَثَقْفًا**۔ رجل ثَقِفَ وَهُ مُفَضَّلٌ (2) جو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اثم ما من الزکوٰۃ، صفحہ 319، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 262، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کاموں کو پختہ کرتا ہے۔ اس آیت میں قیدی کو قتل کرنے پر دلیل ہے۔ پس کا بیان سورہ انفال میں ان شاء اللہ آئے گا۔  
وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ یعنی مکہ سے تم ان کو نکالو۔ طبری نے کہا: یہ خطاب مہاجرین کے لئے ہے اور ضمیر کفار قریش کے لئے ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وہ فتنہ جس پر انہوں نے تمہیں ابھارا اور انہوں نے اس کے ذریعے تمہارے کفر کی طرف لوٹنے کا ارادہ کیا وہ قتل سے زیادہ شدید ہے۔ مجاہد نے کہا: اس کا مطلب ہے مومن کو قتل کرنے سے۔ پس قتل کرنا اس پر فتنہ سے زیادہ خفیف ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: ان کا اللہ سے شریک ٹھہرانا اور اللہ تعالیٰ سے کفر کرنا اس قتل سے بڑا جرم ہے جس کی وہ تمہیں عار دلاتے ہیں (1)۔ یہ دلیل ہے کہ یہ آیت عمرو بن حضری کے بارے میں نازل ہوئی جب اسے واقد بن عبد اللہ تبی نے رجب (جو حرمت والا مہینہ تھا) کے آخری دن قتل کر دیا تھا جیسا کہ عبد اللہ بن جحش کے سر یہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ یہ طبری وغیرہ کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ اس آیت کے متعلق علماء کے دو قول ہیں: (1) ایک یہ کہ یہ منسوخ ہے (2) دوسرا یہ کہ یہ محکم ہے۔ مجاہد نے کہا: آیت محکم ہے کسی کے لئے مسجد حرام میں جنگ کرنا جائز نہیں مگر یہ کہ اس سے مسجد حرام میں جنگ کی جائے (2)۔ یہ طاؤس کا قول ہے اور آیت کی نص اس کا تقاضا کرتی ہے اور دونوں قولوں میں سے یہی قول صحیح ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا نظریہ بھی یہی ہے۔ الصحیح میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا: یہ وہ شہر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس دن سے حرام فرمایا جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ قیامت تک حرام (حرمت والا) ہے اس میں کسی کے لئے مجھ سے پہلے قتال حلال نہ تھا اور میرے لئے صرف دن کی ایک گھڑی حلال کیا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حرمت سے قیامت تک کے لئے حرام ہے (3)۔ قتادہ نے کہا: یہ آیت اس آیت قَدْ أَفْلَحَ الْإِسْلَامُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ (توبہ: 5) سے منسوخ ہے (4)۔ مقاتل نے کہا: اس آیت کو اس آیت وَاقْتُلُوا حَيْثُ لَقِفْتُمُوهُمْ نے منسوخ کیا پس اس ارشاد نے منسوخ کیا فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ (توبہ: 5) پس حرم میں قتال سے آغاز کرنا جائز ہے اور جس سے انہوں نے حجت پکڑی وہ یہ ہے کہ سورہ برأت، سورہ بقرہ کے دو سال بعد نازل ہوئی۔ اور نبی کریم ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سر پر خود تھا۔ کسی نے کہا: ابن خطل کعبہ کے پردوں کے ساتھ لٹکا ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسے قتل کر دو (5)۔

ابن خویز منداد نے کہا: وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ منسوخ ہے کیونکہ جماع سے ثابت ہے کہ دشمن اگر مکہ پر غالب آجائے اور کہے میں تم سے جنگ کروں گا اور میں تمہیں حج سے روکوں گا اور میں مکہ سے نہیں جاؤں گا تو اس سے جنگ کرنا

2۔ معالم التنزیل، صفحہ 235، جلد 1 (دار الفکر)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 262، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب تحمیم مکہ، صفحہ 437، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

5۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، صفحہ 614، جلد 2 (وزارت تعلیم)





**مسئلہ نمبر 4:** بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت دلیل ہے کہ امام پر بغاوت کرنے والا حکم میں کافر کے خلاف ہے۔ کافر جب قتال کرے تو اسے ہر حال میں قتل کیا جائے گا اور باغی جب قتال کرے تو دفاع کی نیت سے اس سے جنگ کی جائے گی۔ بھاگ جانے والے کا پیچھا نہیں کیا جائے گا اور زخمیوں پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ باغیوں کے احکامات سورہ الحجرات میں آئیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَإِنْ أَنْتَهُوَ الْكَرُّهُ الْإِيمَانُ لَانِ كَسَاكُ جَانِ كِيُونَكُ اللّٰهُ تَعَالٰى** ان کے پچھلے سب گناہ معاف کر دے گا اور ان میں سے ہر ایک پر جرموں سے عفو کے ساتھ رحم فرمائے گا۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے: **قُلْ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا اِنْ يَنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (انفال: 38)** (اس کا بیان آگے آئے گا)۔  
**وَقَتْلُوهُمْ حَتّٰى لَا تُلْغُوْا فَتْنَةً وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۚ فَاِنْ اَنْتَهُوْا فَلَا عُدُوْا وَاِنْ اِلَّا عَلٰى الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۹**

”اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ (فساد) اور ہو جائے دین صرف اللہ کے لئے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو (سمجھ لو) کہ سختی (کسی پر) جائز نہیں مگر ظالموں پر“۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَقَتْلُوهُمْ** یہ ہر جگہ ہر مشرک سے جنگ کرنے کا حکم ہے۔ اس کے قول کے مطابق جو اسے ناخ دیکھتا ہے اور جو اسے غیر ناخ کہتا ہے وہ کہتا ہے: اس کا معنی ہے ان سے لڑو جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَاِنْ قَتَلْتُمْ كُمْ اَكْرَهُ تَمَّ سَ لَ اِي س**، پہلا قول اظہر ہے۔ یہ مطلق قتال کا امر ہے اس میں کفار کے آغاز کرنے کی کوئی شرط نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: **وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (دین اللہ کے لئے ہو جائے)**۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ کہیں **لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ**۔ (1) یہ آیت اور حدیث دلالت کرتی ہیں کہ قتال کا سبب کفر ہے کیونکہ فرمایا: **حَتّٰى لَا تُلْغُوْا فَتْنَةً** (حتیٰ کہ فتنہ نہ رہے) یعنی کفر نہ رہے۔ جہاد کی غایت کفر کا نہ ہونا بیان فرمائی۔ اور یہ ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس قتادہ، ربیع، سدّی وغیرہم نے فرمایا: یہاں فتنہ سے مراد شرک اور وہ تمام چیزیں ہیں جو مسلمانوں کی اذیت کا باعث تھیں (2)۔ فتنہ کا اصل معنی اختیار اور امتحان ہے۔ یہ فتنۃ الفضة سے ماخوذ ہے جب تو چاندی کو آگ میں ڈالے تاکہ ردی، عمدہ سے علیحدہ ہو جائے، اس کے محاصل کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِنْ اَنْتَهُوَ اَكْرَهُ تَمَّ سَ لَ اِي س** کے ساتھ قبول کرنے کے ساتھ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یا جزیہ ادا کرنے کے ساتھ، یہ اہل کتاب کے حق میں ہے۔ اس کا بیان سورہ برأت میں آئے گا۔ کفر سے باز آ جائیں تو فہماور نہ قتل کئے جائیں گے۔ یہ ظالم ہیں ان پر ہی تعدی ہوگی۔ ظالموں کی سزا کو عدوان (تعدی) سے تعبیر فرمایا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، فضل استقبال القبلة، صفحہ 56، جلد 1 (وزارت تعلیم) ایضاً حدیث نمبر 6413، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کیونکہ وہ ان کی تعدی (ظلم) کی سزا ہے کیونکہ ظلم اپنے ضمن میں عدوان کو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عدوان کی جزا کو بھی عدوان کہا گیا۔

جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَزَاؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوری: 40)، الظالمون، دونوں تاویلوں میں سے ایک تاویل پر۔ جس نے قتال سے آغاز کیا۔ اور دوسری تاویل پر جو کفر اور فتنہ پر باقی رہا۔

الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَتُ قِصَاصٌ ۖ فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ  
فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿٤١﴾

”حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کا بدلہ ہے اور ساری حرمتوں میں (فریقین کے رویہ میں) برابری چاہئے۔ تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرلو (لیکن) اس قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو۔ اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور جان لو یقیناً اللہ (کی نصرت) پر ہیزگاروں کے ساتھ ہے۔“

اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الشَّهْرُ الْحَرَامُ اس سے پہلے الشَّهْرُ کا اشتقاق گزر چکا ہے اس کے نزول کا سبب وہ ہے جو حضرات ابن عباس، قتادہ، مجاہد، مقسم، سدی، ربیع اور ضحاک وغیرہ سے روایت کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا: یہ عمرۃ القضاء اور حدیبیہ کے سال نازل ہوئی۔ واقعہ اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ عمرہ کے لئے نکلے حتیٰ کہ ذی القعدہ ۶ ہجری میں حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو کفار قریش نے بیت اللہ کی طرف جانے سے روک دیا۔ آپ واپس آگئے اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ فرمایا تھا کہ آپ مکہ میں ضرور داخل ہوں گے۔ پس آپ سات ہجری کو مکہ میں داخل ہوئے اور اپنے عمرہ کی قضا کی تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ حسن سے مروی ہے کہ مشرکین نے نبی کریم ﷺ سے کہا: کیا تجھے شہر حرام میں قتال سے منع کیا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ پس مشرکین نے حرمت والے مہینے میں جنگ کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ معنی یہ ہے کہ اگر وہ اس مہینہ میں قتال کو حلال کریں تو آپ ان سے قتال کریں (2)۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے ان کی موافقت کو مباح کیا۔ پہلا قول مشہور ہے اور اکثر علماء کی رائے اسی پر ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْحُرُمَتُ قِصَاصٌ، الحرامات جمع ہے حرمة کی جیسے الظلمۃ کی جمع الظلمات ہے۔ حجة کی جمع حجرات ہے حرمت جمع ذکر فرمایا کیونکہ شہر حرام کی حرمت، بلد حرام کی حرمت، احرام کی حرمت مراد لی ہے۔ الحرمة کا مطلب جس کے توڑنے سے منع کیا گیا ہو۔ القصاص کا معنی المساوات ہے یعنی میں نے تمہارے لئے ان سے برابری کر دی ہے۔ انہوں نے تمہیں چھ ہجری میں روکا تو تم نے سات ہجری میں عمرہ قضا کیا۔ وَالْحُرُمَتُ قِصَاصٌ۔ ما قبل سے متصل ہے اور اس کے متعلق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ پہلی کلام سے جدا ہے۔ یہ ابتداء اسلام میں تھا جو تیری حرمت کو تار تار کرتا تو اس سے اتنا بدلہ لے سکتا تھا جتنی اس نے تجھ پر زیادتی کی ہوتی تھی پھر یہ قتال کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔ ایک



طائفہ نے کہا: حضرت محمد ﷺ کی امت کے درمیان تعدی اور جنایات میں سے جو اس آیت میں شامل ہیں وہ منسوخ نہیں ہیں جس کے مال میں یا زخم کے اعتبار سے ظلم کیا گیا ہو اس کے لئے اتنی تعدی (زیادتی) کرنا جائز ہے جو اس پر کی گئی ہے جب کہ اس کے لئے زیادتی ظاہر ہو جائے۔ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اپنی زیادتی کا بدلہ لینے میں کچھ نہیں ہوگا (یعنی اسے کوئی گناہ نہیں ہوگا) یہ امام شافعی وغیرہ کا قول ہے یہ امام مالک کے مذہب کی روایت ہے۔ امام مالک کے اصحاب میں سے ایک طائفہ نے کہا: یہ اس کے لئے جائز نہیں۔ قصاص (بدلہ) کا امر حکام پر موقوف ہے اور اموال کو رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد شامل ہے۔ امانت اسے ادا کرو جس نے تمہیں امین بنایا اور جس نے تم سے خیانت کی تم اس سے خیانت نہ کرو (1)۔ اس حدیث کو دارقطنی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ پس جس کو خیانت کرنے والے نے امین بنایا ہو اس کے ساتھ خیانت کرنا جائز نہیں اور جس نے اسے امین بنایا ہے اس کا حق اسے پہنچائے۔ یہ مشہور مذہب ہے۔ امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے انہوں نے اسی حدیث کو دلیل بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے: **إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا (النساء: 58)** (بے شک اللہ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل نہیں)۔ یہ عطا خراسانی کا قول ہے۔ قدامت بن ابیہشم نے کہا: میں نے عطا بن میسرہ خراسانی سے سوال کیا، میں نے ان سے پوچھا: میرا ایک شخص پر حق ہے، جس کا اس نے مجھ پر انکار کیا ہے اور میرے لئے دلیل پیش کرنا بھی ممکن نہیں۔ کیا میں اس کے مال سے اپنے مال کے برابر لے لوں؟ عطائے نے کہا: تم بتاؤ اگر وہ تیری لونڈی سے جماع کرتا تو تو جانتا ہے جو تو کرتا۔

میں کہتا ہوں: صحیح اس کا جواز ہے جیسے ہی اپنے حق کو حاصل کرے جبکہ تو چور شمار نہ ہو۔ یہ امام شافعی کا مذہب ہے اس کو داؤدی نے امام مالک سے حکایت کیا ہے۔ ابن منذر نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے یہ خیانت نہیں ہے یہ تو اپنے حق کو پانا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو (2)۔ ظالم سے حق لینا یہ اس کی مدد کرنا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ہند بنت عتبہ، ابوسفیان کی بیوی کو کہا: جب اس نے کہا تھا۔ ابوسفیان کنجوس آدمی ہے مجھے اتنا خرچ نہیں دیتا جو میرے لئے کافی ہو اور میرے بچوں کے لئے کافی ہو مگر یہ کہ میں اس کے مال سے اس کے علم کے بغیر لے لوں، کیا مجھ پر مال لینے میں کوئی حرج ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو معروف طریقہ سے اتنا لے لے جو تجھے کافی ہو اور تیری اولاد کو کافی ہو (3)۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے لئے لینا مباح قرار دیا مگر وہ اتنی مقدار ہے جو اس کے لئے ضروری ہو۔ یہ تمام صحیح حدیث میں ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ اخْتَلَفَ عَلَيْكُمْ فَأَعْتَدُوا عَلَيْهِمْ مَّا عَتَدُوا عَلَيْكُمْ** (جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کر لو لیکن اس قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی)۔ یہ اختلاف کی صورت میں قطعی حکم ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اس میں اختلاف ہے کہ جو اپنے مال کی جنس کے علاوہ مال حاصل کرنے پر کامیاب ہو جائے۔ بعض

1۔ سنن ابی داؤد، باب البیوع، لی الرجل یاخذ حقہ من تحت یدہ، صفحہ 142، جلد 2 (دوت)

ایضاً، حدیث 3968، جامع ترمذی، حدیث 1183، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، لی المظالم والقصاص، صفحہ 330، جلد 1 (وزارت تعلیم) ایضاً، حدیث نمبر 2263، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، کتاب النکاحات، صفحہ 808، جلد 2

علماء نے فرمایا: وہ نہ لے مگر حاکم کے حکم سے۔ امام شافعی کے اس سلسلہ میں دو قول ہیں: اصح لے لینا ہے انہوں نے اسے اس پر قیاس کیا ہے اگر وہ اپنے مال کی جنس سے حاصل کرنے پر قادر ہو۔ دوسرا قول ہے کہ وہ نہ لے کیونکہ وہ اس کے مال کی جنس کے خلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو اس کے خصم پر ہے اس کی قیمت کا قصد کرے اور اس کی مقدار لے لے یہ صحیح ہے جیسا کہ ہم نے دلیل سے بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 4:** ہم اس لینے پر فرعی مسائل نکالتے ہیں۔ کیا اس پر خود قرض وغیرہ ہے اس کا اعتبار کیا جائے گا؟ امام شافعی نے فرمایا: نہیں، بلکہ جو اس کا اس پر ہے وہ لے۔ امام مالک نے فرمایا: اگر مقروض کو مفلس قرار دیا گیا ہو تو اس کے لئے دوسرے غرباء کے ساتھ جو حاصل ہو گا اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ یہی قیاس ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمِنْ اَعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاَعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اَعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ يَوْمَ تَفْشَىٰ عَلَيهِمْ، خود لینا ممکن ہو تو خود لے لے یا حکام کے ذریعے لے لے۔ لوگوں کا بدلہ لینے میں اختلاف ہے۔ کیا بدلہ کو عدوان کہا جائے گا یا نہیں جس نے کہا: قرآن میں مجاز نہیں ہے۔ فرمایا: مقابلہ عدوان ہے اور وہ مباح عدوان ہے جیسا کہ کلام عرب میں مجاز مباح کذب ہے۔ کیونکہ کہنے والے کا قول ہے: فَقَالَتْ لَهُ الْعَيْنَانِ سَبْعًا وَطَاعَةً... اس کی آنکھوں نے اسے کہا ہم سنیں گی اور اطاعت کریں گی۔ اسی طرح قول ہے: اَمْتَلِ الْخَوْضَ وَقَالَ قُطَيْبٌ۔ حوض بھر گیا اور اس نے کہا مجھے کافی ہے۔ اسی طرح جملہ ہے: شَكَالِ الْخَسَىٰ طُولَ السَّيِّءِ۔ میرے اونٹ نے مجھ سے طویل چلنے کی شکایت کی۔

یہ معلوم شدہ ہے کہ یہ اشیاء بولتی نہیں ہیں اور جھوٹ کی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق اس کی حقیقت کے خلاف خبر دینا۔ اور جنہوں نے کہا: قرآن میں مجاز ہے، انہوں نے اسے مجاز کے طریق پر عدوان کا نام دیا۔ کلام کا مقابلہ اس کی مثل ہے۔ جیسے عمرو بن کلثوم نے کہا۔

الا لا يجهلن احد علينا فنجهل فوق جهل الجاهلينا  
خبردار! ہم پر کوئی جہالت کا مظاہرہ نہ کرے ورنہ ہم اس کی جہالت سے زیادہ جہالت کا مظاہرہ کریں گے۔  
اسی طرح ایک اور نے کہا:

ولي فرش للحلم بالحلم ملجم ولي فرس للجهل بالجهل مسرج  
میرے لئے ایک گھوڑا حلم کے لئے ہے جسے حلم کی لگام دی گئی ہے اور ایک جہالت کا گھوڑا ہے جسے جہالت کی زین پہنائی گئی ہے۔

د من رام تقويى فان مقوم و من رام تعويى فان معوج  
جس نے میری تقویم کا ارادہ کیا تو میں مقوم (سیدھا کیا گیا) ہوں اور جس نے میرے ٹیڑھے پن کا ارادہ کیا تو میں ٹیڑھا ہوں۔ اس کی مراد ہے: میں جاہل اور ٹیڑھے شخص کو بدلہ دیتا ہوں۔ وہ اپنی جہالت اور ٹیڑھے پن سے مدح نہیں کر رہا ہے۔  
**مسئلہ نمبر 6:** اس شخص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جس نے کوئی حیوان یا سامان ضائع کر دیا جس کا نہ کیل کیا

جاتا ہے نہ وزن کیا جاتا ہے۔ امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور علماء کی ایک جماعت نے کہا: اس پر اس کی مثل ہے قیمت کی طرف نہیں پھیرا جائے گا مگر مثل کے نہ پائے جانے کے وقت۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ** اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ** (النحل: 126) (اگر تم انہیں سزا دینا چاہو تو انہیں سزا دو لیکن اس قدر جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے۔)

علماء فرماتے ہیں: یہ تمام اشیاء میں عام ہے اور انہوں نے اس سے تائید حاصل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی زوجہ کے گھر ٹوٹا ہوا پیالہ رکھ لیا تھا جس نے دوسری زوجہ محترمہ کا پیالہ توڑا تھا اور صحیح پیالہ واپس کیا تھا۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: برتن کے بدلے برتن اور کھانے کے بدلہ کھانا ہے (1)۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں مسدد نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں یحییٰ نے بتایا دوسری سند میں سے ہمیں محمد بن ثنی نے بتایا: انہوں نے کہا: ہمیں خالد نے بتایا انہوں نے حمید سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی کسی زوجہ محترمہ کے پاس تھے۔ تو دوسری امہات المؤمنین میں سے کسی نے اپنے خادم کے ساتھ ایک پیالہ بھیجا جس میں کوئی کھانا تھا۔ فرمایا: جس کے پاس رسول اللہ ﷺ موجود تھے اس نے ہاتھ مارا اور پیالہ توڑ دیا۔ حضرت ابن ثنی نے کہا: نبی کریم ﷺ نے دونوں ٹکڑے لئے اور ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا دیا اور اس میں کھانے کو جمع کرنا شروع کر دیا اور فرمایا: تمہاری ماں نے غیرت کی ہے۔ حضرت ابن ثنی نے یہ زائد بیان کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کھاؤ۔ پس حاضرین مجلس نے وہ کھانا کھایا حتیٰ کہ جس نے وہ پیالہ توڑا تھا وہ اپنا وہ پیالہ لے آئی جو اس کے گھر میں موجود تھا۔

پھر ہم مسدد کی حدیث کے الفاظ کی طرف لوٹتے ہیں۔ فرمایا: کھاؤ اور آپ ﷺ نے اس خادم اور پیالے کو روک لیا حتیٰ کہ لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے۔ آپ ﷺ نے صحیح پیالہ خادم کو دیا اور ٹوٹا ہوا پیالہ اپنے گھر میں روک لیا (2)۔ ہمیں ابو داؤد نے بتایا، فرمایا: ہمیں مسدد نے بتایا، فرمایا: ہمیں یحییٰ نے بتایا انہوں نے سفیان سے روایت کیا فرمایا: ہمیں فلیت عامری نے بتایا، ابو داؤد نے کہا: یہ غلط بن خلیفہ ہے انہوں نے جسرہ بنت دجاجہ سے روایت کیا، فرمایا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں نے کوئی ایسا کھانا تیار کرنے والا نہیں دیکھا جو حضرت صفیہ کی طرح کھانا تیار کرتا ہو۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے لئے کھانا تیار کیا پھر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ شدت غیرت کی وجہ سے مجھ پر کچپی طاری ہو گئی میں نے برتن توڑ دیا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس کا کیا کفارہ ہے جو میں نے کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا برتن کی مثل برتن (3)، کھانے کی مثل کھانا۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے فرمایا: جس شخص پر حیوان یا سامان ہو جن کا نہ کیل کیا جاتا ہو نہ وزن کیا جاتا ہو اس کی قیمت ہوگی، مثل نہیں ہوگی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو غلام کے نصف کی قیمت اپنے شریک کو دینے کو کہا جس نے غلام کا نصف آزاد کر دیا۔ آپ نے اس غلام کے نصف کی مثل کی ضمانت کا حکم نہ دیا۔ اور علماء کے درمیان کھانے، پینے والی چیزوں اور روزنی چیزوں میں مثل کی ضمانت دینے پر کوئی اختلاف نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ



نے فرمایا: طعام کے بدلے طعام ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت قصاص میں برابری میں اصل ہے جس نے کسی کو جس چیز سے قتل کیا ہوگا اسے اس چیز کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ یہ جمہور کا قول ہے جب تک کہ اس نے کسی برائی سے قتل نہ کیا ہو۔ جیسے لواطت سے قتل کیا ہو یا شراب پلا کر قتل کیا ہو تو اسے تلوار کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ شوافع کے دو قول ہیں: اسے اس کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ اس صفت پر ایک لکڑی بنائی جائے گی اور وہ اس کی دبر میں ماری جائے گی حتیٰ کہ وہ بھی مر جائے اور اسے شراب کی جگہ پانی پلایا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ ابن ماجہون نے کہا: جس نے آگ یا زہر سے قتل کیا تو اس کے ساتھ قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے سوا آگ کے ساتھ کوئی عذاب نہ دے (1)۔ اور زہر پوشیدہ آگ ہے۔ جمہور علماء کا خیال ہے: وہ اس کے ساتھ قتل کیا جائے گا کیونکہ آیت میں عموم ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** لاشی کے ساتھ قصاص لینا: امام مالک کی ایک روایت میں ہے کہ اگر لاشی سے قتل کرنے میں زیادہ وقت لگتا ہو اور عذاب ہوتا ہو تو تلوار کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ یہ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے اور ابن قاسم کا بھی یہی قول ہے۔ اور امام مالک سے دوسری روایت یہ ہے کہ اسے لاشی کے ساتھ قتل کیا جائے گا اگرچہ اس میں تطویل و تعذیب بھی ہو۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ اشہب اور ابن نافع نے مالک سے پتھر اور لاشی سے قتل کرنے والے کے متعلق روایت کیا ہے کہ ان دونوں کے ساتھ قاتل کو قتل کیا جائے گا۔ جب ایک ضرب سے اس کا کام تمام ہو جائے اور اگر بہت سی ضربوں کی ضرورت ہو تو پھر نہیں۔ پتھر اور تیر نہیں مارے جائیں گے کیونکہ اس میں تعذیب ہے۔ یہ عبد الملک کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: علماء کے اقوال میں سے صحیح یہ ہے کہ مماثلت (برابری) واجب ہے، مگر یہ کہ تعذیب ہوتی ہو تو پھر تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ اور ہمارے علماء کا اتفاق ہے کہ جب کسی نے کسی کا ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیا اور اس کی آنکھ پھوڑ دی اور اس نے اسے عذاب دینے کا قصد کیا تھا تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جائے گا۔ جس طرح نبی کریم ﷺ نے بیت المال کے اونٹوں کے چرواہے کے قاتلوں کے ساتھ کیا تھا۔ اگر وہ مدافعت یا لڑائی میں تھا اور قتل کر دیا تو تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ ایک جماعت کا قول اس کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں: قصاص صرف تلوار سے لیا جائے گا (2)۔ یہ امام ابو حنیفہ، شعبی اور نخعی کا قول ہے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی اس حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: قصاص نہیں ہے (3) مگر لوہے کے ساتھ اور مثلہ سے نہیں کی گئی ہے۔ نیز فرمایا: آگ کے ساتھ صرف آگ کا رب ہی عذاب دے گا (4)۔

صحیح مذہب جمہور کا ہے کیونکہ ائمہ نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ ایک لونڈی کا سر دو پتھروں میں رکھ کر پکلا گیا ہے۔ انہوں نے اس سے پوچھا: تیرے ساتھ یہ کس نے کیا تھا، کیا فلاں نے کیا فلاں نے؟ حتیٰ کہ جب انہوں نے یہودی کا ذکر کیا تو اس نے سر سے (ہاں) میں اشارہ کیا۔ وہ یہودی پکڑا گیا تو اس نے اقرار کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس یہودی کا سر دو پتھروں

2۔ احکام القرآن، صفحہ 14-113، جلد 1 (دار الفکر)

1۔ من ابی داؤد، باب فی کرہیۃ حرق العدو بالنار، صفحہ 6، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ من ابی داؤد، باب فی قتل العدو بالسیف، صفحہ 195، جلد 2 (وزارت تعلیم)

4۔ من ابی داؤد، باب فی حرق العدو بالنار، صفحہ 6، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کے درمیان کچلنے کا حکم دیا۔ ایک روایت میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے دو پتھروں کے درمیان قتل کیا (1)۔ یہ صریح صحیح نص ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهِ (النحل: 126) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَعْتَدُوا عَلَيْهِمْ مِثْلَ مَا عَتَدُوا لَكُمْ۔ اور انہوں نے حدیث جابر سے جو استدلال کیا ہے وہ حدیث محدثین کے نزدیک ضعیف ہے وہ صحیح طریق سے مروی نہیں ہے۔ اگر صحیح ہوتی تو ہم اس کے مطابق قول کرتے۔ جب لوہے کے ساتھ قتل کرے گا تو اسے لوہے کے ساتھ قتل کیا جائے گا اس پر حضرت انس کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ ایک یہودی نے ایک بچی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا سر دو پتھروں کے درمیان کچلنے کا حکم دیا (2)۔ رہی مثلہ کرنے سے نبی تو بھی یہی کہتے ہیں کہ جب اس قاتل نے مثلہ نہ کیا ہو تو اس کا مثلہ نہیں کیا جائے گا۔ جب وہ مثلہ کرے گا تو ہم بھی اس کا مثلہ کریں گے۔ اس پر عربین کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے اسے ائمہ نے نقل کیا ہے۔ اور رہا یہ ارشاد کہ آگ کے ساتھ صرف آگ کا مالک عذاب دے گا۔ صحیح ہے جب اس نے نہ جلایا ہو اگر اس نے جلایا ہو گا تو اسے جلایا جائے گا۔ اس پر قرآن کا عموم دلالت کرتا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر قاتل نے جان بوجھ کر مقتول کو آگ میں ڈالا ہو گا تو اسے بھی آگ میں ڈالا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ وقار نے اپنی مختصر میں مالک سے یہ روایت کیا ہے۔ یہی محمد بن عبدالحکیم کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: بہت سے اہل علم کا قول، اس شخص کے بارے میں جو کسی کا گلہ دبا دیتا ہے یہ ہے کہ اس پر قصاص ہوگا۔ امام محمد بن حسن نے اس میں مخالفت کی ہے۔ انہوں نے کہا: اگر اس نے گلا دبا یا اور آدمی مر گیا یا اسے کنویں میں پھینکا اور وہ مر گیا یا اس نے اسے پہاڑ سے گرایا یا کسی بلند جگہ سے گرایا اور وہ مر گیا تو اس پر قصاص نہ ہوگا اور اس کے عاقلہ (خاندان) پر دیت ہوگی۔ اگر وہ شخص اس جرم میں معروف ہو اس نے کئی شخصوں کا گلا دبا یا ہو تو اس پر قتل ہے۔ ابن منذر نے کہا: جب نبی کریم ﷺ نے اس یہودی سے قصاص لیا جس نے یحییٰ کا سر پتھروں سے کچلا تھا تو یہ بھی اس کے مفہوم میں ہے۔ پس امام محمد بن حسن کے قول کا کوئی معنی نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہی قول امام ابو حنیفہ سے حکایت کیا گیا ہے، نقل کرنے والے نے کہا: امام ابو حنیفہ کا قول مفرد ہے۔ انہوں نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے گلا دبا کر قتل کیا ہو یا زہر دے کر قتل کیا ہو یا پہاڑ سے گرایا ہو یا کنویں میں گرایا ہو یا لکڑی کے ساتھ مارا ہو اسے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ اس سے قصاص لیا جائے گا مگر جس نے اس کو تیز دھار آلہ کے ساتھ یا پتھر کے ساتھ یا لکڑی کے ساتھ قتل کیا ہو وہ گلا دبانے میں معروف ہو یا پہاڑ سے گرانے میں معروف ہو تو اس کے عاقلہ پر دیت ہوگی۔ یہ ان کی طرف سے کتاب و سنت کو چھوڑنا ہے اور امت کا معاملہ جس پر قائم تھا اس میں بدعت نکالنا ہے اور یہ قصاص کو دور کرنے کا ذریعہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نفوس کے لئے مشروع کیا ہے۔ اس سے بھاگنا ممکن نہیں۔

**مسئلہ نمبر 9:** اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے کسی کو روکا اور دوسرے نے اسے قتل کر دیا۔ عطا نے کہا: قاتل کو قتل کیا جائے گا اور روکنے والے کو قید کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ امام مالک نے کہا: اگر اس نے اسے روکا اور

1۔ صحیح مسلم، باب القصاص، صفحہ 58، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ احکام القرآن، صفحہ 115، جلد 1 (دار الفکر) صحیح بخاری، کتاب الخصومات باب ما یذکر فی الاشخاص والخصومة، حدیث 2236، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ بھی اسے قتل کرنا چاہتا تھا تو دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ امام شافعی، ابو ثور، نعمان کے قول میں روکنے والے کو سزا دی جائے گی۔ ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: عطا کا قول صحیح ہے یہ نزول قرآن کا مقتضا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عمر سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب کوئی کسی شخص کو روک لے اور دوسرا اسے قتل کر دے تو قاتل کو قتل کیا جائے گا اور جو روکنے والا ہو گا اسے قید کیا جائے گا (1)۔ اس حدیث کو سفیان ثوری نے اسماعیل بن امیہ سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو معمر اور ابن جریج نے اسماعیل سے مرسل روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 10:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ اعْتَدَىٰ**، الاعتداء کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ** (جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا۔) پس جس نے تجھ پر ظلم کیا تو اپنے ظلم کی مقدار اس سے اپنا حق وصول کر لے اور جس نے تمہیں گالی دی تو اس کو اس کی مثل قول لوٹا دے۔ جس نے تیری عزت کو تار تار کیا تو بھی اس کی عزت کے ساتھ ایسا کر۔ تو اس کے والدین تک تجاوز نہ کر نہ اس کے بیٹے اور اس کے قریبی تک تجاوز کر اور تیرے لئے اس پر جھوٹ بولنا جائز نہیں اگرچہ اس نے تجھ پر جھوٹ بولا ہے کیونکہ معصیت کا مقابلہ معصیت کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ اگر مثلاً اس نے تجھے کہا: اے کافر! تو بھی اسے کہہ سکتا ہے: تو کافر۔ اگر اس نے تجھے کہا: اے زانی! تو تیرا قصاص اسے یہ کہنا ہے: اے جھوٹا! جھوٹ کی گواہی دینے والا۔ اگر تو اسے اے زانی! کہے گا تو تو جھوٹا ہو گا اور جھوٹ میں تو گنہگار ہو گا۔ اگر وہ قرضہ وغیرہ کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا ہے حالانکہ وہ غنی ہے کوئی عذر بھی نہیں ہے تو تو اسے کہہ: اے ظالم! اے لوگوں کا مال کھانے والا! نبی کریم ﷺ نے فرمایا: غنی کا ٹال مٹول کرنا اس کی عزت اور اس کی سزا کو حلال کر دیتا ہے (2)۔ عرض سے مراد وہی ہے جو ہم نے تفسیر بیان کی ہے اور عقوبت سے مراد قید خانہ ہے جس میں اسے قید کیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ اسلام کے قوی ہونے سے پہلے نازل ہوا تھا۔ مسلمانوں میں سے جس کو اذیت دی جاتی تھی اسے اپنی ذات کے برابر اذیت دینے کا حکم تھا یا وہ مبر کرے یا معاف کر دے پھر اس کو اس قول کے ساتھ منسوخ کر دیا (3) **وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَآفَّةً** (التوبہ: 36) بعض علماء نے فرمایا اس کو سلطان کی طرف لوٹانے کے ساتھ منسوخ کیا اور کسی کے لئے سلطان کی اجازت کے بغیر کسی سے قصاص لینا جائز نہیں۔

**وَأَنْفُقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ**

**الْمُحْسِنِينَ** (۹۵)

”اور خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں اور نہ پھینکو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں اور اچھے کام کیا کرو۔ بے شک اللہ

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الحدود والدیات، حدیث 176، صفحہ 140، جلد 3 (دارالحسن)

2۔ مجمع بخاری، کتاب الاستقراض، صفحہ 323، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 264، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)



تعالیٰ محبت فرماتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** بخاری نے حذیفہ سے روایت کیا ہے: **وَ اَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ**۔ کا ارشاد خرچ کے بارے میں نازل ہوا (1)۔ یزید بن ابی حبیب نے اسلم ابو عمران سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نے قسطنطنیہ کی جنگ لڑی اور مسلمانوں کی جماعت کے جرنیل عبدالرحمن بن ولید تھے اور رومیوں نے اپنی پٹھیں شہر کی دیوار سے لگائی ہوئی تھیں۔ ایک شخص نے دشمن پر حملہ کیا تو لوگوں نے کہا: رک جا لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، یہ خود کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری نے کہا: سبحان اللہ۔ یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد فرمائی تھی اور دین کو غالب کیا تھا تو ہم نے کہا: آؤ اب ہم اپنے اموال کی دیکھ بھال کریں اور ان کی اصلاح کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **وَ اَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ**۔ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے اموال کی طرف متوجہ ہوں ان کی اصلاح کریں اور جہاد کو چھوڑ دیں۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے راستہ میں ہمیشہ جہاد کرتے رہے حتیٰ کہ قسطنطنیہ میں دفن ہوئے ان کی قبر مبارک بھی وہاں ہے۔ حضرت ابو ایوب نے کہا: القاء بالید الی التہلکۃ کا مطلب اللہ کے راستہ میں جہاد کو ترک کرنا ہے۔ آیت اس کے متعلق نازل ہوئی۔ اس کی مثل حضرات حذیفہ، حسن، قتادہ، مجاہد اور ضحاک سے مروی ہے۔

میں کہتا ہوں: ترمذی نے یزید بن ابی حبیب سے انہوں نے اسلم ابو عمران سے یہ خبر اس کے ہم معنی روایت کی ہے۔ فرمایا: ہم روم کے شہر میں تھے، رومیوں نے ہماری طرف ایک بڑا لشکر نکالا مسلمانوں میں سے ان کے مقابلہ میں اتنے ہی لوگ نکلے یا ان سے بھی زیادہ تھے۔ اور اہل مصر پر عقبہ بن عامر امیر تھے اور جماعت پر فضالہ بن عبید۔ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے رومیوں کے لشکر پر حملہ کر دیا حتیٰ کہ وہ ان کے اندر داخل ہو گیا۔ لوگ چیخے اور کہا: سبحان اللہ۔ اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری کھڑے ہوئے اور کہا: اے لوگو! تم اس آیت کی یہ تاویل کر رہے ہو، یہ آیت تو ہم انصار کے گروہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائے بغیر ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ کہنے لگے ہمارے مال ضائع ہو گئے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی ہے اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے ہیں۔ اگر اب ہم اپنے اموال کی دیکھ بھال کریں اور جو ضائع ہو چکا ہے اس کی اصلاح کریں تو بہتر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہماری بات کا رد نازل فرمایا۔ **وَ اَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ**۔ آیت میں التہلکۃ سے مراد اموال کی دیکھ بھال کرنا اور ان کی اصلاح کرنا اور جہاد کو ترک کرنا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری کے راستہ میں لڑتے رہے حتیٰ کہ روم کی زمین میں دفن ہوئے (2)۔ ابو عیسیٰ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، صفحہ 648، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورہ بقرہ، صفحہ 121، جلد 1 (وزارت تعلیم) ایضاً حدیث نمبر 2898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت ابن عباس، عکرمہ، عطاء، مجاہد اور جمہور لوگوں کا قول ہے کہ اس آیت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کو ترک کر دینا اور اہل و عیال کا خوف کرنا۔ ایک شخص کہتا: میرے پاس تو کوئی ایسی چیز ہی نہیں ہے (1) جسے میں خرچ کروں۔ اس معنی کی طرف امام بخاری گئے ہیں جبکہ کسی دوسرے نے ذکر نہیں کیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو اگرچہ تمہارے پاس تیر وغیرہ نہ بھی ہو، تم میں سے کوئی یہ نہ کہے: میں تو کوئی چیز نہیں پاتا (2)۔ سدی سے اسی طرح مروی ہے تم خرچ کرو اگرچہ رسی ہی ہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور تم کہو کہ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے (3)۔ تیسرا قول حضرت ابن عباس کا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب لوگوں کو جہاد کی طرف نکلنے کا حکم دیا تو مدینہ طیبہ کے کچھ بدو لوگ ٹھہر گئے۔ انہوں نے کہا: ہم کیا تیاری کریں؟ اللہ کی قسم! ہمارے پاس تو نہ زاد راہ ہے اور نہ ہمیں کوئی کھلائے گا تو یہ ارشاد نازل ہوا: **وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ**۔ یعنی اے خوشحال لوگو! اللہ کے راستہ میں یعنی اللہ کی طاعت میں خرچ کرو۔ **وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ** یعنی اپنے ہاتھوں کو صدقہ سے نہ روکو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

اسی طرح مقاتل نے کہا: حضرت ابن عباس کے قول کا معنی یہ ہے کہ صدقہ سے نہ روکو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے یعنی کمزور لوگوں پر خرچ کرنے سے نہ روکو۔ کیونکہ جب وہ تم سے پیچھے رہ جائیں گے تو دشمن تم پر غالب آجائے گا اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ حضرت براء بن عازب سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا کیا اس سے مراد وہ شخص ہے جو لشکر پر تہا حملہ کرتا ہے؟ حضرت براء نے کہا: نہیں بلکہ ایک شخص گناہ کرتا تھا پھر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا تھا۔ وہ کہتا تھا: میں گناہوں میں حد کو پہنچ چکا ہوں تو بہ کا کوئی فائدہ نہیں وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتا تھا اور اس کے بعد وہ گناہوں میں مستغرق ہو جاتا تھا۔ یہاں ہلاکت سے مراد اللہ تعالیٰ سے مایوس ہونا ہے۔ یہ عبیدہ سلمانی کا قول ہے۔ حضرت زید بن اسلم نے کہا: اس کا معنی ہے جہاد میں بغیر زاد راہ کے سفر نہ کرو۔ کچھ لوگوں نے ایسا کیا تھا تو اس عمل نے انہیں راستہ میں ہی کاٹ دیا تھا یا وہ لوگوں پر بوجھ بن گئے تھے (4)۔ یہ پانچ اقوال ہیں:

**سَبِيلِ اللَّهِ** سے یہاں جہاد مراد ہے اور لفظ تمام راستوں کو شامل ہے۔ **بِأَيْدِيكُمْ** میں بازائدہ ہے۔ تقدیر عبارت **تَلْقُوا** ایذیکم ہے۔ اس کی مثال **الْم يَعْلَمُ بَانَ اللَّهِ يَرِي** اس میں بازائدہ ہے۔ مبرد نے کہا: **بِأَيْدِيكُمْ** سے مراد نفوس ہیں۔ بعض سے کل مراد لیا ہے۔ جیسے ارشاد ہے: **فَهِيََا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ** (الشوری: 30) **بِهَذَا قَدْ مَتَّ يَدُكَ** (الحج: 10) ان آیات میں ایذی اور ید سے مراد پوری ذات ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ضرب الشل ہے تو کہتا ہے: **فَلَانِ الْقِي بِيْدَةٍ فِي أَمْرٍ كَذَا**۔ جب کوئی امر کو تسلیم کرے۔ قال میں شکست تسلیم کرنے والا اپنے ہتھیار اپنے ہاتھ سے پھینک دیتا ہے۔ اسی طرح ہر عاجز کرتا ہے خواہ وہ کسی فعل میں عاجز ہو۔ اسی سے **عَبْدُ الْمَطْلَبِ** کا قول ہے: **وَاللَّهُ إِنْ الْقَاءَ نَابَا يَدِينَا لِمَوْتٍ لِعَبْرَةٍ**۔ اللہ کی قسم! موت کے لئے ہمارا اپنے آپ کو ڈال دینا عجز ہے۔ بعض علماء نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: **لَا تَلْقُوا أَنْفُسَكُمْ بِأَيْدِيكُمْ**۔ جیسے تو کہتا ہے: **لَا تَفْسُدْ حَالَكُمْ بِرَأْيِكُمْ**۔ اپنے حال کو اپنی رائے کے ساتھ خراب نہ کر۔ **التَّهْلُكَةُ** لام کے ضمہ کے ساتھ۔ یہ

2۔ تفسیر طبری، صفحہ 242، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیہ)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 265، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 265، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

3۔ معالم التنزیل، صفحہ 238، جلد 1 (دار الفکر)

مَلَکَ یَهْلِکَ هَلَاکًا وَهَلْکًا وَتَهْلُکَ کَامَصْدَرٍ ہے۔ یعنی اس عمل میں نہ پڑو جو تمہیں ہلاک کر دے (1)۔ یہ زجاج وغیرہ کا قول ہے یعنی اگر تم خرچ نہیں کرو گے تو تم اللہ کی نافرمانی کرو گے اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

بعض علماء نے فرمایا: آیت کا معنی ہے اپنے اموال کو نہ روکو کہ تم سے تمہارے علاوہ اس کے وارث بنیں ورنہ تم اپنے اموال کی منفعت سے محرومی کے ساتھ ہلاک ہو جاؤ گے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ خرچ سے باز نہ آؤ ورنہ دنیا میں نعم البدل اور آخرت میں ثواب چلا جائے گا۔ کہا جاتا ہے لَا تُلْقُوا بِأَیْدِیْکُمْ إِلَى التَّهْلُکَةِ یعنی حرام مال سے خرچ نہ کرو، وہ تم پر لوٹا دیا جائے گا اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ اسی طرح حضرت عکرمہ سے مروی ہے، فرمایا: وَلَا تُلْقُوا بِأَیْدِیْکُمْ إِلَى التَّهْلُکَةِ۔ فرمایا لَا تَسْمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تَنْفَقُونَ، اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی) اس سے خبیث مال خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو۔ طبری نے کہا: وَلَا تُلْقُوا بِأَیْدِیْکُمْ إِلَى التَّهْلُکَةِ عام ہے، ہر صورت جو ذکر کی گئی ہے اس کو شامل ہے کیونکہ لفظ اس کا احتمال رکھتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو جنگ میں گھس جاتا ہے اور اکیلا دشمن پر حملہ کر دیتا ہے، قاسم بن خمیرہ، قاسم بن محمد اور عبد الملک (جو ہمارے علماء سے ہیں) نے فرمایا: تنہا ایک شخص کا بڑے لشکر پر حملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ اس میں طاقت ہو اور نیت خالص اللہ کے لئے ہو، اگر قوت نہ ہو تو یہ تہلکۃ (ہلاکت) سے ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: جب اسے شہادت مطلوب ہو اور نیت خالص ہو تو اسے حملہ کرنا چاہئے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا یہی مقصود ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بیان میں فرمایا: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (البقرہ: 207) (لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے (2))

ابن خویز منداد نے کہا: جو تنہا سو آدمیوں پر یا ایک لشکر پر یا چوروں کے گروہ پر یا محاربین پر یا خوارج پر حملہ کرتا ہے اس کی دو حالتیں ہیں: اگر اسے غالب گمان ہے کہ جس پر وہ حملہ کرے گا اسے قتل کر دے گا اور خود نجات پائے گا تو یہ بہتر ہے اسی طرح اگر اسے غالب گمان ہو کہ وہ شہید ہو جائے گا لیکن وہ دشمن کو سخت نقصان پہنچائے گا یا وہ انہیں آزمائش میں ڈال دے گا یا وہ کوئی ایسا اثر چھوڑے گا جس سے مسلمان نفع پائیں گے تو یہ بھی جائز ہے۔ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ مسلمانوں کے لشکر کا جب ایرانیوں سے مقابلہ ہوا تو مسلمانوں کے گھوڑے ایرانیوں کے ہاتھیوں سے ڈر گئے۔ تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے مٹی کا ایک ہاتھی بنایا اور اس نے اپنے گھوڑے کو مانوس کیا حتیٰ کہ وہ اس سے مانوس ہو گیا۔ جب صبح ہوئی تو اس کا گھوڑا ہاتھی سے نہ بھاگا، اس نے اس ہاتھی پر حملہ کر دیا جو آگے آگے تھا۔ اس کو کہا گیا: یہ تجھے قتل کر دے گا، اس مسلمان نے کہا: میرا قتل ہونا کوئی نقصان نہیں جبکہ مسلمانوں کو فتح مل جائے۔ اسی طرح جنگ یمامہ میں ہوا۔ جب بنو حنیفہ ایک باغ میں محفوظ ہو گئے تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے کہا: تم مجھے چمڑے کی ڈھال میں رکھو اور مجھے دشمنوں کے پاس بھیج دو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اس نے تنہا ان سے جہاد کیا اور ان کے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔

میں کہتا ہوں: اسی قسم سے ہے جو روایت کیا گیا ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی: آپ کی کیا رائے ہے



کہ اگر میں صبر کرتے ہوئے اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے اللہ کے راستہ میں شہید ہو جاؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیرے لئے جنت ہے۔ وہ دشمن کی صفوں میں گھس گیا حتیٰ کہ شہید ہو گیا۔ صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ احد میں سات انصاریوں اور دو قریش میں تنہا تھے۔ جب دشمن قریب آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: جوان کو ہم سے دور کرے گا اس کے لئے جنت ہے یا فرمایا: وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا۔ ایک انصاری آگے بڑھا اس نے جہاد کیا حتیٰ کہ وہ شہید ہو گیا پھر دشمن قریب آئے تو فرمایا: جوان کو ہم سے دور کرے گا اس کے لئے جنت ہے یا فرمایا: وہ جنت میں میرا ساتھی ہے پھر ایک انصاری آگے بڑھا جہاد کیا حتیٰ کہ وہ شہید ہو گیا۔ آپ اسی طرح فرماتے رہے حتیٰ ساتوں آدمی شہید ہو گئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مَا اَنْصَفْنَا اَصْحَابَنَا (1) (ہم نے اپنے ساتھیوں کی قتال پر رہنمائی نہیں کی حتیٰ کہ وہ شہید ہو گئے) (اَنْصَفْنَا اَصْحَابَنَا) میں ایک روایت فا کے سکون اور اصحابنا با کے فتح کے ساتھ ہے اور دوسری روایت میں فا کے فتح اور با کے رفع کے ساتھ ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ روایت لوٹ جائے گی اس کی طرف جو آپ کے ساتھیوں میں سے بھاگ گیا تھا۔ محمد بن حسن نے کہا: اگر ایک مسلمان شخص ہزار مشرکوں پر حملہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں جبکہ اسے نجات کی غالب امید ہو یا دشمن کو قتل کرنے کی امید ہو۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو یہ عمل مکروہ ہے کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ضائع کرنے کے لئے پیش کیا جبکہ اس میں مسلمانوں کا کوئی نفع نہیں ہے اور اگر اس کا مقصد مسلمانوں کو کفار پر جرأت دلانا ہے تاکہ وہ بھی اس کی طرح عمل کریں تو اس کا جواز بعید نہیں کیونکہ اس میں بعض وجوہ کے اعتبار سے مسلمانوں کا فائدہ ہے۔ اگر اس کا قصد دشمن کو ذرا ناہ ہے تاکہ وہ مسلمانوں کے دین میں صلابت کو جان لیں۔ پس اس کا جواز بھی بعید نہیں ہے اور جب اس میں مسلمانوں کا نفع ہو اور وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے دین کے اعزاز کے لئے اور کفر کی توہین کے لئے اپنی جان دیتا ہے تو یہ وہ مقام ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے مومنین کی مدح کی ہے۔ فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ الْاَيَةُ (توبہ: 111) یہ آیت اور دوسری آیات جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی جان قربان کرنے والوں کی مدح فرمائی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اسی بنیاد پر ہونا چاہئے جب اسے دین کے نفع کی امید ہو وہ اس میں جان دے دے حتیٰ کہ وہ شہید کر دیا جائے تو وہ شہداء کے اعلیٰ درجات میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاْمُرُ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْمِ (لقمان) (حکم دینی کا اور منع کرو برائی سے اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے یہ بڑی ہمت کے کام ہیں)۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: شہداء میں سے افضل حمزہ بن عبدالمطلب ہے اور وہ شخص ہے جس نے ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق ادا کیا اور اس نے اسے شہید کر دیا (2)۔ مزید تفصیل ان شاء اللہ سورہ آل عمران میں آئے گی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، صفحہ 107، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنہی، صفحہ 247، جلد 2 (وزارت تعلیم)

سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، الامر بالمعروف، صفحہ 299 (وزارت تعلیم)

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاحْتِنُوا طَاعَتِ** میں خرچ کرنے میں اور اللہ تعالیٰ کے متعلق بہتر بدل عطا کرنے میں اچھا گمان کرو بعض علماء نے فرمایا: طاعات کی پیروی کرنے کے ساتھ اپنے اعمال میں اچھائی کرو یہ مفہوم بعض صحابہ سے مروی ہے۔

وَاتِمُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۖ فَإِنْ أُخْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ۚ فَإِذَا أَمُنْتُمْ ۖ فَمَنْ تَسْتَعِينُ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ۚ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۚ تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٣١﴾

”اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ (کی رضا) کے لئے۔ پھر اگر تم گھر جاؤ تو قربانی کا جانور جو آسانی سے مل جائے (وہ بھیج دو) اور نہ منداؤ اپنے سر یہاں تک کہ پہنچ جائے قربانی کا جانور اپنے ٹھکانے پر۔ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اسے کچھ تکلیف ہو سر میں (اور وہ سر مندا لے) تو وہ فدیہ دے دے روزوں سے یا خیرات سے یا قربانی سے اور جب تم امن میں ہو جاؤ (اور حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) تو جو فائدہ اٹھانا چاہے عمرہ کا حج کے ساتھ تو جو اسے میسر ہو قربانی دے پھر جسے قربانی کی طاقت نہ ہو تو وہ تین دن روزے رکھے حج کے وقت اور سات جب تم گھر لوٹ آؤ۔ یہ پورے دس (روزے) ہوئے۔ یہ رعایت اس کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے قریب نہ ہوں اور ڈرا کرو اللہ سے اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَآتِمُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ**

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** علماء کا حج و عمرہ اللہ کے لئے مکمل کرنے کے مرادی معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: حج و عمرہ کا اللہ کی رضا کے لئے ادا کرنا ہے، جیسے ارشاد ہے: **فَاتْتَمُنَ** (انہیں ادا کیا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ثُمَّ آتُوا الصِّيَامَ إِلَى الْبَيْتِ** (البقرہ: 187) پھر تم رات تک روزہ رکھو، یہ مفہوم ان علماء کے نزدیک ہے جنہوں نے عمرہ کو واجب کیا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور جنہوں نے عمرہ کو واجب نہیں کیا انہوں نے فرمایا: حج اور عمرہ شروع کرنے کے بعد انہیں مکمل کرنا مراد ہے جس نے عبادت (حج یا عمرہ) کا احرام باندھا اس پر اس کو مکمل کرنا واجب ہے وہ اسے فسخ نہ کرے۔ شعبی اور ابن زید نے یہی مفہوم بیان کیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، حج و عمرہ کا اتمام یہ ہے کہ تم اپنے اہل کے گھر سے دونوں کا احرام باندھو۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت سعد بن ابی وقاص سے یہی مروی ہے۔ حضرت عمران بن حصین نے یہی کہا ہے۔

سفیان ثوری نے کہا: حج و عمرہ کا اتمام یہ ہے کہ تو ان کا قصد کر کے نکلے، تجارت یا کوئی غرض نہ ہو۔ اس قول کو اللہ کا قول تقویت دیتا ہے (1)۔ حضرت عمر نے کہا: ان کا اتمام یہ ہے کہ ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے۔ تمتع اور قرآن نہ کیا جائے۔ یہ ابن حبیب کا قول ہے۔ مقاتل نے کہا: اس کا اتمام یہ ہے کہ اس میں تم وہ عمل نہ کرو جو تمہارے لئے مناسب نہیں ہیں۔ یہ اس لئے فرمایا کیونکہ وہ احرام میں شرک کرتے تھے وہ تلبیہ اس طرح کہتے تھے: لبیک اللہم لبیک لا شریک لک الا شریکاً ہو لک تملکہ و ما ملک (اے اللہ! میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شرک بھی تیرے لئے ہے تو اس کا بھی مالک ہے اور جس کا وہ مالک ہے اس کا بھی مالک ہے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حج و عمرہ کو مکمل کرو اور ان کے ساتھ کسی اور شے کو نہ ملاؤ۔

میں کہتا ہوں: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو مروی ہے اور جو حضرت عمران بن حصین نے احرام میں ان مواقیت سے پہلے کیا جن کو رسول اللہ نے مقرر فرمایا ہے اس کے مطابق حضرت عبد اللہ بن مسعود اور متقدمین کی ایک جماعت نے کہا ہے اور ثابت ہے کہ حضرت عمر نے ایلیاء سے احرام باندھا تھا۔ حضرات اسود، علقمہ، عبدالرحمن اور ابواحق نے اپنے گھروں سے احرام باندھا تھا۔ امام شافعی نے اس میں رخصت دی ہے۔ ابوداؤد، دارقطنی نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے بیت المقدس سے حج یا عمرہ کا احرام باندھا وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو گیا جس طرح اس دن تھا جس دن والدہ نے اسے جنم دیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس کے پہلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے (2)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ و کعب پر رحم فرمائے انہوں نے بیت المقدس سے مکہ تک احرام باندھا تھا۔ اس میں میقات سے پہلے احرام باندھنے کی اجازت ہے۔ امام مالک نے میقات سے پہلے احرام باندھنے کو مکروہ کہا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے بھی یہی مروی ہے۔ انہوں نے حضرت عمران بن حصین پر انکار کیا تھا جنہوں نے بصرہ سے احرام باندھا تھا۔ حضرت عثمان نے حضرت ابن عمر پر انکار کیا تھا جبکہ انہوں نے میقات سے پہلے احرام باندھا تھا۔

امام احمد اور اسحاق نے کہا: عمل کی وجہ مواقیت ہیں۔ اس قول کی حجت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مواقیت کو متعین فرمایا اور ان کی تعیین فرمائی، پس یہ حج کے اجمال کے لئے بیان ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے حج کا احرام اپنے گھر سے نہیں باندھا تھا بلکہ اس میقات سے باندھا تھا جو اپنی امت کے لئے مقرر فرمایا تھا اور جو عمل رسول اللہ ﷺ نے کیا وہی افضل ہے۔ ان شاء اللہ۔ اسی طرح جمہور صحابہ اور ان کے بعد تابعین نے کہا: پہلے مقالہ والوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کی وجہ سے پہلے باندھنا افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو دو چیزوں میں اختیار دیا گیا تو آپ نے آسان کو اختیار فرمایا (3)، اور حضرت ام سلمہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے نیز صحابہ کرام سے جو میقات سے پہلے احرام باندھنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے حجت پکڑی ہے حالانکہ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے میقات سے حج کے احرام باندھنے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 265، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، من اهل بصرۃ من بیت المقدس، صفحہ 222 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، قول النبی یراد ولا تعسروا، صفحہ 904، جلد 2 (وزارت تعلیم)



کے وقت موجود تھے انہوں نے اس کی مراد و مقصود کو پہچانا تھا اور انہیں علم تھا کہ میقات سے احرام باندھنا امت پر آسانی کرنے کے لئے تھا۔

**مسئلہ نمبر 2:** ائمہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ کے لئے ذالحلیفہ کو، اہل شام کے لئے جحفہ کو، اہل نجد کے لئے قرن کو، اہل یمن کے لئے یدلم کو میقات مقرر کیا اور یہ میقات ان لوگوں کے لئے ہیں اور جو دوسرے شہروں سے ان مواقیت پر آئے جو حج اور عمرہ کا ارادہ کرتا ہو۔ اور اس کے علاوہ علاقوں کے لوگ جہاں سے چاہیں احرام باندھ لیں حتیٰ کہ اہل مکہ، مکہ سے احرام باندھیں (1)۔ اہل علم کا اس حدیث کے ظاہر قول پر اور اس کے استعمال پر اجماع ہے اس میں سے کسی چیز پر اختلاف نہیں ہے اور اہل عراق کے میقات میں اختلاف ہے اور اس کے بارے میں اختلاف ہے جس نے اس کا میقات مقرر فرمایا۔ ابو داؤد، ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل مشرق کے لئے العقیق کو میقات مقرر کیا (2)۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمر نے اہل عراق کے لئے ذات عرق کو میقات مقرر کیا۔ ابو داؤد کی کتاب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل عراق کے لئے ذات عرق کو میقات مقرر کیا (3)۔ صحیح ہے۔ اور جنہوں نے روایت کیا کہ حضرت عمر نے عراق کے لئے میقات مقرر کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عمر کے دور میں عراق فتح ہوا..... یہ ان کی غفلت ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا میقات مقرر کیا جس طرح اہل شام کے لئے جحفہ کو مقرر کیا اور شام اس وقت دار کفر تھا جس طرح عراق اور دوسرے شہر دار کفر تھے۔ عراق اور شام حضرت عمر کے عہد میں فتح ہوئے تھے۔ اس میں سیرت نگاروں کا کوئی اختلاف نہیں۔ ابو عمر نے کہا: ہر عراقی یا مشرقی ذات عرق سے احرام باندھے گا تمام کے نزدیک وہ اپنے میقات سے احرام باندھنے والا ہوگا اور العقیق علماء کے نزدیک ذات عرق سے احوط اور اولیٰ ہے اور ذات عرق بالا جماع عراقیوں کا میقات ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** اہل علم کا اجماع ہے کہ جس نے میقات پر آنے سے پہلے احرام باندھا وہ محرم ہے اور جو علماء میقات سے احرام باندھنے کو افضل قرار دیتے ہیں وہ میقات سے پہلے احرام باندھنے سے منع کرتے ہیں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان اپنے نفس پر اس چیز میں تنگی نہ کریں جو اللہ نے اس پر وسیع فرمائی ہے اور احرام میں کوئی بدعت نہ کرے۔ لیکن تمام کے نزدیک جو میقات سے پہلے احرام باندھے گا اس پر احرام لازم ہوگا کیونکہ اس نے زیادتی کی نہ کہ کمی۔

**مسئلہ نمبر 4:** اس آیت میں عمرہ کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اتمام کا حکم دیا ہے جس طرح حج کے اتمام کا حکم دیا ہے۔ صبی بن معبد نے کہا: میں حضرت عمر کے پاس آیا۔ میں نے کہا: میں نصرانی تھا پھر میں نے اسلام قبول کیا، میں نے حج اور عمرہ کو اپنے اوپر فرض پایا ہے۔ میں نے دونوں کا احرام باندھا ہے۔ حضرت عمر نے اسے فرمایا: تجھے اپنے

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، مہل اہل مکہ للحج والعمرة، صفحہ 206، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، فی مواقیت الاحرام لاهل الافاق، صفحہ 103، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، فی مواقیت، صفحہ 243، جلد 1 (وزارت تعلیم)

نبی کی سنت کی ہدایت دی گئی ہے۔ ابن منذر نے کہا: حضرت عمر نے اس کے قول (میں نے اپنے اوپر حج اور عمرہ کو فرض پایا ہے) پر انکار نہ کیا۔ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس نے ان کے وجوب کا قول کیا ہے۔ دارقطنی نے ابن جریج سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: مجھے نافع نے بتایا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے اللہ کی مخلوق میں سے کوئی نہیں ہے مگر اس پر حج اور عمرہ واجب ہیں جو ان کی طرف جانے کے راستہ کی طاقت رکھتا ہے (1) اور تابعین میں سے جو عمرہ کے وجوب کے قائل ہیں وہ یہ ہیں۔ حضرات عطاء، طاؤس، مجاہد، حسن، ابن سیرین، شعبی، سعید بن جبیر، ابو بردہ، مسروق، عبداللہ بن شداد، شافعی، احمد، اسحاق، ابو عبیدہ، ابن الجہم (مالکیوں میں سے) ثوری نے کہا: ہم نے سنا ہے کہ وہ عمرہ واجب ہے۔ زین بن ثابت سے حج سے پہلے عمرہ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: دو نمازیں ہوں تجھے کوئی نقصان نہیں جس سے تو آغاز کر لے۔ یہ دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔ محمد بن سید بن زید بن ثابت کے سلسلہ سے مرفوع حدیث مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں تجھے کوئی نقصان نہیں جس سے چاہے آغاز کر لے (2)۔ امام مالک فرماتے تھے، عمرہ سنت ہے اور ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے اس کو چھوڑنے کی رخصت دی ہو۔ یہ نخعی اور اصحاب رائے کا قول ہے جو ابن منذر نے حکایت کیا ہے بعض قزوینی اور بغدادی علماء نے امام ابو حنیفہ سے روایت کیا ہے کہ وہ اسے حج کی طرح واجب کہتے تھے اور یہ سنت ثابتہ ہے (3)۔ یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت جابر بن عبداللہ کا قول ہے۔

دارقطنی نے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں محمد بن قاسم بن زکریا نے بیان کیا فرمایا ہمیں محمد بن العلاء ابو کریب نے بیان کیا فرمایا ہمیں عبدالرحیم بن سلیمان نے بیان کیا انہوں نے حجاج سے انہوں نے محمد بن منکدر سے انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے بیان کیا، فرمایا: ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز، زکوٰۃ اور حج کے بارے میں پوچھا کیا یہ واجب ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ پھر اس نے عمرہ کے متعلق پوچھا کیا یہ واجب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں اور تیرا عمرہ کرنا تیرے لئے بہتر ہے۔ اس حدیث کو یحییٰ بن ایوب نے حجاج اور ابن جریج سے انہوں نے ابن المنکدر سے انہوں نے حضرت جابر سے موقوف روایت کی ہے (4) یعنی یہ حضرت جابر کا قول ہے۔ یہ ان علماء کی حجت ہے جو عمرہ کو واجب نہیں کہتے بلکہ سنت کہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: اس آیت میں وجوب کی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اتمام کے وجوب میں عمرہ کو حج کے ساتھ ملایا ہے نہ کہ آغاز کے وجوب کے اعتبار سے ملایا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ کی ابتدا کا ذکر کیا تو فرمایا: **وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ** (البقرہ: 43) اور حج کے ایجاب کا ذکر ابتدا فرمایا **وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ** (آل عمران: 97) جب عمرہ کا ذکر فرمایا تو اس کے اتمام کا مکمل کرنا واجب ہے۔ آیت کریمہ اتمام کے الزام کے لئے ہے نہ کہ ابتدا کے الزام کے لئے آئی ہے (5)۔ واللہ اعلم۔۔۔ مخالف نے نظر کی جہت سے اس کے وجوب پر یہ دلیل دی ہے کہ حج کا رکن عرفات میں ٹھہرنا ہے اور عمرہ میں وقوف نہیں ہے اگر یہ حج کی سنت کی طرح ہوتا تو افعال میں اس کے مساوی کرنا واجب ہوتا، جس طرح نماز کی سنت

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الحج، فی المواعیت، صفحہ 285، جلد 2 (قاہرہ)  
2۔ ایضاً 3۔ المعراج، صفحہ 266، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)  
4۔ سنن دارقطنی، کتاب الحج، فی المواعیت، صفحہ 285، جلد 1 (قاہرہ)  
5۔ احکام القرآن، صفحہ 19-118، جلد 1 (دارالفکر)

افعال میں اس کی فرضیت کے مساوی ہوتی ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** شعبی اور ابو حیوہ نے العمرة کوتا کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے، یہ بھی اس کے عدم وجوب کی دلیل ہے اور جماعت نے العمرة کوتا کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے یہ وجوب کی دلیل ہے۔ حضرت ابن مسعود کے مصحف میں وااتموا الحج والعمرة الى البيت لله ہے اور ان سے اقیموا الحج والعمرة الى البيت (1) بھی مروی ہے اللہ کا ذکر خصوصی طور پر فرمایا کیونکہ عرب حج کا قصد اجتماعیت، تعاون، مقابلہ، تنافر، قضاء حاجت اور بازاروں میں جانے کے لئے کرتے تھے۔ ان سب میں اللہ کے لئے اطاعت نہیں ہے اور اس ارادہ کا کوئی حصہ نہیں ہے اور عقیدہ کے اعتبار سے کوئی قربت نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے فرض کی ادائیگی اور اللہ کے حق کی ادائیگی کے لئے قصد کرنے کا حکم دیا پھر تجارت کی بھی اجازت فرمادی جیسا کہ آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 6:** اس شخص کے بارے میں علماء کا اختلاف نہیں جو مناسک حج میں حاضر ہو جبکہ اس نے حج اور عمرہ کی نیت نہ کی ہو۔۔۔۔۔ قلم اس کے حق میں اور اس کے خلاف جاری ہے۔۔۔۔۔ اس کا بغیر نیت اور قصد کے ان مقامات پر آنا اسے کچھ مفید نہیں ہے۔۔۔۔۔ نیت کرنا فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاتِمُوا اور عبادت کے تمام سے نیت کا حضور بھی ہے یہ احرام کے وقت احرام کی طرح فرض ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سواری پر سوار ہوئے تو کہا: لبیک بحجة وعمرہ معاً۔ (2) جیسا کہ آگے آئے گا۔

ربیع نے بویطی کی کتاب میں امام شافعی سے روایت کیا ہے، فرمایا: اگر کسی نے تلبیہ کہا اور حج اور عمرہ کی نیت نہیں کی تو وہ حج اور عمرہ کرنے والا نہ ہوگا اور اگر نیت کی اور تلبیہ نہ کہا حتیٰ کہ تمام مناسک پورے کر دیئے تو اس کا حج مکمل ہو گیا اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے حجت پکڑی ہے: انما الاعمال بالنيات۔ (3) فرمایا: جس نے اس طرح کہا جس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے کہا تھا جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام پر احرام باندھا تھا تو یہ نیت درست ہے کیونکہ یہ غیر کی نیت پر واقع ہوا ہے جو پہلے ہو چکی ہے بخلاف نماز کے۔

**مسئلہ نمبر 7:** علماء کا مراہق اور غلام کے بارے میں اختلاف ہے یہ جو حج کا احرام باندھتے ہیں پھر مراہق بالغ ہو جاتا ہے، غلام آزاد ہو جاتا ہے اور یہ وقوف عرفہ سے پہلے ہوتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ان دونوں کو احرام کھولنے کی اجازت نہیں اور نہ کسی اور کو یہ اجازت ہے۔ امام مالک نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے وَاتِمُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ اور جس نے احرام کو کھولا اس کا حج اور عمرہ مکمل نہ ہوا۔ امام ابو حنیفہ نے کہا جب بچہ وقوف عرفات سے پہلے بالغ ہو جائے تو وہ احرام کو نئے سرے سے باندھے۔ اگر اس نے اپنے حج کو جاری رکھا تو یہ فرض حج کی طرف سے جائز نہ ہوگا اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ جب اس کا حج جائز نہ تھا اور نہ اس کو فرض لازم تھا۔ جب اس نے حج کا احرام باندھا تھا پھر اس کو حج لازم ہو گیا جب وہ بالغ ہوا تو اس کے لئے اس فرض کو چھوڑنا محال ہو گیا جو اس پر متعین ہو چکا ہے، نوافل کا ادا کرنا اور فرض کو

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، باب القران، صفحہ 13، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، ہذا الوسی، صفحہ 2، جلد 1 (وزارت تعلیم)



چھوڑنا محال ہے، جس طرح کوئی شخص نوافل میں داخل ہوا پھر فرضوں کی جماعت کھڑی ہوگئی اور اسے فرض کے فوت ہونے کا خوف ہو تو وہ نوافل کو توڑ دے اور فرض میں داخل ہو۔ امام شافعی نے فرمایا: جب بچہ احرام باندھے پھر وقوف عرفات سے پہلے بالغ ہو جائے تو وہ اسی احرام کے ساتھ عرفات میں ٹھہراتو اس کا یہ حج فرض ادا ہو جائے گا اور اسی طرح غلام کا حکم ہے۔ فرمایا: اگر مزدلفہ میں آزاد ہوا اور بچہ مزدلفہ میں بالغ ہوا تو وہ دونوں آزادی اور بلوغ کے بعد عرفہ کی طرف لوٹ آئیں پھر وہ طلوع فجر سے پہلے عرفہ کے وقوف کو پالیں تو ان کا فرض حج ادا ہو جائے گا اور ان پر بکری لازم نہ ہوگی اور اگر وہ احتیاطاً بکری وغیرہ دے دیں تو میرے نزدیک پسندیدہ ہے۔ یہ میرے نزدیک واضح نہیں ہے، اور احرام کی تجدید کو ساقط کرنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کیونکہ جب انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب وہ یمن سے حج کا احرام باندھ کر آئے تھے تم نے کیسا احرام باندھا ہے۔؟ حضرت علی نے کہا: میں نے کہا: لبیک اللہم باہلال کاہلال نبیک۔ اے اللہ! میں نے تیرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام جیسا احرام باندھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے حج کا احرام باندھا ہے اور میں ہدی (بکری یا اونٹ) ساتھ لایا ہوں (1)۔ امام شافعی نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات کا انکار نہ کیا اور انہیں حج مفرد یا حج تمتع یا حج قرآن کی نئی نیت کرنے کا حکم فرمایا۔ امام مالک نے اس نصرانی کے بارے میں فرمایا جو عرفہ کی شام کو اسلام قبول کرتا ہے پھر وہ حج کا احرام باندھتا ہے تو اس کا فرض حج ادا ہو جائے گا۔ اسی طرح غلام آزاد ہو جائے، بچہ بالغ ہو جائے جبکہ وہ احرام باندھے ہوئے نہ ہوں اور ان میں سے کسی پر بکری لازم نہ ہوگی..... بکری اس پر لازم ہوتی ہے جو حج کا ارادہ کرے اور میقات سے احرام نہ باندھے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: غلام پر بکری لازم ہے وہ اس آزادی کا مانند ہے جو میقات سے تجاوز کر گیا۔ بخلاف بچے اور نصرانی کے ان پر دخول مکہ کے لئے احرام لازم نہ تھا کیونکہ ان پر فرض ساقط تھا جب کافر مسلمان ہوا، بچہ بالغ ہو تو ان کا حکم مکی کے حکم کی طرح ہے۔ میقات کو ترک کرنے کی وجہ سے ان پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِنْ أُخْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ

اس میں بارہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** ابن عربی نے کہا یہ آیت انتہائی مشکل ہے اور علماء کو عاجز کر دینے والی آیت ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: اس میں کوئی اشکال نہیں ہے ہم اس کو تفصیل سے بیان کریں گے۔ ہم کہتے ہیں: احصار کا معنی اس وجہ سے روکنا ہے جس کا تو قصد کئے ہوئے ہے خواہ وہ کسی عذر سے ہو، خواہ دشمن روک لے یا ظالم بادشاہ روک لے، یا مرض روک لے یا کوئی اور وجہ ہو۔ علماء کا مانع کی تعیین میں اختلاف ہے۔ علماء کے دو قول ہیں: (1) حضرت علقمہ، حضرت عروہ بن زبیر وغیرہما نے کہا: مانع مرض ہے، دشمن نہیں ہے (3)۔ بعض نے فرمایا: صرف دشمن ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت انس اور امام شافعی کا قول ہے، ابن عربی نے کہا: یہ ہمارے علماء کا مختار مذہب ہے۔ اکثر اہل لغت کی رائے یہ ہے کہ اُخْصِرْتُمْ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، من اهل ل من النہی، صفحہ 211، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ احکام القرآن، صفحہ 119، جلد 1 (دار الفکر)

3۔ البحر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

معنی ہے: اس کو مرض لاحق ہوئی اور حصر کا مطلب ہے: اس پر دشمن نازل ہوا (1)۔

میں کہتا ہوں: ابن عربی نے جو حکایت کیا ہے کہ یہ ہمارے علماء کا مختار مذہب ہے، یہ صرف اشہب کا قول ہے باقی تمام اصحاب مالک نے اس میں مخالفت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: احصار سے مراد مرض کا روک لینا ہے اور رہا دشمن اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: حصر حصر افعو محصور۔ یہ الباجی کا لکھنوی میں قول ابواسحاق۔ زجاج نے حکایت کیا ہے کہ تمام اہل لغت کے نزدیک ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ ابو عبیدہ اور کسائی نے کہا: احصر (مرض کے ساتھ روکا گیا) حصہ (دشمن کے ذریعے روکا گیا) (2) ابن فارس کی مجمل میں اس کے برعکس ہے۔ فحصر (مرض کے ساتھ روکا گیا) احصر (دشمن کے ذریعے روکا گیا) ایک طائفہ نے کہا: دونوں کے لئے احصر استعمال ہوتا ہے یہ ابو عمرو نے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ امام مالک کے قول کے مشابہ ہے کہ انہوں نے مؤطا میں دونوں کے لئے احصر کا عنوان باندھا ہے۔ فراء نے کہا: مرض اور دشمن میں دونوں صیغے برابر ہیں۔ قشیری ابو نصر نے کہا: شوافع نے دعویٰ کیا ہے کہ احصار دشمن کے لئے استعمال ہوتا ہے اور مرض کے لئے حصر استعمال ہوتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں صیغے دونوں (مرض اور دشمن) کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: شوافع نے جو دعویٰ کیا ہے امام غلیل بن احمد وغیرہ نے اس کے خلاف نص قائم کی ہے۔ غلیل نے کہا: حصرت الرجل حصراً (میں نے اسے روک لیا) واحصر الحاج عن بلوغ المناسك من مرض او نحوه (حاجی مرض یا اس جیسی چیز سے مناسک تک پہنچنے سے روک دیا گیا)۔ اسی طرح انہوں نے فرمایا: پہلے تو ثلاثی بنایا حصرت سے مشتق کیا اور دوسرے کو مرض میں رباعی بنایا۔ اسی پر حضرت ابن عباس کا قول ہے: لا حصر الا حصر العدو۔ (3) حصر نہیں ہے مگر دشمن کا حصر۔ ابن السکیت نے کہا: احصره المرض جب مرض سفر سے یا حاجت سے روک دے جس کا اس نے ارادہ کیا تھا۔ حصره العدو يحصره، جب دشمن اسے روک لے اور وہ دشمن کا گھیراؤ کر لیں۔ حاصره محاصره و حصاراً۔ انہوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ انفس نے کہا: حصرت الرجل فهو محصور۔ یعنی میں نے اسے روک لیا۔ فرمایا: احصرت بولی و احصرتی مرضی اس نے مجھے اپنے نفس کو روکنے والا بنادیا۔ ابو عمرو شیبانی نے کہا: حصرتی الشئ و احصرتی۔ یعنی اس نے مجھے روک لیا۔ میں کہتا ہوں: اکثر اہل لغت کا خیال ہے کہ حصر دشمن کے روکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور احصر مرض کے روکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے: لِنُقَرِّ آءَالِیْنِیْنِ اُحْصِرُوْا فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ (البقرہ: 273) (فقراء کے لئے جو روکے گئے ہیں اللہ کے راستہ میں)۔ ابن عبادہ نے کہا:

د ما هجر لیلی ان تكون تباعدت عليك ولا ان احصرتك شغول

لیلی کی جدائی نہیں کہ وہ تجھ سے دور ہوگئی نہ تجھے مشغولیت نے روکا۔

زجاج نے کہا: تمام اہل لغت کے نزدیک احصار مرض سے ہوتا ہے۔ رہا دشمن سے احصار تو اس کے لئے حصر استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: حصہ حصراً۔ پہلے میں احصار احصاراً کہا جاتا ہے۔ یہ ہمارے قول کی دلیل ہے اس کا معنی روکنا ہے۔ اس

3۔ معالم التنزیل، صفحہ 244، جلد 1 (دار الفکر)

1۔ احکام القرآن، صفحہ 119، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 121، جلد 1

سے الحصار ہے وہ شخص جو دل کے راز بتانے سے اپنے نفس کو روکتا ہے۔ الحصار بادشاہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ حجاب کے پیچھے محبوس (قیدی) کی طرح ہوتا ہے۔ الحصار چٹائی کو بھی کہتے ہیں جس پر بیٹھا جاتا ہے کیونکہ اس کے پتے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں جیسے کوئی چیز دوسری چیز کے ساتھ رکی ہوئی ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** جب الحصار کا اصل معنی روکنا ہے تو احناف نے کہا: محصر وہ ہے جو احرام کے بعد مرض یا دشمن یا کسی وجہ سے مکہ سے روکا گیا ہو اور انہوں نے مطلق احصار کے مقتضا سے حجت پکڑی ہے اور انہوں نے فرمایا: آخر آیت میں امن کا ذکر اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ مرض کی وجہ سے نہ ہو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: الزکام امان من الجذام زکام جزام کی مرض سے امان ہے اور فرمایا: جس نے چھینک مارنے والے سے پہلے الحمد کہا وہ دانتوں کی تکلیف، کان کی تکلیف اور پیٹ کی تکلیف سے محفوظ ہو گیا۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔ احناف نے کہا: ہم نے دشمن کے روکنے کو مرض پر قیاس کرتے ہوئے حصار بنایا جب وہ اس کے حکم میں ہے نہ کہ ظاہر کی دلالت کے اعتبار سے حصار بنایا ہے۔ حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر، حضرت ابن عباس، امام شافعی اور اہل مدینہ نے کہا: آیت سے مراد دشمن کا روکنا ہے کیونکہ آیت عمرہ حدیبیہ میں ۶ ہجری میں نازل ہوئی جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ سے روکا تھا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے تو کفار قریش بیت اللہ اور آپ کے درمیان حائل ہو گئے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی ہدی کو خر کیا اور اپنے سر کا حلق کرایا (۱)۔ اس پر قَدْ اَآؤْمِنْتُمْ کا ارشاد دلالت کرتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا: جب تم مرض سے ٹھیک ہو جاؤ۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 3:** جمہور علماء کا خیال ہے کہ محصر جسے دشمن نے روک لیا ہو وہ جہاں روکا گیا ہو وہاں اپنا احرام کھول دے، اپنی ہدی کو خر کر دے اگر اس کے پاس ہدی ہو اور وہ اپنے سر کا حلق کرائے۔ قتادہ اور ابراہیم نے کہا: وہ اپنی ہدی بھیجے اگر ممکن ہو جب اس کی ہدی اپنے مقام پر پہنچ جائے تو وہ حلالی ہو جائے (۲) (یعنی احرام کھول دے) امام ابو حنیفہ نے کہا: احصار کا جانور، دسویں ذی الحجہ کو ذبح کرنے پر موقوف نہیں بلکہ دسویں کے دن سے پہلے بھی اس کو ذبح کرنا جائز ہے جب ہدی اپنے محل کو پہنچ جائے۔ صاحبین نے امام صاحب کی مخالفت کی ہے۔ صاحبین نے کہا: یہ دسویں کے دن ذبح کیا جائے گا، اگر دسویں کے دن سے پہلے ذبح کی تو جائز نہ ہوگی۔ اس مسئلہ کا زیادہ بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 4:** اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ جو دشمن کی وجہ سے روکا گیا ہو خواہ وہ دشمن کافر ہو یا مسلمان ہو یا جابر سلطان نے اسے قید خانہ میں بند کر دیا ہو اس پر ہدی واجب ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ اشہب کا بھی یہی قول ہے۔ ابن قاسم نے کہا: جوج یا عمرہ میں بیت اللہ سے روکا گیا ہو اس پر ہدی نہیں ہے مگر یہ کہ وہ ہدی ساتھ لایا ہو۔ یہ امام مالک کا قول ہے اور ان کی حجت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے روز ہدی کو خر کیا تھا، اسے اشعار کیا تھا اور اسے ہار پہنایا تھا جب عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ جب وہ ہدی اپنے مقام پر نہ پہنچی کفار کے روکنے کی وجہ سے تو رسول اللہ ﷺ نے اسے خر کرنے کا حکم دیا کیونکہ وہ ہدی تھی اور اس کو قلاوہ پہناتا اور اشعار کرنا واجب تھا اور آپ ﷺ اللہ کے لئے نکلے تھے۔ پس اس میں رجوع

۱۔ صحیح بخاری، کتاب العمرة، اذا حصر المعتبر، ص 243، جلد 1 (وزارت تعلیم)  
2۔ البحر الریز، ص 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)



جائز نہ تھا اور رسول اللہ ﷺ نے رکاوٹ کی وجہ سے اسے نخر نہیں کیا تھا۔ اسی وجہ سے جو بیت اللہ سے روکا گیا ہو اس پر ہدی واجب نہیں ہے۔ اور جمہور علماء نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے روز نہ احرام کھولا تھا اور نہ حلق کرایا تھا حتیٰ کہ ہدی کو نخر کر دیا۔ یہ دلیل ہے کہ محصر کے احرام کھولنے کی شرط ہدی کا ذبح کرنا ہے۔ اگر اس کے پاس ہدی ہو اور اگر وہ فقیر ہو تو جب وہ ہدی پائے اور اس پر قادر ہو وہ احرام نہ کھولے مگر ہدی دینے کے بعد۔ یہی ارشاد قرآن اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کا مقتضا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب وہ ہدی پر قادر ہو تو حلالی ہو جائے اور ہدی دے۔ امام شافعی کے دو قول ہیں اسی طرح جو ہدی خریدنے کی طاقت نہیں رکھتا اس کا حکم ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** عطا وغیرہ نے کہا: مرض کی وجہ سے محصر، دشمن کی وجہ سے محصر کی طرح ہے۔ امام مالک اور شافعی اور ان کے اصحاب نے کہا: جس کو مرض نے روک لیا ہو اس کو بیت اللہ کا طواف ہی حلالی کرے گا اگرچہ وہ کئی سال ہی ٹھہرا رہے حتیٰ کہ اسے تکلیف سے آفاقہ ہو جائے (1)۔ اسی طرح جس کو گنتی میں غلطی ہوئی یا اس پر ذی الحج کا چاند بخنی ہوا، اس کا حکم ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس میں اہل مکہ اہل آفاق کی طرح ہیں۔ فرمایا: اگر مریض دواء کا محتاج ہو تو وہ اس کے ساتھ علاج کرے اور نہ یہ دے اور اپنے احرام پر باقی رہے اور اسے کسی چیز سے حلالی ہونا جائز نہیں حتیٰ کہ مرض سے ٹھیک ہو جائے۔ جب مرض سے ٹھیک ہو جائے تو وہ بیت اللہ کی طرف جائے اس کے ساتھ چکر لگائے، صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے اور اپنے حج اور عمرہ سے حلالی ہو جائے۔ یہ تمام امام شافعی کا قول ہے اور ان کا نظریہ اس روایت کے مطابق ہے جو حضرت عمر، حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہم کا ہے۔ انہوں نے کہا: مرض کی وجہ سے محصر یا گنتی میں غلطی کی وجہ سے محصر کے بارے میں فرمایا: اس کو طواف ہی حلال کرے گا۔ اسی طرح کوئی عضو ٹوٹ جائے یا جلاب لگ جائیں۔ اس کا بھی یہی حکم ہے امام مالک کے نزدیک جس کی یہ حالت ہو اسے اختیار ہوگا جب اسے وقوف عرفہ کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو مرض کی وجہ سے تو اگر وہ چاہے تو چلا جائے جب اس کے لئے بیت اللہ تک پہنچنا ممکن ہو تو وہ طواف کرے اور عمرہ سے حلالی ہو جائے۔ اور اگر چاہے تو آئندہ سال تک احرام پر باقی رہے اگر وہ احرام پر باقی رہے گا تو کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو حاجی کو منع ہوتا ہے۔ پس اس پر ہدی نہ ہوگی اور اس میں حجت صحابہ کا اجماع ہے کہ جو تعداد میں غلطی کر جائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ طواف سے ہی حلالی ہوگا اور مکی کے بارے میں فرمایا: جب وہ محصور باقی رہے حتیٰ کہ لوگ اپنے حج سے فارغ ہو جائیں تو وہ حل کی طرف نکل جائے، تلبیہ کہے اور وہ وہی کرے جو عمرہ کرنے والا کرتا ہے اور حلالی ہو جائے جب آئندہ سال آئے تو حج کرے اور ہدی دے۔ ابن شہاب زہری نے کہا: مکہ والوں میں سے مکہ میں محصر ہو تو اسے وقوف عرفہ لازم ہے اگرچہ اسے چار پائی پر اٹھا کر لے جایا جائے۔ اس قول کو ابو بکر محمد بن احمد بن عبد اللہ بن بکیر مالکی نے اختیار کیا ہے۔ فرمایا: محصر مکی کے بارے میں امام مالک کا قول یہ ہے کہ اس پر بھی آقا قیوں کی طرح حج اور ہدی کا اعادہ ہے۔ یہ ظاہر کتاب کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اور فرمایا: میرے نزدیک اس مسئلہ میں زہری کا قول پسندیدہ

ہے۔ یہ اباحت ان لوگوں کے لئے ہے جو مسجد حرام کے رہنے والے نہیں ہیں وہ ٹھہر جائیں کیونکہ ان کی مسافت دور ہے وہ علاج کرائیں اگرچہ حج فوت بھی ہو جائے اور ایسا شخص جس کے درمیان اور مسجد حرام کے درمیان اتنی مسافت ہو جس میں نماز قصر نہیں کی جاتی تو وہ مناسک حج پر جائے اگرچہ اسے چار پائی پر ہی لے جایا جائے کیونکہ وہ بیت اللہ کے قریب ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: ہر وہ شخص جو دشمن، مرض، خرچ ختم ہونے، سواری گم ہونے یا کسی موذی چیز کے ڈسنے کی وجہ سے بیت اللہ تک پہنچنے سے روکا گیا ہو تو وہ احرام کے ساتھ اپنے مکان پر ٹھہرا رہے اور اپنی ہدی بھیج دے یا ہدی کی قیمت بھیج دے، جب وہ نحر کر دے تو اپنے احرام کو کھول دے۔ اسی طرح حضرات عروہ، قتادہ، حسن، عطاء، نخعی، مجاہد اور اہل عراق کا قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَإِنْ أَحْصَرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**۔ (الآیہ)

**مسئلہ نمبر 6:** امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: محرم کو حج میں شرط لگانا کچھ نفع نہیں دیتا جب اسے مرض یا دشمن سے محصر ہونے کا اندیشہ ہو۔ یہ امام ثوری، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ شرط لگانا یہ ہے کہ تلبیہ کہتے وقت لبیک اللہم لبیک۔ جہاں تو مجھے روک لے گا میں اپنا احرام وہاں کھول دوں گا۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور ابو ثور نے کہا شرط لگانے میں کوئی حرج نہیں اور اس کے لئے وہ شرط ہوگی جو وہ لگائے گا۔ دوسرے بہت سے صحابہ اور تابعین نے بھی یہی کہا ہے ان کی حجت ضباعہ بنت زبیر عن عبد المطلب کی حدیث ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہا: یا رسول اللہ! میں حج کا ارادہ رکھتی ہوں کیا میں شرط لگا دوں؟ فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: میں کیسے کہوں؟ فرمایا: تو یوں کہہ: لبیک اللہم لبیک و محلی من الارض حیث حبستنی (1) (جہاں تو مجھے روک لے گا میں احرام کھول دوں گی) اس حدیث کو ابو داؤد اور دارقطنی وغیرہما نے نقل کیا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر ضباعہ کی حدیث ثابت ہوتی تو میں اس سے زیادتی نہ کرتا اس کا احرام کھولنا جائز ہے جہاں اسے اللہ تعالیٰ روک لے۔

میں کہتا ہوں: بہت سے محدثین نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ان میں سے ابو حاتم بستی اور ابن منذر ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ضباعہ بنت زبیر سے کہا: تو حج کر اور شرط لگا لے (2)۔ یہی امام شافعی کا قول ہے جب وہ عراق میں تھے پھر مصر میں اسے توقف کیا۔ ابن منذر نے کہا: پہلا قول بہتر ہے۔ عبدالرزاق نے اس کو ذکر کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں ابن جریج نے بتایا فرمایا مجھے ابو زبیر نے بتایا کہ طاؤس اور عکرمہ نے انہیں حضرت ابن عباس سے روایت کر کے بتایا کہ حضرت ضباعہ بنت زبیر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہا: میں ایک مریض عورت ہوں، میں حج کرنا چاہتی ہوں آپ مجھے کیا حکم فرماتے ہیں اگر میں احرام باندھ لوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تو احرام باندھ لے اور شرط لگا لے کہ میرے احرام کھولنے کی جگہ وہی ہوگی جہاں تو مجھے روک لے گا (3)۔ راوی فرماتے ہیں: اس عورت نے حج کر لیا تھا۔ یہ سند صحیح ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** علماء کا اختلاف ہے کہ محصر پر قضا واجب ہے یا نہیں۔ امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا: دشمن نے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحج، باب الاشتراط علی الحج، صفحہ 247، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ ایضاً، حدیث 83، صفحہ 235، جلد 2

2۔ سنن دارقطنی، کتاب الحج، حدیث 82، صفحہ 235، جلد 2 (قاہرہ)

جسے روک لیا ہو اس پر نہ حج کی قضا ہے نہ عمرہ کی، مگر جس نے اپنا فرض حج نہ کیا ہو تو اس پر وجوب کے مطابق حج ہے۔ اسی طرح ان علماء کے نزدیک عمرہ کرنا واجب ہے جنہوں نے عمرہ کو واجب کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا مرض یا دشمن نے روک لیا ہو تو اس پر حج اور عمرہ ہے۔ یہ طبری کا قول ہے۔ اصحاب الرائے نے کہا: اگر وہ حج کا احرام باندھنے والا تھا تو وہ احصار کی صورت میں حج اور عمرہ قضا کرے گا کیونکہ اس کا حج اور احرام عمرہ بن گیا تھا۔ اگر وہ حج قرآن کرنے والا تھا تو وہ ایک حج اور دو عمرے قضا کرے گا اگر وہ عمرہ کا احرام باندھنے والا تھا تو وہ ایک عمرہ قضا کرے گا ان کے نزدیک ہر مرض یا دشمن کے ذریعے روکا گیا برابر ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ میمون بن مہران کی حدیث سے انہوں نے حجت پکڑی ہے۔ فرمایا: میں اس سال عمرہ کے ارادہ سے نکلا جس میں اہل شام نے حضرت ابن زبیر کا مکہ میں محاصرہ کیا ہوا تھا۔ میری قوم کے کئی لوگوں نے میرے ساتھ اپنی ہدی کے جانور بھیجے، میں اہل شام تک پہنچا تو انہوں نے مجھے حرم میں داخل ہونے سے روک لیا۔ میں نے اسی جگہ ہدی کو نحر کیا پھر میں نے احرام کھول دیا اور واپس آ گیا۔ جب آئندہ سال آیا تو میں اپنے عمرہ کی قضا کے لئے نکلا۔ میں حضرت ابن عباس کے پاس آیا۔ میں نے ان سے مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا ہدی کا بدل دے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو اس ہدی کا بدل دینے کو کہا جو انہوں نے عمرہ قضا میں حدیبیہ کے سال نحر کی تھیں اور ان علماء نے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا جس کا کوئی عضو ٹوٹ گیا یا ٹانگ ٹوٹ گئی تو وہ احرام کھول دے اور اس پر دوسرا حج یا دوسرا عمرہ ہے (1)۔ اس حدیث کو عمرہ بن حجاج بن عمرو انصاری سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کی ٹانگ ٹوٹ جائے یا کوئی اور عضو ٹوٹ جائے تو وہ احرام کھول دے اور اس پر دوسرا حج ہے (2)۔ ان علماء نے فرمایا: آئندہ سال رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کا حدیبیہ کے سال عمرہ کرنا اس عمرہ کی قضا کے لئے تھا۔ اسی وجہ سے اس عمرہ کو عمرۃ القضاء کہا جاتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی صحابی کو اور کسی ساتھی کو کسی چیز کے قضا کرنے کا حکم دیا اور نہ وہ کوئی چیز لئے لوئے اور کسی وجہ سے ان سے کوئی چیز محفوظ نہیں کی گئی اور نہ آئندہ سال یہ کہا کہ میرا ہی عمرہ اس عمرہ کی قضا ہے جس میں مجھے روکا گیا تھا۔ یہ کوئی آپ ﷺ سے منقول نہیں ہے۔ علماء نے فرمایا: عمرۃ القضاء اور عمرۃ التقضیۃ برابر ہیں۔ یہ اس عمرہ کا نام ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قریش سے فیصلہ کیا تھا اور اس سال بیت اللہ سے واپس چلے جانے اور آئندہ سال آنے پر ان سے صلح کی تھی اسی وجہ سے اس کو عمرۃ التقضیۃ کہا جاتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** فقہاء میں سے کسی نے اس شخص کے بارے میں نہیں کہا کہ جس کا کوئی عضو ٹوٹ جائے یا ٹنگڑا ہو جائے تو ٹوٹنے کے ساتھ ہی اسی جگہ اپنا احرام کھول دے سوائے ابو ثور کے۔ انہوں نے حجاج بن عمرو کی حدیث کے ظاہر کا اعتبار کیا ہے اور اس کی متابعت داؤد بن علی اور اس کے اصحاب نے کی ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ وہ عضو ٹوٹنے کے ساتھ احرام کھولے گا لیکن کیسے کھولے گا۔ امام مالک وغیرہ نے کہا: بیت اللہ کے طواف کے ساتھ کھولے گا اس کے علاوہ نہیں کھولے گا اور کوفہ کے علماء نے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب البناسک، باب المعصر، صفحہ 229 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی الذی یصل بالحدیب فیکس، ادیعرب، صفحہ 113، جلد 1 (وزارت تعلیم)



اس کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: وہ نیت اور اس فعل کے ساتھ کھولے گا جو اسے حلالی کر دیتا ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔  
**مسئلہ نمبر 9:** علماء کے درمیان اس میں اختلاف نہیں کہ احصار (روکنا) حج اور عمرہ میں عام ہے۔ ابن سیرین نے کہا: عمرہ میں احصار نہیں ہے کیونکہ اس کا وقت متعین نہیں ہے۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اگرچہ یہ متعین وقت میں نہیں ہے لیکن عذر کے ختم ہونے تک صبر کرنا ضرر (نقصان) ہے۔ اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ حضرت ابن زبیر سے حکایت ہے کہ جس کو دشمن یا مرض نے روک لیا ہو تو اس کا طواف کے بغیر احرام کھولنا جائز نہیں اور یہ حدیبیہ کے سال والی خبر جو نص ہے اس کے مخالف ہے۔

**مسئلہ نمبر 10:** رکاوٹ یا تو کافر کی طرف سے ہوگی یا مسلمان کی طرف سے ہوگی۔ اگر کافر کی طرف سے ہو تو قتال جائز نہیں اگرچہ اس پر غالب آنے کا وثوق بھی ہو اور وہ وہاں حلالی ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ التَّسْجِدَ الْحَرَامَ (البقرہ: 191) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اگر تاوان کا سوال کرے تو دینا جائز نہیں کیونکہ یہ اسلام میں کمزوری ہے اگر مسلمان نے روکا ہو تو اس سے بھی کسی حال میں قتال جائز نہیں اور احرام کھول دینا واجب ہے اگر وہ کوئی چیز طلب کرے اور راستے چھوڑ دے تو اس کو وہ چیز دینا جائز ہے اور قتال جائز نہیں کیونکہ اس میں روح کا اتلاف ہے اور عبادت کی ادائیگی میں یہ لازم نہیں کیونکہ دین آسان ہے اور رہا اس کو تاوان دینا تو اس میں دو نقصانوں میں سے آسان کا قبول کرنا ہے کیونکہ حج میں مال کو خرچ کیا جاتا ہے پس یہ اس کے خرچ میں سے ہٹا ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 11:** روکنے والے دشمن کی دو صورتیں ہیں یا تو اس کے احصار کے بقا اور ہمیشہ ہونے کا یقین ہوگا کیونکہ اس کو قوت اور کثرت حاصل ہے یا ایسا نہیں ہوگا۔ اگر پہلی صورت ہو تو محصر اسی وقت اس کی جگہ احرام کھول دے اور اگر دوسری صورت ہو اور اس احصار کے زوال کی امید ہو تو وہ محصور نہ ہوگا حتیٰ کہ اس کے اور حج کے درمیان اتنا وقت پایا جائے کہ اسے معلوم ہو جائے کہ اب اگر دشمن چلا بھی گیا تو وہ حج کو نہیں پاسکے گا۔ اس وقت ابن قاسم اور ابن ماجشون کے نزدیک احرام کھول دے۔ اشہب نے کہا: دشمن کی وجہ سے حج سے روکا جانے والا شخص احرام نہ کھولے حتیٰ کہ دسویں کا دن آجائے اور تلبیہ کو ختم نہ کرے حتیٰ کہ لوگ عرفہ کی طرف چلے جائیں۔ ابن قاسم کے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ دشمن کی غلبہ کی وجہ سے اس کے حج کی تکمیل سے مایوسی کا وقت ہے۔ پس اس وقت اس کا احرام کھولنا جائز ہے۔ اس کی اصل عرفہ کا دن ہے اور اشہب کے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس پر ممکن حد تک احرام کے حکم میں رہنا ہے اور اس کا دسویں کے دن تک التزام کرنا ہے اور حاجی کے لئے یہی وہ وقت ہے جس میں احرام کھولنا جائز ہے۔ پس اس پر دسویں کے دن احرام کھولنا جائز ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَمَّا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ، مَأْكُلٍ رَفْعٍ میں ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: فالواجب او فعليكم ما استيسر۔ اور محل نصب میں ہونے کا بھی احتمال ہے یعنی فانحدوا او فاهدوا، ما استيسر سے مراد جمہور اہل علم کے نزدیک بکری ہے۔ حضرت ابن عمر، حضرت عائشہ، حضرت ابن زبیر نے فرمایا: وہ اونٹ اور گائے ہے اس کے علاوہ نہیں (1)۔

حسن نے کہا: اعلیٰ ہدی اونٹ ہے، درمیانی گائے ہے اور کم از کم بکری ہے (1)۔ اس میں امام مالک کے نظریہ کی دلیل ہے: جس کو دشمن نے روکا ہو اس پر قضا واجب نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**۔ اس میں قضا کا ذکر نہیں۔

**مسئلہ نمبر 12:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مِنَ الْهَدْيِ**، الہدیٰ اور الہدیٰ دونوں لغتیں ہیں جو بیت اللہ کی طرف بھیجا جاتا ہے خواہ اونٹ ہو یا کوئی اور جانور، عرب کہتے ہیں: کم ہدی بنی فلاں، بنو فلاں کے کتنے اونٹ ہیں۔ ابو بکر نے کہا: اس کو ہدی اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ ان میں سے بعض بیت اللہ کی طرف بھیجی جاتی ہیں۔ پس جو حکم بعض کو لاحق ہوتا ہے اس کے ساتھ تمام کا نام رکھ دیا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ** (النساء: 25)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ لونڈیاں زنا کریں تو ان میں سے لونڈی پر جب وہ زنا کرے تو آزاد کنواری عورت کی سزا کا نصف ہے جب آزاد کنواری عورت زنا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے المحصنات کا لفظ ذکر فرمایا۔ مراد کنواں عورتیں ہیں کیونکہ احسان ان میں سے اکثر میں ہوتا ہے۔ پس انہیں ایسے امر کے ساتھ ذکر کیا گیا جو ان میں سے بعض میں پایا جاتا ہے آزاد عورتوں میں سے محصنہ اسے کہا جاتا ہے جو خاوند والی ہو اس پر رجم واجب ہوتا ہے جب وہ بدکاری کرے اور رجم نصف نہیں ہوتا کہ وہ لونڈی پر نصف ہو۔ پس اس سے ظاہر ہوا کہ المحصنات سے مراد یہاں کنواری عورتیں ہیں نہ کہ خاوند والیاں۔ فراء نے کہا: اہل حجاز اور بنو اسد ہدی کو تخفیف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ فرمایا: تمیم اور سفلی قیس شد کے ساتھ ہدی پڑھتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

حلفت برب مكة والمصلیٰ و اعناق الہدی مقلدات  
میں نے مکہ، مصلیٰ اور ہار پہنائی گئی ہدیوں کے گردنوں کے مالک کی قسم اٹھائی۔

فرمایا: الہدی کا واحد ہدیہ اور الہدی کی جمع میں اهداء بھی کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تَخْلُقُوا مَرْءًا وَلَا نِسَاءً حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ**

اس میں سات مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تَخْلُقُوا مَرْءًا وَلَا نِسَاءً حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ** یہ خطاب تمام امت کو ہے خواہ محصر ہو یا محصر نہ ہو۔ علماء میں بعض یہ محصرین کے لئے خاص کرتے ہیں یعنی احرام نہ کھولیں حتیٰ کہ ہدی کو نحر کر دیا جائے۔ محل وہ جگہ ہے جس میں ذبح حلال ہوتی ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک دشمن کی وجہ سے روکے گئے شخص کے لئے محل احصار کی جگہ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء اس میں ہے کہ حدیبیہ کے زمانہ میں آپ جہاں محصور ہوئے وہاں ہی احرام کھول دیا اور ہدی کو نحر کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَالْهَدْيُ مَعْلُوفًا أَنْ يَبْلُغَ مَحِلَّهُ** (الفتح: 25) بعض علماء نے معکوف کا معنی محبوساً فرمایا جب بیت اللہ تک پہنچنے سے روکی گئی ہو۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک احصار میں ہدی کا محل حرم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لَكُمْ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْحَرَامِ** (الحج) اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا مخاطب وہ امن والا شخص ہے جو بیت اللہ تک

پہنچ پاتا ہے۔ رہا محصر (روکا گیا) وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے خارج ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ نے حدیبیہ میں اپنی ہدیٰ نحر کی تھیں اور حدیبیہ حرم سے نہیں ہے اور دوسری دلیل احناف کی حضرت ناجیہ بن جندب کی حدیث ہے، اس نے نبی کریم ﷺ سے کہا: حضور! آپ میرے ساتھ ہدیٰ بھیجیں میں اسے حرم میں نحر کروں گا۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا: تو اسے کیسے لے جائے گا؟ (1) اس نے کہا: میں اسے وادیوں سے لے جاؤں گا مشرک اس پر قادر نہیں ہوں گے میں اسے لے جاؤں گا حتیٰ کہ میں اسے حرم میں نحر کروں گا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے جہاں احرام کھولے وہاں ہی نحر کر دے، نبی کریم ﷺ کے حدیبیہ کے مقام پر فعل کی اقتدا کرتے ہوئے۔ یہ صحیح ہے اس کو ائمہ نے روایت کیا ہے، نیز ہدیٰ، مہدی (بھیجنے والے) کے تابع ہے۔ جب بھیجنے والا اپنے احصار کی جگہ احرام کھول دے گا تو ہدیٰ بھی اس کے ساتھ نحر کر دی جائے گی۔

**مسئلہ نمبر 2:** محصر (روکا گیا) کے بارے میں ہم نے جو ثابت کیا ہے اس میں اختلاف ہے کہ کیا اس کو حلق کرنا جائز ہے یا مقام حل جیسا کوئی عمل کرنا جائز ہے اس سے پہلے کہ اس نے میسر (ہدیٰ) ذبح نہ کی ہو۔ امام مالک نے فرمایا: سنت ثابتہ جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے کہ کسی کے لئے اپنے بال کاٹنا جائز نہیں حتیٰ کہ اپنی ہدیٰ کو نحر کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَخْلُقُوا مَرْءًا وَلَا نِسَاءً وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحَلَّهُ ۚ اِمَام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: جب محصر، ہدیٰ نحر کرنے سے پہلے احرام کھول دے گا تو اس پر بکری ہوگی اور وہ احرام میں ہوگا جیسا پہلے تھا حتیٰ کہ ہدیٰ کو نحر کر دے۔ اور اگر اس نے شکار کیا ہدیٰ نحر کرنے سے پہلے تو اس پر جزا ہوگی۔ اس میں امیر اور غریب برابر ہیں۔ وہ کبھی احرام نہیں کھولے گا حتیٰ کہ وہ ہدیٰ کو ذبح کر دے یا اس کی طرف سے ذبح کر دیا جائے۔ علماء احناف نے فرمایا: کم از کم ہدیٰ بکری ہے جو نہ اندھی ہو، نہ اس کے کان کاٹے ہوئے ہوں اور ان کے نزدیک روزہ کا یہ مقام نہیں ہے۔ ابو عمر نے کہا: کوفیوں کے قول میں ضعف اور تناقض ہے کیونکہ وہ دشمن سے روکے گئے شخص کے لئے اور مرض سے روکے گئے شخص کے لئے احرام کھولنا جائز قرار نہیں دیتے حتیٰ کہ حرم میں اس کی ہدیٰ نحر کر دی جائے۔ اور جب وہ مرض کی وجہ سے محصر کے لئے جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ ہدیٰ کا بھیجنے والا اور جس کے ساتھ ہدیٰ بھیجی گئی ہے اس سے متعین دن کا وعدہ لے جس میں وہ اس کی ہدیٰ نحر کرے گا۔ پس اس دن کے بعد وہ احرام کھول دے اور حلق کرادے۔ پس انہوں نے اس کے لئے احرام کھولنا جائز قرار دیا جبکہ ہدیٰ کے نحر ہونے اور اس کے حرم میں پہنچنے کا یقین نہیں ہے اور انہوں نے غالب گمان کے ساتھ احرام کھولنے پر اس کو محمول کیا جبکہ علماء کا اتفاق ہے کہ جس پر فرائض لازم ہوں اس کے لئے ان سے گمان کے ساتھ نکلنا جائز نہیں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ ان کے قول کا گمان ہے کہ اگر وہ ہدیٰ ہلاک ہو جائے یا گم ہو جائے یا چوری ہو جائے ادھر اس کا بھیجنے والا احرام کھول چکا ہے۔ اپنی ازواج سے حقوق زوجیت ادا کر چکا ہے یا شکار کر چکا ہے تو وہ احرام میں ہوگا اور جو اس نے شکار کیا اس پر اس کی جزا ہوگی۔ پس انہوں نے اس کے لئے حج کے فساد کو مباح کیا اور اس پر وہ لازم کیا جو احرام نہ کھولنے والے شخص پر لازم ہوتا ہے۔ اس میں تناقض اور مذاہب

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب نہاسة الدمر و کیفیۃ غسلہ، ص 140، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)



کا ضعف ہے اس میں کوئی خفا نہیں۔ احناف نے اپنے مذہب کی بنیاد حضرت ابن مسعود کے قول پر رکھی اور انہوں نے اس کے خلاف میں نظر نہیں کی۔ امام شافعی نے فرمایا: جب محصر ہدی سے عاجز ہو تو اس میں دو قول ہیں۔ وہ کبھی احرام نہیں کھولے گا مگر ہدی دینے کے ساتھ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اسے حکم دیا گیا ہے کہ جس پر وہ قادر ہے وہ ادا کرے۔ اگر وہ کسی چیز پر قادر نہیں تو جب وہ قادر ہو ادا کرے۔ امام شافعی نے فرمایا: جس نے یہ کہا ہے اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اپنی جگہ احرام کھول دے اور جب قادر ہو ہدی ذبح کرے۔ اگر وہ مکہ میں ذبح پر قادر ہو تو اس کے لئے مکہ میں ہی ذبح کرنا ضروری ہے اگر مکہ میں ذبح کرنے پر قادر نہ ہو تو جہاں قادر ہو ذبح کر دے اور فرمایا: کہا جاتا ہے اس میں جائز نہیں مگر ہدی اور کہا جاتا ہے: جب ہدی نہ پائے تو اس پر کھانا کھلانا یا روزے ہوں گے۔ اگر وہ ان تینوں میں سے کوئی بھی نہ پائے تو ان میں سے ایک ادا کرے جب قادر ہو۔ غلام کے بارے میں فرمایا: اس کے لئے صرف روزہ جائز ہے پہلے اس کے لئے بکری کی قیمت دراہم میں لگائی جائے گی پھر دراہم کا کھانا بنایا جائے گا پھر کھانے کے ہر مد کے بدلے میں ایک دن روزہ رکھے گا۔

**مسئلہ نمبر 3:** اس میں اختلاف ہے جب محصر اپنی ہدی کو نحر کرے کیا اس کے لئے حلق کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ ایک گروہ نے کہا: اس پر سر کا حلق کرنا واجب نہیں کیونکہ اس سے عبادت ختم ہو چکی ہے اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ جب احصار کی وجہ سے باقی تمام مناسک ساقط ہو چکے ہیں مثلاً طواف، سعی وغیرہ..... حالانکہ ان کے ساتھ حاجی احرام سے حلالی ہوتا ہے..... تو اس سے وہ تمام احکام ساقط ہو گئے جن کے ساتھ حاجی احرام سے حلالی ہوتا ہے کیونکہ وہ محصر ہو گیا ہے۔ اور جنہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے ان میں امام ابو حنیفہ اور امام محمد بن حسن ہیں۔ انہوں نے فرمایا: محصر پر نہ بال کٹوانا ہے نہ حلق کرنا ہے۔ امام ابو یوسف نے کہا: محصر حلق کرا لے اور حلق نہیں کرائے گا تو اس پر کوئی چیز واجب بھی نہ ہوگی اور ابن ابی عمران نے ابن سماعہ سے اور انہوں نے امام ابو یوسف سے ان کی ”نوادر“ میں روایت کیا ہے کہ اس پر حلق کرنا لازم ہے اور بال کٹوانے کے بغیر تو کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ امام شافعی کے اس مسئلہ میں دو مختلف اقوال ہیں: (۱) محصر کے لئے حلق کرنا عبادت سے ہے۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ عبادت میں سے نہیں ہے جیسا کہ امام ابو حنیفہ نے کہا ہے۔ امام مالک کی حجت یہ ہے کہ طواف، صفا و مردہ کے درمیان سعی وغیرہ سے محصر کو روکا گیا ہے۔ پس جن چیزوں سے اسے روکا گیا ہے وہ تو ساقط ہو جائیں گی لیکن حلق کرنا، اس کے کرنے میں تو کوئی حائل نہیں کہ وہ اس کے کرنے پر قادر ہے اور جس کے کرنے پر وہ قادر ہے وہ اس سے ساقط نہیں اور اس پر دلیل کہ محصر پر حلق کرنا باقی ہوتا ہے جس طرح بیت اللہ تک پہنچنے والے پر باقی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَخْلُقُوا سُحُورًا وَسَلَامًا حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحَلَّهُ۔ اور وہ حدیث ہے جو ائمہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے محلقین (حلق کرنے والوں) کے لئے تین مرتبہ اور قصر کرانے والوں کے لئے ایک مرتبہ دعا فرمائی تھی۔ یہ قطعی حجت ہے اور اس مسئلہ میں نظر صحیح ہے۔ یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کا مسلک ہے۔ ان کے نزدیک وہ حاجی جس نے حج کو مکمل کیا اور جس کا حج فوت ہوا، دشمن کے ذریعے روکا گیا اور مرض کے ذریعے روکا گیا تمام پر حلق کرنا عبادت ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** ائمہ نے روایت کیا ہے کہ امام مالک کے یہ الفاظ ہیں۔ نافع نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی: اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! قصر کرانے والوں کے لئے بھی دعا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے عرض کی: اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! قصر کرانے والوں کے لئے دعا فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے عرض کی: یا اللہ! مقصرین پر رحم فرما (1)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کا حلق کرانے والوں کے لئے تین مرتبہ دعا کرنا اور قصر کرانے والوں کے لئے ایک مرتبہ دعا کرنا دلیل ہے کہ حج اور عمرہ میں حلق کرانا، قصر کرانے سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَلَا تَخْلِقُوا أَرْهَافًا وَسَكْمًا کا مقتضا بھی یہی ہے ولا تقصروا انہیں فرمایا اور اہل علم کا اجماع ہے کہ قصر کرانا مردوں کے لئے جائز ہے مگر ایک چیز حسن بصری سے ذکر کی گئی ہے کہ وہ پہلا حج جو انسان کرتا ہے اس میں حلق کو واجب قرار دیتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 5:** عورتیں حلق میں داخل نہیں ہیں ان کے لئے سنت قصر کرانا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: عورتوں پر حلق نہیں ہے ان پر صرف قصر کرانا ہے (2)۔ اس روایت کو ابو داؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اہل علم کا اس قول پر اجماع ہے۔ ایک جماعت کی رائے ہے کہ عورت کا اپنے سر کا حلق کرانا مشلہ ہے اور عورت بالوں کو کتنا کٹوائے اس مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عمر، امام شافعی، امام احمد، اسحاق کہتے ہیں: وہ ہر مینڈھی سے پورے کی مثل کاٹے۔ عطا نے کہا: بند تین انگلیوں کی مقدار کاٹے۔ قتادہ نے کہا: تہائی یا چوتھائی کی مقدار کاٹے۔ حفصہ بن سیرین نے بوڑھی عورت اور جوان عورت کے درمیان فرق کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں: بوڑھی عورت چوتھائی بال کاٹ دے اور جوان عورت کے لئے انگلی کے پورے کے ساتھ اشارہ کیا وہ تھوڑے تھوڑے کاٹ لے۔ مالک نے فرمایا: پورے سر کے بالوں کو تھوڑا تھوڑا کاٹے جتنا وہ کاٹ لے گی وہ کافی ہوگا۔ امام مالک کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ بعض بالوں کو کاٹے اور بعض کو چھوڑ دے۔ ابن منذر نے کہا: جس پر کاٹنے کے اسم کا اطلاق ہو وہ جائز ہوگا۔ احوط یہ ہے کہ انگلی کے پورے کی مقدار تمام بال کاٹے۔

**مسئلہ نمبر 6:** کسی کے لئے سر کا حلق کرانا جائز نہیں حتیٰ کہ اپنی ہڈی کو نخر کر لے۔ یہ اس لئے ہے کہ ذبح کی سنت حلق سے پہلے ہے۔ اس میں اصل یہ ارشاد ہے: وَلَا تَخْلِقُوا أَرْهَافًا وَسَكْمًا حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے کہا تھا پہلے آپ نے نخر کیا تھا پھر حلق کرایا تھا جس نے اس کی مخالفت کی حلق پہلے کرایا نخر بعد میں کیا اس نے یہ خطا اور جہالت کی وجہ سے کیا ہوگا یا جان بوجھ کر کیا ہوگا۔ اگر پہلی صورت ہوگی تو اس پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ یہ ابن حبیب نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے اور یہ امام مالک کا مشہور مذہب ہے۔ ابن ماجشون نے کہا: اس پر ہدی ہے، یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ اگر دوسری صورت میں ہو تو قاضی ابوالحسن نے روایت کیا ہے کہ نخر پر حلق کو مقدم کرنا جائز نہیں۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ ظاہر مذہب منع ہے اور صحیح جواز ہے کیونکہ حضرت ابن عباس کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ذبح، حلق، ری، نقدیم و

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج باب الحلق والتقصير عند الاحلال، ص 233، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحج، باب الحلق والتقصير، ص 272، جلد 1 (وزارت تعلیم)

تاخیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے حلق کرانے سے پہلے ذبح کیا یا ذبح کرنے سے پہلے حلق کرایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں (2)۔

**مسئلہ نمبر 7:** اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حج میں سر کا حلق کرانا عبادت اور مطلوب ہے اور حج کے علاوہ جائز ہے لیکن بعض علماء نے فرمایا: سر کا حلق کرانا مثلاً ہے، اگر یہ مثلاً ہوتا تو حج اور غیر حج میں جائز نہ ہوتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مثلاً سے منع فرمایا ہے (3)۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جعفر کی شہادت کی خبر آنے کے تین دن بعد ان کے بچوں کا حلق کرایا۔ اگر حلق جائز نہ ہوتا تو آپ ﷺ ان کا حلق نہ کرواتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے سر کا حلق کراتے تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا: علماء کا بالوں کے رکھنے اور حلق کی اباحت پر اجماع ہے یہی حجت کافی ہے۔ وبالله التوفیق

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفُذِيَّةٌ مِنْ صِيَامِهِ أَوْ صَدَقَةٌ أَوْ نُسْلٌ** اس میں نو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا** اس آیت سے بعض شوافع نے استدلال کیا ہے کہ پہلی آیت میں محصر سے مراد دشمن سے روکا گیا ہے نہ مرض سے روکا گیا ہے۔ یہ لازم نہیں ہوتا کیونکہ **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا** **أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ** کا معنی ہے، جو مریض ہو یا اس کے سر میں اذیت ہو پھر حلق کرادے **فُذِيَّةٌ** تو اس پر فدیہ ہے۔ جب یہ بلا اختلاف مرض کے بارے میں وارد ہے تو ظاہر یہ ہے کہ آیت کا آغاز بھی اسی کے متعلق وارد ہے جس کے بارے میں اس کا وسط اور اس کا آخر وارد ہے۔ کیونکہ کلام کا بعض، بعض کے ساتھ جزا ہوا ہوتا ہے اور بعض، بعض کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور آخر آیت میں اضمار کو آیت کے ابتدائی مخاطب کی طرف لوٹانا ہوتا ہے۔ پس ظاہر پر محمول کرنا واجب ہوتا ہے حتیٰ کہ ظاہر سے پھیرنے کی دلیل موجود ہو۔ اور ہمارے کلام پر دلیل اس آیت کے نزول کا سبب بھی ہے۔ ائمہ نے روایت کی ہے اور یہ دارقطنی کے الفاظ میں حضرت کعب بن عجرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھا جبکہ جوئیں اس کے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا یہ جوئیں تجھے تکلیف دیتی ہیں؟ کعب نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے کعب کو حلق کرانے کا حکم دیا جبکہ آپ حدیبیہ میں تھے۔ اور صحابہ کے لئے واضح نہیں ہوا تھا کہ وہ یہاں احرام کھول دیں گے وہ ابھی مکہ میں داخل ہونے کی امید پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فدیہ کو نازل فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ وہ چھ مساکین کو ایک فرق کھانا کھلائیں یا ایک بکری ہدی دیں یا تین دن روزے رکھیں۔ اس حدیث کو بخاری نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ یہ قول کہ (صحابہ کے لئے واضح نہ تھا کہ وہ یہاں احرام کھول دیں گے) (4) دلیل ہے کہ صحابہ کو دشمن کے روکنے کا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز تقدیم الذبح علی الرمي والحلق، صفحہ 422، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النماز، من قدم نسکا قبل نسك، صفحہ 225 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، کتاب النماز، صفحہ 336، جلد 1 (وزارت تعلیم) 4۔ ایضاً، کتاب المغازی، فی غزوة حدیبیہ، صفحہ 599، جلد 2 (وزارت تعلیم)



یقین نہ تھا۔ پس فدیہ کا موجب اذیت اور مرض کی وجہ سے حلق کرانا ہے۔ (واللہ اعلم)

**مسئلہ نمبر 2:** امام اوزاعی نے اس محرم کے بارے فرمایا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو، وہ حلق کرانے سے پہلے فدیہ کے ساتھ کفارہ دے دے تو یہ اس کے لئے جائز ہے۔

میں کہتا ہوں: پھر اس صورت میں فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّنْ رَّأْسِهِ فَفَدِيَّةٌ مِّنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُلٍ کا معنی ہوگا جب وہ حلق کرانے کا ارادہ کرے، جو قادر تھا اور حلق کرایا تو اس پر فدیہ ہے وہ فدیہ نہ دے حتیٰ کہ حلق کرا دے۔ (واللہ اعلم)

**مسئلہ نمبر 3:** ابن عبدالبر نے کہا: اس حدیث میں نُسُل سے مراد بکری ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن روزے اور کھانا کھلانے میں اختلاف ہے۔ جمہور فقہاء کا خیال ہے کہ روزے تین ہیں اور حضرت کعب بن عجرہ کی حدیث سے یہ صحیح محفوظ ہے۔ حضرات حسن، عکرمہ اور نافع سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: اذی کے فدیہ میں دس روزے ہیں اور دس مساکین کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ فقہاء امصار اور ائمہ حدیث میں سے کسی کا قول نہیں ہے اور ابو زبیر کی روایت میں مجاہد عن عبدالرحمن عن کعب بن عجرہ کے سلسلہ سے مروی ہے، کعب نے بیان فرمایا کہ اس نے ذی القعدہ میں احرام باندھا ان کے سر میں جوئیں تھیں۔ نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لے آئے وہ اپنی ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: گویا تجھے تیرے سر کی جوئیں تکلیف دے رہی ہیں۔ حضرت کعب نے کہا: جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: حلق کرا لو اور ہدی دے دو۔ حضرت کعب نے عرض کی: میں ہدی نہیں پاتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: چھ دن روزہ رکھو (1)۔ حضرت ابو عمر نے کہا: اس حدیث کا ظاہر ترتیب پر ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو پھر اس کا معنی ہوتا کہ پہلا پھر دوسرا اختیار کرو جبکہ عام آثار جو حضرت کعب بن عجرہ سے مروی ہے وہ لفظ تخیید (اختیار) کے ساتھ وارد ہیں اور یہ نص قرآنی ہے اسی پر علماء کا فتویٰ اور عمل ہے۔ (بالحمد للہ التوفیق)

**مسئلہ نمبر 4:** علماء کا اذیت کے فدیہ میں جو کھانے کا ذکر ہے اس میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اس میں کھانا دو مد ہیں جو نبی کریم ﷺ کے مد کے حساب سے ہوں۔ یہ ابو ثور اور داؤد کا قول ہے۔ ثوری سے مروی ہے، فرمایا: یہ گندم سے نصف صاع (۲ کلو) اور کھجور، جو اور کشمش سے ایک صاع ہے۔ امام ابو حنیفہ سے بھی اسی کی مثل مروی ہے۔ اس نے نصف صاع گندم کو کھجور کے ایک صاع کے برابر بنایا ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ حضرت کعب کی بعض اخبار میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا: تو کھجور کے تین صاع چھ مساکین پر صدقہ کر (2)۔ امام احمد بن حنبل نے بھی تو اسی طرح کہا جس طرح امام مالک اور امام شافعی نے کہا ہے اور کبھی کہا: اگر وہ گندم کھلانا چاہے تو ہر مسکین کو ایک مد دے اگر کھجور کھلانا چاہے تو نصف صاع دے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، فمن كان منكم مريضاً، ص 244، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ ایضاً، کتاب الحج، جواز حلق الرأس للمعمر، ص 382، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

**مسئلہ نمبر 5:** مساکین کو اذیت کے کفارہ میں صبح و شام کا کھانا کھلانا جائز نہیں حتیٰ کہ ہر مسکین کو نبی کریم ﷺ کے مد کے مطابق دو مد دے۔ یہ امام مالک، ثوری، امام شافعی اور امام محمد بن حسن کا قول ہے۔ امام ابو یوسف نے کہا: صبح و شام کا کھانا کھلانا جائز ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اہل علم کا اجماع ہے کہ محرم کے لئے بالوں کا حلق کرنا، انہیں کاٹنا، توڑنا اور انہیں تلف کرنا جائز نہیں خواہ وہ نورہ یا کسی اور چیز کے ساتھ ہو مگر بیماری کی حالت میں جیسا کہ قرآن میں نص موجود ہے اور جس نے احرام کی حالت میں بغیر کسی بیماری کے حلق کرایا تو اس پر فدیہ واجب ہے۔ اور اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے بغیر عذر کے حلق کرایا، سلا ہوا لباس پہنایا خوشبو لگائی۔ امام مالک نے فرمایا: اس نے برا کیا ہے اور اس پر فدیہ ہے اسے اس میں اختیار ہے اور امام مالک کے نزدیک اس میں عہد، خطا، ضرورت اور عدم ضرورت برابر ہیں۔ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور اس کے اصحاب اور ابو ثور نے کہا: اسے اختیار نہیں مگر ضرورت میں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّنْ رَّأْسِهِ** اور جس نے جان بوجھ کر حلق کرایا یا بغیر عذر کے جان بوجھ کر لباس پہنا تو اسے اختیار نہیں ہے اس پر صرف بکری واجب ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** جس نے بھول کر ایسا کیا اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جان بوجھ کر اور بھول کر یہ عمل کرنے والا فدیہ کے، جو میں برابر ہیں۔ یہ امام ابو حنیفہ، ثوری اور لیث کا قول ہے۔ امام شافعی کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں: (1) اس پر فدیہ نہیں ہے۔ یہ داؤد اور اسحاق کا قول ہے۔ دوسرا اس پر فدیہ ہے۔ اکثر علماء محرم پر لباس پہننے، سر ڈھانپنے یا بعض سر ڈھانپنے، خفین (موزے) پہننے، ناخن کاٹنے، خوشبو لگانے، اذیت کو دور کرنے کی صورت میں فدیہ کو واجب کرتے ہیں۔ اسی طرح جب اپنے جسم کے بالوں کا حلق کیا یا تیل لگایا یا پھپھنے لگوانے کی جگہ کا حلق کیا تو یہی حکم ہے۔ عورت اس مسئلہ میں مرد کی طرح ہے۔ اس پر سرمہ لگانے میں فدیہ ہے اگرچہ اس میں خوشبو نہ بھی ہو اور مرد کے لئے سرمہ لگانا جائز ہے جبکہ اس میں خوشبو نہ ہو اور عورت پر فدیہ ہے جو وہ اپنے چہرے کو ڈھانپنے یا دستانے پہنے۔ اس میں یہ عمل جان بوجھ کر کرنا، بھول کر کرنا اور جہالت کی وجہ سے کرنا برابر ہے۔ بعض علماء ہر چیز میں دم (بکری) واجب کرتے ہیں۔ داؤد نے کہا: جسم کے بال مونڈنے میں مرد، عورت پر کچھ نہیں ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** علماء کا مذکورہ فدیہ دینے کی جگہ میں بھی اختلاف ہے۔ عطا نے کہا: جو دم (بکری) ہو گا وہ مکہ میں دیا جائے گا اور جو کھانا یا روزہ ہو گا وہ جہاں چاہے دے سکتا ہے۔ اسی طرح اصحاب رائے نے کہا ہے: حسن سے مروی ہے کہ بکری، مکہ میں دی جائے گی۔ طاؤس اور امام شافعی نے کہا: کھانا اور بکری دونوں مکہ میں ہی دیے جائیں گے روزہ جہاں چاہے رکھ سکتا ہے کیونکہ روزہ میں اہل حرم کی کوئی منفعت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **هَذِهِ يَابِلَةُ الْكَعْبَةِ** (المائدہ: 95) یہ بیت اللہ کے پڑوس میں رہنے والے مساکین پر شفقت کے لئے فرمایا ہے کھانا کھلانے میں بھی منفعت ہے جبکہ روزہ میں کوئی اہل حرم کی منفعت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

امام مالک نے فرمایا: یہ عمل جہاں چاہے کرے اور یہ صحیح قول ہے اور یہ مجاہد کا قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک یہاں ذبح

سے نسک مراد ہے اور نص قرآن و سنت کی وجہ سے یہ ہدی نہیں ہے اور نسک جہاں چاہے ادا ہو سکتی ہے اور ہدی صرف مکہ میں ہوتی ہے۔ امام مالک کی حجت وہ روایت ہے جو انہوں نے اپنے مؤطا میں حضرت یحییٰ بن سعید سے روایت کی ہے اس میں ہے حضرت علی بن ابی طالب نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر کا حلق کرنے کا حکم دیا (آپ بیمار تھے) پھر ان کی طرف سے سقیا کے مقام پر نسک دیا ان کی طرف سے اونٹ نخر کیا۔ مالک نے فرمایا: یحییٰ بن سعید نے فرمایا: حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ کی طرف سفر میں نکلے۔ اس حدیث میں واضح دلیل ہے کہ اذیت کا فدیہ مکہ کے علاوہ کسی جگہ دینا بھی جائز ہے اور مالک کے نزدیک ہدی میں جائز ہے کہ وہ حرم میں نخر کی گئی ہو تو وہ اہل حرم کے علاوہ لوگوں کو بھی دے سکتا ہے کیونکہ اس میں مقصود مسلمان مساکین کو کھانا کھلانا ہے۔ مالک نے فرمایا: جب روزہ حرم کے علاوہ کسی جگہ رکھنا جائز ہے تو اہل حرم کے علاوہ لوگوں کو کھانا کھلانا بھی جائز ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد **فَوَيْدِيَّةٌ مِّنْ حَيْثُ مَا يَأْكُلُ** اذ صدقۃ اذ نسک مطلق ہے اس میں کسی جگہ کی قید نہیں ہے پس ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں بھی فدیہ ادا کرے گا جائز ہوگا۔ امام مالک نے فرمایا **اَوْ نُسْكَ** جو ذبح کیا جاتا ہے اسے نسک کہا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا یہی نام رکھا ہے اس کو آپ نے ہدی نہیں فرمایا اور ہم پر اس کو ہدی پر قیاس کر کے ہدی کے حکم کی طرف لوٹنا لازم نہیں ہے اور ہم ہدی کا اعتبار نہیں کرتے جو اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کعب کوفہ یہ کا حکم فرمایا تھا تو وہ حرم میں نہیں تھے۔ پس یہ سب کچھ حرم سے باہر بھی جائز ہے۔ امام شافعی سے اس کی مثل ایک بعید وجہ کے اعتبار سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَوْ نُسْكَ**، **نُسْكَ** کا اصل معنی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَمَّا نَا** **مَنَّا سِغْنًا** (البقرہ: 128) یعنی ہمیں اپنی عبادت کی جگہیں دکھا۔ بعض نے فرمایا: لغت میں **نُسْكَ** کا معنی غسل کرنا ہے۔ اسی سے ہے: **نَسَكَ** توبہ، یعنی اس نے اپنے کپڑے کو دھویا گویا عبادت کرنے والا اپنے نفس کو عبادت کے ذریعے گناہوں سے دھوتا ہے۔ بعض نے فرمایا: **النسک** کا معنی چاندی کی پگھلی ہوئی ڈلی ہے، اس کی ہر ڈلی کو نسیکہ کہا جاتا ہے۔ گویا عباد اپنے نفس کو گناہوں کی میل اور کھوٹ سے پاک کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِذَا آوَيْتُمُ** **فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْاَحْيَاءِ** **فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**

اس میں تیرہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِذَا آوَيْتُمُ** بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تم مرض سے ٹھیک ہو جاؤ۔

بعض نے فرمایا: روکنے والے دشمن کے خوف سے امن میں ہو جاؤ۔ یہ حضرت ابن عباس اور قتادہ کا قول ہے۔ یہ مفہوم الفاظ

کے زیادہ قریب ہے مگر مرض کا خوف خیال کیا جائے تو پھر مرض سے امن مراد ہوگا (1) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْاَحْيَاءِ** علماء کا اختلاف ہے کہ اس کا مخاطب کون ہے۔

حضرت عبد اللہ ابن زبیر، حضرت علقمہ اور حضرت ابراہیم نے فرمایا: اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جنہیں راستہ میں حج اور عمرہ



سے روک دیا گیا ہو وہ لوگ مراد نہیں ہیں جن کے لئے راستہ کھلا ہوا ہو۔ ابن زبیر کے نزدیک تمتع کی صورت یہ ہے کہ آدمی کو روک دیا گیا ہو حتیٰ کہ اس کا حج فوت ہو جائے پھر وہ بیت اللہ تک پہنچے اور عمرہ کر کے حلالی ہو جائے پھر آئندہ سال حج کو قضا کرے یہ عمرہ اور آئندہ حج تک کے درمیان میں تمتع ہوا اور دوسرے علماء کے نزدیک محصر تمتع وہ ہے جو روک دیا گیا ہو پھر بغیر عمرہ کئے احرام کھول دے اور اسے موخر کر دے حتیٰ کہ وہ آئندہ سال آئے حج کے مہینوں میں عمرہ کرے اور اسی سال پھر حج کرے۔ حضرت ابن عباس اور علماء کی جماعت کا قول ہے کہ آیت میں روکے گئے اور جن کے لئے راستہ کھلا ہے سب مراد ہیں (1)۔

**مسئلہ نمبر 3:** علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ تمتع جائز ہے جیسا کہ تفصیل آگے آئے گی اور حج افراد جائز ہے اور حج قرآن بھی جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے تمام صورتوں کو پسند فرمایا اور کسی صحابی کے حج پر اعتراض نہیں فرمایا بلکہ انہیں ہرج کی اجازت دی اور ان سے راضی ہوئے۔ علماء کا اختلاف اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کی کون سی صورت کا احرام باندھا تھا اور حج کی ان صورتوں میں افضل صورت کیا ہے؟ کیونکہ اس کے متعلق وارد احادیث مختلف ہیں، بعض علماء نے فرمایا: جن میں سے امام مالک بھی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حج مفرد کیا تھا اور حج افراد، حج قرآن سے افضل ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جو تم میں سے حج اور عمرہ کا احرام باندھنا چاہے وہ ایسا کرے اور جو صرف حج کا احرام باندھنا چاہے وہ حج کا احرام باندھ لے اور جو عمرہ کا احرام باندھنا چاہے وہ عمرہ کا احرام باندھ لے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے حج کا احرام باندھا اور آپ کے ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی احرام باندھا، اور بعض لوگوں نے عمرہ اور حج دونوں کا احرام باندھا، بعض نے صرف عمرہ کا احرام باندھا اور میں ان لوگوں میں سے تھی جنہوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ اس حدیث کو ایک جماعت نے هشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے حج کا احرام باندھا ہے (2)۔ یہ اختلاف کے مقام پر نص ہے یہ ان علماء کی حجت ہے جنہوں نے حج افراد کا قول کیا اور اس کو افضل فرمایا، امام محمد بن حسن نے امام مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب نبی کریم ﷺ سے دو مختلف احادیث مروی ہوں اور ہمیں خبر پہنچے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے ان میں سے ایک حدیث پر عمل کیا اور دوسری کو ترک کیا تو اس میں دلالت ہے کہ حق وہ ہے جس پر ان دونوں نے عمل کیا۔ اور ابو ثور نے افراد کو پسند کیا اور اسے حج تمتع اور حج قرآن پر فضیلت دی۔ یہ امام شافعی کا مشہور قول ہے اور دوسرے علماء نے حج تمتع کو پسند فرمایا۔ انہوں نے فرمایا: حج تمتع افضل ہے یہ حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت عبد اللہ بن زبیر کا مذہب ہے اور یہی امام احمد کا قول ہے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے دارقطنی نے کہا: امام شافعی نے کہا: میں نے افراد کو پسند کیا۔ تمتع بھی اچھا ہے ہم اسے ناپسند نہیں کرتے اور جنہوں نے حج تمتع کو فضیلت دی انہوں نے مسلم کی حضرت عمران بن حصین سے مروی حدیث سے حجت پکڑی ہے۔ انہوں نے فرمایا: تمتع کی آیت کتاب اللہ میں نازل ہوئی (یعنی حج تمتع کے بارے میں آیت) ہمیں رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا پھر کوئی آیت نازل نہ ہوئی جس نے معصۃ الحج

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، افراد الحج، صفحہ 388، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

1۔ البحر الوجیز، صفحہ 268، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

کی آیت کو منسوخ کر دیا ہو اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا حتیٰ کہ آپ کا وصال ہو گیا۔ پھر ایک شخص نے اپنی رائے سے کہا جو کہا (1)۔ ترمذی نے روایت کیا ہے کہ ہمیں قتیبہ بن سعید نے بتایا انہوں نے مالک بن انس سے انہوں نے ابن شہاب سے انہوں نے محمد بن عبد اللہ بن حارث بن نوفل سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے سعید بن ابی وقاص، ضحاک بن قیس سے معاویہ بن ابی سفیان کے حج کرنے کے سال سنا ان دونوں نے حج تمتع کا ذکر کیا۔ ضحاک بن قیس نے کہا: حج تمتع نہیں کرے گا مگر وہ جو اللہ کے حکم سے جاہل ہوگا۔ سعد نے کہا: اے میرے بھتیجے! تو نے میری بات کی۔ ضحاک نے کہا: حضرت عمر بن خطاب اس سے منع کرتے ہیں۔ حضرت سعد نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کیا تھا اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ حج تمتع کیا تھا (2)، یہ حدیث صحیح ہے۔ ابن اسحاق نے زہری اور انہوں نے سالم سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں حضرت ابن عمر کے ساتھ مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شامی شخص آپ کے پاس آیا اس نے حج تمتع کے بارے میں پوچھا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: خوبصورت عمل ہے۔ اس شخص نے کہا: تمہارا باپ اس سے منع کرتا ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: تجھ پر افسوس میرا باپ اس سے اگر منع کرتا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کیا تھا اور اس کا حکم بھی فرمایا تھا۔ میں اپنے باپ کے قول پر عمل کروں یا رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل کروں؟ تو مجھ سے اٹھ جا۔ اس روایت کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ یہ حدیث ابو یعلیٰ ترمذی نے صالح بن کیسان عن ابن شہاب عن سالم کے سلسلہ سے نقل کی ہے۔ لیث عن طاؤس عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان نے حج تمتع کیا تھا سب سے پہلے حج تمتع سے حضرت معاویہ نے منع کیا تھا۔ یہ حدیث حسن ہے۔ ابو عمر نے کہا: لیث کی یہ حدیث منکر ہے، لیث بن ابی سلیم ضعیف ہے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان سے مشہور ہے کہ وہ دونوں حج تمتع سے منع کرتے تھے اگرچہ اہل علم کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ وہ تمتع جس سے حضرت عمر نے منع کیا تھا اور جس پر مارا تھا وہ حج کو فسخ کر کے عمرہ کرنا ہے۔ رہا پہلے عمرہ کرنا اور پھر حج کرنا اس سے حضرت عمر منع نہیں کرتے تھے اور جنہوں نے حضرت عمر کے حج تمتع سے منع کرنے کو صحیح کہا ہے ان کا خیال ہے کہ آپ حج تمتع سے اس لئے منع فرماتے تھے تاکہ بیت اللہ میں لوگ سال میں دو یا زیادہ مرتبہ آئیں تاکہ موسم حج کے علاوہ بھی زائرین کی اس میں کثرت رہے۔ آپ نے اہل حرم پر رفق و مہربانی داخل کرنے کا ارادہ کیا تھا تاکہ حضرت ابراہیم کی دعا ثابت ہو جائے فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً قَوْمٍ الثَّانِي تَهْوِي إِلَيْهِمْ۔ (ابراہیم: 37)

دوسرے کئی علماء نے فرمایا: حضرت عمر نے حج تمتع سے اس لئے منع فرمایا تھا کیونکہ آپ نے دیکھا کہ لوگ آسانی اور رخصت کی وجہ سے حج تمتع کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ پس آپ کو حج افراد اور حج قرآن کے ضیاع کا اندیشہ ہوا جبکہ وہ دونوں حج بھی نبی کریم ﷺ کی سنت ہیں۔ امام احمد نے حج تمتع کے اختیار پر نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے ”اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں ہدی ساتھ نہ لے آتا اور میں حج کے احرام کو عمرہ بنا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز التمتع، صفحہ 403، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جاء في التمتع، صفحہ 101، جلد 1 (وزارت تعلیم)

دیتا (1)۔ اس حدیث کو ائمہ نے نقل کیا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: حج قرآن افضل ہے، ان میں امام ابوحنیفہ اور ثوری ہیں۔ یہی قول مزنی کا ہے۔ انہوں نے فرمایا: کیونکہ اس میں انسان دو فرض اکٹھے ادا کرنے والا ہوتا ہے۔ یہ اسحاق کا قول ہے، اسحاق نے کہا: رسول اللہ ﷺ حج قرآن کرنے والے تھے۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب کا قول بھی ہے اور حضرت علی نے حج قرآن کو پسند کیا ہے اور اس کو فضیلت دی ہے۔ انہوں نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو بخاری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، فرمایا: میں نے وادی عقیق میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ”اس رات میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا آیا اس نے کہا: اس مبارک وادی میں نماز پڑھو اور حج و عمرہ کرو (2)۔“ ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: لبیک بعمرہ وحجۃ۔ (3) یعنی آپ نے عمرہ اور حج کی نیت سے تلبیہ کہا۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے۔ ابو عمر نے کہا: ان شاء اللہ حج افراد افضل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ حج مفرد کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: حج افراد افضل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے حج افراد کے متعلق آثار زیادہ صحیح ہیں نیز حج افراد میں عمل زیادہ ہے پھر عمرہ دوسرا عمل ہے یہ سب طاعت ہیں اور جس میں عمل زیادہ ہو وہ افضل ہوتا ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: حج افراد کرنے والے کو تمتع سے زیادہ تھکاوٹ ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے احرام پر باقی رہتا ہے۔ اس لئے اس میں ثواب زیادہ ہے اور احادیث کے اتفاق کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حج تمتع اور قرآن کا حکم دیا تو یہ کہنا جائز ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع اور قرآن کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ (زخرف: 51)۔

حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا: ہم نے رجم کیا اور رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا حالانکہ آپ ﷺ نے رجم کا حکم فرمایا تھا۔ میں کہتا ہوں: آپ ﷺ کے حج میں ظاہر حج قرآن ہے آپ قرآن کرنے والے تھے اس کی وجہ حضرت عمر اور حضرت انس کی مذکورہ احادیث ہیں اور صحیح مسلم میں بکر سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو حج اور عمرہ کا اکٹھا تلبیہ کہتے ہوئے سنا (4)۔ بکر نے کہا میں نے یہ حضرت ابن عمر سے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے صرف حج کا تلبیہ کہا۔ میں حضرت انس سے ملا۔ میں نے انہیں حضرت ابن عمر کا قول بیان کیا۔ حضرت انس نے کہا: تم ہمیں شمار نہیں کرتے مگر بچے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: لبیک بعمرہ وحجۃ۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ نے عمرہ کا احرام باندھا اور صحابہ کرام نے حج کا احرام باندھا اور نبی کریم ﷺ نے احرام نہ کھولا اور ان صحابہ نے بھی احرام نہ کھولا جنہوں نے ہدی ساتھ لائی تھی اور باقی لوگوں نے احرام کھول دیا تھا۔ بعض اہل علم نے کہا: رسول اللہ ﷺ حج قرآن کرنے والے تھے۔ جب آپ قرآن کرنے والے تھے تو آپ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجة النبی ﷺ، صفحہ 396، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، قول النبی العقیق واد مبارک، صفحہ 207، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، لی الجمع بین الحج والعمرہ، صفحہ 101، جلد 1 (وزارت تعلیم)

4۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، لی الأفراد والقرآن، صفحہ 404، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)



نے حج اور عمرہ کیا تھا۔ اس طرح احادیث متفق ہو گئیں۔ نحاس نے کہا: سب سے بہتر وہ ہے جو کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ جس نے آپ کو دیکھا اس نے کہا: آپ نے عمرہ کیا پھر حج کا احرام باندھا، بعض نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے افراد کیا پھر کہا: لبیک بحجة و عمرہ (1) جس نے آپ سے یہ سنا اس نے کہا: آپ نے قرآن کیا۔ پس احادیث متفق ہو گئیں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے کسی نے یہ روایت نہیں کیا کہ آپ نے فرمایا ہو میں نے حج مفرد کیا اور تمتع نہیں کیا اور آپ سے یہ صحیح مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے حج قرآن کیا۔ جیسا کہ نسائی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا تو نے کیسا احرام باندھا؟ میں نے عرض کی: میں نے آپ کے احرام جیسا باندھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں ہدی ساتھ لایا ہوں اور حج قرآن کا احرام باندھا ہے۔ حضرت علی نے فرمایا اور آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا: اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوتا تو میں بھی ایسا کرتا جیسا تم نے کیا ہے لیکن میں ہدی ساتھ لایا ہوں اور میں نے حج قرآن کا احرام باندھا ہے (2)۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ لوگوں کو کیا ہے کہ انہوں نے اپنے عمرہ کا احرام کھول دیا ہے اور آپ نے احرام نہیں کھولا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے سر پر گوند لگائی ہوئی ہے اور میں ہدی ساتھ لایا ہوں میں احرام نہیں کھولوں گا حتیٰ کہ میں قربانی کر لوں گا (3)۔ یہ حدیث بیان کرتی ہے کہ آپ ﷺ حج قرآن کرنے والے تھے، اگر آپ حج تمتع یا حج مفرد کرنے والے ہوتے تو آپ ہدی کے نحر کی وجہ سے نہ روکتے۔

میں کہتا ہوں: نحاس نے جو یہ کہا ہے کہ کسی سے یہ مروی نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہو کہ میں نے حج افراد کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت پہلے گزر چکی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میں حج کا احرام باندھتا ہوں اور مسلم کی حضرت ابن عمر سے روایت ہے اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلے عمرہ کیا پھر حج کا احرام باندھا تو میں حج کا احرام باندھتا ہوں کے ارشاد میں حج مفرد پر دلیل باقی نہ رہی اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ میں نے حج قرآن کیا باقی رہا اور حضرت انس جو آپ ﷺ کے خادم تھے فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو لبیک بحجة و عمرہ معاً کہتے ہوئے سنا۔ یہ جملہ حق قرآن پر نص صریح ہے کسی تاویل کا احتمال نہیں رکھتا۔ دارقطنی نے عبد اللہ بن ابی قتادہ سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے حج اور عمرہ کو جمع کیا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ اس کے بعد آپ دوبارہ حج کرنے والے نہیں۔

**مسئلہ نمبر 4:** جب حج مفرد، تمتع اور قرآن کے بارے قول گزر چکا ہے کہ یہ سب بالا جماع جائز ہیں اور حج تمتع کی علماء کے نزدیک چار صورتیں ہیں: (1) ایک صورت ایسی ہے جس پر اجماع ہے اور تین صورتیں مختلف فیہا ہیں۔ رہی وہ صورت جو مجتمع علیہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے **فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**۔

یعنی انسان حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے۔ اس کا بیان آگے آئے گا اور وہ شخص آفاقی ہو، مکہ مکرمہ میں آیا ہو، عمرہ

سے فارغ ہو گیا ہو پھر مکہ میں اسی سال حج شروع کرنے تک بغیر احرام کے رہا ہو، اپنے گھر کی طرف واپس نہ گیا ہو یا باہر سے آنے والوں کے میقات کی طرف جانے سے پہلے اسی کیفیت میں رہا ہو۔ جب وہ اس طرح کرے گا تو وہ متمتع ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وہ واجب کیا ہے جو متمتع پر واجب کیا ہے اور یہ میسر ہدی ہے۔ وہ اس ہدی کو ذبح کرے گا اور منیٰ یا مکہ کے مساکین کو کھلائے گا۔ اگر ہدی نہ پائے تو تین روز سے رکھے گا اور سات روز سے اپنے شہر واپس آ کر رکھے گا۔ جیسا کہ آگے آئے گا اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اس پر دسویں کا روزہ نہیں ہے اور ایام تشریق کے روزوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس حج تمتع پر علماء متقدمین و متاخرین کا اجماع ہے۔ اس کی آٹھ شروط ہیں: (۱) حج و عمرہ کا جمع کرنا (۲) ایک سفر میں ہونا (۳) ایک سال میں ہونا (۴) حج کے مہینوں میں ہونا (۵) عمرہ کا پہلے کرنا (۶) دونوں کو نہ ملانا بلکہ عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد حج کا احرام باندھنا (۷) عمرہ اور حج ایک شخص کی طرف سے ہونا (۸) اہل مکہ کے علاوہ سے ہونا۔ ان شروط میں غور کر جو ہم نے تمتع کے حکم میں بیان کی ہیں تو ان کو پالے گا۔

دوسری وجہ حج قرآن ہے وہ یہ ہے کہ ایک احرام میں حج اور عمرہ کو جمع کرنا، وہ دونوں کا اکٹھا احرام حج کے مہینے میں باندھے یا کسی اور مہینے میں باندھے اور وہ کہے: لبیک بحجۃ و عمرۃ معا (میں نے حج و عمرہ کا اکٹھا احرام باندھا) جب مکہ شریف میں آئے تو حج و عمرہ کے لئے ایک طواف کرے اور ایک سعی کرے۔ یہ امام مالک، امام شافعی، ان کے اصحاب، اسحاق اور ابو ثور کی رائے ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت عطاء بن ابی رباح، حسن، مجاہد اور طاؤس کا مذہب ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع کے لئے نکلے ہم نے عمرہ کا احرام باندھا..... الحدیث (۱)۔

اس حدیث میں ہے جنہوں نے حج و عمرہ کو جمع کیا تھا، انہوں نے ایک طواف کیا تھا، یہ حدیث بخاری نے نقل کی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے منیٰ سے جانے کے دن فرمایا جبکہ حضرت عائشہ نے بیت اللہ کا طواف نہیں کیا تھا کیونکہ آپ کو حیض آ گیا تھا: تیرا طواف تیرے حج اور عمرہ کی طرف سے ہوگا۔ ایک روایت میں: تیرا صفا و مروہ کا طواف تیرے حج اور عمرہ کی طرف سے ہوگا (۲)۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے یا مکہ پہنچ کر دو طواف اور دو سعی کرے۔ یہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، ثوری، اوزاعی، حسن بن صالح اور ابن ابی لیلیٰ کا نظریہ ہے۔ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود سے بھی مروی ہے۔ یہی قول شعبی اور جابر بن زید کا بھی ہے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث سے حجت پکڑی ہے کہ انہوں نے حج اور عمرہ کو جمع کیا اور دونوں کے لئے دو طواف اور دو سعی کیں پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح کرتے دیکھا ہے۔ دارقطنی نے اپنی سنن میں یہ احادیث روایت کی ہیں اور تمام کو ضعیف قرار دیا ہے اور حج قرآن کو تمتع کے باب سے بتایا ہے کیونکہ قارن ایک مرتبہ عمرہ اور ایک حج کے سفر کی مشقت کو ترک کرنے کے ساتھ تمتع ہوتا ہے اور دونوں سے اکٹھا تمتع ہوتا ہے اور ہر ایک کے لئے میقات سے علیحدہ احرام نہیں باندھتا اور حج کو عمرہ کے ساتھ ملاتا ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت داخل

ہے: فَمَنْ تَشَاءُ بِالْعُمُرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ یہ تمتع کی ایک صورت ہے اس کے جواز میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں اور اہل مدینہ حج اور عمرہ جمع کرنے کی اجازت صرف اس صورت میں دیتے ہیں جبکہ حاجی ہدی ساتھ لایا ہو۔ اور ان کے نزدیک اس صورت میں اونٹ دینا ہوگا اس سے کم نہیں۔ قرآن کے تمتع ہونے پر دلیل حضرت ابن عمر کا قول ہے۔ قرآن کو انہوں نے اہل آفاق کے لئے بنایا ہے اور پھر یہ آیت پڑھی۔ ذَلِك لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ پس جو مسجد حرام والوں سے ہو اور وہ حج تمتع یا حج قرآن کرے تو اس پر قرآن اور تمتع کا دم (بکری) نہیں ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں نے نہیں سنا کہ کسی مکی نے حج قرآن کیا ہو اگر وہ کرے گا تو اس پر نہ ہدی ہے اور نہ روزہ ہے اور امام مالک کے قول پر جمہور فقہاء کا نظریہ ہے۔ عبد الملک بن ماجشون نے کہا: جب مکی حج، عمرہ کے ساتھ کرے گا تو اس پر قرآن کا دم (بکری) ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ سے خون اور روزہ کو تمتع میں ساقط کیا ہے۔

تیسری وجہ تمتع کی یہ ہے جس پر حضرت عمر نے دھمکی دی تھی۔ آپ نے فرمایا: دو متعے ایسے ہیں جو رسالت مآب ﷺ کے عہد مبارک میں تھے اور میں ان سے منع کرتا ہوں اور ان پر سزا دیتا ہوں۔ ایک عورتوں کا متعہ اور دوسرا متعہ الحج۔ اس کے جواز میں علماء کا ابھی تک جھگڑا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ آدمی حج کا احرام باندھے حتیٰ کہ جب مکہ میں داخل ہو تو حج کے احرام کو عمرہ میں تبدیل کر دے۔ پھر احرام کھول دے پھر بغیر احرام کے ٹھہرا رہے حتیٰ کہ آٹھویں کے دن حج کا احرام باندھے۔ یہ وہ وجہ ہے جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے آثار وارد ہیں۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے حج میں صحابہ کرام کو حکم دیا کہ جس کے پاس ہدی نہیں ہے اور وہ ہدی ساتھ نہیں لایا ہے اور وہ حج کا احرام باندھ چکا تھا تو وہ اسے عمرہ کا احرام باندھے اور ان آثار کی تصحیح پر بھی علماء کا اجماع ہے۔ ان میں سے کسی اثر کو نہیں چھوڑا ہے لیکن اس کے متعلق قول اور علل کی وجہ سے عمل میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء نے اس پر عمل ترک کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اور آپ کے صحابہ کے ساتھ خاص تھا اور اسی حج کے متعلق تھا۔

حضرت ابو ذر نے کہا: حج میں تمتع ہمارے لئے خاص تھا۔ یہ مسلم نے نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے۔ حضرت ابو ذر نے کہا: دو متعے صرف ہمارے ساتھ خاص تھے۔ عورتوں کے ساتھ متعہ اور متعہ الحج (1)۔ خصوصیت کی علت اور اس میں فائدہ وہ ہے جو حضرت ابن عباس نے بیان فرمایا ہے لوگ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا زمین پر بہت بڑا گناہ ہے اور وہ خود محرم کو صفر بنادیتے تھے اور وہ کہتے تھے جب اونٹ کا زخم ٹھیک ہو جائے گا، اثر مٹ جائے گا اور صفر کا مہینہ گزر جائے گا تو عمرہ کرنے والے کے لئے عمرہ حلال ہوگا۔ نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب چار ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھے ہوئے۔ آپ ﷺ نے حج کو عمرہ بنانے کا حکم دیا۔ یہ حکم صحابہ کو بڑا عظیم لگا۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ احرام کھولنا کیسا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر پابندی سے حلالی ہو گئے ہو (2)۔ یہ حدیث مسلم نے نقل فرمائی ہے۔ مسند صحیح ابو حاتم میں حضرت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز التمتع، صفحہ 402، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الحج، جواز العمرة في شهر الحج، صفحہ 406، جلد 1



ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ کو ذی الحجہ میں اس لئے عمرہ کرایا تھا کہ اہل شرک کے نظریہ کا قلع قمع ہو جائے۔ قبیلہ قریش اور جوان کے دین کے پیروکار تھے وہ کہتے تھے: جب اونٹ سے اثر ختم ہو جائے گا اور اس کا زخم ٹھیک ہو جائے گا اور صفر کا مہینہ گزر جائے گا تو عمرہ کرنے والے کے لئے عمرہ حلال ہو جائے گا، وہ عمرہ کرنا حرام سمجھتے تھے حتیٰ کہ ذوالحجہ گزر جائے۔ حضرت عائشہ کو آپ ﷺ نے ان کے نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لئے عمرہ کرایا تھا۔ اس میں دلیل ہے کہ رسول اللہ نے حج کو عمرہ میں اس لئے تبدیل کیا تھا تا کہ آپ انہیں دکھائیں کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ خاص تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو حج اور عمرہ مکمل کرنے کا حکم مطلق دیا جو بھی ان میں داخل ہو اور ظاہر کتاب اللہ کی مخالفت کرنا ثابت نہیں مگر نسخ کتاب یا سنت مبینہ کی طرف رجوع ضروری ہے جس میں کوئی اشکال نہ ہو۔ اور ان علماء نے حضرت ابوذر کے قول اور حضرت حارث بن بلال کی حدیث سے حجت پکڑی ہے۔ حارث اپنے باپ سے روایت فرماتے ہیں، انہوں نے فرمایا: ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! حج کا نسخ کرنا ہمارے ساتھ خاص ہے یا تمام لوگوں کے لئے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہمارے ساتھ خاص ہے (1)۔ اور فقہاء حجاز، عراق اور شام کا یہ نظریہ ہے مگر ایک چیز حضرت ابن عباس، حسن، اور سدی سے مروی ہے اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ امام احمد نے فرمایا: میں ان صحیح متواتر آثار کو جو حج کو عمرہ میں نسخ کرنے کے متعلق وارد ہیں حضرت حارث بن بلال عن ابیہ کی حدیث سے اور حضرت ابوذر کے قول سے رد نہیں کرتا۔ امام احمد نے فرمایا: جو حضرت ابوذر نے کہا ہے اس پر اجماع نہیں ہے اگر اجماع ہوتا تو حجت ہوتا۔ فرمایا: حضرت ابن عباس نے حضرت ابوذر کی مخالفت کی ہے اور اس کو خصوصیت نہیں بنایا ہے۔

امام احمد نے حضرت جابر کی صحیح حدیث سے حجت پکڑی ہے جو حج کے بارے میں ہے۔ اس میں ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوتا تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا اور اسے عمرہ بناتا۔ حضرت سراقہ بن مالک بن جعشم اٹھے اور عرض کی: یا رسول اللہ! یہ ہمارے اس سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیا اور فرمایا: عمرہ حج میں داخل ہوا۔ یہ دو مرتبہ فرمایا: نہیں بلکہ یہ ہمیشہ کے لئے ہے (2)۔ یہ مسلم کے لفظ ہیں اور امام بخاری کا میلان بھی اسی طرف ہے کیونکہ انہوں نے یہ باب باندھا ہے، جس نے حج کا تلبیہ کہا اور اس کا نام لیا۔ پھر حضرت جابر کی حدیث ذکر کی، ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آئے اور ہم نے حج کا احرام باندھا ہوا تھا ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حج کے احرام کو عمرہ کا احرام بنانے کا حکم دیا (3)۔

بعض علماء نے فرمایا: احرام کھولنے کا نبی کریم ﷺ نے جو حکم دیا تھا وہ دوسری وجہ سے تھا۔ مجاہد نے وہ وجہ ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے پہلے حج کو فرض نہیں کیا تھا بلکہ آپ ﷺ نے انہیں مطلقاً احرام باندھنے اور نئے حکم کا انتظار کرنے کا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب النسا، الرجل یحل بالحج ثم یجعلها عمرہ، صفحہ 252، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجة النبی ﷺ، صفحہ 396، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، من ہش بالحج و سبأ، صفحہ 213، جلد 1 (وزارت تعلیم)

حکم دیا تھا۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے مطلق احرام باندھا تھا۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کا احرام تھا اور اس پر دلیل یہ ارشاد ہے اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا اور اس احرام کو عمرہ کا احرام بنا دیتا۔ گویا آپ حکم کے منتظر ہو کر نکلے تھے اور صحابہ کو بھی اسی کا حکم دیا تھا۔ اس پر دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

”میرے پاس میرے رب کی طرف سے آنے والا اس مبارک وادی میں آیا اور کہا: تم کہو میں حج کو عمرہ میں بدلتا ہوں (1)۔“

متعہ کی چوتھی وجہ محصر اور جس کو بیت اللہ سے روکا گیا ہو اس کا متعہ ہے۔ یعقوب بن شیبہ نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں ابو سلمہ تبوزکی نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں وہب نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں اسحاق بن سوید نے بتایا فرمایا: میں نے حضرت عبد اللہ بن زبیر کو یہ خطبہ دیتے ہوئے سنا: اے لوگو! اللہ کی قسم! حج تمتع اس طرح نہیں ہے جس طرح تم کرتے ہو تمتع یہ ہے کہ ایک شخص حج کے ارادہ سے نکلے پھر دشمن یا کوئی عذر اسے روک لے حتیٰ کہ ایام حج گزر جائیں پھر بیت اللہ کے پاس آئے طواف کرے صفا و مردہ کی سعی کرے پھر آئندہ سال تک حلالی ہونے کے ساتھ تمتع ہو، پھر حج کرے اور ہدی دے۔ محصر کا حکم اور اس کے متعلق علماء کی آراء واضح طور پر گزر چکی ہیں۔ والحمد للہ۔ اور ان (حضرت عبد اللہ بن زبیر) کے مذہب سے یہ تھا کہ محصر احرام نہ کھولے بلکہ وہ اپنے احرام پر باقی رہے حتیٰ کہ دسویں کے دن اس کی طرف سے ہدی ذبح کی جائے پھر وہ حلق کرائے اور اپنے احرام پر باقی رہے حتیٰ کہ وہ مکہ میں آئے پھر عمرہ کے عمل سے اپنے حج سے حلالی ہو۔ اور حضرت ابن زبیر نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے عموم کے خلاف ہے: فَإِنْ أُخْضِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ اس کے بعد فرمایا: وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ (اللہ کے لئے حج اور عمرہ مکمل کرو) احصار کے حکم میں حج اور عمرہ کے درمیان کوئی فرق بیان نہیں کیا اور نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہ جب حدیبیہ میں روکے گئے تو صحابہ نے احرام کھولا اور نبی کریم ﷺ نے بھی احرام کھولا اور صحابہ کرام کو احرام کھولنے کا حکم دیا۔

علماء کا اختلاف ہے کہ تمتع کو تمتع کیوں کہا جاتا ہے۔ ابن قاسم نے کہا: کیونکہ وہ ہر اس چیز سے تمتع ہوتا ہے جس کا کرنا محرم کے لئے عمرہ سے حلالی ہونے کے وقت سے حج شروع کرنے کے وقت تک جائز نہیں ہوتا۔ دوسرے علماء نے کہا: اس کو تمتع کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دو سفروں میں سے ایک کے ساقط کرنے کے ساتھ تمتع ہوا کیونکہ عمرہ کا حق ہے کہ تو اس کے لئے سفر کا قصد کرے اور حج کے لئے بھی اسی طرح حق ہے جب ایک کے ساقط کرنے کے ساتھ تمتع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ہدی کو لازم کیا جیسے قارن پر لازم کیا جس نے ایک سفر میں حج اور عمرہ کو جمع کیا۔ پہلی وجہ اعم ہے کیونکہ وہ ہر اس چیز سے تمتع ہوتا ہے جو حلال کے لئے کرنا جائز ہوتا ہے اور اس سے اپنے شہر سے حج کرنے کے لئے سفر ساقط ہوتا ہے جو حلالی کے لئے کرنا جائز ہوتا ہے اور اس سے اپنے شہر سے حج کرنے کے لئے سفر ساقط ہوا اور میقات سے حج کا احرام باندھنا بھی ساقط ہوا۔ اس وجہ سے حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود نے حج تمتع کو ناپسند کیا۔ ان دونوں حضرات نے یا ان میں سے ایک نے فرمایا: تم میں سے کوئی منیٰ میں آئے گا جبکہ اس کے ذکر سے منیٰ کے قطرے گر رہے ہوں گے جبکہ حج تمتع پر مسلمان کا اجماع ہے۔

علماء کی ایک جماعت نے کہا: حضرت عمرؓ نے اس کو ناپسند کیا کیونکہ وہ پسند کرتے تھے کہ بیت اللہ کی سال میں دو مرتبہ زیارت کی جائے۔ ایک دفعہ حج کے لئے ایک دفعہ عمرہ کے لئے۔ حضرت عمرؓ حج مفرد کو افضل سمجھتے تھے اور وہ حج مفرد کا حکم دیتے تھے، اس کی طرف ان کا میلان تھا اور استحباب کے طور پر حج تمتع اور قرآن سے منع کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہا: اپنے حج اور اپنے عمرہ کو علیحدہ علیحدہ کرو۔ یہی تمہارے لئے حج کا اتمام ہے۔ حج کے مہینوں کے علاوہ عمرہ کا احرام باندھنا، عمرہ کا اتمام ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 5:** جو شخص حج کے مہینوں میں عمرہ کرے پھر اپنے شہر کو واپس آ جائے اور پھر اسی سال حج کرے، اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ وہ تمتع نہیں ہے اس پر نہ ہدی ہے اور نہ روزہ ہے۔ حسن بصری نے کہا: وہ تمتع ہے اگرچہ وہ گھر کی طرف لوٹ بھی آئے خواہ اس نے حج کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ انہوں نے فرمایا: کیونکہ کہا جاتا ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ متعہ ہے۔ یہ ہشیم نے یونس سے انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے۔ یونس نے حسن سے روایت کیا ہے کہ اس پر ہدی نہیں ہے، پہلا قول صحیح ہے اسی طرح ابو عمر نے ذکر کیا ہے، اس نے حج کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اس کو ابن منذر نے ذکر نہیں کیا۔ ابن منذر نے کہا: ان کی حجت کتاب اللہ کا ظاہر ہے ارشاد ہے: **فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ**۔ اس آیت میں کوئی استثناء نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹنے والا ہو یا نہ ہو۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کا مراد ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یا اپنے رسول کی زبان پر بیان کر دیتا۔ سعید بن مسیب سے حسن کے قول کی طرح مروی ہے۔ ابو عمر نے کہا: حسن سے اس مسئلہ میں ایسا قول مروی ہے جس کی متابعت نہیں کی گئی اور اہل علم میں سے کسی کا یہ نظریہ نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا: جس نے دسویں ذی الحجۃ کے دن کے بعد عمرہ کیا وہ متعہ ہے۔ طاؤس سے دو قول مروی ہیں، دونوں زیادہ شاذ قول ہیں۔ اس سے بھی جوہم نے حسن سے ذکر کیا ہے، ایک یہ ہے کہ جس نے حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں عمرہ کیا پھر وہ ٹھہرا رہا حتیٰ کہ حج کا وقت داخل ہو گیا، پھر اس نے اسی سال حج کیا تو وہ تمتع ہے (2)۔ یہ طاؤس کے علاوہ کسی عالم نے نہیں کہا ہے اور فقہاء امصار میں سے کسی کا یہ نظریہ نہیں۔ یہ اس لئے کہ حج کے مہینے عمرہ کی نسبت حج کا زیادہ حق رکھتے ہیں کیونکہ عمرہ پورے سال میں سنت ہے اور حج کے لئے معلوم مہینے ہیں۔ جب کسی نے حج کے مہینوں میں عمرہ کیا تو اس نے ایسے وقت میں عمرہ کیا جس میں حج اولیٰ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اپنے رسول ﷺ کی زبان پر تمتع اور قرآن کرنے والے کے لئے حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کی رخصت دی ہے اور اس کے لئے جو عمرہ کو علیحدہ کرے۔ یہ اس کی طرف سے رحمت ہے اور اس میں میسر ہدی کو اس میں مقرر کیا ہے۔ دوسری وجہ وہ ہے جو کسی نے بیان کی ہے جو کسی شہر سے حج تمتع کرے اس پر ہدی ہے۔ یہ ظاہر قرآن کے مطابق نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ذَلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ**۔ تمتع علماء کے نزدیک ان شرائط کے ساتھ جائز ہے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** علماء کا اجماع ہے کہ ایک ایسا شخص جو اہل مکہ سے نہ ہو اگر وہ حج کے مہینوں میں مکہ میں ٹھہرنے کے ارادہ

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، جامع ما جاء في العمرة، صفحہ 358 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجيز، صفحہ 269، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)



سے عمرہ کرتے ہوئے آئے پھر اسی سال حج کرے تو وہ متمتع ہے۔ اس پر وہی کچھ ہے جو متمتع پر ہے اور مکی کے بارے میں اجماع ہے کہ وہ میقات کے پیچھے سے عمرہ کا احرام باندھتے ہوئے آئے پھر مکہ سے حج شروع کرے جبکہ اس کے گھر والے مکہ میں ہوں اور وہ مکہ کے علاوہ کسی جگہ نہ ٹھہرے تو اس پر بکری نہیں ہے۔ اسی طرح کا حکم ہے جب وہ مکہ کے علاوہ کسی جگہ ٹھہرے یا مکہ میں ٹھہرے جبکہ مکہ میں اس کے اہل ہوں اور مکہ کے علاوہ کسی شہر میں بھی اس کے اہل ہوں۔ علماء کا اجماع ہے کہ اگر وہ مکہ سے اپنے اہل کے ساتھ منتقل ہو گیا پھر وہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرتے ہوئے آیا پھر مکہ میں ٹھہرا رہا حتیٰ کہ اسی سال حج کیا تو وہ متمتع ہے۔

**مسئلہ نمبر 7:** امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ، ان کے اصحاب، ثوری اور ابو ثور کا اتفاق ہے۔ متمتع عمرہ کے لئے بیت اللہ کا طواف کرے گا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے گا تو اس پر اس کے بعد حج کے لئے دوسرا طواف اور دوسری صفا و مروہ کے درمیان سعی ہوگی۔ عطا اور طاؤس سے مروی ہے کہ ایک سعی کافی ہے۔ پہلا قول مشہور ہے وہی جمہور کا نظریہ ہے اور قارن کے طواف کے متعلق اختلاف گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 8:** اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں عمرہ شروع کرے پھر حج کے مہینوں میں عمرہ کا عمل کرے۔ امام مالک نے فرمایا: اس کا عمرہ اس مہینہ میں ہوا جس میں وہ حلالی ہوا تھا اگر وہ حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں اس سے حلالی ہونا چاہتا ہے تو وہ متمتع نہیں ہے۔ اگر وہ حج کے مہینوں میں عمرہ سے حلالی ہوا ہے تو وہ متمتع ہے اگر اسی سال حج کرے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب عمرہ کے لئے حرمت والے مہینوں میں بیت اللہ کا طواف کرے تو وہ متمتع ہے اگر اسی سال حج کرے کیونکہ عمرہ بیت اللہ کے ساتھ مکمل ہوتا ہے اور اس کے کمال کی طرف دیکھا جاتا ہے یہ حسن بصری، حکم بن عیینہ، ابن شبرمہ اور سفیان ثوری کا قول ہے اور قتادہ، احمد اور اسحق نے کہا: عمرہ اس مہینہ کے لئے ہے جس میں اس نے احرام باندھا۔ یہی معنی حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے۔ طاؤس نے کہا: اس کا عمرہ اس مہینہ کے لئے ہے جس میں وہ حرم میں داخل ہوا۔ اصحاب رائے کا قول ہے: اگر اس نے رمضان میں تین چکر لگائے اور چار چکر شوال میں لگائے پھر اسی سال حج کیا تو وہ متمتع ہے۔ اگر رمضان میں چار چکر لگائے اور شوال میں تین چکر لگائے تو وہ متمتع نہیں ہوگا۔ ابو ثور نے کہا: جب حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں عمرہ میں داخل ہو تو برابر ہے اس نے رمضان میں طواف کیا ہو یا شوال میں طواف کیا ہو وہ اس عمرہ کی وجہ سے متمتع نہیں ہوگا۔

یہ امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ اس کا عمرہ اس مہینہ کے لئے ہے جس میں اس نے احرام باندھا۔

**مسئلہ نمبر 9:** اہل علم کا اجماع ہے کہ جس نے حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھا اس پر حج کو داخل کر دیا جب تک کہ بیت اللہ کا طواف ابھی شروع نہیں کیا تھا تو وہ قارن شمار ہوگا۔ اس پر وہ لازم ہوگا جو اس قارن پر لازم ہوتا ہے جو حج اور عمرہ کی اکٹھی نیت کرتا ہے۔ اور عمرہ کا طواف شروع کرنے کے بعد عمرہ پر حج کو داخل کرنے میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس پر یہ لازم ہے اور جب تک عمرہ کا طواف مکمل نہ کیا ہو وہ قارن شمار ہوگا۔ اس کی مثل امام ابو حنیفہ سے مروی ہے۔ اور امام ابو حنیفہ سے مشہور یہ ہے کہ اگر اس کے لئے یہ جائز نہیں مگر طواف میں شروع ہوئے سے پہلے نیت کر لے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس

کے لئے جائز ہے کہ وہ عمرہ پر حج کو داخل کرے جب تک طواف کی دو رکعتیں نہ پڑھی ہوں۔ یہ تمام امام مالک اور ان کے اصحاب کے قول ہیں۔ جب عمرہ کرنے والے نے عمرہ کے طواف کا ایک چکر لگالیا ہو پھر اس نے حج کا احرام باندھا ہو تو وہ قارن ہوگا اور اس سے باقی عمرہ ساقط ہو جائے گا اور قرآن کا دم اس پر لازم ہوگا اسی طرح جس نے حج کا احرام باندھا اپنے عمرہ کے طواف کے نصف میں یا اس سے فارغ ہونے کے بعد رکوع سے پہلے تو اس کا یہی حکم ہے۔ بعض نے فرمایا: جب تک صفا و مروہ کے درمیان سعی مکمل نہ کی ہو اس کے لئے حج کو عمرہ پر داخل کرنا جائز ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ تمام اقوال اہل علم کے نزدیک شاذ ہیں۔ اشہب نے کہا: جب عمرہ کے طواف کا ایک چکر لگالیا ہو تو اس پر حج کا احرام لازم نہیں اور وہ قارن نہ ہوگا، وہ اپنے عمرہ کو جاری رکھے حتیٰ کہ اسے مکمل کرے پھر حج کا احرام باندھے۔ یہ امام شافعی اور عطا کا قول ہے اور یہی ابو ثور کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 10:** حج کو عمرہ میں داخل کرنے میں اختلاف ہے۔ امام مالک، ابو ثور اور اسحاق نے کہا: عمرہ حج پر داخل نہ ہوگا اور جس نے عمرہ کو حج کے ساتھ ملایا تو عمرہ کسی چیز کے ساتھ نہیں۔ یہ امام مالک اور امام شافعی کا ایک قول ہے اور مصر میں ان سے یہی مشہور ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام شافعی کا قدیم قول یہ ہے کہ وہ قارن ہو جائے گا اور اس پر وہی ہوگا جو قارن پر ہوتا ہے جب تک کہ اس نے حج کے طواف کا ایک چکر بھی نہ لگایا ہو۔ اگر طواف کر لیا ہو تو اس پر لازم ہوگا کیونکہ اس نے حج میں عمل کیا۔ ابن منذر نے کہا: اس مسئلہ میں میں امام مالک کے قول کے مطابق کہتا ہوں۔

**مسئلہ نمبر 11:** امام مالک نے فرمایا: جس نے عمرہ کے لئے ہدی دی دریاں حالیکہ وہ متمتع ہے تو اس کے لئے یہ کافی نہیں اور اس پر متعہ کے لئے دوسری ہدی ہے کیونکہ وہ متمتع ہو جائے گا جب عمرہ سے حلالی ہونے کے بعد حج شروع کرے گا اس وقت اس پر ہدی واجب ہوگی۔ امام ابو حنیفہ، ابو ثور اور اسحاق نے کہا: وہ ہدی کو نحر نہ کرے مگر دسویں کے دن۔ امام احمد نے فرمایا: اگر متمتع دس دنوں سے پہلے آئے تو طواف کرے، سعی کرے اور اپنی ہدی کو نحر کر دے اور اگر دس دنوں میں آئے تو دسویں کے دن نحر کرے۔ یہ عطا کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب طواف اور سعی کر لے تو وہ عمرہ کا احرام کھول دے خواہ ہدی لایا ہو یا نہ لایا ہو۔

**مسئلہ نمبر 12:** امام مالک اور امام شافعی کا اس متمتع کے بارے میں اختلاف ہے جو مرجائے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب حج کا احرام باندھا لیا تھا تو اس پر متعہ کا دم (بکری) ہے جبکہ وہ اس کو پانے والا ہو۔ زعفرانی نے امام شافعی سے یہ حکایت کیا ہے۔ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس متمتع کے بارے میں پوچھا گیا جو حج کا احرام باندھنے کے بعد عرفہ یا اس کے علاوہ کسی جگہ فوت ہو جاتا ہے، کیا اس پر ہدی ہے؟ امام مالک نے فرمایا: جو جمرہ عقبہ پر رمی جمار کرنے سے پہلے مرجائے تو اس پر ہدی نہیں ہے اور جس نے رمی جمار کر لیا تھا پھر مرجا گیا تو اس پر ہدی ہے۔ امام مالک سے پوچھا گیا کل مال سے ہدی دی جائے گی یا تہائی مال سے؟ امام مالک نے فرمایا: کل مال سے۔

**مسئلہ نمبر 13:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ** اس پر کلام گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَوْسِيًا مِّمَّنْ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَاجِّ وَ سَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ ذَلِك**

لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢٠﴾  
اس میں دس مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ لَمْ يَحْذَرِ یعنی جو ہدی نہ پائے مال نہ ہونے کی وجہ سے یا حیوان نہ ہونے کی وجہ سے تو وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے اور سات روزے اپنے شہر میں واپس آ کر رکھے اور حج کے تین روزے اس طرح رکھے کہ آخری روزہ نویں ذی الحجہ کا ہو۔ یہ طاؤس کا قول ہے۔ شعبی، عطاء، مجاہد، حسن بصری، نخعی، سعید بن جبیر، علقمہ، عمرو بن دینار اور اصحاب رائے سے مروی ہے۔ ابن منذر نے اس کو حکایت کیا ہے۔ ابو ثور نے امام ابو حنیفہ سے روایت کیا ہے، وہ اپنے عمرہ کے احرام میں روزے رکھے کیونکہ وہ تمتع کا ایک احرام ہے۔ پس اس میں ان دنوں کا روزہ جائز ہے جس طرح حج کے احرام میں جائز ہے (1)۔

امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے کہ وہ آٹھویں کے دن سے پہلے ایک دن روزہ رکھے پھر آٹھویں اور عرفہ کے دن کا روزہ رکھے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت مالک بن انس نے کہا: اس کے لئے ہے کہ وہ روزہ رکھے جب سے اس نے حج کا احرام باندھا ہے دسویں کے دن تک (2) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حج میں تین روزے رکھے۔ جب عمرہ میں روزہ رکھے تو وہ اپنے وقت سے پہلے ادا کرنے والا ہوگا تو وہ جائز نہیں۔ امام شافعی، امام احمد بن حنبل نے کہا: حج کا احرام باندھنے اور نویں ذی الحجہ کے درمیان روزے رکھے۔ یہ حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ یہ امام مالک سے مروی ہے، مؤطا میں ان کے قول کا یہی مقتضا ہے تاکہ وہ عرفہ کے دن افطار کرنے والا ہو۔ اس میں سنت کی اتباع ہے اور عبادت پر زیادہ قوت دینے والا ہے (3)۔ امام احمد سے مروی ہے، جائز ہے کہ وہ احرام باندھنے سے پہلے تین روزے رکھے۔ ثوری اور اوزاعی نے کہا: ذی الحجہ کے دس دنوں کے آغاز سے روزے رکھے (4)۔ یہ عطا کا قول ہے۔ عروہ نے کہا: ایام منیٰ میں مکہ میں وہ روزے رکھے۔ یہ امام مالک اور اہل مدینہ کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ایام منیٰ یہ وہ تین دن ہیں جو دسویں کے دن سے متصل ہیں۔ امام مالک نے مؤطا میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، وہ فرماتی تھیں: روزہ اس کے لئے ہے جو حج تمتع کرے اور حج کا احرام باندھنے سے لے کر عرفہ کے دن تک ہدی نہ پائے، اگر پہلے روزے نہیں رکھے تو ایام منیٰ میں روزے رکھے (5)۔ یہ الفاظ حج تمتع کا احرام باندھنے کے وقت سے عرفہ کے دن تک روزہ کی صحت کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ آغاز کا وقت ہے کیونکہ یہ ادائیگی کا وقت ہے اور اس کے بعد ایام منیٰ قضا کا وقت ہے۔ جیسا کہ امام شافعی کے اصحاب کا قول ہے اور دسویں کے دن سے پہلے روزے رکھنا ذمہ سے بری ہوتا ہے اور اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ مذہب یہ ہے کہ ادا کے طور پر ہیں اگرچہ ایام منیٰ سے پہلے روزے رکھنا افضل ہے جس طرح نماز کا وقت ہے اس میں ادائیگی کی وسعت ہے اگرچہ پہلا وقت آخری وقت سے افضل ہے۔ یہ صحیح ہے

2۔ البحر الرائق، ص 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

4۔ تفسیر طبری، ص 297، جلد 2 (دار احیاء التراث العلمیہ)

1۔ احکام القرآن، ص 130، جلد 1 (دار الفکر)

3۔ احکام القرآن، ص 130، جلد 1 (دار الفکر)

5۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، ص 462، ص 462 (وزارت تعلیم)



اور یہ ادا ہے قضا نہیں ہے کیونکہ آیاتہ فی النہی کے کلمات یہ احتمال رکھتے ہیں کہ اس سے مراد حج کی جگہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایام حج مراد ہوں۔ اگر ایام حج مراد ہوں تو یہ قول صحیح ہے کیونکہ آخری دن ایام حج کا دسویں کا دن ہے اور یہ احتمال ہے کہ آخری دن ری جمار کے دن ہوں کیونکہ ری جمار کرنا خالص حج کے عمل سے ہے اگرچہ اس کے ارکان سے نہیں ہے۔ اگر حج کی جگہ مراد ہو تو وہ ایام منیٰ میں جب تک مکہ میں ہے روزے رکھ لے جیسا کہ عروہ نے کہا ہے۔ یہ بہت قوی ہے۔ بعض علماء نے کہا: وہ روزوں کو ایام تشریق تک مؤخر کرے، کیونکہ اس پر روزہ واجب نہیں ہے مگر یہ کہ دسویں کے دن ہدی نہ پائے (1)۔

**مسئلہ نمبر 2:** اگر کہا جائے کہ اہل مدینہ کی ایک جماعت اور امام شافعی کا جدید قول یہ ہے کہ امام شافعی کے اکثر اصحاب کا یہ نظریہ ہے کہ ایام تشریق کا روزہ جائز نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام منیٰ کے روزوں سے منع فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر نئی ثابت ہو تو یہ عام ہوگا، اس سے متمنع خاص ہوگا اس روایت سے جو بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ ان دنوں میں روزہ رکھتی تھیں۔ حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی رخصت نہیں ہے مگر اس شخص کے لئے جو ہدی نہ پائے۔ دارقطنی نے کہا: اس کی سند صحیح ہے۔ اس کو حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ سے تین طرف سے مرفوع روایت کیا ہے اور تینوں طرف کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان دنوں میں روزہ رکھنے کی رخصت دی گئی ہے کیونکہ حج کے ایام میں سے باقی صرف یہی مقدار رہ گئی ہے۔ اسی وجہ سے روزے کا وجوب متحقق ہو جاتا ہے، ہدی کے نہ پائے جانے کی وجہ سے۔ ابن منذر نے کہا: ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب روزہ فوت ہو جاتا ہے تو ایام تشریق کے بعد روزہ رکھے گا (2)۔ یہ حسن اور عطا کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: اسی طرح ہم کہتے ہیں، ایک طائفہ نے کہا: جب دس دنوں میں روزہ نہ رکھے تو پھر ہدی کے سوا کوئی چیز یاد نہیں۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن جبیر، طاؤس اور مجاہد سے مروی ہے۔ امام ابو عمر نے امام ابو حنیفہ سے اور آپ کے اصحاب سے روایت کیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** علماء کا اجماع ہے کہ متمتع ہدی پائے تو اسے روزہ رکھنے کا اختیار نہیں اور اس میں اختلاف ہے کہ جب کوئی ہدی کو پانے والا نہ ہو تو پھر وہ روزے رکھنے شروع کر دے پھر روزے مکمل کرنے سے پہلے ہدی کو پالے۔ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب روزہ میں داخل ہو پھر ہدی کو پالے تو میرے نزدیک ہدی دینا زیادہ پسندیدہ ہے۔ اگر اس نے ہدی نہ دی تو روزہ بھی اس کے قائم مقام ہو جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: روزے کو وہ مکمل کرے جبکہ وہ فرض ہے اسی طرح ابو ثور نے کہا: یہ حسن اور قتادہ کا قول ہے، ابن منذر نے بھی اس کو پسند کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: جب تیسرے روزے میں ہدی میسر آگئی تو روزہ باطل ہو جائے گا اور ہدی واجب ہو جائے گی۔ اگر حج میں تین دن روزے رکھ لے پھر اسے ہدی میسر آگئی تو اس کے لئے جائز ہے کہ گھر واپس آ کر سات روزے رکھ لے اور ہدی کی طرف نہ لوٹے۔ یہ ثوری، ابن ابی نجیح اور حماد کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسَبْعَةٌ جَمُورٌ كِي قِرَآتٍ عَطْفٍ كِي بِنَا بِرَجُورٍ ہے۔ زید بن علی نے وسبعة نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا: وصوموا سبعة (سات روزے رکھو)

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِذَا رَاجَعْتُمْ** جب تم اپنے شہروں کی طرف لوٹو۔ یہ حضرت ابن عمر، قتادہ، ربیع، مجاہد اور عطا کا قول ہے۔ مالک نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: امام شافعی کا بھی یہی قول ہے (1)۔ قتادہ اور ربیع نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے اور کسی پر سات روزے واجب نہیں ہوتے مگر جب وطن واپس آ جائے مگر جو اپنے اوپر سختی کرے جس طرح جو رمضان میں سفر میں روزہ رکھتا ہے (2)۔ امام احمد اور اسحاق نے فرمایا: راستہ میں اسے روزہ جائز ہے۔ مجاہد اور عطا سے مروی ہے، مجاہد نے کہا: اگر وہ چاہے تو راستہ میں روزہ رکھے، یہ رخصت ہے۔ اسی طرح عکرمہ اور حسن نے کہا: بعض اہل لغت نے کہا: اس کا مطلب ہے جب تم حج سے لوٹو یعنی جب تم اس حلت کی طرف لوٹو جس پر تم احرام سے پہلے تھے۔ امام مالک نے ”الکتاب“ میں فرمایا: جب منیٰ سے واپس آ جائے تو روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن عربی نے کہا: اگر تخفیف اور رخصت ہو تو رخصت کو مقدم کرنا جائز ہے اور رخصت کو چھوڑ کر عزیمت کی طرف لوٹنا بالاجماع جائز ہے اگرچہ اس کا وقت متعین ہے لیکن اس میں نص نہیں ہے، نہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد شہر کی طرف لوٹنا ہے اور اغلب یہی ہے کہ حج مراد ہے (3)۔ میں کہتا ہوں: بلکہ اس میں ظاہر نص کے قریب ہے۔

مسلم نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کیا اور ہدی دی۔ آپ ﷺ ذی الحلیفہ سے ہدی لے گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا پھر حج کا احرام باندھا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ لوگوں نے بھی حج تمتع کیا لوگوں میں سے کچھ ہدی ساتھ لائے تھے اور کچھ ہدی ساتھ نہ لائے تھے جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں آئے تو لوگوں سے فرمایا: تم میں سے جو ہدی ساتھ لایا ہے وہ کسی چیز سے حلالی نہ ہو جو حج کی وجہ سے حرام ہوئی حتیٰ کہ اپنے حج کو مکمل کرے اور جس کے پاس ہدی نہیں ہے وہ بیت اللہ کا طواف کرے پھر صفا و مروہ کا طواف کرے، بال قصر کرے اور احرام کھول دے پھر محرم احرام باندھے اور ہدی دے۔ جو ہدی کو نہ پائے وہ حج میں تین روزے رکھے اور سات روزے گھر والوں کے پاس لوٹ آئے تو رکھے (4)۔ یہ نص کی طرح ہے کہ سات روزے گھر والوں میں شہر والوں میں رکھے۔

اسی طرح بخاری میں حضرت ابن عباس کی حدیث میں ہے۔ پھر آپ ﷺ نے آٹھ ذی الحجہ کی شام ہمیں حج کا احرام باندھنے کا حکم دیا جب ہم مناسک حج سے فارغ ہوں گے تو ہم آئیں گے بیت اللہ کا طواف کریں گے، صفا و مروہ کا طواف کریں گے تو ہمارا حج مکمل ہوگا اور ہم پر ہدی واجب ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ تَمَنُّ لَكُمْ يَجْزِيَكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةً إِذَا رَجَعْتُمْ**۔ (5) (یعنی جب ہم اپنے شہروں کی طرف آئیں۔ الحدیث) نحاس نے کہا: یہ بالاجماع ہے۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ** کہا جاتا ہے: مکمل یکمل بروزن نصرینصر مکمل

1۔ احکام القرآن، صفحہ 131، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

3۔ احکام القرآن، صفحہ 131، جلد 1 (دار الفکر) 4۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، وجوب الصوم علی التمتع، صفحہ 403، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

5۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، قول اللہ تعالیٰ ذالک لمن لم یکن اہلہ، صفحہ 241، جلد 1 (وزارت تعلیم)

یکمل بروزن عظم یعظم، کمل یکمل بروزن حید یحید۔ اس میں یہ تین لغات ہیں۔ تِلْكَ عَشْرَةٌ کے معنی میں اختلاف ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ یہ دس ہیں۔ زجاج نے کہا: جب کسی خیال کرنے والے کا یہ خیال ہو سکتا تھا کہ حج کے تین روزوں یا واپسی پر سات روزوں میں اختیار ہے اور یہ سات روزے ان تین کا بدل ہیں کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ سات روزے اور رکھے تو تِلْكَ عَشْرَةٌ کے قول سے اس وہم و خیال کو زائل کر دیا۔ پھر فرمایا گامِلَةٌ حسن نے کہا: ثواب میں کامل، جس طرح اس شخص کا ثواب ہے جو ہدی دیتا ہے۔ بعض نے فرمایا: ہدی کا بدل ہونے میں کامل ہے۔ یعنی یہ پورے دس، ہدی کا بدل ہیں، بعض نے فرمایا: ثواب میں کامل ہیں جس طرح اس شخص کا ثواب ہے (1) جس نے تمتع نہیں کیا۔ بعض نے فرمایا: یہ لفظا اخبار ہے اور اس کا معنی امر ہے یعنی یہ دس مکمل کرو یہ فرض ہیں۔ مبرد نے کہا: عَشْرَةٌ تعداد کے ختم ہونے پر دلیل ہے تاکہ کسی وہم کرنے والے کو وہم نہ ہو کہ ان سات کے بعد بھی کوئی شے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ تاکید ہے جیسا کہ تو کہتا ہے: کتبت بیدی۔ میں نے ہاتھ سے لکھا۔ اسی سے شاعر کا قول ہے

و سادسة تیل ال شامی

ثلاث و اشتان فهن خمس

اس میں خمس تاکید ہے۔

وست حسیں یدرکنی العشاء

ثلاث بالغداة فذاك حسی

و شرب المرء فوق البرق داء

فذلك تسعة فی الیوم ربی

ان اشعار میں تسعة تاکید ہے۔

اور گامِلَةٌ کا ارشاد دوسری تاکید ہے اس میں روزہ رکھنے کی زیادہ تاکید ہے کہ اس تعداد سے کم نہ کرے جیسے تو کسی کو اہم کام کا حکم دیتا ہے تو کہتا ہے: اللہ اللہ لا تقصر۔ اللہ سے ڈرو اس میں کوتاہی نہ کرو۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یعنی وہ مسافر جو مسجد حرام کے رہنے والوں سے نہیں ہے اس پر تمتع کا دم واجب ہے۔ بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان سے حج تمتع کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: مہاجرین، انصار اور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات نے حجة الوداع میں احرام باندھا اور ہم نے بھی احرام باندھا۔ جب ہم مکہ مکرمہ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے حج کے احرام کو عمرہ کا احرام بنا دو مگر جس نے ہدی کو قلاذہ پہنایا ہو۔ ہم نے بیت اللہ اور صفا و مروہ کا طواف کیا اور ہم عورتوں کے پاس آئے اور ہم نے سلعے ہوئے کپڑے پہنے اور فرمایا: جس نے ہدی کو قلاذہ پہنایا ہو وہ حلالی نہ ہو حتیٰ کہ اس کی ہدی اپنے مقام پر پہنچ جائے۔ پھر آپ ﷺ نے ہمیں آٹھویں کی شام حج کا احرام باندھنے کا حکم دیا جب ہم مناسک سے فارغ ہوں گے تو ہم آئیں گے بیت اللہ اور صفا و مروہ کا طواف کریں گے، پس ہمارا حج مکمل ہوگا اور ہم پر ہدی لازم ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ۔ ہدی



میں بکری کافی ہے ایک سال میں انہوں نے دو عبادتیں حج اور عمرہ جمع کیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ حکم نازل کیا اور اپنے نبی کی زبان پر بیان فرمایا اور مکہ کے علاوہ لوگوں کے لئے اس کو مباح فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اشہر حج سے مراد شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ ہیں جو ان مہینوں میں حج تمتع کرے اس پر ہدی یا روزہ ہے۔ الرفث سے مراد جماع ہے اور الفسوق سے مراد گناہ ہیں الجدل سے مراد جھگڑا ہے (1)۔

**مسئلہ نمبر 8:** لِمَنْ میں لام بمعنی علی ہے۔ یعنی جو مکی نہیں ہے اس پر دم (بکری) واجب ہے۔ جیسے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: اشتد علیہم اللہ۔ اس میں لام بمعنی علی ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وان اساتم فلہا۔ اس میں بھی لام بمعنی علی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک مسافر کے لئے حج تمتع اور قرآن کرنے کی طرف اشارہ ہے اور مکہ کے رہنے والوں کے لئے قرآن و تمتع نہیں ہے۔ ان میں سے جو ایسا کرے اس پر جنایت کا دم ہوگا جس سے وہ نہیں کھائے گا کیونکہ یہ دم تمتع نہیں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: ان کے لئے دم تمتع اور قرآن ہے۔ اشارہ ہدی اور روزہ کی طرف ہے ان پر ہدی اور روزہ نہیں ہے۔ عبد الملک بن ماجشون نے تمتع اور قرآن کے درمیان فرق کیا ہے، پس قرآن میں خون کو واجب کیا ہے اور تمتع میں ساقط کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

**مسئلہ نمبر 9:** اس بات پر اجماع ہونے کے بعد کہ اہل مکہ اور اس سے متصل رہنے والے لوگ مسجد حرام میں رہنے والے لوگ ہیں۔ حاضری المسجد الحرام کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ طبرانی نے کہا: اہل حرم پر اجماع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس طرح جس طرح اس نے کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جن پر جمعہ واجب ہے وہ حضری ہے جو اس سے دور ہے وہ بدوی ہے یہ لفظ حضارۃ اور بدادۃ سے بنائے ہیں (2)۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: وہ اہل مکہ اور اس کے متصل رہنے والے لوگ ہیں۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اس سے مراد موافقت اور اس کے اندر رہنے والے لوگ ہیں۔ پس موافقت یا موافقت سے اندر رہنے والے ہیں وہ حضری المسجد الحرام میں سے ہیں۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایسی جگہ پر رہتے ہیں جن پر مکہ آتے وقت نماز قصر نہیں ہوتی۔ یہ موافقت کے قریب رہنے والے لوگ ہیں۔ آیت کی تاویل میں متقدمین کے ان اقوال پر مذاہب ہیں۔

**مسئلہ نمبر 10:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللَّهَ عَنِ الَّذِي تَدْعُونَ لِمَنْ تَدْعُونَ۔ یعنی جو اللہ نے تم پر فرض کیا اس کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ بعض نے فرمایا: بالعموم تقویٰ کا امر ہے اور عذاب کی شدت سے ڈرانا ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَةٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقًا وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللّٰهُ وَتَزُوْدُوْا اَنْ حَيْرَ الرَّاٰدِ التَّقْوٰی وَاتَّقُوْنَ  
يٰۤاُولِيَ الْاَلْبَابِ ۝

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، قول اللہ تعالیٰ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهُ، ص 213، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجیز، ص 271، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

”حج کے چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں۔ پس جو نیت کر لے ان میں حج کی تو اسے جائز نہیں بے حیائی کی بات اور نہ نافرمانی اور نہ جھگڑا حج کے دنوں میں اور جو تم نیک کام کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور سفر کا توشہ تیار کرو اور سب سے بہتر توشہ تو پر ہیزگاری ہے اور ڈرتے رہو مجھ سے اے عقلمندو!“۔

اس میں چودہ مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ** جب اللہ تعالیٰ نے **وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ** میں حج اور عمرہ کا ذکر فرمایا تو وقت میں ان کے اختلاف کو بیان فرمایا۔ سارا سال عمرہ کے احرام کا وقت ہے اور عمرہ کا وقت ہے۔ رہا حج یہ سال میں ایک مرتبہ واقع ہوتا ہے، یہ ان مخصوص مہینوں کے علاوہ میں واقع نہیں ہوتا۔ **الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ** مبتدا خبر ہیں اور کلام میں حذف ہے۔ اس کی تقدیر اشہر الحج اشہر ہے یا وقت الحج اشہر ہے یا وقت عمل الحج اشہر ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی تقدیر الحج فی الاشہر ہے۔ حرف جر کے سقوط کے ساتھ اشہر کی نصب لازم ہے اور کسی نے اس کی نصب کے ساتھ نہیں پڑھا مگر کلام میں ظرف کی بنا پر نصب جائز ہے۔ فراء نے کہا: اشہر مرفوع ہے کیونکہ اس کا معنی ہے: وقت الحج اشہر معلومات۔ فراء نے کہا: میں نے کسائی کو یہ کہتے سنا: انما الصیف شہران، انما الطیلسان ثلاثة اشہر۔ اس سے مراد گرمیوں کا وقت اور چادر، اوڑھنے کا وقت لیا ہے۔ اس میں حذف ہے۔

**مسئلہ نمبر 2:** الاشہر المعلومات میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، عطاء، ربیع، مجاہد اور زہری نے کہا: اشہر حج شوال، ذوالقعدہ اور ذی الحجہ پورا ہے۔ حضرت ابن عباس، سدی، شعبی اور نخعی نے کہا: یہ شوال، ذوالقعدہ اور ذی الحجہ کے دس دن ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے اور حضرت ابن زبیر کا یہی قول ہے۔ دونوں قول مالک سے مروی ہیں۔ آخری قول ابن حبیب نے حکایت کیا ہے (1) اور پہلا ابن منذر نے بیان کیا ہے۔ فرق کا فائدہ دم (جانور قربان کرنا) سے متعلق ہے۔ جس نے کہا: ذی الحجہ مکمل، حج کے مہینوں میں سے ہے وہ دسویں کے دن کے بعد اعمال حج میں سے جو عمل واقع ہو اس میں دم واجب نہیں کرتے کیونکہ وہ اشہر حج میں سے ہے۔ دوسرے قول پر حج دسویں کے دن ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد جو عمل کرے گا وقت سے تاخیر کی بناء پر دم لازم ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 3:** اللہ تعالیٰ نے حج کے مہینوں کا اپنی کتاب میں نام نہیں لیا کیونکہ یہ لوگوں کو معلوم تھے۔ اور الاشہر سے لفظ کا اطلاق دو مہینوں اور تیسرے مہینہ کے بعض حصہ پر ہوتا ہے کیونکہ بعض مہینہ پورے مہینہ کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: رایتک سنة کذا۔ او علی عہد فلاں (یعنی میں نے تجھے فلاں سال یا فلاں کے عہد میں دیکھا) اس نے اسے دیکھا تو ایک لمحہ میں تھا۔ وقت کے بعض کو کل کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایام منی ثلاثة۔ (2) حالانکہ یہ دو دن اور تیسرے دن کا بعض حصہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں: رایتک الیوم، جئتک العام۔ میں نے آج

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 271، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جامد فی من ادرك الامام، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)

تجھے دیکھا اور میں تیرے پاس اس سال آیا۔ بعض نے فرمایا: جب دو اور دو سے زیادہ جمع ہوتے ہیں تو اشہد فرمایا۔

**مسئلہ نمبر 4:** حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینے میں احرام باندھنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے حج کی سنت یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں احرام باندھے۔ حضرت عطاء، مجاہد، طاؤس اور ازاعی نے کہا: جس نے حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھا تو وہ اس کے حج کی طرف سے نہ ہوگا۔۔۔۔۔ وہ عمرہ کا ہوگا جیسے کوئی وقت سے پہلے نماز میں داخل ہو تو وہ اس کی فرض نماز نہیں ہوتی وہ نفل ہوتی ہے۔ یہ امام شافعی اور ابو ثور کا قول ہے۔ ازاعی نے کہا: وہ عمرہ کے ساتھ احرام کھول دے گا۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: یہ مکروہ ہے۔ امام مالک سے مروی ہے اور ان کا مشہور قول پورے سال میں حج کا احرام باندھنے کا جواب ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے، نخعی نے کہا: حج مکمل کرنے تک احرام کھولنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاِهْلَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَاجَّةِ** (البقرہ: 189) اس کے متعلق کلام گزر چکی ہے۔ امام شافعی کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ عام ہے اور یہ آیت خاص ہے یہ بھی احتمال ہے کہ عموم کے بعض اشخاص پر نص کے باب سے ہو کیونکہ ان مہینوں کو دوسرے مہینوں پر فضیلت ہے۔ اس پر امام مالک کا قول صحیح ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 5:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ** یعنی جس نے نیت کے ساتھ قصداً باطناً حج میں شروع ہو کر اپنے اوپر حج لازم کر دیا اور احرام کے ساتھ ظاہر فعل کے ساتھ اور تلبیہ کے ساتھ زبانی اپنے اوپر حج کو لازم کر لیا۔ یہ ابن حبیب کا قول ہے اور امام ابو حنیفہ نے کہا: جس نے تلبیہ کے ساتھ اپنے اوپر حج فرض کر لیا (1)۔ امام شافعی کے نزدیک تلبیہ ارکان حج میں سے نہیں ہے۔ یہ حسن بن حی کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: حج کے احرام میں نیت کافی ہے اور تلبیہ کو اہل ظاہر اور دوسرے علماء نے واجب کہا ہے۔ فرض کا لغوی معنی کاٹنا ہے اسی سے فرضۃ القوس والنہر والجبہل ہے۔ قوس کی شکاف کی جگہ، نہر سے پانی پینے کی جگہ، پہاڑ کا وہ حصہ جو اس کے وسط اور جانب سے لڑھک جائے۔ پس فرضیۃ الحج کا مطلب آزاد آدمی پر اس کا لازم ہونا ہے جس طرح تیر کیلئے شکاف ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فرض کا معنی علیحدہ کرنا ہے۔ یہ بھی قطع کے معنی کی طرف لوٹتا ہے کیوں کہ جو کسی چیز کو کاٹتا ہے تو وہ اسے دوسری چیز سے علیحدہ کرتا ہے اور من مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ اس کا معنی شرط ہے اور خبر فرض ہے کیونکہ من موصولہ نہیں ہے۔ فرمایا: رجل فرض۔ اور فرمایا فیہن اور فیہا نہیں فرمایا۔ بعض علماء نے فرمایا: استعمال میں دونوں برابر ہیں۔ مازنی ابو عثمان نے کہا: غیر ذوی العقول کی جمع کثیر واحد مونث کی طرف آتی ہے اور قلیل اس طرح نہیں آتی۔ تو کہتا ہے: الاجزاء انکسار، الجذوع انکسار۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ قول کرتا ہے: **ان عدة الشہود**۔ پھر فرمایا: منها۔

**مسئلہ نمبر 6:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَلَا تَرَفَّتْ** حضرت ابن عباس، ابن جبیر، سدی، قتادہ، حسن، عکرمہ، زہری، مجاہد اور مالک نے کہا: الرفٹ سے مراد جماع ہے (2)۔ یعنی جماع نہ ہو کیونکہ یہ حج کو فاسد کر دیتا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ وقوف عرفات سے پہلے جماع، حج کو فاسد کرنے والا ہے اور اس پر آئندہ سال حج اور ہدی دینا ہوگی۔ حضرت عبد اللہ بن عمر،



طاؤس، عطا وغیرہم نے فرمایا: الرفث سے مراد عورت کے ساتھ فحش کلام کرنا ہے۔  
اس کا قول: جب ہم احرام کھولیں گے تو ہم تیرے ساتھ ایسا کریں گے۔ یعنی بغیر کنایہ کے کہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے انہوں نے احرام کی حالت میں شعر میں کہا:

و من یشین بنا میسا ان تصدق الطیر تنک لمیسا

تو آپ کے ساتھی حصین بن قیس نے کہا: کیا تو احرام کی حالت میں رفث کرتا ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: الرفث وہ ہے جو عورتوں کے پاس کیا جائے۔ ایک قوم نے کہا: عورتوں کے ذکر کے ساتھ فحش کلام کرنا ہے خواہ وہ حاضر ہوں یا نہ ہوں۔ بعض نے کہا: الرفث ایک جامع کلمہ ہے۔ یہ ہر اس کو شامل ہے جو مرد، عورت سے چاہتا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: الرفث کا معنی لغو کلام ہے اور یہ شعر پڑھا ہے۔

و رب اسباب حیج کظم عن اللغا و رفث التحکم

کہا جاتا ہے: رفث یرفث، فاء کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ۔ حضرت ابن مسعود نے فلا رفث پڑھا ہے یعنی جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عربی نے کہا: فلا رفث سے مراد اس کی مشروعیت کی نفی ہے نہ کہ اس کے وجود کی نفی ہے کیونکہ ہم رفث حج میں پاتے ہیں اور اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خبر غلط واقع نہیں ہو سکتی۔ نفی اس کے مشروع اور وجود کی طرف لوٹتی ہے، محسوساً اس کے وجود کی طرف نہیں لوٹتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَالْمُطَلَّاتُ بِمَا نَفْسِهِنَّ ثَلَثَةٌ قُرْآنٌ (البقرہ: 228)** ہم طلاق والی عورتوں کو پاتے ہیں کہ وہ انتظار نہیں کرتی ہیں پس نفی حکم شرعی کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ وجود حسی کی طرف، یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے **لَا يَمْسُ إِلَّا الظَّهْرُ ۝ (الواقہ)** جب ہم کہتے ہیں یہ آدمیوں کے بارے میں وارد ہے اور یہ صحیح ہے۔ اس کا معنی ہے شرعاً آدمیوں میں سے اس کو بے وضو شخص نہیں چھونا اگر چھونا پایا گیا تو وہ شرع کے حکم کے خلاف ہو گا۔ یہ نکتہ علماء سے فوت ہو گیا انہوں نے کہا: خبر، نفی کے معنی میں ہوتی ہے۔ یہ کبھی نہیں پائی جاتی ہے اور اس کا پایا جانا صحیح بھی نہیں ہے یہ دونوں حقیقت مختلف ہیں و صفا متضاد ہیں۔

**مسئلہ نمبر 7:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تُسَوِّقُوا** اس سے مراد تمام گناہ ہیں یہ حضرت ابن عباس، عطا اور حسن کا قول ہے، اسی طرح حضرت ابن عمر اور ایک جماعت نے کہا: الفسوق کا معنی حج کے احرام کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا ہے جیسے شکار قتل کرنا، ناخن کاٹنا، بال نوچنا اور اس کے مشابہ گناہ کرنا ہے۔ ابن زید اور مالک نے کہا: الفسوق سے مراد بتوں کے لئے جانور ذبح کرنا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **وَأَفْسَقَ أَهْلُ لَغِيْرِ اللَّهِ بِهِ۔**

ضحاک نے کہا: الفسوق سے مراد برے القاب سے یاد کرنا ہے اسی سے ارشاد ہے: **بِئْسَ الْأَسْمُ الْفُسُوقُ۔** حضرت ابن عمر نے کہا: الفسوق سے مراد گالی دینا ہے۔ اسی سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے (1)۔“ پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ وہ تمام اقوال کو شامل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جس نے حج کیا اور

1۔ صحیح مسلم، باب المسلم فسق، صفحہ 58، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)۔ المحرر الوجیز، صفحہ 73-72، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

جماع اور گناہ نہ کیا تو وہ اس طرح لوٹا جیسے اس دن تھا جس میں اسے اس کی والدہ نے جنم دیا تھا (1) اور مقبول حج کی جزا صرف جنت ہے (2)۔ یہ مسلم وغیرہ نے نقل کی ہے اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے آسمان اور زمین کے درمیان اللہ کے راستہ میں جہاد اور مقبول حج سے بہتر عمل کوئی نہیں جس میں جماع، فسق اور جھگڑا نہ ہو (3)۔ فقہاء نے کہا: حج مقبول وہ ہے جس کی ادائیگی کے دوران اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی ہو۔ فراء نے کہا: وہ ہے جس کے بعد اللہ کی نافرمانی نہ کی ہو۔ یہ دونوں قول ابن عربی نے ذکر کئے ہیں۔ میں کہتا ہوں: حج مبرور وہ ہے جس میں اور جس کے بعد اللہ کی نافرمانی نہ کرے۔ حسن نے کہا: حج مبرور یہ ہے کہ وہ لوٹے تو دنیا سے دلچسپی نہ رکھتا ہو اور آخرت سے رغبت رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔

**مسئلہ نمبر 8:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا جَدَالَ فِي الْحَجِّ، فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ رَفْعٍ اور تنوین کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور بغیر تنوین کے نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور وَلَا جَدَالَ میں فتح پر اجماع ہے۔ یہ پہلے کلمات میں نصب کی قراءت کو تقویت دیتا ہے کیونکہ مقصود رفث، فسوق اور جدال سے عام نفی ہے تاکہ منفی کے عموم میں ایک نظام پر کلام ہو جائے۔ نصب پر اکثر قراء ہیں۔ تینوں اسماء محل رفع میں ہیں ہر ایک لا کے ساتھ ہے اور فی الْحَجِّ تمام کی خبر ہے اور رفع کی قراءت کی وجہ یہ ہے کہ لا بمعنی لیس ہے۔ پس اس کے بعد اسم مرفوع ہوا کیونکہ وہ اس کا اسم ہے اور خبر مخذوف ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: فلیس رفث ولا فسوق فی الحج۔ اور اس پر دلیل فی الحج کا قول ہے اور دوسرا ظاہر ہے وہ لا جدال کی خبر ہے۔ ابو عمرو بن العلاء نے کہا: رفع اس معنی میں ہوگا: فلا یكون رفث ولا فسوق۔ یعنی ہر ایسا عمل جو حج سے نکالتا ہے پھر نفی کی ابتدا کی۔ فرمایا: وَلَا جَدَالَ۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ کان تامہ ہو۔ جیسے اس قول میں ہے: وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ (بقرہ: 280)۔ تو یہ خبر کا محتاج نہیں ہوتا اور یہ بھی احتمال ہے کہ کان ناقصہ ہو اور خبر مخذوف ہو جیسا کہ ابھی گزرا ہے۔ اور رفث اور فسوق کو رفع دینا بھی جائز ہے مبتدا کی حیثیت سے اور لافنی کے لئے ہو اور خبر مخذوف ہو۔ ابو جعفر بن قعقاع نے تینوں میں رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض طرق میں عاصم سے یہ مروی ہے۔ اس صورت میں فی الحج تینوں کی خبر ہوگا جیسا کہ ہم نے نصب کی قراءت کے بارے میں کہا اور فی الحج کا قراءت کے اختلاف کے ساتھ تمام کی خبر ہونا اچھا نہیں کیونکہ لیس کی خبر منصوب ہوتی ہے اور ولا جدال کی خبر مرفوع ہوتی ہے کیونکہ ولا جدال پہلے سے علیحدہ کیا گیا ہے یہ مبتدا کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور ایک اسم میں دو فاعل نہیں ہوتے اور فلا رفث ولا فسوق جائز ہے۔ مقام پر عطف ہے۔ نحو یوں نے یہ شعر پڑھا ہے:

لا نسب الیوم ولا حلة اتسع الخرق علی الراقع

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل الحج والعمرة، صفحہ 436، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل یوم عرفہ، صفحہ 436، جلد 1

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، بیان کون الایمان باللہ الفضل الاکمال، صفحہ 462، جلد 1

نہ اس دن نسب کا فائدہ ہوگا نہ دوستی ہوگی چیتھڑے والے پر بھٹن زیادہ ہوگی۔

اور کلام میں فلا رفت ولا فسوق ولا جدال فی الحج لفظ پر عطف کے اعتبار سے جو لا میں واجب تھا یہ فراء نے کہا ہے اور

اس کی مثال یہ ہے:

فلا أب وابنا مثل مروان و ابنه اذا هو بالمجد ارتدئ و تأزراً

نہ باپ، نہ بیٹا مروان اور اس کے بیٹے کی مثل ہے جب اس نے بزرگی کی چادر اوڑھی اور تہبند باندھا۔

ابو رجاء عطاردی نے کہا فلا رفت ولا فسوق دونوں میں نصب کے ساتھ اور ولا جدال رفع اور تنوین کے ساتھ۔ انھش نے کہا:

هذا وجد كم الصغار بعينه لا امر لى ان كان ذاك ولا اب

یہ اور تمہارا ذلیل دادا میرے لئے نہ ماں ہو نہ باپ اگر وہ ہو۔

بعض علماء نے کہا: فلا رفث ولا فسوق کا معنی نہیں ہے، یعنی لا ترفثوا ولا تفسقوا۔ اور ولا جدال کا معنی نفی ہے۔ جب

معنی میں اختلاف ہے تو لفظ میں بھی اختلاف کیا گیا۔ قشیری نے کہا: اس میں نظر ہے کیونکہ کہا گیا ہے کہ ولا جدال بھی نہیں ہے یعنی لا تجادلوا پھر ان کے درمیان کیوں فرق کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 9:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا جَدَالَ یہ مجادلہ سے فعال کے وزن پر ہے یہ جدل سے مشتق ہے جس کا معنی قتل کرنا ہے اسی سے زمام مجدول ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ الجدالہ سے مشتق ہے جو زمین ہے۔ گویا ہر شخص اپنے مخالف کے مقابلہ میں کھڑا ہوتا ہے حتیٰ کہ اس پر غالب آتا ہے۔ پس وہ اس شخص کی مانند ہوتا ہے جس نے مخالف کو زمین پر مارا۔

شاعر نے کہا:

قد اركب الآلة بعد الآلة و اترك العاجز بالجدالة

منعفاً ليست له محالة

**مسئلہ نمبر 10:** علماء نے ان الفاظ کے مرادی معنی میں چھ مختلف اقوال ذکر کئے ہیں۔ حضرت ابن مسعود، حضرت

ابن عباس اور عطاء نے کہا: الجدال کا یہاں معنی یہ ہے کہ تو کسی مسلمان سے جھگڑے حتیٰ کہ تو اس پر ناراض ہو اور وہ گالی تک

پہنچ جائے۔ رہا مذاکرہ علم تو اس سے نہیں ہے۔ قتادہ نے کہا: الجدال سے مراد گالی دینا ہے، حضرت ابن زید اور حضرت

مالک بن انس نے کہا: یہاں الجدال سے مراد لوگوں کا اختلاف ہے کہ کس نے حضرت ابراہیم کے موقف کو پایا جیسا کہ وہ

زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے جب قریش دوسرے عربوں سے مختلف جگہ پر ٹھہرتے تھے پھر اس کے بعد جھگڑتے تھے۔ اس

تاویل پر معنی یہ ہوگا کہ ابراہیم کے موقف کے بارے میں نہ جھگڑو۔ ایک طائفہ نے کہا: الجدال سے مراد یہ ہے کہ ایک گروہ

کہے کہ آج حج ہے اور دوسرا کہے کہ کل حج ہے۔ مجاہد اور ان کے ساتھ ایک طائفہ نے کہا: الجدال سے مراد مہینوں کے بارے

میں جھگڑنا ہے جیسا نسو (1) (ایک مہینہ کو مؤخر کرنا، دوسرے کو مقدم کرنا) میں عربوں کا معمول تھا، کبھی وہ حج کو ذی الحجہ کے



علاوہ مہینے میں کرتے تھے۔ بعض مزدلفہ میں ٹھہرتے، بعض عرفہ میں ٹھہرتے اور درست مقام میں ٹھہرنے کے بارے میں جھگڑتے تھے (ہر ایک کہتا: میں ٹھیک ہوں)

میں کہتا ہوں: ان دو تاویلوں پر معنی ہوگا نہ وقت میں جھگڑو، نہ ٹھہرنے کی جگہ میں جھگڑو۔ یہ قول زیادہ درست ہے جو وِلا جدال کے بارے میں بیان کئے گئے ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: زمانہ اس دن کی ہیئت پر گھوم آیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا (1) (الحديث) مزید بیان سورہ برأت میں آئے گا۔ یعنی حج کا امر اسی جہت پر لوٹ آیا جس پر تھا یعنی اس دن اور وقت پر لوٹ آیا۔ نبی کریم ﷺ نے جب حج فرمایا تو فرمایا: ”مجھ سے مناسک حج سیکھ لو (2)“ اس کے ساتھ آپ نے حج کے مواقف اور مواضع بیان فرمائیں۔ محمد بن کعب قرظی نے بتایا کہ جدال یہ ہے کہ ایک طائفہ کہتا ہمارا حج، تمہارا حج سے زیادہ درست ہے دوسرا بھی اسی طرح کہتا (3)۔ بعض نے فرمایا: الجدال سے مراد اپنے آباء و اجداد پر فخر کرنا ہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ نمبر 11:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمُهُ اللّٰهُ شَرْطٌ اور جواب شرط ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا دے گا کیونکہ عالم میں کسی چیز کے بدلے جزا واقع ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ بخش کلام کی جگہ حسن کلام پر برا بیخنتہ کرنا ہے اور فسوق و جدال کی جگہ اخلاق میں تقویٰ اور نیکی پر ابھارنا ہے۔ بعض نے فرمایا: خیر (نیکی) کے فعل کو ضبط نفس سے تعبیر کیا ہے تاکہ وہ عمل نہ پایا جائے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے۔

**مسئلہ نمبر 12:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَتَزَوَّدُواْ زَادِرَاهُ** ساتھ لینے کا حکم ہے۔ حضرت ابن عمر، عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور ابن زید نے کہا: یہ آیت عربوں کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی جو حج پر بغیر زادراہ کے آتے تھے۔ بعض کہتے ہیں: ہم بیت اللہ کا حج کیسے کریں گے وہ ہمیں کھانا نہیں کھلائے گا؟ وہ لوگوں پر بوجھ بن جاتے تھے۔ انہیں اس عمل سے منع کیا گیا اور انہیں زادراہ ساتھ لانے کا حکم دیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے کہا: لوگ زادراہ کے سلسلہ میں ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے تھے تو انہیں زادراہ کا حکم دیا گیا (4) اور نبی کریم ﷺ کا حج کے سفر میں ایک اونٹ تھا جس پر زادراہ تھا۔ آپ کے پاس مزینہ قبیلہ کے تین سو آدمی آئے جب انہوں نے واپس جانے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عمر! ان لوگوں کو زادراہ دو۔ بعض لوگوں نے کہا: تَزَوَّدُواْ کا مطلب ہے نیک صالح دوست ساتھ لو۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تخصیص ضعیف ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ تم اپنی آخرت کے لئے اعمال صالحہ کا زادراہ ساتھ لو (5)۔

میں کہتا ہوں: پہلا قبول واضح ہے کیونکہ زاد سے مراد حج کے سفر میں کھانے کا سامان ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: اہل یمن حج کرتے تھے اور زاد راہ ساتھ نہیں لاتے تھے اور کہتے

1- صحیح مسلم، کتاب القسامۃ، تغلیظ تحریم الدماء والاعراض، صفحہ 60، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2- ایضاً، کتاب الحج، لتأخذوا عنی مناسککم، صفحہ 419، جلد 1  
3- المحرر الواجیز، صفحہ 273، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

5. الشا

4- المحرر الوجيز، صفحہ 273، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

تھے ہم توکل کرنے والے ہیں جب مکہ مکرمہ آئے تو لوگوں سے سوال کرتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ یہ اس میں نص ہے جو ہم نے ذکر کیا۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ شعبی نے کہا الزاد سے مراد چھوارے اور ستو ہے۔ ابن جبیر نے کہا: کیک اور ستو ہے۔ ابن عربی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں زادراہ کا حکم دیا جن کے پاس مال تھا اور جن کے پاس مال نہیں تھا اگر وہ کوئی پیشہ رکھتا ہے تو راستہ میں اس کو استعمال کرے یا ساکن ہے تو اسے خطاب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خطاب فرمایا جو مال والے تھے اور مال چھوڑ جاتے تھے اور بغیر زادراہ کے نکلتے تھے اور کہتے تھے ہم توکل کرنے والے ہیں، توکل کی شرائط ہیں جو ان شرائط کو بجالائے تو وہ زادراہ کے بغیر نکلے اور وہ خطاب میں داخل نہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے عام مخلوق کے اعتبار سے حکم فرمایا عام لوگ توکل کے درجہ سے قاصر ہوتے ہیں اور اس کے حقائق سے غافل ہوتے ہیں (1)۔ ابو الفرج جوزی نے کہا: ابلیس نے اس قوم پر تلبیس کی جو توکل کا دعویٰ کرتے اور وہ بغیر زادراہ کے نکلتے اور گمان کرتے کہ یہ توکل ہے۔ وہ انتہائی خطا پر ہیں۔ ایک شخص نے امام احمد بن حنبل سے کہا: میں چاہتا ہوں کہ میں مکہ کی طرف توکل کرتے ہوئے بغیر زادراہ کے جاؤں۔ امام احمد نے اسے کہا: بغیر قافلہ کے جاؤ، اس نے کہا نہیں قافلہ کے ساتھ جاؤں گا۔ امام احمد نے فرمایا: لوگوں کے برتن پر تو توکل کرے گا۔

**مسئلہ نمبر 13:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ بہتر زادراہ منہیات سے بچنا ہے۔ پس اللہ نے انہیں زادراہ کے ساتھ تقویٰ کو ملانے کا حکم دیا اور فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ اپنے معنی پر معمول ہے کیونکہ تَزَوَّدُوا کا معنی ہے اس حکم کی اتباع میں اللہ سے ڈرو جو تمہیں زادراہ ساتھ لے جانے کا دیا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس معنی کا احتمال رکھتا ہے کہ بہتر زادراہ ہے جس کے ساتھ مسافر ہلاکت سے اور سوال کرنے اور ہاتھ پھیلانے کی حالت سے بچ جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس آیت میں تنبیہ ہے کہ یہ دنیا، قرار کی جگہ نہیں ہے۔ اہل اشارات نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو آخرت کا سفر یاد دلایا اور انہیں تقویٰ کے زاد پر ابھارا، تقویٰ آخرت کا زاد ہے۔ اعشی نے کہا: جب تو تقویٰ کے زادراہ کے بغیر کوچ کرے گا اور مرنے کے بعد ان سے ملے گا جو زادراہ ساتھ لے گئے ہیں تو تو شرمندہ ہوگا کہ تو ان کی مثل نہیں ہے۔ تو نے اس طرح اعمال کی نگرانی نہ کی جس طرح انہوں نے کی تھی۔ ایک اور شاعر نے کہا: موت ایک موجیں مارنے والا سمندر ہے اس میں تیرنے والے کا حیلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اے نفس! میں کہنے والا ہوں پس تو ایک مشفق ناصح سے بات سن، انسان کے ساتھ قبر میں تقویٰ اور عمل صالح کے علاوہ کچھ نہیں جاتا۔

**مسئلہ نمبر 14:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللَّهَ يَأْخُذْ بِالْأَلْبَابِ اللہ تعالیٰ نے عقل والوں کو خاص فرمایا اگرچہ معاملہ تمام کو شامل ہے کیونکہ ان پر اللہ کی حجت قائم ہوئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کو پانے والے ہیں اور انہیں قائم رکھنے والے ہیں۔ الباب، جمع ہے لب کی اور لب ہر چیز کے خالص حصہ کو کہتے ہیں اسی وجہ سے عقل کو بھی لب کہا جاتا ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے ابو اسحاق کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا: کیا تو عرب کلام میں مضاعف میں سے کوئی ایسی

چیز جانتا ہے جو فعل کے وزن پر آئی ہو؟ میں نے کہا: ہاں، سیبویہ نے یونس سے حکایت کیا ہے: لبیت تلب۔ انہوں نے اس کی تحسین کی اور کہا: میں اس کی مثال نہیں جانتا۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَتٍ فَأَذْكُرُوا  
اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۚ وَادْكُرُوا كَمَا هَدَيْتُمْ ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ لَمَنِ  
الضَّالِّينَ ۝

”نہیں ہے تم پر کوئی حرج (اگر حج کے ساتھ ساتھ) تم تلاش کرو اپنے رب کا فضل (رزق) پھر جب واپس آؤ عرفات سے تو ذکر کرو اللہ کا مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس اور ذکر کرو اس کا جس طرح اس نے تمہیں سکھایا اور اگرچہ تم اس سے پہلے گمراہوں میں سے تھے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ  
اس میں دو مسئلے ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جُنَاحٌ اس کا مطلب ہے: گناہ۔ یہ لَيْسَ کا اسم ہے اَنْ تَبْتَغُوا۔ لَيْسَ کی خبر کی حیثیت سے محل نصب میں ہے یعنی فی ان تبتغوا۔ خلیل اور کسائی کے قول پر محل جر میں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حج کو رفت، فسق، جدال سے پاک رکھنے کا حکم دیا تو تجارت کی رخصت دی۔ یعنی اللہ کا فضل تلاش کرنے میں تم پر کوئی حرج نہیں۔ ابتغاء الفضل (فضل کا تلاش کرنا) قرآن میں تجارت کے معنی میں وارد ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَأَنْتُمْ شُرَآءُ فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ (الجمعة: 10) اس کی صحت پر دلیل بخاری کی حدیث ہے جو انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، فرمایا: عکاظ، مجنہ اور ذوالحجاز زمانہ جاہلیت میں بازار تھے پس لوگ حج کے موسم میں تجارت کرنا گناہ سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی لیس عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ، فی مواسم الحج۔ (1)

**مسئلہ نمبر 2:** جب یہ اس آیت میں ثابت ہے، تجارت کا قصد شرک نہیں ہوگا اور مکلف اخلاص سے نہیں نکلے گا جو اخلاص اس پر فرض تھا۔ فقراء کا قول اس کے خلاف ہے۔ حج بغیر تجارت کے افضل ہے تاکہ عبادت دنیا کی آلائشوں سے پاک رہے اور دل عبادت کے علاوہ کسی چیز سے معلق نہ ہو۔ دارقطنی نے امی سنن میں ابو امامہ التیمی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر سے کہا: میں اس راستہ میں کرایہ پر جانور دیتا ہوں (2) اور لوگ کہتے ہیں تیراج نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے اس کی مثل سوال کیا جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔ آپ ﷺ خاموش ہو گئے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تیراج ہے (3)۔“

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، لیس علیکم جناح، صفحہ 648، جلد 2 (وزارت تعلیم) 2۔ معالم التنزیل، صفحہ 253، جلد 1 (دار الفکر)

3۔ سنن دارقطنی، کتاب الحج، المواقیف، صفحہ 292، جلد 2 (قاہرہ)



فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِنْ عَرَفَتٍ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَادْكُرُوهُ كَمَا هَدَيْتُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنِ  
الضَّالِّينَ ۝ اس میں سولہ مسائل ہیں (☆):

**مسئلہ نمبر 1:** فَإِذَا أَقَضْتُمْ یعنی جب تم چلو۔ کہا جاتا ہے: فاض الاناء۔ جب برتن بھر جائے حتیٰ کہ کناروں سے پھلکنے لگے۔ رجل فیاض، بہت زیادہ عطا کرنے والا۔ زہیر نے کہا۔

وابيض فياض يده غامة على معتيه ما تغت فواضله  
سفید، اس کے ہاتھ طلب گاروں پر بادل کی طرح سخاوت کرتے ہیں اس کی عطاء داغی ہے۔  
اور حدیث مستفیض۔ مشہور حدیث۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ عَرَفَتْ قَرَاءِ كِي جَمَاعَتِ نِي عَرَفَتْ كوتونین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عورت کا نام مسلمات رکھا جائے تو اسے تونین کے ساتھ پڑھا جائے گا کیونکہ تونین منصرف اور غیر منصرف کے درمیان فرق کرنے کے لئے نہیں ہے تاکہ تو اسے حذف کرے۔ یہ تو مسلمین میں جنون ہے اس کے قائم مقام ہے۔ نحاس نے کہا: یہ عمدہ ہے۔ سیہویہ نے عربوں سے، عرفات سے تونین کا حذف حکایت کیا ہے۔ کہتا ہے: هذه عرفات يا هذا و رایت عرفات يا هذا۔ (تا کے کسرہ کے ساتھ اور بغیر تونین کے) جب عربوں نے اسے معرفہ بنایا تو تونین کو حذف کیا۔ انخفش اور کوفیوں نے تا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ فاطمہ اور طلحہ کی تا کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے اور انہوں نے بطور استشہاد یہ شعر پڑھا ہے:

تنورتها من اذرعات واهلها بيثوب ادنى دارها نظر عال (1)  
اس میں اذرعات پر فتح پڑھا ہے۔

پہلا قول عمدہ ہے، اس میں تونین وہی ہے جو مسلمات میں ہے کسرہ مسلمین میں یا کے مقابلہ میں ہے اور تونین (2)، نون کے مقابل ہے۔ عرفات، اسم علم ہے جمع کے ساتھ نام رکھا گیا ہے جیسے اذرعات۔ بعض نے فرمایا: اس کے ارد گرد کی وجہ سے اسے عرفات کہا جاتا ہے جیسے ارض سیاسب (چنیل زمین) بعض نے فرمایا: اس جگہ کو عرفات اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ لوگ وہاں ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ نام اس لئے رکھا کیونکہ جب ہند میں حضرت آدم علیہ السلام اترے اور حضرت حوا جدہ میں اتریں جو بہت لمبی مدت تلاش کے بعد عرفہ کے دن عرفات میں جمع ہوئے اور ایک دوسرے سے متعارف ہوئے، اس دن کو اسی وجہ سے عرفہ کہا جاتا ہے وہ جگہ عرفات کہلائی۔ یہ ضخاک کا قول ہے۔ بعض نے اس کے علاوہ اقوال کہے ہیں جو ذہنا مٹا سکتا (البقرہ: 128) کے قول کے تحت گزر چکا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ یہ اسم مرتجل (☆☆) ہے جس طرح تمام جگہوں کے نام ہیں۔ عرفہ یہ نعبان الاراک ہے۔ اس کے متعلق شاعر نے کہا:

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 274، جلد 2 (دار الکتب العلمیہ)

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 345، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیہ)

☆ متن میں اسی طرح ہے جب کہ تفصیل میں اٹھارہ مسائل ہیں

☆☆ ایک اصطلاح ہے جو مقول کے مقابل ہے مقول اس کو کہتے ہیں پہلے کسی اور کے لیے وضع کیا جائے بعد میں اسم میں استعمال ہو۔ مرتجل جو ابتدا سے ہی اس کے لیے استعمال ہوا۔

تَزُودُ مِنْ نَعْمَانِ عَوْدِ اِرَاكَةِ لَهْنَدٍ وَلَكِنْ مِنْ يَبْلُغِ هِنْدَا (1)

میں نے ہند کے لئے عرفات سے سامان لیا لیکن ہند کو کون یہ پہنچائے گا۔

یہ عرف سے ماخوذ ہے جس کا مطلب خوشبو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عرفہا لہم۔ یعنی اللہ نے اس کو ان کے لئے پاک کیا..... یہ پاک جگہ ہے بخلاف منیٰ کے جہاں جانوروں کی غلاظت اور خون ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو عرفات کہا جاتا ہے اور وقوف کے دن کو یوم عرفہ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا: ان دو اسموں کی اصل صبر ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل عارف جب کوئی شخص صبر کرنے والا، خشوع کرنے والا ہو۔ ضرب المثل ہے: النفس عروف وما حملتها تتحمل۔ نفس صبر کرنے والا ہے جو تو اس کو برداشت کرائے گا یہ برداشت کرے گا۔

فصبرت عارفة لذلك حرةً یعنی میرا نفس صبر کرنے والا آزاد ہے۔

ذوالرمہ نے کہا:

عروف لما خطت عليه البقادر وہ صبر کرنے والا ہے جو اس پر تقدیر نے لکھا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر صبر کرنے والا ہے۔ اس اسم کے ساتھ نام رکھا گیا ہے کیونکہ حاجی خضوع و خشوع کا اظہار کرتے ہیں اور دعا پر صبر کرتے ہیں، مختلف مصائب اور تکلیف برداشت کرتے ہیں تاکہ حج کی عبادت کو قائم کریں۔

**مسئلہ نمبر 3:** اہل علم کا اجماع ہے کہ جو عرفہ کے دن، عرفہ میں زوال سے پہلے ٹھہرا پھر وہاں سے زوال سے پہلے چلا گیا تو اس کا وقوف شمار نہیں ہوگا اور علماء کا اجماع ہے کہ اس کا حج مکمل ہے جو زوال کے بعد ٹھہرا اور رات سے پہلے دن کے وقت چلا گیا مگر امام مالک بن انس نے فرمایا کہ وہ رات کا کچھ حصہ موقف میں گزارے، رہا وہ شخص جو رات کے وقت عرفہ میں ٹھہرا اس کے حج کے مکمل ہونے میں امت کے درمیان اختلاف نہیں ہے اور جمہور کی حجت مطلق یہ ارشاد ہے قَدْ أَفْضَيْتُمْ فَمِنْ عَرَفَاتٍ اس ارشاد میں دن سے رات کو خاص نہیں فرمایا اور حضرت عروہ بن معمر کی حدیث ہے فرمایا میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا جبکہ آپ مزدلفہ میں تھے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں طی کے دو پہاڑوں سے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں، میں نے اپنی سواری کو تھکا دیا ہے اور اپنے نفس کو بھی تھکا دیا ہے اللہ کی قسم میں نے کوئی پہاڑ نہیں چھوڑا مگر میں اس پر ٹھہرا، کیا میرے لئے حج ہے یا رسول اللہ!؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ہمارے ساتھ صبح کی مزدلفہ میں نماز پڑھی اور اس سے پہلے وہ رات یا دن کے وقت عرفات میں آچکا تھا تو اس نے حج کے مناسک پورے کر دیئے اور اس کا حج مکمل ہوا (2)۔ اس حدیث کو بہت سے ائمہ نے نقل کیا ہے ان میں سے ابو داؤد، نسائی اور دارقطنی ہیں یہ لفظ دارقطنی کے ہیں۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابو عمر نے کہا حضرت عروہ بن معمر میں طائی کی حدیث ثابت صحیح ہے۔ اس کو شعبی کے اصحاب میں سے ایک جماعت نے شعبی سے اور انہوں نے عروہ بن معمر سے روایت کیا ہے۔ ان میں سے اسماعیل بن ابی خالد،

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 274، جلد 2 (دارالکتب العلمیہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب المناسک، ما جاء من ادراك الامام، صفحہ 109، جلد 1 (وزارت تعلیم)

داؤد بن ابی ہند، زکریا بن ابی زائدہ، عبد اللہ بن ابی السفر اور مطرف ہیں۔ ان سب نے شعبی سے انہوں نے عروہ بن مضر بن اوس بن حارثہ بن لام سے روایت کیا ہے۔ امام مالک کی حجت، سنت ثابتہ سے حضرت جابر کی طویل حدیث ہے جس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس میں ہے: آپ ﷺ ٹھہرے رہے حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا اور تھوڑی زردی چلی گئی حتیٰ کہ سورج کی نکلیہ غائب ہو گئی اور آپ ﷺ کے افعال وجوب پر ہیں خصوصاً حج کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ سے اپنے مناسک حج لے لو (1)۔

**مسئلہ نمبر 4:** جمہور کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو سورج غروب ہونے سے پہلے عرفات سے چلا گیا اور واپس نہ آیا اس پر حج کی صحت کے ساتھ کیا لازم ہے؟ حضرات عطاء، سفیان ثوری، شافعی، احمد، ابو ثور اور اصحاب رائے وغیرہ نے کہا: اس پر بکری ہے۔ حسن بصری نے کہا: اس پر ہدی ہے۔ ابن جریج نے کہا: اس پر اونٹ ہے۔ مالک نے کہا: اس پر آئندہ سال حج ہے اور ہدی کو وہ آئندہ نحر کرے گا وہ اس شخص کی مانند ہے جس کا حج فوت ہو گیا۔ اگر وہ عرفہ کی طرف لوٹ آیا پھر سورج غروب ہونے کے بعد نکلا تو امام شافعی نے فرمایا: اس پر کوئی چیز نہیں ہے۔ یہی احمد، اسحاق اور داؤد کا قول ہے۔ طبری نے بھی یہی کہا ہے۔ امام ابو حنیفہ، ان کے اصحاب اور ثوری نے کہا: اس سے دم ساقط نہ ہوگا اگرچہ وہ سورج غروب ہونے کے بعد لوٹ آئے یہی ابو ثور کا قول ہے۔

**مسئلہ نمبر 5:** علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو سواری پر قادر ہو اس کے لئے سوار ہو کر عرفہ میں وقوف کرنا افضل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے عرفہ سے جانے تک سورج کے غروب ہونے کے بعد سواری پر وقوف کیا اور حضرت اسامہ بن زید کو آپ ﷺ نے اپنے پیچھے بٹھایا ہوا تھا۔ یہ حضرت جابر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی حدیث میں محفوظ ہے۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں بھی ہے۔ حضرت جابر نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ سوار ہوئے حتیٰ کہ موقف میں آئے اپنی اونٹنی قصواء کا بطن جبل رحمت کے نیچے پتھروں کی طرف کیا اور پیدل چلنے والوں کے راستہ کو سامنے رکھا اور قبلہ کی طرف منہ کیا اور آپ سورج کے غروب ہونے تک ٹھہرے رہے اور زردی تھوڑی سی چلی گئی حتیٰ کہ سورج کی نکلیہ غائب ہو گئی اور حضرت اسامہ بن زید کو آپ نے اپنے پیچھے بٹھایا ہوا تھا (2) (الحدیث) اگر سواری پر سوار ہونے پر قادر نہ ہو تو اپنے قدموں پر دعا مانگتا ہوا کھڑا ہو جب تک طاقت رکھتا ہے اور کھڑے ہونے پر قادر نہ ہو تو بیٹھنے میں بھی کوئی حرج نہیں، سوار ہو کر وقوف کرنے میں مباحات اور حج کی تعظیم ہے۔ وَمَنْ يُعِظْمُ شَعًا بِرَأْسِهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (الحج)

ابن وہب نے اپنے مؤطا میں کہا: مجھے مالک نے کہا: عرفہ میں وقوف سواری اور اونٹ پر وقوف میں نزدیک کھڑا ہو کر وقوف کرنے سے میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے اور جو کھڑا ہو کر وقوف کرے اس کے آرام کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

**مسئلہ نمبر 6:** صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ آپ ﷺ جب عرفہ سے چلے تو تھوڑے

1۔ السنن الکبری، کتاب الحج، الايضاحی وادی محسن، صفحہ 125، جلد 5 (دار الفکر)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجة النبی ﷺ، صفحہ 398، جلد 1 (تدیی کتب خانہ)



تیز چلتے جب کھلی جگہ پاتے تو مزید تیز چلتے (1)۔ ہشام بن عروہ نے کہا: نص، عنق سے زیادہ تیز چلنا ہے۔ اسی طرح حاجیوں کے اماموں اور دوسرے لوگوں کو چلنا چاہئے کیونکہ مزدلفہ کی طرف جلدی چلنا، نماز کی طرف جلدی چلنا ہے اور یہ مسلم ہے کہ مغرب کی نماز اس رات مزدلفہ میں عشاء کی نماز کے ساتھ پڑھی جاتی ہے، یہ سنت ہے۔ جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

**مسئلہ نمبر 7:** قرآن اور سنت ثابتہ کا عموم ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عرفہ سارا موقف ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں یہاں ٹھہرا اور عرفہ سارا موقف ہے (2)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے حضرت جابر کی طویل حدیث سے روایت کیا ہے۔ مؤطا امام مالک میں ہے انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عرفہ سارا موقف ہے اور بطن عرنہ سے بلند رہو۔ اور مزدلفہ سارا موقف ہے اور بطن محسر سے بلند رہو (3) (یعنی ان میں نہ ٹھہرو) اسی طرح حفاظ ثقات اور اہل حدیث میں سے اثبات لوگوں نے جعفر بن محمد کی حدیث سے نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ ابو عمر نے کہا: فقہاء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے وادی عرفہ میں وقوف کیا۔ ابن منذر نے مالک سے ان کا قول ذکر کیا ہے کہ وہ شخص بکری دے اور اس کا حج مکمل ہے۔ یہ روایت خالد بن زرار نے مالک سے روایت کی ہے، ابوالمصعب نے کہا کہ وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے وقوف کیا ہی نہیں اور اس کا حج فوت ہے اس پر آئندہ سال حج ہے جب وہ بطن عرنہ میں ٹھہرا ہو۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: جو وادی عرنہ سے چلا اس کا حج نہیں یہ ابن قاسم اور سالم کا قول ہے ابن منذر نے یہ قول امام شافعی سے روایت کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا: میں بھی یہی کہتا ہوں کہ وہ اس جگہ پر نہ ٹھہرے جہاں رسول اللہ ﷺ نے نہ ٹھہرنے کا حکم دیا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: عرفہ سے بطن عرنہ کی استثناء ایسی نہیں ہے جس کی حجت لازم ہو، نہ نقل کی جہت سے اور نہ اجماع کی جہت سے، اور جو ابوالمصعب کے مذہب پر چلتے ہیں۔ ان کی حجت یہ ہے کہ عرفہ کا وقوف فرض ہے اس پر اجماع ہے اور یہ معین جگہ میں ہے۔ پس اس کی ادائیگی یقین کے ساتھ ہی ہوگی اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوتا بطن عرنہ راء کے فتح اور راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ یہ عرفہ کی مسجد کے مغربی جانب ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا: عرفہ کی مسجد کی مغربی دیوار اگر گرے گی تو وہ بطن عرنہ میں گرے گی۔ الباجی نے ابن حبیب سے روایت کیا ہے کہ عرنہ حل میں ہے اور عرفہ حرم میں ہے۔ ابو عمر نے کہا: رہی بطن محسر تو کعبہ نے ذکر کیا ہے ہمیں سفیان نے بتایا انہوں نے ابو زبیر سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ بطن محسر میں تیز چلے (4)۔

**مسئلہ نمبر 8:** نو ذی الحجہ کو عرفہ کے علاوہ دوسری مساجد میں اہل عرفہ سے تشبیہ اختیار کرتے ہوئے جمع ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شعبہ نے قتادہ سے انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے، فرمایا: سب سے پہلے حضرت ابن عباس نے یہ بصرہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، الاضافة من عرفات الى المزدلفة، صفحہ 417، جلد 1

2۔ صحیح مسلم، ایضاً، کتاب الحج، حجة النبي ﷺ، صفحہ 400، جلد 1

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، الوقوف يعرفه، صفحہ 410 (وزارت تعلیم)

4۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جاء في الاضافة من عرفات، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)

میں کیا تھا یعنی نویں ذی الحجہ کے دن لوگوں کا بصرہ کو عرفہ کے دن خطبہ دیتے ہوئے دیکھا جبکہ لوگ ان کے پاس جمع تھے۔ اثرم نے کہا: میں نے امام احمد بن حنبل سے عرفہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں لوگوں کے جمع ہونے کے متعلق پوچھا جو عرفہ کے دن جمع ہوئے ہیں تو امام احمد بن حنبل نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں اس میں کوئی حرج نہیں کئی لوگوں نے ایسا کیا ہے۔ حسن، بکر، ثابت اور محمد بن واسع عرفہ کے دن مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 9:** نویں ذی الحجہ کی فضیلت: نویں کے دن کی بہت بڑی فضیلت ہے اور بہت بڑا ثواب ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ بڑے بڑے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور نیک اعمال کو اس میں کئی گنا کیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نویں کے دن کا روزہ گزشتہ اور باقی سال کے گناہوں کا کفارہ ہے (1)۔ اس کو ”الصبح“ میں نقل کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: افضل دعا عرفہ کے دن کی دعا ہے اور اس میں سے افضل وہ ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے نبیوں نے کہا: لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ (2)۔ دارقطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عرفہ کے دن سے زیادہ اللہ تعالیٰ کسی دن میں آگ سے زیادہ لوگوں کو آزاد نہیں فرماتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی شان کے لائق قریب ہوتا ہے پھر فرشتوں کے سامنے مباہات فرماتا ہے، جو انہوں نے ارادہ کیا اسے بیان فرماتا ہے (3)۔ اور مؤطا میں عبید اللہ بن کریم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شیطان عرفہ کے دن سے زیادہ کسی دن ذلیل و حقیر، دھتکارا ہوا اور غصہ میں نہیں دیکھا جاتا یہ نہیں ہوتا مگر اس لئے کہ جو رحمت کا نزول اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے گناہوں سے تجاوز دیکھتا ہے۔ مگر بدر کے دن جو اس نے (مسلمانوں کے لیے فرشتوں کی مدد) دیکھی (تو اتنا ہی پریشان و ذلیل ہوا تھا) پوچھا گیا: یا رسول اللہ! بدر کے دن شیطان نے کیا دیکھا تھا؟ فرمایا: اس نے جبریل کو دیکھا کہ وہ فرشتوں کی صفوں کو جنگ کے لئے ترتیب دے رہا ہے (4)۔ ابو عمر نے کہا: یہ حدیث ابوالنضر اسماعیل بن ابراہیم عجلی نے مالک سے انہوں نے ابراہیم بن ابی عیلہ سے انہوں نے طلحہ بن عبید اللہ بن کریم سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے۔ اور اس حدیث میں عن ابیہ کسی اور نے نہیں کہا اور یہ کچھ نہیں ہے۔ صحیح ■ ہے جو مؤطا میں ہے۔ ترمذی الحکیم نے ”نوادیر الاصول“ میں ذکر کیا ہے اپنی مسند سے عباس بن مرداس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لئے عرفہ کے پچھلے پہر مغفرت اور رحمت کی دعا مانگی اور بہت زیادہ دعا مانگی اور اللہ تعالیٰ نے جواب فرمایا: میں نے تیری دعا قبول کر لی مگر جو بعض نے بعض پر ظلم کیا۔ ان کے جو گناہ میرے اور ان کے درمیان ہیں میں نے وہ معاف کر دیئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرض کی: یا رب! تو قادر ہے کہ تو اس مظلوم کو اس پر جو ظلم کیا گیا ہے اس سے زیادہ بہتر جزا عطا فرما دے اور تو اس ظالم کو معاف فرما دے تو اس وقت کوئی جواب نہ دیا جب مزدلفہ کی صبح تھی تو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، استحباب صیام ثلاثۃ ایام من کل شہر، صفحہ 368، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب القرآن، ما جاء فی الدعاء، صفحہ 198 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل یوم عرفہ، صفحہ 436، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، جامع الحج، صفحہ 457 (وزارت تعلیم)

آپ نے دعا میں مزید اجتہاد و کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا: میں نے انہیں بھی معاف کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ مسکرائے۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ! آپ ایسے وقت میں مسکرائے ہیں جس وقت آپ پہلے کبھی نہیں مسکرائے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ کے دشمن ابلیس پر ہنسا ہوں جب اسے علم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے بارے میری بات قبول کر لی ہے تو وہ ویل اور موت کو پکارنے لگا اور اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا اور بھاگنے لگا۔ ابو عبد الغنی حسن بن علی نے کہا: ہمیں عبد الرزاق نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں مالک نے بتایا انہوں نے ابو الزناد سے انہوں نے اعرج سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عرفہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ خالص حاجی کو معاف کر دیتا ہے اور جب مزدلفہ کی رات ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ تاجروں کو معاف فرما دیتا ہے اور جب منیٰ کا دن ہوتا ہے تو اونٹوں والوں کو معاف فرما دیتا ہے جب جمرہ عقبہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سوال کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے اور جو مخلوق موقوف میں لا اِلهَ اِلَّا اللہ کہنے والوں میں سے موجود ہوتی ہے اسے معاف فرما دیتا ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ حدیث مالک کی حدیث سے غریب ہے اور محفوظ نہیں ہے مگر اسی سند سے۔ ابو عبد الغنی نے کہا: میں اسے نہیں جانتا اور اہل علم رغبت اور فضائل والی احادیث ہر ایک سے آسانی سے روایت کر لیتے ہیں اور احکامات کی احادیث میں سختی کرتے تھے۔

**مسئلہ نمبر 10:** اہل علم نے نویں ذی الحجہ کا روزہ مستحب قرار دیا ہے مگر عرفات کے مقام پر نہیں۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عرفہ کا روزہ نہ رکھا اور حضرت ام الفضل نے آپ کو دودھ کا پیالہ بھیجا تو آپ نے نوش فرمالیا۔ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج کیا اور آپ نے عرفہ کے دن روزہ نہ رکھا تھا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا اور انہوں نے یہ روزہ نہ رکھا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا اور انہوں نے یہ روزہ نہ رکھا تھا۔ اکثر اہل علم کا اس پر عمل ہے۔ وہ افطار کو پسند فرماتے تھے تاکہ دعا پر قوت حاصل کرے۔ بعض اہل علم نے عرفہ کا روزہ رکھا (1)۔ حضرت ابن عمر سے پہلی حدیث کی مثل سند سے مروی ہے اور اس کے آخر میں ہے حضرت عثمان کے ساتھ میں نے حج کیا اور انہوں نے روزہ نہیں رکھا، میں نہ خود روزہ رکھتا ہوں نہ اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں (2)۔ یہ حدیث حسن ہے۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ عطا نے عرفہ کے دن کے روزہ کے متعلق فرمایا: میں سردیوں میں روزہ رکھتا ہوں اور گرمیوں میں نہیں رکھتا ہوں۔ یحییٰ انصاری نے فرمایا: عرفہ کے دن فطر واجب ہے۔ حضرت عثمان بن ابوالعاصی، حضرت ابن زبیر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عرفہ کا روزہ رکھتے تھے۔ ابن منذر نے کہا: عرفہ کے دن عرفات میں میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں روزہ نہ رکھنا محبوب ہے اور عرفات کے علاوہ عرفہ کا روزہ رکھنا محبوب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عرفہ کے دن کے روزہ کے بارے پوچھا گیا، یہ ”گزشتہ اور باقی سال کا کفارہ ہے“ (3)۔ اور ہم نے عطا سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس نے عرفہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصوم، فی کراہیۃ صوم یوم عرفہ، ص 93، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ ایضاً، ص 93، جلد 1

2۔ ایضاً، ص 94، جلد 1



کے دن روزہ افطار کیا تاکہ دعا پر قوت حاصل کرے تو اس کے لئے روزہ دار کے اجر کا مثل اجر ہوگا۔

**مسئلہ نمبر 11:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ** یعنی مشعر حرام کے پاس دعا اور تلبیہ کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو، اس کو جمع کیا جاتا ہے کیونکہ یہاں مغرب و عشاء کی نمازوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ یہ قنادہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: کیونکہ اس میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت حواء علیہا السلام کے ساتھ ملے تھے۔ اذدلف الیہا کا مطلب ہوتا ہے وہ اس کے قریب ہوا اسی وجہ سے اس کو مزدلفہ کہا جاتا ہے اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ اس میں موجود لوگوں کے فعل کی وجہ سے اس کو مزدلفہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اللہ کے قریب ہوتے ہیں۔ یعنی وہ اس میں ٹھہرنے کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں اس کو مشعر کہا جاتا ہے۔ یہ شعار سے مشتق ہے جس کا معنی علامت ہے، کیونکہ یہ حج، نماز اور رات گزارنے کی علامت ہے اور اس کے پاس دعا حج کے شعار میں سے ہے اور حرمت کی صفت اس کی حرمت کی وجہ سے لگائی گئی ہے۔

**مسئلہ نمبر 12:** یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مغرب اور عشاء کی نماز مزدلفہ میں اکٹھی پڑھی (1)۔ اہل علم کا اجماع ہے اور کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حاجی کے لئے مغرب و عشاء کی نماز کو جمع کرنا ہے اور اس کے متعلق اختلاف ہے جس نے مزدلفہ میں پہنچنے سے پہلے نماز پڑھی۔ امام مالک نے کہا: جو امام کے ساتھ ٹھہرے اور امام کے ساتھ نکلے تو وہ نماز نہ پڑھے حتیٰ کہ مزدلفہ آئے اور یہاں دونوں نمازیں اکٹھی پڑھے اور اس پر انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا جو نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ بن زید کو فرمایا تھا ”نماز آگے ہے“۔ ابن حبیب نے کہا: جس نے مزدلفہ میں آنے سے پہلے بغیر عذر کے نماز پڑھی تو وہ نماز کا اعادہ کرے جب اسے علم ہو، یہ اس شخص کی مانند ہے جس نے زوال سے پہلے نماز پڑھی کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **الصلاة امامك** (نماز آگے ہے) (2)۔ یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ اشہب نے کہا: اس پر اعادہ نہیں ہے مگر جب اس نے شفق کے غیب ہونے سے پہلے نماز پڑھی ہو، وہ صرف عشاء کی نماز کا اعادہ کرے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ قاضی ابوالحسن نے اس کی تائید کی ہے اور اس نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ یہ دو نمازیں مزدلفہ میں جمع کرنا سنت ہے اور ان کی صحت کے لئے یہ شرط نہیں ہے، یہ استحباب کے معنی پر ہے جیسے ظہر اور عصر کو عرفہ میں جمع کرنا ہے۔ ابن منذر نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور انہوں نے یہ قول عطاء بن رباح، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، سعید بن جبیر، احمد، اسحاق، ابو ثور اور یعقوب سے حکایت کیا ہے اور امام شافعی سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ نماز نہ پڑھے حتیٰ کہ مزدلفہ میں آئے اگر مزدلفہ پہنچنے سے پہلے نصف رات گزر چکی ہو تو دونوں نمازیں پڑھے۔

**مسئلہ نمبر 13:** جس نے جلدی کی اور شفق کے غروب ہونے سے پہلے مزدلفہ پہنچ گیا تو ابن حبیب نے کہا: جو شفق کے غروب ہونے سے پہلے جلدی مزدلفہ پہنچا اس کی نماز نہیں، نہ امام کی نماز ہے اور نہ کسی اور کی حتیٰ کہ شفق غائب ہو جائے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نماز آگے ہے۔ پھر شفق کے غروب ہونے کے بعد مزدلفہ میں نماز پڑھی اس اعتبار سے اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، من جمع بینہما ولم يتطوع، صفحہ 227، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، الافاضة من عرفات الى المزدلفة، صفحہ 416، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

نماز کا وقت شفق کے غائب ہونے کے بعد ہے۔ پس شفق کے غائب ہونے سے پہلے اس کو ادا کرنا جائز نہیں۔ اگر اس کا وقت شفق کے غائب ہونے سے پہلے ہوتا تو اس وقت سے مؤخر نہ کی جاتی۔

**مسئلہ نمبر 14:** جو امام کے جانے کے بعد عرفہ میں آیا یا جس کو عذر لاحق ہوا جو امام کے ساتھ ٹھہرا تھا تو ابن المواز نے کہا: جو امام کے بعد ٹھہرا وہ ہر نماز اپنے وقت پر پڑھے۔ امام مالک نے اس شخص کے بارے فرمایا جس کو عذر امام کے ساتھ جانے سے روک لے تو وہ دونوں نمازیں اکٹھی پڑھے جب شفق غائب ہو جائے۔ ابن القاسم نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو امام کے بعد ٹھہرا، اگر اسے رات کے تیسرے حصہ میں مزدلفہ پہنچنے کی امید ہو تو وہ نماز کو مؤخر کرے حتیٰ کہ مزدلفہ پہنچ جائے ورنہ ہر نماز کو اپنے وقت پر پڑھے۔ ابن المواز نے مزدلفہ تک نماز کو مؤخر کرنے کو کہا جو امام کے ساتھ ٹھہرے نہ کہ کسی دوسرے شخص کے لئے۔ امام مالک نے وقت کی رعایت کی ہے، مکان کی نہیں۔ ابن القاسم نے نماز کے لئے مختار وقت اور مکان کا اعتبار کیا ہے۔ جب مختار وقت کے فوت ہونے کا خوف ہو تو مکان کا اعتبار باطل ہو جائے گا اور مختار وقت کی رعایت اولیٰ ہے۔

**مسئلہ نمبر 15:** علماء کا مزدلفہ میں نماز کی ہیئت میں دو اعتبار سے اختلاف ہے: (۱) اذان اور اقامت کے اعتبار سے (۲) کیا ان کا جمع کرنا متصل ہوگا یا کسی عمل سے ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا یا ان کے درمیان عمل جائز ہے، مثلاً سوار یوں کا اتارنا وغیرہ۔ رہی اذان اور اقامت، ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ پڑھی (۱)، اسی طرح ظہر اور عصر کی نمازوں میں عرفہ میں کیا مگر یہ بالا جماع ظہر کے پہلے وقت میں ادا کی جائیں گی۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک نے جو کہا اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ کی کوئی مرفوع حدیث نہیں جانتا لیکن حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے۔ ابن منذر نے حضرت ابن مسعود کا بھی زائد ذکر کیا ہے۔ نظر کی جہت سے اس بات میں امام مالک کی حجت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ اور عرفہ کی نمازوں میں سنت قائم فرمائی کہ ان دونوں نمازوں کا ایک وقت ہے جب ان کا وقت ایک ہے اور ہر نماز اپنے وقت پر پڑھی جائے گی تو کوئی نماز دوسری سے اذان اور اقامت کے اعتبار سے اولیٰ نہ ہوگی کیونکہ ان میں سے کوئی ایک بھی اس کا تقاضا نہیں کرتی۔ یہ نماز اپنے وقت میں پڑھی گئی ہے اور جو نماز اپنے وقت پر پڑھی گئی ہو اس کی سنت یہ ہے کہ اس کے لئے اذان دی جائے اور جماعت کے لئے بکسیر کہی جائے اور یہ واضح ہے۔ واللہ اعلم

دوسرے علماء نے کہا: ان میں سے پہلی نماز اذان اور اقامت کے ساتھ پڑھی جائے اور دوسری نماز بغیر اذان اور اقامت کے پڑھی جائے۔ علماء نے کہا: حضرت عمر نے دوسری اذان کا حکم دیا تھا کیونکہ لوگ شام کے کھانے کے لئے جدا جدا ہو گئے تھے۔ پس آپ نے اذان دلوائی تاکہ وہ لوگوں کو جمع کریں۔ علماء نے کہا: اسی طرح ہم کہتے ہیں جب لوگ امام سے کھانے وغیرہ کے لئے جدا ہو گئے تو آپ نے مؤذنین کو حکم دیا کہ وہ اذان دیں تاکہ لوگ جمع ہو جائیں۔ جب اذان دی تو اقامت بھی کہی۔ علماء نے کہا: یہ وہ معنی ہے جو حضرت عمر سے مروی ہے۔ عبدالرحمن بن یزید کی حدیث ذکر کی۔ فرمایا: حضرت ابن مسعود عشاء کا کھانا مزدلفہ میں دو نمازوں کے درمیان میں کھاتے تھے اور دوسری سند میں ہے ہر نماز کو اذان اور اقامت کے ساتھ

پڑھا۔ یہ عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: دونوں نمازیں ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ مزدلفہ میں اکٹھی پڑھی جائیں گی اور ان کے درمیان کوئی چیز نہ ہوگی۔ حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے اور یہی ثوری کا قول ہے۔ عبدالرزاق اور عبدالمالک بن صباح نے ثوری سے انہوں نے سلمہ بن کہیل سے انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو جمع کیا مغرب کی تین رکعتیں پڑھیں اور عشاء کی دو رکعتیں پڑھیں ایک اقامت کے ساتھ۔ دوسرے علماء نے کہا: مزدلفہ میں مغرب و عشاء کی نمازیں اکٹھی ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ جمع کرے۔ یہ علماء اس روایت پر عمل کرتے ہیں جو ہشیم نے یونس بن عبید سے انہوں نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز کو مزدلفہ میں جمع کرتے تھے اور ان کے درمیان کچھ نہیں کرتے تھے۔ اس کی مثل حضرت خزیمہ بن ثابت کی حدیث سے مرفوع روایت مروی ہے لیکن وہ قوی نہیں ہے۔ جوز جانی نے محمد بن حسن سے انہوں نے امام ابو یوسف سے انہوں نے امام ابو حنیفہ سے حکایت کیا ہے کہ دونوں نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں سے ادا کی جائیں گی۔ مغرب کے لئے اذان دی جائے گی اور عشاء کے لئے صرف تکبیر کہی جائے گی۔

یہی نظریہ امام طحاوی کا ہے کیونکہ نرت جابر کی حدیث اس کی دلیل ہے۔ یہ پہلا قول ہے اور اسی پر اعتماد ہے۔ بعض علماء نے کہا: بغیر اذان کے دونوں نمازیں دو اقامتوں کے ساتھ ادا کی جائیں گی اور یہ جن علماء نے کہا ان میں سے امام شافعی، ان کے اصحاب اور اسحاق ہیں اور امام احمد کا ایک قول یہی ہے۔ یہ سالم بن عبد اللہ، قاسم بن محمد کا قول ہے۔ ان علماء نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جو عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے ابن شہاب سے انہوں نے سالم سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مزدلفہ آئے تو مغرب و عشاء کی نمازوں کو جمع کیا مغرب کی تین اور عشاء کی دو رکعتیں پڑھیں ہر ایک کے لئے ایک تکبیر کہی اور ان کے درمیان کوئی نوافل نہ پڑھے۔ ابو عمر نے کہا: حضرت ابن عمر سے آثار اس قول کے بارے میں زیادہ ثابت ہیں جو اس باب میں مروی ہیں لیکن یہ تاویل کا احتمال رکھتے ہیں اور حضرت جابر کی حدیث میں اختلاف نہیں ہے اور یہ اولیٰ ہے۔ اس مسئلہ میں نظر کو کوئی دخل نہیں ہے اس میں صرف اتباع ہے۔

**مسئلہ نمبر 16:** نماز کے علاوہ دونوں نمازوں کے درمیان کسی عمل کے ساتھ فاصلہ کرنا۔ حضرت اسامہ بن زید سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مزدلفہ میں آئے تو اترے، وضو کیا اور مکمل وضو کیا پھر نماز کے لئے تکبیر کہی گئی، آپ نے مغرب کی نماز پڑھی پھر ہر شخص نے اپنی منزل میں اپنے اونٹ کو بٹھایا پھر تکبیر کہی گئی تو پھر آپ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور دونوں نمازوں کے درمیان کوئی نماز نہ پڑھی (1)۔ ایک روایت میں ہے ”اور صحابہ نے سامان نہ کھولا حتیٰ کہ عشاء کی تکبیر ہوئی آپ نے نماز پڑھائی پھر سامان کھولا“ ہم نے ابھی ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود سے دونوں نمازوں کے درمیان فاصلہ کرنے کا جواز ہے۔ امام مالک سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو مزدلفہ میں آیا کیا وہ پہلے نماز پڑھے یا نماز کو مؤخر

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، الاقاضۃ من عرفات إلى البذلقة، صفحہ 416، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)



کرے حتیٰ کہ سواری سے سامان اتارے؟ امام مالک نے فرمایا: سامان خفیف ہو تو کوئی حرج نہیں کہ نماز سے پہلے اس کو اتار دے اور رہی ساز و سامان والی سواریاں ان کو بٹھانے اور ان کا سامان اتارنے کا نظریہ نہیں رکھتا، اسے چاہئے کہ پہلے نمازیں پڑھے پھر سواری سے سامان اتارے۔ اشہب نے اپنی کتب میں لکھا ہے کہ اس کے لئے نماز سے پہلے سواری سے اتارنا جائز ہے اور مغرب کی نماز پڑھ کر سامان اتارنا میرے نزدیک محبوب ہے جب تک کہ اس کی طرف مجبور نہ ہو۔ مثلاً سواری پر بوجھ زیادہ ہو یا عذر ہو۔ رہا دونوں نمازوں کے درمیان نفل پڑھنا تو ابن منذر نے کہا: اس میں علماء کا اختلاف نہیں جانتا کہ سنت یہ ہے کہ جمع کرنے والا دونوں نمازوں کے درمیان نفل نہیں پڑے گا۔ حضرت اسامہ کی حدیث میں ہے ان دونوں نمازوں کے درمیان کوئی نماز نہیں پڑھی۔

**مسئلہ نمبر 17:** جمہور علماء کے نزدیک مزدلفہ میں رات گزارنا حج کا رکن ہے جو شخص مزدلفہ میں دسویں کی رات نہیں گزارتا اور مزدلفہ میں نہیں ٹھہرتا اس پر جو واجب ہوگا اس کے متعلق اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا: جس نے مزدلفہ میں رات نہیں گزاری اس پر دم ہے اور جو رات کا اکثر حصہ ٹھہرا اس پر کچھ واجب نہیں ہے کیونکہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک مزدلفہ میں دسویں کی رات گزارنا سنت مؤکدہ ہے فرض نہیں ہے۔ اسی طرح کا قول عطاء، زہری، قتادہ، سفیان ثوری، احمد، اسحاق، ابو ثور اور اصحاب الرائے کا ہے اس شخص کے بارے میں جس نے رات نہیں گزاری۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر مزدلفہ سے نصف رات کے بعد نکل گیا تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں اور اگر نصف رات سے پہلے نکل گیا اور واپس نہ آیا تو فدیہ دے گا (1) اور فدیہ ایک بکری ہے۔ حضرات عکرمہ، شعبی، بخعی، حسن بصری نے کہا: مزدلفہ میں وقوف فرض ہے اور جس سے مزدلفہ کا وقوف فوت ہو جائے تو اس کا حج فوت ہو جائے گا اور وہ اپنے احرام کو عمرہ کا احرام بنا دے گا۔ یہ حضرت ابن زبیر سے مروی ہے اور یہ اوزاعی کا قول ہے اور ثوری سے اس کی مثل مروی ہے۔ اور ان سے اصح قول یہ مروی ہے کہ مزدلفہ کا وقوف سنت مؤکدہ ہے۔ حماد بن ابی سلیمان نے کہا: جس سے مزدلفہ سے چلنا فوت ہو گیا اس کا حج فوت ہو گیا، وہ عمرہ کر کے احرام کھول دے اور آئندہ سال حج کرے اور انہوں نے ظاہر کتاب و سنت سے حجت پکڑی ہے۔ کتاب اللہ میں ارشاد ہے:

فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ

اور سنت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے مزدلفہ کا ٹھہرنا پایا پھر وہ لوگوں کے ساتھ ٹھہرا حتیٰ کہ وہ وہاں سے چلا تو اس نے حج پایا اور جس نے مزدلفہ کا ٹھہرنا نہیں پایا اس کے لئے حج نہیں ہے (2)۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ دارقطنی نے عروہ بن مضر سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا جبکہ آپ مزدلفہ میں تھے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ کیا میرے لئے حج ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے ہمارے ساتھ وقوف کیا حتیٰ کہ ہم یہاں سے چل پڑے اور اس سے پہلے وہ عرفات سے رات یا دن کے وقت نکل چکا ہے تو اس کا حج مکمل ہے اور ۱۱ مناسک حج ادا کر چکا

1۔ المحرر الوجیز، ص 275، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ)

2۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، من لم یدرک صلاۃ الصبح مع الامام، ص 47، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ہے (1)۔ امام شعبی نے فرمایا: جو مزدلفہ میں نہیں ٹھہرا وہ اس احرام کو عمرہ کا احرام بنادے اور جس نے جمہور کے لئے حجت پکڑی اس نے یہ جواب دیا کہ آیت میں وقوف کے وجوب اور رات گزارنے پر کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ آیت میں یہ مذکور نہیں ہے آیت میں صرف اس کا ذکر ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ جب سورج دسویں کے دن طلوع ہو جاتا ہے تو مزدلفہ میں وقوف کا وقت فوت ہو جاتا ہے اور جو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے وقوف کو پالیتا ہے تو وہ وقوف کو پالیتا ہے یہ اجماع ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ فرض ہے اور جو کہتے ہیں کہ یہ سنت ہے اور ربی حضرت عروہ بن مضر کی حدیث اس کے بعض طرق میں عرفہ میں وقوف کا بیان ہے مزدلفہ میں رات گزارنے کا بیان نہیں ہے۔ اس کی مثل حضرت عبدالرحمن بن یحمر الدیلی کی حدیث ہے فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عرفہ میں حاضر تھا۔ اہل نجد میں سے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے انہوں نے حج کے متعلق پوچھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حج عرفہ (میں وقوف ہے) جو اسے مزدلفہ کی رات سے فجر طلوع ہونے سے پہلے پالے تو اس کا حج مکمل ہوا (2)۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں اسحاق بن ابراہیم نے بتایا فرمایا: ہمیں کعب نے بتایا فرمایا: ہمیں سفیان ثوری نے بتایا انہوں نے بکیر سے انہوں نے عطا سے انہوں نے عبدالرحمن بن یحمر الدیلی سے روایت کیا، فرمایا: میں حاضر تھا، پھر انہوں نے مذکورہ حدیث ذکر کی۔ اس کو ابن عیینہ نے بکیر سے انہوں نے عبدالرحمن بن یحمر الدیلی سے، کہا میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: حج عرفات ہے جس نے فجر کے طلوع ہونے سے پہلے وقوف کو پالیا اس نے حج کو پالیا اور منیٰ کے دن تین ہیں جس نے دو دنوں میں جلدی کی اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے تاخیر کی اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور عروہ کی حدیث میں ہے ”جس نے ہماری اس نماز جیسی نماز پڑھی (3)“۔ آپ نے مزدلفہ میں نماز کا ذکر فرمایا۔ علماء کا اجماع ہے کہ اگر کوئی مزدلفہ میں رات گزارے اور امام کے ساتھ نماز پڑھے بغیر سوجائے حتیٰ کہ اس سے نماز فوت ہو جائے تو اس کا حج مکمل ہے۔ جب امام کے ساتھ نماز میں حاضر ہونا حج کی اصل میں سے نہیں ہے تو اس جگہ کا وقوف جس میں نماز ہوتی ہے وہ بدرجہ اولیٰ حج کی اصل میں سے نہیں ہوگا۔ علماء نے فرمایا: اس حدیث کی وجہ سے یہ فرض متحقق نہیں ہوتا مگر خاص عرفہ میں۔

**مسئلہ نمبر 18:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَإِذْ ذُكِّرُوا كَمَا هَلَكْتُمْ تَاكِيدَ كَيْدٍ** لے امر کو دوبارہ ذکر کیا جیسے تو کہتا ہے ارم (تیر مار، تیر مار) بعض علماء نے فرمایا: پہلا حکم مشعر حرام کے پاس ذکر کرنے کا حکم ہے اور دوسرا ذکر کا حکم اخلاص کے حکم پر ذکر کا حکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: دوسرے سے مراد نعمت کا شمار کرنا ہے اور اس کے شکر کا حکم ہے پھر انہیں ان کی گمراہی کی حالت یاد دلانی تاکہ انعام کی قدر ظاہر ہو۔ فرمایا: **وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِمْ لَمَنْ الضَّالِّينَ**، کہا میں کاف مصدر محذوف کی صفت ہے اور ما مصدر یہ یا کافہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عمدہ ذکر کرو جس طرح اس نے تمہیں عمدہ ہدایت دی اور اسے یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا کہ تم کیسے اس کا ذکر کرو، اس سے عدول نہ کرو۔ **إِنْ مَخَفَ مِنْ ثَقِيلَةٍ** ہے۔ اس کی دلیل خبر پر لام کا دخول ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ فراء نے کہا: ان تافیہ بمعنی ما ہے اور لام بمعنی الا ہے۔ جیسے شاعر نے کہا:

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الحج، المواقیب، صفحہ 240، جلد 2 (قاہرہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، من ان عرفۃ قبل الفجر، صفحہ 223 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، فیمن لم یدرک صلاۃ الصبح مع الامام، صفحہ 47، جلد 2 (وزارت تعلیم)

شكلك امك ان قتلت لمسلما حلت عليك عقوبة الرحمن

تیری ماں تجھ پر روئے تو قتل نہیں کرے گا مگر کسی مسلمان کو تو تجھ پر رحم کی سزا ہوگی۔

یا ان بمعنی قد ہے یعنی قد کنتم۔ یہ تین اقوال ہیں۔ قبیلہ میں ضمیر ہدیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض نے فرمایا: قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی تم قرآن کے انزال سے پہلے نہیں تھے مگر گمراہ۔ اگر تو چاہے تو اس کو نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹا دے اگرچہ پہلے آپ کا ذکر نہیں ہے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٣٨﴾

”پھر تم بھی (اے مغروران قریش) وہاں تک (جا کر) واپس آؤ جہاں جا کر دوسرے لوگ واپس آتے ہیں اور معافی مانگو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب جس کو ہے وہ لوگوں کے ساتھ عرفات میں نہیں ٹھہرتے تھے بلکہ وہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور یہ حرم میں ہے۔ وہ کہتے تھے: ہم اللہ کے حرم میں رہنے والے ہیں، پس ہمارے لئے مناسب ہے کہ ہم حرم کی تعظیم کریں اور حل میں سے کسی چیز کی تعظیم نہ کریں۔ اس کے باوجود کہ وہ جانتے تھے اور اقرار کرتے تھے کہ عرفہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا موقف ہے وہ حرم سے نہیں نکلتے تھے اور وہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور اسی سے نکلتے تھے اور لوگ عرفہ میں ٹھہرتے تھے۔ تو انہیں کہا گیا کہ اکٹھے نکلو اور ثُمَّ اس آیت میں ترتیب کے لئے نہیں ہے۔ یہ جملہ کلام کے عطف کے لئے ہے۔ یہ اس آیت سے جدا ہے۔ ضحاک نے کہا: اس آیت کا مخاطب تمام امت ہے اور الناس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جیسے ارشاد فرمایا: الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ۔ یہاں الناس سے مراد ایک فرد ہے اور اس تاویل پر احتمال ہے کہ انہیں عرفہ سے جانے کا حکم دیا گیا تھا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دوسرا چلنا ہو اور یہ مزدلفہ سے چلنا ہے پھر ثُمَّ اپنے معنی پر ہوگا (1)۔ اس احتمال کی بنا پر طبری نے اعتماد کیا۔ معنی یہ ہے کہ تم چلو جہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام مزدلفہ سے چلے تھے یعنی پھر منیٰ کی طرف چلو کیونکہ عرفات سے نکلنا، مزدلفہ سے نکلنے سے پہلے ہے۔ میں کہتا ہوں: اس میں اس شخص کے لئے حجت ہے جس نے مزدلفہ میں وقوف کو واجب قرار دیا، اس سے نکلنے کے امر کی وجہ سے۔ واللہ اعلم۔ اس آیت کی تاویل میں دونوں اقوال میں سے پہلا قول صحیح ہے۔ ترمذی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: قریش اور ان کے دین کے پیروکار یعنی خمس، مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے۔ کہتے تھے: ہم اللہ کے حرم میں ٹھہرنے والے ہیں اور جو ان کے علاوہ تھے وہ عرفہ میں ٹھہرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل کیا: ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ۔ (2) یہ حدیث حسن صحیح ہے اور مسلم کی صحیح میں حضرت عائشہ سے مروی ہے الخمس وہ لوگ ہیں جن کے متعلق

1۔ المحرر الوجيز، صفحہ 275، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع الترمذی، کتاب الحج، ما جاء في الوقوف بعرفات، صفحہ 107، جلد 1 (وزارت تعلیم)



اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: **ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ**۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: لوگ عرفات سے نکلتے تھے اور الحس، مزدلفہ سے نکلتے تھے وہ کہتے: ہم نہیں نکلیں گے مگر حرم سے جب یہ آیت نازل ہوئی **ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ**۔ تو وہ عرفات کی طرف لوٹے۔ یہ صریح نص ہے اور اس کی مثل زیادہ صحیح ہے۔ باقی اقوال پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

واللہ المستعان۔

حضرت سعید بن جبیر نے الناسی پڑھا ہے اور اس کی تاویل حضرت آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عِزًّا** (طہ) بعض کے نزدیک یا کی تحفیف جائز ہے۔ وہ الناس کہتے ہیں جیسے القاض والهاد۔ ابن عطیہ نے کہا: عربی میں اس کا جواز سیبویہ نے ذکر کیا ہے اور اس کو پڑھنے کا جواز مجھے معلوم نہیں اللہ تعالیٰ نے استغفار کا حکم دیا کیونکہ یہ استغناء کی جگہ اور قبولیت کا مقام اور رحمت کے نزول کی جگہ ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ سے اپنے اس گناہ کی معافی طلب کرو جو تم نے وقوف کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی مخالفت کرتے ہوئے کیا۔ تم مزدلفہ میں جبل قزح پر ٹھہرے اور عرفات میں نہ ٹھہرے (1)۔

**مسئلہ نمبر 2:** ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب نبی کریم ﷺ نے صبح کی تو آپ قزح پر ٹھہرے اور فرمایا: یہ قزح موقف ہے اور مزدلفہ سارا موقف ہے۔ میں نے یہاں نحر کیا اور منیٰ سارا نحر کرنے کی جگہ ہے تم اپنے خیموں میں نحر کرو اور حاجیوں کا حکم جب وہ عرفہ سے مزدلفہ کی طرف جائیں تو یہاں رات گزاریں پھر اندھیرے میں امام لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائے اور مشعر حرام میں وہ وقوف کریں۔ قزح ایک پہاڑ ہے جس پر امام ٹھہرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ ذکر کرتے رہیں اور سورج کے طلوع ہونے کے قریب تک دعا مانگتے رہیں۔ پھر طلوع شمس سے پہلے چلے جائیں۔ عربوں کی مخالفت کرتے ہوئے، کیونکہ وہ سورج طلوع ہونے کے بعد جاتے تھے اور کہتے تھے: اشراقی شبید کیا نغید شبیر پہاڑ روشن ہوا تاکہ ہم احرام کھولنے کے قریب ہوں اور ہم غارت گری تک پہنچیں۔

بخاری نے عمرو بن میمون سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں حضرت عمر کے ساتھ موجود تھا۔ انہوں نے صبح کی نماز مزدلفہ میں پڑھی پھر ٹھہرے اور کہا: مشرکین نہیں نکلتے تھے حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جاتا تھا اور کہتے تھے: اشراقی شبید۔ نبی کریم ﷺ نے ان کی مخالفت کی اور آپ سورج طلوع ہونے سے پہلے چلے (2)۔ ابن عیینہ نے ابن جریج سے انہوں نے محمد بن قیس بن مخرمہ سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ اہل جاہلیت، عرفہ سے سورج غروب ہونے سے پہلے چلتے تھے اور مزدلفہ سے سورج طلوع ہونے کے بعد چلتے تھے رسول اللہ ﷺ نے عرفات سے چلنے میں تاخیر فرمائی اور مزدلفہ سے چلنے میں جلدی فرمائی، یعنی مشرکین کے طریقہ کی مخالفت کی۔

**مسئلہ نمبر 3:** جب سورج طلوع ہونے سے پہلے چلیں تو ان کو حکم ہے کہ وہ عرفہ سے چلنے کی ہیئت پر چلیں۔ یعنی امام

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 276، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، مقید فہم من جہم، صفحہ 228، جلد 1 (وزارت تعلیم)

لوگوں کو تھوڑا تیز چلائے جب ان میں سے کوئی کھلی جگہ پائے تو مزید تیز چلے۔ حدیث میں تیز چلنے کے لئے العنق کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ جانوروں کی معروف چال ہے اور النص مزید تیز چلنا ہے جیسے الغیب (جس میں ہچکولے آتے ہیں) یا اس سے زیادہ تیز چلنا۔ صحیح مسلم میں حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے، ان سے پوچھا گیا جب رسول اللہ ﷺ عرفہ سے چلتے تھے تو کیسے چلتے تھے؟ فرمایا: تیز چلتے تھے جب کھلی جگہ پاتے تو مزید تیز چلتے تھے (1)۔ ہشام نے کہا: النص فوق العنق کہ نص عنق سے تیز رفتاری کا نام ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور مستحب ہے کہ بطن محسر میں پتھر پھینکنے کی مقدار اپنی سواری کو حرکت دے اگر ایسا نہ بھی کرے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ منی سے ہے۔ ثوری وغیرہ نے ابوالزبیر سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ چلے تو آپ پر سکینت تھی اور آپ ﷺ نے فرمایا: ”وادی محسر میں تیز چلو (2)“ اور فرمایا: مجھ سے مناسک حج سیکھو۔ جب وہ منی میں آئیں یہ دسویں کے دن کی صبح کا وقت ہے تو جمرہ عقبہ پر چاشت کے وقت سوار ہو کر رمی جمار کریں اگر قادر ہوں اور اس کے علاوہ جمروں میں سوار ہونا مستحب نہیں اور سات کنکریاں ماریں، ہر کنکری ٹھیکری کی مثل ہو۔ جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا..... جب وہ کنکریاں ماریں گے تو جو کچھ لباس وغیرہ میں سے اور مثل میں سے حلالی ہو جائیں گے مگر عورتیں، خوشبو اور شکار امام مالک اور اسحاق کے نزدیک حلال نہ ہوں گے۔ یہ ابوداؤد و خفاف کی ان سے روایت ہے۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابن عمر نے کہا: اس کے لئے ہر چیز حلال ہے سوائے عورتوں اور خوشبو کے۔ امام مالک کے نزدیک جس نے رمی جمار کے بعد اور افاضہ سے پہلے خوشبو لگائی اس پر فدیہ نہیں ہے کیونکہ اس کے متعلق ارشاد وارد ہے اور جو امام مالک کے نزدیک جمرہ عقبہ کے بعد اور طواف افاضہ سے پہلے شکار کرے اس پر جزا ہے۔ امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابو ثور نے کہا: اس کے لئے ہر چیز حلال ہے سوائے عورتوں کے اور یہی حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔

**مسئلہ نمبر 4:** حاجی جمرہ عقبہ پر پہلی کنکری کے ساتھ ہی تلبیہ ختم کر دے مدینہ اور دوسرے شہروں کے اکثر علماء کا یہی قول ہے اور امام مالک کے نزدیک یہ جائز اور مباح ہے اور ان کا مشہور قول یہ ہے کہ عرفہ کے دن سورج کے زوال کے وقت سے تلبیہ ختم کر دے جیسا کہ انہوں نے مؤطا میں حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کر کے ذکر کیا ہے اور فرمایا: یہ امر ہمارے نزدیک ہے۔ میں کہتا ہوں: اس عمل میں سنت وہ ہے جو مسلم نے حضرت فضل بن عباس سے روایت کی ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عرفہ کی شام کو اور مزدلفہ کی صبح کو جب لوگ چلے، تم پر سکینت لازم ہے۔ آپ اپنی سواری کو تیز چلا رہے تھے حتیٰ کہ آپ وادی محسر میں داخل ہوئے۔ وہ منی کے علاقہ میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم کنکریاں لے کر چلو جو جمرہ پر ماری جائیں گی۔ حضرت فضل بن عباس نے کہا: رسول اللہ ﷺ تلبیہ کہتے رہے حتیٰ کہ جمرہ عقبہ پر رمی کی (3)۔ ایک روایت میں ہے نبی کریم ﷺ اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے جیسے انسان کسی چیز کو پھینکتا ہے (3)۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، الافاضة من عرفات الى المزدلفة، صفحہ 417، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، التعجیل من جعم، صفحہ 268، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، استعجاب اداة الحج، صفحہ 415، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

بخاری میں حضرت عبداللہ سے مروی ہے کہ وہ حجرہ کبریٰ تک پہنچے تو بیت اللہ ان کی بائیں جانب تھا اور منیٰ دائیں جانب تھا، انہوں نے سات کنکریاں ماریں اور فرمایا: اسی طرح کنکریاں ماری تھیں اس ذات نے جس پر سورہ بقرہ نازل ہوئی تھی (1)۔ سنن دارقطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب تم رمی جمار کر لو اور حلق کر لو اور جانور ذبح کر لو تو تمہارے لئے ہر چیز حلال ہو گئی سوائے بیویوں کے اور تمہارے لئے کپڑے اور خوشبو حلال ہو گئی (2)۔“ اور بخاری میں حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو ان ہاتھوں سے خوشبو لگائی جب انہوں نے احرام باندھا اور اس وقت بھی جب طواف افاضہ سے پہلے احرام کھولا اور حضرت عائشہ نے اپنے ہاتھوں کو پھیلا یا (3)۔ یہ علماء کے نزدیک چھوٹا حلال ہونا ہے اور بڑا حلال ہونا ہے طواف افاضہ کے بعد اس سے عورتیں اور تمام وہ چیزیں جو احرام کی وجہ سے حرام ہوتی ہیں حلال ہو جاتی ہیں۔ اس کا مزید ذکر ان شاء اللہ سورہ حج میں آئے گا۔

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشْدَّ ذِكْرًا ۚ فَمِنَ النَّاسِ مَن

يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِن خَلَاقٍ ۚ

”پھر جب تم پورے کر چکو حج کے ارکان تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر الہی کرو اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب دے دے ہمیں دنیا میں ہی (سب کچھ) نہیں ہے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ۔“

اس میں دو مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ مجاہد نے مناسک سے مراد ذبائح اور ان کا خون بہانا لیا ہے (4)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہی حج کے شعائر ہیں کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ سے اپنے مناسک سیکھو۔ معنی یہ ہے کہ جب تم حج کے مناسک میں سے کوئی منک ادا کر لو تو اللہ کا ذکر کرو اور اس پر اس کی نعمتوں کی تعریف کرو۔ ابو عمرو نے کاف کو کاف میں مدغم کیا ہے اسی طرح اس نے سلکم میں کہا ہے کیونکہ دونوں ایک جیسے ہیں اور قضیتم یہاں ادیتم اور فرغتم کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ یعنی جب تم جمعہ ادا کر لو۔ یہاں فعل کی ادائیگی کو قضا سے تعبیر کیا ہے جس کا متعین وقت نکل چکا ہو۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ عربوں کی عادت تھی جب وہ حج ادا کر لیتے تو حجرہ کے پاس ٹھہرتے اور اپنے آباء پر فخر کرتے اور اپنے آباء کی جرأت و بہادری اور سخاوت کے کارنامے بیان کرتے۔ حتیٰ کہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، رمی الجمار سیم حصیات، صفحہ 235، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن دارقطنی، کتاب الحج، المواقیب، صفحہ 276، جلد 2 (قاہرہ)

3۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، الطیب بعد رمی الجمار، صفحہ 236، جلد 1 (وزارت تعلیم)

4۔ البحر الوجیز، جلد 1، 270 (دارالکتب العلمیہ)



ان میں سے کسی نے کہا: اے اللہ! بے شک میرا باپ عظیم قبہ اور عظیم تھال والا تھا اور کثیر مال والا تھا تو مجھے اسی طرح عطا فرما جس طرح تو نے اسے عطا فرمایا۔ پس اس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی کا ذکر نہیں کیا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس سے زیادہ کریں جتنا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء کا ذکر کرتے تھے۔ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس، عطاء، ضحاک اور ربیع نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جس طرح بچے اپنے والدین کا ذکر کرتے ہیں۔ ابا، اماں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے استغاثہ کرو اور اس کی بارگاہ میں پناہ لو جیسے تم اپنے بچپن میں اپنے آباء سے کرتے تھے۔ ایک طائفہ نے کہا: آیت کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرو اور اس کی حرمت کا دفاع کرو اور جو اس کے دین اور اس کے مشاعر میں شرک کا ارادہ کرے اسے دور کرو جیسے تم اپنے آباء کا خیر کے ساتھ ذکر کرتے ہو جب ان میں سے کسی کی شان گھٹائی جاتی اور تم ان کی طرف سے حفاظت کرتے ہو اور دفاع کرتے ہو (1)۔ ابوالجوزاء نے حضرت ابن عباس سے کہا: ایک شخص آج اپنے باپ کا ذکر نہیں کرتا، پھر اس آیت کا معنی کیا ہے؟ فرمایا: اس طرح بات نہیں ہے لیکن تو اللہ کے لئے ناراض ہو جب اس کی نافرمانی کی جائے، اس سے زیادہ جتنا کہ تو اپنے والدین کی وجہ سے غصہ کرتا ہے جب انہیں برا بھلا کہا جاتا ہے۔ کذا کریم میں کاف محل نصب میں ہے یعنی ذکا کذا کریم۔ اذ اشذ زجاج نے کہا اواشد، ذکا کریم پر عطف کی بنا پر محل جر میں ہے۔ معنی ہے: اواشد ذکا۔ اور منصرف نہیں کیونکہ افضل صفت کا صیغہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اواذ کر وہ اشد کے معنی میں محل نصب میں ہو اور ذکا بیان کی بنا پر منصوب ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا مَن مَّبْتَدِئِ حَيَاتِهِ مَلَكٌ رَّحِيمٌ اذْذِذْ زجاج نے کہا: عربی زمانہ جاہلیت میں صرف دنیا کے مصالح کے لئے دعا مانگتے تھے (2)۔ وہ ادنٹ، بکری، دشمن پر کامیابی مانگتے تھے اور آخرت کی خیر نہیں مانگتے تھے کیونکہ وہ آخرت کو جانتے نہ تھے اور نہ اس پر ایمان رکھتے تھے۔ پس انہیں صرف دنیا کے لئے دعا مانگنے سے منع کیا گیا، نہی، خبر کے صیغہ میں آئی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ وعید مومن کو بھی شامل ہو جو صرف دنیا کے لئے دعا مانگے۔ اس بناء پر وَمَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔ یعنی اس شخص کے حصہ کی طرح جو آخرت کا سوال کرتا ہے الخلاق سے مراد حصہ ہے، اور من زائدہ ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

”اور بعض لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب عطا فرما ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی اور بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْهُمْ لَنُكَفِّرَنَّ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۚ اُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ اس سے مراد مسلمان ہیں جو دنیا اور آخرت کی

خیر طلب کرتے ہیں۔ اور الحسنین کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دنیا میں الحسنۃ سے مراد حسین و شکیل عورت ہے (1) اور آخرت میں آہو چشم حوریں ہیں۔ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اس سے مراد بری اور بد صورت عورت ہے۔ میں کہتا ہوں: اس میں بعد ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح نہیں ہے کیونکہ النَّار سے مراد حقیقتہً جلانے والی آگ ہے اور آگ سے عورت مراد لینا تجوز ہے۔ قتادہ نے کہا: حسنة الدنيا سے مراد دنیا میں عافیت اور مال بقدر ضرورت ہے۔ حسن نے کہا: حسنة الدنيا سے مراد علم اور عبادت ہے (2)۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔ اکثر اہل علم کا یہ قول ہے کہ الحسنین سے مراد دنیا و آخرت کی نعمتیں ہیں اور یہ صحیح ہے کیونکہ لفظ تمام چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ حسنة نکرہ ہے اور دعا کے سیاق میں ہے۔ یہ بطور بدل ہر حسنة کا احتمال رکھتا ہے اور حسنة الاخرة سے مراد بالا جماع جنت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کوئی ایک حسنة مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ہمیں دنیا میں اچھا عطیہ عطا فرما۔ پس اسم کو حذف کیا گیا۔

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ، قنا اصل میں اَوْقْنَا تھا و او کو حذف کیا گیا جس طرح یقہ اور یشی میں حذف کی گئی کیونکہ و او، یا اور کسرہ کے درمیان واقع ہے جیسے یَعِدُّ، میں و او حذف ہے۔ یہ بھریوں کا قول ہے۔ کوفیوں نے کہا: و او کو لازم اور متعدی کے درمیان فرق کرنے کے لئے حذف کیا گیا ہے۔ محمد بن زید نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ عرب کہتے ہیں درم، یرم، و او کو حذف کرتے ہیں۔ آیت سے مراد یہ دعا ہے کہ وہ ان لوگوں سے نہ ہو جو گناہوں کی وجہ سے آگ میں داخل ہوں گے اور شفاعت انہیں نکالے گی اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دعا جنت میں داخلہ کی طلب کے لئے دعا کو مؤکد کرنا ہے تاکہ دونوں طرف سے نجات اور فوز میں رغبت ہو جیسا کہ ایک صحابی نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی تھی میں اپنی دعا میں کہتا ہوں: اے اللہ! مجھے جنت میں داخل کر اور مجھے آگ سے عافیت دے اور میں آپ کی کلام اور معاذ کی کلام کو نہیں جانتا، رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا: ”ہماری کلام تیری کلام کے قریب ہوتی ہے (3)“۔ ابو داؤد نے اپنی سنن میں اور ابن ماجہ نے یہ روایت کی ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** یہ آیت ایک جامع دعا ہے دنیا و آخرت کو شامل ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں فرمائیں۔ آپ نے دعا کی: اللہم آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ لوگوں نے کہا: ہمارے لئے مزید دعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: تم کیا چاہتے ہو، میں نے دنیا و آخرت تو مانگ لی ہے؟ صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ اکثر اس دعا کے ساتھ دعا مانگتے تھے: اللہم آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (4) حضرت انس جب دعا مانگنے کا ارادہ کرتے تو اس دعا کے ساتھ دعا مانگتے اور حضرت عمر کی حدیث میں ہے کہ وہ بیت اللہ کا طواف کرتے تو یہ دعا مانگتے: رَبِّتَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اس کے علاوہ آپ کی کوئی عادت نہ تھی۔ یہ ابو عبید نے ذکر کیا ہے۔ ابن جریج نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ

3۔ ایضاً، صفحہ 277، جلد 1

2۔ ایضاً

1۔ البحر الرائق، صفحہ 276، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

4۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، قول النبی ﷺ، صفحہ 945، جلد 2 (وزارت تعلیم)

موقف میں مسلمان کی اکثر دعا یہ ہونی چاہئے: رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: رکن کے پاس ایک فرشتہ کھڑا ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا وہ آمین کہتا ہے۔ پس تم کہو: رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ عطاء بن ابی رباح سے رکن یمانی کے متعلق پوچھا گیا جب کہ وہ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ عطاء نے کہا: مجھے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ستر فرشتوں کو اس پر مقرر کیا گیا ہے کہ جو یہ دعا پڑھے: اَللّٰهُمَّ اِنِ اسْأَلْتُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ تو وہ کہتے ہیں: آمین (1) (الحديث) اس حدیث کو ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے اور پوری حدیث مسند سورہ الحج میں آئے گی۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۖ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٣٢﴾

”انہی لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا (دونوں جہانوں میں) بسبب ان کی (نیک) کمائی کے اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

**مسئلہ نمبر 1:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا یہ فریق ثانی کی طرف راجع ہے۔ یعنی اسلام کے فریق کی طرف۔ یعنی ان کے لئے حج کا ثواب ہے یا دعا کا ثواب ہے۔ بے شک مومن کی دعا عبادت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: أُولَٰئِكَ کا مرجع دونوں فریق ہیں مومن کے لئے اس کے عمل اور دعا کا ثواب ہے اور کافر کے لئے اس کے شرک کی سزا اور دنیا پر اس کی نظر کا منحصر ہونے کا وبال ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: فَاَلْيَوْمَ نَكْفِىُكَ مَا كَسَبُوا (انعام: 132)

**مسئلہ نمبر 2:** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ یہ سماع یسراء سماعا و سمرعة سے مشتق ہے جیسے عظم یعظم، اس کا اسم فاعل سریع ہے۔ الحساب محاسبہ کی طرح مصدر ہے۔ محسوب کو حساب کا نام دیا جاتا ہے الحساب کا معنی شمار کرنا ہے: کہا جاتا ہے: حسب يحسب حساباً وحساباً وحساباً وحساباً وحساباً یعنی شمار کرنا۔ ابن الاعرابی نے کہا:

يا جمل اسقاك بلا حسابه سقيا ملوك حسن الريابة

قتلتني بالذل والغلابة

اور الحسب انسان کے مفاخر جو شمار کئے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: حسبہ دینہ۔ کہا جاتا ہے: حسبہ مالہ، اسی سے حدیث ہے: الحسب المال والكرم التقوى۔ (2) (حسب مال ہے اور کرم تقویٰ ہے) اس حدیث کو حضرت سمرہ بن

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب البناسک، فضل الطواف، صفحہ 218 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورہ حجرات، صفحہ 160، جلد 2 (وزارت تعلیم)



جندب نے روایت کیا ہے اور اسے ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور یہ الشہاب میں بھی ہے۔ الرجل حسیب وقد حسب حسابہ جیسے عَطَب عطاہ۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے۔ وہ شمار اور عقد اور فکر کو عمل میں لانے کا محتاج نہیں ہے جیسا کہ حساب لگانے والے کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے فرمایا: کفی بنا حسابین رسول اللہ ﷺ نے دعا کی: اللہم منزل الكتاب سریع الحساب (المحدث (1)

اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے جو کچھ ان کے حق میں ہے اسے جانتا ہے اور جو ان کے خلاف ہے اسے بھی جانتا ہے اسے غور و فکر کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے جو محاسب کے لئے ہے اور جو اس کے خلاف ہے کیونکہ حساب میں فائدہ اس کی حقیقت کا علم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ بندوں کو ان کے اعمال کی بہت جلد جزا دینے والا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کو ایک کام دوسرے کام سے غافل نہیں کرتا۔ وہ ایک حالت میں ان کا محاسبہ کرے گا جیسا کہ فرمایا اور اس کا قول حق ہے: مَا خَلَقْتُمْ وَلَا تَحْكُمُوا إِلَّا كُنُفُسًا وَّاحِدَةً (لقمان: 28)

حسن نے کہا: اس کا حساب آنکھ جھپکنے سے بھی زیادہ تیز ہے (2)۔ خبر میں ہے اللہ تعالیٰ بکری دوہنے کی دیر سے حساب لے لے گا۔ بعض نے فرمایا: وہ جب ایک کا حساب لے گا تو تمام مخلوق کا حساب لے چکا ہوگا۔ کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اللہ تعالیٰ ایک دن میں بندوں کا کیسے محاسبہ فرمائے گا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جیسے ایک دن میں انہیں رزق دیتا ہے۔ حساب کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کے مطابق جزا کی تقادیر کو جانتا ہے اور انہیں وہ چیزیں یاد دلاتا ہے جو وہ بھول چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا أَلْهَبَهُ اللَّهُ وَنَسُوهُ (المجادلہ: 6) بعض علماء نے فرمایا: آیت کا معنی ہے وہ حساب کے دن کو جلدی لانے والا ہے۔ اس آیت سے مقصود قیامت کے دن سے ڈرانا ہے (3)۔

میں کہتا ہوں: ہر مفہوم کا احتمال ہے۔ انسان اپنے لئے اعمال صالحہ کے ساتھ حساب کی تخفیف کو لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں حساب میں تخفیف فرمائے گا اس پر جو دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے۔

**مسئلہ نمبر 3:** حضرت ابن عباس نے اُولَئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وہ شخص جو مال لیتا ہے اور کسی دوسرے کی طرف سے حج کرتا ہے تو اسے ثواب ملتا ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ اس آیت کے تحت مروی ہے کہ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میرا والد فوت ہو گیا ہے اور اس نے حج نہیں کیا میں اس کی طرف سے حج کروں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر تیرے والد پر قرضہ ہوتا اور تو اسے ادا کرتا تو کیا وہ جائز ہوتا؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا قرض ادا کرنے کا زیادہ حقدار ہے۔ اس شخص نے کہا: کیا اس میں میرے لئے اجر ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: اُولَئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا۔ یعنی جو میت کی طرف سے حج کرے تو اس کے اور میت کے درمیان اجر ہوگا۔ ابو عبد اللہ محمد بن خویز مند اد نے احکام

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، الدعاء علی الشہداء، صفحہ 411، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 277، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ معالم الشریعہ، صفحہ 260، جلد 1 (دار الفکر)

میں فرمایا: حضرت ابن عباس کا قول امام مالک کے قول کی طرح ہے کیونکہ امام مالک کے مذہب کا حاصل یہ ہے کہ جس کی طرف سے حج کیا گیا ہے اس کو خرچ کا ثواب ملے گا اور حاجی کو حج کا ثواب ملے گا، گویا اسے اس کے بدن اور اعمال کا ثواب ملے گا اور جس کی طرف سے حج کیا گیا ہے اسے مال اور خرچ کا ثواب ملے گا۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: اس میں جس نے پہلے حج کیا ہوا ہو یا نہ کیا ہوا، ہو حکم مختلف نہیں ہے۔ (یعنی پہلے جس نے حج نہ کیا ہوا ہو وہ حج بدل کر سکتا ہے) کیونکہ وہ اعمال جن میں نیابت ہو سکتی ہے ان میں جس کو نائب بنایا گیا ہے اس کا حکم مختلف نہیں ہے۔ اس نے پہلے اپنا وہ فریضہ ادا کیا ہوا ہو یا نہ کیا ہوا ہو اس میں دین و دنیا کے اعمال کا ہم نے اعتبار کیا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ وہ شخص جس پر زکوٰۃ ہو یا کفارہ ہو یا کوئی اور واجب ہو وہ کسی غیر کی طرف سے ادا کر سکتا ہے اگرچہ اپنا کفارہ ادا نہ بھی کیا ہو۔ اسی طرح جس نے دنیا میں اپنے مصالح کی رعایت نہ کی ہو اس کا اس کی مثل مصالح میں غیر کا نائب بننا صحیح ہے۔ پس وہ غیر کے لئے مکمل ہوگا اگرچہ اس کے لئے مکمل نہ ہوگا۔ آدمی دوسرے کا نکاح کر سکتا ہے اگرچہ اپنا نکاح نہ بھی کیا ہو۔

تم ترجمۃ الجزء الثانی من تفسیر القرطبی ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ

الحمد لله رب العالمین والعاقبة للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین  
سید محمد اقبال شاہ غفری عنہ

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی

کی شہرہ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلاویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء  
لکھنؤ  
بھیرہ شریف  
میں کی زیرنگرانی

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

تفسیر مظہری  
جلد 10

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے

ضیاء امت  
آرٹھ پبلی کیشنز



ابوالفضل حافظ عماد الدین ابن کثیر

کی شہرہ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلاویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء  
مکملہ تفسیر ابن کثیر  
بھیرہ شریف کی زیرنگرانی

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

تفسیر ابن کثیر 4 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے

ضیاء امت قرآن پبلی کیشنز

